# دِل بھٹکے گا

(ناول)

احمد بش

دِل بھٹکے گا

(ناول)

احمد بشیر

ہے کہ آپ اس ناول کو کہیں کہیں سے دیکھ لیں۔ یہ آپ کے
ے گا۔ اس میں کوئی خیال انگیز رومان نہ ملے گا۔ یہ تصوف کی
پ چھپ سکیں۔ اگر آپ کو چہروں کی بدلتی ہوئی حالت کے
ناول کو نہ پڑھیں کیونکہ اس کا مشاہدہ تو آپ کر چکے ہیں۔
ہیں تو اس ناول کو ضرور پڑھیں کیونکہ اس میں بداخلاقی کی
ح اور وقت کاٹنے کے خیال سے بھی پڑھا جا سکتا ہے مگر اس
ناول بازار میں دستیاب ہیں۔

ے ہوئے.....

ں اور گھامڑ پن کے بارے میں کہنا چاہیے۔ میں نے اس
کے اصلی نام بھی لکھ دیئے۔ وہ اتنے عظیم تھے کہ میں ان کو فکشن
ں سچائی ہے یا بدمعاشی۔ میں شرفا کو گلی بازار میں لے آیا اور
ں اور منافقتیں بھی میں نے بیان کر دیں مگر ایسوں کے اصلی
میں ان سے نفرت نہیں کرتا۔
ں سیدھی لکیر کوئی ہے نہیں۔ ہر ناول ہڈ بیتی ہوتا ہے اور اس
بھٹکے گا" میں بھی دکھائی دے جائے۔

احمد بشیر

# دِل بھٹکے گا

(ناول)

احمد بشیر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Bashir, Ahmad
Dil Bhatkay Ga/ Ahmad Bashir.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2012.
856pp.
1. Urdu Literature - Novel.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/مصنف سے باقاعدہ
تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا اگر اس قسم کی
کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے

2012

نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2472-1
ISBN-13: 978-969-35-2472-7

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز لاہور

# فہرست

| | |
|---|---|
| انتساب | 5 |
| ناول لکھنے کی ترکیب | 7 |
| باب1 | 9 |
| باب2 | 54 |
| باب3 | 88 |
| باب4 | 105 |
| باب5 | 131 |
| باب6 | 169 |
| باب7 | 205 |
| باب8 | 225 |
| باب9 | 239 |
| باب10 | 260 |
| باب11 | 287 |
| باب12 | 305 |
| باب13 | 317 |
| باب14 | 328 |
| باب15 | 341 |
| باب16 | 360 |
| باب17 | 384 |

| | |
|---|---|
| باب18 | 405 |
| باب19 | 435 |
| باب20 | 453 |
| باب21 | 480 |
| باب22 | 502 |
| باب23 | 527 |
| باب24 | 544 |
| باب25 | 569 |
| باب26 | 596 |
| باب27 | 612 |
| باب28 | 637 |
| باب29 | 664 |
| باب30 | 682 |
| باب31 | 699 |
| باب32 | 714 |
| باب33 | 734 |
| باب34 | 751 |
| باب35 | 767 |
| باب36 | 792 |
| باب37 | 808 |
| باب38 | 830 |
| باب39 | 837 |


# انتساب

میرے پیارے ہمایوں شیخ کے دل کی ہوک کومل شیخ کے نام

گاتی جاؤ' لبھاتی ہوئی' بھرماتی جاؤ' لمبا سفر بھی ہنستے کھیلتے کٹ جاتا ہے

احمد بشیر

# ناول لکھنے کی ترکیب

جب میں نے ناول لکھنے کا فیصلہ کیا تو مجھے علم نہ تھا کہ ناول کیسے لکھتے ہیں۔ سیانوں سے پوچھا تو انہوں نے بڑی فراخدلی سے اس کی ترکیب بتا دی۔ کہا: پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں لکھنا کیا ہے' پھر اس پر ایک ننھا منا پلاٹ بنا کر کاغذ پر لکھ لو اور وہ کردار تخلیق کرو جو تمہاری کہانی کہہ سکیں۔ جب اتنا کر لو تو اس پلاٹ کو ابواب میں تقسیم کر دو اور ان کے خلاصے بھی لکھ دو' لو ناول تیار ہے۔ فقط اس کا لکھنا باقی رہا۔

مشورہ صائب تھا مگر میری مشکل یہ ہے کہ میں کبھی سیدھی لکیر پر نہیں لکھ سکتا۔ دوسروں کے تجربوں سے کچھ سیکھ نہیں سکتا اور سیدھی سڑک پر نہیں چل سکتا۔ مجھے اس قسم کا کوئی پیغام بھی نہیں دینا تھا کہ نیکی کر دریا میں ڈال۔ پھر میں اپنے ایک دوست کے پاس گیا جس نے ساری دنیا کا فکشن پڑھ رکھا تھا۔ اس نے کہا' لو میں تمہیں ترکیب بتاتا ہوں۔ تم ایک کورے کاغذ کا دستہ اور ایک بال پوائنٹ پنسل لو اور سوچے سمجھے بغیر لکھنا شروع کر دو۔ اگر ایک دستہ ختم کرنے کے بعد بھی تمہارا لکھنے کو دل چاہے تو لکھو ورنہ چھوڑ دو' مگر سب لوگ خاص طور پر بڑے ادیب اس طرح نہیں لکھتے۔ بعض ان میں سے کتاب لکھ سکتے ہیں۔ ناول نہیں لکھ سکتے۔

اس کی بات مجھے پسند آئی۔ میں اندھیرے میں سیڑھیاں چڑھنے میں کوئی دِقت محسوس نہیں کرتا۔ زندگی میں جہاں بھی میں نے پھاٹک بند دیکھا اس کو توڑنے کی کوشش کی۔ پُل آیا تو اس کے پار اُترنے کی اُمنگ جاگی' حالانکہ وہاں میرا کوئی کام اَٹکا ہوا نہ ہوتا۔ فکشن لکھنے کا مجھے کوئی علم نہیں مگر صحافت جیسے بدنام پیشے میں' میں نے نام پایا۔ میں نے اپنے پیاروں کو جو مجھے پڑھتے ہیں' ہمیشہ چونکایا مگر ناول لکھنے سے مجھے ڈر لگتا' اس لیے کہ جو معیار ادب عالیہ کے میرے ذہن میں ہیں' میں خود ان پر پورا نہیں اترتا۔

''دل بھٹکے گا'' میں نے کسی تخلیقی خلش سے مجبور ہو کر نہیں لکھا۔ میں ایک کاہل اور کام چور آدمی ہوں۔ تھوڑا بہت پڑھنے کا شوق مجھے ہے۔ اگرچہ فکشن میں نے کم ہی پڑھا ہے۔ یہ ناول زندگی کی ناکامیوں' نارسائیوں اور گناہوں کا گوشوارہ ہے' جس پر میں کبھی شرمندہ نہیں ہوا۔ یہ میری کہانی نہیں' ایک عہد کی داستان ہے جو آہستہ آہستہ کھلا' اپنے زوال کے کمال کو پہنچا اور اب نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں۔ (افسوس مجھے پیش لفظ بھی لکھنا نہیں آتا۔)

یہ عہد جس کی کہانی میں بیان کرنے والا ہوں' ہم سب پر گزرا ہے۔ پھر میں نے کون سا تیر مار لیا۔

مانا کہ سچ بولنے کی عادت میں مَیں بہت بدنام ہوں' مگر بات کرنے کا سلیقہ مجھے نہیں آتا۔ فقرے بھی میرے بے جان ہوتے ہیں (اور اگر سچ ہی بولنا ہو تو فقرے گھڑنے کی ضرورت کہاں ہوتی ہے۔) پھر سچ تو لوگ روز عدالت میں بولتے ہیں۔ میرے لکھنے میں کون سی خوبی ہے؟

میرے پاس کوئی چکردار پلاٹ نہیں۔ میرے کردار بھی میرے ساتھ دور تک نہیں چلتے۔ ادھر میں نے آنکھ جھپکی ادھر وہ گلیاروں میں گم ہو گئے' مگر کیا زندگی میں ایسا ہی نہیں ہوتا؟ کس نے زندگی پلاٹ کے مطابق گزاری؟ تو کیا میں فقط زندگی کے بارے میں لکھ رہا ہوں جیسی کہ میں نے کی؟

مجھے غیب سے مضامین نہیں آتے۔ میں وقت کے بارے میں ہمیشہ متحیر رہا۔ لمحے کہاں گم ہو جاتے ہیں۔ کہاں سے آئے تھے اور کہاں چلے گئے؟

میں نے ''دِل بھٹکے گا'' میں جذبات نگاری نہیں کی لیکن بعض اوقات لکھتے لکھتے میں خود رو پڑا۔ میں رقیق القلب آدمی نہیں' مگر تقسیم ہند کے زمانے میں جن وارداتوں سے میں گزرا' ان کے بیان میں اگر میری آنکھیں گیلی ہوئیں تو مجبوری تھی۔ یہ عرض کر دوں کہ میں مہاجر نہیں ہوں۔ میرا کوئی عزیز رشتہ دار بھی کسی مصیبت میں نہیں پڑا مگر پھر بھی ہم سب آدھے دھڑ کے رہ گئے۔ کیا اس پر رویا بھی نہ جائے؟ روتے ہوئے میں ڈرتا تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ دیکھ لے تو یہ نہ سمجھے کہ کیے پر روتا ہے بلکہ خیال کرے کہ اپنے لکھے پر روتا ہے۔

میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ آپ اس ناول کو کہیں کہیں سے دیکھ لیں۔ یہ آپ کے امن و سکون کو برباد نہیں کرے گا۔ اس میں کوئی خیال انگیز رومان نہ ملے گا۔ یہ تصوف کی گھپا بھی نہیں جس میں آپ چھپ سکیں۔ اگر آپ کو چہروں کی بدلتی ہوئی حالت کے مطالعے کا شوق ہے تو اس ناول کو نہ پڑھیں' کیونکہ اس کا مشاہدہ تو آپ کر چکے ہیں۔ ہاں اگر آپ اخلاقی آدمی ہیں تو اس ناول کو ضرور پڑھیں کیونکہ اس میں بداخلاقی کی باتیں بہت ہیں۔ اسے تفریح اور وقت کاٹنے کے خیال سے بھی پڑھا جا سکتا ہے مگر اس طور کے زیادہ مفرح قلب ناول بازار میں دستیاب ہیں۔

سیدھی لکیروں پر لکھے ہوئے......

کچھ مجھے اپنی بدتمیزی اور گھامڑ پن کے بارے میں کہنا چاہیے۔ میں نے اس ناول میں بعض کرداروں کے اصلی نام بھی لکھ دیئے۔ وہ اتنے عظیم تھے کہ میں ان کو فکشن میں تخلیق نہ کر سکتا تھا۔ یہ میری سچائی ہے یا بدمعاشی۔ میں شرفا کو گلی بازار میں لے آیا اور بعض کی کمینگیاں' بے وفائیاں اور منافقتیں بھی میں نے بیان کر دیں مگر ایسوں کے اصلی نام میں نے نہیں لکھے کیونکہ میں ان سے نفرت نہیں کرتا۔

افسوس کہ اس ناول میں سیدھی لکیر کوئی ہے نہیں۔ ہر ناول ہڈ بیتی ہوتا ہے اور اس کی جھلک آپ کو شاید ''دِل بھٹکے گا'' میں بھی دکھائی دے جائے۔

احمد بشیر

# باب 1

تیس برس پہلے جب جمال نے نور پور چھوڑا تھا تو جانتا نہ تھا کہ اس شہر سے میرا تعلق ہمیشہ کے لیے ٹوٹ رہا ہے۔ آج جب وہ تیس برس بعد دوبارہ نور پور کے موڑ پر بس سے اترا تو اس کے دل میں اس بستی سے' جس میں اس کا بچپن گزرا تھا' تعلق کی گرمی نہ تھی۔

## گھر کا راستہ

کسی پرانے تاریخی کھنڈر کی سیر کرنے والے سیاح کی طرح اس نے موڑ پر کھڑے ہوئے تانگوں پر نگاہ ڈالی' مریل ٹٹو' خستہ حال تانگے' جھولتے ہوئے پہیئے اور زرد بھوکے چہروں والے کوچوان اس کے لیے کوئی نیا منظر نہ تھے۔ تیس برس قبل سارے تانگے والے اسے پہچانتے تھے مگر اب کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ اس سے جمال کو کچھ اطمینان ہوا۔

نور پور جانے والی سڑک اسی طرح ویران تھی مگر سیم کے پانی کا تعفن کچے دھان کی باس میں گھل کر اُسے زیادہ برا نہیں لگا۔ ہندو ساہوکاروں کے باغ اُجڑ چکے تھے اور ان لٹے پٹے باغوں میں پناہ گیروں نے جھونپڑیاں بنا لی تھیں۔ یہ پناہ گیر ہندوستان کے مہاجرین نہیں تھے۔ انہوں نے تو ساہوکاروں کے پکے مکانات اور دکانیں الاٹ کروا لی تھیں۔ یہ پناہ گیر مقامی بے زمین کسان تھے جن کو صرف فصلوں کے موقعے پر کام ملتا ہے۔ ان میں زیادہ تر چنگڑ تھے جو دھرتی کی تخلیق کے وقت سے محروم اور آوارہ چلے آتے ہیں مگر جنہوں نے دھرتی سے تعلق کبھی توڑا نہ تھا۔

نور پور کا قدیم صدر دروازہ جو نادر شاہ کے قتلِ عام کے بعد تعمیر ہوا تھا' ابھی تک سلامت مگر خستہ حال تھا۔ اس کے قریب کھڑے بوڑھے بڑ کی جٹاؤں کے سائے میں پولیس کی چوکی بھی اسی طرح موجود تھی جس طرح وہ نور پور کے تھانیدار شاہ بادشاہ ذوالفقار علی شاہ کے حکم پر ہندوؤں کے قتلِ عام کے زمانے میں تھی۔ نور پور میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ تیس برس اس کے اوپر سے چیل کی طرح اُڑ کر نکل گئے تھے۔

جمال شہر کے اندر داخل ہوا تو اسے کسی نے بھی نہ پہچانا۔ یہاں اب کوئی گھر ایسا نہ تھا جسے وہ اپنا کہہ سکے مگر اس کے پردادا کی حویلی جس میں اس نے آنکھ کھولی تھی' ابھی موجود تھی۔

حویلی جمال کے والد کے چچاؤں اور ان کی اولادوں میں کمرہ کمرہ تقسیم تھی' مگر آنے جانے کے لیے سب کو ایک ہی سیڑھی اور ایک ہی صحن میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس لحاظ سے یہ حویلی ایک محلہ تھی اور محلہ کسی ایک شخص کا گھر نہیں ہوتا۔ جمال اسی محلے میں پیدا ہوا اور پلا تھا مگر وہ اس کو گھر سمجھنے پر مجبور تھا۔

تنگ اندھیاری سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے اس نے دیکھا کہ طاق دان میں مٹی کا پرانا ڈیوٹ' جس میں سرسوں کا تیل جلتا تھا' کسی مرے ہوئے چوہے کی طرح کونے سے لگا ہے۔ اُترتے چڑھتے ہاتھوں کی رگڑ سے زینے کی دیواروں کے رنگ گہرے نسواری ہو چکے تھے۔ سو برس پرانے چونے کے چکتے اُکھڑ رہے تھے' نانک شاہی اینٹوں کے ردے ننگے ہو رہے تھے' قدمچوں کی ڈاٹیں گھس کر کمان بن چکی تھیں۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جمال کو بجلی کی مدھم روشنی میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھنے پڑ رہے تھے' حالانکہ سورج ابھی ڈوبا نہ تھا۔

جمال کے بچپن میں میاں عیدا اسی طاق دان کے پاس کھڑے ہو کر ''مسیت دی روٹی جی'' کی فریاد کیا کرتے تھے۔

جمال نے آخری سیڑھی پر قدم رکھا اور دالان میں جا کھڑا ہوا۔ جاتی ہوئی دھوپ کی پیلی اداسی مٹی پر ملی ہوئی تھی۔ اس پیڑھی پر جس پر خواجہ قطب دین کی بڑی بیوی اور سارے خاندان کی ''وڈی بے بے'' بیٹھ کر گھر چلایا کرتی تھی۔ اب خواجہ عبدالصمد کی بیوی اور سارے خاندان کی ''چھوٹی بے بے'' بیٹھی چاول چن رہی تھی۔ وڈی بے بے کو مرے بیس سال ہو چکے تھے۔ جمال کے والد اور والدہ بھی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ اس لحاظ سے اب چھوٹی بے بے کے ہاں جمال کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔

خواجہ قطب دین کی چودہ اولادیں نہ جانے کہاں تھیں۔ وہ خود حویلی چھوڑ چکے تھے۔ اُن کے سب سے چھوٹے بھائی خواجہ محمد دین ''چھوٹی بے بے'' جن کی بیوی تھی' ابھی باہر سے نہ آئے تھے۔ حویلی میں سناٹا تھا۔

## میں صدقے میں واری

چھوٹی بے بے سیڑھیوں کے سامنے کھڑے جمال کو اچانک دیکھ کر ''میں صدقے میں واری'' کہتی ہوئی اس کی طرف لپکی۔ اس نے جمال کا ماتھا چوما' اُسے سینے سے لگایا اور دعائیں دینے کے بعد بولی: ''ارے تو تو گھر کا رستہ بھول گیا۔ غیر ہو گیا۔ بتا تو سہی تو کیسا ہے۔ ہائے میں مرگئی۔ کل کا بچہ اور بال سفید کر لیے تو نے۔'' پھر چھوٹی بے بے سسک سسک کر رونے لگی۔ ''تو نے اپنوں کو چھوڑ دیا۔ سدا کا پردیسی ہو گیا۔ چاند سی شکل بگاڑ لی تو نے!''

تھوڑی دیر کے بعد چھوٹی بے بے نے پلو سے آنسو پونچھے اور لڑکیوں کو پکارنے لگی: ''اری سدو' اری بلو دیکھو ری کون آیا ہے میرے ویہڑے میں۔ ہمارا جمال آیا ہے ری تیس برس بعد۔''

سدو بھری ہوئی جوان کوئی بائیس برس کی' بلو چودہ برس کی کچی امبی' ادھ کھلا گلاب۔ دونوں بہنیں سروں پر موٹی چادریں ڈالے اندر سے نکلیں۔ ان کے پیچھے پیچھے روگا' گوگا' مٹھو' گڈی' سونگی اور جونگی قسم کی

بے شمار لڑکیاں اور لڑکے آ کر صحن میں پھدکتے رہے۔

سدو وڈی بے بے کے منجھلے بیٹے حاجی محمد عارف کی بیٹی تھی۔ حاجی محمد عارف میٹرک تک جمال کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اس زمانے میں ان کا نام عارفہ ڈاکو تھا کیونکہ وہ دکانوں سے پھل اٹھا کر بھاگ جانے میں استاد تھے۔ اب وہ زیادہ وقت مسجد میں گزارتے اور گھر آ کر کشتے مارتے تھے۔ ان کا اور ان کی اولادوں کا نان ونفقہ خواجہ محمد دین اور ان کے چھوٹے بیٹے خواجہ عبدالرشید کے ذمے تھا اور یہ مشترکہ خاندانی نظام کا طریق کار ہے۔ باپ اور بھائی نے حاجی محمد عارف کو کاروبارِ زندگی کے بوجھ سے آزاد کر دیا تھا تاکہ وہ یکسوئی سے عبادت میں مصروف رہ سکیں اور خاندان کی نجات کے لیے دعا اور درود کرتے رہیں۔

حاجی عارف جس زمانے میں عارفہ ڈاکو کہلاتے تھے' سکول جاتے تھے مگر انگریزی ان کی زبان پر چڑھتی نہ تھی۔ میٹرک کے امتحان کے لیے انہوں نے ایک عامل کامل کی بانہہ پکڑی۔ عامل کامل نے کچھ چلے کٹوائے۔ کچھ روزے رکھوائے اور کچھ عمل کروائے۔ اس ریاضت کا مقصد یہ تھا کہ ادھر انگریزی کا پرچہ سامنے آئے ادھر موکل نمودار ہو کر جواب لکھوا دے' مگر وائے بدنصیبی کہ عین کمرۂ امتحان میں عارفے ڈاکو کا وضو ٹوٹ گیا اور اس پر بڑے بڑے صوفیانِ باصفا کا بھی بس نہیں چلتا۔ فیل ہونے کے بعد عارفہ اللہ کے پیچھے پڑ گیا۔ وہ دن اور آج کا دن' عارفے کا وضو کبھی نہ ٹوٹا اور اب تو اس نے حج بھی کر لیا تھا' دنیا ترک ہی کر ڈالی تھی کہ اس میں امتحانوں کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ تو جنابِ علت اور معلول کی منطق میں پڑنا ہی نہ چاہیے۔ اللہ کے اپنے بندوں کو اپنی طرف بلانے کے سو ڈھنگ ہیں' کبھی وضو کروا کر کبھی وضو تڑوا کر۔

دونوں لڑکیوں کی زلفوں میں خم تھے۔ ان کے گھنگرو کانوں کے اوپر سے اترتے دکھائی دیتے تھے۔ سادگی اور صحت سے ان کے چہروں پر چاندنی سی چٹکی ہوئی تھی۔ قدامت موزوں' کپڑے کسی قدر میلے اور موٹے۔ دوسری مرتبہ دیکھنے پر دونوں نہایت خوبصورت لگتی تھیں۔

وہ جمال کے سامنے کسی قدر جھکی کھڑی تھیں تاکہ ان کے جسم کے بھید نہ کھل جائیں۔ ان کی بھنور جیسی کالی آنکھوں میں اشتیاق اور استعجاب تھا۔ ان کی لمبی لمبی پلکیں یکدم جھک کر آنکھوں پر سایہ سا ڈال جاتیں۔ کبھی اُٹھ کر بھنوؤں کے ساتھ لگ جاتیں اور پورا چاند نکل آتا۔ جمال کے سامنے آ کر وہ آہستہ آہستہ ہانپنے لگیں۔ جمال کا دل چاہا کہ وہ اُن کے گالوں کو چھو کر دیکھے مگر اس کا ہاتھ اُٹھ نہ سکا۔

چھوٹی بے بے خوشی سے نڈھال تھی۔ اس کی اپنی عمر اسی سے اوپر ہو گئی تھی۔ سر کے بال مہندی کے باوجود سفید نظر آتے تھے مگر چہرے کی رنگت شنگرف کی طرح دمکتی تھی۔ ہاتھوں میں وہی بھاری گوکھڑو جو ساٹھ برس پہلے اس کی ساس نے اس کو پہنائے تھے اور کانوں میں وہی بھاری ڈنڈیاں جن کے وزن سے چھوٹی بے بے کے کانوں کی لویں پھٹ رہی تھیں۔ وہ شفقت سے بھری ہوئی ایک چاٹی تھی جس کی چکنائی رس رس کر ٹھیکرے کو چمکا رہی تھی۔

چھوٹی بے بے نے جمال کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا ''ارے تو کب تک کھڑا رہے گا۔ بلو کی بچی جا اندر سے کرسی لا۔''

بلو لپک کر گئی اور ایک انگلی سے کرسی اُٹھا لائی۔ چھوٹی بے بے نے پیڑھی پر دھرنا دیا۔ لڑکیاں زمین پر اکڑوں بیٹھ کر ایک لمبی اور رنگین داستان سننے کے لیے تیار ہو گئیں۔ شہر کی کہانیاں' ولایتوں کے قصے' سینما' ہوٹل' بازار' فیشن اور نئے زمانے کی عورتوں کے طور طریقے جو مردوں سے ان کے گاؤں چھڑوا دیتی ہیں۔ سدو اور بلو کے شہروں اور شہر والیوں کے بارے میں ایسے ہی تصورات تھے۔ دونوں نے ٹھوڑیوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

مگر جمال کے پاس تو کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ اس کی زندگی سپاٹ گزری تھی۔ اس نے کوئی سمندر نہ کھنگالا تھا۔ اسے کوئی خزانہ نہ ملا تھا۔ کسی ہیر سے بھی اس کی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ زیادہ تر غمِ دوراں اور غمِ روزگار اس کی زندگی کا سرمایہ رہا جس میں سدو اور بلو کی دلچسپی کی کوئی بات نہ تھی۔ اب وہ ان چہچہے کی ڈالی پر بیٹھی ہوئی چڑیوں سے کون سی بات کرے' وہ اپنے آپ کو بہت احمق لگا۔ اسے خیال آیا کہ اسلام آباد کی سڑکیں کتنی کشادہ ہیں اور اب وہاں کے گلاب اپنی پتیوں کے گل کتر رہے ہوں گے' کیوں یہاں آ کر میں نے اپنے آپ کو اجنبی لوگوں میں لا ڈالا۔ اس نے اچانک کہا ''چھوٹی بے بے میں ذرا تھک گیا ہوں۔''

''وہ تو تیری شکل ہی سے ظاہر ہے۔ اتنا لمبا سفر کر کے آیا ہے۔ اب کہیں ماندہ نہ پڑ جانا۔ ذرا آرام کر لے۔ باتوں کو تو رات پڑی ہے۔''

بلو بولی ''اسلام آباد کتنی دور ہے؟ بہت دور ہو گا۔''

''نہیں' بہت دور نہیں۔'' جمال نے جواب دیا۔ ''یہی کوئی سوا سو میل!''

''بس۔'' بلو بولی۔ ''اور سوا سو میل میں آپ تھک بھی گئے۔ لوگ تو ایک دن میں چاند پر پہنچ جاتے ہیں۔''

''ہاں' مگر تھک تو جاتے ہی ہیں۔'' جمال بولا۔

''تو کیا آپ چاند سے آئے ہیں؟'' بلو نے سنجیدہ منہ بنا کر کہا۔

''چپ شریر کہیں کی۔'' سدو بولی۔

''چپ کر مردار۔'' چھوٹی بے بے نے کہا ''چھوٹے بڑے کا لحاظ کیا کر۔''

''میں تو کبھی نہ تھکوں سوا سو میل کے بعد۔'' بلو نے کہا۔

''تو تو چاند پر جا کر بھی نہ تھکے گی۔'' سدو تنک کر بولی۔

''ہاں میں تو چاند پر جا کر بھی نہ تھکوں گی۔ میں پہلے کراچی جاؤں گی مگر چاند پر ضرور جاؤں گی ایک دن۔ تم دیکھنا سدو باجی۔''

''چپ کر۔'' چھوٹی بے بے نے ہنس کر کہا۔ ''اور سنا ہے جمال تو نے لڑکی کی شادی بھی کر دی؟ خوش تو ہے اپنے گھر میں؟ تو نے بلایا ہی نہیں ہمیں۔ اب تو پردیسیوں میں بچے بھی بیاہنے لگا ہے۔''

''آپ نے بھی تو ڈھیر ساری شادیاں کر ڈالیں۔ آپ نے بھی تو مجھے کبھی نہیں بلایا چھوٹی بے بے۔''

''تیرا کوئی ایک ٹھکانہ ہوتا تو تمہیں اطلاع بھی دیتے۔ تو سدا کا مسافر اس میں ہمارا کیا دوش۔ اب اسلام آباد میں رُک جا۔ سنا ہے بڑا امیر شہر ہے۔''

''جی ہاں مگر وہاں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔''

''تیرے بچے خیر سے جوان ہیں۔ بڑا لڑکا کس جماعت میں ہے؟''

''میٹرک میں ہے چھوٹی بے بے۔''

''جوان ہو گیا' اب تجھے کس بات کا غم۔''

''کوئی غم نہیں چھوٹی بے بے۔ غم کس بات کا؟''

''ہوتا ہی ہے اولاد کا غم۔'' چھوٹی بے بے اداس ہو کر بولی۔ ''میرے تین پوتے مر گئے۔ بیٹی کا سہاگ اُجڑ گیا۔ پھر تیری ماں ساتھ چھوڑ گئی۔ تیرا باپ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ تیری بہن رخصت ہو گئی۔ تیرا جوان بھائی چلا گیا۔ یہ سب کیا میری اولادیں نہیں تھیں؟ میری جیٹھانی بھی اُٹھ گئی' تیری وڈی بے بے اور اب تیرا چھوٹا میاں بھی ضعیف ہو گیا ہے۔ کام کاج کے لائق نہیں رہا۔''

''کام کاج چھوڑ دیا انہوں نے؟'' جمال نے مضطرب ہو کر پوچھا۔ ''تو اب دن بھر کیا کرتے ہیں میاں جی؟''

''سودا سلف لے آتا ہے۔ پھر مسجد میں نفل پڑھتا ہے سارا دن اور کیا کرے۔''

''اور بڑے میاں جی؟ وہ کس حال میں ہیں؟''

## کالا کپڑا

''نام نہ لے اس بدبخت کا۔'' چھوٹی بے بے نے بیزاری سے کہا۔ ''جب اس نے سہرے باندھے تھے تو میں دودھ پیتی بچی تھی۔ دعا کر خدا اس کالے کپڑے کو اٹھا لے اب۔''

جمال بہت حیران ہوا۔ چھوٹی بے بے جس کو خواجہ صمدو کے گھر کی ایک ایک اینٹ سے پیار تھا' اپنے جیٹھ کے بارے میں اس قسم کے کلمات کہہ رہی تھی!

جمال کو خواجہ قطب دین کی بے راہ روی کا علم تھا مگر وہ تو جوانی کی باتیں تھیں۔ اب چھوٹی بے بے سو برس کے اس نحیف و نزار بوڑھے کے بارے میں جو اس خاندان کا بزرگ تھا' ایسی سخت زبان استعمال کر رہی تھی!

''مگر وڈے میاں جی نے اب کیا کیا۔ اب تو وہ کسی قابل نہ ہوں گے۔ انہیں تو آنکھوں سے دکھائی بھی نہ دیتا ہو گا۔'' جمال نے پوچھا۔

''اندھا تو بے شک ہو گیا ہے۔ پر کچھ نہ پوچھ ہمیں تو اس نے کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں

چھوڑا۔ یا اللہ تو اس کو اپنی رحمت سے اُٹھا لے۔''

پھر چھوٹی بے بے دامن پھیلا کر دعا مانگنے لگی۔ ''یا اللہ یا پروردگار تو قطب دین کو اٹھا لے۔ اپنی پناہ میں لے لے اُسے اس پر رحم کر دے۔'' دعا مانگ کر چھوٹی بے بے نے پلو سے آنسو خشک کیے اور چاول چننے لگی۔

اتنے میں سدو نیلے ٹین کی پھولدار ٹرے میں چائے کی ایک پیالی سجا کر لے آئی۔ چائے کا رنگ دودھیا تھا۔ جمال نے ایک گھونٹ پیا تو مٹھاس سے اس کا حلق جل گیا۔ اُس نے پیالی رکھ دی۔

''ٹھنڈی کر کے پی۔'' چھوٹی بے بے نے ہنس کر کہا۔ ''اللہ ماری سینہ جلا دیتی ہے۔''

''گرم نہیں چھوٹی بے بے۔'' جمال نے کہا ''میٹھی ہے۔''

''چائے میٹھی نہ ہو تو کیا کڑوی ہو؟'' سدو نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''جمال بھائی کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ سنا تم نے بلو؟''

''ارے نہیں سدو باجی۔'' بلو بولی ''تم نہیں جانتی شہر کے لوگوں کو۔ یہ میٹھا نہیں کھاتے۔ کہتے ہیں اس سے آدمی موٹا ہو جاتا ہے۔ پر اُن کو معلوم نہیں میٹھا کھانے سے آدمی موٹا نہیں ہوتا۔ میز کرسی پر بیٹھنے اور کچھ کام نہ کرنے سے موٹا ہوتا ہے۔ ہمیں دیکھ لو ہم تو گڑ بھی کھاتے ہیں مگر موٹے نہیں ہوتے۔ کام کاج کرتے رہتے ہیں اس لیے۔''

بلو کی بات سن کر جمال کھسیانا ہو گیا۔ بولا ''چھوٹی بے بے میں موٹا ہونے سے نہیں ڈرتا مگر دودھ زیادہ ہے چائے میں۔''

''دودھ تو زیادہ ہونا ہی چاہیے۔ کالی چائے تو جگر جلا دیتی ہے۔'' چھوٹی بے بے بولی۔

''مگر مجھے دودھ اچھا نہیں لگتا۔ میں نہیں پیتا کبھی۔'' جمال نے کہا۔

''اسی لیے تو تیری یہ حالت ہے۔'' چھوٹی بے بے بولی۔ ''آنکھوں پر موٹے موٹے شیشے لگائے ہیں اس عمر میں۔ مجھے دیکھ کیا مجال کہ ایک بھی کوکڑ و میری نظر سے چھوٹ جائے۔ دودھ پیا کر ماں واری۔''

سیانی بلو پھر بولی ''بھائی جان کو تنگ نہ کر چھوٹی بے بے۔ شہر میں دودھ ملتا کب ہے؟ لوگ ڈبے کی سفید دھول کی ایک چٹکی چائے میں ڈال لیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ ہے ڈبے کا خالص دودھ۔ ٹی وی پر اشتہار چلتا ہے ہر روز جس میں گائے کہتی ہے ''مجھے بھی پسند ہے ڈبے کا خالص دودھ'' بلو اور سدو ہنسنے لگیں۔

''ہے ہے۔'' چھوٹی بے بے نے تاسف سے کہا ''تو پھر کیوں رہتے ہیں شہروں میں لوگ؟''

جمال کو خود معلوم نہیں تھا کہ لوگ شہروں میں کیوں رہتے ہیں۔

اس نے کہا ''پتہ نہیں چھوٹی بے بے۔''

سدو بولی ''یاد ہے نا بلو جب ہم مامی فاطمہ کی خبر لینے لاہور گئے تھے۔''

''یاد ہے۔'' بلو نے کہا۔

''لوگ کیسے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے جیسے پاگل ہوں۔'' سدو بولی۔

''ہمیں تو بڑا اچھا لگا لوگوں کا اِدھر اُدھر بھاگنا' سیریں کرتے پھرتے تھے۔ تماشے دیکھتے تھے۔ ہمیں نہیں پسند یہ سڑا ہوا نور پور۔'' بلو بولی۔

''بکواس نہ کر۔'' چھوٹی بے بے نے ڈانٹ کر کہا۔ ''کیا رکھا ہے شہر میں؟ تو بتا جمال۔''

''بے شک کچھ نہیں رکھا جی۔'' جمال نے جواب دیا۔

''مانتے بھی ہو کہ شہر میں کچھ نہیں رکھا مگر بھاگ بھاگ کر وہیں جاتے ہو اور لوٹ کر آتے بھی نہیں۔'' چھوٹی بے بے اداس ہو کر بولی۔ ''گھر کے تمام لڑکے ایک ایک کر کے کراچی چلے گئے۔ مانا انہوں نے بہت کمایا مگر پوچھو تو اب وہ کون ہیں؟ کہاں کے ہیں اور اب تو شادی بیاہ بھی وہیں کرنے لگے۔ دفن بھی وہیں ہونے لگے میں پوچھتی ہوں کیا روپیہ ہی سب کچھ ہے اس جہان میں؟''

''روپیہ تو کچھ بھی نہیں۔ ہاتھ کا میل ہے چھوٹی بے بے۔'' جمال نے جواب دیا۔

''روپیہ دو روٹی سے زیادہ کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ میں کہتی ہوں تھوڑا کماؤ مگر سکھ پاؤ۔ اب تمہی کہو تم نے گھر بار چھوڑ کر ولایتوں میں دھکے کھائے تو کیا کوئی سکھ بھی پایا تم نے؟ روپیہ تو تم نے بہت کمایا ہوگا؟''

جمال شرما گیا' بولا ''میں نے کچھ کمایا بھی نہیں جی۔''

''پھر میں پوچھتی ہوں' کیا تم بھوکے سوئے؟ تھوڑا کما کر بھی تم اچھے ہی رہے۔ سکھ کی زندگی تو گزاری تم نے!''

اس پر جمال کو اپنی تمام محرومیاں اور ناکامیاں یاد آنے لگیں۔ تنگدستی کے طویل زمانے جب وہ سوکھی روٹی بھی نہ کما سکا تھا' پھر وہ قرضے اس کے پہلو میں کچوکے دینے لگے جو وہ ادا نہ کر سکا تھا مگر اس نے چھوٹی بے بے کی ہاں میں ہاں ملانے ہی میں خیریت جانی۔ ''میں تو بہت سکھ کی زندگی گزارتا ہوں چھوٹی بے بے۔ اپنی نیند سوتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''تو اور کیا۔ ان کی تو مت ماری گئی ہے۔ کراچی جا کر پیسے نے دیدے دھو ڈالے۔ غیرت نہیں رہی کسی میں۔'' چھوٹی بے بے بولی۔

''شہر میں لوگ بدل جاتے ہیں چھوٹی بے بے۔'' جمال نے کہا۔

## شہر کے لوگ

''ارے بہت بدل جاتے ہیں۔ بے شرم ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں بیویاں ایسی ہوں جو انگریزی بولیں۔ چاہے ان کو سوئی میں دھاگہ ڈالنا بھی نہ آتا ہو۔ ہانڈی چولہے سے تو ان کو کیا واسطہ۔ کہتے ہیں بچے نوکرانیاں پالیں اور بیویاں دفتروں میں سے کام نکلوائیں۔ بے غیرت کہیں کے۔''

غصے سے چھوٹی بے بے کے منہ میں جھاگ آ گئی۔ ''اچھا ہے وہیں پڑے رہیں۔ دفع دور' میرے

گھر میں تو کسی مردود کو نظر ڈالنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اری سدو، بلو تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو۔ جاؤ چولہا جلاؤ۔"

لڑکیاں اُٹھ کر چلی گئیں۔ چھوٹی بے بے کے ماتھے پر تیوری چڑھی رہی۔

"آپ کے گھر میں شرافت اور سادگی ہے۔ آپ کے گھر میں کون نظر ڈالے گا؟" جمال نے کہا۔

چھوٹی بے بے کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ چہرے پر گھٹا سی اُمڈ آئی۔ اس نے ایک آہ بھری اور چاولوں کے چھاج کی طرف دیکھنے لگی۔

سدو اور بلو دونوں نسائیت کا بھرپور نمونہ تھیں مگر انگریزی سے بے بہرہ، کپڑوں کی تراش خراش سے ناآشنا، سرخی پوڈر سے لاتعلق مگر گال ان کے گلابوں کی طرح چمکتے تھے اور آنکھیں کاجل بن کالی۔ مگر ابھی تک چھوٹی بے بے کے گھر کوئی سوالی نہ آیا تھا۔ روپے نے اپنے پرائے کر دیئے تھے۔

آنسو پی کر چھوٹی بے بے بولی "جس دن لیاقت علی خان کو گولی لگی تھی۔ اس کے اگلے چاند کی دس تاریخ کو پیدا ہوئی تھی سدو اب کتنے برس کی ہوئی؟"

"پچیس برس کی۔" جمال نے حساب لگا کر بتایا۔ چھوٹی بے بے نے آہ بھری۔

"جب تیرا چھوٹا میاں مجھے بیاہ کر لایا تھا تو میں تیرہ برس کی تھی۔"

"وہ اور زمانے تھے چھوٹی بے بے۔" جمال نے تسلی دیتے ہوئے کہا "اب تو لڑکیاں پچیس تیس ہی برس کی عمر میں بیاہی جاتی ہیں۔"

"دفع۔ جب نہ ساس رہے نہ سسر۔ نہ کسی کی خدمت کرنی پڑے نہ کچھ بنانا پڑے۔" چھوٹی بے بے نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

## میاں جی

دالان میں چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ بلو نے کورے گھڑوں کی گردنوں میں موتیے کے تازہ ہار ڈال دیئے تھے۔ سیڑھیوں میں کھنکار ہوئی تو چھوٹی بے بے بولی "لو تمہارا میاں آ گیا۔"

جمال سنبھل کر بیٹھ گیا۔ لڑکیوں نے دوپٹے درست کر لیے۔ کولہے اور سینے ڈھک لیے۔

خواجہ محمد دین آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دالان میں نمودار ہوئے۔ کلمے کا ورد ان کی زبان پر تھا۔ انہوں نے جمال کا ماتھا چوما۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور کھاٹ پر گر گئے۔

بھائی اکرم اور حاجی عارف دونوں اُن کے پیچھے آتے تھے۔ جمال کو دیکھ کر ان کے چہرے خوشی سے کھل گئے مگر انہوں نے رسمی مزاج پرسی سے آگے بات نہ کی۔

حاجی عارف کے ماتھے کا محراب کالا پڑ چکا تھا۔ ڈاڑھی خشخشی، پاجامہ ٹخنوں سے اونچا اور چہرے پر عبادت کا جلال۔ جمال کا دل چاہا کہ اسے ایک طرف لے جا کر پوچھے یار عارف نے ڈاکو آج کی لوٹ کا مال کہاں ہے؟ مگر اس کی آنکھوں کا گیان دیکھ کر وہ چپ ہو گیا۔

اسے وقت کے گزر جانے اور اشیا کی ماہیت کو تبدیل کر دینے والی قوت کا شدید احساس ہوا۔ اسے خیال آیا کہ میں خود بھی تو اب بوڑھا اور بدشکل ہو چکا ہوں۔ اس خیال سے اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔

حاجی عارف نے تسبیح پھیرتے ہوئے کہا "جمال تم اتنی مدت کے بعد نور پور آئے ہو۔ آخر ہم غریبوں کا بھی تمہارے دل میں خیال آ ہی گیا۔"

جمال کو پھر اکساہٹ ہوئی۔ حاجی عارف سارے کا سارا مصنوعی لگتا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ اس سے کہے، عارف ڈاکو چل ترلوک سنگھ کی بیٹھک سے کھیلیں، لوٹیں پھر پرانے قبرستان میں ایک پوا "مٹھا مالٹا" شراب کا پئیں اور بیتے دنوں کی یادیں تازہ کریں مگر وہ خاموش رہا۔ دل میں سوچنے لگا حاجی عارف تم کس چکر میں پڑ گئے۔ ابھی تو توبہ کرنے کے لیے دن بہت تھے۔

حاجی عارف کے ماتھے کا محراب جمال کو گھور گھور کر تکنے لگا۔ اس نے منافقت سے کام لیتے ہوئے کہا "کیا عرض کروں حاجی صاحب، کاروبارِ دنیا نے فرصت ہی نہ دی اِدھر آنے کی۔ یقین مانیے میرے دل میں ہمیشہ آپ کی زیارت کی آرزو رہی، بچپن کے ساتھی کبھی بھولتے نہیں۔"

بچپن کے حوالے سے حاجی عارف کو تھرتھری آ گئی۔ بولے "جمال میاں بچپن کا زمانہ غفلت کا زمانہ ہوتا ہے۔ غفلت کے زمانے کا کیا ذکر۔ ہر گھڑی استغفار کا ورد کرنا چاہیے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر چھوٹے میاں جی بولے "ہزار بار تو لاہور سے اسلام آباد جاتے ہوئے نور پور سے گزر ہوا ہوگا۔ تیرا جی ہی نہ چاہا گھر لوٹنے کو اور اب باتیں بناتا ہے، کون سے کاروبار چلتے ہیں تیرے، کتنے کارخانوں کا تو مالک ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تو نے ہم سے تعلق توڑ لیا۔ اپنی جڑ بنیاد سے منہ موڑ لیا۔"

"میاں جی میں بہت شرمندہ ہوں۔" جمال دبی زبان سے بولا۔

"اپنے آپ کو مت چھوڑ بیٹا۔" میاں جی نے فہمائش کی۔ "اچھا یہ تو بتا کہ اسلام آباد میں تو کرتا کیا ہے۔ سنا ہے بہت بڑا افسر ہے وہاں۔"

"میاں جی میرے جیسے تو وہاں سیکڑوں ہوں گے۔ اسلام آباد میں کوئی بھی بڑا افسر نہیں ہوتا۔"

"تیرا عہدہ کیا ہے؟ طلب کتنی ہے تیری؟"

"جی میں ایک محکمے کا ڈائریکٹر جنرل ہوں۔"

"جنرل تو فوج میں ہوتے ہیں، کیا تو فوج میں ہے؟"

"نہیں جی۔"

"تو ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ہو گے؟"

"نہیں جی۔"

''ایس پی کے دفتر میں ہو؟''

''نہیں جی میں......''

''انکم ٹیکس کے افسر ہو۔ بڑے افسر تو یہی ہوتے ہیں یا پٹواری اور تھانیدار۔ حکم تو انہی کا چلتا ہے ملک میں۔''

''میں وزارتِ تعلیم میں ہوں میاں جی، فلمیں بناتا ہوں۔''

''تم فلمیں بناتے ہو؟ بڑا لچر کام ہے بیٹا۔ گھر کی عزت کا کچھ خیال کر۔''

## لچر کام

''میں لچر فلمیں نہیں بناتا جی۔ ایک فلم میں نے قائداعظم پر بنائی ہے۔''

''قائداعظم پر؟ کیوں اس کی مٹی خراب کرتے ہو۔ آگے ہی تم لوگوں نے اس کا کیا چھوڑا۔''

''میں ان کی توہین نہیں کرتا جی۔ ان کی عظمت بیان کرتا ہوں۔''

''کون سنتا ہے تمہاری۔ وہی تھانیدار، وہی زمیندار، وہی لوٹ مار۔ فرق صرف اتنا پڑا کہ ہندو کی جگہ مسلمان نے لے لی۔ ظلم پہلے سے کئی گنا بڑھ گیا ہے۔ اب تو اللہ کی رحمت بھی اُڑ گئی ہے۔''

بلو اور سدو کو قائداعظم سے کوئی دلچسپی نہ تھی ''مگر ہم نے اس قسم کی کوئی فلم نہیں دیکھی جیسی آپ بناتے ہیں۔'' بلو بولی۔

''میں نے بھی نہیں۔'' سدو بولی۔

چھوٹی بے بے نے بلو کو ایک دھپہ مارا۔ میاں جی نے بھی اسے گھور کر دیکھا۔ پھر بولے ''جمال پیسہ تو تو نے خوب کمایا ہوگا۔ برے کاموں میں پیسہ تو ہوتا ہے۔''

''نہیں میاں جی، میں نے کچھ نہیں کمایا۔''

''کوئی جائیداد، کوئی زمین کا ٹکڑا، بینک میں کچھ؟''

''میرے پاس کچھ بھی نہیں جی۔''

''واپسی کا کرایہ تو ہوگا آپ کے پاس؟'' بلو بولی۔

چھوٹی بے بے نے اسے پھر ایک ٹھوکا دیا۔

جمال نے کہا ''واپسی کا کرایہ تو ہے میرے پاس مگر پیسہ بنانے کے بارے میں میں نے کبھی کچھ سوچا ہی نہیں۔ پھر مجھے موقع بھی نہ ملا۔''

''کیوں؟ اتنا بڑا افسر ہو کر بھی۔''

''میں نے کوئی ناجائز کام کبھی نہیں کیا۔ رشوت نہیں لی جی۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تو نے اپنے آپ کو خراب نہیں کیا۔ شرافت کو ہاتھ سے نہ چھوڑا مگر تو نے پیسہ بھی نہ بنایا اور اپنے ہوتے ہوئے بھی چھوڑ دیئے۔ کیوں؟''

جمال کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ میاں جی کلمے کا ورد کرنے لگے۔

لڑکیوں نے کابلی چنوں کے شوربے اور باسمتی چاول کے تھال مردوں کے آگے رکھ دیئے۔ پانی کے گلاس بھر دیئے اور پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئیں۔ میاں جی کے لیے چھوٹی بے بے خمیری روٹی اور چنگیر خود لگا کر لائی۔ وہ دمے کی وجہ سے چاول نہ کھاتے تھے۔ میاں جی نے لقمہ لیا اور بولے ''جمال تیری عمر اب پکی ہو گئی ہے۔ تو سوچنے سمجھنے کے قابل ہے۔ میری سن اور اب نور پور میں مکان بنا لے۔ مجھے پچیس تیس ہزار روپے لا دے، میں بنوا دوں گا۔''

جمال کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے نور پور میں یا کہیں اور مکان بنانے کے بارے میں کبھی سوچا نہ تھا۔ اب نور پور کی قریب المرگ بستی میں مکان بنوانے کے خیال ہی سے اسے وحشت ہونے لگی۔ اس نے کہا ''میاں جی میرے پاس پچیس تیس ہزار روپے کہاں، پھر میں ذاتی جائیداد میں یقین نہیں رکھتا۔''

''میں نے کب کہا ہے تو جائیداد بنا۔ جائیداد بہت بری چیز ہے۔ اگر میرے میاں جی مرحوم اتنی جائیداد نہ چھوڑتے تو قطب دین یوں برباد نہ ہوتا۔'' میاں جی بولے۔

''میں کہتی ہوں کہ اس کالے کپڑے کا نام نہ لے میرے گھر میں۔'' چھوٹی بے بے تڑپ کر بولی۔

''بیچ میں مت بولا کر نیک بخت۔'' میاں جی نے ڈانٹ کر کہا ''وہ میرا بڑا بھائی ہے۔ میرا بزرگ ہے۔ باپ کی جا ہے، باپ کا دماغ چل جائے تو اولاد اس کی دشمن نہیں ہو جاتی۔ تو بکواس مت کیا کر۔'' پھر وہ جمال سے مخاطب ہوئے۔

''میں نہیں کہتا کہ تو جائیداد بنا۔ جائیداد بنانے کے لیے چوری اور بے ایمانی کرنی پڑتی ہے اور جائیداد بن جائے تو اولادیں چوری اور بے ایمانی میں پڑ جاتی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں رہنے کے لیے گھر بنا لے نور پور میں تاکہ تیری جڑ لگی رہے یہاں۔ آخر دھرتی کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں بیٹا۔''

''مگر میاں جی یہاں نور پور میں گھر خالی پڑے ہیں اور کرائے پر بھی مل جاتے ہیں۔ پھر مالکی کی کیا ضرورت۔'' جمال نے جواب دیا۔

اسے یہ اَن پڑھ بوڑھا کچھ مشکل لگ رہا تھا۔

## نور پور کا مال

''مالکی کے تو میں بھی خلاف ہوں۔ پر بول تو نور پور کا مال ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کی مالکی کو تسلیم کر، اس کی مالکی بن جا اور اس کا مالک نہ بن۔ زمین زندہ ہوتی ہے اور سانس لیتی ہے۔ جو زمین کو جائیداد اور مال تجارت سمجھتے ہیں، وہ زندگی سے رشتہ توڑتے ہیں۔ ان کو بے چینی اور بے یقینی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ بول ملتا ہے کچھ؟''

"کچھ نہیں ملتا جی۔" جمال نے لاجواب ہو کر کہا۔

"کچھ نہیں ملتا نا اگر تو اپنا مکان نہیں بنا تا تو اپنے پردادا کی حویلی میں واپس آنے کا وعدہ کر' تیری سمجھ میں آ جائے تو......"

جمال ایک لمحے کے لیے پریشان ہو گیا کہ واقعی اگر میں اسلام آباد سے نکلا تو کہاں جاؤں گا مگر وہ چپ رہا۔ میاں جی درود شریف پڑھنے لگے۔ سناٹا چھا گیا۔

چھوٹی بے بے نے جمال کا ہاتھ پکڑ کر کہا "اسے کہہ بیس پچیس ہزار بھی خود ہی لگا دے۔ کیا اپنا پیسہ قبر میں لے کر جائے گا۔"

جمال نے کہا "نہیں چھوٹی بے بے......"

"تو کہہ تو سہی۔ اس کے پاس ہے تھوڑا بہت۔ تو کہے گا تو انکار نہیں کرے گا۔ آخر اس کی اولاد ہے تو بھی۔"

پھر میاں جی کو مخاطب کر کے بولی "جمال کہتا ہے پیسہ نہیں ہے میرے پاس مگر میاں اپنی گانٹھ ڈھیلی کیوں نہیں کرتا۔ کیا پیسہ ساتھ لے جائے گا قبر میں۔"

"میں نے نہیں کہا میاں جی۔" جمال گھبرا کر بولا۔

میاں جی مسکرا دیئے۔ پھر بولے "نیک بخت تو جانتی ہے کہ میرے پاس پیسہ نہیں۔ میں نے کام کاج چھوڑ دیا۔ میرے پاس ہوتا تو ضرور دیتا جمال کو۔"

"جتنا ہے اتنا ہی دے دے۔" چھوٹی بے بے نے ضد کی۔

"جتنا ہے اتنا لے لے جمال۔ مگر پہلے جو کچھ تیرے پاس ہے وہ لا۔ رشتوں پر کچھ خرچ کرنا چاہیے بیٹا۔" میاں جی بولے۔

جمال سٹپٹا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس بوڑھے سے جان کیسے چھڑاؤں۔ وہ بولا "مگر میاں جی جن لوگوں کے پاس اپنے مکان نہیں ہوتے کیا وہ دھرتی کی مالکی سے خارج ہو جاتے ہیں۔ میں ایک ٹکڑے کا غلام بننے کی بجائے پاکستان کا غلام کیوں نہ بنوں۔"

"تو کیا تو خود کو اُن لوگوں میں شمار کرتا ہے جو پاکستان کے غلام ہیں؟ اتنی ہمت ہے تجھ میں؟"

جمال کا دل چاہا کہ وہ سچ بول دے۔ کہے نہیں جی میں تو ایک میلا اور چھوٹا آدمی ہوں۔ طرح طرح کی مصلحتوں کا غلام ہوں مگر وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ "میں اپنے آپ کو انہی لوگوں میں شمار کرتا ہوں۔ میرے پاس کچھ نہیں۔ ان دو ہاتھوں کے سوا جن سے میں کام کر کے زندگی بسر کرتا ہوں۔"

"اچھا؟" میاں جی مسکرائے۔ "مگر تو ان دو ہاتھوں سے کیا کام کرتا ہے؟ کچھ بناتا تو نہیں تو ان دو ہاتھوں سے صرف کاغذ کالے کرتا ہے اور ان کی چاکری کرتا ہے جو دوسروں کی چاکری کرتے ہیں۔ یاد رکھ جب تک دنیا میں پیسے کا راج ہے کسی کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے تو تیس برس سے نور پور نہیں آیا۔ لے

اب نماز کا وقت ہو گیا۔ مجھے جانے دے۔ میں بوڑھا بے وقوف تیری جوان عقل کے آڑے نہیں آ سکتا۔"

یہ کہہ کر میاں جی نے جوتی پہنی اور سیڑھیاں اتر گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے حاجی عارف اور بھائی اکرم کچھ دیر جوتیاں تلاش کرتے رہے۔ پھر آنکھ بچا کر بیوی کے کمرے میں گھس گئے۔

چھوٹی بے بے نے جمال کو آزردہ پایا تو بولی "اس کو عادت ہے بڑبڑ کرنے کی۔ تو کچھ خیال نہ کر۔" پھر چھوٹی بے بے وضو کرنے لگی۔

## پھر چاند اتر آیا

تھوڑی دیر میں بلو اور سدو پاخانے سے فارغ ہو کر نیچے اتر آئیں۔ آنکھ بچا کر انہوں نے لوٹا سیڑھیوں میں چھوڑا جیسے پاخانے جانا کوئی بے شرمی کی بات ہو۔

اس کام کے لیے انہیں اندھیرے کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔

سدو بولی "بچھائی کر دوں بھا جی؟"

جمال نے کہا "ابھی تو شام ہی ہوئی ہے۔ تم کیا ابھی سو جاؤ گی؟"

"نہیں بھا جی۔ ابھی تو بچھائیاں کرنی ہیں۔ برتن دھونے ہیں۔ نماز پڑھنی ہے۔ چھوٹی بے بے کے سر میں تیل ڈالنا ہے۔ ابھی تو کام پڑے ہیں۔"

"یہ کام تو گھنٹے بھر کے ہیں۔ تو تم نو بجے سو جاتی ہو؟"

"جب بھی کام ختم ہو جائے۔"

بلو بولی "بھا جی آپ کتنے بجے سوتے ہیں شہر میں؟"

"شہر میں جلد نیند نہیں آتی۔" جمال بولا "بس کوئی بارہ بجے لیٹ جاتا ہوں۔ دو بجے تک تو آنکھ لگ جاتی ہے۔ کبھی تین چار بھی بج جاتے ہیں اور کبھی سورج بھی نکل آتا ہے۔" اس پر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

سدو بولی۔ "آپ بارہ بجے لیٹ جاتے ہیں تو دو بجے چار بجے تک سوتے کیوں نہیں؟"

"نیند جو نہیں آتی۔"

"ارے یہ بات نہیں سدو باجی......" بلو نے بات کاٹ کر کہا "شہر میں لوگ ہوٹلوں میں جاتے ہیں۔ سینما دیکھتے ہیں اور ناول پڑھتے ہیں اس لیے نہیں سوتے۔ ہماری طرح گدھے تھوڑی ہیں کہ اُدھر کھایا اُدھر سو گئے۔ سونا کتنی فضول بات ہے۔ خواہ مخواہ وقت ضائع کرنا۔"

"بکواس بند کر۔" چھوٹی بے بے نے سلام پھیر کر کہا۔ "جاؤ کام دھندا کرو۔" دونوں منہ بنا کر ایک طرف چل دیں۔

## چھت کی سیر

جمال نے سوچا کیوں نہ ذرا چھت کی سیر کر لوں۔ دیکھوں اب نور پور میں رات کس طرح اترتی ہے۔

اس کے بچپن میں سیڑھیوں کے ساتھ ہی ایک برساتی ہوتی تھی جس میں دوستوں کے ساتھ تاش کھیل کر جمال نے کئی سالانہ امتحان گزارے تھے۔ اس برساتی میں اس نے پہلی بار نچلے محلے کے جولاہوں کی بیٹی کو کپڑے بدلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس برساتی میں اس کے دوست یکے بٹ نے آ کر ہانپتے ہوئے کہا تھا' لو بھائی میں تو جوان ہو گیا اور اس کی جوانی کا ثبوت دیکھ کر یاروں کی منڈلی احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئی تھی۔ یکے بٹ کا گلنار چہرہ جمال کی نظروں میں گھوم گیا۔

اس برساتی کا اب کوئی نام ونشان باقی نہ تھا۔ میاں جی نے اسے گرا دیا تھا۔ اب اس کی کھلی جگہ پر گرمیوں میں بھائی اکرم اور اس کی بیوی سوتے تھے۔ سیڑھیوں کے اوپر والی ممٹی البتہ ابھی تک برقرار تھی۔ اس ممٹی پر جمال اور حاجی عارف پتنگ اڑایا کرتے تھے۔ اچانک لالہ ساون مل' جاجے ماچھی اور ملک محمد نواز کی رنگ برنگی پگڑیاں ڈور کے پنے اور پتنگیں فضا میں لہرانے لگیں۔

جمال آہستہ آہستہ خستہ حال دیواروں کی طرف بڑھا۔ ان کے بڑے بڑے جھر نے منہ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ سامنے شاہ ولی کی خانقاہ کا بوڑھا برگد ایک مہیب دیو کی طرح کھڑا تھا۔ تنے کے پاس قبر پر ایک ننھا سا دیا ٹمٹما رہا تھا۔ برگد پر بسیرا کرنے والے سیکڑوں کوؤں اور چڑیوں نے آسمان سر پہ اٹھا رکھا تھا۔

جمال چھت کے اس حصے کی طرف بڑھا جس پر اس کے ابا اور اماں سوتے تھے۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ لگتا تھا اس کا اداس بچپن اسے پکڑ کر بٹھا لے گا۔ اسے مرغا بنائے گا۔ اس سے پہاڑے یاد کرائے گا۔ اس سے پنجاب کی تحصیلوں اور نہروں کے نام پوچھے گا۔ اس سے ماضی استمراری کی گردان سنے گا۔ پھر اس کے خشمگیں والد اچانک پیچھے ہٹ گئے۔ انہیں خیال ہوا کہ تاجی دیوار کی اوٹ میں کھڑی ہے۔

تاجی جمال کے والد کی چھوٹی چچی تھی اور اس کا سب احترام کرتے تھے۔ اس نے خواجہ قطب دین سے جوانی کی مستی میں نکاح کر لیا تھا۔ دراصل تاجی خواجہ قطب دین کی جوانی کی مستی نہیں تھی۔ وہ اپنی جوانی کی مستی تھی۔ وہ دلوں کی بات سمجھتی تھی۔ اس نے جمال کے لیے اندھیری راتوں میں کئی کھڑکیاں کھلوائی تھیں۔

## کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

تاجی اب منوں مٹی کے نیچے پڑی تھی۔ جمال نے منڈیر پر ہاتھ رکھا تو وہ ہلنے لگی۔ پھر اس نے پڑوس کے گھر پر نظر ڈالی۔ سب ویران تھے' سب خالی تھے۔ ماسی اقبال کا بھائی فقیر ہو کر قبرستان میں رہنے لگا تھا۔ وہ اس کے غم میں نیم پاگل ہو کر کوٹھڑی میں بند ہو گئی تھی مگر بملا کو ابھی تک اس نے سینے سے لگا کر رکھا تھا۔ وہ اسے اس کے بھائی سندر داس کے سوا کسی کے سپرد کرنے پر تیار نہ تھی جسے امرتسر سے واپس آ کر اپنی چھینی ہوئی بہن کو واپس لے جانا تھا۔ مگر اس کے قتلِ عام کے اس زمانے میں نور پور آنا مشکل تھا۔ ''پتہ نہیں بملا اب کہاں ہو گی؟'' جمال نے سوچا۔

گاڈے صراف کے بیٹوں نے نور پور چھوڑ دیا تھا۔ ایک سیالکوٹ میں چاندی کے زیورات بناتا تھا۔ ایک دبئی میں بس کنڈیکٹر تھا' تیسرا لاپتہ تھا۔ شمبو گارڈ کا گھر بھی ویران تھا۔ اس کی گریجویٹی کی رقم مدت ہوئے ختم ہو چکی تھی۔ اس کا بیٹا شیخوپورہ میونسپلٹی میں کلرک تھا اور وہ خود ان دنوں گارڈ کی پرانی وردی پہن کر لاہور میں بھیک مانگتا تھا۔ وہ اپنی بغل میں اب بھی دونوں جھنڈیاں رکھتا تھا مگر دھجیوں کے رنگ بوسیدہ ہو کر ایک جیسے ہو چکے تھے۔ وہ نور پور میں بھیک نہیں مانگ سکتا تھا کیونکہ پھر اس کی ناک کٹ جاتی۔

پرلے گھر میں جاموں چاچا ابھی تک آباد تھا۔ لالٹین کی میلی روشنی میں اس کا گھر بھوت بنگلہ نظر آتا تھا۔ آج گھر آتے ہوئے جمال کی پہلی ملاقات اسی سے ہوئی تھی۔ وہ ایک بے موسے کدو کی طرح پھولا ہوا' پھٹا ہوا پلپلا شخص تھا مگر اس کی لٹکتی ہوئی بوڑھی چھاتیاں دودھ کی بوتلوں کی طرح شفقت سے بھری پڑی تھیں۔

چاچا جاموں کے بیٹے نے لاہور میں کنجری بیاہ لی تھی اور جاموں چاچا کی ساری پتنگیں کٹ کر آسمان میں گم ہو چکی تھیں۔ صدیقے نے اب نور پور آنا بھی چھوڑ دیا تھا مگر جاموں چاچا ہر روز دودھ کا گلاس لیے بڑے کنویں کے پاس بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا اور ہر آنے جانے والے سے پوچھتا ''تو صدیقے سے ملا تھا جوان؟ کیا کہتا تھا میرا صدیقہ؟''

جمال نے اس کو فوراً نہیں پہچانا تھا۔ اس نے پوچھا تھا ''کون سا صدیقہ جی؟''

''کون سا صدیقہ جی؟'' جاموں چاچا نے حیرت سے پوچھا ''تم میرے صدیقے کو نہیں جانتے۔ تم کون ہو' کہاں سے آئے ہو۔ کس کے گھر جاؤ گے؟''

پھر اس نے جمال کو پہچان لیا اور کہا ''تو تم میرے یٰسین کے بیٹے ہو۔'' پھر جاموں چاچا دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ ''ہائے یٰسین تمہیں کس کی نظر کھا گئی۔ ہائے ہم بوڑھے مردود ابھی تک بیٹھے ہیں اور تم نے آنکھیں موندلیں۔ ہائے میں کیوں نہ مر گیا تمہارے بدلے۔ اللہ پاک تو مجھ بدنصیب پر کب رحم کرے گا۔''

جمال نے جاموں چاچا کو تسلی دی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے قمیص کے پلو سے آنسو پونچھے اور کہا ''بیٹا مجھے ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا' اندھا ہو گیا ہوں۔ اس لیے تمہیں فوراً نہیں پہچانا۔ یہ لے یہ دودھ تو پی لے۔ پر سچ بتا صدیقہ کیا کہتا تھا' وہ نور پور کب آئے گا۔''

جمال دکھ کے بوجھ کے نیچے دب گیا۔ چاروں طرف ویرانہ تھا۔ بوڑھے مر چکے تھے۔ بچے کسی کو پہچانتے نہ تھے۔ جمال کو بہت افسوس ہوا کہ وہ نور پور آیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ میں صبح ہوتے ہی واپس چلا جاؤں گا۔

میاں صاحب نماز پڑھ کر واپس آ چکے تھے۔ برتن' بھانڈے دھل کر الماری میں لگ چکے تھے۔ چھوٹی بے بے دودھ کو جاگ لگا رہی تھی۔ بلو کاڑھنی چاٹ رہی تھی۔ جب جمال من من کے قدم اٹھاتا ہوا نیچے اترا۔

## شیشوں والی بیٹھک

میاں جی نے کہا ''جمال کو میری کوٹھڑی میں سلانا۔ باتیں کریں گے باپ بیٹا۔''

"نہ۔" چھوٹی بے بے نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔ "جمال تیرے پاس نہیں سوئے گا۔ تو ابھی بیل کی طرح ہانپنے لگے گا۔ دمے سے اور اس کی نیند خراب کرے گا۔ جمال شیشوں والی بیٹھک میں سوئے گا اکیلا۔"

"اکیلا۔" میاں جی نے حیرت سے کہا "وہ کیوں سوئے اکیلا۔ وہ کوئی غیر ہے۔ اسے حاجی عارف کے ساتھ سلادو۔"

"تجھے نہیں پتہ کچھ۔" چھوٹی بے بے نے ڈانٹ کر کہا۔

"ہاں میاں جی آپ کو نہیں پتہ۔" بلو بولی "شہر کے لوگ اکیلے سوتے ہیں اپنے اپنے کمروں میں۔"

"کتی کی طرح بھونکتی ہے بڑوں کے سامنے۔" چھوٹی بے بے نے غصے میں کہا "تیرے منہ پر تو ڈھکنا ہی نہیں۔"

بلو ناک چڑھا کر بولی "میں نے بچھائی کردی ہے اسی کمرے میں بھائی جان کے لیے۔"

"ٹھیک ہے میں شیشوں والی بیٹھک ہی میں سوؤں گا۔" جمال نے کہا۔

"دودھ کا گلاس بھی رکھ دیا ہے تپائی پر۔" بلو چڑ کر بولی۔

"پانی بھی رکھ دے ایک گلاس۔" سدو نے کہا۔

"رکھ دیا ہے پانی بھی۔ مجھے پتہ ہے شہر کے لوگ رات کو پانی پیتے ہیں۔"

پھر بلو شرارت سے مسکرانے لگی۔ جیسے جاہلوں اور گنواروں میں پھنس گئی ہو۔

شیشوں والی بیٹھک حویلی کی دوسری منزل کا سب سے اعلیٰ کمرہ تھی۔ جو کوئی ڈیڑھ دو سو برس پہلے خواجہ صمدو نے اپنی دوسری شادی کے موقع پر خاص طور سے بنوائی تھی۔ اس کی دیواروں اور چھت پر چھوٹے چھوٹے ہزاروں شیشے نصب کرائے تھے جن میں دیواروں کی مینا کاری کے روشن رنگ جھلکتے تھے۔ اس زمانے میں اعلیٰ تعمیرات کا یہی معیار تھا۔

### خواجہ صمدو

جب گلاب سنگھ ڈوگرے نے لاہور کے قلعے میں بیٹھ کر سکھوں پر باڑھیں ماری تھیں تو خواجہ صمدو بارہ برس کا بچہ تھا۔ وہ نسلاً کشمیری پنڈت تھا۔ وہ اپنے نومسلم دادا کے ساتھ پشمینے کے تھان اور سن مرگ کا کچا نیلم لے کر لاہور آیا تھا جو ان اشیاء کی منڈی تھی۔

خواجہ صمدو کے دادا پنڈت کاشی ناتھ ایک فقیر کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے تھے۔

جب گلاب سنگھ، شیر سنگھ کی سپاہ پر گولی برسا رہا تھا تو خواجہ صمدو اپنے دادا کے ساتھ بازار حکیماں کے ایک چوبارے میں چھپا بیٹھا تھا۔ اچانک ڈوگروں کے ایک جتھے نے پنڈت کاشی ناتھ کو نیزے میں پرو لیا مگر خواجہ صمدو کو بچہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اصل میں پشمینے کے تھانوں اور نیلم کے پتھروں میں انہیں زیادہ دلچسپی تھی۔ شیر سنگھ کے افسروں نے قلعے کے آس پاس کے گھروں سے کنواریاں اکٹھی کیں اور اس میں ہندو مسلمان کی کوئی تمیز نہ رکھی۔ پھر ان معصوم لڑکیوں کو ڈھال بنا کر اپنی توپوں کے سامنے کھڑا کر دیا تاکہ وہ ڈوگروں کی گولیاں اپنے سینوں پر روکیں اور شیر سنگھ کے توپچی قلعے کے اندر گولے پھینکتے رہیں۔

خواجہ صمدو بارہ برس کا بے یارو مددگار بچہ کشمیر کا راستہ بھی نہ جانتا تھا۔ راستے کا خرچ، گھوڑا اور کپڑے بھی اس کے پاس نہیں تھے۔

رات کو ایک ملاح نے اسے رحم کھا کر راوی کے پار اتار دیا۔ پھر وہ پیدل پہاڑوں کی طرف چل پڑا۔ تین روز میں وہ نور پور پہنچا۔ بھوکا، پیاسا اور پنجابی زبان سے نابلد۔

نور پور ایک چھوٹا سا خوشحال قصبہ تھا۔ اس کے مکان پکے تھے اور مکین اور مالک ہندو ساہوکار اور مہاجن۔ مسلمان صرف اہل حرفہ تھے مگر نہایت باکمال لوہار، توپوں کی مرمت میں مشاق، سنار زیورات گھڑنے میں استاد، سنیارے خون آلود جواہرات دھونے میں بے مثل، جولاہے ریشم کاتنے اور کپڑا بننے میں حرف آخر، موچی لاجواب کاٹھیاں بناتے تھے، معاہدے لکھنے کے لیے عمدہ سے عمدہ کاتب، تعمیرات کے لیے قابل فن انجینئر اور باغات کے لیے اعلیٰ درجے کے باغبان، یہ چھوٹا سا قصبہ ہنرمندوں کا جزیرہ تھا۔

نور پور لاہور پر حملے کے لیے چھاؤنی کا حکم رکھتا تھا اور لاہور کو لوٹ کر شمال کو جانے والے فاتح بھی پہلا پڑاؤ یہیں کرتے تھے۔ حملہ آوروں، لٹیروں اور سپاہیوں کی ضروریات کے مدنظر بڑے بڑے تاجر، اعلیٰ درجے کی طوائفیں، شعلہ نفس گوئیے اور بذلہ سنج بھانڈوں کے طائفے بھی نور پور کے مستقل باشندے تھے۔ زرگروں کا نور پور سے گہرا تعلق تھا۔ مہاراجہ شیر سنگھ کا ہندو خزانچی بھی نور پور کا رہنے والا تھا جس سے قرض لے کر گلاب سنگھ نے انگریزوں سے کشمیر خریدا تھا۔

خواجہ صمدو نے نور پور میں پہلی رات سرائے میں کاٹی تھی۔ یہاں آ کر کشمیر کے اور لوگ بھی اسے ملے جو اسے ساہوکاروں کے پاس لے گئے۔ اس کے کُرتے میں نیلم کے کچھ نگینے سلے ہوئے تھے۔ نگینے دیکھ کر ساہوکاروں کو یہ برہمن بچہ پسند آ گیا۔ انہوں نے کہا "تم بچے ہو اور آج کل غدر پڑا ہے۔ ایسے میں تم چناب پار نہیں کر سکتے۔ اس لیے فی الحال تم یہیں رہو۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے نگینوں کے بدلے کچھ روپے اسے دے دیئے۔

کچھ دن خواجہ صمدو نے مسجد میں سو کر گزارے مگر حالات سنبھلتے ہی نہ تھے۔ وہ منڈی میں آنے جانے لگا اور اس نے اناج کا کاروبار شروع کر دیا۔ ہوتے ہوتے خواجہ صمدو کو نور پور اچھا لگنے لگا۔ یہاں امن بھی تھا اور کاروبار بھی۔ اس کے والدین پہلے ہی مر چکے تھے۔ دادا کو سکھوں نے قتل کر دیا تھا۔ وادی میں دادا کا ایک بھائی اور ایک ماموں باقی تھے اور ان کی کشش بھی تھی مگر کشمیر بہت دور تھا۔

خواجہ صمدو اگرچہ بچہ تھا مگر زبان کا پکا اور اصول پرست۔ منڈی میں اس کی ساکھ قائم ہو گئی اور وہ

بڑے بڑے سودے کرنے لگا۔ اس کی ملاقاتیں وسیع ہو گئیں۔ وہ جوان ہو گیا۔ اس نے ایک غریب اور شریف گھرانے میں شادی کر لی اور یہیں کا ہو رہا۔

خواجہ صمدو کے تین بیٹے ہوئے۔ خواجہ نظام دین جو جمال کے دادا تھے اور عین جوانی میں فوت ہوئے۔ دوسرے خواجہ قطب دین جو ابھی تک زندہ تھے اور جن کا نام لینے پر چھوٹی بے بے غضب میں آ جاتی تھیں اور تیسرے خواجہ محمد دین' جو آج شام جمال کو زمین کی مالکی کا فلسفہ سمجھا رہا تھا۔

خواجہ نظام دین اپنے ایک سالہ بچے خواجہ یٰسین کو یتیم چھوڑ کر پلیگ کا شکار ہوا تو اس کی پرورش خواجہ قطب دین' خواجہ محمد دین اور ان کی بیویوں نے کی اور اپنے بچوں سے بہتر کی۔ خواجہ صمدو نے اپنے پہلوٹھی کے بیٹے کی موت پر چھت سے چھلانگ لگا دی تھی۔ ان کی جان بچ گئی مگر سر کی چوٹ کی وجہ سے وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھے تھے۔ خواجہ صمدو کافی جائیداد بنا چکے تھے۔ دور دور کی منڈیوں میں ان کی ساکھ تھی۔ اب بے خبر ہوئے تو ان کے بڑے بیٹے خواجہ قطب دین کے ہاتھ مفت کی دولت لگی اور وہ جائیداد بیچ بیچ کر کھانے لگا۔ شراب' جوا اور رنڈی بازی اس کی زندگی کا مقصد بن گیا اور اس طرح خواجہ صمدو کا گھرانہ برباد ہونے لگا۔

## خواجہ صمدو کا پلنگ

خواجہ صمدو نے یہ حویلی اپنی جوانی میں تعمیر کروائی تھی۔ اب ان کے کمرے میں کوئی سوتا نہ تھا۔ اس کی دیواروں کے رنگدار شیشے اکھڑ رہے تھے۔ چھت کے نقش و نگار پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ خواجہ صمدو کا پلنگ ایک طرف پڑا تھا اور کچھ پرانی دیگیں جن میں شام کو کاروبار سے واپس آ کر وہ اپنے چاندی کے روپے رکھتے تھے۔

جمال پلنگ پر بیٹھ گیا۔ بجلی کی مدھم روشنی میں چاروں طرف گرے ہی گرے نظر آتا تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ابھی نو ہی بجے تھے۔ وہ حیران ہوا کہ چھوٹے شہروں میں لوگ اتنی جلدی سو جاتے ہیں۔

پلنگ کی ڈھیلی نواڑ جمال کو بہت آرام دہ لگی۔ اس کے جسم نے حرکت کرنی چھوڑ دی مگر نیند اس سے کوسوں دور تھی۔

تھوڑی دیر میں اسے تھکاوٹ محسوس ہونے لگی۔ بے خیالی میں اس نے کروٹ بدل لی۔ آنکھیں بند تھیں مگر سونے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

اچانک اس نے آواز سنی "او غائب کے بچے پلنگ کیوں ہلا رہا ہے؟" گھبرا کر اس نے آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے کے دھندلے شیشے یکدم صاف ہو کر چمکنے لگے اور پھر پھیل کر آپس میں مل گئے۔ کمرہ جگمگ جگمگ کرنے لگا۔ چاندی کے سفید بالوں والا ایک سرخرو بوڑھا جمال کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے پھر کہا "غائب کے بچے تیرا نور پور سے کیا تعلق؟"

اس گورے چٹے کشمیری برہمن کو جمال نے پچاس برس قبل جب وہ چار پانچ سال کا بچہ تھا' اس پلنگ پر دیکھا تھا۔ جمال نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ اس کا پردادا تھا خواجہ عبدالصمد۔ جمال سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اس نے سر جھکا لیا اور سوچنے لگا' واقعی میں غائب کا بچہ ہوں۔ میری کوئی بنیاد نہیں۔ اپنے پیٹ کے سوا میرا کسی سے کوئی وعدہ نہیں۔ اسے اپنے بدن میں سے گلی کے کتے کی سی بو آنے لگی۔ برہمن کتے کو نجس جانتا ہے' وہ پلنگ سے اتر کر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔

## تاجی

اچانک تاجی تانبے کی دیگ سے نکلی۔ اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ جمال کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

تاجی کے ہاتھوں میں ایک چمٹا تھا۔ اسے دیکھ کر برہمن نے اپنی پگڑی پر ہاتھ رکھ لیے۔ پھر وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ وہ تاجی سے ڈرتا تھا۔ تاجی جس سے گھر کے سب لوگ نفرت کرتے تھے۔ تاجی جو سب کو ستا کر خوش ہوتی تھی۔

تاجی کچھ دیر کھڑی دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت کلکاریاں مار رہی تھی۔ اس نے منہ پر پلو رکھا اور ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی "بابا جی کے تہبند میں چوہا۔"

برہمن نے تڑپ کر آنکھیں کھول دیں۔ "کہاں ہے چوہا؟ کدھر ہے چوہا؟" پھر وہ گھبرا کر تہبند جھاڑنے لگا۔

تاجی نے چمٹے سے چوہا پکڑ لیا۔ درد سے برہمن چیخنے لگا۔ "خنزیر کی بچی' کتے کی اولاد' کنجری' آنے دے قطب دین کو آج میں تجھے طلاق دلوا کر رہوں گا۔"

تاجی نے چوہے کو اور دبایا تو برہمن پگڑی اور جوتے چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ تاجی قہقہے لگاتی ہوئی برہمن کے پیچھے نکل گئی۔

## رنگ کی دھاریں

شیشے سمٹ کر پھر ٹکڑوں میں ڈھل گئے۔ گول گول جھرنوں میں سے رنگ کی دھاریں بہنے لگیں۔ جگنو چمکنے لگے۔ ہوا مہکنے لگی۔ چھت نے کھلے نیلے آسمان کا روپ دھار لیا۔ پھر ایک غبارے نے آہستہ آہستہ نیچے اترنا شروع کر دیا۔ اس نے گڈی کی شکل اختیار کر لی۔ گڈی کو مرے ہوئے کئی سال ہو چکے تھے مگر اس کے پیروں میں چاندی کی وہ جھانجر ابھی تک موجود تھی جس کی جھنکار جمال کی جوانی میں آگ بھر دیا کرتی تھی۔

گھنگرو بجنے لگے۔ ستاریں مینڈھیں گانے لگیں۔ روشنی کی پھوار برسنے لگی۔

گڈی کے ہونٹوں کے کونے کھلے ہوئے تھے۔ اس کی ہلکی گلابی موٹی ناک پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ اس کی آنکھوں میں ساون کے بادلوں کی گھنی مستی تھی۔ اس نے جمال کی ٹھوڑی کو اپنی لمبی مخروطی انگلیوں سے اوپر اٹھا کر کہا "مجھے تم سے کب شکایت ہے۔ قصور میرا اپنا تھا۔ میری گردن پر تم نے جب اپنے گرم گرم

ہونٹ رکھے تھے تو میں ہوائی کی طرح آسمانوں کی طرف اڑ گئی تھی۔ جب قرآن نے تن میں کرنی تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ انہیں ناقص مال ملا تھا۔ پہلی رات ہی انہوں نے کہہ دیا تھا' میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ رات بھر میں روتی اور ان کے پاؤں پڑتی رہی۔ صبح ہوتے ہوتے وہ مان گئے۔ بڑے اچھے ہیں وہ۔ تم کیوں جی تھوڑا کرتے ہو جی! میں تو اپنے گھر میں خوشی سے آباد ہوں۔''

گوماں اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس نے پہلے دوپٹہ اتارا' پھر قمیص اور پھر بنیان' شلوار میں ازار بند ڈالتے ہوئے وہ بولی ''تمہیں مجھے چوری چوری دیکھنے کا شوق تھا نا' لو چوری چوری دیکھ لو مجھے۔ میں بھی تمہیں چوری چوری دیکھا کرتی تھی۔ اس طرح کہ تمہیں تو پتہ چل جائے مگر اور کسی کو خبر نہ ہو۔''

بانو منڈیر پر سے منہ گول کر کے گنگنائی ''میں نے دروازے کے قبضے کو تیل لگا دیا ہے مگر تم بلی کی چال چل کے آنا۔ زمانہ بڑا خراب ہے۔''

''زمانہ؟ زمانہ کیا ہوتا ہے؟'' ڈمارک کی روتھ بولی۔ ''زمانہ تو کسی کو کچھ بھی نہیں کہتا مگر اے منافق راہب جب خود تجھے اپنے جسم پہ قابو نہیں تو پھر پارسائی کیوں دکھاتا ہے۔ دیکھتا نہیں یہ جنگل کس قدر خیال انگیز ہے اور میرا بدن کتنا گرم۔''

ارما نے پیسے جیب میں ڈالے منہ پر چادر لپیٹی اور سیڑھیاں اتر گئی۔ اس نے کہا' میں عام طور پر مسلوں کو نہیں بٹھاتی مگر مارا ماری میں کاروبار کا مندا ہے۔ تم کہو گے تو کرفیو کے دوران میں پھر آ جاؤں گی۔

کرفیو کا ذکر سن کر سیوادارنی کا رنگ اُڑ گیا۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی ''پھر تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ مجھے جا تو مار دیتے۔ میں نے تو تم پر ترس کھایا تھا۔ میں تو صرف تمہیں بھوجن کھلانے آئی تھی۔ تم نے مجھے اسی رات برباد کر دیا۔''

ہلکی ہلکی سسکیوں نے ساری فضا اداس کر دی۔ اس کے بال نچے نچے سے تھے۔ کپڑے گرد آلود تھے۔ اس کی چادر زمین پر پڑی تھی۔ آنسوؤں کے قطرے اس کے رخساروں پر جمے ہوئے تھے۔

''تم نے مجھ اندھی کا کچھ نہ چھوڑا۔ میرے معصوم باپ کی پگڑی اچھال دی تم نے کس لیے؟ کیوں؟'' امینہ بولی۔

سعیدہ نے کہا ''تم نے مجھے بھی اندھی سمجھا ہوگا۔ تمہارا خیال تھا کہ تم میری تعریف میں دو چار خبریں چھپوا کر میرے بدن کے گلاب نوچ لو گے۔ ٹھیک ہے میں نے تمہیں خود اکسایا تھا مگر سیاست میں انسان کیا نہیں کرتا۔''

میجر دربار خان کی جیپ کوٹھی کے گیٹ سے نکلی تو گھٹا جھوم کر اٹھی۔ اولے پڑنے لگے۔ نسیم نے جمال پر لحاف ڈال دیا۔ پھر اس کے اندر گھس کر جمال سے لپٹ گئی۔ اس نے کہا ''بے شک ایک ہاتھ سے میری کلائی پکڑ لو مگر دوسرے ایک ہاتھ سے تم میرا کچھ بگاڑ نہ سکو گے۔''

پھر اس نے ہونٹوں کی لَو جلائی۔ دانتوں نے کوئی پٹاخے ... آنکھوں نے تیر کے ابھرے ہوئے بدن

''چلو گیند گیند کھیلتے ہیں۔ ایک ہاتھ سے تو گیند ہی پکڑا جا سکتا ہے۔ تمہاری انگلیوں میں مہتابیاں جلتی ہیں۔ آٹھ دن میں تم نے میرا کچا سینہ پکا کر رکھ دیا۔ لو دیکھو اب گیندوں کی بہار!'' اس نے سینے کے بند کھولے تو پیازی لو والے دو چراغ روشن ہو گئے۔ کمرہ جگمگ جگمگ کرنے لگا۔ ''آؤ گیند گیند کھیلیں۔'' اس نے جمال کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

بہت سے تانپورے یکدم گونجنے لگے۔ مدھم نے پنچم سے آس ملائی۔ تیور نے کومل کو چھیڑا فرش سے عرش تک گیند ہی گیند اچھلنے لگے۔ ان گیندوں کی بارش میں گرتی گھومتی جھومتی مٹکتی تھرکتی لالی سامنے آ کھڑی ہوئی۔ سائے دیوار سے چپک گئے۔ گیند زمین پر بیٹھ گئے۔ پھر پگھل کر موم کی طرح پھیل گئے۔

## لالی کا چراغ جلا

لالی کے سامنے کوئی چراغ جلتا نہ تھا۔ وہ تیر کی طرح سیدھی کھڑی تھی۔ اس کے گالوں میں چاند کا چورا کٹا ہوا تھا۔ اس کا منہ ایک تازہ زخم کی طرح کھلا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں میں شہد کی شیرینی تھی اور گریبان کا ایک بٹن کھلا ہوا تھا۔ اس کے سینے کا موتیا ہمک ہمک کر باہر آ رہا تھا۔ وہ ایک ٹہلتا ہوا الاؤ تھی۔ وہ حسن کا طنطنہ تھی۔ وہ جلدی میں نہیں تھی' وہ انتظار کرنے کی عادی تھی۔ اسے اور کوئی کام نہیں تھا۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گئی اور بانہیں جمال کے گلے میں ڈال کر بولی ''تم ہی کہو' میں نے کبھی نہ کی؟''

لالی نے واقعی کبھی نہ نہ کی تھی۔ اسے راستے نکالنے آتے تھے۔

لالی جھولتے ہوئے بولی ''کہو کبھی میں نے تمہارے آگے نہ کی؟ میرا دل تمہیں دیکھ کر ہاتھ سے نکل جاتا تھا مگر اس قدر کڑوی اور بدبودار شراب مجھے پلاتے ہوئے تمہیں یہ کبھی خیال نہ آیا کہ میرا پیٹ خالی ہے؟ میں گرمیوں میں کھیس کی بکل مارتی تھی۔ اس لیے کہ میرے پاس دوپٹہ نہ تھا۔ میرے پاس ایک ہی کرتا تھا جسے تم بار بار پھاڑ دیا کرتے تھے مگر پھر بھی میں نے کبھی تمہارا دل نہیں توڑا۔ کبھی میں نے تم سے کچھ مانگا؟''

''تم نے یہ نہ سوچا کہ میں تمہارے پاس اپنے جسم کی آگ بجھانے کے لیے کبھی نہیں آئی۔ بھوکا بدن تو ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اس میں آگ کہاں مگر تم خود کبھی بھوکے نہیں رہے نا۔ تمہیں کیا۔ تم سمجھتے تھے' میں اپنے جسم کی آگ بجھانے کے لیے آتی ہوں۔ تم نے مجھے اپنی میلی چادر سے زیادہ کچھ نہ سمجھا۔ تمہارا خیال تھا میں کوئی بات نہیں سمجھتی۔ یہی خیال تھا نا تمہارا؟''

پسینے کے قطرے جمال کے ماتھے پر سوئیوں کی طرح چبھنے لگے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔

سائے دیواروں میں گھل گئے۔ رنگ آنکھیں جھپکنے لگیں۔ لالی جمال کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی ''کہو تمہیں آج کل کون سا آسن پسند ہے۔''

کام سوترا کی جلد کھل گئی۔ اس کے اوراق کی رنگ برنگی پتنگیں فضا میں اڑنے لگیں۔ بوکاٹا بوکاٹا کا شور مچ گیا۔

سائے دیواروں میں سے نکل کر چیخنے لگے۔ ''جمال بولو آج کل تمہیں کون سا آسن پسند ہے۔ بولو جمال۔'' پھر سایوں نے اپنے آپ آسن بنانے شروع کر دیئے۔ شیشے دیواروں میں سے نکل کر ناچنے لگے۔

جمال ہانپنے لگا۔ اس کی رگ رگ کو دُھنا جا رہا تھا۔ اس کے جسم کے گالے اڑنے لگے۔ اچانک اذان لاؤڈ سپیکر پر گونجی، پتنگیں دوڑ کر مجھولوں میں گھس گئیں۔ سائے دیواروں میں چھپ گئے۔ رنگ چھت سے چمٹ گئے۔ گیندوں نے چادریں اوڑھ لیں۔

زونی نے کانگڑی ایک طرف رکھ کر کسی قدر خفگی اور کسی قدر لجاجت سے کہا۔

''سونے دو اس کو اباجی، آپ کو اس سے کیا کام ہے؟''

ڈونگا جھیل کی شفاف سطح پر ایک بطخ کی طرح پرسکون تیر رہا تھا۔ الف لیلیٰ کی شہزادی اس کے پانی میں برتن دھو رہی تھی۔ دن ابھی چڑھا نہ تھا مگر رات گزر چکی تھی۔

## بستی کی سیر

باسی روٹی مکھن کے ساتھ کھا کر جمال نے لسی کا گلاس پیا تو اسے بڑی فرحت ہوئی۔ اس کا جسم ابھی تک تھکا ہوا تھا مگر ایک طرح کا تجسس اس کے دل کو کھرچ رہا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ معشوق لڑکیاں جو اس کی زندگی میں آئیں، اب کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔

''آپ تو کہتے تھے میں دو بجے سوتا ہوں مگر آپ نے تو کروٹ بھی نہ لی رات بھر۔'' بلو نے کہا۔

''تمہیں کیسے پتہ ہے بلو۔'' جمال نے ہنس کر کہا۔

''پتہ کیوں نہیں۔ میں آئی تھی کوئی گیارہ بجے جب ٹی وی کا پروگرام ختم ہوا۔ میں نے سوچا آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہوگی مگر آپ تو یوں پڑے تھے جیسے برسوں کے جاگے ہوئے ہوں۔ بڑے مزے کی نیند سوئے آپ بھائی جان۔''

''ہاں واقعی۔ بڑے مزے کی نیند سویا۔''

بلو جمال سے اور باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے صبح سویرے کہیں سے اخبار منگوا لیا تھا مگر جمال کو کسی خبر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ کوئی مجھے ان پریوں کے بارے میں کچھ بتائے جنہوں نے مجھے جوانی کے تخت پر بٹھایا اور مورچھل کیا تھا۔ خواب دکھائے تھے اور وہ جنہوں نے مجھے دھتکارا اور دھتکارنے کے ارادے سے بار بار میرے پاس آتیں۔

اسے اپنے کیے پر ندامت ہو رہی تھی مگر اس ندامت کے ساتھ ساتھ دل میں لذت کی ایک لہر بھی ہلکورے لے رہی تھی۔

جمال نے اچٹتی ہوئی نظر اخبار پر ڈالی۔ سرخیوں کو بار بار پڑھا مگر کوئی خبر آج کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔

اکتا کر اس نے کہا ''چھوٹی بے بے میں ذرا شہر کا چکر لگا لوں۔''

پیاز کترتی ہوئی چھوٹی بے بے نے جواب دیا۔ ''مگر اب شہر میں رکھا ہی کیا ہے؟ انبالے کے مہاجروں نے اینٹ سے اینٹ بجادی ہے۔ گلی محلوں کو دیکھے گا تو پہچان نہ سکے گا۔''

## شہر میں اجنبی

''مجھے بھی تو کوئی نہیں پہچانتا۔'' جمال نے ہنس کر کہا اور جوتی پہن کر سیڑھیاں اتر گیا۔

رات جب وہ آیا تو اس نے کسی بات پر غور نہ کیا تھا مگر اب اسے گلیاں بہت تنگ لگیں۔ نالیاں ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں اور ان سے نکل کر گندا پانی پھیل رہا تھا۔ سڑاند سے اس کے نتھنے جلنے لگے۔

بیشتر گھروں پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ کچھ ڈھے چکے تھے جن کی وجہ سے گلی کشادہ تھی۔ ملبے کے ڈھیر ہموار کر کے کچھ عورتوں نے ان پر چولہے جلا رکھے تھے۔ وہ ویران مسجد بھی ڈھے چکی تھی جس میں بیٹھ کر وہ مشتاق اور فدا محمد روز روز کے پروگرام طے کیا کرتے تھے مگر مسجد کا دروازہ سلامت تھا اور اس پر حسب سابق تالہ لگا ہوا تھا۔

جمال کے اعصاب میں اب پہلے جیسا تناؤ نہ تھا۔ پرانی رنجشیں اس کے لیے کوئی معنی نہ رکھتی تھیں۔ اس کے پرانے خوف بھی دور ہو چکے تھے مگر اسے عجیب لگا کہ دیواریں ڈھے جانے کے باوجود لوگ خدا کے گھر پر تالہ لگانا نہیں بھولتے۔ کشمیریوں کی مسجد ابھی تک آباد تھی مگر میاں عیدا۔

نور پور کے لوگوں کو اس قدر خبر تھی کہ میاں عیدا پاکستان کی تخلیق کے بعد نور پور سے لاہور چلا گیا تھا۔ نور پور سے اس کے بھاگنے کی وجہ تنگی روزگار کے علاوہ اس کی بیوہ بہن تھی جو محلے کی عورتوں نے جاموں چاچا کے نام سے بدنام کر دی تھی۔ جمال اس بات کو نہیں مانتا تھا۔ وہ زرد رو دکھیاری کسی قابل نہ تھی۔ پھر چاچا جاموں اتنا شریف اور وضع دار آدمی تھا مگر عورتوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ گلیوں سے نکلتے ہوئے جمال نے سوچا، میں بھی تو اتنا شریف اور وضعدار آدمی سمجھا جاتا ہوں مگر خود میں نے اپنی ذلیل حرکتوں میں کون سی کسر اٹھا رکھی۔

میاں عیدا نے لاہور کی ایک ویران مسجد کی امامت سنبھال لی مگر وہ مقرر بہت اچھا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کے ٹھٹ لگ گئے اور میاں عیدا کی شہرت پھیل گئی۔ انہوں نے قادیانیوں کے خلاف جلوس نکالا تو اخبارات میں ان کی خبریں چھپنے لگیں۔ کچھ نیک دل دکانداروں نے انہیں چندہ دے کر دارالعلوم کھلوا دیا تو میاں عیدا کے دن پھرنے لگے۔

دارالعلوم کے نام پر جو زمین الاٹ ہوئی، اس میں سے میاں عیدا کے لیے ایک چھوٹے سے مکان کی گنجائش نکل آئی۔ پھر سیاسی جماعتیں ادھر متوجہ ہوئیں اور میاں عیدا الحاج عید محمد خان بنگش کے روپ میں

سیاسی لیڈر بن گئے۔ ان کا پروگرام بڑا جاندار تھا یعنی اسلامی نظام۔ لوگ ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ بات مختصر کرنی چاہیے۔ اس لیے یہی سمجھ لو کہ میاں عیدا نے پاکستان کی وجہ سے اپنی قسمت سنواری جیسے اور کچھ لوگوں نے سنواری مگر ایمان کی بات ہے میاں عیدا نے نماز روزے میں کوتاہی کبھی نہیں کی کیونکہ انہوں نے عبادات کی برکات کا ذاتی طور پر مشاہدہ کر لیا تھا۔ وہ کہتے تھے جو کچھ مجھے ملا ہے وہ اللہ کی عنایت ہے ورنہ میں تو ایک گنہگار آدمی ہوں۔

میاں عیدا کو نور پور کے نوجوان بالکل نہیں جانتے تھے کیونکہ ان کی سیاسی اور اپنی مصروفیات انہیں نور پور آنے کا موقع نہیں دیتی تھیں۔ جمال میاں عیدا کے پرانے ٹوٹے ہوئے گھر کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

فدا محمد کے چوبارے کے سامنے اس کے قدم اچانک رک گئے۔

## زندہ درگور

جمال کو چپ چاپ اور بے وجہ گلی میں کھڑا دیکھ کر بچے رک گئے اور حیران ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ چوبارے کے اوپر سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔

جمال کو خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ بھاجی کی آواز ہے۔

بھاجی فدا محمد کے بڑے بھائی تھے۔ دونوں میں کبھی بنی نہ تھی مگر بھاجی جمال سے بڑی شفقت کا سلوک کرتے تھے اور کندھے سے پکڑ پکڑ کر اسے بتایا کرتے تھے کہ تمہارا پیارا فدا محمد اپنے بڑے بھائی سے کیسی کیسی زیادتیاں کرتا ہے۔

بھاجی جوانی میں ٹرک ڈرائیور تھے مگر اب بوڑھے اور بیمار ہو کر گھر بیٹھ گئے۔ فدا محمد نے اپنا آبائی گھر یعنی یہ چوبارہ بازار میں جس کی کوئی قیمت نہ تھی اور نہ اب وہ فدا محمد کے کسی کام آ سکتا تھا' پورے کا پورا بھائی کو عطا کر دیا تھا۔ وہ اس بات کا ذکر بڑے فخر سے یہ ثابت کرنے کے لیے کرتا تھا کہ میں نے اپنے بھائی سے ہمیشہ مہربانی کا سلوک کیا مگر جمال سمجھتا تھا کہ یہ چوبارہ دے کر فدا محمد نور پور سے اپنا رشتہ ہمیشہ کے لیے منقطع کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے بچپن کی غربت اور بے چارگی کی علامات کو دنیا سے مٹا دینا چاہتا تھا اور اب ان لوگوں کو حقارت سے دیکھتا تھا جو اس جیسے تھے مگر زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے تھے۔

اپنے ذہین تعلیم یافتہ اور امیر گھروں میں بیاہے ہوئے اردو بولنے والے بچوں کو اس نے نور پور کبھی دکھایا ہی نہ تھا اور اب تو کئی برس سے اس کی بیوی بھی میکے نہ آئی تھی۔ بوڑھا اور بیمار بھاجی ایک دفعہ اور کھانسا تو جمال کھٹا کھٹ سیڑھیاں چڑھ گیا جیسے وہ لڑکپن میں چڑھا کرتا تھا۔

بیٹھک میں پرانا پلنگ اسی جگہ پڑا تھا جس جگہ آج سے تیس برس پہلے اس نے پہلی مرتبہ لالی سے ملاقات کی تھی۔ شیشم کی پرانی آرام کرسی بھی وہیں کونے میں رکھی تھی۔ تپائی پر دوا کی ایک بوتل پڑی ہوئی تھی۔ دیوار پر کم از کم پانچ برس پرانا کلینڈر لٹکا ہوا تھا۔ بیٹھک کی ہیئت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ صرف اس کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں سے چکیں اُتر گئی تھیں۔

بھاجی نے حیرت سے جمال کو دیکھا۔ انہیں پہچاننے میں کچھ دیر لگی' پھر وہ بستر سے اٹھ کر اس سے لپٹ گئے۔ اظہارِ شوق میں انہیں کھانسی کا ایک بڑا دورہ پڑا مگر اس کے باوجود ان کے چہرے کی راکھ میں ایک لمحے کے لیے سرخی آ گئی۔ سانس سینے میں سماتا نہ تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بولے "بوڑھا ہو گیا ہوں یار بیمار ہوں مگر یہ کھانسی جان ہی لے کر چھوڑے گی۔ تم کہو نور پور کب آئے۔ بچے کتنے ہیں' ان کے نام کیا ہیں؟ سب کچھ بتاؤ کتنے برس کے بعد نور پور آئے؟"

"تیس برس بعد بھاجی!"

"لگتا ہے ایک صدی بیت گئی۔ اب تو یہاں کوئی بھی نہیں آتا۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔"

"بھاجی ہم سب اکیلے رہ گئے ہیں۔"

"وہ بھی کبھی نہیں آتا تمہارا یار۔ بہت امیر ہو گیا ہے۔ بڑا آدمی بن گیا ہے۔ کیا تم بھی بڑے آدمی بن گئے ہو! بہت امیر ہو گئے ہو؟ تم کیوں نہیں آئے یہاں؟"

"نہیں بھاجی میں تو کچھ بھی نہیں بنا۔"

"اپنوں سے تو ملتے جلتے ہو گے۔ اس نے تو سب کو چھوڑ دیا۔ یہ مکان بھی چھوڑ دیا۔ کہتا ہے میں نے اپنے بھائی پر ایک اور مہربانی کی ہے جس سے بات کرتا ہے یہی کہتا ہے۔"

"بھائی بھائیوں کی مدد کرتے ہی ہیں بھاجی۔"

"ہاں وہ میری بہت مدد کرتا ہے۔ کبھی کبھار بیس پچاس روپے بھی دیتا ہے مگر جوتی میں رکھ کر۔ شکل نہیں دیکھتا میری۔"

"بھاجی اس کے پاس وقت نہیں۔ وہ کاروبار میں بہت الجھا ہوا ہے۔"

"تمہیں تو ملتا ہو گا اکثر؟"

"بیس برس کے بعد ملا تھا' جب وہ اسلام آباد میں کسی کام سے آیا تھا۔ بڑی محبت سے ملا' بڑے شوق سے ملا تھا۔"

"تو وہ تمہیں بیس برس کے بعد ملا؟ تم تو اس کے سب سے پیارے دوست تھے' تمہارے بغیر وہ رہ نہ سکتا تھا مگر اس نے بیس برس کاٹ لیے تمہارے بغیر۔"

"اس میں میرا بھی قصور ہے بھاجی' میں آوارہ پھرتا رہا اِدھر اُدھر۔ زندگی کو منہ میں ڈال ڈال کر چکھتا رہا۔ مجھے بھی فرصت نہ ملی اسے ڈھونڈنے کی۔"

"بکواس مت کرو۔ تم میں اسے ملنے کا حوصلہ نہ ہوا۔"

"نہیں بھاجی اس میں حوصلے کی کیا بات ہے۔"

"کسی امیر آدمی سے ملنا خاص طور پر جب وہ غریبی کے زمانے کا دوست ہو بڑے حوصلے کی بات ہے' جرأت کی بات ہے۔ کیا میں غلط کہتا ہوں؟"

جمال مسکرایا پھر بولا "اصولی طور پر آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر فدا محمد میں ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ تو میرا بچپن ہے۔"

"ٹھیک ہے جب تھا تب تھا اب وہ تمہارا بچپن نہیں۔ اب وہ لاہور کا ایک امیر اور عزت دار شہری ہے۔ کہو تمہاری کتنی کوٹھیاں ہیں گلبرگ میں؟ کتنے کارخانے ہیں؟"

"کوئی بھی نہیں جی' کہیں بھی کچھ نہیں۔ میں تو کرائے کے گھر میں رہتا ہوں۔"

"پھر تمہارا اس کا کیا رشتہ۔ تم نے کبھی دیکھا ہے کہ جس کی جائیداد ہو وہ کسی بھوکے ننگے کا دوست ہو؟"

"اس کے مقابلے میں تو میری کوئی حیثیت نہیں جی۔"

"پھر تمہارا اس کا کوئی رشتہ بھی نہیں اور اسی لیے وہ تم سے بیس برس تک نہیں ملا۔ رشتہ ہوتا تو وہ تمہارے پیچھے پیچھے جاتا۔ جس طرح وہ اپنی حیثیت کے لوگوں کے پیچھے جاتا ہے' مانتے ہو؟"

"مگر میں نے بھی تو اس کی پرواہ نہیں کی۔ اس میں میری بھی تو خطا ہے۔"

"تمہاری کوئی خطا نہیں۔ اس کی کوٹھی کا دروازہ پار کرنے کی تم میں ہمت نہ تھی۔ تمہیں پتہ تھا کہ تم گئے تو دربان تم پر جرح کرے گا۔ تمہیں یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ وہ تمہارا استقبال کس طرح کرے گا۔ تمہیں یہ ڈر بھی تھا کہ ملاقات کے تھوڑی دیر کے بعد وہ کہے گا میری اپوائنٹ منٹ ہے جمال۔ تمہیں اپنے آپ پر بھروسہ نہ تھا۔ کیونکہ تم اس کی حیثیت کے آدمی نہ تھے۔ تمہاری کوئی خطا نہ تھی۔ خطا اس کی ہے جو اپنے آپ سے' اپنے پیاروں سے چھپتا پھرتا ہے۔ خطا اس کی ہے جو تسلیم کرنا نہیں چاہتا کہ میں نور پور کے مستری اللہ لوک کا بیٹا ہوں مگر میں نے ترقی کر لی ہے۔ خطا اس کی ہے جو اپنی ولدیت تبدیل کرنا چاہتا ہے کیونکہ اس کے پاس اتنے روپے ہو گئے ہیں جو اس کے باپ نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ تمہیں اسلام آباد میں ملا کیونکہ اسلام آباد میں بڑے لوگ رہتے ہیں۔ اسلام آباد سے نکلو گے تو وہ تمہاری شکل بھی نہیں دیکھے گا۔ یاد رکھنا!"

بھاجی کو کھانسی کا ایک لمبا دورہ پڑ گیا۔ ان کے چہرے پر پسینہ آ گیا۔ وہ نڈھال ہو گئے۔ جمال نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا "بھاجی مجھے چاچا جی کی موت کا بہت افسوس ہوا۔ بڑے مہربان بزرگ تھے۔ اللہ انہیں جنت نصیب کرے۔"

## امیر آدمی کا غریب باپ

"اچھا ہوا میرا باپ مر گیا۔ دکھوں سے چھوٹ گیا وہ۔ اس کا مر جانا ہی جنت میں جانے کے مترادف ہے۔"

"وہ بہت نیک بزرگ تھے۔"

"نیکی اور پارسائی جنت کا ٹکٹ نہیں ہوتی۔ یہ تو اللہ کا کرم ہے جس پر ہو جائے۔ اس کا زندہ رہنا دوزخ کے عذاب سے کم نہ تھا۔"

"بوڑھا اور بیکار ہو جانا واقعی دوزخ کا عذاب ہے بھاجی۔"

"وہ بوڑھا ہو گیا تھا مگر بیکار نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں چلتے تھے۔ پچیس تیس کی دیہاڑی کا مزدور وہ اب بھی تھا مگر......"

"مگر کیا؟"

"تمہارے یار نے جب وہ بہت امیر ہو گیا تو اسے کہا' اب تم راج گیری کا کام چھوڑ دو۔ لوگوں کو پتہ چل گیا کہ میں ایک معمولی مزدور کا بیٹا ہوں تو میری بے عزتی ہو گی۔ یہاں لوگ مجھے خاندانی رئیس سمجھتے ہیں۔"

"پھر؟"

"پھر میرے باپ نے اپنے بیٹے کی عزت کی خاطر کام چھوڑ دیا اور جا کر کوٹھی کے تہہ خانے میں رہنے لگا۔ اس کے پوتے پوتیاں اپنے بیکار اور بوڑھے دادا سے بات نہ کرتے تھے۔ انہیں یہ میلے کپڑوں اور گندی عادتوں والا کیڑا اپنی صاف ستھری کوٹھی میں اچھا نہ لگتا تھا۔"

"کیا بچوں کے ساتھ کبھی تو تکرار ہوئی؟"

"نہیں' غریب باپ امیر بیٹے کے بچوں کے ساتھ تو تکرار نہیں کر سکتا۔ کوئی بات کبھی نہ ہوئی۔ میرا باپ چپ چاپ نوکروں کی طرح کوٹھی کے تہہ خانے میں پڑا رہتا تھا اور نوکروں ہی سے بات چیت کر لیتا۔ اس پر تمہارے یار کو بڑی شرم آئی۔" اس نے کہا "نوکروں سے بات نہ کیا کرو۔ کوئی ملنے والا آ جائے تو اس کے سامنے نکلا نہ کرو۔ تہبند نہ باندھا کرو۔" "اچھا۔"

"پھر میرے باپ نے زبان پر قفل ڈال لیا کیونکہ اب وہ نوکروں سے بھی بات نہ کر سکتا تھا۔ اس نے تہبند چھوڑ کر شلوار پہننی شروع کر دی تھی مگر اب اسے دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ اپنے امیر بیٹے کی عزت کی خاطر قید تنہائی میں پڑ گیا۔ وہ اپنے امیر بیٹے کے سامنے تھر تھر کانپتا تھا۔ وہ اس کے سامنے جانے سے کتراتا تھا۔ کیا یہ بات دوزخ کے عذاب سے کم تھی جمال؟"

"ہاں بڑا عذاب تھی۔"

"تو جب وہ عذاب سے چھوٹا تو کیا موت اس کے لیے جنت سے کم ہوئی؟"

"سچ سچ۔" جمال نے کہا۔

"فدا محمد کا بھی کوئی قصور نہیں۔ اگر وہ اپنی حیثیت کے لوگوں کو بتا دیتا کہ میں ایک دیہاڑی دار

مزدور کا بیٹا ہوں اور یہی وہ گندا بے سلیقہ بوڑھا ہے تو کون اسے پارٹیوں میں بلاتا۔ کون اسے ڈنر کھلاتا اور اگر وہ مان لے کہ میں ایک ذلیل ٹرک ڈرائیور کا بھائی ہوں تو کیا وہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق رہے گا؟ وہ بھی اتنا ہی بے بس ہے جتنا کہ میں ہوں۔ میرا باپ مستری اللہ لوک تھا۔ ہتھکڑی سونے کی ہو تب بھی ہاتھوں کو ہلنے نہیں دیتی۔ اب اس نے سونے کی ہتھکڑی پہن لی ہے تو اس کی قیمت بھی دے مگر میں سمجھتا ہوں کہ فدا محمد اچھا رہا۔ اس نے بےفیض رشتے توڑ دیئے۔ بےفیض چیزوں کو رکھنا بےعقلی کی بات ہے۔''

یہ کہتے ہوئے بھاجی کھانسی کے ایک لمبے غوطے میں چلے گئے۔ دمے نے ان کی گردن ناپ لی۔ بڑی مشکل سے انہوں نے بلغم تھوکی جس میں خون کا ایک لوتھڑا بھی تھا۔

جمال ان کو اس حالت میں دیکھ کر بہت پریشان ہوا۔ آج سے تیس برس قبل وہ تگڑے جوان تھے مگر وقت انسان کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے۔

اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب میں بھاجی سے کیا کہوں۔ وہ اس دکھ کے کنویں سے فوراً نکل جانا چاہتا تھا۔

بھاجی اب پرسکون ہو گئے تھے۔ ان کی سانس نارمل تھی۔ وہ جمال کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔ ان کا موڈ بدلنے کی خاطر جمال نے کہا ''بھاجی یہاں ایک لڑکی ہوتی تھی لالی...... آپ کو یاد ہے؟''

بھاجی نے ہنس کر کہا ''وہ کس کو بھول سکتی ہے۔ عجیب لڑکی تھی۔ اسے مرے ہوئے بیس سال ہو گئے۔ تمہارے جانے کے بعد اس کے نیم پاگل خاوند نے اسے پانچ سو روپے میں ایک زمیندار کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ سال بھر کے بعد وہ اسی کے گاؤں میں دفن ہوئی...... بدنصیب بہت تھی!''

''بہت افسوس ہے۔'' جمال نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا ''میں نے دنیا دیکھی مگر ایسی حسین لڑکی نہیں دیکھی۔''

''اور دل کی بھی بہت اچھی تھی۔ تم لوگ تو اس کے خاص دوست تھے۔''

''ہاں تھے بھاجی۔''

تھوڑی دیر خاموشی رہی' پھر جمال نے کہا ''بھاجی اب مجھے اجازت دیجئے۔''

سیڑھیاں اترتے ہوئے اسے یاد آیا کہ آج سے تیس برس پہلے جب میں نور پور سے نکلا تھا تو انہی سیڑھیوں سے اترا تھا۔

## اس روز بھی جمعہ تھا

اس روز بھی جمعہ تھا۔ وہ فدا محمد کے چوبارے پر بیٹھا تھا' اچانک تاجی کھٹ کھٹ کرتی اوپر چڑھ آئی۔ اس میں فدا محمد کے لیے' جمال کے لیے اور بستی کے ہر جوان لڑکے اور لڑکی کے لیے ایک خاص قسم کی مامتا تھی۔

جوانی میں وہ ایک حسین عورت تھی اور اگر خواجہ قطب دین سے شادی کے بعد اس کی عزت کی جاتی تو شاید وہ ایک وضعدار اور روایتی عورت بن جاتی مگر بڑھاپے تک گھرانے کے لوگ اسے کبھی کھلے عام اور کبھی پیٹھ پیچھے کنجری کہتے رہے۔ وہ چڑ کر کنجریوں جیسی فحش باتیں کرتی تھی۔ اس لیے جوان دلہنیں اسے بہت پسند کرتی تھیں۔

تاجی کو اپنا یہ رول پسند آ گیا تھا مگر رشتوں اور مردوں کی حقیقتیں سمجھتے سمجھتے اس کی جوانی بیت گئی اور اب جب بڑھاپے نے اس پر اپنی سفید چادر ڈال دی تھی وہ ان جوانوں کی مجلس میں آ بیٹھتی جو اقدار کو توڑنے پر تلے ہوتے۔

جمال رشتے میں اس کا پوتا لگتا تھا اور فدا محمد اس کا یار تھا۔ دونوں کے لیے اس کے دل میں بے پایاں شفقت تھی۔ بےتکلفی بھی تھی اس لیے تاجی چوبارے میں داخل ہوتی تو کسی کو اچنبھا نہ ہوا۔ وہ جس گھر میں چاہتی کھلے بندوں جاتی۔ نور پور میں سب اپنے ہی تو تھے۔

چوبارے کے سامنے کی گلی کشادہ تھی' جس میں کسان عورتیں سبزیاں اور پھول بیچا کرتی تھیں۔ قصبے کی بڑی بوڑھیاں' پردہ دار بہویں اور جوان بیٹیاں سودا سلف خریدنے یا گپ مارنے کو صبح سویرے ہی یہاں بھیڑ لگا دیتی تھیں اور اس گہما گہمی میں کوئی نہ دیکھتا کہ فدا محمد کے چوبارے میں کون داخل ہوا اور کون نکلا۔

فدا محمد اور جمال کی دوستی بھی مشہور تھی۔ دونوں پڑھے لکھے۔ دونوں باعزت' اگرچہ تھوڑے بہت بدنام مگر جوانی میں تھوڑا بہت تو سبھی ڈولتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ نور پور کی کنواریاں شریف لڑکوں کو خود اشارے کرتی ہیں۔ پھر دوش کس کا ہوا؟

جمال اور فدا محمد تاجی سے اپنے راز کبھی نہ چھپاتے تھے۔ اس کے سامنے وہ اپنی آرزوؤں اور پسندیدگیوں کا اظہار بےتکلفی سے کر دیتے تھے کیونکہ بستی میں ایک وہی تو ان کی دردمند تھی۔

تاجی نے کہا ''تم دونوں جمعہ پڑھنے نہیں گئے؟''

اسے معلوم تھا کہ وہ نماز نہیں پڑھتے' اس نے انہیں چھیڑا تھا۔

دونوں کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

تاجی سنجیدگی سے بولی ''اب تو قطب دین بھی نماز پڑھنے لگا ہے۔ شراب اس کی سکھوں کے جانے سے چھوٹ گئی اور وہ اب صبح سویرے مسجد چلا جاتا ہے۔''

جمال نے کہا ''بڑے میاں جی کا شراب کے بغیر کیسے گزارہ ہوتا ہوگا۔''

''پاکستان بن گیا ہے اور لوگوں میں خوفِ خدا پیدا ہو گیا ہے۔'' فدا محمد بولا۔

تاجی ہنسی ''خوفِ خدا؟ کس میں ہے خوفِ خدا دنیا میں ہم تینوں کے سوا جو لوگوں سے پیار کرتے

ہیں اور کسی کا دل نہیں دکھاتے۔ قطب دین نے خدا کے خوف کی وجہ سے شراب نہیں چھوڑی۔ اگر چہ وہ کہتا یہی ہے کہ اس نے شراب اس لیے چھوڑی کہ ٹھیکے کا سارا اسٹاک وہ پی چکا جو بیت المال سے اسے امانت کے طور پر ملا تھا اور دھیان سنگھ کی بھٹی ٹھنڈی پڑی ہے۔ جب شراب کہیں ہے ہی نہیں تو قطب دین بیچارہ نماز نہ پڑھے تو کیا کرے؟''

جمال اور فدا محمد نے قہقہہ مارا۔

تاجی بولی ''ان دنوں وہ رات کو افیم کھاتا ہے مگر اس سے اس کی تسلی نہیں ہوتی۔ دھیان سنگھ یہاں تھا تو اس کے لیے شراب کی کمی نہ ہونے دیتا تھا۔ آج کل صرف اسے یاد کرتا اور روتا ہے۔''

جمال نے کہا ''شراب تو ہمیں بھی نہیں ملتی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم نماز پڑھنے لگ جائیں۔''

فدا محمد نے بات بڑھائی۔ ''بچپن میں مَیں بہت نمازی تھا چاچی مگر مجبوراً۔ میاں عیدا مسجد میں ہماری حاضری لگاتے تھے اور مرغا بناتے تھے۔ ان کی سختی ہی سے نماز سے دل اچاٹ ہو گیا۔ ایسی نماز سے کیا حاصل جو ڈنڈے کے زور پر پڑھائی جائے۔''

جمال نے کہا ''مجھے تو نماز آتی ہی نہیں۔ کبھی بچپن میں یاد کی ہو گی مگر مجھے اس میں کبھی مزا نہ آیا۔ پھر جو بھی دعائیں میں نے نماز پڑھ کر مانگیں کبھی پوری نہیں ہوئیں۔''

''میں نے بھی تو کبھی نماز نہیں پڑھی۔'' فدا محمد بولا ''مگر مجھے ڈر بہت لگتا ہے اللہ سے۔''

''ڈر تو مجھے بھی لگتا ہے۔'' جمال نے کہا۔

## خواہشیں اور نماز

''اگر تمہاری خواہشیں پوری ہو جائیں تو نماز پڑھو گے؟'' تاجی نے ڈرانے کے انداز میں پوچھا۔ اس وقت وہ کسی مندر کی کاہنہ معلوم ہوتی تھی جس کے قدموں میں پھولوں کے ہار اور کٹے ہوئے سر پڑے ہوں۔

''کون سی خواہشیں؟'' فدا محمد نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

تاجی بولی ''مثلاً وہ جو نیچے کھیس کی بکل میں تھڑے پر بیٹھی ہے۔ اگر وہ اوپر آ جائے تو.....''

جمال نے اشتیاق سے پوچھا ''لالی؟''

فدا محمد بولا ''مگر اس وقت تو ساری دنیا دیکھ رہی ہے چاچی!''

''تم کہو تو ساری دنیا اندھی کر دوں۔ وہ اوپر بھی آ جائے اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔''

''وہ کیسے چاچی؟''

''وہ تمہارے پڑوس کے گھر جائے گی۔ منہ ہاتھ دھونے پھر آنکھ بچا کر چھت پر چلی جائے گی اور دیوار پھلانگ کر نیچے اتر آئے گی اس چوبارے میں۔''

''واہ چاچی۔'' فدا محمد نے کہا۔

جمال کے زانو پر ہاتھ مار کر تاجی نے کہا ''میں ابھی آتی ہوں۔'' اور یہ کہہ کر وہ سیڑھیاں اتر گئی۔

جمال اور فدا محمد کھڑکی کی چکوں میں سے نیچے دیکھنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تاجی لالی کے پاس جا پہنچی اور تھوڑا رک کر آگے نکل گئی۔ لالی اس کے پیچھے چلی، پھر نکڑ پر غائب ہو گئی۔ فدا اور جمال کے بدنوں میں بجلیاں بھر گئیں۔ دونوں ننگے پاؤں چھت پر جا کر دیوار کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد لالی ایک جنگلی کبوتری کی طرح تول تول کر قدم رکھتی ہوئی پڑوس کی چھت پر نمودار ہوئی۔ اس نے ایک بچے کی سی پھرتی سے منڈیر پر قدم رکھا اور گیند کی طرح نیچے آ رہی۔ فدا محمد نے اسے گود میں لے لیا۔

''صبر کرو۔'' لالی بولی ''بچے پتنگ اڑا رہے ہیں۔ وہ دیکھ لیں گے۔''

مگر بچے پتنگ اڑاتے رہے، کسی نے کچھ نہ دیکھا۔ فدا محمد نے اسے سیڑھیوں میں گود سے اتار لیا۔

اس کے ہونٹوں پر گلابی چاندنی چیخ رہی تھی۔ اس کے گالوں کے گلاب مہک رہے تھے۔ اس کی لمبی چوٹی پیٹھ سے نیچے اتر رہی تھی۔

پھر تینوں آگے پیچھے نیچے اتر کر چارپائی پر بیٹھ گئے۔

لالی مسکراتی رہی۔ کبھی فدا محمد کو دیکھ کر کبھی جمال کی طرف آنکھیں نچا کر۔

جمال نے اسے اتنے قریب سے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسے پتہ نہ تھا کہ اس کی پلکیں اتنی لانبی ہیں اور جھکی رہتی ہیں۔ جب وہ اوپر دیکھتی ہے تب بھی۔ اس کا چہرہ بیضوی نہیں تھا چوکور تھا۔ اس کی آنکھیں رات میں بھی روشن رہتی تھیں۔ جمال نے زندگی میں کبھی ایسی ستواں اور مرمریں ناک دیکھی نہ تھی۔ اس کے جسم کی گولائیوں کو کھیس نے ڈھانپ رکھا تھا۔ جمال ان گولائیوں کو ٹٹول چکا تھا مگر پھر بھی اب وہ اسے بہت خیال انگیز لگیں۔

فدا محمد بے قابو ہو رہا تھا۔ جمال بھی لبریز تھا مگر اس نے کسی قدر متانت کا بہروپ دھار لیا۔

فدا محمد نے کہا ''تم پلنگ پر لیٹ جاؤ لالی اور ہم دونوں سامنے کی کرسیوں پر بیٹھ کر تمہیں دیکھتے ہیں۔''

''تم مجھے دیکھ ہی رہے ہو۔'' لالی سادگی سے بولی ''اور کیا دیکھنا ہے تمہیں؟''

''جی نہیں بھرتا تمہیں دیکھنے سے۔'' فدا محمد بولا۔

''تو اور دیکھ لو کچھ۔'' لالی نے مسکرا کر کھیس پرے رکھ دیا۔ اس کے سینے کے کبوتر چوگ چگنے لگے۔

جمال کا دل دھڑکنے لگا۔ لگتا تھا چھاتی توڑ کر باہر آ جائے گی۔

فدا محمد ہانپنے لگا۔ پھر وہ اس سے لپٹ گیا۔ لالی گھبرا کر کھڑی ہو گئی ''کیا کرتے ہو۔'' اس نے سرزنش کے انداز میں کہا۔

''فدا محمد ذرا ٹھہرو۔ لالی سے بات چیت کرتے ہیں۔ تم اتنے دنوں سے ملی نہیں لالی؟'' اس نے

شکوہ کیا۔ ''کہاں رہی؟'' جمال نے کہا۔

''کہیں نہیں۔ جب سے ابا مرا ہے چھوٹا سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ رات کو سوتا بھی میرے ساتھ ہے۔ پہلے ابا کے ساتھ سوتا تھا۔'' لالی نے لاپروائی سے کہا۔

فدا محمد اور جمال دونوں ٹھنڈے ہو گئے۔ انہیں لالی کے باپ کی موت اور اس کے چھوٹے بھائی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مگر انہوں نے دلگیروں جیسی شکل بنالی۔

''اور اب تو ہمارا کمانے والا بھی کوئی نہیں۔'' لالی بولی ''میں رسالداروں کے کپڑے دھو دیتی ہوں تو وہ بھی کبھار کچھ دے دیتے ہیں مگر مائی مجھے ڈراتی بہت ہے اور مجھ سے بڑی بڑی دریاں دھلواتی ہے۔ اف میرے تو کندھے درد کر رہے ہیں۔''

''لالی میں تمہارے کندھے دبا دوں؟'' فدا محمد نے کہا۔

''نہیں جی، ہم خود چاکر ہیں۔ لوگوں کے کام کرتے ہیں۔''

جمال کا دل چاہا کہ اسے کچھ روپے دے دے مگر اس کی جیب میں صرف پان سگریٹ کا خرچہ تھا۔ پھر یہ خیال بھی تھا کہ شاید لالی برا مان جائے۔ آخر وہ کوئی پیشہ ور عورت تو تھی نہیں۔

''لاہور سے میں تمہارے لیے سرخی اور پاؤڈر لاؤں گا۔'' فدا محمد نے کہا۔

''لالی کو سرخی کی حاجت نہیں۔ اس کے ہونٹ تو پہلے ہی رس کے بھرے ہیں اور گال اتنے نرم جیسے گلاب کے پھول، کیوں لالی؟'' اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''ہمیں نہیں سرخی پاؤڈر کی ضرورت۔ لوگ ویسے ہی جینے نہیں دیتے ہم غریبوں کو، ہم کس کو دکھائیں گے سرخی پاؤڈر؟'' لالی بولی۔

''ہم دیکھیں گے۔ تمہیں کسی کی کیا پرواہ؟'' فدا محمد بولا۔

''ہمیں نہیں جی کسی کی پرواہ۔ ہمارا کوئی کیا کر لے گا۔ لوگ مار پیٹ کر چپ ہو جائیں گے۔ عورتیں گالیاں دیں گی۔ سو اب بھی دیتی ہیں۔ ایک چھوٹے کی روٹی کا فکر ہے۔ وہ بھی میں کسی نہ کسی طرح لے ہی آتی ہوں۔ کپڑے دھو کر کسی کے برتن مانجھ کر۔ سوچتی ہوں چھوٹا کسی طرح فوراً ہی بڑا ہو جائے۔ صبح اٹھے تو اس کے داڑھی مونچھ اتر آئے مگر خدا بھی غریبوں کی نہیں سنتا۔'' لالی بولی۔

''کس عمر کا ہوگا چھوٹا؟'' جمال نے ہمدردی سے پوچھا۔

''ابھی پانچ برس کا ہے۔''

''تو اسے سکول بھیجا کرو۔''

لالی ہنس دی۔ ''تم بڑے بھولے ہو جمال۔ غریبوں کے بچے بھی کیا سکول جاتے ہیں؟ ہم ان کی فیسیں کہاں سے بھریں۔ کتابیں اور کپڑے کہاں سے لائیں اور کھائیں گے کہاں سے؟''

فدا محمد بیزار ہو رہا تھا۔ اس کو بات چیت کا یہ انداز بہت تکلیف دے رہا تھا۔ بات کو بدلنے کی نیت سے اس نے کہا ''لالی ٹھیک کہتی ہے۔ پڑھ کے بھی یہ لوگ کیا کریں گے۔ میں نے لالی پر جو نظم کہی ہے وہ نہ سنائیں اسے؟''

پھر وہ لہک لہک کر اپنی نظم سنانے لگا۔ لالی نے نگاہ نیچی کر لی اور اپنی الجھی ہوئی لمبی چوٹی کے بالوں کے تار گننے لگی۔

جمال یہ نظم کئی بار سن چکا تھا اور یہ اسے بہت بیکار لگی تھی۔ وہ لالی کے حالات پر غور کرنے لگا۔

## مکھیاں ہی مکھیاں

اتنے میں کروڑوں مکھیاں بھنبھنانے لگیں۔ گلی میں شور مچ گیا۔ یہ شور شرارت آمیز تھا۔ اس میں ہنگامے کی بُو تھی۔

چوبارے کے سامنے والی کشادہ گلی میں جہاں عورتیں سبزی بیچتی اور خریدتی تھیں، داڑھیاں، پگڑیاں اور ٹوپیاں گھنے بادلوں کی طرح امڈ آئیں۔ ٹوکرے بھاگ کھڑے ہوئے۔ پھر ایک معزز شخص تقریر کرنے لگا۔ ''دن دہاڑے بدکاری ہو رہی ہے۔ گناہ کے کاروبار جاری ہیں۔ اللہ کا غضب ٹوٹنے والا ہے نور پور پر۔''

ہجوم چیخنے اور چلانے لگا۔ ''باہر کے دروازے پر کنڈی لگا دو۔ کوئی نکلنے نہ پائے۔''

دروازے پر کنڈی لگ گئی۔ جمال گھبرا گیا۔ اس نے فدا محمد سے کہا ''پکڑے گئے، مارے گئے۔''

فدا محمد کا رنگ اڑ گیا مگر لالی پرسکون تھی۔ ''میں اوپر سے کود جاتی ہوں۔ تم کہہ دینا یہاں تو کوئی بھی نہیں۔'' وہ متانت سے بولی۔

وہ جواب کا انتظار کیے بغیر دبے پاؤں چھت پر چلی گئی۔ چوبارے میں صرف فدا محمد اور جمال رہ گئے۔ نیچے ہجوم بپھرا ہوا تھا۔ لگتا تھا وہ آج ہی ساری دنیا کی بدی کو ختم کر کے دم لے گا۔

عین اس وقت گلی کے نکڑ پر تاجی نمودار ہوئی اور اس کے پیچھے پیچھے خواجہ قطب دین۔

خواجہ قطب دین جمعے کی نماز پڑھ کر گھر پہنچے ہی تھے کہ تاجی کو ہنگامے کا پتہ لگ گیا۔ نمازیوں نے جمال اور فدا محمد کو مکان میں بند کر دیا تھا مگر تاجی نے خواجہ قطب دین کو سمجھایا کہ لڑکے بے قصور ہیں۔ میں خود ابھی ان سے مل کر آئی ہوں۔ وہ دونوں پتنگ اڑانے کی سوچ رہے تھے مگر رسالداروں نے شرارت کی ہے۔ وہ اصل میں ہمارے خاندان کو بدنام کرنا چاہتے ہیں۔

اور خاندان کے نام پر خواجہ قطب دین طیش میں آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی کہا ''میں خون پی جاؤں گا اس کا جس نے کوئی بات کی۔''

لوگ بولے ''تم خود دیکھ لو خواجہ۔ اندر فدا محمد ہے اور تمہارا جمال۔ دونوں اس کنجری کو لے کر بیٹھے

ہیں۔دن دہاڑے غضب ٹوٹ رہا ہے۔''

خواجہ قطب دین کچھ گھبرا گئے۔تاجی بولی۔''چلو اوپر چلو۔ہم خود دیکھتے ہیں' اندر کیا ہو رہا ہے۔''

خواجہ قطب دین سیڑھیوں پر چڑھ آئے اور ان کے پیچھے پیچھے جتنے بھی لوگ آ سکے مگر کمرے میں جمال اور فدا محمد کے سوا کوئی نہ تھا۔پھر خواجہ قطب دین نیچے اترے اور انہوں نے پورے ہجوم کے اور خاص طور پر ان کی عورتوں کے مقدس مقامات کا پوری وضاحت اور بلاغت کے ساتھ جغرافیہ بیان کیا کیونکہ انہوں نے نیک بچوں کو خواہ مخواہ بدنام کیا تھا۔لوگ ایک ایک کر کے کھسکنے لگے بالآخر میدان خالی ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد جمال اور فدا محمد چوبارے سے اتر کر باہر چلے۔کچھ عورتیں گھروں سے نکل آئی تھیں مگر انہوں نے کسی سے آنکھ نہ ملائی۔باہر جانے کے لیے انہیں پچھواڑے کے مکان کے سامنے ہی سے گزرنا پڑتا تھا۔

پچھواڑے کے مکان کے دروازے پر عورتوں کا ایک ہجوم تھا۔عورتوں کے ہاتھوں میں جوتیاں تھیں جو ہجوم کے درمیان میں گھری ہوئی لالی کے سر پر برس رہی تھیں۔اسے اندھا دھند گالیاں پڑ رہی تھیں۔اسے بری طرح نوچا جا رہا تھا۔لالی کچھ کہتی نہ تھی۔کسی کا ہاتھ بھی پکڑتی نہ تھی۔اسے عورتوں نے چھت سے اتر کر دروازے سے نکلتے دیکھ لیا تھا اور اب اس کو اس بدکاری کی سزا دے رہی تھیں جو اس نے کی بھی نہیں تھی۔

فدا محمد اور جمال کو عورتوں نے دیکھا مگر کچھ نہ کہا۔وہ بھی نظریں جھکائے چپ چاپ چلتے رہے۔

عورتوں کی نظروں میں وہ قصوروار نہیں تھے کیونکہ لالی کنجری خود اپنے قدموں چل کر لڑکوں کے پاس گئی تھی۔

جمال نے چوبارے سے اتر کر رسالدار کے گھر پر ایک ہلکی سی نظر ڈالی۔اس کے دروازے اکھڑ رہے تھے۔لگتا تھا کہ اندر کوئی نہیں۔نہ کوئی نغمہ نہ کوئی جھنکار۔نور جہاں پتہ نہیں کہاں ہو گی۔

رسالدار کے گھر کے واقعات چکردار مہتابی کی طرح اس کی آنکھوں کے آگے گھومنے لگے۔

یادیں دل کو کتنا اداس کر دیتی ہیں!

## کہاں گئے وہ لوگ!

بازار میں دکانیں اپنی اپنی جگہ موجود تھیں مگر دکاندار اجنبی تھے۔چوک میں سے ہندوؤں کا مندر' جس کے سامنے رام لیلا کا کھیل کھیلا جاتا تھا۔انبالے کے مہاجرین نے ڈھا دیا تھا اور اب اس کھلے میدان میں سبزی فروشوں کے ٹوکرے رکھے تھے۔وہ نلکا اسی طرح موجود تھا جس سے زخمی کرشنا نے مشتاق کی اوک سے پانی پیا تھا۔

یہ بازار نور پور کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادیوں کے درمیان ایک واضح لکیر تھا۔مسلمان ایک طرف جس میں ایک بھی ہندو گھرانہ نہ تھا۔دوسری طرف ہندو ساہوکاروں' مہاجنوں اور جاگیرداروں کی حویلیاں جن میں کوئی مسلمان گھرانہ نہ تھا۔

نور پور کے ہندو محلوں سے جمال اچھی طرح آشنا تھا۔بچپن میں سرکاری ہسپتال سے ملیریے کی دوا لینے کے لیے اُدھر ہی سے ہو کر جانا پڑتا تھا۔

ہندو لڑکوں کو پیٹنے ان سے کتابیں چھیننے اور انہیں ستانے کے لیے مسلمان لڑکوں کی ٹولیاں ان کی گلیوں میں پھرا کرتی تھیں۔مسلمان لڑکوں کا ہندو لڑکوں سے فقط اتنا ہی رابطہ ہوا کرتا تھا۔

نور پور کے ہندو بہت شائستہ لوگ تھے۔کبھی کبھار کسی مقروض کے رہن مکان کو نیلام کروانے کے سوا انہوں نے مسلمانوں پر کبھی کوئی زیادتی نہ کی تھی۔ہندوؤں کے جواں بچے نور پور چھوڑ کر بڑے بڑے شہروں میں کاروبار اور نوکریاں کرتے تھے۔بڑے بوڑھے خود کفیل اور تنہائی پسند تھے۔ان کا اپنے مزارعین اور مقروضوں کے سوا کسی مسلمان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ان کے گھر تین تین چار چار منزلہ تھے مگر گلیاں تنگ اور تاریک تھیں۔ہندو عورتیں اپنے گھروں کے اندر اور تقریباً پردے کی حالت میں رہتی تھیں۔انہیں مسلمانوں کی غنڈہ گردی کا خوف تھا۔مسلمان اپنے افلاس کی وجہ سے ہندوؤں سے ڈرتے تھے اور ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور احترام بھی نفرت ہی کا ایک روپ ہوتا ہے مگر اب تو چاروں طرف انبالے کے مہاجروں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

## دمادم مست قلندر

منڈی کے چوک میں ہجوم تھا۔ایک مست قلندر میلا گندا بڑے بڑے گھنگرو پہنے گردن میں لوہے کی گھنٹیاں لٹکائے ناچ رہا تھا۔اس کے الجھے ہوئے بال کھچڑی تھے۔اس کے منہ میں کوئی دانت نہ تھا۔اس کی آنکھیں سرخ تھیں' اس کا بدن کبھی کسرتی ہو گا مگر اس کی مچھلیاں اب ڈھیلی ہو کر لٹک رہی تھیں۔وہ گا رہا تھا:

مایا کرے صفایا علی جی مست قلندر
راہ وچ مار مکایا علی جی مست قلندر
رب نے جدوں بلایا علی جی مست قلندر

جمال ہجوم میں گھس کر کھڑا ہو گیا۔اسے کوئی بھی پہچانتا نہ تھا۔اس کے بچپن میں نور پورے کے فقیر دھمال ڈالتے تھے تو وہ اس طرح مبہوت کھڑا گھنٹوں تماشا دیکھا کرتا تھا۔

دفعتاً فقیر نے جمال کو گریبان سے پکڑ لیا اور اسے گھور کر کہا''آج آئے ہو اتنی مدت کے بعد۔''

''سائیں جی آپ کہیں تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔''جمال نے گھبرا کر کہا۔

فقیر بولا''چلے جاتے ہیں جو آتے ہیں۔سب رولا ای رولا۔باقی سب مولا ای مولا۔دمادم مست قلندر۔علی دا پہلا نام۔''

وہ اس طرح جمال کا گریبان پکڑے ہوئے ناچنے لگا۔جمال نے قمیص چھڑانے کی پوری کوشش کی

مگر فقیر کی گرفت مضبوط تھی۔ ''سائیں جی میری گردن تو چھوڑ یئے۔'' جمال نے عاجزی سے کہا۔

''کوئی کسی کی گردن نہیں چھوڑتا جب ہاتھ میں آ جائے۔ مولا ای مولا۔ باقی سب رولا ای رولا۔''

فقیر نے نعرہ لگایا۔

''یہ شیفا ہے۔ شیفا ماچھی'' کسی نے آواز دی۔ ''اس کو نہیں پہچانتے میاں جی۔''

''ارے شیفے تجھے کیا ہو گیا۔ تیرا خانہ خراب۔'' جمال نے اسے پہچان کر کہا۔

وہ بولا ''میں شیفا ماچھی نہیں۔ شیفا ماچھی تو قاتل تھا۔ اس نے دیوان مایا رام اور اس کی بیٹی کی گردن پر تلوار پھیری تھی۔ وہ خونی تھا۔ میں تو لال شہباز کا قلندر ہوں۔ دمادم مست قلندر۔''

''اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کہتا ہے شیرے بودم کو بھی میں نے ہی قتل کیا تھا۔ بھنگ پی پی کر اس کی مت ماری گئی ہے۔'' ہجوم میں سے کسی نے کہا۔

''سب دا کرے صفایا۔ دمادم مست قلندر۔''

شیفا ماچھی پھر ناچنے لگا۔

شیفے ماچھی نے تقسیم کے فسادات میں تھانیدار ذوالفقار علی شاہ کے حکم پر نور پور میں کئی ہندو مرد' عورتیں اور بچے قتل کیے تھے۔ جمال کو ان واقعات کا ذاتی طور پر علم تھا۔ شیفے ماچھی کو اس حالت میں دیکھ کر جمال کو اس سے کوئی ہمدردی نہ ہوئی۔ پھر لوگوں نے بتایا کہ شیفے ماچھی کو ضمیر کے کچوکوں نے پاگل نہیں کیا۔ اس نے جو لوٹ مار کی تھی' وہ اتنی نہ تھی کہ اس سے اس کی زندگی گزر جاتی۔ تھوڑے دنوں کے بعد اس کی بیوی کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ کچھ روز وہ اس کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ پھر جی چھوڑ بیٹھا اور فقیر ہو گیا کیونکہ فقیروں کو روٹی بھی مل جاتی ہے اور ان پر کوئی ذمہ داری بھی نہیں ہوتی۔

شیفا ناچتے ناچتے تھک گیا تو جمال کا دامن پکڑ کر بولا ''باؤ اتنے برس بعد آیا ہے تو اپنے قلندر کو ایک روپیہ روٹی کے لیے دیتا جا۔''

جمال نے ایک روپیہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

''ایک روپیہ اور دے کیونکہ تو یہاں سے جائے گا تو پھر کبھی نہ آئے گا۔''

جمال نے ایک روپیہ اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''جب دو روپے دیئے ہیں تین کر دے۔'' شیفے نے نہایت ڈھٹائی سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں ایک مکارانہ چمک تھی۔

## ہندوؤں کی حویلیاں

منڈی کا چوک عبور کر کے جمال ہندو جاگیرداروں کی دو سو برس پرانی حویلیوں کی طرف نکل گیا۔ یہ حویلیاں تیس برس پہلے جب پاکستان وجود میں آیا تھا تو جمال نے اپنی آنکھوں سے لٹتی دیکھی تھیں۔ لڑکپن میں وہ یہاں ہولی کے موقعے پر رنگ پچکاریوں کی پھوار کی بہار دیکھنے کے لیے آیا کرتا تھا۔ یہ حویلیاں نور پور کی عظمت کا نشان تھیں۔ تینوں حویلیاں محلات کی صورت میں تعمیر ہوئی تھیں مگر ان کے صحنوں میں باغات اور فوارے نہیں تھے۔ محصور ہو کر بیٹھ جانے کے لیے یہ حویلیاں بہت موزوں تھیں۔ تنگ گلیوں میں سے جمال کو بہت سے ننگ دھڑنگ بچے کھیلتے ہوئے نظر آئے۔ جن کے ماں باپ نور پور میں آباد ہوئے تھے۔

ایک حویلی کو دیکھ کر جمال کو سکتہ سا ہو گیا۔ وہ اپنی بنیادوں پر کھڑی تھی۔ اس کے بڑے بڑے آہنی دروازے بھی موجود تھے مگر چھت پر کچھ بھینسیں بندھی تھیں۔

دراصل یہ چھت نہیں تھی' ملبے کا ایک پہاڑ تھی۔ پہلی منزل کی بے شمار کوٹھڑیوں میں میواتی پناہ گزین کنبہ در کنبہ آباد تھے۔ ان میں جو حوصلہ منداور جیالے تھے' انہوں نے ساہوکاروں کے پکے مکان الاٹ کروا لیے تھے۔ غریبوں اور کمزوروں نے حویلیوں میں کوٹھڑی کوٹھڑی بسیرا کر لیا تھا۔

انہوں نے اوپر کی چھتیں گرادی تھیں تاکہ کڑیوں' شہتیر وں' جھروکوں اور دروازوں کی سوکھی لکڑی چولہوں میں جلا سکیں۔

ملبے کے پہاڑوں کو انہوں نے ڈھلان بنا لیا تھا۔ سیڑھیوں کا استعمال چھوڑ دیا تھا کیونکہ ان کی بھینسیں سیڑھیاں نہ چڑھ سکتی تھیں۔ غلام گردشوں نے گلیوں اور کوچوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ دالانوں میں انہوں نے بوریاں اور پرانی دلائیاں لٹکا کر چھوٹے چھوٹے گھروندے بنا لیے تھے۔ ان کے سامنے وہ بھینسیں باندھتے تھے یا حقے بھر کر گرمی اور سردی کی سیر دیکھتے تھے۔ جھروکوں اور فصیلوں پر عورتیں کپڑے سکھاتیں یا بیٹھ کر بچوں کی جوئیں نکالتی تھیں۔

جمال کو یہ منظر دیکھ کر بڑی تکلیف ہوئی۔ اس کا ان حویلیوں سے کوئی جذباتی رشتہ نہ تھا مگر اس کا دل بوجھل ہو گیا۔

نور پور کوئی تشدد پسند اور بے حس قصبہ نہیں تھا۔ بھائی چارہ' برداشت اور صبر و سکون اس کی روایت تھی جو تقسیم ہند کے زمانے میں شاہ بادشاہ ذوالفقار علی شاہ نے بدل ڈالی تھی مگر وہ تو علاقے کا تھانیدار تھا اور تھانیدار پیدا ہی ظلم اور تشدد کے لیے ہوتے ہیں۔ آم کے جھنڈوں' موتیے کے باغیچوں اور جھکی ہوئی میٹھی بیریوں میں گھرا ہوا یہ قصبہ صدیوں سے اپنی گھنی چھاؤں میں بیٹھا کوئلوں کی کوک' طوطوں کی سیٹیاں اور کونجوں کی کرلاہٹیں سنتا تھا۔ اچانک خون کے ایک دریا نے اپنی سرخ چادر اس پر ڈال دی تھی۔ اس وقت جمال کے سامنے خون کے دریا کے ہٹ جانے کے بعد کے ویرانے نمودار تھے۔

نور پور کا مزاج بدل چکا تھا۔ مقامی باشندے شہر چھوڑ کر جا چکے تھے تاکہ پاکستان کی لوٹ مار میں اپنا حصہ وصول کر سکیں۔ نور پور میں تو کوئی کاروبار نہ تھا۔ کوئی کارخانہ نہ تھا۔ بجلی نہ تھی' ریل نہ تھی' نور پور جرنیلی سڑک سے کوسوں دور ایک طرف واقع تھا۔ یہاں کوئی حوصلہ مند شخص جو انفرادی ترقی کرنا چاہتا ہو کیسے رہتا۔

یہاں تو نور پور کے بوڑھے بیکار اور قریب المرگ لوگ پڑے سسک رہے تھے۔ نور پور ایک بہت بڑی اجتماعی قبر تھا۔

میواتی پناہ گزین جن علاقوں سے آئے تھے ان میں سے پیشتر کی زندگی لوٹ مار، بھوک اور افلاس میں کٹتی تھی۔ نور پور کی زرخیز زمین اور اس کے پکے مکان ان کے لیے روشن زندگی کا وعدہ تھے مگر ان میں سے بھی بہتوں کو کچھ نہ ملا۔ ان کے چودھریوں نے اپنا سکہ چلایا اور ان کو جن کو کچھ نہ ملا تھا، چوری، رسہ گیری اور لوٹ مار پر لگا دیا۔

اس طرح پناہ گیروں کی قصبے کے پرانے باشندوں پر جو باقی رہ گئے تھے، دھونس جم گئی۔ میواتیوں کے چودھریوں کی ضلعے کے افسروں اور پولیس والوں کے ساتھ امداد باہمی کے تعلقات قائم ہو گئے اور قاتلوں اور ڈاکوؤں کی ضیافتیں ہونے لگیں۔ ان کے الاٹ ہوئے گھروں پر کہیں پیپلز پارٹی اور کہیں جماعت اسلامی کے پھریرے اُڑ رہے تھے۔

نور پور پھر دو واضح منطقوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ ایک میں حرکت اور تشدد، دوسرے میں بزدلی اور بے چارگی۔ پہلے یہاں ہندو ساہوکاروں کا راج تھا۔ اب میواتی حکمران تھے۔

شہر کے باہر سوکھے ہوئے تالاب میں گدھے چر رہے تھے۔ وہ بوڑھا بڑ جس کی چھاؤں میں بیٹھ کر جمال گرمی کی چھٹیاں گزارا کرتا تھا، کسی نے کاٹ کر جلا ڈالا تھا۔ اس کے سائے میں بنی ہوئی چھتریاں جن کے نیچے بیٹھ کر لوگ تالاب کی بہار دیکھتے ہوں گے، ڈھے چکی تھیں۔ مغل شہزادی کے مقبرے کے گنبد میں دراڑ پڑ چکی تھی۔ جامن کے باغ میں سیم کا پانی نکل آیا تھا۔ زمین شور ہو گئی تھی۔ اب یہاں کچھ اُگ نہ سکتا تھا۔

کنارے پر کچھ بگلے سر جھکائے بیٹھے تھے۔

نور پور کی ٹیڑھی تنگ اور خاک اڑاتی گلیاں جمال کو بتائے بغیر شرارت سے اس طرف لے گئیں جہاں کبھی اس کے پردادا خواجہ صمد کا ڈیرہ ہوتا تھا۔ اس میں وہ کاروبار کرتا تھا۔ کبھی باسمتی چاولوں کا، کبھی کچے چمڑے کا، کبھی بھینسوں کا، کبھی بھیڑوں کا، کبھی اس ڈیرے کے وسیع احاطے میں آٹا پیسنے کی ایک مشین بھی کوکو کرتی تھی۔ اس میں لکڑی چیرنے کا ایک آرا بھی تھا اور کیکر کی چھال پیسنے کی چکی بھی اور یہ پہلی مشینیں تھیں جو نور پور نے دیکھیں مگر یہ صنعتی انقلاب جمال کے بچپن ہی کے زمانے میں رک گیا تھا۔

اس احاطے میں جمال کے بزرگوں نے جن میں خواجہ قطب دین آگے آگے تھے، عدم تشدد کی تحریک کے زمانے میں اپنی عورتوں کے ریشمی کپڑے جلائے تھے تاکہ انگریزی مال کی درآمد روکی جا سکے۔ انگریز کے خلاف محاذ میں ہندو مسلمان ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلے تھے۔ پگڑیاں، ساڑھیاں، قمیص، رومال سب جل کر خاک ہوئے۔ پھر اس الاؤ کے گرد سب نے مل کر بھنگڑا ڈالا تھا۔

اچانک دھول کے غبار میں جمال نے دیکھا کہ ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر خواجہ قطب دین سر جھکائے بیٹھا ہے جس کا نام سننے کی بھی چھوٹی بے روادار نہ تھی۔

## ضرورتِ رشتہ

خواجہ قطب دین کوئی سو برس کے پیٹے میں تھے مگر چہرے کا رنگ لال اور چمکیلا تھا۔ جس بات پر جمال کو سب سے زیادہ حیرت ہوئی وہ خواجہ قطب دین کے سر کے بال کالے اور منہ میں پورے دانت تھے۔ جمال سمجھا کہ خواجہ قطب دین نے خضاب لگا رکھا ہے اور دانت مصنوعی ہیں۔ یقیناً یہی بات تھی کیونکہ خواجہ قطب دین کے بال تو تیس برس پہلے بھی سفید تھے جب جمال نے نور پور چھوڑا تھا اور دانت بھی ان کے گر چکے تھے مگر لگتا تھا کہ بال بھی قدرتی اور صحت مند ہیں اور دانت بھی مصنوعی نہیں۔

کالے کپڑے نے جمال کے سلام کا جواب دینے کی بجائے اپنی چندھیائی ہوئی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں جیسے سوچ رہا ہو کہ یہ کون شخص ہے جس نے مجھے ادب سے سلام کیا ہے۔

خواجہ قطب دین کی آنکھیں گدلی تھیں۔ ڈیلوں کے کالے حاشیے پھیل کر پتلیوں کی سفیدی میں گھل چکے تھے۔ ظاہر تھا کہ ان کی نظر قائم نہ تھی۔ وہ صاف دیکھ نہ سکتے تھے۔

”تو کون ہے جوان؟“ انہوں نے نرمی سے پوچھا۔ ”دکھائی نہیں دیتا اب۔“

”جی میں جمال ہوں میاں جی۔“ جمال نے جواب دیا۔

کالا کپڑا بدستور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پاس کھڑے سائیں کریم بخش نے کہا۔

”یہ جمال ہے تیرے یٰسین کا بیٹا۔ اپنی اولاد کو بھی نہیں پہچانتا اب؟ یہ تیرا پوتا ہے قطب دین۔“

خواجہ قطب دین نے زور سے جمال کی کلائی پکڑ لی کہ کہیں چھڑا کر بھاگ نہ جائے۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا ”ارے یٰسین میرے لال تو کہاں تھا اب تک۔ لوگ کہتے ہیں تو فوت ہو گیا ہے خدانخواستہ مگر تو تو زندہ ہے میرے لال۔“

سائیں کریم بخش گھبرا کر بولا۔ ”یہ یٰسین نہیں ہے قطب دین۔ یٰسین کو تو نے خود قبر میں اتارا تھا۔ یہ اس کا بیٹا ہے جمال۔“

خواجہ قطب دین بے اختیار ہو کر رونے لگا۔ ”ہائے یٰسین کو میں نے خود قبر میں اتارا تھا۔ ہائے میرا لال۔ تو مجھے چھوڑ کر جنگل میں جا سویا، ہائے تو نے کچھ خیال نہ کیا کہ مجھ پاپی پر کیا گزرے گی۔ ہائے یٰسین تو نے کچھ نہ سوچا۔“

خواجہ قطب دین کی رقت بڑھ گئی۔ وہ زانوؤں پر ہاتھ مار مار کر سیاپا کرنے لگے۔ پھر انہوں نے چھاتی پیٹنی شروع کر دی۔ چپت مار مار کر منہ لال کر لیا۔ ان کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ جمال کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں بوڑھے کو کس طرح تسلی دوں۔

کریم بخش نے آہستہ سے کہا۔ ”اب اس کو ہوش نہیں کسی بات کا۔ پاگل ہو گیا ہے۔ بھلے برے کی

تمیز بھی نہیں رہی اسے۔ اب تو آیا ہے تو اسے لاہور لے جا اور پاگل خانے میں ڈال دے۔ اتنا تو کر۔"

جمال کو سائیں کریم بخش کی بات بہت بری لگی۔ خواجہ قطب دین اس کے خاندان کا بزرگ تھا۔ عزت اور دبدبے والا شخص تھا۔ اس وقت وہ اپنے ساتویں بیٹے کے گھر کے سامنے بیٹھا اپنے مرحوم بھتیجے کا ماتم کر رہا تھا جس کو اس نے اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ پتہ نہیں لوگ بوڑھوں کے ساتھ ایسی سنگدلی کا سلوک کیوں کرتے ہیں۔ لوگ اپنی اولاد کو اپنے بچوں کو روتے ہیں' کیا یہ پاگل پن ہے؟

جمال خواجہ قطب دین کو گود میں لے کر پیار کرنے لگا۔ "میاں جی خدا کی مرضی میں کسے دخل ہے۔" اس نے کہا "صبر کیجیے' حوصلہ کیجیے۔"

تھوڑی دیر کے بعد خواجہ قطب دین چپ ہو گئے۔ پھر آہستہ سے بولے "یہی وقت تھا جب ڈاکیا تیرے ابے کی چٹھی لایا تھا۔" اس نے کہا "خواجہ قطب دین تو لٹ گیا' تیرا کچھ نہ رہا۔ ہائے میں کیوں نہ مر گیا اسی وقت۔ میری باری تو لے گیا یٰسین۔" خواجہ قطب دین پھر دھاڑیں مارنے لگے۔

جمال نے انہیں سینے سے لگایا۔ ان کے ہاتھ چومے۔ خواجہ قطب دین نے کرتے کے دامن سے آنسو پونچھے۔ ناک صاف کی پھر جمال سے پوچھا۔ "پر تو کون ہے جوان؟ تجھے کبھی دیکھا نہیں۔"

"میں جمال ہوں میاں جی۔ آپ کے یٰسین کا بڑا بیٹا۔ اسلام آباد سے آیا ہوں آپ کی زیارت کے لیے۔"

"سمجھ گیا تو میرے لال کا لال ہے۔"

جمال نے کہا "جی بہت خوش ہوا آپ کو دیکھ کر۔ خدا آپ کو ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔"

"تو تو صرف مجھے ملنے کے لیے آیا ہے۔" قطب دین نے اشتیاق سے پوچھا۔ "آیا ہے تو میرا ایک کام کر دے بیٹا۔"

جمال فوراً سمجھ گیا۔ اس کی جیب میں دو سو روپے تھے۔ اس نے کہا "میاں جی' جو حکم میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔"

"مگر تو بھی نہیں کرے گا میرا کام۔" خواجہ قطب دین نے مایوس ہو کر کہا۔

"پاگل ہو گیا ہے۔" سائیں کریم بخش نے زور دے کر کہا۔ "اب تو کر دے اس کی فرمائش پوری۔ اسے پاگل خانے میں دے آ۔ میں کہتا ہوں یہ وہیں کا مال ہے۔"

جمال کو بہت غصہ آیا مگر اس نے خواجہ قطب دین کو پیار سے تھپک کر کہا "کیوں نہیں کروں گا میں آپ کا کام۔ میاں جی منہ سے کچھ بولیں تو سہی!"

"کوئی نہیں کرتا میرا کام۔ سب گالیاں دیتے ہیں مجھے۔ پاگل خانے بھیجتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا میرا دکھ!"

"مجال ہے کوئی آپ پر ٹیڑھی نظر ڈالے۔" جمال نے بے قرار ہو کر کہا۔ اس کا دل پگھل کر پانی ہو گیا۔ وہ اس کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

عین اس وقت خواجہ قطب دین کی ساتویں بہو گھر سے نکلی۔ منہ پر گھونگھٹ مگر غصے سے کھولتی ہوئی۔ اس نے جمال کو دیکھے بغیر سلام کیا' پھر قطب دین سے کہنے لگی۔

"گھر چل اب' بہت ہو چکی میاں۔"

اس نے خواجہ قطب دین کا بازو پکڑ لیا اور اسے کھینچنے لگی۔ بوڑھا بے بسی سے جمال کی طرف دیکھنے لگا۔

"میاں گھر چل اور دودھ پی۔ ہماری ناک نہ کٹوا جگ میں۔"

"ٹھہر جا لڑکی۔ میاں جی کو مجھ سے بات کرنے دے۔" جمال نے ڈانٹ کر کہا۔

بہو نے گھونگھٹ اٹھا کر کہا "مگر بھا جی آپ نہیں جانتے اس کالے منہ والے کو۔ اس نے تو ہمیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔" پھر وہ خواجہ قطب دین کو جھٹکے مار مار کر چارپائی سے اٹھانے لگی۔

جمال نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا "میاں جی کو یوں نہ کھینچ لڑکی۔"

بہو ان سنی کرتے ہوئے میاں جی کو کوسنے لگی۔ "تجھے کتے کھا جائیں میاں' تجھے موت آ جائے اور میں تیرا سیاپا کروں۔ اللہ اس کو اٹھا لے اب۔"

جمال کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس نے غصے سے کہا "مگر ہوا کیا ہے لڑکی۔ تجھے شرم نہیں آتی میاں جی کو کوسنے دیتے ہوئے۔"

"لڑکی بے قصور ہے بیٹا۔" سائیں کریم بخش بولا "اسے کچھ مت کہو۔ اس کی بڑی ہمت ہے۔ اس نے ابھی تک قطب دین کو سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ اس کی اپنی بیٹیاں تو اس سے بات بھی نہیں کرتی شرم کے مارے۔"

جمال کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس سو برس کے بوڑھے سے جسے کچھ دکھائی بھی نہیں دیتا۔ ایسی کون سی خطا سرزد ہو گئی ہے کہ سب اس کی جان کے دشمن ہو گئے ہیں۔ اس نے کہا "مگر مجھے بھی کچھ پتہ چلے۔ کیا ہوا ہے؟"

"سمجھ لو کہ خواجہ قطب دین پاگل ہو گیا ہے۔" سائیں کریم بخش نے کہا۔

"پاگل نہیں ہوا۔" بہو بولی۔ "جن ہو گیا ہے۔ بھوت بن گیا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ یہ کوئی بلا ہے جو گلے پڑ گئی ہے ہمارے۔"

"مگر...... خدا کے لیے۔" جمال نے التجا کی۔

"اب میں آپ کو کیا بتاؤں۔" بہو بولی۔ "آپ کو پتہ ہے میاں جی کی بدمعاشیوں کا۔ ساری عمر انہوں نے شراب پی' جوا کھیلا اور مرغ پلاؤ پر ہتھے مارے۔ باپ دادا کی جائیداد بیچ بیچ کر عیاشیاں کیں۔ ہم تو ابھی پیدا بھی نہ ہوئے تھے مگر آپ کو تو سب کچھ پتہ ہوگا بھا جی۔ پاکستان بننے کے بعد جب سکھ چلے گئے تو

انہوں نے شراب چھوڑ دی کیونکہ ملتی ہی نہ تھی' پھر افیون کھانے لگے۔ آخر میں اس نے اس سے بھی توبہ کر لی کیونکہ جائیداد ساری کی ساری بک چکی تھی۔ جب مجھے بیاہ کر لایا تو بھلا چنگا تھا مگر بھوکا ننگا تھا۔ جب کچھ نہ رہا تو مسجد میں دو وقت جھاڑو دینے اور نماز پڑھنے لگا۔ ہم نے سوچا شکر ہے مگر پھر اچانک اس پر خدا کی مار پڑ گئی۔ پاگل ہو گیا آخر عمر میں۔ ناک ناموس کا کچھ خیال نہ رہا اس کو۔''

''خدا کی مار کیسے پڑی؟'' جمال نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

بہو بولی ''پچھلی سردیوں میں اس نے کہا بیٹی! میرے مسوڑھوں میں درد ہوتا ہے۔ اب نور پور میں کوئی ڈاکٹر تو ہے نہیں۔ میں نے خود ہی پھٹکری میں تیل ملا کر مسوڑھوں پر مالش کر دی مگر مجھے کیا پتہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ سو برس کی عمر میں اس کے دانت نکل آئیں گے بچوں کی طرح۔ اس کے دانت نکل آئے۔ کالے بال نکل آئے آپ ہی آپ۔ پھر اس نے مسجد چھوڑ دی اور کالی بلا بن گیا اور بے شرموں اور بے حیاؤں کی طرح کہنے لگا ابھی تو میں جوان ہوں۔ میرا بگڑا ہی کیا ہے۔ میرے لیے کوئی رشتہ دیکھو۔ لو بتاؤ۔''

بہو نے ہاتھ ملے۔

''یہ میاں جی نے کہا؟'' جمال حیران ہو کر بولا ''پھر کیا ہوا؟''

''پھر کیا ہونا تھا۔'' سائیں کریم بخش مسکرا کر بولا۔

''پھر یہ راہ چلتی عورتوں کو تاڑنے لگا۔ شریف زادیوں کا راستہ روکنے لگا۔ اسے بہو بیٹی کی پہچان بھی نہ رہی۔ جسے دیکھتا اسے کہتا میرے ساتھ نکاح کر لو۔ میں تمہیں نئے کپڑے بنوا کر دوں گا۔ ہے نا پاگلوں والی بات۔''

بہو بولی ''اس کی بیٹیوں نے تو شرم کے مارے نور پور آنا چھوڑ دیا ہے۔ پر میں قسمت کی ماری کہاں جاؤں بچوں کو چھوڑ کر۔ اس کا بیٹا کہتا ہے میں کچھ کھا کے سو رہوں گا ایک دن۔ بھا جی سوچو پھر ہمارا کیا بنے گا۔''

جمال کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پھر وہ بولی ''بھا جی آپ آئے ہیں تو اسے پاگل خانے میں داخل کروا دیں۔ ہمیں ان چیزوں کا پتہ نہیں یا کسی سپاہی کو دس روپے دے کر اس کی ٹانگیں تڑوا دیں تا کہ گھر میں پڑا رہے۔ ہماری ناک نہ کٹوائے روز روز۔'' یہ کہہ کر وہ پھر میاں کو کھینچنے لگی۔ ''چل میاں اٹھ چل کر دودھ پی لے۔ چل ہمارا خانہ خراب نہ کر۔''

خواجہ قطب دین اب تک چپ چاپ کہانی سنتے رہے تھے۔ جیسے اس کا ان سے کوئی تعلق نہ ہو۔ پھر بولے ''اچھا اچھا چلتا ہوں۔ دودھ بھی پی لیتا ہوں مگر تو نے سوچا کچھ؟ کوئی رشتہ دیکھا میرے لیے؟''

''سوچا ہے۔ بہت کچھ سوچا ہے۔'' وہ جل کر بولی ''سوچا ہے تجھے پھٹے پر ڈال کر اپنے ہاتھ سے کفن پہناؤں گی جو میں اپنی مشین پر سیوں گی۔ پھر تیری میت کو گدھے پر لاد کر تجھے کسی گڑھے میں ڈالوں گی اور اس کے اوپر ایک گڈا گوبر کا ڈلواؤں گی۔ یہ سوچا ہے میں نے تو بھی سن لے میاں۔''

''سبھی مجھے قبر میں ڈالنے کی سوچتے ہیں۔ میں نے سب کی پرورش کی۔ سب کی ذمہ داریاں پوری کیں مگر سب مجھے زندہ گاڑھ دینا چاہتے ہیں۔'' میاں جی روہانسے ہو کر بولے۔

جمال کو میاں جی سے سخت ہمدردی ہو رہی تھی۔ اگرچہ اسے ان کی بہو کی اذیت کا بھی بخوبی اندازہ تھا۔ اس نے میاں جی کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے تھپتھپایا۔ میاں جی بولے ''تو ہی بتا بیٹا لیٹین کیا میں نے تیری پرورش میں کوئی کوتاہی کی؟ کوئی مجھ سے قصور سرزد ہوا؟''

''نہیں میاں جی۔ آپ نے مجھے بڑے لاڈ پیار سے پالا۔'' جمال بولا۔

''لے اب تو ہی انصاف کر۔ جو کچھ میں کہتا ہوں کیا یہ شرع شریعت کے خلاف ہے؟ کیا یہ اسلام کا حکم نہیں کہ مسلمان شادی کرے؟''

جمال بولا ''یہ تو ٹھیک ہے میاں جی۔ مگر آپ اپنے حالات دیکھیے' اپنی عمر دیکھیے۔''

''کیا خرابی ہے میرے حالات میں اور عمر کا کیا ہے۔ مرد کیا کبھی بوڑھا ہوتا ہے؟ پھر جو کچھ میں کہتا ہوں یہ خدا کا حکم ہے۔ کون ہے جو خدا کی نافرمانی کرے۔''

''کوئی نہیں جی۔'' جمال بے بسی سے بولا۔

''تو تو مان لے میری بات۔ میری اولاد ہے آخر تو سن لے۔''

میاں جی ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے۔ گویا سوچتے ہوں کہ بات کس طرح شروع کریں۔ سانس روک کر بولے ''تو میرا نکاح کرا دے بیٹا۔ اسلام آباد میں میرے لیے رشتہ ڈھونڈ۔ نور پور کی عورتیں مجھے پسند نہیں۔ اتنا سا میرا کام کر دے بیٹا۔''

جمال کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ یہ بات جتنی سنگین تھی اتنی ہی مضحکہ خیز بھی تھی مگر اس نے سادگی سے پوچھا ''مگر آپ اس عمر میں شادی کر کے کیا کریں گے میاں جی؟''

خواجہ قطب دین کو جھٹکا سا لگا۔ جیسے یہ بات پوچھنے کی نہ ہو۔ بولے ''شادی کر کے وہی کروں گا جو شادی کر کے لوگ کرتے ہیں۔ میری پچھلی اولاد ساری کی ساری حرام خور ہے۔ بدذات ہے اب میں جو اولاد پیدا کروں گا' وہ نیک اور باادب ہو گی تمہاری طرح۔''

جمال پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ سو برس کے خواجہ قطب دین کے کالے بالوں اور نئے دانتوں کا راز کیا ہے؟ سو برس کی عمر میں بوڑھے کے ہارمون پلٹا کھا گئے تھے اور اس میں جوانی کی بعض گلٹیاں عود کر آئی تھیں۔ یہ بات اس نے کتابوں میں پڑھی تھی۔ اب آنکھوں سے دیکھ لی۔

بوڑھا قطب دین بے قصور تھا۔ وہ اپنے جسم کی کیمسٹری سے مجبور تھا۔ اس کی بہو بھی سچی تھی اور چھوٹی سبے اسی شرم کی وجہ سے اس کا نام تک سننے کی روادار نہ تھی۔

قطب دین کی گلٹیاں واپس آ کر بھی اس کی بوڑھی آنکھوں کو روشن نہ کر سکیں۔ اس کے جسم کے بعض

وظیفے جاری ہو چکے تھے مگر اس کی ذہنی کیفیت اور سوجھ بوجھ پر سو برس کی بوری رکھی تھی۔ وہ اپنے بیٹے اور بہو کے سوا کسی کو پہچانتا نہ تھا۔ اسے ایک عورت کی ضرورت تھی۔ وہ سچا تھا مگر سب لوگ اسے پاگل اور بے شرم سمجھتے تھے۔ واقعی علت اور معلول کا بھید کوئی نہیں جانتا!

## واپسی

گھر واپس آ کر جمال نے جلدی جلدی کھانا کھایا۔ کپڑے تہ کر کے بیگ میں رکھے اور رخصت چاہی۔ چھوٹی بے بے' میاں جی اور بلو نے اسے بہت روکا مگر اس نے نور پور کو فوراً چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس سے زندگی کی مجہولیت دیکھی نہ جاتی تھی۔

اس نے میاں جی سے وعدہ کیا کہ میں نور پور جلد واپس آؤں گا۔ اپنے پردادا کی حویلی میں گھر بناؤں گا۔ ٹوٹے ہوئے رشتوں کو پھر جوڑوں گا مگر دراصل وہ ہاتھ چھڑا کر نور پور سے ہمیشہ کے لیے بھاگ رہا تھا۔

یہ میرا نور پور ہے! اس نے تانگے میں بیٹھتے ہوئے دل میں سوچا!

تھانے میں بڑ کے نیچے بیٹھے سپاہی تاش کھیل رہے تھے مگر جمال نے ان کی طرف نگاہ نہ کی۔ آم کے باغ کی گری ہوئی دیواروں کی اوٹ میں بنی ہوئی چنگڑوں کی جھگیاں بھی نکل گئیں۔ جمال کی آنکھیں افق پر جمی ہوئی تھیں مگر پھر اچانک نالے کا پکا پل آ گیا۔ گھوڑے نے ذرا سی ٹھوکر کھائی۔

## بملا دیوی کی لاش

تیس برس پہلے جب وہ گورداسپور سے بھاگ کر نور پور آیا تھا تو اسی جگہ شام کے دھندلکے میں بملا دیوی کی لاش پڑی تھی۔ اس کے کپڑے صاف اور بے داغ تھے۔ اس کی سینڈل خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ اس کے قریب پڑی لالہ مایا رام اور ان کے چھوٹے بھائی کی تازہ کٹی ہوئی گردنیں اسے گھور گھور کر تکنے لگیں۔ بملا دیوی کے چہرے پر اس وقت بھی زردی چھائی ہوئی تھی جب اس نے قتل ہو جانے سے کچھ ہی دیر پہلے نور پور کے ریلوے سٹیشن پر جمال کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا تھا اور پھر ساڑھی کا پلو سر پر لے لیا تھا۔

جمال نے زمین کو بڑے غور سے دیکھا جیسے وہ بملا دیوی کے خون کے دھبے ڈھونڈ رہا ہو۔

نور پور کے ہندو لٹ پٹ کر پاس کے شرنارتھی کیمپ میں پہنچ چکے تھے۔ جب وہ تیس برس پہلے نور پور میں لالی کے ساتھ پکڑے جانے پر گھبرا کر لاہور چلا گیا تھا۔

پنڈ دادنخان کی شرنارتھی گاڑی نور پور کے ریلوے سٹیشن پر کاٹی جا چکی تھی۔ ہندوؤں اور سکھوں سے لوٹے ہوئے زیور' کپڑے اور لڑکیاں نور پور کے بیت المال کے مہتموں نے قرآن شریف کا واسطہ دے کر لٹیروں اور قاتلوں سے واپس لے لی تھیں۔ جمعے کی نماز کے بعد سب نے اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی تھی۔

تیس برس پہلے جب جمال نور پور سے آخری بار نکلا تھا تو جمعے کا دن تھا۔ یہ جمعہ وہ کبھی بھول نہ سکا حالانکہ ہزاروں جمعے اس کی زندگی میں آئے اور گزر گئے تھے۔

مسجدوں میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ پاکستان بننے کے بعد لوگوں کو یکدم اپنے گناہوں کا احساس ہونے لگا تھا۔ نیکی کی ایک لہر سی چل پڑی تھی۔ شرابیوں نے شرابیں چھوڑ دی تھیں۔ جواریوں نے جوئے سے توبہ کر لی تھی۔ بے نمازیوں نے مصلّے بچھا لیے تھے۔ کچھ خدا کا خوف کچھ اپنی جان کا غم۔ نور پور والوں نے اب تک بکریوں اور کنواریوں کے سوا کسی کا خون دیکھا نہ تھا۔ تقسیم کے زمانے میں انہوں نے اتنی ڈھیر ساری لاشیں دیکھیں تو ڈر گئے۔

مقامی تھانیدار شاہ بادشاہ ذوالفقار علی شاہ کے حکم پر آوارہ اور بے روزگار جوانوں کی ٹولیاں چاروں طرف گھومنے لگی تھیں۔ ان کے ناخنوں میں انسانی خون کے چھلکے جمے ہوئے تھے۔ ان کے ٹکوؤں' بلموں' کلہاڑیوں اور چھروں کی دھاریں انسانی چربی سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ جب جمال نے آخری بار نور پور چھوڑا۔ وہ خونریزی اور لوٹ مار سے بہت آزردہ تھا مگر امن اور سلامتی تو کہیں بھی نہیں تھی۔

اچانک تانگہ رک گیا۔ جمال کو جھٹکا سا لگا۔ وہ نور پور سے نکل کر جرنیلی سڑک پر پہنچ گیا تھا۔ وہ ابھی ہوش سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا جب تانگے والے نے کہا "اسلام آباد کی بس آتی ہی ہو گی صاحب جی۔ کیا میں سوٹ کیس اتار کر سڑک کے کنارے رکھ دوں؟"

# باب 2

بچوں کو جانے کیوں سن اور سال یاد نہیں رہتے۔ کون سی بات کب ہوئی ہے۔ بچپن کب شروع ہوا' کب ختم ہوا۔

تاجی کے دودھ بلونے کی گڑگڑاہٹ اور خواجہ یٰسین کی سپاٹ اور کھردری آواز میں قرآن شریف کی تلاوت کی بھن بھن جمال کی صبح کی میٹھی نیند خراب کر رہی تھی اور یہ بھی اس کی اپنے باپ سے عمر بھر کی دوری کی ایک وجہ تھی۔ گرمیوں کی صبح کی مکھیوں نے ڈنگ مار مار کر اس کے منہ اور ماتھے میں سوراخ کر ڈالے تھے' مگر اٹھنے کو اس کا جی نہ چاہتا تھا۔ سکول اسے بہت برا لگتا تھا۔ یہ اس کی روز کی کیفیت نہ تھی اور وہ اپنے نانا کے گھر سوتا تھا مگر ملیریے نے اس کا کچومر نکال دیا۔ آنکھیں بھی دُکھ رہی تھیں' اس لیے اس کی ماں نے رات اسے اپنے گھر میں سلا لیا تھا۔

## مشترکہ خاندان

اپنے گھر کو اس نے اپنا گھر کبھی سمجھا نہ تھا۔ جب وہ بہت چھوٹا تھا اور اپنے پردادا کی حویلی میں رہتا تھا تو خاندان کا سربراہ خواجہ قطب دین تھا اور دیگر بے شمار بچوں کی طرح جن میں حاجی عارفہ اور غازی اس کے ہم عمر تھے' اسے بھی لنگر سے روٹی مل جاتی تھی جو وہ صندوقوں' سیڑھیوں' دہلیزوں اور جہاں جگہ مل جاتی وہاں بیٹھ کر کھا لیتے تھے۔ رات کو اس مشترکہ خاندان کی جوان بیٹیاں بچھائی کر دیتی تھیں اور وہ چاچا احمد دین سے پریوں کی کہانیاں سنتے سنتے دو دو تین تین کسی ایک کھاٹ پر سو جاتے تھے۔ کسی کو اپنے ماں باپ سے خصوصی تعلق نہ تھا۔

چاچا احمد دین خواجہ قطب الدین کا کزن تھا۔ اس نے عمر بھر شادی نہ کی تھی۔ وہ دن بھر کہیں غائب رہتا۔ رات کو گھر آ جاتا اور بچوں کو کہانیاں سنا کر پھر غائب ہو جاتا۔ اس زمانے میں رشتوں کے بندھن بہت وسیع اور ڈھیلے ڈھالے ہوتے تھے۔ بچے' بھینس اور رشتہ داریاں سب مشترکہ ہوتی تھیں۔ عورتیں خدمت کرتی تھیں۔ مرد حکم چلاتے تھے۔ بچوں کو بڑے ہر بات پر ڈانٹ سکتے تھے۔ ایک انسان اور دوسرے انسان میں کوئی فرق نہ ہوتا تھا۔

خواجہ یٰسین اس گھرانے کا سب سے معزز فرد تھا اور اس کی کئی وجوہات تھیں۔ پہلی یہ کہ وہ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی یتیم ہو گیا تھا اور خواجہ قطب دین خواجہ محمد دین اور ان کی بیویوں نے اسے گود لے لیا تھا۔ خواجہ قطب دین اور خواجہ محمد دین خود ان پڑھ تھے مگر تعلیم کی ان کے دل میں بہت عزت تھی۔ خواجہ یٰسین نے میٹرک پاس کر لیا اور انگریزی پڑھنے لگے تو ان کی عزت اور اہمیت اور بھی بڑھ گئی۔ پندرہ برس کی عمر میں ان کی شادی بھی ہو گئی۔

جمال کی والدہ سے خواجہ یٰسین کی شادی جمال کی ولادت سے پہلے طے ہو چکی تھی۔ جمال کا پردادا اور جمال کی پرنانی آپس میں بہن بھائی تھے اور اس زمانے میں بہنوں کو بھائیوں پر بڑا مان ہوتا تھا۔ جب جمال کی پرنانی نے سنا کہ میری بہو کا پاؤں بھاری ہے تو اس نے کہا' صمد و بھائی مجھے خدا نے نواسی دی تو وہ تیری بہو ہو گی۔ اس پر بھائی صمدو نے بتاشے منگوا کر بہن کی جھولی میں ڈال دیئے۔ یہی بتاشے آگے چل کر جمال کی ولادت کا بہانہ بن گئے۔

خواجہ یٰسین شادی کر کے گھر میں بیٹھ گئے کیونکہ خاندان کے نوجوانوں کو کمائی کی ایسی مجبوری نہ تھی۔ کاروبار چل رہے تھے۔ آٹا پیسنے کی مشین' کیکر کی چھال پیسنے کی مشین' لکڑی کاٹنے کے مشینی آرے' باسمتی چاول کی آڑھت' بھیڑوں اور بھینسوں کی خرید و فروخت اور لوہے کے سامان کی ایک دکان خاندان کی ضرورتیں پوری کرنے کے علاوہ خواجہ قطب دین کی شراب کباب کے لیے بھی کافی تھی۔ وہ میونسپل کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ ضلع کا ناظم اور علاقے کا تھانیدار ان کی سفارش مان لیا کرتا تھا۔ دھیان سنگھ شراب کی ناجائز بھٹی ان کی شہ پر کھلے عام چلاتا تھا۔ خواجہ قطب دین کہہ دیتا تو گاماں بر چھا لوٹا ہوا مال بھی واپس کر دیتا۔

خواجہ قطب دین کاروبار کم ہی کرتا تھا۔ یہ ذمہ داری خواجہ محمد دین کی تھی جو اپنے بھتیجوں کی مدد سے کام چلاتا تھا۔ خواجہ قطب دین کاروبار کے تمام اڈوں پر پھر کر شام کو ساری آمدنی وصول کر لیتا مگر گھر کا خرچ چھوڑ دیتا تھا۔ یہ بڑے بھائی کا تسلیم شدہ حق تھا۔ وہ بڑے گھر کا بڑا بیٹا تھا۔ لوگ اس کی شراب خوری پر کھل کر اعتراض نہ کرتے تھے۔ دن میں وہ آنکھیں جھکا کر چلتا۔ علاقے کی اغوا شدہ عورتوں کی واپسی اور مقامی جھگڑوں میں ثالثی کے لیے ہر حاجت مند کی نگاہ اس پر پڑتی تھی مگر رات کو نشے کی حالت میں کوئی خواجہ قطب دین سے تکرار کی جرأت نہ کرتا۔

## تاجی کنجری

جمال کے بچپن میں خواجہ قطب دین کی گھرانے میں بڑی دھونس تھی۔ پھر اس نے تاجی کے ساتھ شادی کر لی۔ تاجی ایک چھریرے بدن کی خوبصورت عورت تھی۔ اس کی پہلی شادی ہوئی تو اسے اپنا خاوند پسند نہ آیا اور اس سلسلے میں مقدمہ خواجہ قطب دین کی عدالت میں آیا۔

خواجہ قطب دین نے میاں بیوی میں صلح صفائی کی از حد کوشش کی مگر تاجی نہ مانی۔ نور پور میں خاوندوں کے گھروں سے بیویوں کے صرف جنازے نکلا کرتے تھے۔ طلاق لے کر تاجی بہت مشہور ہو گئی۔

جن عورتوں نے اسے دیکھا نہیں تھا وہ جا کر اسے دیکھنے اور حیران ہونے لگیں۔ تاجی ایک حوصلہ مند عورت تھی۔ اس نے طلاق پر شرمانے کے بجائے اس پر مان کرنا شروع کر دیا۔ عورتوں کے چلتے ہاتھ اور لمبی زبانیں پکڑنے کے خیال سے وہ کھل کر بے شرمی کی باتیں کرنے لگی۔ اس سے اس کی خوشبو محلوں محلوں پھیل گئی۔ خواجہ قطب دین کو تاجی نے بہت لبھایا۔ ایسے چھریرے بدن کی اور ایسی بے باک عورت اس نے کبھی دیکھی نہ تھی۔

پھر ایک روز اچانک تاجی اپنے باپ کے گھر سے غائب ہوگئی۔ نور پور میں کہرام مچ گیا۔ عورتوں کا خیال تھا کہ چودھویں صدی کا انجام قریب ہے۔ کوئی دم کی دیر ہے۔ عزرائیل صور پھونکے گا' سورج سوا نیزے پر آ جائے گا اور پہاڑ روئی کے گالے بن جائیں گے۔

لوگوں نے خواجہ قطب دین سے کہا ''تاجی کو تلاش کرو۔'' تاجی کے باپ اور بھائی نے اس کے قدموں میں پگڑیاں ڈال دیں۔

خواجہ قطب دین نے کہا ''انشاء اللہ! بلکہ میں اس بدکار کو تلاش کر ہی رہا ہوں۔ دنوں کا پھیر ہے ورنہ تاجی کہاں جائے گی۔ ذرا تحصیلدار کے آدمی چلے جائیں جن کی وجہ سے میں مصروف ہوں۔''

گھر میں اس نے حکم چلایا کہ تحصیلدار کے آدمی بستی کے مہمان ہیں۔ چنانچہ بھنے ہوئے گوشت' مچھلی پلاؤ اور بٹیروں کی سینیاں تحصیلدار صاحب کے لیے دو وقت جانے لگیں۔ سینیاں محمد علی نائی خود اٹھا کر مہمان خانے میں لے جایا کرتا تھا۔ خواجہ قطب دین کو رات وہیں گزارنی پڑی کیونکہ مہمانوں کو اکیلے چھوڑا نہ جا سکتا تھا۔ نور پور چھوٹی سی بستی تھی۔ اس میں کوئی ہوٹل' کوئی ریسٹورنٹ نہ تھا۔ نہ کوئی ایسی جگہ جہاں کسی شخص کی رسائی نہ ہو۔

سینیاں بازار کے جس چوبارے پر جاتی تھیں' وہ عام گزرگاہ پر واقع تھا۔ چوبارے کی کھڑکیاں دن بھر بند رہتی تھیں۔ رات کو وہاں لالٹین جلتی تھی مگر کوئی شخص تحصیلدار صاحب کے خوف سے سیڑھیاں نہ چڑھ سکتا تھا سوائے خواجہ قطب دین کے۔

کوئی دس دن اسی طرح گزر گئے۔

## راز کھل گیا

پھر لوگوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ تحصیلدار کے آدمی اتنے روز سے بند چوبارے میں کیا کرتے ہیں؟ جبکہ وہ باہر نکلتے ہی نہیں۔ پھر وہ آنکھ بچا کر اندر جھانکنے لگے۔

اس روز کے بعد مسجد صرافاں کے امام قاری صاحب نے بات کھول دی۔ اتنے دن تک راز کا سینے میں چھپانا ان کو بیمار کیے دیتا تھا۔ پھر یہ شرع کے بھی خلاف تھا۔ قاری صاحب نے عشاء کی نماز کا سلام پھیرا اور نمازیوں سے کہا کہ جو کچھ ہوا شرع کے مطابق ہوا ہے۔ میں نے تاجی کا نکاح خواجہ قطب دین کے ساتھ خود پڑھایا ہے اور بی بی نے بلا جبر و اکراہ ہاں کر دی ہے۔ اس پر غلام علی صراف اور محمد علی نائی گواہ ہوئے۔ مہر شرعی ہے مگر خواجہ قطب دین نے تاجی کو کڑوں کی ایک جوڑی بنوا کر دی ہے اور اس کے لیے لاہور سے کپڑے' پراندے' ریشمی جرابیں اور عطر حنا کی شیشی آئی ہے۔

خواجہ قطب دین کے خاندان میں کھلبلی مچ گئی۔ ان کی بڑی بیوی نے کوٹھڑی میں جا کر سیاپا کیا۔ چھوٹی بے بے بھی اس کے گلے لگ کر بہت روئی۔ لڑکیوں سے یہ بات چھپائی گئی تھی مگر سب کو معلوم تھا کہ گھر پر کوئی بہت بڑی آفت آ گئی ہے۔

خواجہ محمد دین کو بہت دکھ ہوا مگر وہ بھائی کے آگے بول نہ سکتا تھا۔ اس نے بھابھی کو تسلی دی اور کہا ''گھر کی مالک تو تم ہی ہو۔ بچوں کی ماں بھی تم ہو۔ اس کا کیا ہے یہاں۔''

''میں اس بات کو نہیں روتی محمد دین۔'' وڈی بے بے نے کہا ''اب دیکھو اس کنجری کو لے کر چوبارے میں پڑا ہے۔ چوباروں میں کیا شریف زادیاں رہتی ہیں؟''

خواجہ قطب دین نے گھر آ کر بڑی بیوی سے بھی کہا ''تمہارا اس کا کیا مقابلہ۔ گھر والی تو تو ہی ہے۔ وہ تو ایک بازاری عورت ہے۔''

''مگر تو تو خواجہ صمدو کا بیٹا ہے۔ اب کیا خواجہ کی بہوئیں چوباروں میں رہیں گی۔'' یہ کہہ کر وڈی بے بے خاندان کی عزت کی بربادی کے بین کرنے لگی۔ پھر اس نے روتے ہوئے خواجہ قطب دین سے کہا ''اس بے غیرتی کو چھوڑ اور اس کو گھر لے آ۔ اب اس کنجری نے خاک اڑائی ہے تو کل کلاں کو اولاد بھی ہوگی' پھر خلقت کیا کہے گی؟''

خواجہ محمد دین نے کہا ''اسے گھر لے آ قطب دین' یوں خاک نہ اڑا۔''

## پیا گھر آیا

وڈی بے بے بولی ''میں نے اوپر کی برساتی کی صفائی کروا دی ہے۔ اس میں رہ اس کنجری کے ساتھ۔ اپنا پکائے اپنا کھائے تماشہ نہ بنائے۔''

اس پر خواجہ محمد دین ذرا چونکے۔ یہ بات کہ اس کا بڑا بھائی الگ رہے۔ اپنا کھائے اپنا پکائے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اس خیال سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

چھوٹی بے بے نے کہا ''ہاں وہ الگ رہے۔ ہم اس بازاری عورت کے لیے پراٹھے پکانے سے تو رہے۔''

''تو بک بک نہ کر نیک بخت۔'' خواجہ محمد دین نے روہانسا ہو کر اپنی بیوی سے کہا مگر بات معقول تھی۔ مشورے کے لیے خواجہ یٰسین کو دوسرے کمرے میں بلایا گیا۔ خواجہ یٰسین کی رائے کی گھر میں بہت اہمیت تھی۔ وہ ابھی لڑکا ہی تھے مگر انگریزی بولتے تھے۔

خواجہ یٰسین بڑے دلگیر تھے۔ بڑوں کے مقابلے میں زبان کھولنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ اس نے کہا ''جی جو بڑی چاچی جی کی مرضی۔''

اس گراں قدر مشورے پر خواجہ محمد دین کی تسلی ہوگئی اور شام کو لٹھے کی چادر میں لپٹی تاجی خواجہ قطب دین کے پیچھے چھم چھم کرتی ہوئی سڑھیاں چڑھ آئی۔ خواجہ قطب دین کسی قدر نادم تھا اور مسکرا مسکرا کر باتیں کرتا تھا۔ وڈی بے بے سامنے نہ آئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بے چین ہوگیا اور کسی کو مخاطب کیے بغیر بولا ''اب یہ کہاں گئی ہے؟ آتی کیوں نہیں سامنے؟''

کسی نے خواجہ قطب دین کو جواب نہ دیا۔

تھوڑی دیر میں وڈی بے بے کی دھیمی سی آواز آئی ''کفن سی رہی ہوں تمہارا۔''

دراصل وہ خواجہ قطب دین اور تاجی کا بستر تیار کر رہی تھی۔ گھر کے تمام لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اندیشہ تھا کہ اب صحن میں بھوت ناچے گا مگر خواجہ قطب دین نے ابھی پی نہ تھی اور وہ کچھ شرمسار بھی تھے۔ پھر لجاجت سے بولے ''ادھر تو آ' بات تو سن!''

کچھ دیر سناٹا رہا۔ پھر وڈی بے بے صحن میں آ گئی۔ ''ہاں بول کیا کہتا ہے۔'' اس نے متانت سے کہا۔

''میں کچھ نہیں کہتا۔'' خواجہ قطب دین کھسیا کر بولا۔ ''میں کہتا ہوں تاجی تیری چوہڑی ہے۔ وہ تیری نوکری کرے گی' گھر کی مالک تو تو ہے۔ تجھے کس بات کا غم ہے؟''

چادر میں لپٹی ہوئی تاجی نے چمک کر پہلو بدلا مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔ خواجہ محمد دین نے ٹھنڈی سانس لی۔ چھوٹی بے بے نے بکل درست کی۔ جمال کی والدہ سر جھکائے منہ پر گھونگھٹ ڈالے اسی طرح گم صم بیٹھی رہی۔ خواجہ یٰسین پریشان ہو کر انگلیوں پر انگوٹھا پھیرنے لگے۔

''مجھے نہیں کسی بات کا غم۔'' وڈی بے بے بولی ''میں کہتی ہوں تو خاک نہ اُڑا۔ اب شریفوں کی طرح گھر میں رہ اور اس کنجری کو سنبھال کر رکھ۔ یہ بھی تو خواجہ صمدو کی بہو ہے آخر۔ جس طرح تو چاہے گی اسی طرح ہوگا۔''

تاجی نے زور سے پیر زمین پر مارا۔ خواجہ قطب دین نے اسے ڈانٹا ''آرام سے بیٹھ کنجری!''

کنجری آرام سے بیٹھ گئی۔

جب خواجہ قطب دین اور تاجی برساتی میں چلے گئے تو گھر کی باقی عورتوں نے کان دروازے سے لگا لیے۔ وہ دیر تک خواجہ قطب دین کے دھیمے اور تاجی کے تیز اور کھنکتے ہوئے قہقہے سنتی رہیں۔ اس رات خواجہ قطب دین نے مٹھا مالٹے کا پوا گھر ہی میں پیا۔

اس رات کے بعد خواجہ قطب دین کا مشترکہ خاندانی نظام ٹوٹنا شروع ہوگیا۔ رسیاں کھل کر اِدھر اُدھر الجھنے اور بکھرنے لگیں۔ یہ شکست و ریخت جذباتی تھی۔ اقتصادی طور پر گھرانے کی سالمیت میں ابھی کوئی دراڑ نہ آئی تھی۔ خواجہ قطب دین اب بھی سربراہ تھا۔ وہ اب بھی تمام کاروبار کی آمدنی وصول کرتا اور اب بھی خاندان کی روزانہ کی ضروریات عورتوں بچوں کے گرمی سردی کے کپڑے' سکول کی فیسیں اور کتابیں' پھل اور اناج اس کی ذمہ داریاں تھیں۔

خواجہ قطب دین ایک خوش خوراک اور خوش پوشاک آدمی تھا۔ تاجی کھانا پکانے میں یکتا تھی۔ مرغی بھوننے اور پلاؤ دم کرنے میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا اور اس بات کو وڈی بے بے بھی مانتی تھی اور انگلیاں چاٹتے ہوئے کہتی ''کنجری کا پکوان تو راجوں' مہاراجوں کے لائق ہے۔''

پھر اس کے رت جگے بھی خواجہ قطب دین کی کمزوری بن گئے۔ لذت بہم پہنچانے کے سارے ہی گُن تاجی کو ازبر تھے۔

تاجی نے وڈی بے بے کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ وہ اس سے ساری عمر خم کھاتی رہی کیونکہ اس کی سماجی حالت وڈی بے بے کے مقابلے میں کمزور تھی۔ چھوٹی بے بے سے اس کے تعلقات برابر کے تھے لیکن جمال کی والدہ سے اس کی دوستی ہوگئی۔ خواجہ محمد دین تاجی سے براہ راست مخاطب نہ ہوتا تھا۔ خواجہ یٰسین اس کا احترام کرتے تھے۔ گھر کی کنواری لڑکیاں اور لڑکے بالے اس کے گرویدہ تھے۔ وہ آوارہ ہوا کا ایک بگولہ تھی جو آنگن میں ناچتی پھرتی تھی اور یہ بات جوان لڑکیوں کو بہت اچھی لگتی تھی۔

تاجی کو معلوم تھا کہ گھر کے بڑے دل سے اس کی عزت نہیں کرتے مگر خواجہ قطب دین کو پلو سے باندھ کر وہ بے فکر ہوگئی اور اس نے اپنا کنجری ہونا قبول کر لیا۔ وہ بات بات پر کہتی ''آج کا پلاؤ کنجری کو خود پسند نہیں آیا۔ کنجری کو نیند آ رہی ہے۔ دیکھو آج کنجری کیسی لگ رہی ہے؟''

وہ دیدے مٹکاتی' جھوم جھوم کر کولہے گھما گھما کر ننگے پاؤں اُچک اُچک کر چلتی تاکہ لوگ اس کی گوری جلد کو دیکھیں اور اس کے بارے میں سوچیں۔ وہ بڑے بڑے قہقہے مار کر مردوں کو متوجہ کرتی۔ یہ اس کی بغاوت کا ایک روپ تھا۔ وہ معاشرے کے پرزے پرزے کر دینے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ ہم عمر اور کچھ بڑی کچھ چھوٹی عورتوں میں بیٹھ کر اگر وہ شادی شدہ ہوں تو وہ بے تکلفی اور روانی سے اپنے جسم کے راز بیان کرتی اور لذت بھری کہانیاں سناتی۔ محلے کی عورتیں گھنٹوں اس کی باتیں سنتیں اور واپس جا کر اس کی بے شرمی کے قصے سناتیں مگر اگلے روز پھر اس کی طرف کھنچی چلی آتیں۔

## گریٹ ڈپریشن

خواجہ قطب دین کا دوہرا نشہ ایک دن اچانک اتر گیا۔ امریکی اقتصادی بحران کی وجہ سے کلکتے والے صاحب نے چمڑے کی خرید بند کر دی۔ اس پر لاہور والے آڑھتی میاں صاحب دیوالیے ہو گئے۔ حالانکہ مال ان کے گوداموں میں بھرا پڑا تھا۔ نور پور کے خواجہ قطب دین کی تو بساط ہی کیا تھی۔ ان کو چکر آ گیا۔ اناج بوریوں میں پڑا پڑا سڑنے لگا۔ لوہے کی دکان بند ہوگئی۔ آٹے کی چکی نے ہونکنا چھوڑ دیا۔ بھیڑوں کے گلے آوارہ ہو گئے۔ کیکر کے درخت کھڑے کھڑے سوکھنے لگے۔ کسی چھال اور کسی کھال کی اب کوئی قیمت نہ رہی تھی۔

نور پور کے بہت سے نوجوان ریلوے میں ملازم تھے۔ ان کو بلا تنخواہ چھٹی مل گئی۔ جلتے چولہے بجھ گئے۔ بنتے مکان رک گئے۔ بہتے پانی بند ہو گئے۔ کھیت اجڑ گئے۔ کسان جو مالیہ نہ دے سکتے تھے فصلیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ساہوکاروں نے ٹکوں میں مربعے ہتھیا لیے اور کوڑیوں میں دودھیلی بھینسیں اور جوان عورتیں گھروں میں ڈال لیں۔ کوئی کسی کو قرضہ نہ دیتا تھا۔ ساہوکار صرف حویلیاں رہن رکھتے تھے یا زیورات۔

پھر انگریزوں نے ہندوستان میں پونڈ چلانے شروع کر دیئے۔ سکے کی شکل میں کم نوٹ کی شکل میں زیادہ۔ پونڈ کے چلنے سے سونے کا بھاؤ بڑھ گیا تو لوگوں نے خوشی خوشی زیورات بیچنے شروع کر دیئے کیونکہ آمدنی کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا تھا۔

پونڈ کے ساتھ اپنا ہندوستانی روپیہ بھی چلتا تھا اور پونڈ کی ریزگاری دیسی روپے ہی میں مل جاتی تھی۔

یہ لوگوں کو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ سونا مہنگا ہونے سے ہر چیز کے بھاؤ چڑھ گئے ہیں اور زیور بیچ کر انہیں جو کچھ ملا وہ مہنگائی کی نذر ہو گیا مگر یہ بات کسی کو معلوم نہ ہوئی کہ پونڈ کے ہندوستانی کرنسی بن جانے سے انگریزوں نے اربوں روپے کا سونا خرید کر بینک آف انگلینڈ کو دیوالیہ ہونے سے بچا لیا اور جب ان کی مالی حالت مستحکم ہو گئی تو انہوں نے پونڈ کرنسی واپس لے لی اور کاغذ کے کھڑکھڑاتے نوٹ ہندوستانی روپے میں واپس کر دیئے۔ یوں ٹنوں کے حساب سے ہندوستان کا سونا انگلینڈ چلا گیا۔

حالات سنبھالے نہ سنبھلتے تھے۔ خواجہ قطب دین بزرگ خاندان کی حیثیت سے بہت سراسیمہ ہوئے۔ انہوں نے ایک دن خواجہ محمد دین سے کہا ''کاروبار سارے جگ میں مندا ہے۔ باہر والی حویلی ساون مل ساہوکار ڈھائی ہزار میں لینے پر تیار ہے۔ تم کہو تو بیچ دوں۔''

خواجہ محمد دین جس پر گھر کی براہ راست ذمہ داری نہ تھی' مندے سے بخوبی واقف تھا مگر اس نے کہا' ''میں باپ کی جائیداد کو بکتے نہیں دیکھ سکتا۔''

خواجہ یٰسین ایف سی کالج سے فارغ التحصیل ہو کر ان دنوں نور پور میں سکول ماسٹر تھے۔ وہ خاموش رہے۔ جمال کی والدہ نظریں جھکا کر نیچے دیکھتی رہی۔ چھوٹی بے بے کا رنگ زرد ہو گیا۔

خواجہ محمد دین نے کہا ''ہمارا فرض ہے کہ ہم ماں باپ کی جائیداد میں اضافہ کریں۔ بیچ بیچ کر کھائیں نہیں۔ دنیا کیا کہے گی اور کل کو بچے کہاں جائیں گے۔ یہ بھی سوچا ہے تو نے قطب دین؟''

خواجہ محمد دین آج تک بڑے بھائی کے آگے کبھی بولا نہ تھا' آج نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔

## ہاں میں کنجری ہوں

خواجہ قطب دین کو یہ بات کچھ عجیب لگی مگر اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سارے کاروبار بند کیوں ہو گئے ہیں جبکہ سارے پیٹ خالی ہیں۔ تاجی مرغ پلاؤ پکانا نہیں بھولی۔ شراب کے پڑے میں اسی طرح نشہ باقی ہے اور رات دن اسی طرح ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ پھر کیوں سارا جگ بھوکا ننگا ہو رہا ہے۔

وہ اقتصادیات کو نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے کہا ''محمد دین مجھ سے نہیں ہوتا گھر کا انتظام۔ میں کدھر سے خرچہ لاؤں' آخر تو حویلی بھی بیچنے نہیں دیتا۔''

خواجہ محمد دین بولا ''اپنا خرچہ گھٹا' شراب چھوڑ' دال روٹی کھا اور اس کو سمجھا۔''

تاجی پاس ہی بیٹھی تھی' بولی ''میں کیا کھاتی ہوں تمہاری کمائی میں سے۔ اپنے بھائی کو سمجھاؤ مجھے کیا ملا ہے اس کے گھر میں۔ اس سے تو اچھا تھا میں کوٹھے پر بیٹھ جاتی۔''

''چپ کر کنجری۔'' خواجہ قطب دین نے اسے ڈانٹا۔ تاجی نے دوپٹہ اتار پھینکا اور صحن میں ناچنے اور باہیں چلانے لگی۔ ''ہاں میں کنجری ہوں' بازار میں بیٹھنے والی۔ اس سے پوچھ محمد دین مجھے کیوں لایا تھا۔ شریفوں کے گھر میں جہاں روٹیاں گنی جاتی ہیں۔ اس سے پوچھ یہ شراب کے بغیر سو کیوں نہیں سکتا۔ اس سے پوچھ جوا کیوں کھیلتا ہے۔ اس سے پوچھ محمد دین مجھ سے بات نہ کر میں تو کنجری ہوں۔''

قطب دین نے اس کی چوٹی پکڑ کر اسے تھپڑ مارا ''حرامزادی کو شرم نہیں آتی۔''

تاجی رونے اور چھاتی پیٹنے لگی۔ پھر اس نے اپنی قمیص پھاڑ ڈالی۔ اس کے گورے گورے پستان ننگے ہو گئے۔

چھوٹی بے بے نے اٹھ کر اس پر چادر ڈال دی اور اسے کوٹھڑی میں چھوڑ آئی مگر اس کے بین باہر تک سنائی دیتے رہے۔

خواجہ قطب دین کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ اس نے کہا ''محمد دین تو بڑا ہے' تو سنبھال لے گھر کو۔''

یہ سن کر خواجہ محمد دین بہت آزردہ ہو کر بولا ''میں کیوں سنبھالوں تیرے ہوتے ہوئے؟ اللہ تجھے ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ میں تو اتنا ہی کہتا ہوں کہ تو اپنا خرچ گھٹا' ہم سب کا بھی گھٹا دے' شراب کباب سے توبہ کر۔''

## اپنا اپنا گھر

مگر خواجہ قطب دین شراب کباب کے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں ندامت سے بھر آئیں۔ پھر گھر کی بڑی عورتیں بولنے لگیں۔ آہوں اور آنسوؤں میں یہ فیصلہ ہوا کہ چونکہ قطب دین اپنا خرچ گھٹا نہیں سکتا اس لیے گھرانے کے لوگ علیحدہ ہو جائیں۔ مرد اپنی اپنی فکر کریں۔ عورتیں اپنے اپنے چولہے اور بچے سنبھالیں اور اپنے اپنے اخراجات کو اپنے اپنے وسائل سے پورا کریں۔ گھرانے کی جائیداد کو بچانے کے لیے اسے تقسیم کر لیا جائے۔

خواجہ محمد دین کی جائیداد سے نفرت کی ابتدا وہیں سے ہوئی۔ اس نے سوچا کہ اگر خواجہ صمد کوئی

جائیداد نہ چھوڑتے تو قطب دین باپ کی وراثت کے زور پر حلوے مانڈے نہ اڑاتا۔ کام کاج سے جی نہ چراتا اور کما کے کھاتا۔ اب جائیداد نے خاندان کے بیچ خون کی دھار کھینچ دی تھی۔ دیا ٹمٹما رہا تھا اور رات ڈھل رہی تھی۔ اس ٹمٹماتے چراغ کو جس میں تیل ختم ہو رہا تھا' بچانے کے خیال سے خواجہ محمد دین نے جائیداد اور گھرانے کی تقسیم کی منظوری دے دی۔

جائیداد کی تقسیم کے لیے وہ کسی عدالت میں نہیں گئے۔ برادری کے بزرگوں نے افراد خانہ کے حساب سے مکانوں اور دکانوں کی دھاریں تول کر زمین پر رکھ دیں۔ ایک ایک دھارن سب نے اٹھالی۔ اس روز گھر میں موت کا سماں تھا۔ کوئی کسی سے بات نہ کرتا تھا' کسی چولہے میں آگ نہ جلی۔ عورتیں منہ پر پلو ڈال کر چپکے چپکے روتی رہیں۔ بچے سہم گئے۔ جائیداد تقسیم ہو گئی۔ خواجہ قطب دین کو بھی برساتی چھوڑنی پڑی۔ وہ اپنے حصے کے مکان میں جا رہا تھا۔ اس کے گال آنسوؤں سے تر تھے۔ تاجی ٹک ٹک کر چل رہی تھی۔

## صبح سہانی

خواجہ یٰسین کو وہ تین منزلہ کوٹھڑیاں ملی تھیں جن کی چھت پر جمال ملیریے اور آنکھیں دکھنے کی وجہ سے پڑا سوتا تھا۔ صبح کی فرحت بخش خنکی میں جاگنے کو اس کا جی نہ چاہتا تھا۔ مکھیاں اس کے گالوں میں سوئیاں چبھو رہی تھیں۔ خواجہ یٰسین اپنی سپاٹ اور بے سری آواز میں قرآن شریف کی تلاوت کر رہے تھے۔ بھن بھن بھن بھن۔ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ جمال کے لیے جاگنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں سکول کی گھنٹی بجنے لگی اور خواجہ یٰسین تلاوت سے فارغ ہو کر اسے للکارنے لگے۔ ''اٹھ اوئے جمال۔ سورج سر پر آ پہنچا ہے۔''

جمال کی والدہ نماز نہ پڑھتی تھی۔ اسے بھی نور کے تڑکے گہری نیند آتی تھی مگر اس کو بھی اٹھنا پڑتا تھا کیونکہ اسے خواجہ یٰسین کو ناشتہ دینا ہوتا تھا۔

باپ کا کڑکا سن کر جمال اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی چپکی ہوئی آنکھیں کھلتی نہ تھیں۔ وہ راستہ ٹٹولتا ہوا نلکے پر جا کر آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دینے گا۔

شریف جو خواجہ قطب دین کا بیٹا اور عارف ڈاکو بستے لیے تیار کھڑے تھے۔ جمال اور وہ دونوں گھر سے اکٹھے نکلے۔ تینوں نے کچھ کھایا نہ تھا۔ سکول اتنی سویرے لگ جاتا تھا کہ کسی کو کچھ کھانے کی مہلت نہ ملتی تھی۔

سکول سے نور پور کے مسلمانوں کو بڑی عقیدت تھی کیونکہ یہ انہوں نے اپنی گرہ سے قائم کیا تھا۔ شدھی کے زمانے سے قبل نور پور میں ایک ہائی سکول تھا جس کے ناظم ہندو ساہوکار تھے مگر مسلمان بچے بھی اس میں پڑھتے تھے۔ شدھی کے زمانے میں آریہ سماجی پنڈت گاؤں گاؤں پھرنے اور ہندوؤں کو رام راجیہ کے قصے سنانے لگے۔ تان اس بات پر ٹوٹتی کہ مسلمان ملیچھ ہیں۔ ان کو ہندو بناؤ کیونکہ ہندوستان ہندوؤں کا وطن ہے۔

نور پور کے ساہوکار امن پسند تھے۔ ان کو جاگیروں کی آمدنی اور سود کی کمائی نے بے حرکت بنا دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ نور پور کی زندگی میں کسی بھی طرح کی کوئی تبدیلی آئے مگر وہ اتنے ساکت اور جامد ہو چکے تھے کہ آریہ سماجی پنڈتوں اور جٹا دھاری سادھوؤں کے آگے ان کو بولنے کا یارا نہ ہوا۔

آریہ سماجیوں کی سناتن دھرمیوں سے ٹھن گئی مگر جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا دونوں کے رویئے ایک سے تھے۔ سکول میں گیتا کا پاٹھ ہونے لگا تھا۔ مسلمانوں کو ہندوؤں سے سخت نفرت تھی مگر اس کی بنیاد ہندو ساہوکاروں کا مسلمانوں پر مالیاتی غلبہ تھا۔ بڑے زمیندار بھی وہی تھے اور بڑے دکاندار بھی وہی۔ اس اقتصادی نفرت نے مذہب میں پناہ لے لی۔ آریہ سماجیوں کے مقابلے میں مولوی فیض اللہ عطار نے سیالکوٹ اور لاہور سے مناظر بلوا لیے۔ ہندوؤں نے فیصلہ کیا کہ وہ مسلمانوں کی دکان سے سودا نہ خریدیں گے۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ہندوؤں کے سکول میں نہیں پڑھیں گے۔

مولوی فیض اللہ کی انجمن خادمانِ اسلام نے پیر جھاڑو شاہ کی خانقاہ سے ملحقہ زمین پر قبضہ کر لیا۔ مجاوروں کو بھنگ کی کاشت کے لیے جتنی زمین درکار تھی' یہ بہر حال اس سے فاضل تھی۔ لوگوں نے سکول کے لیے روپیہ دھیلی کا چندہ فراخدلی سے دیا۔ عورتوں نے آٹے کی مٹھیاں سکول کے لیے وقف کر دیں۔ نور پور میں میونسپل کمیٹی بن چکی تھی۔ رسالدار صاحب جنگِ عظیم کے بعد دو مربعے جاگیر پا کر گھر بیٹھے مکھیاں مارا کرتے تھے۔ اب انہوں نے سوچا کہ الیکشن لڑیں۔ انہوں نے مسلمان معززین کا جلسہ بلایا اور سکول کے دو کمروں کے لیے اینٹوں کی چنائی شروع کرا دی۔ خواجہ قطب دین اور شیخ اکرام اللہ بھی الیکشن میں امیدوار تھے۔ انہوں نے بھی ایک ایک کمرے کا وعدہ کر لیا۔ پھر سب امیدوار لاہور چلے گئے تا کہ اپنے اپنے نام کی سنگِ مرمر کی تختیاں تیار کروا لیں جو ان کے خرچ سے بنے سکول کے کمروں کے باہر نصب ہوں۔

خواجہ قطب دین اپنی مجبوریوں پر قابو نہ پا سکتے تھے۔ انہوں نے صرف تختی ہی بنوائی۔ کمرہ نہ بنوا سکے۔

## مسلمانوں کا سکول

ہوتے ہوتے مسلمانوں نے اسلامیہ ہائی سکول کھول لیا۔ قلیل تنخواہوں پر کچھ ماسٹر بھی مہیا ہو گئے۔

ماشکی اور چوہڑے گلی کی نالی دھو رہے تھے۔ جب جمال اور عارف ڈاکو سکول کو چلے۔ گندے پانی کے چھینٹے ان پر بھی پڑے مگر انہوں نے پرواہ نہ کی۔ کنوئیں کی منڈیر پر قدم جما کر ماشکی بوکے کھینچ رہے تھے۔ مشکیں زمین پر کالی کتیوں کی طرح لیٹی پانی پی پی کر پیٹ پھیلا رہی تھیں۔

کنوئیں کے آگے فدا محمد کا چوبارہ تھا۔ انگریزی فدا محمد کی زبان پر چڑھتی نہ تھی اور سکول میں اسے روز مار پڑتی تھی۔ حالانکہ وہ سید زادہ تھا۔

جمال کو فدا محمد میں کوئی برائی نظر نہ آتی تھی۔ رہا اس کے تائے کا جرسی ہونا تو جمال کا بزرگ خاندان بھی شراب کا عادی تھا اور پی کر شہر بھر کو گالیاں دیتا تھا۔ جمال کی فدا محمد سے دوستی ہو گئی۔

بہت سارے بچے سکول کی طرف بھاگ رہے تھے۔ پہلی گھنٹی بج چکی تھی اور بچوں کو دس منٹ کے

اندر اندر پون میل کے فاصلے پر سکول پہنچنا تھا۔ وہ فدا محمد کے چوبارے تک پہنچا تو فدا محمد کی آواز آئی "جامی رُک جا ذرا۔" جمال نے اس کی آواز سن لی مگر وہ رکا نہیں۔ تھوڑی دیر میں فدا محمد اس سے آن ملا۔ "حساب کا کام کرلیا؟" اس نے جمال سے پوچھا۔

"نہیں یار۔"

"انگریزی تو تمہیں آتی ہے اس کا کام تو کرلیا ہوگا؟"

"ہاں۔ سپیلنگ یاد کرنے تھے کر لیے۔"

"مجھے تو آج بڑی مار پڑے گی۔" فدا محمد نے اداس ہو کر کہا۔

"مجھے بھی۔" جمال بولا "میرا ابا بہت مارے گا۔ مجھے جغرافیہ نہیں آتا۔"

"ہاں یار تیرا ابا بہت مارتا ہے۔ وہ تیری ماں سے ڈرتا نہیں۔"

"بالکل نہیں۔ میں تو اپنی ماں سے بھی ڈرتا ہوں۔"

"شکر ہے میری ماں نہیں اور میرا باپ بھی شیخوپورہ میں رہتا ہے۔ سنا ہے اس نے وہاں شادی کر لی ہے۔"

"پھر تمہارے سوتیلے بہن بھائی بھی ہوں گے۔"

"ہوں گے تو انہیں مارتا بھی ہوگا۔" فدا محمد نے کہا۔

بھاگتے ہوئے دونوں شہر کے بڑے دروازے سے نکل گئے۔ کھیتوں کی ہریالی اور روڑی کے ڈھیروں کے پیچھے سکول کی عمارت صاف نظر آ رہی تھی۔

"مگر یار تیرا ابا اتنا مارتا کیوں ہے؟ ماسٹر نصر اللہ تو اپنے بیٹے کو کبھی نہیں مارتا بلکہ اسے امتحان کے سوال بھی بتا دیتا ہے۔"

"ماسٹر نصر اللہ کی بیوی بڑی زبردست ہے اور گوری چٹی بھی ہے اس لیے۔"

"میں نے سنا ہے کہ وہ اس سے گھر کے کپڑے بھی دھلواتی ہے۔"

"میں نے بھی سنا ہے۔"

"تیری ماں تیرے باپ سے کپڑے نہیں دھلواتی؟"

"کبھی نہیں۔ میرے ابا سے سب ڈرتے ہیں۔"

"یاں یار تیرا ابا تجھے بھی نہیں چھوڑتا اور مجھے بھی نہیں چھوڑتا۔ پر مجھے تو سبھی ماسٹر مارتے ہیں۔ ماسٹر نصر اللہ تیرا لحاظ بھی کر جاتا ہے۔ کبھی کبھی مگر مجھے کبھی نہیں چھوڑتا۔"

"کبھی نہیں۔ میں اس کا کام کر کے جاتا ہوں۔"

"کام تو میں بھی کر کے جاتا ہوں۔ پر وہ میرا لحاظ نہیں کرتا۔ مجھے تو ٹھیک سے کوئی سبق بھی نہیں پڑھاتا۔ ہم ذرا غریب ہیں ناں اس لیے۔"

"نہیں یار اس میں غریب امیر کا کیا سوال۔"

"سوال ہے نا! پر تمہیں نہیں پتہ۔ تم غریب نہیں ہوناں۔"

"ہم غریب ہیں۔ بہت غریب ہیں فدا محمد۔"

"تم غریب نہیں ہو۔ تمہاری شکل بھی غریبوں جیسی نہیں۔"

کچھ دیر وہ یونہی بھاگتے رہے۔

اچانک فدا محمد بولا "ایک دن میں ماسٹر نصر اللہ صاحب کے بیٹے کی دال نکالوں گا۔ اسے خوب ماروں گا۔ اس کا باپ اسے کبھی ہاتھ نہیں لگاتا اس لیے۔"

"مگر اس کا کیا قصور فدا محمد؟"

"اس کا قصور ہے بس مگر یار تیرے باپ میں ایک بات بہت اچھی ہے۔ وہ تمہیں بھی برابر مارتا ہے لحاظ نہیں کرتا۔ یہ ہوئی ناں انصاف کی بات!"

جمال سوچا کرتا تھا کہ میرا باپ مجھے اتنی شدت سے کیوں مارتا ہے اور میری ماں مجھے بچانے کی کبھی کوشش کیوں نہیں کرتی مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔

اتنے میں دونوں سکول کی سرحد کے اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے بستے کونے میں رکھ دیئے اور دعا میں شامل ہو گئے۔ "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری!"

بچے یہ دعا طوطے کی طرح دہراتے تھے۔ ان کی کوئی تمنا لب پر آ سکتی ہی نہ تھی۔

دعا کے بعد کھلے میدان میں پریڈ ہوتی۔ ماسٹر غلام محمد ڈرل ماسٹر نے بچوں کو میدان میں بھگایا۔ پریڈ کے بعد میاں عیدا سپارے کھلوا کر بیٹھ گئے اور بچے سر ہلا ہلا کر عربی پڑھنے لگے۔ ان کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ قرآن شریف میں کیا لکھا ہے مگر قرآن شریف کا ان کے دلوں میں بہت احترام تھا۔ نماز سے ان کی جان جاتی تھی۔ خدا ان کے نزدیک ایک ڈراوٗنی چیز تھا جو گنہگاروں کو آگ میں جلانے کے لیے کرسی لگا کر بیٹھا تھا۔

میاں عیدا قرآن شریف پڑھانے میں بڑے مستعد تھے۔ انہیں یہ بابرکت کتاب حفظ تھی۔ چوبیس گھنٹے میں غالباً یہی ایک وقت ہوتا جب وہ بھول جاتے تھے کہ مجھے شام کو ہر بچے کے گھر جا کر روٹی مانگنی اور ذلیل ہونا ہے۔ ان کی ضروریات دو چار ہی گھروں سے پوری ہو جاتی تھیں مگر وہ ہر گھر پہ دستک دینے پر مجبور تھے۔ اس میں میاں عیدا کی بوڑھی اور سخت گیر ماں کا بھی کچھ فائدہ تھا۔ وہ فالتو روٹیاں سکھا کر ان کا بستی کے گوالوں سے دودھ کا تبالہ کر لیتی تھیں۔

میاں عیدا ہاتھ میں کیکر کی ہری سونٹی رکھتے تھے اور جس کو چاہتے تھے اسے پیٹ دیتے تھے اور اس پر نور پور والے ان سے بہت خوش تھے کیونکہ ان کے نزدیک بچوں کو پیٹنا ہی ان کی تربیت کرنا ہے مگر میاں عیدا ہر

بچے پر توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ جمال اور فدا محمد جان بوجھ کر پیچھے بیٹھتے تھے تاکہ میاں عیدا کی پرسش احوال سے بچ جائیں۔ جمال سر ہلا ہلا کر سبق دہراتا۔ فدا محمد سر جھکا کر گٹھڑی سی بن جاتا اور جمال کی کاپی سے انگریزی کا کام نقل کرتا۔

قرآن شریف کی کلاس کے بعد انگریزی' حساب' فارسی' اردو وجغرافیہ وغیرہ۔ دوسری میں انگریزی کلاس کے بعد انہیں آدھی چھٹی ہو جاتی۔ گھنٹی بجتے ہی بچے گھروں کو بھاگتے۔ انہیں نصف گھنٹے میں ناشتہ کھا کر واپس آنا پڑتا تھا مگر جمال کو ملیریا نہ ہوتا تو اس کی ماں اس کے لیے پراٹھا پکا کر تیار رکھتی۔ دو چار منٹ میں وہ بڑے بڑے لقمے نگل کر واپس بھاگتا تو اس کی بکھیوں میں درد ہونے لگتا۔

اس روز جب جمال اور فدا محمد ناشتہ کھانے کے بعد سکول کی طرف بھاگ رہے تھے تو پیچھے سے مشتاق کی آواز آئی۔ ''جامی' فدا میں بھی آیا۔''

مشتاق جمال کا ماموں تھا۔ اس سے چار برس بڑا اس کے منہ پر دہی کی پھٹکی لگی ہوئی تھی۔ وہ الجھے ہوئے بالوں والا ایک خوبصورت لڑکا تھا مگر کپتے کی طرح پھولا ہوا۔ اس کے گال آٹے کے پیڑے کی طرح گول تھے۔ وہ تھانیدار کا بیٹا تھا۔ باپ کے سامنے اس کی گھگھی بندھی رہتی تھی مگر چھوٹوں پر وہ خود اچھا خاصا تھانیدار تھا۔ باپ نے اسے چھروں والی بندوق لے کر دی ہوئی تھی۔ جس سے وہ چڑیوں' کبوتروں اور چھت سے چمٹی ہوئی چھپکلیوں کی روحیں قبض کرتا۔ شہر کے لڑکوں میں اس کی بڑی عزت تھی۔ ماسٹر بھی اس کا لحاظ کرتے تھے کیونکہ اس کی حویلی بڑی تھی اور وہ پڑھائی میں بھی ایسا برا نہ تھا۔

جمال اور فدا محمد رک گئے۔

مشتاق نے کہا ''چلو آج سکول نہیں جاتے۔ چڑیاں مارتے ہیں۔''

فدا محمد نے کہا ''بہت اچھا۔ کیوں جامی؟''

جمال نے کہا ''نہیں بھائی۔ میرا ابا مارے گا۔'' یہ کہہ کر وہ بھاگنے لگا۔ تھوڑی دیر میں فدا محمد اور مشتاق بھی اس کے پیچھے بھاگنے لگے مگر جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں یہ بھی نہ آتا تھا کہ اللہ میاں ہر وقت گھڑی سامنے کیوں رکھتے ہیں۔ دو چار منٹ کی رعایت کیوں نہیں دے دیتے۔

ماسٹر صاحب نے کہا ''تمہیں پانچ پانچ بید مارے جائیں گے کیونکہ تم دیر میں پہنچے مگر چاہو تو پانچ پانچ ٹوکریاں مٹی کی اٹھا کر جوہڑ میں ڈالو تاکہ سکول کی گراؤنڈ وسیع ہو جائے۔''

مٹی کی ٹوکریاں اٹھانا بھی ایک پر لطف کام تھا۔ اس میں کھلی فضا کا لطف بھی شامل تھا۔

دیہاتی لڑکے بستی کے لڑکوں سے بڑے مرعوب تھے اور ان کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ وہ ان کی خوشامدیں کرتے تھے کہ کسی طرح ان کو انگریزی کا کوئی لفظ بتا دیں۔

چھٹی کے بعد جمال کو خواجہ یٹیین کے لیے بادام رگڑ کر سردائی تیار کرنی پڑتی' پھر بھینس کے لیے گوتاوہ کرنا پڑتا۔ سکول کے سوال حل کرنے پڑتے۔

ان کاموں سے فارغ ہو کر وہ پھر بھاگتا۔ اسے نور پور سے دو میل دور جا کر جنگل میں ہاکی کھیلنی پڑتی۔ وہاں حاضری لگتی تھی اور غیر حاضر کو مار پڑتی تھی۔ سکول کے لڑکے جوگندر سنگھ سے بہت رشک کرتے تھے کیونکہ جوگندر سنگھ کو نماز اور ہاکی دونوں کی رخصت تھی۔

## جوگندر سنگھ

جوگندر سنگھ اسلامیہ ہائی سکول کا واحد غیر مسلم طالب علم تھا۔ وہ ہندوؤں کے علاقے میں رہتا تھا مگر مسلمانوں کے ہاں پڑھتا تھا۔ بستی کے ہندوؤں نے اس کے دادا سردار دساکھا سنگھ پر ہر طرح کا دباؤ ڈالا کہ وہ اپنے پوتے کو مسلمانوں کے سکول میں داخل نہ کروائے۔ دساکھا سنگھ ایک ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر تھا۔ کسی کی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ دن بھر وہ ٹھیکے کی دکان میں بیٹھ کر شراب پیتا اور فارسی کے شعر پڑھتا۔ اسے شہر کے لوگوں سے بہت محبت تھی۔ وہ تمام بچوں کو کیا ہندو' کیا مسلمان ایک جیسا جانتا تھا۔ اپنے پوتے جوگندر سنگھ کو وہ بہت ہی چاہتا تھا۔ آریہ سماجی پنڈتوں اور سادھوؤں کے مناظرے اسے بہت برے لگتے تھے۔ اس نے اس رسم کی بہت مخالفت کی مگر کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔

پچھلی بیساکھی پر اس نے بہت شراب پی۔ پھر وہ اپنے پوتے جوگندر سنگھ کی انگلی پکڑ کر جو نشے میں لڑکھڑا رہا تھا' چوک میں بھنگڑا مارنے لگا۔ اس کی پگڑی کھل گئی۔ تھوک اس کے منہ سے اڑنے لگی۔ اس نے ایک میٹھا پان کھایا اور پیک تھوک کر گانے لگا۔

''او تھے عملاں دے ہون نبیڑے تے جات کسے پچھنی نیں۔''

اگلے روز وہ جوگندر سنگھ کو لے کر اسلامیہ ہائی سکول جا پہنچا اور ہیڈ ماسٹر سے کہنے لگا ''جوگندر سنگھ کو اپنے سکول میں داخل کر لو اور اسے بتاؤ کہ نیک عمل کسے کہتے ہیں۔''

یہ بات ہیڈ ماسٹر صاحب کے لیے عجیب تھی۔ سب ماسٹر اکٹھے ہو گئے اور دساکھا سنگھ کو سمجھانے لگے کہ یہ مسلمانوں کا سکول ہے۔ ہندو تم سے بگڑ جائیں گے سردار جی۔

''میں ہندو نہیں' سکھ ہوں اور وحدت پرست ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ جوگندر سنگھ ہندوؤں کے سکول میں جا کر کافر ہو جائے۔ بتوں کو ماننے لگے۔ اپنی آخرت خراب کرے۔''

''مگر یہاں تو عربی پڑھائی جاتی ہے۔ قرآن بھی پڑھنا پڑتا ہے۔''

''تو جوگندر سنگھ عربی پڑھے۔ قرآن شریف کیوں نہ پڑھے؟'' دساکھا سنگھ بولا ''فارسی بھی پڑھے۔ شیخ سعدی کے بغیر جوگندر سنگھ اچھا انسان نہیں بن سکتا۔ میں چاہتا ہوں وہ انسان بنے' سچا سکھ بنے۔ ہمارے گرو صاحبان بھی فارسی پڑھتے تھے اور دسویں پادشاہی تو فارسی میں شعر بھی کہتی تھی۔''

''مگر یہاں نماز' روزے کی پابندی کرائی جاتی ہے۔'' میاں عیدا بولے ''جوگندر سنگھ کیا کرے گا؟''

''نماز روزے کی بھی پابندی کرے' اگر جوگندر سنگھ چاہے تو۔ نماز میں بھی تو واہگورو کی ثنا کی جاتی ہے اور روزہ ضبطِ نفس سکھاتا ہے۔ اس میں کون سی بات سکھی کے خلاف ہوئی۔''

اس پر ماسٹر صاحب چپ ہو گئے۔ ان کو لگتا تھا کہ بات غلط ہے مگر ان کے پاس کوئی دلیل نہ تھی۔ نماز میں تو وہ واقعی واہگورو کی ثنا کرتے تھے اور روزہ بھی ضبطِ نفس سکھاتا تھا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے دبلے پتلے جوگندر سنگھ کو داخل کر لیا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ سب میں گھل مل گیا۔ کسی کو خیال بھی نہ رہا کہ وہ سکھ ہے۔

جوگندر سنگھ کی حیثیت سکول میں ایک لاڈلے بچے کی سی ہو گئی۔ اس کو مار پڑتی تھی مگر سبق میں اسے خاص توجہ دی جاتی تھی۔ اس کو خواہ مخواہ اسلام کی طرف کھینچا نہیں جاتا تھا۔ وہ قرآن شریف کی کلاس میں بیٹھا دوسروں کو مار پڑنے کا تماشا دیکھا کرتا۔ کبھی کبھی وہ خود بھی کوئی آیت پڑھنے لگتا مگر میاں عیدا اسے دیکھ کر ہنس پڑتے۔

اسے نماز پڑھنے سے رخصت تھی۔ اس کو ہاکی کھیلنے سے رخصت تھی کیونکہ اس کا گھر بہت دور تھا اور وہ اتنی دور سے واپس آ نہ سکتا تھا۔

## قدم قدم پر کانٹے

کھیل کا میدان ایک کھلا جنگل تھا جس میں کیکر کے کانٹے قدم قدم پر بکھرے پڑے ہوتے۔ شام کو بچوں کے پیر کانٹوں کی وجہ سے سوج جاتے۔ وہ تھکے ہارے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گھروں کو لوٹتے تو بہت پرسکون ہوتے۔ یہ وقت ان کے روزمرہ وقت کا بہترین حصہ ہوتا۔ کسی کی آنکھیں انہیں دیکھتی نہ تھیں۔ کسی کے کان ان کے فحش لطیفوں' گندی گالیوں اور بھونڈے مخولوں کو نہ سنتے۔ وہ ہاتھوں میں ہاتھ اور گردنوں میں بانہیں ڈال کر جھولتے ہوئے چلتے اور وہ ٹولیوں کی شکل میں ماہیا گاتے۔ اتنے میں چاند روشن ہو جاتا۔ اس کی دودھیا روشنی آسمان کی نیلگوں سیاہی پر نور کی چادر ڈال دیتی جس میں کالی کونجوں کی ڈاریں بہت بھلی لگتیں۔ خانقاہوں کے گنبد سنولا جاتے تو ان پر بیٹھے ہوئے بے شمار جنگلی کبوتر غٹرغوں غٹرغوں کا ترانہ چھیڑتے۔ نقاروں پر چوب پڑتی۔ چراگاہوں سے لوٹتی ہوئی بکریوں کے گلے جھانجروں کی کھڑتالیں بجاتے ہوئے گزرتے۔ اذانیں ڈوب ڈوب کر ابھرتیں اور ہوا کے نرم جھونکے گالوں کو چھو چھو کر گزر جاتے۔

مگر رات بڑی تکلیف دہ ہوتی۔ گھر کی ذمہ داریاں' سکول کا کام' جلدی سو جانے کی پابندی' شام ڈھلتے ہی ایک خوف کی فضا بچوں پر چھا جاتی۔ خوف ایک بوڑھے بندر کی طرح ہمیشہ ان کی گردنوں پر سوار رہتا۔

بندروں کی شکلیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ سب بڑے اور بوڑھے بھی ایک جیسے تھے۔ ان کے ناک نقشوں میں جو فرق تھا وہ بچوں کو کبھی دکھائی نہ دیتا۔ انہیں ان کو غور سے دیکھنے کی اجازت ہی کبھی نہ ہوئی۔ انہیں حکم تھا کہ وہ نظریں نیچی رکھیں۔

## جہاں چاہو لیٹو

نانا کا گھر جمال کے والد کے گھر کے بالکل سامنے واقع تھا۔ بیچ میں گلی پڑتی تھی۔ یہ ایک بہت بڑی حویلی تھی۔ اس میں اتنے کمرے تھے کہ آدمی راستہ بھول جائے۔

نور پور میں گرمیاں بہت طویل ہوتی تھیں اس لیے یہاں چھتوں کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ لوگ کھلے آسمان کے نیچے سوتے تھے۔ سردیوں میں دھوپ تاپتے تھے۔ پتنگ بازی کرتے تھے۔ لڑکے اپنی ہم عمر لڑکیوں کو اشارے کرتے اور بوڑھیاں ایک دوسرے کی بُرائیاں کرتیں۔ سب سب کو جانتے تھے۔ یہاں پر پردے کا رواج تھا مگر عملی طور پر کسی کا بھی چھپنا محال تھا۔ نور پور ایک بہت بڑا مشترکہ گھرانہ تھا۔

جمال کے نانا کی حویلی عموماً خالی رہتی تھی کیونکہ وہ کہیں دور تھانیداری کرتے تھے۔ اس کے مستقل باشندوں میں تھانیدار کی پہلی بیوی اور اس کی ایک بھانجی تھی یا پھر جمال' جس کے باپ کے گھر میں سونے کی جگہ نہیں تھی۔

جمال ملیریے کا مستقل مریض تھا۔ سکول میں گیارہ بجے اسے زور کی سردی لگتی اور جسم تپنے لگتا۔ پھر وہ بستہ اٹھا کر سیدھا ہسپتال کا رخ کرتا جہاں پنڈت کرم چند کمپاؤنڈر اسے گیارہ نمبر کی بوتل میں سے کڑوی دوا کی تین خوراکیں انڈیل دیتا اور یوں گھنٹے بھر میں بخار کی حالت میں دو میل کا فاصلہ طے کر کے وہ بستہ اور دوا کی شیشی ہاتھ میں لیے نانا کے گھر پہنچ جاتا۔ تین بجے اسے زور کا پسینہ آتا۔ پھر ایک ہرے رنگ کی قے کے بعد اس کا جسم ٹھنڈا ہو جاتا اور وہ اپنی والدہ کی بھیجی ہوئی روٹی کھا کر سکول کا کام کرنے بیٹھ جاتا۔

نانا کی حویلی اسے بہت پیاری لگتی تھی۔ یہاں وہ آزادی سے زندگی گزار سکتا تھا۔ بخار میں جہاں چاہتا لیٹ جاتا' قے کر دیتا' بے ہوش ہو جاتا' اٹھ کر بیٹھ جاتا اور کھاتا پیتا۔ یہاں اسے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ تھا۔ بھائیں بھائیں کرتی ہوئی قلعہ نما حویلی اسے اپنا ذاتی گھر لگتی تھی۔

رات کو ابا کے گھر جا کر اسے ابا کے سامنے بیٹھ کر پڑھنا پڑتا تھا مگر اس کے ابا نے اسے کبھی پڑھایا نہیں۔ وہ دیوار گیر لیمپ کی مدھم روشنی میں انگریزی ناول پڑھتے رہتے۔ جمال کی والدہ مسلسل باتیں کرتی رہتیں اور جمال دونوں کے پاس چٹائی پر بیٹھا کتاب آگے رکھ کر اپنی والدہ کی دلچسپ باتیں سنتا رہتا۔

جمال کو اپنے چھوٹے بھائی اختر سے بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ بہت لاڈلا' منچلا اور شریر تھا۔ جمال پڑھتا تو وہ مونگ پھلی ٹھونگتا یا اچانک شور مچا دیتا' دیکھو جمال جیومیٹری کی کتاب کے اندر رکھ کر ناول پڑھ رہا ہے۔

جمال نے ابھی ناول پڑھنا شروع نہیں کیا تھا مگر سکول کی لائبریری سے اسے بچوں کی کتابیں مل جاتی تھیں۔ انہیں پڑھتے ہوئے وہ کبھی اپنے آپ کو پریوں کے جھرمٹ میں پاتا۔ کبھی چوروں اور ڈاکوؤں کے ساتھ مہمات میں شریک ہوتا مگر اختر اس کی کتابوں کو ہمیشہ ناول ہی کہتا۔ ان کے گھر میں ناول پڑھنا عورتوں اور بچوں کے لیے ایک خوفناک جرم سمجھا جاتا تھا۔ جمال کے ابا ناول ہی پڑھتے تھے مگر بچوں کو سکھایا گیا

تھا کہ بڑوں کی اور بات ہے۔

جمال کا نانا بڑے دھڑلے کا آدمی تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا گنجا شیر جس سے لوگ ڈر کے مارے کانپتے تھے۔ وہ ایک بہت بڑا افسر تھا اور تھانیدار سے بڑا افسر جمال نے آج تک کبھی نہیں دیکھا۔

خواجہ یٰسین کی پرورش بہت شفقت والے ماحول میں ہوئی تھی۔ مگر چونکہ وہ یتیم تھے اور ان کی پرورش بہت سی چچی ماؤں نے مل کر کی تھی اس لیے وہ بے یقینی کا شکار ہو کر پلے تھے۔ وہ طنزیہ گفتگو کے عادی تھے۔ جمال کی آئندہ بے باکی اور صاف گوئی خواجہ یٰسین کے طنز کے خلاف احتجاج کی پیداوار تھی۔ جمال کا نانا ایک طاقتور شخص تھا۔ اس کے پاس زمین تو نہ تھی مگر وہ طبعاً جاگیردار تھا۔ انگریزوں کو وہ اہل کتاب سمجھ کر ہندوستان اور رعایا کا مالک سمجھتا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے بل پر انگریزوں نے دو سو برس حکومت کی۔ وہ انگریزوں کی حکومت کو خدا کی رضا سمجھتا تھا اور اس کی مخالفت کو وہ مداخلت فی الدین سمجھتا تھا۔

خدا کی رضا کے سلسلے میں جمال نے اپنے بچپن میں کئی کسانوں کو مالیہ بروقت ادا نہ کرنے اور چوری ڈاکے کے ملزموں کو یا کسی اور انگریزی قانون کی خلاف ورزی کی پاداش میں اسی کے نانا کے حکم پر درختوں سے الٹے لٹکتے دیکھا۔ ایک منظر تو ہمیشہ کے لیے جمال کے ذہن میں جم گیا۔

تھانے کے صحن میں ایک بوڑھے پیپل کے ٹہنے کے ساتھ مونج کی موٹی رسی سے ایک سکھ کسان الٹا لٹک رہا ہے۔ اس کے سر کے بال زمین کو چھو رہے ہیں۔ وہ مادرزاد ننگا ہے۔ اس کے چوتڑوں پر جوتے برس رہے ہیں۔ کہر سنگھ ہیڈ کانسٹیبل کو گندی گالیاں دے رہا ہے۔ رسی آہستہ آہستہ گھوم رہی ہے۔

جمال کو وہ منظر اس لیے یاد رہا کہ اس نے پہلی مرتبہ ایک جوان آدمی کا ننگا جسم دیکھا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ جوان آدمی کے اعضا اتنے بڑے ہوتے ہیں اور ان پر بال اُگتے ہیں۔

## بصرے کی لڑائی

جمال کے نانا نے پہلی عالمی جنگ کے دوران جبری بھرتی کے سلسلے میں عظیم خدمات انجام دی تھیں۔ وہ کبھی اچھے موڈ میں ہوتا تو انگیٹھی کے سامنے دھسے کی بُکل مار کر نمکین کشمیری چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے پرانی کہانیاں سنایا کرتا۔

''بصرے کی لڑائی کے لیے انگریز کو ہندوستانی نفری کی ضرورت تھی۔ کالووال کے کسان بھرتی نہ دیتے تھے۔ مجھے کارروائی کا حکم ہوا کیونکہ پولیس کپتان صاحب بہادر مجھ سے بہت خوش تھے۔'' تھانیدار نے بات شروع کی۔

تھانیدار کو اس سے غرض نہ تھی کہ بصرہ کہاں ہے؟ لڑائی کن کن کے درمیان ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے اور کالووال کے کسان بھرتی کیوں نہیں ہوتے۔ اسے کارروائی کا حکم ہوا تو وہ کسانوں کو سرکشی کا مزہ چکھانے کے لیے چل پڑا۔

کالووال کے کسان سرکش نہ تھے۔ وہ ڈھور ڈنگر چرانا اور کھیتی باڑی کرنا جانتے تھے۔ وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ رہنا اور انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے جوان ہوتا دیکھنا چاہتے تھے۔ لڑائی اور فوج کے بارے میں وہ کچھ جانتے نہ تھے مگر انہیں اتنا پتہ تھا کہ سرکار نے جن کو زبردستی گاڑیوں میں لاد کر بصرے روانہ کیا' وہ لوٹ کر نہیں آئے۔

کسانوں کو پتہ تھا کہ سرکار ان کے خلاف کارروائی کرے گی۔ وہ دن بھر چھپے رہتے۔ راتوں کو کمین گاہوں سے نکلتے۔ اندھیرے میں بیل جوتتے۔ کھیتوں میں گوڈی اور بوائی کرتے اور صبح کی اذان سے پہلے پھر چھپ جاتے۔

کالووال چھوٹی مالکی کا گاؤں تھا جن علاقوں میں بڑے زمیندار اور جاگیردار مالک تھے وہاں بھرتی میں سرکار کو کوئی دقت نہ ہوتی۔ وہ مزارعوں کے جوان بچوں کو چھتری کے کبوتروں کی طرح آسانی سے پکڑ کر فوج کے حوالے کر دیتے۔ کالووال کی بات دوسری تھی۔ یہاں کے لوگ خود کاشت آزاد اور خودمختار تھے اور ان کی عورتیں بھی چپ نہ رہتی تھیں۔

تھانیدار کالووال کے گوشے گوشے سے واقف تھا۔ اس نے پولیس کی پوری نفری لے کر آدھی رات کے وقت گاؤں کو گھیر لیا۔ کسان اپنے کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ چاند نکلا ہوا تھا اور ان کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔

تھانیدار نے للکار کر کہا جو جہاں کھڑا ہے وہیں رک جائے۔ بھاگنے کی کوشش کرنے والوں کو گولی ماردی جائے گی۔

اس کی گرجدار آواز کی گونج رات کے سناٹے میں پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ اس نے سب کو ایک جگہ اکٹھا کرلیا۔ کسی نے چوں تک نہ کی۔ انگریز سرکار کا ایسا ہی دبدبہ تھا۔

پھر تھانیدار گاؤں میں داخل ہو گیا۔ عورتیں جاگ رہی تھیں۔ انہوں نے بچوں کو صندوقوں اور اناج رکھنے کے بھڑولوں میں چھپا دیا تھا۔ وہ منہ سر لپیٹے دروازوں میں کھڑی تھیں جیسے پہرہ دے رہی ہوں۔ بوڑھے ہاتھ باندھ کر گھروں سے نکل آئے۔ انہوں نے گردنیں جھکائی ہوئی تھیں۔

تھانیدار نے سب کو پکڑ لیا۔ پھر ان سے ان کے بچے طلب کیے۔ تمام پگ بندھ جو اپنے سر پر پگڑی باندھ سکتے ہوں۔ ماؤں نے بین کرنے شروع کر دیئے۔ بہنیں سسکیاں لینے لگیں۔ نانیاں دادیاں چھاتیاں پیٹنے لگیں۔

تھانیدار نے گھروں کے اندر گھس کر چارپائیاں الٹوا دیں۔ صندوق کھلوا دیئے۔ بھڑولے دیکھے اور نو سال کی عمر تک کے تمام بچوں کو باندھ کر لے چلا۔ عورتوں نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ کچھ دیر وہ اس جلوس کے پیچھے پیچھے چلیں' پھر مایوس ہو کر بیٹھ گئیں۔ کالووال میں اب ایک بھی مرد باقی نہ رہا تھا۔ مگر تھانیدار ظالم آدمی

نہیں تھا۔ وہ ایک فرض شناس افسر تھا اور انگریزوں کو دستِ خدا سمجھتا تھا۔ بصرے کی لڑائی کے لیے کالووال کو تیس آدمی دینے تھے۔ اگر کالووال کے کسان فرض شناس ہوتے تو وہ کیوں ان کو باندھ کر لے جاتا۔

## فرض شناس افسر

تھانیدار ایک خدا ترس انسان تھا۔ گاؤں سے ایک میل دور جا کر اس نے قافلے کی گنتی کی۔ بچوں، جوانوں اور بوڑھوں سمیت کل پینسٹھ آدمی اس کی گرفت میں تھے۔ بے زبان حیوان۔

تھانیدار نے کہا ''جن کی مسیں نہیں بھیگیں وہ قطار سے نکل کر آگے آ جائیں'' چودہ لڑکے نکل آئے۔

پھر اس نے کہا ''جن کی داڑھیوں میں سفید بال ہیں، وہ بھی قطار سے نکل آئیں۔''

یہ حکم سن کر بارہ بوڑھے بھی جن میں سے بعض کی کمریں جھکی ہوئی تھیں، آگے آ گئے۔

پھر اس نے کہا ''جو ماؤں کے اکلوتے بیٹے ہیں، وہ بھی۔''

تین جوان اور نکل آئے۔

''اور ایسے کتنے ہیں جن کی پچھلے سال شادی ہوئی؟''

ایک نوجوان اس قبیل سے بھی نکلا۔

جو باقی رہے ان کی گنتی کی گئی تو وہ بتیس نکلے مگر تھانیدار کو صرف تیس کی ضرورت تھی، اس نے سوچا دو اور نکال دوں۔

مگر پھر اس کو خیال آیا کہ شاید بتیس میں سے دو کی جسمانی صحت ایسی نہ ہو کہ بھرتی ہو سکیں۔ اس لیے دو نفر زیادہ ہونا بہتر ہے۔ پھر یہ تقدیر کی بات ہے، کون جانتا ہے کہ کس کو زندہ واپس آنا ہے، کس کو نہیں۔

پھر اس نے ان بوڑھوں اور بچوں کو جو اس نے چھوڑ دیئے تھے، حکم دیا کہ وہ مرغا بن جائیں۔ کان پکڑ لیں۔

یہ حکم سن کر بچے، بوڑھے اور جوان اپنے گاؤں سے ایک میل دور آدھی رات کے وقت جنگل میں مرغا بن گئے۔ کسی نے وجہ نہ پوچھی۔

اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ سب کو پانچ پانچ جوتے لگاؤ۔ بوڑھوں کو سیدھے اور جوانوں کو الٹے تا کہ انہیں پتہ چلے کہ سرکار کو دھوکہ دینا آسان نہیں۔

سپاہیوں نے بوڑھوں اور جوانوں کے تہبند کھول کر زمین پر ڈال دیئے۔ انہوں نے شرم سے نظریں جھکا لیں۔ انہوں نے آپس میں کبھی ایک دوسرے کو بے ستر نہ دیکھا تھا۔

ننگے کولہوں پر جوتے کھاتے ہوئے کوئی کچھ نہ بولا۔ نہ بچہ، نہ جوان، نہ بوڑھا۔ تھانیدار جب ان کو یقین دلا چکا کہ سرکار کو دھوکہ دینا آسان نہیں تو وہ ان کو بھاگتے ہوئے گھروں کو واپس جا کر عورتوں کو تسلی دینے کا حکم دینے کے بعد آگے روانہ ہو گیا۔ روتے ہوئے کسانوں کی سسکیاں جو اس نے باندھ لیے تھے، اس کے گھوڑے کے ہم رکاب تھیں۔ اب اس کی گرفت میں بتیس جوان تھے جن کا جرمنوں سے کوئی جھگڑا نہ تھا۔ جن کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ بصرہ کہاں ہے اور لڑائی کس بات پر ہو رہی ہے۔ انہوں نے ابھی تک بندوق بھی دیکھی نہ تھی۔ انہیں تو شہر کے راستے تک نہ آتے تھے۔

## رشوت کے اصول

تھانیدار رشوت لینے کے معاملے میں بھی بڑا اصول پرست تھا۔ اپنی ساری ملازمت کے دوران اس نے کسی یتیم بچے یا کسی بیوہ عورت سے ایک پائی بھی نہیں لی اور اگر انہیں بے گناہ پایا تو انہیں قانون کے پنجے سے رہا کرا دیا۔ اس نے کسی مجرم سے بھی رشوت نہ لی کیونکہ ایسوں سے رعایت برتنا وہ گناہ کبیرہ سمجھتا تھا۔ وہ صرف باحیثیت بے گناہوں سے رشوت لیا کرتا جو کسی وجہ سے کسی قانونی گورکھ دھندے میں پھنس جاتے یا کسی سازش کا شکار ہو جاتے۔ وہ ان کو آزاد کرانا اپنا دینی فرض سمجھتا تھا۔ ایسے نیکی کے کام وہ محض خدا کی خوشنودی کے لیے کرتا۔ اس میں چار پیسے بھی اسے مل جاتے تو وہ کہتا ''مرضی مولا! از ہمہ اولے۔''

تھانیدار کے گھر میں تین بھینسیں ہوتی تھیں مگر اونٹ گھوڑے حسب ضرورت گھٹتے بڑھتے رہتے۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے کئی کئی نوکر ہوتے تھے مگر ان کو باقاعدہ ماہوار تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ وہ بے زمین مزارعوں کے بیٹے ہوتے تھے جنہیں ان کے والدین بیکاری کا زمانہ کاٹنے کے لیے تھانیدار کے ہاں چھوڑ جاتے تا کہ انہیں دو وقت پیٹ بھر کر روٹی ملتی رہے۔

نوکروں کو کھلانے پلانے کے معاملے میں تھانیدار بڑا سخت گیر تھا۔ حکم تھا کہ وہ صبح اٹھ کر دودھ پراٹھے کا ناشتہ کریں۔ دودھ پراٹھے پر اس کا کوئی خرچہ نہ ہوتا تھا۔ پنجاب میں گائے بھینسوں کی کثرت تھی۔ چارہ توڑی بھی مفت اور وافر مل جاتی تھی۔ ان حالات میں دوچھیل جانور کا زمیندار یا مالک کے کھونٹے پر بندھنا یا تھانیدار کے طویلے میں جگالی کرنا ایک ہی بات تھی۔ کم سے کم تھانیدار کا یہی خیال تھا۔

## تھانیدار کی سواری

جب تھانیدار کو تفتیش کے لیے دورے پر جانا ہوتا تھا تو دھارو مصلی پچھلی رات کو اٹھ کر گھوڑوں کو کھرکنا اور اونٹوں کی ٹہل کرتا۔ بالا باورچی سات دیگچیوں کا سیٹ نکال کر پھر سے مانجتا۔ چینی کی پیالیاں ڈونگے اور چمچیاں صافیوں میں لپیٹتا اور گرم مصالحے کی بوتلیں بھرتا۔

تھانیدار اچھے کھانے کا عادی تھا۔

محرر مسلیں صندوقچی میں مقفل کرتا۔ قلمدان میں نئی سیاہی ڈالتا اور قلموں کی نبیں صاف کرتا۔ تھانے سے چار بڑے بڑے لکڑی کے صندوق آ جاتے۔ چھولداریاں مچھر دانیاں اور کلے بانس اور رسیاں اصطبل کے سامنے ڈھیر کر دی جاتیں۔ پھر اونٹ لدنے شروع ہو جاتے۔ ان کے گھٹنے بندھے ہوئے ہوتے۔ اونٹوں پر چھولداریاں، مچھر دانیاں، کلے بانس اور رسیاں بستر بند اور اسی قسم کا بھاری سامان لد جاتا۔

خچروں پر باورچی خانے کا سامان، گھوڑوں کے لیے دانہ اور متفرقات۔

دن کے بارہ بجے قافلہ روانہ ہو جاتا۔ جیسے کسی راجہ کا جلوس چلے، اس میں فقط ہاتھیوں کی کمی ہوتی۔

قافلہ روانہ ہوتا تو تھانیدار کے ارد گرد کھڑے معززین بار بار پوچھتے۔ خیر سے آج مقام کہاں ہوگا۔

تھانیدار بتاتا کہ آج مقام لکھن پور میں ہوگا، اگر خدا نے چاہا۔

شام کو تھانیدار خود سوار ہوتا۔ اسے شریر گھوڑے پسند تھے۔ یہ گھوڑا جس پر وہ سواری کرتا اسے ایک فوجی رسالے نے نیلام کر دیا تھا کیونکہ وہ کسی کو سواری کرنے نہ دیتا تھا۔ تھانیدار نے اسے تین روز تک بھوکا پیاسا رکھا۔ چوتھے روز اس پر سواری کی تو اسے بھگا بھگا کر پانی کر دیا۔ گھوڑے نے اسے اتار پھینکنے کی بڑی کوشش کی مگر تھانیدار کی ران مضبوط تھی۔ گھوڑا اپنے مالک کا مزاج سمجھ گیا۔

سوار ہونے سے پہلے تھانیدار نے بسم اللہ پڑھی۔ اس نے برجس پہنی ہوئی تھی۔ ایک بغل میں حمائل شریف لٹک رہی تھی۔ دوسری میں بارہ بور کی فرانسیسی بندوق۔

اسے اس رات وہاں سے تین میل دور لکھن پور قیام کرنا تھا۔ وہاں اسے کھانا تیار ملتا۔ تنبو میں بستر لگے ہوتے۔ چھڑکاؤ سے زمین کی مٹی بیٹھ چکی ہوتی اور غنڈے اور معززین ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے۔

جمال نے اس جمال وجلال کے ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کی والدہ تھانیدار کی سب سے بڑی بیٹی تھی اور اس کے گھر کی سب سے معزز فرد۔ سکول میں اس نے دو جماعتیں پاس کر لی تھیں، پھر اسے پردے میں بٹھا دیا گیا تھا مگر بڑی ہو کر اس نے اپنے زمانے کا اردو لٹریچر پڑھ لیا تھا اور سمجھدار اور سیانی شمار ہونے لگی تھی۔ تھانیدار اہم خاندانی معاملات میں اس سے مشورہ کرتا تو وہ اسے بڑے عمدہ مشورے دیتی اور دوپٹے سے منہ سر ڈھانپ کر زیرِ لب کہتی "جیسی آپ کی مرضی میاں جی!"

## میاں بیوی

جمال کی والدہ کی خواجہ یٰسین سے شادی ہوئی تو اگرچہ وہ میاں صمد کی حویلی میں اٹھ آئے تھے۔ توقع یہ کی جاتی تھی کہ میاں بیوی میں کھلے بندوں بات چیت نہ ہو۔ خواجہ یٰسین نے دسویں کا امتحان دے دیا تھا۔ بچوں کو بڑوں جیسی باتیں زیب نہ دیتی تھیں۔ اس لیے وہ اپنی بیوی سے دور دور ہی رہتا۔

سترہ برس کی عمر میں جب خواجہ یٰسین باپ بن گئے تو خواجہ قطب دین نے بڑی خوشیاں منائیں اور بچے کو قسم قسم کی ماؤں نے گود لے لیا۔ پندرہ برس کی ماں کو اپنا بچہ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ اس کی نیند خراب کرتا۔ بیمار رہتا، روتا، کہیں آنکھ بچا کر اسے خواجہ یٰسین سے بات کرنے کا موقع ملتا تو جمال چیختا چلاتا اور بیزار کرتا۔

نانا کے گھر جمال کے دو ساتھی تھے۔ ایک اس کا چھوٹا بھائی دوسرا اس کا ماموں مشتاق جس کو کچھ بڑا ہونے کے سبب ہر بات میں ترجیح ملتی تھی۔ تھانیدار بچوں کو شخص نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اسے دلچسپ لگتے تھے۔ شخص تو وہ اپنی بیویوں اور کئی بیٹیوں کو بھی نہیں مانتا تھا، وہ محض بے تنخواہ نوکرانیوں کا مقام رکھتی تھیں مگر اس کی خوبصورت

بیوہ بہو اس کے گھر کی شہزادی تھی۔

پراسرار باتیں سنتے اور بات بات پر ڈانٹ کھاتے بچے بہت جلد بچپن کی سرحد پار کر لیتے ہیں۔ انہیں فوراً ہی بڑوں کے معیاروں پر پورا اترنا، سوچنا اور چپ رہنا پڑتا ہے۔

مشتاق نے باپ کے معیار پر پورا اترنے کی بجائے اس سے چھپنا اور شرمانا شروع کر دیا تھا مگر دوسرے بچوں میں وہ خود تھانیدار بن جاتا۔ جمال جو والدین کی پریشانی کا باعث تھا، مشتاق کی تھانیداری کا تختۂ مشق بن گیا۔

جمال ایک حساس بچہ تھا۔ بڑوں کے دوہرے معیارات پر اسے حیرت ہوتی تھی۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ جب چائے اتنی بری چیز ہے اور بچوں کو پینے نہیں دی جاتی تو پھر تھانیدار خود دو وقت باقاعدگی کے ساتھ اسے کیوں پیتا ہے۔

## لپٹن چائے

لپٹن چائے کا ذکر اس نے کچھ ہی عرصہ پہلے سنا تھا۔ جب خواجہ یٰسین اسے ملیریے کے علاج کے لیے لاہور لائے تھے۔ وہ اندرون شہر کسی کوچے میں کسی دور کے عزیز کے ہاں ٹھہرے تھے۔ بخار کی وجہ سے وہ گلی میں جا نہیں سکتا تھا۔ اس لیے کھڑکی میں بیٹھا باہر کا تماشہ دیکھتا تھا۔ اچانک ایک ریڑھی چائے دانی، چینی کا ڈبہ، چائے کا ڈبہ، پیالیاں، چمچیاں اور رنگ برنگے اشتہار لے کر گلی کے موڑ سے نکلی۔ اس کے ساتھ ایک انگریزی چولہا بھی تھا جس میں مٹی کا تیل جلتا تو نیلے رنگ کی آگ نکلتی۔

لوگ ابھی تک مٹی کے تیل کا ایک استعمال جانتے تھے اور وہ یہ کہ اس سے لالٹین جلائی جا سکتی ہے یا سوکھے ہوئے اُپلے سلگائے جا سکتے ہیں۔ مٹی کے تیل سے باقاعدہ چولہا جلنے اور نیلے رنگ کی آگ نکالنے کا معجزہ لپٹن چائے والے نے دکھایا تھا۔ چولہا عجیب تھا۔ پیتل کے ایک لٹو کے سے ڈبے پر لوہے کی ایک چڑیا بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ نیلے رنگ کی آگ اُگلتی مگر اس میں سے دھواں بالکل نہیں نکلتا تھا۔

لپٹن چائے والے نے گلی میں بیٹھ کر چولہا جلایا۔ اس پر ایک پتیلی پانی کی رکھی۔ اس میں چائے کی پتی کی چمچیاں گن گن کر ڈالیں۔ جب اس کو ابال آ گیا تو اس نے دودھ گرم کیا، پیالی بھری۔ اس میں چینی ڈالی اور ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ "انگریز کا کمال دیکھو اور اپنا برا حال دیکھو۔ سرکار کی مہربانی سے مفت کی چائے پیو اور ترقی کرو۔"

مگر دروازہ نہ کھلا۔ حالانکہ دوسری منزل پر بیٹھا گھر کا گھر گلی کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ ماؤں نے چیخ چیخ کر بچوں کو کمروں میں بند کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ چائے بچوں کا کلیجہ جلا دیتی ہے۔

تھوڑی دیر میں دروازہ تھپتھپانے کے بعد چائے والے نے واپس جا کر تھیلی سے پیک فریئرز بسکٹ کا ڈبہ نکالا۔ جمال نے پہلی بار پیک فریئرز کو یہیں دیکھا۔ پھر اس نے نعرہ لگایا "مفت کی چائے پیو اور لاٹ

صاحب والے بسکٹ کھاؤ۔''

عورتیں مٹر مٹر تکتی رہیں۔ پھر اچانک ایک بڑھیا کمر پر ہاتھ رکھے لاٹھی ٹیکتی ہوئی باہر نکلی۔ اس نے چائے کی پیالی اور بسکٹ لیا اور پینے سے پہلے اوپر بیٹھی ہوئی عورتوں کو مخاطب کر کے بولی ''میں بوڑھی ہوں۔ میری کمر میں درد رہتا ہے۔ حکیم نے کہا ہے کہ گرم چیز کھاؤ۔ چائے مجھے بہت آرام دیتی ہے۔ میں کوئی شوق سے نہیں پیتی۔ مجبوری ہے۔'' اور یہ کہہ کر اس نے چائے کی پیالی کو منہ لگا لیا اور دوائی کی طرح غٹاغٹ پی گئی۔

عورتوں کی سخت مزاحمت کی وجہ سے لپٹن والوں کو پنجاب میں بہت ناکامی ہوئی۔ کئی برس وہ چائے کے مشروب کو رواج دینے میں ناکام رہے۔ چائے اپنی گرم تاثیر کی شہرت کی وجہ سے بہت بدنام تھی۔ اس کا توڑ کرنے کے لیے انہوں نے نعرہ ایجاد کیا۔ ''گرم چائے گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔''

مگر بات پھر بھی نہ بنی کیونکہ ٹھنڈک پہنچانے کے لیے پنجاب میں بہت سے مشروب تھے۔ مثلاً فالسے کا شربت' بادام کا شربت' صندل کا شربت' لیموں کی سکنجبین' قلفہ' فالودہ اور لسی وغیرہ۔ ان چیزوں کو ترک کرنے پر کوئی آمادہ نہ تھا۔

لپٹن چائے والے کے بسکٹ لوگوں کو بہت پسند تھے اور اگر لاٹ صاحب انہیں کھاتے تھے تو کوئی بہت ہی اعلیٰ درجے کی چیز ہوں گے۔ بسکٹ کھانے کے شوق میں عورتوں نے چائے کی پیالی لینی شروع کر دی مگر بسکٹ کھا کر وہ چائے کی پیالی نالی میں انڈیل دیتیں۔ اس پر لپٹن والوں نے فیصلہ کیا کہ بسکٹ صرف اسی کو ملے گا جو پہلے چائے کی پیالی پی کر دکھائے گا۔

## کنجروں کے بازار میں

تھانیدار کی قصور بدلی ہوئی تو جمال پانچ برس کا تھا۔ اس کے سکول کا راستہ تھانیدار کے اصطبل سے ہو کر جاتا تھا۔

شروع شروع میں اسے روزانہ سکول جانا بہت برا لگتا تھا مگر اس نے دیکھا کہ میں جس تنگ سی گلی میں سے گزرتا ہوں اس میں خوبصورت جوان لڑکیاں گہنوں سے بھری پڑی بے پردہ انکھیلیاں کرتی پھرتی ہیں۔ ان کے گھروں کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔ ان کے فرشوں پر سفید چاندنیاں بچھی رہتی ہیں جن پر بڑے بڑے گاؤ تکیے' چمکیلے گلدان' مرجھائے ہوئے موتیے کے ہار' گلاب کے باسی پھول اور ہارمونیم اور طبلے پڑے رہتے ہیں۔ کسی کمرے میں اس کی عمر کی یا اس سے کچھ بڑی لڑکیاں گانا سیکھتی اور گھنگرو باندھ کر ناچ کرتی ہیں۔ چھوٹی لڑکیاں ریلوں پر سیپارے رکھے مولوی صاحب سے قرآن شریف پڑھتی ہیں۔ سکول جانے کی بجائے جمال کو اس گلی میں کھیلنا اچھا لگتا۔

جلد ہی اسے کچھ لڑکیوں کے نام بھی معلوم ہو گئے۔ ایک دن اسے ایک خوبصورت لڑکی نے عطر کی ایک خالی شیشی سونگھنے کے لیے دی۔ پھر وہ ہر روز عطر کی خالی شیشیاں مانگنے لگا اور بہت سی لڑکیوں سے اس کی دوستی ہو گئی۔ جمال ایک خوبصورت بچہ تھا۔ بعض اسے پیار کرتیں' بعض اس کا منہ چوم لیتیں۔ عطر والی ایک مسکراتی ہوئی لڑکی نے کہا ''میرا نام ہے عمدہ جان۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟''

جمال اس پر شرما گیا تو عمدہ جان اسے گھر کے اندر لے گئی۔ اندر اللہ دتی اس کی ہم عمر لڑکی عمدہ جان کی بہن گیند کھیل رہی تھی۔ وہ بہت گوری تھی۔ اس نے تنگ پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ اوڑھنی سے سر پر پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں پر مہندی خوب بہار دے رہی تھی۔ اس نے جمال پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر گیند کھیلنے لگی۔ جمال کو بڑا دکھ ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ جانے لگا تو اللہ دتی بولی ''ٹھہرو لڑکے۔''

جمال رک گیا۔

''آؤ گیند گیند کھیلیں۔''

جمال نے کہا ''تو لاؤ پھینکو میری طرف۔''

اللہ دتی بولی ''خبردار جو میرے گیند کو ہاتھ لگایا۔ تم اپنی گیند لاؤ۔''

جمال کا دل بجھ گیا۔ اس کے پاس گیند نہیں تھی۔

پھر اللہ دتی بولی ''میرا گیند لینا ہے تو اپنا بستہ مجھے دے دو۔''

جمال نے اپنا بستہ اس کے آگے رکھ دیا۔ اس نے جزدان کھولا۔ اس کے اندر سے ایک پھٹا ہوا قاعدہ اور صوف والی دوات کے سوا کچھ نہ نکلا تو وہ بولی ''میں نہیں لیتی تمہارا گندا بستہ۔''

پھر وہ اپنے ہونٹ چاٹ کر بولی ''میرے پاس شیشے کی دوات ہے' تمہارے پاس ہے؟''

پھر اللہ دتی نے شیشے کی دوات جمال کو دکھائی جس کی سیاہی الٹنے پر بھی گرتی نہ تھی۔ اس نے جمال کی مٹی کی دوات پکڑی اور گلی میں پھینک دی۔ جمال پریشان ہوا تو وہ کھلکھلا کر ہنسنے اور اپنی چوڑیاں بجانے لگی۔

جمال کو اس روز سکول سے دیر ہو گئی۔ ماسٹر جی نے کان کھینچے اور تھانیدار سے شکایت کر دی کہ آپ کا جمال ابھی سے کنجروں کے ہاں جانے لگا ہے۔ کوٹھے کی لت پڑ گئی ہے اس کو۔

## کانگریس کا جلوس

ایک دن اسے پتہ چلا کہ میرے ابا جو شملہ میں نوکر تھے' واپس آئیں گے اور پھر ہم سب کو دہلی جانا پڑے گا۔

دہلی اس زمانے میں اتنی دور نہ تھی اور کسی کا دہلی جانا عزت کی بات تھی۔ جمال کی والدہ بہت خوش تھیں۔

خواجہ یٰسین آئے اور دو روز کے بعد ان کا خاندان دہلی روانہ ہو گیا۔ دہلی ریلوے سٹیشن سے یکے پر سبزی منڈی کی طرف جاتے ہوئے جمال نے سڑک پر ایک بہت بڑا ہجوم دیکھا۔ اس میں عورتیں بھی تھیں اور

کھدر کے کپڑے پہنے ہوئے مرد بھی۔جن کے سروں پر عجیب سی کشتی نما ٹوپیاں تھیں۔ہجوم پولیس کے گھیرے میں تھا مگر فضا پرامن تھی۔نعرے لگ رہے تھے۔شراب بند کرو' نشہ بند کرو۔خواجہ یٰسین نے جمال کی والدہ کو بتایا کہ یہ لوگ کانگرسی ہیں۔شراب خانہ خراب کے خلاف نعرے لگا رہے ہیں۔

خواجہ یٰسین کو شراب سے بڑی نفرت تھی۔ان کا خیال تھا کہ شراب پی کر آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔ ہوش وحواس سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔دنگا کرتا ہے' گالیاں دیتا ہے' جوا کھیلتا ہے' رنڈی بازی کرتا ہے اور جائیداد بیچتا ہے۔یہ خانہ خراب جس نے ایک مرتبہ چکھ لی اس کو چمٹ گئی۔

جمال کی والدہ کو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی۔کہ عورتوں کے دیدے ڈھل گئے ہیں۔مردوں کے ساتھ گھل مل کر چل رہی ہیں اور نعرے مار رہی ہیں۔

خواجہ یٰسین نے جواب دیا کہ ان میں کچھ آوارہ عورتیں ہیں اور کچھ آزاد خیال جو اپنے والدین اور خاوندوں کے بس میں نہیں اور سب کی سب ہندو ہیں۔

سبزی منڈی سے نکل کر ایک جنگل میں کوارٹروں کی ایک بستی تھی جس میں خواجہ یٰسین کا کنبہ اُتر پڑا۔ دہلی کے اس ویرانے میں بچوں کا کوئی سکول نہ تھا۔جمال کو باہر جانے اور دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت تھی۔گھر سے تھوڑی دور ایک بہت بڑے میدان کے گرد خاردار تار کا جنگلہ لگا تھا۔اس کے اندر انگریز گالف کھیلتے تھے۔جمال کنارے کے قریب جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ جاتا کہ گالف کی کوئی گیند جنگلے کے قریب آئے تو میں لپک کر اسے اٹھا لوں۔

گالف کی گیند ابھرتی بہت تھی اور بازار میں ملتی نہ تھی۔گیند اٹھا کر بھاگ جانا اسے بہت اچھا لگتا تھا کیونکہ اسے بھاگتے دیکھ کر بندر جیسے لال لال چہروں والے انگریز چیختے اور اپنے کالے کالے ہندوستانی نوکروں کو کوستے تھے۔ان بندر جیسے لال لال چہروں والے انگریزوں سے اس کا اتنا زبردست نانا جو مالیہ ادا نہ کر سکنے والے کسانوں کو ننگا کر کے درختوں پر لٹا سکتا تھا' کتنا ڈرتا تھا۔جمال تو ان سے ذرا بھی نہیں ڈرتا تھا۔

## آؤ گیند کھیلیں

گیند اٹھا کر جمال پیچھے دیکھے بغیر گھر کی طرف بھاگتا اور کوارٹروں کی چکر دار گلیوں میں غائب ہو جاتا۔گھر پہنچ کر وہ پچھلے کمرے میں بیٹھ کر کھیلنے لگتا۔اچانک اس کو اللہ دتی یاد آ جاتی جو اس کو روز بلاتی اور روز ستاتی تھی۔گیند کھیلتے کھیلتے وہ تھال یاد کرنے کی کوشش کرتا جو نور پور کی لڑکیاں گاتی تھیں مگر ان کے بول کبھی اس کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔

جمال اکیلا تھا۔اس کا بھائی اختر صرف فرش پر رینگ سکتا تھا۔اس کے ساتھ کھیل نہ سکتا تھا۔

اکیلے بیٹھے بیٹھے دیوار پر بنی ہوئی بلی دانت نکال نکال کر اسے ڈرانے لگتی۔وہ طرح طرح کے منہ بناتی' پنجے اٹھا کر اس کی طرف غور سے گھورتی۔جمال کا دل دھڑکنے لگتا۔اللہ دتی اچانک الماری سے سر باہر نکالتی اور کہتی جمال آؤ گیند کھیلیں۔بلی کی طرف مت دیکھو۔

جمال بے اختیار اس کی طرف بڑھتا تو وہ کہتی۔''وہیں رک جاؤ'' وہ وہیں رک جاتا تو اللہ دتی اس کی بے بسی پر ہنستی اور کہتی ''رک کیوں گئے۔آگے کیوں نہیں آتے۔میرے ساتھ گیند کیوں نہیں کھیلتے۔''

جمال خوش ہو کر گیند اللہ دتی کی طرف پھینکتا تو اس کی والدہ پھر چیختی۔''آج تم نے پھر الماری کا شیشہ توڑ دیا' آ جائے تیرا باپ۔''

اللہ دتی جمال کی والدہ کی آواز سن کر الماری میں چھپ جاتی تو جمال اپنی مٹی کی دوات فرش پر مار کر توڑ دیتا۔

رات کو اکیلے کمرے میں جمال کو بہت ڈر لگتا تھا۔ان مُردوں کا جو بچوں کی ایڑیوں سے منہ لگا کر خون پی جاتے ہیں۔ان بلاؤں کا جن کے بال کھلے ہوتے ہیں۔ان کے حقیقی واقعات اس نے اپنی خالہ سے سن رکھے تھے۔وہ یہ واقعات اپنے کمرے میں کھلی آنکھوں سے دیکھا کرتا تھا۔اس کی گھگھی بندھ جاتی اور وہ کروٹ بدلے بغیر رات کاٹ دیتا۔

جمال نے باقاعدہ سکول جانا نور پور میں شروع کیا تھا کیونکہ خواجہ یٰسین نے انگریز کی نوکری چھوڑ دی تھی۔اس کی وجہ سیاسی نہیں تھی۔وہ انگریز کو پسند بھی نہیں کرتا تھا مگر یہ تصور اس کے لیے محال تھا کہ انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلا جائے گا۔انگریز کی مخالفت ایک خطرناک بات تھی۔اس میں لمبی قید اور پولیس کی مار پیٹ کے سوا کسی کو کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔ایک دن انہوں نے لاٹ صاحب کے دفتر سے استعفیٰ دے دیا جہاں وہ کلرک تھے۔کہا میں نہیں کرتا انگریز کی نوکری۔

دراصل انہیں باقاعدگی سے کام پر جانا اور آٹھ گھنٹے ڈیوٹی دینا پسند نہیں تھا۔

انہوں نے کہا ''میں کتابوں کی دکان کھولوں گا۔'' کتابوں کی دکان کھولنے کی بجائے وہ بال بچے لے کر نور پور آ گئے۔نور پور میں جمال کو سکول میں داخل کرا دیا گیا۔

## پہلا دن

سکول میں پہلے دن جمال نے کسی لڑکے سے بات نہ کی۔بسم اللہ اسے پہلے آتی تھی مگر یہ اسے پھر سے سکھائی گئی۔شام کے چار بجے تک جمال ناک کی سیدھ میں تکتا رہا۔

دوسرا روز بھی شاید اسی طرح گزر جاتا مگر دوسرے روز جو لڑکا کلاس میں داخل ہوا وہ ناک کی سیدھ میں تکنے والا نہیں تھا۔اس نے آتے ہی دوسرے لڑکوں کو دھکیلنا اور چھیڑنا شروع کر دیا۔جمال جماعت میں سب سے خاموش تھا' اس لیے اس نے اس کی طرف زیادہ توجہ کی۔

اس کے ہاتھ پاؤں سڈول تھے۔رنگ کسی قدر سانولا' دانت خوبصورت' آنکھیں روشن' بال گھنے اور گھنگھریالے تھے جنہیں وہ بار بار کھجاتا۔جیسے ان میں جوؤں کے گاؤں آباد ہوں۔اس کی آنکھ بچا کر ایک

لڑکے نے جمال سے کہا ''یہ فدا محمد سیدوں کا بیٹا ہے۔ اس سے ہوشیار رہنا۔''

نور پور کے سیدوں کی شہرت ایسی ہی ہے اور سید اس شہرت کو برقرار رکھتے ہیں۔ فدا محمد کا باپ مستری اللہ لوک شاہ کسی دور کے شہر میں راجگری کا کام کرتا تھا اور فدا محمد کا ٹرک ڈرائیور بھائی بھی کبھی کبھار ہی نور پور آتا تھا۔

فدا محمد شاہ اکیلا بچہ اپنی بیوہ پھوپھی کے ساتھ نور پور میں رہتا تھا جو خود بے اولاد تھی۔ وہ چھوٹی عمر میں اپنی غربت اور سماجی تنہائی سے واقف ہوگیا تھا۔ وہ ایک حساس اور غصیل بچہ تھا۔ وہ اپنا وجود منوانا چاہتا تھا۔ چند ہی دنوں میں اس نے ساری کلاس کی دواتیں پھوڑ دیں' قاعدے پھاڑ دیئے اور ہر بچے سے لڑائی کر لی۔ مولوی صاحبان اسے بری طرح سے پیٹتے تھے۔ وہ ایک ہی ہاتھ پر بید کھاتا اور یہ اس کی بغاوت کے اظہار کی ایک صورت تھی۔

پھر چھوٹی کلاسیں یکدم بڑی ہونے لگیں۔

## کتے کی بولی

ڈسپلن جمال کو کسی طرح کا بھی پسند نہ تھا۔ گرمی کی دوپہریں اسے حویلی کی پہلی منزل کے ایک لمبے اور اندھیرے کمرے میں ماں باپ کے ساتھ سو کر گزارنی پڑتی تھیں مگر چار گھنٹے روزانہ آنکھیں بند کر کے لیٹ رہنا اسے ظلم لگتا تھا۔ اس نے سکول کی لائبریری سے یارانہ لگالیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ میں کتابیں پڑھتا رہوں' کوئی کام نہ کروں' کسی کا حکم نہ مانوں اور موقع پا کر باہر نکل جاؤں اور دیکھوں گرمیوں کی تیز دھوپ میں کسی کا کیا بگڑتا ہے۔ اس کے اباماں بڑی گہری نیند سوتے تھے اور چار پانچ بجے سے پہلے ان کے جاگنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ادھر عارفہ ڈاکو شیرا بودم اور بکا لنگڑ بگڑ بھی جمال کو اکساتے تھے کہ باہر آ ؤ۔ جنگلی بیریوں کے بیر بڑے میٹھے ہوتے ہیں۔ وہ اسے بلانے کے لیے کھڑکی کے پاس آ کر کتے کی بولی بولتے۔

بلی کی چال چلتا ہوا جمال نکلا تو عارفے ڈاکو نے کہا ''جامی آج گیند گیند کھیلیں۔ برساتی میں کوئی نہیں اس وقت۔''

دوپہر چمکیلی اور سنسان تھی مگر گرمی چنگھاڑ رہی تھی۔ گرمی کی چنگھاڑ کو جمال نے پہلی مرتبہ سنا۔

عارفہ ڈاکو شیرا بودم اور بکا لنگڑ بگڑ گیند کے کھیل سے واقف تھے۔ ان کو پتہ تھا کہ گیند دبانے سے ابھرتا ہے۔

برساتی میں پہنچتے ہی انہوں نے کنڈی چڑھالی اور اپنے اپنے گیندوں کو دبانا اور ابھارنا شروع کر دیا۔ عارفے ڈاکو نے کہا ''جمال تم بھی اپنا گیند نکالو۔''

جمال نے کہا ''میرے پاس گیند نہیں ہے۔'' مگر وہ اپنے کھیل میں مگن تھے۔ وہ اپنے گیندوں کو ہتھیلیوں میں چھپالیتے۔ کبھی اچانک اچھال دیتے۔ پھر ان کے گال سرخ ہوجاتے اور وہ ہانپنے لگ جاتے۔

جمال کو اس کھیل کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا مگر وہ سمجھ گیا کہ یہ بات کسی کو بتانے والی نہیں ہے۔

جب وہ گیند گیند کھیل کر تھک چکے تو صلاح ہوئی کہ اب جا کر بیر کھائے جائیں۔

جنگلی بیروں کی جھاڑیاں نور پور کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ کانٹوں کے ڈر سے جمال نے کبھی بیر توڑے نہ تھے۔ آج اس کا جی چاہا کہ انگلیوں میں کانٹے بھی چبھ جائیں۔

جنگل کی طرف جاتے ہوئے چاروں کو بازار میں سے ہو کر نکلنا پڑتا تھا جہاں جاموں چاچا کی دکان پر موٹے موٹے پیٹوں والے بزرگ ہاتھوں میں کھجور کی پنکھیاں لیے پتے پر پتہ پھینک رہے تھے اور ان میں خواجہ قطب دین بھی تھے۔ جمال کے قدم لڑکھڑائے مگر وہ ادھر اُدھر دیکھے بغیر ناک کی سیدھ میں نکل گیا۔ اس کے پیچھے عارفہ ڈاکو شیرا بودم اور بکا لنگڑ بگڑ۔

جھاڑیوں پر لال لال بیر موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ کانٹے چبھے انگلیاں لہولہان ہوگئیں مگر جمال کو اس درد میں بڑا مزہ آیا۔ اس کے ہاتھوں پر لمبی لمبی خراشیں آ گئیں مگر چاروں دوست ہنستے شور مچاتے بلند آواز میں گندی گالیاں بکتے اور بیر کھاتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد جمال کو خیال آیا کہ دوپہر ڈھل رہی ہے اور ابا جاگنے والے ہوں گے اور مجھے ان کے لیے بادام گھوٹ کر مشروب تیار کرنا ہے۔

جب وہ گلی میں داخل ہوئے تو دھوپ کے سائے لمبے ہو رہے تھے مگر ابھی لوگ جاگے نہ تھے۔

جمال نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور دبے پاؤں چلتا ہوا جا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔

## موٹی کتاب

اس کمرے میں ایک الماری کتابوں سے بھری ہوئی تھی جو اس کے ابا پڑھا کرتے تھے۔ اوپر کے خانے میں چمڑے کی جلد میں ایک بہت بڑی کتاب رکھی تھی۔ جمال کے ابا کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ جمال کتابیں پڑھے مگر انہوں نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ اوپر کے خانے والی موٹی کتاب کو ہاتھ نہ لگائے۔ جمال ہر روز اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا اور سوچتا کہ نجانے اس میں کیا ہے۔ ویسے بھی اس تک اس کا ہاتھ نہ پہنچتا تھا۔

ایک دن جب اس کے ابا خراٹے لینے لگے تو اس نے چارپائی کو دیوار کے ساتھ لگا کر سیڑھی بنائی اور کانپتے ہاتھوں سے وہ بڑی کتاب اٹھالی۔ وہ مولانا ابوالکلام کے اخبار الہلال کی فائل تھی۔

جمال نے اس کے صفحات الٹنے شروع کر دیئے تو اسے ایک مضمون دلچسپ لگا۔ ''غدر کا دوسرا رخ'' اس میں انگریزوں کے مظالم کی تفصیل تھی جو انہوں نے 1857ء میں مغلوں اور ہندوستانی باغیوں پر ڈھائے تھے۔ اس کے بدن میں آگ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ پھر اس کا دستور ہوگیا۔ جب تک عارفہ ڈاکو بشیرا بودم اور بکا لنگڑ بگڑا سے کھڑکی کے پاس آ کر کتے کی بولی نہ بولتے وہ الہلال کو کھنگالتا رہتا۔

جمال کی کتاب میں ایک مضمون تھا حضور ملک معظم شاہ برطانیہ قیصر ہند کی سلطنت پر آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا۔اس مضمون میں حضور ملک معظم کی سلطنت کا جغرافیہ بھی تھا اور جغرافیے سے جمال کی جان جاتی تھی۔ایشیا کے بارے میں اس کا کوئی تصور نہ تھا اور افریقہ کو کتابوں میں تاریک براعظم لکھا جاتا تھا۔رہے عرب تو ان کو وہ حج کے معلموں کے حوالے سے جو ہر سال نور پور میں آ کر عربی بولتے اور نذرانے بٹورتے تھے یا حاجیوں اور حاجنوں کے سنائے ہوئے واقعات سے جانتا تھا مگر ملک معظم شاہ برطانیہ قیصر ہند کے بارے میں اس کی معلومات وسیع تھیں۔

## سلور جوبلی

اعلان ہوا کہ عنقریب نور پور میں حضور ملک معظم شاہ جارج پنجم برطانیہ قیصر ہند کی تخت نشینی کی سلور جوبلی کی تقریب ہوگی جس میں بچے جشن منائیں گے۔

انہیں اس تقریب کے لیے نئے کپڑے بنوانے اور گلابی رنگ کی پگڑیاں رنگوانے کی ہدایت جاری کر دی گئی۔گلابی رنگ جو حضور ملک معظم کی سلطنت کا رنگ تھا۔

بستی کی حالت عجیب تھی۔کنجڑے' قصائی' نونجنت اپنے اپنے کاموں میں مگن رہے مگر پنڈت دینا ناتھ کے آریہ سماج پنڈت رام داس کمپاؤنڈر کے سناتن دھرم مولوی شعبان علی عطار کی انجمن شباب المسلمین میں بھونچال آ گیا۔لگتا تھا کہ سورج جو ملک معظم کی سلطنت میں کبھی غروب نہیں ہوتا' عنقریب نور پور کی دلدل میں اترنے والا ہے۔

سلور جوبلی کے انتظامات میں شہر کے سبھی معززین شامل ہوئے۔کیا ہندو کیا مسلمان مگر ایک بابا وساکھا سنگھ تھا جو اس روز شراب پینے کے لیے بھی گھر سے نہ نکلا۔اپنے پوتے جوگندر سنگھ کو اس نے گلابی پگڑی رنگوا دی تھی کیونکہ یہ اسلامیہ سکول کے ہیڈ ماسٹر کا حکم تھا مگر خود اسے سلور جوبلی کی کوئی پرواہ نہ تھی۔

گوگے حلوائی نے بھی جس کو بچوں میں لڈو تقسیم کرنے تھے' بوسکی کا تہبند باندھ کر سر پر گلابی پگڑی سجا لی تھی۔حالانکہ وہ سکول کا بچہ نہ تھا۔

## بلڈی فول فیکن

مگر رسالدار محمد نواز کی بات ہی کچھ اور تھی۔رسالدار جنگِ عظیم کا ریٹائرڈ فوجی تھا۔بصرے میں اس نے خدمات انجام دی تھیں اور ان دنوں پنشن اور دو مربعے کی جاگیر پا کر نور پور میں عزت کا نان کلچہ کھاتا تھا۔

اس روز جب شہر کے صدر دروازے کے سامنے سکول کے سیکڑوں بچے سروں پر گلابی رنگ کی طرح دار پگڑیاں باندھ کر کھڑے ہو گئے' سکاؤٹ اپنے اپنے مورچوں پر ڈٹ گئے۔ماسٹر صاحبان بت بن گئے اور سڑک پر سناٹا چھا گیا تو محمد نواز رسالدار اپنی پرانی وردی میں ملبوس سینے پر میڈل لٹکائے گھوڑا دوڑاتا اِدھر اُدھر جائزہ لینے کے بعد گھبرا کر بولا "یہ فیکن جوہڑا کہاں ہے۔کسی حرامزادے نے عین سڑک پر لید کر دی ہے اور صاحب بہادر پہنچنے ہی والے ہیں۔"

کچھ فاصلے پر ایک کسان اپنے ٹٹو پر کہیں جا رہا تھا۔

"کون ہے۔کدھر جاتا ہے تو؟" پنڈت دینا ناتھ للکارے۔

"پکڑو پکڑو۔" خواجہ قطب دین نے نعرہ مارا۔"بے ایمان کے ٹٹو نے لید کر دی ہے۔"

سکاؤٹ دوڑ کر اسے پکڑ کر لے آئے۔

اس نے سفید تہبند باندھ رکھا تھا۔ڈھلے ہوئے کھدی کے کرتے پر لمبا کالا کوٹ پہنے ہوئے وہ چھوٹی مالکی کا ایک معزز کسان معلوم ہوتا تھا۔اسے پتہ نہ تھا کہ مجھے کیوں پکڑ کر کھینچا جا رہا ہے۔رسالدار نے اتنے لمبے کالے بوٹ اور برجس کیوں پہن رکھی ہے۔اس کی سفید براق داڑھی اتنی خشمگیں کیوں ہے۔ایڑیوں پر بندھی ہوئی چمکیلی مہمیز بار بار گھوڑے کے پیٹ میں کیوں ماری جا رہی ہے اور یہ سب لوگ گلابی پگڑیاں باندھے اس قدر پریشان کیوں کھڑے ہیں۔

وہ اپنے کسی کام سے جاتا تھا۔اس کو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ اچانک میرے ٹٹو نے سڑک پر لید کر دی ہے اور یہ بری بات ہے۔

رسالدار نے کسان کو ایک چابک مارا اور کہا "نیچے اترو بلڈی فیکن فول۔ہمارے سامنے سواری کرتا ہے؟"

کسان حیران و پریشان گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔

"یہ لید تمہارے ٹٹو نے کی ہے بلڈی فیکن فول؟"

"تجھے پتہ نہیں کہ آج حضور ملک معظم کی سلور جوبلی ہے۔" پنڈت رام داس بولے۔

"اور حضور ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر یہاں پہنچنے ہی والے ہیں۔" مولوی شعبان علی عطار چنگھاڑے۔

"اور تو ان کا راستہ گندا کرتا ہے؟" لالہ دینا ناتھ بولے۔

"تجھے جان کی پرواہ نہیں۔" خواجہ قطب دین کڑکے۔

کسان کچھ دیر ٹکر ٹکر تکتا رہا۔سمجھ گیا کہ سلامتی اسی میں ہے کہ میں چپ رہوں۔

"اب دیکھتا کیا ہے بلڈی فیکن فول۔" رسالدار نے ڈانٹ کر کہا "اٹھا اس لید کو۔"

"جلدی اٹھا۔" پنڈت رام داس بولے۔"صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر اب آئے کہ آئے۔"

"اور اٹھا کر دور لے جا۔" مولوی شعبان علی عطار نے حکم دیا۔

"ابھی اسی وقت!" خواجہ قطب دین نے کڑک کر کہا۔

کسان حیران ہو کر کبھی ان چاروں کو دیکھتا۔کبھی لید پر نگاہ ڈالتا۔اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں لید کو کیوں اٹھاؤں اور اٹھا کر کہاں لے جاؤں کیونکہ سڑک پر کوئی صاف یا گندی جگہ نہ تھی۔سب کچھ دھول ہی

دھول تھا۔ اس چھوٹے سے کچے راستے پر کسی نے موٹا موٹا جھاڑو پھیرا ہوا تھا جس پر لوگ ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کا انتظار کر رہے تھے۔ کسان نے گھبرا کر پوچھا ''پر میاں جی میں اس لید کو کیوں اٹھاؤں اور کہاں پھینکوں؟''

''تو تو اس لید کو اٹھانا نہیں چاہتا۔ یو بلڈی فیکن فول؟'' رسالدار صاحب گرجے۔

''تو حضور ملک معظم قیصر ہند کی سلور جوبلی خراب کرنا چاہتا ہے۔'' پنڈت رام داس نے کڑک کر کہا۔

''صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کو ناراض کرنا چاہتا ہے؟'' مولوی شعبان علی عطار بولے۔

''لید کی بدبو سے میم صاحب بہادر کو بیمار کرنا چاہتا ہے؟'' لالہ دینا ناتھ نے گرہ لگائی۔

''قید ہونا چاہتا ہے؟ برباد ہونا چاہتا ہے؟'' خواجہ قطب دین نے دھمکی دی۔

سب کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ قریب تھا کہ سب اس معزز کسان پر ٹوٹ پڑیں اور اُس کی بوٹیاں نوچ ڈالیں کہ اس نے گھبرا کر پوچھا ''پر میاں جی میں اس لید کو کیا کروں؟''

''ساتھ لے جا بلڈی فیکن فول۔ اپنے گھر لے جا۔ بے بے کے پاس لے جا۔'' رسالدار صاحب نے جواب دیا۔

پنڈت جی لالہ جی' مولوی شعبان علی اور خواجہ قطب دین نے اس مشورے کی پرزور تائید کی اور کہا ''جلدی کر کھوتے کے بچے۔ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر بس آئے کہ آئے!''

کسان لید کے ڈھیر کو اپنے ہاتھوں سے اٹھانے لگا مگر اس کی مقدار کچھ زیادہ تھی اور ہاتھوں میں سماتی نہ تھی۔ یہ دیکھ کر رسالدار نے کہا ''بلڈی فیکن فول اسے اپنی پگڑی میں باندھ لے' تم دیہاتیوں میں ذرا بھی عقل نہیں۔''

کسان نے مردہ ہاتھوں سے اپنی دھلی ہوئی دستار جسے وہ اپنے وقار کی علامت سمجھتا تھا' سر سے اتاری' غلاظت کو اس میں باندھا اور ٹٹو کی باگ پکڑ کر آہستہ آہستہ مڑ کر دیکھے بغیر روانہ ہو گیا۔

جمال اور فدا محمد قطار میں کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔

دیہاتی غیر مہذب اور حیوان ہوتے ہیں' وہ سرکار کو مالیہ نہیں دیتے۔ چوری ڈاکے کی وارداتیں کرتے ہیں اور حضور ملک معظم کی سلور جوبلی کی راہ میں گھوڑوں کی لید پھیلاتے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کو اور دوسرے بچوں کو کسانوں کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔

## گاڈ شیو دی کنگ

جمال اور فدا محمد اپنی قطار میں کھڑے تھے۔ ان کے آگے پیچھے اسلامیہ ہائی سکول کے باقی بچوں کی قطاریں تھیں۔ ان سے کچھ ہٹ کر ہندو سکول کے بچوں نے پرے جما رکھے تھے۔

تھانہ ہندو اور مسلمان علاقوں کے وسط میں واقع تھا مگر اس روز نور پور میں ہندو اور مسلمان کی کوئی تمیز نہ تھی۔ دونوں کے بزرگ اور معتبر دست بستہ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر اور میم صاحب بہادر کے انتظار میں کھڑے تھے۔

ملک محمد نواز رسالدار بہت مضطرب تھا۔ وہ اچانک گھوڑے کو مہمیز لگاتا اور آن کی آن میں دھول اڑاتا نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ پھر اسی طرح اڑتا ہوا واپس آ جاتا اور اپنی زنجیر سے لٹکی ہوئی گھڑی جیب سے نکال کر وقت دیکھتا۔

اس کو دیکھ کر تمام معززین اپنی اپنی گھڑیاں نکال کر دیکھتے اور کھسر پھسر کرتے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کی عجیب حالت تھی۔ ان کی دستار سر پر ٹکتی نہ تھی۔ وہ بار بار اسے اتارتے اور پھر سر پر رکھ لیتے۔ پھر لڑکوں پر ایک نظر ڈالتے اور ماسٹروں کو پہلے سے دی ہوئی ہدایات دہرانے لگتے۔

میاں عیدا نے اس روز نیکر پہن رکھی تھی۔ اس پر سکاؤٹوں والی قمیص' پیٹی کے ساتھ ایک چاقو' سفید رسی کا ایک گچھا اور ایک سیٹی بھی لٹک رہی تھی۔ ان کے ہاتھ میں ایک پتلی سی ڈانگ تھی جسے انہوں نے زمین پر جمایا ہوا تھا۔

میاں عیدا نے چپکے چپکے ماسٹر نصر اللہ سے کچھ انگریزی پڑھ لی تھی اور ان دنوں وہ میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے مگر لڑکوں کو اس بات کا پتہ نہ تھا۔ وہ چپ چاپ کھڑے تھے جیسے کوئی بہت بڑی مصیبت آنے والی ہو۔

اب کے ملک محمد نواز رسالدار گھوڑا اڑاتے ہوئے لوٹے تو دور ہی سے چیخے۔ ''آ گئے آ گئے صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر آ گئے ہوشیار بلڈی فیکن بول۔''

لالہ مکند لال' مولوی محمد شعبان عطار' سیٹھ بہرام' پنڈت رام داس کمپاؤنڈر' خواجہ قطب دین بھی ایڑیاں اٹھا اٹھا کر افق کی جانب دیکھنے لگے مگر دھول میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

میاں عیدا اکڑ کر سونٹا ہو گئے۔ انہوں نے چھاتی پھلا کر دم روک لیا۔

''میم صاحب بہادر بھی ساتھ ہیں۔'' رسالدار صاحب نے کہا ''میں نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا فیکن مال افسر صاحب بہادر۔ کپتان پولیس بہادر اور کئی اور صاحب بہادر اور تھانیدار صاحب مع گارڈ اردل میں ہیں۔ گھوڑے دلکی میں ڈال رکھے ہیں۔'' رسالدار صاحب خوشی سے بولے۔ ''اے لو اب وہ صاف نظر آنے لگے۔ بلڈی فیکن۔''

پھر انہوں نے بینڈ والوں کو اشارہ کیا۔ کلارنٹ والے نے اپنا مقبول عام مکھڑا کہا ''غازی مصطفےٰ پاشا کمال دے۔ گورے پھڑ پھڑ توں کیتے حلال دے...... پم پم پم پم!''

یہ اس زمانے کا مقبول عام گیت تھا۔ نور پور کے باجے والے یہ نغمہ عام طور پر بچوں کے ختنوں کے موقع پر چھیڑا کرتے تھے۔

ملک محمد نواز رسالدار کو جیسے بجلی کا تار چھو گیا ہو۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اچھل اچھل کر باجے

ولوں ہنٹر برسانے لگا۔ ''حرامزادو' کتو!''

پنڈت دیناناتھ' مولوی محمد شعبان عطار' سیٹھ رلیارام' پنڈت رام داس کمپاؤنڈر اور خواجہ قطب دین کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ میاں عیدا اسی طرح سونٹے کی طرح اکڑے کے اکڑے کھڑے رہے۔

معززینِ شہر نے باجے والوں پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر دی جنہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ ہمیں کیوں مارا جا رہا ہے۔

جمال اور فدا محمد کو بھی معلوم نہ تھا۔ انہیں یہ دھن اچھی لگتی تھی۔ اس میں ڈھول بڑی خوبصورت گونجدار لے بناتا تھا۔

پنڈت دیناناتھ نے باجے والوں کو بڑی مشکل سے سمجھایا تو انہوں نے دوسری دھن بجانی شروع کر دی۔

''یسوع اترآ سانوں آیا۔ پم پم پم!''

جمال نے اس سے پہلے انگریزوں کو دہلی میں دیکھا تھا۔ جب وہ گالف کھیلنے آتے تھے۔ چونکہ حضور ملک معظم کی سلطنت پر آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا تھا اس لیے اس کے دل میں حضور ملک معظم کو دیکھنے اور انہیں سلام کرنے کی بڑی آرزو تھی۔ اس کے دل میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں جیسے حضور ملک معظم اس کا سلام وصول کرنے کے لیے خود نور پور آ رہے ہوں۔

ڈھول کچھ چھٹی تو لوگوں نے سینوں میں دم روک لیے۔

''گھوڑا اپو یئے میں ڈال رکھا ہے خیر سے۔ میں نے کہا تھا نا فیکن فول۔'' ملک محمد نواز بولے۔

''سبحان اللہ سبحان اللہ!'' مولوی محمد شعبان منمنائے۔ جیسے حضور ملک معظم ان کی بات سن رہے ہوں۔

پنڈت جی بولے ''انگریز کی بھی کیا شان ہے جیسے کوئی دیوتا اگنی رتھ پر آکاش سے اترے۔''

''یہ اہلِ کتاب کی شان ہے۔'' مولوی صاحب نے غصے سے جواب دیا۔ ''انگریز اہلِ کتاب ہے۔ کافر اور بے ایمان نہیں۔ اہلِ کتاب کی شان کے کیا کہنے!''

پنڈت جی چپ ہو گئے جیسے دیوتا کے حضور میں جھگڑا کرنا گناہ ہو۔

دیوتا تھانے کے سامنے آ کر گھوڑے سے اتر گیا۔ اس کے ساتھ ہی فیکن مال افسر صاحب بہادر فیکن پولیس کپتان صاحب بہادر' فیکن تھانیدار معہ گارڈ وغیرہ سارے بلڈی فیکن فول جو صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کے ہم رکاب تھے۔

ملک محمد نواز نے پاؤں جوڑ کر سلیوٹ مارا۔ مولوی شعبان علی پنڈت دیناناتھ' خواجہ قطب دین اور ہیڈ ماسٹر غلام محمد پھولوں کے ہار ہاتھوں میں لیے آگے بڑھے۔

''تھینک یو تھینک یو۔'' صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر نے کہا اور انہیں ہار پہنانے سے روک دیا۔ پھر بولے ''ہم جانتا تم لوگ حضور ملک معظم کا وفادار ہے۔ اس واسطے اتنا پھول لایا۔ میم صاحب کو ڈے دو۔'' اس پر حاضرین اور معززین نے تالیاں بجائیں۔ عین اس وقت میاں عیدا نے کڑک کر کہا ''گاڈ شیو دی کنگ۔''

''گاڈ شیو دی کنگ۔'' بچوں کے جواب سے بستی گونج اٹھی۔

ہیڈ ماسٹر صاحب لپک کر میاں عیدا کے پاس پہنچے اور سرزنش کے انداز میں مگر اس طرح کہ لوگ سن لیں' بولے ''گاڈ شیو دی کنگ نہیں۔ حضور ملک معظم کے چہرے پر تو داڑھی عجب بہار دیتی ہے کہو گاڈ سیو دی کنگ شین سے نہیں سین سے۔ گاڈ سیو دی کنگ۔''

ڈپٹی کمشنر صاحب کو کچھ پتہ نہ چلا۔ وہ معززینِ شہر سے ہاتھ ملانے میں مصروف تھے۔ ملک محمد نواز رسالدار لپک لپک کر معززین کو صاحب ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کے حضور میں پیش کر رہا تھا۔ صاحب بہادر کے بعد میم صاحب نے سب کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ ہاتھ ملانے کے بعد معززین نے اپنے ہاتھوں کو بڑی احتیاط سے نیچے لٹکا لیا۔ ایسے کہ کپڑا اُن کو چھو نہ جائے۔

میم صاحب کے ہاتھ گلابی رنگ کے گیند لگتے تھے۔ گول گول نرم نرم۔ جمال نے سوچا کہ اگر یہ گلابی گیند اس کے ہاتھ میں آ جائیں تو کتنا مزا آئے۔

تعارف کے بعد صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر نے بچوں پر نظر ڈالی اور مسکرا کر بلند آواز میں بولے ''حضور ملک معظم قیصر ہند ہندوستانی بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں۔ تم حضور ملک معظم قیصر ہند کے وفادار رہو اور مزے پاؤ۔''

''حضور ملک معظم قیصر ہند زندہ باد!'' ملک محمد نواز نے نعرہ لگایا۔ بستی نور سے بھر گئی۔

جمال کو ڈپٹی کمشنر ایک لمبا تڑنگا بندر لگا جس نے سفید پتلون اور ہیٹ پہن رکھا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ میں زور سے تالیاں بجاؤں اور بلند آواز میں نعرہ لگاؤں ''باندر اوئے باندر اوئے۔'' اس کا دل رسالدار کے مصالحہ کھائے ہوئے گھوڑے کی طرح ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا اور عارفہ ڈاکو کو کہنیاں مار مار کر تماشا دکھا رہا تھا۔

ڈپٹی کمشنر نے واپسی کے لیے پاؤں رکاب میں رکھا تو پوری پارٹی سوار ہو گئی' لہٰذا باجے والوں نے پھر چیخنا شروع کر دیا ''یسوع اترآ سانوں آیا' پم پم پم!''

ملک محمد نواز پارٹی کے آگے آگے ہوئے تاکہ اسے بستی کی سرحدوں تک پہنچا آئیں۔ گھوڑے دلکی میں چلے تو ڈھول نے گوگا حلوائی کے بنائے ہوئے لڈوؤں کے ٹوکروں کو ڈھانپ لیا مگر بچوں کو یہ کرکراتے ہوئے لڈو بہت مزے کے لگے۔

ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر نور پور سے بہت خوشی خوشی لوٹے تھے۔ مسجدوں اور مندروں کے مینار اور کلس پہلے سے کچھ اونچے ہو گئے تھے۔

❧❧❧❧❧❧❧❧❧❧

# باب 3

عربی سے جمال ہمیشہ کتراتا۔قرآن شریف کا ترجمہ یاد کرنا مشکل کام تھا مگر فارسی اسے اچھی لگتی تھی۔وہ فارسی کے ماسٹر صاحب کے ہاں پڑھنے'ان کے گھر کا سودا سلف لانے اور ان کی بھینس کو نہلانے پر ہمیشہ تیار رہتا۔

ماسٹر صاحب کی شادی نئی نئی ہوئی تھی۔ان کی بیوی پازیب پہنتی تھی اور تلوؤں پر مہندی لگاتی تھی۔وہ جمال سے پردہ نہ کرتی تھی۔گھونگھٹ بھی نہیں نکالتی تھی کیونکہ جمال اسے چھوٹے بھائی جیسا لگتا تھا۔

**الہڑ دلہن**

ماسٹر صاحب جمال کو فارسی پڑھاتے تو ان کی الہڑ دلہن پاس بیٹھ کر چاول چنتی اور اِدھر اُدھر کی گپ ہانکتی۔جمال ماسٹر صاحب کے لیے حقہ تازہ کرتا تو وہ اُپلوں کی آگ بناتی۔پھونکیں مار مار کر اس کی کالی کالی آنکھیں لال ہو جاتیں۔جمال کو اس کی گیلی آنکھیں اور گدگدے جیسے ہاتھ بہت اچھے لگتے تھے۔کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ میں ان کو چھو کر دیکھوں۔

اب وہ ذہنی طور پر بچوں کی کتابوں سے نکل چکا تھا۔اس نے الف لیلہ پڑھ لی تھی۔وہ بازار سے گزرتا تو اِدھر اُدھر دیکھتا کہ شاید خچر پر سوار کوئی لمبی آنکھوں والی حسینہ اس کی تلاش میں ہو اور اسے گھر لے جا کر اپنی سنہری مسہری پر سلائے۔وہ اکثر سوچتا کہ کاش میں بھی بغداد کا کوئی سوداگر بچہ ہوتا مگر نور پور میں اسے کوئی زنگی غلام اور خچر پر سوار کوئی حسینہ نظر نہ آتی۔تھک ہار کر وہ لنگڑے موچی کی دکان پر بیٹھ جاتا جو جوتے کے بدلے کھیس کا تبادلہ کرتا اور جمال کو نصیحت کرتا کہ تمہیں تعلیم پر زیادہ دھیان دینا چاہیے تاکہ بڑے افسر بن سکو۔ماں باپ کا نام روشن کر سکو۔

بڑے افسر بننے کی جمال کو کبھی آرزو نہ ہوئی۔بعد میں جب اتفاق سے وہ بڑا افسر بن گیا تو بھی اسے کچھ مزہ نہ آیا۔لنگڑے موچی کی اس وقت ہڈیاں گل چکی تھیں ورنہ وہ اس سے پوچھتا کہ میں بڑا افسر بن گیا'پھر کیا میرے ماں باپ کا نام روشن ہو گیا؟

ایک دن فارسی والے ماسٹر صاحب کے گھر میں اسے ایک کتاب ملی''زاہدہ کی آپ بیتی''الف لیلہ کے بعد اسے کسی اور کتاب کے پڑھنے کی آرزو نہ تھی مگر اس کتاب کا عنوان بڑا خیال انگیز تھا۔زاہدہ کی آپ بیتی!

ماسٹر جی نے کتاب اس کے ہاتھ سے چھین لی اور غصے سے اسے گھورنے لگے۔''یہ کتاب تمہارے پڑھنے کی نہیں۔''انہوں نے کہا۔

ماسٹر صاحب کی بیوی بولی''کیوں اس کے پڑھنے کی کیوں نہیں۔جب تم پڑھتے ہو تو وہ کیوں نہ پڑھے۔''

ماسٹر صاحب نے کہا''تو نہیں سمجھتی بے وقوف۔تو ان پڑھ ہے۔میری اور بات ہے۔میں بڑا ہوں۔جمال ابھی بچہ ہے اور بچوں کو ایسی کتابیں نہیں پڑھنی چاہئیں۔''

انہوں نے جمال کے دل میں اس کتاب کے پڑھنے کا اشتیاق پیدا کر دیا۔اس نے پوچھا''ماسٹر جی بچوں کو کیوں نہیں پڑھنی چاہیے جی یہ کتاب۔''

''جب تو بڑا ہو گا تو سمجھ جائے گا۔چل مجھے گردان سنا۔کرد کردند۔ہاں شاباش۔''

جمال گردان دُہرانے لگا مگر زاہدہ اس کے دل میں کھبی رہی۔نجانے اس پر کیا بیتی!

ماسٹر جی کی بیوی اُپلوں کی آگ بنانے لگی تو جمال چولہے کے قریب جا کر آگ کو پھونکیں مارنے لگا۔دھوئیں سے اس کی آنکھیں کڑوی ہو گئیں تو اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ماسٹر جی کی بیوی نے قہقہہ لگایا اور اسے پیچھے دھکیل دیا۔اس کے ہاتھ گیند کی طرح گول تھے۔اس کا چھونا جمال کو بہت اچھا لگا۔

''میں دوں گی تجھے کتاب۔''اس نے آہستہ سے جمال سے کہا''ماسٹر گاؤں جائے گا تب۔''

''کب جائیں گے؟''

''کل۔''وہ پھونک مار کر بولی۔''اس کے تایا کے نواسے کی سنتیں ہیں۔دو روز اسے لگ جائیں گے۔کل آ کر کتاب لے جانا اور پرسوں تک پڑھ لینا۔خود اس نے بھی یہ کتاب ایک رات میں پڑھی تھی۔پڑھ کر مجھے بھی بتانا کہ کیا لکھا ہے اس میں۔کتابیں کیا بری بھی ہوتی ہیں جمال؟''

''کبھی نہیں۔''جمال نے وثوق سے کہا۔اگرچہ خود اس کو اس کا یقین نہیں تھا۔

وہ زور زور سے پھونکیں مارنے لگی۔شعلہ بھڑک اٹھا تو بولی''بے شک میں اَن پڑھ ہوں مگر مجھے پتہ ہے کہ کتابوں میں کبھی کوئی بری بات نہیں ہوتی۔کتابوں میں نیکی کی باتیں ہوتی ہیں۔''

اگلے روز جب ماسٹر جی اپنے تایا کے نواسے کی سنتوں میں شرکت کے لیے گاؤں جا چکے تو ان کی بیوی نے زاہدہ کی آپ بیتی جمال کے حوالے کر دی۔کتاب لیتے ہوئے جمال کا ہاتھ ماسٹر جی کی بیوی کے نرم اور گدگدے ہاتھ سے ٹکرا گیا۔''اوئی''اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

جمال نے کتاب نیفے میں اڑس لی۔گھر جاتے ہی اس نے اعلان کر دیا کہ مجھے سردی لگ رہی ہے۔

''اسے تپ چڑھے گا۔''جمال کی والدہ نے اس کے گالوں پر ہاتھ لگا کر کہا''ملیریا اسے چھوڑتا ہی نہیں۔''

خواجہ یٰسین نے بات ان سنی کرتے ہوئے کہا''جا لحاف لے کر سو جا۔آج رات نہ پڑھ۔''

اور یہ جمال کے منصوبے کے عین مطابق تھا۔ وہ نانا کے گھر چلا گیا۔ اس نے کتاب کھولی۔ شروع کے کچھ اوراق اسے بے مزہ لگے۔ پھر وہ اس میں گم ہو گیا۔

زاہدہ ایک اچھے گھر کی لڑکی تھی۔ پھر اسے کسی نے گھر سے بھگا کر کوٹھے پر بٹھا دیا۔ کتاب میں زاہدہ کے فرار اور ان بے شمار راتوں کی تفصیلات درج تھیں جو اسے طرح طرح کے مردوں کے ساتھ گزارنی پڑیں۔

جمال کے خیالات میں لڑکیوں کے گھر سے بھاگنے کا کوئی تصور نہ تھا۔ نور پور کی لڑکیاں تو تھان پر بندھی ہوئی گائیں تھیں۔ ان کو کبھی کسی نے انسان نہ سمجھا تھا۔ انہیں کبھی اچھے کپڑے نہ ملے تھے۔ انہیں بچا کھچا کھانا کھلایا جاتا تھا۔ بیمار ہوتیں تو ان کا علاج بھی کوئی نہ کرواتا۔ بڑی بوڑھیاں ان کی ولادت پر ناک بھوں چڑھاتیں۔ ناراض ہوتیں تو کہتیں اللہ انہیں موت کیوں نہیں دیتا۔ خوش ہوتیں تو کہیں ''مرجانی کتنی اچھی ہے۔ مرجانی نے برتن کتنے اچھے دھوئے ہیں۔ مرجانی کی شادی ہونے والی ہے۔ اللہ کرے اپنے گھر میں خوش رہے مرجانی۔''

ان کی شادیاں بزرگ طے کرتے تھے۔ ان کے لیے حق مہر بھی مانگا نہ جاتا تھا۔ میکے سے نکل کر بھی وہ ظلم سہتی تھیں۔ ساس کا، نندوں کا، اپنے بال بچوں کا اور اپنے خاوندوں کا۔ ان میں اور زاہدہ میں اتنا فاصلہ تھا کہ جمال زاہدہ کے حوالے سے کچھ سمجھ ہی نہ سکتا تھا۔ وہ اس کے لیے ایک دلچسپ اور نامانوس جنس تھی۔

زاہدہ کی آپ بیتی اس نے رات ہی میں ختم کر ڈالی اور اس کے الف لیلہ کے خواب پھر تازہ ہو گئے۔ اس کے دل میں زاہدہ کو ملنے اور اس کی باتیں سننے کی خواہش بیدار ہو گئی مگر کتاب میں اس کے گھر کا پتہ تو لکھا ہی نہ تھا۔

پھر اس میں بھی وہ گراموفون ریکارڈ سننے کی شدید خواہش پیدا ہوئی جن کے بول زاہدہ کی آپ بیتی میں لکھے تھے مگر نور پور میں باجا اور ریکارڈ صرف ملک محمد نواز رسالدار کے گھر میں ہی تھے جہاں جمال کی رسائی نہ تھی۔

جمال نے فدا محمد سے بات کی۔

فدا محمد نے کہا ''میرا رسالدار کے گھر میں آنا جانا ہے مگر میں وہاں سے باجا اور ریکارڈ نہیں لا سکتا۔ ریکارڈ سننا بری بات ہے۔''

گانا سننا نور پور میں بری بات سمجھی جاتی تھی۔ جب بڑے باجا بجاتے تھے فرض کر لیتے تھے کہ بچے نہیں سن رہے۔

**رسالدار کی بیٹی**

''رسالدار کی ایک بیٹی بھی ہے۔ اس کے گھر جانا ایک خطرناک بات ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔''

''کیا کہیں گے فدا محمد؟''

''لڑکی جوان اور خوبصورت ہے۔ اس کا ایک بھائی ہے بیچارہ بڑا شریف ہے۔ گڈی اس کے کوٹھے پر گر جائے تو واپس کر دیتا ہے۔ لاہور میں پڑھتا ہے آج کل۔''

''لڑکی کا کیا نام ہے؟''

''نور جہاں۔ مگر کسی سے بات نہیں کرتی۔ وہ گھر میں بڑی ریکارڈ سنتی ہے سارا دن۔''

''تو اس کو کوئی منع نہیں کرتا؟'' جمال نے حیران ہو کر پوچھا۔

''گھر میں ہے کون اس کی ماں کے سوا۔ یار اس کی ماں بھی جوان ہے ابھی۔ رسالدار تو بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس کی دوسری بیوی ہے۔ اب تو وہ گھر بھی کم ہی آتا ہے۔ سارا دن باہر کی حویلی میں پڑا رہتا ہے اکیلا۔ محمد علی بروالا اسے دو وقت کھانا دے آتا ہے وہیں۔''

''نوراں کے تو پھر بڑے مزے ہوں گے۔ بڑی لاڈلی ہو گی ماں کی۔''

''لاڈلی بھی ہے اور مغرور بھی۔ وہ اردو بولتی ہے اور کاپی میں شعر لکھتی ہے۔''

''اردو بولتی ہے؟'' جمال نے پوچھا۔

اس کی مادری زبان جو ہوئی۔ اس کی ماں دہلی کی رہنے والی ہے۔ نور پور میں اس کا کوئی رشتہ دار نہیں۔ کسی سے ملتی جلتی بھی نہیں۔ اس کے سوتیلے بیٹے اس کے ساتھ بات چیت نہیں کرتے۔ رسالدار مر جائے گا تو زمین پر جھگڑا ہوگا تم دیکھنا۔ وہ تو ابھی سے کہتے ہیں کہ ہم انہیں واپس دہلی پہنچا کر دم لیں گے۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک آوارہ عورت تھی۔ اس نے ناز نخرے دکھا کر ہمارے باپ کو پھنسا لیا تھا۔''

''کچھ کچھ میں نے بھی سنا ہے۔ تاجی بہت سی باتیں کرتی تھی مگر یار وہ رسالدار کی بیوی۔ اب تو شریف ہے نا۔'' جمال بولا۔

''اصل میں وہ خود آوارہ عورت نہیں تھی۔'' فدا محمد نے کہا ''اس کی ماں طوائف تھی۔''

''مگر اس میں نور جہاں کی کیا خطا؟''

''نور جہاں کی کوئی خطا نہیں مگر وہ کسی سے سیدھے منہ بات بھی تو نہیں کرتی نا؟''

''نور جہاں خوبصورت جو ہے۔ اس کی طرف دیکھو تو دیکھ نہ سکو۔ اپنی ماں پر گئی ہے۔ رسالدار کی ناک تو گھوڑے جیسی ہے۔ جب میں پتنگ اڑاتا ہوں تو دیکھتا ہوں کوئی کتاب یا رسالہ ہمیشہ نور جہاں کی گود میں ہوتا ہے۔''

جمال نے سوچا کہ اگر وہ کتابیں رسالے پڑھتی ہے تو اس نے زاہدہ کی آپ بیتی بھی پڑھی ہوگی۔ اس خیال سے اس کا چہرہ کھل گیا۔ رنگوں اور روشنیوں کے دریچے کھل گئے مگر اس نے فدا محمد سے بات نہ کی کیونکہ فدا محمد نے تو زاہدہ کی آپ بیتی پڑھی نہ تھی۔

فدا محمد نے الف لیلہ بھی نہ پڑھی تھی۔ اسے زنگی غلاموں اور مٹک مٹک کر چلتی ہوئی کنیزوں کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ زیورات سے لدے ہوئے خچروں پر سوار رنگین چادروں میں لپٹی ہوئی

طرحدار حسیناؤں اور نوخیز جوہری بچوں کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔

جمال نے کہا ''تم کیسے کہتے ہو فدا محمد کہ میں اسے دیکھوں تو دیکھ نہ سکوں۔''

''دیکھ کر دیکھ لو۔'' فدا محمد نے جواب دیا۔

دونوں کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ فدا محمد کے چوبارے کی چھت پر چڑھ گئے۔ رسالدار کی ممٹی میں کوئی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر میں نوراں کی ماں کپڑے سکھانے کے لیے چھت پر آ گئی۔

وہ چالیس پینتالیس سال کی ایک گوری چٹی عورت تھی۔ تول تول کر قدم رکھتی تھی۔ کپڑے پھرتی سے جھٹکتی تھی۔ اچانک اس نے جمال اور فدا محمد کو دیکھ لیا۔ فدا نے اشارے سے اسے سلام کیا۔

''جیتے رہو۔'' اس کی آواز آئی۔ ''یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟''

جمال نے جلدی سے سر اونچا کر کے کہا ''جی میں ہوں جمال ماسی جی۔''

''خواجہ یٰسین کے بیٹے؟ مگر تم چھپ کیوں گئے تھے' شرماتے ہو؟''

''جی نہیں۔ میں نہیں شرماتا۔''

اچانک اس نے آواز دی۔ ''نوراں اری نوراں!''

جمال کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

نوراں ممٹی کی طرف سے نکلی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ وہ جمال اور فدا محمد کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئی۔

جمال اسے دیکھ نہیں سکا مگر اس کو یقین ہو گیا کہ وہ بڑی دلربا لڑکی ہے جس کو دیکھو تو دیکھا نہ جائے۔

جانے سے پہلے نوراں کی ماں نے فدا محمد سے کہا ''کبھی آنا ہمارے گھر۔ ایک پتنگ پڑی ہے لے جانا آ کر اور اس کو بھی ساتھ لانا اپنے یار کو۔''

نیچے اتر کر دونوں اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنے لگے۔ پھر نوراں کے گھر جانے کے پروگرام بننے لگے۔

## نوراں کے گھر

دو روز بعد دونوں نوراں کے گھر کی طرف چلے۔ ان کے دل اچھل رہے تھے۔ جمال نے کہا ''فدا محمد تم دروازے پر دستک دو۔''

''کون ہے؟'' نوراں کی ماں بولی۔ ''دروازہ کھلا ہے۔''

دونوں اندر داخل ہو گئے۔

''ماسی سلام۔'' فدا محمد نے کہا۔ جمال کچھ نہ بولا۔

ماسی پلنگ پر لیٹی تھی۔ انہیں دیکھ کر مسکرا دی۔ نور جہاں نے دونوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

''جانوراں! انہیں اندر سے پتنگ لا دے۔ پلنگ کے نیچے پڑی ہو گی۔''

نوراں لپک کر گئی اور اس نے پتنگ لا کر ان کے سامنے ڈال دی جیسے کتے کو روٹی دیتے ہیں۔

نوراں لانبے قد کی لڑکی تھی۔ کمر پتلی' سینہ بھرا ہوا اور پیٹھ گول جیسے کوئی بہت بڑا گیند ہو جس سے کوئی کھیل نہ سکے۔

جمال نے تھوک نگل کر کہا ''ماسی سنا ہے آپ کے ہاں بڑے بڑے اچھے ریکارڈز ہیں۔''

''اچھا؟'' نوراں کی ماں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''تمہیں ریکارڈ سننے کا شوق ہے اس عمر میں؟'' اس کا چہرہ کسی قدر حیرت سے کھل گیا۔

جمال بولا ''جی ہم اصل میں دوسرے ریکارڈ سننے کے لیے آئے ہیں۔ زاہدہ کی آپ بیتی والے نہیں۔''

''زاہدہ کی آپ بیتی والے کون سے ریکارڈ ہیں؟'' نوراں کی ماں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''جی ہم دراصل عشقیہ ریکارڈ سننے نہیں آئے۔ ہم تو قوالیاں اور نعتیں سننے آئے ہیں۔ ہم تو ابھی بچے ہیں۔''

نوراں کھلکھلا کر ہنسی۔ پھر یکدم خاموش ہو گئی۔

نوراں کی ماں بولی ''ٹھیک ہے تم نیک والدین کی اولاد ہو۔ پیار محبت کے گیت سننے کی تمہاری عمر نہیں۔ یہ بڑے گورکھ دھندے ہوتے ہیں۔'' نوراں سے مخاطب ہو کر بولی ''جانوراں! ان کے لیے بھائی چھیلا کی نعتیں اور گوہر سلطانہ کی مناجاتیں لے آ۔''

جمال اور فدا محمد کو نوراں کی والدہ نے پاس بٹھا لیا۔ دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر جمال سے کہنے لگیں۔ ''تم خواجہ یٰسین کے بیٹے ہو نا؟''

''جی ہاں۔'' جمال نے آہستہ سے کہا۔

''بہت نیک ہے تمہارا باپ۔ فدا محمد مستری اللہ لوک کہاں ہے آج کل؟''

''شیخوپورہ میں جی۔'' فدا محمد نے رکھائی سے جواب دیا۔

اتنے میں نوراں ریکارڈوں کا ڈبہ اٹھا لائی اور تمکنت سے بولی ''ہم سے نہیں چنے جاتے اچھے اچھے ریکارڈ' خود ہی چن لے کوئی۔ باجا بھی نہیں اٹھایا جاتا ہم سے کوئی اندر جا کر اٹھا لائے۔''

فدا محمد کوے کی طرح اڑا اور گراموفون اٹھا لایا۔ ''خدا تمہیں نیکی دے۔'' ماسی بولی۔ ''ان میں ہدایت ہی ہدایت ہے۔ جب تک جی چاہے سنو۔''

پھر ہدایت پاتے پاتے جمال اور فدا محمد کے کانوں میں چھالے پڑ گئے۔ انہیں کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔

وہ چابی پر چابی دیتے چلے جا رہے تھے۔

نوراں گڑیا بنی بیٹھی رہی مگر اس کی والدہ پر قوالیاں سنتے سنتے رقت طاری ہو گئی۔ عقیدت کے

مارے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر خراٹے لینے لگی۔ اس پر نوراں مسکرائی مگر اس نزاکت کے ساتھ کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ وہ اپنی دوہری بکل میں لپٹی بیٹھی رہی۔ اس کے جسم کا کوئی بھید ظاہر نہ ہوا۔

ریکارڈ ختم ہو گئے تو نوراں کی والدہ نے آنکھیں کھول لیں۔ فدا محمد اور جمال نے بڑے ادب سے جانے کی اجازت مانگی تو اس نے دونوں کے جذبہ نیکی کی بڑی تعریف کی اور کہا ''پھر بھی کبھی آ جانا۔ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔''

جمال اس ملاقات کے بعد ایک طویل عرصے تک نوراں کو نہ دیکھ سکا اور اس کی وجہ اس کے سیاسی حالات تھے۔

## سیاسی حالات

حالانکہ جمال اور فدا محمد احمق بن کر نوراں کے گھر سے لوٹے تھے۔ رات دونوں نے بڑے مزے سے کاٹی۔ فدا محمد تو جاتے ہی سو گیا مگر جمال رات بھر جاگا اور بعض حالات میں رات بھر جاگنے کا مزہ بھی لاجواب ہوتا ہے۔ وہ بستر پر پڑا کروٹیں لیتا اور چپکے چپکے مسکراتا رہا۔ لگتا تھا اس کے بدن میں سے خوشبو پھوٹ رہی تھی۔

رات کے آخری حصے میں کہیں اس کی آنکھ لگ گئی مگر پو پھٹنے سے پہلے تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ اسے تو آج عارفہ ڈاکو' شیرا بودم اور بکا لنگڑ بگڑ کے ساتھ ڈولا مچھلیاں پکڑنے جانا تھا۔ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر منہ میں کیکر کی داتن لیے وہ نیچے اترا تو اس کے ساتھی اس کے منتظر تھے۔ راستے میں انہوں نے فدا محمد کو بھی ساتھ لے لیا۔

سورج کی ہلکی پیلی دھوپ کی تھپکیاں جمال کو اپنے گالوں پر بڑی اچھی لگیں۔ جوہڑوں' ڈھابوں اور آبچوں کی سطح پر جمی ہوئی برف چمکارے مار رہی تھی۔

نور پور میں ڈولے پکڑنا لڑکوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ ڈولا ایک چھوٹی سی مچھلی ہوتی ہے جو دھان کے کھیتوں میں پائی جاتی ہے اور فصل کٹ جانے کے بعد جوہڑوں' ڈھابوں اور چھپڑوں میں سو جاتی ہے۔ سردیوں کے ٹھنڈے کیچڑ میں لڑکے ان کو ہاتھوں سے پکڑ لیتے ہیں۔ سردیاں گزر جاتی ہیں تو ڈولے کیچڑ میں زمین کی نچلی تہوں میں چھپ کر سو جاتے ہیں اور آٹھ مہینے کے بعد جب برسات ہوتی ہے تو جاگ اٹھتے ہیں۔ جمال کو ڈولے پکڑنے کا بہت شوق تھا مگر عارفہ ڈاکو' شیرا بودم اور بکا لنگڑ بگڑ اس فن میں استاد کا مقام رکھتے تھے۔

ان استادانِ فن نے ایک چھپڑ کا ماہرانہ نظروں سے جائزہ لیا۔ سطح پر کہرا جما ہوا تھا۔ نیچے کیچڑ اور گدلے پانی کے سوا کچھ نہ تھا مگر وہ کہنے لگے ''اس میں ڈولے بہت ہیں۔'' پھر انہوں نے جوتے اتار کر سلیقے سے ایک طرف رکھ دیئے۔ شلواریں' نیفوں میں اڑس لیں اور کرچ کرچ کرتے ہوئے ٹھنڈے کیچڑ میں اتر گئے۔ فدا محمد اور جمال کنارے پر بیٹھ گئے۔ ان کی دنیا رات کے دلفریب واقعے سے رنگین تھی۔

یہ تو طے تھا کہ نور جہاں سے ایک اور ملاقات ضروری ہے مگر اس کی کوئی آسان ترکیب ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی بالآخر فدا محمد نے کہا ''اصل بات یہ ہے کہ پہلے نور جہاں کی والدہ کو ہاتھ میں لیا جائے۔''

دوپہر کے قریب جب عارفہ ڈاکو' شیرا بودم اور بکا لنگڑ بگڑ ڈولے پکڑ پکڑ کر تھک گئے اور ان کی جھولی بھر گئی تو جمال اور فدا محمد بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ بھی اپنے آج کے مسائل حل کر چکے تھے۔

مگر انہیں پتہ نہ تھا کہ ان کے پیچھے ان کے سیاسی حالات کس قدر خراب ہو چکے ہیں!

## رولدو محمد دین

جمال گھر پہنچا تو صحن میں خواجہ قطب دین کی صدارت میں ایک بہت بڑی میٹنگ جاری تھی۔ خواجہ یلیین اور گھر کے چھوٹے بڑے فرد سر جھکائے چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ عورتوں میں وڈی بے بے' چھوٹی بے بے' تاجی' جمال کی والدہ اور دیگر جوان بیٹیاں اور بہوویں درجہ بدرجہ سیڑھیوں اور دروازوں کی دہلیزوں پر جمی ہوئی تھیں۔ چوکھٹوں کے ساتھ کھڑی چھوٹی لڑکیوں کے چہرے اداس تھے۔ جمال بھی کونے سے لگ گیا۔

خواجہ قطب دین رسالدار محمد نواز خان پر برس رہے تھے مگر ان کے غصے کا اصل ہدف رولدو محمد دین تھا اور اس سے جمال کو کچھ حوصلہ ہوا ورنہ اس کی تو جان ہی نکل گئی تھی۔

رولدو محمد دین ایک یتیم بچہ تھا۔ ساٹھ سال پہلے جب اس کا باپ مرا تھا تو خواجہ صمد نے اس کی بیوہ ماں کی کچھ امداد کی تھی۔ رولدو محمد دین بچپن میں صرف رولدو کہلاتا تھا۔ وہ ناداری اور بے یقینی کی فضا میں جوان ہوا تھا۔ اس کو پتہ تھا کہ پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے۔

پیسے کمانے کے لیے پہلے اس نے منڈی میں بوریاں ڈھوئیں' پھر وہ ترازو پر بیٹھ گیا اور دھانیں گننے لگا اور اس میں وہ غلہ بیچنے والوں کو دس کی نو بتانے لگا تو منڈی میں اس کی کاروباری لیاقت کا سکہ جم گیا۔ ہوتے ہوتے اس نے آڑھت کی دکان کھول لی' پھر وہ کسانوں کو سود پر قرضے دینے لگا تو اس کی خوشحالی کو گویا پر لگ گئے۔ پہلی جنگ کے زمانے میں اس نے اپنے مقروض کسانوں کے بچوں کو بھرتی کروایا اور اس کے عوض میلسی کے علاقے میں کچھ مربعے انعام میں پائے۔ تحصیلداروں اور ناظروں کے ہاں اس کا آنا جانا ہو گیا اور آہستہ آہستہ اسے ڈپٹی کمشنر کے دربار میں کرسی بھی ملنے لگی۔

اس نے اپنے بچوں کو مشن سکولوں میں تعلیم دلوائی اور نور پور میں ایک بڑی حویلی بنا کر بیٹھ گیا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ نور پور کے لوگ مجھے ابھی تک رولدو ہی سمجھتے ہیں۔ اس نے یتیموں اور بیواؤں کو چار چار آنے ماہوار دینے شروع کر دیئے۔ اسلامیہ ہائی سکول کے خرچے میں کم و بیش سو روپے کی کمی رہتی تھی۔ اسلام کی خدمت کے جذبے سے اس نے سکول کی انجمن کے مالیات کی ذمہ داری سنبھال لی اور محکمۂ تعلیم کے چپڑاسی بھی اسے پہچاننے لگے۔ اے ڈی آئی صاحب دورے پر آتے تو رولدو محمد دین ہی کے مہمان ہوتے۔

رولدو محمد دین نے ایک مدت تک خواجہ قطب دین سے مروت دکھائی۔ جانتا تھا کہ وہ ایک امیر باپ کا بیٹا اور بڑے کنبے کا سربراہ ہے۔ شرابی ہے اور پیتا ہے تو چھوٹے بڑے کا لحاظ نہیں رکھتا مگر اب خواجہ قطب دین کے مالی حالات خراب ہو چکے تھے اور سرکار دربار میں اس کی رسائی تو کبھی پہلے بھی نہ ہوئی تھی۔ اب موقع تھا کہ وہ اسے زک پہنچائے اور رئیس اعظم نور پور کہلائے۔

رولدو محمد دین صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا۔ اسلام کے کاموں میں روپیہ دھیلہ خرچ کرنے سے گریز نہ کرتا تھا۔ اس کی کوئی آرزو اب ایسی نہ تھی کہ وہ جس پر بقول شاعر دم نکلے سوائے اس کے کہ وہ دین کی خدمت میں نام پائے اور نور پور کی میونسپل کمیٹی کا ممبر منتخب ہو جائے۔

خواجہ قطب دین نے نماز کبھی پڑھی نہ تھی۔ مسجد کے اندر جھانک کر بھی کبھی دیکھا نہ تھا۔ انہیں پتہ نہ چلا کہ میاں عیدا جمعے کے خطبوں میں کب سے اسلام کی خدمت کی تلقین کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں رولدو محمد دین نے کس قدر نام کما لیا ہے۔

خواجہ یٰسین اسلامیہ ہائی سکول میں مدرس تھے۔ وہ بہت پڑھے لکھے شخص تھے مگر ان کے مطالعے نے ان کی ذہانت اور معاملہ فہمی کو سان پر چڑھانے کی بجائے وقت گزارنے اور حقائق سے گریز کا وسیلہ بنا دیا تھا۔ ان کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ رولدو محمد دین صدر انجمن اسلامیہ کے عزائم کیا ہیں۔

## الیکشن کی مہم

خواجہ قطب دین ایک مدت سے الیکشن لڑتے اور کامیاب ہوتے چلے آئے تھے۔ انہیں ممبری کی کچھ ایسی پرواہ بھی نہ تھی مگر اب حالات خراب ہو چکے تھے۔ وہ اخراجات سے کسی قدر تنگ تھے اور ممبری ان کی روٹی اور شراب کا وسیلہ بھی بن سکتی تھی۔ منتخب ہو کر وہ گندے پانی کے استعمال کے ٹھیکے اپنی مرضی کے لوگوں کو دلوا سکتے، چونگی میں سے حصہ وصول کر سکتے تھے اور مجرموں اور ملزموں کو تھانوں سے چھڑوا سکتے تھے۔ پھر یہ گھرانے کی عزت کا سوال بھی تھا۔

رولدو محمد دین نے الیکشن کی مہم سال بھر پہلے سے شروع کر رکھی تھی۔ اس نے مختلف برادریوں کے سربراہوں سے چوری چوری ملاقاتیں کر کے دھڑا بنا لیا تھا۔ سکول ماسٹر، خطیب اور انجمن شباب المسلمین کے جوان اس کے اشاروں پر چلتے تھے۔ کچھ کشمیری خاندان بھی ان کے ہمنوا ہو گئے تھے اور یہ خواجہ قطب دین کے لیے مر جانے کا مقام تھا۔

رولدو محمد دین نے اپنا نام تو اس وارڈ میں پیش کیا جس میں غریب سید رہتے تھے۔ ان کے ووٹوں کو ٹکوں میں خریدا جا سکتا تھا مگر خواجہ قطب دین کے مقابلے میں انہوں نے رسالدار محمد نواز خان کو کھڑا کر دیا تھا اور وہ اپنی سابقہ فوجی خدمات اور انعام میں پائے ہوئے مربعوں کے بل پر بھوکے ننگے خواجہ قطب دین کے لیے ایک طاقتور حریف تھا۔

رسالدار اپنی برادری میں ہر دلعزیز نہ تھا کیونکہ اس نے دوسری شادی برادری سے باہر کی تھی۔ شہر کی عورتیں اس کی دلہن کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ ایک تو وہ طوائف زادی تھی۔ دوسرے چالیس برس سے نکل کر بھی وہ ایک خوبصورت عورت تھی۔ عمدہ لباس اور زیورات پہنتی تھی اور گراموفون پر گانے سنتی تھی۔

خواجہ قطب دین گھر کی میٹنگ میں جب رسالدار محمد نواز اور اس کی بیوی کو صلواتیں سنا چکے تو الیکشن کی عملی منصوبہ بندی زیرِ غور آئی۔ اس کے خطوط بھی خواجہ قطب دین نے متعین کر دیے۔ پہلا سوال یہ تھا کہ اپنی برادری کو کس طرح متحد کیا جائے۔

خواجہ قطب کے خلاف برادری کا جو سب سے بڑا حصہ تھا، وہ پشمینے کے دکانداروں پر مشتمل تھا۔ پشمینے والے امرتسر اور دہلی کے سوداگروں سے پشمینے کے تھان ادھار لیتے اور نور پور کے قریبی دیہات میں چھوٹے دکانداروں اور منیاروں کے ہاتھ ادھار بیچ کر سود بھی لیتے۔ گھروں میں وہ الائچی دار سبز چائے کے حمام کے حمام پی جاتے، سفید کپڑے پہنتے، پان کھاتے اور پنج وقتہ نمازیں پڑھتے۔

پشمینے والوں کی کچھ لڑکیاں خواجہ قطب دین کے خاندان اور ان کے حامیوں کے ہاں بیاہی ہوئی تھیں مگر مجموعی طور پر انہوں نے رولدو محمد دین کی اطاعت کر لی تھی کیونکہ وہ انہیں ہندو ساہوکاروں کے مقابلے میں کم شرح سود پر قرض دیتا تھا۔ رولدو محمد دین اسلام کا سچا خادم تھا۔ پشمینے والے دینی اور دنیاوی وجوہات سے اس کے دھڑے کو ووٹ دینے پر مجبور تھے مگر ان کے ووٹوں کی خواجہ قطب دین کو بھی شدید ضرورت تھی۔

انتخابی تیاریوں کے سلسلے میں گھر میں جو جلسہ ہو رہا تھا اس میں قرار پایا کہ پہلے تو پشمینے والوں کی ان بیٹیوں کو میکے جانے سے روک دیا جائے، جو خواجہ قطب دین کے دھڑے کی بہوئیں ہیں، پھر ڈانگیں لے کر ان کے گھروں کو گھیرا جائے۔

نور پور میں سکول ماسٹروں کا بڑا اثر تھا۔ سکول ماسٹروں کے ذریعے طلبہ کے والدین پر دباؤ ڈالنے کا فرض خواجہ یٰسین کو سونپا گیا۔ مختلف مساجد کے امام بھی بہت مفید کام کر سکتے تھے۔ ان کی ذمہ داری خواجہ محمد دین نے لے لی مگر کمیوں، کمہاروں، جولاہوں اور لوہاروں کی برادریاں خواجہ قطب دین نے اپنی تحویل میں رکھیں کیونکہ اہل حرفہ ہماں شماں کے قابو میں نہیں آتے۔

پھر فریق مخالف کے محاذ پر حملہ کرنے کی تدبیریں زیرِ غور آئیں۔

خواجہ قطب دین کا خیال تھا کہ باہر سے پرتاب سنگھ کلہاڑے کے آدمی بلا کر رسالدار محمد نواز اور رولدو محمد دین کی ٹھکائی کروا دی جائے۔ عورتوں نے اس تجویز کی مخالفت کی کیونکہ شہرداری میں یہ بات مناسب نہ تھی۔ ان کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ رولدو محمد دین اور رسالدار نواز کے پاس زمینداریاں ہیں اور وہ اپنے مزارعوں کو مقابلے کے لیے میدان میں اتار سکتے ہیں۔ خواجہ قطب دین کے پاس زمین تھی نا مزارعے، پھر رولدو اور رسالداروں کی جیسی رسائی ڈپٹی کمشنر کے دربار میں تھی، خواجہ قطب دین اس سے محروم تھا۔

تاجی جواب تک خاموش بیٹھی تھی' ایک دم اٹھ کر کھڑی ہوئی اور اس نے کہا "میری سنو! میں رسالدار کی ہندوستانی بیوی اور اس کی بیٹی کو گھر بلا سکتی ہوں' پھر ہم مولوی بلوا کر رسالدار کی بیٹی کا نکاح اپنے کسی لڑکے سے پڑھوا دیتے ہیں۔ ہمارا جمال ہر طرح سے نور جہاں کے لائق ہے' پھر رسالدار کو اپنے داماد کے مقابلے میں الیکشن لڑنے کا حوصلہ نہیں ہوگا۔"

اس تجویز پر سب نے غور کیا مگر چونکہ رسالدار غیر برادری کا آدمی تھا اور کشمیری اپنی برادری سے باہر شادی نہیں کرتے' اس لیے یہ تجویز مسترد ہوگئی۔

سیاسی حالات کی اچانک خرابی کی وجہ سے جمال کے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

انتخابی جلسے کے بعد جمال کا جی چاہا کہ میں لپک کر جاؤں اور نور جہاں کو سب کچھ بتا دوں مگر اس تک پہنچنے کی کوئی ترکیب اس کے ذہن میں نہ آئی۔

## خدمت اسلام

رولدو محمد دین اور ملک محمد نواز رسالدار کے حق میں سب سے زیادہ کام انجمن شباب المسلمین نے کیا۔ اس نے دو چار ہی جلسوں میں ثابت کر دیا کہ اسلام خطرے میں ہے اور اسے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ نور پور کے لوگ نیک' پرہیزگار اور صالح امیدوار کو ووٹ دیں۔ سکول کے ماسٹر صاحبان نے بھی یہی کہا کہ کسی شرابی کبابی کو منتخب کرو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو!

اس نظریاتی حملے سے خواجہ قطب دین بہت پریشان ہوئے۔ انہوں نے شباب المسلمین کے مقابلے میں ایک اور انجمن بنوا دی خادمانِ اسلام۔ اس کے کارکنوں نے بھی اسلام کو خطرے میں بتایا اور اس کی حفاظت کا خواجہ قطب دین کو ضامن ٹھہرایا جو ایک عوامی آدمی تھا۔ نور پور کے لوگوں کو دونوں انجمنوں کے جلسے بڑے اچھے لگے مگر وہ کسی ایک امیدوار کے حق میں فیصلہ نہ کر سکے۔ اسلام کی خطرناک صورتحال کو البتہ سب نے فوراً ہی تسلیم کر لیا۔ اس لیے بات پھر برادریوں پر آ ٹھہری۔ اس محاذ پر خواجہ قطب دین کا پلہ بھاری تھا۔

خواجہ قطب دین نے کمہاروں کو تو فوراً ہی ساتھ لگا لیا۔ انہوں نے ان کی ایک اغواہ شدہ لڑکی حال ہی میں واپس دلوائی تھی۔ جاٹ ان کے خاندان کے روایتی ساتھی چلے آئے تھے۔ اسی طرح سنیارے اور لوہار' ککے سیدوں میں تقسیم تھی مگر کشمیریوں کی قبائلی تقسیم خواجہ قطب دین کو بہت کھلتی تھی۔ سودی تجارت اور چھوٹے منافعوں نے ان کی ذہنیت بدل ڈالی تھی۔

رولدو محمد دین بڑا کائیاں آدمی تھا۔ اس نے الیکشن سے کچھ قبل بھانپ لیا تھا کہ میرے دھڑے کی حالت کمزور ہے۔ الیکشن کے دن اس نے اپنے مزارعے بلائے اور ان کے ہاتھ میں بلمیں اور کلہاڑیاں دے کر انہیں نور پور میں گھمایا پھرایا تا کہ لوگ ڈر جائیں۔ نور پور کے لوگ کسی صورت یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ پینڈو اور گنوار ان کے معاملات میں دخل انداز ہوں۔ ایک پینڈو گنوار کو پکڑ کر انہوں نے خوب مارا۔ گھبرا کر اس نے بغل میں سے چھرا نکالا اور ایک ارائیں کے بازو پر چرکا لگا دیا۔ شہر میں کھلبلی مچ گئی۔ پولیس کے تینوں سپاہی بازار میں گھس آئے اور انہوں نے رولدو محمد دین کے آدمیوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ رولدو محمد دین نے انہیں بچانے کی کوشش کی تو شہر والوں نے خواجہ قطب دین کے حق میں فیصلہ دے دیا اور اگلے روز محمد نواز رسالدار کی ضمانت ہوگئی۔ پہلے کی طرح وہ اپنی باہر کی حویلی میں جا گھسے۔ پھر کم لوگوں نے ان کی صورت دیکھی۔ رولدو محمد دین اپنے کاروبار میں مصروف ہوگئے۔ خواجہ قطب دین نے حسبِ سابق میونسپل کمیٹی میں اپنا منصب سنبھال لیا اور ٹھیکوں کی نیلامی کی ڈونڈی پٹنے لگی۔ انجمن شباب المسلمین اور انجمن خادمانِ اسلام کے کارکنوں میں ہمیشہ کے لیے ٹھن گئی۔

زخمی ارائیں کے بازو میں پیپ پڑ گئی اور وہ مشکل سے زندہ بچا۔ حملہ آور مزارع پر مقدمہ چلا اور اسے کئی ماہ پولیس کی مار کھانے کے بعد بلوے کے جرم میں سزا ہوگئی مگر رولدو محمد دین نے اس کی خدمات کو فراموش نہیں کیا۔ مقدمے کے اخراجات کے علاوہ اس نے مزارع کی بیوی کو پچاس روپے نقد اور آٹھ من چاول بھجوا دیئے۔

مگر رولدو محمد دین نے خواجہ یٰسین کو سکول ماسٹری سے برخاست کر دیا۔ انہوں نے اپنے چچا کا سیاسی کام کر کے سکول کے ڈسپلن کو توڑا تھا۔

میاں عیدا نے بھی خواجہ قطب دین کا ساتھ دے کر ڈسپلن توڑا تھا۔ اب کسی کو یاد آیا کہ میاں عیدا اپنے حرام کے جنے بھانجے کی پرورش کرتا ہے اور اس نے اپنی بدکار بہن کو بھی قتل نہیں کیا۔ اس لیے اس کے پیچھے نماز حرام ہے۔

میاں عیدا نے اپنی بیوہ بہن کو بہت مارا۔ اس کی چیخ و پکار سارے محلے نے سنی۔ تصدیق ہوگئی کہ وہ بدکار عورت ہے ورنہ اس کا بھائی اس کو اس بے رحمی سے نہ مارتا۔ انہوں نے شام کی روٹیاں مانگنی چھوڑ دیں اور گھر بیٹھ گئے مگر پڑوسیوں کی الٹی سیدھی باتیں ان کی جان اب بھی نہ چھوڑتی تھیں۔ لوگ منڈیروں سے اُچک اُچک کر ان پر فقرے کستے تھے۔

پھر میاں عیدا نور پور سے غائب ہوگئے۔ تانگے والے نے کہا' انہوں نے سرگودھا کا ٹکٹ لیا تھا۔

حکومتِ ہند کے ایکٹ مجریہ 1919ء کے تحت انتخابات میں بہوؤں کے میکے چھوٹے' سہاگنوں کے سسرال روٹھے' بستے ہوئے گھر ٹوٹے اور بہویں اور بیٹیاں دونوں روئیں۔ جمال' فدا محمد' نور جہاں' ہر چیز ریزہ ریزہ ہوگئی۔ حکومتِ ہند کے ایکٹ مجریہ 1919ء کے تحت جمہوری انتخابات کے نتیجے میں!

## بھوک اور بیروزگاری

اگلے زمانے ہوتے تو جمال کو پتہ بھی نہ چلتا کہ میرے ابا کی نوکری چھوٹ گئی ہے۔ اگلے زمانے

سے مراد وہ زمانے جب ان کا گھرانہ مشترکہ گھرانہ ہوتا تھا۔ اگلے زمانے جب لوگ ایک بہت بڑے بڑ کی چھاؤں میں جھاڑی کی طرح اُگ کر مر جاتے تھے' نا پھول نہ پھل۔ خواجہ یٰسین کے بیوی بچوں کو دن کی دھوپ سے کوئی حصہ ملتا تھا نہ رات کی چاندنی سے کچھ حاصل ہوتا تھا مگر روٹی مل جاتی تھی۔

خواجہ یٰسین کی نوکری چھوٹی تو ان کو فوراً پتہ چل گیا کہ گھر پر کوئی بہت بڑی آفت ٹوٹی ہے۔ اس ہمدردی نے جو ہمسایوں نے وقت بے وقت گھر آ کر کی۔ ہائے خواجہ یٰسین اب تمہارا کیا بنے گا۔ بچوں کا پیٹ کیسے پالو گے۔ ہائے تم نے کیوں الیکشن میں کام کیا۔ کیوں نوکری خطرے میں ڈالی۔ انہیں زندگی سے شرمندہ کر دیا۔

پھر لوگوں نے مشوروں سے نوازنا شروع کر دیا۔ یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے سے تو کچھ نہ ہو گا' کچھ سوچو' کچھ کرو میاں' تمہارا اسسرا اتنا بڑا افسر ہے۔ اسے کہو تمہیں کہیں مربع دلوا دے۔ سنا ہے انگریز اس سے بہت خوش ہیں مگر فی الحال تمہارا خرچہ تو اٹھائے۔ کم سے کم اپنی بیٹی اور نواسوں کو تو پاس بلائے۔

خواجہ یٰسین بہت شریف آدمی تھے۔ ان کی آنکھ میں بڑی مروت تھی۔ وہ کسی سے بحث نہ کرتے۔ ہوں ہاں کرتے رہے مگر وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ رہے تھے۔

جمال کی والدہ ایک مغرور عورت تھیں مگر خاوند کی اطاعت اور احترام اس کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے۔ اب اس کے دل میں خواجہ یٰسین کی دانش مندی کے بارے میں شبہات پیدا ہونے لگے۔

خواجہ یٰسین کو نوکری چھوٹنے کا بڑا دکھ تھا۔ اخراجات کی اہمیت تسلیم' مگر ان کو پڑھانے کا پیشہ بہت پسند تھا۔ اس کی وجہ ان کے جذبہ خدمت سے کہیں زیادہ وہ مقام تھا جو اس زمانے میں استادوں کو بالعموم حاصل تھا۔ مشترکہ خاندان میں ایک یتیم بچے کی حیثیت سے انہیں زندگی میں اپنی سماجی اہمیت کا کوئی ثبوت فراہم نہ ہوا تھا۔ ان کی پرورش شفقت اور مہربانی کی فضا میں ہوئی تھی مگر ان کی ذات میں وہ اعتماد پیدا نہ ہوا تھا جو بچے اپنے ماں باپ ہی کے گھر میں پل کر حاصل کر سکتے ہیں۔ خود جب ان کے ہاں بچے پیدا ہوئے تو کم از کم جمال کی حد تک ان کا رویہ غیروں کا سا رہا۔ اگر جمال کی فطرت میں بغاوت نہ رکھ دی گئی ہوتی تو وہ ایک بوڑھی بھینس کی طرح بودا اور گدھے کی طرح لدو جانور ہوتا۔ خواجہ یٰسین عمر بھر اسے ایک شریف آدمی بنانے کی کوشش کرتے رہے مگر شکر ہے کہ سارے ماں باپ اپنے بچوں کی تعمیر میں کامیاب نہیں ہوتے۔

خواجہ یٰسین محض زندہ رہنے پر راضی تھے اور اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ نور پور جیسی معمولی بستی میں برٹرینڈ رسل' رومی اور اقبال پڑھتے پڑھتے عمر گزار دیتے۔ نوکری سے برخاست ہو کر انہیں سخت جھٹکا لگا۔ وہ لوگوں کی ہمدردیوں سے تنگ آ کر اور روزگار کی تلاش میں لاہور چلے گئے۔

جمال اس پر خوش تھا کہ کچھ دنوں کے لیے باپ کی نگرانی سے جان چھوٹی۔

## نور پور کی کنواریاں

جمال اور فدا محمد کے سامنے فی الحال کوئی محاذ نہ تھا۔ نور جہاں کا مورچہ نور پور کی سیاست کی نذر ہو چکا تھا اور سکول میں اب کوئی کتاب نہ تھی جس میں جمال کو دلچسپی ہو۔ پھر گرمی کی چھٹیاں گزارنے کے لیے مشتاق نور پور آ گیا۔

مشتاق ایف اے میں پڑھتا اور لاہور میں رہتا تھا۔ یہ بات بجائے خود بڑی دلچسپ تھی مگر مشتاق میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ خوبصورت چہرہ' موٹی موٹی آنکھیں' گھنگھریالے اور گھنے بال' مضبوط ہاتھ پیر' سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے پاس ایک ہارمونیم تھا اور اسے ٹھمریوں کے کئی بول زبانی یاد تھے۔

وہ دن ڈھلے چھت پر بیٹھ جاتا اور ہلکے سروں میں کوئی ٹھمری چھیڑ دیتا۔ ایسی بات نور پور میں کبھی ہوئی نہ تھی۔ ہارمونیم پر زندہ گانا سن کر نور پور کی کنواریاں بیمار ہونے لگیں۔ بہتوں کے مثانے خراب ہو گئے اور پیشاب کی حاجت تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد انہیں چھتوں پر جانے پر مجبور کرنے لگی۔ یہ بات مشتاق کے منصوبے کے عین مطابق تھی۔ وہ خود اپنی تمام شوخیوں کے باوجود کسی قدر شرمیلا آدمی تھا۔ اردگرد کی چھتوں پر آنے والی کوئی لڑکی غیر نہ تھی مگر اس کے دل میں چور تھا۔ اس نے ان لڑکیوں کو دیوار کے جھرنوں میں سے عجیب عجیب اشارے کرنا شروع کر دیئے۔

یہ اشارہ بازی جمال کو بھی بہت مزیدار لگی۔ پھر مشتاق نے اسے ان اشاروں کے معنی سمجھانے شروع کر دیئے۔ عورت اور مرد کے تعلقات کی نوعیت کو اس نے کھول کھول کر بیان کیا اور اس سے جمال میں جوان ہو جانے کی آرزو کا طوفان جاگ اٹھا۔

مشتاق کی باتیں جمال فوراً ہی فدا محمد تک پہنچا دیتا۔ پھر دونوں پہروں ان پر تبصرہ کرتے۔

مشتاق کا یار سادو باندری شام کو مشتاق کے پاس بیٹھ کر پھامی ترکھانی کے عشق میں رویا کرتا کیونکہ وہ اسے گھاس نہ ڈالتی تھی۔

فدا محمد کو یقین تھا کہ میں نور جہاں پر عاشق ہوں جس سے ملنا دشوار ہے۔ وہ بہت کوشش کرتا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آتے۔ پھر وہ اداس ہو کر آہیں بھرنا اور پنجابی کے دوہے پڑھنے لگتا۔

ایک دن جمال نے کہا "مگر فدا محمد نور جہاں کو تو تمہارے عشق کا پتہ بھی نہیں۔"

"معشوق کو کبھی پتہ نہیں ہوتا جمالی۔ یہ عشق کی توہین ہے۔" مگر مشتاق نے اس بات کو مذاق میں اڑا دیا۔ اس نے کہا "وہ عشق جس کا معشوق کو پتہ نہ ہو' عشق نہیں ہوتا حماقت ہوتی ہے۔ عشق تو یہ ہے کہ آدمی معشوق کو حاصل کرے۔ اس کو زیر کرے۔ اس پر قبضہ کرے ورنہ سالیاں بھاگ جاتی ہیں دوسروں سے آنکھیں لڑانے کے لیے۔"

اب تک نور پور کی لڑکیوں کے بارے میں جمال نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ وہ تو محض خدمتگار ہوتی تھیں۔ گرمیوں میں وہ گھڑے بھر بھر تپتی ہوئی چھتوں پر پانی چھڑکتیں اور انہیں مردوں کے لیے ٹھنڈا کرتیں جب وہ گھر آئیں۔ سردیوں کو وہ رضائیاں اور گدے سیتیں اور سوت کاتتیں تاکہ مردوں کے لحاف نرم ہوں۔ وہ

فرش دھوتیں، کھانے پکاتیں، برتن مانجتیں، حقے بھرتیں اور بھینسوں کے لیے گتاوے کرتیں۔ ان خدمات کے عوض انہیں پھٹا پرانا پہننے کو اور جوٹھا موٹا کھانے کو مل جاتا۔ پھر ان سے پوچھے بغیر ان کی شادیاں کر دی جاتیں اور بچوں کی پرورش اور سسرال اور خاوند کی تابعداری میں عمریں گزار دیتیں۔ باپ ان کے حق مہر بھی نہ لکھواتے۔ اپنی وراثت میں انہیں کوئی حصہ نہ دیتے اور خاوند بیویوں کو بے سہارا چھوڑ جاتے۔ نور پور کی لڑکیوں کو کھیل تماشے کی فرصت کہاں تھی۔ ان کا تو اپنے خاوندوں سے تنہائی میں ملنا بھی دشوار ہوتا تھا۔

مگر فدا محمد کا خیال تھا کہ نور پور کی عورتیں بھی کھیل تماشے کرتی ہیں۔ اصل میں اس کو ایک اپنی بوڑھی پھوپھی سے واسطہ پڑا تھا جسے وہ کبھی ماں سمجھتا اور کبھی نوکرانی۔ دوسرے اس کی کمسن بہن، جس سے وہ کبھی بات نہ کرتا۔ کبھی اس کو اپنی بہن پر پیار آتا تو وہ اسے ڈانٹتا اور جھڑکنا شروع کر دیتا۔ اسے عورتوں کا کوئی تجربہ نہ تھا مگر اس نے بڑے وثوق سے کہا ''کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، ٹھیک ہے۔ نور پور کی عورتیں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں۔''

کچھ دن مشتاق فدا محمد اور جمال کا امتحان لیتا رہا۔ جب اس کو یقین ہو گیا کہ دونوں بنیادی باتیں سمجھ گئے ہیں تو وہ اپنے کالے صندوق میں سے ایک کتاب نکال لایا۔ کوک شاستر از کوکا پنڈت۔

## کوک شاستر

یہ ایک باتصویر کتاب تھی جس کی تصویریں اسی کاتب نے بنائی تھیں جس نے الف لیلہ کے جن اور پریاں بنائے تھے۔ ایک ہزار سال پہلے اسے ایک پنڈت نے سنسکرت میں لکھا تھا جس کا اردو ترجمہ اب جمال کے ہاتھ میں تھا۔ اس میں عورتوں کی چار قسمیں بیان کی گئی تھیں۔ پدمنی، مکرنی، ہستنی اور پیرنی۔ جمال کو پدمنی بہت پسند آئی جس کے جسم میں سے کنول کی خوشبو آتی تھی۔ جمال اور فدا محمد دیر تک کتاب کے مطالعے میں کھوئے رہے۔ انہوں نے اس کے بیان کردہ چوراسی آسنوں پر بھی بہت غور کیا مگر ان کے پلے کچھ نہ پڑا۔

چھٹیاں ختم ہوئیں۔ مشتاق اپنے تھانیدار باپ کے پاس چلا گیا تو نور پور میں اداسی چھا گئی۔ نہ ہارمونیم نہ ٹھمریوں کے بول نہ چھت پر جانے کے مشغلے۔

سادو باندری بھی اکیلا رہ گیا۔ اس نے اپنے برہ کے گیت سنانے کے لیے جمال اور فدا محمد سے دوستی نکالی۔ وہ ان سے برابری کا سلوک کرتا۔ ان کو بھامی کی بے رخی کے قصے سناتا۔ وہ ہر قیمت پر اس سے شادی کرنا چاہتا تھا اور جمال سے برابری کے ثبوت میں اس نے اسے کویراج ہرنام داس کی کتاب ہدایت نامہ خاوند باتصویر پڑھنے کو دے دی۔ یہ کتاب خاوند کے فرائض کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس نے لاہور سے منگوائی تھی۔

## خفیہ لفافہ

کتاب کا سب سے اہم باب جلد میں شامل نہ تھا۔ کتاب کے ساتھ ایک لفافے میں بند تھا۔ سادو باندری نے یہ خفیہ لفافہ روک لیا تھا۔ بڑی مشکلوں سے جمال اسے یقین دلا سکا کہ میرا مقصد صرف علم حاصل کرنا ہے۔

کویراج صاحب نے لکھا تھا کہ عورت مثل ایک ستار کے ہے جسے بجانے سے پہلے سر کرنا پڑتا ہے اور مرد ایک جتا ہوا گھوڑا کہ باگ اٹھاؤ تو چل دیا مگر یہ ستار کس طرح سر کی جاتی ہے، اس کا اسے کوئی تجربہ نہ تھا۔

## بستی میں بھونچال

بستی میں اچانک انجمن شباب المسلمین اور خادمانِ اسلام کے چرچے ہونے لگے۔ وردیاں ڈھل گئیں۔ بیج اور بلے بدل گئے۔ مولوی گرجنے، لیڈر برسنے اور رضا کار اچھلنے کودنے لگے۔

رولدو محمد دین پھر چونیاں بانٹنے لگا۔ رسالدار محمد نواز دائیں طرف کے فالج سے معذور ہو چکا تھا مگر لیٹے لیٹے نعرے مارنے لگا۔ خواجہ قطب دین البتہ شیر کی طرح گرجتا تھا۔ اس نے شراب چھوڑی تو نہ تھی مگر اب وہ پی کر گھر ہی میں پڑا رہتا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ نیکی کی راہ پر چل نکلا ہے کیونکہ اسلام خطرے میں ہے۔

سکول کے ماسٹروں نے بھی اخبارات باقاعدہ پڑھنے شروع کر دیئے تھے۔ جوگندر سنگھ جماعت میں شرمندہ اور خاموش بیٹھا رہتا اور طرح طرح کے طعنے سننے کے باوجود فارسی کی گردانیں یاد کرتا رہتا۔

سکھ گرنتھی نیلی پگڑیاں باندھے کرپانیں اٹھائے نور پور کے قریبی دیہات کے سکھ کسانوں کو مسلمانوں کے قتل و غارت پر ابھارنے لگے۔ مسلمانوں نے لاہور کے گوردوارہ شہید گنج کو مسجد شہید گنج بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور سکھ دھرم خطرے میں تھا۔

بابا دسا کھا سنگھ نے جلسے کے دن بہت پی لی۔ سٹیج پر چڑھ کر اس نے پگڑی کھول کر گلے میں ڈال لی اور ہاتھ جوڑ کر بولا سکھ دھرم خطرے میں نہیں ہے۔ یہ چند دن کا جنون ہے، پھر سب کو یہیں رہنا ہے۔ طیش میں نہ آؤ، خون نہ بہاؤ۔ ماؤں کے بچے کیا سکھ کیا مسلمان ماؤں کے بچے ہیں۔ ماؤں کے کلیجے نہ چیرو۔

جلسے کے حاضرین نے کرپانیں سونت لیں اور نیلی پگڑیوں والے کچھ سکھ جوان بابا دسا کھا سنگھ پر وار کرنے کو لپکے۔

بابا دسا کھا سنگھ نے کہا اگر میرا خون بہا کر تمہارا غصہ ٹھنڈا ہوتا ہے تو جم جم، پھر وہ اپنی بوڑھی آواز میں ٹھہر ٹھہر کر گوربانی پڑھنے لگا ''الف اللہ رب رضائے قدرت دے سب بندے'' قریب تھا کہ اس کے ٹکڑے ہو جائیں کہ وہ نشے میں لڑکھڑا کر سٹیج سے نیچے گر گیا۔

جلسے میں فیصلہ ہوا کہ نور پور سے سکھ رضا کاروں کا ایک جتھہ گوردوارہ شہید گنج کے سامنے مورچہ لگائے گا۔ پھر سکھ رضا کاروں کے نام لکھے گئے اور چندے کے لیے جھولی پھیلا دی گئی۔

جمعرات کو مولوی شعبان علی عطار نے بھی نور پور کے چوک میں ایک جلسہ بلایا جس کے لیے لاہور سے بڑے بڑے آتش نوا مولوی قلیل معاوضے پر اسلام کی خدمت کے جذبے سے سرشار بلوائے گئے تھے۔ اسلام کو خطرے سے نکالنے کے لیے سب سے پہلے مسلمانوں کا متحد ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ علمائے

دین نے رولدو محمد دین اور خواجہ قطب دین میں صلح کروادی۔ جب مسلمانوں میں اتحاد قائم ہو گیا تو انجمن شباب المسلمین اور خادمانِ اسلام بھی آپس میں متحد ہو گئے۔ ان کی نئی وردیوں کا کپڑا رولدو محمد دین نے مہیا کر دیا تھا۔ سلائی شہر کے درزیوں نے مفت کر دی کہ اسلام خطرے میں ہو تو دھیلے ٹکے کی بات زیب نہیں دیتی۔ خواجہ قطب دین نے ڈانگوں پر بلمیں اپنے پلے سے فٹ کروادیں۔

رولدو محمد دین خواجہ قطب دین انجمن شباب المسلمین اور انجمن خادمانِ اسلام کے مسلمان جان کی بازی لگانے پر تیار ہو گئے تو اسلامیہ سکول کے لڑکوں نے جا جا کر ہندو سکول کے لڑکوں کو مارنا شروع کر دیا مگر اس دار و گیر میں جوگندر سنگھ کو کسی نے کچھ نہ کہا۔ جوگندر سنگھ سکھ تھا مگر وہ اسلامیہ سکول کا لڑکا تھا۔

مولوی شعبان علی نے کوچہ کوچہ پھر کر مسلمان رضا کاروں کی فہرست مرتب کی۔ کام کرنے والوں نے کام چھوڑے۔ کمائیاں رک گئیں اور لوگ گھروں سے نکل آئے کیونکہ ان کی اصل ذمہ داری اسلام کو خطرے سے نکالنے کی تھی۔ جب نمازیوں کا دمِ رخصت آ پہنچا تو ماؤں، بہنوں نے رونا اور سر پیٹنا شروع کر دیا۔

جمال کو بھی بہت جوش آیا۔ فدا محمد نے بھی جان پر کھیل جانے کی ٹھان لی۔ دونوں نے مسجد میں میاں عیدا کو گواہ بنا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی مگر انہیں جیش کے ساتھ لاہور جانے کی اجازت نہ ملی کیونکہ ابھی ان کے چہروں پر داڑھی مونچھ اُگی نہ تھی۔

جیش کو روانہ ہونے کے لیے اخراجات کی ضرورت تھی مگر مولوی شعبان علی کے پاس پیسہ نہ تھا۔ اس سے پہلے ان پر مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں چندہ خورد برد کرنے کا الزام لگ چکا تھا۔

رولدو محمد دین کو ڈر تھا کہ اگر میں نے سرگرمی دکھائی تو صاحب ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر ناراض ہوں گے۔ رہے خواجہ قطب دین تو وہ کسی قابل نہ تھے۔ شام کی شراب بھی انہیں ادھار پینی پڑتی تھی۔ جب شہر کے بڑوں نے کچھ نہ دیا تو چھوٹے موٹے لوگ بھی کھچ گئے۔ حالانکہ خدمت اور قربانی کے جذبے سے سبھی سرشار تھے۔

شہید گنج میں مورچہ لگا مگر بالآخر سکھ مقدمہ جیت گئے اور مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان نفرت کی ایک گہری لال لکیر کھنچ گئی۔

بہت دن بعد لاہور میں امن قائم ہوا۔

# باب 4

اچانک خوش قسمتی خواجہ یلیین پر برق کی طرح گری، انہیں نوکری مل گئی۔ نہ کوئی سفارش نہ کوئی انتظار۔ وہ سری نگر کے اسلامیہ ہائی سکول میں سیکنڈ ہیڈ ماسٹر ہو گئے تھے۔ انہیں دو ہی دنوں کے بعد روانہ ہو جانا تھا۔

انسان کی خوشی کے لیے روٹی سب سے بڑی حقیقت ہوتی ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ انسان فقط روٹی ہی کے لیے نہیں جیتا انہوں نے بھوک کبھی چکھ کر نہیں دیکھی۔

جمال کو اپنا باپ بڑا شاندار لگا۔ خواجہ یلیین پہلے جا کر مکان کا بندوبست کر لیں تو جمال والدہ کے ساتھ سرینگر جائے گا۔ وہ ابھی بچہ ہی تھا مگر اس کے والد نے اسے اتنی بڑی ذمہ داری سونپ دی تھی۔

## کشمیر کا سفر

ڈیڑھ ماہ بعد جمال والدہ، چھوٹے بھائی اور دو بہنوں کے ساتھ کشمیر روانہ ہوا۔ اس نے کلف لگوا کر کلے پر پگڑی باندھی۔ طرے کو کافی اونچا جمایا۔ صندوقوں اور بستروں کی گنتی کی تا کہ وہ بڑا اور ذمہ دار آدمی لگے۔ پہلی مرتبہ اسے خاندان کی سربراہی کا منصب ملا تھا۔

راولپنڈی سے نکل کر بس گہری کھڈوں کے ساتھ پہاڑوں کی چوٹی پر چلی تو اسے بہت لطف آیا۔ اوپر چھوٹا سا گھومتا ہوا آسمان اور نیچے پانی کی پتلی سی لکیر جسے دریائے جہلم کہتے تھے۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی تھی۔

چناری پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی اور مسافروں نے ڈیرے ڈال دیئے۔ رات ان کو راستے میں گزارنی تھی۔ خواجہ یلیین نے اپنے خط میں تفصیلی ہدایات لکھ دی تھیں۔ ایک معتبر شخص کی طرح جمال نے چناری کے پڑاؤ پر ایک کمرہ کرائے پر لے لیا جس میں سارا کنبہ منتقل ہو گیا۔

چھوٹے چھوٹے لڑکے جو پہاڑی لہجے میں پنجابی بولتے تھے، گرم پانی، تولیے اور صابن لے آئے۔ پھر وہ بستر بچھانے لگے۔ تھوڑی دیر میں کھانے کی سینی آ گئی۔ کھانے کے بعد ہاتھ دھلانے کے لیے وہ پانی لے آئے۔ سارے کام وہ مشین کی سی پھرتی سے کرتے تھے۔

ان کے گال لال تھے، بال چھدرے، کپڑے پھٹے ہوئے اور پاؤں ننگے۔ وہ منہ اندھیرے ایک

آنہ روزانہ کی مزدوری پر مسافروں کی خدمت کے لیے ہوٹلوں پر آ جاتے اور رات گئے تک کام کرتے۔ سولہ گھنٹے کی اس مشقت کے دوران انہیں مسافروں کا بچا کھچا کھانا اور ہوٹل کی چائے مل جاتی مگر رات کا کھانا وہ گھروں کو لے جاتے تاکہ ان کے ماں باپ اور بہن بھائی بھی پکا ہوا سالن چکھ لیں۔

ان کے گھروں میں مکئی کی موٹی روٹی پکتی تھی مگر کبھی کبھار وہ جنگلی ساگ کے پات بھی سرسوں کے تیل میں بھون لیتے تھے۔ عام طور پر وہ مکئی کی موٹی روٹی نمک کی ایک چٹکی کے ساتھ کھاتے اور ٹھنڈا پانی پی کر زندگی گزارتے تھے۔

سورج نکلنے سے پہلے جب ابھی اندھیرا ہی تھا۔ پہاڑی لڑکے پھر آ کر سامان بسوں میں لادنے لگے۔ جمال نے اپنی لمبے طرے والی پگڑی سر پر رکھی اور اپنے کنبے کے ساتھ لکڑی کے تنگ زینوں سے اتر کر بس میں بیٹھ گیا۔

بس چلی تو سردی بڑھنے لگی۔ جنگل کی ٹھنڈی اور تازہ ہوا اسے اپنے گالوں پر بڑی اچھی لگی۔ ہری ہری گھاس کی مہک کو اس نے زور زور سے اپنے اندر اتارا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ میں اس مہک سے اپنے وجود کو بھر لوں۔

پہاڑ سنسان تھے۔ کہیں اکا دکا عورتیں سروں پر چھوٹی چھوٹی اوڑھنیاں لپیٹے بکریوں اور گایوں کے پیچھے بھاگتی نظر آتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے درانتی سے گھاس چھیل رہے تھے مگر مرد دھوپ میں ہاتھوں پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ عورتیں ہی چشموں اور ندیوں سے پانی کے گھڑے بھر کر لاتیں۔ گھر کا کام کرتیں' بھیڑیں پالتیں' دودھ دوہتیں اور بیچتیں۔ یہ بات جمال کو کچھ عجیب لگی۔

## دوسرا منظر

بس چوٹی کی طرف بڑھی تو منظر بدل گیا۔ برف کی سفید چادر نے جنگل کے سبزے کو ڈھانپ لیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک سرنگ میں داخل ہو گئی۔ نکلی تو اور ہی سماں تھا۔ کشمیر کی وادی حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ سپاٹ میدان میں پھول کھلے تھے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ آسمان گہرا نیلا تھا اور جنگلی انار کی جھاڑیاں پکے ہوئے عنابی داڑوں کے بوجھ سے زمین پر لیٹی ہوئی تھیں۔ داڑو یعنی کھٹے انار جن سے انار دانہ بنتا تھا۔

سڑک کے دونوں طرف بنفشے کے نیلے پھول اور ان گنت لال پیلے گہرے زرد شگوفے لہرا رہے تھے۔ پرندوں کی قطاریں بجلی کے تاروں پر بیٹھی تھیں۔ ہرے بھرے کھیتوں کے لاتعداد تختوں میں کھڑے کشمیری کسان سروں پر الٹی ٹوپیاں پہنے لمبے لمبے فرغلوں میں لپٹے کام دھندے میں مصروف تھے۔ کوئی پانی کھینچتا تھا' کوئی گوڈی کرتا تھا۔

نیچے اترے تو پہاڑ پیچھے ہٹ کر مودب کھڑے ہو گئے۔ مسافروں کے چہروں پر رونق آ گئی۔ وہ چہک چہک کر باتیں کرنے لگے۔ جمال کی والدہ نے برقعے کا نقاب الٹ لیا اور اٹھ اٹھ کر باہر دیکھنے لگی۔

ڈرائیور نے کہا' لو جی ہم بارہ مولہ پہنچ گئے۔

ایک لمبی سی خوبصورت سڑک سے نکل کر جس کے دونوں طرف ایک ہی گولائی اور لمبائی کے بے شمار درخت تن کر کھڑے تھے' بس رک گئی کہ مسافر چائے پی لیں۔

یہاں بھی وہی چھوٹے چھوٹے لڑکے خدمتگار تھے جنہیں جمال چناری میں چھوڑ کر آیا تھا۔ ان کے کپڑے ذرا ڈھیلے تھے۔ انہوں نے چھوٹی چھوٹی شلواریں بھی پہن رکھی تھیں جن پر دھجیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان کے پاؤں بھی ننگے تھے۔ ان میں پھرتی بھی مشین کی سی تھی مگر وہ کشمیری بولتے تھے یا ٹوٹی پھوٹی اردو جو انہوں نے مسافروں سے سیکھ لی تھی۔ ان کی اجرت بھی وہی ایک آنہ روزانہ اور بچا کھچا کھانا تھا جسے وہ رات کو گھر لے جاتے تھے تاکہ ان کے ماں باپ اور بہن بھائی بھی پکا ہوا سالن چکھ لیں۔

ان کے گھروں میں مکئی کی موٹی روٹی کی بجائے موٹے چاول پکتے تھے اور جنگلی ساگ کی جگہ کرم ساگ جسے وہ دو وقت ہر موسم میں اور تمام عمر سرسوں کے تیل میں پکا کر کھاتے چلے آئے تھے۔ ان کے منہ کا ذائقہ کبھی بدلا نہ تھا۔

جمال نے اپنی آنکھوں سے کشمیر کی ہریالی اور زرخیزی دیکھ لی تھی۔ وہ حیران تھا کہ پھر یہ لوگ اتنے غریب کیوں ہیں۔

## ہاتو

اسے نور پور میں بھی پتہ تھا کہ کشمیری بہت غریب ہوتے ہیں۔ سردیوں کے موسم میں وہ لکڑیوں کے گٹھے اٹھائے اور باسمتی چاول کی بوریاں کھول کر دھوپ میں سکھانے کے لیے نور پور آیا کرتے تھے۔ نور پور کے لوگ انہیں بہت پسند کرتے تھے کیونکہ وہ اجرت پر جھگڑا نہیں کرتے تھے۔ گھر کی عورتیں رحم کھا کر انہیں بچا کھچا کھانا بھی دے دیا کرتی تھیں۔ ان سے پردہ نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ ان کا مرد ہونا بعید از قیاس تھا۔ وہ تو صرف سستے اور بے زبان مزدور ہوتے تھے۔ وہ کشمیر سے پیدل چلتے ہوئے پنجاب کے دور دراز شہروں اور قصبوں میں چالیس پچاس روپے کما کر چھ ماہ بعد اسی طرح پیدل چلتے ہوئے واپس چلے جاتے تھے۔ وہ کشمیر کے بے زمین کسان ہوتے تھے۔ ان کے لیے ان کے زعفران زاروں میں خوشبو نہیں ہوتی تھی۔ ان کو اپنے پھلوں کا ذائقہ معلوم نہیں تھا۔ ان کے گاؤں بھوکے اور اداس ہوتے تھے۔ ان کے پاس ایک لوئی کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ وہ ہاتو کہلاتے تھے۔

## سرینگر

بس جونہی سرینگر میں داخل ہوئی سڑکیں کشادہ اور ہموار ہو گئیں۔ بڑے بڑے مکان اور ہوٹل مسافروں کو گھورتے۔

ٹریفک کے سپاہیوں کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ ان کے جسم مضبوط اور چوڑے تھے۔ وہ کشمیری نہ

تھے۔ پونچھی تھے اور پنجابی بولتے تھے۔

خواجہ یٰسین اڈے پر پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے سامان اور جمال کی والدہ اور بہن بھائیوں کا چارج لے لیا۔ جمال ایک کامیاب کوہ پیما کی طرح ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ نور پور، فدا محمد، نور جہاں اور شہید گنج بہت پیچھے رہ گئے تھے۔

امیرا کدل کا پل پار کرتے ہوئے جمال نے تانگے میں بیٹھے چاروں طرف غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ سرینگر شہر ایسا خوبصورت تھا کہ یہ کبھی اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ کہاں نور پور کی گندگی سے اٹی ہوئی نالیاں اور کہاں شہر کے بیچوں بیچ بہنے والے دریائے جہلم کا گہرا نیلا پانی۔

دریا کے دونوں کناروں پر چھوٹے چھوٹے دریچوں والے مکانوں کے سلسلے تھے۔ جن کے دروازے دریا میں کھلتے تھے اور سواری کی تلاش میں چھوٹی کشتیاں بطخوں کی طرح سطح آب پر محوِ خرام تھیں۔

امیرا کدل کا پل پار کرنے کے بعد تانگہ ہری سنگھ ہائی سٹریٹ میں داخل ہو گیا۔ بازار میں دونوں طرف ایک ہی وضع کی دکانیں سامان سے بھری مگر ویران پڑی تھیں۔ دوسری منزل پر ایک ہی قسم کے لکڑی کے برآمدے اور پھر رہائشی کمرے آگے گول باغ جس میں نرگس کے پھولوں کی خوشبو نے آفت مچا رکھی تھی۔ پھر شیر گڑھی کے محلات جن میں کبھی مہاراجہ پرتاب سنگھ رہائش پذیر ہوتا تھا اور اب اس میں سیکریٹریٹ قائم تھی۔ شالی سٹورز سے نکل کر جن میں ٹین کے بڑے بڑے گوداموں میں چاول محفوظ کیے جاتے تھے تانگہ حبہ کدل کی تنگ گلیوں میں داخل ہو گیا تو جمال کو سرینگر کی اندرونی آبادی کی کسمپرسی پر بڑی حیرت ہوئی۔

مکان اندھیرے تھے۔ اگرچہ ان میں بجلی کے بلب ٹمٹما رہے تھے۔ عورتوں، مردوں کے چہرے پیلے اور پچکے ہوئے تھے۔ بچے پھولوں کی طرح شگفتہ مگر بڑوں پر نقاہت اور مردنی طاری!

برف اور کیچڑ کی دلدلوں میں سے گزرتے ہوئے بدبو کے بھبکوں سے بچنے کے لیے جمال کی والدہ نے دوپٹے کا پلو منہ پر رکھ لیا۔

"بہت گندے ہوتے ہیں کشمیری۔" خواجہ یٰسین نے کہا۔ "مہینوں غسل نہیں کرتے۔ ان کے گھروں میں پاخانے بھی نہیں ہوتے۔"

"توبہ توبہ۔" جمال کی والدہ بولی۔

"کھاتے بھی کچھ نہیں۔ دو وقت موٹے چاول اور تیل میں پکا ہوا کرم ساگ، مگر ہیں بہت شریف۔ بہت ڈرپوک اور جاہل اس قدر کہ جو بھی شخص باہر سے کشمیر آتا ہے، یہ اسے پنجیب یعنی پنجابی کہتے ہیں۔"

"کیوں بھلا؟"

"متعصب لوگ ہیں۔ بس کچھ انہیں شیخ عبداللہ نے بگاڑ دیا ہے۔"

اتنے میں تانگہ ایک کھلے میدان میں داخل ہوا۔ سامنے ہری پربت کا ٹلہ نظر آنے لگا جس کی چوٹی پر ایک قلعہ بنا ہوا تھا۔ اس کے دامن میں گلابی رنگ کے درختوں کی چادر بچھی ہوئی تھی۔

"یہ بادام واری ہے۔" خواجہ یٰسین نے کہا "یعنی باداموں کا باغ۔ بادام کے شگوفے گلابی ہوتے ہیں۔ بہار آئے گی تو ان کا رنگ بدل جائے گا۔"

ایک تنگ گلی کے دہانے پر تانگہ رک گیا۔ سامان اترنے لگا۔ بڑے بڑے پھرن پہنے ہوئے چھوٹے چھوٹے لڑکے تماشہ دیکھنے لگے۔ انہوں نے اس سے پہلے اور اس قدر قریب سے لمبے گھیر کی شلواریں اور لمبے کوٹوں اور طروں والے پنجابی نہ دیکھے تھے۔ محلہ میر یوسف سرینگر کے آخری کونے پر جموں اور راولپنڈی جانے والی سڑکوں سے بہت دور واقع تھا۔ جموں کے پنجابی بولنے والے ہندو افسر امرتسر کے پشمینے کے تاجر اور کشمیر کے ڈوگرے حکمران اس علاقے میں کبھی نہ آئے تھے۔

## گلابی رنگ کی زدنی

گھر کے اندر زدنی نے چولہا جلا رکھا تھا۔ باورچی خانہ گرم تھا۔ وہ تیرہ برس کی ایک گلابی رنگ کی لڑکی تھی۔ پھرتیلی اور پر اشتیاق۔ اس نے پھرن پہن رکھا تھا۔ سر پر ٹوپی جس کے ساتھ چاندی کی موٹی موٹی ڈنڈیاں سرخ ڈوری سے لٹک رہی تھیں۔ اس کے بازو بے حد سرخ تھے۔ صحن کی طرف سے وہ برف پر ننگے پاؤں چل کر آئی تھی۔ خواجہ یٰسین نے کہا "یہ زدنی ہے۔ ہماری مالکہ مکان کی بیٹی۔ کیوں زدنی؟ کیا چھیس نام؟" انہوں نے ہنس کر کہا۔ زدنی نے شرما کر انہیں دیکھا اور پھکنی سے آگ بھڑکانے لگی۔ پھر اس نے کہا "آپا جی سلام!"

زدنی کو اردو بالکل نہیں آتی تھی۔

جمال کی والدہ نے صندوق اور بستر ایک طرف رکھوا دیئے اور اب بوری میں سے آلو نکال کر چھیلنے لگی۔

جمال کا دل چاہا تھا کہ میں گلی میں جا کر لڑکوں سے دوستی کروں مگر اندھیرا ہو رہا تھا اور خواجہ یٰسین سورج غروب ہو جانے کے بعد بچوں کا باہر جانا خطرناک سمجھتے تھے۔

جمال کو زدنی بہت اچھی لگی۔ اس میں نور پور کی لڑکیوں سے بھی زیادہ سادگی اور معصومیت تھی۔ اسے کسی قسم کی گھٹن کا احساس نہ تھا۔ جب وہ پھکنی چلا رہی تھی تو لگتا تھا کہ جنگلی انار کی جھاڑی پھل کے بوجھ سے زمین پر جھکی ہوئی ہے۔

زدنی چولہے کے پاس بیٹھ کر جمال کی والدہ کو پھلکا پکاتے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ ایسا تماشہ اس نے کبھی دیکھا نہ تھا۔ جب وہ کھانے پر بیٹھے تو وہ چپکے سے چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد تول تول کر قدم رکھتے ہوئے وہ پھر باورچی خانے میں آ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک بڑا سا سماوار اور بغل میں چھوٹی چھوٹی پیالیوں کی ٹوکری تھی۔ پھر وہ ان میں قہوہ انڈیلنے لگی۔ جمال کے ہونٹ جل گئے مگر اسے بڑا مزہ آیا۔ زدنی نے پیالی اس کو پکڑاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تک نہ تھا مگر سی

کی آواز سن کر وہ زور سے ہنس پڑی۔

## پہلا دن

اسلامیہ ہائی سکول جمال کے گھر سے دور نہ تھا۔ اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ سکول میں سب ہاتو ہی ہاتو ہیں۔ سب نے کھلے کھلے پھرن پہن کر لوئی کی بکل مار رکھی تھی۔ پھرن کے اندر آگ سے بھری کانگڑی۔ سروں پر پگڑیاں مگر کلوں اور طروں کے بغیر۔ سکول میں ایک پنجابی لڑکا اور تھا۔ تجمل قاضی وہ ہیڈ ماسٹر کا بیٹا تھا۔ وہ پگڑی نہیں باندھتا تھا۔ طرے والی پگڑی کی وجہ سے جمال سکول کے بچوں کو کسی قدر دلچسپ لگا مگر وہ بالعموم پنجابیوں سے خوفزدہ تھے۔ انہیں شُبے کی نظر سے دیکھتے تھے اور اس کی بڑی وجہ ان کا تاریخی تجربہ تھا۔

کشمیر ایک پیالے کی طرح وادی ہے جس میں داخل ہونے کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک جموں سے اور دوسرا راولپنڈی سے۔ مغلوں کے زمانے میں جہلم نوری چھمب اور پونچھ سے راستے سرینگر کو جاتے تھے۔ جتنے بھی حملہ آور وادی میں آئے اور جتنی بھی لوٹ مار ہوئی وہ پنجاب کی طرف سے ہوئی۔ اگرچہ حملہ آور کبھی مغل تھے کبھی پٹھان اور کبھی ڈوگرہ اور کبھی سکھ مگر وہ سب کو پنجابی ہی سمجھتے تھے۔

جموں کے ڈوگرے جو وادی کے اصل حکمران تھے' شیر گڑھی سیکریٹریٹ میں یا پولیس اور خزانے میں اعلیٰ عہدوں پر قابض تھے۔ کشمیری پنڈت ان کے شریک کار تھے مگر کشمیری مسلمانوں کو چپڑاسی یا دفتری سے بڑی کوئی نوکری کبھی کبھار ہی ملتی تھی۔

پولیس کی عام نفری چند کشمیریوں پر مشتمل تھی مگر ان میں پونچھیوں کا حصہ غالب تھا۔ کشمیری جب حقوق کے سلسلے میں جلوس نکالتے تو انہیں مارنے کچلنے کا کام پونچھی پولیس والوں سے لیا جاتا اور وہ بھی لمبے طرے والی پگڑیاں باندھتے اور نوکدار مونچھیں رکھتے تھے۔ طرے بازوں میں امرتسر اور جموں کے تاجر بھی تھے جو پشمینہ' شالیں' گبھے' قالین' لکڑی کا سامان' پیپر ماشی کے نوادرات' قیمتی پتھروں کے نگینے کوڑیوں کے مول خرید کر لے جاتے۔ کشمیر کو پنجاب کی طرف سے آنے والوں نے صدیوں لوٹا تھا۔

## دانی میراجانی

چھٹی کے بعد دانی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ جمال کے گھر کے سامنے رک کر اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا ''اسلام علیکم' میرا گھر قریب ہی ہے۔ میں کتابیں رکھ کر آتا ہوں۔ پھر باتیں کریں گے۔''

جمال کو دانی بہت اچھا لگا۔ اس کے چہرے پر وہی نور پور کے ہاتووں جیسی مسکراہٹ اور عاجزی تھی۔

جمال کے گھر کے سامنے جو میدان تھا اس میں بے شمار چھوٹی چھوٹی قبریں تھیں۔ باورچی خانے کی کھڑکیاں صحن میں کھلتی تھیں جو زونی کے کمرے کے سامنے تھا۔ زونی اپنی بیوہ ماں اور شادی شدہ بہن کے ساتھ وہیں رہتی تھی مگر نلکا جمال والے حصے کے مکان اور زونی کے حصے والے مکان میں مشترکہ تھا۔



دانی ہنسا اور بولا ''تم تو پنجابی ہو' کشمیری تو ہم ہیں جن کے پاس کچھ بھی نہیں۔''

''ہم کشمیری ہیں ایمان سے۔ میرا پردادا یہیں کا رہنے والا تھا۔ وہ پنڈت سے مسلمان ہوا تھا۔'' جمال نے زور دے کر کہا۔

''مسلمان ہو گیا تھا تو چلا کیوں گیا۔ اسے ڈوگروں نے مار کر بھگا دیا ہوگا۔''

اسی قسم کی باتیں کرتے کرتے وہ ایک درگاہ تک آ پہنچے۔ اس کی عمارت گھڑے ہوئے پتھروں سے بنی تھی۔ چوٹی تک سیڑھیاں جاتی تھیں۔ اخروٹ کی موٹی لکڑی کی چوکھٹ پر ایک زنجیر لٹک رہی تھی۔ مزار کی دیواروں میں رنگ دار شیشے والی کھڑکیاں تھیں۔ دانی زنجیر کو پکڑ کر دعا مانگنے لگا۔ جمال نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔ اس سے اسے بہت سکون ملا۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے دانی نے کہا ''حضرت خواجہ صاحب نے کہا تھا کہ بیسویں صدی میں قیامت آئے گی۔''

''ضرور آئے گی ایک دن۔'' جمال بولا۔

''حضرت مولوی صاحب کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے ناراض ہیں۔ ہمیں توبہ کرنی چاہیے۔ وہ کبھی غلط نہیں کہتے۔''

''وہ کون؟''

''حضرت مولوی صاحب میر واعظ یوسف شاہ۔''

جمال نے حضرت مولوی صاحب میر واعظ کا نام اپنے ابا سے سنا تھا۔ وہ انجمن اسلامیہ کے صدر تھے اور کشمیری مسلمانوں کے دل پر راج کرتے تھے۔ لوگوں کو ان سے اتنی عقیدت تھی کہ وہ انہیں دیکھتے ہی دھاڑیں مار کر رونے لگتے تھے۔

''مگر شیخ عبداللہ ان کو نہیں مانتا۔'' دانی نے مسکرا کر کہا۔

شیخ عبداللہ کہتا ہے ''میر واعظ غدار ہے اور ڈوگروں سے ملا ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے ایجی ٹیشن مت کرو۔ صرف نمازیں پڑھو۔ توبہ کرو' دعائیں مانگو۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔''

اتنے میں دونوں بادام واری کے کنارے تک آ پہنچے۔ راستے میں بے شمار پتھر پڑے تھے۔ ایک پتھر پر سیندور ملا ہوا تھا جس کے سامنے ایک پنڈت ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کیے دبی زبان میں اشلوک پڑھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک نورانی روشنی تھی۔

''پنڈت بت پرست ہیں۔ یہ کسی بھی پتھر کو سیندور لگا کر اس کی پوجا کرنے لگتے ہیں کافر۔ دوزخی۔'' دانی نے حقارت سے کہا۔

جمال چپ رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جیسا سکون مجھے مزار پر اللہ سے دعا مانگ کر حاصل ہوا تھا' وہ سکون اس پنڈت کو راستے میں پڑے ہوئے ان گھڑ پتھر کی پوجا کرنے سے ملا ہے۔ پھر سچ کیا ہے؟

مگر یہ بات اس نے دانی سے نہ کی۔

## قربتیں

دو چار دنوں میں جمال اپنے نئے ماحول میں رچ گیا۔ اس نے کشمیری زبان کے کچھ لفظ بھی سیکھ لیے۔ زدنی بھی جمال کی والدہ سے بات چیت کرنے لگی۔ وہ اپنے گھر کا کام نمٹانے کے بعد جمال کے گھر کا آدھا کام کر دیتی۔ چولہا جلاتی' پانی بھر دیتی اور سائرہ اور رعنا کی جوئیں نکالنے لگتی۔ جمال کا دل چاہتا تھا وہ اس کی جوئیں بھی نکالے۔ اسے بڑا افسوس تھا کہ میرے سر میں جوئیں نہیں ہیں۔

زدنی کو جمال سے کوئی خاص حجاب نہ تھا۔ وہ اس کو نظر انداز بھی نہ کرتی تھی اور اس پر بھری ہوئی نظر بھی نہ ڈالتی۔ وہ اس کے سامنے کھانا لگا دیتی اور کبھی سرزنش کے انداز میں ٹوکتی۔ دیکھو تم نے قمیص پر شوربہ گرالیا چھوٹے بچوں کی طرح۔ کبھی کہتی اپنی کتابیں ہر جگہ نہ پھیلایا کرو۔ کھانے سے پہلے ہاتھ دھولیا کرو۔

صبح سویرے جب وہ منہ دھونے کے لیے غسل خانے میں جاتا تو وہ ڈول لے کر پانی بھرنے کے لیے آجاتی اور اس پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اڑاتی۔ اسے پتہ تھا کہ جمال کو ٹھنڈے پانی سے خوف آتا ہے' وہ چیختا۔ اس کی بانہہ مروڑتا تو وہ ہنستے ہنستے دوہری اور تہری ہو جاتی۔

ہنستے ہنستے کبھی وہ جمال پر گر جاتی۔ جمال گھبرا کر اسے دور دھکیلنے کی کوشش کرتا مگر اس طرح کہ وہ دور نہ جا پڑے۔ کبھی اس ریل پیل میں دونوں گتھم گتھا ہو جاتے۔ تھک جاتے تو بانہوں میں بانہیں ڈالے وہ چند لمحے سانس برابر کرنے میں گزار دیتے۔ اس سے پہلے جمال کو اس قسم کی لذت کا کوئی تجربہ نہ ہوا۔

جمال کو پتہ تھا کہ زدنی ایک نوخیز لڑکی ہے' اگرچہ الہڑ ہے۔ اس نے ہمیشہ احتیاط کی کہ جھکا جوری میں اس کے ہاتھ اس کے گیندوں سے نہ چھو جائیں اور وہ آپا جی یعنی ماں سے اس کی شکایت نہ کر دے۔

اس کی ماں ماج بہت شفیق عورت تھی اور اپنے اٹکتے اور کھنچتے ہوئے سانسوں کے باوجود ہر وقت ہنستی رہتی تھی۔ اسے دمے کا مرض لاحق تھا۔ ٹھنڈی اور کھلی ہوا میں اسے دورہ پڑ جاتا تھا۔ وہ دن رات ایک اندھیری کوٹھڑی میں پڑی حقہ پیتی رہتی۔ جس سے اسے کھانسی کے لمبے غوطے آتے تھے۔ جمال کبھی زدنی کو دیکھنے کے بہانے ماج کے پاس چلا جاتا تو وہ اصرار کر کے اسے میٹھا قہوہ پلاتی اور کشمیری زبان میں لمبی لمبی خوبصورت دعائیں دیتی۔ جمال کو اس شفقت کی گٹھڑی پر بڑا پیار آتا۔ جب وہ کھانستی تو وہ اس کے کندھے پکڑ کر ہلکے ہلکے دباتا' اس پر زدنی جمال کو بالکل اپنی بن کر کہتی "تم اسے منع کرو جمال۔ یہ حقہ کیوں پیتی ہے۔"

مگر زدنی اور زدنی کی معصوم ماں کو جمال کی چوریوں کا علم نہ تھا جو وہ غسل خانے میں اور راستہ چلتے کر لیتا تھا۔

## موسم گدرایا

مہینے بھر میں رت بدلی اور زندگی بخش تمازت دھوپ کے سنہرے میں گھل گئی۔ وادی نے سبز جوڑا پہن لیا۔ گندی نالیوں تک میں پھولوں کا چھڑکاؤ ہو گیا۔ اتنے روشن رنگ جمال کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ چاروں طرف دھیمی دھیمی خوشبو پھیل گئی۔ جمال باہر جاتا تو زور زور سے سانس اندر کھینچتا۔

جمال نے دانی کے ساتھ امیرا کدال کی سیر کر لی تھی۔ وہ چوتھے پل زینہ کدل سے شکارے میں سواریوں کے ساتھ فتح کدل اور حبہ کدل کی سیر کر چکا تھا اور دیکھ چکا تھا کہ دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر بنے ہوئے مکانات سے لوگ دریا میں کیسے اترتے ہیں۔

وہ پرتاب پارک میں ویدانتی جوگیوں کے لیے لیکچر سن چکا تھا اور ایس پی کالج کے چکر کاٹ چکا تھا۔ جہاں سے جھیل ڈل کو راستہ نکلتا تھا مگر جھیل ابھی اس نے دیکھی نہ تھی۔

ابھی اس نے نسیم باغ کے دیوزاد چنار بھی نہ دیکھے تھے۔ چشمہ شاہی کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی بھی نہ چکھا تھا جسے دہلی اور آگرہ میں مغل بادشاہ پینے کے لیے دہلی منگواتے تھے۔ اس نے ابھی شالامار باغ کی سیر بھی نہ کی تھی جس کے ساتویں تختے پر شاعر ٹامس مور نے اپنی داستان لالہ رخ کا آخری منظر باندھا تھا۔

اس نے پہاڑ کے وسط میں واقع لائبریری کے کھنڈروں کے بارے میں فقط سنا ہی تھا جس میں دارا شکوہ مطالعہ کیا کرتا تھا۔ دانی نے بتایا تھا کہ اب اس میں پریاں رہتی ہیں مگر جنگلی ریچھ اِدھر کسی کو جانے ہی نہیں دیتے۔

اس کے سامنے جھیل کے دوسرے کنارے پر حضرت بل کی درگاہ واقع تھی جس میں رسول اکرم ﷺ کا ایک موئے مبارک جمعے کی نماز کے بعد نمازیوں کی زیارت کے لیے باہر لایا جاتا تھا اور جسے دیکھ کر کشمیری فرطِ عقیدت سے بے ہوش ہو جایا کرتے تھے۔

یہ سارے عجوبے جھیل ڈل کے چاروں کناروں پر واقع تھے۔ کچھ تو قدرت کی دین تھے اور کچھ مغلوں نے اختراع کیے تھے تو شب آفریدی' چراغ آفریدم!

کشمیر آنے سے قبل جمال نے خواجہ محمد دین سے جو آباؤ اجداد کا ذکر کرتے نہ تھکتے تھے شنکراچاریہ کا نام سنا تھا۔ یہ مندر بھی جھیل کے راستے میں پڑتا تھا اور کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ چار ہزار سال پرانا ہے۔ جمال کے پردادا کے دادا اس مندر کے کاہن تھے' جب وہ مسلمان ہوئے۔ جمال کے دل میں اس مندر کو دیکھنے کی بھی بڑی آرزو تھی۔

## کھول آنکھ زمین دیکھ

خواجہ یٰسین کریلے کھانے کے شوقین تھے اور کریلے پکانے میں جمال کی والدہ یدطولیٰ رکھتی تھیں۔ خواجہ یٰسین کو کشمیر میں اپنی مرضی کا تمبا کو بھی دستیاب ہو گیا تھا۔ اس سے ان کی زندگی بہت خوشگوار ہو گئی۔ کشمیر کا

دہی انہیں اچھا نہ لگتا تھا مگر لسی اس کی وہ خوشی سے پی لیتے تھے۔

کریلے کھا کر لسی پی کر اور حقے کے کش لگا کر وہ بہت خوش بیٹھے تھے۔ جمال کی والدہ بڑی ادا شناس تھیں۔ بے موقع اس نے اپنے میاں سے کبھی کوئی فرمائش نہ کی تھی۔ کہنے لگی ''جی آپ کو تین چھٹیاں ہیں۔ آپ کہیں چلے کیوں نہیں جاتے دوستوں کے ساتھ۔ کہیں سیر کر آتے۔''

''ٹھیک ہے۔'' خواجہ یٰسین نے دھواں چھوڑتے ہوئے کہا ''مگر تم بھی تو گھر ہی میں پڑی ہو جب سے کشمیر آئی ہو۔ میرا خیال ہے تمہیں جھیل ڈل کی سیر کرا دوں ڈونگے میں۔''

''ڈونگا کیا ہوتا ہے؟'' جمال کی والدہ نے پوچھا۔

''ڈونگا ایک بہت بڑی کشتی ہوتی ہے جس میں چار پانچ کمرے میں ہوتے ہیں اور ایک باورچی خانہ، ہانجی یعنی ملاح۔ اسے جہاں کہو کھیہ کر لے جاتے ہیں جھیل میں۔''

''ڈونگا حبہ کدل سے دس آنے روز میں ملتا ہے اباجی۔'' جمال نے لقمہ دیا۔

جمال کی والدہ بہت خوش ہوئی، پھر رسد کی باتیں ہونے لگیں۔

''سب کچھ ملتا ہے جھیل میں۔'' زدنی بولی ''گوشت، کیک، پیسٹری، سبزی، پھل، گاڑا، کشتی میں دکان ہوتا ہے۔''

''گاڑا کیا زدنی۔'' جمال کی والدہ نے پوچھا۔

''گاڑا مچھلی کو کہتے ہیں آپا جی۔ شکاروں پر دکاندار آتا اور ڈونگے میں چیزیں بیچتا۔ کسی چیز کا تکلیف نہیں ہوتا آپا جی۔''

''تم بھی چلو ہمارے ساتھ۔''

جمال نے معصوم بن کر کہا ''اور کیوں نہ ماج کو بھی ساتھ لے چلیں اماں جی؟''

وہ جانتا تھا کہ ماج دمے کی وجہ سے کہیں جا نہیں سکتی۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ مجھے زدنی کے جانے یا نہ جانے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں مگر دل اس کا بلیوں اچھل رہا تھا۔

زدنی بولی ''ماج نہیں جا سکتا آپا جی۔ اس لیے میں بھی نہیں جا سکتا۔''

رعنا اور سائرہ بولیں۔ ''زدنی چلے گی ہمارے ساتھ ابا جی۔'' چھوٹا اختر اچھل کر زدنی کی گود میں جا بیٹھا۔ ''میں زدنی کے ساتھ سوؤں گا۔ کہانی سنوں گا۔'' اس نے کہا۔

خواجہ یٰسین بولے ''ہاں زدنی کو لے چلو ساتھ۔ کام کاج میں ہاتھ بٹائے گی۔''

بات اس پر ٹھہری کہ ماج سے درخواست کی جائے۔ اگر وہ اجازت دے دے تو زدنی چلے ساتھ۔

زدنی کو کچھ کچھ رضامند پا کر جمال نے کہا ''یعنی امی ماج اکیلی کیسے رہے گی گھر میں؟ زدنی کو اس کی دیکھ بھال کرنی ہوگی۔'' پھر اس نے آنکھ کے کونے سے زدنی کی طرف دیکھا۔ زدنی کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے۔ جمال سے اس کی نگاہیں ٹکرا گئیں۔ بولی ''نہیں آپا جی میں کیسے جائے گا۔ میں نہیں جائے گا۔ جمال ٹھیک بولی۔''

آنکھ بچا کر جمال ماج کی کوٹھڑی میں گھس گیا۔ پیچھے پیچھے زدنی جس کی پازیب کے گھنگرو چھنک چھنک بج رہے تھے۔ جمال نے ظاہر کیا کہ مجھے تو کچھ خبر ہی نہیں۔

جاتے ہی اس نے ماج کا ماتھا چوم لیا اور اس کے کندھے دبانے لگا۔

ماج اسے دعائیں دینے لگی۔

جمال نے کہا ''ماج ایک بات کہنے آیا ہوں، مانو گی؟''

ماج مسکرا دی، بولی ''میٹھا قہوہ؟''

جمال نے بیزاری سے کہا ''نہیں ماج۔ میری امی نے بھیجا ہے۔ وہ کہتی ہے......''

''جھوٹ۔ اس کی امی نے نہیں بھیجا۔'' زدنی چیخ کر بولی۔

جمال نے سنی ان سنی کر دی۔ ''ہم ڈونگے پر حضرت بل جا رہے ہیں۔ موئے مبارک دیکھنے۔ زدنی کو بھی ہمارے ساتھ بھیج دو۔ اس کی شادی نہیں ہوتی نا دعا کے لیے۔''

''تمہاری شادی نہیں ہوتی۔ تم جاؤ۔'' زدنی نے چڑ کر کہا۔

''میری امی نے بھیجا ہے۔ زدنی کو ہمارے ساتھ بھیج دو۔'' جمال نے ماج سے کہا۔

ماج مسکرائی اور اشارے سے بولی ''نہیں۔'' پھر وہ کھانسنے لگی۔ جمال نے اس کے کندھے پکڑ لیے اور اسے آہستہ آہستہ دبانے لگا۔

جب اس کے دم میں دم آیا تو جمال نے کہا ''میری امی کہتی ہے۔ مجھے حضرت بل کا راستہ نہیں آتا۔ میں موئے مبارک کی زیارت کیسے کروں گی۔''

زدنی خاموش ہو گئی۔ ماج سوچ میں پڑ گئی۔

جمال نے ضد کرنی شروع کر دی۔ پھر وہ ماج کا بوڑھا منہ چومنے لگا اور لپٹ کر بولا ''زدنی ضرور حضرت بل جائے گی۔ موئے مبارک کی زیارت کرے گی۔''

زدنی نے کشمیری میں ماج کو بتایا کہ جمال کی امی نے کہا ضرور تھا مگر اس نے جمال کو بھیجا نہیں۔ ''میں نہیں جاؤں گی تمہیں اکیلا چھوڑ کر۔ جمال جھوٹ بولتی ہے۔''

ماج نے جمال کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا ''لوکٹ چھو'' (بچہ ہی تو ہے)

زدنی بولی ''لوکٹ نہ چھو۔ شیطان چھو۔''

ماج نے کچھ سوچا، پھر زدنی کی طرف دیکھ کر بولی ''گس زدنی'' (چلی جا زدنی) اس پر زدنی خاموش رہی۔ جمال نے ایک دفعہ پھر ماج کا منہ چوما اور باہر نکل گیا اور جا کر امی سے کہنے لگا ''زدنی نے اپنی ماں سے

اجازت لے لی ہے۔ وہ تو مانتی نہ تھی مگر زدنی نے ضد کی تو بیچاری مجبور ہوگئی۔"

مگر اس کو خبر نہ تھی کہ زدنی اس کے پیچھے دبے پاؤں آ کر چوکھٹ سے لگی ہے۔ "جھوٹ۔" اس نے چیخ کر کہا۔ "ہم ماج کو مجبور نہیں کیا۔ جمال مجبور کیا۔ اب ہم کیا بولے گا۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔" جمال نے کہا۔

اب چونکہ دونوں نے تھوڑا تھوڑا جھوٹ بولا تھا اور دونوں دل سے چاہتے تھے کہ ذرا جھیل ڈل کی سیر ہو جائے۔ اس لیے دونوں چپ ہو گئے۔

بدھ کی صبح خواجہ یٰسین کا خاندان اور زدنی تانگے میں بستر' برتن' آٹے' چینی کی پوٹلیاں اور آلو کے پراٹھے لے کر زینہ کدل پہنچ گئے جہاں انہیں ڈونگے پر سوار ہونا تھا۔ زدنی نے کشمیری طرز کا برقعہ پہنا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ کھلا تھا۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔

جمال بظاہر زدنی سے لاتعلق رہا۔ اس نے پہلے سامان ڈونگے میں رکھا۔ پھر ایک تجربہ کار شخص کی طرح اپنی والدہ' اپنے چھوٹے بھائی اختر' چھوٹی بہنوں سائرہ اور رعنا کو کشتی میں اتارا۔ آخر میں اس نے زدنی کا گدیلا سا ہاتھ پکڑا تو وہ ایک گیند کی طرح اچھل کر ڈونگے میں جا پڑی۔

## یا پیر دستگیر

جب سب کچھ لد چکا تو ہانجی نے ایک بڑا سا بانس دریا کی پتھریلی تہ میں گاڑ کر "یا پیر دستگیر" کی لے پر ڈونگے کو کھینچنے لگا۔

جمال کی والدہ اور زدنی کھڑکی میں ساتھ ساتھ بیٹھ گئیں۔ بچے دوسری کھڑکی میں جم گئے۔ جمال چتوار پر کھڑا ہو گیا۔ خواجہ یٰسین اخبار پڑھنے لگے۔ گھروں' گھاٹوں' مندروں' مسجدوں' درگاہوں' پلوں' کشتیوں اور شکاروں کے ساتھ پھسلتا ہوا ڈونگا آہستہ آہستہ جھیل ڈل کی طرف بڑھنے لگا۔

جمال نے ایک بڑا سا چپو پکڑ لیا مگر تھوڑی دیر میں اس کے ہاتھ دکھنے لگے۔ اچانک چپو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دریا کے تیز پانی میں بہہ گیا۔ ہانجی نے شور مچایا تو اس کی بیوی نے جھک کر بہتے ہوئے چپو کو پکڑ لیا۔ زدنی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

خواجہ یٰسین نے جمال کو خون آلود نگاہوں سے دیکھا۔ زدنی بولی "جب تمہارا ہاتھ میں طاقت نہیں جمال تو کیوں کرتا ہے شرارت؟"

جمال کھسیانا ہو گیا اور کنارے پر اُگے لمبے لمبے سفید درختوں کو دیکھنے لگا۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد زدنی چاول کی پیچ نکالنے کے لیے اس کے قریب سے گزری تو اپنا پلو اس کے منہ پر پھیر گئی۔ جمال نے اس کی طرف دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ تھوڑی دور جا کر زدنی نے جمال پر ایک چور نظر ڈالی تو اس کے دل میں گھنگھرو بجنے لگے۔ دل دھک دھک کرنے لگا اور وہ گنگنانے لگا "اب کے ساون گھر آ جا۔"

نور پور میں مشتاق چھت پر بیٹھ کر یہی گیت گایا کرتا تھا۔

دوپہر سے کچھ پہلے ڈونگا دریائے جہلم سے جھیل کے دہانے پر پہنچ گیا۔ جھیل کی سطح دریا سے بلند تھی۔ ہانجی اور اس کی بیوی نالے کی دیوار سے لگی ہوئی زنجیر کو پکڑ پکڑ کر ڈونگے کو آگے بڑھانے لگے۔ اندر داخل ہوتے ہی شفاف اور پرسکون پانی کی نیلی چادر آنکھوں کے سامنے بچھ گئی۔ لگتا تھا کہ نیلے رنگ کا شیشہ سطح آب پر رکھا ہوا ہے اور شاعرانہ بات کیجیے تو سمجھئے کہ جھیل قدرت کی نیلی آنکھ تھی جس میں ڈونگا اتر گیا تھا۔

چاروں طرف پہاڑوں کا سلسلہ تھا جن کی چوٹیوں پر گھنے جنگل تھے۔ بے شمار شکارے (چھوٹی کشتیاں) جن کے خوبصورت گدیلوں پر سیاح لیٹے ہوئے تھے' ڈونگے کو کاٹ کاٹ کر آگے نکل رہے تھے۔ ان کے سرخ' سبز اور زرد حریری پردوں میں سے یورپین اور ہندوستانی امراء' تاجروں اور افسروں کی خوبصورت اور بدصورت موٹی اور نازک اندام بیویاں پانی کی سیر دیکھ رہی تھیں۔

ان میں کشمیری کوئی ایک بھی نہیں تھا۔

پانی کی شفاف تہہ میں سبزہ ہی سبزہ تھا۔ رنگدار پھولوں والی بیلیں بل کھا کھا کر گھاس میں زلفوں کی طرح الجھی ہوئی تھیں۔ جن میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں آنکھ مچولی کھیلتی تھیں۔ جھیل کے کناروں پر ریشمی پردوں والے عالیشان ہاؤس بوٹ گھاٹوں سے بندھے کھڑے تھے۔ کھلی کھڑکیوں میں سے ان کے ڈرائنگ رومز' بیڈ رومز اور کچنز کی آرائش کا کچھ اندازہ ہوتا تھا۔ ان میں بھی یورپین اور ہندوستانی امراء بال بچوں کے ساتھ مستقل طور پر رہائش پذیر تھے۔ چھتوں پر ان کے مکین دھوپ میں کرسیاں ڈالے اونگھ رہے تھے یا شراب کے جام سامنے رکھے محوِ گفتگو تھے۔

کشمیری ان میں بھی کوئی نہ تھا۔

سوائے وردی پوش بیروں' خانساموں اور دیگر نوکروں کے جن کی عورتیں خوبصورت تھیں۔ وہ اپنے کھلے گھیر کے پھرنوں میں صاحب لوگوں کی خدمت میں ہرنیوں کی طرح چوکڑیاں بھرتی پھرتی تھیں۔

کچھ ہاؤس بوٹ رہائشی نہیں تھے۔ یہ سیاحوں کے غسل کے لیے مخصوص تھے۔ یورپین عورتیں تیراکی کے لباس پہنے اپنے سڈول مرمریں جسموں کی نمائش کرتی ہوئی ہاؤس بوٹ کی چھت سے جھیل میں کودتیں تو ان کے بیئر پیتے ہوئے مرد قہقہے مارتے اور انگریزی بولتے جو جمال کی سمجھ میں بالکل نہ آتی۔

## چشمہ شاہی

دوپہر کے بعد ڈونگا چشمہ شاہی کی طرف گھوما۔ جمال چھوٹی چھوٹی چڈیوں میں پھنسی ہوئی یورپی عورتوں کی گول ٹانگوں کو کچھ اور دیکھنا چاہتا تھا کہ زدنی نے آواز دی "جمال بھات کھیو۔" اس پر سارے رنگ

پھیکے پڑ گئے۔

شام کے قریب ڈونگا چشمہ شاہی کے کنارے لگ گیا۔ میل بھر کی چڑھائی کے بعد چشمہ شاہی کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی پی کر اور جہانگیر کی بنائی ہوئی عمارت میں جمال تازہ دم ہو گیا۔ جیسے اسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ چھوٹی بہن رعنا اس کی بکھیوں پر چڑھی رہی۔ سائرہ نے اس کی انگلی پکڑ لی اور وہ اور زدنی آگے پیچھے پھولوں کے تختوں میں بھاگتے رہے۔

اختر بھیا نے زدنی کو گھوڑی بنالیا اور اس کے دونوں چوٹیوں کی لگام ہاتھ میں لے لی۔ زدنی ہنسی اور قہقہے لگاتی رہی۔ جیسے گلاب کے پھول اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھے ہوں۔

شام ڈھلتے ہی جھیل کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے چراغ جلنے لگے۔ شکاروں میں گیس پمپ درخشاں ہو گئے۔ ڈونگوں میں لالٹینیں جل گئیں۔

جمال کی والدہ نے لالٹین جلائی۔ زدنی نے پھکنی سے آگ دہکائی۔ خواجہ یٰسین حقہ پینے لگے۔ بچے خاموش ہو گئے۔ جمال کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔

کھانا کھانے کے بعد بستر بچھنے لگا۔ جمال کو شام بہت اداس لگی۔

## جوان لڑکی

جمال کی والدہ کو احساس تھا کہ زدنی جوان ہو چکی ہے اور اگرچہ جمال ابھی بچہ ہی ہے اور شرافت اور حیا اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے مگر اس کا بستر بہر حال زدنی کے بستر سے دور ہی بچھنا چاہیے۔

جگہ کی تنگی کی وجہ سے کسی کا بھی کسی سے دور ہونا مشکل تھا۔ زیادہ سے زیادہ بچے ساتھ ساتھ سو سکتے تھے۔ جمال کی والدہ نے زدنی کا بستر اپنے بستر کے ساتھ لگوایا۔ اختر بھیا نے زدنی کے ساتھ سونے کی ضد کی تو اسے بھی دونوں کے بیچ لٹا لیا گیا۔ خواجہ یٰسین پتوار پر پڑ گئے۔ جمال کے لیے ڈونگے کی دوسری نوک پر جگہ نکلی۔ رعنا اس کے ساتھ سوتی تھی۔

لالٹین مدہم کر دی گئی اور سب لیٹ گئے تو رعنا مچلنے لگی۔ زدنی مجھے کہانی سنائے۔ رعنا نے اپنا تکیہ سر کی جانب سے زدنی کے تکیہ کے ساتھ لگا لیا اور یوں جمال کا سر محض رعنا کی ضد کی وجہ سے زدنی کے سر کے ساتھ لگ گیا مگر ایک کی ٹانگیں شمال کو تھیں تو دوسرے کی جنوب کو۔

پھر رعنا اپنی توتلی زبان میں آپ ہی کہانی سنانے لگی۔ جمال کی والدہ تھوڑی ہی دیر میں خراٹے لینے لگی۔ اختر بھیا زدنی سے لپٹ کر سو گیا مگر رعنا کا بیان جاری رہا۔ چڑیا بولی۔ چڑیا بولی......

جمال بے خیالی میں تھوڑا سا اوپر کو سرک گیا۔ اس کے بال زدنی کے بالوں سے مس ہونے لگے یا یہ محض اس کا خیال تھا مگر پھر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے کیوں لگا تھا۔

دور کسی ہانجی نے تان اٹھائی......

"دلولالہ رویو۔ دلک حال ہاوی......" (اے لالہ رخو! آؤ تمہیں دل کا حال بتاؤں)

رات جگمگ جگمگ کرنے لگی۔

جمال کو رعنا سے بہت پیار تھا۔ اس کی توتلی باتیں اسے بہت پیاری لگتی تھیں۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ رات وہیں رک جائے۔ رعنا کی کہانی جاری رہے اور وہ اسی طرح زدنی کے بالوں سے بال الجھائے ہانجی کا گیت سنتا رہے۔ دلولالہ رویو......

اس نے تکیے پر ہاتھ رکھا تو زدنی کی ایک لٹ اس کی انگلی سے الجھ گئی۔ اس لٹ کو اس نے آہستہ آہستہ انگلی کے گرد لپیٹنا شروع کر دیا۔

زدنی نے اچانک لٹ کی لرزش محسوس کر لی اور اس نے سر اٹھا کر نظروں ہی نظروں میں جمال کو ڈانٹ دیا۔ زدنی نے منہ سے کچھ بھی نہ کہا تھا مگر وہ سمجھ گیا تھا کہ زدنی نے اس کی حرکت کو پسند نہیں کیا۔ اندیشوں کے تانے بانے میں کسی وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔

## آب نشاط انگیز

علی الصبح جمال کا کنبہ سیر کی دوسری منزل نشاط باغ کی طرف چل دیا۔ شاہی چشمے سے کچھ ہی فاصلے اور اسی کنارے پر باغ کے تختے شروع ہو جاتے تھے۔ مغلوں کے ذوق کے مطابق اس میں بھی فواروں اور تالابوں کا ایک سلسلہ تھا اور حدِ نگاہ تک پھول ہی پھول۔ پھلدار درختوں کے جھنڈ کچے سیبوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔ کچھ پیلے کچھ سبز اور کچھ زدنی کے ہونٹوں جیسے سرخ اور تر بتر مگر جمال کو زدنی کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی اور اس نے اس سے کوئی بات نہ کی۔

رات کو جمال جلدی چادر اوڑھ کر پڑ گیا مگر تکیے کا رخ بدل کرتا کہ اس کا ہاتھ غلطی سے پھر زدنی کی لٹ تک نہ پہنچ جائے۔

مگر نیند اس سے کوسوں دور تھی۔

رعنا جمال کے ساتھ لپٹ کر سو چکی تھی۔ جب زدنی اپنے بستر میں آئی۔

تھوڑی دیر کے بعد زدنی نے سر تکیے سے اٹھا کر کہا۔

"آز (آج) کہانی نہیں سنائیں گا رعنا؟"

رعنا تڑپ کر اچھلی اور زدنی کی طرف چل دی۔ اس نے تکیہ جمال کے سر کے نیچے سے کھینچ لیا۔

جمال نے غصے سے کہا "کیا کرتی ہو رعنا؟"

زدنی آہستہ سے بولی "ہم کو کہانی سناتا ہے رعنا۔ تم کیوں روتا ہے؟"

جمال کی آنکھوں میں واقعی آنسو آ گئے۔ وہ بولا "میں کب روتا ہوں زدنی؟"

"تم سارا دن رویا۔ تم نے کسی سے بات نہ کیا۔ کیا تم کو کسی نے مارا تھا؟"

''نہیں تو۔'' جمال کھسیانا ہو کر بولا۔

''تو تم بھی رعنا کا کہانی سنو۔ آ جاؤ اِدھر۔'' پھر وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں جمال کو پچکارنے لگی۔

جمال کے دل میں پٹاخہ سا چھوٹ گیا۔

چڑیا بولتے بولتے سو گئی۔ زدنی نے ہنکارے بھرنے چھوڑ دیئے۔ جمال بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اس نے زدنی کی لٹ کو ڈھونڈنے کی کوشش نہ کی۔ وہ اس کے لمبے اور گہرے سانسوں کی موسیقی سنتا رہا۔ اس کے سانسوں میں نشاط باغ کی خوشبو رچی ہوئی تھی مگر اس میں زدنی کی اپنی گرم مرطوب مہک بھی شامل تھی۔

اس مستی اور ترنگ میں اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح کی تازگی میں اسے اپنا بدن بہت ہلکا لگا۔ زدنی چتوار پر بیٹھی جھیل کے پانی سے منہ دھو رہی تھی۔

جمال کا جی چاہا کہ میں زور زور سے گانے لگوں...... دلولالہ رویو!

یہ ان کی سیر کا آخری دن تھا۔ رات شالیمار میں کاٹ کر اگلی صبح انہیں واپس روانہ ہو جانا تھا۔ اس خیال سے ایک لمحے کے لیے اس پر اداسی چھا گئی۔

شالیمار میں جمال کو کوئی خاص جدت نظر نہ آئی۔ وہی پھول' فوارے' روشیں اور وہی پھلوں سے لدے ہوئے درخت۔ مگر یہاں چنار کے پتے بڑے دلاویز تھے اور چھاؤں ان کی ایسی گھنی کہ خواہ مخواہ اس میں بیٹھنے کو دل چاہے۔

وہ سارا دن شالیمار کی بارہ دریوں اور جھروکوں میں کھیلتے رہے مگر زدنی جمال کے قریب ہو کر بھی دور رہی۔

رات کو وہ پھر اسی طرح لیٹے تکیے سے تکیہ اور سر سے سر ملا کر اور دیر تک رعنا کی چڑیا بولتی رہی۔

جمال کو اچانک یہ خیال ہلاک کرنے لگا کہ زدنی اور میں اتنی دیر تک پھولوں کی کیاریوں میں کھلے آسمان کے نیچے یوں ایک ساتھ پھر کبھی رہ نہ سکیں گے۔

نینداس سے کوسوں دور تھی اور زدنی اس قدر قریب! اس کی بھینی بھینی خوشبو میں رات آہستہ آہستہ ڈھلنے لگی۔

زدنی نے کروٹ لی تو اس کا ہاتھ جمال کے بالوں میں الجھ گیا۔ جمال نے چپ سادھ لی کہ کہیں زدنی جاگ نہ جائے۔

مگر زدنی کی انگلیوں میں ہلکی ہلکی حرکت ہونے لگی۔ اس کے پور جمال کے سر میں گدگدی سی کرنے لگے۔ چاند ڈونگے کے بالکل قریب آ گیا۔ ستارے ایک دوسرے کے دامن کھینچنے لگے۔ آسمان سے پھول برسنے لگے جنہیں چننے کے لیے جمال ڈونگے سے نکل کر باہر آ گیا۔

گلی میں اندھیرا چھایا ہوا تھا مگر بازار میں کافوری شمعیں روشن تھیں۔ دکانوں پر بزاز کمخواب اور زربفت کے تھان کھولے بیٹھے تھے۔ جوہریوں کے ہیرے آنکھوں کو چندھیا رہے تھے اور روپہلی چادروں میں لپٹی ہوئی شہزادیاں سونے کے کنٹھے پہنے خچروں پر سوار اپنی اپنی راہ جاتی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے ہٹے کٹے زنگی غلام ننگی تلواریں سونتے اور بانکے قدموں والی چھیل چھبیلی کنیزیں جن کی پائلیں بھیروی گاتی تھیں۔

جمال سنہری گیندوں والے محلوں اور فلک پیما برجوں کے سائے میں منہ میں انگلی ڈال کر ان کا تماشہ کرتا تھا کہ ایک کنیز جو اپنی مالکہ کے ساتھ ابھی گزر کر گئی تھی' واپس آئی اور بولی ''اے جوان رعنا تجھ پہ میرے ماں باپ قربان۔ میرے پیچھے پیچھے آ۔''

جمال دم بخود اس کی طرف دیکھنے لگا۔

کنیز نے پیچھے مڑ کر پھر کہا ''میرے پیچھے پیچھے آ۔ میری شہزادی تجھے دل دے بیٹھی ہے۔ اگر تو نے اسے شربتِ وصل نہ پلایا تو وہ تڑپ تڑپ کر جان دے دے گی اور اس کے خون کا بوجھ تیری گردن پر ہوگا۔ ہائے ایسا غضب نہ ڈھانا۔ ایسا اندھیر نہ کرنا میرے آقا!''

جمال حیرت میں گم رہا۔ کچھ نہ بولا۔

کنیز نے کہا ''میری شہزادی لاکھوں میں ایک ہے۔ اس کے حسن کا کوئی ثانی نہیں۔ چاند اس سے شرما جائے۔ سورج اس کی چھب دیکھے تو چھپ جائے۔ بادِ نسیم اس کے چمن میں لڑکھڑائے۔ پانی اس کی ایک جھلک دیکھ کر شیشہ بن جائے۔ گھٹا اس کے صحن میں پھول برسائے ہے۔ جلدی چل میرے آقا۔ میری مالکہ تیرے انتظار میں کہیں دیوانی نہ ہو جائے۔''

جمال اس کے پیچھے چلتا ہوا ایک محل میں داخل ہو گیا۔

بڑے پگڑ والا دربان اسے دیکھتے ہی زمین تک جھک گیا۔ لمبے چغوں اور چھوٹی چھوٹی ٹوپیوں والی کنیزوں نے اسے جھرمٹ میں لے لیا۔ خواجہ سرا نظریں جھکا کر اس کے سامنے باادب کھڑے ہو گئے۔ ایک منقش دروازے کے سامنے جا کر یہ جلوس رک گیا۔ پھر وہی کنیز جو اسے بازار سے ساتھ لائی تھی آگے آئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی ''یہی وہ شبستانِ عیش ہے جس کے اندر وہ دلگیر بیٹھی تیری راہ تک رہی ہے۔ تیرے انتظار میں اس کی آنکھیں تارا ہو گئی ہیں۔ اب تو اس کا دم لبوں پر آ گیا ہوگا۔ جا اور اسے شربتِ وصل پلا کہ شاید اس میں جینے کی امنگ پھر جاگ اٹھے۔''

پھر اس نے دروازہ کھول کر جمال کو اندر دھکیل دیا۔

بیش قیمت قالینوں پر سیمرغ کے پروں کے تکیے قرینے سے آراستہ تھے۔ کمرے میں رنگوں کے فوارے چھوٹ رہے تھے اور خوشبو کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ فانوسوں میں ستارے جل رہے تھے۔ ان کے بیچ ایک سنہری مسہری پر کنیز کی اداس شہزادی سر جھکائے منہ لٹکائے جمال کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس کی ہلکی ہلکی آہوں سے کمرے کی دھونکنی چل رہی تھی۔

جمال آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا۔ خوشبو کی لپٹیں اس کی جان میں اتر گئیں۔ ایک عجیب سا درد اس کے دل میں ہلکورے لینے لگا۔ نہایت نرمی اور اشتیاق سے جمال نے اپنا ہاتھ اس کی ٹھوڑی پر رکھ کر اس کا چہرہ اوپر کو اٹھایا۔

''زدنی؟'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''یہ تم ہو میری شہزادی؟''

زدنی نے سوئی ہوئی آنکھوں سے جمال کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ اس کے گالوں کے زرد گلاب سرخ ہو گئے۔

جمال نے آہ بھرتے ہوئے کہا ''میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا زدنی۔ میں مر جاؤں گا تمہارے بغیر۔''

زدنی نے ہونٹوں کے دیئے روشن کر لیے۔ جمال کی رگیں ستار کی طرح بجنے لگیں۔ اس کا جسم جھنجھنانے لگا۔ مسہری پر گر کر وہ دونوں ایک لڑھکتا ہوا گیند بن گئے۔ جمال کے جسم میں مہتابیاں چھوٹنے لگیں۔ اس کا رواں رواں دہکنے لگا۔ پھر وہ پورے کا پورا ایک مشعل کی طرح روشن ہو گیا۔

عین اس وقت زدنی نے ہاتھ بڑھا کر نلکے کی ٹونٹی جمال کی طرف گھما دی۔ اس کے کپڑے شرابور ہو گئے۔

''اٹھ اوئے جمال۔'' خواجہ یسین چلائے۔ ''دوپہر ہو گئی ہے۔''

جمال نے آواز سن لی مگر آنکھیں کھولنے کی کوشش نہ کی۔

''سونے دو اسے ابا جی۔'' زدنی نے کہا۔ وہ جھیل کے پانی سے چائے کی پیالیاں دھو رہی تھی۔

ڈونگا آہستہ آہستہ شہر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جمال کو اپنے آپ سے بڑی گھن آئی۔ اس کے کپڑوں میں سے ایک عجیب طرح کی بو آ رہی تھی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ میں تو جوان ہو چکا ہوں۔

سیاحوں کا یہ قافلہ شام کو گھر پہنچا۔ سب لوگ تھکے ہوئے تھے۔ زدنی لپک کر ماج کے پاس چلی گئی۔

جمال کی والدہ نے جلدی جلدی آلو تلے' چھلکے پکائے اور کھا کر سب سونے کے لیے چلے گئے۔ جمال گزرے ہوئے واقعات پر غور کرتا اور اپنے آپ مسکراتا رہا۔ نیند اس سے کوسوں دور تھی۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ باہر کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ گلی میں کھمبے روشن تھے مگر اتنے مدھم کہ لگتا تھا اندھیرا اور گھنا ہو گیا ہے۔ پھر ایک عجیب آواز گانے کی ابھری۔

جمال نے کھڑکی کے پٹ کھول کر دیکھا۔ اندھیرے کے باوجود سامنے کے میدان میں پتھر کی قبروں کے اوپر بیٹھے محلے کے نوجوان غل کر گا رہے تھے۔

''باگ نشاط کے گلو۔ ناز کراں کراں ولو۔''

دھن دلکش مگر اداس تھی۔ گاتے گاتے سائے خاموش ہو جاتے پھر یکدم بول اٹھتے۔ باغ نشاط کے پھولو ناز کرتے کرتے آؤ۔ جمال نے سوچا۔ زدنی تو اس وقت گہری نیند سو رہی ہو گی۔ اسے پتہ ہی نہیں کہ بہار آ گئی ہے۔

## لو پھر بہار آئی

سویرے جب اس کی آنکھ کھلی تو پو پھٹ رہی تھی۔ جمال کے دل کا کٹورا مسرت سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے رات کا گیت گنگنانے کی کوشش کی جو اس کے ذہن میں جھنن جھنن بج رہا تھا مگر حلق سے نکلتا نہ تھا۔ اس نے دیکھا کہ کھڑکی کے قریب والے سفیدے کے تنے پر کل جو چھوٹی چھوٹی سبز کھیاں بیٹھی تھیں۔ ایک ہی رات میں ان کے پر نکل آئے ہیں اور چٹیل میدان میں قبروں کے اردگرد سبز پیلے اور سرخ رنگ کی رُت اُگ پڑی ہے۔

جمال کے ذہن میں بہار کا کوئی تصور نہ تھا۔ نور پور میں کیکر کے درختوں پر زرد پھول کھلتے تھے۔ کھیتوں میں سرسوں پھولتی تھی مگر اس سے زیادہ بہار کے کچھ معنی نہ تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گرمی انگارے برسانے لگتی اور کسی کو خیال بھی نہ آتا کہ رت بدل گئی ہے۔ یہاں جمال بہار کو اپنی آنکھوں کے سامنے پھڑ پھڑاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ دور ہری پربت کے دامن سے گلابی دھند دور ہو چکی تھی اور باداموں کے سبز شگوفے چھب دکھلا رہے تھے۔

## پوپ صاحب

قرآن شریف کی کلاس سکول کی گراؤنڈ میں گھاس کے ایک تختے پر لگتی تھی۔ بہت بوڑھے مولوی صاحب پھرن اور لوئی میں لپٹے ہوئے ایک گیند لگتے تھے۔ اگر ان کے سر پر اتنی بڑی پگڑی نہ ہوتی تو وہ محض کپڑوں کی ایک گٹھڑی بھی سمجھے جا سکتے تھے۔

سپارے ریل پر رکھے تھے۔ انہوں نے ایک بہت بڑا عصا زمین میں گاڑ رکھا تھا اور چمڑے کا ایک درہ بغل میں دابا ہوا تھا۔

وہ بہت نیک اور دیندار آدمی تھے اور چاہتے تھے کہ بچے حضرت عمرؓ کے زمانے کی زندگی گزاریں۔ انہوں نے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی تھی۔

لڑکے ایک دائرے میں ان کے سامنے بیٹھ گئے مگر ان کی بات کوئی بھی دھیان سے نہ سنتا تھا۔ لڑکے ہنستے اور شور مچاتے تو مولوی صاحب باری باری اُن کو بلا کر اپنے نحیف ہاتھ سے درے مارتے۔ انہوں نے کبھی کسی کو لکڑی سے نہیں مارا۔ ان کے خیال میں لکڑی سے مارنا بدعت تھا اور بدعت کے وہ بہت خلاف تھے۔ درے مارنا ان کے نزدیک سزا کا شرعی طریقہ تھا۔

سر کے بال ترشوانا' ٹخنوں تک لمبا پاجامہ پہننا اور نیم کی مسواک کی بجائے برش سے دانت صاف کرنا بھی بدعت تھا۔

گھنٹی بجتے ہی انہوں نے کلاس چھوڑ دی۔ جلدی جلدی جوتا پہن کر عصا اکھاڑا اور سکول سے نکل گئے۔

''ڈرل کی گھنٹی سنتے ہوئے روز اسی طرح بھاگتا ہے۔'' دانی نے مسکرا کر کہا'' حالانکہ ویسے اٹھ بھی نہیں سکتا پوپ صاحب! کبھی کبھی تو ہیڈ ماسٹر صاحب کو بھی ڈانٹ دیتا ہے جب وہ انہیں پتلون پہنے دیکھتا ہے۔ کہتا پتلون پہننا بدعت ہے۔''

''اچھا!'' جمال نے حیران ہو کر کہا۔

''نوے سال کا ہوگا مگر ابھی تک اس نے امیرا کدل نہیں دیکھا۔''

''امیرا کدل زیادہ سے زیادہ تین میل ہوگا یہاں سے۔''

''مگر پوپ تو یہاں سے ایک میل سے آگے نہیں گیا۔''

کہتا ہے زینہ کدل سے آگے کی شکلیں مسلمانوں جیسی نہیں ہیں۔ حج پر گیا تھا مگر اس نے حرم شریف کے سوا کسی چیز پر نظر نہیں ڈالی۔ جہاز میں سمندر بھی نہیں دیکھا۔ تم نے اس کے کانوں میں روئی ٹھنسی دیکھی؟

''کان خراب ہوں گے۔'' جمال نے کہا۔

''نہیں۔'' دانی نے جواب دیا۔ ''اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن شریف کی کلاس کے بعد ڈرل کا پیریڈ ہوتا ہے جس میں بینڈ بجتا ہے۔''

''تو کیا ہوا؟''

''وہ کہتا ہے کہ بینڈ کی آواز شیطان کی آواز ہے۔ اس لیے وہ بھاگ جاتا ہے کہ کہیں میں شیطان کی آواز نہ سن لوں۔ تمہیں تو بینڈ اچھا لگتا ہے نا جمالی؟''

''بہت اچھا۔''

جب بینڈ سکول میں آیا تو پوپ صاحب نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے سمجھایا کہ پرانے مسلمان جب جنگ کرتے تھے تو بینڈ بجاتے تھے۔ پوپ صاحب نے کہا ''غلط پرانے مسلمان تو صرف نفیری اور دف بجاتے تھے۔ سکول میں دف اور نفیری بجاؤ خلافِ شرع نہیں لیکن بینڈ بجا کر بدعت نہ کرو۔''

جمال مسکرا دیا۔

دانی بولا ''انگریزی طرز کا بینڈ مہاراجہ کے حکم سے آیا تھا۔ جب وہ پولو کھیلتا ہے تو بینڈ باقاعدہ بجتا ہے مگر پوپ صاحب نے کانوں میں روئی ٹھونس لی ہے۔ جماعت میں ہم کچھ بھی کہیں نہیں سنتا۔ کبھی کبھی تو صحیح سبق سنا دینے پر بھی درے مار دیتا ہے۔ اس کے دروں سے درد بالکل نہیں ہوتا مگر مار مار کر وہ خود ہانپ جاتا ہے بیچارہ۔''

ڈرل کے بعد ڈرل ماسٹر صاحب نے فلانڈرز نمبر کے محاذ پر بچوں کو اپنی بہادری کے واقعات سنائے تا کہ ان پر انگریزوں کی کمزوری اور بزدلی آشکار ہو اور سمجھیں کہ ہندوستان کو آزاد کرانا اتنا مشکل نہیں۔ انگریزوں کے خلاف اس زمانے میں لوگ بات کرنے لگے تھے مگر مہاراجہ ہری سنگھ اور ڈوگروں کی دہشت تو شہ رگ سے بھی قریب تھی۔ میر واعظ کے سکول میں تو ان کے خلاف کوئی ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکتا تھا۔ اس پر فوراً شیخ عبداللہ کا آدمی ہونے کا الزام لگ جاتا اور وہ غنڈہ اور شر پسند شمار ہوتا۔

## نئے جذبے

گھر میں زدنی کو دیکھ کر اب جمال شرما جاتا مگر زدنی بالکل نارمل تھی۔ اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ جمال کے جسم اور جذبوں میں نئے احساسات ابھر رہے ہیں۔ وہ اب بھی اسے بچہ ہی سمجھتی تھی اور اس کے کمرے میں اکیلی آ جایا کرتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اسے کہہ دے' میرے کمرے میں اکیلی نہ آیا کرو مگر وہ اس کو اچھی بہت لگتی تھی۔

اس نے زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنا شروع کر دیا۔ سکول کا کام کرنے کے بہانے وہ دانی کے ہاں چلا جاتا۔ پھر دونوں سینما دیکھنے کے لیے نکل پڑتے مگر ان کے پاس روز روز ٹکٹ کے پیسے نہ ہوتے تھے۔ اس لیے جمال نے لائبریری کو کھنگالنا شروع کر دیا۔ انہی دنوں ترقی پسند مصنفین کی کچھ نئی کتابیں سکول میں آئی تھیں۔ ان میں ایسی باتیں لکھی ہوتی تھیں جن کا دوسری کتابوں میں کوئی ذکر نہ ہوتا تھا۔ مثلاً غریبوں کا استحصال' عورتوں اور مردوں کے نفسیاتی گنجل' جنسی وارداتیں' انگریزوں سے آزادی کے جذبے' طبقاتی سماج کے خلاف نفرت وغیرہ۔ طرزِ بیان واضح اور حقیقت پسندانہ ہوتا تھا اور بعض اوقات کھلم کھلا اشتعال انگیز۔ کچھ تو جمال پر بچپن میں پڑھے ہوئے الہلال کا اثر تھا۔ کچھ بھید کی باتیں اس نے کوی راج ہرنام داس کے ہدایت نامہ خاوند اور کوک شاستر با تصویر سے سیکھ لی تھیں۔ اس لیے اسے ترقی پسند مصنفین کی کتابوں کے جادو نے دبوچ لیا اور وہ زدنی سے ایک طرح غافل ہو گیا۔ وہ انسانی رشتوں کے بارے میں گہرائی سے سوچنے لگا۔ اسے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ ہندوستان کی غربت اور جہالت کی اصل وجہ انگریز ہیں۔ انہوں نے افسروں اور بڑے زمینداروں کو عوام کو کچلنے اور لوٹنے پر لگا رکھا ہے اور وہی ہیں جن کی خوشنودی کے لیے علمائے دین نے تقدیر کا ڈھونگ رچا رکھا ہے ورنہ خدا نے تو سب انسانوں کو آزاد اور مادی پیدا کیا تھا اور انہیں تخلیق کی قوت بھی دی تھی۔

انہی دنوں ڈرل ماسٹر صاحب نے ایک مرتبہ پھر کہا ''لڑکو چلو انگریزوں کے چھکے چھڑا دو۔'' اتاترک کی وفات کے تعزیتی جلسے میں انہوں نے پہلے تو بلقان اور گیلی پولی کے معرکوں میں انگریزوں کی ترکوں کے ہاتھوں عبرتناک شکست کا نقشہ کھینچا جس پر سوپور کے جوانوں نے دشمن کے چھکے چھڑوا دیئے تھے۔ پھر کہا ''لڑکو اٹھو اور انگریزوں کے چھکے چھڑا دو۔ اگر تم کشمیری ہو۔''

تھوڑے دنوں کے بعد جب علامہ اقبال کا انتقال ہوا تو ان کی کشمیری تقیم نے اور بھی زور باندھا۔ انہوں نے کہا کہ دراصل اقبال نے انگریزوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے شہادت پائی ہے۔ یہ جو کہتے ہیں کہ انہیں دل کا عارضہ تھا' یہ انگریز کے ایجنٹ ہیں' جھوٹ بولتے ہیں۔

ڈرل ماسٹر صاحب ہندوؤں کے بہت خلاف تھے اور ان کا ذاتی تجربہ بھی اب ایسا ہی تھا۔ کشمیر کے

ڈوگرے حکمران ہندو تھے اور وہ مسلمانوں پر بہت سختی کرتے تھے۔ ان سے خصوصی ٹیکس لیتے تھے اور انہیں معمولی جرائم پر بھاری سزائیں دیتے تھے مگر وہ پنڈت نہرو کے معترف تھے جو اگرچہ ہندو تھے مگر کشمیری تھے۔ ڈرل ماسٹر صاحب جمعرات کو ڈرل کے پیریڈ کے خاتمے پر لڑکوں سے دعا کروایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جب تو نے پنڈت جی کو اتنا عالی دماغ دیا ہے تو انہیں اسلام قبول کرنے کی توفیق بھی عطا کر۔

سردیوں کے آغاز میں دوسری جنگ چھڑ گئی تو ماسٹر صاحب جرمنوں کی فتح کی امید لگا کر بیٹھ گئے مگر عام لوگوں کے دلوں میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ حضور ملک معظم قیصر ہند کی سلطنت پر سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔

سرینگر میں چھٹیاں گرمی میں نہیں۔ سردی کے موسم میں ہوتی تھیں۔ جب خواجہ یلیین کا کنبہ پہاڑوں سے اتر کر پنجاب کے میدانوں میں داخل ہوا اور اس نے کھیت میں ہل چلاتے کسانوں' گھاس چھیلتی عورتوں اور ننگے بدن بچوں کو بکریاں چراتے دیکھا تو اسے خیال آیا کہ پنجابی ظالم لوگ نہیں ہیں۔ جن ظالموں نے کشمیریوں کو لوٹا ہوگا انہوں نے پنجابیوں کو کب چھوڑا ہوگا۔ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے نکتے' اس نے ترقی پسند مصنفین کی کتابوں سے سیکھے تھے۔ موٹے پیٹوں والے جاگیرداروں' سیٹھوں' ساہوکاروں' افسروں اور لمبی مونچھوں والے پولیس والوں کے خلاف نفرت کی ایک لہر اس کے سراپے میں دوڑ گئی تھی۔

## جوگی اتر پہاڑوں آیا

نور پور میں تھوڑی ہی دیر بعد جمال فدا محمد کے ساتھ شاہ ولی حضور کی خانقاہ کی منڈیر پر بیٹھا تھا۔

جمال نے رازداری سے پوچھا ''کہو اس کا کیا حال ہے؟''

''نور جہاں کا؟'' فدا محمد فوراً ہی سمجھ گیا۔ ''بڑی شریف ہے حرامزادی۔ بات بھی نہیں کرتی اب تو۔''

''اس کی ماں سے تو دوستی ہو گئی ہے مگر وہ کمرے میں آتی بھی نہیں۔ امیر لوگ ہیں بھائی۔''

''ہاں امیر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مغرور اور کمینے۔''

''مگر میں اس پر عاشق ہو گیا ہوں۔ کچھ کرو جمال۔'' فدا محمد نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

جمال نے اسے سمجھایا ''جنہوں کا عشق صادق ہے وہ کب فریاد کرتے ہیں۔''

''یہ تو درست ہے۔'' فدا محمد نے آہ بھر کر کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر فدا محمد بولا ''اس کی ماں تو میرے ہاتھ میں ہے۔ دو چار دن میں نہ جاؤں تو بلا بھیجتی ہے مگر آگے بات نہیں چلتی نا۔''

جمال نے ہنکارا بھرا۔

''اس کی ماں کہتی تھی کہ کسی دن سینما چلیں گے' سالم تانگہ لے کر۔ شہر میں کوئی نئی فلم لگے تو بتانا۔ نور جہاں بھی ساتھ ہوگی۔''

جمال نے جوش میں آ کر کہا ''یہ تو کمال کی بات ہے۔''

''ضرور ساتھ ہوگی۔''

''لو بن گئی بات۔'' جمال بولا۔

''کیسے بن گئی بات؟'' فدا محمد نے کہا۔

''سینما میں پیار و محبت کی بات تو ہوتی ہی ہے۔ جب لڑکا لڑکی گانا گائیں گے تو تم چپکے سے نور جہاں کا ہاتھ پکڑ لینا۔''

''نہیں یار وہ ہاتھ چھڑا لے گی یا اپنی ماں کو بتا دے گی۔ سارا کھیل بگڑ جائے گا اس طرح۔''

''ہو سکتا ہے' ہو سکتا ہے۔'' جمال نے اس سے اتفاق کیا۔ ''مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہاتھ نہ چھڑائے اور ماں سے بھی کچھ نہ کہے۔ اگر تمہارا عشق صادق ہے تو وہ کچھ بھی نہ کرے گی۔''

فدا محمد نے چیخ کر کہا ''خدا کی قسم میرا عشق صادق ہے۔ تم مجھ پر یقین کرو۔''

جمال نے فوراً یقین کر لیا۔

جذبے کی صداقت سے فدا محمد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' پھر وہ سسکیاں لینے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

جمال کا دل پسیج گیا۔ اس نے اس کو گلے سے لگا کر تھپکنا شروع کر دیا اور کہا ''صبر کرو فدا محمد۔ عشق میں ایسے ہی ہوتا ہے۔ میرا دل کہتا ہے وہ بھی تمہارے عشق میں گھل رہی ہے۔ عاشق روئے تو معشوق سکھ کی نیند سوئے؟ ایسا کبھی ہو نہیں سکتا۔''

''نہیں' وہ پتھر کا دل رکھتی ہے۔'' فدا محمد نے مایوس ہو کر کہا۔ ''وہ کچھ نہیں جانتی اور ادھر دسویں کا امتحان سر پر ہے۔ انگریزی کا گھوٹا لگانے لگتا ہوں تو دھیان نور جہاں کی طرف چلا جاتا ہے۔ میں فیل نہیں ہونا چاہتا جمالی!''

گلی کے نکڑ پر فدا محمد سے جدا ہوتے ہوئے جمال نے کہا ''کبھی ہمارا بھی سلام کہہ دینا اس سے۔''

''ضرور ضرور۔ میرا کام بن جائے تو پھر۔''

اگلے دن فدا محمد صبح سویرے ہی جمال کے گھر آ دھمکا۔ ''یار بیمار ہو گئی ہے سالی۔'' اس نے کہا۔

''کون' نور جہاں؟''

''نہیں یار۔ اس کی ماں۔ اس کے گھٹنے سوج گئے ہیں۔ چل پھر نہیں سکتی۔ فلم کا پروگرام ختم۔ سوچا تھا تم بھی تانگے میں ساتھ ہو گے۔ اس کی ماں کو کشمیر کی باتوں میں لگا لو گے اور میں نور جہاں سے سیٹی ملاؤں گا مگر قسمت!''

''پوری بات سناؤ۔''

"دروازہ اسی نے کھولا تھا نور جہاں نے۔" فدا محمد ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا "اس کی ماں کھاٹ پر پڑی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ خیر نہیں۔ میں نے بتانا مناسب نہ سمجھا کہ آج حسن کا ڈاکو فلم لگی ہے۔"

"یہ تم نے عقلمندی کی بات کی۔"

پھر میں نے کہا "ماسی دوا دارو لانا ہو تو میں حاضر ہوں۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئی' بولی تم ہی تو میرے بیٹے ہو یہاں' پھر میں نے اس کی ٹانگیں دبا دیں۔ اس نے مجھے بڑی دعائیں دیں۔"

"مگر نور جہاں سے بھی کوئی بات کی؟"

"وہ پاس بیٹھی رہی۔ تم ٹھیک کہتے تھے۔ اس کو میرا خیال ہے کچھ کچھ۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ عاشق روئے اور معشوق سکھ کی نیند سوئے۔"

"مگر منہ سے بھی کچھ بولی فدا محمد؟"

"ہاں۔ اس نے پوچھا چینی زیادہ تو نہیں چاہئے میں؟"

"تو چائے بھی اڑائی تم نے؟"

"اور مالٹے بھی کھائے' وہ بھی اس نے چھیل کر دیئے تھے۔ یہ دیکھو۔"

پھر اس نے مالٹے کا ایک چھلکا جیب سے نکالا اور اسے زور زور سے سونگھنے لگا۔

"کمال ہے یار۔" جمال بولا "تم ایک ہی چھلانگ میں اتنی دور چلے گئے۔"

"ہاں یار اب میں فیل نہیں ہو سکتا۔ وہ کیا کہے گی......"

## دیس پردیس

نور جہاں کی والدہ کا نور پور میں کوئی رشتے دار نہ تھا اور دہلی سے بھی اس کی خبر لینے کبھی کوئی نہ آیا۔ ہو سکتا ہے اس کی کسی پشت میں کوئی نانی پرنانی طوائف ہو اور اشرافوں میں ایسے خاندان ہوتے ہی ہیں۔

تاجی کہتی تھی کہ نور جہاں کا نانا نواب تھا اور کافی جائیداد چھوڑ کر مرا تھا۔ سوتیلی اولاد نے جائیداد ہتھیانے کی خاطر نور جہاں کی نانی کو زہر دے کر مارنے کی کوشش کی تو وہ گھبرا کر لاہور آ گئی۔ نواب صاحب نے جب اس سے شادی کی تھی تو وہ بوڑھے ہو رہے تھے۔ لاہور میں ان کی اپنی کوٹھی تھی اور جب وہ ریس کھیلنے کے لیے آتے تو اسی میں ٹھہرتے تھے۔ اسی کوٹھی میں وہ بیوہ ہوئی۔ دل بہلانے کے لیے وہ کبھی کبھی ریس کورس جانے لگی جہاں اس کو نواب صاحب کے پرانے دوست مل جاتے۔ لوگ اس کو اشتیاق بھری نظروں سے دیکھتے' اس کی بوڑھی ماں چاہتی تھی کہ کوئی ڈھب کا آدمی جس کا راج دربار میں بھی اثر ہو ملے تو لڑکی اس کے گھر بیٹھ جائے۔

موزوں رشتے کے چکر میں اسے ملک محمد نواز نظر آیا جو اپنے انگریز افسر کے ساتھ کبھی کبھی ریس کورس جایا کرتا تھا۔ وہ ریٹائرڈ فوجی تھا اور حکومت نے اسے مربع بھی دے رکھے تھے۔ وہ گھوڑوں پر داؤ بھی دلیری سے لگاتا تھا۔ رسالدار کی مردانگی اور خلوص سے متاثر ہو کر اور اس کے انگریز افسر کی ضمانت پر رشتہ طے ہو گیا اور میاں بیوی نور پور اٹھ آئے۔

شادی کے بعد بھی رسالدار نے بیوی کی دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اگرچہ دونوں کی عمروں میں فاصلے کافی تھے۔

بڑھیا بیٹی کو ہنستے بستے دیکھ کر چل بسی تو اس کے ماضی کے تمام رشتے کٹ گئے۔ وہ دہلی والی تھی۔ اردو زبان بولتی تھی اور اگرچہ شیریں زبان تھی۔ نور پور میں وہ عموماً تنہا ہی رہی۔ چند ہی عورتوں سے اس کے رابطے تھے اور ان میں ایک تاجی بھی تھی۔

نور پور میں نور جہاں کی والدہ کو وہی واقعات پیش آئے جن کا تجربہ اسے دہلی میں ہو چکا تھا۔ نور پور میں بھی اس کی سوتیلی اولاد اس کی جان کی دشمن ہو گئی۔ نور جہاں اس کی زندگی کا واحد سہارا تھی۔ وہ نور پور ہی میں پل کر جوان ہو رہی تھی۔

تاجی اس خاندان کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ نور جہاں کی ماں بڑی گھنی ہے۔ اس نے بوڑھے رسالدار کو قابو میں کر رکھا ہے اور اس کی خوشی کی خاطر شراب کا پوا پی جاتی ہے مگر کسی کو پتہ چلنے نہیں دیتی۔ تاجی کو اس پر کوئی خاص اعتراض نہ تھا مگر دنیا کی بات اور تھی۔ نور پور جیسے معمولی قصبے کی کسی عورت کا شراب پینا' اس کے طوائف ہونے کا پکا ثبوت تھا۔ لوگ باتیں کرتے مگر چونکہ رسالدار کو صاحب ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کے دربار میں کرسی ملتی تھی اور صاحب پولیس کپتان صاحب ان سے ہاتھ ملاتے تھے۔ اس لیے کھل کر کوئی کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ لوگ کہتے تھے رسالدار کو اس کی بیوی نے باہر کی حویلی میں پھینک دیا ہے اور وہ کبھی کبھار ہی گھر آتا ہے۔

## شراب خانہ خراب

فدا محمد گھبرایا ہوا جمال کے پاس آیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ بولا "جمال تم نے کبھی شراب خانہ خراب پی ہے؟"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" جمال نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ماسی نے آج مجھ سے یہی پوچھا تھا۔ بتاؤ کیا یہ بات اسے مجھ سے پوچھنی چاہیے تھی۔"

"توبہ توبہ۔" جمال نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔ "پھر تم نے کیا کہا۔"

"میں نے کہا نہیں ماسی مگر اب میرا خیال ہے کہ وہ مجھے چھیڑتی تھی۔ میرا دادا شراب پیتا تھا اس لیے۔"

"ہمارے خواجہ قطب دین بھی شراب پیتے ہیں مگر مجھے تو کوئی چھیڑتا نہیں۔ کیا نور جہاں کے سامنے یہ بات ہوئی؟"

''نہیں وہ دوسرے کمرے میں تھی۔ میں نے کہا ماسی کیسی باتیں کرتی ہو۔ توبہ توبہ۔'' پھر وہ مسکرا کر بولی ''میں تو مذاق کر رہی تھی۔ شراب بہت بری چیز ہے۔ اس کو ہاتھ بھی نہ لگانا کبھی۔ بڑی کڑوی اور بدبودار ہوتی ہے اور آدمی کی مت مار دیتی ہے۔ پینے والے کو برے بھلے کی پہچان نہیں رہتی۔ اس نے ایسی بات کیوں کی جمالی؟ اسے کیسے پتہ ہے؟''

''یار بڑی خراب عورت لگتی ہے۔ اس سے تو بچ کر ہی رہنا چاہیے۔''

''ہاں یار۔ مگر نور جہاں بہت شریف لڑکی ہے۔ چاہے مجھ سے بات نہ کرے۔ بہت نیک ہے اور اتنی لمبی ہوگئی ہے ایک سال میں۔ پوری جوان' چھاتی دیکھو تو لگتا ہے اس پر جنگلی کبوتر بیٹھے ہیں۔''

''دکھاؤ پھر ہمیں بھی۔'' جمال نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''ذرا صبر تو کرو۔''

مگر چھٹیاں ختم ہوگئیں اور جمال کو ابا کے ساتھ کشمیر جانا پڑ گیا۔

## باب 5

سرینگر میں برف پگھل چکی تھی۔ مگر نل کا پانی ابھی بہت ٹھنڈا تھا۔ زدنی حسب معمول آتی جمال پر پانی کے چھینٹے اڑاتی اور معصومیت بھرے قہقہے لگاتی۔ جمال نے دیکھا کہ اس کا سینہ بھی بھر گیا ہے' کمر پتلی ہوگئی ہے اور آنکھوں نے باداموں کی گولائیاں اختیار کر لی ہیں۔ وہ ذرا کھنچ گیا۔ اسے اپنے آپ سے ڈر لگنے لگا تھا۔ اسے زدنی بہت اچھی لگتی تھی مگر وہ اس سے عشق کرنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ یہ اسے خطرناک بات لگتی تھی۔

مہینے بھر میں دھوپ میں تیزی آ گئی۔ بادام داری کے گلابی پر جھڑ چکے تھے اور اب یہاں ہریاول کا دور دورہ تھا۔ گھروں کی ڈھلان چھتوں پر لالے کے پھولوں اور کالے زیرے کے خودرو پودوں کی خوشبو نے دھوم مچا رکھی تھی۔ وہ موسم قریب تھا جب لوگ ڈونگے میں جھیل کی سیر کو جاتے ہیں مگر اب کے سال سیر کو جانے کی بجائے خواجہ یٰسین نے مکان بدل لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ کشمیریوں میں رہتے رہتے تنگ آ چکے تھے۔

جمال کی والدہ بھی پریشان رہتی تھی کیونکہ اس علاقے میں کوئی پنجابی خاندان آباد نہ تھا اور کشمیری اس کو آتی نہ تھی۔ انہوں نے امیرا کدل کے قریب یہاں سے کوئی تین میل دور ایک مکان کرائے پر لے لیا۔

جمال نے کشمیریوں کو پسند کرنا سیکھ لیا تھا۔ اسے امیرا کدل میں کوئی دلچسپی نہ تھی مگر اس سے کسی نے پوچھا ہی نہ تھا' چند ہی دنوں کے بعد وہ سامان اٹھا کر چل دیئے۔

### ٹوٹ گئے ہیں تار!

سامان باندھتے ہوئے جمال کی انگلی کٹ گئی اور خون کی ایک پتلی سی دھار بہہ نکلی۔ اس وقت کمرے میں زدنی کے سوا کوئی نہ تھا۔ مامتا کے جذبے سے بے اختیار ہو کر زدنی نے لپک کر اس کی انگلی منہ میں ڈال لی اور خون چوسنے لگی۔ جمال لذت اور اشتیاق سے ڈھیلا ہو کر اس پر جھک گیا۔ زدنی نے دوسرے ہاتھ سے گرتے کو تھام لیا تو اس کے جسم میں بجلی سی کوند گئی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ میرا خون بہتا رہے اور زدنی اسے چوستی رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد زدنی نے خون تھوک دیا اور انگلی کو دیکھنے لگی۔ جمال نے آنکھیں کھول دیں۔ زدنی نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شفقت، ہمدردی اور پیار کے دریا بہہ رہے تھے۔ جیسے

گلاب کے بھرے ہوئے کٹورے شبنم سے لرز رہے ہیں۔

پتہ نہیں جمال کو کیا ہوا۔ جھپٹ کر اس نے زدنی کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے جیسے پھاہا پھوڑے پر رکھتے ہوں۔ زدنی ہرنی کی طرح چوکڑی بھر کر اس کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ دیوار کے ساتھ لگ کر اس نے جمال کو غصے سے گھورا۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ جمال کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ چپ چاپ نیچے اتر گئی۔

سامان تانگے میں لادتے ہوئے جمال نے چور آنکھوں سے اس کا راستہ دیکھا مگر وہ الوداع کہنے کے لیے کمرے سے نہ نکلی۔ خواجہ یٰسین اور جمال کی والدہ سامان لادنے کے بارے میں جمال کو ہدایت دیتے رہے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ظاہر تھا کہ زدنی نے اندر کی بات اندر ہی رکھ لی تھی مگر جانے سے پہلے جمال چاہتا تھا کہ ایک نظر زدنی پر اور ڈال لے۔

گھر کو چھوڑتے ہوئے جمال کو بڑی تکلیف ہوئی۔ تانگہ موڑ مڑنے لگا تو اس نے اپنے کمرے پر ایک آخری نظر ڈالی۔ کھڑکی کھلی تھی اور اس میں اداس زدنی چپ چاپ کھڑی جانے والوں کو دیکھ رہی تھی۔ بلا سوچے سمجھے جمال نے اپنا ہاتھ ماتھے پر رکھ دیا۔ اس کے جواب میں زدنی کے چہرے پر آئی ہوئی موہوم مسکراہٹ کو جمال کے سوا کوئی بھی نہ دیکھ سکا۔

## ترقی کا راستہ!

خواجہ یٰسین نے جمال کو یقین دلا دیا تھا کہ تم کبھی میٹرک پاس نہ کر سکو گے مگر کسی نہ کسی طرح اس نے یہ منزل سر کر لی اور خواجہ یٰسین نے اپنی پیش گوئی غلط ہو جانے کے بعد اسے کالج میں داخل کروا دیا۔ خواجہ یٰسین چاہتے تھے کہ جمال کسی نہ کسی طرح بی اے پاس کر لے تو پھر ان کا ایک دوست جو دہلی میں ڈپٹی سیکریٹری تھا، اسے کلرک بھرتی کروا دے گا اور وہ آہستہ آہستہ ترقی کرتا رہے گا۔

اس زمانے میں یا تو نوجوان آئی سی ایس کا امتحان پاس کر کے افسر بن جاتے یا کلرک لگ جاتے تھے۔ وہ بھی اگر قسمت یاوری کرے تیسرا کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔

جمال آئی سی ایس پاس کرنے والا لڑکا نہیں تھا اور خواجہ یٰسین جو خود آئی سی ایس نہ بن سکے تھے، جمال کو جلی کٹی سناتے رہتے تھے مگر وہ اس پر بھی خوش تھے کہ جمال تعلیم کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا میں جونیئر کلرک بھرتی ہو جائے۔

کالج میں ایک کھلا میدان تھا۔ یہاں پنجابی لڑکے بھی زیر تعلیم تھے مگر کشمیریوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ کشمیری پنڈت اپنے حلقے سے باہر کسی سے بات نہ کرتے تھے اور ان کو اپنی تر دماغی کا بھی بڑا گھمنڈ تھا۔ ڈوگرے تھے، ان کو راج دربار پولیس اور فوج میں اپنی حیثیت کا بڑا غرور تھا۔ وہ جاہل، بد دماغ اور بزدل تھے۔ کچھ گلگتی، لداخی اور پونچھی بھی تھے مگر ان کو کشمیری ڈوگرے اور پنڈت پاس بیٹھنے نہ دیتے تھے۔ وہ بڑے غریب اور ڈرپوک لڑکے ہوا کرتے تھے۔ ان کو آتا جاتا بھی کچھ نہ تھا۔ قبائلی روایات کے مطابق ان میں سے بیشتر کے اخراجات ان کے والدین کی بجائے ان کی پنچایتیں چندہ کر کے ادا کرتی تھیں یا سرکاری جنگلات میں سے چیل اور دیودار کے درخت چرا کر پورا کرتی تھیں۔

کالج کی گراؤنڈ شاید دنیا کی خوبصورت ترین گراؤنڈ تھی۔ ایک وسیع اور سرسبز میدان جس کے ایک کنارے پر لمبے لمبے سفیدے تھے، دوسری طرف چیری اور انار کی جھاڑیاں اور ان کے پیچھے ایک ٹیلے پر شنکر اچاریہ کا قدیم مندر جس میں جمال کے جدامجد ڈیڑھ دو سو برس پہلے پروہت ہوتے تھے۔ کالج کی عمارت کے اردگرد چناروں کے گھیردار درختوں کی بھینی بھینی باس سے جنگل مہکتا تھا۔

اس کے پہلے حصے میں کرکٹ کی پچ تھی جس کے کھلاڑی زیادہ تر پنجابی بولنے والے لڑکے تھے۔ دوسرے حصے میں کشمیری ننگے پیروں سے فٹ بال کھیلنے والے، بائیں جانب ٹینس کورٹ جو جموں کے امیر ہندوؤں، ڈوگروں اور پروفیسروں کا مشغلہ تھا مگر کھیلوں میں بھی ہندو مسلمان کی تفریق صاف دیکھی جا سکتی تھی۔

مگر وہاں جے چند بھی تھا۔

## جے چند

جے چند کی بات ہی اور تھی۔

جے چند کوہاٹ کا ایک جوشیلا اور پھرتیلا لڑکا تھا۔ وہ بڑے گھیر کی شلوار اور چپل پہنتا اور اپنے پٹھان ہونے پر ناز کرتا۔ اگر اس کا نام جے چند نہ ہوتا تو سب لوگ اسے مسلمان سمجھتے۔ جمال سے اس کی دوستی ہو گئی اور اس کی بڑی وجہ پنجابی زبان تھی۔

جمال اس کے گھر میں بیٹھا تھا کہ اسے پیاس لگی۔ جے چند اس کے لیے پانی لایا مگر گلاس کے بجائے چائے کی پیالی میں۔

''پیالی میں پانی کیوں لائے جے چند؟'' جمال نے پوچھا ''گلاس بھر کے لاتے تو میری سیری ہو جاتی۔''

''اس لیے کہ یہ مٹی کی ہے۔ اسے توڑ کر پھینکا جا سکتا ہے۔ گلاس بھرشٹ ہو جائے تو اسے توڑا نہیں جا سکتا۔ میری دادی کہتی ہے کہ تم اپنے مسلمان دوستوں کو رسوئی کے برتنوں میں کھلا پلا دو گے تو میں کیا کروں گی تمہارا؟'' یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔

''تمہاری دادی اس قدر پرہیز کرتی ہے مسلمانوں سے۔''

''وہ تو لکڑیاں بھی دھو کر جلاتی ہے۔ لکڑہارے مسلمان ہوتے ہیں نا۔''

## پوتر پنڈت

کشمیری پنڈت بڑے سخت مذہبی تھے مگر انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ رہنا سیکھ لیا تھا۔ وہ پیروں،

فقیروں سے بھی عقیدت رکھتے تھے اور آستانوں درگاہوں کی سیڑھیوں پر سیندور لگا کر دور ہی سے پرنام کر لیتے تھے۔ خود وہ شولنگ کے پجاری تھے۔ سرِعام بھی چھوٹے چھوٹے چبوتروں میں لمبوترے پتھر رکھے رہتے تھے جن پر وہ دریا میں اشنان کے بعد گیندے کے پھول اور سرسوں کا تیل چڑھاتے۔ یہی ان کی پوجا کا پاٹ تھا۔

مسلمانوں نے بھی کشمیری پنڈتوں کے ساتھ رہنا سیکھ لیا تھا۔ دراصل وہ سب انہی پنڈتوں کی اولاد تھے اور انہوں نے راجا رنچن شاہ کے زمانے میں استصواب رائے سے فیصلہ کیا تھا کہ لداخ کے بدھ مت' کشمیر کے ہندومت اور ایران کی آتش پرستی کے مقابلے میں اسلام ایک 'بہتر ضابطۂ حیات ہے' جس سے انسانوں میں اونچ نیچ ختم ہو جاتی ہے اور مل بانٹ کر کھانے کا کلچر پیدا ہو جاتا ہے (افسوس کہ اس بات پر عمل نہ آیا) مگر کشمیری مسلمانوں نے شولنگوں کو کبھی توڑنے یا نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کی تھی۔ ان میں آشتی کی وجہ تو ان کی نسل کا سانجھ تھا۔ دوسرے کشمیری زبان تھی جو ان کو جموں کے ہندوؤں اور ڈوگروں کے مقابلے میں ایک قوم کا تصور دیتی تھی مگر کچھ تضاد بھی تھا اور اس کی وجہ پنڈتوں کا راج دربار میں فضیلت پانا۔ علم میں برتری حاصل کرنا اور نسبتاً خوش حال ہونا تھا۔ مسلمان اپنے پنڈتوں کا دل سے احترام کرتے تھے۔ کچھ اس کی وجہ ان کا فارسی پر عبور بھی تھا۔

جمال اکثر سوچا کرتا کہ میرے جدامجد جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا، پتہ نہیں سرینگر میں کہاں رہتے تھے اور کیا ان کی نسل ابھی چل رہی ہے یا نہیں۔ اسے شنکر اچاریہ کا مندر دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا۔

وہ اس کے پروہت سے ملنا چاہتا تھا۔ شاید وہ کسی حوالے سے اس کا رشتہ دار نکلے۔

شنکر اچاریہ کا مندر جھیل ڈل کے کنارے پر ایک پہاڑی کی چوٹی پر براجمان تھا۔ راستہ کچا اور پیچ دار تھا۔ دو ڈھائی میل کی چڑھائی کے بعد آدمی مندر کی سیڑھیوں تک پہنچتا تو اس کی سانس پھولی ہوتی۔ راستے میں بیٹھنے اور دم لینے کی بھی کوئی جگہ نہ تھی۔ کوئی چشمہ بھی نہیں تھا کہ یاتری پیاس بجھا سکے۔ کوئی ساتھ جانے والا بھی نہ تھا۔

جمال پہاڑی پر اس وقت چڑھا جب پوجا کا وقت گزر چکا تھا۔ راستہ سنسان تھا۔ چوٹی پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ گھڑے ہوئے پتھروں کی ایک قدیم عمارت کھڑی ہے جس کے آس پاس زندگی کے کوئی آثار نہیں۔ یہ مندر ہزار سال پرانا بھی ہو سکتا تھا اور شاید اس سے بھی زیادہ۔ سلیٹی رنگ کے جمے ہوئے پتھروں سے اس کی قدامت کا اندازہ ممکن نہ تھا۔ سیڑھیوں کے سامنے ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ جمال وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

ساٹھ ستر پتھریلی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد یہ ایک چھوٹی سی گول عمارت تھی جس کے چاروں طرف چلنے کے لیے تھڑے بنے ہوئے تھے۔ مندروں کی تعمیر مسجدوں، گوردواروں اور گرجوں کے برعکس اس انداز سے کی جاتی ہے کہ اس میں داخلے کا ایک ہی راستہ ہو اور اسی راستے سے لوگ واپس جائیں۔ ہندومت میں کشادگی نہیں اور ان کی عبادت گاہیں کسی دوسرے کو برداشت نہیں کرتیں۔

جمال کو پتہ تھا کہ مسلمان مندروں کے اندر نہیں جا سکتے مگر وہ اندر جانے اور پروہت سے بات کرنے کے لیے بے چین تھا۔

اگر اس میں عقل ہوتی تو وہ رکے بغیر سیدھا مندر کے اندر گھس جاتا اور یہ ظاہر نہ کرتا کہ میں مسلمان ہوں مگر اس میں عقل نہیں تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک بوڑھا کاہن ننگے بدن مالا پہنے مندر سے برآمد ہوا اور جمال کو دیکھ کر واپس چلا گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جمال مسلمان ہے، پھر وہ مندر کے بیرونی چبوترے پر آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ جیسے جمال کی نگرانی کر رہا ہو۔

جمال مندر کے اندر لازماً جانا چاہتا تھا۔ جب پروہت مندر کے عقب کی طرف گیا تو وہ لپک کر مندر کے دروازے تک جا پہنچا۔

اندر عضوِ تناسل کی تمثیل کالے رنگ کا گھڑا ہوا شولنگ رکھا تھا جو اس نے کئی مرتبہ سڑک کے کنارے یا استھانوں میں پڑا دیکھا تھا۔ اس کی نوک پر گیندے کے کچھ پھول رکھے تھے مگر گھی اور تیل کی میل بھی اس پر چمک رہی تھی۔ ہر بل کے دھوئیں نے اس پر گاڑھی سیاہی پھیری ہوئی تھی۔ یہ شوجی مہاراج کا ایک گندہ اور بدبودار عضوِ تناسل تھا۔

وہ ابھی کھڑا دیکھ ہی رہا تھا کہ پنڈت جی مندر کا چکر لگا کر سامنے آ گئے اور جمال کو مارنے کو لپکے۔

جمال کھٹ کھٹ سیڑھیاں اتر گیا اور نیچے پہنچ کر بولا "پنڈت جی مہاراج اس مندر میں کبھی میرے بزرگ بھی کاہن ہوتے تھے۔ آج تم اس غریب کو مارنے کو دوڑتے ہو۔"

"تم بکتے ہو۔" پنڈت جی غرا کر بولے "تم مسلمان ہو۔ تمہارے بزرگوں کا یہاں کیا کام؟ تم نے شنکر اچاریہ کا استھان بھرشٹ کر دیا۔"

"میں مسلمان ہوں مگر دو ڈھائی سو سال پہلے برہمن ہوتا تھا۔" جمال نے چیخ کر کہا۔

"تم نے پچھلے جنم میں پاپ کیے ہوں گے۔ اسی لیے اب ملیچھ پیدا ہوئے۔ کرموں کے چکر سے کون بچا ہے آج تک؟"

"میں نے اچھے کرم کیے ہوں گے اسی لیے مسلمان پیدا ہوا۔ یہ اعلیٰ مقام ہے پنڈت جی۔"

"اچھے کرم کرنے سے کسی کا مقام گرتا نہیں، بڑھتا ہے مورکھ۔ مسلمان ہو کر اونچے مقام سے نیچے آ گئے تم اور اب جنم جنم دکھ بھگتتے رہو گے۔ تمہاری آتما کبھی شانت نہیں ہو گی۔ تم نے بھگوان کا استھان بھرشٹ کیا۔ اب مجھے یہاں ہون کرنا پڑے گا۔ صندل جلانا پڑے گا اور سیڑھیوں تک کو دھونا پڑے گا اور یہاں پانی ہے نہیں۔ تم نے بڑا پاپ کیا اندر آ کر۔ تمہارے بزرگ برہمن نہیں ہو سکتے۔ برہمن کبھی بھولے ناتھ کے

استھان کو بھرشٹ نہیں کرسکتا۔ اب دفع ہو جاؤ ورنہ میں تمہیں ڈنڈے ماروں گا۔''

مگر جمال نے دیکھ لیا تھا کہ یہاں پنڈت جی کے سوا اور کوئی نہیں اور ان میں اتنی جسمانی طاقت نہیں کہ وہ سیڑھیاں اتر کر مجھ پر حملہ کریں۔ وہ بیٹھ کر مسکراتا رہا۔ بولا ''پنڈت جی میں تو یہاں بیٹھا ہوں اور ایک مرتبہ اور بھگوان کے درشن کروں گا۔ آؤ مجھے ڈنڈے مارو۔''

پنڈت جی بھی جانتے تھے کہ یہاں وہ اکیلے ہیں اور وہ ایک جوان اور صحت مند مسلمان کو مار نہیں سکتے۔ اس لیے وہ سیڑھیوں کے اوپر ہی کھڑے رہے۔ پھر انہوں نے گالیاں دینی شروع کر دیں اور شراپ دینے لگے۔ آخر میں منت سماجت پر اتر آئے۔ ''دیکھو اگر تمہارے بزرگ واقعی برہمن تھے تو جو کچھ تم نے کیا ہے، اس سے اُن کی آتما دکھی ہوگی۔ اب تم چلے جاؤ۔ دیا کرو۔ کرپا کرو۔ مجھے استھان کو دھونا اور پوتر کرنا ہے۔''

جمال کو اس کمزور بوڑھے پر بڑا ترس آیا۔ وہ بہت دکھی ہو رہا تھا۔ دو ڈھائی میل نیچے جا کر پانی لانا اور مندر کو دھونا کیا اس کے لیے کم مصیبت تھی، پھر جرم کا احساس کہ اس نے شو جی کے استھان کی حفاظت نہیں کی۔ اس نے اسے مزید چڑانے کے لیے کہا ''مگر تم خود کون ہو پنڈت جی۔ برہمن تو نہیں لگتے مجھے۔''

''اندھے ہو۔'' پنڈت جی غصے سے بولے۔ ''بھگوان کے داس سے پوچھتے ہو کہ تم کون ہو۔''

جمال نے نہایت پرسکون ہو کر کہا ''تم بھگوان کے داس نہیں لگتے۔ بھگوان کے سالے لگتے ہو۔ تم حلوے مانڈے کے داس ہو بیٹا۔ بولو مجھے مندر کے اندر جانے کے لیے کیا دینا پڑے گا؟ روپیہ کہ اٹھنی؟''

''دھت تیرے کی۔ ملیچھ بدمعاش!'' پنڈت جی کھٹا کھٹ سیڑھیاں اترنے لگے مگر آخری سیڑھی پر آ کر رک گئے۔ ان کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ ''شوشنکر شوشنکر۔'' انہوں نے نعرہ مارا۔

پنڈت جی کشمیری نہیں تھے۔ ان کے لہجے سے بنارس کے پانڈوں کی بو آ رہی تھی۔ وہ یو پی کے پنڈتوں کی طرح لفظ چبا چبا کر بولتے تھے۔ جمال نے گھاٹی اترتے ہوئے سوچا ممکن ہے میرے بزرگوں کے قبولِ اسلام کے بعد یہ گدی کشمیری پنڈتوں سے چھن گئی ہو۔ ممکن ہے کہ موجودہ کاہن کے کسی دادا پردادا کو مہاراجہ گلاب سنگھ ڈوگرہ بنارس سے لے آیا ہو کیونکہ وہ کشمیری پنڈتوں پر بھروسہ نہیں کر سکتا مگر پھر میرے بزرگ اور ان کے رشتہ دار کہاں گئے۔

## پردادا پنڈت

جمال باتوں باتوں میں اپنے پنڈت ہم جماعتوں سے ان کی ذاتوں، گوتوں اور خاندانوں کے بارے میں پوچھتا رہتا۔

جمال کو معلوم تھا کہ کشمیری پنڈت اپنے مخصوص محلوں اور تنگ گلیاروں میں رہتے ہیں۔ زیادہ تر حبہ کدل اور نالہ شیر گڑھی کے اس کنارے پر جو پرانے شہر کو الگ کرتا ہے، وہ نالے کے کنارے چلتے ہوئے اکثر سوچتا کہ میں کون ہوں، کیا میرے بزرگوں کی ہندو نسل زندہ ہے؟

پنڈت بہت صاف ستھرے کپڑے پہنتے تھے۔ سروں پر انگیٹھی دار پگڑیاں، پشمینے کے بڑے بڑے سفید پھرن اور چست چوڑی دار پاجامے میں وہ تول تول کر قدم رکھنے کے عادی تھے۔ ان کی عورتیں زیادہ تر عنابی رنگ کے پھرن زیب تن کرتی تھیں۔ سروں پر گول ٹوپیاں جن پر ان کی چھوٹی چھوٹی چنریاں ٹکی ہوتی تھیں۔ ان کو اپنے وقار کا شدید احساس تھا۔ باہر نکلتی تھیں تو کسی سے بات نہ کرتی تھیں۔ جوان پنڈت بالعموم داڑھی منڈواتے تھے مگر بوڑھے داڑھیاں رکھتے تھے۔ ان کا زیادہ وقت پوجا پاٹ اور فارسی اور سنسکرت کے مطالعے میں گزرتا تھا۔ علومِ نجوم میں انہیں بہت کمال حاصل تھا۔ بہت سویرے جمال پنڈتوں کو نالے کے گھاٹ پر اشنان کرتے اور گیندے کے پھول بھینٹ کر کے پانی میں بہاتے دیکھا کرتا۔

وہ مسلمانوں سے دامن لپیٹ کر ہی ملتے تھے مگر شاہ ہمدان کی خانقاہ کی سیڑھیوں پر سیندور مل کر پرنام کرتے تو ان کی آنکھیں بھی پرنم ہو جاتی تھیں۔ کشمیری مسلمانوں کی طرح وہ بھی تصوف کی طرف مائل تھے۔ شو جی کی پوجا کے باوجود انہیں بھی توحید کا گیان تھا۔ وہ اپنشدوں کے بڑے سنجیدہ طالبِ علم تھے۔

## میں کون ہوں؟

ایک دن جمال نے شام لال پنڈت سے جو کرکٹ بھی کھیلتا تھا، پوچھ لیا ''کیا تم کسی کوشل برہمن خاندان کو جانتے ہو؟''

''کوشل برہمن سرینگر میں کوئی نہیں۔ کیا تم نے جنم پتری بنوانی ہے؟'' شام لال نے کہا ''یہاں جیوتش کے ماہر اور پنڈت بھی ہیں۔''

''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میں کون ہوں؟''

''یعنی تم پچھلے جنم میں کون تھے مگر مسلمان تو آواگون کو نہیں مانتے، تم مانتے ہو کیا؟''

''میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میرے پردادا کا دادا کون تھا۔ وہ شنکر اچاریہ کے پروہت تھے، پھر مسلمان ہو گئے۔ ہم کوشل برہمن تھے شام لال۔''

شام لال حیرت سے جمال کا منہ تکنے لگا۔ پھر بولا ''یہ تو دو سو برس پرانی بات ہوئی۔ اب کس کو پتہ ہوگا؟''

''میرے خاندان کا شجرہ صرف میرے پردادا کے دادا کا اسلامی نام بتاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کچھ گواہوں کے نام ہیں جن کے سامنے اس نے اسلام قبول کیا تھا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کیوں مسلمان ہوئے تھے؟''

رات جمال نے بے چینی سے گزاری۔

اگلے روز شام لال نے آتے ہی کہا ''کوشلوں کا ایک پرانا خاندان تو حبہ کدل کے پاس رہائش پذیر

ہے۔میرے پتا جی نے بتایا۔پنڈت وشوا ناتھ خاندان کا بزرگ بہت بڑا نجومی ہے اور صوفی آدمی مشہور ہے۔''

جمال پوچھتے پوچھتے اس کے گھر جا پہنچا۔

## ساوتری بہن

دستک کی آواز سن کر ایک زرد رنگ کی جوان لڑکی نے دروازے کی اوٹ سے جھانکا اور جمال کو دیکھ کر بات کیے بغیر دروازہ بند کر لیا۔

تھوڑی دیر کے بعد جمال نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔لڑکی چوبارے کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔وہ بہت نرمی سے دروازے پر ہاتھ مارتا رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ نیچے اتری اور دروازہ کھولے بغیر کشمیری میں بولی ''کسو چھو۔''

جمال نے اردو میں کہا ''میں پنڈت وشوا ناتھ کوشل کو پرنام کرنے کے لیے آیا ہوں۔کیا وہ گھر پر ہیں؟''

تھوڑی سی خاموشی کے بعد لڑکی بولی ''کام کیا چھس؟''

اب جمال کیا بتاتا۔اس نے کہا ''بہن جی یہ میں پنڈت جی کو بتاؤں گا۔''

لڑکی جواب دیئے بغیر ہٹ گئی۔جمال کھڑا رہا۔

کچھ دیر کے بعد وہ واپس آ کر بولی ''پنڈت جی بولے تم صبح کے سمے آؤ۔پھر وہ تمہاری پتری بنا دے گا۔'' اور یہ کہہ کر وہ جانے کو مڑی۔

جمال جلدی سے بولا ''بہن جی مجھے پتری نہیں بنوانی۔پنڈت وشوا ناتھ میرے بزرگ ہیں۔ان کے درشن کو آیا ہوں۔میں بھی کوشل برہمن ہوں۔''

لڑکی نے دروازہ کھول دیا اور ایک بچے کی طرح حیران ہو کر بولی ''تم کوشل برہمن کس طرح ہوئیں گا۔تم مسلمان ہے،تم پنجیب ہے۔''

''بے شک میں مسلمان ہوں اور پنجابی ہوں مگر میں کوشل برہمن ہوں۔میرے پردادا کے دادا مسلمان ہو کر سرینگر سے پنجاب چلے گئے تھے۔وہ شنکر اچاریہ کے کاہن تھے۔''

لڑکی نے جمال کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔پھر حیران ہو کر بولی ''یہ کیسے ہوئیں گا......'' اور لپک کر واپس چلی گئی۔

بہت دیر ہو گئی۔جمال کو گمان ہوا کہ اب وہ نہیں آئے گی مگر وہ دروازہ کھلا چھوڑ گئی تھی۔اس لیے وہ امید لگائے ہاتھ باندھے کھڑا رہا۔بالآخر وہ آئی اور بولی ''پنڈت جی نے اوپر بلایا ہے۔''

تنگ سیڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر گیا تو لکڑی کے فرش پر بچھے ہوئے ایک نمدے پر پنڈت وشوا ناتھ کوشل بیٹھے تھے۔عمر کوئی اسی کے لگ بھگ۔بال چاندی کی طرح سفید،داڑھی لمبی،رنگ پیلا جیسے طاق میں رکھی ہوئی موم بتی۔

جمال نے ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔

پنڈت جی کچھ دیر اس کو گھورتے رہے۔پھر انہوں نے اسے آگے آنے کا اشارہ کیا۔جمال نے جوتی اتاری اور دوزانو ہو کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

''بولو مہاراج کیا منگتا ہے؟'' انہوں نے کہا۔

''پنڈت جی میں ذات کا کوشل برہمن ہوں۔'' جمال نے منمنا کر کہا ''میرے پردادا کے دادا پنڈت کاشی ناتھ کوشل دو سو برس پہلے مسلمان ہو کر لاہور چلے گئے تھے۔میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا اب یہاں کوئی ہمارا رشتہ دار ہے؟''

پنڈت وشوا ناتھ کے چہرے پر کوئی تاثر نہ ابھرا۔وہ سوچتے رہے اور زیر لب بولتے رہے۔''پنڈت کاشی ناتھ کوشل...... پنڈت کاشی ناتھ کوشل......''

جمال بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔اس کا جسم تنا ہوا تھا۔لگتا تھا اس کا بدن ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔اچانک پنڈت جی نے سر اٹھایا اور آواز دی ''ساوتری۔''

ساوتری کونے میں کھڑی یہ عجیب تماشا دیکھ رہی تھی۔پنڈت جی بولے ''مدھر (میٹھا) قہوہ لا۔چینی پیال میں۔بھگوان کی کرپا خود چل کر ہمارے دوارے آئی ہے۔''

ساوتری حیرت سے پنڈت جی کا منہ تکنے لگی۔کشمیری پنڈت اپنے گھر میں مسلمان کو چینی کی پیالی میں میٹھا قہوہ نہیں پلاتے۔اس کی ہچکچاہٹ دیکھ کر پنڈت جی بولے ''کسو ساوتری۔''

لڑکی باورچی خانے میں چلی گئی۔جمال کو افسوس ہوا کہ میرے جانے کے بعد پنڈت جی کو چینی کی پیالیاں توڑنی پڑیں گی مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔

پنڈت جی نے پھر سر جھکا لیا اور زیر لب کہنے لگے ''بھگوان تیری لیلا نیاری۔پربھو کی جے ہو۔تمہارا کیا نام ہے بالک؟''

''جی مجھے جمال کہتے ہیں۔''

''پنڈت کاشی ناتھ کوشل تمہارے کیا لگتے تھے؟''

''جی وہ میرے پردادا کے دادا تھے۔میں ان کے بڑے بیٹے کی اولاد میں سب سے بڑا ہوں۔مجھے اپنی تلاش ہے مہاراج،بتائیے میں کون ہوں؟''

''تلاش تم بھگوان کی کرو پنڈت جی۔پھر اپنا آپ بھی مل جاتا ہے مہاراج!''

پنڈت وشوا ناتھ نے جمال کو پنڈت جی کہہ کر مخاطب کیا تو اس کے گال تمتمانے لگے ''جیسا حکم۔'' اس نے دبی زبان سے کہا۔

"حکم بھی اسی کا ہے جو تینوں لوکوں کا مالک ہے۔ وہی ترلوکی کا ناتھ ہے۔ وہی آگے وہی پیچھے، وہی دھرت وہی کرت، وہی پربھو وہی پجاری۔ وہی کھیل وہی کھلاڑی، چندرماں سوریہ منگل برہپت، دیوی دیوتا سب اسی کے جلوے ہیں۔ وہی تو ہے۔ مولانا رومی کو نہیں پڑھا تم نے؟"

"جی نہیں۔"

"مولانا روم کو پڑھو۔ فریدالدین عطار کو پڑھو۔ بات سمجھ میں آجائے گی۔"

"بجا ارشاد۔" جمال نے کہا۔

پنڈت جی دھیرے دھیرے مسکرانے لگے۔ ان کا چہرہ روشن ہوگیا۔ اتنے میں ساوتری ساوار اور چائے کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں لے آئی۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹی چھوٹی باقرخانیاں بھی۔ اس نے بڑے سلیقے سے ابلتا ہوا قہوہ پیالیوں کے کناروں تک بھر دیا اور ادب سے ہٹ کر ستون کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔

دفعتاً پنڈت جی ساوتری سے مخاطب ہوکر بولے "یہ تمہارا بھائی ہے۔ کیا نام......"

"جمال جی۔ جمال دین کوشل۔" جمال بولا۔

"پنڈت جمال دین کوشل ہمارا بچہ ہے ساوتری۔ تمہارا جنم کا بھائی۔ خون کا بندھن ہے تمہارا۔"

ساوتری کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پنڈت وشواناتھ مسکرا کر بولے "بھگوان کے چلتر تو دیکھو ذرا۔ کس کو یہاں بھیج دیا۔ پنڈت جمال دین کوشل ہمارے بزرگ پنڈت کاشی ناتھ کوشل کی پانچویں استھان سے ہیں۔"

"کون پنڈت کاشی ناتھ کوشل بابا؟" ساوتری حیرت زدہ ہوکر بولی۔

"یہ تمہارے جنم سے پہلے کی بات ہے ساوتری۔ میرے جنم سے بھی پہلے کی۔ پنڈت کاشی ناتھ کوشل بھگوان شنکر اچاریہ کے داس تھے۔ ہمارے دادا کے تایا۔ مسلمان ہوکر وہ ہمیں چھوڑ گئے۔ پنڈت جمال دین کوشل اب تم خود آگئے ہمارے دوار پر دیکھو بھگوان کا کھلنڈرا پن!"

"وہ مسلمان ہوگئے تھے؟" ساوتری نے پوچھا۔ "پر کیوں؟"

"بھگوان کی اِچھا۔" پنڈت جی بولے۔ "سب دین دھرم اسی کے تو ہیں۔ وہ بڑا نٹ کھٹ ہے۔ ہمارے پتا جی مہاراج کہتے تھے، پنڈت کاشی ناتھ سورگباشی بہت اچھے لوگ تھے۔ سادھوؤں، صوفیوں کی سیوا ان کا دھرم تھا۔ خود بھی بڑے مہاتما تھے۔ انہوں نے من کو بھگوان کی رچنا سے ایسا سجایا کہ ایک مسلمان فقیر نے جو بہت پہنچا ہوا بزرگ تھا، پنڈت کاشی ناتھ کوشل کی مونڈی پکڑ لی کہ جاتا کہاں ہے۔ وہ کوئی دیوتا ہوگا جو پنڈت کاشی ناتھ کوشل کو انگلی لگا کر لے گیا۔ پھر ان کی خبر نہ ملی۔ اب ایسے دھرماتما کہاں ملتے ہیں!"

اور اس بات پر پنڈت وشواناتھ کفِ افسوس ملنے لگے۔

جمال کا ڈر جاتا رہا۔ وہ قہوہ پینے لگا تو اس کے ہونٹ جل گئے۔ ساوتری کھلکھلا کر ہنس دی۔

"ٹھنڈی کر کے پیو پنڈت جی۔" پنڈت وشواناتھ نے کہا "ہوسکتا ہے کہ تم میں پنڈت کاشی ناتھ جی کی آتما برا جان ہوگئی ہو۔ کیا تم اس کا منہ جلاؤ گے؟"

جمال شرمندہ ہوگیا۔ اس کے لیے یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ حقیقی ہے۔ ایسی باتیں تو صرف کتابوں میں ملتی ہیں۔

پنڈت وشواناتھ نے کوئی بات سنی نہ تھی۔ وہ ایک پرانی الماری میں سے بہیا پوتھیاں اور رجسٹر نکالنے لگے۔ ان پر برسوں کی گرد جمی ہوئی تھی۔ پنڈت جی مٹی جھاڑتے، انہیں کھول کر دیکھتے اور رکھ دیتے۔

## پرانی پوتھیاں

کاغذوں کا رنگ خاکی ہو رہا تھا۔ ان پر سرخ اور کالی روشنائی سے زائچے اور نقشے بنے ہوئے تھے اور سنسکرت اور فارسی کی تحریریں تھیں۔ روشنی مدھم تھی۔ جمال کوشش کے باوجود کچھ پڑھ نہ سکا۔

پنڈت جی کی نظریں ایک صفحے پر جم گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے کہا "پنڈت کاشی ناتھ کوشل 1836ء بکرمی میں بیساکھ کی پہلی کو منگل کی صبح دو گھڑی تین پل کے سمے پیدا ہوئے تھے۔ ان کی جنم پتری میں سوریہ سنیچر ار چندرماں کی بیٹھک یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ دھرم تبدیل کریں گے اور دور دیشوں کی یاترا کریں گے۔ یہ دیکھو۔"

پنڈت جی نے خاکی رنگ کا ایک کاغذ جمال کے آگے رکھ دیا جس پر دو تین زائچے بنے ہوئے تھے اور شکستہ خط میں فارسی لکھی ہوئی تھی جس کا کوئی لفظ جمال نہ پڑھ سکا۔

پنڈت وشواناتھ بولے "جنم پتری بتاتی ہے کہ ایسے مہمان لوگ کبھی کبھار ہی پیدا ہوتے ہیں۔ سادھو سنت ہوتے ہیں۔ اک اونکار کے سوا کسی کو نہیں مانتے کیونکہ سب کچھ اک اونکار ہی ہوتا ہے۔"

"مچھلی سارے جل میں پھرتی ہے۔ اس کے لیے ایک کنارے اور دوسرے کنارے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ پنڈت جمال دین کوشل۔ سارے دین دھرم اسی کے ہیں۔ تم مسلمان ہو پنڈت جی مگر ہمارا آپ کا جنم جنم کا ساتھ ہے کیونکہ ہمارا آپ کا خون بھی ایک ہے۔ یہ رشتہ اگلے جنم میں بھی اسی طرح رہے گا۔ مسلمان آواگون کو نہیں مانتے۔ پر ایک اور جنم کو تو مانتے ہیں جب کرنی بھرنی پڑے۔ وہاں تک تو ہمارا آپ کا ساتھ رہے گا۔ رہے گا کہ نہیں مہاراج؟"

"بے شک پنڈت جی۔ ہمارا آپ کا مکمل ساتھ ہے۔"

پنڈت وشواناتھ نے کہا "جب پنڈت کاشی ناتھ مسلمان ہوکر چلے گئے تو ہمارے شجرے سے ان کا نام کٹ گیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ مسلمان ہوگئے تھے بلکہ اس لیے کہ وہ کشمیر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ آگے کا حال آپ بتائیں تاکہ ہم اپنا شجرہ مکمل کرلیں۔ ان کی اولادیں کون کون تھیں اور ان کی اگلی اولادیں۔ ہر ایک کے نام اور کام بتائیں۔"

جمال کو جتنا معلوم تھا اس نے بتا دیا اور پنڈت جی نے لکھ لیا مگر اس کی معلومات مکمل نہ تھیں۔

شام ہوگئی مگر جمال کو پتہ ہی نہ چلا۔ پنڈت جی بھی تھکے نہیں، تازہ دم رہے۔ جمال کو لگتا تھا کہ میں اپنے کسی بہت مہربان بزرگ کی خدمت میں بیٹھا ہوں۔ وقت تھم گیا ہے، پھر اسے اپنے بدن میں سے خوشبو آنے لگی۔

ساوتری نے پہلے تو کسی بات میں کوئی دلچسپی نہ لی تھی۔ اب وہ چہک چہک کر باتیں کرنے لگی جیسے وہ جمال کی برسوں سے بچھڑی ہوئی بہن ہو۔ وہ ایک خوبصورت اور جوان لڑکی تھی مگر جمال نے اس کو اس زاویئے سے دیکھا ہی نہ تھا۔ وہ تو موتیے کی کلی سے بھی زیادہ معصوم دکھائی دیتی تھی۔

جمال نے کہا ''پنڈت جی میں تو شنکر اچاریہ کے استھان پر بھی گیا تھا۔''

## ترلوک کا قانون

''بے شک پنڈت کاشی ناتھ کی آتما اپنے پرانے استھان کیوں نہ دیکھے گی، پھر کیا دیکھا وہاں؟''

''پروہت جی نے مجھے وہاں سے نکال دیا۔ میری بہت بے عزتی کی۔ کہا مجھے مندر کو اشنان کروانا پڑے گا، تم نے اندر گھس کر اسے بھرشٹ کر دیا ہے۔''

''بھگوان کا گھر بھگوان کے ماننے والوں کے آنے سے بھرشٹ نہیں ہوتا مگر پنڈت جمال دین کوشل ہر استھان کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ ان کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ اگرچہ جگ کے قانون بھگوان کے قانون نہیں ہوتے۔''

''میرے جانے سے اچاریہ جی کا استھان بھرشٹ ہوا کیونکہ میں مسلمان ہوں۔ اگر پانڈے جی اس کو دھو کر پوتر نہیں کریں گے تو کیا بھگوان شو شنکر ناراض نہیں ہوں گے؟'' جمال نے پوچھا۔

''بھگوان سب کا پتا اپنے بالکوں کے آنے سے کہیں ناراض ہوتا ہے؟ بچوں کی اور بات ہے، وہ ایک دوسرے کو گھروں سے نکال دیتے ہیں مگر یہ مورکھ ہیں۔ بھگوان کو اپنے من میں سے نکال کر چوکی پر بٹھا دیتے ہیں۔ وہ بھگوان کو اپنے آپ سے الگ کر دیتے ہیں۔ یہ کل جگ کی نشانیاں ہیں پنڈت جمال دین کوشل۔ انسان بھگوان سے الگ ہو کر بیٹھ گیا۔ مٹی کی مورتی کی آرتی اتارنے لگا، کیا فائدہ؟''

''پنڈت جی آپ نے تو دھرم کی بساط ہی الٹ دی۔'' جمال نے کہا ''انسان اور بھگوان کا فرق ہی مٹا دیا۔ پھر یہ ہندو، مسلمان، برہمن، شودر، آواگون اور کرموں کا چکر یہ سب کیا ہے۔ آپ ان کو نہیں مانتے؟''

''یہ سب اس جگ کے قانون ہیں۔ ترلوک کے قانون نہیں ہیں اور ایک لوک کے قانون تین لوک کے قانون پر حاوی نہیں ہو سکتے۔ ایک لوک کی پوری سچائی ترلوک کی ایک تہائی سچائی ہوتی ہے پنڈت جی۔''

''تو آپ ذات پات کو بھی نہیں مانتے؟''

''مانتے ہیں پنڈت جمال دین کیونکہ ایک لوک میں رہتے ہیں، جس کو ترلوک کا گیان ہوگا وہ نہیں مانے گا۔ ترلوک کا گیان بھگوان کا گیان ہے پربھو۔''

جمال یہاں سے اٹھنا نہ چاہتا تھا مگر رات ہو رہی تھی اور اسے حکم تھا کہ وہ رات سے پہلے گھر پہنچ جائے۔

خواجہ یٰسین ماننے والے نہیں تھے کہ جمال اپنے خاندانی پنڈت بزرگ سے مل کر آیا ہے۔ جمال پنڈت وشوا ناتھ کے گیان کی پھوار میں اور بھیگنا چاہتا تھا مگر جگ کے قانون کو توڑنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اجازت لی۔

بھگوان مندر میں نہیں تھے اس سمے۔ جمال نے انہیں اپنے پاس ہی بٹھایا تھا۔

مگر پنڈت جی کہتے تھے، وہ پاس نہیں بیٹھا۔ اندر بیٹھتا ہے اور جمال کے اندر تھوڑی سی سرخوشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ تھوڑی سی خوشی، تھوڑا سا سکون اور تھوڑا سا نشہ، خدا شاید اسی کیفیت کا نام ہے۔

## گورو گولواکر

انہی دنوں چرچا ہونے لگا کہ گورو گولواکر سرینگر میں جلسہ کریں گے۔ گورو صاحب سے ہندوؤں کو بہت عقیدت تھی۔ مسلمان ان کو جانتے نہ تھے مگر جمال ہنگاموں کا شوقین تھا۔ ان کی تقریر سننے کے لیے چلا گیا۔ ایسا عجیب و غریب ہجوم اس نے پہلے نہ دیکھا تھا۔ لوگوں نے کھدر کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ہاتھوں میں ترشول تھے اور پیلے جھنڈے اور ان کی آنکھوں میں دیوانگی کی چمک تھی۔ جمال کو ہجوم کے آخر میں جگہ ملی۔ وہ گورو صاحب کو اچھی طرح دیکھ نہ سکا مگر تقریر ان کی صاف سنائی دیتی تھی۔ وہ بولے ''ہندوستان کا اصل نام ہندواستھان ہے اور یہ آریاؤں کا وطن ہے جو کہیں باہر سے نہیں آئے۔ ہمیشہ سے یہیں رہتے تھے اور آریہ ہی اصل ہندو اور ہندواستھان کے مالک ہیں۔ مسلمان باہر سے آئے ہیں اور غیر ملکی ہیں۔ انہیں یہاں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ ان کو نکالنے کے لیے ہندو نوجوانوں کو شکتی کی ضرورت ہے۔ اس لیے تم صبح اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے اشنان کیا کرو۔ کسرت بھی کرو اور اپنی دھاتوں کی رکشا کرو۔ اسے عورتوں پر نشٹ کرو گے تو مٹ جاؤ گے۔ پھر مسلمان تم پر راج کرنے لگیں گے۔ گاندھی تو زنخا ہے اس کی بات مت سنو!''

جب برف نے سارے راستے بند کر دیئے۔ پانی جم گئے اور درختوں نے پتے جھاڑ دیئے تو جمال کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بستر میں بیٹھا دن رات پڑھتا رہے۔ گرمیاں اس نے کرکٹ کھیل کر گزار دی تھیں۔ کتابوں کو اٹھا کر بھی دیکھا نہ تھا۔ دسمبر کے امتحانات میں وہ چار مضامین میں فیل ہوا تھا۔ اب وہ بہت خوفزدہ تھا۔ موسم کھلا تو اس نے گول باغ میں ڈیرے لگا لیے۔ جہاں نرگس فروری ہی میں بہار دکھانے لگی تھی۔ وہ صبح سویرے کتابیں، ایک لوئی اور اپنی چھوٹی بہن رعنا کو ساتھ لے کر ایک بڑے سے چنار کے تنے سے لگ کر بیٹھ جاتا اور پڑھتا۔

رعنا سے اس کی بہت دوستی تھی۔ وہ جمال کی رازدار بھی تھی۔ فدا محمد کے خط جس دکاندار کی معرفت آتے تھے اس سے اسی کا رابطہ تھا۔ خواجہ یٰسین فدا محمد کو اور جمال کے سبھی دوستوں کو ناپسند کرتے تھے۔ اسی لیے

اگرچہ خطوں میں کوئی راز کی بات نہ ہوتی تھی، انہیں گھر کے پتے پر منگوانا خطرے سے خالی نہ تھا۔

جمال نے بی اے کے امتحان کے پرچے اچھے کر لیے اور اب گھر میں اس کے دہلی جا کر کلرک بھرتی ہونے کی باتیں ہونے لگیں۔ خواجہ یٰسین بھی کشمیر سے اُکتا چکے تھے۔ پھر انہیں نوکری چھوڑنے کا عذر بھی مل گیا۔ انجمن اسلامیہ کے صدر کا حکم تھا کہ چونکہ اب خواجہ یٰسین ہیڈ ماسٹر ہیں اور اسلامیہ سکول کے ہیڈ ماسٹر کو لازماً داڑھی رکھنی چاہیے۔ اس لیے وہ شریعت کے مطابق عمل کریں۔

خواجہ یٰسین انتہائی نیک دل مسلمان تھے۔ ان کی زندگی بے عیب تھی، مگر داڑھی رکھنے پر وہ تیار نہ ہوئے اور پنجاب کے سکولوں میں نوکری کے لیے درخواستیں گزارنے لگے۔ خیال تھا کہ بالآخر کوئی صورت نکل آئے گی مگر جمال سے سورج پرکاش چوپڑہ کی دکان پر ایک بے احتیاطی ہو گئی اور اسے فوری طور پر کشمیر چھوڑنا پڑا۔

## کرشن جی کا بھگت

سورج پرکاش چوپڑہ پنڈ دادنخان کا ایک موٹا پلپلا دکاندار تھا۔ مہاراجہ بازار میں اس کی سٹیشنری کی دکان تھی۔

ایک روز جمال شام کو لائٹ کے بغیر بائیسکل چلاتا ہوا پکڑا گیا۔ اس زمانے میں ٹریفک کے سپاہی کا ریٹ ایک روپیہ تھا جو بڑی رقم تھی۔ جمال کو کل دو روپے ماہوار کا جیب خرچ ملتا تھا۔ ایک روپیہ اس کی جیب میں نہ تھا۔ سپاہی نے اس کے پچھلے پہیے کی ہوا نکال دی۔ وہ حیران کھڑا تھا کہ ایک لحیم شحیم آدمی جس نے سر پر گلابی پگڑی باندھ رکھی تھی، سپاہی کو اشارے سے ایک طرف بلایا۔

تھوڑی دیر کے بعد سپاہی کو وہیں چھوڑ کر بائیسکل کو کھینچتے ہوئے گلابی پگڑی والا موٹا پلپلا شخص جمال کے پاس آیا اور بولا ''پربھو یہ رہی آپ کی رتھ۔ داس کو کوئی سیوا بتائیے۔''

جمال کو پربھو کا تخاطب کچھ عجیب سے لگا مگر اس نے شکریہ ادا کر کے رخصت مانگی۔ بائیسکل میں ہوا نہ تھی اس لیے اسے پیدل ہی چلنا پڑا۔ پلپلا ہندو کسی قدر پیچھے رہ کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ اس نے ہاتھ باندھ رکھے تھے، گردن جھکا رکھی تھی۔

جمال کسی قدر پریشان ہوا۔ ایسی تعظیم کی اسے توقع نہ تھی۔ پھر وہ پلپلا ہندو پختہ عمر کا آدمی تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ ایک مسلمان نوجوان کو پربھو کہے جسے ایک معمولی سپاہی نے بے بس کر رکھا تھا۔ اس نے کہا ''بھائی جان آپ کا شکریہ۔ اب میں گھر چلا جاؤں گا۔''

پلپلے ہندو کی جان اس کے کانوں میں اتر آئی۔ جمال کے منہ سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو اس نے غور سے سنا۔ جیسے دل میں اتار رہا ہو۔ پھر بولا ''دھن ہے پربھو! دھن ہے ناتھ جی او۔''

جمال رک گیا اور بولا ''بھائی صاحب میں نے عرض کیا نا، آپ کی بڑی مہربانی آگے چل کر میں سائیکل میں ہوا بھروا لوں گا۔''

موٹے ہندو نے جڑے ہوئے ہاتھوں کو آگے بڑھا کر کہا ''یہ سیوا بھی داس کو مل جائے پربھو!''

جمال کو غصہ آ گیا۔ اس نے چڑ کر کہا ''بھائی صاحب آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میں کوئی بچہ نہیں اور پنکچر والے کی دکان پل کے پار ہی ہے۔ اب آپ جائیں۔''

''جو پربھو کی اِچھا۔ بھگوان کی خوشی۔''

یہ کہہ کر وہ وہیں رک گیا۔ تھوڑی دور جا کر جمال نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہیں کھڑا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے۔ جمال نے سائیکل موڑ لی اور تیز تیز چلتا ہوا اس کے پاس جا پہنچا۔ اس نے اپنی کمر اور بھی جھکا لی۔

جمال نے پوچھا۔ ''بھائی صاحب آپ کون ہیں؟''

''داس کا نام سورج پرکاش چوپڑہ ہے مگر بھگوان کو کس بات کا علم نہیں۔ دھن بھاگ کہ پربھو چاکر امتحان لیتے ہیں۔''

اس کی بات میں بڑا اخلاص تھا۔ عقیدت کے مارے اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ جمال بہت حیران ہوا۔ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''بھائی صاحب آپ کس چکر میں ہیں، کون سا پربھو، کیسا بھگوان؟ آپ بیمار تو نہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟''

''تن کے بعد منت شانت ہوا مہاراج۔ ہری درشن ہو گئے۔ داس کو جو روگ تھا دور ہو گیا۔ اب بیماری کیسی؟''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب۔'' جمال نے حیران ہو کر پوچھا۔

''پربھو درشن کی بات کر رہا ہوں۔ پربھو سیوا کی بات کر رہا ہوں کنہیا جی۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ میں آپ کا پربھو ہوں۔'' جمال نے کسی قدر خفگی سے کہا۔

''پربھو کو کوئی کیا بتائے کہ تم کون ہو۔''

''دیکھیے جناب سورج پرکاش چوپڑہ صاحب۔ میرا نام جمال ہے۔ میں مسلمان ہوں۔ اگرچہ نماز روزے سے فارغ ہوں۔ بھگوان اور پربھو سے میرا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ میں فلمیں دیکھتا ہوں، کرکٹ کھیلتا ہوں اور لڑکیوں کو اشارے کرتا ہوں۔ آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہیں۔''

## کھلنڈرا بھگوان

''بھگوان تو ہے ہی کھلنڈرا۔ کبھی گوویں چراتا ہے، کبھی گوپیوں کے کپڑے اڑاتا ہے۔ کبھی ماکھن چراتا ہے، کبھی بنسی بجاتا ہے۔ اب چاہے وہ فلمیں دیکھے، کرکٹ کھیلے، لڑکیوں کو اشارے کرے، اس کو کون کچھ کہہ سکتا ہے۔ یہی تو اس کے لچھن ہیں!''

جمال لاجواب ہو گیا۔ وہ اسے ساتھ لے کر دریا کے گھاٹ پر بیٹھ گیا۔ سورج پرکاش چوپڑا نے جوتی اتار لی اور ہاتھ جوڑ لیے۔

جمال نے سنجیدگی سے پوچھا ''کیا آپ واقعی مجھے بھگوان سمجھتے ہیں۔ مجھے جس کو ابھی آپ نے ایک پولیس والے سے چھڑوایا ہے؟''

سورج پرکاش عارفانہ ہنسی ہنسا اور بولا ''وہ تو بھگوان کے چمتکار ہیں تاکہ داس کے لیے درشن کا سمبندھ بن جائے۔ داس پر کرپا کرنی نہ ہوتی تو پولیس والا کھڑے کھڑے بھسم ہو جاتا۔ بھگوان کی لیلا نیاری، اس کے کھیل انیلے!''

''مگر آپ نے کس بات پر مجھے بھگوان مانا۔ مجھ میں آپ نے کون سا گن دیکھا۔''

''اب کب تک چھپو گے بھگوان۔ سامنے تو ہو۔ سامنے تو ہو پر...... پر...... آپ ہی نے تو مہنت کو بھیجا تھا اور اب مجھی سے پوچھتے ہو؟''

''کون سے مہنت کو؟''

''بھگوان بندرابن میں بھی تو ایسے ہی بھولے بنتے تھے۔ وہاں بھی پربھو نے بھید کو بھید ہی رکھا، پر کب تک؟ وہی مہنت جسے پربھو نے شری بدری ناتھ کی کے کنڈ پر بھیجا تھا، کہو نہیں بھیجا تھا؟''

''میں نے تو کسی کو نہیں بھیجا تھا بھائی صاحب۔'' جمال بولا۔

''اب داس کو آزماتے ہو۔ جے ہو، جے ہو۔'' سورج پرکاش چوپڑہ نے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ آنکھیں بند کر لیں۔

جمال کو اس پر بڑا رحم آیا۔ توہم کا مارا ہوا موٹا پلپلا ہندو! مگر تھا معصوم اور نیک۔

دوسرے دن جمال اس واقعے کو بھول چکا تھا مگر شام کو جب کرکٹ کھیل کر گھر واپس جانے کے لیے نکلا تو اس نے دیکھا کہ سورج پرکاش ہاتھ جوڑے ایک جھاڑی کے پیچھے کھڑا ہے۔ جمال کو دیکھ کر وہ پیٹ کے بل زمین پر لیٹ گیا اور بڑی بھونڈی مگر بھرائی ہوئی آواز میں سنسکرت کے شلوک پڑھنے لگا۔

اس کا ماتھا زمین کے ساتھ لگا ہوا تھا اور وہ رینگ رینگ کر جمال کے پیروں کو چھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ جمال نے پیر پیچھے ہٹا لیے تو سورج پرکاش چوپڑہ گھگھیا کر بولا ''چرنوں کی شرن دو بھگوان۔''

جمال زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے سورج پرکاش کے کھچڑی بالوں پر ہاتھ رکھا تو اس کی ڈھیلی پگڑی کے بل کھل گئے۔

جمال نے اسے بڑی مشکل سے اٹھا کر بٹھایا اور کہا ''بھائی سورج پرکاش میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ایک معمولی شخص ہوں، گنہگار ہوں اور مسلمان ہوں۔ میں تمہارا بھگوان نہیں ہو سکتا۔ خدا کے لیے میری بات پر یقین کرو۔''

سورج پرکاش روہانسا ہو کر بولا ''داس کچھ نہیں مانگتا۔ بچاری کو تو چرنوں کی آشا ہے بس۔''

''چلو تم میں میرے چرنوں کی آشا ہے تو پکڑ لو میرے گندے پیر مگر اتنا تو بتا دو مہنت نے تم سے کیا کہہ دیا تھا۔'' جمال بولا۔

سورج پرکاش نے حواس مجتمع کر کے کہا ''آپ ہی نے تو اسے بھیجا تھا میرے پاس۔ آپ ہی نے تو کرپا کی تھی۔ اب مجھی سے پوچھتے ہو؟''

''ایک مرتبہ تم بھی کہہ دو کہ آخر میں نے اسے کیا کہا تھا۔''

''پربھو آپ نے خود ہی تو داس کو اپنے چرنوں میں بٹھایا تھا۔ آپ ہی نے اسے بتا دیا تھا کہ ہم اگلے پورن ماشی کو سدا ماں جی کے ساتھ سری ناگ کے کنارے کمل کا پھول ہاتھ میں لیے کھڑے ہوں گے۔ داس کے بھاگ جاگ گئے۔ داس نے اسی رات اپنی آنکھوں سے بھگوان کو سدا ماں جی کے ساتھ کمل کا پھول ہاتھ میں لیے دیکھا۔ برج بہاری جی۔ مہاراج کا روپ دیکھا نہ جاتا تھا۔ چندرماں نے شرما کر چہرے پر بدلی اوڑھ لی۔ داس نے بھگوان کے آگے سیس نوا دیئے مگر سر اٹھا کر دیکھا تو بھگوان غائب تھے۔ بندرابن میں بھی تو پربھو اسی طرح چھل بل کرتے تھے۔''

جمال اس بات پر ہنسا نہیں۔ وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگا۔ سپاٹ آواز میں بولا ''بھائی سورج پرکاش تم ٹھیک کہتے ہو۔ پورن ماشی کی رات میں اپنے دوست دانی کے ساتھ سری ناگ کی سیر کو گیا تھا۔ رات کی تنہائی اور چاندنی مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ چشمے کے کنارے بیٹھ کر میں نے کنول کی ایک گلابی کلی بھی توڑی تھی۔ بس اتنی سی بات تھی۔ دانی کو سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی اور ماچس ہمارے پاس نہیں تھی۔ اگر ہم آپ کو دیکھ لیتے تو آپ سے ماچس ضرور مانگتے۔ ہم وہاں سے غائب نہیں ہوئے تھے۔ ٹہلتے ٹہلتے کہیں اور چل دیئے تھے۔ کون سا کرشن اور کیسا بھگوان، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے بھائی جان۔ اگر کرشن جی کو کسی کا روپ دھارنا ہوتا تو وہ کسی مسلمان کو کیوں پسند کرتے۔ کیا جگ میں ہندوؤں کی کمی ہے جو ان کے بھگت بھی ہوں گے؟''

جمال نے ساری بات رک رک کر خلوص کے ساتھ کہی۔ سورج پرکاش چوپڑہ ہاتھ جوڑے اس کی بات سنتا رہا مگر اس کے دل میں شک سا پڑ گیا۔ وہ اپنے خواب کی ایسی سپاٹ تعبیر کو اتنی جلدی قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے کہا ''بھگوان کے لیے ہندو مسلمان میں کوئی فرق نہیں۔ وہ تو آتما کے گاہک ہیں۔ آپ کی آتما اچھی دیکھی تو اس میں پدھار لیے۔''

''میری آتما اچھی نہیں۔'' جمال بولا۔ ''میرے والدین مجھ سے ناراض رہتے ہیں اور فارسی کی گرائمر بھی مجھے نہیں آتی۔ میرے پیروں میں سے سخت بدبو آتی ہے اور کل ہی آپ نے مجھے پولیس والے سے چھڑوایا تھا شاید ایک روپیہ دے کر یعنی میں کنگلا بھی ہوں۔''

''وہ تو داس پر کرپا تھی۔ بھگوان بڑے دیالو ہیں۔''

''اگر میں کرشن مہاراج ہوں تو میری بنسری کہاں ہے۔ بنسری کے بغیر تو وہ کہیں بھی آتے جاتے نہ تھے۔''

اس پر سورج پرکاش کو جھٹکا سا لگا کیونکہ کرشن مہاراج کا بنسری کے بغیر کوئی تصور نہیں ہے۔ بنسری واقعی جمال کے پاس نہیں تھی۔ سورج پرکاش مسکرا کر بولا ''بنسری ہے تو پر نظر نہیں آتی داس کو۔''

جمال نے کہا ''جب میں داس کو نظر آتا ہوں تو بنسری کیوں نظر نہیں آتی۔ پھر رادھے جی بھی میرے ساتھ نہیں اور گوویں بھی غائب ہیں۔ کیا بھگوان کرشن رادھے جی کے بغیر بھی کہیں نکلتے تھے؟ اور کیا گوویں ان کے بغیر بھی چرتی تھیں؟''

سورج پرکاش کو ایک اور جھٹکا لگا مگر وہ بولا ''بھگوان کے درشن کے لیے درشکوں کی اندریاں کافی نہیں ہوتیں۔ شیام چاہیں تو رادھے جی کے درشن بھی ابھی ہو جائیں وہ بھگوان سے کوئی الگ تھوڑی ہیں۔ آپ ہی بولو پربھو!''

''بھائی سورج پرکاش کیا پربھو پربھو کر رہے ہو۔ میں تو روز اشنان بھی نہیں کرتا۔ کہہ دیا کہ میں ایک گندا میلا انسان ہوں کیوں اپنی منزل کھوٹی کرتے ہو میرے پیچھے لگ کر؟''

''روز اشنان بھی نہیں کرتے؟'' پھر وہ آہستہ سے منمنایا۔ ''میرے من میں وسوسے پیدا نہ کرو۔ کرپا کرو مہاراج۔''

جمال چڑ کر بولا ''میں تمہاری طرح کا ایک عام انسان ہوں۔ سمجھتے کیوں نہیں؟''

سورج پرکاش چوپڑہ آنکھیں بند کر کے بولا ''مجھ پر دیا کی نظر رکھو۔ تم کرشن مہاراج ہو یا نہیں مگر میں بڑا اپرادھی ہوں، بڑا گنہگار ہوں۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''لو وعدہ کرو کہ مجھے روز درشن دیا کرو گے۔''

اگلے دن سے جمال نے سورج پرکاش چوپڑہ کی دکان پر جانا شروع کر دیا۔ اسے دیکھ کر اس کی باچھیں کھل جاتیں اور اگرچہ اسے شک پڑ گیا تھا کہ جمال بھگوان کرشن نہیں ہے۔ وہ اس کے لیے دودھ اور مکھن لا کر رکھ دیتا اور چوری چوری دیکھتا کہ جمال نے کچھ چرایا ہے یا نہیں۔

جمال کو دودھ اور مکھن سے رغبت نہیں تھی۔ اس سے سورج پرکاش کو یقین ہونے لگا کہ جمال کرشن بھگوان نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اسے جمال کہہ کر پکارنے لگا مگر اس کے دل میں جمال کے لیے عقیدت کم نہ ہوئی۔ وہ اس بات کا منتظر رہتا تھا کہ جمال کسی خواہش کا اظہار کرے۔

ایک دن ایک پونچھی پولیس والے نے جو مسلمان تھا اور اس کی بڑی بڑی مونچھیں اور گھنے چھتے تھے۔ سورج پرکاش چوپڑہ کی دکان سے بچوں کی کچھ کتابیں اور کاپیاں خریدیں۔ ''کل تین روپے دس آنے۔'' سورج پرکاش نے پیسے مانگے تو پولیس والے نے اسے ماں کی گالی دی۔ پھر اس کے منہ پر تھپڑ مارا جس سے اس کی گلابی پگڑی اچھل کر دور جا گری۔ جمال نے پولیس والے کے منہ پر گھونسا مارا تو اس کے گال سے خون

بہہ نکلا۔ جمال کو اس پر حیرت ہوئی کہ اس کے گھونسے سے اتنے بھاری بھرکم پولیس والے کے گال کی کھال پھٹ گئی۔ سپاہی ابھی سنبھلا نہ تھا کہ سورج پرکاش نے جیب میں سے کچھ روپے نکال کر جمال کی مٹھی میں دیئے اور کہا ''بھاگ جاؤ مہاراج'' اور جمال سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلا۔ پہلے دریا کے ساتھ ساتھ، پھر کشتی میں بیٹھ کر پار جا اترا۔ وہ چاہتا تو سامنے آنے والے جلوس میں گم بھی ہو سکتا تھا مگر وہ ہجوم میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔

## ذمہ دارانہ نظامِ حکومت

جلوس نعرے لگا رہا تھا اور خالص کشمیری مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ بچہ، بوڑھا مانگے ذمہ دارانہ نظام حکومت۔ شیرِ کشمیر زندہ باد۔ آہن گرا مردہ باد!

آہن گرا سے مراد کشمیر کا مدراسی وزیراعظم رام گوپال آئینگر تھا جسے لوگ آہن گر کہتے تھے۔ ذمہ دارانہ نظامِ حکومت کا مطالبہ بہت بلند آہنگ تھا۔ اگرچہ جلوس میں سے شاید کسی کو بھی اس کے معنی معلوم نہ تھے۔ اصل میں کشمیری لیڈر ایک منتخب اسمبلی مانگتے تھے اور نامزدگی کے سخت مخالف تھے۔ جمال شکل وصورت سے پنجابی لگتا تھا اور یہ عقل کی بات نہ تھی کہ وہ بھاگتا ہوا کسی خالص کشمیری جلوس میں گھس جائے۔

کشمیری اپنی قوم پرستی میں بہت شدت پسند تھے اور پنجابیوں کو کشمیریوں کا دشمن اور مہاراجہ ہری سنگھ کا ہمدرد سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ ان کا طویل تاریخی تجربہ تھا۔ تاتاری مغل پٹھان، سکھ اور ڈوگرے جتنے حملہ آور وادی میں آئے اور انہوں نے کشمیریوں کو لوٹا مارا پنجاب ہی کی طرف سے آتے تھے۔

جمال شام تک دریا پار کر کے پارک کی سیر دیکھتا رہا۔ شام ہوئی تو گھر کو چلا۔ خواجہ لٹیین کو جمال کی غنڈہ گردی کی خبر مل چکی تھی۔ وہ ایک امن پسند اور خوفزدہ آدمی تھے۔ انہیں جمال کے جنم کا ہمیشہ ملال رہا۔ وہ کسی کلاس میں کبھی بھی اول نہ آ سکا تھا۔ کالج کے دن اس نے کرکٹ کھیل کھیل کر ضائع کر دیئے تھے۔ آئی سی ایس کے امتحان میں بیٹھنے کی اس نے جرأت ہی نہ کی اور اب اس نے پولیس کو پیچھے لگا لیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ جمال کو سرینگر سے دفع کیسے کیا جائے۔

صبح سویرے ہی سورج پرکاش جمال کے گھر آ پہنچا۔ وہ بھی پولیس کے ڈر سے دکان کھولنا نہ چاہتا تھا۔ دونوں نے سوچا کہ کیوں نہ ہم کچھ دنوں کے لیے سرینگر سے غائب ہو جائیں۔

## وادیٔ سم وادی

جمال کی والدہ نے خواجہ لٹیین کو سمجھایا کہ جمال اپنے دوست سورج پرکاش چوپڑہ کے ساتھ کشمیر کی سیر کو چلا جائے تو پولیس کی بلا اس کے سر سے ٹل جائے گی۔

جمال کے پاس مہینے کے خرچ سے بچے ہوئے چھ آنے تھے۔ سورج پرکاش چوپڑہ کی جیب میں کوئی ڈھائی روپے۔ دونوں نے چشمہ ویری ناگ کی بس لی جہاں سے دریائے جہلم نکلتا ہے۔

چشمہ ایک پہاڑی کے دامن میں سڑک سے کسی قدر ہٹ کر ایک ہشت پہلو مغل عمارت میں قید

تھا۔ یہاں پانی ابل کر نہیں نکلتا، اوپر کو چڑھتا رہتا ہے اور کنارے سے چپ چاپ بہہ جاتا ہے۔ یہی پتلی سی لکیر آگے جا کر دریائے جہلم بن جاتی ہے جب اس میں بے شمار نالے اور ندیاں گرتی ہیں۔

تھوڑی دیر تو جمال اور سورج پرکاش چوپڑہ چشمے کی سیر دیکھتے رہے۔ پھر اکتا گئے۔ انہیں بھوک بھی لگ رہی تھی مگر اس جنگل میں نہ تو کوئی بازار تھا نہ دکان۔ وہ سوچے سمجھے بغیر پہاڑوں میں گھس گئے۔ اونچی نیچی پگڈنڈیاں، خودرو پھولوں کی مہک، جنگل کی خوشبو جمال کو بہت اچھی لگی۔ گہرے سبز درختوں پر اِکا دُکا مرغ زریں بیٹھے بول بولتے تھے۔ ایسے سنہری پرندے اس نے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے مگر سورج پرکاش کا برا حال تھا۔ اس سے چلا نہ جاتا تھا۔ اس کی جوتی ڈھیلی اور جسم موٹا تھا۔ سورج ڈوب رہا تھا جب وہ ایک گاؤں کے قریب پہنچے۔ بھوک سے ان کا برا حال تھا۔

## گائے اور گوجر

گاؤں کے باہر ایک درخت کے نیچے ایک گائے بندھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے لکڑی کی کھرلی میں تازہ اور رس بھری ناشپاتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کا رس گائے کے منہ سے ٹپک ٹپک کر زمین کو گیلا کر رہا تھا۔ جمال اور سورج پرکاش کھرلی پر ٹوٹ پڑے۔ گائے نے تھکی تھکی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا، پھر منہ پھیر لیا۔ ایسی میٹھی اور خوشبودار ناشپاتیاں جمال نے زندگی بھر نہ کھائی تھیں اور گداز ایسی کہ منہ میں گھل جاتیں۔ انہیں چبا کر کھانا نہ پڑتا تھا۔ پیٹ بھر جانے کے بعد سورج پرکاش چوپڑہ بڑی بڑی ڈکاریں لینے لگا۔ پھر دونوں گائے کے قریب ہی گھاس پر لیٹ گئے۔

تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو گیا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ اب جمال نے سوچا کہ نہ کپڑا نہ لتا۔ رات کیسے کٹے گی۔ کھلے آسمان کے نیچے تو ہم جم کر مر جائیں گے مگر سورج پرکاش چوپڑہ تو بیس برس پہلے کشمیر میں آباد ہوا تھا۔ وہ کشمیریوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ خاص طور پر ان کو جو دیہات میں رہتے تھے۔

گاؤں میں ننھے ننھے چراغ جلنے لگے تھے۔ انہیں کی روشنی میں سونگھتے سونگھتے وہ گوجروں کے ایک گھر کے سامنے جا کر رک گیا۔ اندر سے تیل میں پکتے ہوئے کرم ساگ اور گرم گرم گوبر کی بو کے بھبکے آ رہے تھے۔ سورج پرکاش نے دروازہ کھٹکھٹایا اور جمال سے کہا ''کشمیر میں گوجروں کا مہمان بننا سب سے آسان ہوتا ہے۔ ان کے ہاں اور کچھ نہیں تو دودھ تو ہوتا ہی ہے۔ پھر چونکہ یہ چلتے پھرتے لوگ ہوتے ہیں اس لیے اجنبیوں سے پرہیز نہیں کرتے۔''

اندر سے ایک بڑے پھرن والا گوجر نکلا۔ سورج پرکاش کشمیری بڑی روانی سے بولتا تھا۔ اس نے کہا ''یہ میرا چھوٹا بھائی ہے جمال دین۔ ہم دونوں ویری ناگ دیکھنے کو آئے تھے۔ واپسی پر بس نکل گئی۔ آج کی رات ہمیں پناہ چاہیے۔''

گوجر نے اشارہ کیا، اوپر آ جاؤ۔

گھر میں پردے یا علیحدگی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ کشمیری گھر آئے ہوئے مہمان سے یوں بھی پردہ نہیں کراتے۔

پہلی منزل پر تو گائیں بندھی تھیں۔ دوسری منزل ایک ہی کمرے پر مشتمل تھی۔ ایک کونے میں کھانا پکتا تھا اور گھر کے سارے لوگ وہیں فرش پر سو جاتے تھے۔

گھر کی عورتوں نے دونوں اجنبیوں کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کی۔ گوجر نے تمباکو کی ایک چلم بنا کر سورج پرکاش کے ہاتھ میں تھما دی اور کسی کام سے نیچے چلا گیا۔ عورتیں ایک کونے میں ہانڈی پکاتی رہیں۔

کشمیری حقے کو مسلسل کش نہیں لگاتے، ان کا حقہ پشاور کے حقے کی طرح ہوتا ہے۔ چلم بھی چھوٹی جس میں وہ پتی دار تمباکو کناروں تک بھر لیتے ہیں۔ پھر حقے کے نیچے سے ایک قطرہ پانی لے کر چلم پر ڈالتے ہیں اور اس پر دیا سلائی کا شعلہ رکھ کر زور زور سے کش لگاتے ہیں۔ دو چار دم لگا کر حقے کا پیندا جس میں پانی بھر جاتا ہے گاڑی کے انجن کی طرح دھوئیں سے بھر جاتا ہے۔ شعلہ بجھ جاتا ہے اور پینے والے کا نشہ پورا ہو جاتا ہے۔ پھر وہ بری طرح کھانستا اور حقہ دوسرے امیدوار کے حوالے کر دیتا ہے۔

## بابا کریلا

جمال کو کشمیری حقہ بہت دلچسپ لگتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کشمیری پنجابیوں کی طرح اطمینان سے حقہ کیوں نہیں پیتے۔ نور پور کا بابا کریلا اس معاملے میں آرٹسٹ تھا۔ فجر کی نماز پڑھ کر چلم اس اہتمام کے ساتھ بناتا کہ وہ چوبیس گھنٹے چلے۔ اس کی آگ تہ دار ہوتی تھی۔ کہیں اُپلے، کہیں کیکر کی چھال، کہیں کوئلے اور کہیں بجھی ہوئی راکھ۔ اس کو چلانے میں بھی گھنٹہ بھر لگتا تھا اور اس کے لیے اس نے ایک جولاہے کو نوکر رکھا ہوا تھا۔

وہ جولاہا ہر روز نہاتا اور نیم مسواک سے دانت صاف کرتا۔ گھنٹے بھر کے بعد جب چلم آہستہ آہستہ دھواں دینے لگتی اور تمباکو کے ساتھ گڑ، گلاب، لونگ اور بڑی الائچی کی خوشبو کمرے میں پھیل جاتی تو بابا کریلا جولاہے کو ہٹا کر حقے کی نَے خود منہ میں لے لیتا۔ وہ حقہ اسی طرح مزے لے لے کر پیتا جیسے بچہ دودھ کی بوتل کو چوسے۔

اس کا تمباکو خاص طور پر تیار ہوتا تھا۔ حقے کی نَے پر جو کے پودے اُگے ہوتے تھے جن پر وہ عرقِ گلاب چھڑکتا رہتا تاکہ وہ تازہ بھی رہیں اور خوشبو بھی دیں۔

خود حقہ پی کر بابا کریلا گلی میں آ بیٹھتا تاکہ اہلِ ذوق اس سے حظ اٹھائیں۔ عام راہگیر کو اسے ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی اور جن کو اجازت تھی وہ بھی نالی کو منہ نہ لگا سکتے تھے۔ نالی کو ہتھیلی میں رکھ کر کش لیتے تھے۔

مگر بابا کریلا کو فرصت بہت تھی۔ کشمیریوں کی اور بات تھی، وہ کام کر کے بھی بھوکے رہتے تھے۔ ان کے پاس حقہ پینے کو دو چار ہی منٹ ہوتے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد گوجر عورت بھات کے دو گرم گرم تھال لے آئی۔ اس کے ساتھ ہی دہی کے دو پیالے اور کچھ کرم ساگ۔

جمال تو چھوٹے چھوٹے لقمے لینے لگا مگر سورج پرکاش کو پتہ تھا کہ کشمیری دہی یا کرم ساگ کو چاولوں کے تھال پر انڈیل کر چھوٹے چھوٹے گولے بناتے ہیں اور پھر منہ میں ڈال لیتے ہیں تاکہ کوئی دانہ گر نہ جائے۔ دراصل صدیوں کی بھوک نے کشمیریوں کو کھانا پیٹ میں ڈالنے سے پہلے ہاتھوں سے چکھنے کا شوق پیدا کر دیا تھا۔

## واز بھتہ

کشمیری جب کھا سکتے ہیں تو بے تحاشہ کھا سکتے ہیں۔ شادی کی دعوت میں دوسرے لوگ کشمیری سالنوں کی تعداد اور مقدار کا تصور نہیں کر سکتے۔ پانچ سات آدمیوں کے لیے بھی میزبان کو چھ سات بکرے ذبح کرنے پڑتے ہیں۔ پندرہ سالن غریبانہ دعوت کا شیوہ ہے۔ آگے چلیے تو تیس اور چالیس۔ ان کے پکوان ہندوستانی، پٹھانی یا پنجابی کسی صورت نہیں ہوتے۔ ان کا طریقہ سمرقند و بخارا سے ملتا ہے مگر اپنی خصوصیت رکھتا ہے۔ وہ دعوتوں میں صرف گوشت پکاتے ہیں اور دودھ یا دہی میں پکاتے ہیں۔ تمام سالن تیل میں پکتے ہیں مگر ہر سالن کا ذائقہ منفرد ہوتا ہے۔

دعوت کھانے کا بھی ایک خاص انداز ہے۔ وہ سارے سالن ایک ہی دفعہ مہمان کے آگے نہیں رکھ دیتے۔ دو چار چار کے گروہوں میں انہیں دسترخوانوں پر بٹھاتے ہیں اور بھات کی ایک بہت بڑی سینی بیچ میں رکھ دیتے ہیں۔ پھر آش پاز یعنی باورچی یا بیرا سالنوں کی دیگچیاں لے کر ہر گروہ کے پاس جاتا ہے اور اس کا حصہ سینی میں ڈال دیتا ہے۔ پھر چاروں میں سے سب سے معمر شخص گوشت کے چار مساوی حصے کر کے بانٹ دیتا ہے۔ اتنے میں اگلے سالن کی دیگچی آ پہنچتی ہے مگر سب کو سب کچھ کھانا پڑتا ہے۔

سورج پرکاش چوپڑہ نے گوجروں کا تھال مزے لے لے کر کھایا۔ اس کی اوجھڑی بھر گئی مگر نیت نہ بھری۔ کوئی آٹھ بجے نمکین چائے پی کر سب وہیں لیٹ گئے۔ گوجر، اس کی بیوی بچے، اس کی ماں اور اس کا چھوٹا بھائی۔ جمال اور سورج پرکاش کو بھی ایک ایک لوئی مل گئی۔

جمال تکیے کے بغیر کبھی سویا نہ تھا۔ یہاں تو اس کے نیچے لکڑی کے فرش کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ رات گہری ہوئی تو پاس کی ندی شور مچانے لگی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے اس کی ہڈیاں جلنے لگیں۔ شاید وہ کچھ اچھا ہو کر سو بھی جاتا مگر لوئی میں پسو اس قدر تھے کہ لگتا تھا اس میں بنے ہوئے ہیں۔ باقی لوگ جن میں سورج پرکاش چوپڑہ بھی تھا، بے سدھ ہو گئے۔

خدا خدا کر کے پو پھٹی اور اس دوران جمال نے کہیں اونگھ لیا۔ پو پھٹنے پر وہ اور سونا چاہتا تھا مگر گوجر دودھ دھو چکے تھے اور نمکین چائے کا سماوار دہک رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں وہاں سے رخصت ہو گئے۔ سورج پرکاش نے گوجروں کا کشمیری میں بہت شکریہ ادا کیا مگر گوجروں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

صبح کا منظر بہت دلفریب تھا۔ ہلکی پیلی دھوپ، رات کے ٹھٹھرے ہوئے جسموں کو نکور کرنے لگی۔

سورج پرکاش نے گوجروں سے اچھابل کا راستہ پوچھ لیا تھا۔ وہ ادھر کو چل دیئے۔

## ہم کون تم کون

جو زمین قابل کاشت تھی سرخی مائل تھی۔ جنگل میں پھولوں کی اتنی قسمیں اور رنگوں کے اتنے زیادہ سلسلے تھے کہ کوئی گن نہ سکے۔ ان کو تو کوئی کبھی دیکھنے بھی نہ آیا ہوگا۔ جمال نے سوچا۔ ہوا ایسی تازہ اور خوشبودار تھی کہ لگتا تھا دنیا میں پہلی بار چلی ہے۔ دونوں آگے پیچھے اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر چلتے رہے۔ پروگرام یہ تھا کہ کھانا اچھابل پہنچ کر کھایا جائے گا۔

اچھابل ایک خوبصورت آبشار کا نام ہے اور شاعر ایسی آبشاروں کی بہت تعریف کرتے ہیں مگر اس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ نہ اس کے دامن میں قوس وقزح بنتی تھی، نہ اس کا پانی شفاف تھا۔ وہ گرتے ہی دودھیا ہو جاتا تھا۔ تھوڑی دیر سیر کرنے کے بعد جمال اور سورج پرکاش کو خیال آیا کہ کھانے کا کچھ انتظام کیا جائے۔ بازار سے انہوں نے گوشت، پیاز، نمک، مرچ، سرسوں کا تیل اور ایک مٹی کی ہنڈیا خریدی۔ نو آنے اس پر لگ گئے۔

## لنچ بریک

سورج پرکاش نے کہا ''ماس میں پکاؤں گا۔''

جمال کو پتہ تھا کہ ہندو کو گوشت پکانا نہیں آتا مگر سورج پرکاش نے ضد کی۔ جمال نے پتھروں کا چولہا بنا کر لکڑیاں سلگا دیں۔ سورج پرکاش نے مٹی کی ہانڈی کو پانی میں تر کیے بغیر چولہے پر رکھ دیا۔ پھر اس میں تیل انڈیل کر دھوئے بغیر گوشت ڈال دیا اور پیاز چھیلنے لگا۔ نمک مرچ اور دیگر مصالحے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

جمال نے کہا ''مصالحہ تو تم نے ڈالا ہی نہیں۔''

''مصالحے آخر میں ڈالتے ہیں۔'' سورج پرکاش نے جواب دیا۔ ''جب تمہیں کچھ معلوم نہیں تو چپ کیوں نہیں رہتے۔''

پندرہ منٹ کے بعد سورج پرکاش نے ہانڈی اتار دی۔ بولا ''دیکھو ماس کتنے مزے کا پکا ہے۔''

جمال نے ہانڈی میں جھانکا تو تیل ملے ہوئے گرم پانی میں پیاز کے بڑے بڑے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ نیچے کہیں کہیں گوشت کی کوئی بوٹی بھی دکھائی دی مگر پکی نہ تھی۔ اس کا رنگ بھی تبدیل نہ ہوا تھا۔

سورج پرکاش نے ایک بوٹی اٹھا کر ٹھنڈی کی اور منہ میں ڈال کر کھینچنے لگا جیسے کتا مردار کو کھینچتا ہے۔

جمال بولا ''کہا تھا نا تم کھانا نہیں پکا سکتے۔''

''کیوں نہیں پکا سکتا۔ چکھ کر تو دیکھو۔'' بوٹی ابھی تک اس کے دانتوں میں پھنسی ہوئی تھی۔

''تم نے تو نمک مرچ بھی نہیں ڈالا۔ چکھوں کیا؟'' جمال بولا۔

''چلو اب ڈال لیتے ہیں۔'' سورج پرکاش نے جواب دیا۔ یہ کہہ کر اس نے نمک کی ایک ڈلی اور مرچوں کی آدھی پڑیا ہانڈی میں ڈال دی۔ ڈوئی تو تھی نہیں۔ وہ ہانڈی کو ایک سوکھی لکڑی سے چلانے لگا۔

جمال سے رہا نہ گیا۔ اس نے کہا ''بھائی سورج پرکاش تم اول درجے کے چوپڑے ہو یعنی گدھے۔''

سورج پرکاش اپنی ناکامی پر پہلے ہی خفیف تھا۔ بوٹی اس سے ٹوٹتی نہ تھی۔ اس نے جھلا کر کہا ''میں گدھا ہوں تو گدھا ہی سہی۔'' اور یہ کہہ کر اس نے ہانڈی پتھر پر پھوڑ دی۔ کچی بوٹیاں گھاس پر بکھر گئیں۔

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

اچھابل انت ناگ کے قریب واقع ہے۔ مسلمان جسے اسلام آباد کہتے ہیں۔ جموں سے سرینگر کا راستہ یہیں سے ہو کر جاتا ہے۔ انہیں بارہ مولا جانا تھا اور اسلام آباد اور بارہ مولا کے درمیان کوئی پکی سڑک نہ تھی۔ ایک پگڈنڈی چلتی تھی جس کے بارے میں جمال اور سورج پرکاش کو کچھ معلوم نہ تھا۔

دونوں منہ بسورے غصے میں بھرے بھوکے اور آپس میں بات کیے بغیر آگے پیچھے پگڈنڈی پر چل دیے۔ راستہ بالکل ہموار تو نہیں تھا مگر اس میں جان لیوا چڑھائیاں بھی نہ تھیں۔ کوئی دو چار سو فٹ کی پہاڑی آ جاتی جس پر دم پھول جاتا تو اس سے اترتے ہوئے فرحت بھی ہوتی۔

## دوڑ وزمانہ چال قیامت کی چل گیا

جمال دم لینے کو بیٹھ گیا تو سورج پرکاش بھی بیٹھ گیا مگر دونوں نے آپس میں کوئی بات نہ کی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک کشمیری لڑکا چٹان کی اوٹ سے نکلا۔ اسے اس جنگل میں کسی پنجابی سے ملاقات کی امید نہ تھی۔ وہ رک گیا۔ ''کوت گسک؟'' اس نے پوچھا۔

''بارہ مولا۔'' جمال نے جواب دیا۔

''بارہ مولا؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''تم پنجابی پیدل بارہ مولا تک نہیں جا سکتے۔ ہم کشمیری تو جا سکتے ہیں۔''

''ہم بھی جا سکتے ہیں۔'' جمال نے جواب دیا۔

''جا سکتے ہو تو آؤ۔ بیٹھے کیوں ہو۔''

جمال کو معلوم نہیں تھا کہ بارہ مولا کتنی دور ہے۔ اس کا خیال تھا کہ چلتے رہے تو شام تک ہم پہنچ ہی جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ بھی رات تک اور اس قسم کی مہم کے لیے وہ ہمیشہ تیار رہتا تھا مگر بھاگ کر بارہ مولا جانے کا اس نے کبھی سوچا نہ تھا۔ کشمیری لڑکے کے چیلنج کے جواب میں اسے بھاگنا پڑ گیا مگر اسے پتہ تھا کہ میں اتنا لمبا فاصلہ دوڑ کر طے نہ کر سکوں گا۔

تھوڑی دیر میں وہ ہانپنے لگا مگر اچانک ڈھلان آ گئی اور وہ کسی کوشش کے بغیر لڑھکتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ اس سے اسے بڑی فرحت ہوئی اور دم سینے میں سمانے لگا۔

کشمیری لڑکا نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ سورج پرکاش کا بھی کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ موٹا پلپلا بھاگنے کے قابل بھی نہ تھا۔ دو چار فرلانگ اور دوڑنے کے بعد جمال کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ پھر اس نے سوچا کہ دیکھنے والا تو کوئی ہے نہیں' کیوں نہ میں اگلے درخت کے نیچے جا کر سستا لوں۔

اگلے درخت تک پہنچ کر اس نے محسوس کیا کہ میں ابھی کچھ اور بھی دوڑ سکتا ہوں۔ اگلے درخت تک پہنچنے میں اترائیاں اور چڑھیاں طے کرتے ہوئے وہ بھاگتا رہا۔ زمین کی اونچ نیچ نے اسے بڑا سہارا دیا۔ سیدھی سڑک ہوتی تو وہ کب کا گر گیا ہوتا۔

اگلے درخت کے نیچے کشمیری لڑکا دم لے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر جمال نے دوڑ جاری رکھی۔ اب یہ پنجاب کے وقار کا سوال تھا۔

سورج ڈھل رہا تھا۔ موڑ پر پہنچ کر اس نے محسوس کیا کہ میری ٹانگیں رک نہیں رہیں بلکہ ایک مشین کی طرح اپنے آپ چل رہی ہیں۔ تھکاوٹ ایک مقام پر پہنچ کر ختم ہو چکی تھی مگر اسے پیاس بڑے زور کی لگ رہی تھی۔ ندی کے کنارے رک کر اس نے اوک سے پانی پیا مگر اسے حیرت ہوئی کہ مجھے بھوک نہیں لگی اور میں کمزور بھی نہیں ہوا۔ ایک چھوٹی بچی وہیں گوویں چرا رہی تھی۔ جمال نے اس سے پوچھا ''بارہ مولا کتنی دور ہے۔''

### دور بہت دور

''بہت دور۔'' وہ بولی۔ ''تم ایک گھنٹے میں بھی وہاں پہنچ نہیں سکتے۔ کیا وہاں تمہاری نوکری ہے؟''

''نہیں۔ میں تو پڑھتا ہوں۔''

''تو پھر تم بھاگتے کیوں ہو۔ کیا تمہیں پولیس والے پکڑتے ہیں؟''

''نہیں مجھے وہاں کام ہے۔''

''تمہاری ماں وہاں ہو گی اس لیے بھاگ رہے ہو۔ کیا وہ تمہیں مارے گی؟''

''میری ماں تو سرینگر میں رہتی ہے۔ وہ مجھے کبھی نہیں مارتی۔''

''تو پھر آرام سے کیوں نہیں جاتے۔ آرام سے جاؤ تو رات تک پہنچ جاؤ گے۔ تمہیں بھوک تو نہیں لگی؟''

''بھوک بھی لگی ہے۔''

''تو پھر تم بھاگ کر ہی جاؤ۔''

وہ بہت پیاری بچی تھی اور بھوک سے ڈر گئی تھی۔ اسے وہیں چھوڑ کر جمال آگے بڑھا۔ اس کی ٹانگیں کسی قدر بوجھل ہو رہی تھیں۔ اس قسم کے سفر میں ستانے سے ٹانگیں بوجھل ہو جاتی ہیں۔

اندھیرا ہو چلا تھا اور بارہ مولا کا کوئی نشان نہ تھا۔ پگڈنڈی بھی اب صاف دکھائی نہ دیتی تھی اور راستے کے پتھروں سے ٹھوکریں بھی لگتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے گھر آس پاس بکھرے ہوئے تھے جن میں دھیمی لو والے چراغ جل رہے تھے جو روشنی نہ دیتے تھے۔ دوڑتے دوڑتے اس کی طاقت عود کر آئی۔ اس کے گھٹنے ریل کے انجن کے گھٹنوں کی طرح آپ ہی آپ چلنے لگے مگر پھر وہ اچانک تھک گیا۔ کشمیری لڑکا کہیں بہت پیچھے رہ گیا تھا اور اب اندھیرے میں دوڑنے کی کوئی مجبوری باقی نہ رہی تھی۔ وہ ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس سے اس کی کمر اور ٹانگوں کو بہت آرام ملا۔

آرام ملا تو اسے پریشانی نے گھیر لیا۔ رات سر پر تھی۔ بارہ مولا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس کی جیب خالی تھی کیونکہ تھوڑے سے جو پیسے اس کے پاس تھے' وہ اچھابل میں ہانڈی چولہے کی نذر ہو چکے تھے۔ اس نے کچھ کھایا نہ تھا۔ سردی اتر رہی تھی اور سورج پرکاش چوپڑہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ جمال کو اسے جنگل میں اکیلا چھوڑ دینے پر شرمندگی ہونے لگی۔ اسے یہ خیال بھی تھا کہ وہ موٹا پلپلا پھر کسی گجر کا مہمان بن جائے گا مگر اس سائیں سائیں کرتی ٹھنڈی رات میں میرا کیا بنے گا۔ اس کے بدن میں جان بالکل نہ رہی تھی۔ پتہ نہیں وہ کتنے میل دوڑا تھا۔ تھکاوٹ اس کے جسم پر سوار ہو گئی۔ اس میں ہلنے کی طاقت بھی نہ رہی۔ اس امید پر کہ شاید میری آنکھ لگ جائے' اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

پتھر کی ٹھنڈی سل اسے کسی کروٹ چین نہ لینے دیتی تھی' اچانک کچھ لوگ اس کے قریب سے گزرے۔ اس کا جی چاہا کہ میں ان سے بارہ مولا کو جانے کا راستہ پوچھوں مگر بات کرنے کی طاقت بھی اس نے ضائع کرنی نہ چاہی اور انہیں گزر جانے دیا۔

جب وہ کافی دور جا چکے تو جمال نے محض شرارت کے خیال سے انہیں پکارا۔ ''کسو چھو؟''

جمال کا خیال تھا کہ میری آواز ان تک نہ پہنچے گی مگر وہ رک گئے اور ان میں سے ایک آدمی واپس آیا۔ جمال اٹھ کر بیٹھ گیا مگر اندھیرے میں اسے آنے والے نے دیکھا نہیں۔ پہلے اُس نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی پھر آہستہ سے کہا ''کسو چھوحض؟''

''میں یہاں ہوں۔'' جمال نے چہک کر کہا ''مجھے بارہ مولا جانا ہے۔ کیا آپ بھی بارہ مولا جا رہے ہیں؟''

اس نے حیران ہو کر جمال کو دیکھا پھر کہا ''بارہ مولا ہی تو ہے جہاں تم بیٹھے ہو۔''

جمال اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''کدھر ہے بارہ مولا؟''

''پیچھے مڑ کر دیکھو۔ بتیاں نہیں نظر آ رہی تمہیں؟''

جمال نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ وہ بارہ مولا کے سامنے سرینگر جانے والی سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دریائے جہلم بہہ رہا تھا جس کی رات کو چیرتی ہوئی دھاڑ اس نے پہلی بار سنی۔ ایک چھوٹی چٹان پر سے چھلانگ لگا کر وہ سڑک پر پہنچ گیا۔ آگے دریا کی منڈیر تھی۔ وہ اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔

بارہ مولا کے ہوٹل اور چائے خانے اس کی نظروں کے سامنے تھے مگر اس کی جیب اس کے پیٹ کی طرح خالی تھی اور سورج پرکاش چوپڑہ جس کے پاس پیسے تھے' پتہ نہیں کہاں تھا۔ اس وقت ایک سوکھی روٹی۔ بھات کے ایک گرم تھال' گوجروں کے گھر کے کھٹے دہی اور پسوؤں سے گندھی ہوئی ایک لوئی پر اس کی دنیا نثار تھی۔ افسوس! چھوٹی چیزوں کی بڑی قیمتوں کے بارے میں لوگ کچھ بھی نہیں جانتے!

سڑک سنسان تھی کیونکہ راولپنڈی سے سرینگر جانے والی بسیں شام سے پہلے ہی روانہ ہو چکی تھیں۔ اب یہاں کوئی آنے والا نہ تھا۔ جمال کا دماغ سردی' بھوک اور تھکاوٹ سے شل ہو چکا تھا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب وہ منڈیر سے لڑھک کر سڑک پر گر گیا اور سردی کی وجہ سے گھٹنے سینے سے لگا کر سو گیا۔ سو گیا یا بے ہوش ہو گیا؟

## ہو گئی آدھی رات

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔

جمال نے نیند میں یا بے ہوشی میں قدموں کی چاپ سنی مگر اس نے سوچا' کوئی ہو گا۔ مجھے کیا؟ اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔

چلتے ہوئے قدم اس کے پاس آ کر رک گئے۔ پھر کوئی اس پر جھکا اور اس کے بال پکڑ کر بولا۔

''جمال۔ میں آ گیا میرے یار۔ آنکھیں تو کھول۔''

سورج پرکاش چوپڑے کی آواز سنتے ہی جمال اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دونوں لپٹ گئے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے ہوں۔

سورج پرکاش چوپڑہ راستے میں رکا نہیں تھا۔ وہ مسلسل اور ایک رفتار سے چلتا رہا تھا۔ اسے اس بات کا زیادہ فکر تھا کہ جمال راستہ جانتا نہیں اور کشمیری زبان اسے اچھی طرح نہیں آتی۔ اس کو یہ خیال بھی تھا کہ اس کے یار کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ احساس ذمہ داری کی وجہ سے وہ مسلسل چلتا رہا۔ راستہ بھولنے کا کوئی سوال نہ تھا کیونکہ اچھابل سے جو پگڈنڈی چلی تھی وہ سیدھی بارہ مولا تک جاتی تھی۔ اسی پر چلتا وہ عین وہیں پہنچ گیا جہاں جمال پڑا تھا۔

دونوں دریا کی منڈیر پر بیٹھ گئے۔ بات کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ دونوں نے ایک دم

قہقہے مارنے شروع کر دیئے۔ پھر سورج پرکاش چوپڑہ نے کہا ''جمال تم بالکل ٹھنڈے ہو رہے ہو۔ چلو پھرو تاکہ تمہارا جسم گرم ہو جائے۔ بازار تو بند پڑا ہے مگر شاید ہم کوئی دکان کھلوا سکیں۔''

بازار میں سورج پرکاش نے ایک ایک دکان کھٹکھٹانی شروع کر دی۔ مالک اندر ہی پڑے سوتے تھے مگر دروازہ کسی نے نہ کھولا۔ ایک دکان کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے کشمیری زبان میں تقریر شروع کر دی۔ پھر اچانک وہ پنجابی بولنے لگا۔

''اسیں بھکھے بھانے آں سردار جی۔ بوہا کھول۔''

پنجابی سن کر سردار جی نے دروازہ کھول دیا اور حیران ہو کر دونوں کی طرف تکنے لگا۔ وہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ ہم جھوٹ تو نہیں بول رہے۔

سورج پرکاش نے کہا ''ایہہ میرا بھرا اے چندر پرکاش چوپڑہ۔ میرا ناں سورج پرکاش چوپڑہ اے۔ سانوں کجھ کھان نوں دیو۔''

''ایس ویلے تو کجھ ہے نہیں۔'' سردار صاحب نے تاسف سے کہا ''ہنے دودھ آ جاسی۔ کہہ وجیا ہوسی؟''

گھڑی کسی کے پاس نہ تھی۔ سردار جی خود ہی بولے ''چار وجے ہوسن۔''

''آہو جی۔ پر کوئی آنڈا تے ہوسی۔''

''آنڈا تے ہے جی۔ چار ابال دیاں؟''

سردار جی نے فٹافٹ آگ جلائی۔ اس پر پانی کی پتیلی رکھی اور چار انڈے اس میں ڈال دیئے۔

جمال اور سورج پرکاش پاس کھڑے ہو کر آگ تاپنے لگے۔

''کتھوں پدھارے او خیر نال۔'' سردار جی نے پنکھا مارتے ہوئے پوچھا۔

''اچھابلوں۔'' سورج پرکاش نے کہا۔ ''ایہہ میرا بھرا بڑا مورکھ اے۔ مینوں سیر کروان لے ٹریا تے کھجل کرایا۔ پر چھوٹیاں دی گل منی پیندی ای اے سردار جی۔''

''ست بچن اے۔ چھوٹیاں دی گل موڑی نہیں جا سکدی۔''

انڈے کھا کر دونوں کی جان میں جان آئی۔ اتنے میں دودھ والا آ گیا۔ سردار جی نے گرم کر کے دونوں کو ایک ایک گلاس اس کا بھی پلایا تو ان کی رگوں میں خون دوڑنے لگا۔

رات کی رکی ہوئی بسیں سٹارٹ ہونے لگیں۔ چٹانوں کی اوٹ سے چھوٹے چھوٹے کشمیری لڑکے مسافروں کی خدمت کے لیے نکل آئے۔ وہی پھٹی ہوئی شلواریں' میلے کرتے' ننگے پیر' سرخ چہرے مگر وہی ان کی پھرتی اور تیزی۔

یہ کشمیر تھا۔ صدیوں سے پامال۔ سرسبز' چابکدست اور بھوکا۔

انتہائی خوبصورت اور انتہائی بدصورت۔

جس کی کومل وادیوں میں ڈوگرے اور سانپ ساتھ ساتھ رہتے تھے۔

جس کے پھولوں کی کوئی گنتی نہیں کر سکتا۔ جس کی روشنی دریاؤں میں گھل کر راستوں کے اندھیرے دور کرتی ہے۔

جس کے اپنے دامن میں کچھ نہیں ہوتا۔

## کشمیر سے رخصت

جمال بارہ مولا سے سرینگر دو ہی گھنٹے میں پہنچ گیا۔ خواجہ ٹیلین سکول جا چکے تھے۔ اس کی والدہ نے بتایا کہ تمہیں کل ہی جہلم روانہ ہو جانا ہے کیونکہ پولیس تمہارے پیچھے لگی ہے۔ جہلم میں جمال کا ماموں مشتاق رہتا تھا اور مشتاق جمال کا دوست اور استاد تھا۔ اسی نے اس کو زندگی کے ابتدائی اسباق پڑھائے تھے۔

سرینگر سے رخصت ہوتے ہوئے جمال کو رہائی کا احساس ہوا۔ اس کو پتہ نہیں تھا کہ میں زندگی میں پھر کبھی کشمیر نہ آ سکوں گا اور اس پر بھی اس نے کبھی غور نہ کیا تھا کہ جوانی کے ابتدائی سال کشمیر میں گزارنے کے کیا معنی ہیں مگر یہ رہائی اس کے بچپن کی گھٹن سے تھی۔ کرائے کے علاوہ اب اس کی جیب میں پچاس روپے کی خطیر رقم بھی تھی جو اس نے کبھی دیکھی نہ تھی۔

## پہلا پڑاؤ

مشتاق نے تعلیم ختم کرنے کے بعد زندگی میں بڑی کھکھیڑیں اٹھائی تھیں۔ کسی بات سے بگڑ کر اس کے تھانیدار باپ نے اسے جائیداد سے عاق کر دیا تھا اور اس پر وہ بہت خوش تھا کیونکہ اب اسے اپنے باپ کے لیکچر نہ سننے پڑتے تھے۔

مشتاق ایک خوش گفتار' خوش وقت اور بذلہ سنج آدمی تھا۔ روپے کی اہمیت ابھی اس نے سمجھی نہ تھی۔ طبلہ بجانے اور پاس پڑوس کی لڑکیوں کو اشارے کرنے کے سوا اسے کوئی کام نہ تھا۔

بیوی کے زیور بیچ کر وہ کھا چکا تھا اور اب وہ جہلم کے ایک موٹر مکینک کا محبوب دوست تھا جس نے اسے ایک پرانی کار خرید کر لے دی تھی۔ اس کار کو مالک اور ڈرائیور کی حیثیت سے مشتاق نے فوجی مال کی سپلائی کے ٹھیکے پر لگا رکھا تھا اور اس کی کمائی میں وہ کھاتا پیتا آدمی شمار ہوتا تھا۔ روزانہ کی شراب کا خرچہ اس پر نہ تھا کیونکہ یہ ذمہ داری اس کے مکینک دوست کی تھی جو اس کی ایک ایک بات پر جان نثار کرتا تھا۔

جہلم جیسے فوجی شہر میں اس نے کچھ گوئیے بھی تلاش کر لیے تھے اور ہر شام اسے مکینک کی دکان سے اٹلی کی وہسکی کے جام لنڈھانے اور خوشبودار پان کھانے کے بعد وہ اپنی بیٹھک میں طبلہ لے کر بیٹھ جاتا اور محفل میں خیال اور ٹھمری کے بول' قہقہے اور لطیفے روشنی پھیلانے لگتے۔

جمال کو کشمیری مزدوروں کے کورس گیت بہت اچھے لگتے تھے۔ جب وہ پتھروں سے بھری گاڑی

کھنچتے تو بڑی عمدہ لے میں نعرے لگاتے تھے یا پیر دستگیر!

یا گھریلو ورکشاپوں میں بیٹھے ہوئے بچے سوزن کاری کی بوریت دور کرنے کے لیے دن بھر تبک ناری کی اداس لے میں گیت گاتے تھے۔

کلاسیکی راگ کا ذوق جمال میں پیدا ہو چکا تھا۔ ایک مرتبہ ہری سنگھ ہائی سٹریٹ میں سے گزرتے ہوئے ایک بالا خانے سے ایک تان اڑی تو اس کے قدم رک گئے تھے۔ اتفاق سے ان دنوں مشتاق بھی سرینگر آیا ہوا تھا۔ وہ دونوں بے کھٹکے چڑھ گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کمرے میں جٹا دھاری جوگی بیٹھا درگا راگ گا رہا ہے اور اس کی شخصیت اور آواز میں ایک عجب جادو تھا۔ کچھ کاٹ درگاہ راگ کی بھی تھی جس نے دونوں کو مسحور کر دیا تھا مگر یہ بات وہیں پر رکی ہوئی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ جوگی ہندوستان کا مشہور گویا وشنو یا گمبر ہے۔

جہلم شہر جمال کو کچھ عجیب لگا۔ نہ تو اس میں نور پور کی سی گتھی ہوئی قربتیں تھیں اور نہ سرینگر جیسی دوریاں۔ شہر میں لمبے قدموں والے مزدور، لمبی ناکوں والے سپاہی اور موٹی توندوں والے ساہوکاروں کی کثرت تھی۔ شہر کے آس پاس کی زمین بنجر تھی۔ پورس کے وقت سے اس بانجھ زمین نے تمام لوگوں کو اب تک زخموں، محرومیوں اور پردیسوں میں محاذوں پر موت کے سوا کچھ نہ دیا تھا۔ یہ لوگ سخت جان اور جفاکش تھے۔ شمالی حملہ آوروں کو خیبر سے اترنے کے بعد ہمیشہ انہی لوگوں نے روکنے کی کوشش کی تھی اور صرف وہی آگے بڑھ سکے تھے جو ان کو شکست دے سکے۔ اسی لیے 1857ء کے بعد جب انگریزوں نے یو پی، بنگال اور مدراس سے بھرتی بند کی تو فوج کے لیے جہلم کے سخت کوشوں پر انحصار کیا کیونکہ انہیں روسی زاروں کے ہندوستان پر حملے کا اندیشہ تھا اور جہلم کے جوان ہی ان کا راستہ روک سکتے تھے۔

جس روز جمال جہلم پہنچا مشتاق گھر ہی پر تھا۔ اس کی کار کے کسی نے پرزے چرا لیے تھے جو اب بازار میں ملتے نہ تھے۔ مشتاق بے روزگار ہو گیا تھا مگر اس کے دل پر بوجھ نہ تھا۔ بیوی کی تسلی کے خیال سے اس نے گھر آ کر غم کا اظہار کیا مگر وہ اس چوری پر خوش تھا۔ اب روزانہ مال لاد کر چھاؤنی جانے اور بل وصول کرنے کی مشقت سے اس کی جان چھوٹ چکی تھی۔

## چاندرات

شام ہوتے ہی مشتاق جمال کو ساتھ لے کر اپنے مکینک دوست کی دکان پر جا پہنچا جو اپنی صحت اور قد بت کے حساب سے ایک جنگلی بھینسا لگتا تھا۔ اس کے بال حبشیوں کی طرح گھنگھریالے تھے۔ پان کی پیک سے اس کے موٹے موٹے کالے ہونٹوں پر عنابی رنگ کی پپڑیاں جم رہی تھیں۔ جمال کو دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔

مشتاق نے کہا ''یہ سیب کشمیر سے بے داغ آیا ہے۔''

''اچھا؟'' اس نے اشتیاق سے جواب دیا۔ ''ابھی کرتے ہیں اس کا بندوبست۔'' وہ ڈکرایا اور للکار کر بولا ''اوئے گامی، اوہ ماما یا دا سور واپس آیا کہ مر گیا راستے میں؟''

''نہیں استاد۔'' ایک شاگرد بولا۔ ''آتا ہی ہو گا۔''

''پان آ گئے؟''

''جی ہاں۔''

''اور نقل؟ کتے کے بچے تجھے کب سے کہہ رکھا ہے کہ دو درجن کباب سیخ پر لگوا دے اور سوڈے کی بوتلیں بھی ابھی تک نہیں آئیں اور برف؟ بچہ آیا ہے۔ کشمیر سے کیا کہے گا؟''

جمال کو سوڈے سے سخت نفرت تھی۔ بچپن میں جب اسے ملیریا ہوتا تھا تو اسے روزانہ دودھ سوڈا پلایا جاتا تھا اور یہی ملیریے کی دوائی سمجھی جاتی تھی۔ اسے ڈر لگا کہ مجھے کباب تو ملیں گے مگر دودھ سوڈا بھی پینا پڑے گا حالانکہ مجھے بخار بالکل نہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد گامی نے تھیلا لا کر میز پر رکھ دیا۔ پھر کرسیاں سیدھی کیں اور پان کے بنڈل، پاسنگ شو سگریٹ کی چار ڈبیاں، سوڈے کی بوتلیں اور کباب کی تھالیاں میز پر لگا دیں۔ آخر میں گامی نے تھیلے میں سے ایک لمبی بوتل نکالی جس کے منہ پر سنہرے رنگ کا کارک لگا ہوا تھا اور لیبل پر لکھا تھا ''مانو پول وہسکی۔ میڈ ان اٹلی!''

شراب کے خلاف خواجہ یلیین نے اس قدر پروپیگنڈا کر رکھا تھا کہ جمال کے دل میں پینے کی زبردست خواہش پیدا تھی۔ اب موقع آیا تو اس کا دل دھڑکنے لگا مگر وہ یہ ثابت بھی نہ کرنا چاہتا تھا کہ میں کشمیر سے آیا ہوا محض ایک بے داغ سیب نہیں ہوں۔

مشتاق نے پیچ کس سے کاک اڑایا تو بوتل میں سے ہلکے سنہرے رنگ کے بلبلے نکلے، پھر شراب گلاسوں میں بیٹھ گئی۔ جمال کے لیے گلاس مشتاق نے ذرا کم ہی بھرا۔ ''چیرز!'' مکینک نے کہا۔ جمال نے ان کے گلاس سے گلاس ٹکرایا اور سانس روک کر غٹا غٹ پی گیا۔ کڑواہٹ اس کے جگر تک اتر گئی اور بو ایسی جیسے کوئی مرا ہوا کتا کسی نے اس کی جیب میں ڈال دیا ہو۔

جمال کا خیال تھا کہ ادھر شراب حلق سے اتری اُدھر میرے ہوش و حواس اڑے۔ پھر میں خواجہ قطب دین کی طرح گالیاں بکنے اور گریبان پھاڑنے لگوں گا۔

مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔

مشتاق نے نعرہ مارا۔ ''شاباش میرے شیر'' اور پھر ایک کباب اٹھا کر اس کے منہ میں ڈال دیا۔ پھر وہ بولا ''اچھی چیزوں کو جلد ختم نہیں کرتے۔ رک رک کے رک رک کے چلتے ہیں نوجوان۔''

کباب کھانے کے بعد جمال کے منہ کا ذائقہ بدل گیا اور مرے ہوئے کتے کی بو بھی اس کی ناک سے جاتی رہی۔ مشتاق نے پوچھا ''کیوں کیسی لگی؟''

''مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا۔'' جمال نے جواب دیا۔

''اسے ایک پیگ اور دے مشتاق۔'' مکینک بولا ''کشمیر سے سیبوں کا رس پی کے آیا ہے۔ ایک پیگ سے اس کا کیا بگڑے گا۔''

مشتاق نے تین گلاس بھرے اور اب کے جمال کا گلاس بھی برابر کا بھرا۔ مشتاق نے کہا ''چوس چوس کے پی۔ یہ شربت نہیں ہے۔ شراب ہے۔''

ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگا۔ جمال کو لگا کہ بازار کی روشنیاں کچھ مدھم ہو کر آپس میں گڈمڈ ہو رہی ہیں اور چاند اچانک کچھ بڑا ہو گیا ہے۔ اس نے معصومیت سے کہا ''مجھے خیال نہ تھا کہ جہلم میں چاند اتنا بڑا ہوتا ہے۔''

اس پر دونوں پراسرار طریقے سے ہنسنے لگے۔ پھر مشتاق بولا ''شاباش میرے شیر۔ جہلم کا چاند نہ صرف بڑا ہوتا ہے بلکہ کبھی کبھار زمین پر اتر کر کھڑکی سے جھانکنے بھی لگتا ہے تو پیگ تو ختم کر پہلے۔''

جمال کو شبہ ہوا کہ مجھے نشہ ہو رہا ہے۔ اس نے چوکنا رہنے کا عزم کر لیا۔

تینوں نے گلاس پھر ٹکرائے۔

''یہ میرا بھانجا ہے۔'' مشتاق نے کہا ''میرا سب سے پکا دوست بھی ہے مگر بہت شریف ہے بیچارہ۔''

''میں بالکل شریف نہیں۔'' جمال نے احتجاج کیا۔

''ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔'' مکینک نے جواب دیا۔ ''جھاڑ سے سبھی کچے اترتے ہیں پال پر پکیں گے تو میٹھے ہوں گے۔''

''میں جھاڑ سے کچا نہیں اترا۔'' جمال نے کہا۔

''ثابت کر۔'' مشتاق بولا۔ ''سنا کوئی کارنامہ۔''

مگر جمال کے پاس سنانے کو کوئی کارنامہ نہ تھا۔ ایک مرتبہ وہ معمولی بلمین لے کر دوستوں کے ہمراہ پہاڑ پر جنگلی ریچھوں کا شکار کرنے گیا تھا مگر خالی ہاتھ لوٹ آیا۔ یہ تو کوئی کارنامہ نہ ہوا۔ سوچ سوچ کر اس نے کہا ''میں نے ایک لڑکی پھنسائی تھی۔''

''پوری بات سنا۔'' مشتاق نے چوتھا پیگ بناتے ہوئے کہا۔

''پھر کیا ہوا؟''

''میں نے زدنی کو پھنسا لیا تھا۔ وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔''

''ارے واہ رے میرے شیر۔'' مکینک بولا ''میں نہ کہتا تھا بچہ کشمیر کے سیبوں پر پلا ہے۔''

''پھر کیا ہوا۔'' مشتاق نے اشتیاق سے پوچھا۔

''میں نے اس کا منہ چوم لیا تھا ایک دن۔ دسویں میں تھا اس وقت۔'' جمال شرما کر بولا۔

''ارے واہ رے میرے شیر۔'' مکینک بولا۔ ''اتنی چھوٹی سی عمر میں؟''

''واہ واہ۔'' مشتاق نے داد دی۔ ''آگے چل۔''

مگر آگے تو بات ختم ہو چکی تھی اور یہی جمال نے کہہ دیا۔

''چچ چچ چچ چچ۔'' مشتاق اور مکینک حسرت سے بولے۔ پیگ پی کر مشتاق نے کہا ''بات تو یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ جہاں تم نے ختم کر دی۔''

''بچہ ہے ابھی کہا نا!'' مکینک نے مشتاق کو سمجھایا ''اتنی چھوٹی عمر میں اتنا اچھا سٹارٹ لے کر آگے بس؟''

مشتاق کو اس پر بڑا افسوس ہوا۔

مگر آگے تو جمال نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ آگے کی بات خطرناک لگتی تھی مگر اب وہ اپنی شرمندگی کو کس طرح چھپائے! ''آگے کی بات کا وقت ہی نہ ملا۔'' جمال نے کہا ''ہم نے مکان بدل لیا تھا۔''

''اوہو۔'' مشتاق نے کہا مگر کشمیر میں سیبوں کی تو کمی نہیں ہوتی۔'' کیا تم بن چکھے ہی جوان ہو گئے؟''

جمال نے سر جھکا کر کہا ''میں نے کوئی سیب چکھا تو نہیں۔''

''بچہ ہے مشتاق۔ جوان ہو جائے گا۔'' مکینک نے کہا۔

''ہو جائے گا۔'' مشتاق بولا ''جوان کرنا پڑے گا اسے۔'' اور اس پر دونوں مطمئن ہو کر ہنسنے لگے۔

سارے جگ میں خوشی کی پھوار پڑنے لگی۔ جمال کا دل چاہتا تھا کہ میں ہنستا چلا جاؤں۔ اس کے ہاتھ پیر بہت ہلکے ہو گئے تھے۔ زندگی خوبصورت تھی اور وہ ہلکے ہلکے کرسی پر جھول رہا تھا۔

مشتاق نے اسے دیکھ کر کہا ''اب ہوئی نا بات لے اب بس۔ تیرے لیے تین پیگ بہت ہیں۔''

پھر وہ جام بھر بھر کر پینے اور کباب کھانے میں لگ گئے۔ جب وہ اٹھے تو بوتل میں تھوڑی سی باقی تھی۔ مشتاق نے جمال کو کرسی سے اٹھایا اور اس کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر آہستہ آہستہ گھر کو چلا۔ جمال کو اس کے سہارے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اپنے قدموں سے چل سکتا تھا اور یہ سوچ کر اسے خیال آیا کہ شراب میں ایسی کوئی خرابی نہیں۔ خواہ مخواہ میرے ابا نے عمر بھر اس کی برائیاں کرتے گزار دی۔ پھر اس نے زدنی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ پتہ نہیں اب وہ کیسی ہوگی۔ مجھے یاد بھی کرتی ہے یا نہیں۔ میں نے سخت حماقت کی جو اسے یوں چھوڑ دیا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ میری محبت میں تڑپتی ہو۔

گھر پہنچ کر بھی اس پر ندامت طاری رہی۔

## شراب اور بھینس

مشتاق کی بیوی جمال کی صورت دیکھتے ہی بھانپ گئی۔ اس نے منہ بنا کر کہا ''کر دیا نا اس معصوم کا بھی بیڑا غرق؟''

مشتاق فاتحانہ بولا ''جوانی ہوتی ہی بیڑا غرق کرنے کے لیے ہے اے نازنین!''

جمال کچھ شرمندہ ہوا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں مامی جی۔ مجھے تو نشہ وغیرہ کچھ ہوا نہیں۔''

''اسے تو کچھ بھی نہیں ہوا'' مشتاق سنجیدگی سے بولا۔ ''مگر نکڑ پر بندھی ہوئی بھینس کو جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ گوجر بیچارہ اس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوگا۔''

''بھینس؟ کون سی بھینس؟'' مشتاق کی بیوی نے پوچھا۔

''ایک بھینس رسہ تڑا کر بھاگی تو تھی۔'' جمال نے کہا ''مگر میں تو ایک طرف ہٹ گیا تھا۔''

''جب ہم واپس آ رہے تھے تو بھینس بیٹھی جگالی کر رہی تھی۔'' مشتاق نے کہانی سنانے کے انداز میں کہا۔ ''جمال چلتے چلتے اس پر چڑھ گیا۔ وہ رسہ تڑوا کر نہ بھاگتی تو کیا کرتی۔ میرے خیال میں جمال کافی سرور میں ہے۔ اس کے سونے کا انتظام کر پیاری۔''

''نہیں ماموں میں سونا نہیں چاہتا ابھی۔ اندھیرے کی وجہ سے مجھے بھینس نظر نہ آئی۔ میں نشے میں نہیں تھا۔''

''تو چل پھر بیٹھک میں۔ ذرا راگ رنگ ہو جائے۔''

مشتاق نے ہارمونیم نکالا اور ہلکے ہلکے گنگنانے لگا۔ مکھ موڑ موڑ مسکات جات!

اچانک زدنی بیٹھک کی کھلی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی اور جمال کو دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگی۔ اس کے ہونٹوں کے کونے نئے چاند کی طرح ٹھنڈی ٹھنڈی لو دینے لگے۔ کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ جمال کا جی چاہا کہ میں ایک پیگ اور پیوں مگر اس خیال سے کہ زدنی برا مان جائے گی۔ وہ خاموش رہا۔

اک چھبیلی نار کرت سولہ سنگار

مکھ موڑ موڑ مسکات جات

مشتاق نے انترہ اٹھایا

پندرہ بیس روز اسی طرح دن عید اور شب برات میں گزر گئے۔ پھر خواجہ یٰسین کی چٹھی آ گئی کہ مجھے لاہور کے ایک سکول میں نوکری مل گئی ہے اور میں ہفتے دس دن میں نور پور پہنچ جاؤں گا۔ جمال کو حکم تھا کہ میرے ایک ڈپٹی سیکریٹری دوست نے تمہاری نوکری کا انتظام کر دیا ہے اس لیے دہلی جانے کی تیاری کرو۔

خواجہ یٰسین نے استعفیٰ دینے کے بعد اپنی موہوم سی داڑھی مونڈ کر لفافے میں صدر مجلس اسلامیہ کو بھیج دی جو انہوں نے نوکری بچانے کے لیے مجبوراً رکھی تھی۔ انہوں نے اپنی سنجیدہ اور متین زندگی میں غالباً یہی ایک مذاق کیا تھا۔ یہ مولوی کمال کے لوگ ہوتے ہیں۔ اچھے بھلوں کو مسخرے پن پر مجبور کر دیتے ہیں!

## دہلی چلو

جمال دہلی جانے کے خیال سے بہت خوش تھا۔ نور پور میں اسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ عارفہ ڈاکو' شیرا بودم اور بکا لنگڑ بگڑ چھوٹے موٹے کاروباروں میں لگ گئے تھے۔ عارفہ ڈاکو زندگی کی مشقت سے بچنے کے لیے درود و صلوٰۃ کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ رہا فدا محمد تو وہ لاہور میں کہیں ٹائپسٹ تھا مگر وہ ارادہ مند آدمی نکلا۔ اس میں کچھ بن کر دکھانے کی بے پناہ طاقت تھی۔ وہ اچھے کپڑے پہننے' روزانہ شیو کرنے اور بالوں میں گھنگھر وڈالنے کا شوقین تھا۔ وہ اپنی پتلون پر روزانہ استری کرتا تھا۔

فدا محمد کو جمال کے جہلم آنے کی خبر تھی اور دہلی جانے کی خوشخبری اسنے اسے سنا دی۔ انہیں ملے ہوئے ایک برس گزر چکا تھا اور ان کے پاس کرنے کی بہت سی باتیں جمع تھیں۔

مگر فدا محمد بہت مصروف بھی تھا' دن بھر وہ سرکاری چٹھیاں ٹائپ کرتا اور رات کو اپنی کرائے کی کوٹھڑی میں منشی فاضل کی تیاری کرتا۔ وہ بی اے کرنا چاہتا تھا اور منشی فاضل کے بعد انگریزی ایف اے اور پھر بی اے پاس کیا جا سکتا تھا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ حسن و عشق میں اس نے دلچسپی چھوڑ دی تھی۔ نور جہاں کے ہاں اس کا آنا جانا جاری تھا۔ اگرچہ بات ابھی تک گرم آنسوؤں اور سرد آہوں پر رکی ہوئی تھی۔

فدا محمد جمال کے دہلی جانے پر بہت خوش ہوا۔ اب وہ ہر عید پر نور پور آ سکتا تھا۔ خرچے کرائے کی کوئی تنگی اب اس کا راستہ نہ روکتی تھی۔

مشتاق بھی بیکار تھا۔ جمال کی والدہ نے اس کی سفارش کی تو خواجہ یٰسین نے اپنے دوست کو اس کی مدد کرنے کی بھی بات کر لی۔ بابر لین میں ڈپٹی سیکریٹری امتیاز کی کوٹھی کا نمبر دونوں نے زبانی یاد کر لیا۔

## جی ایچ کیو

جمال اور مشتاق کو نوکری دلانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ جنگ زوروں پر تھی۔ محکمے کھل رہے تھے' کلرکوں کی بھرتی جاری تھی۔ امتیاز نے انہیں راستہ دکھا دیا۔ جمال کے لیے اس نے اپنا سرونٹ کوارٹر کھلوا دیا۔ مشتاق نے اپنے ایک دور کے رشتہ دار کے برآمدے میں بستر لگا لیا۔ بھرتی تو وہ فوراً ہو گئے مگر ڈیوٹی دینے سے پہلے انہیں ایک سکول میں ٹریننگ لینی تھی۔ استادوں میں انگریز بھی تھے اور ہندوستانی بھی' مگر انگریزوں کی انگریزی جمال کی سمجھ میں نہ آتی تھی اور اسے فیل ہو جانے کے خوف نے گھیر لیا تھا۔ ملک میں ہندو مسلمان تقسیم ہو چکے تھے۔ کوئی مسلمان کسی ہندو کی اور کوئی ہندو کسی مسلمان کی مدد کرنے پر تیار نہ تھا مگر جمال بڑا آزاد خیال' انسان دوست اور ہمدرد آدمی تھا اور اگرچہ اسے پتہ تھا کہ ہندو ہم مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں اسے ہندو ساتھیوں سے کوئی بیر نہ تھا۔ بعض اوقات وہ ان کی بے جا امداد بھی کر دیتا تھا۔ دہلی میں اس نے جتنے بھی دوست بنائے ان میں زیادہ تر پنجابی ہندو تھے۔

## مہربان استاد

ایک ہندو استاد جمال پر خاص مہربان تھا۔ جب اس کو پتہ چلا کہ انگریز انسٹرکٹر کی انگریزی اس کی سمجھ میں نہیں آتی تو اس نے اسے ایک راز کی بات بتا دی۔ اس نے کہا کہ سکول کا سپرنٹنڈنٹ ایک مسلمان صدیقی ہے جو دہلی کا رہنے والا ہے مگر مسلمانوں کی مدد کرتا ہے۔ چاہے وہ پنجابی ہی کیوں نہ ہوں۔ تم اس کے

پاس جاؤ اور اسے کہو کہ تمہیں وہ پرچہ نکلوا دے جو امتحان میں تمہیں حل کرنا پڑے گا۔ یہ پرچہ لے کر تم رات کو میرے پاس آ جانا۔ میں تمہیں حل کروا دوں گا اور تم اے گریڈ میں بھرتی ہو جاؤ گے مگر اس بات کا کسی کو پتہ نہ چلے' چاہے وہ تمہارا کیسا ہی پیارا دوست کیوں نہ ہو اور یہ بات بعد میں بھی تمہارے منہ سے نہ نکلے کہ پرچہ تمہیں میں نے حل کروایا ہے۔

جمال صدیقی صاحب کو جانتا نہ تھا مگر وہ مہربان آدمی تھے۔ انہوں نے جمال کو وہ پرچہ دے دیا' جو امتحان میں اسے حل کرنا تھا۔

جمال رات کو پرچہ بغل میں دبائے اپنے محسن کے گھر جا پہنچا۔ وہ چھپ چھپا کر اندر داخل ہوا کیونکہ ڈرتا تھا کہ راز نہ کھل جائے اور لالہ جی کی نوکری خطرے میں نہ پڑ جائے۔ ویسے بھی اسے کہہ دیا گیا تھا کہ اس بات کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونی چاہیے۔

اندر داخل ہوتے ہی لالہ جی نے پوچھا ''کہو کامیابی ہوئی؟''

جمال نے کہا ''جی ہاں۔''

''کسی کو پتہ تو نہیں لگا؟''

''کسی کو نہیں جی۔''

''لگنا بھی نہیں چاہیے۔ تم ڈرائنگ روم میں بیٹھو' میں ذرا دھوتی بدل لوں۔''

لالہ جی دھوتی بدل کے آئے تو ان کے پیچھے پیچھے پانچ ہندو لڑکے جو جمال کے ہم جماعت تھے' کمرے میں داخل ہوئے۔

لالہ جی نے کھسیانے ہو کر کہا ''یہ کسی سے بات نہیں کریں گے۔ میں نے ان کو بھی بلوا لیا کیونکہ یہ غریب لڑکے ہیں۔ یہ بھی تمہارے طفیل اے گریڈ لے سکیں گے۔''

جمال کو جھٹکا سا لگا۔ لالہ جی نے ایک مسلمان کو تو فائدہ پہنچا دیا مگر اس کے ذریعے پانچ ہندو لڑکوں کو بھی اے گریڈ دلوا دیا۔ صدیقی صاحب کی سکیم انہوں نے ایک ہی وار میں فیل کر دی اور یہ تھی ہندو ذہنیت' جس نے ہندوستانی قوم پرستی کی جڑھ لگنے نہ دی۔

## جامع مسجد کی سیڑھیاں

مشتاق اور جمال سکول سے فارغ ہو کر جامع مسجد کی طرف سیر کو نکل جاتے جہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔

سامنے کے کھلے میدان میں جس میں اگلے وقتوں میں مغل امراء کے محلات ہوتے تھے اور جن پر انگریزوں نے 1857ء میں ہل پھروا دیا تھا اب پتنگ بازی ہوتی تھی یا پھولوں کے گجرے بکتے تھے۔ یہاں کی سیر دیکھنے کے بعد جمال اور مشتاق مسجد کی بغل میں مسیتا کبابی کے کھوکھے پر گرم گرم کباب کھاتے۔ خوانچے والوں کے دلچسپ آوازے سنتے اور ٹہلتے ٹہلتے شاہی مسجد کی سیڑھیوں کی طرف بڑھتے جن پر ٹھنڈی ٹھار قلفیاں بکتی تھیں۔

ہجوم میں لولے' لنگڑے اور فقیر' میلے برقعوں میں کھلے چہروں والی بھکارنیں جن کے بالوں کی لٹیں ان کے گالوں پر لٹکتیں اور یتیم خانوں کے لیے چندہ مانگنے والے چھوٹی چھوٹی داڑھیوں' دو پلی ٹوپیوں اور لنگی پہننے والے مولوی شور مچاتے تو کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔

ایک میلی بھکارن نے لٹ کو جھٹکا دے کر جمال سے کہا ''اللہ! ہمیں بھی ایک قلفی دلوا دیجیے۔''

بھکارن جوان تھی۔ رنگ سانولا' ناک موٹی' دانت ہموار اور آنکھیں کاجل کی لکیر سے دور تک کھنچی ہوئی اس کی آواز میں ایک خاص قسم کی کھنک تھی۔

جمال نے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹاتے ہوئے کہا ''معاف کر مائی۔''

''اللہ کیا ہم مائی ہیں؟ ایک نظر دیکھ تو لیجیے ہماری طرف۔''

جمال گھبرا گیا۔

''دور ہٹ حرام جادی۔'' قلفی والا بولا۔ ''دکنداری کھراب کرتی ہے۔''

''بات کرتے ہیں میاں چھکن۔'' وہ تلخی سے بولی۔ ''آپ کے باوا کا کیا جاتا ہے بلکہ آپ ہماری دکنداری کھراب کرتے ہیں۔'' پھر جمال سے مخاطب ہو کر آہستہ سے بولی ''کھولی ہے ہمارے پاس۔''

جمال چپ رہا۔ مشتاق بولا ''کیا لوگی شہزادی؟''

''ایک کے بیس روپے دلوا دیجیے۔ اللہ قسم یاد کرو گے۔ دونوں کے پینتیس روپے۔ پانچ روپے چھوڑے دیتے ہیں۔''

''بہت زیادہ ہیں۔'' مشتاق نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

''بیس روپے دونوں کے۔'' وہ بولی۔

مشتاق نے سر ہلا کر کہا ''دس روپے دونوں کے۔''

اس نے بیزاری سے کہا ''اب ہم کیا کہیں میاں' کچھ شرافت کی بات کرو۔ خدا سے ڈرو۔''

مشتاق نے منہ پھیر لیا۔ کچھ دیر وہ یونہی تنی کھڑی رہی پھر بولی ''ہمارا دل تو آپ نے توڑ ہی دیا۔ لے اب پیچھے پیچھے آ جائیے۔ دس روپے ہی سہی۔''

جمال نے بے چین ہو کر کہا ''مگر کیوں تمہارے پیچھے پیچھے کیوں؟''

مشتاق نے اس کا ہاتھ دبایا اور قلفی کھاتے ہوئے بولا ''آج نہیں حسینہ کل۔''

لڑکی نے غصے سے پیر زمین پر مارا اور بڑبڑاتی ہوئی ہجوم میں غائب ہو گئی۔

''رنڈی تھی۔'' مشتاق نے جمال کو بتایا۔

''مگر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر۔ خدا سے نہیں ڈرتے یہ لوگ۔''

''ڈرتے ہیں، بہت ڈرتے ہیں۔'' مشتاق دانائی سے بولا ''مگر کیا جامع مسجد کی سیڑھیوں پر لوگوں کو بھوک نہیں لگتی؟ تو ان باتوں میں نہ پڑ۔ قلفی کھا اور خدا کی خدائی کا تماشہ دیکھ۔''

جمال خدا کے خوف سے کانپنے لگا۔ پھر بولا ''اس کا غضب ٹوٹے گا ایک دن۔''

''ہاں ٹوٹے گا۔ ضرور ٹوٹے گا مگر اس میں سبھی بہہ جائیں گے کیا نیک کیا بد۔ ہم تم دونوں......''

اتنے میں وہی لڑکی پھر آ کھڑی ہوئی اور اِٹھلا کر بولی ''کل ضرور آ جائیو اسی وقت۔ ہم تمہاری راہ دیکھیں گے۔''

مشتاق نے جواب دیا۔ ''ضرور اسی وقت۔''

''اور اب ایک قلفی تو دلوا دیجیے۔ صبح سے پیٹ میں کچھ گیا نہیں۔''

مشتاق نے اسے ایک قلفی دلوا دی اور دونوں ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ اچانک مشتاق نے جمال کی گردن میں بانہیں ڈال کر کہا ''ایک بات پلے باندھ کر رکھنا یار۔''

''کون سی بات؟'' جمال نے پوچھا۔

''سب طرف جانا۔ ایک طرف نہ جانا کبھی۔''

''کس طرف؟''

''رنڈی کی طرف کبھی نہ جانا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔''

''توبہ توبہ کبھی نہیں۔''

پھر مشتاق نے رنڈی کے پاس جانے کے خطرات پر جمال کو ایک طویل لیکچر دیا۔

## باب 6

اگر جنگ بیس پچیس سال چلتی تو جمال یقیناً ڈپٹی سیکریٹری ہو کر اپنے ابا کی آرزو کو پورا کرتا مگر فی الحال وہ کلرک ہی بھرتی ہو سکا تھا۔

مشتاق نے پنجاب کے محکمہ تعلیم میں پی ٹی کی نوکری کی درخواست دے رکھی تھی۔ وہ کلرکی سے نفرت کرتا تھا۔ اسے چٹھی مل گئی تو وہ جمال کو زندگی گزارنے کے بھید بتا کر لاہور چلا گیا۔

### سول وار

درگا داس رائے پوری نے بھی جمال کے ساتھ ہی اے گریڈ لیا تھا مگر وہ ہر وقت خشمگیں رہتا۔ اس کے سیکشن کے سارے کلرک ہندو تھے اور درگا داس کے اشاروں پر چلتے تھے۔ جمال کو معلوم ہو گیا کہ وہ کسی تشدد پسند ہندو تنظیم سے منسلک ہے اور مسلمانوں سے نفرت کرتا ہے۔ جمال اسے کوئی اہمیت نہ دیتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ قائداعظم سب کو ٹھیک کر لیں گے۔ اگرچہ اسے ہندوستان کی سیاست کا کچھ پتہ نہ تھا۔

جمال نے کہیں سے سول وار کی ترکیب سن لی تھی۔ اسے اس کے معنی معلوم نہ تھے مگر اس نے اعلان نشر کرنا شروع کر دیا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد ہندوستان میں سول وار ہو گی۔ اس کا مقصد درگا داس کو چڑانے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔

سول وار کی پیش گوئی اس نے کینٹین میں بیٹھے ہوئے ایک انگریز افسر کے سامنے بھی کر دی۔ اس نے ایک بیرے کے ذریعے جمال کو بلوایا۔ اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پیش کی اور مسکراتے ہوئے بولا ''ینگ مین! تمہارے خیال میں ہمارے جانے کے بعد ہندوستان میں سول وار ہو گی؟''

جمال نے میز پر مکا مار کر کہا ''ہو گی اور ضرور ہو گی۔''

انگریز فوجی بولا ''ہم تو چلے ہی جائیں گے جنگ کے بعد مگر ہندوستان کا کیا بنے گا۔ یہ بھی سوچا ہے تم نے؟''

''جو بھی بنے۔ ہم ماریں گے ہندوؤں کو۔''

''ہندوستانیوں کو مل جل کر رہنا چاہیے۔ ہندوستان متحد ہو کر کتنی بڑی طاقت بن سکتا ہے، جانتے

ہو؟ کیا تم نہیں چاہتے کہ دنیا کے بڑے بڑے فیصلے دہلی میں ہوں؟''

یہ بات جمال کو اچھی لگی مگر اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں مسلمانوں کے خدشات کو کس طرح بیان کروں۔ اس نے کہا ''ہم تو پاکستان لے کے رہیں گے، پھر چاہے دنیا کے بڑے بڑے فیصلے دہلی ہی میں ہوں۔''

اگر انگریز پوچھ بیٹھتا کہ پاکستان کیسے بنے گا تو جمال جواب نہ دے سکتا تھا۔ اس کو پاکستان کے جغرافیے کا بھی کچھ پتہ نہ تھا۔ مسلمانوں نے سوچنے کا کام محمد علی جناح پر چھوڑ رکھا تھا۔

انگریز فوجی کا خیال تھا کہ جمال بہت باخبر آدمی ہے۔ نڈر اور پرجوش ہے۔ اس نے کہا ''آزاد ہندوستان کو تم جیسے نوجوانوں کی بہت ضرورت ہوگی۔''

''پاکستان کو بھی ہوگی۔'' جمال نے بات کاٹی۔

''پاکستان کو بھی ہوگی اگر یہ کبھی بنا۔'' انگریز فوجی نے کہا ''مگر پہلا کام تو جنگ جیتنا ہے۔ جرمنوں کو شکست دینا ہے۔ میں تم جیسے پرجوش نوجوانوں کو بہت پسند کرتا ہوں۔ تم کہاں کام کرتے ہو؟''

جمال نے بنا سوچے سمجھے اپنے دفتر کا پتہ لکھوا دیا۔

## پیشی

اگلی صبح اس کے افسر نے اسے حکم دیا کہ تم فلاں دفتر میں جا کر کرنل کلرائے کے سامنے پیش ہو جاؤ۔ ضرور تم نے کوئی غلط بات کی ہے۔

کرنل کلرائے کا دفتر ساؤتھ بلاک کے ایک چھوٹے سے کمرے میں قائم تھا۔ کچھ ہندوستانی افسر بھی اس کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کے چہروں پر خشونت چھائی ہوئی تھی مگر کرنل کلرائے کا چہرہ نرم اور شفیق تھا۔ وہ مسکرا کر بولا ''یہی وہ ینگ مین ہے۔''

میجر دربار خان نے گھور کر اسے دیکھا اور منہ ٹیڑھا کر کے کہا ''لکس لائیک اے مین...... لکس آل رائٹ......''

میجر پشوارا سنگھ نے دانت نکال کر کہا ''منڈا ٹھیک ٹھاک ہے جی۔''

جب کرنل کلرائے جمال، اس کے تعلیمی پس منظر اور اس کے خاندان کے بارے میں پوچھ چکا تو میجر دربار خان بولا ''کوئی کھیل ویل بھی کھیل سکتے ہو؟''

''میں کرکٹ کا کپتان تھا اور آل انڈیا ٹیم کے ساتھ کھیل چکا ہوں۔ آپ بھی کچھ کھیلتے ہیں یا خالی وردی ہی ہیں میجر صاحب؟''

جمال کو ماتحتی کے آداب نہ آتے تھے۔ وردی کی رعونت اور اس کے اندر کی ناتوانی کا اسے کوئی اندازہ نہ تھا۔

میجر دربار خان کی بھنویں تن گئیں۔ آنکھیں لال ہو گئیں۔ کرنل کلرائے ہنس دیا اور اسے ہنستے دیکھ کر میجر پشوارا سنگھ نے پنجابی میں کہا ''منڈا چست لگدا اے۔ کھڑکو گا دربار خان!''

کلرائے بولا ''میں نہ کہتا تھا بڑا شوخ نوجوان ہے۔ بے دھڑک بات کرتا ہے۔''

میجر دربار خان کا چہرہ ڈھیلا پڑ گیا۔ بولا ''ہاں میں بھی کھیلتا ہوں ٹینس ینگ مین۔ تمہیں افسروں سے بات کرنے کی تامیز نہیں۔ (تامیز یعنی تمیز)''

وہ اردو بھی خالص ثامی لہجے میں بولتا تھا۔

''خالی اوقات میں کیا کرتے ہو؟'' کرنل کلرائے نے پوچھا۔

''خالی اوقات میں شعر کہتا ہوں۔''

جمال نے شروع شروع میں شعر کہے تھے مگر گھٹیا۔ اب اس نے شاعر ہونے کی لاف مار دی۔

''وری گڈ۔'' کلرائے بولا۔ ''دربار خان ہمارے سیٹ اپ میں ایک پوسٹ پوئٹ کی بھی ہے۔ اسے پوئٹ اپوائنٹ کر لو، پھر دیکھیں گے۔''

## پوئٹ

جمال جب کرنل کلرائے کے دفتر سے نکلا تو اس کے ہاتھ میں پوئٹ کی ملازمت کا پروانہ تھا۔ اس کی پوسٹنگ جالندھر میں تھی جہاں کلرائے کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

یہ ایک نیا محکمہ تھا اور اس کا کام تھا ناچ گانے کے ٹروپ لے کر گاؤں گاؤں جانا اور مقامی جاگیرداروں، مولویوں اور پنڈتوں کی وساطت سے کسان بچوں کو فوج میں بھرتی کروانا۔ اس خدمت کے بدلے مولویوں اور پنڈتوں کو دو روپے فی کس ملتے تھے۔ جاگیرداروں کو اگر وہ زیادہ بھرتی دلوا سکیں تو نہری اراضی کے مربعے اس کے علاوہ......

کرنل کلرائے پنجابی کا سکالر تھا۔ اس نے سکھ رجمنٹوں میں عمر گزاری تھی۔ گرنتھ صاحب پڑھی تھی اور گورمکھی لٹریچر سے اچھی طرح واقف تھا۔ دراصل وہ برطانوی انٹیلی جنس کا آدمی تھا اور اس محکمے کی اوٹ میں اس کو اکالیوں سے آگے کے سیاسی معاملات طے کرنے تھے جن کی ہدایت اسے وائسرائے کے دفتر سے براہ راست ملتی تھی۔ جمال کو یہ باتیں آہستہ آہستہ ہی معلوم ہوئیں۔

تھوڑے دنوں کے بعد کرنل کلرائے کا سٹاف جالندھر پہنچ گیا اور نوہری سیٹھ کی کوٹھی میں اس کا دفتر کھلا۔ نوہری سیٹھ نے کرایہ نہ لیا۔ اس کے بدلے جالندھر ضلع کے لیے راشن کے کپڑے اور چینی کی تقسیم کا ڈپو اسے عطا ہو گیا۔ وہ ایک موٹا اور نیک دل ساہوکار تھا۔ سود بیاج کے کاروبار کی بات دوسری ہے مگر وہ ہر شام پانچ روپے کے پیسے یتیموں اور بیواؤں میں اپنے ہاتھ سے بانٹتا اور اس معاملے میں ہندو مسلمان کی تفریق نہ کرتا تھا۔ وہ ہر روز کھادی کے نئے کپڑے پہنتا مگر وہ کانگریسی نہ تھا کیونکہ کانگریسی سرکاری طور پر جنگ میں

انگریزوں کا ساتھ نہ دیتے تھے۔

کوٹھی کے عقب میں نوکروں کے کمرے تھے۔ ان میں سے ایک جمال کو بھی مل گیا۔ باقی سب ملازم ہندو تھے۔ وہ بھی وہیں رہ گئے۔ شرط یہ تھی کہ کوٹھی کی حدود میں کوئی ماس نہ پکائے ماسوائے کرنل کلرائے۔ وہ کوٹھی کے اندر بھی گائے کا گوشت پکوا سکتا تھا اور علاقے کے سردار صاحبان سور کا شکار تحفے میں بھیجتے تو وہ بھی کھا سکتا تھا۔ اس سے نوہری سیٹھ کا دھرم بھرشٹ نہ ہوتا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد کلکتے اور اڑیسے سے چالیس پچاس بنگالی لڑکیاں اور پچاس ساٹھ مرد آ گئے۔ یہ لوگ رقاص اور سازندے تھے اور کچھ ان کے گورو۔ ان کے لیے علیحدہ کوٹھی لے لی گئی۔ یہ طائفہ دیہاتیوں کی تفریح کے لیے لایا گیا تھا۔

شروع شروع میں جالندھر میں کرنے کو کوئی کام نہ تھا۔ ہندوؤں کو جمال کا مسلمان ہونا بہت کھلتا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ اسے نکلوا دیا جائے مگر چونکہ وہ کوئی کام بھی نہ کرتا تھا اس سے کوئی غلطی بھی نہ ہوتی تھی جس کی پاداش میں اسے برطرف کروایا جا سکتا مگر شیاما پرشادا کاؤنٹنٹ اس پر کڑی نگاہ رکھتا تھا۔

شیاما پرشاد کلرائے کا منہ چڑھا تھا۔ اس نے اس سے کہا کہ جمال کی پوسٹ سرپلس ہے، کیوں نہ اسے کسی اور شعبے میں تبدیل کر دیا جائے اور اس کی پوسٹ ختم کر دی جائے۔

کلرائے نہایت مکار اور چالاک آدمی تھا۔ جمال سے اور ہندوستان کے مسلمانوں سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے جمال کو صرف اس لیے ملازم رکھا تھا کہ کوئی یہ نہ کہے کہ کلرائے کے دفتر میں کوئی مسلمان نہیں ہے۔ جمال کو اس نے ایک نادان اور ناتجربہ کار نوجوان سمجھ کر بھرتی کیا تھا جسے کسی بھید کا پتہ ہی نہ چل سکتا تھا۔ شیاما پرشاد نے نوٹ بھیجا تو کرنل کلرائے نے اسے ڈانس گروپ کے ساتھ نتھی کر دیا کہ پروگرام کا تعارف لچھے دار الفاظ میں کرے گا کیونکہ شاعر آدمی ہے۔

نہائے دھوئے داڑھیوں پر ڈھاٹے باندھے موٹے اور لمبے چوڑے اکالی سکھ کرنل کلرائے کے دفتر میں گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ پھر کانفیڈنشل چٹھیاں ٹائپ ہوتیں جنہیں اس کی انگریز سٹینوگرافر خود ڈاک خانے کے ڈبے میں ڈالتی۔

وہ رات کو چھت پر کرنل کلرائے کے ساتھ ہی سوتی تھی کیونکہ گرمی بہت تھی۔ سب لوگ اس بات کا مزہ لیتے تھے مگر کوئی منہ سے کچھ نہ کہتا۔ دفتر میں اس کی مرضی کے بغیر پتہ بھی نہ ہل سکتا تھا۔

## اروناگھوش

بنگالی رقاصائیں بہت منحنی تھیں۔ دراصل وہ بھوک سے مری ہوئی تھیں۔ ان کے رنگ پیلے تھے جیسے برسوں کی بیمار ہوں۔ یہی حال لڑکوں کا تھا۔ وہ ایک دھوتی پر مکٹ سجا کر ناچتے تو ان کی پسلیاں گنی جا سکتیں۔ ان کی تنخواہیں چپڑاسیوں سے کچھ ہی زیادہ تھیں مگر وہ فنکار تھے۔ وہ دن بھر آپس میں لڑتے۔ رات کو شراب پیتے شام کو دال بھات کی تھالیاں دیکھ کر ان کے چہرے کچھ دیر کو کھل جاتے۔ ساتھ رہتے رہتے ان میں اپنے آپ جوڑے بن گئے اور رقابتیں بھی پیدا ہو گئیں۔ عورتیں عورتوں کے بال نوچتیں۔ مرد مردوں کے گریبان پھاڑتے مگر بات باہر نہ نکلتی۔

اروناگھوش اور طرح کی لڑکی تھی۔ خدوخال موزوں، جسم کی گولائیاں چست اور طبیعت طرح دار۔ وہ کسی کی پرواہ نہ کرتی اور کبھی کبھی کالی ناتھ بینر جی سے بھی اُکھڑ جاتی جس سے سارے بنگالی خم کھاتے تھے۔

کالی ناتھ بینر جی میوزک ڈائریکٹر تھا اور ہر وقت غصے میں بھرا رہتا مگر وہ اروناگھوش پر لٹو تھا اور بنگالی ہندوؤں کے رواج کے مطابق اس کے ساتھ مالکانہ سلوک کرتا تھا۔ باقی لڑکیاں اپنے چاہنے والوں کے مالکانہ سلوک کو نارمل سمجھتی تھیں اور بعض تو اپنی تنخواہیں بھی ان کے حوالے کر کے سارا مہینہ ان سے ٹکا ٹکا مانگ کر گزارہ کرتیں یا سب کچھ ان کے کپڑوں اور ان کی شراب پر خرچ کر دیتیں۔ نشے میں کبھی کبھی ان کے عاشق ان کی ٹھکائی بھی کر دیتے۔ پھر جب دال بھات کی تھالیاں لگ جاتیں تو وہ آنسو پونچھ کر کھانے اور کھلانے میں لگ جاتیں۔ یہ عورتیں شوہروں کے زاویئے سے دنیا کی بہترین عورتیں تھیں۔ یہ بھوکے اور یتیم بچوں کا ایک گروہ تھا جس کے بارے میں جنسی زاویئے سے کچھ سوچا ہی نہ جا سکتا تھا۔

مگر اروناگھوش کو اپنے عورت ہونے کا شعور تھا۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ جمال مجھے شوق بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

وہ ایک اچھی رقاصہ تھی۔ جمال کے ساتھ تھوڑی سی بے تکلفی کے بعد اس نے ریہرسل میں دلچسپی لینا چھوڑ دی تھا اور اس پر کالی ناتھ بینر جی کی آنکھیں کچھ اور سرخ رہنے لگیں۔ ایک دن اس نے اسے بہت مارا۔ اسے چڑانے کے خیال سے وہ جمال کو سینما لے گئی۔ جمال ہال میں اشارے سے بھی اس سے کوئی بات نہ کر سکا مگر اگلے روز اس نے بھری محفل میں جمال کو اور سب کو اپنے جسم کے ان حصوں پر جنہیں وہ ننگا کر سکتی تھی، پڑے ہوئے نیل دکھائے۔ کالی ناتھ بینر جی نے رات اسے بری طرح مارا تھا، اب وہ خاموش بیٹھا اروناگھوش کو گھورتا رہا۔ اچانک ارونا نے کہا ”جمال ہم تمہارا بات سمجھتا اور ہمارا من مانتا بھی مگر تم ہم سے شادی نہیں بنائے گا۔ کبھی نہیں بنائے گا۔ کالی ناتھ کی طرح مفت مزہ کرے گا ہمارے ساتھ، ہم جانتا۔“

جمال کا رنگ زرد ہو گیا۔ اس نے کہا ”ارونا میں نے تو تم سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔“

”تم منہ سے کچھ بولا نہیں مگر آنکھ سے بات کیا۔ تم بہت اچھا آدمی ہے، سندر بھی ہے۔ تم بھی ہم سے مفت مزہ کرے گا۔ ایسا ہو نہیں سکیں گے۔ کیسے ہو سکیں گا؟“

”کیسی بات کرتی ہو ارونا۔“ جمال نے گھبرا کر کہا۔

”اگر تم ہم سے شادی بنائیں گا تو ہم مسلمان ہو جائیں گا، ہم کو کسی کا پرواہ نہیں۔“

کالی ناتھ نے اپنی بڑی بانسری تھیلے سے نکالی۔

ارونا بولی ''ہم سالا کالی ناتھ سے نہیں ڈرتا۔ وہ ہم سے شادی نہیں بنائیں گا۔ مفت میں مارتا اور جھوٹ بولتا روج روج۔''

کالی ناتھ طیش میں آ کر اٹھا اور ارونا کو بالوں سے گھسیٹتے ہوئے کمرے میں لے گیا۔ جمال نے اسے چھڑانے کی کوشش کی تو ارونا نے کہا ''جمال تم ہٹ جاؤ، مار لینے دو سالے کو۔ ایک دن تھک جائیں گا۔'' کمرے سے کچھ دیر تک ارونا کے چیخنے کی آوازیں آتی رہیں۔ کالی ناتھ اس کو بانسری سے مار رہا تھا اور اسے بنگالی میں گالیاں دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے دروازہ بند کر لیا تو ارونا کی سسکیاں آہوں میں بدل گئیں۔ لڑکے اور لڑکیاں جو دروازے کے ساتھ کان لگائے کھڑے تھے، ایک ایک کر کے کھسک گئے۔

میجر دربار خاں جمال سے شروع ہی سے حقارت کا سلوک کرتا تھا مگر ایک دن مسز پریتو سنگھ جمال کو ساتھ لے گئی تو میجر دربار خان جمال کی جان کا دشمن ہو گیا۔

## مسز پریتو سنگھ

مسز پریتو سنگھ میجر اتم سنگھ ناگرہ کی بیوی تھی جو برما کے محاذ پر جاپانیوں سے لڑ رہا تھا۔ وہ اپنے دو بچوں کے ساتھ جالندھر میں رہتی تھی اور اپنے خاوند کے حوالے سے کرنل کلرائے کے دفتر آتی جاتی تھی۔ چھریرے بدن کی وہ چلبلی عورت انگریزی بولتی اور جالندھر جیسے شہر میں سائیکل چلاتی تھی۔ اس کا حسن اور اس کی شوخی چھپ نہ سکتی تھی اور اونچی محفلوں میں جو زیادہ تر فوجی افسروں تک محدود تھیں، اس کے لیے اٹیک پلان بنتے رہتے تھے۔ میجر دربار خان بھی اس محاذ پر اپنی توپوں کو آراستہ رکھتا تھا۔ وہ پینتالیس برس کا ایک مصنوعی آدمی تھا۔ اس نے کلرائے کو اپنی چرب زبانی، انگریز پرستی اور چاپلوسی سے شیشے میں اتار رکھا تھا۔ وہ اردو بھی ہندوستانی لہجے میں نہ بولتا۔ چینی کو چائنی اور نیکی کو نائیکی کہتا مگر کلرائے اس کے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ تھا۔ وہ اس کو اس خیال سے طرح دے جاتا تھا کہ راولپنڈی کا رہنے والا ہے اور بھرتی کے لیے جوان دلوا سکتا ہے۔

دربار خان کی پہلی بیوی فوت ہو چکی تھی جس سے ایک بیٹی جوان ہو رہی تھی۔ پھر اس کی کنواری بہن تھی جو اس کے ساتھ رہتی تھی۔ خود اس نے ایک نسبتاً جوان عورت کے ساتھ شادی کر رکھی تھی مگر وہ کوئی اولاد پیدا نہ کر سکی تھی۔ اس کا یہ چھوٹا سا پر نوچتا ہوا مرغی خانہ راولپنڈی میں رہتا تھا۔ میجر دربار خان جالندھر میں مسز پریتو سنگھ کا مورچہ سر کرنے میں لگا ہوا تھا۔

میجر دربار خان ایک بے وقوف آدمی تھا اور فوجی آدمی شہری مورچوں پر کبھی عقلمند ثابت نہیں ہوتے۔ اس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ فتوحات کے سلسلے میں پریتو سنگھ کے اپنے محاذ بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ ایک ہرنی تھی جو تعاقب کرنے والے کتوں کو تھکا سکتی تھی۔

پریتو سنگھ کو میجر دربار خان کے مسلمان ہونے پر اتنا اعتراض نہ تھا جتنا اس کے احمق ہونے پر۔ اس نے دربار خان کا قد فوراً ہی ناپ لیا اور دل لگی کی خاطر اس کی حوصلہ افزائی کرنے لگی۔ دربار خان سمجھا کہ میں نے خندق پار کر لی ہے، اب فقط جھنڈا گاڑنا باقی ہے۔

جمال جگہ کی قلت کی وجہ سے میجر دربار خان کے کمرے کے ایک کونے میں بیٹھا کرتا تھا۔ اس روز اس نے جمال کو خواہ مخواہ جھاڑ ڈالی۔ دفتر میں دوبارہ شیو کی اور کھود کھود کر کھونٹی نکالی۔ پھر چائے کا نیا سیٹ نکلوا کر گھڑی دیکھی۔ تین بجنے والے تھے۔ وہ کاغذات پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اس نے چپڑاسی کو بلوا کر حکم دیا کہ مسز پریتو سنگھ نظر آئے تو مجھے فوراً اطلاع دی جائے۔

تھوڑی دیر میں آہٹ ہوئی تو خوشبو کی ایک لپٹ نے اسے بتا دیا کہ پریتو سنگھ کمرے میں داخل ہو چکی ہے۔ چپڑاسی کو اس کی آمد کی اطلاع دینے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ میجر دربار خان اشتیاق سے کھڑا ہو گیا۔ کاغذات اس کے ہاتھ سے گر گئے۔

جمال نے آنکھ کے کونے سے پریتو پر نظر ڈالی۔ اس نے سفید ریشمی ساڑھی پر ہلکے گلابی رنگ کی کُرتی پہن رکھی تھی جو ناف کے اوپر ختم ہو جاتی تھی۔ نیچے اتریئے تو اس کی پتلی کمر کے نیچے بھرے بھرے کولہوں پر نظر رک جاتی تھی۔

''ہیلو دربار!'' اس نے بے تکلفی سے کہا۔

میجر دربار خان نے کتے کی طرح دانت نکال دیئے۔ ''بڑی بہار آ رہی ہے آج۔'' وہ بولا۔

''بہار مجھ پر نہیں۔ میرے جسم پر آ رہی ہے دربار۔'' پریتو ادا سے بولی۔ پھر اس نے جمال کی طرف دیکھ کر کہا ''جمال تم نے نہیں دیکھا میری طرف۔ دیکھو تو کیسی لگ رہی ہوں میں آج؟''

دربار خان جل کر بولا ''اسے کام کرنے دو مسز پریتو سنگھ۔ گیٹ آؤ جمال۔ چھٹی، چلو۔'' اس نے چٹکی بجا کر جمال کو کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کیا۔

''ٹھہرو جمال۔ مجھے تم سے کام ہے یار۔'' پریتو بولی۔

دربار خان حقارت سے ہنسا۔ ''اس سے کیا کام ہے تمہیں؟''

''مجھ سے کیا کام ہے مسز پریتو سنگھ؟'' جمال نے گھبرا کر پوچھا۔

''ٹھیک ہے میں اتم سنگھ کی بیوی ہوں اور میرا نام مسز پریتو سنگھ ہے مگر میرے دوست مجھے پریتو کہہ کر پکارتے ہیں۔ تم مجھے پریتو کہو جمال ڈارلنگ!''

جمال کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ پھر وہ بولی ''پریتو آج سینما دیکھنا چاہتی ہے اور سوان سانگ کے دو ٹکٹ لے کر آئی ہے۔''

دربار خان کی باچھیں کھل گئیں، بولا ''اسی لیے میں نے جیپ روک رکھی ہے پریتو جی۔''

''پریتو جی نہیں۔ مسز پریتو سنگھ میجر صاحب۔'' اس نے فہمائش کے انداز میں کہا۔ ''ہر شخص مجھے پریتو نہیں پکار سکتا اور جیپ کی مجھے ضرورت نہیں۔ سائیکل پر چلیں گے ہم دونوں۔''

''سائیکل پر؟'' میجر دربار خان خفیف ہو کر بولا۔ ''وردی پہن کر میں سائیکل پر نہیں بیٹھ سکتا۔ یہ ریگولیشنز کے خلاف ہے۔''

''ریگولیشنز کے خلاف ہے مگر جمال نے تو وردی نہیں پہنی ہوئی۔ وہ مجھے بٹھا لے گا سائیکل پر۔ جمال تم مجھے سائیکل پر بٹھا لو گے نا ڈارلنگ؟ تم جیسے بانکے سجیلے کے ساتھ بدنام ہونے میں بھی مزہ ہے۔''

''مسز پریتو سنگھ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میجر اتم سنگھ کی بیوی اور ایک معمولی شخص کے ساتھ سائیکل پر جائے؟''

دربار خان کے منہ سے تھوک کے فوارے نکلنے لگے۔ اس کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

پریتو سنگھ بولی ''کیا حرج ہے۔ آخر یہ کوئی پچاس برس کا بوڑھا بے وقوف نہیں جو دوسروں کی بیویوں پر ہاتھ پھیرتا ہو۔ بیس برس کا پٹھا ہے جس کے ہاتھ بالکل صاف ہیں۔ چلو جمال یار دیر ہو رہی ہے۔''

میجر دربار خان کی جیسے ماں مر گئی ہو۔ جمال کے ہاتھ پیر بھی ٹھنڈے ہو گئے مگر پریتو نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے گئی۔ ''بائی بائی میجر صاحب۔'' اس نے چبا چبا کر کہا۔

باہر آ کر جمال نے کہا ''اب وہ مجھے مار ہی ڈالے گا......''

وہ بولی ''اس کی مجال ہے جو تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔''

جمال نے کہا ''آپ نہیں جانتیں اسے۔ وہ بڑا کینہ پرور آدمی ہے۔''

''تم مجھے نہیں جانتے نا۔ میں اکالیوں سے کہہ دوں کہ ایک مسلمان افسر مجھ پر ہاتھ پھیرتا ہے تو پتہ ہے اس کا کیا حشر ہوگا؟ اس کو اچھی طرح پتہ ہے، تمہیں نہیں پتہ کچھ۔''

''مگر مسلمان تو میں بھی ہوں مسز پریتو سنگھ۔''

''تم مسلمان کہاں ہو۔ بانسری ہاتھ میں لے لو تو کنہیا لگو۔ تمہیں دیکھ کر گوپیاں کپڑے پھاڑ ڈالیں۔ ہرنیاں چوکڑی بھول جائیں۔ پر شکر ہے تمہیں کچھ پتہ نہیں۔ تم اپنے آپ کو مسلمان سمجھ کر خوش رہو۔ لے اب چل دو۔ میں سائیکل پر تمہارے آگے بیٹھوں گی۔''

جمال گھبرا گیا اور بولا ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں نے زندگی میں کسی جوان لڑکی کو سائیکل پر آگے نہیں بٹھایا۔ یہ خطرناک بات ہے۔''

''آج بٹھا لے پیارے۔ دیکھ تو سہی کیا ہوتا ہے۔ ویسے میں جوان لڑکی نہیں۔ جوان عورت ہوں گوروکی کرپا سے۔''

وہ سکھ عورت تھی اور سارا جالندھر اسے جانتا تھا۔ جمال کسی مصیبت میں پڑنا نہ چاہتا تھا۔ تھوڑی سی تکرار کے بعد پریتو بولی ''اچھا مان لی تیری بات۔ مجھے آگے نہ بٹھا۔ تو بیٹھ جا ڈنڈے پر میرے آگے۔ میں چلاتی ہوں سائیکل۔ میں سکھوں سے نہیں ڈرتی۔''

جمال قریباً رو دیا۔ بولا ''پھر تو مجھے لوگ مار ہی ڈالیں گے۔''

اس نے ہنس کر کہا ''ارے میرے کنہیا۔ تجھے نہیں ہم دونوں کو مار ڈالیں گے۔ دونوں ساتھ رہیں گے تو لوگ ماہیے لکھیں گے۔ ہم دونوں امر ہو جائیں گے۔ ہم پر فلمیں بنیں گی۔''

جمال اس عورت کی جرأت سے ڈر گیا۔ اس نے چپ چاپ پریتو کو سائیکل پر اپنے آگے بٹھا لیا۔

راستے میں دونوں نے آپس میں کوئی بات نہ کی۔ وہ بے فکری سے بیٹھی لوگوں کی حیرت زدہ نظروں پر ہنستی اور ان پر تبصرے کرتی رہی۔ ایسا تماشا جالندھر نے کبھی دیکھا نہ تھا۔

جمال کو بالکل معلوم نہ ہو سکا کہ سینما میں کون سی فلم چل رہی ہے۔ پریتو فلم میں ڈوبی رہی۔ شو ختم ہوا تو اس نے رکھائی سے کہا ''شکریہ جمال۔ تمہارے ساتھ وقت بہت اچھا کٹا۔''

جمال کو یکدم گویائی مل گئی۔ اس نے کہا ''مگر یہ تم نے کیا کیا مجھے سینما کیوں لائیں۔ آخر میں کہاں تم کہاں۔''

''لائی بس۔'' وہ بولی۔ ''تم پیارے بچے ہو اس لیے۔''

''مگر میں تمہارا بے تکلف دوست تو نہیں تھا۔''

''نہیں تھا تو نہیں تھا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

جمال کو دھچکا سا لگا۔

''مگر تم بہت پیارے بچے ہو۔ بہت معصوم ہو۔ جب میں اتم سنگھ کو دربار خان کی کہانی لکھوں گی تو یہ بھی لکھ دوں گی کہ تم بہت سندر اور بہت شریف آدمی ہو۔ اتم سنگھ مسلمانوں کا دشمن نہیں۔ وہ ایک بہادر سپاہی ہے۔ لو اب جاؤ پھر ملیں گے ضرور۔''

پریتو اسے سینما کے سامنے چھوڑ کر سائیکل پر سوار ہو گئی۔ جمال سمجھ گیا کہ پریتو سنگھ نے میجر دربار کو ذلیل کرنے اور اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے مجھے استعمال کیا ہے مگر وہ اسے بری نہیں لگی۔

## سر کڑاہی میں

راولپنڈی میں دفتر کھلنے کا چرچا ہوا تو سب لوگ ترقی کے خواب دیکھنے لگے مگر راولپنڈی مسلمانوں کا علاقہ تھا اور وہاں مسلمان ہی کام آ سکتے تھے۔ علاقے میں میجر دربار خان کے ذریعے یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ انگریز کے راج میں سب کچھ مسلمانوں ہی کے لیے ہے۔

دفتر میں انتہائی احتیاط بھی برتی جائے تو ملازمین کو پتہ لگ جاتا ہے کہ یہاں کام کی نوعیت کیا ہے۔ اکالی آتے اور کرنل کلرائے سے گھنٹوں باتیں کرتے۔ پریتو سنگھ نے اشارے سے جمال کو بتا دیا کہ جنگ کے

بعد اگر ہندوستان کو آزادی ملی تو پنجاب میں سکھوں کو بھی حصہ دیا جائے گا۔ اسی لیے سکھ لیڈر کسان بچوں کو بھرتی کی ترغیب دیتے تھے۔

جمال نے راولپنڈی میں دفتر کھلنے کی خبر سنی تو خدا کا شکر ادا کیا کہ دربار خان سے جان چھوٹ جائے گی۔ وہ اب جمال کو ڈانٹتا نہ تھا نظر انداز کرتا تھا مگر جمال کو پتہ تھا کہ وہ ایک دن مجھ سے بدلہ لے گا۔ حالانکہ اس کی پریتو سنگھ تک نارسائی میں جمال کا کوئی قصور نہ تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ دربار خان کے سٹاف میں میرا بھی نام ہے تو اس کی جان نکل گئی۔ نوکری انسان کو کس قدر کمزور کر دیتی ہے۔

دربار خان نے جمال کو جیپ کی پچھلی سیٹ پر ایک کونے میں ایک بڑے کالے صندوق کے ساتھ جکڑ دیا۔ آگے پیچھے بستر اور دوسرا سامان۔ جالندھر سے لاہور پہنچتے پہنچتے اس کا بدن اکڑ گیا۔ دربار خان لاہور چھاؤنی میں اتر کر غائب ہو گیا۔ واپس آیا تو اس کے ساتھ میجر پشاورا سنگھ بھی تھا۔ اسے بھی راولپنڈی جانا تھا۔

جیپ چلی تو بادل گرجا اور ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ پھر یکدم اولے پڑنے لگے تو جمال کے دانت بجنے لگے۔ میجر پشاورا سنگھ نے اپنی گرم برساتی جمال پر ڈال دی۔ دربار خان نے اسے گھور کر دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ کہا۔

راولپنڈی پہنچتے پہنچتے جمال کی قلفی جم چکی تھی۔ جیپ ایک بہت بڑی کوٹھی کے اندر داخل ہو گئی۔

جمال نے برساتی نہایت ادب سے میجر پشاورا سنگھ کو واپس کر دی۔ ''آج کچھ سردی زیادہ ہی ہے۔'' دربار خان نے کہا۔

بلا سوچے سمجھے جمال کے منہ سے نکلا۔ ''میجر صاحب سپاہی آدمی ہیں جی۔ وہ نہیں پرواہ کرتے۔''

پشاورا سنگھ نے خوش ہو کر جمال کی پیٹھ پر تھپکی دی اور اسے کھینچ کر جیپ سے باہر نکلا۔

اس کی پیٹھ مڑتے ہی دربار خان نے جمال کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ ''تمہیں پتہ نہیں افسروں سے بات کیسے کی جاتی ہے۔ ''تامیز'' نہیں تمہیں۔''

''میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا جی۔'' جمال نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

''میجر صاحب کو تم نے سپاہی کہہ دیا حالانکہ وہ افسر ہیں اور کہتے ہو کہ میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ یہ جالندھر نہیں راولپنڈی ہے، سمجھے؟''

رات کو اس نے جمال کو اپنے بیرے نوردین کے کمرے میں سلایا۔

پریتو سنگھ الوداع۔

الوداع پیاری ارونا گھوش۔

الوداع اے جالندھر کے پیارے لوگو۔

## تیری دو ٹکے کی نوکری

دربار خان نے جمال کو صبح سویرے ہی بلوا لیا۔

اس نے لمبا ریشمی گاؤن پہن رکھا تھا۔ میز پر چائے کے برتن لگے ہوئے تھے۔ وہ اخبار دیکھ رہا تھا۔

جمال سلام کر کے چپ چاپ بیٹھ گیا۔

دربار خان نے چونک کر کہا ''بیٹھنے کو کس نے کہا ہے تمہیں؟'' جمال سہم کر کھڑا ہو گیا۔

''تم میرے مہمان نہیں ہو۔ معمولی ملازم ہو، سمجھے۔ حکم کے بغیر کرسی پر نہ بیٹھنا کبھی۔'' دربار خان اسی لہجے میں بولا۔

''جی۔'' جمال نے منمنا کر جواب دیا۔ ''جی جی۔''

''ٹائپ جانتے ہو۔ ہز میجسٹی کی وار ایفرٹ میں تم کس کام آ سکتے ہو؟''

''جی نہیں جانتا۔''

''تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تم وار ڈیپارٹمنٹ کے بجٹ پر بوجھ ہو۔ تم نے جی ایچ کیو کو یتیم خانہ سمجھ رکھا ہے۔''

جمال کے جی میں آئی کہ دربار خان کو نورپور والی پنجابی کی کوئی بہت ہی خیال انگیز گالی دوں۔ گرمی کی ایک لہر اس کے سر کو چڑھی مگر وہ چپ رہا۔ اسے پتہ تھا کہ پھر میری نوکری چلی جائے گی۔

''آنکھیں نیچی کرو۔'' دربار خان غرایا۔

جمال نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

''اور برآمدے میں حکم کا انتظار کرو۔''

جمال من من کے قدم اٹھاتا ہوا باہر آ کر سردی میں کھڑا ہو گیا۔

## کھڑکی کھلی

کوٹھی دو منزلہ تھی۔ گھر کے لوگ دوسری منزل پر رہتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد کسی نے کھڑکی زور سے بند کی۔ جمال نے اوپر دیکھا، پھر نظریں جھکا لیں۔

ایک پچیس چھبیس سال کی لڑکی اسے گھور رہی تھی مگر اس نے دوبارہ ادھر دیکھنے کی ہمت نہ کی۔

تھوڑی دیر میں نوردین بیرا اندر سے چائے کے برتن لے کر نکلا تو بولا ''بنچ پر بیٹھ جاؤ۔ صاحب کا حکم ہے کھڑے مت رہو پہریداروں کی طرح۔''

جمال بنچ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا فارسی، اقتصادیات اور تاریخ جو میں نے چودہ برس پڑھی بیکار تھی۔ میں تو ہز میجسٹی کی وار ایفرٹ میں کسی کام نہیں آ سکتا۔ میں جی ایچ کیو کے بجٹ پر بوجھ ہوں تو پھر اسے ارونا گھوش یاد آ گئی جو بھوک سے بچنے کے لیے مسلمان ہو جانے پر تیار تھی۔ گورورام داس نے جو جالندھر میں منی پور ناچ کے استاد تھے، اسے بار بار ترغیب دی تھی کہ تم ناچ سیکھ لو۔ تم جیسا سندر جوان ناچے گا تو بھوبازار کلکتے کے تمام تھیٹر بند ہو جائیں گے مگر جمال کو ناچ سیکھنا مردانگی کے خلاف لگا تھا اور اب وہ پیٹ کی بھوک سے بچنے

کے لیے ذلیل ہو رہا تھا۔

کھڑکی ایک دفعہ اور کھلی اور بند ہوئی مگر جمال نے اس کا نوٹس نہ لیا۔ وہ اپنی مظلومیت میں غوطے کھاتا رہا۔

دوپہر کے قریب دربار خان وردی میں ملبوس اچانک ڈرائنگ روم سے نکلا "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے ترشی سے پوچھا اور پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر جیپ میں بیٹھ کر کوٹھی سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد نوردین نے کہا "بیگم صاحبہ آپ کو بلاتی ہیں۔"

بیگم صاحبہ شلوار قمیص میں ملبوس چالیس برس کی ایک بھرپور عورت تھی۔ چہرے پر ہلکی ہلکی چھائیاں، آنکھوں میں کاجل کی لمبی لکیر اور ہونٹوں پر تیز سرخی جس سے وہ اور بھی موٹے اور بھدے لگ رہے تھے۔

بڑے نرم لہجے میں بیگم صاحبہ بولیں۔ "میرا نام رضیہ ہے۔ میں صاحب کی بیگم ہوں۔ تعجب ہے کہ صبح سے آپ یہیں برآمدے میں بیٹھے ہیں۔"

"نوردین۔" انہوں نے آواز دی۔ "کچھ کھانے کو بچا ہے نوردین؟"

"جی شکریہ۔ مجھے بھوک نہیں۔" جمال نے کہا۔

"کچھ نہیں بچا جی۔" نوردین نے جواب دیا۔ "تھوڑی سی دال ہے میرے لیے۔"

"انڈے تو ہوں گے؟" بیگم صاحبہ بولیں۔

"انڈے تو جی پانچ ہیں۔ دو صاحب کے لیے اور ایک ایک آپ تینوں کے ناشتے کے لیے۔"

"رہنے دیجیے بیگم صاحبہ۔" جمال نے گھبرا کر کہا۔

"ایک انڈا فرائی کروان کے لیے۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"صاحب نے گن رکھے ہیں جی۔" نوردین بولا۔ "ایک کم ہو گیا تو میری شامت آ جائے گی۔"

"کہہ دینا ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا تھا۔"

جمال کو اب شرم آ رہی تھی۔ اسے لگا کہ کوئی ڈول بھر بھر کر نالی کا گندہ پانی میرے سر پر ڈال رہا ہے۔ اس کی بھوک واقعی مر گئی۔

"ناشتہ کیا تھا آپ نے؟"

"جی؟ میں نے عرض کیا نا کہ مجھے بھوک نہیں، خدا کی قسم نہیں۔" جمال ہکلا کر بولا۔

بیگم صاحبہ بولیں "ناشتہ بھی نہیں کیا۔ بھوک بھی نہیں۔ اچھا آپ بازار میں سے کچھ کھا کر آ جائیں۔ اس گھر میں تو خاک اڑتی ہے مگر صاحب کے آنے سے پہلے واپس آ جائیں۔"

جمال کو راولپنڈی کا کچھ پتہ نہ تھا۔ ایک کھوکھے سے وہ ایک کڑک چائے اور دو بسکٹ کھا کر فوراً واپس آ گیا۔ بھوک اسے واقعی نہیں تھی۔

درختوں کے سائے لمبے ہونے لگے۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی۔ میجر دربار خان نے گیٹ ہی سے اسے اپنے کمرے کے سامنے کھڑے ہوئے دیکھ لیا تھا مگر وہ اس کی طرف دیکھے بغیر کمرے میں گھس گیا۔

## آپ کون ہیں جی

تھوڑی دیر میں بلقیس اوپر سے اتری۔ اس کے پیچھے گیند کی طرح ناچتی ہوئی نسیم۔

بلقیس کوئی پچیس سال کی دراز قد لڑکی تھی۔ چہرے پر کیلوں کا چھتہ۔ بال پیٹھ تک اترتے ہوئے، سینہ بھرا ہوا اور جسم موزوں مجموعی طور پر وہ ایک بے رونق اور اجڑی ہوئی لڑکی تھی۔ وہ دربار خان کی یتیم بہن تھی۔

نسیم پہلی نظر میں تیرہ برس کی لگتی تھی۔ بال کٹے ہوئے، بچے سا معصوم چہرہ۔ آنکھیں موٹی، ہونٹ رس بھرے۔ سینہ سپاٹ، کمر پتلی، کولہے لٹو کی طرح گول اور لمبی مضبوط ٹانگیں، بچپن اور جوانی کے الگ الگ ٹکڑے جیسے کسی نے جوڑ دیے ہوں۔ پھوپھی اور بھتیجی آہستہ آہستہ جمال کے پاس سے ہو کر نکلیں، پھر بلقیس نے رک کر افسرانہ انداز میں پوچھا "آپ کون ہیں جی؟"

"جی میرا نام جمال ہے۔"

"یہاں کیوں کھڑے ہیں؟" بلقیس نے پوچھا۔

"صاحب کے سٹینوگرافر ہیں پھپھو۔" چھوٹی اِٹھلا کر بولی۔

"تمہیں کیسے پتہ ہے؟"

"مجھے پتہ ہے نا۔ رات جب تم سوئی ہوئی تھی تو یہ آئے تھے صاحب کے ساتھ جالندھر سے۔"

"میں کب سوئی تھی۔" بلقیس نے غصے سے کہا "میں تو سوتی ہی نہیں۔ ایسے ہی باتیں بناتی ہو تم ہمیشہ۔"

"لو نو بجے تو آپ خراٹے لینے لگتی ہیں پھوپھی جان۔" نسیم نے لاپرواہی سے کہا۔

"میں کب خراٹے لیتی ہوں۔ خراٹے تو تم لیتی ہو اور پھر بکواس بھی کرتی ہو۔ میں کہہ دوں گی صاحب سے۔" بلقیس نے چہک کر کہا۔

"کیا کہہ دو گی؟" چھوٹی نے تن کر کہا۔

"کہہ دوں گی جو میری مرضی۔" بلقیس بولی۔ "کہہ دوں گی کہ یہ رات رات بھر ناول پڑھتی ہے۔ پھر ہر بات میں میرا مقابلہ کرتی ہے۔ میری بے عزتی کرتی ہے ہر ایک کے سامنے۔"

"کس کے سامنے؟" نسیم چھیڑتے ہوئے بولی۔

"ہر ایک کے سامنے۔" بلقیس نے زور دے کر کہا۔ "سٹینوگرافر کے سامنے۔"

"میں سٹینوگرافر نہیں جی۔" جمال نے وضاحت کی۔

"تو آپ کون ہیں؟" بلقیس نے پوچھا۔

"میں پوئٹ ہوں جی۔" جمال نے شرما کر کہا۔

"پوئٹ؟" چھوٹی نے اشتیاق سے پوچھا۔ "یعنی شاعر؟"

"تو شعر کہتے ہیں آپ؟" بلقیس کا چہرہ کھل اٹھا۔

"جی جی ہاں۔" جمال نے کھکھیا کر کہا۔ "یہی میری نوکری ہے۔"

"ٹھیک ہے پھوپھی جان۔" نسیم بولی۔ "مگر مرزا غالب کو تو نوکری نہ ملی۔ ہماری کتاب میں لکھا ہے۔ ان کو کیسے مل گئی؟"

"تو پھر آپ کوئی شعر سنائیں۔" بلقیس نے حکم دیا۔

"آپ پر پھوپھی جان؟" نسیم نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"اچھا مجھ پر کیوں نہیں۔" بلقیس کو پھر غصہ آنے لگا۔

"بڑے لکھیں شعر آپ پر۔ اگر ان کا موڈ ہو تو۔" چھوٹی متانت سے بولی۔ "مگر شاعر موڈ کے بغیر کچھ نہیں لکھ سکتا۔ ہم تو نہیں کہتے کوئی ہم پر کہے شعر۔ موڈ کے بغیر۔"

"تم پر کوئی کیا لکھے؟" بلقیس حقارت سے بولی۔ "تم تو ابھی بچی ہو۔"

"چودہ برس کے ہو گئے ہم۔" نسیم تن کر بولی۔

بڑی بولی۔ "جوان ہو جانے کا بڑا شوق ہے تمہیں۔ ہر بات میں میرا مقابلہ!"

"آپ کا مقابلہ کون کرتا ہے۔" چھوٹی نے جل کر کہا۔ "کہاں پچیس برس، کہاں چودہ برس!"

"میں پچیس برس کی نہیں۔" بلقیس بولی۔ "میں بیس برس سے زیادہ کی نہیں۔"

"پچیس برس۔" نسیم نے نعرہ لگایا۔

"بیس۔" بلقیس چیخ کر بولی۔

"بلکہ چھبیس۔" نسیم نے کہا۔

بلقیس خاموش ہو گئی۔ اس کا سانس رکنے لگا۔

نسیم نے نعرہ مارا۔ "چھبیس، ستائیس، اٹھائیس!"

بلقیس کی آنکھیں ابل کر باہر آ گئیں۔ ہونٹ نیلے پڑ گئے، ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ پھر وہ ہچکیاں لینے لگی اور ہچکیاں لیتے لیتے چکرا کر گر گئی۔

"پھپھو کو پھر دورہ پڑ گیا۔" نسیم نے لاپرواہی سے کہا۔ "اسے بچہ بننے کا شوق ہے۔ ذرا سی بات پر دورہ ڈال لیتی ہے۔"

بلقیس کے منہ سے جھاگ بہنے لگی۔ ہاتھ پیر مڑ گئے۔ پتلیاں سفید ہو گئیں۔

جمال گھبرا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ میں اسے گود میں لے لوں۔ اس کے تلوؤں کی مالش کروں۔ اس کا تپتا ہوا سر پکڑ کر سہلا دوں مگر وہ ڈرتا تھا کس طرح وہ صاحب کی کنواری بہن کے جسم کو ہاتھ لگائے۔ کاش کہ وہ یکدم یہاں سے بھاگ سکتا۔ وہ صاحب کے کمرے میں گھس گیا۔

دربار خان نے نہایت غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ اس طرح اچانک دروازہ کھٹکھٹائے بغیر، وقت اور اجازت لیے بغیر کمرے میں گھس جانا کسی بھی افسر کے لیے قابل برداشت نہیں ہوتا۔

"جناب بی بی بلقیس کو دورہ پڑ گیا ہے۔ جناب کچھ کیجیے، ڈاکٹر کو بلایئے جناب۔" اس نے جلدی سے کہا۔

دربار خان نہایت اطمینان کے ساتھ اٹھ کر باہر نکلا۔ بلقیس بدستور ٹھنڈی زمین پر پڑی تڑپ رہی تھی۔

"اِدھر اُدھر بھاگنے کی بجائے تمہیں بے بی کی مدد کرنی چاہیے تھی۔" دربار خان نے جمال کو سرزنش کی۔ پھر اس نے بیٹ مین کو بلایا۔

فوراً ہی وردی میں ملبوس سپاہی نے بوٹ جوڑ کر صاحب کو سلام کیا۔

"بے بی کو اٹھاؤ۔" دربار خان نے حکم دیا۔

بیٹ مین نے جھک کر بلقیس کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ نسیم نے گردن کے نیچے ہاتھ رکھا مگر زور لگا کر بلقیس کو اٹھانے کی کوئی کوشش نہ کی۔

دربار خان نے جمال کو ڈانٹا۔ "میرا منہ کیا دیکھتے ہو۔"

جمال فوراً سمجھ گیا۔ بلقیس اوندھی پڑی تھی اور اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے گود میں اٹھا لے۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھوں میں بلقیس نہیں بلکہ ربر کے دو گیند ہیں۔ اس کا دل رحم اور ہمدردی سے بوتل کی طرح بھر گیا۔

اوپر جا کر بلقیس کو بستر پر ڈال دیا گیا۔ بیگم صاحب نے بڑی احتیاط سے اس کے پیر سیدھے کیے۔ نسیم نے تکیہ سر کے پیچھے رکھا اور اس کے پیر دبانے لگی۔ بیٹ مین ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ جمال واپس جانے کو مڑا تو دربار خان کڑک کر بولا "تم یہیں ٹھہرو۔ میں ڈاکٹر کو فون کر کے آتا ہوں۔"

کمرے کا سامان نہایت معمولی تھا۔ بستر کی چادر میلی، پردے بے رنگ اور ایک چھوٹی سی الماری جس کے پٹ کھلے تھے۔ اس میں کچھ کپڑے رکھے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل میل سے چکنی ہو رہی تھی۔

دربار خان کے جانے کے بعد نسیم نے آہستہ سے کہا "پھپھو کو ہسٹریا ہے، اس کی شادی نہیں ہوتی نا۔"

بلقیس ہوش میں نہیں تھی مگر تشنج میں کسی قدر کمی واقع ہو گئی تھی۔ پتہ نہیں اس نے نسیم کی بات سنی یا نہیں

مگر وہ دوبارہ ہانپنے لگی۔

''ہم تو کچھ نہیں کہتے بابا۔'' رضیہ بولی ''ہمارے لتے لے گی ہوش میں آ کر۔''

تھوڑی دیر میں دربار خان واپس آ گیا اور جمال کی طرف دیکھ کر بولا ''تم کیا کر رہے ہو یہاں؟'' پھر چٹکی بجا کر کہنے لگا ''چلو چھٹی کرو۔''

سلام کر کے جب جمال نیچے اترا تو اسے لگا کہ میں جان بچا کر بھاگ رہا ہوں۔ دن اس پر قیامت بن کر گزرا تھا۔

مگر سوال یہ تھا کہ چھٹی کر کے وہ کہاں جائے۔ تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے اس نے دربار خان کے گھرانے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ رضیہ اتنی مہربان طبیعت کے باوجود گھر میں کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ بلقیس پر اسے بہت رحم آیا۔ نسیم اسے ظالم اور کھلنڈری لڑکی لگی مگر وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ بچہ ہے یا جوان۔ پھر میجر دربار خان خود کیا ہے۔ اسے اپنے خاندان سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ وردی پہن کر ہز میجسٹی کی وار ایفرٹ میں خدمات انجام دینے کے سوا اسے کسی بات کا خیال نہ تھا۔ گھر کے سب لوگ ایک دوسرے کو جلا جلا کر مار ڈالنے کے درپے تھے۔ یہ کیسے لوگ ہیں، جمال نے سوچا۔

جب تانگہ ایک گھٹیا سے ہوٹل کے سامنے رکا تو اس نے فوراً ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔

## ہز میجسٹی کی وار ایفرٹ

راولپنڈی میں جمال کی زندگی بڑی بے بسی سے شروع ہوئی۔ دربار خان کے پاس اس کے لیے کوئی کام نہ تھا۔ دراصل اس کے پاس خود کوئی کام نہ تھا۔ وہ سارا دن وردی پہن کر ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہتا اور آنے جانے والوں سے گپ مارتا، آنے جانے والے اس کے پاس بہت تھے۔ پھر شام کو وہ اپنی کار گزاریوں کی تفصیل جالندھر کو روانہ کر دیتا۔

جنگ کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔ جرمن ہتھیار ڈال چکے تھے۔ جاپانی ہر جگہ پسپا ہو رہے تھے اور ہندوستان میں آزادی کی صبح طلوع ہو رہی تھی۔ کانگرس بلاشرکت بڑے اقتدار کی طلبگار تھی۔ مسلمان ہندوستان میں تحفظات یا پاکستان مانگتے تھے۔ سکھوں کو مراعات درکار تھیں اور میجر دربار خان تینوں کے ساتھ رابطے استوار رکھتا تھا کیونکہ ہز میجسٹی کی وار ایفرٹ جس کا تذکرہ وہ دن میں بار بار کرتا تھا، ابھی جاری تھی۔

لالہ رام سرن داس کی دربار خان سے گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ انہیں یقین دلاتا تھا کہ پاکستان ایک پاگل کا نعرہ ہے اور برطانوی حکومت کا ہرگز یہ ارادہ نہیں کہ وہ ہندوستان کو مسلم لیگ کی خاطر تقسیم کر دے۔

لالہ رام سرن داس مقامی کانگریس کے ایک بارسوخ لیڈر تھے۔ راولپنڈی میں ان کا خاندانی ساہوکارہ تھا اور وہ صرافہ بازار کے صدر بھی تھے۔ ان کی زندگی کا ایک ہی آدرش تھا کہ وہ ایک سوتنتر جمہوری ہندوستان کو طلوع ہوتے دیکھیں جس میں ایک ہندوستانی قوم آباد ہو۔ ہندو اور مسلمان مل کر اپنے نمائندے چنیں اور ہندو اکثریت راج کرے۔ وہ کہتے تھے کہ ہندو مسلمان تو بھائی بھائی ہیں۔ ایک یہ جناح ہے جو انگریزوں کا ایجنٹ ہے اور قوم میں پھوٹ ڈالتا ہے۔

میجر دربار خان لالہ جی کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ جناح کا مذاق اڑاتا اور پاکستان کو ایک ڈھکوسلا بتاتا۔ لالہ جی چائے پی کر ہنستے ہنستے رخصت ہو جاتے۔

سردار جسونت سنگھ سے بھی دربار خان کی بہت گہری دوستی تھی۔ وہ مقامی اکالی دل کا جتھے دار تھا۔ دربار خان اسے یقین دلاتا کہ ہندوستان کی آزادی اور سکھوں کی خودمختاری کا دارومدار اس امر پر ہے کہ جاپانی ہتھیار ڈال دیں اور اب وہ وقت قریب تھا۔ پھر وہ سردار جسونت سنگھ کو انگریزی شراب پلاتا۔ پاکستان کو گالیاں دیتا اور جالندھر کو لمبے لمبے خط لکھتا۔

پھر راجا محمد علی خان آ جاتے۔ ان کے خاندان نے انگریزوں کو کافی بھرتی دلوائی تھی مگر راجا صاحب مسلم لیگی تھے اور قائداعظم اور پاکستان پر جان چھڑکتے تھے۔ میجر دربار خان ان کی بڑی تواضع کرتا۔ قائداعظم کی تعریف میں قصیدے کہتا اور انہیں اندر کی بات بتا دیتا۔ اندر کی بات یہ تھی کہ انگریز مسلمانوں کو پاکستان دے کر جائے گا کیونکہ کانگرس نے ہز میجسٹی کی وار ایفرٹ میں تعاون نہیں کیا تھا۔ ہندو مہاسبھا کو تو وہ بہت ہی گالیاں دیتا اور اس پر راجا صاحب کا چہرہ خوشی سے کھل جاتا۔

کانگرس کو راجا صاحب ایک آزادی پسند جماعت سمجھتے تھے مگر انہیں اس کے لیڈروں پر اعتراض تھا جو کہتے تھے کہ ہندوستان میں زمینداری نظام کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ یہ بات راجا صاحب کو اسلام کے خلاف لگتی تھی اور مسلمانوں کے خلاف ایک سازش۔ دربار خان ان سے سو فیصد متفق ہوتا اور راجا صاحب کو یقین دلاتا کہ انگریز مسلمانوں کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہونے دے گا اور پاکستان میں زمینداری کو کوئی ضعف نہ پہنچے گا۔

چکنی چپڑی باتوں کے علاوہ دربار خان کے پاس بااثر افراد کے دل جیتنے کے لیے فنڈ بھی تھے۔ گھر کے سارے اخراجات یہیں سے پورے ہو جاتے تھے اور ان میں ان انڈوں کی قیمت بھی شامل تھی جو اسے لوگ تحفے میں دے جاتے تھے۔ کوٹھی، نوکر، گاڑی اور شراب تو تھا ہی وار ایفرٹ کا سلسلہ۔

یہ باتیں جمال کو آہستہ آہستہ بیگم صاحبہ سے معلوم ہوئیں جن کی اپنی جیب ہمیشہ خالی رہتی تھی۔

آہستہ آہستہ جمال کو اور باتوں کا بھی پتہ چل گیا۔ نسیم اور بلقیس شدید جلاپے کے باوجود آپس میں دوست تھیں۔ بلقیس تعلیم سے فارغ ہو چکی تھی۔ اب تک اس کی شادی کے لیے ایک ہی امیدوار آیا تھا جو اسے دیکھ کر گیا تو واپس نہ آیا۔ اسے اپنی بڑھتی ہوئی عمر کا شدید دکھ تھا۔

نسیم بہت چلبلی تھی۔ اس کی بہت سی سہیلیاں تھیں اور ان میں سے بعض کے بوائے فرینڈز بھی تھے۔ خود نسیم کا ہاتھ خالی تھا۔ وہ اوپر سے بچہ بنی رہتی مگر اندر سے اسے پتہ تھا کہ میرے نین کیسے رس کے بھرے

ہیں اور میرے ہونٹوں میں کیسے کیسے پھول کھلے ہیں۔ کبھی کبھی وہ کالج سے کھسک کر سینما چلی جاتی اور واپس آ کر رضیہ اور بلقیس کے دل جلاتی۔ اسے مہینے میں دس روپے جیب خرچ کے لیے ملتے تھے جن میں سے اسے اپنے لیے ٹوتھ پیسٹ بھی خریدنی پڑتی تھی۔ اسے مٹک مٹک کر چلنے کا شوق تھا۔

بیگم رضیہ ایک ناآسودہ عورت تھی۔ نہ آگا نہ پیچھا۔ میجر دربار خان اس کی عزت نہ کرتا۔ اس سے پائی پائی کا حساب مانگتا۔ رات کو اس کے ساتھ سونے کے باوجود اس سے کوئی تعلق نہ رکھتا اور بات بات پر اسے ڈانٹتا۔

رضیہ بات کرنے کو ترستی تھی۔ نسیم اور بلقیس دونوں سے ڈرتی تھی، اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ ایک بیٹے کی آرزو لے کر زندگی گزار رہی تھی۔

جمال اس پورے خاندان سے ڈرتا تھا۔ وہ سارا دن چپ چاپ برآمدے میں بیٹھا دربار خان کے گھر کے حالات کو دیکھتا رہتا۔ اس نے ماتحتی کے آداب سیکھ لیے تھے۔ اس کی شوخیاں ختم ہو چکی تھیں۔ وہ چپ رہنے لگا تھا۔ دربار خان نے بھی اسے ٹوکنا اور ڈانٹنا کچھ کم کر دیا تھا۔

## سیاسی باتیں

ایک دن جب سردار جسونت سنگھ اٹھ کر چلے گئے تو دربار خان نے جمال کو اندر بلایا۔

شراب کا آدھا پیگ سردار صاحب بن پیے ہی چھوڑ گئے تھے۔ دربار خان نے اسے واپس بوتل میں انڈیلا اور پھر پیسٹری کے وہ ٹکڑے جو سردار صاحب نے آدھے کھا کر چھوڑ دیے تھے، چھری سے کاٹ کر ڈبے میں واپس رکھ دیئے۔ پھر جمال سے بولا ''تم سارا دن برآمدے میں بیٹھے کیا کرتے رہتے ہو۔''

''کچھ نہیں جی۔'' جمال نے جواب دیا۔

''تم میری اور میرے مہمانوں کی باتیں سنتے رہتے ہو۔ مجھے پتہ ہے۔''

''نہیں جی۔ میں تو کچھ بھی نہیں سنتا۔''

''ہماری باتیں سیاسی ہوتی ہیں اور سیاسی باتیں سننا وار ڈیپارٹمنٹ کے ریگولیشنز کے خلاف ہے۔ جانتے ہو؟''

''جی ہاں۔'' جمال منمنایا۔

''انڈین آرمی کے افسروں کو بھی سیاسی باتیں کرنے کی اجازت نہیں۔ سوائے ان کے جو پروفیشنل ہوتے ہیں۔''

''جی ہاں۔'' جمال نے اتفاق کیا۔

''جانتے ہو کہ میں انڈین آرمی کا پروفیشنل افسر ہوں؟''

''جی ہاں۔''

''کیا تم مسلم لیگی ہو؟''

''جی؟ جی ہاں۔'' جمال کے منہ سے نکل گیا۔ حالانکہ اس نے کبھی سوچا نہ تھا۔

''تمہارے خیال میں پاکستان بن جائے گا؟''

''جی ہاں۔''

''کبھی نہیں۔'' دربار خان میز پر ہاتھ مار کر بولا ''انگریز کا سورج کبھی غروب نہیں ہوگا۔ وہ ہندوستان کو چھوڑ کر کبھی نہیں جائے گا اور کیوں جائے؟''

''جی۔''

''تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ جنگ کے بعد بھوکے مرو گے۔ کبھی سوچا ہے تم نے؟''

''جی نہیں۔''

''بہتر ہے کہ تم رائل انڈین ایئر فورس میں بھرتی ہو جاؤ اور ہز میجسٹی کی وار ایفرٹ میں کسی کام آؤ۔ ویسے افسر تم کبھی بن نہیں سکتے۔ تمہاری کوئی خاندانی بیک گراؤنڈ نہیں۔ تم ایک معمولی سکول ماسٹر کے بیٹے ہو۔''

''جی ہاں۔''

''اور سیاسی باتیں مت سنا کرو اور خبردار جو تمہارے منہ سے کبھی ایک لفظ بھی نکلا......''

''جی کبھی نہیں۔''

''تمہاری سلامتی اسی میں ہے، چلو اب جاؤ۔'' اس نے چٹکی بجا کر جمال کو کمرے سے نکال دیا۔

## ترقی ہو گئی

اگلے روز میجر دربار خان نے جمال کی ترقی کر دی اور اسے چپڑاسی کے ساتھ بنچ پر بٹھانے کے بجائے دور ایک چھوٹے کمرے میں بٹھا دیا جس میں میز کرسی لگی ہوئی تھی۔ دراصل میجر دربار خان اپنے دفتر کو پھیلانا چاہتا تھا جس میں بہت سے لوگ کام کرتے نظر آئیں مگر جگہ کی تنگی ہو۔

کھڑکی کے سامنے سفیدے کے بڑے بڑے درخت جمال کو بہت سہانے لگے۔ یہاں سے وہ سڑک بھی نظر آتی تھی جس پر کالج جاتی نسیم پر اس کی نگاہ پڑ جاتی تھی۔ اسے اندر جاتے ہوئے جمال کی کھڑکی سے لگ کر گزرنا پڑتا تھا۔

اسے قریب آتے دیکھ کر جمال جھوٹ موٹ کسی کاغذ پر نظریں جما لیتا مگر نسیم کے کپڑوں کی سرسراہٹ پر اس کے کان لگے رہتے۔

بلقیس کبھی کبھی پھول توڑنے کے بہانے یا دھوپ تاپنے کے خیال سے اس کے سامنے سے گزر کر لان میں کرسی لگا کر بیٹھ جاتی۔ اس کی آنکھیں بڑی اداس تھیں۔ وہ بڑی معصوم لڑکی تھی۔ جمال کو اس پر بڑا رحم آتا۔

رضیہ باورچی خانے میں کھڑی زور زور سے نوکروں کو بے معنی حکم دیتی۔ کبھی کبھی وہ کھڑکی کے پاس رک کر جمال سے بات کرتی اور ظاہر کرتی کہ میں بڑی دکھیاری ہوں۔ وہ اس طرح کی باتیں کر کے جمال سے ہمدردی چاہتی تھی۔

مگر جمال یہاں بڑی احتیاط سے زندگی گزار رہا تھا۔

دربار خان کا پورا گھرانہ ایک اداس، خوفزدہ اور تنہائی کا شکار افراد کا گھرانہ تھا۔ کوٹھی ایک بوجھ کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ درختوں پر بھوت بسیرا کرتے تھے۔ شاخوں پر چڑیوں کے روپ میں چڑیلیں چیختی تھیں۔

دربار خان جب دورے پر جاتا تو گھر میں بہار آ جاتی۔

نسیم سیدھی چال چلنا بھول جاتی۔ وہ بچوں کی طرح اچھل اچھل کر ایک ٹانگ پر چلتی۔ گھاس پر اوندھی لیٹ کر لڑھکتی اور قہقہے لگاتی۔ بلقیس ساڑھی پہنتی، پلو لہرا لہرا کر چلتی اور مڑ مڑ کر دیکھتی کہ کوئی میرے پیچھے لگا یا نہیں۔

رضیہ منہ ہاتھ دھو کر سرخی لگاتی۔ بال کھول کر شانوں پر ڈالتی اور پودوں پر جھک جھک کر پھول سونگھتی۔ کبھی تینوں ایک ساتھ اور کبھی الگ الگ جمال کی کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو جاتیں جیسے انہیں کسی کا ڈر ہی نہ ہو۔

جمال ان کے صاحب کا ادنیٰ ماتحت تھا اور اسے اس بات کا شدید احساس تھا مگر رضیہ، بلقیس اور نسیم بھی کم و بیش جمال ہی کی طرح صاحب کی ادنیٰ ماتحت تھیں۔ یہ مشترکہ مظلومی ان سب کو ایک دوسرے کے قریب لے آئی۔ اس اجتماعی رشتے داری میں تینوں عورتیں جمال میں خصوصی دلچسپی لینے لگیں۔

دربار خان کے دورے کے دنوں میں نور دین خانساماں بھی سرِ شام بال بچوں سے ملنے کے لیے مری چلا جاتا۔

### تین عورتیں تین کہانیاں

دربار خان جب چکوال جانے کے لیے جیپ میں بیٹھا تو رضیہ ہکلاتے ہوئے بولی ''ہمیں آپ کے بغیر رات کو بہت ڈر لگتا ہے۔ اتنے دورے نہ کیا کریں جی۔''

دربار خان نے کہا ''تم اندر سے دروازے بند کر لیا کرو باہر چوکیدار موجود ہوتا ہے۔''

''مگر آپ کے بغیر ہمیں نیند بھی تو نہیں آتی جی۔'' بلقیس نے منہ بسور کر کہا۔

''سونے کی کوشش کیا کرو۔'' دربار خان نے حکم دیا۔

''ہم اداس ہو جاتے ہیں نا۔'' نسیم اٹھلا کر بولی۔

''اداس مت ہوا کرو۔'' دربار خان نے کہا ''میں شوقیہ دورے پر نہیں جاتا۔ یہ ہز میجسٹی کی وار ایفرٹ کی مجبوری ہے۔''

''مگر آپ واپس کب آئیں گے۔'' رضیہ نے پوچھا۔

''پرسوں شام کا کھانا میں گھر میں کھاؤں گا۔''

پھر گاڑی دھاڑتی ہوئی گیٹ سے نکل گئی۔ جمال اس عرصے میں سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

جیپ کے گیٹ سے نکلتے ہی دونوں لڑکیاں لان میں کرسیاں بچھا کر بیٹھ گئیں۔ رضیہ پیچھے پیچھے جمال کے ساتھ چلی اور سرگوشی کے انداز میں بولی ''ہماری بھی کوئی زندگی ہے؟''

''جی۔'' جمال نے جواب دیا۔

''وہ دن بھر کام میں مصروف رہتے ہیں اور شام کو پی کر سو جاتے ہیں۔ صرف ان کے جوتے اتارنا ہماری قسمت میں لکھا ہے۔''

''جی۔'' جمال نے کہا۔

''وہ کہتے ہیں تم بیکار ہو۔ میں نے تم سے شادی اس لیے کی تھی کہ تم ایک بیٹا پیدا کرو گی۔ پہلی بیوی سے ان کا کوئی بیٹا نہیں تھا نا۔''

''جی۔'' جمال کسی قدر گھبرا گیا۔

''اب بھلا میں بیٹا کہاں سے لاؤں؟ خدا کی مرضی ہے یا پھر ان کی اپنی کوئی کمی ہے۔''

''جی ہاں یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔ آپ کیا کر سکتی ہیں؟''

''کاش میرے ہاں ایک بیٹا ہو جاتا۔'' اس نے آہ بھر کر کہا۔

''اللہ کرے آپ کے ہاں ایک بیٹا ہو جائے۔'' جمال نے دعا کی۔ کچھ دیر رضیہ خاموش چلتی رہی پھر اچانک بولی ''آپ کا کوئی بیٹا ہے؟''

''میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی جی۔'' جمال شرما کر بولا۔

''منگنی تو ہوئی ہوگی کہیں؟''

''جی ماں باپ بات چلا رہے ہیں ایک جگہ۔''

''لڑکی پسند ہے آپ کو؟''

''جی پتہ نہیں۔''

''شاید کوئی اور لڑکی بھی ہوگی آپ کی نظر میں۔''

''جی نہیں۔'' جمال نے جواب دیا۔

''اتنے اچھے ہیں آپ۔ کوئی لڑکی پسند کر لیجیے نا۔ آپ کے آگے کون انکار کر سکتا ہے؟''

''جی شاید کوئی کر دے۔''

''ناممکن۔'' رضیہ یقین کے ساتھ بولی۔ اتنے میں جمال کا کمرہ آ گیا۔ رضیہ آگے بڑھ گئی۔

دونوں لڑکیاں دور سے رضیہ کو جمال سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ اب دونوں ٹہلتی ہوئی جمال کی کھڑکی کے سامنے آ کر رک گئیں۔ بلقیس بولی ''کیا کہتی تھی مائی؟''

''کہتی تھی آج شاید بارش ہوگی۔''

''جھوٹ۔'' نسیم بولی۔ ''کچھ اور کہتی ہوگی۔ آپ چھپاتے ہیں ہم سے۔''

''جی نہیں۔ میں کچھ نہیں چھپاتا۔''

''میری برائی کرتی ہوگی۔'' بلقیس بولی۔

''جی نہیں آپ کی تو بات ہی نہیں ہوئی۔'' جمال نے جواب دیا۔

''نہیں پھپھو۔ آپ کی بات نہیں ہوئی مجھے پتہ ہے۔'' نسیم بولی۔

جمال گھبرا گیا کہ اب بات بڑھ جائے گی اور بلقیس کو دورہ پڑ جائے گا۔ مگر نسیم نے اسے مزید چڑانے کی بجائے کہا ''رضیہ کبھی کسی کی بات نہیں کرتی۔ صرف اپنا رونا روتی ہے، کیوں جمال صاحب؟''

''اپنی بات بھی نہیں کی جی انہوں نے۔'' جمال نے کہا ''کہتی تھیں مجھے بلقیس کی بڑی فکر ہے۔ بیمار رہتی ہے۔''

''ہاں بیمار تو میں بہت رہتی ہوں۔ ٹانگوں میں درد اس وقت بھی ہے۔'' بلقیس نے آہ بھر کر کہا۔

''اور رات کو سو بھی نہیں سکتی پھپھو۔'' نسیم نے ہلکا سا طنز کیا۔ ''سلیپنگ پلز کھا لیا کرو باجی۔'' وہ بولی۔

''ہاں واقعی۔ آپ کے پاس ہیں سلیپنگ پلز جمال صاحب۔''

''جی نہیں۔ میں نے کبھی کھائی نہیں نیند کی گولیاں۔'' جمال نے جواب دیا۔

''آپ تو مزے کی نیند سو جاتے ہوں گے۔'' بلقیس بولی۔

''شعر کہتے کہتے سو جاتے ہوں گے۔'' نسیم نے شرارت سے کہا۔

''کسی کے خیالوں میں ڈوب کر۔ کون ہے وہ خوش قسمت؟''

''کوئی نہیں جی۔''

''کوئی بھی نہیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' بلقیس بولی ''کوئی تو ہوگی؟''

''ہو سکتا ہے پھپھو۔ کیوں نہیں ہو سکتا۔'' نسیم نے دانائی سے کہا۔

''ممکن ہے ان کی پسند بہت ہی اونچی ہو۔ اس سفیدے سے بھی زیادہ اونچی۔ اتنے اونچے سفیدے پر چڑھ کر تو کچھ دکھائی نہیں دیتا نا۔''

''اور یہ بھی ممکن ہے کسی نے ان کو پسند ہی نہ کیا ہو۔'' بلقیس نے کہا۔

''یہ بھی ممکن ہے۔ جمال صاحب ہیں تو بدھو۔'' نسیم بولی۔

جمال کو پسینہ آ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لڑکیاں اس سے بے تکلف ہو جائیں۔ اس نے نسیم سے کہا ''آپ کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔''

بلقیس نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''دیکھو نسیم تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ دیکھو ان کے گالوں پر پسینہ آ گیا ہے۔''

پھر وہ نسیم کو چٹیا سے پکڑ کر گھسیٹ کر لے گئی۔

جمال نے نظریں اخبار پر گاڑ دیں۔ اس کو ڈر تھا کہ رضیہ ان کی باتیں سن لے گی۔

نسیم اور بلقیس لان میں بگولے کی طرح گھومنے اور قہقہے لگانے لگیں۔

تھوڑی دیر میں نسیم پھر جمال کی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

''پھپھو پوچھتی ہیں۔ آپ نے کبھی کسی سے لو کیا ہے یعنی محبت؟'' نسیم نے بڑی سنجیدگی سے سوال کیا۔ پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر قہقہہ مار کر بھاگ گئی۔

جمال کو یہ لڑکیاں اچھی لگیں مگر وہ جانتا تھا کہ یہ کھیل خطرناک ہے۔ دربار خان کو رضیہ، اپنی بہن بلقیس اور بیٹی نسیم سے کوئی جذباتی تعلق نہ تھا مگر تینوں خواتین جمال کے بارے میں صاحب کے رویئے میں کسی قدر نرمی پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکی تھیں۔ اپنے اپنے زاویئے سے۔

دربار خان نے اسے ایک فالتو پرزہ سمجھ کر دفتر میں رکھ لیا تھا۔ گھر کے اندر اس کی آمد و رفت پر کوئی پابندی نہ تھی مگر دربار خان کے کمرے میں جانے کے لیے اسے اجازت لینی پڑتی تھی۔

''آج کل کیا کر رہے ہو؟'' ایک دن جمال سے دربار خان نے پوچھا۔

''اخبارات کی کٹنگ جی۔ جیسا آپ نے حکم دیا تھا۔''

''یہ بھی کوئی کام ہے؟'' دربار نے کہا ''بیکار بیٹھے رہتے ہو سارا دن۔ حرام کی روٹی مت کھایا کرو۔ نسیم کو انگریزی پڑھا دیا کرو فی الحال۔ پڑھا سکو گے؟''

جمال نے سر ہلایا۔

''ڈسمس۔'' دربار خان نے نعرہ مارا۔

تھوڑی دیر میں نسیم انگریزی کی کتاب لے کر آ گئی۔ اس کے چہرے پر وہی معصوم بچپنا تھا مگر آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

جمال نے کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پوچھا ''پوئٹری کی کتاب ہے۔ کہاں سے شروع کروں؟''

نسیم اِٹھلا کر بولی ''شروع سے جی۔ پہلے بتائیے کہ لو کیا ہوتا ہے اور کیسے ہوتا ہے ماسٹر صاحب؟''

جمال کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔

نسیم بولی ''مگر آپ نے تو محبت کی ہی نہیں۔ آپ کو کیا پتہ۔''

"چھی چھی! آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ ابھی آپ بچہ ہیں۔" جمال نے کہا۔

"بچہ ہوں؟ ذرا ہاتھ تو پکڑیے میرا۔" اور یہ کہہ کر اس نے اپنی کلائی ننگی کر کے آگے بڑھا دی۔ بھری ہوئی مضبوط، گوری چٹی، گول۔

"کیا میں بچہ ہوں؟" وہ بولی۔ "اور ادھر دیکھیے۔" اس نے اپنی پنڈلیوں پر سے شلوار اٹھائی۔ اس پر ہلکے ہلکے سنہری رنگ کے بال کنڈل مار کر بیٹھے تھے۔ "کیا میں بے بی ہوں۔" اس نے پوچھا۔

جمال کوئی جواب نہ دے سکا۔

اس کا چہرہ واقعی بچوں والا تھا۔ چھاتی بھی سپاٹ تھی مگر اس کے ہاتھ کی گرمی اور ہونٹوں کی ضیا کہہ رہی تھی کہ میں ارادوں اور منصوبوں سے مسلح ہوں۔ بچہ نہیں ہوں، عورت ہوں اور اپنے عورت پن کو رگڑ کر دیکھنا چاہتی ہوں کہ سونا بنا کہ نہیں۔

جمال کو بہت ڈر لگا۔ بات بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور زیادہ رفتار ہمیشہ خطرناک ہوتی ہے۔ اس نے شکر کیا۔ جب بلقیس لان میں آ کر سامنے بیٹھ گئی۔

نسیم آہستہ سے بولی "پھپھو کو ہم پر شک ہے۔ وہ ہمیں موقع دینا نہیں چاہتی۔"

جمال کو خیال آیا کہ نسیم ایک لذیذ تجربہ ہے۔ اس کے دل میں شوق کے بلبلے پھٹنے لگے۔ اسے پتہ لگ گیا کہ نسیم میں سازش کرنے اور بچ نکلنے کی صلاحیت موجود ہے۔ بلقیس کا شک دور کرنے کے خیال سے اس نے خزاں پر ایک نظم بلند آواز سے پڑھانی شروع کر دی۔

وہ زرد پتوں، گرے ہوئے پھولوں اور شمال سے آنے والی سرد ہواؤں کے بارے میں شعر پڑھتا رہا۔ اس کی آواز سے نچلی سطح پر نسیم آہیں بھرتی رہتی۔ پھر اچانک بولی۔ "کیوں نہ آپ میرے بوائے فرینڈ بن جائیں۔"

جمال نے کہا "شٹ اپ!"

### بوائے فرینڈ

"میری ساری سہیلیوں کے بوائے فرینڈز ہیں اور وہ ان سے چھپ چھپ کر ملتی اور ان کے ساتھ فلمیں بھی دیکھتی ہیں۔" نسیم نے اِٹھلا کر کہا "ایمان سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ سب مجھے بچہ سمجھتے ہیں۔ کسی کو شک بھی نہیں پڑ سکتا۔ توبہ آپ کتنے ڈرپوک ہیں!"

کچھ ہی دنوں میں جمال نسیم سے کھل گیا۔ اس کا ڈر جاتا رہا۔ وہ سبق دیتا بھی تھا اور لیتا بھی تھا۔ نسیم اس کی استاد بن گئی۔ میز کے نیچے سے وہ اپنے ننگے پیر اس کی گود میں رکھ کر لذت بھرے پیام دیتی۔ اس کے جواب میں جمال ہاتھ سے اس کی گوشت سے بھری پنڈلیوں کے چھوٹے چھوٹے سنہری بال نوچتا۔ پھر اس کے دل میں نسیم کے جسم کے سارے بھید جاننے کی آرزو کے شیش ناگ نے سر اٹھا لیا۔

نسیم نے ایک دن اسے صاف کہہ دیا "نیکنگ کے آگے راستہ بند ہے جی......"

جمال آگے کے راستے سے ناآشنا تھا۔

"ایمان سے بالکل بدھو ہیں آپ۔" نسیم بولی۔ "میری ساری سہیلیاں نیکنگ کرتی ہیں۔ نیکنگ یعنی گردن سے اوپر اوپر۔ گردن سے اوپر اوپر پیار کا پتہ نہیں چلتا بشرطیکہ کوئی گنوار گالوں پر کاٹ نہ کھائے۔ میں آپ کو ایسا گنوار نہیں سمجھتی۔"

کھڑکی کھلی تھی مگر لان میں کوئی نہ تھا۔ نسیم نے اپنا منہ گول کر کے جمال کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے ہونٹ اندر کی گرمی سے سوجے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے لب نسیم کے لبوں سے ہٹائے ہی تھے کہ بلقیس کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئی مگر اسے شک نہیں ہوا۔ "پڑھائی بس کرو نسیم۔ تھک جاؤ گی۔" وہ بولی۔ "چلو آؤ دو گھڑی لان میں بیٹھیں اور جمال صاحب کو بھی اب چھٹی دو۔"

بلقیس نہایت سادہ دل لڑکی تھی۔ اس کی اداس آنکھوں کو دیکھ کر جمال کے دل میں رحم کے سوا کوئی جذبہ بیدار نہ ہو سکا۔ اس کی آرزو بس اتنی تھی کہ کوئی جوان آدمی مجھے چاہت کی نظروں سے دیکھے اور کبھی کبھی چھو لے۔ اگر اس کا رشتہ چھوٹ نہ جاتا تو وہ ایک پرسکون اور وضع دار بیوی بن سکتی تھی۔ وہ نسیم کو ہمیشہ یقین دلاتی رہتی کہ تم ابھی بچی ہو اور شاید خود کو بھی۔

مگر رضیہ کی مکار آنکھوں نے بھانپ لیا کہ جمال اور نسیم کی دال میں کچھ کالا ہے۔

اس پر اسے کوئی اعتراض نہ تھا۔ ایک تو اس طرح خاوند کے خلاف اس کے جذبۂ انتقام کی تسکین ہو جاتی تھی۔ دوسرے نسیم اور بلقیس دونوں کے مزاج میں نرمی پیدا ہو رہی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود جمال سے بے تکلف ہو سکتی تھی اور اب کوئی بھی رائی کا پہاڑ نہ بن سکتا تھا۔ اسی طرح نسیم اور بلقیس کو بھی جمال پر رضیہ کی مہربانیاں ناگوار نہ ہوتیں۔

جمال کے لیے سارا ماحول پرلطف اور رنگین ہو گیا۔ وہ بڑے سرور کے ساتھ ان بوڑھی اور جوان گوپیوں میں بنسری بجانے لگا۔ رضیہ سمجھتی تھی کہ نسیم میری اوٹ ہے۔ اصل میں جمال مجھے چاہتا ہے۔ بلقیس کا خیال تھا کہ جمال میرا ہم عمر ہے، اس لیے میں ہی اس کے دل میں دھڑکتی ہوں مگر جمال کی توجہ کو بھڑکانے کے لیے اس کے پاس اپنی بیماری اور بے خوابی کے چرچوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں بولتی رہوں اور کوئی توجہ سے سنتا رہے۔

رضیہ کے پاس بھی کچھ نہ تھا۔ ایک بیٹے کی آرزو اور اپنی مظلومی اور نارسائی کے قصے!

نسیم کی بات ہی اور تھی۔

تھوڑے ہی دنوں میں جمال کی نیکنگ سے نسیم کے سینے کی سپاٹ زمین پر گل بوٹوں نے سر اٹھا لیا۔ آن کی آن میں سیب پک کر لال ہو گئے۔ آن کی آن میں نسیم کا کچا سینہ دہکنے لگا اور اس پر چھوٹے چھوٹے

کبوتر پھڑ پھڑانے اور تتلیوں سے سر پھوڑنے لگے۔ پھر ایک رات راولپنڈی کی بارش اور بھنی ہوئی مونگ پھلی نے مل کر شرارت کی۔ بارش اور بھنی ہوئی مونگ پھلی نے شرارت نہ کی ہوتی تو جمال کو نجانے کب تک راولپنڈی میں رہنا پڑتا۔

## ڈوب چلے میخانے بھی

اگلے روز جب بستر بندھ کر جیپ کے پیچھے لگ گیا۔ ناشتہ دان لٹک گیا اور ڈرائیور پچھلی سیٹ پر اور دربار خان اگلی سیٹ پر بیٹھ چکا تو سب نے منہ لٹکا لیے جیسے سب دربار خان کے دورے سے دل شکستہ ہوں۔

آسمان پر بادل اُمڈ رہے تھے۔ ہوا سیٹیاں بجا رہی تھی۔ جمال نے نہایت عاجزی سے التجا کی ''سر آج نہ جائیے، آج گھٹا اُمڈ رہی ہے۔''

جمال کو پتہ تھا کہ دربار خان نے کیمبل پور کے معززین کا جلسہ بلا رکھا ہے اور وہ کسی صورت بھی ہز میجسٹی کی وار ایفرٹ کو ملتوی نہیں کر سکتا۔

دربار خان نے جمال کی التجا سن کر کہا ''رائل انڈین آرمی کے افسر موسم کی پرواہ نہیں کرتے۔ ڈیوٹی از ڈیوٹی!''

''رک جائیے نا۔'' رضیہ لاڈ سے بولی۔ ''کل چلے جائیے گا۔''

جلسے کے پروگرام کا اس کو بھی پتہ تھا۔

''ہمیں ڈر آئے گا۔ آپ کے بغیر۔'' بلقیس بولی۔

وہی تھی جو دل سے چاہتی تھی کہ میرا بھائی رک جائے۔ نسیم بالکل نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کہا ''ہم نہیں جانے دیں گے آپ کو آج۔''

''فضول باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔'' دربار خان نے حکم دیا اور جیپ تیر کی طرح گیٹ سے نکل گئی۔ سب نے سکھ کا سانس لیا۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا چھا گیا اور چھم چھم مینہ برسنے لگا۔

''ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھیں ذرا۔ سردی بہت ہے۔'' رضیہ بولی۔

جمال نے کہا ''صاحب کو پتہ چلا تو برا منائیں گے۔''

''صاحب کو کیسے پتہ چلے گا۔'' بلقیس بولی۔

''چاہے چل جائے پتہ۔'' نسیم نے اِٹھلا کر کہا ''ہم تو نہیں ڈرتے صاحب سے۔''

''اتنی سردی ہے آج۔ توبہ توبہ۔'' بلقیس نے کہا۔

''مجھے تو اجازت دیجیے۔'' جمال نے جھوٹ موٹ کہا۔

''اس بارش میں؟'' رضیہ بولی۔

''نمونیا ہو جائے گا آپ کو۔'' بلقیس نے ڈرایا۔ ''راولپنڈی میں کوئی سر بھی نہیں دبائے گا آپ کا۔ آپ کا ہے کون یہاں؟''

''ابھی تو دو ہی بجے ہیں۔'' نسیم نے سنجیدگی سے یاد دلایا ''چار بجے تک تو آپ کو دفتر میں بہر حال رہنا ہے۔ ڈیوٹی بھی کوئی چیز ہے آخر۔''

اس قانونی نکتے پر جمال بہت خوش ہوا۔ وہ جانا کہاں چاہتا تھا۔ وہ تو اپنے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر نسیم کو اس کی ٹانگوں میں ٹانگیں ڈال کر پڑھانا چاہتا تھا مگر رضیہ اور بلقیس اسے ڈرائنگ روم میں ہیٹر کے سامنے بٹھانے پر تلی ہوئی تھیں۔

ہیٹر کے سامنے نرم گدوں پر بیٹھتے ہی سب کے جسم گرم ہو گئے اور چہروں پر طمانیت بھری مسکراہٹ آ گئی۔

''گرم گرم بھنی ہوئی مونگ پھلی اس وقت گھر میں ہوتی تو مزہ آ جاتا۔'' بلقیس بولی۔

''کچھ بھی نہیں اس گھر میں۔'' رضیہ نے جل کر کہا ''کوئی لا کے بھی نہیں دیتا کچھ۔''

''میں لا دوں؟'' جمال نے پیشکش کی۔

''مگر آپ کو تیرنا کہاں آتا ہے۔ باہر تو تالاب بھر رہے ہیں۔ ایسے میں گرم چائے پر گزارہ کریں۔'' رضیہ نے کہا ''میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

بلقیس نے کہا ''میرے پاس کچھ بسکٹ ہیں۔''

''میں اپنا ٹی سیٹ نکالتی ہوں۔'' نسیم بولی ''پارٹی ہو جائے آج۔''

آن کی آن میں تینوں کمرے سے نکل گئیں۔ جمال نے باہر دیکھا۔ بارش موسلا دھار جاری تھی۔ کچھ نظر نہ آتا تھا مگر اس کی مردانگی جاگ اٹھی اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پانی میں شرابور گرم گرم بھنی ہوئی مونگ پھلی سے دونوں جیبیں بھر کر واپس آیا تو تینوں عورتیں سخت فکر مند تھیں۔ انہوں نے اس کا گیلا کوٹ اتارا۔ تولیے سے منہ پونچھا۔ بال خشک کیے اور دربار خان کا ڈریسنگ گاؤن پہنا کر اسے ہیٹر کے سامنے بٹھا دیا۔ اس کی بہادری کی ایک ایک نے داد دی جس سے جمال پھول کر کپا ہو گیا۔

بلقیس اس بات پر مسرور تھی کہ جمال نے اس کی ذرا سی خواہش پر اپنی جان خطرے میں ڈال دی۔

رضیہ کو فخر تھا کہ اس کے لیے کوئی اس کالے طوفان میں بھی بازار جا کر کچھ لے آیا۔

نسیم اس پر اِتراتی تھی کہ میرا بوائے فرینڈ اتنا جیالا ہے۔

پھر تینوں نے چائے کا پیالہ بھرا۔ بسکٹ اس کے آگے رکھے اور تمنا بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔ ''جمال کے ہونٹ نیلے پڑ گئے ہیں۔'' رضیہ نے کہا۔

اس پر سب نے اتفاق کیا۔

نسیم آہستہ سے بولی جسے صرف جمال ہی سن سکا۔ "تو ہم گرم کر دیں؟"
"کوئی بات نہیں۔" جمال نے لاپرواہی سے کہا۔
اس کو پتہ تھا کہ مجھے سردی نہیں لگ رہی اور میرے ہونٹ نیلے نہیں پڑ گئے مگر ایسی زبردست توجہ اسے زندگی میں پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔

ہلکی ہلکی پرلطف باتیں کر کے مونگ پھلی کھاتے، ہاتھوں پر ہاتھ مارتے انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ بارش تھم گئی اور تارے نکل آئے۔ جمال نے سوچا اب اجازت لینی چاہیے۔
"کھانا کھا کر جایئے گا۔" رضیہ نے لاڈ سے کہا "ابھی لگاتی ہوں۔"
"مگر مناسب یہی ہے کہ اب میں اجازت لوں۔" جمال نے کہا۔
بلقیس بولی "ابھی تو آٹھ ہی بجے ہیں۔ وہاں کون آپ کا راستہ دیکھ رہا ہے۔ کھانا کھا کر چلے جایئے گا۔"
نسیم اٹھلا کر بولی "کیا پتہ۔ شاید کوئی کر رہا ہو اُن کا انتظار!"
"میرا کون انتظار کرے گا؟" جمال نے ہنس کر کہا۔
"تو پھر کھانا کھا کر چلے جایئے گا۔"

کھانے کے بعد چائے کا ایک اور دور چلا۔ اب جمال کے لیے رک جانے کا کوئی عذر نہ تھا۔ وہ جانے کے لیے اٹھا۔ رضیہ نے کہا "بارش پھر امڈ رہی ہے۔ تھوڑی دیر دیکھ لیجیے۔"
بلقیس بولی "شمال میں آسمان بالکل سیاہ ہو رہا ہے اور بجلی دیکھو کیسی کڑک رہی ہے۔"
نسیم نے کہا "میرا دل کہتا ہے کہ موٹے موٹے اولے پڑیں گے دیکھ لینا ابھی۔"
جمال نے کھڑکی کے پردے میں سے دیکھا مطلع بالکل صاف تھا۔ موٹے موٹے تارے چمک رہے تھے۔ آسمان پر دور کہیں ابر کے ایک ٹکڑے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بجلی کڑک رہی تھی مگر وہ جاتے ہوئے بادلوں کی کڑک تھی۔ تینوں عورتوں نے جان بوجھ کر باہر دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ باہر ایک طوفانِ قیامت اٹھ رہا ہے۔
رضیہ نے کہا "میں نہ کہتی تھی بارش آنے والی ہے۔"
"دیکھے بغیر کوئی بات نہیں مانتے جمال صاحب۔" بلقیس بولی۔
"اب کیسے چپ ہو گئے ہیں کالا سیاہ آسمان دیکھ کر۔"
نسیم نے اپنے نئے ابھرے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
"بادل کی گرج سن کر میرا تو کلیجہ کانپ رہا ہے۔"
دراصل تینوں چاہتی تھیں کہ جمال کچھ دیر اور بیٹھے۔

جمال نے کہا "واقعی بارش بہت زور کی ہونے والی ہے۔ میں تو پھنس ہی جاتا راستے میں۔"
پھر اس نے کھڑکی بند کر دی تاکہ آسمان کو کوئی دیکھ نہ لے۔
"لیٹ جایئے ذرا۔" رضیہ نے گدی بڑھاتے ہوئے کہا۔
بلقیس نے جمال کو دیوان پر گرا کر گدی اس کے سر کے نیچے لگا دی۔
نسیم نے جمال پر کمبل ڈال دیا۔ پھر تینوں اس کے اردگرد بیٹھ گئیں۔ بلقیس سر کی جانب، رضیہ سامنے کی کرسی پر اور نسیم دیوان پر اس کے ساتھ لگ کے۔
تھوڑی دیر میں واقعی پھوار پڑنے لگی۔ چھت پر پانی کے قطرے چھن چھن کر بجنے لگے۔ اس پر سب کے چہرے خوشی سے کھل گئے۔

## کھل کے برس

دربار خان کا خوف جمال کے دل سے قطعی طور پر دور ہو چکا تھا۔ چاہے جانے والی رومانی فضا کی مدھم روشنی میں وہ بن پیئے ہی نشے میں تھا۔ معلوم ہوتا تھا سب نے تھوڑی تھوڑی پی رکھی ہے اور سب لڑکھڑا رہے ہیں۔

بلقیس چہک رہی تھی اگرچہ اس کی باتوں میں چاشنی نہ تھی۔ نسیم بظاہر جمال میں کوئی دلچسپی نہ لیتی تھی مگر اپنے جسم کے لمس سے اور آنکھوں آنکھوں میں پیغام دے رہی تھی۔ رضیہ کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا اور اس کو کوئی متوجہ بھی نہ کرتا تھا۔ وہ بور ہو گئی تو بولی "میں تو اب سوتی ہوں۔ بارش کے بعد جمال صاحب چلے جائیں گے۔ لڑکیاں چاہیں تو کچھ دیر اور بیٹھیں آپ کے پاس۔"
پھر وہ مسکرا کر اوپر چلی گئی۔
بلقیس نے کہا "آپ کا سر تو ابھی تک گیلا ہے۔ زکام ہو جائے گا۔ لایئے میں خشک کر دوں۔"
وہ آہستہ آہستہ جمال کا سر سہلانے لگی۔ اس کی رانیں جمال کے گالوں سے چھو رہی تھیں۔
تھوڑی دیر کے بعد کوئی بے معنی سی بات سناتے ہوئے اس نے جمال کا سر اپنی رانوں پر رکھ لیا۔ نسیم نے اس کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ وہ جمال کے بدن سے چپکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بلقیس کی بے معنی بات نہایت توجہ سے سنتی رہی۔
"کمبل اوپر ڈال لے چھوٹی۔" بلقیس نے اچانک نسیم سے کہا "سردی لگ جائے گی تجھے۔ بچوں کو احتیاط کرنی چاہیے۔"
نسیم نے اس پر کوئی احتجاج نہ کیا اور جمال کے کمبل میں منہ ڈال لیا۔ پھر سرک کر لمبی ہو گئی۔ بلقیس کو پتہ ہی نہ چلا۔
کیونکہ بڑوں کے ساتھ بچوں کا بستر میں سرک جانا ایک نارمل بات ہے۔

بلقیس جمال کا سر سہلاتے ہوئے زور زور سے فضول باتیں کرنے لگی تاکہ نسیم کو کسی قسم کا شک نہ پڑے۔ وہ آہستہ آہستہ جمال کے چہرے پر جھکی جا رہی تھی۔ اس کی پراشتیاق سانسوں کی گرم ہوا جمال کے گالوں پر پڑنے لگی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ بلقیس مسکرا کر بولی "میرا خیال تھا آپ سو گئے ہیں۔" مگر جمال سویا نہ تھا۔ مست تھا اور یہ مستی نسیم کے جسم کے لمس کی مستی تھی۔

جمال نے کہا "مجھے تو نیند آ رہی ہے۔"

"بارش بند ہونے میں ہی نہیں آتی۔" بلقیس بولی "بارش رکے تو جائیں۔ آپ ویسے تو جا نہیں سکتے۔"

نسیم نے کمبل میں سے منہ نکالا اور کہا "نیند تو مجھے بھی آ رہی ہے۔"

"تو پھر تو اوپر جا کر سو کیوں نہیں جاتی۔" بلقیس بولی۔ پھر کہنے لگی "مگر میں یہاں ایک غیر مرد کے ساتھ اس کالی گھور رات میں اکیلی تو نہیں بیٹھ سکتی۔ اس لیے تو رک فی الحال۔"

"تو آپ بھی چل کر سو جائیں پھپھو۔" نسیم بولی "مگر آپ کو نیند بھی تو کم ہی آتی ہے۔"

"ہاں۔ اوپر جا کر بھی تو جاگنا ہی ہے۔" بلقیس نے کہا۔

"تو آپ سلیپنگ پلز کھا لیں نا تاکہ نیند آ جائے بلکہ مجھے بھی دے دیں ایک گولی۔" یہ کہہ کر نسیم بلقیس کو کھینچنے لگی۔ "چلو نا پھپھو۔ اٹھو نا پھپھو۔"

بلقیس مجبوراً اٹھتے ہوئے جمال سے بولی "بارش تھمے بغیر نہ جائیے گا اور جاتے ہوئے بتی بجھا دیجیے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ اس بارش میں جا بھی کیسے سکتا ہوں۔" جمال نے کہا۔

"آپ کو میری قسم مت جائیے گا۔" بلقیس لاڈ سے بولی "چل چھوٹی اوپر چلیں ہم دونوں۔"

وہ آگے آگے چلی۔ نسیم نے دروازے کے پاس رک کر جمال کو ایک اشارہ کیا جسے جمال سمجھ نہ سکا۔

بارش کا زور اور بڑھ گیا۔ ہوا سیٹیاں بجانے لگی۔ اگر ذرا بھی وقفہ آتا تو جمال چلا جاتا۔ اس کو پتہ تھا کہ دربار خان کے بیمار گھرانے میں اتنی بے تکلفی بالآخر اچھی ثابت نہ ہو گی مگر اس میں کچھ قصور اس کا بھی تھا۔ نسیم کے بارے میں وہ فکرمند نہ تھا کیونکہ نسیم کامیاب سازش کی اہلیت رکھتی تھی مگر بلقیس ایک سادہ لوح اور پھسپھسی لڑکی تھی۔ وہ کوئی حماقت کر سکتی تھی۔ پھر رضیہ تھی جو چپ چاپ میدان چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اسے لڑکیوں کے ساتھ جمال کی بے تکلفی پر دل میں اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ دروازے کے پاس نسیم نے اسے جو اشارہ کیا تھا، اس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں اور اسی سوچ میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ بارش کی جھنکار بھی بہت سریلی تھی۔



ابھی اس کی نیند گہری نہ ہوئی تھی کہ ٹیلی فون کے سیٹ سے ٹن کی آواز آئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور باقاعدہ گھنٹی کا انتظار کرنے لگا۔ دربار خان کہیں سے ٹیلی فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس خیال سے وہ گھبرا گیا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد ٹن کی آواز پھر آئی مگر باقاعدہ گھنٹی نہ بجی۔ وہ سمجھ گیا کہ نسیم اپنے بیڈروم میں پڑے ہوئے ٹیلی فون سے جس کا کنکشن نیچے کے سیٹ سے ہے، مجھے چھیڑ رہی ہے مگر ہو سکتا تھا کہ یہ نسیم نہ ہو بلقیس ہو۔

اس نے منہ پر کمبل ڈال لیا اور سانس روک کر آواز سننے لگا۔

تھوڑی دیر میں اسے محسوس ہوا کہ کسی نے کمرے کی بتی بجھا دی ہے۔ کپڑوں کی سرسراہٹ کہے دیتی تھی کہ میں نسیم ہوں۔

وہ جمال کے پاس دیوان پر بیٹھ گئی اور آہستہ سے بولی "بدھو میرا انتظار نہیں کیا تم نے؟ سو گئے بچوں کی طرح!"

جمال اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گالوں سے ملنے لگا۔ وہ ڈھیلی ہو کر ٹوٹی ہوئی کمان کی طرح اس پر گر گئی۔ دونوں ساتھ ساتھ لیٹ گئے۔

جمال کے ہاتھوں میں مہتابیاں روشن ہو گئیں۔ اس کا بدن تن گیا۔ دونوں نے گردنیں گردنوں میں ڈال لیں۔ نسیم آہیں بھرنے لگی۔ دونوں کی ٹانگیں عشق پیچاں کی بیل کی طرح آپس میں گتھ گئیں۔ وہ ساتھ ساتھ چپٹے جھولنے لگے۔ دونوں کا خون گردش کرتے کرتے آپس میں الجھنے لگا۔

جمال نے نسیم کے کان میں کہا "بلقیس تو نہیں جاگ جائے گی؟"

"وہ تو کل دوپہر تک سوتی رہے گی۔" نسیم نے ہنس کر کہا "میں نے اسے ایک کی بجائے دو گولیاں کھلا دیں۔"

"اور رضیہ؟"

"رضیہ خراٹے لے رہی تھی جب میں کمرے سے نکلی۔ اب تم بہت آگے نہ نکل چلو۔" اس نے جمال کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا "آؤٹ آف باؤنڈ۔"

"حرج کیا ہے آخر؟" جمال نے رازداری سے کہا۔

"آگے حرج کی بات ہے۔"

"اگر تم نے مجھے روک دیا تو میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا پیاری۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں۔"

''تم کیوں نہیں سمجھتیں؟ کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں؟''

''ایمان سے بہت محبت ہے۔ ورنہ میں کیا یوں تمہارے آگے پڑی ہوتی اور کیا تم اس طرح میرا سینہ مسلتے؟''

''محبت میں کوئی کچھ بچا کر نہیں رکھتا، سب کچھ حوالے کر دینا پڑتا ہے۔''

یہ کہہ کر جمال نے پھر ہاتھ بڑھایا۔

نسیم چڑ کر بولی ''اگر تم ضد کرو گے تو میں چلی جاؤں گی اسی وقت...... ایک دن میری شادی بھی ہونی ہے آخر۔ اسے سیندھ لگا گھر ملا تو کیا ملا۔ تم تو اس وقت کسی اور کے بستر میں ہو گے۔''

جمال کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ شرارت سے ہنسی ''بس؟ ہو گئے ٹھنڈے ٹھار ایک ہی بات پر؟''

جمال کے بدن میں گرمی کی ایک لہر دوڑی۔ اس نے ایک ہاتھ سے نسیم کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور دوسرے ہاتھ سے قفل کھولنے کی کوشش کرنے لگا مگر ایک ہاتھ سے کبھی قفل نہیں کھلتا۔ نسیم اس کا بندوبست کر کے آئی تھی۔ وہ کبھی جمال پر بگڑتی، کبھی ہنسنے لگ جاتی۔ وہ قفل بند رکھنا چاہتی تھی مگر اس کا دل چاہتا تھا کہ جمال اسے کھولنے کی کوشش کرتا رہے۔ جمال تھوڑی دیر میں ہانپ گیا۔ اس کو نسیم پر غصہ آنے لگا۔ اتنی چھوٹی سی ہو کر بھی وہ اتنی ہوشیار نکلی۔ گانٹھ پر گانٹھ دے کر آئی تھی۔

''ناراض ہو گئے؟'' نسیم نے جمال سے پوچھا۔

''تمہیں دراصل میرا کچھ خیال نہیں۔'' جمال نے جواب دیا۔

نسیم بولی ''خیال ہے اور تم جانتے ہو۔ اس لیے اس کی قیمت وصول کرنا چاہتے ہو۔ چاہے اس کے بعد میری ساری زندگی برباد ہو جائے۔ بڑے خودغرض ہو تم! گیند گیند کھیلنے سے تو میں نے منع نہیں کیا۔ کیا یہ کم ہے؟''

جمال کے لیے گیند کھیلنے میں اب کوئی لذت نہ رہی تھی۔ خالی دوڑیں لگا لگا کر کون تھک نہیں جاتا جبکہ سکور کچھ بھی نہ ہوتا ہو۔

تھوڑی دیر کمرے میں خاموشی رہی۔

پھر نسیم لبوں کو پھول بنا کر بولی۔ ''میں تمہاری بات سمجھتی ہوں۔ میرا دل بھی تمہاری بات ماننے کے لیے بے قرار ہے۔ میں مجبور ہوں ڈارلنگ مگر ایک دن میں تمہاری خواہش پوری کر دوں گی۔ یہ میرا وعدہ رہا تم سے آج نہیں، پھر کبھی۔''

''پھر کب؟ کس دن؟''

''یہ تو مجھے پتہ نہیں مگر میری شادی ہو جانے دو۔ اس کے بعد میں موقع نکالوں گی۔ میں بات کی پکی ہوں!''

جانے سے پہلے نسیم نے اپنے گال جمال کے گالوں سے ملائے۔ اس کے بالوں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ اس کے لبوں پر گرم مگر بے لذت بوسہ دیا۔

دروازے کے پاس جا کر اس نے بتی جلا دی۔ کمرہ جگمگ جگمگ کرنے لگا۔ پھر وہ برآمدے میں غائب ہو گئی۔

دور گھڑیال نے تین بجائے۔ بارش ابھی تھمی نہ تھی۔ جمال نے کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لیں۔

## اب کون آیا

تھوڑی دیر میں وہ اونگھنے لگا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب کوئی اس کے دیوان پر آ کر بیٹھ گیا ہے۔ کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ جب اس نے آنکھ کھولی۔

اس نے سوچا کہ نسیم بالآخر میری بات مان گئی ہے۔ اس نے کہا ''شکریہ تم آ گئیں پیاری۔''

''مجھے پتہ تھا کہ آپ میرے انتظار میں ہوں گے۔''

رضیہ کی آواز سن کر جمال کی جان نکل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا ''ارے آپ؟ اس وقت؟'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

رضیہ رازداری سے بولی ''میں نے سوچا کہ رات ذرا ڈھل جائے تو آؤں۔ لڑکیاں گہری نیند سو جائیں پہلے۔ ایسی باتوں میں احتیاط کرنی چاہیے۔'' پھر وہ کسی قدر خفت کی ہنسی ہنسی۔

جمال کے دل میں اس کے لیے رحم کے سوا کوئی جذبہ نہ تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا ''مگر بیگم صاحبہ آپ کو اس طرح رات کے وقت میرے پاس نہیں آنا چاہیے۔''

''کیوں بھلا؟ کیا میں آپ کو اچھی نہیں لگتی؟''

''آپ تو بہت اچھی ہیں۔ میں تو دل سے آپ کی عزت کرتا ہوں بیگم صاحبہ۔''

''یہ کیا آپ نے بیگم صاحبہ بیگم صاحبہ کی رٹ لگا رکھی ہے۔ کیا آپ کو میرا نام نہیں آتا؟''

''آتا ہے جی۔''

''تو مجھے رضیہ کہیے، رجو کہیے، راضی کہیے۔''

''جی رضیہ جی۔''

''اب دل پر کسی کو اختیار تو نہیں ہوتا نا۔ اتنے اچھے ہیں آپ۔ اتنے بھولے ہیں آپ۔ اتنے ہمدرد۔ میری تو جان حاضر ہے آپ کے لیے۔''

وہ اس کے قریب سرکنے لگی۔ جمال ذرا سا پیچھے ہٹا۔

''ارے میں تو آپ کو بہت بہادر سمجھتی تھی مگر آپ کو شاید عورت کے قرب کا تجربہ نہیں ابھی۔''

''جی نہیں مجھے تجربہ نہیں۔''

ایمان سے مجھے پتہ تھا۔ آپ کو زندگی کی لذتوں کا علم نہیں۔''

پھر اس نے جمال کا ہاتھ پکڑ کر جلدی سے چوم لیا۔ جمال نے ہاتھ کھینچ لیا۔

''ڈریئے نہیں۔'' وہ بولی ''کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کسی بات کا۔ ایسی راتیں روز روز نہیں آتی نا۔''

جمال پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔

''توبہ ہے ایسی بھی کیا بے اعتنائی۔'' رضیہ بولی۔ ''کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔''

یہ کہہ کر وہ لپک کر جمال سے چمٹ گئی اور اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ بولی ''دیکھیے دل موا کیسے دھک دھک کر رہا ہے۔ کیسا جادو کر دیا آپ نے رضیہ پر۔ آپ آ بھی جایئے نا دیوان پر۔ اوئی کیسے بے درد ہیں آپ؟''

جمال کا گلا خشک تھا۔ تھوک اس سے نگلی نہ جاتی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے کہا ''بات یہ ہے رضیہ جی کہ آپ میری بزرگ ہیں۔ میں صاحب کا ادنیٰ ملازم ہوں۔ میرا آپ سے کوئی رشتہ ہو نہیں سکتا۔''

''اس کا نام نہ لیجیے اس وقت۔ وہ تو ایک پاگل شخص ہے۔ ہز میجسٹی کا کتا۔ موڈ خراب ہوتا ہے۔ دیکھیے تو یہ رات کس قدر سہانی ہے۔''

''جی ہاں۔'' جمال نے رکھائی سے کہا مگر ٹس سے مس نہ ہوا۔

رضیہ نے ایک لمبی آہ بھری اور بولی ''تو آپ نہیں چاہتے کہ میرا آپ کا کوئی رشتہ ہو جائے۔ چاہے آج ہی کی رات کے لیے ہو؟''

''میرا مطلب ہے......'' آگے جمال کے منہ سے کچھ نہ نکلا۔

رضیہ کچھ مایوس ہو گئی اور بولی ''رشتے اسی طرح بنتے ہیں مگر آپ نہیں چاہتے شاید۔''

''جی نہیں میں تو چاہتا ہوں کہ......''

''ٹھیک ہے آپ نہیں چاہتے۔ میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔ آپ کے قابل نا تجربہ کار اٹھتی جوانیاں ہیں اور وہ آپ کے اور ے تو رے گھوم بھی رہی ہیں۔ میری بھلا کیا حیثیت۔''

رضیہ جمال سے الگ ہو گئی۔ اس نے اپنی کھلی قمیص کے بٹن بند کر لیے اور بولی ''میں تو دل سے مجبور ہو کر آ گئی تھی آپ کے پاس۔ دل سوچنے نہیں دیتا ورنہ میں ایسی غلطی نہ کرتی۔ میں تو آئی تھی کہ آپ سے دو گھڑی بات کر لوں۔ ذرا جی بہلا لوں اور شاید خدا مجھے آپ کی طرح کا کوئی بیٹا عنایت کر دے مگر میری ایسی قسمت کہاں۔ آپ ابھی کھیل کود کی عمر میں ہیں۔ مرد نہیں بنے ابھی۔ گہری باتوں کا آپ کو علم نہیں۔ کچی امبیوں سے رغبت ہے آپ کو۔''

جمال بت بنا اس کی طرف دیکھتا رہا۔

رضیہ نے اپنے بال سمیٹے۔ دوپٹہ اوڑھا اور جس طرح ننگے پاؤں آئی تھی اسی طرح واپس مڑ گئی۔

دروازے کے پاس جا کر اس نے جمال پر ایک زہریلی نظر ڈالی اور بولی ''اب آپ کسی سے کوئی بات نہ کر بیٹھیے گا۔ اتنی عقل تو ہو گی آپ میں......''

جواب کا انتظار کیے بغیر وہ برآمدے میں غائب ہو گئی مگر بتی بجھا کر۔

جمال بت بنا دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے یہ سب کچھ مصنوعی لگ رہا تھا۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔

دیوان پر لیٹ کر اسے وحشت ہونے لگی۔ اس نے کمبل منہ پر ڈال لیا۔ وہ گہری نیند سونا چاہتا تھا مگر گہری نینداس سے کوسوں دور تھی۔

## اندھیرا اجالا

تھوڑی دیر میں بتی پھر روشن ہو گئی۔ رضیہ پھر آ گئی ہے شاید! اس نے سوچا۔

جمال نے گھبرا کر کمبل سے منہ نکالا تو دیکھا رضیہ نہیں نسیم کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''تم کیوں آ گئیں نسیم؟'' جمال نے بے چینی سے پوچھا۔

''یہ بتانے کے لیے گندے بچے کہ تم بہت اچھے بچے ہو۔''

نسیم اِٹھلا کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور بولی ''میں ساری باتیں تو نہیں سن سکی مگر اور کیا کہتی تھی مائی؟ منتیں کرتی تھی نا بیچاری؟''

''بکواس مت کرو۔'' جمال نے غصے سے کہا۔

''ایمان سے تم بہت پیارے ہو۔ تم نے خوب دھتکارا اسے۔ وہ سمجھتی ہو گی کہ تم کچے ہو۔ اس کے پھندے میں پھنس جاؤ گے مگر کیا تمہیں واقعی عورت مرد کے قرب کا ابھی تجربہ نہیں؟ یہ بات ماننی ذرا مشکل ہے۔''

''اب جاؤ اور جا کر سو جاؤ۔'' جمال نے بے زاری سے کہا۔

''مگر بتاؤ نا کیا تمہیں بالکل تجربہ نہیں۔'' نسیم نے اشتیاق سے پوچھا۔

''خدا کے واسطے میری جان چھوڑ دو۔'' جمال نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''چلی جاتی ہوں، چلی جاتی ہوں۔'' نسیم بولی ''میں تو تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے آئی تھی کہ تم بہت اچھے بچے ہو۔ اگر تم نے رضیہ کو ہاتھ بھی لگایا ہوتا تو میں شور مچا دیتی ایمان سے۔ اب میں یہ ساری کہانی سہیلیوں کو بتاؤں گی اور پوچھوں گی کہ کیا تمہارے بوائے فرینڈ بھی ایسے ہی وفادار ہیں؟''

جاتے ہوئے نسیم نے پھر بتی جلا دی اور اس کا مطلب تھا کہ کمرے میں کچھ بھی نہیں ہو رہا۔

## رات گئی بات گئی

صبح سویرے اپنے ہوٹل میں پہنچ کر جمال بستر پر اینٹ کی طرح گر گیا۔ اس وقت اس کی سب سے

بڑی آرزو تھی کہ مجھے کسی طرح نیند آ جائے۔ کروٹیں بدلنے اور کراہنے کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔

کھڑکی میں سے دھوپ آ رہی تھی۔ آسمان نے گہری نیلی چادر اوڑھ لی تھی۔ ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ وہ دن بھر کمرے سے باہر نہ نکلا۔ رات کو اس نے ایک گھٹیا فلم دیکھی۔ راجا بازار سے نان کباب کھائے۔ پان میں لونگ ڈال کر منہ لال کیا۔ دوسرے دن وہ مری چلا گیا۔ دراصل وہ اپنا منظر تبدیل کرنا چاہتا تھا۔

اگلے روز اس نے کپڑے بدلے اور عین دفتر کے وقت دربار خان کی کوٹھی پر پہنچ گیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

رضیہ اسے دور سے دیکھ کر کسی قدر خجالت سے مسکرائی مگر کھڑکی کے قریب نہ آئی۔

بلقیس نے کہا ''مجھے پتہ تھا کہ آپ بیمار ہو گئے ہوں گے۔ اب کیسی ہے طبیعت؟''

''پتہ ہے، پتہ ہے۔'' نسیم اِٹھلا کر بولی۔ ''آپ سے کس نے کہا تھا کہ اتنی زور کی بارش میں گیارہ ہی بجے چلے جائیں۔ اتنی سردی تھی ایمان سے!'' پھر وہ ایک ٹانگ پر کودتے ہوئے گول گول چکر لگانے لگی۔

اتنے میں ہارن بجا اور سب چوکنے ہو گئے۔

دربان نے دروازہ کھولا۔ سب سمجھ گئے کہ صاحب کی جیپ آ رہی ہے۔

بلقیس اور نسیم کھسک گئیں۔ جمال نے میز پر سر جھکا لیا۔ رضیہ برآمدے میں کھڑی رہی۔ گھنٹے بھر کے بعد دربار خان نے جمال کو دفتر میں طلب کر لیا۔

''آج کے اخبار دیکھ لیے تم نے؟'' اس نے پوچھا۔

''جی؟ جی نہیں ابھی۔'' جمال نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو جا کر۔ میں تمہیں نکال کر شکر کروں گا۔'' دربار خان نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا ''جنگ ختم ہو چکی ہے اور اب تمہاری جی ایچ کیو کو کوئی ضرورت نہیں۔ تھوڑی دیر میں تمہیں نوٹس مل جائے گا۔ جاؤ اور اپنے کاغذات سمیٹو مگر ٹھہرو۔ میں دیکھنا چاہوں گا کہ تم یہاں سے کیا کیا لے کر جا رہے ہو۔''

جمال اسی شام فرنٹیئر میل میں بیٹھ گیا۔

دربار خان سے اس کی پھر کبھی ملاقات نہ ہوئی۔

رضیہ کی اس نے پھر کبھی صورت نہ دیکھی۔

بلقیس پاکستان بننے کے بعد انگلینڈ چلی گئی۔ برتن مانجھنے اور خصم ڈھونڈنے۔

نسیم سے اس کی ایک اور ملاقات ہوئی۔ تیس برس بعد!

مگر یہ بات یہاں غیر متعلق ہے۔

# باب 7

شام کو جب جمال نور پور کے ریلوے سٹیشن پر اترا تو مشتاق اور فدا محمد دونوں اس کے استقبال کے لیے پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔ مشتاق گورداسپور میں اے ڈی آئی تھا اور فدا محمد ایک مرتبہ فیل ہونے کے بعد دوسری مرتبہ منشی فاضل کی تیاری میں مصروف تھا۔

گھر پہنچتے پہنچتے جمال نے اپنی راولپنڈی کی پوری داستان کہہ سنائی۔ رضیہ کی کہانی پر وہ بہت ہنسے مگر مشتاق نے کہا، کسی کا دل توڑنا گناہ ہے۔ اصل میں تمہیں زندگی کا کوئی تجربہ نہیں اور اس کی تلافی ہونی چاہیے۔

## آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں

اگلے روز مشتاق نے تاجی سے کچھ باتیں کیں۔ وہ جمال کی طرف دیکھ دیکھ کر شرارت سے مسکراتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد مشتاق نے جمال سے کہا ''اوپر چھت پر چلو۔ وقت ہو گیا ہے۔''

چاروں طرف بچے گڈیاں اڑا رہے تھے۔ کچھ دیر وہ ان کو دیکھتے رہے۔ پھر پیچھے سے اڑتی ہوئی ایک گڈی کی ڈور جمال کی گردن میں لپٹ گئی۔ چھ سات گھر دور ڈور ہاتھ میں لیے لالی موتیے کی ڈال کی طرح کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کے سر پر دوپٹہ نہیں تھا۔ اس کی سنگ مرمر کی بنی ہوئی چھاتی اتنے فاصلے سے بھی صاف نظر آ رہی تھی۔

لالی کے بارے میں فدا محمد اور مشتاق نے جمال کو بہت کچھ بتا رکھا تھا۔ وہ ایک لاوارث لڑکی تھی۔

بلا کی حسین، فاقوں کی ماری اور جیالی۔

اس کے پاس کھو دینے کو ایک جوانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ نور پور کے جوان اس کی ایک ایک ادا پر مرتے تھے۔ بوڑھے اسے مار مار کر تھک چکے تھے اور عورتوں نے اسے کنجری قرار دے رکھا تھا مگر وہ اتنی دلفریب تھی کہ اسے کنجری کہنے والی عورتیں بھی اس کی راہ دیکھتی رہتی تھیں۔ تاجی اس کی رازدار سہیلی تھی۔

سب سے پہلے اس کی رسم و راہ فدا محمد سے ہوئی تھی۔ اسی نے اسے مشتاق سے ملایا تھا اور اب وہ ان کے کہنے پر جمال کی منتظر تھی۔ لالی نے کبھی کسی سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا تھا۔ کبھی کسی سے اپنی حالت بیان نہ کی تھی۔

تاجی کا پیغام اس کو مل چکا تھا اور اپنے چھوٹے بھائی کی گڈی کی ڈور ڈھیلی چھوڑ کر اس نے جمال سے ملاقات پر رضامندی کا اظہار کر دیا تھا۔ اس کے نزدیک مشتاق، فدا محمد اور جمال میں فرق نہ تھا۔ تینوں اس کے مقابلے میں اپر کلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ان کے پاس جسم کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے نہیں بلکہ چند لمحوں کے لیے اپنی غربت، بے بسی اور بے کسی کو بھول جانے، چاہے جانے، لپٹائے جانے اور اپنی نچلی سطح سے اوپر اٹھ جانے کے خیال سے آتی تھی۔

جمال اس گڈی اڑاتی ہوئی، ہنسی جھولتی اور مٹکتی ہوئی لذت کو بے خود ہو کر دیکھنے لگا۔ اس کے پھٹے ہوئے کپڑوں، ٹوٹی ہوئی جوتی اور بھوکے پیٹ کا اسے بالکل خیال نہ آیا۔

''کیسی ہے؟'' مشتاق نے پوچھا۔

''یہ تو گندھارا کا بت ہے۔ نور پور میں کیسے پیدا ہو گئی یہ حسینۂ عالم۔''

''تب دیکھنا جب یہ بت تمہاری جھولی میں گرے گا۔''

''مگر گر کیسے جائے گا؟'' جمال نے پوچھا۔

''وہ آئے گی نا۔'' مشتاق نے جواب دیا۔

''آئے گی کیسے؟'' جمال نے سوال کیا۔

''آئے گی۔ شیر کی بچی ہے۔ اس نے آج تک کبھی ہمیں دھوکا نہیں دیا۔''

شام بہت لمبی ہو گئی۔ رات آنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ بہت انتظار کے بعد بھی بمشکل نو ہی بج سکے تھے۔

نور پور کے لوگ دروازے بند کر کے سو چکے تھے۔ گلیاں سنسان ہو گئی تھیں۔ کتے بھونکنے لگے تھے۔ جمال ذرا سی آہٹ پر سیڑھیوں کی طرف دیکھتا پھر منہ پھیر لیتا۔ مشتاق پان کھاتا اور ہلکے سُروں میں ٹھمریاں گاتا۔

وہ مشتاق کی حویلی کی تیسری منزل پر تھے جس میں گھر کے لوگ رہتے نہ تھے۔ گھر میں داخل ہو کر تین چکر دار سیڑھیوں کے بعد وہ کمرہ آتا تھا جس میں جمال اور مشتاق لالی کا انتظار کر رہے تھے۔

دو بج گئے۔

## رات کی بات

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا۔ لالی کے پیچھے ایک اور لڑکی بھی تھی۔ جوتیاں انہوں نے ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھیں تاکہ ان کے قدموں کی چاپ کسی کو سنائی نہ دے۔

''یہ چھیماں ہے میری سہیلی۔ میں اسے بھی ساتھ لے آئی ہوں۔'' لالی نے آہستہ سے کہا۔

چھیماں نے لالی کا پلو پکڑ رکھا تھا۔ اسے جوانی نے ابھی چھوا ہی تھا۔ اسے اس کے اسرار معلوم نہ تھے۔ اس کا خیال تھا کہ میں کسی خطرے کو متوجہ کرنے کے قابل ہی نہیں۔ لالی نے اسے بہت کچھ زبانی بتا دیا تھا اور اب وہ اس کے تجربے کو قریب سے محسوس کرنے کے خیال سے چلی آئی تھی۔ اس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہاں جمال کے علاوہ وہ مشتاق بھی ہوگا جو لڑکیوں سے مساوی سلوک کا قائل ہے۔

دونوں نے ایک لحظہ کے لیے دم لیا۔ لالی کے چہرے کی دلربا مسکراہٹ سے کمرہ روشن ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں سے رس ٹپک رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ابھی لڑکھڑا کر گر جائے گی۔ جمال کے دل کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اس نے لالی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مشتاق نے چھیماں کی کمر میں ہاتھ ڈالا تو وہ گھبرا کر بولی ''میں تو اندھی ہوں''

''میں بھی اندھا ہوں۔'' مشتاق نے سنجیدگی سے جواب دیا اور اسے اٹھا کر چھت پر لے گیا۔ جہاں دن میں لالی نے گڈی پھینکی تھی۔ ''ہائے میں مر گئی لالی۔ اب میں کیا کروں۔'' چھیماں نے دبے لفظوں میں فریاد کی۔

جمال نے دروازہ بند کر لیا۔ لالی کی خوشبو سے جمال کا رواں رواں مہکنے لگا۔ اس کے خون میں کسی نے ہلکی شراب کی ایک بوتل انڈیل دی۔ جسم کے تناؤ نے اسے شکنجے میں کس دیا۔ اس نے لالی کو پلنگ پر لٹا لیا۔

## کویراج ہرنام داس

اچانک کویراج ہرنام داس کونے میں نکل کر اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنی کتاب ہدایت نامہ خاوند ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ ان کی آنکھوں میں دانائی کا اسرار تھا۔ انہوں نے کہا ''ٹھہر جا بے وقوف۔''

جمال ادب سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ سرگوشی میں بولے ''عورت ایک خوبصورت ستار ہے جسے بجانے سے پہلے سر کرنا پڑتا ہے اور مرد ایک جتا ہوا گھوڑا کہ باگ اٹھائی تو چل دیا۔''

جمال نے نکتے کی یہ بات بہت سال پہلے کویراج کی کتاب میں پڑھ رکھی تھی اور اسے پلے باندھ لیا تھا مگر لالی کو دیکھ کر وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ اسے بڑی شرم آئی۔

اس نے سوچا کہ میں پہلے ستار کو سر کر لوں پھر گھوڑے کو جوتوں۔ استاد آپ ہی فرماتے ہیں۔ اس نے ستار کی گھنڈیاں گھمانی شروع کر دیں۔ لالی کے کرتے کے بٹن زیادہ سخت نہیں تھے۔ مگر جمال کو یہ پتہ نہ تھا کہ ستار سر ہو جائے تو اس میں سے کیسی راگنیاں نکلتی ہیں۔ کویراج ہرنام داس نے اپنی کتاب میں ایسی کوئی راہنمائی نہ کی تھی۔

وہ دیوانہ وار ستار کی گھنڈیاں گھماتا رہا۔ ستار نے اس معاملے میں کوئی مداخلت نہ کی۔ ستار ہمیشہ چپ چاپ لیٹی رہتی ہے۔

گھوڑا جتا ہوا کھڑا رہا۔ جمال نے اس کی باگ ہی نہ اٹھائی وہ ستار ہی کو چھیڑتا رہا اور اسے پتہ نہ چلا

کہ اس میں کتنا وقت نکل گیا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ مشتاق کوٹ کے بٹن بند کر رہا تھا۔ اندھی کے بال کھلے تھے۔ وہ چھوٹی چھوٹی ہچکیاں لے رہی تھی "واٹ ہیپنڈ؟" اس نے جمال سے پوچھا۔ "کچھ ہوا؟"

"نتھنگ یٹ۔" جمال نے شرمندگی سے جواب دیا۔ "کچھ بھی نہیں۔"

"بے وقوف گدھا۔ روشنی ہونے والی ہے۔ نمازی مسجدوں کو جانے والے ہوں گے۔ لڑکیوں کو فوراً واپس چلے جانا چاہیے۔"

لالی کپڑے پہن چکی تھی مگر اس کے چہرے پر وہی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ اس نے کوئی بات نہ کی۔ مشتاق نے کہا "تم نے وقت ضائع کر دیا ناحق۔ تم تو تھس آدمی ہو۔ تم میں جرأت نہیں ہرگز!"

جمال نے سر جھکا لیا۔ لالی بولی "کوئی بات نہیں جامی۔ میں پھر آ جاؤں گی۔ شروع میں ایسا ہو جاتا ہے۔"

پھر وہ اندھیرے میں سیڑھیاں اترنے لگی۔ چھیماں نے اس کا پلو پکڑ رکھا تھا۔

مشتاق ان کے جانے کے بعد بولا "سالی مانتی ہی نہ تھی۔ کہتی تھی میں تو ایسے ہی چلی آئی تھی۔ کہتی تھی میرا ابا مجھے مار ہی ڈالے گا۔ میرے ابا کی پگڑی مٹی میں نہ رولو۔ میں اندھی بدصورت ہوں۔ مجھے چھوڑ دو، میرے پاؤں پڑتی تھی۔"

"پھر؟" جمال نے بے چینی سے پوچھا۔

مشتاق بولا "میں نے اسے نرمی سے سمجھایا۔ پیار کیا۔ ساتھ لپٹایا مگر وہ مچل مچل کر میری بغل سے نکلتی تھی۔ پھر میں نے اسے ایک چانٹا مارا۔ یار چانٹا بڑے کام کی چیز ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟" جمال نے سوال کیا۔

مشتاق ہنس کر بولا۔ "پھر اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیے اور چپ چاپ زمین پر لیٹ گئی۔ یار سردی بہت تھی ننگی زمین پر۔ تم کہو کوئی بات بھی ہوئی لالی سے؟"

"بات تو ہوئی مگر ہر بات کے جواب میں وہ کہتی تھی "بس جی مفید۔" اس کا مطلب میں نہیں سمجھا۔"

مشتاق نے قہقہہ مارا۔ "تم نے کیا کہا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"میں نے کہا تھا میں تمہیں نئے کپڑے سلوا دوں گا۔ جوتی بھی لے دوں گا عید پر۔ کہنے لگی بس جی مفید۔ بس جی مفید۔"

"اوہو!" مشتاق بولا۔ "اس کا مطلب تھا بس جی شکریہ۔ مفید کا لفظ اس نے کہیں سے سن لیا ہوگا۔"

دونوں ہنسنے لگے۔

## ستار پر گت

جمال کی ناکامی سے مشتاق کی ذمہ داری اور بڑھ گئی۔ اگلے روز جب وہ فدا محمد کے ساتھ لسی پینے کے لیے بازار گئے تو فیصلہ ہوا کہ جمال بالکل بدھو ہے۔ اس کا علاج فوری طور پر ہونا چاہیے۔ فدا محمد کو لاہور فوری طور پر جانا تھا۔ بات اگلے ہفتے پر جا پڑی۔

ایک ہفتے کے بعد جمال جیسا کہ طے ہو چکا تھا، صبح سویرے ہی فدا محمد کے گھر جا کر بیٹھ گیا۔ پروگرام کے مطابق دونوں تاش کھیلتے اور شعر کہتے رہے۔

پورے دو بجے لالی کھیس کی بکل مارے سیڑھیاں چڑھ آئی۔ وہ ماسی ماسی کے نعرے مار رہی تھی تاکہ محلے والے کچھ خیال نہ کریں۔

اسے دیکھ کر فدا محمد نے کہا "لالی تم اسے وقت ضائع نہ کرنے دینا۔ یہ بے وقوف ہے۔"

"تم کہاں جا رہے ہو؟" جمال نے گھبرا کر پوچھا۔

"نور جہاں میری منتظر ہوگی۔" فدا محمد نے کہا اور اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی جمال نے کویراج پرنام داس کو دھکا دے کر دروازے سے باہر پھینکا۔ اندر سے چٹخنی چڑھا لی۔ ستار کو سر کرنے کا اس نے خیال نہ کیا۔ فوراً ہی گت چھیڑ دی اور سم پر پورا اتر آیا۔

## جوڑوں کا درد

نور جہاں کو فدا محمد کچھ پہلے رام کر چکا تھا۔ اس کی ماں کو دونوں کے دوستانہ تعلقات کی حد تک کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ اسے نوجوانوں کے بنیادی حقوق کا معاملہ سمجھتی تھی مگر اس کو بدنامی سے خوف آتا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس کے سوتیلے بیٹے جائیداد کے جھگڑے کی وجہ سے اس کے گھر آتے جاتے نہ تھے اور رسالدار باہر کی حویلی میں پڑا رہتا تھا۔ ایک فدا محمد تھا جو نور جہاں کی والدہ کی سوجی ہوئی ٹانگوں پر تیل کی مالش کر دیتا تھا۔

جوڑوں کے درد نے بیچاری کو بہت بے حال کر رکھا تھا۔ اب وہ رات کے علاوہ دن میں بھی برانڈی پینے پر مجبور تھی۔ برانڈی خریدنا اور چوری چوری اسے لا کر دینا بھی فدا محمد کی ذمہ داری تھی۔ ان حالات میں اس سے نور جہاں کا چھپنا اور دور رہنا ناممکن تھا۔ جب نور جہاں کے لیے آنے والے رشتوں کو نور جہاں کے سوتیلے بھائیوں نے بھگا ہی دیا تو وہ فدا محمد کی محبت کا دم بھرنے لگی۔ نور جہاں کی والدہ کو صرف اسی قدر معلوم تھا۔

آگے کا راستہ نور جہاں اور فدا محمد نے خود نکال لیا۔ دنوں بڑھیا کو بھر بھر کر جام دیتے۔ اس پر غنودگی طاری ہو جاتی تو گھونگھٹ کے سارے پٹ کھل جاتے۔ کبھی فدا محمد خود چسکی لگا لیتا اور کبھی نور جہاں اس کو اکساتی مگر برانڈی سے فدا محمد کی تسلی نہ ہوتی تھی۔ وہ کہتا کہ "برانڈی میں نشہ نہیں ہوتا۔ یہ تو فقط جوڑوں کے درد

کی دوا ہے۔نور جہاں تم چکھ کر دیکھ لو۔"

نور جہاں نے بالآخر اس کی بات پر یقین کر لیا اور ایک گھونٹ پی لیا۔اسے کچھ بھی نہ ہوا۔

کچھ دنوں کے بعد فدا محمد لونگ والا پان کھا کر کھیل ہی کھیل میں نور جہاں کے ہونٹ رنگنے لگا اور ایک دن دونوں کسی خاص ارادے کے بغیر بانہوں میں بانہیں ڈالے پیار کی وادی میں اتر گئے۔نور جہاں کی والدہ اس وقت مدہوش پڑی تھی۔

لالی اور نور جہاں میں بھی فدا محمد کی خواہش کے مطابق گہری دوستی ہو چکی تھی۔ بظاہر ان میں مالکن اور ملازمہ کا رشتہ تھا مگر دونوں ایک دوسری کی راز دار تھیں۔ مثلاً نور جہاں کو علم تھا کہ آج جمال اور لالی فدا محمد کے گھر میں ملاقات کریں گے۔ ہو سکتا ہے کہ جمال پھر کوئی دلچسپ حماقت کر جائے۔ پہلی حماقت کا اسے بخوبی علم تھا۔

اس روز جمال نے کوئی حماقت نہیں کی۔ لالی فدا محمد کے چوبارے سے سیدھی نور جہاں کے گھر گئی۔

## دیوی دیوتا

نور پور میں جمال کا لمبے عرصے تک رہنا بہت مشکل تھا۔خواجہ لیٹین اس سے مشکل سوال پوچھتے تھے۔مثلاً اب کیا کرو گے،نوکری کیسے ملے گی،کب تک بیکار بیٹھو گے۔

تین چار سو کی رقم اس کی جیب میں تھی اور اس کا خیال تھا کہ میرا مستقبل محفوظ ہے۔اپنے محفوظ مستقبل کو جیب میں ڈال کر وہ مشتاق کے پاس گورداسپور چلا گیا کہ وہاں ایک ایسا گھر تھا اور ایسے لوگ تھے جو جمال کو دل سے پیار کرتے تھے۔

مشتاق یہاں کے محکمۂ تعلیم میں ایک چھوٹا موٹا افسر سا تھا۔وہ ہمیشہ کی طرح خوش و خرم تھا۔اس کی بیوی بھی زندگی سے مطمئن تھی۔اس گھر میں جمال آزادی کی زندگی گزار سکتا تھا۔مشتاق کو روزانہ کچھ بھی نہ کرنا پڑتا تھا۔مہینے میں ضلعے کے سکولوں کے ایک آدھ دورے میں اسے کوئی زحمت نہ کرنی پڑتی تھی۔

وہ اب بھی بے فکرا اور لاابالی تھا...... جوگی جیسے چرخے کی گھوک سن کر لوبھ میں ٹیلے سے اتر کر دروازے دروازے پھرتا اور رس بھرے گیت گاتا ہو۔وہ ایک شہزادہ تھا سر پر مکٹ سجائے سیس نوائے زندگی کی دیوی کے چرنوں میں مدھ ماتا۔

گورداسپور میں دیویوں کی کمی نہ تھی۔ وہ تو خود بال کھولے اکتارے اٹھانے پجاریوں کی آرتی اتارتی تھیں اور مشتاق جیسا پجاری کس دیوی کو ملتا ہے۔

اس پجاری کے ہاں ہر شام میٹھے مالٹے کی بوتل کھلتی تو دیوانے گریباں چاک کرنے لگتے۔صوفی، فقیر، گویئے، عاشق، شاعر اور طبلہ نواز اس کی کٹیا میں جھن جھن بجتے۔تانپورے کے بھراؤ میں من و تو کی تمیز نہ

رہتی تھی۔لذت کے اس دریا میں سے جس کو ایک چلو نصیب ہو جاتا، وہ بادلوں میں اڑنے لگتا۔

مشتاق کی بیوی نے اسے اس کے حال پر چھوڑ رکھا تھا۔وہ مشتاق کو بے قصور سمجھتی تھی۔لڑکیاں اس کا پیچھا ہی نہ چھوڑیں تو وہ کیا کرے۔وہ تو صرف پیتا ہے، گاتا ہے اور آ کر سو جاتا ہے۔بیویوں کو اور کیا چاہیے۔

جمال اس مجلس میں نیا تھا مگر اس کے بیٹھتے ہی حجاب اٹھ گئے۔قاضی نے مالکونس کا الاپ ختم کیا تو جمال میٹھے مالٹے کے تین پیگ چڑھا چکا تھا۔

## چھوٹے قد کا بڑا آدمی

رات دس بجے وہ آیا۔پیشانی کشادہ، آنکھیں چھوٹی اور سر کے بال جمے ہوئے۔

اس نے دیسی اون کی جوگیا اچکن پہن رکھی تھی۔ پاجامہ میلا اور بوٹ پالش کیے بغیر۔ وہ نہ خوبصورت تھا نہ بدصورت۔وہ ایسا آدمی تھا جس پر کوئی دھیان نہ دے، کم سے کم پہلی نظر میں۔

مشتاق نے کہا "آ بھئی مفتی! یہ ابھی ابھی ڈمس ہو کر آیا ہے راولپنڈی سے۔میرا بھانجا ہے مگر دوست بھی ہے۔"

"تمہارا بھانجا ہے۔" مفتی نے گٹھڑی زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔پھر جمال کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے بولا "کیا تمہارے خاندان میں سانپ ہی پیدا ہوتے ہیں۔اسے کہو یوں کنڈلی مار کر نہ بیٹھے......"

جمال گھبرا گیا۔

"......ورنہ کہیں ڈنگ کھا جائے گا اور کوئی ناگن تڑپ تڑپ کر جان دے دے گی۔خدا کی زمین میں فساد پھیلانا اچھی بات نہیں۔"

جمال کا رنگ لال ہو گیا۔"نہیں جی۔" اس نے کہا۔"ایسی کوئی بات نہیں جناب۔"

"میرا نام مفتی ہے۔خبردار جو مجھے کبھی آپ جناب کہا۔"

مفتی جمال سے کم و بیش پندرہ برس بڑا تھا اور اتنی بڑی عمر کے آدمیوں کو جمال نے کبھی نام لے کر مخاطب نہ کیا تھا۔

مشتاق نے گٹھڑی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "یہ کیا لائے ہو؟"

مفتی بولا "جوڑی ہے امرتسر سے لایا ہوں۔تم نے جو کہا تھا کہ طبلہ سیکھنا ہے تو پہلے جوڑی خریدو۔لو سکھاؤ اب۔"

مشتاق نے اسے کہا ضرور تھا مگر اس کو یہ خیال نہ تھا کہ وہ اسی روز امرتسر جا کر طبلہ خرید لائے گا۔

مفتی گورنمنٹ ہائی سکول میں ماسٹر تھا اور مشتاق کے پڑوس میں رہتا تھا۔مشتاق کے رنگ دیکھ کر اسے ملنے چلا آیا تھا۔

مشتاق نے جوڑی کھول کر بجائی، پھر مفتی کو بول یاد کرانے لگا۔دھگ نک تک دھن۔دھگ نک

تک دھن۔ ایک دو تین چار۔ جیسے وہ پہلی جماعت کا بچہ ہو۔ کل طبلے پر انگلی رکھنا سکھاؤں گا۔ اس نے کہا۔

پھر مشتاق نے طبلہ بجانا شروع کر دیا۔ حکیم نے کلیان ٹھاٹھ کی ٹھمری چھیڑی۔ سوکن گھر نہ جا۔ بیرن گھر نہ جا۔ طبلہ بجاتے ہوئے مشتاق کے بال اور بکھر گئے۔ مفتی طبلے پر نظریں گاڑے ایک بت کی طرح خاموش بیٹھا رہا۔

رات کو سونے سے پہلے جمال نے مشتاق سے کہا ''یہ مفتی عجیب آدمی معلوم ہوتا ہے۔''

''بہت عجیب۔'' مشتاق نے جواب دیا۔ ''استاد آدمی ہے۔''

''کس بات میں؟'' جمال نے پوچھا۔

''ہر بات میں۔ ہم تو بچے ہیں اس کے سامنے۔''

''اچھا!''

''بہت بڑا ادیب ہے۔ بڑے بڑے رسالوں میں افسانے چھپتے ہیں اس کے۔ لڑکیاں اس کو خود خط لکھتی ہیں جناب۔ اس کو تمام گُر معلوم ہیں۔''

## مسئلے مسائل

اگلی شام زبیدہ کا مسئلہ پیش ہوا۔

''کیا کہتی ہے حسینہ؟'' مفتی نے ایک استادِ فن کی طرح پوچھا۔

مشتاق نے مایوس ہو کر کہا ''کہتی ہے میں نہیں ملتی کسی سے۔ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں۔ خبردار جو کبھی تم نے آئندہ کوئی رقعہ بھیجا۔ یار وہ نہیں مانے گی۔''

مفتی نے قہقہہ لگایا اور بولا ''مانے گی مانے گی بلکہ مان گئی ہے۔ پر تم بدھو ہو۔''

''کس طرح؟'' مشتاق نے معصومیت سے پوچھا۔

''سیدھی بات ہے۔'' مفتی بولا۔ ''اس نے تمہیں پیغام بھیجا ہے۔ اگر وہ واقعی تم سے کبھی ملنا نہ چاہتی تو پیغام کیوں بھیجتی۔ چپ رہتی کہ نہیں؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کا مطلب ہے، میں ملوں گی ضرور۔ ملوں گی میرے رانجھے۔''

''جانے بھی دے یار۔'' مشتاق نے ہنس کر کہا۔

''تم بے وقوف ہو مشتاق۔'' مفتی سنجیدگی سے بولا۔

''جب عورت نہ کہتی ہے تو ہاں کہتی ہے اور جب ہاں کہتی ہے تو وہ عورت نہیں ہوتی۔''

''وہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی ہے۔ وہ ہاں نہیں کہہ سکتی بے وقوف۔''

''ہو تو سکتا ہے۔'' مشتاق سوچتے ہوئے بولا۔ ''پھر وہ سلطانہ ہے۔ دیکھتا ہوں تو ہٹ جاتی ہے۔ نہیں دیکھتا تو کھڑکی کے ساتھ لگی رہتی ہے۔''

''گورداسپور کی قسمت خراب ہے۔'' مفتی بولا۔ ''گورداسپور میں تم جیسے بدھو آن بسے۔''

''مگر کیوں؟'' مشتاق نے پوچھا۔

''تم نے اچھی بھلی لڑکیوں کو پریشان کر رکھا ہے اور پوچھتے ہو کیوں اور اب اس قاتل کو لگا لائے ہو ساتھ۔ پتہ نہیں یہ کس کس کا ایمان خراب کرے گا۔''

جمال نے شرما کر کہا ''میں تو ابھی آیا ہوں۔''

مفتی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر مشتاق سے کہنے لگا۔ ''جو لڑکی تیرے قابو میں نہیں آتی یعنی تیرا خیال ہے کہ تیرے قابو میں نہیں آتی وہ اس ناگ دیوتا کے آگے ڈال دے۔ پھر بین آپ ہی آپ بجنے لگے گی اور سانپ کو بانبی سے نکال لے گی۔''

''میں تو کسی کو نہیں جانتا یہاں۔'' جمال نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''یہ تیرا خیال ہے برخوردار۔'' مفتی بولا۔ ''تیری خوشبو سے گورداسپور کی فضا معطر ہو رہی ہے۔ یہ تجھے پتہ نہیں۔ مشتاق کے کنڈ پر کوئی دیوتا اترے اور کسی کو پتہ نہ چلے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میری مان مشتاق۔ وہ اس کے حوالے کر دے۔ مجسٹریٹ والی۔ کیا نام ہے اس کا نکہت؟ ایک مرتبہ گزر جائے جمال اس کی گلی میں سے......''

اگلے روز مشتاق جمال کو لے کر نکہت کی گلی میں سے گزرا مگر کسی کھڑکی کے پردے بھی نہ ہلے۔ پھر وہ آ کر سامنے کے میدان میں کھڑے ہو گئے۔ مشتاق نے بندوق نکالی اور اڑتی ہوئی چیلوں کے نشانے لینے لگا۔ پاس پڑوس کی لڑکیوں کو اپنی موجودگی کی اطلاع دینے کی یہ اس کی تکنیک تھی۔

تھوڑی دیر میں ایک ایک کر کے کئی لڑکیاں منڈیروں سے لگ گئیں۔ مجسٹریٹ کے گھر کی چھت بھی روشن ہو گئی مگر جمال اچھی طرح سے نکہت کے نین نقش نہ دیکھ سکا۔

رات کو واقعہ سن کر مفتی نے کہا ''وہ تمہارے پیغام کی منتظر ہے۔ اسے رقعہ بھیجو۔''

''کیسے بھیجوں؟ کیا لکھوں؟'' جمال نے سوال کیا۔

دانائے راز نے جواب دیا ''لکھو میں تمہارے عشق میں دیوانہ ہو رہا ہوں۔ اگر تم مجھے جلد نہ ملیں تو میں مر جاؤں گا۔ اوپر اس کا نام نہ لکھنا۔ نیچے دستخط بھی نہ کرنا تا کہ رقعہ پکڑا جائے تو کچھ بھی ثابت نہ ہو سکے۔ یار یہ لڑکیاں بڑی بے وقوف ہوتی ہیں۔ پیار کے رقعے ضائع نہیں کرتیں۔ سنبھال سنبھال کر رکھتی ہیں اور بالآخر پکڑی جاتی ہیں۔''

جمال کو اس قسم کے فقرے بڑے پوچ لگے۔ اس نے کہا ''مفتی تم اتنے بڑے ادیب ہو۔ کوئی عمدہ سا فقرہ لکھواؤ۔ یہ کیا کہ میں تمہارے عشق میں دیوانہ ہو گیا ہوں۔''

''تم بے وقوف ہو۔'' مفتی نے دانائی سے جواب دیا۔ ''تم نہیں جانتے کہ لڑکیاں صرف پوچ اور گھٹیا فقروں سے متاثر ہوتی ہیں۔ وہ صرف ایسے آدمیوں کو پسند کرتی ہیں جو اوپر سے چھری کی دھار لگیں۔ خوبصورت ہوں۔ گھٹیا بات کریں اور کسی خطرے کی پرواہ نہ کریں۔ ان کے علاوہ کسی خوبی کی کسی لڑکی کو پرواہ نہیں ہوتی۔''

''ہاں ہاں لکھتے ہیں رقعہ۔'' مشتاق نے کہا۔

''مگر بھجوائیں گے کس کے ہاتھ؟'' جمال نے پوچھا۔

''مہترانی جو ہے۔ رقعہ پہنچانا مہترانی کی ڈیوٹی ہوتی ہے، ہر مہترانی یہ جانتی ہے اور یہ رقعہ تم خود بھی اس کے ہاتھ میں دے سکتے ہو۔''

''وہ کیسے؟''

''جب وہ سکول جانے کو نکلے تو اس کے ہاتھ میں تھما دو اور مڑ کر مت دیکھو۔''

''بھئی وہ مجسٹریٹ کی بیٹی ہے۔'' مشتاق بولا۔

''پکڑوا دے گی۔'' جمال نے کہا۔

''پکڑوا دے گی تو کیا ہوگا؟'' مفتی نے کہا۔

''پولیس کے حوالے کر دے گا اس کا باپ۔'' جمال نے جواب دیا۔

''پھر کیا ہوگا؟'' مفتی بولا۔

''جیل بھجوا دے گا کسی مقدمے میں۔'' مشتاق نے کہا۔

''آج تک کسی شریف باپ نے کسی آدمی کو اس بات پر جیل نہیں بھجوایا کہ اس نے اس کی بیٹی کو پیار کا رقعہ لکھا اور نہ کسی لڑکی نے اپنے باپ کو اپنے عاشق کا رقعہ دکھایا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ تم سے ملے گی نہیں اور وہ بھی بدنامی کے خوف سے۔ بدنامی سے لڑکیاں بہت ڈرتی ہیں۔''

''مگر یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ مجھے پسند کرے۔'' جمال نے کہا۔

مفتی بولا ''یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ کوئی نارمل لڑکی تمہارے آگے انکار کر ہی نہیں سکتی۔ شکر ہے اس بات کا تمہیں یقین نہیں ورنہ قیامت آ جائے گی گورداسپور میں۔''

جمال کو اپنے بارے میں ایسا گمان نہ تھا۔ پریتو سنگھ، اروناگھوش، نسیم، بلقیس، رضیہ اور لالی نے اپنے اپنے رنگ میں اس سے چاہت کا اظہار کیا تھا مگر وہ اپنی اپنی مجبوریوں میں گرفتار تھیں۔ کسی نے اسے محض استعمال کیا، کسی نے اس سے دال بھات کی ضمانت چاہی۔ کسی نے اپنی ذات کی تکمیل کے لیے اس کا سہارا مانگا۔ کسی کو ایک بیٹے کی آرزو تھی۔ کوئی بھی جمال کے تیر نظر سے گھائل ہو کر گری نہ تھی۔ کسی کو جسم کی آگ نے تپا کر مارا نہ تھا۔ جمال کو بھی کسی سے عشق نہ ہوا تھا۔ وہ اپنے بچپن کی گھٹن سے چھوٹ کر آزاد فضاؤں میں اڑ جانے کی سعی کرتا رہا۔ شمال کو جاتی ہوئی کالی کونجوں اور نوخیز لڑکیوں کو دیکھ کر اس کا دل اچھلنے لگتا تھا۔

جمال نے جیسا کہ مفتی نے کہا تھا نگہت کو رقعہ بھجوایا۔ نامہ بر کو لڑکی نے ڈانٹ دیا مگر رقعہ رکھ لیا۔ کئی روز وہ چھت پر نہ آئی۔ مشتاق نے کئی چیلیں مار گرائیں مگر کھڑکی نہ کھلی۔

مفتی نے کہا ''پہلا مرحلہ تو بخیر و خوبی گزر گیا۔ اب آگے بڑھنا چاہیے۔''

''آگے کیسے بڑھوں؟'' جمال نے پوچھا۔

''تم نے اس کا کمرہ دیکھ لیا ہے۔ گلی میں کھڑکی کھلتی ہے۔ رات کو جب وہ اکیلی پڑھ رہی ہوتی ہے۔ کھڑکی میں سے اندر کود جاؤ۔''

''اس سے بڑی حماقت اور کیا ہوگی۔'' جمال نے اس تجویز کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔

مشتاق نے بھی اس کی تائید کی۔

مفتی بولا ''اگر تم اس کی کھڑکی میں سے کود کر اندر جاؤ گے تو دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو وہ گھبرا کر شور مچا دے گی۔ اس صورت میں تم الٹی زقند لگا کر واپس آ سکتے ہو۔ دوسری صورت میں وہ حیران ہو کر چپ رہے گی۔ دارومدار اس پر ہے کہ تم کس طرح کمرے میں داخل ہوتے ہو۔ اگر اسے پہلے سے معلوم ہو جائے کہ تم رات کو اس کے کمرے میں آ سکتے ہو تو پھر وہ شور نہیں مچائے گی۔ تم کل جب وہ سکول جائے تو اس کے پیچھے پیچھے جا کر اسے کہہ دینا کہ جانِ من ہم تو مرے جا رہے ہیں اور تم ہم سے بات بھی نہیں کرتیں تو کیا پھر ہم تمہارے کمرے میں آ کر تم سے ملاقات کر لیں۔ اس بات کا وہ کوئی جواب نہیں دے گی مگر چوری چوری تمہارا انتظار کرے گی۔ اصل بات جرأت کی ہے۔ جرأت کو لڑکیاں بہت پسند کرتی ہیں۔''

''مجھ میں اتنی جرأت نہیں مفتی۔'' جمال نے کہا۔

''تمہیں کیسے پتہ ہے۔ جرأت تو کرنے سے ہوتی ہے۔ منہ زبانی نہیں ہوتی۔ جرأت کرو۔''

''اور اگر کوئی مصیبت آ گئی تو؟'' جمال نے کہا۔

''اس کا اندازہ تمہیں پہلے ہو جائے گا۔ جب تم راستہ چلتے اس سے بات کرو گے۔ کمرے میں جا کر تم اسے ڈرانے کی کوشش نہ کرنا۔ پہلی ملاقات میں دست درازی اچھی بات نہیں۔''

جمال مفتی کی باتوں میں آ گیا۔ اگلے روز اس نے سکول جاتی نگہت سے کہہ دیا کہ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ دروازہ توڑ کر آ جانے کو جی چاہتا ہے۔ وہ چپ رہی۔ اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

مفتی نے واقعہ سن کر کہا ''اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے تمہیں قبول نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ فوری طور پر تمہارے ساتھ کوئی قرارداد نہیں چاہتی۔ تھوڑی محنت کرو۔''

''یار تم سے بحث کرنا مشکل ہے اور مجھ پر سے تو ابھی میجر دربار خان کے گھرانے ہی کی تھکن دور نہیں ہوئی۔ میں نہیں چاہتا مزید کوئی جھگڑا، کوئی نئی مصیبت آن کھڑی ہو۔''

"آن کھڑی ہوگی تو سووہاٹ؟ پھر کیا ہو جائے گا؟"

## سووہاٹ

مفتی نہایت بزدل آدمی تھا مگر اس نے چہرے پر بہادری کا نقاب ڈال رکھا تھا۔ اصل میں یہ اس کی ذاتی آرزوئیں تھیں جنہیں وہ اپنے دوستوں کے ذریعے تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا مگر یہ باتیں جمال کو آہستہ آہستہ ہی معلوم ہوئیں۔ دیکھنے میں تو سووہاٹ مفتی کا فلسفہ زندگی تھا۔ وہ اس پر یقین بھی کرتا تھا اور بعض اوقات اپنے باپ یا افسر کے سامنے دونوں پیروں پر کھڑا بھی ہو جایا کرتا تھا۔

جمال کی زندگی میں بڑے گھاؤ تھے۔ وہ والدین سے سخت ڈرتا تھا۔ وہ اس کی جس خاندانی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے، وہ اسے پسند نہ تھی۔ اصل میں ابھی ذہنی طور پر وہ شادی کے لیے تیار ہی نہیں تھا اور اب وہ بے روزگار بھی تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کے ابا اس سے پوچھیں کہ تم نے جنگ کیوں ختم ہونے دی۔ جب تمہیں پتہ تھا کہ تمہاری نوکری اسی کی وجہ سے ہے۔

مفتی نے کہا "شادی سے صاف انکار کر دو۔"

"میرا باپ مجھے مار ڈالے گا۔" جمال بولا۔ "وہ بہت کمزور آدمی ہے۔ رشتہ داروں سے بہت ڈرتا ہے۔ میرے ماں باپ، بہن بھائی مجھ سے سب چھوٹ جائیں گے پھر کیونکہ لڑکی ہماری قریبی عزیزہ ہے۔"

"چھوٹ جائیں پھر؟" مفتی نے کہا۔

"ہمارے گھرانے میں دکھ پھیل جائیں گے۔ سب کی بے عزتی ہو جائے گی۔"

"ہو جائے۔"

"میری ماں پہلے ہی مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ وہ کبھی میری صورت نہ دیکھے گی۔"

"نہ دیکھے۔"

"میں نور پور کبھی نہ جا سکوں گا۔ سب مجھے آوارہ، بدکردار اور بے شرم سمجھیں گے۔"

"سووہاٹ!"

"سووہاٹ! سووہاٹ! سووہاٹ!"

اس نے جمال کے دل میں ایک نئے رویئے کو جنم دیا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے اندیشے سکڑ کر کونوں میں گھسنے لگے۔ خطرات نے گردن ڈال دی۔ ڈر نے کمبل اوڑھ لیا اور جمال نے ہاتھ میں بغاوت کی ڈانگ پکڑ لی۔ اس ایک لمحے نے اس کی زندگی بدل ڈالی۔

پھر کیا ہوا ایک عجیب فلسفہ تھا۔ جمال نے اس طرح کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ مفتی سے حوصلہ پا کر اس کے سارے بندھن یکدم ڈھیلے پڑ گئے۔ جال کھلنے لگے۔ وہ سمجھ گیا کہ خوف کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ خطروں میں پڑ جانے سے کچھ بھی نہیں بگڑتا اور جو کچھ ہونا ہے ہو جاتا ہے۔ احتیاط اور خوف کے باوجود۔ کیوں نہ پھر آدمی کھل کر جئے؟

کھل کر جینے کی راہ اسے مفتی نے سووہاٹ کے فلسفے میں دکھائی۔ اس نے غور کیا تو اسے معلوم ہوا کہ ہم لوگ روزانہ زندگی میں خواہ مخواہ ہی ڈرتے ہیں۔ صبح سویرے گھر سے نکلتے ہیں تو ہمیں دس کام ہوتے ہیں۔ لوگوں سے ملنا ہوتا ہے مگر ڈر ہوتا ہے کہ یہ کام نہیں ہوں گے۔ فلاں آدمی نہیں ملے گا۔ ملے گا تو بات نہیں مانے گا۔ مگر شام کو جب حساب لگاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دس کاموں میں سے آٹھ تو آسانی ہو گئے۔ نواں کام مشکل تھا مگر ہم نے کوشش اور دانائی سے اس مشکل کو حل کر لیا۔ دسواں کام ناممکن تھا نہ ہوا گویا ہم خواہ مخواہ ہی وسوسوں میں گرفتار رہتے ہیں۔ اگر کھل کر جئیں تو کتنا اچھا ہو۔ کام نہیں ہوتا...... سووہاٹ!

مگر جمال کو گورداسپور میں زیادہ کھل کر جینے کا موقع نہ ملا۔ وہ یہاں مہینہ بھر گزار چکا تھا اور بالآخر اسے لاہور جانا اور نوکری تلاش کرنی تھی۔ اس میں دشواریاں تھیں، کیونکہ جنگ کے خاتمے کی وجہ سے جگہ جگہ لوگ بے روزگار ہونے لگے تھے مگر زندہ تو بہرحال رہنا ہی تھا اور خوف جمال کے دل سے مفتی کے سووہاٹ فلسفے نے نکال دیا تھا۔

مفتی کو سکول ماسٹری سے سخت نفرت تھی۔ اس نے لاہور ریڈیو میں ملازمت کے لیے درخواست دے رکھی تھی۔ اچانک اسے تار ملا کہ فوراً حاضر ہو جاؤ۔

جمال نے کہا تو پھر دونوں اکٹھے ہی چلتے ہیں۔ لاہور تو کھل کر جینے کا بلاوا ہے۔

فدا محمد منشی فاضل کے امتحان میں دو مرتبہ فیل ہو کر تیسری مرتبہ تیاری کر رہا تھا۔ اس کا ارادہ قابلِ داد تھا۔ وہ دن بھر دفتر میں ٹائپ کرتا۔ شام کو آ کر کنگھی سے دبا دبا کر بالوں کی لہریں بناتا اور کپڑے بدل کر گھومنے نکل جاتا۔

فدا محمد دل محمد روڈ پر ایک لاج میں رہتا تھا جس میں غسل خانہ سب کے لیے مشترک تھا۔ کھانے کے لیے بھی اس نے ایک اجتماعی باورچی خانے کی رکنیت حاصل کر رکھی تھی۔ بازار سے بھی آدمی چھ آنے میں پیٹ بھر لیتا تھا مگر لنڈے بازار میں ابھی تک ایک آنے کی تنوری روٹی اور دال مفت مل جاتی تھی۔

## لاہور میں اجنبی

مفتی لاہور میں اجنبی تھا۔ اسے اپنے تمام تر اعتماد اور حکمت کے باوجود دوسروں سے خوف آتا تھا۔ وہ ایک صاحبِ طرز ادیب تھا جو عورتوں کی نفسیات پر انوکھے افسانے لکھا کرتا تھا۔ لوگ اس کے مشتاق تھے۔ اس احساس کی وجہ سے کہ میں دوسروں سے کمتر آدمی ہوں، وہ بڑی چمکیلی اور حیران کر دینے والی باتیں کیا کرتا۔ اس نے اپنی ذاتی زندگی میں بے انتہا جوتے کھائے تھے۔ وہ اپنے خاندان کا مجرم تھا۔ وہ اکیلا تھا اور اپنے اکیلے پن سے ڈرتا تھا۔ وہ انتہائی مخلص، جانثار اور محبت کرنے والا شخص تھا مگر اس نے اپنے تحفظ کے خیال سے اپنے چہرے پر سرد مہری کی جراب چڑھا رکھی تھی۔ دراصل وہ احساسِ کمتری کا مارا ہوا تھا۔

تھوڑے ہی دنوں میں مفتی سمجھ گیا کہ جمال سے چھپنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی راہبوں جیسی تنہائی سے بھی اکتایا ہوا تھا۔ زندگی میں اسے کہیں سے محبت بھی نہ ملی تھی۔ اس کے برعکس جمال میں ناتجربہ کاری کے باعث بے انتہا تازگی اور زندگی تھی۔ وہ ہر نئی ندی میں اس کی گہرائی کا خیال کیے بغیر کود جانے والا شخص تھا۔ دونوں میں دوستی بڑی تیزی سے بڑھی۔

مگر دونوں میں نظریاتی اختلاف بھی تھا۔

مفتی کو ریڈیو سٹیشن پر ادیب ملتے تھے اور یہاں سے ہٹ کر وہ ایک بڑے پبلشر کے بالاخانے پر بھی جایا کرتا تھا جہاں ادبی مباحثے ہوتے تھے۔ جمال کو یہ مباحثے بڑے دلچسپ لگتے۔ بمبئی میں اردو کے ادیبوں نے ایک نئی ترقی پسند تحریک چلا رکھی تھی مگر اس پر گفتگو لاہور ہی میں ہوتی تھی۔ ہندوستان کی آزادی کا غلغلہ تھا اور ہندو اور مسلمان دانشور آزادی کے بعد کے ہندوستان کی سماجی بست وکشاد کے بارے میں بات کرتے تھے۔ مفتی نئے ادبی فلسفے کے خلاف تھا جو ادب کو زندگی تبدیل کرنے کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ مفتی کہتا تھا کہ اس خیال کے ادیبوں نے عمدہ ادب پیدا کیا ہے مگر ادیب کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ زندگی کو جیسی کہ وہ ہے پیش کرے۔ اسے تبدیل کرنے کا کام سیاستدانوں کا ہے اور ادیب سیاستدان نہیں ہوتا۔

مفتی فرائیڈ کا مقلد تھا مگر وہ برٹرینڈ رسل کو بھی مانتا تھا۔ وہ اس کی آزاد خیالی کو فرد کی غیر مشروط آزادی کے معنی دیتا تھا۔ کلاسیکی اردو ادب سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میر و غالب تک بھی اس کی رسائی نہ تھی اور اقبال کا تو اس نے محض نام ہی سنا تھا مگر وہ ایک سچا اور گہرا ادیب تھا۔

وہ پکا مسلمان بھی تھا مگر خدا سے زیادہ وہ پیروں، فقیروں اور قبروں پر تکیہ کرتا تھا۔ اس نے جس قسم کی زندگی بسر کی تھی۔ اس میں علت و معلول کا باہمی رشتہ اس کو ہمیشہ جُل دیتا رہا اور اس کا خیال تھا کہ زندگی منطق سے عاری ہے یا یہ محض اچھے اور برے اتفاقات کی ایک لڑی ہے اور یہ لڑی نظر نہ آنے والے خدا سے کہیں زیادہ نظر آنے والے پیروں اور فقیروں کے ہاتھ میں ہے جو اللہ کے کارکن ہیں۔ اس کی باتوں کو جمال آہستہ آہستہ کئی سالوں کے سفر کے دوران ہی سمجھ سکا۔ فی الحال وہ میلے میں کھویا ہوا ایک دیہاتی بچہ تھا۔ وہ ہر چیز کو چکھ کر دیکھنا چاہتا تھا اور دھرتی کی چال کو تبدیل کر دینا چاہتا تھا۔ یہ اس کی اپنی زندگی کا دباؤ تھا۔ اس کے محرکات داخلی تھے مگر وہ خارجی حقیقتوں کو نئی جہت دینا چاہتا تھا۔ اس عمل میں اس کی ذاتی ترقی، نشو و نما اور تحفظ کو کوئی دخل نہ تھا۔

جمال جو دھرتی کا دھرا تبدیل کر دینا چاہتا تھا، مفتی جو کچھ بھی تبدیل کرنا نہ چاہتا تھا اور فدا محمد جو صرف اپنا طبقہ اور اپنا سماجی مقام تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ تین مختلف قسم کے کردار تھے مگر وہ تینوں گہرے دوست بن گئے۔ کیا یہ عجیب و غریب بات نہ تھی؟

## سانولی سڑکیں

جمال کا زیادہ وقت فدا محمد کے ساتھ گزرتا تھا۔ شام کو کھانا کھا کر دونوں سڑکوں پر گھومنے نکل جاتے۔ کسی ایسی تفریح کی تلاش میں جو ان سے بات کرے۔ اپنی بنے۔

لاہور میں ان جیسوں کے لیے جو بھرے بازار میں ایک معمولی کوٹھڑی میں رہتے تھے، کوٹھے اور دیواریں پھلانگنا ممکن نہیں تھا۔ وہ شام کو اچھے کپڑے پہن کر چھوٹے چھوٹے پرائیویٹ ہسپتالوں کے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ جن میں سے غریب لڑکیاں تھوڑا بہت پڑھی ہوئی نرسوں کا کام کر کے تھکی ہوئی نکلتی تھیں۔ ان کی تنخواہیں قلیل ہوتیں جن میں سے کچھ پس انداز کر کے وہ اپنے غریب ماں باپ اور بہن بھائیوں کو بھیجتی تھیں۔ انہیں بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ وہ مریضوں کی غلاظتیں صاف کر کر کے اکتائی ہوئی ہوتی تھیں اور انہیں بھی مختلف قسم کی لاجوں میں جانوروں کی طرح رہنا پڑتا تھا۔ ان کو ترقی کرنے یا گھر بسانے کی کوئی امید نہ تھی۔ معاشرہ انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ بھی چاہتی تھیں کہ شام کو دو گھڑی کوئی ان کا راستہ دیکھے۔ کبھی کبھار ان کو ساتھ لے جائے۔ سینما دکھا دے اور اگر کسی کو پتہ نہ چلے اور ساتھ لے جانے والا مناسب احتیاط کرنے کی اہمیت کو سمجھتا ہو تو ان کو اپنے ساتھ سلا بھی لے۔ وہ بھی دو گھڑی زندگی کی قید سے رہائی چاہتی تھیں۔ آوارگی ان کے مزاج میں قطعاً نہ تھی۔ یہ محض مادی ضروریات اور انسانی رشتوں کا مسئلہ تھا اور اگر کوئی بعد میں دس پانچ روپے ان کے پرس میں ڈال دیتا تو وہ اس سے بھی انکار نہ کرتیں کیونکہ ضرورتیں غریب عورتوں کو بہت پامال کر سکتی ہیں۔

فدا محمد اپنے ڈھب کی لڑکیوں کو دور ہی سے پہچان لیتا۔ کوئی ہسپتال سے نکلتی تو وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیتا۔ اگر وہ پیچھے مڑ کر دیکھ لیتی تو اس کے قریب جا کر کہتا ''جی ہم بھی تو پڑے ہیں۔''

بالعموم لڑکی فوراً جواب نہ دیتی مگر فدا محمد اسی قسم کے پوچ اور عامیانہ فقرے کہتا رہتا۔ ''آج موسم بہت خوبصورت ہے۔ آج دل کو جانے کیا ہو گیا ہے۔ آج بڑی اچھی فلم لگی ہے جی۔''

اس قسم کے فقرے وہ آہستہ آہستہ کہتا تاکہ کوئی اور سن نہ لے۔ اگر لڑکی کو منظور نہ ہوتا تو وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی ہجوم میں گم ہو جاتی۔ اگر اس کو اطمینان ہو جاتا کہ میرا طلب گار شریف آدمی ہے تو وہ چال آہستہ کر لیتی۔ پھر دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگتے۔ سینما دیکھتے، پان کھاتے اور کبھی کبھار ساتھ سو بھی جاتے۔

صبح اٹھ کر فدا محمد اپنی پتلون پر استری کرتا، بال جماتا اور دفتر چلا جاتا۔ شام کو واپس آ کر ہسپتالوں کے چکر لگاتا اور اگر کامیابی نہ ہوتی تو منشی فاضل کے امتحان کے لیے اخلاقِ جلالی کے گھوٹے لگاتا۔

جمال کے کرنے کو کچھ نہیں تھا مگر زندگی اس کی بور نہیں تھی۔ وہ بے فکری اور آزادی کے مزے لیتا رہا۔

## آوارہ گردی

مفتی نے محمد نگر میں ایک گھر کرائے پر لیا تھا مگر وہ اکیلا رہنے سے ڈرتا تھا۔ اس لیے اس نے جمال کو ساتھ لیا۔ وہ صبح سویرے ریڈیو سٹیشن چلا جاتا تو جمال کو بھی ساتھ لے جاتا اور لوگوں سے ملواتا تاکہ وہ اپنے

آپ کو دریافت کر لے۔

اچانک ان دونوں کی زندگی کو پہیے لگ گئے۔

مفتی بمبئی کے ایک فلم پروڈیوسر کے لیے ایک کہانی لکھ چکا تھا جو اسے پسند آ گئی تھی۔ اسے تار ملا کہ فوراً بمبئی پہنچو۔

مفتی کے پاس کرائے کے پیسے نہیں تھے۔ حالانکہ اس زمانے میں لاہور سے بمبئی کا کرایہ صرف سترہ روپے تھا۔

جمال کے پاس چار سو روپے تھے اور یہ بہت بڑی رقم تھی۔ پھر دونوں بمبئی چلے۔ جنگ کے خاتمے کی وجہ سے گاڑیاں گھر لوٹنے آنے والے سپاہیوں سے بھری ہوتی تھیں۔ مگر جمال نے گھونسے مار کر اور کھا کر دو برتھوں پر قبضہ کر لیا۔ سفر بڑی خطرناک چیز ہے۔ اس میں آدمی کے سارے بھید کھل جاتے ہیں۔ سفر کے دوران جمال کو احساس ہوا کہ مفتی سیانا ضرور ہے، پڑھا لکھا بھی ہے مگر اس کے اندر کوئی رانا سانگا کوئی خالد بن ولید، کوئی گاماں پہلوان چھپا نہیں ہوا۔ وہ اپنے ماضی میں محصور ایک اپاہج آدمی کی طرح ہمسائیگی اور سنگت کی بیساکھیوں کا محتاج ہے۔ وہ ایک پل ہے جس پر سے ہر قسم کا بوجھ بے تکان گزارا جا سکتا ہے۔

مفتی جمال کو ایک نڈر اور ذہنی طور پر آوارہ آدمی سمجھتا تھا جس کے ساتھ رہنے سے مردہ دل زندہ ہو جاتے ہیں۔ وہ اس خوش نما غنڈے کو باندھ باندھ کر بچا بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔ وہ اسے بات بات پر ٹوکتا تھا۔

بمبئی میں وہ ایک گھٹیا ہوٹل میں ٹھہرے۔ پروڈیوسر نے کہانی کا مسودہ لے کر انہیں آٹھ سو روپے دے دیئے اور کہا چونکہ آزادی کے سلسلے میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو چکے ہیں اس لیے فی الحال اس فلم کو کوئی ڈسٹری بیوٹر نہیں خریدے گا۔ ہندوستان کا مستقبل کوئی رخ اختیار کرے تو پھر یہ فلم شروع ہو سکے گی۔

آٹھ سو روپے یکمشت مفتی نے کبھی دیکھے نہ تھے۔ جمال کے لیے بھی یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ دونوں کی باچھیں کھل گئیں۔ بمبئی میں انہوں نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ وہ باندرہ رکے، جس ہوٹل میں ٹھہرے تھے وہیں سے سیدھے ریلوے سٹیشن کو چل دیئے۔

اور یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔

## بڑے لوگ

مرزا ہادی حسن رسوا اپنا لافانی ناول امراؤ جان ادا لکھنے سے پہلے ایم ایس سی کیمسٹری کا امتحان دینے لکھنؤ سے لاہور آئے تو یہاں انہیں کوئی جانتا نہ تھا۔ ہوٹل ابھی نمودار نہ ہوئے۔ نخاس میں دہلی دروازے کے سامنے وسط ایشیا سے آئے ہوئے تاجروں اور روسی جاسوسوں اور سیاحوں کے لیے طرح طرح کی سرائیں اور بھٹیار خانے موجود تھے مگر مرزا ہادی حسن کو ان کا پتہ نہ تھا۔ شب بسری کے کچھ ٹھکانے ہیرا منڈی میں بھی تھے۔ مال روڈ بن چکی تھی مگر ابھی پختہ نہ ہوئی تھی۔ اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ چلتا تھا اور رڈیارڈ کپلنگ جو بعد میں اس کے ایڈیٹر ہوئے اس کے رپورٹر تھے اور اپنا مشہور ناول ''کم'' بھی ابھی انہوں نے لکھا نہ تھا۔

مرزا ہادی حسن نے ریلوے سٹیشن سے اترتے ہی تانگے والے سے کہا ''میاں ہمیں لاہور کی سب سے اونچی طوائف کے ہاں لے چلو۔'' اب وہ کون سی طوائف تھی اس کا پتہ نہیں مگر مرزا رسوا نے اپنا سامان اس کے بالا خانے پر اتارا اور کہا ''بائی جی ہم یہاں تین روز قیام کریں گے اور جب تک ہم ہیں کوئی تماشبین آپ کے کوٹھے پر نہیں آئے گا۔ اس کے بدلے ہم منہ مانگی رقم دیں گے۔''

امتحان کے بعد مرزا صاحب نے منہ مانگی رقم دی۔ تانگے پر سامان رکھوایا اور وہیں سے ریلوے سٹیشن کو چل دیئے۔ شاہی مسجد تک دیکھنے کی انہوں نے تکلیف گوارا نہ کی۔

ایسا ہی ایک واقعہ حمید شیخ نے بیان کیا۔ وہ لاہور کی تہذیبی زندگی کا خزینۂ معلومات تھے۔ کلاسیکی موسیقی کا گہرا ذوق رکھتے تھے اور استاد عاشق علی خان سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک دن وہ حمید شیخ کے پاس آئے اور کہا شیخ صاحب کلکتے میں کوئی روشن آرا بیگم آج کل گا رہی ہیں۔ سنا ہے بے مثل ہیں۔ چلیے ذرا اس کو سن آئیں۔

اور اسی روز استاد عاشق علی خان اور حمید شیخ کلکتے چل دیئے۔ ریلوے سٹیشن پر انہوں نے گھوڑا گاڑی والے سے کہا ''ہمیں روشن آراء بیگم کے چوبارے پر لے چلو۔''

روشن آرا بیگم کو معلوم تھا کہ استاد عاشق علی خان کا مقام کیا ہے۔ وہ باادب کھڑی ہو گئیں اور دروازے بند کروا دیئے۔ رات بھر وہ حمید شیخ اور استاد عاشق علی خان کو گانا سناتی رہیں۔ صبح کا ناشتہ کھا کر اور روشن آرا بیگم کو داد دے کر وہ سیدھے لاہور کی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ انہوں نے بھی ہوڑا کا پل تک دیکھنے کی تکلیف گوارا نہ کی تھی۔

مگر وہ تو بڑے لوگ تھے۔ بعد میں مفتی نے بھی بڑا نام پایا مگر اس وقت تو دونوں کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

اس زمانے میں گاڑی کا ٹکٹ حاصل کرنا دشوار تھا کیونکہ سپاہیوں کی واپسی کو ترجیح ملتی تھی۔ وہ دونوں بلا ٹکٹ ہی سوار ہو گئے۔ راستے میں پکڑے گئے تو مفتی تو سر جھکا کر بیٹھ گیا مگر جمال نے ٹکٹ کلکٹر سے آدھے راستے کے ٹکٹ کا سودا کر لیا۔ وہ ڈرا بالکل نہیں۔ اس سے مفتی کا جمال پر اعتماد بہت بڑھ گیا۔ بمبئی سے دونوں جنم جنم کے ساتھی بن کر لوٹے۔

## پنجاب پولیس ایکشن

محمد نگر کے مکان میں جمال ہلکے ہلکے بخار میں اونگھ رہا تھا۔ جب پولیس کا ایک دستہ دستک دیئے بغیر اندر گھس آیا۔

مفتی اپنی والدہ کو ملنے کے لیے بٹالہ گیا ہوا تھا۔ جمال کے کچھ دوست تاش کھیل کر ابھی فارغ ہوئے تھے۔ میز پر کھانسی کے لال شربت کی بوتل اور ایک روپے چھ آنے کی رقم رکھی تھی۔ پولیس والوں نے

آتے ہی سب کو گرفتار کر لیا اور ایک روپے چھ آنے قبضے میں کر لیے۔ پھر سب کو ہتھکڑیاں لگا لیں اور انہیں سول لائن کے تھانے میں لے گئے۔

تھانے پہنچ کر جمال کو معلوم ہوا کہ ہمارا گھر جوئے کا اڈہ ہے جہاں شہر کے بدمعاش رات گئے تک شور مچاتے اور محلے والوں کو تنگ کرتے ہیں اور کبھی کبھی یہاں کنجریاں آ کر بدکاری پھیلاتی ہیں۔ ان سب کو جو گرفتار ہوئے تھے، جوئے اور بدکاری کا اڈہ چلانے کے جرم میں پانچ پانچ برس کے لیے جیل بھیجا جائے گا کیونکہ شریف آبادی میں گندگی کے اڈے برداشت نہیں کیے جا سکتے اور ایسی بدکاری اسلام کے خلاف بھی ہے۔

جمال گھر سے پولیس کی مار پیٹ کے لیے تیار ہو کر آیا تھا مگر جب اس کو الزامات سنائے گئے تو وہ گھبرا گیا۔

ایک روپے چھ آنے تو وہ رقم تھی جو انہوں نے داؤں پر لگائی ہوئی تھی۔ جب پولیس نے چھاپہ مارا مگر عورت تو وہاں کوئی نہیں تھی۔ اس کے لیے ان کے پاس ہمسایوں کی درخواستیں تھیں جو پولیس والوں کے مطابق عدالت میں دکھائی جائیں گی۔

شام تک جمال اور اس کے دوست بھوکے پیاسے تھانے میں زمین پر بیٹھے رہے۔ کسی نے ان سے بات تک نہ کی۔

شام کی نماز کے بعد شاہ صاحب نے انہیں حاضری کے لیے طلب کیا۔

شاہ صاحب تھانے کے انچارج تھے۔ جمال کو ان کی داڑھی بہت اچھی لگی گول مخروطی۔

شاہ صاحب نے کاغذوں سے سر اٹھایا۔ ان کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کڑک کر پوچھا ''کیا نام ہے تمہارا۔ کس کے بیٹے ہو۔ کیا کرتے ہو؟''

جمال نے نام بتایا اور کہا '' کچھ نہیں کرتا جناب بیکار ہوں۔''

''اسی لیے جوا کراتے ہو؟ نال میں بہت کچھ مل جاتا ہوگا۔''

جمال کو پتہ نہیں تھا کہ جوئے کے اڈے پر مالک کو جو کمیشن ملتا ہے اسے نال کہتے ہیں۔ اس نے کہا ''جی مجھے نہیں پتہ نال کا۔''

''اور ٹیکسیاں بھی نہیں منگواتے تم...... ہیں؟''

جمال کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کرائے پر بلائی جانے والی رنڈیوں کو ٹیکسی کہتے ہیں۔ اس نے کہا ''جی میں نے کبھی نہیں منگوائی ٹیکسی۔ میرے پاس تو بائیسکل ہے۔''

''اور تم میں سے فحش گانے کون گاتا ہے؟''

جمال کے دوست مکھیوں کی طرح بھنبھنانے لگے۔ ''ہم میں سے تو کوئی نہیں گاتا فحش گانے اور ہم تو کبھی کبھار ہی جمال کو ملنے جاتے ہیں۔ روز کا ہمارا ادھر کا آنا جانا نہیں جناب۔''

پھر شاہ صاحب نے اپنا بید ہلکے سے میز پر مارا اور پوچھا ''تم میں سے مکان کس نے کرائے پر لے رکھا ہے؟''

''میں نے جناب۔'' جمال بولا۔ حالانکہ مکان مفتی کے نام پر تھا۔

''کیا تم شادی شدہ ہو؟''

''نہیں جناب۔''

''اسی لیے آوارگی کی زندگی گزارتے ہو۔''

''جی نہیں جناب۔''

پھر شاہ صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد بولے ''شکل سے تم اچھے گھر کے چشم و چراغ لگتے ہو۔ اسی لیے تمہیں سزا دینے کو میرا دل نہیں چاہتا۔ تمہاری مائیں فریادیں کرتی پھریں گی۔ تم اس قسم کے لچھن چھوڑ دو اور یہ مکان آج ہی خالی کر دو بلکہ ابھی۔ لالہ کیدار ناتھ بہت شریف آدمی ہیں۔ انہوں نے بھی تمہاری سفارش کی ہے۔''

اب جمال کو یاد آیا کہ مالک مکان لالہ کیدار ناتھ کچھ عرصے سے مکان کا کرایہ بڑھانے یا اسے خالی کر دینے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ یہ شرارت اسی کی تھی۔

''ایک گھنٹہ دیتا ہوں تمہیں۔'' شاہ صاحب بولے ''عشاء کی نماز سے پہلے سامان باہر نکال لو ورنہ پانچ سال کے لیے اندر کر دوں گا، سمجھے؟''

جمال نے شاہ صاحب کا شکریہ ادا کیا اور سیدھا محمد نگر جا کر آدھے گھنٹے میں چارپائیاں، پھٹے ہوئے لحاف، ٹوٹے ہوئے ٹرنک، نمک مرچ کے پرانے ڈبے، ہانڈیاں، تھالیاں اور کچھ کتابیں باہر نکال کر گلی میں رکھ دیں اور خود ایک بالٹی کے اوپر بیٹھ گیا، کہیں جانے کو کوئی جگہ ہی نہ تھی۔

ٹھیکیدار لالہ کیدار ناتھ نے حقارت سے اسے دیکھا اور خالی گھر کے اندر سے کنڈی چڑھا لی۔ بچے جمال کے گرد جمع ہو گئے۔ عورتیں کھڑکیوں میں سے تماشا دیکھنے لگیں۔ عشاء کے بعد نمازی اپنا اپنا راستہ چلتے رہے۔

مفتی کے بٹالے سے آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ اس نے گلی میں جمال کو بالٹی پر بیٹھے ہوئے اور گھر کے سامان کو بکھرے ہوئے دیکھا تو اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اتنی بے عزتی اور تحقیر اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

وہ تماشا بننے سے بہت ڈرتا تھا۔ جمال نے کہا ''مفتی دیکھا جائے گا۔ سو واٹ!''

اس سے مفتی کی ڈھارس بندھ گئی۔ جلدی سے اس نے ایک تانگے پر سامان لدوایا اور دونوں چل دیئے۔ راستے میں مفتی نے پوچھا ''مگر ہم جائیں گے کہاں؟''

''دل محمد روڈ۔'' جمال نے تانگے والے سے کہا۔

## لوٹ کر بدھو گھر کو آئے

فدا محمد کا کمرہ اب اس کے دل کی طرح کشادہ نہیں تھا۔ اس میں بستر، ٹرنک اور دیگر سامان انہوں

نے بڑی مشکل سے ڈالا۔ مفتی کے دل پر بڑا بوجھ تھا، وہ کسی کو تکلیف دینا نہ چاہتا تھا۔

اس نے کہا ''کرشن نگر میں میری بہن ہے۔ میں اس کے ہاں چلا جاتا ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد فدا محمد اپنے مشترکہ باورچی خانے سے ایک پلیٹ سالن اور کچھ پھلکے لے آیا۔ وہ باورچی کو کبھی کبھار ایک روپیہ دے دیتا تھا۔ اس کے بدلے وہ اسے سالن دگنا دے دیتا اور روٹیوں کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا۔

دونوں نے بستر پر بیٹھ کر کھانا کھایا اور اسی پر لیٹ گئے۔ تکیے البتہ دو تھے۔

اسی بستر پر وہ پہلے بھی سو جاتے تھے۔ کمرے میں چارپائیوں کی گنجائش ہی نہ تھی۔ مہترانی کو بھی آسانی ہوتی تھی۔ وہ چلتے چلاتے بستر پر بھی جھاڑو پھیر جاتی تھی۔

اس بستر میں وہ کبھی تین بھی سو جاتے تھے۔

مگر اس طرح مس زینت پال پر طنز کرنا گری ہوئی بات ہے۔ اسی طرح یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ پرائیویٹ ہسپتالوں کی تمام نرسیں اسی طرح راتیں گزارتی ہیں۔ یہ بات غلط ہے کیونکہ بہتوں نے فدا محمد اور جمال کو دھتا بھی بتایا۔

مگر کسی نے بھی ان کے لیے مصیبت پیدا نہ کی۔ کسی ڈاکٹر سے کسی پولیس والے سے انہوں نے ان کی شکایت نہیں کی۔ وہ خود بھی ہنگاموں سے ڈرتی تھیں۔

دھگڑے ان کے چاروں طرف پھرتے تھے اور وہ ہر ایک کا مقابلہ نہ کر سکتی تھیں۔

بعض ان میں سے تجربے کے بعد ہوشیار بھی ہو گئی تھیں۔ انہوں نے زندگی کی حقیقتوں کو قبول کر لیا تھا اور وہ چھوٹی چھوٹی رقمیں بھی شکریے کے ساتھ قبول کر لیتی تھیں۔

کیونکہ پیٹ کا جہنم وقار اور عزت کو جلا دیتا ہے۔

اور وہ پیٹ بھی جس میں کسی کا ڈالا ہوا جہنم بھڑکنے لگ جاتا تھا۔

پھر ان کی زندگیاں تباہ ہو جاتیں۔ ان کے خطرات بہت تھے۔ اس لیے ہسپتالوں میں دو چار ہی اپنی مجبوریوں کے آگے ہتھیار ڈال سکتی تھیں۔

اور ایسی بے کسی سکولوں، دفتروں اور گھروں میں بھی ہوتی ہے۔ ان کی جلتی ہوئی ہڈیوں پر بھی کوئی پانی نہیں ڈالتا۔

عورتوں اور عورتوں میں مجبوریوں کے حوالے سے کوئی فرق نہیں ہوتا اور مرد بھی ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔
کیونکہ ہم سب ایک کمینے سماج کے پھوڑے پھنسیاں ہیں۔ اس سماج کے بدن میں زہر کے سوا کچھ نہیں۔

# باب 8

جمال کو بکے لگڑ بگڑ نے راستے میں پکڑ لیا۔ اس نے بوسکی کی قمیص پہنی ہوئی تھی۔ اس کے سینے کی جیب نوٹوں سے پھٹی پڑتی تھی۔

بکا لگڑ بگڑ نے ہز میجسٹی کی وار ایفرٹ میں چھاؤنی کے لیے قیمے کی سپلائی کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ کوارٹر ماسٹر اس پر مہربان تھے کیونکہ طے شدہ کمیشن کی ادائیگی میں اس نے ہمیشہ دیانتداری کا ثبوت دیا تھا۔ کرسمس کی خوشی میں نور پور کی ڈھاب سے پکڑی ہوئی مرغابیاں اور سکاچ وسکی کی بوتلیں صاحب لوگوں کے دلوں میں اس کی قدر و قیمت بڑھاتی تھیں اور وہ بیل کے لال قیمے کو ہمیشہ بکرے کا قیمہ مان کر بل دلوا دیتے تھے۔

بکے لگڑ بگڑ نے اس کاروبار میں ڈھیروں روپیہ کمایا تھا۔ وہ آٹھویں جماعت پاس نہ کر سکا تھا مگر حساب کتاب کے لیے ایک بی اے پاس نوجوان اس کا نوکر تھا۔

اس نے جمال کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا ''مدت سے تمہاری شکل نہیں دیکھی۔ آج کی شام میرے ساتھ گزارو۔''

جمال نے اس کی جیب میں پھنسے ہوئے نوٹ دیکھ لیے تھے۔

''ذرا عیش کریں گے جمال۔'' بکے نے آنکھ مار کر کہا۔ ''گانا سنیں گے، کھائیں پئیں گے۔''

اصل میں اسے یقین نہیں تھا کہ جمال اس کی عزت داری سے آگاہ ہے۔

## رنڈی کا کوٹھا

جمال نے رنڈی کا کوٹھا دیکھا نہ تھا۔ دونوں نے فدا محمد کو بھی ساتھ لے لیا۔

تنگ سیڑھیوں سے گزر کر جب وہ مشتری بائی کے کوٹھے پر پہنچے تو وہاں کچھ لوگ پہلے سے بیٹھے تھے اور یہ کوئی عیب کی بات نہ تھی۔ لگڑ بگڑ کے منیجر نے موتیے کے ڈھیر سارے ہار خرید لیے پھر اس نے بیگ سے میٹھے مالٹے کی بوتل نکالی، کباب آ گئے۔ بساط بچھ گئی۔ گھنگھرو بجنے لگے۔

مشتری ایک بھری ہوئی پختہ عمر کی عورت تھی۔ کسی زمانے میں خوبصورت ہو گی۔ اب چنچل بننے کی کوشش میں بڑی بھونڈی ادائیں کر رہی تھی۔ وہ گاتی تو ایسے جیسے پہاڑی کوا بولے۔ آواز اس کی گلے کو کھرچ

کر نکلتی تھی۔ ناچتے ناچتے جب وہ پھیری لیتی تو لگتا گھوڑا بھنگڑا مار رہا ہے۔

بکے لنگڑ بگڑ نے نوٹوں کی گڈی اٹھا کر سامنے رکھ لی۔ اس میں سے ایک ایک روپے کے نوٹ نکال کر کبھی وہ جمال کے منہ پر رکھتا اور کبھی گالوں سے لگاتا، جنھیں مشتری بائی منک منک کر اُچک لیتی اور حقارت سے استاد کے ہارمونیم پر پھینک دیتی۔

جمال کو یہ ماحول اجنبی اور بیگانہ لگا۔ سارے لوگ مصنوعی تھے۔ جیسے ٹین کے سپاہی پریڈ کر رہے ہوں۔ اس کام میں انسان صرف مشتری بائی تھی جس کی محنت کی بدبو گلاب کے عطر کے تیز بھبھکوں میں چھپائے نہ چھپتی تھی۔

مشتری کی نائیکہ مسلسل چھالیہ کتر رہی تھی۔ اب وہ خود کسی قابل نہ تھی۔ مگر پاپی پیٹ کے لیے کم سے کم اتنا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

فدا محمد کو اس ماحول سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر اس نے لہرا لہرا کر باتیں کیں۔ وہ صرف جمال کی خاطر اور بکے لنگڑ بگڑ کی جیب کا بوجھ کسی قدر ہلکا کرانے کے خیال سے آ گیا تھا۔

جمال کو صرف رنڈی کا کوٹھا دیکھنے کا شوق تھا اور یہ مان بھی کہ میں روایات کا باغی ہوں۔

باقی لوگ شراب پینے آتے تھے۔ کچھ روپے کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ کچھ غربت کے ہاتھوں نیم جان۔

مگر یہاں کسی کو کچھ بھی نہ ملا۔ مشتری بھی خالی ہاتھ رہی۔ ساری آمدنی نائیکہ اور استاد جی نے بانٹ لی مگر تھانے کا حصہ نکال کر۔

جب سب چلے گئے تو مشتری کا محبوب آیا۔ نشے میں دھت، چرس کے لمبے لمبے کش لگاتا ہوا بدبودار۔

وہ محلے کا غنڈہ تھا۔ اس کا دنبہ ہیرا منڈی کا سب سے موٹا دنبہ تھا۔ تھانے والوں سے اس کی آشنائی تھی۔ وہ کئی طوائفوں کا محافظ تھا اور سب سے پیسے لیتا تھا۔ مگر معشوق صرف مشتری کا تھا۔

اس رات ہر رات کی طرح آ کر اس نے پہلے مشتری کو گالیاں دیں، پھر مارا۔ خرچے کے پیسے لیے اور چلا گیا۔ یہی اس کا روز کا معمول تھا۔

اسی طرح گالیاں دینے والے' مارنے والے' پیسے چھین لینے والے اور کبھی کبھی ساتھ سو جانے والے یار ہیرا منڈی کی ساری طوائفوں نے رکھے ہوئے تھے۔ دوسری طرح کا مرد ان کو اچھا نہ لگتا تھا کیونکہ وہ ان کی نفسیاتی اور جسمانی اذیت کی لذت پوری نہ کر سکتا تھا۔ اس قسم کے یاروں کی چھینا جھپٹی پر رنڈیوں میں رقابتیں اور لگاوٹیں ان کی زندگیوں میں رونق کا باعث تھیں اور یہی ان کے سوشل مسائل تھے۔

یاروں کے علاوہ بھائی، بھتیجے، ماموں، نانا اور دادا ان کی کمائی میں حصہ دار تھے۔ مردوں کا خود کام کرنا اور کما کے کھانا ان کی عورتوں کے لیے ذلت کی بات تھی۔ اس سے طوائفوں کی کاروباری ساکھ بھی بگڑ جاتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے خاندان کے لیے زیادہ کمائی نہیں کر سکتیں۔ ان کے کوٹھے پر کوئی کھاتا پیتا تماشبین نہیں آتا۔

طوائفوں کے آداب مقرر تھے۔ وہ گال سے روپیہ اُچک لیتیں۔ ہر منہ میں پان کی گلوری ڈال دیتیں اور ہر غزل ایک ہی دھن میں گا دیتیں۔ ان کو پتہ تھا کہ یہی ان کا پیشہ ہے اور اپنا کام وہ مشینوں کی سی مستعدی کے ساتھ کرتیں۔

یہ باتیں جمال کو آہستہ آہستہ ہی معلوم ہوئیں۔

## دوسرا پھیرا

جمال نے سن رکھا تھا کہ لکھنؤ کے شرفاء اپنے بچوں کو طوائفوں کے ہاں مجلسی آداب سیکھنے کے لیے بھیجتے ہیں مگر مشتری بائی کے گھر کا ماحول دیکھ کر وہ افسردہ ہو گیا۔ وہ نہ تو اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھی نہ بدمعاش اور بدکار عورت۔ طوائفوں کے بارے میں اس کے تصورات غلط نکلے تھے۔ آغا حشر نے اپنے ڈراموں میں جھوٹ بولا تھا۔ جمال طوائفوں کے بارے میں کچھ اور جاننا چاہتا تھا۔ دوسرے دن شام کے چار ہی بجے وہ مشتری کے کوٹھے پر جا پہنچا۔

مشتری نے کہا ''ابھی تو میں سو کے اٹھی ہوں۔ ابھی تو میں نہائی بھی نہیں۔ ابھی تو سازندے بھی نہیں آئے۔ ابھی تو بازار بھی نہیں کھلا۔ دھندا شروع نہیں ہوا ابھی۔''

جمال نے جواب دیا ''میں گانا سننے نہیں آیا۔''

''تو پھر کیا کرنے آئے ہو؟''

''آپ سے ملنے کے لیے۔''

مشتری ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ بولی ''آپ کی مہربانی مگر میں تو ملازم ہوں۔ چودھری خان محمد کی خانگی ہوں۔ میں آپ کے کام نہیں آ سکتی۔ ساتھ والی بیٹھک میں رشیدہ بائی خالی ہے۔ میں کسی اور سے بات نہیں کر سکتی چودھری صاحب کے سوا۔''

''کون سی بات؟'' جمال نے پوچھا۔

وہ حیران ہو کر جمال کا منہ تکنے لگی۔ پھر بولی ''وہی بات جس کے لیے آپ آئے ہیں۔ آپ کا کام نہیں بن سکتا یہاں۔ کاروبار کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔''

وہ بھانپ گئی کہ جمال نرا بدھو ہے۔ بولی ''ویسے آپ شاید نئے آئے ہیں لاہور میں۔ کیا کرتے ہیں؟''

''کچھ بھی نہیں۔ بیکار ہوں آج کل۔''

"آپ کو نہیں آنا چاہیے کوٹھے پر۔ یہ اچھی جگہ نہیں اور ایسے کاموں میں پڑنے کی آپ کی عمر بھی نہیں۔ کیا عمر ہے آپ کی؟"

"بیس اکیس۔" جمال نے جواب دیا۔ "مگر میں برے کاموں میں نہیں پڑتا۔ میں تو صرف بات کرنے آیا ہوں۔ بیس روپے ہیں میرے پاس۔ یہ لے لیجیے اور اتنا بتا دیجیے کہ کیا آپ زندگی سے خوش ہیں؟ یہ کام چھوڑ کیوں نہیں دیتیں جب آپ خوش نہیں۔"

مشتری نے بیس روپے لے لیے۔ پھر بولی "آپ کا کیا نام ہے؟"

"جمال۔"

"تو جمال صاحب آپ پہلے یہ بتائیے کہ کیا آپ خوش ہیں زندگی سے؟"

"مجھے کوئی غم تو نہیں۔" جمال بولا۔

"تو پھر یہاں کوٹھے پر کیوں آئے ہیں۔ جن کو کوئی غم نہیں ہوتا وہ نہیں آتے یہاں۔ آپ مجھے بہت شریف آدمی لگتے ہیں یا بہت ہی بے وقوف!"

"نہیں جی میں تو بہت خراب ہوں۔" جمال بولا۔ "بہت آوارہ، ایمان سے بہت بد چلن۔"

"ہم لوگ چہرے پڑھ لیتے ہیں۔ آپ بھوکے ننگے ہیں اور شاید یہی بیس روپے تھے آپ کے پاس۔ آپ جیسوں سے تو ہم بات بھی نہیں کرتے۔"

"مگر بات تو آپ کر ہی رہی ہیں مشتری بائی......"

"یہ وہ بات نہیں نا۔ میں تو آپ کو سمجھا رہی ہوں۔ ویسے میں اس زندگی سے خوش نہیں ہوں۔ یہی پوچھنا چاہتے تھے نا آپ؟"

"جی ہاں۔ شکریہ۔" جمال نے جواب دیا۔

"بس؟ اور کچھ اس بات کے علاوہ......؟"

"اور کچھ نہیں جی۔" یہ کہہ کر جمال واپسی کے لیے مڑا۔

مشتری بائی بولی "یہاں شام کے وقت کبھی مت آنا۔ اب سیدھے گھر جانا۔ کسی اور کوٹھے پر نہ چڑھ جانا۔ تم بہت ہی شریف اور بے وقوف آدمی ہو۔"

دو چار دن گزر گئے۔

پھر جمال نے سوچا مشتری بہت اچھی عورت ہے۔ اس سے ایک بار اور ملنا چاہیے۔

جمال کو وہ طوائف لگتی ہی نہ تھی۔

اس نے بھی بات چیت سے انکار نہ کیا۔ جمال اس کے گندے میلے یار کی طرح نہیں تھا۔ اس میں ایسی کوئی خوبی نہ تھی جو کسی طبیعت دار طوائف کو اس کی طرف مائل کر سکے۔ دونوں کی دوستی میں بستر کی لذت کا کوئی سوال نہ تھا۔

مشتری کی نائیکہ نے شروع شروع میں جمال کے آنے پر برا منایا مگر مشتری نے کہہ دیا جمال "ایویں" ہی ہے یعنی خواجہ سرا ہے جو دل بہلانے کو آ جاتا ہے اور شام کو گاہکی بھی خراب نہیں کرتا۔ اس پر گھر میں سب لوگ اس سے بے تکلف ہو گئے۔ طبلے والا، ہارمونیم استاد، بچوں کو قرآن شریف پڑھانے والے مولوی صاحب، موتیے کے ہار بیچنے والا اور مشتری کا ماموں سب اس سے گھل مل گئے۔ سب کا خیال تھا کہ بالآخر وہ یہیں کا ہو کر رہ جائے گا کیونکہ خواجہ سرا ہے۔

### بہو جی

ایک دن وہ کوٹھے پر چڑھا تو کمرہ خالی پڑا تھا۔ مشتری کو ایک دو آوازیں دینے کے بعد وہ مجرا کرنے والے کمرے سے نکل کر صحن کی طرف جا نکلا جس میں باورچی خانہ بھی تھا۔ یہاں پہنچ کر اس نے آواز دی "مشتری بائی۔"

مشتری ننگے بدن پر تولیہ لپیٹے گھبرا کر غسل خانے سے نکلی اور چیخ کر بولی "آگے مت جانا، آگے مت جانا۔"

اس کا چہرہ زرد تھا۔

"آگے پردہ ہے۔" وہ بولی۔ "واپس چلے جاؤ۔"

"پردہ؟" جمال نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کس کا پردہ؟" اور گھبرا کر بیٹھک کی طرف بھاگا۔

تھوڑی دیر میں مشتری کپڑے پہن کر آ گئی اور بولی "یہ تم نے کیا کیا۔ منہ اٹھا کر اندر گھس آئے۔ اندر پردہ ہے۔"

"مگر کس کا پردہ؟ کون ہے اندر؟"

"اندر بہو جی ہیں۔ ان کا پردہ ہے۔"

"بہو جی کون؟"

"بہو جی۔ میرے بھائی کی بیوی۔ بہو جی کو کوئی غیر مرد نہیں دیکھ سکتا۔"

"بہو جی تمہاری رشتہ دار نہیں ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ وہ طوائف نہیں ہیں۔"

"ہماری بہویں طوائفیں نہیں ہوتیں۔ بہویں شریفوں کی بیٹیاں ہوتی ہیں۔ تمہیں اتنا بھی نہیں پتہ!"

"مگر شریف لوگ طوائفوں کے خاندان کو رشتے کیسے دے دیتے ہیں۔" جمال نے حیران ہو کر پوچھا۔

"شریف لوگ رشتے نہیں دیتے۔ ہم خرید لیتے ہیں شریفوں کی کنواری بیٹیوں کو۔ بدمعاش اڑا لاتے ہیں اور دلال ان کے سودے کر دیتے ہیں۔ پھر ان میں سے جو واقعی بے داغ ہوتی ہیں، ان کے ہم اپنے بھائیوں اور بیٹوں سے نکاح کروا دیتے ہیں تا کہ ان کے گھر بس جائیں۔ شادی کے بعد بہویں گھر سے باہر

نہیں جاسکتیں۔ بازار بھی انہوں نے کبھی دیکھا نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ گھروں کے اندر پردے میں رہتی ہیں تاکہ کوئی بری نگاہ نہ پڑے ان پر۔ اس طرح ان کے وارثوں کو بھی ان کا پتہ نہیں چلتا۔“

”مگر کیا وہ اپنے رشتہ داروں، اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو یاد نہیں کرتیں؟ طوائفوں کے خاندانوں کو قبول کیسے کر لیتی ہیں؟“

”شروع شروع میں نہیں کرتیں۔ روتی پیٹتی ہیں، چیختی چلاتی ہیں مگر پھر وہ زندگی کو قبول کر لیتی ہیں۔ جب ان کے بچے ہو جاتے ہیں۔ سال دو سال مشکل کے ہوتے ہیں۔“

”مگر ان کے بچوں کا کیا ہوتا ہے؟“ جمال نے پوچھا۔

”بیٹیاں گانا بجانا سیکھتی ہیں۔ بیٹوں کو کوئی طوائف سنبھال لیتی ہے جس میں توفیق ہو یا ہم ان کی شادیاں کروا دیتے ہیں۔ خاندانی طوائفوں کے ہاں یہی طریقہ ہے۔“

”اور یہ جو بازار میں بیٹھتی ہیں۔“

”یہ ہماری بیٹیاں نہیں ہوتیں۔ یہ گھٹیا عورتیں ہوتی ہیں۔ ان کو بدمعاش بلب لگا کر بازار میں بٹھا دیتے ہیں جن کی صورت شکل اچھی نہیں ہوتی یا جو پہاڑوں سے اغوا کر کے لائی جاتی ہیں اور جن کو کسی بات کا پتہ نہیں ہوتا۔ لاوارث ہوتی ہیں، گا بجا بھی نہیں سکتیں۔ اسی طرح تھوڑا تھوڑا کر کے یہ اپنے ڈیرے والوں کا خرچہ نکال لیتی ہیں۔ پھر تھانے کو بھی حصہ دینا پڑتا ہے ورنہ ان کا کاروبار ہی نہ چلے مگر زندگی ان کی بہت خراب ہوتی ہے۔ بیمار ہوں تو علاج بھی ان کا کوئی نہیں کرواتا۔ بوڑھی ہو جاتی ہیں تو ان کو کھانا پکانے اور جھاڑو برتن کے کام پر لگا دیتے ہیں۔ بعض کو جوان نوچیاں اپنی خدمت کے لیے رکھ لیتی ہیں۔ اگر وہ بیمار نہ ہوں تو۔ مفت تو کوئی کسی کو نہیں کھلاتا اور یہاں کون سے کسی کے اماں باوا بیٹھے ہیں۔“

”ان کے اماں باوا بھی کہیں تو ہوں گے۔“

”یہ زیادہ تر سوات اور کشمیر سے آتی ہیں جہاں غربت اور جہالت زیادہ ہے اور اب تو بنگال سے آ گئی ہیں بہت سی۔ وہاں کال پڑا تھا نا اس لیے سب بک جاتی ہیں۔ پر بنگالنوں کو اردو نہیں آتی۔ بالکل جنگلی ہوتی ہیں۔ ان کو دھندے پر لگا دیتے ہیں مگر بڑی مار پیٹ کرنی پڑتی ہے ان کی۔ اس کام کے لیے بھی خاص لوگ ہوتے ہیں جو مالکوں سے اجرت لے کر ان کو توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔ سدا سے اسی طرح ہوتا آیا ہے اور سدا اسی طرح ہوگا۔“

جمال کا دل بیٹھ گیا۔ اسے ان زرد رو بازاری لڑکیوں پر رحم آنے لگا جو آٹھ دس گھنٹے روزانہ اپنے سوکھے بدن بھوکے کتوں سے نچواتی ہیں۔ ڈیرے داروں سے مار کھاتی ہیں۔ اس روٹی کے لیے جسے جانور بھی کھانا پسند نہ کریں۔

مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔

”اب تم چلے جاؤ۔“ مشتری بولی۔ ”میرا حاجی اب آتا ہی ہوگا۔ میں نے اس کے لیے نیا جوڑا سلا رکھا ہے۔“

”مگر وہ تو رات گئے آتا ہے۔“ جمال بولا۔

”دیوالی ہے آج۔“ مشتری نے کہا ”اس کو جوا کھیلنے کے لیے رقم کی ضرورت ہوگی اور آج شاید وہ مجھے نہ مارے۔ اسے جانے کی جلدی ہوگی۔“

”کیوں مار کھاتی ہو اس سے۔“ جمال نے چڑ کر کہا۔ ”اور پیسے بھی دیتی ہو اس گندے میلے غنڈے کو۔“

”ہائے ہائے اسے غنڈہ نہ کہو۔“ مشتری بولی۔ ”وہ مجھے بہت پیارا لگتا ہے۔ اب دل پر تو بس نہیں چلتا نا کسی کا۔“

”کبھی مجھے بھی اس سے ملواؤ۔“ جمال نے کہا۔

”نہیں۔“ مشتری بولی۔ ”وہ ناراض ہوگا۔ کہے گا میں تماش بینوں سے پیسے لیے بغیر ملتی ہوں۔ ناک کٹ جائے گی میری۔“

اور ناک کا طوائفوں کو بہت خیال ہوتا ہے۔

## نوکری کے بھید

جمال کو ملٹری اکاؤنٹس کے دفتر میں نوکری مل گئی۔ اسے روزانہ صبح سویرے اٹھ کر چھاؤنی جانا برا نہ لگتا تھا مگر وہ کلرکی سے نفرت کرتا تھا۔ اس کا کام تھا کہ سپاہیوں کے گھر والوں کو جو رقم ماہوار جاتی ہے، وہ ان کے حساب میں درج کر دے۔ یہ اچھی خاصی بینکنگ تھی، مگر یہاں کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔

ڈر جمال کی ہڈیوں میں ابھی اترا نہ تھا۔ میجر دربار خان نے اس کا گلا بہت دبایا تھا تو اس کی مہربان بیوی، مظلوم بہن اور بانکی بیٹی نے اسے ابھارا بھی بہت تھا۔ کرنل کلرائے اور شیاما پرشاد اس کی روح کو کچل نہ سکے تھے۔ ارونا گھوش اور پریتو سنگھ نے اس کے دل کو ٹکور کی تھی۔ مفتی، مشتاق اور فدا محمد نے اس کی رگوں میں بارود بھر دیا تھا۔ وہ ایک چلتی پھرتی مہتابی بن گیا تھا۔

اس کی دلچسپ اور باغیانہ باتیں اس کے انچارج سردار سردول سنگھ کو بہت پسند آئیں۔ وہ دو چار ہی دن میں سمجھ گیا کہ کام جمال کی طبیعت کے مطابق نہیں اور وہ ترقی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس نے اسے نوکری کے سارے بھید بتا دیے۔ اس نے کہا کہ رقم جس نام کے آگے چاہے لکھ دیا کرو۔ سپاہیوں کے نام وغیرہ مت پڑھا کرو۔ سرکاری کام میں کوئی جان کیوں کھپائے۔

جمال کو پتہ نہیں تھا کہ اس طرح کس کا کتنا نقصان ہو سکتا ہے۔ سپاہی محاذوں سے لوٹیں گے تو دھکے کھاتے پھریں گے۔ ان کے واجبات میں سخت گڑبڑ ہوگی۔ کوئی ان کا حساب سیدھا نہ کرے گا مگر وہ تو صرف خانوں میں رقمیں بھرتا تھا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ اس سے غریب سپاہیوں کا بیڑا غرق ہوتا ہے۔

انگریز بھی انہیں انسان کہاں سمجھتے تھے۔ وہ تو ان کے لیے محض گنز الاؤنسز تھے یعنی بندوقیں۔ رہا سردول سنگھ تو وہ سپاہیوں کو رقموں کی شکل میں دیکھتا تھا۔

## بغاوت

بڑے افسروں کی کاہلی کی وجہ سے پچھلے کئی ماہ سے دفتر کے لوگوں کے الاؤنسز کے بل ملٹری اکاؤنٹس کے صدر دفتر پونے نہ بھیجے جا سکے تھے اور کلرکوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا مگر کسی میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ وہ انگریز افسر کے منہ لگے۔ انہوں نے جمال کو اپنا لیڈر بنا لیا اور اس سے ہڑتال کا اعلان کروا دیا۔

جمال نے ہڑتالیوں کی فہرست تیار کی اور سب سے اوپر اپنا نام لکھا۔ افسروں میں ایک شاعر عبدالحمید جمال کے ہم مشرب تھے۔ وہ بھی ہڑتال کے حق میں تھے۔ انہوں نے جمال سے کہا، ہڑتالیوں کی فہرست ذرا مجھے بھی دکھا دو تاکہ اس میں کوئی جاسوس شامل نہ ہو سکے۔

آدھے گھنٹے کے بعد جمال اور اس کے چار ساتھی ملٹری اکاؤنٹس کی جیل میں تھے۔

کیونکہ شاعر نے یہ فہرست انگریز افسر کو دے دی تھی اور کہہ دیا تھا کہ اوپر کے پانچ کلرک ہی بدمعاش ہیں اور سب کا سرغنہ جمال ہے۔

جیل کے دروازے پر سنگین پہرہ تھا۔ جمال حیران بیٹھا تھا کہ لالہ بھگوتی رام سپرنٹنڈنٹ نے ادھر آ کر اسے بے نقط گالیاں دینی شروع کر دیں۔ ''تیری ماں کی، تیری بہن کی، بدمعاشی دکھاتا ہے۔ سرکار سے ٹکر لیتا ہے؟''

کلرکوں کو واجبات اسی روز مل گئے مگر کسی ہڑتالی نے جمال کی کوٹھڑی کی طرف آنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

جب واجبات ادا ہو گئے تو جمال کو کوٹھڑی سے نکال کر ڈپٹی چیف لالہ بھانا رام کے سامنے پیش کیا گیا۔ لالہ جی غصے میں نہیں تھے۔ گھبرائے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا ''مسٹر جمال آپ کا تبادلہ نہایت اچھی جگہ کر دیا گیا ہے۔ آپ کو ایڈوانس ٹی اے بھی دلوا دیا جائے گا۔ آپ ہوشیار نوجوان ہیں۔ پونا میں آپ کی ترقی کا میدان بڑا وسیع ہے۔''

جمال نے کہا ''مگر میں پونا جانا نہیں چاہتا۔''

''پونا تو بہت ہی صحت بخش مقام ہے۔ وہاں کا پانی بہت اچھا ہے۔'' لالہ جی بولے۔

''میری صحت لاہور میں بہت اچھی ہے۔''

''کمال ہے۔ پونا میں تو اور بھی مزے ہیں مگر آپ کو کچھ معلوم نہیں۔ پونا میں ایک سے ایک طوائف ملتی ہے اور صرف دو روپے میں۔ آپ کو مرہٹہ طوائفیں پسند نہ ہوں تو پنجابی، کشمیری، بنگالی، مدراسی اور لکھنوی طوائفوں کی بھی وہاں کوئی کمی نہیں۔ میں نے تو آپ کے ذوق کا اتنا خیال کیا اور آپ بات ہی نہیں سمجھتے۔''

## خانہ ویرانی

جمال نے اپنے ذوق کا کچھ خیال نہ کیا اور نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھ گیا۔ فدا محمد کا کمرہ اس نے ایک بار پھر آوارہ گردوں کے اڈے میں تبدیل کر دیا۔ اب اس کے پاس وقت بہت تھا۔

بے روزگار شاعر اور ادیب دن بھر وہیں رہنے لگے۔ شام ہوتی تو وہ گھٹیا شعر کہتے اور گھٹیا شراب پیتے، اچھی اردو بولتے اور بعض نشے کی حالت میں وہیں زمین پر پڑ کر رات کاٹ لیتے۔

جو دفتروں میں ملازم تھے، وہ صبح اٹھ کر وہیں ناشتہ کرتے اور بعض اوقات جمال کے کپڑے پہن کر نوکریوں پر چلے جاتے اور اپنے میلے کپڑے وہیں چھوڑ جاتے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کا جمال نے کبھی نام بھی نہ پوچھا تھا۔ فدا محمد کا کمرہ جمال نے ایک گندا بھنگڑ خانہ بنا دیا۔ وہ جمال کی خاطر صبر کرتا رہا۔ پینے اور غزل سنانے کے بعد جب سب سو جاتے تو وہ اخلاق جلالی کا گھوٹا لگانے لگتا۔

خواجہ یٰسین جمال کی بیروزگاری اور آوارگی پر بہت رنجیدہ تھے۔ چاہتے تھے کہ وہ کسی کام پر لگ جائے۔ ان کے ہم زلف اور جمال کے خالو خواجہ نعیم نے جنگ کے زمانے میں پنسلیں فروخت کر کے لاکھوں کمائے تھے۔ خواجہ یٰسین کے تجارت کے بارے میں خیالات بڑے رومانی تھے۔ انہوں نے جمال کو تھوڑی سی رقم دے کر اور تجارت کی رمزیں بتا کر سیالکوٹ بھیج دیا۔

خواجہ نعیم ایک خوبصورت اور طرح دار آدمی تھے۔ شکل سے آرٹسٹ مگر زندگی میں چوروں کی نانی۔ ان کو آرڈر لینے، پیشگی وصول کرنے، رشوت دینے، گھٹیا مال سپلائی کرنے اور مزدوروں کی اجرت مار لینے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ جھوٹ بولنے میں وہ صاحب کمال تھے اور دھوکا دینے میں استاد کامل۔ پیسہ ہی ان کی زندگی کا واحد مقصد تھا۔

گھر میں خواجہ نعیم کی حالت کتے کی سی تھی۔ نوکر تک ان کا تمسخر اڑاتے تھے۔ جمال کی خالہ اپنے تھانیدار باپ کی صحیح بیٹی تھی۔ جب غصے میں گرجتی تو دیواریں کانپنے لگ جاتیں۔ خوش ہوتی تو طرح طرح کے پکوان پکا کر کھلاتی۔ گانا سناتی اور قہقہے مارتی اور خواجہ نعیم کو وہ ہر حال میں کٹ کھنے کتے کی نظر سے دیکھتی۔

جمال سے اس کی دوستی تھی اور اس زمانے سے تھی جب وہ گرمیاں کاٹنے کے لیے کشمیر آیا کرتی تھی۔ اسے دق کا عارضہ تھا اور جمال اس کے لیے چھوٹی موٹی خریداری کرتا تھا یا اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جایا کرتا تھا۔ دونوں میں ایک طرح کی رفاقت کا رشتہ تھا۔ خواجہ نعیم کے ہاں جمال کی بہت آؤ بھگت ہوئی۔

## کتے کے پٹے

جمال کی ایک ہزار کی راس میں خواجہ نعیم نے ایک ہزار روپیہ اپنا ڈال کر جمال کے کاروبار میں شراکت کر لی۔ وہ جمال کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ اس نے جمال کے لیے چھری، چاقو، کتے کے پٹوں اور چمڑے کی پیٹیوں کی لائن منتخب کی۔ اس کا خیال تھا کہ میں آئندہ دورے پر ہندوستان کے ہر شہر میں جہاں اپنی پنسلیں

فروخت کروں گا وہاں جمال کے چھری چاقو اور کتے کے پٹے بھی بکوا دوں گا اور یوں ایک ہی دورے میں وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا۔ جیسے اور لوگ، چوہڑے، چمار، مستری اور ترکھان وغیرہ۔

چوہڑے، چمار سے اس کی مراد غریب کاریگر تھے جو اب اپنا مال مڈل مین کو بیچنے کی بجائے ہندوستان میں خود بیچنے لگے تھے۔

مستری الہ دین بالکل ان پڑھ تھا۔ دستخط بھی نہ کر سکتا تھا۔ وہ بائیسکلوں کی گدیاں بناتا تھا جن کی سارے ہندوستان کو ضرورت تھی۔ شروع شروع میں اس نے گدیاں دلالوں کے ذریعے بیچیں۔ پھر اپنے بھائیوں کو ساتھ ملا کر ایک چھوٹی سی ورکشاپ کھول لی، جس میں اس نے غریب اور لاوارث بچے سکھلائی کے باب میں مفت رکھ لیے۔ اس طرح اس میں سستا مال تیار کرنے اور زیادہ سپلائی کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔

مستر الہ دین کی خواجہ نعیم سے دوستی تھی۔ خواجہ نعیم کا خیال تھا کہ مستر الہ دین تگڑے ہاتھ پیر کا آدمی ہے۔ لڑ بھڑ کر گاڑی میں سیٹ لے سکتا ہے۔ قلیوں کو مار سکتا ہے اور سامان کی حفاظت نیند میں بھی کر سکتا ہے۔ ہندوستان کے دورے میں جب جنگ کی وجہ سے ہر طرف افراتفری مچی تھی، دو آدمیوں کا ساتھ ہونا اچھا تھا۔

خواجہ نعیم اور مستری الہ دین میں کوئی کاروباری رقابت بھی نہ تھی مگر دو سے تین بھلے۔ اسے جمال کو ساتھ لے جانے پر کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ ان کے کاروبار الگ الگ تھے۔

گاڑی میں جمال کی پہلی لڑائی فیروز پور کے قریب تین فوجیوں سے ہوئی جو گھر چھٹی پر جا رہے تھے۔ انہوں نے جمال کی سیٹ پر قبضہ کر لیا تھا۔ تین کے مقابلے میں وہ بھی تین تھے اور جمال کلکتے تک کا سفر کھڑے ہو کر نہ کر سکتا تھا۔ تو تو میں میں کے بعد جب جمال نے پلٹ کر دیکھا تو تگڑے ہاتھ پیر والا مستری الہ دین منہ پر کپڑا لپیٹ کر خراٹے لینے لگا تھا۔ خواجہ نعیم نے سپاہیوں کے سامنے کچھ قانونی وضاحتیں کیں مگر اتنے میں جمال نے ایک حریف کو گھسیٹ کر نیچے پھینک دیا تو اس کے دونوں ساتھی لڑنے کے لیے اوپر والی سیٹ سے نیچے اتر آئے۔ سیٹ خالی ہوئی تو مستری الہ دین چیتے کی طرح اچھل کر اس پر لیٹ گیا اور بولا ''چار گھڑی کا سفر ہے بھائیو۔ لڑنے کا کیا فائدہ؟''

دہلی میں تینوں نے کاروبار کی ابتدا کی۔ خواجہ نعیم جمال کو مستری الہ دین کے سپرد کر کے اپنے بازار کو چل دیئے۔ اس نے جمال سے کہا ''میں ان پڑھ اور غریب ہوں مگر مال بیچنا مجھے آتا ہے۔ تم میرے ساتھ رہو تا کہ تجارت کے بھید تمہیں معلوم ہو جائیں۔ میرے آرڈر بک ہو جائیں تو گھنٹے بھر میں تم جتنے چاہو گے اتنے چاقو، چھریاں اور کتے کے پٹے بکوا دوں گا۔''

چاندنی چوک کے قریب ایک گلی کی نکڑ میں ایک دبلا پتلا شخص جس کی ہڈیاں گنی جا سکتی تھیں گندگی کے ایک ڈھیر پر بیٹھا چاول کے دانے چن چن کر کھا رہا تھا۔ جمال کا دل دہل گیا۔ اس نے چاہا کہ سائیکل رکشہ میں سے کود کر اسے ایک دونی دے دے تا کہ وہ اپنا پیٹ بھر سکے مگر مستری الہ دین نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا ''یہ تو سالا بنگالی ہے۔ ایسے بہت ملیں گے ہندوستان میں۔ بچہ نہ بن پہلے اپنا مال بیچ۔''

جمال شام تک مستری الہ دین کی آرڈر بک بغل میں دبائے بائیسکل کی گدیوں کے آرڈر لکھتا رہا۔ دکانداروں کے سامنے وہ جمال سے اس طرح بات کرتا جیسے وہ اس کا منشی ہو۔

شام کے وقت جب دکانیں بند ہونے لگیں اور جمال کچھ بے چین ہوا تو مستری الہ دین نے کہا ''دہلی ایک چھوٹا سا شہر ہے اور یہاں کتے رکھنے کا رواج بھی نہیں۔ تمہارا مال الہ آباد میں بکے گا۔''

الہ آباد میں بھی جمال کی کتاب خالی رہی مگر جمال کو تشویش نہ ہوئی کیونکہ الہ آباد میں اسے پتہ چلا کہ کتے رکھنے کا رواج تو کلکتے میں ہے جہاں سے سارا ہندوستان مال خریدتا ہے مگر بنارس پہنچتے پہنچتے جمال کا سارا غم جاتا رہا کیونکہ اب اس کا کاروبار کہیں بھی نہ تھا۔

مستری الہ دین نے اپنے نمونوں کے ڈبے اور جمال کے نمونوں کے ڈبے ایک سائیکل رکشہ پر رکھوائے تھے۔ بازار میں جا کر وہ اپنے ڈبے جمال سے اٹھوا کر آرڈر بک کرنے کے لیے نکل گیا۔ جمال کے ڈبے وہیں رکھے تھے کیونکہ رکشہ گھنٹے کے حساب سے بک کیا گیا تھا۔

جب وہ واپس آئے تو رکشہ والا غائب اور جمال فارغ البال ہو چکا تھا۔

## صبح بنارس

رات تینوں نے ریلوے سٹیشن کے بنچوں پر کاٹی۔ صبح اٹھ کر جمال نے صبح بنارس دیکھی جس کے بارے میں اس نے بڑے خوبصورت اشعار پڑھ رکھے تھے۔

صبح بنارس گنگا کے مشرق میں طلوع آفتاب سے شروع ہوتی تھی۔ آفتاب کی سنہری کرنیں پانی پر پڑتیں تو لگتا سونے کا دریا بہہ رہا ہے۔ پھر اچانک کنارے پر کھڑے سائے ڈسنے لگے۔

ہندوستان بھر کے بوڑھے اور بیمار ہندو مرد اور عورتیں آواگون کے چکر میں آگے بلند تر مقام پانے کے خیال سے اور بالآخر نروان پا جانے کی امید میں گنگا میں اشنان کر رہے تھے۔ ان میں سے بیشتر مادرزاد ننگے تھے۔ پامال، خستہ، سوکھے ہوئے زرد لٹکتے ہوئے جسم بوڑھی عورتوں کی چھاتیوں پر جھلیوں کے لوتھڑے، مرجھائی ہوئی ٹانگوں والے ڈگمگاتے ہوئے بوڑھے مرد، بیماری، مایوسی، ذلت، فنا ہی فنا۔ یہ تھی صبح بنارس جس پر لکھنؤ کے بانکے شاعر مضمون کی ہوا باندھتے تھے۔

صبح بنارس یعنی بوڑھی اور بیمار عورتوں کے ننگے بدن جب وہ گرد و پیش سے بے خبر نروان کی امید میں دنیا کی آلائشوں اور دکھوں سے چھوٹ جانے کے لیے گنگا میں نہا کر ان دیکھے ڈراؤنے دیوتاؤں سے شرن کی بھیک مانگتی تھیں۔ دریا گندے پانی کی پھیلی ہوئی چادر تھا جس میں کروڑوں مردوں کے بیمار جسموں اور جلی ہوئی انسانی ہڈیوں کی راکھ گھلی ہوئی تھی اور عقیدہ جلی ہوئی انسانی ہڈیوں کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔

گھاٹوں پر نجومی، پانڈے، سادھو اور پروہت چیلوں کی طرح منڈلاتے اور بات بات پر یاتریوں

سے دکھشنا بٹورتے تھے۔

ہنومان جی کے مندر کا گھنٹہ بجا تو "جے ہو جے ہو گنگا میا کی جے ہو۔ بجرنگ بلی کی جے ہو" کے نعروں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

بوڑھے اور بیمار جسموں کی ایک اور کھیپ اشنان کرنے ڈُرنے اور پیسے بانٹنے کے لیے آگے بڑھی۔

جمال کا دل جذبۂ ترحم سے بھر گیا۔

اب چونکہ جمال کے پاس آرڈر بک کرنے کو کچھ بھی باقی نہ رہا تھا اس لیے مستری الہ دین مطمئن تھا۔ جمال اب اس کے آرڈر بک کرنے کے لیے خالی تھا۔

## کوچۂ استاد داغ

لکھنؤ اور پٹنہ سے نکل کر تینوں تاجروں نے کلکتہ میں کوچۂ استاد داغ کے ایک ہوٹل میں کمرہ لے لیا۔ وہ کلکتہ کے ریلوے سٹیشن پر سو نہیں سکتے تھے کیونکہ یہاں نل سے پانی لینا بھی دشوار تھا۔ قحط بنگال کی وجہ سے کالے بدنوں والے بے شمار بھوکے بچے، عورتیں اور بوڑھے پلیٹ فارم پر رہنے لگے تھے کہ شاید کسی گاڑی سے پیٹ بھرنے کے لیے انہیں کیلے کا چھلکا ہی مل جائے۔

خواجہ نعیم اور مستری الہ دین نے دن بھر میں بہت سے آرڈر بک کر لیے تھے۔ شام کو انہوں نے چورنگی کی سیر کی سوچی۔

چورنگی ایک عجیب جگہ تھی۔ جمال کو یہاں پہنچ کر ڈر لگنے لگا۔ امریکی اور انگریزی فوجی نشے میں دھت بھیڑیوں کی طرح ٹولیوں میں منڈلاتے پھرتے تھے اور کبھی ریوالور نکال کر ہوا میں یا دیواروں پر گولیاں چلاتے تھے۔

انگریزی فوجی امریکی فوجیوں سے جلتے تھے۔ انہیں بہت زیادہ تنخواہ ملتی تھی اور وہ پانچ روپے کی لڑکی کو سو روپے دے ڈالتے اور بھاؤ خراب کرتے تھے۔ انہوں نے ہندوستانیوں کا مزاج بگاڑ دیا تھا اور اب تو انگریزوں کو ٹیکسی بھی بڑی مشکل سے ملتی تھی۔

امریکی فوجی جس کو چاہتے پکڑ کر مارنے لگتے مگر انگریزوں کو انہوں نے کبھی کچھ نہ کہا۔ سکھ ٹیکسی ڈرائیوروں اور بنگالی غنڈوں کی اور بات تھی۔ وہ گلیوں میں اکا دکا امریکی کو پکڑ کر اس کی خوب ٹھکائی کرتے۔ انگریزوں کی ملٹری پولیس زور زور سے سیٹیاں بجاتی۔ انگریزوں کو امریکیوں سے نفرت سہی مگر وہ یہ برداشت نہ کر سکتے تھے کہ گورے امریکیوں کو کالے ہندوستانی مار پیٹ دیں۔

چورنگی میں زرد چہروں اور کالے بدنوں والی چھوٹی چھوٹی بنگالی لڑکیاں چولی کے بغیر ساڑھیاں لپیٹے یا سائے پہنے اپنی ہڈیوں کی بولی لگاتی تھیں۔ لگتا تھا کلکتے کی ساری لڑکیاں اس چوک میں آ گئی ہیں۔ ہر طرف بھیڑ لگی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ جسم بیچ کر بھوک کے آواگون سے نجات پا جائیں۔ وہ امریکی اور انگریز فوجیوں کے گرد مکھیوں کی طرح بھنبھناتی تھیں۔

چورنگی میں درندوں کا راج تھا۔ جمال نے کہا "مستری الہ دین اب چلیں۔ بہت کچھ دیکھ لیا۔"

مستری الہ دین نے زور کا قہقہہ مارا اور بولا "گھبرا گئے۔ کوئی مال وال دیکھو۔ بہت سستا ہے یہاں۔ دو روپے تو میں بھی تم پر خرچ کر سکتا ہوں۔"

خواجہ نعیم شرارت سے مسکرایا مگر جمال کی آزردہ صورت دیکھ کر اسے کچھ خیال آ گیا اور بزرگی کے تقاضے سے اس نے کہا "نہیں، یہ ہمارے قابل نہیں ہیں۔ یہ گندی عورتیں ہیں۔"

## زکریا ہوٹل

پھر تینوں ایک ہی سائیکل رکشہ پر بیٹھ گئے۔ کھینچنے والا دبلا پتلا آدمی، عمر کوئی چالیس برس، منہ پر چھوٹی سی داڑھی، ذرا سی دھوتی کے سوا اس کا بدن بالکل ننگا تھا۔ تین پلی ہوئی پنجابی لاشوں کو کھینچنے میں اس کی جان خرچ ہو رہی تھی۔ وہ پنڈلیوں پر کھڑا ہو کر اپنے بوجھ سے رکشہ چلا رہا تھا۔ اس کی سانس اس کے سینے میں سماتی نہ تھی۔ اس کا منحنی جسم پسینے سے شرابور تھا جس کی کھٹی اور گرم باس سے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔

زکریا ہوٹل کے چوک میں بڑی بھیڑ تھی۔ سیکڑوں کالے ننگے بدن آپس میں الجھ رہے تھے۔ چیخ چیخ کر انہوں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو مارتے، دھکیلتے، روندتے اور گالیاں دیتے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جمال مستری الہ دین اور خواجہ نعیم نے رکشہ چھوڑ دیا کیونکہ ہوٹل کے دروازے تک پہنچنا مشکل تھا۔

جمال نے رینگتے ہوئے کیڑوں کے اس دنگل پر نگاہ ڈالی۔ اس میں زیادہ تر بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں تھیں یا چھوٹے چھوٹے بچے۔ کچھ چیخ رہے تھے، کچھ رو رہے تھے۔ بیچ بیچ میں لاغر کتے اور بھوکی بلیاں ان کی بوٹیاں نوچنے کو پھرتی تھیں۔ دھکم پیل جاری تھی کہ پولیس آن پہنچی۔ جوانوں نے ڈنڈے نکال لیے اور ہجوم پر اندھا دھند یلغار شروع ہو گئی حالانکہ کسی کا کوئی قصور نہ تھا۔ مار کھا کر زخمی ہو کر تھک کر تھوڑی دیر میں لوگ بے حرکت ہو گئے اور میونسپل کمیٹی کا وہ گند اٹرک نظر آنے لگا جس پر زکریا ہوٹل کا کوڑا لادا جا رہا تھا۔ چچوڑی ہوئی ہڈیاں، مچھلی کے کانٹے، چاول کے دانے، پیاز کے چھلکے اور روٹی کے ٹکڑے کالے کیچڑ میں گڈمڈ تھے۔ ہجوم کے ہر نفس نے اس کوڑے پر نظریں لگا رکھی تھیں۔

پولیس والوں نے مار کر سب کو پیچھے دھکیل دیا تھا مگر کوڑا گاڑی کا راستہ صاف نہ ہو سکا تھا۔ گلی میں بوڑھوں، بچوں اور عورتوں نے دھرنا مار لیا تھا یا نقاہت سے گر کر انہوں نے سڑک بند کر دی تھی۔ ان کو مزید ڈنڈے مار کر ہٹایا نہ جا سکتا تھا۔ ان کے بدنوں میں اٹھنے کی طاقت ہی نہ تھی۔

کلکتے کے پولیس والے اتنے سنگدل بھی نہ تھے یا مارتے مارتے ان کے بازو شل ہو چکے تھے۔ ان کا افسر اب تقریر کرنے لگا۔ ہندوستان کے بھوکوں کو تقریریں سننے کا بڑا شوق تھا۔ وہ دھینگا مشتی چھوڑ کر تقریر سننے لگے۔

جمال بنگالی نہیں جانتا تھا۔ مستری الہ دین سے اس نے پوچھا تو اس نے کہا ''گندی بات کرتا ہے سالا۔ کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے۔''

تھوڑی دیر میں تقریر ختم ہوگئی۔ مردہ جسم آہستہ آہستہ زمین سے اٹھنے لگے۔ سپاہیوں نے انہیں قطاروں میں کھڑا کر دیا جو کوڑا گاڑی پر ختم ہوتی تھیں۔ کتوں اور بلیوں کو انہوں نے ڈنڈوں سے بھگا دیا۔

تب اس نے جو قطار میں سب سے آگے کھڑا تھا، بڑھ کر کوڑے کے دو اوک اپنی جھولی میں ڈال لیے اور قرینے سے پیچھے ہٹ گیا۔ پھر دوسرا بڑھا۔

اسی طرح نظم وضبط اور صبر و سکون سے بھوکے بچے، بھوکی عورتیں اور بھوکے بوڑھے پولیس کی نگرانی میں باری باری آگے بڑھتے اور کیچڑ کے دو اوک لے کر پیچھے ہٹتے رہے۔ گندگی والی گاڑی خالی ہونے لگی۔ پولیس کا انتظام نہایت اعلیٰ تھا۔ کسی نے بھی دو اوک سے زیادہ کیچڑ کا ایک لقمہ لینے کی کوشش نہ کی تھی۔

بنگال میں قحط سرکاری طور پر ختم ہو چکا تھا مگر اس کے گھاؤ بہت گہرے تھے۔ غیر سرکاری اندازوں کے مطابق اس میں کم وبیش پینتیس لاکھ لوگ بھوک اور بیماری سے مر گئے اور سڑکیں لاشوں سے اَٹ گئیں جنہیں صاف کرنے کے لیے افسروں کو فوج بلانی پڑی تھی مگر بنگال ہمیشہ کے لیے بھوکا مشہور ہو گیا اور بنگالی عورتیں، بچے سارے ہندوستان میں روٹی کی تلاش میں پھیل گئے۔ باقی صوبوں کے لوگ ان کا ذکر حقارت سے کرتے یا ان کو دیکھ کر نظریں پھیر لیتے۔

مگر یہ قحط مصنوعی تھا۔ بنگال میں خوراک کی کمی نہ تھی۔ گودام چاولوں سے بھرے تھے مگر لوگوں میں خریدنے کی طاقت نہ تھی۔ کچھ اس میں حکومت برطانیہ کا بھی قصور تھا۔ چرچل چاہتا تھا کہ خوراک کے ذخیرے فوجی مہمات کے لیے محفوظ رہیں۔ گندم کے کچھ جہاز انگریزوں نے آسٹریلیا سے بھی منگوائے تھے مگر انہیں یورپ کے لیے مخصوص کر لیا گیا۔ ہندوستان کی آبادی اس زمانے میں چالیس کروڑ تھی۔ اس میں تیس پینتیس لاکھ کی موت سے برطانوی سلطنت کا سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ ہندوستان ویسے بھی کثرت آبادی کا شکار تھا۔

### خاتمہ بالجبر

سیالکوٹ واپس جا کر خواجہ نعیم نے جمال کے کاروبار کا حساب کیا۔ اس کی ایک ہزار روپے کی راس میں سے چھ سو روپے کے نمونے بنے تھے۔ سو روپے کی سٹیشنری چھپی تھی اور تین سو روپے کلکتے کے سفر میں اٹھ گئے تھے۔ حساب برابر۔ جمال کسی کا مقروض نہ ہوا تھا۔

مگر سیالکوٹ چھوڑتے ہوئے اس کا دل بوجھل تھا۔ ایک اور ناکامی! ایک اور شکست!

مستری الہ دین نے پلیٹ فارم پر اسے رخصت کرتے ہوئے کہا ''یار جمال تم بے وقوف بہت ہو۔ کاروبار تمہاری لائن نہیں۔ نوکری کرو تو اچھے رہو......''

# باب 9

جمال ایک اور ناکامی کے بعد نور پور جا کر خواجہ یٰسین کے مشکل سوالات کا جواب دینے کے بجائے لاہور چلا گیا۔ لاہور جو اس کو آسانی سے قبول کر لیتا تھا۔ یہاں اسے مفتی کے ساتھ گپ مارنے، اس کے ادیب دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے اور فدا محمد کے ساتھ سڑکیں ناپنے کے سوا کوئی مصروفیت نہ تھی۔ مگر مفتی اس کے بارے میں فکرمند رہتا تھا۔ اس کو یہ خیال بھی تھا کہ جمال کی شخصیت ابھی کھلی نہیں۔ بیکار رہ کر کہیں اس کی چمک دمک اور تازگی ضائع نہ ہو جائے۔ اس نے اسے ایک فلمی رسالے کی بلاتنخواہ ایڈیٹری دلوا دی۔

### ادیب لوگ

مگر لکھنے سے جمال کو خوف آتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ادیب خاص لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی شکل و صورت بھی عام لوگوں سے مختلف ہوتی ہے اور وہ نور پور جیسے معمولی قصبوں میں پیدا نہیں ہوتے مگر اب جو اس نے ادیب قریب سے دیکھے تو اسے جھٹکا سا لگا۔ ان کی باتیں پھیکی اور بے مغز تھیں۔ وہ بے معنی باتوں پر بڑی سنجیدگی سے بحث کرتے تھے۔ ان میں سے بعض فکرمند اور کم گو بھی تھے۔ بعض پڑھے لکھے بھی تھے مگر بعض محض انوکھی باتیں کرتے تھے۔ لگتا تھا سب عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ مزدور کسان کی بات کرتے ہیں۔ انصاف اور عدل اجتماعی چاہتے تھے مگر وہ ایک غیر حقیقی اور رومانی دنیا میں رہتے ہیں۔ نچلے طبقے کے لوگوں سے ان کا کوئی رابطہ نہ تھا۔ وہ ملک کی تاریخ سے بھی نابلد تھے۔ طبقاتی سماج کے بست وکشاد کا بھی انہیں ادراک نہیں تھا۔ ان کی جیب بالعموم خالی ہوتی مگر وہ غصے میں بھرے رہتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو ترقی پسند کہلواتے تھے۔

مفتی ترقی پسندوں کے بہت خلاف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ لوگ اللہ کے کاموں میں مداخلت کرتے ہیں، جو جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے بھوکا مارے۔

پاکستان کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا اور مسلمانوں نے فرض کر لیا تھا کہ پاکستان میں سماجی انصاف ہوگا۔ جمال ترقی پسندوں کا حامی تھا۔ وہ اگر عدل اجتماعی چاہتے ہیں، طبقاتی نظام کے دشمن ہیں تو اچھے لوگ ہیں اور اگر لوگ اپنے معاملات خود طے کر لیں تو اس میں اللہ میاں کو اعتراض کیوں ہونے لگا۔

فدا محمد اور مشتاق کو ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایک کی جان اخلاق جلالی میں اٹکی ہوئی تھی،

دوسرا راگ رنگ میں مست تھا۔

## یہ ہمارا پاکستان ہے

کرنا خدا کا کیا ہوا کہ جمال کو شیخوپورے میں کلاتھ انسپکٹر کی نوکری مل گئی۔ اس کے افسر رانا صاحب بہت عمدہ آدمی تھے۔ اپنے ماتحتوں سے وہ برادرانہ سلوک کرتے تھے۔ تھوڑی سی گپ شپ کے بعد جمال کو انہوں نے سر پر بٹھا لیا اور رات کو اسے گھر لے گئے۔

جمال نے انہیں اپنی زندگی کی کہانیاں سنائیں تو ان کا دل باغ باغ ہو گیا۔ بولے ''آپ جیسے خوش طبع اور مہم جو شخص سے گرہ گرہ کپڑے کی پیمائش کروانا، تھان گنوانا اور راجڈ ڈپو ہولڈروں کا حساب کتاب چیک کروانا انسانی تہذیب سے زیادتی ہے۔''

جمال نے کہا ''روٹی کے لیے تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے رانا صاحب۔''

''اللہ رازق ہے۔'' وہ بولے۔

چک کی اوٹ سے چوڑیاں چھنکیں، مگر جمال نے کچھ خیال نہ کیا۔

''مگر اللہ میاں کسی کو چیک تو نہیں بھیجتا۔'' جمال نے کہا۔

''اللہ میاں چیک بھی بھجوا سکتا ہے۔'' وہ بولے۔ ''اپنے کسی کتے کے ہاتھ۔ آپ صبح لاہور چلے جائیں کسی مرغ زرین کو شیخوپورے کے پنجرے میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ کپڑے کا حساب ہم خود کر لیا کریں گے۔''

چوڑیوں کی جھنکار پھر سنائی دی۔ کوئی لڑکی جمال کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

رانا صاحب ہنس کر بولے ''میری چھوٹی بہن ہے۔ جب لاہور میں پڑھتی تھی تو ریڈیو پر تقریریں کیا کرتی تھی۔'' پھر انہوں نے آواز دے کر کہا ''سعیدہ جی اب چائے بھی بھجوا ہی دو۔ جمال صاحب آرٹسٹ آدمی ہیں۔ چائے کی طلب ہو گی انہیں۔''

چوڑیاں چھنکتی چھنکتی پیچھے ہٹ گئیں۔

رانا صاحب بولے ''شیخوپورے میں آپ کی دلچسپی کی کوئی چیز نہیں۔ آپ لاہور سے پہلی کی پہلی آ کر تنخواہ لے جایا کریں۔''

رانا صاحب کی باتوں میں بے حد خلوص تھا۔

تھوڑی دیر میں چوڑیاں پھر چھنکیں۔ چک کے پیچھے سے رانا صاحب کی بہن نے ہولے سے کہا ''چائے لے جائیے۔'' اس کی آواز بہت سریلی تھی۔

جمال نے اسے سناتے ہوئے کہا ''بریانی بہت عمدہ تھی اور ساگ کے تو کیا ہی کہنے!''

رانا صاحب بولے ''سعیدہ بریانی سپیشلسٹ ہے۔''

چوڑیاں خوش ہو کر پھر چھنکنے لگیں۔

رانا صاحب اور ان کا پورا اسٹاف آپس میں شیر و شکر تھے۔ مہینے دو مہینے کے بعد جب کپڑے کا کوٹہ آتا تو رانا صاحب پورا کوٹہ بلیک مارکیٹ میں بکوا کر منافع عہدوں کی رعایت سے سارے سٹاف میں تقسیم کر دیتے اور کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہ ہوتی۔

جمال کی شیخوپورے میں رہائش کا مطلب تھا دفتر کے معاملات میں اس کی شرکت اور منافع میں حصہ داری۔

پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جمال جسے زندگی کا کوئی تجربہ نہ ہوا اور جسے پیسے کی اہمیت کا پتہ نہ لگا، حصہ لینے سے انکار کر دے اور افسران بالا کو اطلاع کر دے، ایسے گاؤدی کا شیخوپورے سے دور ہی رہنا اچھا۔

جمال کو یہ باتیں آہستہ آہستہ ہی معلوم ہوئیں مگر رانا صاحب کی محبت اور خاطر داری نے جمال کا من موہ لیا۔ پہلی تاریخ کو جب وہ لاہور سے ایک سو سترہ روپے چودہ آنے وصول کرنے کے لیے شیخوپورے جاتا تو رانا صاحب اس کی بڑی خوشی مناتے۔ جمال کو تنخواہ کے بدلے کچھ بھی کرنا نہ پڑتا۔

سچ ہے اس کے دینے کے ڈھنگ نرالے ہیں!

## مرا تو نہیں جاتا نہ

رسالدار صاحب اچانک چل بسے تھے۔ ان کے کفن دفن میں فدا محمد نے بڑا کام کیا تھا اور نور جہاں رام ہو چکی تھی۔ اب پروگرام یہ بنا کہ مشتاق اور جمال سے اس کی دوستی کروائی جائے۔ نور جہاں اس پر راضی ہو چکی تھی کہ مرنے والے کے ساتھ مرا تو نہیں جاتا نہ۔

نور جہاں کی والدہ اب کوئی بڑا مسئلہ نہ تھی۔ اس کے جوڑوں کا درد بڑھ گیا تھا اور وہ چارپائی پر پڑی رہتی تھی۔ بے سدھ، بے خبر۔

اس کی بے خبری کی وجہ اس کا مرض نہیں تھا۔ میٹھے مالٹے کی بوتل تھی جس کی وہ عادی ہو چکی تھی۔

شروع شروع میں فدا محمد اسے برانڈی پلاتا رہا مگر اپنی کلرکی کی تنخواہ میں وہ اس کا خرچہ برداشت نہ کر سکتا تھا۔ ایک دن چپکے سے اس نے نور جہاں کی والدہ کو میٹھے مالٹے کے دو پیگ پلا دیئے۔ بڑھیا کو اس کی تیز بو اور تلخی سے متلی سی ہوئی مگر تھوڑی دیر میں اس کے جوڑوں کا درد بالکل جاتا رہا اور وہ لہک لہک کر باتیں کرنے لگی۔ اس نے گراموفون منگوا کر کملا جھریا اور سہگل کے ریکارڈ سنے۔ اب دن بیتے نا ہیں!

پھر اپنی جوانی کے قصے سنائے۔ جب وہ پیروں میں سونے کی پازیبیں پہنتی تھی اور رسالدار کی مونچھیں تیر کی طرح سیدھی ہوتی تھیں۔

سوتیلے بھائیوں نے نور جہاں کے حصے کی ساری زمین جو رسالدار کو انگریزوں نے دی تھی، مار لی تھی اور اب ماں بیٹی زیور بیچ بیچ کر یا اس رقم کے سود سے جو رسالداران کے نام پر جمع کروا گیا تھا، گزارہ کر رہی تھیں۔

سوتیلے بھائیوں نے نور جہاں کی شادی بھی نہ ہونے دی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی آئے اور مربعوں کا حساب مانگے۔ نور جہاں میں تو کوئی خرابی نہ تھی۔ وہ ان کے باپ کی بیٹی تھی اور ان کا خون تھی مگر وہ کہلوا دیتے تھے کہ اس کی نانی کنجری تھی۔ اب آنکھوں دیکھی مکھی تو کوئی نہیں کھاتا۔

## نور جہاں سرور جہاں!

نور جہاں اپنی شادی سے مایوس ہو چکی تھی۔ فدا محمد کے سوا اس کا اپنا کوئی نہ تھا اور اپنوں کے بغیر زندگی گزارنا مفت کے پتھر ڈھونے کے مترادف ہوتا ہے۔ اس عمر میں لڑکیوں کو ساتھیوں، سنگیوں کی ضرورت ہوتی ہے مگر سوکھے سڑے نور پور میں تھا کون اس کے قابل؟

نور جہاں مفت کے پتھر ڈھونا نہ چاہتی تھی۔ اس کو معلوم تھا کہ فدا محمد کی شادی ہو چکی ہے مگر چاہے جانے کی امنگ میں لڑکیاں اس قسم کی باتیں نہیں سوچتیں۔ کچھ ان میں یہ آرزو بھی ہوتی ہے کہ وہ کسی دوسری لڑکی سے اس کا خصم چھین لیں۔

## جھوم کے اٹھی ہے گھٹا

چاہے جانے کی خوشی میں اور فدا محمد کے مجبور کرنے پر کہ آج گھٹا جھوم کے اٹھی ہے، ایک دن نور جہاں نے بھی ایک پیگ ناک پر ہاتھ رکھ کر پی لیا تھا۔ فدا محمد کی خوشی کی خاطر پھر اس کو یہ جان کر بڑا اطمینان ہوا کہ ایک پیگ سے تو کچھ بھی نہیں بگڑتا۔

اس نے شکر کیا کہ ان کے گھر میں کسی کا آنا جانا نہیں۔ اس نے ایک پیگ اور پی لیا۔

دو پیگ پی کر اسے ایک عجیب طرح کی فرحت اور تازگی کا احساس ہوا جیسے وہ زندگی کی آلائشوں سے پاک ہو گئی ہو۔ جیسے وہ اڑن کھٹولے کی سیر کر رہی ہو۔ جیسے وہ کبوتری ہو، کوئل ہو، کونج ہو......

اُف! آسمان کتنا کھلا تھا اور ہوا کتنی لطیف! اس نے محسوس کیا کہ سارا جہاں میرے چمکیلے پروں کے نیچے ہے۔

پھر وہ روزانہ فدا محمد کا انتظار کرنے لگی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ لمحوں کو پکڑ کر مٹھی میں بند کر لے۔

فدا محمد کو اپنی گردن سے ٹکراتی ہوئی اس کی گرم گرم سانسیں بہت مزہ دیتی تھیں۔ پھر میٹھے مالٹے کا نشہ دوبالا ہو جاتا۔ اس کی رگوں میں مہتابیاں سی چھوٹنے لگ جاتیں اور سارا جہان نور جہاں نور جہاں کی مہکار سے بھر جاتا۔

ان مہکاروں کا تذکرہ فدا محمد جمال اور مشتاق کو مزے۔ لے لے کر سنایا کرتا۔

نور جہاں کو خود ان سے ملنے کا اشتیاق تھا کیونکہ وہ دونوں فدا محمد کے اتنے پکے اور اتنے رنگیلے یار تھے، پھر وہ راز کو راز رکھ سکتے تھے اور اس بات کا فدا محمد نے نور جہاں کو یقین دلا دیا تھا۔

مگر سوال یہ تھا کہ نور جہاں سے ملاقات کیسے ہو۔

لالی تو آدھی رات کو خود چل کر آ جاتی تھی اور تاجی کے ذریعے ملاقاتیں طے ہو جاتی تھیں مگر نور جہاں کی اور بات تھی۔ وہ دوسرے تیسرے محلے میں رہتی تھی اور اس کا اتنی گلیاں پار کر لینا اور دیکھے نہ جانا ممکن نہ تھا۔

یہ بھی خیال تھا کہ نور جہاں اونچے گھرانے کی لڑکی ہے۔ اس کا ملاقات کے لیے رضامند ہو جانا ہی بڑی بات ہے۔ اسے یہ کہنا کہ تم آدھی رات کو گھر سے نکلو اور فلاں جگہ پہنچ جاؤ اس کے مرتبے سے گری ہوئی بات ہوتی۔ یوں بھی اسے بلایا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ وہ ایک باپردہ اور باحیا لڑکی تھی۔

## ایک ہی راستہ

ملاقات کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ فدا محمد جمال اور مشتاق کو ساتھ لے کر کسی طرح نور جہاں کے بیڈ روم میں پہنچ جائے مگر سوال یہ تھا کہ پھر نور جہاں کی اماں جی کا کیا جائے۔ جمال اور مشتاق اس کے کسی طرح بھی رشتہ دار نہ تھے۔

یہ بات بھی تھی کہ نور جہاں اور اس کی والدہ ایک ہی کمرے میں سوتی تھیں۔ نور جہاں تھوڑی دیر کے لیے کمرے سے نکل کر آ سکتی تھی مگر تھوڑی دیر میں کیا ہو سکتا ہے۔

ضرورت اس بات کی تھی کہ نور جہاں ان کے پاس بہت دیر تک رہے۔ بات چیت کرنے میں آزاد ہو اور کمرے میں کسی دھڑکے کا گزر نہ ہو۔

ان مسائل کو صرف فدا محمد ہی حل کر سکتا تھا۔ اس نے نور جہاں سے صلاح کی۔ نور جہاں نے لالی سے مشورہ کیا۔

لالی نے اسے بتا دیا تھا کہ میرا تعلق مشتاق اور جمال سے بھی ہے اور اس سلسلے میں اس نے نور جہاں کو جمال سے اپنی پہلی ملاقات کی کہانی بھی سنا دی تھی۔ جب جمال نے ستار کو سر کرنے میں ہی رات بتا دی تھی۔ جمال کی معصومیت پر نور جہاں کو بڑی ہنسی آئی تھی اور وہ اس بے وقوف کو ملنے کے لیے بے قرار تھی۔

طے پایا کہ فدا محمد نور جہاں کی والدہ سے کہے کہ میں اپنے پیارے دوستوں کو دوپہر کا کھانا کھلانا چاہتا ہوں مگر میری بیوی میکے میں ہے اور میں کوئی انتظام نہیں کر سکتا۔

اس پر نور جہاں کہے، ہم سے نہیں پکتا کسی کا کھانا!

لالی کہے، کھانا پکانا نوکروں کا کام ہے۔

پھر فدا محمد کہے ''تمہاری بڑی مہربانی لالی۔ یہ میری عزت کا سوال ہے۔''

نور جہاں جل کر کہے، ہمیں کیا کسی کی عزت سے! اس پر فدا محمد اماں جی کے سامنے روہانسا ہو جائے اور کہے افسوس نور پور میں ہماری عزت کا کوئی گاہک نہیں۔ اب کیسی ہماری بے عزتی ہوگی دوستوں میں جنہیں ہم نے بیوقوفی سے بلا ہی لیا ہے۔

فدا محمد نے ایسا ہی کیا۔ نور جہاں نے بھی ایسا ہی کیا۔ لالی نے بھی ایسا ہی کیا۔ اماں جی نے بھی ایسا

ہی کیا جیسا کہ خیال تھا۔ بولیں، ہاں نور جہاں کیا حرج ہے۔ لالی کھانا پکا دے گی۔ اب فدا محمد کس کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ اس کا اور ہے بھی کون نور پور میں؟

اب سوال تھا کہ دن دیہاڑے جمال اور مشتاق نور جہاں کے گھر میں داخل کیسے ہوں۔ لوگ دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے۔ ممکن ہے کوئی نور جہاں کے بھائیوں کو خبر کر دے یا ویسے ہی شور مچا دے۔

اس کا علاج مشتاق نے فوراً سوچ لیا۔ اس کا بڑا بھائی اشتیاق جمال کا بڑا ماموں لاہور میں رہتا تھا۔ وہ انگلستان میں حیوانات کی ڈاکٹری کا امتحان تو نہ پاس کر سکا تھا مگر اس نے اپنی دو برس کی پڑھائی کے دوران حیوانات کی بیماریوں اور دوائیوں کے نام یاد کر لیے تھے۔ وہ اس بات سے بھی واقف ہو چکا تھا کہ حیوانوں اور انسانوں کا نظام حیات ایک ہی جیسا ہوتا ہے اور گائے بھینس کو بھی تپ دق، نزلہ، زکام اور بخار کی بیماریاں ہو جاتی ہیں۔ اس نے اپنے تھانیدار باپ کی خوشی کی خاطر نور پور میں ڈاکٹری کی دکان کھول لی تھی اور بیمار کسانوں پر حیوانات کی دوائیں آزما آزما کر علاج میں کسی قدر شہرت حاصل کر لی تھی مگر وہ نور پور چھوڑ کر ایک کپڑے کی مل کا منیجر ہو گیا تھا کیونکہ اس کو انگریز افسروں سے بات کرنی آتی تھی۔ وہ بلا کا چرب زبان، بلا کا ذہین اور بلا کا باتونی آدمی تھا اور تھوڑی رشوت دے کر افسروں سے بڑے بڑے کام نکلوانے کا فن جانتا تھا۔

اس کا اسٹیتھسکوپ ابھی تک نور پور میں پڑا تھا۔

## مریض عشق ہیں

مشتاق کو انسانی صحت سے خصوصی دلچسپی تھی۔ لوگوں کو معلوم تھا کہ اس کا بھائی ڈاکٹر ہے۔ اس لیے وہ اسے بھی فن سے بے بہرہ نہ سمجھتے تھے اور اسی خیال کو مشتاق نے اپنی مخلصانہ خدمات کے ذریعے مضبوط کر رکھا تھا۔ نور پور میں کسی اور ڈاکٹر کی عدم موجودگی میں اس کا دم غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ وہ نور پور آتا تو بیمار عورتیں اس کو گھیر لیتیں اور اس سے اپنی پیچیدہ بیماریوں کے نسخے لکھواتیں۔ کبھی کبھی وہ کونین کی گولیاں از خود بھی ان میں بانٹ دیا کرتا تھا۔ اس قسم کی نیکی اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔

لوگ کہتے تھے اس کے ہاتھ میں شفا ہے۔ شفا تھی یا نہیں مگر اس پر بھروسہ سبھی کرتے تھے۔

مشتاق نے اپنے بھائی کا چھوڑا ہوا اسٹیتھسکوپ گلے میں ڈالا۔ جمال نے دوائیوں کا بکس اٹھایا اور وہ یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ ہم مریض دیکھنے جا رہے ہیں، اطمینان سے چلتے ہوئے کھلم کھلا نور جہاں کے گھر میں داخل ہو گئے۔ یہ عجب اتفاق تھا کہ اس وقت گلی بالکل خالی تھی۔

نور جہاں نے انہیں کھڑکی میں سے دیکھ لیا تھا۔ وہ ہانڈی میں زور زور سے چمچہ ہلانے لگی۔ جیسے اسے کچھ خبر ہی نہ ہو، جیسے اسے کوئی پرواہ ہی نہ ہو۔

لالی نے بھاگ کر تپائی لگائی۔ مشتاق اور جمال اماں جی کو ادب سے سلام کرتے بیٹھ گئے۔ پھر مشتاق نے سنجیدہ منہ بنا کر اماں جی سے بیماری کی کیفیت پوچھی جو انہوں نے کھرچ کھرچ کر بتائی۔ اس سے ان کا موڈ کچھ بہتر ہو گیا۔

مشتاق نے جمال کے ہاتھ سے دوائیوں کا بکس لے لیا اور ایک خوبصورت بوتل میں سے دو گولیاں نکال کر کہا ”ان کو برانڈی کے ساتھ کھانا چاہیے مگر افسوس کہ برانڈی میں لے کر نہیں آیا۔“

اماں جی ہلکی سی مسکرائیں۔

فدا محمد نے میٹھے مالٹے کی بوتل تپائی پر رکھ کر کہا۔

”یہ رہی برانڈی!“

مشتاق نے سوچتے ہوئے کہا ”یہ برانڈی تو نہیں مگر یہ بھی ٹھیک ہے۔ اس میں طاقت ذرا زیادہ ہوتی ہے اور کوئی خرابی نہیں۔“

اماں جی بولیں ”برانڈی سے مجھے فائدہ نہیں ہوتا مگر کبھی اس کا گھونٹ پی لوں تو درد میں فوراً افاقہ ہو جاتا ہے۔“

”بے شک یہ بری چیز نہیں۔“ مشتاق نے دانائی سے کہا۔ پھر جمال کو اشارہ کیا۔ ”اسے کھولو۔“ بوتل کھولنے کا یہاں کوئی سامان نہ تھا۔ اس کو پریشان دیکھ کر اماں جی نے نور جہاں سے کہا ”برف توڑنے والا سوا لانا نور جہاں۔“

نور جہاں نے بے رخی سے سوا اماں کے آگے ڈال دیا۔

”گلاس بھی لے آ...... چار۔“ وہ بولی۔

”کیوں؟“ نور جہاں تنک کر بولی۔ ”کیا ان سب کو جوڑوں کا درد ہے۔“

اس پر اماں جی مسکرا کر بولیں ”بچے ہیں۔ ذرا بہل جائیں گے میرے ساتھ دو گھڑی۔ تو اندر جا کر کتاب پڑھ۔“

نور جہاں نے چار گلاس لا کر تپائی پر رکھ دیئے۔ لالی نے برف توڑی اور بھنی ہوئی بوٹیوں کی قاب سامنے رکھ دی۔

فدا محمد نے چار گلاس بنائے۔ جمال نے ان میں تھوڑا تھوڑا پانی ملایا۔ مشتاق نے بڑی نزاکت سے ان میں برف کا چورا ڈالا، پھر چاروں نے گلاس ٹکرائے اور اماں جی کی صحت کی دعا کے بعد غٹا غٹ پی گئے۔ منہ کی تلخی دور کرنے کو انہوں نے بوٹیاں کھانی شروع کر دیں۔

تھوڑی دیر میں اماں جی کی ٹانگوں کا درد کم ہو گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں اور چہک چہک کر باتیں کرنے لگیں۔ نور جہاں اور لالی باورچی خانے میں بند رہیں۔ انہوں نے وہیں سے طرح طرح کے اشارے کیے جنہیں اماں جی بالکل نہ دیکھ سکیں۔

مشتاق، جمال اور فدا محمد بڑھیا کی باتیں بڑے انہماک سے سنتے رہے۔ جیسے انہوں نے اس قدر

دلچسپ کہانیاں زندگی میں پہلی مرتبہ سنی ہوں مگر وقفے وقفے سے وہ بڑی بی کو بڑے بڑے جام پلاتے رہے۔ کچھ ان کی وجہ سے اور کچھ نیند کی ان دو گولیوں کے زیر اثر جو مشتاق نے دوا کے طور پر اسے کھلا دی تھیں بڑھیا کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ بستر پر دراز ہوتے ہوئے وہ بولی "لڑکیو! کھانا لگاؤ، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

پھر وہ گہری نیند سو گئی۔ مشتاق جمال اور فدا محمد نے آہستہ سے بوتل اور گلاس اٹھائے اور پنجوں کے بل چلتے ہوئے پچھلے کمرے میں چلے گئے۔ پیچھے پیچھے نور جہاں اور لالی برف کا چورا اور بوٹیوں کی قاب اٹھائے۔

نور جہاں کو بڑے زور کی ہنسی آ رہی تھی۔ اس کے قہقہے رکتے ہی نہ تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی فوارے کی طرح پھوٹ بہے گی اور اس کی پھوار سارے جگ میں پھیل جائے گی۔

مشتاق نے پانچ گلاس بھرے۔ نور جہاں نے پانی ملایا، لالی نے برف ڈالی۔ جمال نے پانچ سگریٹ سلگائے۔

فدا محمد کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ یہ اس کا دن تھا۔

لالی نے ابھی تک پی نہ تھی۔ اس کو پینے کے آداب کا پتہ نہ تھا۔ جب فدا محمد مشتاق جمال نے گلاس ٹکرائے تو وہ ناک بند کر کے گلاس خالی کر چکی تھی۔ اس پر نور جہاں نے اسے ہلکے سے ڈانٹا۔

مشتاق بولا "یوں نہیں میری شہزادی۔ آہستہ آہستہ۔ گلاس کو ایک دم خالی نہیں کرتے۔"

"رک رک کر پیتے ہیں۔" نور جہاں نے کہا "گھونٹ گھونٹ!" اس پر لالی کچھ شرمندہ ہوئی۔

دو پیگ پی کر نور جہاں نے دوپٹہ اتار کر پھینک دیا اور ایک چھوٹا سا آئینہ نکال کر ہونٹوں پر سرخی لگانے لگی۔ اس کے ہونٹ کمان کی طرح کھچے ہوئے تھے۔ پھر اس نے لالی کا کھیس نوچ کر سرخی کی ایک لکیر اس کے گلابی ہونٹوں پر بھی لگا دی۔

لالی کے گریبان کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔ اس کا دودھیا سینہ چاند کی طرح چمکنے لگا۔ نشے میں اس کی آنکھیں کچھ اور لمبی اور کچھ اور کالی ہو گئیں۔

مشتاق نے اچانک بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی زانوں پر ڈال لیا اور اس کے گریبان کو ٹٹولنے لگا۔

## مستی و بے خودی

نور جہاں خود ہی جھوم کر فدا محمد کی آغوش میں گر گئی اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

جمال کسی قدر اداس ہو گیا۔ اس سے پہلے اسے خیال ہی نہ آیا تھا کہ میرے پہلو میں تو کوئی بھی نہ ہو گا۔ مشتاق اور فدا محمد نے بھی کچھ سوچا نہ تھا۔ اب اس کو دونوں کی خود غرضی پر غصہ آنے لگا جسے چھپانے کے خیال سے اس نے اپنے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ چڑھا لی۔

مشتاق نے کہا "جمال ایک پیگ اور بنا دو۔"

"میرے لیے بھی۔" نور جہاں بولی "میں ابھی تک صرف پہلے آسمان تک اڑی ہوں۔"

لالی نے مستی سے کہا "میرے لیے ابھی نہیں۔" مگر اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا تا کہ پیگ پکڑ سکے۔

گلاس اس کے ہاتھوں میں کانپنے لگا۔ مشتاق نے کہا "اے حسینہ! لا میں تجھے اپنے ہاتھ سے پلا دوں۔"

پھر وہ اسے چھوٹے چھوٹے گھونٹ پلانے لگا۔ اس کے سینے کے ابھار چمکنے لگے۔ جیسے کسی کمہار نے سنگ مرمر کو گوندھ کر ان میں چاندنی ملا دی ہو۔

نور جہاں نے اپنا گلاس فدا محمد سے لے لیا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر اور مسکرا مسکرا کر اپنے ہونٹوں کو چوسنے لگے۔

جمال نے اپنی آزردگی کو چھپانے کے لیے اپنا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر دیا۔

اس پر لالی بولی "یوں نہیں جمال۔ آہستہ آہستہ۔۔۔ رک رک کر جیسے تمیزدار لوگ پیتے ہیں۔ رک رک کر۔ جیسے ستار سر کرتے ہیں۔ رک رک کر۔۔۔ رک رک کر۔" پھر وہ شرارت سے ہنسی۔

اس چوٹ کو سب سمجھ گئے اور سب ہنسنے لگے۔ کھسیانا ہو کر جمال بھی ہنسنے لگا۔

نور جہاں بولی "بچوں کو چھیڑا نہیں کرتے لالی۔" پھر وہ ہلکے ہلکے قہقہے لگانے اور دہرانے لگی "رک رک کر، رک رک کر جمال۔"

فدا محمد اور مشتاق پریشان ہو گئے۔ مشتاق نے کہا "آہستہ بولو بے وقوفو، کوئی سن لے گا۔"

"مجھے نہیں کسی کا ڈر۔" نور جہاں نشے میں جھوم کر بولی۔ "چاہے کوئی آ کر دیکھ لے۔ مجھے نہیں کس کی پرواہ۔ مگر میں پوچھتی ہوں شراب میں کیا برائی ہے۔ کیوں لوگ اس کے پیچھے پڑے ہیں۔"

لالی نے کہا "میں تو پہلے بھی کسی سے نہیں ڈرتی۔ مجھ سے اب اور کوئی کیا چھین لے گا۔ زیادہ سے زیادہ مجھے پکڑ کر جوتیاں مار لیں گے۔ جوتیاں تو میں بہت کھا چکی ہوں۔"

دونوں مستی میں بے خود تھیں۔ ساری دنیا ان کے پیروں کے نیچے پھیلی ہوئی تھی اور وہ اسے حقارت سے دیکھ رہی تھیں۔

مشتاق اور فدا محمد کے دل جھانجھروں کی طرح چھن چھن بج رہے تھے۔ ان کی انگلیاں اور ہونٹ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔

نور جہاں اور لالی نے ان کی گردنوں میں باہیں ڈال کر اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ ان کے جسموں میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔

لڑکیوں نے بہت پی لی تھی۔ اس خیال سے جمال کے دل میں ہول اٹھنے لگا۔ مشتاق اور فدا محمد نے ان کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اس کو پہلی مرتبہ خیال آیا کہ دونوں بہت ذلیل آدمی ہیں۔

اس نے کاگ لگا کر بوتل چپکے سے کرسی کے نیچے رکھ دی۔

اچانک مشتاق نے کہا ''مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو جمال؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' جمال نے آواز کو پر مسرت بنا کر کہا۔

''مزے میں ہو نا؟'' فدا محمد نے اپنی مست آنکھیں اٹھا کر پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر وہ نور جہاں پر گر گیا۔

''بہت مزے میں ہے جمال۔'' نور جہاں لڑکھڑائی ہوئی زبان سے بولی۔ ''مگر فدا محمد تو بھوکا بھیڑیا نہ بن۔''

اس کے گال تپ رہے تھے۔ فروغ مے سے اس کا چہرہ اور بھی فروزاں ہو رہا تھا۔

لالی سر اٹھا کر بولی ''دنیا تیرا بیڑا غرق، تیرے منہ پر سو جوتی!''

پھر نور جہاں اور لالی کی گھڑیاں کھلنے لگیں۔ فدا محمد اور مشتاق لذت سے کراہنے لگے۔

اچانک مشتاق بولا ''جمال ذرا باہر جا کر دیکھو اماں جی تو نہیں جاگیں۔ اگر حرکت کریں تو ایک پیگ انہیں اور دے دینا۔''

نور جہاں ہنسی۔ اس نے کہا ''مجھے نہیں اماں جی کی پرواہ، چاہے وہ جاگ جائیں۔ جب تک جیتے ہیں جیتے ہیں۔''

جمال اٹھ کر اماں جی کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ ابھی تک بے سدھ سوئی ہوئی تھیں۔ اس کا اور پینے کو جی نہ چاہتا تھا مگر اس نے ایک پیگ گلاس میں ڈال لیا۔ اس کا جسم تن کر لکڑی کا تختہ ہو چکا تھا اور بدن میں تکان کی ہلکی ہلکی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں اس بوڑھی عورت کے پاس بیٹھ کر کیا کروں۔

تھوڑی دیر اور گزر گئی۔

پھر مشتاق اور فدا محمد اپنے بال انگلیوں سے درست کرتے ہوئے باہر نکلے۔

## چاچا جاموں سے مڈبھیڑ

مشتاق نے اسٹیتھسکوپ پہلے کی طرح گلے میں ڈالا۔ دوائیوں کا بکس جمال کے ہاتھ میں دیا اور بولا ''جلدی نکلو یہاں سے۔''

باہر نکلتے ہی جاموں چاچا سے ان کا سامنا ہو گیا۔ اسے کاٹ کر نکل جانا ممکن نہیں تھا۔ وہ ہنس کر بولا ''کیا بات ہے بیٹا؟''

اس نے شراب کی بو سونگھ لی تھی۔ مسکرا کر بولا ''میں سمجھ گیا ٹیکہ لگا کر آئے ہو نا۔ تم سے سپرٹ کی بُو آ رہی ہے۔ بہت بیمار رہتی ہے بیچاری۔''

''ہاں چاچا۔'' مشتاق سنبھل کر بولا۔ ''بہت بیمار رہتی ہے بیچاری۔''

''بہت نیک بچہ ہے۔ بیمار کے علاج سے بڑا کوئی اور ثواب نہیں۔ اللہ زندگی دے۔ نیکی کی توفیق دے۔''

پھر وہ دعائیں دیتا ہوا رخصت ہو گیا۔

تینوں نے راستے میں کوئی بات نہ کی۔ وہ بڑے بڑے ڈگ بھرتے ہوئے کھیتوں میں نکل گئے۔ باہر کی کھلی فضا میں انہیں کسی قدر اطمینان ہوا۔ اتنا بڑا مرحلہ دن دیہاڑے اتنی آسانی سے طے ہو گیا تھا۔

فدا محمد نے اچانک جمال کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا ''ایمان سے کہو جمال۔ تمہیں کیسا مزہ کرایا آج!''

## گورباٸی

لاہور پہنچ کر جمال نے سارا واقعہ تمام تر تفصیل کے ساتھ مفتی کو سنایا۔ وہ جنسی تعلقات کو بشرطیکہ ایک فریق نے دوسرے کو دھوکا نہ دیا ہو، بڑا مقدس جانتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ مرد جو کچھ کرتے ہیں دراصل خود نہیں کرتے، ان سے کروایا جاتا ہے۔ اس معاملے میں فدا محمد کا کچھ کمال نہیں تھا۔

''بالکل غلط اور تم جانتے ہو کہ میں ہمیشہ سچ بولتا ہوں۔'' جمال نے اسے ٹوک کر کہا۔ ''میں موقعے کا گواہ ہوں۔''

مفتی بولا ''بے شک تم ہمیشہ سچ بولتے ہو اور موقعے کے گواہ بھی ہو مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم جانتے بھی ہو۔ عورت جادوگر ہوتی ہے برخوردار!''

''مگر اس معاملے میں جو کچھ ہوا، وہ فدا محمد سے ہوا۔ ملاقات کی ساری سکیم ہم نے خود بنائی۔ بڑھیا کو نیند کی گولیاں مشتاق نے کھلائیں اور چل کر ہم خود ان کے گھر گئے۔ نور جہاں اور لالی نے تو ہمیں بلایا نہیں تھا۔''

مفتی نے کہا ''انہی نے بلایا تھا بے وقوف۔ فدا محمد تو ان کا دعوتی رقعہ تھا۔ دعوتی رقعے کیا خود بھی مہمانوں کو بلاتے ہیں۔''

اس وقت وہ مال پر چل رہے تھے۔

جمال نے کہا ''زیادہ سے زیادہ تم کہہ سکتے ہو کہ نور جہاں ملاقات کی تجویز پر رضامند ہو گئی تھی۔ اس کو فدا محمد کی دلجوئی منظور تھی۔ یہ ساری سازش تو ہم نے تیار کی تھی۔ اسے تو اس کا پتہ بھی نہ تھا۔''

مفتی بولا ''لڑکیوں کو نہ صرف یہ کہ پہلے سے پتہ تھا، وہ چاہتی تھیں کہ تم تین بانکے سجیلے جوان ان کے آگے جھکو، ان کی پوجا کرو پھر وہ تمہاری آرتی اتاریں۔ تمہیں نہیں پتہ کہ دیوی کو پجاری سے کیسا عشق ہوتا ہے۔ نور جہاں نے فدا محمد کے دل میں یہ تمنا بھر دی کہ وہ نور پور کے رنگیلوں کو اس کے حضور لانے کی تدبیر کرے۔ اس سارے ڈرامے میں تم لوگوں کا کردار ایکٹروں کا تھا۔ ڈائریکٹر نور جہاں ہی تھی۔''

''نور جہاں ہرگز ایسی لڑکی نہیں۔'' جمال نے یقین سے کہا۔

''میں نے کب کہا کہ نور جہاں ایسی لڑکی ہے۔ وہ تو محض ایک لڑکی ہے جو اکیلی پڑی کڑھتی رہتی ہے۔ اس کو تازہ ہوا اور روشنی کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو دریافت کر سکے۔ وہ ایسی ویسی لڑکی نہیں وہ گھٹن کا شکار ہے۔ اگر تم میری بات سمجھ سکو تو......''

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اسمبلی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''کیا مطلب؟'' جمال نے پوچھا۔ ''کیا اس کی ماں بھی اس ڈرامے میں ایکٹر تھی۔ اسے تو ہم نے بے ہوش کر کے سلا دیا تھا۔''

''مطلب یہ کہ ڈرامے میں چھوٹے ایکٹر دراصل بڑے ایکٹر ہوتے ہیں۔'' مفتی بولا ''ان کے بغیر کہانی سر نہیں ہوتی۔ مطلب یہ کہ شاید اماں جی بھی چاہتی ہوں کہ میری بیٹی کی تنہائی کسی قدر کم ہو جائے۔ وہ گہری نیند سو گئیں۔''

''یہ میں کبھی مان نہیں سکتا مفتی۔ تم بکواس کرتے ہو۔''

''چاہے نہ مانو مگر اس سارے واقعے میں اماں جی کی مرضی شامل تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ میری بیٹی لمحے بھر کے لیے آزاد ہو جائے اور یہ ہر جوان لڑکی کا حق ہے۔ وہ چاہتی تھیں کہ میری بیٹی زندہ رہنے کی لذت سے آشنا ہو جائے ورنہ وہ ڈھیر ساری شراب پی کر یوں بے سدھ نہ ہو جاتیں۔''

''شراب تو ہم نے اسے دھوکے سے پلائی اور اس میں نیند کی گولیاں بھی ڈال دیں۔ اس کی خواہش کا کیا سوال؟''

''جوان بیٹیوں کی مائیں تو راتوں کو بھی نہیں سو سکتیں۔'' مفتی بولا۔ ''مانا کہ اس کو نیند کی گولیوں کا پتہ نہ تھا مگر اس نے دیسی شراب جو سکھوں کی مت مارنے کے لیے بنتی ہے، اتنی زیادہ کیوں پی لی۔ اس امر کے باوجود کہ اس کے گھر میں تین جوان اور شریر لڑکے بیٹھے تھے۔ کیا وہ تم تینوں فتنوں سے واقف نہیں تھی؟''

''شہرت تو ہماری نور پور میں اچھی نہیں۔''

''تمہاری بری شہرت ہی کی وجہ سے اس نے تم سے امید لگا لی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جب وہ بے ہوش ہو جائے گی تو تم موقعے کو ہاتھ سے جانے نہ دو گے۔ میں تو یہ کہنے پر بھی تیار ہوں کہ دراصل وہ اتنی بے سدھ بھی نہ تھی اس روز!''



باتیں کرتے ہوئے وہ وکٹوریا کے بُت کے پاس پہنچ چکے تھے' جہاں سکھوں اور ہندوؤں کا ہجوم ہو رہا تھا۔ ان کے چہرے خشمگیں تھے، وہ غصے سے کھول رہے تھے۔ مسلمان کوئی اس ہجوم میں دکھائی نہ دیتا تھا۔

اسمبلی کی سیڑھیوں پر نیلی پگڑیوں والے اکالیوں کے جھرمٹ میں ماسٹر تارا سنگھ تقریر کر رہا تھا۔ اس کی آواز نعروں میں ڈوب ڈوب جاتی تھی۔ جمال نے چاہا کہ میں آگے جا کر تقریر سنوں' مگر مفتی نے روک دیا۔ اسے سیاست اور سیاسی تقریروں سے نفرت تھی اور ہجوم سے اسے خوف آتا تھا۔

کھولاؤ

دفعتاً ماسٹر تارا سنگھ نے کرپان نیام سے نکالی اور اسے ہوا میں لہراتے ہوئے نعرہ مارا ''جو مانگے گا پاکستان اس کو ملے گا قبرستان!''

ہجوم غصے سے کھولنے لگا اور جوابی نعروں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں سکھوں نے کبھی کوئی واضح مطالبہ نہ کیا تھا۔ پنجاب اور بنگال کی مذہبی بنیادوں پر تقسیم پر کانگریس تلی ہوئی تھی اور یہ اس کا جذبۂ انتقام تھا۔ جناح نے تو صرف ہندوستانی مسلمانوں کے لیے کچھ تحفظات مانگے تھے کیونکہ وہ ایک پسماندہ اقلیت تھے۔ گوکھلے نے جب وہ کانگریس کے صدر تھے، جناح سے سمجھوتہ کر لیا تھا مگر پھر گاندھی جی نے افریقہ سے آ کر کانگرس کی روح تبدیل کر دی تھی اور اب وہ ہندوستانی قوم پرستی کے نام پر ہندو قوم پرستی کی علمبردار ہو گئی تھی۔ مسلمان اقلیت کو گاندھی جی کے زیر اثر ایک دوسری قوم کی حیثیت سے پیچھے رکھا گیا تھا۔ جناح نے آخر دم تک کوشش کی کہ کانگرس سے کوئی باعزت سمجھوتہ ہو جائے مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ تنگ آ کر انہوں نے اعلان کیا کہ ہندوستانی مسلمان ایک دوسری قوم ہیں اور انہیں اپنے لیے زمین کا ایک ٹکڑا درکار ہے مگر بعد میں انہوں نے اس پر بھی سمجھوتہ کر لیا جب کیبنٹ مشن کا منصوبہ آیا...... مگر بعد کی بات بعد میں......

فی الحال تو پنجاب اور بنگال کی مذہبی بنیادوں پر تقسیم کی بات ہو رہی تھی۔ اور اکالی اس میں ہندو کانگرس کے آلہ کار تھے۔ جناح نے جو پاکستان چاہا تھا، اس میں غیر مسلموں کو مساوی حقوق حاصل ہوتے اور ملک اور ریاست دونوں الگ الگ ادارے سمجھے جاتے۔ اس میں تبادلہ آبادی کا کوئی سوال نہ تھا مگر کانگرس نے پنجاب اور بنگال کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا اور سکھوں کو لالچ دیا کہ پنجاب پر تمہارا راج ہوگا۔ سکھ سیاسی لحاظ سے معصوم لوگ ہیں۔ وہ یہ نہ سمجھے تھے کہ مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کو مار بھگانے کے باوجود سکھوں کو اکثریت حاصل نہ ہوگی اور کانگرس جو ہندوستان میں ہندو راج کی علمبردار ہے اور اس کے پیچھے اس نے ہندوستان کی تقسیم قبول کر لی تھی' پنجاب میں سکھوں کو اقتدار نہ دے گی۔ اس نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مطالبہ جناح کے مطالبۂ پاکستان کی چوٹ پر کیا تھا اور کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ جو پارٹی ہندوستان کی وحدت

کی قسم کھاتی ہو اور سیکولر کہلاتی ہو، وہ پنجاب کی مذہبی بنیادوں پر تقسیم پر اصرار کرنے لگے۔ اس کا خیال تھا کہ جناح ڈر کر بھاگ جائے گا اور ہمیں مسلمانوں کو کسی قسم کے تحفظات دینے نہ پڑیں گے۔ پھر راج کرے گا برہمن بنیا سامراج۔

## شیر پنجاب

پنجاب کی تقسیم کی مخالفت مہاراجہ فرید کوٹ نے کی؛ جس سے نواب ممدوٹ کے رابطے تھے اور جناح کے اشارے پر فیروز خان نون بھی مذاکرات میں شامل رہے۔ قائداعظم خود آگے نہیں آئے۔ ماسٹر تارا سنگھ سے ملنے کی انہوں نے بہت کوشش کی مگر ماسٹر صاحب نے انکار کر دیا تو انہوں نے یہ بات پنجابیوں پر چھوڑ دی کہ وہ مل جل کر زندہ رہنے کی شرائط طے کر لیں۔ انہوں نے گیانی ہری سنگھ کے ذریعے اکالی دل کو پیشکش کی کہ وہ مشرقی پنجاب میں سکھوں کو مکمل داخلی خودمختاری دینے کے علاوہ پاکستان میں مساوی سیاسی حقوق اور بلوکی ہیڈ کے راستے ننکانہ صاحب کا کنٹرول دینے پر تیار ہیں۔ یہ بات انہوں نے مہاراجہ پٹیالہ سے خود بھی کی۔

ماسٹر جی کا خیال تھا کہ پاکستان اگر بنا تو چناب سے پرے اور خانیوال سے آگے سندھ کی طرف ہو گا لاہور سکھوں کو ملے گا، چنانچہ وہ نہ مانے۔ انہوں نے مہاراجہ پٹیالہ سے کہہ رکھا تھا کہ آپ رنجیت سنگھ کی کرسی پر بیٹھیں گے، شیر پنجاب کہلائیں گے اور راج کرے گا خالصہ۔

فرید کوٹ کی شکایت مہاراجہ پٹیالہ نے ماؤنٹ بیٹن سے کر دی اور اکالیوں نے اسے دھمکی دی کہ تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔ وہ ایک چھوٹی سی سکھ ریاست کا حاکم تھا، ڈر گیا۔

سکیم یہ تھی کہ مسلمانوں کو مار کر مشرقی پنجاب سے بھگا دیا جائے۔ مہاراجہ پٹیالہ دوسرے سکھ راجے اور سکھ جاگیردار مسلمانوں کے قتل عام کے لیے تیار ہو چکے تھے، جب ماسٹر تارا سنگھ نے لاہور اسمبلی کی سیڑھیوں پر کرپان لہرائی۔

یہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کا اذن تھا، مگر اس وقت لوگوں نے سمجھا کہ ماسٹر تارا سنگھ جوشِ خطابت میں کچھ آگے نکل گیا ہے مگر سکھوں کے بپھرے ہوئے ہجوم اور ہندو مہاسبھا کے زرد جھنڈوں والے رضاکاروں کے غول تلواریں اور نیزے لہراتے ہوئے شہر میں پھیل گئے۔

## خون کی دھار چھوٹی

جمال کو تو یہ ایک دلچسپ ہنگامہ لگتا تھا مگر مفتی کا رنگ زرد ہو گیا۔ اس نے کہا چلو واپس۔ کرشن نگر میں میری بہن رہتی ہے۔ اس کو اور اس کے بچوں کو وہاں سے نکال لائیں۔

کرشن نگر جس علاقے میں آباد ہوا اس کی زمین ایک ہندو سوسائٹی نے مسلمان زمیندار سے خریدی تھی مگر مالک کو ایک ٹکڑا الاٹ کرنے کے بعد کسی مسلمان کو یہاں جگہ نہ ملی۔ ایک مفتی کی بہن مسلمان تھی جو اس علاقے میں کرائے کے مکان پر رہتی تھی۔

کرشن نگر پنجاب سیکریٹریٹ کے عقب میں واقع ہے اور اس میں داخلے کا ایک ہی راستہ تھا۔

جب مفتی اور جمال بڑے ڈاک خانے کے پاس پہنچے تو سکھوں اور مہاسبھائیوں کا ایک بڑا جلوس ست سری اکال اور ہر ہر مہادیو کے نعرے لگاتا ادھر سے گزرا۔ موڈ اس کا بڑا خراب تھا۔

مفتی نے کہا چلو چلو کرشن نگر جلدی چلو۔

جمال کو مرنے سے ڈر نہ لگتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں لافانی ہوں اور جوانی میں سب ایسا ہی سوچتے ہیں۔ جمال نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ اس سے مفتی کی کچھ تسلی ہو گئی۔ جلوس آگے جا کر انارکلی کی طرف مڑ گیا۔ پھر دونوں کمرشل بلڈنگ میں بلیڈ اور نکٹائیاں خریدنے لگے۔ اس میں کچھ وقت لگ گیا۔ جب وہ یہاں سے فارغ ہوئے تو مفتی کو خیال آیا کہ مجھے پان اور چھالیہ خریدنی ہے اور اس کا بازار لاہوری دروازے میں تھا۔ دونوں لوہاری بازار جانے کے لیے انارکلی میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر کسی قدر حیران ہوئے کہ بازار بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔

دکانیں بند ہو چکی ہیں۔ لوگ جلدی جلدی چل رہے ہیں۔ ان کے چہروں پر خوف چھایا ہوا ہے۔

جمال کو یہ ماحول بہت ڈرامائی لگا۔ مفتی کا دل بیٹھنے لگا۔

جلوس انارکلی سے سرکلر روڈ کی طرف مڑ گیا۔ لوہاری کے چوک میں پان والوں نے اپنے ٹوکرے اٹھا لیے تھے۔ چھالیہ کی دکانیں بند تھیں۔

پھر ایک ریہڑے والا گوجر گھوڑے کو بھگاتا ہوا ادھر سے گزرا۔ اس کی گردن پر خون کے دھبے تھے۔ اس کی ولٹوہیاں خون آلود تھیں۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ تازہ خون سے اس کا کرتا لال ہو رہا تھا۔

شور مچا کہ شاہ عالمی دروازے میں مسلمانوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔

شاہ عالمی دروازہ امیر ہندوؤں کا مخصوص گڑھ تھا۔ انارکلی میں تو مسلمانوں کی کل دو دکانیں ہوا کرتی تھیں مگر شاہ عالمی کے تھوک بیوپار میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہ تھا۔ محلوں اور گلیوں میں بھی ہندو اور سکھ رہتے تھے۔ سرکلر روڈ سے ان کی اجازت کے بغیر کوئی گزر نہ سکتا تھا۔ آج وہ اکا دکا مسلمان راہگیروں اور تانگے ریہڑے والوں کو پکڑ پکڑ کر قتل کر رہے تھے۔ جو مانگے گا پاکستان اس کو ملے گا قبرستان۔

مفتی نے کہا "جلدی چلو، میری بہن اکیلی ہے۔"

مگر کوئی تانگے والا کرشن نگر جانے پر تیار نہ ہوا۔

## کرشن نگر

مفتی اور جمال دوڑتے بھاگتے کرشن نگر جا پہنچے۔ نکڑ پر مہاسبھا کے سیوادار بارہ بور کی بندوقیں اور ننگی تلواریں لیے کھڑے تھے مگر ابھی ان پر خون کا کوئی دھبہ نہ تھا کیونکہ کوئی مسلمان اِدھر آیا ہی نہ تھا۔ مفتی اور جمال نے چال ٹھیک کر لی تھی۔ انہیں اطمینان سے چلتے دیکھ کر سیواداروں نے انہیں ہندو سمجھ لیا تھا۔

مفتی کی ہمشیرہ باپردہ عورت تھی۔ مفتی نے اسے کہا ''بہن آج برقع نہ پہنو۔'' اس پر وہ بہت گھبرائی۔ برقعے کے بغیر چلنے کی اسے عادت نہ تھی۔ جمال نے کہا ''بہن برقع پہن کر چلیے ہمارے ساتھ۔ دیکھا جائے گا۔''

مفتی خوش ہوگیا۔ ذمہ داری جمال نے اپنے سر لے لی تھی۔ خطرے میں مفتی کے حواس اور ہاتھ پیر سُن ہو جاتے تھے۔

جمال بہادر نہیں تھا، بے وقوف تھا۔ اس کو خطرے کا احساس ہی نہ تھا۔ اس کے لیے یہ سارا مسئلہ ایک ایکشن پر اکسانے والے ڈرامے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔

بہن نے زیورات کی پوٹلی بغل میں دبائی، چھوٹی بچی کو گود میں لیا اور برقعہ پہن کر درود شریف پڑھتی ہوئی نیچے اتر آئی۔

جمال نے ایک بچے کو اٹھا لیا اور دوسرے کو انگلی سے لگایا۔

مفتی نے کپڑوں کا سوٹ کیس پکڑ لیا اور اس طرح وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے چوک کی طرف بڑھے۔

مگر تانگے کے بغیر یہاں سے نکلنا ممکن نہ تھا۔ ننگی تلواریں اور دیوانے نعرے ایک برقعہ پوش عورت، ایک ڈرے ہوئے دلگیر بھائی، کچھ خوفزدہ بچوں اور ایک بے وقوف نوجوان کا راستہ روک کر کھڑے تھے۔

بے وقوف نوجوان نے کہا ''ٹھہرو، ابھی کوئی تانگہ آجاتا ہے۔''

ہجوم میں ہلچل ہوئی۔ ایک تانگہ سوار آیا جسے سیواداروں نے گھیر لیا۔ اس میں سفید مونچھوں والا ایک بوڑھا ہندو اور سفید بالوں والی ایک بوڑھی عورت سوار تھی۔

سیواداروں نے تانگے والے کو کھینچ کر نیچے گرا لیا۔ بڑھیا رونے چلانے لگی۔ ''اسے مت مارو۔ پرماتما کے لیے چھوڑ دو اسے۔ یہ تو ہمیں سٹیشن سے گھر لایا ہے۔''

بوڑھی کوچوان کے اوپر گر گئی۔

گھوڑا ہنہنانے اور فریاد کرنے لگا۔

بوڑھے نے کہا ''اس نے ہماری مدد کی۔ ہمیں تو کوئی سٹیشن سے لاتا ہی نہ تھا۔ پاپ نہ کرو، دیا کرو۔ پھر وہ ایک ایک تلوار کے سامنے ہاتھ جوڑنے لگا۔ پرماتما کے لیے ایشور کے لیے اس کو چھوڑ دو۔''

بارہ بور والے نے اپنی بندوق کا کندا زمین پر رکھ دیا اور سوچنے لگا۔ اٹھے ہوئے نیزے جھک گئے، کھلے ہوئے چاقو بند ہوگئے۔

یہ امن پسند دکانداروں اور چھوٹے سرکاری ملازموں کی بستی تھی۔ اس میں مہاسبھا کے سیوادار بھی تھے مگر ابھی کسی نے خون نہ دیکھا تھا۔ ابھی ان میں انسانی جان لینے میں جھجک باقی تھی۔

جمال ٹہلتا ہوا ہجوم میں جا پہنچا اور نہایت وقار سے اور کسی قدر تحکمانہ لہجے میں بولا ''جانے دو اسے۔''

پھر اس نے گرے ہوئے کوچوان کو زمین پر سے اٹھایا اور کہا ''اچھرے کا کیا لوگے پہلوان؟''

تانگے والا حواس باختہ تھا۔ ہوش سنبھال کر بولا ''جو حضور کی خوشی۔''

جمال نے مفتی کو اشارہ کیا تو اس کی بہن اور بچے چھوٹے چھوٹے قدموں سے دوڑتے اور لڑکھڑاتے ہوئے آ کر تانگے پر بیٹھ گئے۔ کسی نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔

پھر جمال نے ہجوم سے کھرج کی آواز میں کہا

''ہٹ جاؤ، راستہ دو ہمیں۔''

تانگہ آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ سیکریٹریٹ کا موڑ کاٹ کر کوچوان نے گھوڑے کو سانٹا مارا۔ ''چل بھی سؤر کی اولاد۔ کیا یہاں ہماری قبر کھدوائے گا۔''

سانٹا کھا کر بھی گھوڑے کی پھٹیچر چال نہ بدلی مگر مفتی کے دم میں دم آ گیا اور بچے بھی چہکنے لگے۔

وہ سیدھے مزنگ کی طرف مڑ گئے۔ آگے اچھرے تک کی آبادی مسلمان تھی۔

## ہائے میرا ماموں

مزنگ کی طرف مڑتے ہی جمال کو خیال آیا کہ میرا بڑا ماموں اشتیاق شاہ عالمی کے چوک میں رہتا ہے اور اس علاقے میں وہی ایک مسلمان خاندان آباد ہے۔ میری بوڑھی نانی بھی وہیں رہتی ہے۔ پھر میری ممانی اور اس کی چھوٹی سی بچی جو پیاری پیاری توتلی باتیں کرتی ہے...... یہ لوگ مصیبت میں ہوں گے۔

جمال کو پتہ تھا کہ اشتیاق انتہائی بزدل اور کمزور آدمی ہے۔ خطرے میں ہو تو اپنی گوروں جیسی انگریزی بھول جاتا ہے۔ پھر اس کے منہ سے بات بھی نہیں نکلتی۔

جمال نے کہا ''مفتی تم چلو۔ میں اشتیاق کو دیکھ کر آتا ہوں۔''

میو ہسپتال کے چوک میں بہت بڑا ہنگامہ تھا۔ بانسوں کی دکانیں لٹ چکی تھیں کیونکہ وہ مسلمانوں کی تھیں۔ ہندو بپھرے ہوئے تھے مگر شاہ عالمی کو راستہ اُدھر سے ہی نکلتا تھا۔

لٹے ہوئے بانسوں کے بازار میں سے وہ خراماں خراماں شاہ عالمی کے چوک کی طرف بڑھا۔

مسلمانوں نے اس کی بےفکری کو دیکھ کر اسے مسلمان سمجھا اور اسے آوازیں دینے لگے۔ ''ادھر مت جا۔ رک جا بھائی......''

ہندوؤں نے اس کی لاپروائی کو اس کے ہندو ہونے پر محمول کیا اور ان کے علاقے کی طرف تو وہ جا ہی رہا تھا۔

شاہ عالمی کے چوک میں ہندوؤں کا ہجوم اکٹھا تھا۔ بعض کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں۔

جس نے بارہ بور کی بندوقیں پکڑ رکھی تھیں۔ کچھ کے ہاتھوں میں بانس تھے مگر سب بے چینی سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ بڑے بوڑھے کسی قدر فکرمند چھتوں پر بیٹھے چوک کا منظر دیکھ رہے تھے۔ عورتیں کھڑکیوں سے لگی تھیں۔

سڑک پر ایک ریڑھا الٹا پڑا تھا۔ گھوڑا اس سے بندھا حیران کھڑا تھا۔ کوچوان کی لاش سیدھی پڑی تھی۔ سڑک پر سیاہی مائل کیچڑ ہو رہا تھا۔ خون آلود کیچڑ کو دیکھ کر جمال دہشت زدہ ہو گیا۔

چوک سے پچاس گز آگے زمین بالکل خالی تھی۔ نو مینز لینڈ! آگے دو سو گز کے فاصلے پر ایک اور ہجوم کھڑا تھا مگر کسی قدر چھوٹا۔ یہ موری دروازے کا علاقہ تھا جس میں مسلمان آباد تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کدالوں اور کسیوں کے بڑے بڑے کالے دستے تھے جو کسی مسلمان ٹھیکیدار نے فوج کو سپلائی کے لیے بنوائے ہوں گے مگر اب اس نے یہ مسلمان لڑکوں کو دے دیئے تھے کہ وہ ہر حملہ آور جن سنگھوں کا راستہ روکیں۔

اُدھر سے کوئی ہندو اِدھر نہ جاتا تھا اور اِدھر سے کوئی مسلمان اُدھر نہ آتا تھا۔ دونوں ہجوم ایک دوسرے سے خوفزدہ تھے۔

شاہ عالمی کے چوک میں بانسوں والے بازار کی نکڑ پر ایک کرائے کے مکان میں اشتیاق رہتا تھا۔ جمال اس کی طرف بڑھا تو اس نے لپک کر دروازہ کھول دیا۔ جمال بے دھڑک سیڑھیاں چڑھ گیا۔

## ہمیں بچالو آج

اشتیاق پر نزاع کا عالم تھا۔ اس کی بیوی اپنی سنگین آنکھوں سے اس کی بزدلی پر طنز کر رہی تھی اور فقرے پر فقرہ کس رہی تھی۔ وہ بہادر نہ تھی مگر اپنے خاوند کو ذلیل کرنے کے موقعے سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

جمال کو دیکھتے ہی اشتیاق پر زندگی عود کر آئی۔

اس نے کہا "ہمیں بچالو کسی طرح بچالو اور اب تو میرے ساتھ والے مکان میں ایک جن سنگھی خاندان آباد ہو گیا ہے جس کی چھت سے ہماری چھت پر آسانی سے کودا جا سکتا ہے۔"

جمال نے کہا "چلو نکل چلو میرے ساتھ سب لوگ۔"

اشتیاق کی بیوی بولی "مگر میرے گہنے......؟"

"چھوڑ دے مامی۔ وہ پھر لے جائیں گے۔" جمال نے کہا۔

"پھر کب؟" وہ بولی۔ "ہندو سب کچھ لوٹ کر لے جائیں گے تب؟"

اشتیاق اپنی بیوی سے بہت ڈرتا تھا۔ اس نے جمال سے کہا "تم میرے مالک کے پاس جا کر سارے حالات بتاؤ اور کہو کہ وہ اپنی گاڑی اور ڈرائیور بھیج کر ہمیں یہاں سے نکالے۔ ہمارے دوسرے پڑوسیوں سے تعلقات اچھے ہیں۔ اگر اس کی کار آ جائے تو ہم ایک دو سوٹ کیس لے کر ان کی چھت سے نیچے اتر جائیں گے۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ ہم مسلمان ہیں۔"

اتنی لمبی چوڑی سکیم جمال کو پسند نہ آئی۔ اسے یہ خیال بھی تھا کہ ہندوؤں نے مجھے مسلمان گھرانے کا زینہ چڑھتے دیکھ لیا ہے۔ اس لیے میں نیچے اترا تو شاید وہ مجھ پر حملہ کر دیں مگر اشتیاق اس کا بزرگ تھا اور اس زمانے میں چھوٹے بڑوں کے آگے بولتے نہ تھے۔

## سیٹھ صاحب کی نئی کار

جمال پہلے کی طرح سیڑھیوں سے اترا اور خراماں خراماں میو ہسپتال کے چوک میں پہنچ کر اس نے مال روڈ کی طرف بھاگنا شروع کر دیا جہاں اشتیاق کے مالک کا دفتر تھا۔

بات سن کر سیٹھ صاحب کو بڑا تاؤ آیا۔ پہلے تو انہوں نے اشتیاق کی ساری نالائقیاں اور غلطیاں گنوائیں جن کا وہ ملازمت کے دوران مرتکب ہو چکا تھا۔ پھر کہا "اشتیاق کو کبھی عقل نہ آئے گی۔ اب اگر میں اپنی گاڑی بھیج دوں تو کیا ہندو اس کو توڑ پھوڑ نہ دیں گے اور کیا عجب کہ اسے جلا ہی ڈالیں اور گاڑی میں نے پچھلے مہینے ہی خریدی ہے۔ تم سمجھدار آدمی لگتے ہو۔ واپس جاؤ اور اسے سمجھاؤ۔ بہتری اسی میں ہے کہ تم سب پیدل ہی نکلنے کی کوشش کرو۔"

جمال پھر بھاگتا ہوا میو ہسپتال پہنچا اور یہاں سے ٹہلتے ٹہلتے شاہ عالمی چوک کی طرف چل دیا۔

ہجوم کو معلوم ہو گیا تھا کہ اوپر جانے والا مسلمان ہے۔ تلواریں اور بندوقیں دروازے کے آگے جمع ہونے لگیں۔ اشتیاق کو غشی کے دورے پڑنے لگے۔ جمال پر ذمہ داری آن پڑی تو وہ بہادر بن گیا۔ چارپائی کھول کر اس نے پٹی نکالی اور کہا "دیکھتے ہیں کون روکتا ہے۔ چلو نکلو میرے ساتھ۔"

اشتیاق کی بیوی نے اپنا کالا برقعہ پہن لیا۔ جمال کی نانی کو برقعے کے بغیر چلنا آتا ہی نہ تھا مگر اشتیاق نے ہوش سنبھال کر اچانک کہا کہ تم دونوں عورتیں برقعے اتار دو۔ ساڑھیاں پہن لو تاکہ کھترانیاں لگو۔ اس پر اشتیاق کی بیوی نے اس کا ٹھٹھا اڑایا مگر چونکہ اسے ساڑھی پہننے اور بے پردہ ہونے کا شوق تھا اس لیے اس نے فوراً ساڑھی پہن لی اور شیشے کے سامنے کھڑی ہو کر پلو کے بل درست کرنے لگی۔

نانی کا معاملہ بے ڈھب تھا۔ بڑھیا کے لیے ساڑھی پہننا ناممکن تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے شلوار کے اوپر ساڑھی لپیٹ کر پلو نیفے میں اڑس لیا۔

اشتیاق کی بیوی نے کپڑوں کا سوٹ کیس اشتیاق کے ہاتھ میں دیا۔ کنجیوں کا گچھا اپنی انگیا کے اندر چھپایا اور جمال سے کہا "چلو آگے آگے تم اترو پہلے۔"

اشتیاق تقریباً روتے ہوئے بولا "تم کیوں ہمیں موت کے منہ میں لے کر جا رہے ہو جمال۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔"

عین اسی وقت خواجہ خان محمد دھم دھم کرتا سیڑھیاں چڑھ آیا۔

## خان محمد کی آمد

خان محمد رشتے میں خواجہ یلیین کا ماموں تھا۔ ہاتھ پیر کا مضبوط، بے جگر، دلاور مگر بوڑھا۔ اسے معلوم تھا کہ اشتیاق شاہ عالمی میں پھنسا ہوا ہے۔ اس نے موری دروازے کے مسلمان غنڈوں سے کہا کہ آگے چوک میں مسلمان خواتین کی آبرو خطرے میں ہے۔ کچھ ان میں سے مسلمان خواتین کی آبرو پر کٹ مرنے کے لیے تیار ہو گئے اور یوں مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی ٹولی اشتیاق کے گھر کے دروازے تک آن پہنچی۔

خان محمد نے چھتوں پر بیٹھے ہوئے بوڑھے ہندوؤں سے کہا "ہم لڑنے کے لیے نہیں آئے، ہماری باپردہ عورتیں اندر ہیں۔"

شیشم کی لکڑی کے بھاری کالے ڈنڈے مسلمان لڑکوں کے ہاتھوں میں تھے جن کی ایک ضرب کسی بھی کھوپڑی کا چورا کرنے کو کافی تھی مگر یہ بات نہیں تھی جس پر ہندو چپ رہے۔ فسادات شروع ہوئے ابھی چند ہی گھنٹے ہوئے تھے اور دلوں میں عورتوں کا احترام باقی تھا اور بڑے بوڑھوں کی بات بھی سنی جاتی تھی۔ بزرگ ہندوؤں نے اپنے سیواداروں کی ٹولی کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ہندو عورتیں بھی کھڑکیوں میں سے بولنے لگیں۔ "جانے دو، عورتوں کو جانے دو۔" سیوادار شبہے میں مڑ گئے۔ اس گومگو کی حالت میں خان محمد سیڑھیاں چڑھ آیا تھا۔

سب سے پہلے وہی نیچے اترا۔ اس کے پیچھے اشتیاق پھر دونوں عورتیں۔ آخر میں جمال جس نے اشتیاق کی چھوٹی بچی کو گود میں اٹھایا ہوا تھا، چوک سے نکل کر وہ موری دروازے کے مسلمان غنڈوں کی حفاظت میں سیتلا مندر کو چلے۔ انہیں کسی نے کچھ بھی نہ کہا۔

رات انہوں نے دہلی مسلم ہوٹل کے ایک کمرے میں زمین پر لیٹ کر گزاری مگر اشتیاق کو نیند نہ آئی۔ رات بھر ڈھول بجتے رہے اور نعروں کی آوازیں اسے پریشان کرتی رہیں۔ ست سری اکال۔ جو بولے سو نہال! جے بجرنگ بلی! ہر ہر مہادیو!

اشتیاق کو یقین تھا کہ یہ سارے نعرے مجھے قتل کرنے کے لیے لگائے جا رہے ہیں کیونکہ سب کو معلوم ہو گیا ہے کہ میں یہاں ہوں۔

اشتیاق کی بیوی نے کہا "اور ہمارا کیا بنے گا؟"

اشتیاق بولا "تمہیں کوئی نہیں مارے گا۔ سکھ فقط تمہیں اٹھا کر لے جائیں گے اور آگے جو اللہ کی مرضی!"

صبح اٹھ کر فیصلہ ہوا کہ یہاں سے نکل کر کسی طرح کشمیری دروازے پہنچ جانا چاہیے۔ وہ مسلمانوں کا علاقہ ہے اور وہاں اشتیاق کے مالک کے بھائی کی مل ہے۔ اس میں ایک کوارٹر اشتیاق کو بھی مل جائے گا۔

انارکلی سے نیلا گنبد پہنچتے پہنچتے اشتیاق آدھا مر چکا تھا۔ نیلا گنبد سے انہیں میکلوڈ روڈ اور ریلوے سٹیشن کا تانگہ مل گیا۔

## سوٹ کیس کی تلاش

مل کے مزدوروں کے ایک کوارٹر میں سب خالی زمین پر بیٹھ گئے۔ اشتیاق نے سکھ کا سانس لیا مگر اب اس کی بیوی نے شور مچا دیا۔ میرا گرم کپڑوں والا سوٹ کیس کہاں گیا۔ ہائے میرے گہنے اسی میں تھے۔

سوٹ کیس کہیں بھی نہیں تھا۔ اشتیاق نے گھبراہٹ میں اسے وہیں چھوڑ دیا تھا۔

اس کی بیوی اس سے لڑنے لگی۔ تم نے میرے جہیز کے جوڑے بھی وہیں چھوڑ دیے۔ اب میں کیا تمہارا کفن پہنوں گی؟ میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ پھر وہ زور زور سے رونے لگی اور اس کی بچی نے بھی چیخنا شروع کر دیا۔

شام ہو رہی تھی۔ جمال واپس جانا چاہتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ مفتی میری غیر حاضری پر پریشان ہوگا مگر اشتیاق نے اسے زبردستی روک لیا۔ اس کا خیال تھا کہ ادھر جمال نکلا ادھر سکھ اور جن سنگھی ڈھول بجاتے آ کر اس کے سینے میں برچھیاں بھونک دیں گے۔

رات کو جمال ریلوے سٹیشن سے آلو چھولے اور نان لے آیا۔ کھا کر اشتیاق کو کسی قدر اطمینان ہوا تو وہ حملے کی صورت میں دفاع کے منصوبے بنانے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ اول تو مسلمان مزدور سکھوں کو مل کے بڑے دروازے پر ہی روک لیں گے اور اگر وہ اندر گھس ہی آئے تو ہم کوارٹر کے دروازے پر باہر سے تالا ڈال کر چپ چاپ اندر بیٹھ رہیں گے۔ پھر اس کو فکر ہوئی کہ تالا کہاں سے آئے گا۔ ایک تالے میں اس کی جان اٹک گئی۔

صبح اٹھ کر اشتیاق کی بیوی نے پھر رونا بسورنا شروع کر دیا۔ وہ کپڑوں اور زیوروں کے بغیر چولہا جلانے پر تیار نہ تھی۔

دو تین دن اسی طرح روتے پیٹتے گزر گئے۔ جمال روز روز کی کل کل سے تنگ آ گیا تھا۔ اپنے ماموں کی بے بسی پر بھی اس کا دل دکھتا تھا جس کو اس کی بیوی دو وقت جوتیاں مارتی تھی۔ اس نے کہا، مامی میں لا دوں تمہارا سوٹ کیس؟

# باب 10

مامی کے چہرے پر بہار آ گئی۔ بولی ''واری جاؤں قربان جاؤں۔ تو لا دے میرا زیور، کپڑا۔ شام کو چلا جا جب سیوادار گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ شام کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا اور تو تو اتنا بہادر ہے، خدا کی قسم۔ تیرے تو کوئی قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔''

نانی نے شور مچایا ''نہ جا میرا بچہ۔ کافر تجھے مار ہی ڈالیں گے۔'' مگر اشتیاق کی بیوی نے اپنی ساس کو جھڑک دیا۔

اشتیاق نے کہا ''مگر احتیاط سے جانا اور فوراً واپس آ جانا، ہمیں چین نہیں پڑے گا تمہاری واپسی تک!''

شام کے قریب جمال میو ہسپتال کے چوک سے ہوتا ہوا شاہ عالمی جا پہنچا۔ علاقہ سنسان تھا۔ مسلمان جا چکے تھے اور سیواداروں کو اب یہاں کوئی کام نہ تھا۔ وہ سامنے کے باغ میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ اگرچہ تلواریں ان کی بے نیام تھیں۔

جمال ایک عام راہگیر کی طرح اشتیاق کے گھر کے زینے کے قریب آیا اور پھرتی سے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ کسی نے کچھ خیال نہ کیا۔

کمرے میں اتھل پتھل ہو چکی تھی۔ صندوق کھلے ہوئے تھے۔ رضائیاں، تکیے اور کمبل فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ کرسیاں اوندھی پڑی تھیں۔ برتن بھانڈے زمین پر گرے ہوئے تھے۔ اندھیرا ہو رہا تھا۔ جمال کی ممانی کے سوٹ کیس کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد وہ کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔

## سیوادارنی

اچانک چھت کی سیڑھیوں میں سے ایک نرم سی آواز آئی ''تم پیارے لال کے آدمی ہو؟''

سیڑھیوں کے قدمچے پر ایک جوان لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے سفید ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ ہاتھ میں چھوٹا سا ڈنڈا۔ سر پر پیلے رنگ کی گاندھی ٹوپی۔ اندھیرے کی وجہ سے اس کے نین نقش واضح نہیں تھے مگر اس کی آواز میں نسائیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جمال کا خیال تھا کہ یہ ایک سانولے رنگ کی لڑکی ہے۔ کوئی سترہ اٹھارہ برس کی۔

جمال نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔

''ہمارے آدمی تو یہاں سے جا چکے ہیں، تم کیوں بیٹھے ہو؟''

''ویسے ہی۔'' جمال نے جواب دیا۔

''مگر تم ہو کون؟''

''میں میں ہوں۔'' جمال نے مصنوعی تمسخر سے کہا ''مگر تم کون ہو؟''

''مجھے نہیں پہچانتے تم؟''

وہ جمال کے قریب آ گئی۔

''کہیں دیکھا تو ہے تمہیں۔'' جمال نے مسکرا کر کہا۔ ''مگر تم یہاں کیا کرنے آئی ہو؟''

''یہاں میری ڈیوٹی ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ کوئی مسلمان غنڈہ یہاں آگ لگا کر بھاگ نہ جائے۔ یہ میرا علاقہ ہے۔''

''تمہیں ڈر نہیں لگتا یہاں اکیلی کو؟'' جمال نے پوچھا۔

''ڈر کس بات کا؟'' وہ بولی۔

''مسلمان غنڈوں کا۔ ہو سکتا ہے کوئی مسلمان کسی گھر میں چھپا بیٹھا ہو اور وہ تمہیں پکڑ لے۔''

''مجال ہے کسی کی۔'' اس نے اعتماد سے کہا ''یہ دیکھو۔'' اس نے اپنی ساڑھی کے نیفے میں اُڑسا ہوا چاقو نکالا اور بولی ''کس کی ہمت ہے مجھ پر ہاتھ ڈالے۔''

''واقعی کس کی ہمت ہے!'' جمال نے جواب دیا۔

''مگر تم ہو کون۔ نام کیوں نہیں بتاتے۔ نام بتاؤ ورنہ میں سیٹی بجاتی ہوں۔''

''سیٹی مت بجاؤ۔'' جمال نے کہا۔ ''میرا نام ہے جے لال۔''

''جے لال نام کا یہاں کوئی سیوادار نہیں۔ کون ہو، کہاں سے آئے ہو۔ مسلمان غنڈے تو نہیں تم؟''

''بے شک۔'' جمال نے جواب دیا۔ ''میں مسلمان غنڈہ ہوں۔ جمال نام ہے میرا۔ جے لال نہیں۔''

جمال کا ڈر جاتا رہا تھا۔ سیڑھیاں کھلی ہوئی تھیں اور وہ بھاگ کر نکل سکتا تھا۔

''تم مسلمان غنڈے ہو۔'' لڑکی نے سیٹی لبوں کے ساتھ لگائی تو جمال نے اچھل کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی چوڑیاں کرچی کرچی ہو گئیں۔ پھر جمال نے اس کی بانہہ مروڑی اور اسے چارپائی پر پھینک دیا۔ اس کے گال بڑے نرم تھے۔

کچھ دیر وہ کشمکش کرتی رہی۔ پھر بے بس ہو کر اس کی طرف زخمی ہرنی کی طرح تکنے لگی۔ جمال نے آہستہ آہستہ اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور منہ سے ہاتھ ہٹا کر آہستہ سے پوچھا ''تمہارا نام کیا ہے پیاری؟''

وہ غصے سے بولی ''خبردار جو مجھے پیاری کہا۔''

"بتادو نا۔" جمال نے منت کی۔ "پیاری تو تم ہو ہی۔"

"بکواس بند کرو۔"

اس پر جمال نے کہا "ورنہ میں سیٹی بجاتا ہوں۔ پیارے لال کے آدمی آ کر تمہیں ایک مسلمان غنڈے کے ساتھ چارپائی پر لیٹے ہوئے دیکھیں گے تو آگے خود سوچ لو......"

"بڑے کمینے ہو۔ چھوڑو مجھے۔ تم واقعی غنڈے بدمعاش ہو۔"

وہ اٹھ کر اپنی ساڑھی کے بل درست کرنے لگی۔ پھر بولی "سارے مسلمان غنڈے ہوتے ہیں۔ شریف لڑکیوں کو بدنام کرتے ہیں۔ چھوڑ دو مجھے۔"

جمال نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ سیڑھیوں میں جا کر بولی "اب میں تمہیں مزہ چکھاتی ہوں۔ پیارے لال کے آدمی تمہارا خون پی جائیں گے۔ ابھی تمہاری لاش پھڑکتی ہوگی یہاں۔ کالی ماتا کی بلی بنو گے تم۔"

جاتے ہوئے وہ کمرے کو باہر سے کنڈا لگا گئی تاکہ جمال بھاگ نہ جائے۔

اب جمال گھبرایا۔ اس کو خیال آیا کہ میں نے اس لڑکی کو چھوڑ کر حماقت کی ہے۔ واقعی میں سخت بے وقوف آدمی ہوں۔ اب یہاں سے بچ نکلنے کی کوئی صورت باقی نہ تھی۔

اس نے ہر آہٹ پر کان لگا کر سنا مگر کسی سیوادار کے اوپر آنے کی آواز نہ آئی۔

سڑک پر اندھیرا ہو چکا تھا۔ اچانک سائرن بجنے کی آواز آئی جس کا مطلب تھا کہ کرفیو لگ گیا ہے اور اب کوئی باہر نہیں نکل سکتا۔ اسے پیارے لال کے آدمیوں کا انتظار تھا مگر اب شاید وہ بھی نہ آسکیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کرفیو کے انتظار میں ہوں اور اب آ کر میرا گلا کاٹ دیں۔ موت کے انتظار میں وہ چارپائی پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا، یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ ایک سوٹ کیس کی خاطر میں نے جان کی بازی کیوں لگا دی مگر دس بجے تک اس کے سارے خوف دور ہو چکے تھے۔ اس نے سوچ لیا کہ اگر مجھے مرنا ہے تو مرنا ہے۔

دو دن میں جو کچھ ہو گیا تھا، غیر حقیقی لگتا تھا۔ کیوں ماسٹر تارا سنگھ نے کرپان نکالی تھی؟ کیوں مسلمان قتل ہونے لگے تھے؟

رات ڈھلنے لگی۔ پولیس والوں کے بوٹوں کی دھمک سے سناٹے میں دل دہلنے لگا۔ اس نے نفری کی گنتی کرنے کی کوشش کی۔

## ہو گئی آدھی رات

دو بجے ہوں گے اور جمال اونگھ رہا تھا۔ جب اچانک سیڑھیوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ جمال گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ سامنے قد مچے پر وہی لڑکی کھڑی تھی۔ "پیارے لال مجھے ملا ہی نہیں، تمہاری قسمت آج کی رات اچھی ہے۔" اس نے کہا۔ "صبح تو تم بلی چڑھ ہی جاؤ گے۔"

جمال چپ رہا۔ وہ سیڑھیوں سے اتر کر آگے آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں تھالی تھی جس میں دو روٹیاں اور بھاجی کا کٹورا رکھا تھا۔

"یہ کھا لو۔" اس نے حقارت سے تھالی اس کے آگے رکھ دی۔ "میں نہیں چاہتی کہ تم مرو تو بھوکے ہو۔ ماتا جی سو نہ جاتیں تو تم بھوکے رہتے رات بھر اور صبح سویرے پیارے لال کے ہاتھوں قتل ہو جاتے۔ دیوی ماں بھوکی بلی قبول نہیں کرتیں۔"

جمال نے تھالی اس کے ہاتھ سے لے لی اور کہا "مگر میں تمہارے ہاتھوں سے کیوں نہ مروں۔ اتنا بڑا چاقو تم نے بھی تو کمر سے لٹکا رکھا ہے۔ پیارے لال کا انتظار کیوں کروں؟"

"جی تو چاہتا ہے مگر مجھ سے کسی کا خون نہیں ہوتا۔ اب اس پر تم شیر نہ ہو جانا۔ میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں مگر میں حیران ہوں کہ تمہیں یہاں آنے کا حوصلہ کس طرح ہوا۔ تم بے وقوف ہو یا بہادر؟ مرنے سے پہلے اتنا بتا دو۔"

"بے وقوف تو میں نہیں۔ بہادر بھی اتنا نہیں مگر میری ممانی بڑی کمینی ہے۔" جمال نے لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا "کہتی تھی میرا سوٹ کیس لا دو۔ اس میں اس کے کپڑے اور زیور تھے۔"

"تمہاری ممانی کو یہ خیال نہ آیا کہ تم یہاں قتل بھی ہو سکتے ہو؟"

"اس کو خیال نہیں آیا۔"

"تو تمہیں خود سوچنا چاہیے تھا۔"

"میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ خاص طور پر اپنے بارے میں۔"

"تم بہت بے وقوف معلوم ہوتے ہو۔" اس نے تعریفی لہجے میں کہا۔

"بہت! میرے سارے دوستوں کا یہی خیال ہے...... اور وہ اس لیے مجھے پسند بھی کرتے ہیں۔"

"چچ چچ۔" وہ رحم کھا کر بولی۔ اب وہ اس کے قریب آ گئی تھی۔

"مگر تمہیں کیوں فکر ہے میری؟" جمال نے سوال کیا۔

"مجھے کیوں تمہاری فکر ہونے لگی۔ تم چاہے ابھی مر جاؤ۔ چاہے تمہیں کتے کھا جائیں میرے سامنے۔ سارے مر جائیں مسلمان غنڈے قاتل!"

"غنڈہ تو میں ہوں مگر قاتل نہیں ہوں......"

"تم نے کسی کا خون نہیں کیا آج تک؟"

"توبہ توبہ کیسی بات کرتی ہو۔"

"گویا تم شریف آدمی ہو مسلمان ہو کر بھی۔"

"تو تمہیں مجھ سے ڈر نہیں آتا؟"

’’نہیں۔‘‘ وہ مسکرا کر بولی۔ ’’تم نے کسی کا خون نہیں کیا نا اب تک۔ پر تم میں جرأت بہت ہے۔ اس بات کی میں تعریف کرتی ہوں۔‘‘

’’میں تو لوگوں سے بہت پیار کرتا ہوں۔ ہندوؤں اور سکھوں سے بھی۔ سب انسان ہیں۔ انسانوں سے کیا ڈرنا۔‘‘

’’اس میں کیا شک۔ انسانوں سے کیا ڈرنا۔ ویسے تم ہو ایک دلیر آدمی۔‘‘

’’تم بہت پیاری لڑکی ہو۔‘‘ جمال نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ’’اور بہادر بھی ہو۔ میں تمہیں ہاتھ لگا لوں ذرا؟‘‘

’’خبردار!‘‘ وہ بولی اور ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

’’ہائے میں کسی طرح تمہاری شکل دیکھ سکتا! اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا نا۔‘‘

’’میں کہتی ہوں بکواس مت کرو۔‘‘ اور یہ کہہ کر وہ واپس جانے کے لیے مڑی۔

جمال نے اچھل کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کشمکش میں جمال نے اسے سینے سے لگا لیا۔ حالانکہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپنے اور تلملانے لگی۔ ’’چھوڑ دو۔ چھوڑ دو مجھے۔ بھگوان کے لیے۔ میری تو سگائی بھی ہو چکی ہے۔ پاپ نہ کرو۔‘‘

جمال نے اپنے گال اس کے گالوں سے ملنے شروع کر دیئے تو اس نے اپنا چہرہ بغل میں چھپا لیا۔ تھوڑی دیر میں وہ تھک کر رہ گئی اور دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر رونے لگی۔ ’’ہائے بھگوان اب میں کیا کروں۔‘‘ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

جمال نے اسے چارپائی پر ڈال دیا۔ اس کی ساڑھی کے نیفے میں اڑسا ہوا چاقو جوراجوری میں زمین پر گر گیا۔

جوراجوری کا لڑکی کو کوئی تجربہ نہ تھا۔ کسی غیر مرد نے اسے اس طرح چھوا بھی نہ تھا۔ وہ ایک معصوم لڑکی تھی۔ بالکل بچہ جسے پتہ نہ ہو کہ میں جوان ہو گئی ہوں۔ وہ چڑھتی جوانی کے الھڑپنے میں جوشیلی ہندو قوم پرست بن گئی تھی اور اپنی ذات کو دریافت کرنے کی غرض سے ایک پرتشدد مذہبی سیاسی تنظیم سے منسلک ہو گئی تھی، جس کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں کو قتل و غارت کر کے پاکستان کے مطالبے سے روکنا تھا۔

سیوادارنی روتے روتے بے حال ہو گئی۔ اس نے تھک کر اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ گلے میں لٹکی ہوئی سیٹی جمال کے سینے پر چبھتی رہی۔ چبھتی رہی......

پھر اس نے اس گولی کھائی ہوئی کونج پر ایک فاتحانہ نظر ڈالی۔ جمال ایک شریف اور دردمندی آدمی تھا مگر ایسے مقامات پر کمینہ پن مردوں کی فطرت ہوتی ہے۔ اس کو لڑکی کی بے کسی پر رحم آیا۔ اس کا جی چاہا کہ میں اسے ہلکا ہلکا پیار کروں۔ اس کی آنکھوں کو چوم لوں مگر وہ اپنی آنکھوں پر سے اپنے ہاتھ اٹھانے پر تیار نہ تھی۔ وہ بلک رہی تھی اس کا کھلونا ٹوٹ چکا تھا۔

جمال نے کمر میں ہاتھ دے کر اسے بٹھا دیا۔ وہ اس کی کھلی ہوئی ساڑھی اس کے جسم کے گرد لپیٹ کر پلو سے اس کی آنکھیں خشک کرنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ سنبھل گئی۔ اٹھ کر اس نے اپنی ساڑھی کے بل درست کیے۔ بال سیدھے کیے اور اعتماد سے بولی ’’تو نے جو کیا سو کیا، اب میری ایک بات مان۔ ایک کام کر دے میرا۔ کرے گا؟‘‘

’’جان حاضر ہے۔‘‘ جمال نے جواب دیا۔

’’وعدہ کر۔‘‘

’’خدا کی قسم جو تم کہو گی میں کروں گا۔‘‘

سیوادارنی نے زمین سے چاقو اٹھایا۔ اسے کھولا۔ اس کا پھل اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا۔ پھر بولی ’’اب میں بھرشٹ ہو چکی ہوں۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ تم نے میری آتما لوٹ لی۔ اب تو مجھ پر اتنی دیا کر کہ یہ چاقو میرے سینے میں بھونک دے اور یہاں سے بھاگ جا۔ میں آواز بھی نہیں نکالوں گی۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ مجھے کس نے قتل کیا ہے۔‘‘

’’یہ نہیں ہو سکتا۔‘‘ جمال نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

’’اب میرا جینا بیکار ہے۔ اب میں شادی نہیں کر سکتی۔ میرے ماتا پتا برباد ہو جائیں گے۔ سنسار ان کو جینے نہ دے گا کیونکہ میں ایک مسلمان کے ہاتھوں بھرشٹ ہوئی۔ بھگوان کے لیے مجھے مار ڈال۔ میں تیرے پاؤں پڑتی ہوں۔‘‘

وہ جمال کے پاؤں کی طرف جھکی تو وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

لڑکی واقعی مر جانا چاہتی تھی۔ اس پر جمال پر ندامت کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس نے کہا ’’میں نے واقعی تم پر بڑا ظلم کیا ہے۔ میں تمہارا گنہگار ہوں۔ اس کی جو بھی سزا مجھے دینا چاہو دے دو مگر میں تمہیں چاقو نہیں مار سکتا۔ تم تو ایک چڑیا سے بھی زیادہ معصوم ہو اور اگرچہ میں نے تمہارا شریر بھرشٹ کر دیا۔ تم ایک دیوی کی طرح پاکیزہ ہو۔‘‘

’’تو تو میری بات نہیں مانے گا؟ میں خود بھی مر سکتی ہوں۔‘‘ وہ بولی۔

’’نہ نہ۔‘‘ جمال نے اس کا چاقو والا ہاتھ پکڑا اور کہا ’’اتنی مایوسی کی بات نہیں۔ اس بات کا کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ تمہارے ماتا پتا برباد نہیں ہوں گے۔ تمہاری سگائی نہیں ٹوٹے گی اور شادی کے بعد ایسی باتیں کوئی اٹھاتا بھی نہیں۔ تم اپنا سینڈل اتار کر میرے منہ پر مارو اور چپ چاپ جا کر سو جاؤ۔ بھول جاؤ کہ تم کبھی یہاں آئی تھی۔ مجھے بہرحال اس کا افسوس ہے۔ ایسا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں تمہیں اپنے قریب دیکھ کر بے بس ہو گیا تھا۔ میں اس قابل نہیں کہ معاف کر دیا جاؤں، مگر تم مجھ پر دیا کر سکو تو کر دو۔ دیویاں رحمدل ہوتی ہیں۔‘‘

"مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔" وہ بولی "مگر تم مجھے مار ڈالو کسی طرح۔" اس کی آواز میں بڑی لجاجت تھی۔

"اس سے بہتر تو یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو مار ڈالوں۔" جمال نے جواب دیا۔ "لاؤ چاقو دو مجھے۔"

جمال کا واقعی ارادہ تھا کہ میں چاقو اپنے سینے میں اتار لوں۔ شاید اس طرح اس معصوم کے دکھ کا کچھ ازالہ ہو جائے۔ اس نے چاقو سیوادارنی کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کی۔ وہ پیچھے ہٹ کر بولی "غنڈے اب تو چاقو مار کر میرے کپڑوں پر خون کے چھینٹے ڈالنا چاہتا ہے تاکہ میں بدنام ہو جاؤں اور میرے ماتا پتا برباد ہو جائیں؟ بدمعاش ذلیل کمینے......"

جمال نے کہا "تم چاقو مجھے دے کر اوپر چلی جاؤ گی تب میں اپنے آپ کو ماروں گا۔ میں تمہیں بدنام کرنا نہیں چاہتا۔ لاؤ یہ چاقو مجھے دے دو ورنہ میں تم سے چھین لوں گا۔"

لڑکی پیچھے ہٹی اور کھڑکی کے قریب جا کر اس نے چاقو سڑک پر پھینک دیا۔

## سہانی صبح

صبح سویرے جب کرفیو کھلا تو ابھی اندھیرا ہی تھا۔ جمال کو سیڑھیاں اترتے کسی نے نہ دیکھا۔

جمال کی ممانی نے جمال کو خالی ہاتھ آتے دیکھا تو چلانے لگی۔ "ہائے میرے پھوٹے نصیب! مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ تم اپنے ماموں کی طرح بزدل ہو۔ مجھے پتہ تھا تم میں شاہ عالمی چوک تک جانے کی ہمت نہ ہوگی۔"

جمال کا خیال تھا کہ میری ممانی میری رات بھر کی غیر حاضری پر کچھ فکر مند تو ہوگی اور اس کے کئی جواب اس نے سوچ رکھے تھے۔

تھوڑی دیر اور چیخنے کے بعد وہ بولی "اور اب تم ناشتہ بھی مانگو گے۔"

"نہیں مامی جان میں نے راستے میں لسی پی لی تھی۔" حالانکہ اس نے کچھ بھی کھایا پیا نہ تھا۔

جمال کا ماموں چپ چاپ شیو کرنے میں مصروف رہا۔ جمال اب یہاں ایک منٹ بھی رکنا نہ چاہتا تھا۔

## گوروجی بولے

رات کے واقعے کی تفصیلات مفتی نے بڑی توجہ سے سنیں۔ جمال بے حد پشیمانی کا شکار تھا کہ میں نے ایک معصوم لڑکی کو بے بس پا کر برباد کر ڈالا۔ وہ محض انسانی جذبے کے تحت مجھے کھانا کھلانے آئی تھی۔ حالانکہ میں مسلمان تھا مگر میں نے اسے کتے کی طرح بھنبھوڑ ڈالا۔

اس پر مفتی داناؤں کی سی ہنسی ہنسا اور بولا "تم بے وقوف ہو۔"

"میں کیوں بے وقوف ہوں؟"

"تم اول درجے کے بے وقوف ہو۔ خواہ مخواہ اپنا جی جلاتے ہو۔" وہ بولا۔

"خواہ مخواہ نہیں۔ میں نے اس پر ظلم تو کیا ہے۔"

"تمہارا خیال ہے کہ وہ تم پر رحم کھا کر رات کے دو بجے محض تمہیں کھانا کھلانے کے لیے آئی تھی!"

"بے شک وہ اس خیال سے آئی تھی اور یہ بھی کہتی تھی کہ اگر بلی کالی ماتا کے چرنوں میں بھینٹ کرتے وقت بھوکا ہو تو دیوی قربانی قبول نہیں کرتی۔ یہ اس کے دھرم کا سوال بھی تھا۔"

"اور اس کے علاوہ اس کا کوئی خیال نہ تھا؟ یہی ہے نا تمہارا مطلب؟"

"بے شک! اس کا کوئی اور ارادہ نہ تھا اور میرا بھی کوئی ارادہ نہ تھا۔"

"بے وقوف! تم نہیں جانتے کہ جو کچھ ہوا اس کی مرضی سے ہوا۔ اس کی خواہش کے عین مطابق ہوا۔ اس نے تمہیں بندر کی طرح نچایا، اپنی الہڑ جوانی کی ڈگڈگی بجا کر۔"

"یہ میں کبھی مان نہیں سکتا۔"

"سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ لاشعوری طور پر اسی ارادے سے آئی تھی۔ رات کے دو بجے جب دنیا پڑی سوتی تھی۔"

"ناممکن۔ وہ متعصب ہندو سیوادارنی۔ میں مسلمان یہ کیسے ممکن ہے، پھر وہ تو جسم کے بھیدوں سے بھی واقف نہ تھی۔ بڑی پاک صاف لڑکی تھی وہ۔"

"مانتا ہوں۔" مفتی بولا۔ "مگر تم جیسے غنڈوں سے متاثر ہو جاتی ہیں بھولی بھالی لڑکیاں۔"

"مجھے تو اس نے اچھی طرح دیکھا بھی نہیں تھا۔ اتنا گاڑھا اندھیرا تھا کمرے میں پھر میں ایسا لڑکیوں کو بے بس کر دینے والا جوان رعنا بھی نہیں!"

"صورت کا سوال نہیں بے وقوف۔ عورتیں صورت کو خاص اہمیت نہیں دیتیں سمجھے؟"

"نہیں سمجھا۔"

"وہ تمہاری جرأت سے متاثر ہو گئی تھی۔ ہندوؤں کے علاقے میں کسی مسلمان کا رات کے وقت خالی ہاتھ چلے جانا جرأت کی بات ہے یا نہیں ہے؟"

"مگر میں تو اپنی ممانی کی کل کل سے تنگ آ کر گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ بے وقوفی کی بات کہی جا سکتی ہے۔ بہادری کی بات ہوتی تو میں کبھی اس قتل گاہ کی طرف نہ جاتا۔"

"بہادری کو بے وقوفی سے الگ کوئی چیز سمجھتے ہو تم؟ عقلمند آدمی بھی کہیں بہادر ہوتا ہے؟"

جمال کو پتہ تھا کہ میں ایک بے وقوف آدمی ہوں۔ اب اسے خیال آیا کہ شاید اس حوالے سے میں بہادر بھی ہوں مگر اس کا دل مانتا نہ تھا۔ اس نے کہا "مگر بہادر تو ہندوؤں میں بھی بہت ہوں گے۔ پیارے لال کا نام تو وہ بڑے چاؤ سے لیتی تھی۔"

مفتی بولا "پیارے لال ایک تنظیم کا سربراہ تھا۔ وہ منصوبے کے مطابق حملے کے لیے تیار ہو کر نکلتا تھا۔ وہ خطروں سے بچ کر ہتھیار لے کر چلتا تھا۔ وہ ذاتی طور پر بہادر نہیں تھا۔ تمہاری طرح موت کے کنویں

میں کود جانے والا بے وقوف نہیں تھا اور عورتیں ایسی بہادری سے متاثر نہیں ہوتیں جن میں بے وقوفی شامل نہ ہو۔ پیارے لال کا نام وہ محض تنظیمی وفاداری کی وجہ سے لیتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ میرا محافظ ہے۔ جب تک اس نے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔''

''مگر اس نے شور کیوں نہ مچایا۔ سیٹی کیوں نہ بجا دی فوراً؟'' جمال نے پوچھا۔

مفتی نے پان کی گلوری منہ میں ڈالی اور بولا ''اس لیے کہ وہ شور مچانا چاہتی ہی نہ تھی۔ وہ لاشعوری طور پر تمہارے ہاتھوں پامال ہونے کے لیے آئی تھی کیونکہ تم اپنی بہادری کی وجہ سے اسے پیارے لال سے بڑے محافظ لگے تھے۔''

''مگر میں نے تو اس کی حفاظت نہیں کی۔ الٹا اسے توڑ کر چکنا چور کر دیا۔''

''تمہیں نہیں پتہ نا کہ ٹوٹ جانا ہی عورت کے لیے محفوظ ہو جانا ہوتا ہے بشرطیکہ توڑنے والا بہادر آدمی ہو۔ خطروں کی پرواہ نہ کرے کود پڑے آگ میں۔ یہی تو تم نے کیا تھا۔''

''مگر وہ ہندو، میں مسلمان......''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مرد مرد ہے اور عورت عورت۔ آخری تجزیہ یہی ہے۔ باقی سوشل مجبوریاں ہیں، رکھ رکھاؤ کی باتیں ہیں، تعصبات ہیں۔''

''مگر یہ باتیں ایسی معمولی نہیں۔ کون اپنے تعصبات چھوڑ سکتا ہے خاص کر اس زمانے میں جب کہ خون کے دریا بہہ رہے ہوں۔''

مفتی بولا ''آج کل تو اس کا امکان زیادہ ہے۔ خون کے دریا نہ بہیں تو اعصاب تن جاتے ہیں۔ خطرے کی گھنٹیاں آٹھوں پہر بج رہی ہیں۔ آج کل ہندو لڑکیوں کو محافظوں کی خاص طور پر ضرورت ہے۔ بہت کمزور ہیں اس لیے......''

''میں نہیں مانتا تمہاری بکواس۔'' جمال نے جل کر کہا۔

''نہ مان۔'' مفتی بولا۔ ''مگر یہ تسلیم کر لو کہ شام کو جب تمہیں وہ کمرے میں بند کر کے چلی گئی تو اس نے کسی کو بتایا نہیں کچھ، کسی پیارے لال کو اطلاع نہیں دی کہ شکار اندر پھنسا بیٹھا ہے۔ کیوں؟''

''اسے شام کے وقت کوئی ملا ہی نہ ہوگا۔''

''پھر وہ آدھی رات کو جب اس کی ماتا جی گہری نیند سو گئیں، اپنی چھت سے کود کر دوبارہ کس لیے آئی تم جیسے بانکے جوان کے پاس؟ کس لیے؟''

''وہ تو محض رحم کھا کر مجھے کھانا کھلانے آئی تھی تاکہ صبح میں خالی پیٹ دیوی کی بلی نہ چڑھا دیا جاؤں۔''

مفتی بولا ''اس میں عورت کی پرورش کا جذبہ بھی تھا۔ مامتا بھی تھی تمہارے لیے۔ تھی کہ نہیں؟''

''اب میں کیا کہوں؟'' جمال بولا۔

''آدھی رات کو اسے کوئی اس ویران کمرے میں تمہارے ساتھ دیکھ لیتا تو کم سے کم اس کی سگائی تو فوراً ہی ٹوٹ جاتی۔''

''یقیناً اور بھی بہت کچھ ہو جاتا۔''

''مگر اس نے یہ رسک لیا۔ خطرہ مول لیا۔ تمہاری خاطر اور جان بوجھ کر کیا۔ اپنے منگیتر کو دل سے ترک ہی کر کے وہ تمہارے پاس آئی تھی...... کم از کم ان چند لمحوں کے لیے۔''

''یہ کہنا مشکل ہے۔''

''پھر وہ تمہیں رات کے نو بجے بھی کھانا پہنچا سکتی تھی۔ کیوں اس نے اپنی ماتا جی کے گہری نیند سو جانے کا انتظار کیا؟ کیوں؟ اس نے تو تمہیں کرفیو کی ویرانی کے دوران ملنے کی سوچی...... تاکہ کوئی مخل نہ ہو سکے۔ مانتے ہو؟''

''پھر تمہیں کھانا دینا بھی کیا ضروری تھا۔ تم مسلمان ہو، وہ ہندو۔ تم چاہے بھوک سے مر جاتے پھر ایک رات میں کوئی بھوک سے مر بھی نہیں جاتا۔''

''یہ تو سچ ہے......''

''پھر وہ کیوں آئی آدھی رات کے وقت۔ کس لیے آئی؟''

''خیر آئی تو وہ کھانا ہی دینے کے لیے تھی۔ اب تم جو بھی کہو۔''

''کیوں اس نے پیارے لال کے آدمیوں کو نہ بلایا...... اگر واقعی وہ اسے نہیں مل سکا تو وہ اپنے ماں باپ کو اطلاع دے سکتی تھی کہ ایک بکرا اندر بند ہے۔''

''وہ خون نہیں دیکھ سکتی تھی۔ قتل کرانا قتل کرنے سے کم نہیں ہوتا۔ ایک معصوم ہندو لڑکی کسی کو قتل کیسے کرا سکتی ہے؟''

''بے شک نہیں کرا سکتی۔'' مفتی بولا۔ ''مگر اس نے جاتے ہوئے تمہارے کمرے کا دروازہ باہر سے کیوں بند کر دیا تھا۔''

''تاکہ میں بھاگ نہ جاؤں۔'' جمال نے جواب دیا۔

''نہیں۔'' مفتی نے کہا۔ ''دراصل وہ تمہیں سنبھال کر رکھ گئی تھی۔ تم کہیں اس کے ہاتھ سے نکل نہ جاؤ۔''

''مگر جب میں نے اسے پکڑ لیا تو وہ روئی کیوں۔ وہ بلک بلک کر روتی تھی۔ اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے، بھگوان کے واسطے دیئے تھے۔''

مفتی بڑا سنگدل فلسفی تھا۔ بولا ''رو کر اس نے اپنے آپ کو اور بھی کمزور اور قابلِ توجہ ظاہر کیا۔ اس نے تمہاری مردانگی کو ابھارا۔ تمہیں اکسایا اور تم اس کے اشاروں پر چلے۔''

''یہ بڑی زیادتی ہے مفتی۔ اتنی بے رحمی نہ دکھاؤ۔''

''اور اس کو روتے دیکھ کر تمہاری مردانگی بھڑک اٹھی۔ حالانکہ پہلے سے تمہارا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔''

''خدا سے ڈرو مفتی۔ تمہارے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔''

''یہ اسی کا ارادہ تھا اور شام ہی سے تھا۔ تم لاشعور کے چھل بل کو نہیں جانتے برخوردار!''

''فرائیڈ تو شیطان کا بچہ ہے اور تم بھی کچھ کم نہیں ہو۔ ہمارا کلچر اور ہے۔ ہماری عورتیں جرمن عورتوں جیسی نہیں جن سے فرائیڈ نے اپنے اصول اخذ کیے۔ وہ بیچاری بہت ہی دکھی تھی۔ ایک دفعہ تم نے اسے دیکھا ہوتا تو......''

''وہ دکھی نہیں ہے۔ وہ ساری عمر تمہاری یاد میں جئے گی۔ تم اس کے پہلے ذاتی شکار ہو جسے اس کی نسائیت نے خود مار کر کھایا۔ وہ اس کارنامے کی یاد میں خوشی سے زندگی بسر کرے گی۔''

''وہ تو مر جانا چاہتی تھی خدا کی قسم۔ اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے کہ میں اسے مار ڈالوں۔ تم بکواس کرتے ہو مفتی!''

''تمہاری خاطر یہ بھی مان لیتا ہوں۔ اس نے سوچا ہوگا کہ میری زندگی کی تکمیل ہوگئی۔ اب آگے جینا فضول ہے۔ آگے اسے اوروں کی مرضی پر چلنا ہوگا مگر وہ تمہیں کبھی بھلا نہ سکے گی۔ وہ تم سے ناراض نہیں تمہاری احسان مند ہے۔''

''وہ مجھ سے سخت نفرت کرتی تھی۔ وہ کچھ کر نہ سکتی تھی ورنہ......''

''جب تم نے خودکشی کرنے کے خیال سے اس سے چاقو مانگا تو اس نے اسے کھڑکی سے باہر پھینک دیا، کیوں؟''

''ظاہر ہے کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ خون بہے اور میں مر جاؤں۔''

''یہی تو میں کہتا ہوں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ تم مر جاؤ، تم جس نے اسے اس کا عورت پن دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ تم ہمیشہ زندہ رہو مگر تم نہیں سمجھے۔ تم اول درجے کے بے وقوف ہو۔ ایک دم اُلو۔ کچھ نہیں جانتے تم!''

ہفتہ دس دن میں حکومت نے لاہور میں فسادات کنٹرول کر لیے۔ راولپنڈی، مری وغیرہ میں چھوٹے چھوٹے بلوے ہوتے رہے اور مشرقی پنجاب میں آگ سلگتی رہی مگر مجموعی طور پر امن ہوگیا اور زندگی معمول پر آ گئی۔

مسلم لیگی لیڈر فسادات نہ چاہتے تھے کیونکہ انہیں امید تھی کہ پنجاب کی حکومت ہمیں مل جائے گی۔ ویسے بھی انہوں نے قوم کو کسی خانہ جنگی کے لیے تیار نہ کیا تھا۔ مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے نام سے جو تنظیم تھی، وہ وردیاں پہننے، لیڈروں کی دریاں بچھانے اور بگل بجانے تک محدود تھی۔ عملی جدوجہد سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

اگلے مہینے کی پہلی کو جب جمال شیخوپورے سے مفت کی تنخواہ لے کر آیا تو اس کے پہلو میں درد کی ایک لذیذ کسک تھی۔

## درد کی کسک

رانا صاحب شرقپورے کے دورے پر تھے۔ جمال ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ سوائے اماں جی کے اور وہ پچھلے کمرے میں وظیفہ کر رہی تھیں۔

''میاں مٹھو، میاں مٹھو۔'' سعیدہ کی آواز آئی۔ ''لے چوری کھا لے۔'' اس کی آواز میں ٹھمری کا سا لوچ تھا۔ طوطا پنجرے میں بند تھا۔

''میاں مٹھو تو میری طرف دیکھتا کیوں نہیں۔'' سعیدہ بولی۔

جمال نے آنکھیں چک پر گاڑ دیں۔ اسے ایک لڑکی کا ہیولا سا نظر آیا جس کا سر ننگا تھا۔

سعیدہ نے اِٹھلا کر کہا ''اب میری طرف دیکھتا کیا ہے۔ کیا میں تیری چُوری ہوں۔''

جمال کے دل میں گدگدی ہونے لگی۔

سعیدہ بولی ''ندیدے کیا اب تو مجھے کھا ہی جائے گا۔''

پھر اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

جمال نے نظریں ہٹا لیں اور بے خیالی میں دیوار پر لگی ہوئی تصویریں دیکھنے لگا۔

سعیدہ بولی ''اور اس پر چوری کھانے کا شوق بھی ہے۔ بزدلوں کو کہیں چُوری ملتی ہے۔''

جمال حیران تھا کہ چک کے پیچھے بیٹھی سعیدہ میرے دل کو پڑھ رہی ہے اور فقرے پر فقرہ کس رہی ہے۔ اس نے آہستہ سے کہا ''کوئی کسی بزدل کو بھی کھلا دے چُوری۔''

سعیدہ بولی ''چوری کر اور چُوری کھا۔ ڈاکہ مار لے۔ لوٹ کے کھا جا۔''

''کوئی راستہ بھی تو بتائیے۔'' جمال بولے۔

''کوئی ہاتھ جوڑے، پاؤں پڑے۔'' سعیدہ نے کہا۔

''کوئی موقع بھی تو دے۔ ہم تو پاؤں چومنے کے لیے بے قرار ہیں۔ مرے جا رہے ہیں آرزو میں۔''

سعیدہ بولی ''وہ تو تمہاری شکل ہی سے ظاہر ہے۔ مسکین، یتیم، بھکاری!''

''تو کچھ جھولی میں ڈال دو۔''

سعیدہ گنگنانے لگی۔ دس دروازے میں بند کر سوئی کھڑکی کھلی تھی...... گھائل پڑی تھی...... آواز اس کی کافی سریلی تھی۔ پھر بولی ''لاہور میں تو دروازے بھی کھلے تھے اور کھڑکیاں بھی...... اور تم ابھی اندھے بھی نہ ہوئے تھے۔''

''کیا مطلب؟ لاہور سے تمہارا کیا مطلب؟'' جمال نے بے چین ہو کر پوچھا۔

مگر عین اس وقت رانا صاحب کا تانگہ آ دھمکا اور بات آگے نہ بڑھ سکی۔ جمال کو بڑا قلق ہوا مگر اس کے بدن میں ایک نشہ سا گھل گیا۔

## چلو بمبئی چلو

مفتی نے بات سن کر کہا "کوئی نہ کوئی سعیدہ تمہیں چُوری کھلانے کے لیے بے چین رہتی ہے۔ ہر وقت مگر کل تو ہم بمبئی جا رہے ہیں۔ ہم دونوں......"

"کیا مطلب؟" جمال نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کل صبح کی گاڑی سے۔"

سعیدہ یک دم چک کے پیچھے سے غائب ہوگئی۔ طوطا پنجرے سے اڑ گیا۔

جمال بولا "بہت اچھا۔ گاڑی کتنے بجے چھوٹتی ہے؟"

مفتی نے کہا "تم ابھی شیخوپورے واپس جا کر چھ مہینے کی چھٹی لے آؤ۔"

مگر جمال کو نوکری کی پروا نہ تھی۔ بمبئی کا تصور بڑا رنگین تھا۔ اس نے پوچھا "مگر ہم بمبئی جا کر کیا کریں گے؟"

"ہم وہاں جا کر ایک اعلیٰ درجے کا پرچہ مرتب کریں گے، جس کا موضوع ہوگا فلم، آرٹ اور فن، چونکہ ہندوستان کے تمام ادیب وہیں جمع ہو چکے ہیں اور فلمیں بھی وہیں بنتی ہیں اس لیے پرچہ بھی وہیں مرتب ہو سکتا ہے۔ میرے پبلشر نے مجھے میری کتاب کی رائلٹی پیشگی دے دی ہے اور کرشن چندر سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنے گھر میں ہمیں جگہ دے دے۔"

مفتی نے ادیبوں کے ایڈریسوں کی کاپی بڑی احتیاط سے جیب میں رکھی اور دونوں سوار ہو گئے۔

جمال کو گاڑی میں اس خیال سے ہنسی آتی رہی کہ میں شیخوپورے میں سرکاری ملازم تھا! یعنی چہ؟

مفتی کا خیال تھا کہ میں بمبئی میں فلمی کہانیاں لکھوں گا۔ جمال کو فلم میں ایکٹنگ کا شوق تھا۔ اپنی شکل وصورت کے بارے میں وہ کسی بڑی غلط فہمی میں مبتلا نہ تھا مگر جانتا تھا کہ میں ایسا بھی نہیں کہ سکرین پر اچھا نہ لگوں۔

کرشن چندر کی ہدایات کے مطابق وہ اندھیری سٹیشن سے گھوڑا گاڑی پر چار بنگلہ نامی بستی میں کوور لاج پہنچ گئے جہاں کرشن چندر رہتا تھا۔

## کوور لاج

ناریلوں کے جھنڈ میں یہ ایک پرانی وضع کی بہت بڑی حویلی تھی۔ سارے علاقے میں چیکو اور آم کی کیریوں کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور ارد گرد سمندری ریت کے ٹیلے اور ان کے پیچھے ساحل پر ٹوٹتی ہوئی موجوں کا ہلکا ہلکا شور جیسے بہت سارے تانپورے ایک ساتھ چھیڑے ہوئے ہوں۔ جمال کو یہ ماحول بہت رومانی لگا اور چونکہ ادیبوں کو ایسے ہی ماحول میں رہنا چاہیے۔ اسے خیال آیا کہ میں نے صحیح فیصلہ کیا ہے۔

کرشن چندر اور مفتی کی یہ پہلی ملاقات تھی مگر دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ کرشن چندر ایک جذباتی سوشلسٹ تھا۔ تحریر اس کی رواں اور دلکش تھی۔ مفتی نے اردو افسانے میں نئی روش نکالی تھی۔ اسے اردو نہ آتی تھی۔ اس لیے وہ آسان اور صاف زبان لکھتا تھا۔ موضوع کے اعتبار سے وہ درمیانہ طبقے کی گھریلو بندھنوں میں جکڑی ہوئی عورتوں کی تہہ دار الجھنوں میں دلچسپی رکھتا تھا جو اپنی مظلومیت اور کمزوری کے پردے میں اپنے بظاہر طاقتور اور سخت گیر مردوں کو انگلیوں پر نچاتی ہیں۔

مفتی ظالم اور مظلوم میں انصاف کا ترازو لے کر بیٹھ نہیں جاتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ زندگی اس طرح ہے۔ اصل بات اس کو بیتنا ہے بدلنا نہیں ہے۔

مفتی نے کہانی لکھنے کے میدان میں بڑا نام پیدا کر لیا تھا۔ مگر ادیبوں کا سرتاج کرشن چندر یا منٹو ہی کو سمجھا جاتا تھا۔

کرشن چندر مفتی سے بڑے خلوص سے ملا۔

اس کا سر گنجا تو نہیں تھا مگر اس کے بال بڑی تیزی سے اُڑ رہے تھے۔ اس کے چھوٹے قد پر اس کی چھوٹی سی توند بڑی توند لگتی تھی۔ وہ بار بار تھوکتا تھا۔ وہ کسی طرح بھی ادیب نہ لگتا تھا اور اس روز اس نے کوئی ذہانت کی بات بھی نہ کی۔

مفتی اس سے ملتے ہی سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے کرشن کی معمولی باتوں کا بھی سوچ سوچ کر جواب دیا۔ ہر لفظ تول تول کر منہ سے نکالا اور کھرج میں بات کی جیسے وہ بہت ہی سیانا اور پر اعتماد شخص ہو۔

جمال ایک پرندے کی طرح چہچہاتا رہا۔ اس نے لاہور کے بارے میں کرشن چندر کے سوالوں کے جواب بے تکلفی اور شوخی سے دیئے۔ پھر کرشن چندر کی لالائن بیوی آ گئی۔ سفید ساڑھی میں لپٹی ہوئی، چہرے پر چندن جیسی زردی، معزز کھترانیوں جیسی حیا اور پختہ عمر کی چال ڈھال۔ وہ اپنے ننھیال کے بارے میں پریشان تھی جو چونا منڈی میں رہتے تھے۔

کرشن کو فسادات پر بڑا دکھ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ لیڈر بدمعاش ہیں جو عوام کو تشدد پر بھڑکاتے ہیں مگر اسے امید تھی کہ آزادی کے بعد قومی لیڈر حالات کو سنوار لیں گے۔ پاکستان کے حق میں اس نے واضح بات کی اور اس پر جمال بہت خوش ہوا۔

## دوسری منزل

کوور لاج کی دوسری منزل میں تین بڑے ہال نما کمرے تھے، دروازوں کے بغیر۔

ان ہال کمروں میں کھڑکیوں کے سامنے فرش پر کئی بستر بچھے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک ایک ٹرنک اور کچھ کتابیں۔ دو کھڑکیوں کے ساتھ مفتی اور جمال نے بھی بستر لگا لیے۔ یہی ان کا دفتر، سونے کا کمرہ

اور ڈرائنگ روم تھا۔

مفتی نے سب سے پہلے تو جمال کو اس کی بے باک گفتگو پر ڈانٹ پلائی۔ اسے سمجھایا کہ یہ ادیب لوگ ہیں۔ ان کے ساتھ بات میں احتیاط نہ کرو گے تو یہ تمہاری عزت نہ کریں گے۔

مفتی نے جمال کو کبھی یوں ٹوکا نہ تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی بات منوا لیتا مگر بڑے طریقے سے' یعنی میری بات مانو یا نہ مانو، مجھے اس کی پرواہ نہیں مگر میں جو کہتا ہوں صحیح ہے۔

مگر جمال جانتا تھا کہ وہ بہت فکر مند آدمی ہے۔ اپنے دوست کی ذرا سی تکلیف پر اس کی جان پر بن جاتی ہے مگر اسے لگا کہ بمبئی پہنچ کر اس کے سکول ماسٹر نے کیکر کی لکڑی پکڑ لی ہے۔

پچھلے پہر اور ادیب آ گئے اور راج مہرہ بھی۔ کرشن چندر کی ناکام فلم کا ایک ایکٹر۔ مہندر ناتھ کرشن چندر کا چھوٹا بھائی، معصوم اور آہستہ آہستہ مسکرانے والا پھر وشوامتر عادل جوشیلا، غصیل اور جذباتی اور پھر میرا جی۔

## سانپ یا سپیرا

میرا جی ایک پراسرار شخص تھا۔ بال الجھے ہوئے، کپڑے گندے، بغل میں انگریزی کے پرانے جاسوسی رسالے، ہاتھ میں لوہے کے دو گولے جن پر سگریٹ کی پنی چڑھی ہوئی تھی۔ دانت پان کی پیک سے کالے، آنکھیں سانپ کی طرح تیز جن میں سے روشنی کی ایک کرن نکل کر دیکھنے والے کے سینے میں گھس جاتی تھی۔

وہ اردو دلی کے لہجے میں بولتا تھا اور بات شروع کرنے سے پہلے وہ کہتا...... جہاں تک ہم جانتے ہیں یا جہاں تک ہمیں معلوم ہے...... وہ بڑی اتھارٹی سے رائے دیتا تھا، اس کی ہر بات فتویٰ ہوتی تھی۔

مفتی اور جمال پر اس نے فوراً ہی قبضہ کر لیا۔ اس نے پہلے تو انہیں بمبئی کے خطرات سے آگاہ کیا۔ آنے جانے کے راستے سمجھائے۔ پھر اصرار کیا کہ وہ آج ہی ان کے ساتھ باہر جائیں۔ پہلے بمبئی کا نقشہ خریدیں تاکہ انہیں پتہ چلے کہ کون سا راستہ کہاں جاتا ہے اور کونسی گاڑی کہاں سے ملتی ہے۔

بمبئی میں اردو لکھنے والوں سے ملاقاتیں اور مضامین کی فراہمی جمال کی ذمہ داری تھی۔ میرا جی نے کہا ''چونکہ میں سب کو جانتا ہوں، اس لیے تم میرے ساتھ رہو گے۔ میں تمہیں مضامین بھی لکھوا دوں گا۔''

کوور لاج میں رہائش سب کی مشترکہ تھی مگر کھانا سب لوگ اپنا اپنا کھاتے تھے۔ چینی ملتی نہیں تھی۔ اس لیے ہر شخص مٹی کے تیل کا سٹوو جلا کر اس پر دو سوکھے توس سینکتا اور پھیکی چائے پی کر باہر نکل جاتا۔

دوپہر کو کوئی گھر میں نہ ہوتا۔ مفتی بالعموم چپ رہتا یا جمال کو روکتا ٹوکتا رہتا۔ وہ بطور ادیب کسی سے کم نہ تھا مگر احساسِ کمتری کے مارے کسی سے کھل کر بات نہ کر سکتا۔ جمال کی اور بات تھی۔ ایک تو وہ طبعاً باغی تھا اور دھرتی کا دھرا تبدیل کر دینا چاہتا تھا۔ دوسرے اسے ترقی پسندوں کی سوشلزم اچھی لگتی تھی۔ وہ اکثر اس بات پر کڑھتا کہ میں مارکسی علم سے بے بہرہ ہوں۔ لوگ انقلاب کی بات کرتے اور اس جنت کی سیر کرواتے' جو آنے والی ہے تو وہ ان کی بصیرت پر رشک کرتا۔

کوور لاج ایک کمیون تھی۔ ہندوستان سے جو بھی ادیب بمبئی آتا جب تک چاہتا کوور لاج میں رہتا۔ اتوار کے دن ترقی پسند مصنفین کا باقاعدہ اجلاس ہوتا۔ پھر سب لوگ میرین ڈرائیو پر ٹہلتے یا پیریزین ڈیری میں چائے پیتے۔

اس کی دوسری منزل پر جوشؔ صاحب مقیم تھے۔ خواجہ احمد عباس کا گھر شیوا جی پارک میں تھا۔ عصمتؔ چغتائی باندرہ کی گلیوں سے نکل کر ایک فلیٹ میں اور منٹوؔ سب سے الگ تھلگ کبھی یہاں کبھی وہاں۔

بمبئی کے ترقی پسند مصنفین جوشؔ اور کرشن چندر کی پوجا کرتے تھے' جیسے دونوں انسان نہ ہوں دیوتا ہوں۔ منٹوؔ سب کو گالیاں دیتا تھا جو سب سر جھکا کر سنتے تھے۔ وشوامترؔ عادل کی میرا جی سے یاری تھی اور قدر مشترک دونوں کی جوشؔ کی خود پسندی کے خلاف مورچہ بندی۔ میراؔ جی ویسے بھی ترقی پسند تحریک کا مخالف تھا۔ کرشنؔ کی پوجا کو تو وہ برداشت کر لیتا تھا کیونکہ وہ ایک نرم گفتار اور ہنس مکھ آدمی تھا مگر جوشؔ کا انداز جاگیردارانہ تھا اور دوسروں کو حملے پر اکساتا تھا۔ پھر میراؔ جی وشوامترؔ عادل کو بھڑکاتا اور وہ جوشؔ کے کلام میں کیڑے ڈالتا۔ اس کے ادق بیان اور گاڑھی زبان کے بخیے ادھیڑتا۔

میرا جی صرف فن کے حوالے سے بات کرتا مگر وشوامتر ذاتیات پر اتر آتا۔ ''جوشؔ صاحب! آپ کی زبان مزدور کسان نہیں سمجھتے۔ آپ کس طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں؟''

جوشؔ صاحب بڑے دھڑلے سے جواب دیتے۔ ''میں ان کے لیے لکھتا ہوں جو میری بات سمجھ سکیں۔''

اس پر وشوامترؔ عادل کا چہرہ کھل جاتا کیونکہ جوشؔ صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ وہ عوام کے شاعر نہیں ہیں یعنی وہ ترقی پسند نہیں ہیں۔

پھر طبقاتی معاشرے پر بحث چھڑ جاتی اور خاندانی پس منظر اور طبقاتی مفادات کے حوالے سے ضربیں لگائی جاتیں۔ وشوامترؔ عادل کا گلا غصے سے رُندھ جاتا۔

اس قسم کے مباحثوں کو سجاد ظہیر سنبھالنے کی کوشش کرتے۔ وہ ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکریٹری تو تھے ہی مگر کمیونسٹ پارٹی کے اہم لیڈر بھی تھے۔ ان کا خاندانی پس منظر جاگیردارانہ تھا۔ لکھنوی رکھ رکھاؤ بھی ان کی طبیعت میں رچا ہوا تھا۔ وہ بہت پریشان ہوتے اور اس پر وشوامترؔ عادل اور میراؔ جی کی چڑھ مچتی۔ ان ہنگاموں کے باوجود ماحول بہت پر لطف رہتا۔

کچھ عرصے کے بعد پنجاب سے فسادات کی خبریں پھر آنے لگیں۔ حکومت نے پابندی لگا دی تھی کہ مرنے اور مارنے والوں کی مذہبی شناخت نہ کرائی جائے مگر سب جانتے تھے کہ شہر کے کس علاقے میں کس کا پلہ

بھاری ہے۔ کوورلاج میں فسادات پر سب کڑھتے تھے مگر ہندو مسلم کے حوالے سے کوئی بات نہ کرتا تھا۔

ایک ڈیڑھ مہینہ اور گزر گیا۔ لاہور سے ڈاک آنی غیر یقینی ہوگئی۔ مفتی کے پاس پیسے ختم ہو رہے تھے مگر وہ جمال کو کچھ بتاتا نہ تھا۔ ایک دن اس نے اچانک کہا ''جمال میرے خیال میں میں واپس چلا جاؤں اور پرچے کی کتابت شروع کروا دوں تاکہ ہم یوم آزادی پر پرچہ نکال سکیں۔ تم فی الحال یہیں رہو...... جب باقی مسودے مل جائیں تو تم بھی واپس آ جانا۔ یوم آزادی کے بعد ہم پرچہ لے کر واپس بمبئی آ جائیں گے۔''

پھر مفتی نے کرایہ رکھ کر باقی سارے پیسے جمال کو دے دیئے۔

## بے فکری کے دن

مفتی کے جانے کے بعد جمال قطعی طور پر آوارہ ہوگیا۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ عیاشی میں پڑ گیا۔ پرچہ مرتب ہو چکا تھا اس لیے وہ بے فکری سے گھومنے پھرنے لگا۔

اس کی آوارہ گردی بڑی رومانی تھی کیونکہ اس کا کوئی مقصد نہ تھا۔

کبھی کبھی وہ گھر میں اکیلا پڑا رہتا۔ حویلی کے مرد چلے جاتے تھے تو کبھی کبھی پاس پڑوس کی لڑکیاں جو کوورلاج کے باغیچے میں چیکو توڑنے کے لیے آتی تھیں اور خوب ہنستی چیختی اور شور مچاتی تھیں، جمال کو بھی کھیل میں شامل کر لیتیں۔ اس کے کندھے پر چڑھ کر وہ پھل توڑتیں، کھاتیں اور کھلاتیں۔

ایک ان میں اکیلی بھی آ جاتی۔ وہ کوئی پندرہ برس کی سانولی لڑکی تھی۔ دبلی پتلی، شرمیلی مگر زندگی سے بھری ہوئی۔ وہ ہندو تھی مگر جمال کو پسند کرتی تھی۔ اوپر آ کر کبھی وہ جمال کے پلنگ کے ایک کونے پر بیٹھ جاتی اور دوسرے کونے پر بیٹھے ہوئے جمال کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی۔ پھر اس کا چہرہ حیا کی سرخی سے لال ہو جاتا اور وہ کوئی بات کیے بغیر ہی کمرے سے بھاگ جاتی۔

جمال نے اس سے کبھی دست درازی نہ کی۔ وہ سمجھتا تھا کہ لڑکی بہت معصوم ہے۔ اگر میں نے پیش قدمی کی تو وہ بھاگ جائے گی۔ یہ ملاقاتیں اس طرح بھی بہت پرلطف تھیں۔

کوورلاج میں دوسرا شخص جس کی زندگی کا کوئی مقصد نہ تھا میراجی تھا۔

دونوں روزانہ باندرہ میں سکھوں کے ہوٹل سے جھٹکے کا قلیہ قورمہ کھاتے۔ مارواڑی کے ہاں کڑک چائے پیتے اور شام ڈھلے لوکل ٹرین کے پائیدان پر لٹکے ہوئے گھر واپس آ جاتے۔

## کالبادیوی میں بلوہ

کالبادیوی کے قریب ٹرام میں بیٹھے ہوئے میراجی نے اچانک کہا ''اتر جاؤ فوراً۔ یہاں بلوہ ہونے والا ہے۔'' اور یہ کہہ کر میراجی ٹرام سے اتر گیا۔

بازار پرسکون تھا۔ لوگ اپنے دھیان میں اپنے اپنے کاموں پر جا رہے تھے۔ بلوے کی کوئی علامت نہ تھی۔

ٹرام رک گئی تھی۔ ڈرائیور نے بھی بھانپ لیا تھا۔ وہ ٹن ٹن گھنٹی بجانے لگا۔ مسافر جلدی جلدی اترنے لگے۔

جمال اطمینان کے ساتھ ٹرام سے اترا۔ میراجی ہجوم میں غائب ہو چکا تھا۔

ہندو غنڈے نے پوچھا۔ ''ایچ کے ایم؟''

جمال نے کہا ''مسلمان ہوں۔''

''تو اس لائن میں لگ جاؤ۔''

اب جمال کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ وہ مسلمانوں والی قطار کی طرف بڑھا مگر اچانک بھگدڑ مچ گئی کیونکہ اُدھر سے مسلمان بلوائی جوابی حملے کے لیے آ پہنچے تھے۔ بنا سوچے سمجھے جمال بھی ایک طرف کو بھاگا۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ میں کالبادیوی کے اندر کے گلیاروں کی طرف جا رہا ہوں جن میں صرف ہندو رہتے ہیں۔ بڑے اطمینان کے ساتھ وہ ہجوم کے ساتھ ایک بڑے مندر میں گھس گیا۔ کسی نے دیوی کو پرنام نہ کیا تھا۔

جمال نے بھی نہ کیا اور وہ نچنت ہو کر کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ اس کو مزہ آنے لگا۔

پھر اسے شیواجی پارک کا واقعہ یاد آ گیا۔

وہ اور مفتی خواجہ احمد عباس کے گھر جا رہے تھے کہ اچانک ایک گروہ نے انہیں روک لیا۔

''نام کیا ہے؟'' کسی نے پوچھا۔

جمال کے حواس قائم رہے مگر مفتی کا رنگ زرد ہو گیا۔ جمال نے کہا ''میرا نام ہے ڈیوڈ کاکروچ۔''

کاکروچ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ بمبئی میں دیکھے تھے اور اس وقت اسے کوئی اور نام نہ سوجھا۔

مفتی نے کہا ''میرا نام ہے مائیکل مامفتی۔ بات کیا ہے جناب؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ بولے۔ ''ہمارے علاقے میں چینی کا کوئی ڈپو نہیں۔ درخواست پر لوگوں کے دستخط کروا رہے ہیں۔''

مگر کالبادیوی کے مندر کے صحن میں کسی نے جمال کا نام نہ پوچھا۔ اسے ہندوؤں کی حماقت پر بڑی ہنسی آئی جس کو وہ مارنا چاہتے تھے، وہ ان کی دیوی کی گود میں بیٹھا اس کا استھان بھرشٹ کر رہا تھا۔

دو گھنٹے میں مارا ماری ختم ہوگئی۔ پولیس سیٹیاں بجانے لگی کہ سب ٹھیک ہے۔

## وہی ارونا گھوش

شام ہونے والی تھی جب وہ مندر سے نکلا۔ اس نے بمبئی سنٹرل کے سٹیشن سے اندھیری کے لیے گاڑی پکڑی تو پائیدان پر کھڑی ڈنڈے سے لٹکی ہوئی اسے ارونا گھوش نظر آ گئی۔

ارونا گھوش کو جمال جالندھر سے نکل کر بھول چکا تھا مگر وہ اس کی لمبی لٹکتی ہوئی چوٹی سے اسے پہچان گیا۔ اگرچہ ارونا گھوش کا چہرہ دوسری طرف تھا۔

جمال نے اروناکی گردن میں ہاتھ ڈال دیا۔اس نے مڑ کر دیکھا تو خوشی سے چیخنے لگی۔''ارے تم کدھر آ گیا جمال...... کدھر جائیں گا۔''

جمال نے بے تکلفی سے اسے ساتھ چمٹا لیا۔ارونا بولی''صبر کرو۔ابھی گاڑی چھوٹتا ہے۔میرا ساتھ لٹک جاؤ۔ڈنڈا پکڑلو۔''

جمال نے پائیدان پر پاؤں رکھ لیے جس پر مچھلی بیچ کر واپس گھروں کو جانے والی گھاٹنیں اپنے خالی ٹوکرے لیے کھڑی تھیں۔بمبئی کی لوکل ٹرین بجلی سے چلتی ہے اور چھوٹتے ہی منہ زور ہو جاتی ہے۔

گاڑی چلی تو جمال کو خیال آیا کہ میرا جی پتہ نہیں کس حال میں اور کہاں ہوگا۔

راستے میں جمال اور ارونا ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر مسکراتے رہے۔

ارونا نے جمال کو اندھیری سٹیشن پر اترنے نہ دیا اور کہا''آ ز میری کھولی دیکھ لو۔'' دو چار سٹیشن اور نکل گئے تو گورے گاؤں پر دونوں اتر گئے۔فلمستان سٹوڈیو یہاں سے کچھ دور تھا۔جمال سمجھ گیا کہ ارونا ان دنوں اسی میں کام کرتی ہوگی۔

ارونا کے چہرے پر ابھی تک ویسا چلبلا پن تھا۔

پیدل چلتے ہوئے دونوں نے کوئی بات نہ کی۔تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک پرانی بلڈنگ کے سامنے پہنچ گئے۔

بلڈنگ میں بے شمار کھولیاں تھیں۔کھولیاں یعنی چھوٹے چھوٹے کمرے، جن میں اکیلے دکیلے پردیسی اور بعض میں پورے پورے خاندان آباد تھے۔غسلخانہ سب کا مشترکہ اور حبس اور اندھیرا بھی سب کے لیے ایک جیسا، گہرا اور تہ دار۔

لکڑی کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ارونا نے جمال کا ہاتھ پکڑ لیا۔اس کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔

اس کی کھولی اداس اور گندی تھی۔ایک کونے میں مٹی کے تیل کا سٹوو اور کچھ برتن، ایک گھٹیا سا آئینہ اور میک اپ کا کچھ سامان ایک ٹین کے صندوق پر رکھے تھے۔ایک ڈھیلی سی چارپائی جس پر چادر بچھی ہوئی تھی دوسری طرف رکھی تھی۔ارونا نے جمال کو اس پر بٹھا دیا۔خود اس کے سامنے زمین پر چوکڑی مار کر بیٹھ گئی۔

جمال سمجھ گیا کہ ارونا کے حالات اچھے نہیں ہیں مگر اس نے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی۔

ارونا کچھ دیر اسے گھورتی رہی پھر اچانک ہنسنے لگی۔جمال بھی مسکرانے لگا۔جمال نے کہا''اچھا ارونا تم اپنے حالات سناؤ۔''

''ہمارے حالات کچھ نہیں جمال۔''ارونا بولی۔''ہم تو خالی پیلی رنڈی ہے۔تم بولو جالندھر سے نکل کر تم نے کیا کیا اور اب ادھر کاہے واسطے آیا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو ارونا؟''جمال نے پریشان ہو کر کہا۔

''ہاں سچ، ہم رنڈی ہے مگر آز ہم دھندا نہیں کرے گا۔آز تمہارے ساتھ بات کرے گا۔کیا تم کو برا لگا ہم رنڈی ہے؟''

''دکھ ہوا۔''جمال نے کہا''مگر تم اتنی اچھی ڈانسر ہو۔کیا تمہیں کام نہیں ملتا؟''

''ملتا کبھی کبھی۔پر روٹی تو روز کھاتا۔روز کیسے گزریں گا۔ادھر بمبئی میں موکلی بھات بہت مسکل ہے۔مرد لوگ کا حال بھی بہت کھراب ہے یہاں۔پر تم ادھر کیا کرتا جمال؟''

''وہ تمہارا کالی ناتھ بینرجی کدھر گیا؟''جمال نے پوچھا۔

''وہ سالا ہم سے سادی نہیں کیا۔''ارونا بولی۔''کولکتے چلا گیا۔''

''تم کلکتے کیوں نہیں گئیں؟''

''کولکتے میں دال بھات نہیں ملتا۔ابھی کال پڑا ہے وہاں۔ادھر رنڈی کو پیسہ بھی کم ملتا۔پانچ روپے میں ایک گاہک کو لایا تو کھولی کا کرایہ، روٹی، کپڑا اور خرچہ نہیں دے سکتا۔ہم سنا تھا بمبئی میں ڈانسر کو بہت پیسہ ملتا پر نہیں ملتا۔کیا کریں گا۔ہم عورت ہے، شادی بنا کر بھی مرد کے ساتھ سوتا تو کھانا ملتا، عورت لوگ کا قسمت!''

''بہت افسوس ہے ارونا۔''جمال نے کہا۔

''کوئی افسوس نہیں۔''ارونا بولی۔''عورت لوگ کیا کریں گا۔عورت لوگ اسی واسطے بنا ہے۔''

''تم اس واسطے نہیں بنا ارونا۔''جمال نے کہا''تم بڑی اچھی لڑکی ہو۔''

''کوئی مانے جب نا......ہم کو بینرجی سادی بناتا تو ہم اچھی لڑکی بن جاتا۔وہ ہم سے مفت مزہ کیا اور بھاگ گیا۔روٹی کدھر سے کھائے گا۔تم بولو۔تم ہم کو اچھی لڑکی سمجھتا نا؟''

جمال کو اس بات کا جواب نہ سوجھا۔

ارونا بولی''پھر ہم سے سادی کیوں نہیں بناتا۔اچھا چھوڑو اب اپنا سناؤ۔پھلم میں کام کرتا؟''

''نہیں ارونا۔''جمال نے کہا۔

''تم پھلم میں کام کرو۔تم بہت سندر آدمی ہے۔کام ملے گا، پیسہ بھی ملے گا۔''

''تم بھی تو سندر عورت ہو۔''جمال نے کہا۔

ارونا بولی''ہم اتنا سندر نہیں۔ہم تو اردو بھی نہیں بول سکتا۔ہمارا پاس اچھا کپڑا بھی نہیں۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔پھر جمال نے کہا''مگر یہ بھی تو سوچو ارونا کہ آگے کیا کرو گی؟''

''ہم سوچا۔بہت سوچا جمال۔دو چار برس اسی طرح گزرے گا، پھر ہم بیمار ہو جائے گا۔پھر ہم مر جائے گا۔''

یہ کہہ کر ارونا ہنسنے لگی۔اس کے قہقہوں میں بے انتہا کرب تھا۔

''ایسانہ کہو ارونا۔'' جمال نے کہا۔

ارونا یکدم سنجیدہ ہو کر بولی۔ ''مر جائے گا تو اچھا ہوگا۔ ہم پیٹ کے لیے روز روز گندے، شرابی مردوں کے ساتھ سونا نہیں چاہتا۔ وہ ہمارے جسم کو مروڑتا...... مر جائے گا تو جان چھوٹے گا۔ ہم کس لیے جئے گا۔ بیماری سے ڈر لگتا۔ بہت ڈر لگتا۔ پر کیا کریں گا......''

جمال بہت اداس ہوگیا۔ وہ ارونا کو ملنے اور اس کے ساتھ چلے آنے پر سخت پشیمان ہوا۔

ارونا بولی ''جمال ہم تمہارے واسطے روٹی بنائے گا تم ہمارا روٹی کھائے گا نا؟''

جمال فوراً وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر ارونا کی خاطر اس نے کہا ''ضرور کھاؤں گا، کیا کھلاؤ گی؟''

''ہم تمہارے واسطے موسلی لائے گا آلو بھی ہے۔ تم تھوڑا دیر چارپائی پر لیٹو۔''

وہ جانے لگی تو جمال نے کہا ''ارونا پیسے مجھ سے لے جاؤ۔''

ارونا بولی ''پیسہ ہمارے پاس ہے۔ پیسہ کا واسطے تو ہم رنڈی کا دھندا کرتا۔ دارو بھی پیئے گا تم؟''

''نہیں ارونا۔''

''تاڑی بھی ملتا ہے اُدھر۔ پر تم تاڑی کاہے واسطے پیئے گا۔ تاڑی گریب لوگ پیتا۔ تمہارے پنجاب میں گریب آدمی نہیں ہوتا۔''

ارونا سیڑھیاں اتر گئی مگر جاتے ہوئے باہر سے دروازہ بند کر گئی۔ وہ جمال کے اچانک بھاگ جانے کا خطرہ مول لینا نہ چاہتی تھی۔

جمال سگریٹ پینے لگا۔ کھولی میں ایک چھوٹا سا بلب روشن تھا۔ اس سے اندھیرے کا احساس گہرا ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ دروازے کے باہر بے شمار بچے شور مچا رہے تھے۔

## مچھلی کا ڈنر

تھوڑی دیر کے بعد ارونا مچھلی کا ایک ٹکڑا لے آئی۔ اس نے ساڑھی کے پلو سے سر ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ ایک معصوم اور گھریلو عورت لگتی تھی۔

اس نے مچھلی کو کوٹا۔ ٹکڑوں پر نمک مرچ چھڑکا اور تلنے لگی۔ مونگ پھلی کے تیل کی سڑاند اور کڑوے دھوئیں سے کمرہ بھر گیا۔ جمال کا دم گھٹنے لگا مگر وہ مسکراتا رہا۔ ارونا بھی بیچ بیچ میں اس کی طرف دیکھتی اور مسکراتی رہی مگر کسی قدر حجاب بھی اس کی آنکھوں میں تھا۔

مچھلی تل کر اس نے ایک ٹین کی ٹرے میں رکھی۔ روٹی وہ بازار سے خرید لائی تھی۔ ایک کونے میں پانی کا گلاس رکھ کر وہ اس کے پاس آ کر بیٹھی اور پلو سے پنکھا جھلنے لگی۔ بولی ''تم کھاؤ جمال۔''

جمال نے کہا ''تم بھی تو کھاؤ۔''

''ہم پیچھے کھائے گا۔ عورت لوگ مرد کے پیچھے کھاتا ہے۔ بانگلہ میں ایسا رواج ہے۔''

''مگر یہ بنگال نہیں۔'' جمال نے کہا ''بمبئی ہے۔''

''ہمارا کھولی بانگلہ ہے۔'' ارونا بولی۔ ''بمبئی ادھر ہے۔ باہر..... تم کھاؤ۔''

لقمے جمال کے حلق سے نیچے اترتے نہ تھے۔

ارونا نے پھر پوچھا ''جمال تم ادھر بمبئی میں کیا کرتا، کدھر رہتا۔''

''میں چار بنگلہ میں رہتا ہوں۔ اندھیری سے آگے۔''

''پر تم کام کیا کرتا؟ کھاتا کدھر سے ہے؟''

''میں ادھر کچھ بھی نہیں کرتا۔ آوارہ پھرتا ہوں۔''

ارونا کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی ''سچ بولو، کیا تم ادھر کسی سیٹھ عورت کا رکھیل تو نہیں ہے؟ ادھر اس کا بہت رواج ہے۔''

''نہیں ارونا۔ مجھے کوئی سیٹھ عورت کیوں رکھے گی؟''

''ارے بابا تم بہت سندر آدمی ہے۔'' ارونا بولی ''تم کسی سیٹھ عورت کا رکھیل بن جاؤ۔ بڑا پیسہ ملتا۔ گریب آدمی اور کیا کر سکیں گا بمبئی میں؟''

''نہیں ارونا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''ہم امیر ہوتا تو تم کو ضرور رکھ لیتا اور پیسہ بھی بہت دیتا......''

''مگر مجھے پیسہ نہیں چاہیے ارونا۔''

ارونا بولی ''تم امیر لوگ ہے اِدھر پنجاب میں۔ ہم کو تو مزبوری ہے بنگلہ میں۔''

کھانا کھاتے کھاتے دیر ہوگئی۔ جمال نے کہا ''اچھا ارونا اب مجھے اجازت دو، پھر کبھی آؤں گا۔''

''مگر ابھی تم کیسے جائیں گا جمال۔ گاڑی کا وقت تو کھلاس ہوگیا۔ پھلستان سے ٹیکسی ملتا ہے پر وہ ادھر سے چار مائل ہے اور بھاڑا بہت لگتا ہے۔''

جمال کی جیب میں تھوڑے سے پیسے تو تھے مگر چار میل کا پیدل سفر کوئی دلکش بات نہ تھی۔ وہ سوچنے لگا۔

ارونا بولی ''تم آج رات ادھر رہ جاؤ۔ ہم تمہارے پاس زمین پر سو جائے گا۔''

''نہیں ارونا۔'' جمال نے کہا۔ ''یہ اچھی بات نہیں، لوگ کیا کہیں گے......''

''ارے لوگ کیا کہیں گے۔'' ارونا بولی۔ ''ادھر تو روز کوئی نہ کوئی سوتا ہے۔ دھندا ہے بابا۔ کوئی کیا بولے گا۔''

''مگر ارونا میں دھندے کے لیے تو نہیں آیا۔''

''ہم کب بولا۔ تم ادھر کھاٹ پر سو جاؤ۔ صبح اٹھ کر چلے جانا۔''

''نہیں ارونا۔ میں پھر آؤں گا کبھی۔''

''جانے نہیں سکتا بابا، ہم بول دیا۔ اور ہم نہیں چاہتا کہ اِدھر تم دوبارہ آؤ۔ تم اچھا آدمی ہے رنڈی کے پاس نہیں آنا پھر...... ہاں؟''

''تم رنڈی نہیں ہو ارونا۔ تم بڑی اچھی لڑکی ہو۔''

''سب یہی کہتا۔'' ارونا بولی۔ ''پر من میں کوئی نہیں بٹھاتا۔''

''میں تمہیں من میں بٹھاتا ہوں۔'' جمال نے کہا۔

''تم ہمیں من میں بٹھاتا ہے تو ہم مانتا ہے۔ چلو لیٹ جاؤ پھر......''

جمال مجبور ہو کر لیٹ گیا۔ ارونا نے بلب بجھا دیا اور اندھیرے میں کپڑے اتارنے لگی۔ اس کے کپڑوں کی سرسراہٹ کو جمال اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ کپڑے اتارتے ہوئے ارونا بولی ''سو نہیں جانا۔ ہم آتا ہے تمہارے پاس۔''

''میرے پاس؟'' جمال نے حیران ہو کر کہا۔

''ہم آج تمہارے ساتھ سوئے گا جمال۔'' ارونا بولی ''تم ہم کو من میں بٹھاتا ہے اس لیے...... جالندھر میں بھی ہم تمہارا ساتھ سونا چاہتا تھا۔''

''جالندھر کی اور بات تھی۔'' جمال نے کہا۔

ارونا بولی ''جالندھر میں ہم تمہارا ساتھ سونا چاہتا تھا مگر ادھر شالا بینرجی تھا۔''

یہ کہہ کر وہ جمال کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ بالکل برہنہ تھی۔ جمال اٹھ کر بیٹھ گیا۔

ارونا بولی ''ہم کو مرد کے ساتھ سونے سے گھن آتی ہے۔ پر آج ہم تمہارا ساتھ ضرور سوئے گا۔ تم بہت اچھا آدمی ہے۔ تم ہماری عزت کیا۔ ہم کو من میں بٹھایا۔ آج ہم تمہارے ساتھ مزہ کریں گا۔ ہم کبھی مزہ نہیں کیا......''

ارونا جمال سے لپٹ گئی۔ وہ اندر سے کمزور ہو چکا تھا مگر پیچھے ہٹا تو وہ بولی ''ہم بیمار نہیں جمال۔ ہمارا شریر بالکل ٹھیک ہے ابھی تک۔ تم ہم کو گالی دو، پر آج ہم تمہارے ساتھ ضرور سوئے گا۔''

ارونا نے جمال کے بٹن کھولے تو اس نے اس کا ہاتھ نہ پکڑا۔ وہ بولی ''ہم اس کام کا شوق نہیں جمال۔ پر تم جیسا آدمی ہم کو کدھر ملتا۔ تمہارا ساتھ سوئیں گا تو ہم بھی اچھا ہو جائیں گا...... پر ہم بہت گندہ ہے جمال۔ تمہارے لائق نہیں۔''

جمال کا دل چاہا کہ ارونا اسی طرح اس کے ساتھ چمٹی اور ہانپتی رہے۔

صبح اٹھ کر اس نے ارونا سے رخصت لی تو دو آنسو اس کی آنکھ سے ٹپکے جو اس نے اپنی ساڑھی میں جذب کر لیے۔ پھر بولی ''جمال خوش رہو۔ اِدھر پھر کبھی نہ آنا۔ ہم کو تم بہت یاد آئے گا۔''

## میراجی غصے میں

کوور لاج میں میراجی غصے سے بھرا بیٹھا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ کالبا دیوی کے ہنگامے میں گم ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ میراجی کا ریل کا ٹکٹ بھی جمال کی جیب میں رہ گیا تھا اور اسے بغیر ٹکٹ کے سفر کر کے گھر پہنچنا پڑ گیا۔

جمال کو اس بات پر حیرت تھی کہ میراجی جیسا درویش جس نے اپنی شناخت گم کر دینے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا تھا' موت سے اس قدر ڈرتا ہے کہ اس کی چھٹی حس خطرے کی قبل از وقت نشاندہی کر دیتی ہے!

## کمیونسٹ پارٹی

کبھی کبھی جمال میراجی کے ساتھ نہیں بھی گھومتا تھا تب وہ سینڈ ہرسٹ روڈ پر کمیونسٹ پارٹی کے دفتر چلا جاتا جہاں ترقی پسند ادیب اور پارٹی کے کارکن کام کرتے اور گپ مارتے تھے۔ جمال کی وہاں کوئی حیثیت نہ تھی مگر جمال کو اس کی کوئی پرواہ نہ تھی۔

اس روز پارٹی ہیڈ کوارٹر کا دروازہ اندر سے بند تھا مگر اس کی دستک سن کر ایک کارکن نے کہا ''جلدی سے اندر آ جاؤ جمال۔''

ہیڈ کوارٹرز میں آنے والے پنجابیوں اور یو پی کے لوگوں کو ترقی پسند ادیب سمجھا جاتا تھا۔ زیادہ تر ان میں کمیونسٹ پارٹی کے آدمی ہوتے تھے یا انڈین پیپلز تھیٹر کے کارکن اور ایکٹر۔

## بلوہ

اس روز سب کے چہروں پر خشونت چھائی ہوئی تھی۔ ان میں بعض مل مزدور بھی تھے جو بڑی بے چینی سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ پی سی جوشی جنرل سیکریٹری میلی سی نیکر پہنے داڑھی بڑھائے کارکنوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ دوسری منزل پر کھڑکیوں کے سامنے اینٹوں کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر پڑے تھے۔

جمال ایک کونے میں ٹک گیا۔

تھوڑی دیر میں بات کھل گئی۔ کانگرس کا ایک جلوس کمیونسٹ پارٹی کے دفتر پر حملے کے لیے آ رہا تھا۔

کانگرس اور کمیونسٹ پارٹی کے تعلقات ایک مدت سے کشیدہ چلے آ رہے تھے۔ جب روس نے عالمی جنگ کو پیپلز وار کہہ دیا اور کمیونسٹ جو اس سے پہلے اس جنگ کو بین الاقوامی سرمایہ داروں کی باہمی جنگ کہتے تھے، انگریزوں کے اتحادی ہو گئے۔ اس پر کانگرس جو انگریزوں سے جنگ کی حمایت کے بدلے یکطرفہ انتقالِ اقتدار طلب کرتی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی کی دشمن ہو گئی۔ مہاتما جی کو امید تھی کہ جنگ میں انگریزوں کو شکست ہو گی اس لیے بھی وہ ان سے تعاون کرنے پر آمادہ نہ تھے اور جنگ کے پورے زمانے میں کانگرس کے بڑے لیڈر نظر بند رہے۔

کمیونسٹ پارٹی مہاتما جی کو رجعت پسند اور سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا ساتھی سمجھتی تھی' تو مہاتما جی اور ان کے کانگرسی ساتھی کمیونسٹ پارٹی کو انگریزوں کا دلال اور ہندوستان کی ایکتا کا دشمن کہتے تھے۔ جرم اور بھی سنگین ہو گیا جب کمیونسٹ پارٹی نے حقِ خود اختیاری کے اصول پر ہندوستان کے اٹھارہ علاقوں کی خود اختیاری کی حمایت کر دی اور ان میں پاکستان بھی شامل تھا۔ کمیونسٹ کانگرس پارٹی سے الگ ہو چکے تھے اور

دونوں میں ٹھنی ہوئی تھی۔

مسلمان نشے میں تھے اور ہندو سمجھتے تھے کہ ہندو مسلم فسادات کے پیچھے انگریزوں کا ہاتھ ہے اور جناح انگریزوں کا ایجنٹ ہے۔

کیمونسٹ پارٹی کو پنجاب اور بنگال کے معروضی حالات کا کچھ علم نہ تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ قتل عام انگریزوں کا نہیں بلکہ کانگریس کے دائیں بازو کے سرمایہ داروں، جاگیرداروں، جن سنگھیوں اور اکالیوں کا منصوبہ ہے۔

سکھ ایک خودمختار صوبے کے طلب گار تھے۔ کانگرس کے بڑے لیڈروں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اگر مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کو نکال سکو تو تمہیں صوبہ مل سکتا ہے۔ اسی خیال سے ماسٹر تارا سنگھ نے لاہور کی صوبائی اسمبلی کے سامنے تلوار نکال کر اپنے کارکنوں اور مشرقی پنجاب کی ریاستی فوجوں اور پولیس والوں کو مسلمانوں کے قتل عام کا اشارہ کیا تھا۔

انگریز بے خبر نہ تھے مگر انہوں نے قتلِ عام کو روکنے کی کوئی کوشش نہ کی کیونکہ قانونی طور پر ہندوستان کے داخلی نظم ونسق کی ذمہ داری ہندوستان کی عبوری حکومت پر تھی۔ انگریز پاکستان کے خلاف تھے مگر وہ تیل کی دھار دیکھتے تھے۔ ویسے انہیں غریب ہندوؤں اور سکھوں سے بھی کوئی ہمدردی نہ تھی کہ مرتے ہیں تو مریں۔

## کیمونسٹوں کی بوکھلاہٹ

کیمونسٹ پارٹی بوکھلا گئی تھی۔ ہندوستان کی سیاست میں عملی طور اس کا کوئی کردار رہا نہ تھا۔ انگریزوں کی غیر مشروط حمایت کے نتیجے میں اس نے اپنا سب کچھ گنوا دیا تھا۔ پارٹی کے کارکن پنڈت نہرو پر جان چھڑکتے تھے مگر پنڈت جی کسی کیمونسٹ سے بات کرنے کے روادار نہ تھے۔ اُدھر روسی کہتے تھے کہ دنیا دو متحارب محاذوں میں بٹ چکی ہے۔ پنڈت نہرو کی حکومت اینگلو امریکی سامراج کی طرف جھک رہی ہے اور ہندوستان کے سرمایہ دار سامراج کے گماشتے پنڈت جی جن کے اشاروں پر چل رہے ہیں، چنانچہ ہندوستان کے مزدوروں، کسانوں اور دانشوروں کو چاہیے کہ وہ ہندوستان کی سرمایہ دارانہ قیادت سے ہندوستان کی غریب اور محنت کش آبادی کو آزاد کرائیں۔ ان حالات میں کیمونسٹ پارٹی ایک زبردست فکری تضاد کا شکار تھی۔

کانگرس کی کیمونسٹ دشمنی کی بہت سی وجوہات تھیں۔ ایک تو یہی کہ اس نے مہاتما جی کی ہندوستان چھوڑ دو تحریک کی مخالفت کی تھی۔ پھر اس نے سبھاش چندر بوس کی انڈین نیشنل آرمی کو وطن دشمن قرار دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ مسلمانوں کے لیے دوستانہ جذبات رکھتی تھی مگر اب اس کے اپنے بھی اس کے اپنے نہ رہے تھے۔ مزدور اس سے برہم تھے کیونکہ جنگ کے زمانے میں کیمونسٹ پارٹی نے مزدوروں کو ہڑتال کرنے سے روک دیا تھا۔ رہے کسان تو ان کی نہ پوچھیے۔

بمبئی میں تلنگانہ کی کسان تحریک کا بڑا چرچا تھا۔ ترقی پسند مصنفین اور شعرا ان کی سرفروشی کے ترانے گاتے نہ تھکتے تھے۔

جنگ چھڑی تو کیمونسٹ پارٹی نے قرارداد پاس کی کہ یہ موقع ہندوستانی انقلاب کے لیے ایسا ہے کہ کھویا نہیں جا سکتا۔ بین الاقوامی سرمایہ داری اپنے انتہائی بحران میں گرفتار ہے۔ اس لیے ہندوستان کے مزدوروں، کسانوں، طالب علموں اور دانشوروں کو چاہیے کہ وہ اس جنگ کو انقلابی جنگ میں بدل دیں اور دفتروں، تھانوں اور فوجی اڈوں پر حملے کر کے انگریزوں کے نوآبادیاتی نظام کو تباہ کر دیں۔

مگر ابھی ہٹلر نے روس پر حملہ نہیں کیا تھا۔

جب ہٹلر نے روس پر حملہ کر دیا تو کیمونسٹ پارٹی نے انقلابی جنگ کا نعرہ تہہ کر کے طاق پر رکھ دیا اور کہا "یہ جنگ سامراجی نہیں بلکہ عوامی جنگ ہے اور فتح کے بعد ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ ادھر سے ہم دباؤ ڈالیں گے تو ادھر سے روس انگریزوں کو مجبور کرے گا کہ وہ ہماری جان چھوڑ دے، پھر ہم انقلاب کی جدوجہد کریں گے۔"

اس تجزیے کو ایک مدت تک بعض کیمونسٹ کمیٹیوں نے بھی تسلیم نہ کیا تھا اور ان میں ایک آندھرا کی کیمونسٹ کمیٹی بھی تھی۔

## تلنگانہ کی تحریک

تلنگانہ حیدرآباد کے آٹھ مشرقی اضلاع پر مشتمل ایک علاقہ ہے جس میں زیادہ تر تیلگو بولنے والے بے زمین کسان رہتے تھے۔ زمین ساری کی ساری حیدرآبادی جاگیرداروں کی ملکیت تھی جو کسانوں سے غلاموں کا سا سلوک کرتے تھے۔ تنگ آ کر انہوں نے کیمونسٹ پارٹی آف آندھرا کی قیادت میں علم بغاوت بلند کر دیا اور نالگنڈہ اور وارنگل کے ضلعے مسلح جدوجہد کا مرکز بن گئے تھے۔

نظام کی حکومت نے ان پر بے انتہا جبر کیا مگر اس کی پولیس کسانوں کی بغاوت کو نہ دبا سکی۔ انہوں نے مسلح بریگیڈ بنا کر ریاستی پولیس کا مقابلہ شروع کر دیا اور گاؤں گاؤں آگ لگ گئی۔

کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کسانوں کی جدوجہد کی حامی تھی مگر اسے ان کا راست اقدام گوارا نہ ہوا۔ وہ صرف اتنا چاہتی تھی کہ بیگار اور ناجائز استحصال کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ وہ نظام کو ناراض کرنا بھی نہ چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے مسلح جدوجہد روک دی اور کہا کہ تلنگانہ کے کسان پرامن جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں۔

ادھر بنگال میں کسانوں نے لگان اور بٹائی ادا نہ کرنے کی تحریک چلا رکھی تھی مگر عوامی جنگ کے نعرے کے بعد کیمونسٹ پارٹی نے انہیں بھی بٹھا دیا تھا۔ وہ ہندوستان کی برطانوی حکومت کو کوئی تکلیف دینا نہ چاہتی تھی اور یہی روسی مفاد کا تقاضا تھا۔

روسی مفاد میں کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا نے اپنا دامن جھاڑ دیا تھا۔ اس کی پچیس سالہ قربانیاں خاک میں مل گئیں۔ ہندوستانی سیاست کے میدان سے اس کے قدم ہمیشہ کے لیے اکھڑ گئے۔ اس نے عالمی اشتراکی تحریک کو بلکہ روس کو بچانے میں اپنا وجود کھو دیا اور اب ہندوستان میں اس کو کوئی پوچھتا نہ تھا۔ فلسفہ یہ تھا

کہ اگر روس سلامت ہے تو عالمی طبقاتی اور اشترا کی انقلاب سلامت ہے اور یہی فلسفہ کمیونسٹ انقلاب کو لے ڈوبا۔ اتنی سی بات پارٹی کا کوئی فلسفی اور مفکر نہ سمجھا کہ اشترا کی انقلاب سو فیصد مقامی لوگوں کی ذمہ داری ہے۔ روس رہے یا نہ رہے۔

### پر یہ تماشا نہ ہوا

کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں اینٹ، پتھر اور ٹوٹی ہوئی بوتلوں کے ڈھیر میں سے ایک ٹوٹی ہوئی بوتل جمال نے بھی پکڑ لی۔ اسے پتہ تھا کہ میرا نشانہ اچھا نہیں مگر ایسے ہنگامے اسے خدا دے۔ وہ بڑی بے چینی سے کانگرسی حملہ آوروں کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر میں سینڈ ہرسٹ روڈ کے اس سرے کی طرف جدھر پرتھوی راج کا تھیٹر تھا ''مہاتما گاندھی کی جے'' کے نعرے سنائی دینے لگے۔ بیچ بیچ میں ''ایک رہے گا ہندوستان'' ''بھارت ماتا کی جے'' اور ''نیتا جی سبھاش چندر بوس کی جے'' کا شور بھی اٹھتا تھا۔ جمال کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ جوش میں اس کے کانوں کی لوئیں جلنے لگیں۔

کھڑکیاں کھلی تھیں۔ جن میں سے کمیونسٹ کارکن جلوس کو دیکھ رہے تھے۔ پارٹی نے واضح ہدایات دے رکھی تھیں کہ اگر کوئی کامریڈ روتا پیٹتا اور زخمی واپس آیا یا اس نے مقابلے میں پیٹھ دکھائی تو اسے پارٹی سے نکال دیا جائے گا۔ ہاں انفرادی سطح پر کسی کو کسی پر حملہ کرنے کی اجازت نہ تھی۔

مگر تھوڑی دیر میں شور گم ہو گیا۔ جلوس پارٹی دفتر کے سامنے سے گزر گیا۔ غالباً اس کا ارادہ حملہ کرنے کا نہ تھا۔ اس سے جمال کو بڑی مایوسی ہوئی۔ جب وہ پارٹی ہیڈ کوارٹر سے نکلا تو شیشے کی ٹوٹی ہوئی بوتل بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔

## باب 11

پہلے شمارے کے مسودے تو کب کے جمع ہو چکے تھے مگر آوارہ گردی کے شوق میں جمال نے دوسرا شمارہ بھی تیار کر لیا۔ ادیبوں سے اس کی دوستی ہو چکی تھی جو اس کی لاپرواہی، بے فکری اور شوخ گفتگو سے متاثر تھے۔

جمال کے پاس پیسے ختم ہو رہے تھے مگر فکرمندی اس کی فطرت میں نہ تھی۔ اس لیے وہ خوش باش رہا۔ مفتی کو پتہ تھا کہ جمال خالی ہاتھ ہے۔ اس نے لکھا کہ آزادی قریب ہے۔ پرچہ 15 اگست ہی کو شائع ہونا چاہیے۔ اس لیے تم واپس آ جاؤ۔ پرچہ چھاپ کر واپس چلے جانا۔

دراصل کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ 15 اگست کے کیا معنی ہیں۔ کوئی اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ پھر پاکستان اور ہندوستان دو دشمن ملک بن جائیں گے۔ آگ اور خون کے دریا تنکا تنکا بہا لے جائیں گے جس میں ہندو اور مسلمان کی تمیز باقی نہ رہے گی۔

راجکماری ملہوترہ تو بالکل ہی بے خبر تھی۔

### راجکماری ملہوترہ

اٹھارہ برس کی راجکماری ملہوترہ دبلی پتلی زرد روشرمیلی دیکھنے میں چودہ برس کی لگتی تھی۔ لگتا تھا کم خوراکی کی وجہ سے اس کا بدن تعمیر ہونے سے رہ گیا ہے۔ وہ چار بنگلہ ہی کے ایک گھر میں رہتی تھی۔ وہ سفید ساڑھی پہنتی۔ سیدھی مانگ نکالتی اور سرخی پاؤڈر سے بے نیاز، چپل پہنے دن بھر اکیلی گھومتی یا اپنی کھڑکی میں کھڑی سمندر کی طرف دیکھتی رہتی۔

اس کی کھڑکی جمال کی کھڑکی کے سامنے تھی۔ مگر جمال نے اسے بے رنگ جان کر کبھی اس کی طرف توجہ نہ کی تھی۔

جمال کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ لاہور کی رہنے والی ہے۔ اس کے پتا بمبئی میں فلم ڈائریکٹر ہیں جن کو آج کل کام نہیں مل رہا اور وہ دن بھر پروڈیوسروں، ایکٹروں اور سٹوڈیو والوں کے پیچھے پھرتے ہیں۔

فرصت سے تنگ آ کر جمال نے بھی ریت پر ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔ کوور لاج میں دن بھر کوئی مرد نہ ہوتا تھا۔ کرشن چندر کی خاموش بیوی رسوئی سے باہر جھانک کر بھی نہ دیکھتی تھی اور جمال کا ساتھی میراجی اچانک

پونا چلا گیا تھا۔

راجکماری آ کر ریت پر بیٹھ گئی جمال کے قریب۔

''آپ کہاں کی ہیں؟'' جمال نے دبی زبان سے پوچھا تاکہ اگر وہ چاہے تو سنی ان سنی کر سکے۔

آہستگی سے وہ بولی ''جی ہم لاہور سے آئے ہیں۔ گوالمنڈی میں گھر ہے ہمارا۔ آپ کہاں کے ہیں جی؟''

''میں بھی لاہوری ہوں۔''

''یہاں کیا کرتے ہیں؟''

''کچھ بھی نہیں کرتا۔ آوارہ پھرتا ہوں۔''

''میں بھی کچھ نہیں کرتی جی۔'' پھر وہ ہولے سے ہنسی۔

''سینئر کیمبرج کر کے گھر میں بیٹھی ہوں۔ پتا جی نوکری نہیں کرنے دیتے مجھے' مگر کیا آپ واقعی کچھ نہیں کرتے؟''

''میں ایک فلمی رسالہ نکالتا ہوں جو ابھی نکلا نہیں۔''

''مجھے پتہ ہے کہ کوور لاج میں صرف رائٹر رہتے ہیں۔ مجھے بڑے اچھے لگتے ہیں رائٹر۔ اپنے خیالوں میں مگن!''

''جی ہاں۔ اپنے خیالوں میں مگن، مگر ہم ہر حال میں خوش نہیں ہوتے۔ لوگوں کا درد بہت ستاتا ہے ہمیں اور ظلم، غریبی۔ کیا نام ہے آپ کا؟''

''راجکماری ملہوترہ۔'' اس نے شرما کر جواب دیا۔ ''اور آپ کا شبھ نام؟''

''جی میرا نام جمال ہے۔''

''مسلمان ہیں آپ؟''

پھر اس نے آہ بھری اور کہا ''آج کل تو بڑے فسادات ہو رہے ہیں لاہور میں۔ پتہ نہیں لوگ ایک دوسرے کو قتل کیسے کر دیتے ہیں؟''

تھوڑی دیر خاموش رہی۔ پھر جمال نے کہا ''میں روز دیکھتا تھا آپ کو۔''

''میں بھی۔'' اس کے منہ سے نکل گیا۔ پھر اس نے شرما کر ساڑھی کا پلو منہ پر رکھ لیا اور اٹھ کر بھاگ گئی۔

اس کے بعد راجکماری ملہوترہ کا انتظار جمال کا معمول بن گیا اور وہ بھی کام دھندے سے فارغ ہو کر ریت پر آ بیٹھتی۔ پھر دونوں اِدھر اُدھر کی فضول باتیں کرتے۔ آس پاس کوئی دیکھنے والا نہ ہوتا اور یہ بھی ایک لذت کی بات تھی۔

دونوں نے براہ راست چاہت کی کبھی کوئی بات نہ کی۔ مگر جمال جانتا تھا کہ راجکماری میرے ساتھ باتیں کر کے خوش ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ اتنی قریب کبھی نہ آئی کہ جمال اس کو چھو سکے۔

وہ چیکو کاٹ کر چھری سے بیج نکالتی اور قاشیں چٹکی میں پکڑ کر اس کو دے دیتی مگر احتیاط کے ساتھ کہ دونوں کے ہاتھ چھو نہ جائیں۔

ایک دن اس نے کہا ''ماتا جی کو شک پڑ گیا ہے۔''

''کس بات کا؟'' جمال نے بھولپن سے پوچھا۔

''میں آپ کے پاس آتی جو ہوں۔''

''میں بھی تو آتا ہوں آپ کے پاس!''

''میں نے ماتا جی سے کہہ دیا۔ سب مسلمان خراب نہیں ہوتے۔''

''پھر؟''

''پھر وہ چپ ہو گئیں مگر انہیں اچھا نہیں لگتا میرا آپ سے ملنا۔ میں کنواری لڑکی جو ہوئی۔ مردوں کی اور بات ہے۔ مرد جس سے چاہیں ملیں۔''

''آپ سے بھی...... جب چاہیں؟''

''ہاں اگر آپ چاہیں تو، مگر یہ کس طرح ممکن ہے؟''

''میں تو آپ کو بہت چاہتا ہوں۔''

''جھوٹ۔''

پھر وہ شرما کر بھاگ گئی۔ اس کے رخساروں پر جمال نے پہلی مرتبہ سرخی کی جھلک دیکھی۔

پھر اچانک وہ غائب ہو گئی۔ اس کی ماتا جی نے اسے روک دیا تھا یا خود ہی اس نے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد جمال اس کو بھول گیا۔

## تم جیسا بے وقوف!

مفتی کی چٹھی پڑھ کر جمال نے دوستوں کی فہرست بنائی جو اسے واپسی کا کرایہ اُدھار دے سکتے تھے۔ قرض مانگنے سے وہ کبھی شرمایا نہ تھا اور قرض لے کر وہ ہمیشہ واپس بھی کر دیا کرتا تھا۔

فہرست میں پہلا نام راج مُہرے کا تھا۔ اس لیے نہیں کہ مہرہ اس کا سب سے گہرا دوست تھا، اس لیے کہ وہ اس کا ہم عمر تھا۔ اس کے ساتھ آسانی سے بات ہو سکتی تھی۔

مہرہ نے اس کی بات سن کر تھوک نگلی۔ اس کو پتہ تھا کہ جمال کے پاس واپسی کا کرایہ نہیں ہے مگر وہ جمال کی سادگی پر حیران تھا جس نے اس بے تکلفی سے قرضہ مانگ لیا تھا۔

اس نے کہا ''جمال بھائی! بمبئی میں کوئی کسی کو قرضہ نہیں دیتا۔ اس لیے کہ پیسے لوگوں کے پاس ہوتے ہی نہیں کہ واپس کر دیں۔ ہم ایکٹر لوگ تو بہت ہی کمزور ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس جمع پونجی کہاں؟''

"نہ سہی۔" جمال نے کہا "جانے دو پھر......"

"تمہیں یہاں کوئی قرض نہیں دے گا۔ خاص طور پر آج کل اور کوئی مسلمان بھی نہیں دے گا اور کوور لاج میں تو آج کل کوئی مسلمان رہا بھی نہیں۔"

"نہیں یار فکر نہ کر۔" جمال نے کہا۔

"تم جیسا بے وقوف آدمی میں نے زندگی میں نہیں دیکھا جمال۔" مہرہ بولا "مگر تم جیسے بے وقوف کو اتنی سنگدل دنیا میں اکیلا چھوڑتے ہوئے میرا دل ڈرتا ہے۔ اس لیے میں محض تمہاری بے وقوفی پر رحم کھا کر تمہیں پچاس روپے دے دوں گا۔ لاہور سے لوٹ کر مجھے واپس کر دینا۔"

جمال نے پچاس روپے جیب میں رکھ لیے۔ انہیں واپس کرنے کا اس کا پکا ارادہ تھا۔

پھر اس نے پیکنگ شروع کر دی۔ پرانے کپڑے، کچھ کتابیں اور کچھ مسودے اس نے کھدر کا ایک لمبا کرتا پہن لیا۔ صبح کے دس بجے تھے اور گاڑی بمبئی سنٹرل سٹیشن سے تین بجے چھوٹتی تھی۔

اچانک راجکماری ننگے پاؤں اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔

جمال نے اسے سوٹ کیس پر بٹھا دیا "اتنے دنوں کے بعد؟ میں تمہاری راہ دیکھتا رہا۔" اس نے کہا۔

"میں آ نہ سکی۔ ماتا جی بیمار ہیں۔" وہ آزردہ ہو کر بولی۔

"اب کیسی ہیں ماتا جی؟" جمال نے ہمدردی سے پوچھا۔

"بہت بیمار ہیں اور اسی سلسلے میں میں آپ کے پاس آئی ہوں۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں ان کے لیے؟"

"جی آپ سے ایک کام ہے۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ اس کا گلا رندھا ہوا تھا۔

"ضرور ضرور۔" جمال بولا۔

"آپ سے کام ہے۔ اگر ہو سکے تو...... آپ کے پاس پچاس روپے تو ہوں گے۔ ان کی دوائی کے لیے ضرورت ہے۔ پتا جی کو کہیں سے قرضہ ملا نہیں۔ پتا جی کو ایڈوانس ملا تو ہم واپس کر دیں گے اسی وقت۔"

جمال کا جی چاہا کہ میں فوراً پچاس روپے راجکماری کو دے دوں مگر پھر اسے خیال آیا کہ بمبئی میں تو کوئی کسی کو قرض نہیں دیتا۔ اس نے راجکماری سے یہی کہہ دیا۔ "بمبئی میں تو کوئی کسی کو قرض نہیں دیتا۔"

راجکماری کا رنگ زرد ہو گیا۔ پسینے کے قطرے اس کے ماتھے پر دمکنے لگے۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنے کے بعد جس طرح ننگے پاؤں آئی تھی اسی طرح چلی گئی۔

اب جمال کو سخت پشیمانی ہوئی۔ مہرہ ٹھیک کہتا تھا کہ میں سخت بے وقوف ہوں۔

جمال کو گاڑی میں دروازے کے ساتھ ہی جگہ ملی۔ راجکماری ملہوترہ سے اس نے جو سلوک کیا تھا، اس پر اس کی شرمندگی جاتی نہ تھی۔

بھوپال تک وہ سوتا جاگتا بیٹھا رہا۔ اس نے کسی مسافر سے کوئی بات نہ کی۔ بھوپال کے سٹیشن پر اس نے ترکی ٹوپیوں والے بے شمار ونڈر دیکھے تو اسے یاد آیا کہ یہاں مجھے مسلمانوں جیسے کپڑے پہننے چاہئیں، وہ اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔

مفتی نے اسے سفر کے بارے میں ہدایات مفصل لکھ دی تھیں۔ ان سٹیشنوں کے نام نوٹ کروا دیئے تھے جن پر اسے ہندو یا مسلمانوں کے کپڑے پہننے تھے۔

ان دنوں ریل گاڑیوں میں مسلمان مسافر قتل ہو رہے تھے۔ مسلمانوں کے ہاں قاتلوں کی ایسی کوئی تنظیم نہ تھی مگر اپنے طور پر بھی کوئی مسلمان کسی کو ہندو سمجھ کر چھری مار سکتا تھا۔ ابھی تک ایسا کوئی واقعہ ہوا نہ تھا مگر احتیاط لازم تھی۔

جمال کے کپڑے بدلتے بدلتے گاڑی بھوپال سے نکل گئی۔ اس نے باہر آ کر ادھر ادھر نظر ڈالی اور پھر باتھ روم میں جا کر کھدر کے کپڑے پہن لیے۔

دہلی میں اسے چوکنا ہونا پڑا کیونکہ آگے مشرقی پنجاب کی قتل گاہ تھی اور گاڑی کو رات میں یہاں سے گزرنا تھا۔

## جوگندا

انبالے میں جمال اونگھ رہا تھا جب گاڑی چلی۔ اس نے کرشن کمار جین بن کر کچھ روز یہاں ایک دھرم شالے میں گزارے تھے۔ اس کے ہندو سیوک کو پتہ تھا کہ جمال مسلمان ہے۔ کرشن کمار جین نہیں ہے مگر سیوک ایک صوفی منش شخص تھا۔ دن بھر دیسی شراب کے نشے میں مگن رہتا اور مسافروں کی خدمت کرتا۔ اسے مسلمانوں سے نفرت نہ تھی۔ وہ بلھے شاہ کی کافی کا عاشق تھا مگر وہ دن ہوا ہوئے۔ اب تو ہوا میں خون کی بو رچی ہوئی تھی۔

اچانک گاڑی میں شراب کی کچی لاندھ کی بو پھیل گئی۔ انبالے سے کچھ دیہاتی سوار ہوئے تھے۔ ایک لمبی کالی داڑھی اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ ہاتھ میں کرپان، آنکھیں نشے میں چڑھی ہوئیں۔ اس کے پیچھے گاڑی کے پائیدان پر چھریرے بدن کے کچھ اور سکھ اور ہندو۔

ڈبے میں مسلمانوں کا صرف ایک ہی کنبہ تھا۔ بی بی نے برقعہ اوڑھ رکھا تھا۔ مرد کے چہرے پر محراب کا نشان تھا۔ وہ آہستہ آہستہ تسبیح پڑھ رہا تھا۔ بچہ سویا ہوا تھا۔

آنے والے گھور گھور کر مسافروں کا جائزہ لے رہے تھے۔ مسافر پہلو بدلنے لگے۔ ان میں گھبراہٹ پھیل گئی۔

جمال نے ایک نظر لمبے تڑنگے سکھ پر ڈالی جو داڑھی پر ہاتھ رکھے کچھ سوچ رہا تھا۔ اچانک جمال نے نعرہ مارا "اوئے سکھا تیری ماں نوں اوئے جوگندیا۔ توں کتھے؟"

کالی داڑھی والا جوگندر سنگھ نور پور کے اسلامیہ ہائی سکول میں جمال کا ہم جماعت واحد سکھ تھا جس کے دادا وساکھا سنگھ نے اسے فارسی پڑھ کر انسان بننے کے خیال سے اسلامیہ ہائی سکول میں داخل کروا دیا تھا۔ اس کو دیکھے جمال کو ایک مدت ہو چلی تھی۔

جوگندر سنگھ نے حیران ہو کر جمال کی طرف دیکھا۔ پھر وہ اس سے لپٹ گیا۔ دونوں ایک لمحے کے لیے وقت اور مقام کا بھاؤ بھول کر سکول کے بچے بن گئے۔

''اوئے جمالو تو کہاں؟'' جوگندر سنگھ نے پوچھا۔

تھوڑی دیر میں جوگندر نے حواس قائم کر لیے اور چھریرے بدن والے سیواداروں سے کہنے لگا ''یہ میرا پرنام یار ہے۔ ہم دونوں ساتھ پڑھتے تھے نور پور میں۔''

''میرا نام جمال ہے جی اور میں مسلمان ہوں۔''

جوگندرے نے اسے کہنی ماری ''چپ بھی کر۔'' اس نے کہا۔ پھر وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ یکدم اداس ہو گیا۔

''کدھر جا رہے جوگندرے؟'' جمال نے پوچھا۔

''اچھا ہوا تم نے مجھے پہچان لیا ورنہ بڑی غلطی ہو جاتی۔''

''کیسی غلطی؟''

## واہگورو کی ثنا!

''یہاں لاش بھی نہ ملتی تمہاری۔''

''کیوں میں نے کیا کیا ہے جوگندرے؟''

''میرے بابے نے کیا کیا تھا؟ وہ تو صرف تمہارے داتا صاحب کو سلام کرنے گیا تھا جمعرات کے دن۔ جیسی کہ اس کی عادت تھی۔''

''پھر کیا ہوا بابا جی کو؟'' جمال نے بے چینی سے پوچھا۔

''ہم نے انہیں بہت سمجھایا کہ آج کل ہندو مسلمان پاگل ہو رہے ہیں نہ جا' مگر بابا نہ مانا بوڑھا بے وقوف!''

''مگر ہوا کیا پھر؟''

''وہ گیا داتا صاحب سلام کرنے۔ کہتا تھا جان واہگورو کی دین ہے۔ جب چاہے گا لے لے گا۔ میں قوالی سننے کے لیے لاہور ضرور جاؤں گا۔ وہاں بھی تو واہگورو کی ثنا ہوتی ہے۔ دو دن کے بعد ہمیں اس کی لاش ہی ملی۔ بھاٹی کے ساتھ والے باغیچے میں۔ میں پوچھتا ہوں کہ میرے بابے نے کسی کا کیا بگاڑا تھا، اسے کیوں مار ڈالا تم نے؟ وہ تو مسلمانوں کے اور پاکستان کے خلاف نہیں تھا۔''

جمال کا دل بیٹھ گیا اور وہ نادم ہو کر افسوس کے رسمی جملے کہنے لگا۔ ''بڑے افسوس کی بات ہے۔ بڑی شرم کی بات ہے جوگندرے۔''

''پھر میں نے فیصلہ کر لیا جمالو کہ مسلمان کو جہاں پاؤں گا مار ڈالوں گا۔ امرتسر تک ڈیوٹی میری ہے آج کل۔ گاڑی میں میں نے مسلمان بہت مارے مگر دل کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ میرے بابے نے تو سب سے محبت کی تھی۔''

جمال کا دل چاہا کہ جوگندا اپنی کرپان میرے پہلو میں بھونک دے تا کہ اس کی آگ ٹھنڈی ہو۔ جن سنگھ کے سیواداروں کے ہاتھ سے وہ مرنا نہ چاہتا تھا۔ اس نے کہا ''جوگندرے میں تیرا مجرم ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔ مجھے مار ڈال ابھی......''

''تمہیں نہیں مار سکتا میں۔'' جوگندا بولا۔ ''تم میرا بال پن ہو اس لیے۔ میرا دادا تمہیں کتنا پیار کرتا تھا!''

پھر اس نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ ''رام چند آج کام نہیں ہو گا۔ جالندھر سے تم واپس لوٹ آنا۔ میں اپنے یار کو امرتسر چھوڑ کر واپس آؤں گا۔''

رام چند نے ناک سکوڑ کر کہا ''کوئی بھی نہیں بالکل خالی؟''

''بالکل خالی۔'' جوگندرے نے تحکمانہ انداز میں کہا ''میرا یار سادھو سنت ہے۔ اس کو خوشی خوشی گھر جانے دے۔ اس کا دل نہ دکھے۔ بمبئی سے آ رہا ہے۔''

ڈبے کے سارے ہندو ایک ایک لفظ کو بڑے غور سے سن رہے تھے۔ وہ اشارے سمجھتے تھے۔ ان کا دل بھی چاہتا تھا کہ ہمارے سامنے خون نہ بہے اور مسافر شانتی سے اپنے اپنے گھروں کو پہنچ جائیں۔

محراب والے مرد نے تسبیح کا ورد جاری رکھا مگر اس کے کان اِدھر ہی کو لگے تھے۔ اس کی برقع پوش بی بی نے منہ بند کھڑکی کی طرف کر لیا تھا۔ وہ جو کچھ دیکھ رہی تھی، دیکھنا نہ چاہتی تھی۔

جالندھر میں سیوادار اتر گئے۔ جوگند نے کہا ''جمالو آج میں نے تیری خاطر ساری گاڑی چھوڑ دی۔ امرتسر سے آگے تیرا اپنا علاقہ ہے اور امرتسر تک تیری جان کی حفاظت میری ذمہ داری ہے۔ کوئی تیری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا میرے یار۔ تجھے دیکھ کر کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی۔''

جالندھر سے گاڑی چلی تو جمال کو پریتو سنگھ یاد آئی۔ ''جانے وہ کہاں ہو گی۔'' اس نے سوچا۔

امرتسر تک جوگندا جمال سے نور پور کی باتیں سنتا رہا۔ وہ سکول کا چھوٹا سا معصوم بچہ بن گیا۔ وہ کسی کو بھی قتل کرنے کے قابل نہ تھا۔ لگتا تھا وہ ابھی اٹھ کر فارسی کی گردان یاد کرنے لگے گا۔ کشت، کشتہ، کشتہ اند، کشتہ بودند......

جمال کو لگا میں ذاتی طور پر بابا وساکھا سنگھ کے قتل کا ذمہ دار ہوں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اب جو تلوار لہرائی، وہ ماسٹر تارا سنگھ کی تھی۔ کیا اس خونخوار اکالی کو معلوم نہ تھا کہ بابا وساکھا سنگھ کو جمعرات کے دن

داتا صاحب کے مزار پر جا کر قوالی سننے کی عادت ہے۔ وہ تو نانک کا فقیر تھا۔ بندہ بیراگی کا چیلا نہ تھا۔

## تیرہ چارپائیاں

امرتسر کے پلیٹ فارم پر تیرہ چارپائیاں ساتھ ساتھ پڑی تھیں۔ ان پر رکھی ہوئی تیرہ لاشوں کو ادوائن کی رسیوں سے باندھا ہوا تھا۔ ان کے کٹے ہاتھ پیر پائینتی کے رخنوں میں سے نیچے لٹک رہے تھے۔ ان میں عورتیں تھیں، بچے، بوڑھے اور نوجوان تھے، مگر گوشت کے لوتھڑوں میں تمیز کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ بعض کی آنکھیں کھلیں تھیں۔ ان کے رخساروں، گردنوں اور سینوں پر خون جما ہوا تھا یا قطرہ قطرہ رس رہا تھا، جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ بعض عورتوں کے جسم بالکل ننگے تھے۔ پولیس کی ایک گارڈ لاتعلقی سے کتوں کو بوٹی نوچنے اور خون چاٹنے سے روک رہی تھی۔ ونڈروں کا سودا دھڑا دھڑ بک رہا تھا۔

یہ تیرہ لاشیں رات کی گاڑیوں کا اترا ہوا سامان تھا۔ تیرہ مسلمان مسافر اپنی منزل کو پہنچ چکے تھے۔

جوگندے نے کہا ''جمالو رخصت ہونے سے پہلے ایک پیالہ چائے کا پی لیں۔ پھر شاید تم سے ملاقات نہ ہو۔''

جمال کے پیٹ میں شیشے کی کرچیں چبھ رہی تھیں۔ وہ چائے پینا نہ چاہتا تھا۔ وہ کہیں الگ بیٹھ کر بہت بڑی قے کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا ''نہیں جوگندے تیرا رب راکھا۔ میرا راستہ چھوڑ دے اب۔''

## جے بجرنگ بلی

لاہور ریلوے سٹیشن پر بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ہندو، مسلمان اور سکھ سب گڈمڈ تھے۔ یہاں نہ خنجر چمکتا تھا نہ کرپان کا کوندا لپکتا تھا۔ سب کو اپنی اور اپنے بال بچوں کی پڑی ہوئی تھی۔ یہاں وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نہیں تھے۔ انسان تھے جنہیں درندوں نے اچانک آ لیا ہو۔

جمال نے بغچیوں، گٹھڑیوں، سوٹ کیسوں، بستروں، بائیسکلوں، طوطے کے پنجروں، ٹانگیں گھسیٹتی ہوئی عورتوں، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں پر ایک تماشائی کی سی اچٹتی نظر ڈالی۔ پھر وہ محراب والے مولوی صاحب اور ان کی بڑھیا کو اترنے میں مدد دینے لگا۔ قلی کسی کی بات سنتے نہ تھے۔ یہ بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ کون مسافر ہے اور کون کسی کو لینے کے لیے پلیٹ فارم پر آیا ہے۔ کوئی امرتسر جانے والی گاڑی کے انتظار میں پریشان پھرتا تھا۔ کوئی امرتسر سے آنے والے رشتہ داروں کی تلاش میں ڈبے جھانکتا تھا۔

پلیٹ فارم پر جن سنگھ کے سیوادار ڈیوٹیوں پر مستعد تھے۔

گاڑی سے نکلتے ہی مولوی صاحب نے شور مچا دیا، کسی نے ان کی جیب کاٹ لی تھی اور جیب کترا ان کے سامنے ہجوم میں گم ہو جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

مولوی صاحب کا شور سن کر لوگ اس کے پیچھے بھاگے اور ایک لمحے کے لیے بھول گئے کہ کون ہندو ہے، کون مسلمان۔ آن کی آن میں جیب کترا پکڑا گیا اور سب لوگ اسے گھونسے مارنے لگے۔ جمال کو ہنگاموں میں دلچسپی تھی۔ اس نے بھی اس کی گردن پکڑ لی۔ گھونسے کھاتے ہوئے جیب کترے نے آہستہ سے کہا ''جے بجرنگ بلی'' مطلب یہ تھا کہ میں ہندو ہوں۔ نعرہ سن کر اٹھتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ سیواداروں نے اس کی گردن جمال سے چھڑا کر اس کے گرد گھیرا ڈال دیا اور اسے کھینچتے ہوئے ایک طرف لے چلے۔ تھوڑی دور جا کر انہوں نے ''بھاگ جا کتی کے پتر۔''

وہ بھاگنے لگا تو جمال نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

''جانے دے جانے دے اسے۔'' ایک سیوادار نے کہا۔

''اس نے ایک غریب مسافر کی جیب کاٹی ہے۔'' جمال بولا۔

''دیکھتے نہیں ہو کہ یہ ہمارا ہندو بھائی ہے......اور جس کی جیب کٹی ہے وہ مولوی ہے مسلا سالا۔''

انہوں نے جمال سے اس کی کلائی چھڑوا دی اور وہ آناً فاناً ریلوے لائن پار کر کے دوسرے پلیٹ فارم پر کود گیا۔

مولوی صاحب کی نقدی کے علاوہ ٹکٹ بھی غائب تھے مگر ٹکٹ چیکر مسلمان تھا۔ اس نے مولوی صاحب سے رعایت برتی۔ سمجھ گیا کہ مولوی صاحب دہلی سے آئے ہیں اور دہلی والوں کی عزت لاہور میں بہت تھی جو بعد میں خوف میں بدل گئی۔

مولوی صاحب کے کچھ رشتہ دار دہلی دروازے میں رہتے تھے اور دہلی دروازے تک کا راستہ مسلمان آبادی میں سے جاتا تھا۔

ریلوے سٹیشن کے سامنے کے بڑے چوک میں کسی قدر کھچاؤ تھا۔ یہاں آمدورفت چاروں طرف ہوتی تھی اور مہا سبھا اور جن سنگھ اور دہلی دروازے کے مسلمان رضاکاروں کی ٹولیاں چاروں طرف پھرتی اور اپنی اپنی قوم کے لوگوں کی حفاظت کرتی تھیں، مگر یہاں مسلم لیگ نیشنل گارڈ کا کوئی آدمی نہ تھا۔ اس کے رضاکار زیادہ تر نواب ممدوٹ کی کوٹھی کے اور ے تورے پھرتے تھے مگر جن سنگھ کے آدمی اپنے تنظیمی نشانات لیے ہر طرف موجود تھے۔ مسلمانوں کی حفاظت کا ذمہ مسلمان غنڈوں نے لے رکھا تھا اور وہ بھی ٹولیوں میں اپنے آپ کھل جانے والے بڑے بڑے چاقو اور ہاتھوں میں ڈنڈے لیے پھرتے تھے۔ کھچاؤ کے باوجود اس چوک میں کسی بڑے معرکے کا اندیشہ نہ تھا۔

ریلوے سٹیشن سے اچھرے جاتے ہوئے اچانک نوجوان نے گھوڑے کی باگ موڑی تو جمال سمجھ گیا کہ کوئی ہنگامہ ہو گیا ہے۔ چاروں طرف بھگدڑ مچ گئی۔ سیٹیاں بجنے لگیں۔ راہگیر راستوں سے ہٹ گئے اور پندرہ برس کا لڑکا بائیسکل پر جا رہا تھا۔ اس نے دانتوں میں ایک خون آلود چھری پکڑی ہوئی تھی۔ وہ کسی ہندو یا سکھ کو قتل کر کے آ رہا تھا۔

رات بھر جمال مفتی کو بمبئی کے قصے سناتا رہا۔ وہ اس بات پر بہت مسرور تھا کہ جمال آتے ہوئے

گاڑی میں قاتلوں کے ہاتھ سے بچ کر سلامتی سے واپس پہنچ گیا ہے۔اس کا خیال تھا کہ یہ سب کرامات داتا صاحب کی ہیں، جو پاکستان کے محافظ مقرر ہوئے ہیں۔ایسی باتیں مفتی بڑے یقین سے کیا کرتا تھا۔

''اب تم سناؤ مفتی لاہور کس حال میں ہے؟'' جمال نے چائے بناتے ہوئے پوچھا۔

''بقول آغا حشر شہر لوہے کے جال میں ہے۔'' مفتی بولا۔

''یعنی؟''

''برباد ہوگیا۔لٹ گیا۔جل گیا لاہور۔''

## لاہور برباد ہوگیا

''میں تو ادھر کبھی گیا نہیں مگر سنا یہی ہے۔''

''کیا لاہور برباد ہوگیا ہے؟'' جمال نے بے چین ہوکر پوچھا۔''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''سارا نہیں۔جہاں ہندو سکھ آبادی تھی مثلاً شاہ عالمی دروازہ۔ہندو سکھ سارے کے سارے لاہور سے بھاگ رہے ہیں۔''

''یہ اچانک کیا ہوا؟'' جمال نے پوچھا۔

''ہندو سکھ لاہور کو کسی طرح بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے اور ڈٹے رہنے کی انہوں نے تیاری بھی کر رکھی تھی۔چھری، چاقو گولی بارود کی ان کے ہاں کوئی کمی نہ تھی۔پھر ان کی سیوادار تنظیمیں بھی تھیں جو دراصل قاتلوں کی تنظیمیں ہیں......''

''مجھے اس کا پتہ ہے۔چھ مہینے پہلے جب میں نے شاہ عالمی دروازے کے باہر والے ایک مکان سے اپنے ماموں اشتیاق کی فیملی کو نکالا تھا اس وقت وہاں پیارے لال نامی ایک سیوادار انچارج تھا......''

''اور اس سیوادار کی موجودگی میں تم نے اس ہندو مرغابی کو مار گرایا تھا۔'' مفتی ہنس کر بولا ''مگر دراصل تم نے نہیں اس نے تمہیں مار گرایا تھا۔''

''پتہ نہیں وہ چلی گئی کہ نہیں۔'' جمال نے زیر لب کہا...... پھر مفتی سے پوچھا ''مگر پھر بھگدڑ کیسے مچی؟''

''بتاتا ہوں۔'' مفتی بولا ''شاہ عالمی کا علاقہ لاہور کے امیر ہندوؤں کا علاقہ تھا۔انہوں نے گلیوں پر آہنی دروازے بھی لگوا لیے تھے اور مسلح پہریدار بھی ملازم رکھ لیے تھے۔اگر کسی گلی میں مسلمانوں کے حملے کے آثار دکھائی دیتے تو دور دور تک سیٹیاں بجنے لگتیں اور سب کو خطرے کی خبر ہوجاتی......''

''بہت خوب!''

''تم آگے کی تو سنو۔اس علاقے کا بڑا سیوادار اوتار سنگھ نامی ایک سکھ پہلوان تھا۔پہلوانی میں مقام پیدا نہ کرسکا تو وہ بدمعاش بن گیا۔معقول پیسے ملے تو وہ اپنے اکھاڑے کے سارے ہندو سکھ جوان شاہ عالمی میں لے آیا۔اس کی ٹولی علاقے میں پھرتی اور اکا دکا مسلمان کو دیکھتی تو اسے بازار ہی میں ذبح کر دیتی۔اس سے شاہ عالمی کے ہندوؤں کے حوصلے بڑھ گئے۔اوتار سنگھ بعض اوقات مقتولوں کے کٹے ہوئے سر بالوں سے پکڑ کر گلی گلی پھرتا۔آج کل کسی کو مار دینا کوئی اچنبھے کی بات نہیں مگر اوتار سنگھ مسلمانوں کو ذلیل کرنے لگ گیا تھا۔''

''کیا کسی نے اوتار سنگھ کا ہاتھ نہیں روکا؟'' جمال نے پوچھا۔

''تم سنو تو۔'' مفتی بولا۔''اس بات پر بھاٹی دروازے کے مسلمان لڑکے جل گئے اور ایک دن وہ بیس پچیس کی ایک ٹولی لے کر رنگ محل سے ہوتے ہوئے اوتار سنگھ تک جا پہنچے۔بلمیں، کلہاڑیاں اور چھرے ان کے ہاتھوں میں دیکھ کر اوتار سنگھ پہلوان ایک گلی میں گھس گیا اور پہریداروں نے آہنی دروازہ اندر سے بند کرلیا۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر مسلمان لڑکوں نے ربر اور پٹرول کا محلول بوتلوں میں بھر کر محلوں کے اندر پھینکنا شروع کردیا۔آن کی آن میں گھروں نے آگ پکڑلی اور دھویں سے در و دیوار سیاہ ہوگئے......''

''تو کیا سارے ہندو جل کر مر گئے؟''

''اب کسی نے سارا واقعہ آنکھوں سے تو نہیں دیکھا مگر اغلب یہی ہے کہ زیادہ تر گلی کے دوسرے سرے سے بھاگ کر بچ نکلے۔کچھ بے سروسامان ریلوے سٹیشن تک پہنچ گئے۔کچھ اپنے مسلمان دوستوں کے ہاں چھپ گئے مگر علاقہ خالی ہوگیا اور زیادہ تر جل کر خاک ہوگیا۔''

''پہلوان اوتار سنگھ کا کیا بنا؟''

''کچھ معلوم نہیں۔بزدل آدمی تھا۔جان بچا کر لے گیا ہوگا۔''

''یہ کب کا واقعہ ہے؟''

''تاریخ تو مجھے یاد نہیں مگر اس سے ایک روز پہلے امرتسر سے مسلمانوں کی ایک گاڑی لاہور کے پلیٹ فارم نمبر 2 پر رکی تھی۔اس میں لاشوں، کٹے ہوئے سروں اور پھٹے ہوئے پنڈوں کے سوا کچھ نہ تھا۔جن سے ساری گاڑی میں کیچڑ ہورہا تھا۔یہ منظر بھی لاہور کے مسلمانوں نے جا جا کر دیکھا۔تمہیں پتہ ہے کہ لاہوریے کیسے زبردست تماشبین ہیں، مگر اس تماشے نے سب کے دلوں میں آگ بھر دی۔سیکڑوں بچے اور عورتیں شاہ عالمی میں زندہ بھی جل گئے ہوں گے۔''

''چچ چچ۔'' جمال نے زیر لب کہا۔

''مگر اس سے کچھ روز پہلے امرتسر کے مسلمانوں نے لاہور کے مسلمانوں کو چوڑیاں بھی بھیجی تھیں۔'' مفتی نے کہا۔

''چوڑیاں؟ وہ کس لیے؟''

''امرتسر کے مسلمانوں نے پیغام بھیجا کہ لاہوریو! کچھ غیرت کھاؤ۔ وہاں مسلمانوں اور سکھوں اور ہندوؤں میں زبردست لڑائی ہو رہی تھی مگر سکھ وہاں اکثریت میں تھے اور مسلح بھی تھے۔ انہوں نے وہاں کی مسلمان لڑکیوں کے ایک ہوسٹل کو آگ لگادی، لڑکیاں جانیں بچانے کے لیے باہر کو بھاگیں تو سکھوں نے ان تمام 172 لڑکیوں کو سربازار ننگا کیا۔ ان کا جلوس نکالا۔ ان کے بدن نوچے، مروڑے اور جس کا جی چاہا اس نے ان کو سربازار یا گلی کوچوں میں بے عزت کیا۔ پھر ان کو قتل کر کے یا زخمی کر کے وہیں چھوڑ گئے۔ اس بات پر چوڑیاں بھیجی گئیں......''

''توبہ توبہ...... مگر یہاں تو ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا...... یا ہوا ہے؟''

''نہیں یہاں کسی ہندو عورت کو سربازار رسوا نہیں کیا گیا۔ اگرچہ لوٹ مار بہت ہوئی۔'' مفتی نے جواب دیا۔

## آگ کا دریا

مفتی کا ایک بچہ جس کو اس نے ماں بن کر پالا تھا، اس کی بوڑھی والدہ کے ساتھ بٹالہ میں تھا۔ ان کے لیے وہ کسی قدر پریشان تھا مگر اس کا خیال تھا کہ بٹالے میں کوئی خطرہ نہیں۔ پھر ان کی خاندانی حویلی میں وہ پراسرار تہہ خانہ ابھی موجود تھا جس کا راستہ کنویں میں سے ہو کر جاتا تھا اور جو اس کے بزرگوں نے بندہ بیراگی کے قتلِ عام سے خاندان کو بچانے کے لیے تعمیر کروایا تھا۔ اس کو پتہ تھا کہ حملے کی صورت میں میری والدہ بچے کو لے کر تہہ خانے میں اتر جائے گی۔ خط میں اس نے اپنی والدہ کو اس کی تاکید بھی کر دی تھی۔

جمال کو اس نے اچھی طرح تسلی کرادی مگر جمال جانتا تھا کہ مفتی جب اندر سے پریشان ہوتا ہے تو اوپر سے بڑے اطمینان کا اظہار کرتا ہے۔

## لاہور میں

مسلمان غنڈے اپنے پروگرام فرداً فرداً بناتے تھے اور زیادہ تر قتل اپنے کم عمر شاگرد پیشوں سے کرواتے تھے۔ پولیس اور مسلم لیگی لیڈروں سے رابطے کا کام استادوں نے اپنے لیے رکھا ہوا تھا۔ اس رابطے کی ضرورت مسلمانوں کی اجتماعی حفاظت اور خدمت وایثار کے سوا کچھ نہ تھی مگر لوٹے ہوئے یا چھینے ہوئے مال کو جو مالِ غنیمت سمجھا جاتا تھا، اکیلے ہضم کرنا مشکل تھا۔ اس لیے پولیس کا حصہ اس میں سے باقاعدگی کے ساتھ نکلتا تھا اور مسلم لیگی لیڈر اس سلسلے میں باخبر رکھے جاتے تھے۔ لوٹ مار اور قتل وغارت میں پولیس اور غنڈے کا اتحاد اور لیڈروں کی سرپرستی اور اعانت کی روایت مستحکم ہونا شروع ہو چکی تھی۔ حالانکہ پاکستان ابھی کئی دن کے فاصلے پر تھا۔

## مست گڑھ

مشرقی پنجاب کی خبریں ہولناک تھیں۔ یہاں سے کل مسلمان آبادی کو نکالا جانا تھا۔ سکھ ریاستوں کی فوجیں اور ہندو اور سکھ پولیس، مسلمان دیہات کے گرد گھیرے ڈال کر پہلے مسلمانوں سے بندوقیں، پستول اور کلہاڑی درانتی چھین لیتی پھر نہتی آبادیوں پر ٹوٹ پڑتی۔ سیوادار بچوں، بوڑھوں کو قتل کر دیتے۔ جوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے جاتے اور شرابیں پی کر مسجدوں میں ان کی آبروریزی کرتے۔ جن کو مست گڑھ کہتے تھے۔ بعض کے پستان کاٹ دیتے اور بعض کو قتل کر دیتے۔ کچھ کو وہ گھروں میں ڈال بھی لیتے کیونکہ سکھوں میں عورتوں کی کمی تھی اور یہ بات اسے چند سال پہلے جالندھر میں مہتا سنگھ باورچی نے بتائی تھی جب وہ کرنل کلرائے کا ملازم تھا۔

مہتا سنگھ کے چار بھائی ایک ہی بیوی سے گزارہ کرتے تھے اور یہ بات مہتا سنگھ کے نزدیک معیوب نہ تھی۔ اس طرح باپ دادا کی زمین تقسیم ہونے سے بچ جاتی ہے۔ یہ اس نے کہا تھا۔

مشرقی پنجاب کے دیہات سے غریب مسلمان، بال بچوں کو لے کر قافلوں کی شکل میں پیدل ہی لاہور کی طرف رواں تھے۔ لگتا تھا یہ سب کچھ غیر حقیقی ہے مگر یہ سب کچھ حقیقی تھا۔ بہتا ہوا خون گرم تھا۔ گری ہوئی لاشیں ٹھنڈی تھیں۔

## عوامی عدالت

مزنگ کی آبادی مسلمان تھی اور یہاں لوگ بازاروں میں بیٹھ کر حقہ پیتے اور بے فکری سے گپ لگاتے۔ بچے بالے بے غم پھرتے۔ مسجدیں نمازیوں سے بھری رہتیں جہاں نماز سے فارغ ہو کر بڑے بوڑھے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے۔ جمال اُدھر سے گزرا تو اس نے راستہ بند پایا۔ لوگوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے اور وہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ بیچ میں ایک بڑی چارپائی پر کچھ بھاری بھرکم پہلوان نما قسم کے آدمی بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے ایک پندرہ برس کا بچہ مرغا بنا تھا۔ اس کے ننگے چوتڑوں پر بے تحاشہ جوتے برس رہے تھے اور وہ بلبلا رہا تھا۔

جمال نے کچھ دیر تماشا دیکھا۔ اسے بچے پر بڑا رحم آیا۔ اس نے ساتھ کھڑے ہوئے استاد سے پوچھا ''پہلوان اسے کیوں مارا جا رہا ہے۔''

''بڑا اماں کا یار ہے جی یہ۔ آپ کو نہیں پتہ۔''

''مجھے بھی بتاؤ۔'' جمال نے کہا۔

یہ بات اس پہلوان نے بھی سن لی جو چارپائی پر بیٹھا تھا اور جس کے حکم پر لڑکے کو جوتے لگ رہے تھے۔ وہ بولا ''باؤ آ میں تجھے بتاؤں کہ اس کا قصور کیا ہے۔ یہ کتی کا پتر جب کسی کافر کو مارتا ہے تو چھری اس کے پیٹ کے اندر ہی چھوڑ دیتا ہے۔ کئی بار سمجھایا کہ کام صاف کیا کر۔ چھری کھینچ کر نکال لایا کر مگر یہ برے کا بچ کام کر کے گھبرا جاتا ہے اور فوراً بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ لگا رے چھے اس کو ایک جوتا اور اس کے چوتڑ اچھی طرح ننگے کر۔''

جمال نے کہا ''استاد اب بہت ہو چکی۔ اب سمجھ گیا ہوگا۔ اب اس کو چھوڑ دو۔''

''نہیں جی۔ یہ نہیں سمجھے گا۔ چھری آج کل ڈیڑھ روپے میں آتی ہے۔ اب کون اس کو چھریاں روز روز لا کے دے اور وہ چھری جو یہ کافر کے پیٹ میں چھوڑ دیتا ہے، کسی کام نہیں آتی۔ میں نے تو اسے کہا ہے کہ اپنی ماں کا نکاح کسی لوہار سے کروا دے۔ چھے تو نے اس کے چوتڑ اچھی طرح ننگے نہیں کیے...... چمڑی ادھیڑ اس کی......''

## غازی کابلی

مفتی کی بوڑھی والدہ اور بیٹا بٹالے میں تھے مگر جمال کا خیال تھا کہ وہ محفوظ نہیں ہیں۔ انہیں وہاں سے نکال لانا چاہیے۔

مفتی بولا ''نہیں بٹالے میں کوئی خطرہ نہیں مگر مشتاق گورداسپور میں ہے۔ وہ بے وقوف اور منچلا بھی ہے۔ تم جا کر اسے لے آؤ پہلے۔ بٹالہ راستے میں پڑتا ہے۔ تم وہاں سے حالات کا جائزہ بھی لے سکو گے۔''

لاہور سٹیشن پر ہندوؤں اور سکھوں کا ہجوم تھا جو امرتسر جانے کے لیے بے تاب تھا۔ اس ہجوم میں جمال کو کوئی پہچانتا نہ تھا۔ وہ بڑی مشکل سے ٹکٹ لے کر نکلا تو اس نے دیکھا کہ امرتسر جانے والے ہجوم میں غازی کابلی بھی کھڑا ہے۔

غازی کابلی کسی زمانے میں کانگرس کے جلسے جلوسوں میں ہندوستان کی آزادی کی نظمیں پڑھا کرتا تھا۔ اس سے پہلے وہ شہید گنج تحریک کا سرگرم کارکن ہوتا تھا۔

غازی کابلی کے کپڑے میلے تھے۔ اس کے چہرے پر خشونت چھائی ہوئی تھی۔ اس نے جمال کی نظروں سے بچنے کی کوشش کی۔ جمال نے سوچا کہ غازی کابلی بھی کسی کام سے امرتسر جا رہا ہے۔ دونوں اکٹھے سفر کریں گے اور بات کریں گے۔

غازی کابلی کھڑکی سے ہٹا تو اس کے ہاتھ میں ساڑھے تین ٹکٹ تھے۔ جمال نے پوچھا ''کہاں جا رہے ہو؟ کیا امرتسر؟''

غازی کابلی نے کچھ جواب نہ دیا۔

جمال نے پھر پوچھا تو غازی کابلی نے درشتی سے جواب دیا ''امرتسر نہیں، دہلی جا رہا ہوں۔''

''کیوں؟ اور آپ نے ساڑھے تین ٹکٹ کیوں لیے؟''

''میرے تین چھوٹے بچے ہیں اور دو ہم میاں بیوی۔ اب جاؤ۔ میری جان چھوڑو۔''

''آپ بال بچوں کو لے کر دہلی جا رہے ہیں اس زمانے میں؟'' جمال نے ڈھٹائی سے پوچھا۔

غازی کابلی نے منہ پھیر لیا۔ ٹی ٹی گیٹ پر نہیں تھا۔ دونوں پلیٹ فارم پر جا پہنچے۔ غازی کابلی کے پیچھے پیچھے میلے برقعے میں اس کی بیوی اور چھوٹے بچے ایک اس کی گودی میں اور دو ساتھ ساتھ ننگے پیر۔

پلیٹ فارم پر ابھی گاڑی لگی نہ تھی۔ غازی کابلی جمال سے جان چھڑانا چاہتا تھا مگر اسے مجبوراً رک جانا پڑا۔ بڑی برہمی سے اس نے کہا ''ہاں میں بال بچوں کو لے کر دہلی جا رہا ہوں اس زمانے میں...... تمہیں کیا؟''

''مگر کیوں خاں صاحب؟ وہاں تو ہندوؤں کا راج ہوگا۔'' جمال نے متعجب ہو کر پوچھا۔

''اسی لیے۔'' غازی کابلی بولا ''اسی لیے تو جا رہا ہوں کہ ہندوؤں کا راج ہوگا۔ میں کسی ایسے ملک میں نہیں رہ سکتا جس میں مسلمان راج کریں۔''

''مسلمان تو آپ بھی ہیں خان صاحب۔'' جمال نے سمجھایا۔ ''راستے میں یا دہلی پہنچ کر کوئی ہندو، کوئی سکھ آپ کو اور آپ کے بچوں کو مار ڈالے گا۔''

''بے شک۔'' غازی بولا۔ ''اس کا امکان تو ہے۔''

''پھر آپ یہ خطرہ کیوں مول لے رہے ہیں؟''

''اس لیے کہ ہندوؤں اور سکھوں سے مجھے کوئی گلہ نہ ہوگا۔ وہ میرے اپنے نہیں ہیں، غیر ہیں غیر۔ بے شک مجھے مار ڈالیں۔''

''میں سمجھا نہیں خاں صاحب۔''

''تمہیں مسلمانوں کا تجربہ نہیں۔''

''مگر مسلمان آپ کو یا آپ کے بچوں کو قتل تو نہیں کر سکتے۔ اس بات پر کہ آپ مسلمان ہیں۔''

''مسلمان مجھے اور میرے بچوں کو مار سکتے ہیں، زندہ جلا سکتے ہیں اور اگر تمہیں نظر آ سکے تو میں مردہ ہی ہوں۔ انہوں نے مجھے مار ہی ڈالا تھا، صرف دفن نہیں کیا تھا۔ تم نہیں سمجھ سکتے میری بات۔ تم ابھی بچے ہو۔''

''خان صاحب میں ایسا بچہ بھی نہیں۔''

''شہید گنج کے زمانے میں کیا عمر تھی تمہاری؟''

''دس بارہ برس مگر شہید گنج کا یہاں کیا ذکر خان صاحب؟''

''شہید گنج ہی کا ذکر ہے۔ تم تو دس بارہ برس کے بچے تھے۔ میں جوان تھا۔ میں گوروں کی بندوقوں پر اچھل اچھل کر گرتا تھا۔ سکھوں سے کرپانیں چھینتا تھا۔ ایک گورے سے پستول چھین لینے پر میں گرفتار ہو گیا۔ تھانے میں مسلمان پولیس نے مار مار کر میری دو پسلیاں توڑ دیں۔ مقدمہ چلا اور مجھے چار برس کی سزا ہو گئی مگر مجھے کوئی افسوس نہیں جو ہونا تھا ہوا مگر کسی مولوی نے میری ضمانت کی کوشش نہ کی۔ کسی نے میرے لیے کوئی وکیل کھڑا نہ کیا۔ کسی نے چار برس مجھ سے جیل میں ملاقات نہ کی۔''

''بڑی ذلت کی بات ہے۔ بڑے دکھ کی بات ہے خان صاحب۔'' جمال نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"چار برس کے بعد جب میں جیل سے نکلا تو مجھے پتہ نہیں تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ جب میں اپنے پرانے گھر پہنچا تو وہاں کوئی اور ہی مقیم تھا۔ اس نے کہا، تمہاری بیوی اور بچوں کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا۔ میں گلی گلی محلہ محلہ بھٹکتا رہا۔ لیڈروں کے پاس گیا۔ کارکنوں اور رضاکاروں سے ملا۔ کسی کو میرے بال بچوں کی خبر نہ تھی۔ میری بیوی ان پڑھ افغانی تھی۔ لاہور میں اس کا کوئی رشتہ دار نہ تھا۔"

"پھر وہ آپ کو کیسے ملی؟" جمال نے پوچھا۔

"پانچ مہینے کے بعد وہ مجھے سڑک پر بھیک مانگتی ہوئی ملی۔ پہلی نظر میں نہ اس نے مجھے پہچانا، نہ میں نے اسے پہچانا۔ میرا ایک بچہ تھا، وہ مجھے جانتا ہی نہ تھا۔"

"بڑا تکلیف دہ سانحہ ہے خان صاحب۔"

"وہ دن اور آج کا دن۔ میں مسلمانوں سے نفرت کرتا ہوں۔ اگر شہید گنج مسجد نہ تھی، گوردوارہ تھی تو مسلمانوں نے مورچہ کیوں لگایا اور اگر لگایا تو پھر پیچھے کیوں ہٹ گئے؟ مسلمان دنیا کی سب سے ناشکری قوم ہے۔ میں تمہارے ساتھ ایک ڈبے میں بیٹھنا بھی نہیں چاہتا اس لیے کہ تم مسلمان ہو۔"

## مشتاق کے شب و روز

جمال کے سامنے جو ڈبہ آ کر رکا اس میں جمال کے سوا کوئی مسلمان سوار نہ ہوا۔ صرف ہندو تھے جو لاہور سے بھاگ رہے تھے۔

عورتوں کے چہرے پیلے تھے۔ مرد کھوئے ہوئے تھے اور بار بار سامان کی گنتی کرتے تھے۔ مائیں بچوں کو گھرکیاں دے دے کر چپ کراتی تھیں۔

گاڑی چلی تو ایک بزرگ ہندو نے پوچھا "تمہارے گھر والے کہاں ہیں برخوردار۔ اکیلے کہاں چلے؟"

"جی میرے گھر والے گورداسپور میں ہیں۔" جمال نے جواب دیا۔

"مگر سنا ہے گورداسپور پاکستان کو ملے گا۔ ضلعے میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔" لالہ جی بولے۔

"ہو سکتا ہے جی۔" جمال نے لاپروائی سے کہا۔

"تمہیں اپنے رشتہ داروں کو گورداسپور سے نکال لینا چاہیے۔ کیا پتہ کل کیا ہو جائے۔"

"یہ تو ہے۔ پتہ تو کسی کو نہیں۔"

"جناح نے بیڑا غرق کر دیا ملک کا۔ ہمیں اپنے گھر بار چھوڑنے پڑے۔ گھر بار، کاروبار سب کچھ تباہ!" ہندو بزرگ نے کہا۔

"جی ہاں تباہی تو بہت ہوئی ہے۔"

"ابھی اور ہوگی۔ تم دیکھنا سکھ بدلہ لیں گے ایک دن۔"

سفید بالوں والی بڑھیا بولی۔ "تارا سنگھ کا بیڑا غرق ہو۔ پنجاب میں تو آگ اسی نے لگائی۔ کیسے چین سے رہ رہے تھے سب لوگ۔ پرماتما اس کا منہ کالا کرے۔"

"تو چپ کر بیوقوف۔" بوڑھے نے اسے جھڑک دی۔ "سکھوں کو برا مت کہہ آج کل۔"

ڈبے میں خاموشی چھا گئی۔

جمال نے ایک چھوٹی سی ہندو بچی کو گود میں بٹھا لیا اور اسے کھیت، کسان، رہٹ اور بھینس گھوڑے دکھانے لگا۔ دیہاتوں میں بربادی کی کوئی نشانی نظر نہ آتی تھی۔ بچی اس کی گود میں بے تکلف ہو گئی۔

امرتسر کے سٹیشن پر آج کوئی لاش نہ تھی۔ خون کے دھبے دھوئے جا چکے تھے مگر کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔

شام کو جب جمال مشتاق کے ہاں پہنچا تو محفل جمی ہوئی تھی۔ قاضی اور حکیم گا رہے تھے۔ ترس رہی درشن کو صبح و شام۔ مشتاق ٹھیکہ لگا رہا تھا۔ اس کی بھری ہوئی بندوق آتش دان پر رکھی تھی۔ اس کے بچے پہلے ہی نور پور جا چکے تھے۔

اس روز گانا سننے یا شراب پینے کو جمال کا دل بالکل نہ چاہا۔ حالات بہت خراب تھے مگر مشتاق فی الحال گورداسپور چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔

صبح اٹھ کر مشتاق بندوق سے اڑتی ہوئی چیلوں کو مارتا اور ارد گرد کی محبوباؤں کو چھتوں اور کھڑکیوں میں آتے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ان کی طرف اشارے کیے جن سے اس کے رقعے چلتے تھے۔ اس کو گورداسپور کی لڑکیوں سے بڑی شکایات تھیں، وہ بڑی بزدل تھیں۔

## لیڈر بھاگ گئے

شام کو پتہ لگا کہ مسلم لیگ کے مقامی لیڈر کے گھر پر تالا پڑا ہے۔ اس کی چھت سے مسلم لیگ کا جھنڈا بھی اتر گیا ہے۔ وہ خود اپنے رشتہ داروں سمیت غائب ہو چکا ہے۔ اس پر گورداسپور کے مسلمان کچھ فکرمند ہوئے۔ ان کے چندوں سے جو اسلحہ خریدا گیا تھا، وہ بھی دفتر میں موجود نہیں تھا۔ بعض کا خیال تھا کہ اسلحہ خریدا ہی نہیں گیا تھا۔ وہ قوم کا مال کھا کر بھاگ گیا ہے۔ یہ افواہ بھی پھیل گئی کہ گورداسپور پاکستان میں شامل نہیں ہوگا اور یہی سن کر مسلم لیگ کا ضلعی صدر شہر کے مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر اور چندہ کھا کر لاہور بھاگ گیا ہے۔

مگر یہ ماننے پر لوگ تیار نہیں تھے کہ گورداسپور پاکستان کے بجائے ہندوستان کو ملے گا کیونکہ ضلع میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ریڈکلف نے ساعت کے دوران اشارہ بھی کر دیا تھا کہ گورداسپور پاکستان کا ہے اور سر ظفر اللہ خاں نے یہ بات مسلم لیگ کے لیڈروں کو بھی بتا دی تھی۔

اب گورداسپور کے مسلمانوں کے دلوں میں بے یقینی نے سر اٹھا لیا تھا۔ ہندو اور سکھ شہری اب بھی مسلمانوں کو مسکرا مسکرا کر پرنام کرتے تھے اور پاکستان میں شمولیت کی مبارکبادیں دیتے تھے، مگر لوگ کھسر پھسر

کرنے لگے تھے۔

رات کو بڑی لمبی بحث کے بعد مشتاق اس پر رضامند ہو گیا کہ صبح کی گاڑی سے چند دن کے لیے نور پور چلا جائے۔ جمال کی خاطر۔

صبح اٹھ کر دونوں نے بندوق الماری میں رکھی۔ کمروں کو تالے لگائے اور ایک سوٹ کیس لے کر ریلوے سٹیشن پر جا پہنچے۔ انہیں بالکل گمان نہ ہوا کہ یہ گورداسپور سے مسلمانوں کو لے کر جانے والی گاڑی آخری ہے۔ اس کے بعد جورہ گیا سو رہ گیا۔

# باب 12

لاہور وہ دوپہر کے بعد پہنچے۔ انہیں نور پور کی گاڑی فوراً ہی مل گئی۔ وہ اسٹیشن پر اترے تو سورج ڈھل رہا تھا۔

ان کے ساتھ ہی اور بہت سے لوگ بھی اترے تھے۔ لالہ مایا رام، اس کا چھوٹا بھائی اور سفید ململ کی ساڑھی میں لپٹی ہوئی ایک سادہ سی لڑکی۔ عمر کوئی سولہ سترہ برس، پھیکا منہ، زرد رنگ، اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور ڈری ہوئی لگتی تھیں۔ وہ بچوں کی طرح شرما کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

لالہ جی نے گونگے قلی سے جلد جلد سامان اتروایا۔ جمال اور مشتاق کو دیکھ کر وہ ہلکے سے مسکرائے اور بولے ''لاہور میں افراتفری ہے۔ میں نے سوچا سیتا کو گھر لے آؤں کچھ دنوں کے لیے۔ جب یہ پاگل پن دور ہو جائے گا تو پھر لاہور چلی جائے گی۔ ہوسٹل میں رہنا ٹھیک نہیں آج کل۔''

مشتاق نے کہا ''بہت اچھا کیا آپ نے۔ لاہور میں بہت خطرہ ہے۔''

''مگر نور پور میں تو بھگوان کی کرپا ہے۔'' لالہ جی بولے ''کچھ روز اپنی ماں کے پاس رہ لے سیتا' پھر چلی جائے گی۔ اچھا رام رام!''

لالہ مایا رام نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ سیتا نے بھی بچے کی طرح لجا کر ہاتھ جوڑے' اس کے ہاتھ بہت چھوٹے تھے۔ شہر کو جانے والا سب سے پہلا تانگہ انہی کا تھا۔

سواریوں پر تانگے والوں میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ سب مسافروں کے سامان کھینچ کھینچ کر لادنے لگے پھر ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ سانٹے برسنے لگے اور گالیاں گونجنے لگیں۔ یہ ان کا روز کا وطیرہ تھا۔

خدا خدا کر کے تانگے والوں میں سمجھوتہ ہوا۔ سب کو سواریاں مل گئیں۔ مشتاق اور جمال کے پاس تو فقط ایک سوٹ کیس تھا۔ وہ جلد ہی روانہ ہو گئے مگر اس تو تکار میں لالہ مایا رام کے تانگے کی روانگی سے اب تک پندرہ منٹ نکل چکے تھے۔

تانگے والے نے راستے میں شہر کے واقعات کی پوری تفصیل سنا دی۔ پھجے نائی کا گامے نائی پر استرے سے حملہ، اسلامیہ ہائی سکول کا قریبی جوہڑ بھر چکا تھا اور اس پر اب لڑکے ہاکی کھیلتے تھے، مولوی محمد دین

عطار کا تپ اتر تا نہ تھا۔ چاچا جاموکا تیتر بولنے لگا تھا، واں واں پٹ پٹا! واں واں پٹ پٹا!

## خیریت ہے

جمال نے پوچھا ویسے تو شہر میں خیریت ہے؟ کوئی ہندو مسلمان جھگڑا تو نہیں ہوا؟

''نور پور میں؟'' تانگے والا ہنس کر بولا ''اجی یہاں کیا جھگڑا ہوگا۔ لوگ ساہوکاروں سے ڈرتے ہیں۔ البتہ دیہات میں کچھ گڑبڑ ہے۔ سنا ہے ذیلدار فتح محمد چیمہ سکھوں پر چڑھا ہوا ہے۔ اس نے ان کی گھوڑیاں اور بھینسیں چھین لی ہیں۔ عورتوں، بچوں کو گھروں سے نکال دیا ہے اور ان کی کھڑی فصلوں پر اپنے آدمی بٹھا دیئے ہیں...... اندھیر ہے جی......''

''خون تو نہیں ہوا کوئی؟'' جمال نے پوچھا۔

''خون بھی ہوئے زیادہ تر سکھوں کے، مگر اکیلا دکیلا مسلمان بھی سکھوں نے شکار کر لیا۔ شکر ہے نور پور میں کوئی سکھ اب نہیں رہتا۔ ایک بابا وساکھا سنگھ تھا، اسے کسی نے لاہور میں مار ڈالا۔ پھر اس کا خاندان یہاں سے کوچ کر گیا۔ اب یہاں خدا کا فضل ہے۔ رہے ہندو تو وہ بہت شریف لوگ ہیں۔ مسلمان بھی ان کا لحاظ کرتے ہیں۔ شہرداری کا معاملہ ہے اور صدیوں سے ہم لوگ ساتھ ساتھ رہتے ہیں یہاں۔ بڑا اللہ کا فضل ہے جی۔''

## تین لاشیں

دیکھتے ہی دیکھتے سورج ڈوب گیا۔ شہر سٹیشن سے پانچ میل دور تھا۔ اندھیرا چھا گیا مگر اتنا بھی نہیں کہ کچھ نظر ہی نہ آئے۔ پھر افق پر چاند کی زردی بھی پھیل رہی تھی۔

چلتے چلتے جب تانگہ پرانے قبرستان کے پاس پہنچا تو جمال اور مشتاق کو سڑک پر پڑی ہوئی تین گٹھڑیاں دکھائی دیں۔ گھوڑا خوف کے مارے ہنہنایا۔ تانگہ رک گیا۔ سب اتر پڑے۔

سیتا کا گلا صاف کٹا ہوا تھا جیسے کسی نے اسے ذبح کیا ہو۔ اس کی گردن سے ابھی خون رس رہا تھا۔ وہ سرخ رنگ کے کیچڑ میں لتھڑی پڑی تھی۔

لالہ مایا رام اوندھے پڑے تھے۔ پگڑی ان کی لاش سے لپٹی ہوئی تھی۔ ان کے پیٹ سے خون کی دھار بہہ رہی تھی۔ ان کے ساتھ ہی ان کا چھوٹا بھائی، جس کے سینے میں پروئی ہوئی برچھی زمین کی طرف جھک رہی تھی۔ خون ابھی بہہ رہا تھا مگر تینوں میں سے کسی میں بھی زندگی کی کوئی رمق باقی نہ تھی۔

یہ منظر دیکھ کر سب گھبرا گئے۔ خون کی بو سونگھ کر گھوڑا پھر ہنہنایا۔ اس نے تانگے کو دولتیاں ماریں۔ نور پور شہر یہاں سے صرف ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔

تانگے والے نے گھوڑے کو سنبھالا، پھر سب سوار ہو کر شہر کی طرف بھاگے۔

صدر دروازے پر علاقے کا تھانیدار ذوالفقار علی شاہ رائفل لیے تن کر کھڑا تھا۔ اس نے کہا ''جلدی سے گھروں کو پہنچو۔'' پھر اس نے رائفل آسمان کی طرف چلا دی۔

تھوڑی دیر میں لالہ مایا رام، اس کے بھائی اور اس کی بیٹی کے قتل کی خبر نور پور کے گھروں میں پھیل گئی۔ عورتوں کے رنگ زرد ہو گئے۔ انہوں نے بچوں کو سینوں سے چمٹا لیا۔ مرد باہر سے فوراً ہی لوٹ آئے۔ سب حیران تھے کہ نور پور میں ایسا شقی کون ہو سکتا ہے جو بے گناہ ہندوؤں کے خون سے ہاتھ رنگے۔ اندازے سے بھی کوئی کچھ نہ بتا سکتا تھا کیونکہ نور پور میں تو ایسا شقی القلب کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

گھر کے لوگ محلے والے اور بڑے بوڑھے جمال اور مشتاق سے کرید کرید کر تفصیلات پوچھنے لگے کیونکہ سب سے پہلے بدنصیب مقتولوں کو انہی نے دیکھا تھا۔

اس رات روٹیاں زہر لگیں۔

جمال اور مشتاق ہاتھ ملتے تھے کہ ہم کیوں نہ لالہ مایا رام کے تانگے میں سوار ہو گئے۔ وہ ساتھ ہوتے تو کوئی شہر دار ان کے قتل کی جرأت نہ کرتا۔ سیتا بیچاری تو نور پور کو دارالامان سمجھ کر آئی تھی۔ وہ تو اتنی چھوٹی سی بچی تھی۔ ظالموں نے اس کا گلا کیوں کاٹ ڈالا۔ وہ چیختی اور فریاد کرتی ہوگی۔ اس کی معصومیت پر کیوں کسی کو رحم نہ آیا۔ رات ان کی جاگتے سوتے گزری۔ صبح اٹھ کر وہ نہانے کے لیے مسجد کو چلے گئے۔

## بے ایمانی عام ہوگئی

بھٹی چپ چاپ مسجد میں داخل ہوا اور ادب سے سلام کر کے مشتاق اور جمال کے پاس بیٹھ گیا۔

وہ ایک ناکام پہلوان تھا اور ان دنوں گلیوں میں پھیری لگا کر روزی کماتا تھا۔ وہ بہت ہنس مکھ آدمی تھا اور جمال اور مشتاق کا بہت احترام کرتا تھا۔

اس نے ایک میلی سی چادر اوڑھ رکھی تھی۔

بیٹھ کر بھٹی نے چادر میں سے ایک تلوار نکالی۔ اس کی دھار پر دندانے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''بے ایمانی عام ہوگئی ہے جی۔ ابھی پرسوں میں نے یہ بیس روپے میں خریدی تھی مگر ایک ہی کام میں بیکار ہوگئی۔ کچا لوہا تھا اس کا۔ خدا کا خوف نہیں رہا جی کسی کو۔''

تلوار پر جمی ہوئی چربی دیکھ کر جمال ڈر گیا۔

بھٹی بولا ''آپ سیانے ہیں۔ میں نے سوچا آپ سے پوچھوں کہ یہ چربی کس طرح ڈھلتی ہے۔ ولایتی صابن تو ہوگا آپ کے پاس؟''

''کیا کہہ رہے ہو بھٹی پہلوان؟ کیسی چربی ہے یہ؟'' جمال نے پوچھا۔

''رات کی بات کر رہا ہوں سرکار۔'' وہ تلوار پر نظریں جمائے ہوئے بولا ''جب آپ کا تانگہ گزرا تو ہم تینوں وہیں کھڑے تھے جھاڑیوں میں مگر آپ تو رکے ہی نہیں۔ ہمارا حال بھی نہ پوچھا۔''

''تو لالہ مایا رام کو تم نے قتل کیا؟''

"میں اکیلا کہاں تھا جی۔" بھٹی بولا "شیخ اور بابا قصائی بھی ساتھ تھے میرے۔ مایا رام کو میں نے تکبیر پھیری۔ شیخ نے اس کے بھائی کے سینے میں برچھی ماری۔ بوبے قصائی کا شکار چھوٹا تھا مگر اس سے لڑکی کی گردن کٹتی ہی نہ تھی۔ نرم بہت تھی جی۔ اسے کافی دیر لگی۔"

"کیا انہوں نے بھاگنے کی کوشش نہ کی؟" جمال نے پوچھا "وہ بھی تو تین تھے، پھر تانگے والا بھی تمہارا ساتھی تو نہ تھا۔"

"ہم نے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔ اور پھوجی سے کہا اوئے پھوجے تو بھاگ جا فوراً ورنہ تیری بھی خیر نہیں۔ وہ تانگہ بھگا کر لے گیا جی۔ لالہ مایا رام کا سارا سامان ساتھ لے گیا۔ لالا جی نے کہا میری بیٹی کو چھوڑ دے بھٹی پہلوان۔ مجھے مار ڈال۔ بڑی منتیں کرتا تھا جی، مگر میں نے فوراً اس کے پیٹ میں تلوار بھونک دی۔ مجھے اس پر رحم آنے لگا تھا اس لیے۔ آخر شہر دار تھا۔ شیخ نے ادھر اس کے بھائی کو ٹھنڈا کر دیا۔ بوبے نے لڑکی کو آرام سے زمین پر لٹایا۔ اس کی گردن سے ساڑھی ہٹائی اور تلوار پھیر دی۔ بوٹی نرم تھی، کٹتی نہ تھی۔"

"اس نے شور نہیں مچایا؟" مشتاق نے پوچھا۔

"بولی ہی نہیں سرکار۔" بھٹی حیران ہو کر بولا۔ "عجب صبر والی لڑکی تھی۔ گردن کٹنے میں درد تو ہوتا ہی ہے نا جی، جب تلوار بھی کند ہو مگر اس نے ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔ جب اس کی شہ رگ کٹ گئی تو وہ خرخر کرنے لگی۔ مجھے بڑا افسوس ہوا، اسے تڑپتے دیکھ کر۔ اتنے میں آپ کا تانگہ دور سے دکھائی دیا، ہم چھپ گئے۔ آپ آ جاتے تو مشکل پڑ جاتی۔"

"ہم کیا کر سکتے تھے بھٹی۔" مشتاق نے بے بسی سے کہا۔

"آپ وقت پر آ جاتے تو ہمیں روک دیتے۔ آپ کا لحاظ ہے جی اور کام خراب ہو جاتا تو شاہ جی ہمیں مار ہی ڈالتے۔"

"کون شاہ جی؟" جمال نے پوچھا۔

"اپنے شاہ جی تھانیدار سید ذوالفقار علی شاہ بادشاہ! یہ ان کا حکم تھا ورنہ ہمیں تو لالہ مایا رام سے کوئی دشمنی نہ تھی۔"

"تو یہ اس کا کہا تھا؟"

"حکم تھا جی۔ حکم تھا کہ جو بھی ہندو گاڑی سے اترے گھر نہ پہنچے۔ اب یہ قسمت کی بات ہے کہ اترے تو لالہ مایا رام اترے۔"

"مگر شاہ جی نے ہندوؤں کو مارنے کا حکم کیوں دیا؟"

## اسلام کا حکم

"انہوں نے کہا تھا کہ ہندو جالندھر میں گاڑیاں کاٹتے ہیں۔ مسلمانوں کی جان لیتے ہیں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کا لحاظ نہیں کرتے۔ شاہ بادشاہ نے کہا تھا کہ قتل کا بدلہ قتل ہوتا ہے اور یہ اسلامی کام ہے۔ اسلام کے حکم کو ہم کیسے ٹال سکتے تھے۔" جمال سوچ رہا تھا کہ اسلامی احکام کو جاہل کتنے غلط انداز میں سمجھتے ہیں۔

جمال اور مشتاق کو اپنے کانوں پر یقین نہ آتا تھا۔ وہ سمجھ نہ سکتے تھے کہ اتنا نرم گفتار اتنا باادب شخص اندر سے اتنا سنگدل قاتل بھی ہو سکتا ہے اور پھر اس کو اپنے جرم کا احساس ہی نہیں۔

جمال نے پوچھا "بھٹی پہلوان تمہیں کوئی پشیمانی نہیں کہ تم نے ظلم کیا؟"

"بڑی پشیمانی ہو رہی ہے جی اور بے بے نے رات کو جوتیاں مار کر مجھے گھر سے نکال بھی دیا تھا۔ شہر والے بھی مجھے بری نظروں سے دیکھتے ہیں مگر شاہ بادشاہ سے کون بات کرے۔ کس میں ہمت ہے؟"

"تمہیں ڈر نہیں لگتا کہ گرفتار ہو جاؤ گے، پھانسی چڑھ جاؤ گے۔"

"جب تھانیدار کا حکم ہو تو پھانسی نہیں چڑھ سکتا کوئی۔ تھانیدار چاہے تو بے گناہ رسے پر جھول جائے۔ شاہ بادشاہ مجھے پھانسی کے تختے سے اتار لیں گے، اگر کوئی بات ہوئی تو۔"

"اب آگے کیا پروگرام ہے بھٹی پہلوان؟" مشتاق نے پوچھا "کوئی اور حکم ملا؟"

"ابھی تو نہیں دیا کوئی حکم۔ وہ مجھ سے بہت خوش ہیں۔ پاسنگ شو کا ایک سگریٹ بھی پلایا انہوں نے اور کہا بھٹی پہلوان تیار رہ۔ ابھی اور کام ہے تیرے ساتھ مگر تلوار ٹھیک نہیں جی میری۔"

ولایتی صابن کی ٹکیہ اس نے ڈاب میں رکھ لی اور اینٹ سے تلوار کی دھار بنانے لگا۔

## اور بڑھی تاریکی

نور پور کے ہندوؤں نے جو شہر کے ایک حصے میں الگ تھلگ رہتے تھے، راتوں رات گھر خالی کر دیئے اور زیور، کپڑے کی گٹھڑیاں باندھ کر ان تین حویلیوں میں چھپ گئے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہندو خزانچی نے اپنے خاندان کے لیے تعمیر کروائی تھیں۔

قدیم نور پور کو نادر شاہ نے لوٹ کر جلا ڈالا تھا مگر چونکہ زمین زرخیز تھی اس لیے رنجیت سنگھ نے اسے اپنے خزانچی کو جاگیر میں دے دیا تھا اور موجودہ شہر اسی نے بسایا تھا۔ اس کی حویلیاں قلعوں کی شکل میں تھیں۔

مگر رات ہی رات میں مسلمانوں میں بھی ہراس پھیل گیا۔ قتل اور لوٹ مار کسی کو بھی پسند نہیں ہوتی۔ بے گناہ ہندوؤں پر ظلم کے خیال سے مسلمان عورتیں منہ میں پلو ڈال کر روئیں۔ انہوں نے اپنے جوان بیٹوں کو کمروں میں بند کر دیا اور مردوں کو لعن طعن کرنے لگیں کہ تم شہر کے غنڈوں، بدمعاشوں کو روک کر نہیں رکھتے۔ شریف گھرانوں کے مرد جن میں زیادہ تر دکاندار تھے، کچھ باسمتی چاول کے آڑھتی، کچھ لاٹ صاحب کے دفتر کے کلرک اور کچھ بیروزگار۔ اپنی عورتوں کے غم میں برابر کے شریک تھے، مگر سب شاہ بادشاہ ذوالفقار علی شاہ تھانیدار کے آگے بے بس تھے۔ بھٹی پہلوان بوبے قصائی اور کبے شیخ کی طرح!

بھٹی، بوبا اور شیخ اپنی اپنی تلواریں ٹھیک کرتے رہے مگر دوسروں نے جن میں زیادہ تر پھیری والے چھوٹے دکاندار اور بیروزگار تھے، ہندوؤں کی بند دکانیں لوٹ لیں اور کئی دکانیں خالی ہوگئیں تو انہیں آگ لگا دی گئی۔ شہریوں کا دھوئیں سے دم گھٹنے لگا۔

ناڈے کمہار کا بیٹا سب سے اچھا رہا۔ اس نے ساونی مل صراف کی دکان لوٹی اور زیوروں کی ایک پوٹلی آہنی الماری میں سے نکال لی۔ یہ زیورات علاقے کے مسلمان مزارعین نے بیج اور بیل خریدنے کے لیے شاہ جی کے ہاں گروی رکھے تھے۔ بہی کھاتوں کو اس نے پرزے پرزے کر ڈالا اور پھٹے ہوئے کاغذوں کو پاؤں تلے روند کر پوٹلی ڈاب میں اڑس لی۔

ناڈا کمہار مفلوج تھا۔ وہ سارا دن چارپائی پر پڑا رہتا۔ حکیم جی نے اسے دو وقت بکرے کی دیچی کا شوربہ پینے کا حکم دیا تھا مگر اس میں استطاعت نہ تھی۔ وہ خالی ہاتھ بھوکا پیاسا چیختا رہتا۔ اب اپنے بیٹے کی کمائی سے اس نے کئی برس بعد بکرے کی دیچی کی آش پی تو امید لگائی کہ میں جلد اچھا ہو جاؤں گا۔

اس کے بیٹے نے زیور اپنی ماں کے پاس رکھوا دیئے کہ حالات سدھریں گے تو کاروبار کروں گا۔

راتوں کو مسلمان چھتوں پر کھڑے اللہ اکبر کے نعرے مارتے۔ گلی میں کوئی اترتا نہ تھا کیونکہ اندھیرے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ مسلمان بھی مسلمان کا خون پی سکتے تھے اور ابھی تو ہندو بھی اپنی حویلیوں میں چھپے ہوئے تھے۔

## کہرام

اچانک شہر میں کہرام مچ گیا۔ بوبے قصائی کو سکھوں نے قتل کر ڈالا تھا۔ وہ پاس کے گاؤں سے ایک گجر سولویری بھینس کھول کر لا رہا تھا۔ کٹڑی اس کی ساتھ ساتھ چل رہی تھی کہ ایک سکھ جتھے نے اسے دھان کی ہری ہری کونپلوں میں لٹا کر چھری پھیر دی۔ کرپان اس کے کلیجے میں کھبی ہوئی تھی، جب لوگ اس کی لاش کو اٹھانے کے لیے پہنچے۔

بوبے قصائی کی میت پر عورتوں نے چھاتیاں پیٹ لیں اور دردناک بین کیے۔ مولوی محمد عطار نے جہاد کے فلسفے پر روشنی ڈالی اور کہا انہیں مرا ہوا نہ کہو جو اللہ کی راہ میں شہید ہوئے کیونکہ وہ تو زندہ ہیں۔ بوبے قصائی کی ماں کو مبارکباد دو کیونکہ اس نے ایک شہید بیٹے کو جنم دیا۔ مسلمانوں کے دل اس کی تقریر سن کر عشق الٰہی سے بھر گئے۔

دوسرے دن کئی فوجی ٹرک آ گئے، جن میں گورکھا پلٹن کے جوان کیل کانٹے سے لیس کھڑے تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کو حویلیوں سے نکالا اور آن کی آن میں بستی سے نکال لے گئے۔

## لوٹ مار

لوٹ مار ایک فریضہ بن گئی۔ پلنگ، کرسیاں یا صندوق پرانے کپڑے، دریاں، برتن، شیشے کے گلاس، پرانے لیمپ، کڑاہیاں، اناج کی بوریاں، گھی اور اچار کے مرتبان، چینی کے ڈبے، سروں، لندسوں اور پیٹھوں پر لد لد کر گھروں میں پہنچنے لگے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ سامان قابل استعمال ہو۔ ہندو کا مال لوٹنا ثواب کا کام تھا۔ پاکستان ابھی معرضِ وجود میں نہ آیا تھا مگر اس کی نظریاتی بنیاد پڑ چکی تھی۔

مسلمان عورتوں کو اس لوٹ مار پر بڑا دکھ تھا۔ دیکھتے دیکھتے بستے گھر برباد ہوئے مگر انہیں اس بات کی خوشی بھی تھی کہ بالآخر ہندو خاندان مسلمان غنڈوں کی دست برد سے آزاد ہو گئے اور کیمپ میں ان کی جانیں محفوظ ہیں۔ انہیں اس بات کی بھی خوشی تھی کہ نور پور میں کسی عورت کی عزت نہیں لٹی۔ اس بات کا غنڈوں اور قاتلوں کو بھی حوصلہ نہ ہوا تھا۔ شاہ بادشاہ سید ذوالفقار علی شاہ نے بھی اس کی اجازت نہ دی تھی، کیونکہ اسلام زناکاری پر سنگسار کر دیتا ہے۔ وہ صرف کافروں کے قتلِ عام ہی پر خوش تھے۔

لٹے ہوئے اور جلے ہوئے مال کے کوڑے سے راستے اٹ رہے تھے۔ حویلیوں میں بھوت ناچتے تھے۔ ڈیڑھ سو برس پرانی کمخواب کی رضائیاں جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہندو خزانچی نے اپنے سرداروں کی مہمانداری کے لیے بنوائی تھیں، پرزے پرزے گلیوں میں پڑی تھیں کیونکہ ان کا کمخواب چنگی چنگی ہو چکا تھا۔ پرانی بندوقوں سے بچے کھیلتے تھے۔ ہاتھیوں کے ہودے اوندھے پڑے تھے۔ پیتل کے ہزاروں کٹوروں سے جن میں فوجیں بھوجن کھاتی تھیں، نالیاں اٹ رہی تھیں۔ اونٹوں کے جاوے ٹوٹے پڑے تھے۔ وکٹوریہ کے عہد کا ایک بہت بڑا آرگن باجہ بچوں نے توڑ کر اس کی سروں کی سیٹیاں بنالی تھیں۔

مشتاق نے ایک ٹوٹی ہوئی ستار کا کدو ایک بچے کے منہ پر چانٹا مار کر چھین لیا۔ جمال نے فارسی کا ایک قلمی مسودہ زمین سے اٹھا لیا۔ اس کے آگے اور پیچھے کے ورق پھٹے ہوئے تھے، کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ اس کا موضوع کیا ہے۔ جمال نے اسے پھر کوڑے پر پھینک دیا۔

## سب کچھ بیکار

معلوم ہوتا تھا کہ سب کچھ بیکار ہو گیا ہے۔ پیچھے جو کچھ تھا ختم ہوا۔ آج کا خون نالی میں بہہ رہا ہے اور آنے والے کل کی صورت کسی نے دیکھی ہی نہ تھی۔ منزل نامعلوم پاکستان کہاں واقع ہے۔ ہندوستان کو راستہ کدھر سے نکلتا ہے۔ کوئی ہندوستان، پاکستان، مسلمانوں اور سکھوں کی پہچان کرا دے۔ اس خون کی پیاس کا ذمہ دار کون ہے اور یہ پیاس کیسے بجھے گی۔ کیا قائداعظم خطاوار ہیں؟ کیا یہ ماسٹر تارا سنگھ کا کیا دھرا ہے؟ کیا یہ مہاتماجی کی مذہبی سیاست کا زہریلا پھل ہے۔ کیا یہ انگریز کی آخری ٹھوکر ہے؟ یا کیا یہ ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے طبقاتی تضاد کا چٹکار ہے۔ تاریخ کا مطالعہ، سماجی شعور، اقتصادی پھندے، سیاسی رندے، مذہبی جنون سب کا حاصل خون۔ آگ، لوٹ مار، ظلم، کمزوروں پر، بچوں پر، عورتوں پر، بوڑھوں پر، نوجوانوں پر، اکیلوں پر اندھیرے کا دریا ہے کہ اپنے پاٹ میں پھیلتا ہی جا رہا ہے۔

ظلم سے آشفتہ پہلو میں درد کی کسک دبائے انسانوں کی حیوانیت پر حیران جمال لڑکھڑاتا ہوا گھر کو

چلا تو اسے ٹھیک سے راستہ دکھائی نہ دیتا تھا حالانکہ سورج ابھی ڈوبا نہ تھا۔

مشتاق شاہ نشین پر اداس بیٹھا تھا۔ ستار کے ٹوٹے ہوئے تونبے پر اس نے حسرت بھری نگاہیں جما رکھی تھیں۔

جمال کا دل چاہا کہ میں بھاگ کر لاہور چلا جاؤں جہاں مفتی میرا منتظر ہوگا۔ جہاں فدا محمد میرا دل بہلائے گا مگر لاہور کے راستے بند تھے۔ کوئی گاڑی، کوئی بس ان دنوں اُدھر جاتی نہ تھی۔

مشرقی پنجاب سے خوفناک آوازیں آ رہی تھیں۔ ستلج اور بیاس میں پھولی ہوئی مسلمان لاشوں پر بیٹھے گدھ بوٹیاں نوچ رہے تھے۔ کتوں کے پیٹ بھرے ہوئے تھے اور وہ انسانی اعضا کو کھیل ہی کھیل میں گھسیٹتے پھرتے تھے۔ ماؤں کے پیٹ پھاڑ کر نامکمل بچوں کو بلموں میں پرو دیا جا رہا تھا۔ کنواری عورتوں کے برہنہ جلوس نکلوا کر ان کے چاروں طرف بھنگڑا مارا جا رہا تھا...... یا دیسی شراب کے چھنّے پی کر کرپانوں سے ان کی شلواریں پھاڑی جا رہی تھیں۔

## سرخ آندھی

نورپور سے جو سرخ آندھی اٹھی وہ آس پاس کے دیہات تک پھیل گئی۔ مسلمان مجاہدوں نے ہندوؤں اور سکھوں کو گھروں سے بھگا دیا تھا اور بعض کو قتل بھی کر دیا تھا مگر وہ عورتوں کی بے حرمتی اور خون بہانے میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ وہ ان کے گھر لوٹ کر زیادہ خوش ہوتے تھے۔ پھر وہ گھروں کی دیواریں توڑتے، چولہے کھودتے، اور ان میں چھپی ہوئی دولت کو تلاش کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندو اور سکھ اپنا سونا یہاں کہیں رکھ گئے ہیں مگر عموماً زمین میں سے کچھ نہ نکلتا۔ پھر وہ کافروں کو گالیاں دیتے اور مکان کو آگ لگا دیتے یا چودھریوں کے قبضے کے لیے چھوڑ دیتے اور خود تھان پر بندھی ہوئی بھینس یا گھوڑی کھول کر واپس آ جاتے۔ ''ہندو بڑے چالاک ہیں، کچھ چھوڑ کر نہیں گئے۔'' وہ گھر آ کر کہتے۔

لوٹنے جلانے اور قتل کرنے والے مجاہدین کے دلوں سے خدا کا خوف تو پہلے ہی نکل چکا تھا۔ شاہ بادشاہ ذوالفقار علی شاہ تھانیدار نے قانون کا خوف بھی نکال دیا تھا اور وہ آدم خور درندے بن گئے تھے۔ ان کی صورتیں بھی بدل گئیں۔ ان کے چہروں ہی سے پتہ لگ جاتا کہ وہ قاتل اور لٹیرے ہیں۔

## رنگ لائے گا لہو

چند ہی دنوں میں دیہات میں لوٹنے کو کچھ نہ رہا۔ مسلمان غنڈوں میں رقابتیں شروع ہو گئیں اور بعض ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔

بوبے قصائی کے قتل کے بعد دیہات راتوں رات ہندوؤں اور سکھوں نے خالی کر دیئے تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ اب ہماری خیر نہیں، بعض دیہاتوں میں مسلمانوں نے خود کہہ دیا تھا کہ بھائی تم چلے جاؤ۔ اپنا سامان اور زیورات ہمیں دے جاؤ گے تو ہم تمہیں کچھ نہ کہیں گے مگر حاجی محمد دین نمبردار کے آدمی چڑھائی پر ہیں اور ان کا ہاتھ ہم پکڑ نہیں سکتے۔ چنانچہ پیشتر کو مال دے کر سلامتی سے نکل جانے کا موقع مل گیا۔ گائے، بھینس، گھوڑے اور بکری کی بات اور ہے مگر یہ بات مجاہدین کے حق میں کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے سکھوں اور ہندوؤں کی عورتیں نہیں چھینیں۔

بوبے قصائی کے قتل کے بعد اس کے بھائیوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ انہوں نے ہندوؤں اور سکھوں سے انتقام لینے کی بہت کوشش کی مگر جب کوئی ہاتھ نہ آیا تو ان کے اجڑے گھروں کو آگ لگانے سے جی بہلانے لگے۔

مجاہدین کی آپس کی رنجشوں کی افواہیں پھیلنے لگیں۔ کسی نے اڑا دی کہ بوبے قصائی کو سکھوں نے نہیں مارا۔ شیفے بھٹی نے مارا ہے۔ بستی توبہ توبہ کرنے لگی۔ شیفے بھٹی نے وضو کر کے مسجد میں قرآن اٹھا لیا کہ مجھے تو اس کے قتل کا دوسرے دن پتہ چلا۔ میرا تو وہ جگری یار تھا۔ لالہ مایا رام کو ہم نے مل کر قتل کیا تھا اور اس کے علاوہ بھی ہم نے وارداتیں کیں۔ ہم میں تو کبھی تو تو میں میں بھی نہ ہوئی۔

یہ بات بوبے قصائی کے بھائی نہ مانے۔ بات شاہ بادشاہ تک پہنچی انہوں نے تفتیش کے بعد فیصلہ سنایا کہ بوبے قصائی کو سکھوں ہی نے قتل کیا ہے۔ اب اگر اس کے بھائیوں نے قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کی اور اسلام کے خادم شیفے بھٹی سے الٹی سیدھی بات کی تو ان کے سارے خاندان کو سولی پر چڑھا دیا جائے گا۔

معاملہ دب گیا۔ شیفا بھٹی شیر ہو گیا اور پھیل پھیل کر چلنے لگا۔ وہ الزام کی اب بھی تردید کرتا تھا مگر اتنے زور سے نہیں۔ بات سن کر وہ پُرمعنی طریقے سے مسکراتا اور کہتا اگر کسی کا خیال ہے کہ یہ بھی اپنا ہی کام ہے تو ایسا ہی سہی' مگر اللہ جانتا ہے کہ بوبے قصائی کو میں نے نہیں مارا۔

## اپنا ہی کام

جمال نے کہا'' بھٹی پہلوان تو تو اپنا یار ہے۔ یاروں سے کیا پردہ؟''

''یاروں سے تو کوئی پردہ نہیں ہوتا جی۔'' بھٹی بولا'' پر بوبا قصائی آخر بھائی بھتیجے والا ہے۔ مٹی ڈالیے اس بات پر۔''

اصل میں وہ سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا مگر اس کا دل چاہتا تھا کہ جمال اور اصرار کرے۔ جمال نے بہت اصرار کیا تو اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا'' اب سمجھ بھی لو جی۔''

''یعنی بوبے قصائی کو سکھوں نے نہیں مارا۔''

''آہستہ بولیے جی۔ سکھ کسی کو کیا قتل کرتے۔ ان کو تو اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی۔ یوں بھی بوبا بزدل آدمی تھا۔ اکیلا دکیلا سکھوں کے قریب کب جاتا تھا۔''

''تو تم نے اسے قتل کیا۔ کیوں بھلا؟''

''بڑا کتی کا پتر تھا جی۔''

"بات کیا ہوئی۔"

"بس کچھ بھی نہیں جی۔ میری اس کی پہلے ہی سے لگتی تھی۔"

"کس بات پر؟"

"میری اس کی پچھلی سردیوں سے لگتی تھی جب ساونی مل نے ہمارے گھر کی قرقی کروائی تھی۔ میں نے بوبے کی منت کی کہ تم بولی مت دینا۔ آخر محلے داری ہے اور مسلمان کو اپنے مسلمان بھائی کا کچھ خیال کرنا چاہیے۔ اگر وہ بولی نہ دیتا تو ہمارا جدی پشتی گھر نیلامی سے بچ سکتا تھا' کیونکہ اور کوئی گاہک نہ تھا مگر اس کے باپ نے بولی دے دی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ ایک دن بدلہ لوں گا اس کتی کے بچے سے۔ اس دن ہم دونوں مندپور گئے تھے۔ دھیان سنگھ کا گھر لوٹ کر جب ہم گاؤں سے نکلے تو شام ہو رہی تھی۔ شروع میں تو میرا کچھ خیال نہ تھا مگر جب میں نے دیکھا کہ اندھیرا ہو رہا ہے اور دیکھنے والا کوئی نہیں تو اچانک دھان کے کھیت میں ہونے والی بات ہوگئی۔"

"مگر کیسے بھٹی؟"

"بس جی دھیان سنگھ کی کرپان جو میں نے اس کی پڑچھتی سے اٹھائی تھی، اس کی بغل میں گھونپ دی۔ باہر کھینچی تو گردن تک چیرا آ گیا۔ سکھوں کی کرپانیں بہت اعلیٰ لوہے کی ہوتی ہیں جی۔"

"پر تم نے ظلم کیا پہلوان۔" جمال نے کہا۔

"واپس آ کر میں نے کہہ دیا کہ سکھوں نے بوبے کو مار ڈالا ہے۔ ایسا ہو تو سکتا تھا نا جی۔"

جمال خاموش ہو گیا۔ بھٹی بولا "افسوس نہ کریں جی۔ وہ بڑا کتی کا بچہ تھا۔ قرآن کی جھوٹی قسمیں کھاتا تھا۔ مجھے کہا، مجھے کچھ نہیں ملا مگر وہ زخمی ہو کر گرا تو میں نے اس کی ڈاب سے کڑوں کی جوڑی نکالی اور تین مندریاں۔ اس کی جان نکل رہی تھی، اس وقت مگر اس نے دیکھ لیا کہ میں نے اس کا جھوٹ پکڑ لیا ہے۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بڑے آرام سے مرا جی وہ!"

## پاکستان زندہ باد

رات کے بارہ بجے جب آل انڈیا ریڈیو کے لاہور سٹیشن سے آواز آئی۔ یہ ریڈیو پاکستان ہے تو لوگوں کے دل خوشی سے دھک دھک کرنے لگے۔ چودہ اگست کا دن ختم ہو چکا تھا۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کا اعلان آدھی رات کو ہوا تھا مگر لگا کہ پندرہ کا دن چڑھ گیا ہے۔ عورت مرد چھتوں پر ایک دوسرے کو بلا بلا کر مبارکبادیں دینے لگے۔ لو جی اللہ کا فضل ہو گیا۔ ہمیں اپنا ملک مل گیا۔ ہم انگریز سے بھی آزاد ہو گئے اور ہندو سے بھی چھوٹے۔ اب امن وامان ہوگا، انصاف ہوگا، کاروبار کھلے گا اور جو بوئے گا سو کاٹے گا۔

پاکستان کے بارے میں لوگوں کے تصورات ایسے ہی تھے۔ ایک ایسا ملک جس کی بنیاد عدل اجتماعی پر رکھی جائے گی اور جس میں کوئی بھوکا نہ سوئے گا۔

یہ ریڈیو پاکستان کی آواز سن کر جمال بھی کچھ لمحوں کے لیے بھول گیا کہ میں کس زمان ومکان میں سانس لے رہا ہوں۔ وہ بھی خواب دیکھنے اور مسکرانے لگا۔ حالانکہ اس کے دل میں دکھ کی کرچیاں چبھی ہوئی تھیں۔ گزرے ہوئے سو برس اس کو پیچھے کھینچنے لگے کیونکہ آج کا دن انہی کی کوکھ سے پیدا ہوا تھا۔

## آزادی کے مجاہد

مغلوں نے شاعروں اور موسیقاروں کے منہ موتیوں سے بھرے مگر ریاضی اور سائنس پر ایک کوڑی خرچ نہ کی تھی۔ یوں بھی کوئی خانوادہ یا کوئی نظام حکومت سدا قائم نہیں رہتا۔ انگریز آئے تو مغلوں کا نظام گل سڑ چکا تھا۔ جاگیردار سلطنت کو برباد کر چکے تھے۔ پھر وہ انگریزوں کے ساتھ مل گئے مگر مسلمان کسانوں نے پھر بھی ہتھیار نہ ڈالے۔ حاجی شریعت اللہ، تیتو میر شہید، قاسم نانوتوی، احمد خاں کھرل مجاہدین ثمرقند، ریشمی رومال تحریک اور عبیداللہ سندھی ہندوستان کی آزادی کے روشن چراغ تھے۔

وہ انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد پر یقین رکھتے تھے۔ ادھر راجا رام موہن رائے، بپن چندر پال، آروبندو گھوش اور گوکھلے تھے جو انگریزوں کے خلاف دستوری جدوجہد کے علمبردار تھے۔ مولانا محمد علی جوہر، محمد علی جناح اور ابوالکلام آزاد نے بھی دستیاب حالات کی روشنی میں یہی راستہ اپنایا۔

پھر مہاتما گاندھی نے ہندوستان کی قومی جدوجہد کو ہندو قوم پرستی کا رخ دے دیا اور تاریخ تبدیل ہونے لگی۔ مسلح جدوجہد کے علمبردار بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد اور سبھاش چندر بوس بھی تھے مگر مہاتما جی ہندو اور انگریز سرمائے کے سانجھ کے نمائندے تھے مگر ان کے رام راجیہ کے نعرے نے ہندو ضمیر کو ہندوستانی ضمیر سے الگ کر دیا۔ کانگریس نے مسلمانوں کو ایک الگ قوم سمجھ کر ہندوستان کے اقتدار میں حصہ دار بنانے کی بجائے انہیں ایک کونے میں دھکیل دیا۔ محمد علی جناح نے چالیس برس تک ہندوؤں سے باعزت مفاہمت کی کوشش کی مگر گاندھی جی مسلمانوں کو ایک مقابل اور رقیب اقلیت جان کر سیاسی اور اقتصادی تحفظات دینے پر تیار نہ ہوئے۔ ناچار محمد علی جناح کو حقائق تسلیم کرنے پڑے اور وہ مسلم قومیت کا نعرہ لگانے پر مجبور ہوئے جس کا ادراک انہیں کانگریس کی ہندو قوم پرستی کی وجہ سے ہوا۔

محمد علی جناح ہندوؤں کے دشمن نہیں تھے۔ وہ تو ان کے ساتھ برادرانہ تعلقات چاہتے تھے۔ وہ سکھوں کے لیے بھی لڑے۔ اچھوتوں کے لیے بھی لڑے مگر ان کی کسی نے نہ سنی۔ مہاتما جی نے مسلمانوں کو تحفظات دینے کی بجائے ملک کی تقسیم کو پسند کر لیا۔

مگر کیا ہندوستان اور پاکستان کے مظلوموں کو انصاف ملے گا کیا انہیں تعلیم، صحت، روٹی، روزگار، باعزت اور مساوی زندگی بسر کرنے کا حق ملے گا؟

جن لوگوں کے جگر کٹ چکے تھے، کیا وہ اپنے زخم سی سکیں گے؟

انگریز یہاں سے چلا گیا مگر کیا اس کا قائم کردہ ریاستی ڈھانچہ اس کے افسر اس کے جاگیردار اور

اس کا اقتصادی نظام ہندو اور مسلمان عوام کی گردنیں چھوڑے گا؟ انہی خیالات میں کھویا جمال رات بھر سوتا جاگتا رہا۔

### نیا سویرا

نیا سویرا پرانے سویروں کی طرح لال اور آگ کی صورت دہکتا ہوا طلوع ہوا۔ کوئی بات بھی تبدیل نہ ہوئی تھی۔ وہی ویرانی، وہی بے بسی، وہی بے خبری۔

نئے سویرے پر بھی شاہ بادشاہ ذوالفقار علی شاہ تھانیدار کی آنکھوں میں مجنونانہ چمک تھی۔ اس کی خونخواری اور ظلم کی عادت پاکستان کے بن جانے کے باوجود بڑھتی جا رہی تھی۔ بات کرتا تو جوشِ انتقام سے جسے وہ جوش ایمان کہتا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ بہتی۔ مشرقی پنجاب سے آنے والی خبروں پر سب کے تن جلتے تھے مگر شاہ بادشاہ جن لوگوں سے انتقام لینا چاہتا تھا، وہ بے گناہ تھے۔

ہندو اب کہیں دکھائی نہ دیتے تھے اور اس بات پر شاہ بادشاہ پاگل کتے کی طرح غراتا تھا کیونکہ ہندو اور سکھ عورتیں، بوڑھے، بچے اور جوان اس کے ہاتھوں سے نکل کر جا چکے تھے۔

نور پور کے قاتلوں میں ذرا سی حیا ابھی باقی تھی۔ انہوں نے ابھی تک کسی عورت کی عزت نہ لوٹی تھی۔ وہ صرف ان کے کڑے اتارتے یا گلے کے ہار نوچتے رہے۔ اگر کہیں انہیں قتل بھی کیا تو سیدھے سبھاؤ ان کی گردنیں کاٹ دیں۔ عورتوں کی بے حرمتی کی کوئی جرأت نہ کرتا تھا۔

اس کی بڑی وجہ نور پور کی عورتیں تھیں جو کسی کی آبرو لٹ جانے کے تصور کو برداشت نہ کرتی تھیں اور قاتل بھی ان کے جذبات کا پاس کرتے تھے۔

تھوڑے دن اسی بے سمتی میں گزر گئے۔ بے سمتی میں اس لیے کیونکہ کوئی ان کو کچھ بتاتا نہ تھا۔ مسلم لیگ کے رضا کار لوٹ مار میں مصروف تھے۔ لیڈر وزارتوں کے لیے جوڑ توڑ کرتے تھے۔ قائداعظم نے حلف اٹھا لیا تھا مگر خزانے میں ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ مشرقی پنجاب اور ہندوستان سے مہاجرین کے سر کٹے قافلے آ رہے تھے۔

## باب 13

اچانک نور پور کی مضمحل اور لٹی ہوئی بستی میں ہلچل مچ گئی۔ خبر آئی کہ نور پور کے ریلوے سٹیشن پر جو شہر سے پانچ میل دور تھا، جہلم کے ہندو شرنارتھیوں کی گاڑی شاہ بادشاہ ذولفقار علی شاہ نے روک لی ہے اور اس گاڑی میں سونے کے پہاڑ ہیں۔

شاہ بادشاہ نے ڈونڈی پٹوادی تھی کہ رات کی مہلت ہے۔ سورج نکلنے سے پہلے علاقے کے تمام پگ بندھ جوان کلہاڑیاں، تلواریں، بلمیں اور چھرے لے کر ریلوے سٹیشن پر پہنچ جائیں ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

### آنکھ کے بدلے آنکھ

حکم آیا مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ بیاس اور ستلج پر کٹی ہوئی مسلمان گاڑیوں کا بدلہ لیں کیونکہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت حکم الٰہی ہے۔

حکم آیا کہ سورج نکلتے ہی گاڑی پر حملہ کر دیا جائے گا جو رہ گیا سو رہ گیا۔

ڈونڈی کی آواز سن کر جمال کا دل بیٹھ گیا۔ مشتاق نے کہا ''چلو ہم بھی چلتے ہیں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔''

جمال نے کہا ''چھوڑو، بے گناہ لوگ قتل ہوں گے۔ بہتا خون ہم سے دیکھا نہ جائے گا۔''

مشتاق ایک نرم دل آدمی تھا۔ سوچنے لگا۔

رات دونوں نے کروٹیں لیتے گزاری۔ سورج نکلا تو وہ بدحواس ہو کر اٹھ بیٹھے کیونکہ اس وقت نور پور کے ریلوے سٹیشن پر جہلم کے ہندو بوڑھے، بچے اور عورتیں قتل ہو رہی ہوں گی اور لٹیرے سونے کے پہاڑ سمیٹ کر جا رہے ہوں گے۔ دونوں نے شکر کیا کہ ہم موقعے پر موجود نہیں۔

دوپہر کو خبر آئی کہ گاڑی ابھی تک سلامت کھڑی ہے۔ اس کے آخری ڈبے میں لیفٹیننٹ محمد علی آٹھ سپاہیوں کے ساتھ مشین گنیں سیدھی کیے مسافروں کی حفاظت پر ڈٹا ہوا ہے۔ کسی کو گاڑی کے قریب آنے نہیں دیتا۔

خبر آئی کہ شاہ بادشاہ بھی اپنے فیصلے پر قائم ہیں۔ انہوں نے ریل گاڑی کی پٹڑی اکھڑوا دی ہے اور انجن ڈرائیور کو سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔ خبر آئی کہ گاڑی کے تمام دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند ہیں۔ مگر سونے کے پہاڑ لوٹنے کے لیے نور پور اور ارد گرد کے دیہات کے

پگ بندھ جوان تیار کھڑے ہیں اور ابھی آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔

شام ہوگئی۔ گاڑی اسی طرح کھڑی رہی۔ بہت سے پگ بندھ جوان تھک کر واپس چلے گئے۔

انہوں نے لیفٹیننٹ محمد علی کو موٹی موٹی گالیاں دیں جو اسلام کا حکم ماننے پر تیار نہ ہوا۔

اگلی صبح وہ پھر نور پور کے ریلوے سٹیشن پر جا پہنچے کہ شاید سونے کا کوئی گرا پڑا پہاڑ کوئی صندوق' کوئی بستر یا کوئی بالٹی ہی ہاتھ لگ جائے۔

دوپہر کو خبر ملی کہ گاڑی اسی طرح لوہے کے جنگلے والے پلیٹ فارم پر کھڑی ہے اور لیفٹیننٹ محمد علی ابھی تک ڈٹا ہوا ہے۔ ادھر شاہ بادشاہ نے بھی کہہ دیا ہے کہ میں اپنے باپ کا نہیں اگر میں گاڑی کو نکل جانے دوں۔

رات کو خبر ملی کہ لیفٹیننٹ محمد علی اور شاہ بادشاہ میں مذاکرات ہو رہے ہیں جو لوگ اکتا کر واپس آ گئے تھے، دن نکلتے ہی پھر چل پڑے کہ شاید سونے کا وہ پہاڑ جو رات بھر خوابوں میں ان کے سامنے رہا، ان کے ہاتھ لگ جائے یا پھر کوئی گرا پڑا بستر یا کوئی ڈول ڈبہ۔

مشتاق نے پھر کہا "جمال چلو دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ قتل خون کا تو اب کوئی اندیشہ نہیں۔ ہونا ہوتا تو ہو چکا ہوتا۔ ہندو مال حوالے کر دیں گے تو ان کو راستہ مل جائے گا۔"

اور جمال یہ سوچ رہا تھا کہ دو راتیں گزرنے کے باوجود اگر ہندوؤں کی جان سلامت ہے تو آگے بھی کوئی انہیں کچھ نہیں کہے گا، پھر اس کو فوج پر بھی بھروسہ تھا جس کو حکم تھا کہ گاڑی کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ اس نے کہا "چلو دیکھتے ہیں۔"

اختر انہیں پلیٹ فارم پر مل گیا۔ وہ جمال کا چھوٹا بھائی تھا جو چاول کا آڑھتی تھا۔ وہ ایک خوش باش، ہنس مکھ اور لطیفہ گو شخص تھا اور والدین سے گہری وابستگی کے باوجود آزادی کی زندگی گزارتا تھا۔ جمال کی خودسری سے قطع نظر وہ اس سے گہری محبت کرتا تھا اور وہ مشتاق کا بھی دلدادہ تھا۔

وہ تین دن سے مظلوموں کی حالت دیکھ رہا تھا۔ اسے اس بات سے بڑی اذیت ہو رہی تھی کہ اس گرمی کے موسم میں پانی کا ایک قطرہ بھی ان تک نہیں پہنچ سکا۔ تین روز میں چھوٹے بچے بھوک پیاس سے مر چکے ہوں گے اور ماؤں کے کلیجے چر چکے ہوں گے۔

شاہ بادشاہ کے لیفٹیننٹ کے ڈبے میں مذاکرات ہو رہے تھے۔ لوگوں کو یقین تھا کہ فوج کے آگے شاہ بادشاہ کی ایک نہ چل سکے گی اور انہیں خالی ہاتھ گھروں کو لوٹ جانا پڑے گا۔ دبی زبان میں بعض شاہ جی کو برا بھلا بھی کہہ رہے تھے کہ کیوں نہیں وہ لیفٹیننٹ کو قید کر لیتے۔

تھوڑی دیر بعد شاہ بادشاہ ڈبے سے اتر کر ایک طرف کو چل دیئے۔

## سونے کے پہاڑ

پھر گاڑی آہستہ آہستہ پلیٹ فارم سے کھسکنے لگی۔ بیٹھے ہوئے لوگ پگ بندھ جوان کھڑے ہو گئے۔ کھڑے ہوئے نعرے مارنے لگے اور چلتی گاڑی پر لاٹھیاں برسانے لگے۔ سونے کے پہاڑ ان کے ہاتھوں سے نکلے جا رہے تھے اور وہ اپنی بربادی کا تماشا خاموشی سے دیکھ نہیں سکتے تھے۔

واپس آ کر اختر نے کہا "شاہ بادشاہ کہتے ہیں کہ لیفٹیننٹ محمد علی بالآخر مان گیا ہے۔ میں نے اسے سمجھا دیا ہے کہ جب تک ادھر سے امرتسر کو جاتی ہوئی کوئی گاڑی مکمل طور پر صاف نہ کی جائے گی۔ ستلج اور بیاس کے پلوں پر مسلمانوں کا خون بہتا رہے گا۔ اس گاڑی کو سلامتی سے چھوڑ دینے کا مطلب ہے ہندو اور سکھ قاتلوں کو مشرقی پنجاب کے مظلوم مسلمانوں کے قتلِ عام کی چھوٹ۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم نے اپنی باعصمت عورتوں کو کافروں کی ہوس کا نشانہ بنا دیا۔ شاہ جی کہتے ہیں کہ یہ غیرت کا معاملہ ہے اور اگر تو اب بھی نہیں مانتا تو پھر میرے پاس بھی دس رائفلیں ہیں۔ پہلے ہمیں آپس میں فیصلہ کرنا پڑے گا اور یہ بات لیفٹیننٹ کی سمجھ میں آ گئی۔

شاہ بادشاہ کہتے ہیں کہ اب پلیٹ فارم سے نکل کر گاڑی کھلے میدان میں کاٹی جائے گی اور کسی ایک کافر کو بھی زندہ چھوڑا نہ جائے گا۔"

پھر اختر بھیا پلیٹ فارم سے نکل کر کھلے میدان میں رکی ہوئی گاڑی کی طرف بھاگنے لگا۔ جمال اور مشتاق سوچے سمجھے بغیر اس کے پیچھے لپکے۔ ابھی وہ گاڑی سے دور ہی تھے کہ فوجیوں نے مشین گن کا فائر کھولا اور تڑاتڑ گولیاں برسنے لگیں۔ پگ بندھ جوان سراسیمہ ہو کر الٹے بھاگے۔

مگر تڑاتڑ گولیوں کے باوجود نہ کوئی زخمی ہوا نہ کوئی گرا۔ پھر شاہ بادشاہ کا اشارہ پا کر پگ بندھ جوان نئے جوش اور ولولے کے ساتھ گاڑی پر پل پڑے وہ سمجھ گئے کہ لیفٹیننٹ محمد علی کا ارادہ کسی کو مارنے کا نہیں۔ وہ ہوا میں گولیاں چلا کر اس بات کی شہادت فراہم کر رہا تھا کہ میں نے تو ہجوم کو روکنے کی پوری کوشش کی تھی کہ بعد میں کوئی انکوائری ہو تو وہ اپنے فرائض میں غافل نہ پایا جائے۔

پگ بند جوان جو گاڑی کے دونوں طرف موجود تھے، چیونٹیوں کی طرح گاڑی سے چمٹ گئے۔

مشتاق، جمال اور اختر دہشت زدہ ہو کر ایک دیوار کے ساتھ لگ گئے۔

گاڑی میں زیادہ تر تعداد تھرڈ کلاس کے ڈبوں کی تھی۔ مجاہدوں نے دروازوں کے ہینڈل گھمائے اور اندر گھس گئے۔

جمال، مشتاق اور اختر کو دور سے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ کچھ کمزور چیخوں اور کلہاڑیوں، بلموں اور تلواروں کی حرکت سے معلوم ہوتا تھا کہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو کچلا اور کاٹا جا رہا ہے۔ مقتول فرش پر گرے جاتے تھے جیسے وہ گھاس کی گٹھڑیاں ہوں۔ پھر لاشیں ڈبوں سے نیچے پھینکی جانے لگیں۔ بوڑھی عورتوں کی جن کے پیٹ پھٹے ہوئے تھے، بوڑھے مردوں کی جن کی اوجھڑیاں باہر لٹک رہی تھیں۔ جوان جن کے سینے چرے ہوئے تھے۔ بچے جن کے سر کلہاڑیوں سے دو نیم تھے۔ سب مٹی کے ڈھیلوں کی طرح لڑھکنے لگے۔ چیخ نہ پکار۔

پھر صندوق، بستر، ٹوکریاں، برتن، بالٹیاں اور پتیلیاں گرنے لگیں۔

کچھ مسافر چپ چاپ کسی مزاحمت کے بغیر ڈبوں سے نیچے اتر آئے۔ زمین سے خون کے فوارے اچھلے مگر کسی نے آہ نہ کی۔ برچھا کھا کر کسی کو کوئی تکلیف نہ ہوئی۔

جو گر جاتا اس کی طرف کوئی لوٹ کر نہ دیکھتا۔ جو ابھی تک سانس لیتا ہوتا اسے ایک کلہاڑی اور کھانی پڑتی۔

پگ بندھ جوانوں کو اب نعرے مارنے کی فرصت نہ تھی۔ کروڑوں مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ میں وہ مشینی آدمیوں کی طرح نیزے اور کلہاڑیاں چلا رہے تھے۔ وہ بہت مصروف تھے۔

## ایف آئی آر

عین اس وقت شاہ بادشاہ تھانے میں بیٹھے واقعے کی ایف آئی آر لکھ رہے تھے کہ کیسے کافروں نے اچانک گاڑی روک کر نور پور کو لوٹنے کی کوشش کی اور کیسے لوگوں نے اپنی حفاظت کے خیال سے ان کی مزاحمت کی۔ انہوں نے لکھا کہ اس ہنگامے میں دونوں طرف کے آدمی زخمی ہوئے۔ عینی شاہدوں میں انہوں نے کچھ پگ بندھ جوانوں اور مسجد کے مولوی صاحب کے نام لکھ دیئے۔

آپس میں قاتلوں نے کوئی جھگڑا نہ کیا' جس نے جس صندوق پر ہاتھ رکھا، اس کا ہوا۔ جو عورت جس کے ہاتھ لگی اس نے لے لی، وہاں سب کے لیے سب کچھ تھا۔

جوان لڑکیوں کو کسی نے کچھ نہ کہا، پگ بندھ جوان انہیں گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔ ان بیچاریوں میں مدافعت کی طاقت نہ تھی۔ ان کو پتہ بھی نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ان کے ماں باپ بہن بھائی ان کی آنکھوں کے سامنے کاٹے گئے تھے۔ ان کے شیر خوار بچوں کی گردنیں ان کے سامنے اڑائی گئی تھیں۔ انہوں نے کسی سے احتجاج نہ کیا۔ وہ روئیں بھی نہیں۔ وہ چابی والی پتلیوں کی طرح چپ چاپ چلتی رہیں۔

## ایک پھرتیلا جوان

ایک پھرتیلا جوان آنکھ بچا کر گاڑی کی چھت پر چڑھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ مجھے کسی نے نہیں دیکھا۔ حالانکہ سب اسے دیکھ رہے تھے۔ چھت پر چڑھ کر وہ چت لیٹ گیا اور اس نے فرض کر لیا کہ میں نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہوں۔

اس نے سفید قمیص اور شلوار پہنی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی سونے کا پہاڑ نہ تھا۔ اس کی مٹھی میں اس کی جان کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے موت کو دھوکا دینے کی کوشش کی تھی اور یہ جرم پگ بندھ جوان معاف کرنے پر تیار نہ تھے۔ آن کی آن میں پانچ سات کلہاڑیاں چھت پر چڑھ گئیں۔

لڑکے نے انہیں دیکھا تو اٹھ کر آگے بھاگنے لگا۔ جست لگا کر وہ اگلے ڈبے پر کود گیا۔ کلہاڑیاں اس کے پیچھے پیچھے جیسے ہرن کے پیچھے کتے۔

اس نے دوسرا ڈبہ پار کیا، پھر تیسرا، پھر چوتھا، پھر پانچواں۔

پگ بندھ جوانوں کو یہ کھیل بہت دلچسپ لگا۔

بالآخر ہرن انجن تک جا پہنچا اور اس کے پچھلے حصے میں کود گیا جہاں پتھر کا کوئلہ رکھا تھا۔

فائر مین کا بیلچہ ابھی تک سرخ تھا۔ اس نے یہ بیلچہ دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھا کر گرے ہوئے نوجوان کے سر پر دے مارا۔ فوراً ہی بہتے ہوئے مغز کے گودے سے اس کی گردن سفید ہو گئی اور پتھر کے کالے کوئلے پر لال لال دھبے پڑ گئے۔ اس کے منہ سے بھی کوئی آواز نہ نکلی۔

فائر مین نے اسے ٹانگوں سے گھسیٹ کر انجن کی بھٹی میں جھونک دیا۔ چمنی میں سے کالے دھوئیں کا ایک بادل نکل کر پھیل گیا۔

لوٹنے والے اور قتل کرنے والے ہاتھ تھک چکے تھے۔ چھریاں اور تلواریں کند ہو چکی تھیں۔ بازو شل ہو چکے تھے اور ہندو ختم ہو چکے تھے۔ پگ بندھ جوانوں نے جن کے پاس سامان جمع ہو چکا تھا، واپس جانا شروع کر دیا مگر ایک ڈبہ ابھی تک بند تھا۔

## آخری ڈبہ

اس زمانے میں فرسٹ کلاس کے ڈبوں کے اندر موٹی موٹی چٹخنیاں لگی ہوتی تھیں تاکہ مسافروں کو سفر کے دوران کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔ پگ بندھ جوانوں نے اس ڈبے کو کھولنے کی کوشش کی تھی۔ ان کو پتہ تھا کہ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں عورتیں خوبصورت اور سونا وزن دار ہوتا ہے مگر اس دروازے کو کھولنا طویل محنت کا کام تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ دوسرے ڈبوں کی طرف چلے گئے تاکہ وقت ضائع نہ ہو اور سب کچھ دوسرے ہی لوٹ کر نہ لے جائیں۔

لیفٹیننٹ محمد علی نے جواب نیچے اتر کر تماشا دیکھ رہا تھا، انہیں اس کی طرف متوجہ کیا۔ پگ بند جوان اس پر پل پڑے۔ بے شمار کلہاڑیاں نئے ولولے کے ساتھ اس پر برسنے لگیں اور ساگوان کی بھاری لکڑی کی کھپچیاں آہستہ آہستہ اڑنے لگیں۔

پھر ایک سوراخ ہو گیا۔ اس کے آگے فوراً ہی ایک سبز رنگ کا بستر لگ گیا۔

نیزوں اور کلہاڑیوں نے اس کے پھوسڑے اڑانے شروع کر دیئے تھے۔ پھر ایک لوہے کا صندوق سامنے آ گیا۔

تھوڑی دیر میں کھڑکیاں توڑی جا چکی تھیں۔ اندر جوان اور خوبصورت لڑکیاں بھی تھیں جن کی وجہ سے مسافروں کے حوصلے اور بھی پست ہو چکے تھے۔ انہوں نے دروازہ کھول دیا۔

## دروازہ کھلا

پگ بند جوانوں کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے رک گئے۔ دروازے میں سفید بالوں والا ایک

بزرگ ہندو ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ وہ خزاں کے زرد پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے کہا ''بچو ہم تین دن کے پیاسے ہیں۔ ہمیں ایک گھونٹ پانی پلا دو، پھر بات سنو۔''

''مت سنو، مت سنو اس کی بات۔'' ہجوم چیخا۔ ''تم سب نیچے اترو پہلے۔''

''اترو اترو نیچے اترو۔'' سب بولنے لگے۔

''اترتے ہیں مہاراج۔'' بوڑھا ہندو بولا ''پر میری ایک پرارتھنا ہے......''

''بکتا ہے۔ بکواس کرتا ہے کافر کا بچہ۔'' آواز آئی۔

''میری پرارتھنا ہے کہ ہمیں مسلمان کر لو۔ کلمہ شریف تو مجھے پہلے ہی آتا ہے۔ لاالہ اللہ......''

''نیچے اتر سور کے بچے۔ ہمیں دھوکا دیتا ہے۔ کلمہ شریف مت پڑھ اپنے پلید منہ سے۔''

ہندو بزرگ ہاتھ جوڑے ہوئے نیچے اتر آیا۔ پیچھے پیچھے اس کے تین جوان بیٹے۔ تین جوان بہوئیں، تین بچے اور ایک بڑھیا جس نے سفید کھدر کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔

بزرگ ہندو سب کے آگے کھڑا ہو گیا اور نہایت عاجزی سے کہنے لگا ''مہاراج ہم تو دل میں پہلے ہی سے مسلمان ہیں۔ ہمیں مسجد شریف میں لے چلو۔ ہمیں نماز سکھا دو۔ لاالہ ال...... آہ''

وہ اللہ نہ کہہ سکا۔ کسی نے اس کے سینے میں بلم بھونک دی تھی۔ اس کے منہ سے اللہ کی بجائے ایک چھوٹی سی آہ نکلی۔ ہاہ!

پگ بندھ جوان نے بلم کھینچ کر اس کے سینے سے نکالی۔ پھر کلہاڑیاں اس کے بچوں کے ٹکڑے کرنے لگیں۔ آخر میں انہوں نے بڑھیا کو مارا۔ وہ کسی کام کی نہیں تھی اور اسے زندہ چھوڑنا بھی بے وقوفی کی بات تھی کیونکہ اس کا اب کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

پھر پگ بند جوانوں نے اس کی تینوں جوان بہوؤں کو چوٹیوں سے پکڑ لیا اور انہیں کھینچنے لگے۔ باقی پگ بندھ سامان پر ٹوٹ پڑے۔

عورتیں چپ رہیں۔ ان کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکا۔ انہوں نے اپنے تڑپتے ہوئے پیاروں پر ایک آخری نظر بھی نہ ڈالی۔ صندوقوں اور ٹوکریوں کی طرح وہ چپ چاپ قاتلوں کے پیچھے چلنے لگیں۔

سورج ڈھل رہا تھا مگر مسافروں کو ابھی بہت دور جانا تھا۔

## کرشنا کھڑی تھی

اختر، جمال اور مشتاق کو پتہ ہی نہ تھا کہ کرشنا ان کے سامنے کھڑی ہے۔ وہ چار سال کی بچی خالی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے سر پر چھوٹی چھوٹی مینڈھیاں گندھی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے کا رنگ کاغذ کی طرح سفید تھا۔ وہ پیروں سے ننگی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر لگتا تھا وہ سوئی ہوئی ہے یا اس کے سامنے اندھیرا ہے جس میں اسے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اسے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ میں یہاں کیوں کھڑی ہوں۔

کچھ دیر اختر، جمال اور مشتاق اسے دیکھتے رہے جیسے وہ وہاں کھڑی ہی نہ ہو۔ جیسے جگہ خالی ہو، مگر وہ جگہ خالی تو نہ تھی۔ وہاں تو کرشنا کھڑی تھی۔ انہیں اسے دیکھنا اور تسلیم کرنا پڑ گیا۔

مشتاق نے لپک کر اسے گود میں اٹھا لیا۔ پھر اچانک اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ جب اس نے دیکھا کہ کرشنا کی پیٹھ میں ایک چھرا کھبا ہوا ہے اور جمے ہوئے خون سے اس کا فراک کیچڑ ہو رہا ہے۔ اختر نے چھرا کھینچ کر نکالا تو زخم میں سے تازہ اور گرم خون کی دھار پھوٹ پڑی۔ کرشنا چپ رہی جیسے اسے درد کا احساس ہی نہ ہو۔

اختر نے چھرا دور پھینک دیا۔ وہ اسے بھول جانا چاہتا تھا۔ پھر تینوں کرشنا کو لے کر اختر کے چوبارے کو چلے۔ مشتاق نے زخم کو دیکھے بغیر اس پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ خون رک جائے۔

تینوں میدان میں پڑے ہوئے زخمیوں، مُردوں اور زندوں کو پیروں تلے روندتے ان کے اوپر سے پھلانگتے اور گرتے پڑتے آگے بڑھے مگر وہ گھر کا راستہ بھول گئے۔

## مُردے نے ٹانگ پکڑ لی

اچانک ایک مُردے نے جمال کی ٹانگ پکڑ لی۔ تیس پینتیس سال کی اس زخمی عورت کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ حالانکہ اس کے کولہے کے زخم سے چربی نکل رہی تھی اور اس کے گال پر جما ہوا خون کالا ہو چکا تھا۔

جمال نے کوشش کی کہ اس ناقابل برداشت دکھ سے اپنی ٹانگ چھڑا لے۔ مگر اس کے جسم میں طاقت نہ رہی۔ مجبور ہو کر اس نے اسے اٹھایا اور کندھے پر ڈال کر ساتھ لے چلا۔

پگ بندھ جوانوں نے اسے دیکھا تو انہیں افسوس ہوا۔ یہ عورت کسی کام کی نہیں تھی۔ گھنٹے دو گھنٹے میں مر جانے والی تھی۔ وہ اسے کیوں لے کر جا رہا ہے۔ مگر انہوں نے اسے کچھ نہ کہا۔ لاشوں کے اس شہر سے نکل کر اختر کے چوبارے تک پہنچنے میں انہیں ایک صدی لگ گئی۔

چوبارے کی گلی میں بندر جیسا گنوار ایک پیاری سی نوخیز لڑکی کو گھسیٹ کر لے جا رہا تھا۔ قاتل کا دایاں ہاتھ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ پیاس سے لڑکی کی زبان باہر لٹک رہی تھی۔ جمال چپ نہ رہ سکا۔ اس نے نرمی سے کہا ''چودھری صاحب ہمارا گھر سامنے ہے۔ اگر ایک منٹ ہمارے ساتھ چل کر اس کو پانی پلا دو تو اللہ خوش ہوگا۔ تین دن سے پیاسی ہے بیچاری!''

''تو اپنے کام سے کام رکھ باؤ۔'' گنوار غصے سے بولا ''میرا مال چھیننا چاہتا ہے۔''

''خدا کی قسم نہیں۔'' مشتاق نے کہا ''ایک قطرہ پانی پلا دے اس کو۔''

''تو اپنا کام کر۔'' وہ بولا۔ ''تجھے کیا۔''

اور پھر وہ اسے گھسیٹتا ہوا گلی میں غائب ہو گیا۔

## اب کیا کریں

اختر نے زخمی عورت کو تکیہ لگا کر بٹھا دیا۔ اس کا نام پاروتی تھا۔

پھر اختر نے چائے بنائی۔

مشتاق نے کہا ”کہیں سے ٹنکچر آیوڈین کی ایک بوتل اور روئی کا بندوبست کر یار۔“

مشتاق اور جمال نے گرم پانی سے کرشنا اور پاروتی کے زخموں میں جما ہوا خون دھویا تو دونوں درد سے سسکیاں لینے لگیں۔

ایسے گہرے گھاؤ جمال اور مشتاق نے کبھی دیکھے نہ تھے۔ ان کے ہاتھ کانپتے تھے۔ پھر انہوں نے پرچ میں چائے ڈال کر گھونٹ گھونٹ دونوں کو پلائی اور مجرموں کی طرح ان کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو گئے۔

تھوڑی دیر میں پاروتی نے ہوش سنبھال کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر اس نے نیفے میں سے ایک پوٹلی نکالی اور کہا ”یہی ہے میرے پاس اور کچھ نہیں رہا۔ یہ تم لے لو اور مجھ سے جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر لو۔ مجھے موت سے ڈر لگتا ہے۔“

اس کی بات سن کر مشتاق ایک بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ اس نے ہمیشہ عورتوں کو استعمال کی شے سمجھا تھا۔ اب اس کی خونخوار مردانگی ڈھاہ کر کے زمین پر گر گئی۔

وہ بچے سے ایک دم بوڑھا ہو گیا۔ ہاتھ جوڑ کر پاروتی سے کہنے لگا ”تم میری بہن ہو۔ ماں کی طرح مقدس اور محترم۔ مجھے اپنا بچہ سمجھو۔“

## کہاں ہے میرا بچہ؟

”بچہ؟“ پاروتی چونک کر بولی۔ ”کہاں ہے میرا بچہ۔ ابھی تو میں نے اس کو دودھ پلایا تھا۔“

پھر وہ کمرے میں اپنے نو ماہ کے بیٹے کو تلاش کرنے لگی جو میدان میں کسی تلوار سے کٹا پڑا ہو گا اور جس کے گرد کتے منڈلا رہے ہوں گے۔

وہ ایک ایک کو یاد کرنے اور بین کرنے لگی مگر آنسو اس کی آنکھوں میں خشک ہو چکے تھے۔

جمال نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ میں اندھا اور بہرہ ہو جاؤں اور پانی سے اپنے ذہن کو دھو کر صاف کر ڈالوں۔

اختر آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں ٹنکچر آیوڈین کی بوتل اور روئی کا پیکٹ تھا۔ پٹی اسے کہیں سے مل نہ سکی تھی۔

مشتاق اور جمال نے پاروتی اور کرشنا کے زخموں پر آیوڈین چھڑکی۔ ان میں روئی کے گالے بھرے۔ بستر کی چادر پھاڑ کر پٹیاں بنائیں مگر خون کا رسنا بند نہ ہوا۔ تھوڑی دیر میں پٹیوں پر خون کے چکتے جم گئے۔

رات کے آٹھ بج چکے تھے۔

## نئی مصیبت

اختر نے کہا ”بڑی مصیبت ہے ماموں۔“

”کیا ہوا؟“ مشتاق نے پوچھا۔

”ذوالفقار علی شاہ تھانیدار نے منادی کروادی ہے کہ جتنی عورتیں ہیں، انہیں نو بجے تک تھانے میں حاضر کر دیا جائے ورنہ سب کو گولی سے اڑا دیا جائے گا۔“

”مگر کیوں؟“ مشتاق نے پوچھا۔

”وہ چاہتا ہے کہ زخمی عورتوں کو قتل کر دیا جائے تاکہ لوگ زنا کاری کے گناہ سے بچ جائیں اور کل جب انکوائری ہو، کوئی شہادت دینے والا باقی نہ ہو۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ مشتاق نے فیصلہ کن الفاظ میں کہا ”ہم کرشنا اور پاروتی کو تھانیدار کے حوالے نہیں کر سکتے کسی صورت۔“

اختر نے کہا ”اس نے تھانے کے پچھواڑے میں ایک بہت بڑا گڑھا کھدوا لیا ہے جس میں قتل کرنے کے بعد عورتوں کو گاڑ دیا جائے گا۔ اس نے قاتل بھی تھانے میں بٹھا رکھے ہیں۔“

مشتاق نے ایک لمحے کے بعد کہا ”اختر کہیں سے تین بائیسکل پیدا کر۔ ہم انہیں گھر لے چلیں کسی طرح۔“

”مگر ذوالفقار علی شاہ کے آدمی سڑک پر کھڑے ہیں۔“ اختر نے جواب دیا۔

”کرشنا کو تو میں گود میں اٹھا لوں گا۔“ جمال نے کہا ”کہہ دوں گا میری بیٹی ہے مگر پاروتی کا کیا کریں۔“

مشتاق نے ایک بوڑھے آدمی کی طرح دانائی سے کہا ”اختر کہیں سے ایک برقعہ بھی پیدا کر۔“

تھوڑی دیر میں اختر اپنے پلے دار کی بیوی کا برقعہ لے آیا۔ طے پایا کہ پاروتی برقعہ پہن کر نوکر کے پیچھے پیچھے چلے کیونکہ وہ بیمار ہے اور اپنے خاوند کے ساتھ ہسپتال جا رہی ہے۔ کرشنا کو بھی وہی گود میں اٹھائے تاکہ وہ اس کی بیٹی لگے۔ جمال، مشتاق اور اختر آگے آگے چلیں اور ذوالفقار شاہ کے آدمیوں کو باتوں میں لگائیں تاکہ نوکر، پاروتی اور کرشنا کو نکل جانے کا موقع مل جائے۔

رات کو نو بجے جب ساری زخمی ہندو عورتوں کو تھانے میں پیش کرنے کا حکم تھا، مشتاق، جمال اور اختر گھر سے نکلے۔ اختر سپاہیوں کو پہچانتا تھا۔ اگرچہ اس وقت کسی نے بھی وردی نہیں پہنی ہوئی تھی۔ پیچھے پیچھے برقعے میں گرتی پڑتی پاروتی اور پلے دار کی گود میں کرشنا۔

جمال، مشتاق اور اختر تینوں سردار محمد سپاہی کے پاس جا کر رک گئے۔ اختر نے کہا ”بڑا ظلم ہوا ہے سردار محمد۔“

”ظلم تو ہوا ہے جی۔ مگر ادھر بھی تو کتے کی اولاد کسی کو چھوڑتے نہیں۔ اب ان کو بھی کچھ پتہ لگے گا۔“

اتنے میں اختر نے سگریٹ کی ڈبی اس کی طرف بڑھا دی اور مشتاق نے جلدی سے اس کے سگریٹ کو دیا سلائی دکھا دی۔ کش لے کر وہ بولا ”ظلم واقعی بہت ہوا ہے مگر ستلج اور بیاس پر سکھوں نے مسلمانوں کی تین گاڑیاں اسی طرح کاٹی ہیں۔ سنا ہے کہ پیدل قافلوں میں سے وہ ہماری عورتیں چھین کر لے جاتے ہیں حرامزادے۔ اندھیر مچا ہوا ہے اُدھر تو۔“

”ہاں میں نے بھی ایسا ہی سنا ہے۔“ جمال نے کہا۔

”جب تک ادھر سے کوئی سلامتی سے اِدھر نہ پہنچ جائے۔ شاہ بادشاہ یہاں سے کوئی گاڑی جانے نہ دے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ جمال نے کہا۔

## ان دیکھے راستے

اتنے میں نوکر پاروتی اور کرشنا کو لے نکل گیا۔ پاروتی کا کولہا زخمی تھا۔ برقعہ پہن کر اندھیرے میں ان دیکھے راستے پر چلتے ہوئے وہ لڑکھڑا رہی تھی۔ اس کے قدم سیدھے پڑتے نہ تھے۔ مگر سردار محمد سپاہی نے کچھ خیال نہ کیا۔

کوئی دو منٹ بعد جمال اور مشتاق نے پاروتی اور کرشنا کو سائیکلوں کے آگے بٹھا لیا۔ اختر آگے آگے چلا کہ کوئی خطرہ ہو تو خبردار کر دے۔

انہیں اس اندھیرے میں یہاں سے پانچ میل تک اس ویران اور وحشت ناک سڑک پر چلنا تھا۔ جرنیلی سڑک پر بڑا خطرہ تھا۔ ڈوگروں اور گورکھوں کے فوجی ٹرک اچانک آ نکلتے تھے اور راہگیروں کو نام پوچھے بغیر گولی مار دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس وقت سڑک پر جو بھی ہے وہ قاتل اور لٹیرا ہے۔

مشتاق کو اندیشہ تھا کہ گورکھوں اور ڈوگروں کو دیکھ کر پاروتی شور مچا دے گی اور ہم سب مارے جائیں گے۔ اس لیے وہ ٹرکوں کی روشنیاں دیکھتے تو کچے پر اتر جاتے اور کرشنا اور پاروتی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتے کہ وہ بولنا بھی چاہیں تو بول نہ سکیں اور اسی طرح رک رک کر رات کے دو بجے وہ نور پور شہر کے تھانے کے سامنے سے پہنچے۔ سپاہی نے للکارا تو انہوں نے جواب نہ دیا۔ تینوں نور پور کی تنگ گلیوں میں غائب ہو گئے۔

زخمی پاروتی اور کرشنا کو دیکھ کر گھر کی عورتوں نے رونا شروع کر دیا۔ سب قاتلوں کو کوسنے اور بددعائیں دینے لگیں۔ پھر کرشنا اور پاروتی کی منتیں کرنے لگیں۔ ”اللہ کے واسطے ہمیں معاف کر دو۔ ہم مسلمان بڑے ظالم ہیں۔ اللہ کے واسطے......“

پھر انہوں نے دودھ گرم کیا۔ بستر بچھائے اور ان کو سہلانے اور ملنے لگیں۔

پاروتی کو انہوں نے ایک چارپائی پر ڈال دیا۔

مشتاق نے کہا ”کرشنا میری فرتو کے ساتھ سوئے گی۔ دونوں میری بیٹیاں ہیں۔ میرا بستر ان کے ساتھ لگے گا اور ان کی امی پاروتی کے ساتھ چارپائی بچھائے گی۔ باقی سب لوگ ہٹ جائیں تاکہ ان بیچاریوں کو کچھ آرام ملے۔“

اس رات دراصل کوئی بھی نہ سویا۔ زخمی کرشنا اور پاروتی بے سدھ پڑی رہیں۔ وہ اچانک آنکھیں کھول کر خلا میں تکنے لگتیں۔ پھر بند کر لیتیں جیسے وہ کچھ دیکھنا ہی نہ چاہتی ہوں۔ مشتاق کی بیوی نے ان کے سرہانے بیٹھ کر ساری رات گزار دی۔

# باب 14

صبح سویرے ہی شہر میں کہرام مچ گیا۔ عورتیں چھاتیاں پیٹنے اور لمبے لمبے بین کرنے لگیں۔ تن بدن دکھ سے جلنے لگے۔ کھانے پکانے کا کسی کو ہوش نہ رہا۔ صبح سویرے ہی سب کو پتہ چل گیا کہ نور پور کے پگ بندھ جوان رات بھر عورتوں اور بچوں کو کٹی ہوئی گاڑی سے اٹھا کر نور پور لاتے رہے۔ قاتلوں کی ماؤں بہنوں نے انہیں فوراً اپنی حفاظت میں لے لیا تھا اور اپنے قاتلوں کو گھروں سے نکال دیا تھا۔ اب وہ ہر مرد کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔

## ماسی اقبال

ماسی اقبال نے اپنے سفید ریش میاں کی بہت بے عزتی کی۔ حالانکہ وہ تو مسجد سے نکلا بھی نہ تھا۔ اپنے دیور کو انہوں نے جوتیاں مار کر گھر سے نکال دیا جو بملا کو اٹھا کر لایا تھا۔

بملا کھیوڑے کے ٹکٹ کلکٹر کی بیٹی تھی جس نے اس سال میٹرک پاس کیا تھا۔ وہ ایک زرد معصوم بچی تھی۔ اس کی لیڈی ہملٹن کی مونگیا رنگ کی شلوار پر خون کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ ماسی اقبال کے دیور نے بملا کے بھائی، بھاوج اور اس کے دو بچوں کو بملا کی آنکھوں کے سامنے کلہاڑیاں مار کر قتل کیا تھا۔ پھر وہ ان کے دونوں سوٹ کیس سر پر رکھ کر رات بھر بملا کو پانچ میل کھیتوں میں گھسیٹتے ہوئے صبح سویرے نور پور لایا تھا۔

ماسی اقبال بملا کو سینے سے لگا کر بے تحاشا روئی، پھر اس نے اپنے خاوند کی صورت پر تھوک دیا۔

ماسی اقبال پینتالیس برس کی ایک خوبصورت عورت تھی۔ اس کی اصول پسندی، دانائی اور عزت نفس کا سارا محلے میں بڑا رعب تھا۔ وہ بے حد غریب تھی۔ اپنے بچوں کو دو وقت کی روٹی بھی بڑی مشکل سے دے سکتی تھی۔ مشتاق نے کہا ''ماسی اقبال تم بملا کو میرے حوالے کر دو، تم پر بوجھ ہوگی۔''

وہ بولی ''میں اس کی خدمت خود کروں گی۔ اسے روٹی دوں گی۔ چاہے میرے بچے بھوکے رہیں۔ میں خود اس کی عزت کی حفاظت کروں گی۔ مجھے کسی اور پر بھروسہ نہیں۔ وہ اللہ کی امانت ہے۔''

مشتاق دن بھر کرشنا اور پاروتی کی خدمت کرتا۔ وہ بازار سے آئیڈوفارم کا ایک پیکٹ لے آیا جو زخم میں پیپ پڑنے نہیں دیتا۔ وہ ان کی گندی پٹیاں کھولتا اور زخموں کو گرم پانی سے دھو کر پھر باندھ دیتا۔

کرشنا کے لیے وہ بازار سے کھلونے لایا۔ وہ عام طور پر چپ رہتی۔ کسی سے بات نہ کرتی تھی مگر مشتاق سے وہ کسی قدر مانوس ہو گئی تھی۔

پاروتی کھانا نہ کھاتی تھی۔ کہتی مجھے بھوک نہیں۔ مشتاق سمجھ گیا کہ پاروتی ڈرتی ہے کہ مجھے گائے کا ماس کھلا دیا جائے گا اور میرا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔

مشتاق نے کہا ''پاروتی تم خود مونگ کی دال پکا لو اور جب تک تم اس گھر میں ہو یہاں ماس نہیں پکے گا، نہ چھوٹا نہ موٹا۔''

## شور قیامت

رات کے بارہ بجے جب جمال ابھی سویا نہ تھا، ماسی اقبال کے گھر سے ایک شور قیامت اٹھا۔ چیخوں اور گالیوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ماسی اقبال اور مشتاق کے گھروں کی دیوار ایک تھی۔ سب لوگ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

گلی میں ایک مدھم لالٹین کی روشنی میں ماسی اقبال، اس کا بوڑھا میاں اور کچھ اور لوگ زمین پر پڑی ہوئی بملا کو گود میں اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ درد سے کراہ رہی تھی۔ اس کے پاؤں زخمی تھے۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہونے کے قابل نہ تھی۔ سب نے مل کر اسے اٹھایا اور ڈنڈا ڈولی کر کے اوپر لے چلے۔

یونس کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

یونس کو ماسی اقبال نے اسی دن گھر سے نکال دیا تھا جب وہ بملا کو اغوا کر کے لایا تھا۔ رات کو وہ خود اوپر کی چھت پر سوتی تھی کہ اوپر سے کوئی حرام خور کود کر بملا کی عزت پر ہاتھ نہ ڈالے۔ نیچے وہ دروازے کو تالا لگا دیتی۔ درمیانی منزل پر بملا دونوں طرف سے محفوظ ہو کر رات گزارتی تھی۔

اس رات یونس آدھی رات کو دیوار پر چڑھ کر کھڑکی سے اندر کود گیا۔

بملا ڈر گئی۔ اسے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ اپنے دیور کی حرامزدگی میں ماسی اقبال کی رضامندی شامل نہیں ہے۔ اس کا شور مچانا اور فریاد کرنا لاحاصل تھا۔ اس نے یونس کی بڑی منتیں کیں۔ ہاتھ جوڑے پاؤں پکڑے مگر یونس پر بھوت سوار تھا۔ مایوس ہو کر بملا نے کہا ''اچھا میں تمہاری بات مان گئی مگر کرپا کر کے مجھے بدنام نہ کر دینا۔''

یونس نے کہا ''قرآن کی قسم میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ قرآن کی قسم میں برا آدمی نہیں۔''

بملا بولی ''ایک منٹ کی مہلت دو ورنہ میرا پیشاب نکل جائے گا۔''

یونس نے کہا ''بمل رانی جی۔ تم پیشاب کر لو۔ میں منہ دوسری طرف کیے لیتا ہوں۔''

یونس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ بملا نے کھلی کھڑکی سے گلی میں چھلانگ مار دی۔

یونس تو فوراً ہی فرار ہو گیا مگر شور مچ گیا۔ بملا کے کراہنے سے محلے کی عورتیں جاگ گئیں۔ انہوں نے اپنے مردوں کو بستروں میں سے گھسیٹ کر باہر نکالا اور ان کی گردنیں پکڑ پکڑ کر مجبور کرنے لگیں کہ وہ اسی

وقت تمام اغوا شدہ ہندو عورتوں کو برآمد کرائیں جن کی عزتیں قاتلوں اور غنڈوں کے ہاتھوں خطرے میں ہوں گی اور اگرچہ ان کی ماؤں، بہنوں نے مظلوموں کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔ وہ وہاں محفوظ نہیں ہیں۔ جس طرح بملا پر حملہ ہوا اسی طرح دیگر لڑکیوں پر بھی مردود جتھے مار سکتے ہیں۔ یہاں ان بیچاریوں کا کون سگا بیٹھا ہے۔

مردوں نے گلی میں میٹنگ کی۔ پھر انہوں نے دوسرے محلوں کے اشرافوں کو جمع کیا۔ شہر میں کل بائیس لڑکیاں اغوا ہو کر آئی تھیں اور سب کو پتہ تھا کہ وہ کس کس گھر میں ہیں۔ وہ عورتوں کی حفاظت میں تھیں مگر انہیں یوں چھوڑا نہ جا سکتا تھا۔ مرد لالٹینیں لے کر گھر گھر پہنچے اور سوتی جاگتی لڑکیوں کو برآمد کر کے نجیب اور شریف گھروں کے سپرد کرنے لگے۔ صبح کی نماز تک وہ فارغ ہو گئے۔ کسی کی عزت ابھی تک لٹی نہ تھی اور یہ اللہ کا بڑا فضل تھا۔

## زخم بھرنے لگے؟

دو چار روز میں کرشنا اور پاروتی کے زخم بھرنے لگے اور یہ کسی قدر حیرت کی بات ہے۔ نہ انہیں کسی نے ٹیکہ لگایا نہ کوئی گولی کھلائی نہ کسی نے ان کے زخم سیئے۔ ابلے ہوئے گرم پانی اور آئیڈوفارم کے دھوڑے نے کرشمے دکھا دیئے۔ آئیڈوفارم کا دھوڑا زخموں پر مرچیں لگا دیتا تھا اور پٹی زخموں سے چپک جاتی تھی جسے نکالنے سے تازہ سرخ خون ٹپکنے لگتا تھا مگر اس نے زخموں میں پیپ پڑنے نہ دی تھی اور وہ سوکھنے اور سکڑنے لگے۔ مشتاق کا خیال تھا کہ اس میں اس کے ڈاکٹری علم کا بھی دخل ہے۔

کرشنا بستر سے اٹھ کر مشتاق کی بیٹی سے کھیلنے لگی تھی۔ پاروتی نے بھی اپنے ہنستے بستے گھر کی جھلکیاں دکھانی شروع کر دیں مگر وہ اپنے پیاروں کی یاد میں چھلک چھلک کر رونے لگتی تو گھر کی ساری عورتیں اس کو سینے سے لگا کر بین کرنے لگیں۔

پاروتی مشتاق کو دعائیں دیتی اور ماسٹر تارا سنگھ اور پنڈت نہرو کو کوستی۔ گاڑی کے قتلِ عام کا ذکر اس نے کبھی نہ کیا۔ عورتیں شرمندہ تھیں اور چاہتی تھیں کہ کسی طرح پاروتی شرنارتھی کیمپ چلی جائے اور فوج کی حفاظت میں ہندوستان پہنچ جائے۔

کرشنا کا کوئی حل نہ تھا۔ اس کو اپنے وارثوں کا کچھ پتہ نہ تھا۔ مشتاق نے فیصلہ کیا کہ میں اسے اپنی بیٹی بنا کر فرتو کے ساتھ پالوں اور پڑھاؤں گا۔

وہ اسے پیٹھ پر لاد کر بازار لے جاتا، مٹھائی اور پھل دلواتا اور دبے دبے آرزو کرتا کہ کوئی اغوا شدہ ہندو عورت اسے دیکھ کر پہچان لے شاید اس کی ماں یا کوئی بہن نور پور میں زندہ لائی گئی ہو۔ بہانے بہانے وہ ان تمام گھروں میں جاتا جن میں اغوا شدہ ہندو عورتیں لائی گئی تھیں، مگر کرشنا کا کوئی رشتہ دار اسے نہ ملا۔

## جامو چاچا کا منصوبہ

جامو چاچا کا خیال تھا کہ سیدھی طرح کوئی غنڈہ کوئی قاتل چھینی ہوئی ہندو عورتوں کو ان سے ملنے نہ دے گا پھر وہ نور پور کے اردگرد کے دیہات میں بھی موجود ہیں۔ ان دیہات کا چکر لگانا چاہیے اور کوئی ترکیب لڑانی چاہیے جس سے دہقانی غنڈے ہندو عورتوں کو چھوڑ دیں۔

ترکیب کے مطابق مشتاق نے اپنے مرحوم تھانیدار باپ کی برجس پہنی۔ لمبے شکاری بوٹ پھر سے پالش کر کے گھٹنوں تک چڑھائے۔ فوجیوں والی خاکی قمیص پر کارتوسوں کی پیٹی لٹکائی اور سر پر سولا ٹوپ منہ میں پائپ اور ہاتھ میں باپ کی بندوق لے کر وہ گھوڑے پر سوار ہو گیا جس کی کاٹھی پر جامو چاچا نے ریشمی چادر ڈال دی تھی۔

پیچھے پیچھے جمال ایک ٹٹو پر اور جامو چاچا پیدل۔ وہ ایک گھوڑا اپنے لیے بھی مہیا کر سکتا تھا مگر مشتاق کی افسری کا رعب جمانے کے لیے اس کا ساتھ ساتھ پیدل بھاگنا ضروری تھا۔ چنانچہ تینوں افسری کے روپ میں گاؤں گاؤں گھوم کر کرشنا کی کسی رشتہ دار عورت کی تلاش میں لگ گئے۔

گاؤں کے قریب پہنچ کر جاموں چاچا بھاگ کر چودھری یا نمبردار کے پاس جاتا اور کہتا صاحب کا حکم ہے کہ جو لڑکی اس گاؤں میں لائی گئی ہے، اسے پیش کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی وہ صاحب کے غصے کا نقشہ کھینچتا اور سب کو خوفزدہ کرتا۔

جمال کو بھی ٹٹو سے اتر کر بات کرنے کی اجازت تھی کیونکہ وہ صاحب کا پیشکار تھا۔

افسروں کے گاؤں کے دائرے میں پہنچتے ہی لسی کے مٹکوں، دودھ کے بڑے بڑے گلاسوں، جن کی سطح پر موٹی موٹی بالائی تیر رہی ہوتی اور مکھن کے پیڑوں کی بہار آ جاتی۔ پھر میلی چادروں میں لپٹی ہوئی مظلوم ہندو عورتیں گھروں سے نکال نکال کر صاحب کی خدمت میں لائی جاتیں۔

مشتاق پائپ پیتا رہتا۔ جمال پوچھتا ''تم میں سے کرشنا کی ماں کون ہے۔ کوئی اسے جانتا ہے؟ کرشنا چار برس کی بچی ہے۔ اس نے مینڈھیاں کر رکھی تھیں۔ اس نے شلوار اور فراک پہن رکھا تھا۔ اس کی پیٹھ میں کسی نے چھری مار دی تھی۔ اب اس کے زخم بھر گئے ہیں۔ وہ اس وقت سرکار کی حفاظت میں ہے۔ کوئی اس کی ماں یا بہن کو جانتا ہے؟''

مشتاق اور جمال کو جامو چاچا گاؤں گاؤں لے کر پھرا۔ چار برس کی کرشنا جس نے مینڈھیاں کر رکھی تھیں، کو پہچاننے والی کوئی عورت انہیں نہ ملی۔ ہفتے بھر کی تلاش کے بعد وہ تھک کر بیٹھ گئے۔ کرشنا کا کہیں بھی کوئی وارث نہ تھا۔

شہر کے اشراف جتنی بھی عورتیں برآمد کرا سکے، انہوں نے کروا لیں مگر بعض دور افتادہ محلوں میں اور کمہاروں کی نواحی بستی میں کچھ عورتوں کو چھپا لیا گیا تھا۔ اب کمہاروں سے جھگڑا کون کرے خاص طور پر ان حالات میں۔

پھر شہر کے بڑوں نے نور پور کے غنڈوں کی سرکوبی کا فیصلہ کیا کیونکہ لڑکے ہاتھوں سے نکلے جا رہے

تھے۔ لوٹ مار اور قتل وغارت سے ان کے دیدے ڈھل گئے تھے۔

شہر کے تمام معتبر، خواجے، شیخ، پٹھان، سید، لاٹ صاحب کے دفتر کے بابو، قصائیوں اور سناروں کے بزرگ، سکول کے ہیڈ ماسٹر، خواجہ قطب دین، رولدو علی نواز، مولوی میاں محمد کاتب، جامع مسجد کے خطیب اور انجمن شباب المسلمین اور خادمانِ اسلام کے دیرینہ کارکن مل کر بیٹھے اور انہوں نے گھروں کی فہرست بنائی جن میں لوٹ کا مال آیا تھا۔

انہوں نے حمائل شریف گلوں میں لٹکائی اور جلوس کی شکل میں گلی گلی دروازوں پر دستک دینے لگے۔

## بیت المال

ماسی اقبال نے بملا کے دونوں سوٹ کیس بیت المال کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ ان کی مالک بملا زندہ سلامت اس کے گھر میں موجود تھی۔ جامع مسجد کے خطیب نے فتویٰ دیا کہ شرعی طور پر ماسی اقبال کا موقف صحیح ہے۔ گاڑی یکطرفہ کاٹی گئی تھی۔ ہندوؤں نے غزوے میں کوئی مزاحمت نہ کی تھی۔ اس لیے سوٹ کیس اپنے وارث کی موجودگی میں مالِ غنیمت شمار نہیں ہو سکتے۔

بملا کے ٹخنے زخمی تھے۔ ماسی اقبال ان پر کڑوے تیل کی مالش کرتی مگر وہ ابھی رینگ رینگ کر اور دو دو لاٹھیاں لے کر چلتی تھی۔ اس نے کہا ''مولوی صاحب یہ دونوں سوٹ کیس میں آپ کو خود دیتی ہوں۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں۔'' مگر ماسی اقبال نے دروازہ بند کر دیا اور معززین چپ چاپ چلے گئے۔

کرشنا اور پاروتی کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔

معززین انہیں چھوڑ گئے۔ ''بیت المال غیر مسلموں کا ذمہ دار نہیں۔'' مولوی صاحب نے کہا۔

کالو ترکھان کے بیٹے نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر کہہ دیا کہ میں تو اس روز ریلوے سٹیشن پر گیا ہی نہ تھا۔

سب کو پتہ تھا کہ کالو ترکھان کا بیٹا نہ صرف اس روز ریلوے سٹیشن پر موجود تھا بلکہ اس نے کئی ہندو کلہاڑی سے قتل کیے تھے مگر اس نے کسی عورت کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ وہ دو چمڑے کے صندوق اور ایک ٹوکری اٹھا کر لایا تھا اور اب ان کے گھر میں گوشت پکنے لگا تھا۔ حالانکہ کام سارے بند پڑے تھے۔ اس نے قرآن کی جھوٹی قسم کھائی تھی۔ اس پر عورتوں کے کلیجے کانپ گئے۔

کالو ترکھان کی ماں کا بھی کلیجہ کانپ گیا جو کھڑکی میں بیٹھی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اپنے بیٹے کو قرآن کی جھوٹی قسم کھاتے دیکھ کر وہ روتی پیٹتی نیچے اتر آئی۔ خوفِ خدا سے اس کا چہرہ زرد تھا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

اس کے ہاتھ میں زیوروں کی ایک پوٹلی تھی۔ وہ اس نے خطیب صاحب کے آگے رکھ دی۔ پھر قرآن شریف کو چوما اور اپنے بیٹے کو دو تھپڑ مار کر کہنے لگی ''اللہ کرے تو کھڑا کھڑا مر جائے۔ تجھ پر اولوں کا جھکڑ برسے۔ تجھ پر بجلی گرے اور تیری خاک اڑ جائے۔ تو نے قرآن شریف کی جھوٹی قسم کھائی ہے۔'' پھر بڑھیا نے سر جھکا لیا۔ ہاتھ ادب سے سینے پر باندھ لیے جیسے نماز کی حالت میں ہو اور بلک بلک کر رونے لگی۔

کالو ترکھان کا بیٹا چپ رہا۔ بیت المال کے امین اس پر پھٹکاریں بھیجنے کے بعد اسے خدا کے جلال سے ڈرانے لگے۔ مولوی صاحب نے اسے کہا ''تم فوراً غسل کرو۔ پاک کپڑے پہنو اور مسجد میں جا کر توبہ کرو۔ اللہ بڑا غفور الرحیم ہے۔''

اسی طرح گلی گلی پھر کر شام تک بیت المال کے امینوں نے سارا لوٹا ہوا زیور سارے کپڑے، نقد روپیہ، خالی صندوق، ٹوٹی ہوئی ٹوکریاں، برتن اور بالٹیاں سب کچھ نکلوا لیا۔ قرآن شریف کی جھوٹی قسم کھانے پر اور کوئی تیار نہ ہوا تھا۔

چار پانچ ہی دنوں میں لوٹ کا سارا مال بیت المال کے دونوں کمروں میں بھر گیا۔

## شراب کا مسئلہ

مگر بیچ میں شراب کے ٹھیکے کا مسئلہ آن پڑا۔ ''یہ حرام شے ہے۔ بیت المال میں شراب کی بوتلیں نہیں رکھی جا سکتیں۔'' مولوی صاحب نے کہا۔

''مگر یہ بیت المال کا مال تو ہے۔'' ہیڈ ماسٹر صاحب بولے ''اسے یوں کھلا تو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ لوگوں کے ایمان خراب ہوں گے۔''

''یہ تو ٹھیک ہے مگر اسے کس کے سپرد کریں۔ اسے بیچ کیوں نہ دیں۔ یہیں کھڑے کھڑے۔'' خواجہ یٰسین بولے۔

''کیا فضول بات کی تم نے خواجہ یٰسین۔'' مولوی صاحب بولے۔ ''حرام مال کی تجارت کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر جو خریدے گا، وہ بھی مسلمان ہوگا اور اسلام میں شراب خانہ خراب کو حرام قرار دیا گیا ہے۔''

''پھر کیا کیا جائے؟''

کچھ دیر اس پر غور ہوتا رہا۔ پھر خواجہ قطب دین بولے ''مولوی صاحب اس کے بارے میں سوچیں اور جمعے کے وعظ میں ہمیں بتا دیں کہ اس ناپاک شے کا کیا کیا جائے۔ اگلے جمعہ تک اس حرام مال کو میری امانت میں دے دیا جائے۔ شاید اس طرح مجھ گنہگار کی بخشش ہو جائے۔''

بیت المال میں سب سے قیمتی شے سونے کے زیور تھے۔ زیورات کو معززین نے برابر برابر تقسیم کر کے ان کی حفاظت کی ذمہ داری لے لی۔ بستر، کپڑے اور برتن نور پور کے غربا اور مساکین کے لیے محفوظ ہو گئے۔ اعلیٰ چمڑے کے سوٹ کیس اور جست کے بھاری صندوق غریبوں کے کام کی چیز نہ تھے۔ یہ معززین نے اپنے پاس رکھ لیے کیونکہ بیت المال پر سب کا حق ہوتا ہے۔ جمال نے اسلامی نظام کی پہلی جھلک وہیں دیکھ لی۔

## ہائے میری بھابو

مشتاق کرشنا کی والدہ کی تلاش سے مایوس ہو کر اسے اپنی بیٹی بنا چکا تھا۔ وہ بھی اس سے بہت ہل گئی تھی اور پیاری پیاری باتیں کرنے لگ گئی تھی۔ مشتاق اسے شام کے وقت نور پور کے باغات کی سیر کرواتا اور اس کا دل بہلاتا۔ اس کے زخم بھر چکے تھے مگر وہ ابھی اس قابل نہیں تھی کہ زیادہ چل سکے۔ مشتاق اسے پیٹھ پر بٹھاتا اور اپنی بیٹی فرتو کو انگلی لگا کر باہر نکل جاتا۔

کمہاروں کی بستی میں مٹی کو چاک پر گول برتنوں میں ڈھل جانے کا تماشا کرشنا کو بہت اچھا لگا۔ پھر اچانک اس نے کمہار کی کوٹھڑی پر نظریں گاڑ دی۔ سانس روک لی اور پتھر کا بت بن گئی۔

''کیا بات ہے کرشنا جی۔'' مشتاق نے گھبرا کر پوچھا۔

''اندر میری بھابو ہے۔'' کرشنا نے آہستہ سے کہا تا کہ کوئی سن نہ لے۔

''تمہاری بھابو؟ تمہاری ماں کرشنا؟''

کرشنا نے کوٹھڑی کی طرف اشارہ کیا اور مشتاق کی گردن سے لپٹ گئی۔

مشتاق چیتے کی طرح جست لگا کر کوٹھڑی کے اندر گھس گیا۔ اندر ایک ہندو عورت سر پر چادر اوڑھے برتن مانجھ رہی تھی۔

کمہار چاک چھوڑ کر اس کے پیچھے دوڑا۔ ''اندر کیوں جاتے ہو خواجہ؟''

مشتاق برتن مانجنے والی ہندو عورت کو ہاتھ سے پکڑ کر باہر لے آیا۔ وہ کرشنا کو دیکھ کر چیخیں مارنے لگی۔ ماں بیٹی لپٹ گئیں۔ کرشنا سہمی ہوئی تھی جیسے اس سے پھر کوئی اس کی بھابو چھین لے گا۔ پھر کرشنا کی ماں نے اپنی بیٹی کا انگ انگ چوما، اسے بھینچ بھینچ کر سینے سے لگایا۔ وہ اسے اپنے تن میں گھول لینا چاہتی تھی۔

مشتاق کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر کمہار بھی خاموش ہو گیا۔ اس کے گھر کی عورتیں پریشان ہو گئیں۔

مشتاق نے کہا ''یہ عورت میں تیرے پاس چھوڑ کر نہ جاؤں گا چودھری۔ اسے جانے دے۔''

کمہار بولا ''اسے میں لایا تھا گاڑی سے، یہ میرا مال ہے۔''

مشتاق نے آنسو پی لیے۔ دکھ نے قہر کا روپ دھار لیا۔ اس نے کڑ کا مارا ''میں تمہارا خون پی جاؤں گا امام دین۔ تمہارے گھر کے ایک ایک فرد کو گولی سے اڑا دوں گا مگر میں اس عورت کو لے کر جاؤں گا یہاں سے۔'' اس نے بندوق جمال کے ہاتھ سے لے لی۔

کرشنا اور اس کی ماں نے رونا بند کر دیا۔ خوفزدہ ہو کر وہ کمہار کی طرف دیکھنے لگیں۔

کمہار ڈر گیا۔ اس کی عورتیں بھی سہم گئیں۔ اس کی ماں بولی ''لے جا اسے لے جا۔ ہمیں اس کو کیا چولہے میں ڈالنا ہے۔''

کمہار چپ رہا۔

مشتاق بولا ''میں تم سے برادرانہ بات کرتا ہوں چودھری۔ تم نے جو کیا سو کیا مگر اب اسے جانے دے۔ اسی میں بہتری ہے۔ ماں بیٹی تمہیں دعا دیں گی۔ اب تمہی بولو کہ ماں بیٹی کی دعائیں لینی ہیں یا اپنی ماں کے بین سننے ہیں؟ میری بندوق بھری ہے مگر تم تو اپنی ماں کے بین سننے کو باقی ہو گے نہیں۔'' پھر مشتاق بولا ''جمال تم کرشنا اور اس کی ماں کو لے کر چلو۔ میں آتا ہوں تمہارے پیچھے پیچھے۔''

جمال کرشنا اور اس کی ماں کو لے کر گھر کو چلا تو کمہاروں نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ تھوڑی دور جا کر کرشنا کو اس کی ماں نے اپنی گود میں لے لیا۔ تھوڑی دیر میں مشتاق ''تورے نین کجر بن کارے'' گاتا ہوا سیڑھیاں چڑھ آیا۔ اس کے چہرے پر نمازیوں کی سی لالی تھی۔ گورداسپور سے آنے کے بعد اس نے ٹھمری پہلی مرتبہ گنگنائی تھی۔

گھر کی عورتوں نے کرشنا کی ماں کو جھرمٹ میں لے لیا۔ کوئی اس کے لیے گرم دودھ کی پیالی لائی، کسی نے ہمدردی کے نیر بہائے۔ کرشنا کی ماں جو ابھی تک کھل کر روئی بھی نہ تھی، ہمدردی کے اس سیلاب میں بہہ گئی۔ اس نے کرشنا کے مل جانے کی خوشی میں اپنے میاں اور اپنے بھائی کے دو بچوں کو یاد نہ کیا جو اس کی آنکھوں کے سامنے چیرے گئے تھے۔

## شرنارتھی کیمپ

اگلے روز مشتاق نے کرشنا اور اس کی ماں کو شرنارتھیوں کے کیمپ میں بھجوا دیا۔ عورتیں ان سے گلے مل مل کر روئیں، معافی مانگتے مانگتے ان کے گلے خشک ہو گئے۔ فرتو کرشنا کے ساتھ چمٹ گئی اور ضد کرنے لگی، مجھے بھی کیمپ میں چھوڑ آؤ۔ پھر فرتو نے کرشنا کو اپنی کپڑے کی بنی ہوئی گڈی پٹولوں کا ایک ڈبہ اور گلہ توڑ کر اپنے سارے پیسے دے دیئے۔ کرشنا نے کہا، جہلم جا کر میں تمہیں خط لکھوں گی۔ تم بھی آ جانا ہمارے پاس۔ میرے پتا جی بہت اچھے ہیں۔

ایک رقعے میں مشتاق نے کرشنا کی ماں پاروتی اور کرشنا کی ساری کہانی لکھ دی اور ہندوؤں اور سکھوں کو پیغام دیا کہ تم مسلمانوں سے اتنی نفرت نہ کرو، ہم اتنے برے نہیں ہیں۔ ہو سکے تو تم بھی مسلمان عورتوں اور بچوں کو ان کے گھروں کو پہنچاؤ۔ نیچے اس نے اپنا پورا پتہ لکھ دیا۔ اس رقعے کو کرشنا کی ماں نے اپنے اس دوپٹے کے پلو سے باندھ لیا جس سے اس نے بار بار آنسو پونچھے تھے۔

## بملا بولی

ماسی اقبال نے بملا سے کہا ''میں تو چاہتی ہوں بیٹی تم ساری عمر میرے پاس رہو مگر یہ تمہارے ساتھ بے انصافی ہو گی کیونکہ ہم لوگ تمہارے اپنے نہیں ہیں۔ موقع اچھا ہے تم بھی مشتاق کے ساتھ کیمپ میں چلی جاؤ۔''

بملا بولی ''میں کیمپ میں نہیں جاؤں گی۔ کیمپ میں میری عزت محفوظ نہیں ماسی۔ میں تمہارے چرنوں میں پڑی رہوں گی۔ جب تک میرا بھائی امرتسر سے نہ آ جائے۔''

ماسی نے حیران ہو کر کہا۔ ''مگر بیٹی کیمپ میں کوئی مسلمان تو نہ ہوگا۔ وہاں صرف ہندو اور سکھ ہیں اور یہ تمہارے اپنے لوگ ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ وہاں ڈوگرہ پلٹن کا پہرہ بھی ہے۔''

بملا راضی نہ ہوئی۔ اس نے کہا ''مجھے کسی پر بھروسہ نہیں ماسی۔ میں تمہارے چرنوں میں محفوظ ہوں۔''

اس پر سب حیران ہوئے۔ کیا جوان لڑکی کہیں بھی محفوظ نہیں؟ اپنوں میں بھی نہیں؟ اس بے کس لڑکی پر جس کے پیارے اس کی آنکھوں کے سامنے مارے گئے، کیا اس کے ہندو اور سکھ رحم نہ کھائیں گے؟ جو کچھ اس کے پاس بچ رہا ہے، وہ بھی لوٹ کر لے جائیں گے؟

ماسی اقبال نے کہا ''یہ لڑکی میرے پاس رہے گی۔ یہ میری بیٹی ہے۔ یہ کیمپ میں نہیں جائے گی......''

پھر ماسی اقبال اور بملا گھر کے کام کاج میں لگ گئیں۔ ایک نے چولہا جلایا۔ دوسری نے آٹا گوندھا۔ جیسے دونوں ماں بیٹیاں ہوں۔

## کرشنا پاروتی الوداع

گھنٹے بھر میں تانگہ کیمپ کے سامنے جا پہنچا۔ گیٹ پر ڈوگرے فوجی پہرہ دار تھے۔ ہندو اور سکھ سیوادار اِدھر اُدھر چوکنے کھڑے تھے۔ اندر عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں کا ہجوم تھا زمین پر گندگی کے ڈھیروں میں بستر، صندوق، برتن اور کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔

مشتاق کرسی پر بیٹھے ہوئے سکھ سیوادار کے پاس گیا اور بولا ''سردار جی میں تین ہندو عورتوں کو آپ کے حوالے کرنے آیا ہوں۔ کیا آپ ان کی حفاظت کی ضمانت دیتے ہیں؟''

سکھ نے تانگے پر نگاہ ڈالی اور اٹھ کر مشتاق کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ ''تیری مہربانی میاں جی۔ بڑی کرپا آپ جوان مرد ہیں۔ آپ سچے پنجابی ہو۔ واہگورو آپ پر مہربانی کرے۔''

''مگر کیا آپ ان کی حفاظت کا وعدہ کرتے ہیں؟...... ایک سچے پنجابی کی طرح......'' مشتاق نے کہا۔

''سمجھو میاں جی کہ یہ اپنے گھر عزت سے پہنچ گئی ہیں۔'' سکھ بولا۔

مشتاق کے اشارے پر جمال نے کرشنا کو گود سے اتارا۔ کرشنا کی ماں نے گھونگھٹ نکال لیا تھا جیسے وہ غیروں کے سامنے جا رہی ہو۔ پاروتی سب سے آخر میں تانگے سے اتری۔

مشتاق نے پانچ پانچ روپے کے تین نوٹ نکال کر تینوں کو دے دیئے۔ اس سے زیادہ کی اس میں استطاعت بھی نہ تھی۔ تھوڑے سے انکار کے بعد تینوں نے نوٹ رکھ لیے۔ انہیں کئی روز کیمپ میں رہنا تھا اور آگے کا بھی کچھ پتہ نہ تھا۔

کرشنا مشتاق سے ایک دفعہ اور بھینچ کر لی۔ اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر اس نے کہا ''چاچا تم ہمارے پنڈ دادنخان میں ضرور آنا۔ میں تمہیں شکر چاول کھلاؤں گی۔ میرے پتا جی کی دکان پر سفید شکر ملتی ہے۔''

کرشنا کو معلوم تھا کہ میرے پتا جی قتل ہو چکے ہیں مگر وہ اس بات کو بھول جانا چاہتی تھی۔

مشتاق کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کرشنا کا ماتھا چوما، اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کی ماں کے حوالے کر دیا۔

جانے والی عورتوں نے منہ پر پلو ڈال لیے اور سسکیاں بھرنے لگیں۔

شاہ بادشاہ ذوالفقار علی شاہ نے ایک دفعہ اور ڈونڈی پٹوائی تو عورتیں، بچے سب کھڑکیوں دروازوں میں امڈ آئے۔

مگر یہ ڈونڈی کسی قتلِ عام کا بلاوا نہیں تھی۔ یہ ڈونڈی اس خبر کا اعلان تھی جس کا نور پور کے لوگ ایک مدت سے انتظار کر رہے تھے۔

''خلقت خدا کی، ملک قائداعظم کا، حکم سید ذوالفقار علی شاہ تھانہ صدر کا۔ جس کسی کے پاس کوئی ہندو یا سکھ عورت، بچہ بچی چھپی ہوئی ہے، وہ تھانے میں خبر کر دے ورنہ اس کو کولہو میں پلوا دیا جائے گا۔ ڈم ڈم ڈم......''

اگلے روز ضلعے کا ڈپٹی کمشنر، کپتان پولیس، ایک مسلمان میجر مع گارڈ اور ایک ہندو میجر نور پور تھانہ صدر میں کچہری لگا کر بیٹھ گئے۔ شاہ بادشاہ ذوالفقار علی شاہ ان کی اُردل میں کھڑا ہو گیا۔

## عورتوں کی واپسی

شاہ بادشاہ کو ان تمام گھروں کا پتہ تھا جن میں ہندو اور سکھ عورتیں اور بچے اغوا ہو کر آئے تھے۔ انہیں اردگرد کے دیہات کی بھی پوری خبر تھی۔ آدھی رات کو انہوں نے سپاہی دوڑا دیئے تھے۔ صبح ہوتے ہوتے چوبیس عورتیں، بچے گھوڑوں اور تانگوں پر سوار سپاہیوں کے پہرے میں بحفاظت تھانہ صدر پہنچ گئے۔ افسران نے شاہ بادشاہ کی فرض شناسی اور لیاقت کی بڑی تعریف کی۔

بملا ان میں شامل نہیں تھی۔ ماسی اقبال نے کہہ دیا تھا کہ کوئی اس لڑکی کو ہاتھ نہ لگائے۔ وہ کسی غیر کے ساتھ گھر سے نہیں جائے گی۔

تھانیدار کے آدمی بملا کو لینے آئے تو محلے کی عورتوں نے اس کے گرد حصار کھینچ لیا۔ زبانوں کی تلواریں نکال لیں۔ ذوالفقار علی شاہ کے سپاہیوں کو ماسی اقبال کے گھر کے اندر داخل ہونے کا حوصلہ نہ ہوا۔

تھانے کو خبر ہوئی تو ڈپٹی کمشنر مسلمان میجر اور ہندو میجر ماسی اقبال کے گھر جا پہنچے۔ ہندو میجر کا

موقف تھا کہ مسلمان عورتوں نے ایک بے کس ہندو لڑکی کو زبردستی روک رکھا ہے ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہندو لڑکی جس کے سارے رشتہ دار اس کی آنکھوں کے سامنے قتل کیے گئے ہوں، قاتلوں کے پاس رہنا چاہتی ہو۔ بات معقول تھی۔ ڈی سی اور مسلمان میجر اس کا کوئی جواب نہ دے سکتے تھے۔

بملا نے کہا ''ماسی میں خود بات کرتی ہوں۔ میں پردہ نہیں کرتی۔''

پھر وہ گھونگھٹ نکال کر دروازے کی دہلیز میں آ کر بولی ''میجر صاحب میں یہاں اپنی خوشی سے رہنا چاہتی ہوں۔ مجھ پر کسی کا دباؤ نہیں۔ میں کیمپ میں جانا نہیں چاہتی کیونکہ مجھے اپنی عزت کا ڈر ہے۔''

ہندو میجر نے کہا ''میں آپ کی عزت کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔ کوئی آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔''

بملا بولی ''مجھے آپ پر بھروسہ نہیں۔''

ماسی اقبال پردہ کرتی تھی۔ دروازے کے پیچھے سے اس نے بملا کو کمر سے پکڑ رکھا تھا تا کہ کوئی زبردستی اسے اٹھا کر نہ لے جائے۔ کسی غیر آدمی سے بات کرنا اس کے وہم و گمان سے بھی دور تھا مگر وہ بولی ''بملا کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔''

مسلمان میجر بولا ''اگر لڑکی جانا نہیں چاہتی تو اسے برآمد نہیں کرایا جا سکتا۔''

ڈی سی اور ایس پی خاموش رہے۔

عورتوں نے شور مچا دیا ''خبردار بملا کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ وہ یہیں رہے گی۔ جب تک اس کا بھائی نہ آ جائے امرتسر سے۔''

ہندو میجر نے کہا ''لڑکی پر دباؤ ہے۔ میں ہائی کمان سے شکایت کروں گا۔ اغوا شدہ عورتوں کی بازیابی میں شرارت کی جا رہی ہے۔ پاکستان اپنے معاہدوں میں ہیرا پھیری کر رہا ہے۔''

بملا بولی ''پاکستان اور ہندوستان کا میری عزت سے کیا تعلق؟ میرے بھائی کو لاؤ پہلے نند لال ریل بازار میں رہتا ہے۔ وہ ہندوستان سے آئے اور مجھے لے جائے۔ آپ لوگوں کو میں نہیں جانتی۔''

ہندو اور مسلمان افسر جھگڑا کرنے لگے۔ دونوں کی قانونی پوزیشن درست تھی اور بملا بھی غلط نہ تھی۔

## سرخ داڑھی والا میجر

بہت دن اسی طرح گزر گئے۔ علاقے کی ساری اغوا شدہ ہندو عورتیں برآمد ہو کر کیمپ میں چلی گئی تھیں مگر بملا وہیں ماسی اقبال کے ہاں رہ گئی۔ اس نے اپنے دیور یونس کو نور پور سے نکلوا دیا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد ایک مسلمان میجر جس کی داڑھی سرخ رنگ کی تھی، ڈی ایس پی اور ذوالفقار علی شاہ تھانہ صدر کو ساتھ لے کر ماسی اقبال کے گھر آیا۔ اس نے کہا ''میں بملا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

ماسی اقبال نے کہا ''بملا سے کوئی اکیلے میں بات نہ کرے۔ میرے سامنے کرے۔ میں اپنی بیٹی کی خاطر پردہ چھوڑتی ہوں۔''

پھر اس نے ایک لمبا گھونگھٹ نکالا اور بملا کو اپنی بانہوں میں لے کر میجر کے سامنے آ گئی۔

میجر نے کہا ''بملا بی بی اگر تم ہندوستان نہ جاؤ گی تو ہندوستان ان مسلمان عورتوں کو روک لے گا جو مشرقی پنجاب میں چھین لی گئیں اور جو اپنے پیاروں کے لیے تڑپ رہی ہیں۔''

یہ سن کر بملا کچھ پریشان ہو گئی۔ بولی ''چاچا جی میں کیمپ میں کیسے جاؤں۔ وہاں سیوا داروں کے ہاتھوں سے مجھے کون بچائے گا۔ آپ میرے بھائی کو کیوں نہیں بلا دیتے؟''

''راستے بند ہیں بیٹی۔ گاڑیاں صرف پناہ گیروں کے لیے ریزرو ہیں۔ ان میں تمہارے بھائی کو جگہ نہیں مل سکتی اور اس طرح آنا اس کے لیے خطرناک بھی ہے۔''

بملا بولی ''تو جب راستے کھلیں گے میرا بھائی آ کر مجھے لے جائے گا۔ ابھی مجھے یہیں رہنے دیجیے۔''

''تب تک یہیں رہے گی میری بیٹی۔'' ماسی اقبال گرج کر بولی۔

میجر بہت سٹپٹایا۔ اس کو حکم تھا کہ وہ بملا کو برآمد کرے مگر بملا کا خدشہ بھی صحیح تھا۔ لال داڑھی والے میجر نے سوچا کہ میں کیسے اس معصوم اور بے کس لڑکی کو سیوا داروں کے سپرد کروں محض اس لیے کہ یہ حکم ہے۔ بیٹی سب کی بیٹی ہوتی ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ اسے اکیلی پا کر بھوکے کتے کیمپ میں اس کی بوٹی بوٹی نوچ لیں۔ اپنے ہندوؤں اور سکھوں کو بملا بہتر جانتی ہو گی۔ وہ پریشان ہو گیا۔

اسے پریشان دیکھ کر بملا نے کہا ''ایک شرط پر میں یہ گھر چھوڑ سکتی ہوں چاچا جی۔ امرتسر میں میرے جیجا جی کی دکان بھی ہے۔ اگر آپ خود میرے ساتھ جا کر مجھے ان کے حوالے کر دیں تو میں جانے کے لیے تیار ہوں۔ میں آپ کو ستانا نہیں چاہتی اور مجھے اپنی مسلمان بہنوں کا بھی خیال ہے جو ہندوؤں اور سکھوں نے مشرقی پنجاب میں قید کر رکھی ہیں۔''

ان حالات میں کسی مسلمان میجر کا امرتسر جانا اور ایک ہندو لڑکی کو اس کے جیجا جی کے حوالے کر کے واپس آنا ایک احمقانہ خیال تھا۔ ہائی کمان اس کی اجازت کبھی نہ دیتی اور پھر یہ طے شدہ طریقہ کار کے بھی خلاف تھا۔ میجر صاحب نے کہا ''بیٹی تم مجھ پر اتنا بھروسہ کیسے کر سکتی ہو۔ مسلمانوں نے تمہارے اپنوں کو تمہارے سامنے قتل کیا۔ پھر تمہیں پکڑ کر یہاں بھی وہی لائے۔ میں بھی مسلمان ہوں۔ مجھ پر تمہارا اتنا بھروسہ عجیب سی بات ہے!''

بملا بولی ''جی مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے۔ مجھے سیوا داروں کے حوالے نہ کرنا۔ میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں۔''

میجر نے ایک لمحے کے لیے سوچا، پھر کہا ''بہتر اگر تمہیں مجھ پر اس قدر بھروسہ ہے تو پھر میں کسی قانون کسی ہائی کمان کی پرواہ نہیں کرتا۔ ایک ٹرک اور تین جوان میرے پاس ہیں۔ میں کسی سے پوچھے بغیر

امرتسر جا کر تمہیں تمہارے جیجا جی کے گھر پہنچا دوں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ رہا۔''

''اور اگر میرے جیجا جی وہاں نہ ملے تو؟'' بملا بولی۔

میجر نے جواب دیا ''ہاں اگر تمہارے جیجا جی امرتسر میں نہ ملے تو پھر؟''

''تو پھر آپ مجھے واپس لے آئیں گے اسی ٹرک میں؟'' بملا نے مطالبہ کیا۔ ''پھر میں ماسی کے پاس عمر گزار دوں گی۔''

''یہ میرا وعدہ رہا۔'' میجر نے ہنس کر کہا۔

پھر بملا ماسی اقبال سے لپٹ گئی۔ دونوں سسکیاں بھر بھر کر رونے لگیں۔ میجر کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد چادر میں لپٹی ہوئی بملا جب ماسی اقبال کے گھر سے نکلی تو گلی میں کہرام مچ گیا۔ ایک ایک عورت اسے گلے لگانے اور سینے سے چمٹانے لگی۔ بچے اس کے کپڑے چھونے لگے۔ آہ وزاری نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ماسی اقبال پچھاڑیں کھا کھا کر گرنے اور زمین پر لوٹنے لگی۔ دھاڑیں مارتے اور دعائیں دیتے ہوئے اس کا گلا خشک ہو گیا۔ معافیاں مانگتے ہوئے عورتوں کی زبانیں خشک ہو گئیں۔

بملا کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ عورتیں اس کے ساتھ گلی کی نکڑ تک گئیں، پھر وہیں بیٹھ کر بین کرنے لگیں۔

اس کے دونوں سوٹ کیس میجر نے خود اٹھا لیے، کسی سپاہی کو اس نے بملا کے سامان کو ہاتھ لگانے نہ دیا تھا۔

ماسی اقبال ایک عمر تک بملا کے خط کا انتظار کرتی رہی۔ بڑی مشکل سے اسے یقین آیا کہ سرحد پار سے اب ہمارے سارے رشتے ٹوٹ چکے ہیں۔

☙☙☙☙☙☙☙☙☙☙

# باب 15

نور پور میں زندگی معمول پر آ گئی۔ پاکستان بننے کے بعد آدھا شہر ویران ہو گیا تھا۔ ہندوؤں کے محلے بھائیں بھائیں کرتے تھے۔ لوگ شرمسار بھی تھے اور ڈرتے بھی تھے۔

مشرقی پنجاب سے آنے والے پناہ گیر پیاسے اونٹوں کی طرح گھروں کی تلاش میں بلبلاتے پھرتے تھے مگر جرنیلی سڑک سے پانچ میل اتر کر اس نیم مردہ بستی کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے سیکڑوں پکے مکانات یہاں خالی پڑے تھے۔ زرخیز مُربعے نئے مالکوں کے منتظر تھے۔ پھر آموں کے باغات اور موتیے کے چمن، جن میں کوئلوں، کونجوں اور طوطوں کا کوئی شمار ہی نہ تھا۔

نور پور کے مسلمانوں نے جو بے گھر بھی تھے، ہندوؤں کی جائیدادوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ پناہ گیروں کے انتظار میں تھے اور مکانات کو ان کی امانت سمجھتے تھے۔

آزادی کی افراتفری میں، جو قتل وغارت ہوا اور جو لوٹ مار ہوئی اس کی وجہ سے لوگوں نے دوسرں کو لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ یوں بھی اب سب آزاد ہو چکے تھے۔

**آ عندلیب**

انہی دنوں فدا محمد اچانک لاہور سے آ گیا۔ راستے تو بہت پہلے سے کھل چکے تھے مگر جمال نور پور سے نکل نہ سکا تھا۔ اس نے جمال سے کہا ''میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ اب ہم لاج کے ایک کمرے میں نہیں رہیں گے۔ میں نے ایک کوٹھی پر قبضہ کر لیا ہے جس میں قیمتی سامان سے کمرے بھرے ہیں۔''

''تم نے قبضہ کر لیا ہے؟'' جمال نے پوچھا۔

''بھئی اب پاکستان بن گیا ہے۔''

''مگر یہ جائیداد تو مہاجرین کو ملنی چاہیے، ہمارا حق نہیں۔''

''غور کرو تو ہم بھی مہاجر ہی ہیں۔ نہ تمہارے پاس رہنے کو ٹھکانہ، نہ میرے پاس کوئی کوٹھڑی، جسے میں اپنا کہہ سکوں۔ بس اب چلنے کی تیاری کرو۔''

''مگر حکومت تمہارے قبضے کو کیسے تسلیم کرے گی۔'' جمال نے پوچھا۔

''میرا سالا ہے نا تھانیدار۔ وہ سب کچھ سنبھال لے گا۔ اس کی ڈیوٹی شاہ عالمی دروازے میں تھی۔ اس کے اندر ہندو سیٹھ قلعہ بند تھے۔ وہ اپنی دکانوں سے قیمتی مال اٹھوا کر پہلے ہی گھروں کو لے آئے تھے۔ انہوں نے کوچوں اور دروازوں پر زمینی جنگلے نصب کروا لیے تھے۔ لاہور سے جانے کا ان کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ میرے سالے نے افراتفری کے زمانے میں مجھے بھی لاج سے نکلوا کر اپنے کوارٹر میں رکھ لیا تھا۔ رات کو وہ علاقے کے گشت پر جاتا تو مجھے بھی ساتھ لے جاتا اور موقع دیکھ کر جوانوں کو دکانوں کے تالے توڑنے کا حکم دیتا۔''

''اور کوئی نہ پوچھتا؟'' جمال نے حیرت سے کہا۔

''پوچھتا کون؟'' فدا محمد نے ہنس کر کہا۔ ''سیٹھوں کو تو اپنی جانوں کی پڑی تھی۔ تالے توڑ کر رنگ کے ڈبے، الائچی، بادام اور چینی کی بوریاں، تلے کے گچھے، کشمیری چادریں، ریشمی کپڑے کے تھان اور اسی قسم کا مال جو وزن میں ہلکا اور قیمت میں بھاری ہوتا سفید کپڑوں والے سپاہی اٹھا کر میرے سالے کے کوارٹر میں پہنچا دیتے مگر ان کو حصہ برابر مل جاتا کیونکہ میرا سالا انصاف پسند آدمی ہے، اگرچہ پولیس والا ہے۔''

''اور جن دکانوں میں سے کچھ نہ نکلتا؟'' جمال نے پوچھا۔

''ان کو ہم آگ لگا دیتے۔'' فدا محمد نے ہنس کر کہا ''اب میرے پاس مال بھی بہت ہے جو ہم نے کوٹھی میں منتقل کر دیا ہے۔''

فدا محمد کی آنکھوں میں عجیب سا تھکا تھکا سا نشہ تھا۔ نور جہاں کی اچانک موت کا غم بھی اسے یاد نہ تھا۔ نہ اس نے جمال سے بمبئی کے حالات سنے نہ گاڑی کے قتلِ عام نے اس کے دل پر کوئی اثر کیا۔ وہ پاکستان کی آزادی پر مسرور بلکہ مست تھا جس کی بدولت اسے کھلی چھوٹ ملی تھی اور اب اس کے قبضے میں ایک کوٹھی اور کوٹھی میں فرنیچر کے علاوہ بکنے والا تجارتی مال بھی تھا۔ تجارتی مال سے اسے رغبت نہ تھی۔ روپے کو بھی وہ اچھا نہ جانتا تھا۔ مگر مال اور روپے کی اسے ضرورت تھی اور وہ جانتا تھا کہ مال اور روپیہ لوٹ مار کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ حرام اور حلال کے قوانین بنائے جا سکتے ہیں مگر اپنی اصل میں تجارت بھی لوٹ مار، سود بھی لوٹ مار اور جائیداد بھی لوٹ مار ہوتی ہے اور یہ بات فدا محمد کی سمجھ میں آ گئی جب اسے اس کا موقع ملا۔

## آتما کے اندھیرے میں

مفتی اپنی والدہ اور بچے کو بٹالہ سے لے آیا تھا مگر اس سفر میں وہ جن تجربات سے گزرا تھا، انہوں نے اس کے اندر ایک بنیادی انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ للکارتے ہوئے نعروں، کرپانوں، نیزوں اور چھروں میں سے بچ کر نکل آنا ایک معجزہ تھا اور اس کا خیال تھا کہ پاکستان اللہ کی دین ہے ورنہ قائداعظم کیا کر سکتا تھا۔

مفتی ایک مقدس باپ کی طرح کا ادیب تھا۔ مقدس باپ عقل سے عاری ہوتا ہے مگر دوسرں کو وعظ کرنے سے باز نہیں آتا۔ مفتی ایک بودھی بھکشو کی طرح نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو آتما کے گیان میں گم نہیں کر سکتا تھا۔ فرائیڈ اسے جھنجھوڑ کر واپس لے آتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ زندگی ایک گھور اندھیرا ہے اور اندھیرے میں آنکھیں کھولنے یا بند رکھنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔

مفتی کہتا تھا کہ ادیب کو صرف محسوس کرنے کا حق ہے دیکھنا اور سوچنا سیاستدانوں کا کام ہے اور اشیا کی ماہیئت کو تبدیل کرنے کا حق خدا کو ہے۔ سیاستدان اس کی خدائی میں مداخلت کرتے ہیں اس لیے وہ سیاستدانوں سے شدید نفرت کرتا تھا۔

مفتی قائداعظم کو ایک سیاستدان سمجھتا تھا اور ان کا ذکر اتنی پسندیدگی سے نہیں کرتا۔ پھر پاکستان کس نے بنایا۔ ولیوں اور فقیروں نے جو قبروں میں سوتے ہیں مگر خدا کی طرف سے نظامِ ہستی چلانے پر مامور ہیں۔

مگر بٹالہ کے سفر نے اسے بتا دیا کہ تم مسلمان ہو۔ پاکستان کے سوا تمہیں کہیں پناہ نہ ملے گی۔ وہ پرجوش پاکستانی بن گیا مگر قائداعظم کو اس نے کریڈٹ کم ہی دیا۔ اس کے خیال میں پیروں، فقیروں نے پاکستان کے کیس کی فائل کسی اچھے وقت میں اللہ میاں کے حضور پیش کر کے دستخط کروا لیے تھے۔

مفتی کے عملی تجربے کی روشنی میں یہ تجزیہ درست تھا۔ اپنی سکول ماسٹری کے زمانے میں اس نے جس قدر تبدیلیاں دیکھیں ان کے لیے کسی نے فائل تیار کر کے کسی سے دستخط کروا لیے تھے اور فائلوں میں ہمیشہ خداوندی کی طاقت ہوتی ہے۔ ان دستخطوں سے جاری ہونے والی تبدیلیوں کو صحیح یا غلط قرار دینا یا ان کے بارے میں سوچنا عبث ہے اور ادیب کے منصب سے خارج تھا۔ مفتی نے اپنا تضاد حل کر لیا تھا اور سوچنے سمجھنے کے پاکھنڈ سے آزاد ہو گیا تھا۔

## آبادکاری

جمال فدا محمد کے ساتھ لاہور آ گیا مگر وہ اس کی کوٹھی میں آباد ہونے کے بجائے مفتی کے گھر چلا گیا۔ فدا محمد اپنے مستقبل کے بارے میں بہت فکرمند تھا۔ اس نے منشی فاضل پاس کر لیا تھا اور اب بی اے کی تیاری کر رہا تھا مگر اس نے اپنی دوربین درست کر لی تھی اور وہ اپنے خوشحال اور قابل عزت مستقبل کو بڑے یقین کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ میں اپنی کوٹھی میں عربی فارسی کا ایک کالج کھولوں گا جس میں دیہات کے میٹرک پاس طلبہ منشی فاضل کے بعد بی اے کر سکیں گے۔ یہ نیکی کا کام تو تھا ہی مگر اس میں آمدنی بھی بہت تھی۔ اس کے برعکس جمال کی سوچ نے کوئی ترقی نہ کی تھی اور یوں نہ چاہتے ہوئے بھی اور فدا محمد کی مخلصانہ اور بے لوث محبت کے باوجود دونوں جگری دوستوں میں تھوڑا سا طبقاتی فاصلہ پیدا ہو گیا تھا۔

## کرشن نگر

وہی کرشن نگر جس میں سے جمال نے مفتی کی بہن اور بچوں کو فسادات کے شروع میں نکالا تھا، اب خالی پڑا تھا۔ اس کے تمام کے تمام مکین ہندو تھے اور سب کے سب جا چکے تھے۔ اسی طرح شام نگر، رام نگر اور سنت نگر کی خالص ہندو بستیاں ویران پڑی تھیں۔ امرتسر کے پناہ گیر گوالمنڈی کی دکانوں اور مکانوں پر قبضہ کر

چکے تھے۔ جالندھر کے پناہ گیر جن میں جالندھر کی بستیوں کے پٹھان زمینداروں کی اکثریت تھی، اپنے مزارعین کو ساتھ لے کر منٹگمری، لائل پور اور ملتان کے شاداب مربعوں اور لاہور کے ماڈل ٹاؤن، ایمپریس روڈ، جیل روڈ اور مال روڈ کی بڑی بڑی کوٹھیوں کے مالک بن چکے تھے۔ محکمہ بحالیات کے افسر بھی جالندھر کے پٹھان تھے۔ انہوں نے دیہاتی جائیدادوں کو شہری جائیدادوں میں تبدیل کر کے مسکینوں کو خاندانی رؤسا میں تبدیل کر دیا تھا۔ مزارعے پھر مزارعت پر لگ گئے تھے جو وہاں بے زمین تھے، یہاں بھی بے زمین رہے۔

دہلی سے پناہ گیروں کی ایک بڑی کھیپ آئی جو دکانداروں پر مشتمل تھی۔ انہیں انار کلی بازار الاٹ ہو گیا۔ اس میں صرف دو دکانیں مسلمانوں کی تھیں۔ باقی کسی دکان کو کسی غنڈے نے ہاتھ نہ لگایا تھا اور یہ دکانیں مال سے بھری تھیں۔

دہلی والے خوش ہو کر پاکستان کو دعائیں دیتے تھے۔ ایسی دولت انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی تھی۔ آنکھیں میری باقی ان کا......

مفتی اور جمال کو لوٹ مار سے سخت نفرت تھی۔ مگر ان کو رہنے کے لیے ایک مکان کی بہر حال ضرورت تھی۔ مفتی کے چھوٹے بھائی کے پاس مہاجر ہونے کے باعث ایک مکان کی الاٹمنٹ کا پرمٹ بھی تھا مگر اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ مجسٹریٹ کے پیچھے پیچھے پھرے۔

مکان حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جس مکان کا چاہو تالا توڑ کر اندر گھس جاؤ۔ مجسٹریٹ آئے تو اسے آنکھیں دکھاؤ، رو رو کر فریاد کرو۔ اپنے مقتولوں کے نام گنواؤ اور کرتا اٹھا کر پیٹ دکھاؤ کہ دیکھو بھوک نے ہمارا کیا حال کر دیا ہے۔ کیا اسی لیے ہم نے پاکستان بنایا تھا؟ کیا اسی لیے ہم نے جان و مال کی قربانی دی تھی؟ کیا اسی لیے ہم نے بیٹیاں سکھوں کے حوالے کر دی تھیں؟

اگلے روز جمال مفتی کے بھانجے کے ساتھ ایک مکان کے اندر کود گیا۔ مجسٹریٹ کے پیچھے پھرنے سے یہ بہر حال آسان کام تھا۔ ہندو کا گھر سامان سے بھرا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر جمال گھبرا گیا۔ خالی مکان پر کسی کی مہر نہیں ہوتی مگر سامان دیکھ کر مالک چابک لے کر سامنے آ جاتا ہے اور امن و انصاف کے تمام معیار آنکھیں دکھانے لگ جاتے ہیں۔

جمال نے سوچا کہ میں فوراً بھاگ جاؤں۔ دروازے کی طرف بڑھا تو اس نے دیکھا کہ ایک بائیسکل نسبتاً اچھی حالت میں کھڑی ہے۔ اس کی اپنی بائیسکل بہت پرانی تھی۔ چلتی تھی تو پہیہ چوں چوں کرتا تھا۔ مڈگارڈ کھڑکھڑاتے تھے۔ جمال نے اپنی سائیکل دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی اور بہتر بائیسکل لے کر بھاگ گیا۔ کسی کے بھرے ہوئے گھر پر قبضہ کرنے کا اس میں حوصلہ نہ ہوا۔

اگلی صبح وہ الاٹمنٹ کی پرچی لے کر گلی گلی مجسٹریٹ کے پیچھے چلا اور اس طرح تین دن گزر گئے۔ چوتھے روز جب مجسٹریٹ جمال کی شکل دیکھ دیکھ کر تنگ آ چکا تھا، اس نے پوچھا ''تم نے کون سا مکان پسند کیا ہے؟''

### گھر کا راستہ

جمال نے تو کوئی مکان پسند نہ کیا تھا مگر جس مکان کے سامنے یہ بات ہوئی وہ بھی خالی تھا اور جمال نے اُدھر ہی اشارہ کر دیا۔

یہ مکان بھی سامان سے بھرا تھا، اگرچہ کسی قدر غریبانہ تھا۔ چارپائیوں پر بستروں کے ڈھیر لگے تھے۔ نارتھ ویسٹرن ریلوے سے چرائے ہوئے کاوچ، نہانے کا ایک ٹب، الماریوں میں ٹھسے ہوئے پرانے کپڑے، دو بائیسکلیں، باورچی خانے میں چینی، گھی اور اچار کے ٹین، دیواروں پر لٹکتی ہوئی اہل خانہ کی تصویریں، ہنومان جی کی ایک شبیہہ اور ایک الماری میں گھر کے بنے ہوئے صابن کی ٹکیاں۔

اس قسم کا سامان جمال کے والدین کے گھر میں بھی ہوتا تھا۔ اس کو دیکھ کر جمال بالکل نہ گھبرایا۔

مکان میں ایک تہہ خانہ بھی تھا۔ اس میں گندم کی پانچ بوریاں اور جلانے کی لکڑی کے گٹھے رکھے تھے۔

جب وہ اس گھر کو دیکھ رہا تھا تو امرتسر کے کچھ پناہ گیر اس کے ساتھ اندر گھس آئے تھے۔ وہ گھر کی ہر چیز کو دیکھتے اور اپنی بدقسمتی پر ہاتھ ملتے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد جمال اندر سے چٹخنی لگا کر اکیلا صحن میں بیٹھ گیا۔ اس کے پاس تالا نہیں تھا کہ ڈال کر مفتی کو بلا لائے اور تالا لگانے کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ کوئی اور اس کو توڑ کر گھر پر قبضہ نہ کر لے گا۔

### حق ہمسایہ

اچانک دروازے پر دستک نے اسے چونکا دیا۔ میاں معراج دین نے کہا ''بھائی جی میرے بچے بھوکے ہیں۔ آپ کو خدا نے اتنا کچھ دے دیا ہے۔ کچھ میرے بچوں کا بھی خیال کیجیے۔ حق ہمسایہ خدا کا جایہ! کل سے انہوں نے کچھ نہیں کھایا۔''

جمال نے کہا ''ہاں آپ کچھ گندم لے جائیں۔ نیچے تہہ خانہ میں رکھی ہے۔''

میاں معراج دین نے آن کی آن میں اپنے بھائی اور بیٹے بلا لیے اور وہ پانچوں بوریاں اور لکڑی کے گٹھے اٹھا کر لے گئے۔

جمال نے کچھ خیال نہ کیا۔

تھوڑی دیر میں پھر دستک ہوئی۔ میاں معراج دین پھر دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے بھک منگوں کی سی مسمسی صورت بنائی اور بولا ''آپ کی بڑی مہربانی باؤ جی۔ میرے بچے رہتی دنیا تک آپ کو دعا دیں گے۔ تھوڑا سا گھی بھی اندر پڑا ہے۔ ہانڈی کس طرح پکے گی اس کے بغیر۔''

''گھی بھی لے جاؤ۔'' جمال نے کہا۔

اس کے بھائی اور بیٹے باہر ہی کھڑے تھے۔ وہ چیتے کی طرح اچھل کر اندر آئے اور دیکھتے ہی

دیکھتے گھی، چینی اور اچار کے ٹین اچک کر لے گئے۔

جمال نے پھر دروازہ بند کر لیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بھائی اور بیٹے پھر آ گئے۔ اب انہوں نے تکلف ضروری نہ سمجھا اور باورچی خانے کا ساران سامان' برتن، نارتھ ویسٹرن ریلوے کی چرائی ہوئی کرسیاں، ڈریسنگ ٹیبل جلدی جلدی اٹھانے لگے۔ تھوڑی دیر میں نہانے کا ٹب دو کالے پلنگوں اور دو بائیسکلوں کے سوا گھر میں کچھ بھی نہ رہا۔

جمال کو غصہ نہ آیا کیونکہ اس کو پتہ تھا کہ یہ چیزیں میری نہیں مگر اسے پناہ گیروں کی حرص پر کسی قدر حیرت ہوئی۔ ان میں سے بعض کی بہنیں بیٹیاں سکھوں نے لازماً چھینی ہوں گی مگر وہ سامان کے لالچ میں مرے جا رہے تھے اور انہیں اپنے مقتول بھی یاد نہ تھے۔

اسے بھوک بڑے زور کی لگی مگر گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہ تھا اور بازار بند تھے۔ گھر کو خالی چھوڑ کر اور اس امید کے ساتھ کہ اندھیرے میں کوئی اُدھر کا رخ نہ کرے گا وہ اپنی سائیکل پر سوار ہو کر سیدھا اچھرے جا پہنچا اور اگلے روز دوپہر سے پہلے مفتی اور اس کا خاندان اپنے کاٹھ کباڑ سمیت کرشن نگر کے نئے مکان میں اٹھ آئے۔ دن سب نے خوشی خوشی کاٹا۔ رات مفتی کی بیوی نے آلو کے قتلے تلے اور ٹھنڈا پانی پی کر سب صحن میں چارپائیوں پر لیٹ گئے۔

**آوازِ دوست**

آدھی رات کے قریب جمال کی آنکھ کھل گئی۔ سناٹا بھی بہت پر شور ہوتا ہے مگر رات کے سناٹے میں بند کمرے کے اندر کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی یقیناً میاں معراج دین نقب لگا رہا تھا۔ مفتی کو ساتھ لے کر وہ کمرے کے اندر گیا تو سرسراہٹ بالکل بند ہو گئی۔

کمرے میں ایک نیم چھتی تھی۔ آواز اسی نیم چھتی سے آئی تھی۔ جمال نے رعب دار آواز میں کہا ''کون ہے؟ اوپر کون ہے؟''

کچھ توقف کے بعد ڈری ہوئی آواز میں جواب آیا ''ہم ہیں مہاراج۔ ہماری بات سن لیجیے کرپا کر کے۔''

پھر ایک دبلا پتلا شخص سر پر جناح کیپ پہنے ہاتھ جوڑے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے پیچھے اور لوگ بھی تھے۔

مفتی ڈر گیا۔ جمال نے کہا ''نیچے اتر آیئے لالہ جی۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ کیا آپ اس گھر کے مالک ہیں؟''

لالہ جی نے اوپر سے بانس کی ایک سیڑھی اتار کر زمین پر ٹکائی اور آہستہ آہستہ نیچے اتر آئے۔ لالہ جی کے چہرے پر سخت گھبراہٹ تھی۔ جمال نے لالٹین اونچی کر کے دیکھا وہ چالیس برس کا ایک کمزور سا آدمی تھا۔ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ''میرے ساتھ عورتیں اور بچے بھی ہیں مہاراج۔ حکم ہو تو وہ بھی آ جائیں نیچے۔ ہم سب نے پرسوں سے پانی نہیں پیا۔''

جمال کا اشارہ پا کر سارا خاندان نیچے اتر آیا۔ دو عورتیں، تین سہمے ہوئے بچے اور لال چند چوپڑا کا چھوٹا بھائی مول چند چوپڑا۔

مفتی بھاگ کر نلکے سے پانی کا ڈول اور ایک گلاس لے آیا۔ پانی پی کر سب صحن میں آ گئے۔ عورتوں نے گھونگھٹ نکالے ہوئے تھے۔ بچوں نے ماؤں کی انگلیاں پکڑی ہوئی تھیں۔

لال چند چوپڑے نے کہا ''آپ کی صورت ہی سے پتہ چلتا تھا کہ آپ کے من میں بھگوان کی دیا ہے۔ ہم نے شکر کیا آپ کے آنے پر......''

''مگر آپ لوگ کون ہیں، یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' جمال نے پوچھا۔

لال چند بولا ''جناب یہ گھر ہمارا ہے۔ اسی سال مکمل ہوا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ پاگل پن دور ہو جائے گا مگر ہم نکل ہی نہ سکے یہاں سے۔ بس جی غلطی ہو گئی۔ ہم علاقے کے کوچوانوں اور مذبح خانے کے قصائیوں سے ڈرتے تھے۔ وہ دیکھ لیتے تو زندہ نہ چھوڑتے۔ باہر سے تالا ڈال کر ہم یہیں پڑے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ پاکستان بننے کے بعد امن و امان ہو جائے گا۔ ہم ہندوستان کے پردیسوں میں بھٹکنا نہ چاہتے تھے۔ گھر چھوڑا نہیں جاتا میاں جی۔''

''تو آپ یہیں پڑے ہیں اس نیم چھتی میں؟''

''جی ہاں۔ رات کو نکل کر ہم پانی پی لیتے تھے۔ میری پتنی دروازے بند کر کے کچھ پکا لیتی تھی۔ ہم نے اس گرمی میں بڑی مصیبت کے دن کاٹے ہیں مہاراج۔''

جمال کا دل پسیج گیا۔ مفتی کی بیوی نے عورتوں کو تسلی دی اور آن کی آن میں چولہا جلا دیا۔

''آپ کوئی تکلیف نہ کریں بہن جی۔ رام دئی خود پکا لے گی۔'' لالہ جی نے کہا۔

جب وہ کھانا کھا چکے تو لال چند بولا ''کرپا کر کے آپ ایک تکلیف اور کریں صبح ہمیں کسی طرح ریلوے سٹیشن تک پہنچا دیں، ہمیں قصائیوں سے ڈر لگتا ہے۔''

صبح اٹھ کر انہوں نے زیوروں کے خالی ڈبے پھینک دیئے، زیوروں کی پوٹلیاں نیفوں میں اُڑس لیں۔ ریشمی کپڑوں کو انہوں نے دو عدد سوٹ کیسوں میں بند کیا اور رخصت کے لیے تیار ہو گئے۔ مفتی تانگہ لینے چلا گیا۔

پھر لال چند نے کہا ''مگر ہمارا باقی کا سامان کہاں گیا جی؟''

جمال نے جواب دیا۔ ''لوگ لے گئے۔''

''اپنے لیے کچھ بھی نہیں رکھا آپ نے؟ بڑے دیالو ہیں آپ!''

''شرمندہ نہ کیجیے لالہ جی۔'' جمال بولا۔ ''یہ سامان میرا نہیں تھا۔ آپ کا تھا، آپ دیالو ہیں۔''

لال چند نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں پھر کہا ''ہم جا رہے ہیں جی اور پتہ نہیں واپسی کب ہو۔ آ گیا ہو تو میں گھر پر ایک آخری نظر ڈال لوں۔ گھر چھوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے جی۔''

''ضرور ضرور۔'' جمال نے کہا ''یہ آپ کا گھر ہے، میرا تو نہیں ہے۔''

''بھگوان آپ کو خوش رکھے۔'' پھر وہ کمروں میں جا جا کر دیکھنے لگا۔ جمال شرم کے مارے زمین میں گڑ گیا۔

تھوڑی دیر میں مفتی تانگے لے آیا۔ جمال نے دونوں سوٹ کیس آگے رکھ دیے اور عورتوں کو پیچھے بٹھا کر آگے خود کوچوان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دوسرے تانگے پر کچھ اور سامان دونوں لالے اور مفتی۔ تانگہ چلنے لگا تو لال چند چوپڑے نے کہا ''ایک بات ہے جی اگر آپ برا نہ مانیں تو......''

''ضرور ضرور فرمائیے۔''

''وہ جی اندر کچھ دیسی صابن پڑا ہے الماری میں۔ رام دئی نے خود بنایا تھا کچھ دن پہلے۔ اگر آپ کو اس کی ضرورت نہ ہو تو...... میرا مطلب ہے اگر آپ اجازت دیں تو وہ صابن اٹھا لیں ہم۔ کپڑے دھو لیں گے امرتسر پہنچ کر۔''

مفتی لپک کر اندر سے صابن ایک پرانے تولیے میں لپیٹ کر لے آیا جسے لال چند چوپڑے نے اپنی گود میں رکھ لیا۔ تانگہ چلا تو اس نے کہا ''گاڑی میں سوار ہو کر ہم آپ کا تولیہ واپس کر دیں گے جی۔''

پورا راستہ جمال کے منہ سے ایک بات نہ نکلی۔ اس نے سوچا جو لوگ دیسی صابن کی ٹکیاں چھوڑ نہیں سکے، وہ سامان سے بھرے ہوئے مکان، آباد زمینیں اور زیوروں سے بھری ہوئی تجوریاں چھوڑ کر کس دل سے گئے ہوں گے۔ وقت کبھی ان کے گھاؤ بھر سکے گا؟

گاڑی میں بیٹھ کر لال چند چوپڑا نے پرانا تولیہ تہہ کر کے جمال کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کی دیا کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اس نے کہا ''ایک بات اور ہے جی......''

''فرمائیے۔'' جمال نے کہا۔

''بات یہ ہے جی کہ میں ریلوے ہیڈ کوارٹر میں سپرنٹنڈنٹ تھا۔ بائیس سال کی سروس ہے جی میری۔ میں نے اپنا جی پی فنڈ اس مکان پر لگا دیا مگر یہ مکان اب شاید آپ کی قسمت میں ہے۔ بالکل نیا نکور ہے جی۔''

''پتہ نہیں لالہ جی۔'' جمال نے شرمندہ ہو کر جواب دیا۔ ''یہ مکان آپ ہی کا رہے گا۔ امن ہو جائے تو واپس آ کر لے لیجیے گا۔''

''یہ تو ٹھیک ہے جی پر اگر امن نہ ہوا تو؟''

''امن ضرور ہوگا۔''

لالہ جی بولے ''بھگوان آپ کی رکھشا کرے۔ آپ کے وچار دیوتا سمان ہیں مہاراج۔ پر دل ڈرتا ہے جی۔ میرا مطلب ہے کہ یہ مکان آپ ہی کیوں نہیں لے لیتے جی۔ سستا لے لیجیے۔''

''یہ تو بعد کی باتیں ہیں لالہ جی۔'' جمال بولا۔

''جی بے شک۔'' لالہ جی نے جواب دیا۔ ''ابھی تو کچھ نہیں ہو سکتا مگر آخر دنیا کے دھندے تو چلنے ہی ہیں۔ میرا مطلب ہے آپ سودا کر لیں۔ پورا ستر ہزار لگا ہے اس پر میرا۔ پائی پائی کا حساب میرے پاس ہے۔''

''ضرور لگا ہوگا۔'' جمال نے بیزاری سے کہا۔

''اب آپ کو جتنے میں بھی منظور ہو۔'' لالہ جی بولے ''اس حال میں بکارا تو نہیں کیا جا سکتا نا۔ جو بھی آپ دیں، مجھے منظور ہے۔''

''مگر لالہ جی میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔'' جمال نے کہا۔

''کچھ بیعانہ ہی دے دیجیے پھر۔''

''لالہ جی میں آپ کا مکان خریدنا نہیں چاہتا۔ مجھے جائیداد سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

لال چند کھسیانا ہو گیا۔ بولا ''آپ تو ناراض ہو گئے مہاراج۔ میرا مطلب یہ نہ تھا۔ جب آپ کا دل چاہے گا، اس وقت بات کر لیں گے۔ میں ہندوستان پہنچ کر آپ سے پوچھ لوں گا۔ گھر کی بات ہے جی۔''

## بیت المال

واپس پہنچے تو مجسٹریٹ کا باوردی آدمی جس نے مکان الاٹ کیا تھا، دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے کہا ''مجسٹریٹ صاحب ناراض ہو رہے ہیں جی۔''

''کس بات پر؟'' جمال نے پوچھا۔

''وہ ساتھ کی گلی میں انتظار کر رہے ہیں۔''

''ہمارا انتظار، وہ کیوں؟'' مفتی نے پوچھا۔

''بات یہ ہے جی کہ آپ کے گھر سے دو نئے بائیسکل نکلے ہیں۔'' چپڑاسی بولا۔

''نئے تو نہیں۔'' جمال نے جواب دیا۔

''حکم ہے جی جو نیا ہے وہ دے دیجیے، بیت المال کے لیے۔ دوسرا آپ رکھ لیں۔''

جمال نے کہا ''دونوں لے جاؤ، ہمیں نہیں ضرورت ہمارے پاس اپنے بائیسکل ہیں۔''

چپڑاسی دونوں بائیسکل لے کر مجسٹریٹ صاحب کے گھر کو روانہ ہو گیا۔ جمال کو اس وقت نور پور کا بیت المال بہت یاد آیا۔

## بے وقوف آدمی

جمال کو مفتی کے ہاں سے روٹی، سگریٹ اور ہمدردی مل جاتی تھی اور اس سے بڑھ کر اس کی کوئی حاجت نہ تھی۔ ابھی اس نے سوچنا شروع نہ کیا تھا۔ اسے اس عظیم ایثار کا بھی احساس نہ تھا جو مفتی اپنی بیوی کی مرضی کے برعکس اسے اپنے گھر میں رکھ کر کر رہا تھا۔ اسے یہ اندازہ بھی نہ تھا کہ میری روٹی اور سگریٹ سے مفتی کی تھوڑی سی تنخواہ پر کتنا بوجھ پڑتا ہے۔ کوئی پاگل ہی اتنا بے حس ہو سکتا تھا یا کوئی کمینہ آدمی مگر جمال نہ پاگل تھا نہ کمینہ، وہ ایک بے وقوف آدمی تھا۔

مفتی چاہتا تھا کہ لوگ جمال کی عزت کریں۔ اسے سنجیدہ اور ذمہ دار آدمی سمجھیں مگر جمال اب کچھ اور بھی لاابالی ہو گیا تھا۔ وہ رکھ رکھاؤ سے بے نیاز چبھتی ہوئی باغیانہ باتیں کرتا اور لوگوں کو کچوکے دیتا۔

## انہیں مردہ مت کہو

مفتی کو والٹن کے مہاجر کیمپ میں عارضی نوکری مل گئی تھی اور کبھی کبھی جمال بھی اس کے ساتھ چلا جاتا تھا۔ والٹن کیمپ حشر کا میدان تھا۔ حد نظر تک کالے پیلے بھوک کے ننگے پتھرائی ہوئی خشک آنکھوں والے بچے، جوان عورتیں جو اچانک بوڑھی ہو گئی تھیں، لڑکھڑاتے ہوئے بوڑھے اور کہیں کہیں جوان جن کے ماتھوں پر موت کنڈلی مار کر بیٹھی ہوئی تھی، معلوم ہوتا تھا سب کی گردنیں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ سردیوں کی زرد گھاس کی طرح زمین پر پڑے وہ ہر گزرنے والے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے تھے پھر اچانک کوئی عورت بین کرنے لگتی یا روتے ہوئے بچوں کو چپ کرانے کے لیے بے رحمی سے انہیں مارنے لگتی۔ معلوم ہوتا تھا زمین نے ان کو پکڑ رکھا ہے۔

مفتی کی ڈیوٹی تھی کہ وہ لاؤڈ سپیکر پر ان بدنصیبوں کو پاکستان کی تخلیق پر سجدۂ شکر بجا لانے، راضی برضائے الٰہی رہنے، اپنے مرے ہوؤں کو زندہ سمجھنے کیونکہ وہ راہِ حق میں شہید ہوئے تھے، اپنے قدموں پر کھڑا ہونے اور وطن کو تعمیر کرنے کی تلقین کرے۔ سننے والوں پر اس کی تقریروں کا ضرور اثر ہوتا ہوگا۔ ان کے دلوں کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا ہوگا مگر جمال کو رینگتی ہوئی زرد ٹانگوں اور پامال جسموں کو پھلانگ کر کیمپ آفس جاتے ہوئے بڑا دکھ ہوتا تھا۔

گاڑیوں میں اب زیادہ تر دہلی اور یوپی کے بڑے شہروں کے مہاجرین آ رہے تھے کیونکہ اب ریل کا سفر محفوظ ہو گیا تھا۔ وہ پورے ساز و سامان کے ساتھ آتے اور شہر میں گم ہو جاتے۔ انہیں والٹن کیمپ میں جانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

مگر مشرقی پنجاب کے دیہاتی پناہ گزینوں کے قافلے ابھی تک راستے میں تھے۔ جوان بیٹیاں، بیویاں اور بہنیں، مردہ، زخمی یا زندہ سلامت سکھوں سے چھنوا کر بھوکے پیاسے گرتے پڑتے، دریا میں ڈوبتے گردنیں ڈالے کمریں بند[illegible]ے، کارواں در کارواں گروہ در گروہ! والٹن کیمپ ان کی منزل تھی۔

مسلم لیگی نوابوں نے منٹگمری اور لائل پور کی اچھی اچھی زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ خاندانی طور پر وہ سارے کے سارے یونینسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے تھے جو پاکستان کے سخت خلاف تھی مگر جب انہوں نے دیکھ لیا کہ پاکستان کی گاڑی چل ہی پڑی ہے تو وہ اس پر کود گئے تاکہ پاکستان پر قبضہ کر کے اپنی جاگیریں واپس لے لیں اور جو ہندو ساہوکاروں کے پاس رہن تھیں، چنانچہ پنجاب میں انہی کا راج تھا اور اب تو ہندوؤں کی جائیدادیں اور رقبے بھی وہ آپس میں بانٹ رہے تھے۔

بے زمینوں کے لیے کام بہت تھا۔ مزارعت، کھیت مزدوری اور چاکری۔ مفتی کی نوکری عارضی تھی مگر غریب پناہ گیروں کا مسئلہ مستقل معلوم ہوتا تھا۔

## افکارِ تازہ

اس لمبی چوڑی کوٹھی کا ہندو مالک بھی جان بچا کر سرحد پار کر چکا تھا جس میں فدا محمد کو اس کے تھانیدار سالے نے بٹھا دیا تھا۔

فدا محمد اچانک جمال کو کوٹھی کے لان میں دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ ان دنوں وہ اس فکر میں تھا کہ کس طرح یہ کوٹھی اس کی ہو جائے مگر فدا محمد میں ایک بڑی کمی تھی۔ وہ مہاجر نہیں تھا بلکہ مقامی تھا اور ایک معمولی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اس بات پر وہ بہت شرمندہ تھا۔ پھر کسی ہندوستانی شہر میں اس کا کوئی عزیز بھی قتل نہ ہوا تھا اور اس غم میں بے شمار مقامی باشندے آہیں بھرتے تھے مگر کچھ جو زیادہ حوصلہ مند تھے، انہوں نے متعلقہ افسروں کو کچھ دے دلا کر یا جائیدادیں میں حصہ دار بنا کر مہاجر ہونے کے کاغذات حاصل کر لیے تھے۔

فدا محمد جمال سے مل کر بہت خوش ہوا مگر اس کی آنکھیں کہیں دور دیکھتی تھیں۔ وہ بار بار کوٹھی کی پیمائش کرتا، کمروں کی گنتی کرتا اور دیواروں کی اونچائی ناپتا اور اس ڈر سے کہ کوئی اس کی عدم موجودگی میں کوٹھی پر قبضہ نہ کر لے دن رات وہیں پڑا رہتا۔

کوٹھی کے سارے کمروں پر بھاری قفل پڑے ہوئے تھے۔ فدا محمد انہیں کھینچ کھینچ کر دیکھتا۔ اس روز جمال کو شک پڑا کہ شاید یہ فدا محمد نہیں کوئی اور شخص ہے۔

## ہمارا پاکستان!

مفتی کو جمال کے کیریئر کی بہت بڑی پریشانی تھی مگر وہ اسے ظاہر نہ کرتا تھا۔ جمال کو روٹی اور سگریٹ تو مل جاتے تھے مگر پیسوں کی اسے پھر بھی ضرورت تھی جو کہیں سے ملتے دکھائی نہ دیتے تھے۔ کرشن نگر جاتے ہوئے لاٹ صاحب کے دفتر کے سامنے کسی نے اچانک اس کی بغل میں ہاتھ ڈال کر کہا ''سلاواں لیکم جمال صاحب۔'' جمال نے مڑ کر دیکھا تو یہ رانا صاحب تھے، شیخوپورہ کے سول سپلائز کنٹرولر جن کی نوکری سے بھاگ کر وہ بمبئی چلا گیا تھا۔

''وعلیکم السلام رانا صاحب۔'' جمال نے گرمجوشی سے جواب دیا اور پھر اسے بمبئی جانے اور واپس

آنے کی کہانی سنادی۔

''تو آج کل کیا کرتے ہیں آپ؟''

''کچھ نہیں رانا صاحب! سب کچھ تہس نہس ہوگیا۔''

''یہ تو ٹھیک ہے مگر آپ تو سلامت رہے؟''

''خدا نے بڑا کرم کیا۔ میرا کچھ نہیں بگڑا اس قتل وغارت میں۔''

''میرا مطلب ہے کہ زندہ رہنے کے لیے کچھ تو کرنا ہے آخر''

''یہ تو ہے رانا صاحب مگر کیا کریں۔''

''بھئی جب ہم ہیں تو کیا غم ہے۔''

''کیا مطلب رانا صاحب؟''

''مطلب یہ ہے کہ نوکری پر واپس آجایئے۔''

''تو میری جگہ خالی ہے ابھی تک؟'' جمال نے حیران ہوکر پوچھا ''آپ نے ڈسمس نہیں کیا مجھے؟''

رانا صاحب قہقہہ مار کر بولے ''ہم نے ہیڈ آفس کو اطلاع ہی نہیں دی۔ آپ کی غیر حاضری کی اور اب تو پاکستان بن گیا ہے، اب ہمارا اپنا راج ہے!''

''یعنی میری نوکری ابھی تک موجود ہے۔''

''واپس آجائیں تاکہ ہمارا بھی دل لگے۔ شیخوپورے میں تو بات کرنے کو آدمی نہیں ملتا تو کب جوائن کریں گے؟ کل ہی آجایئے۔ ہم آپ کی رپورٹ آج ہی کی تاریخ میں لے لیں گے اور پچھلی تنخواہیں آپ کو دو چار روز میں مل جائیں گی۔''

''پچھلی تنخواہ؟'' جمال نے پوچھا ''یعنی بمبئی میں غیر حاضری کے زمانے کی تنخواہ؟''

''تو بھائی کیا پچھلی تنخواہ نہیں لوگے۔ خواہ مخواہ گورنمنٹ پر احسان کروگے؟'' رانا صاحب بولے۔

''کمال ہے رانا صاحب!'' جمال نے حیران ہوکر کہا۔

''گورنمنٹ کے کام ایسے ہی چلتے ہیں جمال صاحب۔'' رانا صاحب نے دانائی سے جواب دیا۔ ''آپ کی پچھلی تنخواہ رکھی ہے خزانے میں۔ لو اب کل پہنچ جاؤ۔ مجھے جلدی ہے سعیدہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔''

رات کو مفتی اور جمال دیر تک ہنستے رہے۔ پاکستان بن جانے کے باوجود سب کچھ اسی طرح تھا...... اور شاید سعیدہ بھی!

## نہ تم بدلے نہ ہم بدلے

جمال کو رانا صاحب نے پھر بریانی اور ساگ کی دعوت کھلائی۔ کچھ کاغذوں پر دستخط کروائے اور دو چار روز کے بعد گزشتہ سات ماہ کی تنخواہ دلوا کر شاہدرہ میں اس کی پوسٹنگ کردی' جو لاہور سے صرف راوی کے پل کے فاصلے پر تھا مگر اسے ہدایت کردی کہ وہ جانے سے پہلے ڈی سی شیخوپورہ کو سلام کرلے۔

ڈی سی ضلعے میں ایک ہی پھنیئر ہوتا ہے۔ محکموں کے سارے اہلکار عملی طور پر اس کے ماتحت ہوتے ہیں۔ زمیندار مقامی اخبارات، سکول ماسٹر، علمائے دین، دکاندار، میونسپل کمیٹی کے ممبر، شراب فروش، بدمعاش، عدلیہ اور پولیس سب اسی زلف کے اسیر ہوتے ہیں۔

ڈی سی ضلعے کا قادرِ مطلق ہوتا ہے۔ شام کو کلب میں ٹینس کھیلنے والے دوسرے افسر اور نوجوان زمیندار اسے خوش کرنے کے لیے کبھی کبھی جان بوجھ کر بھی ہار جاتے ہیں۔ برج کے کھیل میں اس پر چڑھ کر بولی کوئی نہیں دیتا۔

انگریز نے ڈیڑھ سو برس راج ڈی سی کے سر پر کیا۔ وہ زمینداروں کا مالیہ معاف کرسکتا ہے۔ مزارعین کو اپنے حصے کی فصل اٹھانے سے روک سکتا ہے۔ بے گناہوں کو مار سکتا ہے۔ گنہگاروں کو چھوڑ سکتا ہے۔ روئے زمین پر اس سے بڑا حاکم آج تک کوئی ہوا نہیں۔

جمال کو ڈی سی کی جبروت کا کوئی اندازہ نہیں تھا' مگر جب اس کے اردلی نے اسے دو گھنٹے باہر کھڑا رکھا تو اس کا دل بیٹھ گیا۔

ڈی سی کے چہرے پر خشونت چھائی ہوئی تھی۔ اس نے اس کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ اشارے سے کہا سلام وصول یعنی دفع ہوجاؤ۔

افراتفری کے باعث کپڑے کے کوٹے رکے ہوئے تھے اور شاہدرہ میں جمال کو کوئی کام نہیں تھا۔ اسے حکم تھا کہ وہ شاہدرے کے نائب تحصیلدار کے ہاں رپورٹ کرے۔ اس کے دروازے پر بھی اُردلی تھا۔ اس نے بھی جمال کو کھڑا رکھا۔

## آٹے کی بوری

راوی کے پل پر اور اس کے آر پار شاہدرہ کی طرف جی ٹی روڈ کے دونوں طرف حقیر کیڑوں کے چھوٹے چھوٹے قافلے زمین پر پڑے تھے۔ جمال کو حکم ہوا کہ وہ آٹے کی ایک بوری اس طرح تقسیم کرے کہ کسی کو بھی شکایت نہ ہو۔

حقیر کیڑے سیکڑوں کی تعداد میں تھے۔ آٹے کی ایک بوری ان میں کس طرح تقسیم ہوسکتی تھی۔ اس نے ہر خاندان کو دو دو مٹھی آٹا تقسیم کرنا شروع کردیا اور اس آٹے میں صرف ڈیڑھ پھلکا پک سکتا تھا۔

جب اس نے ایک گبھرو لڑکی کی جھولی میں دو مٹھی آٹا ڈالا تو اس نے جمال کی کلائی پکڑ لی۔ ''یہ کیا دیا تم نے؟ کیا ہم بھیک مانگ رہے ہیں؟'' وہ غصے سے بولی ''میرے تین چھوٹے چھوٹے بہن بھائی ہیں۔ بوڑھے ماں باپ ہیں، دو مٹھی آٹے میں ان کے پیٹ کیسے بھروں گی۔ کیا پاکستان کا مطلب یہی ہے؟''

جمال نے دو مٹھی آٹا اس کی جھولی میں اور ڈال دیا۔

ساتھ والی چیخنے لگی "ہمیں بھی اور دو۔ ہمیں بھی اور دو......" پھر اور دو اور دو کا شور مچ گیا۔

کیڑے رینگ رینگ کر کھڑے ہو گئے اور بوری پر ٹوٹ پڑے۔ آٹا بکھر گیا۔ وہ ایک دوسرے کو دھکیلنے اور مٹی ملے آٹے کو اٹھانے لگے۔ کلکتے کے بھوکوں کی طرح، جو گندگی پر لڑتے تھے۔ لاہور کی جرنیلی سڑک پر بھی ذکریا ہوٹل کھل گیا۔

نائب تحصیلدار کے چپڑاسی نے نائب تحصیلدار کو خبر کر دی اور آن کی آن میں وردی پوش سپاہی ہاتھوں میں ڈنڈے لے کر آ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی کیڑے دبک کر بیٹھ گئے۔ امن وامان قائم ہو گیا۔

جمال کو پتہ نہ تھا کہ یہ افراتفری کس طرح شروع ہوئی۔ وہ ان کی نشاندہی نہ کر سکا جنہوں نے آٹے کی بوری لوٹی تھی۔ سب کی شکلیں ایک جیسی تھیں اور پولیس والے اتنے سنگدل نہ تھے کہ وہ خواہ مخواہ کسی کو پکڑ لیتے، مگر انہوں نے جمال کو سمجھا دیا کہ ان لوگوں کو ڈھیل دی جائے تو سر کو آ جاتے ہیں۔ ان کی بات سننی نہ چاہیے۔

## چلتے ہوئے کاروبار

کچھ دنوں کے بعد کپڑے کا کوٹہ آ گیا۔ پاکستان کو چلتے ہوئے کاروبار کی ضرورت تھی۔ مقامی ڈپو ہولڈر جمال سے پہلے ہی مل چکا تھا۔ گھی کا ایک کنستر اور انڈوں کی ایک ٹوکری اس نے جمال کے ڈیرے پر پہنچا دی تھی مگر اس نے کہہ دیا کہ اس کو رشوت نہ سمجھا جائے۔ یہ تو خدمت ہے جو افسروں کا حق ہے۔ جمال اس پر بہت ناراض ہوا تھا۔ اس پر اس نے کہہ دیا تھا کہ میں اس کی قیمت وصول کر لوں گا۔ جب صاحب کو تنخواہ ملے گی۔

شام کو ڈپو ہولڈر اپنے کاغذات معائنے کے لیے لے آیا اور کہا "رات کے وقت ان پر نظر ڈال لی جائے جب سرکار کو فرصت ہو۔"

کاغذات کے ساتھ ایک موٹی جلد والا رجسٹر بھی تھا جس میں گزشتہ کوٹے کی تقسیم کی تفصیلات درج تھیں۔

رات کو جمال نے رجسٹر کھولا تو اس میں سو سو روپے کے نوٹوں کی ایک گڈی رکھی تھی، پورے سولہ سو روپے!

جمال کو ڈپو ہولڈر کی حماقت پر بڑا رحم آیا کہ بے وقوف اپنے نوٹ رجسٹر میں ہی چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

وہ اسی وقت ڈپو ہولڈر کے گھر گیا۔ "حساب کتاب ٹھیک ہے نا سرکار؟" اس نے ہنس کر پوچھا۔

جمال نے کہا "حساب تو میں نے دیکھا نہیں، مگر تم رجسٹر میں کچھ نوٹ چھوڑ آئے ہو۔ احتیاط کرنی چاہیے میاں۔"

"احتیاط کی ہے جی۔" ڈپو ہولڈر بولا "آٹھ ہزار کے کپڑے پر آپ کے سولہ سو ہی بنتے ہیں، بیس فیصد کے حساب سے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" جمال نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جناب افسروں کے ساتھ بے ایمانی ہمارا اصول نہیں۔" ڈپو ہولڈر بولا "ہم افسروں کا حصہ پہلے اور برابر نکال دیتے ہیں۔ رانا صاحب کو فدوی سے کبھی شکایت نہیں ہوئی۔ آپ تو آج آئے ہیں حضور۔ افسر ہمارے مائی باپ ہیں اور مائی باپ کی خدمت کون نہیں کرتا۔"

اب بات کچھ کچھ جمال کی سمجھ میں آ گئی۔ رشوت کی برکتیں اس کے سامنے گھنگھرو باندھ کر ناچنے لگیں۔

مگر رات کو جمال کو دیر تک نیند نہ آئی۔ کوئی اس کے کان میں یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اگرچہ تم ان سولہ سو روپوں سے بہت کچھ کر سکتے ہو۔ نئی بائیسکل خرید سکتے ہو، نئے کپڑے بنوا سکتے ہو اور روزانہ سینما دیکھ سکتے ہو، مگر یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔

صبح سویرے اٹھ کر جمال نے کپڑے بدلے۔ روپے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھے۔ سوٹ کیس، گھی کا کنستر اور انڈوں کی ٹوکری ساتھ لے کر وہ لاہور بھاگ گیا' ہمیشہ کے لیے۔ شاہدرہ سے رخصت ہوتے وقت اسے رانا صاحب کا بھی خیال نہ آیا جو اسے گھر کا آدمی سمجھتے تھے۔ سعیدہ بھی یاد نہ آئی جس کی چوڑیوں میں ساتوں سُر بولتے تھے۔

## خوش رنگ آگ

فرزندانِ اسلام نے شاہ عالمی کے راج محل پر بھی بالآخر قبضہ کر لیا، مگر اب کوئی ہندوؤں کی جان لینے کے درپے نہ تھا۔ مسلمانوں کو صرف ان کی دکانوں اور ان کے مال کی ضرورت تھی۔ حق شفع کے اصول پر اس کا حق بھاٹی اور موچی کے جی داروں کا تھا۔ ایک رات طے شدہ منصوبے کے مطابق جوانوں نے پولیس کی نگرانی میں بند گلیوں اور مقفل دکانوں پر برابر پٹرول کا محلول چھڑک کر آگ لگا دی۔ لال دوائی اور گلیسرین کا محلول زیادہ کارآمد تھا مگر ان کا حصول مشکل تھا۔ ادویات کی ساری دکانیں ہندوؤں کی تھیں اور مسلمان ان کے کیمیائی خواص سے واقف بھی کم کم ہی تھے۔

شاہ عالمی کے گوداموں میں جنگِ عظیم کی پیراشوٹ چھتریوں کا ایک بڑا ذخیرہ پڑا تھا۔ ان کا کپڑا عمدہ اور پختہ تھا اور مسلمانوں کو بہت پسند تھا کیونکہ اس کے برقعے اور شلواریں کئی کئی سال پھٹتی نہ تھیں۔ پھر اس میں ہر طرح کے رنگ مل جاتے تھے۔ ہندو سیٹھ اسے روک روک کر اور بہت مہنگا کر کے بیچتے تھے۔

جمال کرشن نگر میں چھت پر لیٹا تھا' جب وہاں سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر شاہ عالمی کے گوداموں نے آگ پکڑ لی۔ آسمان روشن ہو گیا اور عجیب عجیب رنگوں کے شعلے نکلے۔ لگتا تھا پنچھل پائیوں کی بارات کے آگے چھٹتے انار اور مہتابیاں جلا رہے ہیں۔ نائیلون کے کڑوے دھوئیں سے شہر کے لوگ کھانستے اور رات بھر پانی پیتے رہے۔

گوداموں کے مالک سیٹھ پہلے ہی علاقے کو خالی کر چکے تھے۔ صرف ان کے قفل اور ان کا خوف باقی تھا۔ کہیں کسی نے اِکا دُکا مسلمان چوکیدار بھی چھوڑا ہوگا جو خطرہ دیکھ کر کھسک گیا اور شاہ عالمی کا مورچہ کسی

خاص مزاحمت کے بغیر اہل اسلام نے سر کرلیا۔

رات ہی رات میں آگ کی لپٹوں میں سے بھاٹی اور موچی کے جی داروں نے پولیس والوں کی مدد سے سارا تجارتی سامان نکال لیا۔ تانگے اور ریہڑے اس وقت ملتے نہ تھے، اس لیے بیچاروں کو رات بھر مال کے پھیرے لگانے پڑے۔

مال تو لٹا سو لٹا مگر شاہ عالمی کی جائیدادیں، دکانیں اور مکان ایسے جلے کہ بنیادیں خلط ملط ہو گئیں۔ کسی مہاجر کے لیے ان کی الاٹمنٹ میں اب کچھ بھی نہ رکھا تھا۔

## کفر کا آخری گڑھ

لاہور کے تازہ ولولوں پر کفر کا ایک ہی نشان باقی تھا۔ ٹیمپل روڈ پر گوردوارہ دسویں پادشاہی۔

دسویں پادشاہی گورو گوبند سنگھ جی کو کہتے ہیں جنہوں نے سکھ پنتھ کی بنیاد رکھی تھی۔ گورو صاحب کا سکھ اتہاس میں بڑا مقام ہے۔ دھرت ناس، کرت ناس، دھرم ناس، کرم ناس اور کل ناس وغیرہ انہی کا منشور تھا' جس پر ان کے بعد ان کے چیلے بندہ بیراگی نے دلجمعی سے عمل کیا اور تشدد کو سکھوں کی روایت بنا دیا۔ یوں بھی وہ ایک ننھی سی اقلیت تھے مگر اپنے غیر معمولی تہور سے اور مغلوں کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد حکمرانی کا مزہ چکھ چکے تھے۔ پنجاب پر طلوعِ اسلام کے بعد سکھ حکومت پنجابیوں کی پہلی حکومت تھی جس میں ہندو اور مسلمان اکابرین اور فوجی قبائلی سردار برابر کے شریک تھے۔ اس سکھ حکومت کا سرتاج مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک اعلیٰ درجے کا جرنیل اور حاکم تھا۔ انگریز اس سے ڈرتے تھے۔ فتح پنجاب کے بعد انگریزوں نے سکھوں کو بڑی تعداد میں بھرتی کیا اور جنگِ عظیم میں ان کی خدمات کے بدلے انہیں پنجاب میں خصوصی حقوق دینے کا وعدہ کیا۔ سردار پٹیل نے انہیں مشرقی پنجاب میں سکھ صوبے کا خواب دکھایا۔ بشرطیکہ وہ مسلمانوں کو نکال کر مشرقی پنجاب میں اپنی اکثریت بنالیں۔ پنڈت نہرو تو مسلم لیگ کے خلاف زہر کھائے ہوئے تھے کہ وہ ہندوستان پر کیوں نہیں ہندو اکثریت کے ابدی حق حکومت کو تسلیم کرلیتی۔ مہاتما گاندھی بھی بات سن کر چرخہ کاتنے میں مصروف ہو جاتے۔

سکھوں کے اصل گورو اور قبلہ نما سری گوبند سنگھ تھے جن کے نام کا سب سے وقیع گوردوارہ ٹیمپل روڈ پر دسویں پادشاہی کے نام سے موسوم تھا۔

اس کی حفاظت کے لیے آٹھ دس سرفروش سکھ چار دیواری میں قلعہ بند ہو کر مزنگ کے مومنوں کے جی جلاتے تھے۔ لاہور چھوڑنے کا ان کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

حق شفع کی بنا پر یہ گوردوارہ مزنگ کے وڈ قصائیوں کی ذمہ داری تھی۔ لاہور کے دیگر وڈ قصائی انہیں چوڑیاں بھیجتے اور ان پر فقرے کستے تھے۔

مزنگ کے وڈ قصائیوں کو پتہ تھا کہ سیواداروں نے سروں پر موت کی نیلی پگڑیاں باندھ رکھی ہیں۔ وہ رات دن جپ جی کا پاٹھ کرتے۔ گورو صاحبان کی بانیاں پڑھتے اور موت کا انتظار کرتے۔ وقت ان کا بھی بہت مشکل سے گزرتا تھا۔

مزنگ کے وڈ قصائیوں کا محکم عقیدہ تھا کہ ان کا ربِ قدیر زندگی اور موت پر قادر ہے مگر وہ ان چند اکالیوں سے خوفزدہ تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ گورودوارے کے اندر تھوڑے بہت گھی شکر، کچھ آٹے کی بوریوں اور مرچ مصالحے کے سوا کچھ نہیں۔ اتنے حقیر مالِ غنیمت کے لیے کوئی اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا عقل کی بات نہ سمجھتا تھا۔ پھر اسلام بھی قتال کو پسند نہیں کرتا تھا۔

جب مزنگ کے وڈ قصائیوں کے لیے طعنے ناقابلِ برداشت ہو گئے تو انہوں نے تھانہ مزنگ سے مشورہ کیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ تھانیدار نے انہیں خود طلب کیا تھا مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مسلمان اپنے معاملات میں مشورہ کرنے کے پابند ہیں۔

مزنگ کے تھانیدار نے وڈ قصائیوں کی مشکل حل کردی۔ اس نے کہا پٹرول اور کچے ربر کے کنستر تمہیں میں دیتا ہوں۔ تم فقط انہیں دیواروں اور دروازوں پر انڈیلنے اور ماچس جلانے کا کام کردو۔ پھر اس نے اپنی گارڈ میں خاص خاص جوان چنے۔ انہیں سفید کپڑے پہنوائے اور مقررہ وقت پر سب کو ساتھ لے کر گورودوارے پر ہلہ بول دیا۔ رات کے اندھیرے میں شریف شہریوں نے گولیوں کی تڑتڑ سنی تو دروازے بند کرلیے۔

گولیوں کی بوچھاڑ کی وجہ سے دست بدست لڑائی کا کوئی موقع نہ آیا۔ سیوادار اندر ست سری اکال اور جو بولے سونہال کے نعرے مارتے گولیاں کھا کھا کر گوردوارے کے صحن میں گرتے رہے۔ انہیں موقع ہی نہ ملا کہ وہ کرپان لہرائیں، پستول چلائیں یا اپنے ایٹم بموں کے ذخیرے کو ہوا لگنے دیں جو لاہوریوں کی اطلاع کے مطابق ریڈکلف جاتے جاتے وقت ان کو دے گیا تھا۔

سفید کپڑوں میں ملبوس مجاہدین گولیوں کی ایک باڑھ مار کر رک جاتے تو سیوادار نکل کر زخمیوں کو صحن سے گھسیٹ گھسیٹ کر گوردوارے کے اندر لے جاتے۔

کچھ دیر یہ عمل جاری رہا۔ پھر منصوبے کے مطابق مزنگ کے وڈ قصائیوں نے پٹرول اور کچے ربر کے کنستر گوردوارے کی دیواروں، کھڑکیوں اور چھتوں پر بہا دیئے۔ آن کی آن میں آگ نے گوردوارے کو گھیر لیا جس میں مردہ زندہ اور زخمی کافر تیتروں کی طرح پھڑکنے لگے۔

صحن میں ایک بہت بھاری بھرکم سیوادار تین گولیاں کھا کر گرا پڑا تھا۔ وہ ایک بھینسے کی طرح موٹا اور طاقتور تھا اور تین گولیاں کھا کر بھی ڈکراتا تھا...... ''مسلو ہمت ہے تو آگے آؤ، ست سری اکال جو بولے سونہال!'' وہ اٹھ کر کھڑا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کو اور گولی بھی نہیں ماری جاسکتی تھی کیونکہ وہ دیوار کی اوٹ میں پڑا تھا اور دھوئیں میں اس کا ٹھیک سے نشانہ بھی نہیں لیا جاسکتا تھا مگر وہ ڈکراتا، للکارتا اشتعال دلاتا تھا...... اور جب وہ للکارتا تھا تو جو باقی رہ گئے تھے، ان میں بھی دم تھا۔

## جوشِ ایمانی

تھانیدار نے مزنگ کے مجاہدوں کو گالیاں دیں تو ان کے جوشِ ایمانی کو بھی غیرت آ گئی اور وہ اچانک چاروں طرف سے دیواریں پھاند کر اس للکارتے ہوئے زخمی کافر پر پل پڑے۔ اس کے ہاتھ میں ننگی کرپان تھی مگر اس کا بازو اٹھتا نہ تھا۔ جوشِ ایمانی کے جذبے سے سرشار مجاہدین نے اس پر پٹرول کا ایک پورا کنستر انڈیل دیا مگر وہ اسے وہیں جلانا نہ چاہتے تھے۔ چاروں منڈیروں پر کھڑے شرفا کو وہ اس دردناک منظر سے بچانا چاہتے تھے۔ پھر انہیں یہ بھی خیال تھا کہ کل کلاں کو کسی نے انکوائری کر دی تو اتنے بہت سے چشم دید گواہوں کو گواہی دینے سے روکا نہ جا سکے گا۔ چنانچہ انہوں نے اس موٹے لمبے للکارتے اور ڈکارتے ہوئے سکھ کو جس کے کیس کھل کر اس کے خون میں لتھڑ رہے تھے، ٹانگوں سے گھسیٹ کر گورودوارے کے اندر لے جا کر آگ دکھا دی۔

اور ''جو بولے سونہال'' کی آواز شعلوں کے گنبد میں سے آخری مرتبہ ابھری۔

رات ہی رات میں آگ بجھ گئی کیونکہ پاس پڑوس کے مکانات جو مسلمانوں کی ملکیت تھے، خطرے میں تھے۔ لوگوں نے آگ پر اس قدر پانی ڈالا کہ نلکے اور کنویں خشک ہو گئے۔

رات ہی رات میں تھانیدار نے چوہڑے بلوا کر سکھوں کی جلی ہوئی ہڈیاں، بستر اور کپڑے کوڑے میں اٹھوا دیئے کہ کل کلاں کے لیے کوئی ثبوت باقی نہ رہے۔ پولیس والے قانون کا بہت احترام کرتے ہیں۔

صبح سویرے ہی تھانیدار نے ایف آئی آر لکھ کر نقل اوپر بھجوا دی......

''گورودوارہ دسویں بادشاہی کے سیواداراں نے جو آتشیں اسلحہ سے مسلح تھے، اچانک مزنگ کے شریف شہریوں پر حملہ کر دیا تاکہ علاقے کو فتح کر کے ہندوستان میں شامل کروایا جا سکے۔ انہوں نے پیغمبر اسلام اور حضرت قائداعظم کے خلاف بھی نعرے لگائے۔ پاکستان کو قبرستان کہا اور گلا پھاڑ کر کہا تاکہ واہگہ پار سے اُن کی آواز سن کر مزید اکالی ان کی مدد کو پہنچیں۔ مزنگ کے شریف شہریوں نے انہیں اس اشتعال انگیزی سے روکا تو انہوں نے اگنی بان چلا دیئے اور اسی کشمکش میں ان کے بارود کے ذخیرے نے آگ پکڑ لی۔ شریف شہریوں نے آگ بجھانے اور ان کو جو گورودوارے کے اندر قلعہ بند تھے، بچانے کی سرتوڑ کوشش کی مگر دروازہ اندر سے بند تھا اور جب انہوں نے لوہار بلا کر اسے توڑنے کے بعد اندر دیکھا تو سکھ حملہ آور جل کر راکھ ہو چکے تھے۔ پولیس علاقے کے معززین سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ برائے اطلاع افسران بالا رقمطراز ہوں: فدوی......''

ڈی ایس پی نے Seen لکھ کر رپورٹ داخل دفتر کر دی۔

## تعمیرِ وطن

لاہور میں اب کفر کا کوئی گڑھ باقی نہ رہا تھا۔ مسلمان نہا دھو کر پاک وطن کی تعمیر میں لگ گئے تھے۔

ہر شخص اپنی جلد ترقی کی آرزو میں رات دن ایک کر رہا تھا۔ جن کے رشتہ دار راستے میں تھے، وہ ان کا انتظار کرتے تھے مگر اس میں کوئی وقت ضائع نہ کرتا تھا۔ جن کی بیٹیاں، بہنیں اور بیویاں سکھوں نے چھین لی تھیں، انہوں نے اپنے دلوں کو سمجھا لیا تھا کہ وہ مر چکی ہوں گی اور اللہ کی مرضی میں کسے دخل ہے۔

تاجروں، زمینداروں اور افسروں نے منصوبے بنائے تھے اور اب صرف وہی خالی ہاتھ نظر آتے تھے جنہوں نے ہمتِ مرداں سے کام نہ لیا تھا، جن کے باپ دادا نے اپنی نالائقی اور کاہلی کی وجہ سے ہندوستان میں کوئی جائیداد نہ چھوڑی تھی یا جو کسی جائیداد کے اصلی یا جعلی کاغذات تیار نہ کروا سکے تھے۔ ایسے لوگ ملک پر بوجھ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی دربدری کے ذمہ دار خود ہوتے ہیں۔ پھر ان حرامزادے ہندوؤں نے اتنی جائیداد چھوڑی بھی نہیں تھی کہ سب کو حصہ مل جاتا۔

مہاجرین نے ہندوستان میں مصیبتیں برداشت کیں۔ وہ گھروں سے نکالے گئے۔ ان کے پیارے ان کی آنکھوں کے سامنے قتل ہوئے مگر پاکستان کے دارالامان میں پہنچتے ہی ان میں سے بعض اپنے غم بھول کر نئی زندگی کی تلاش میں جُت گئے۔

حکومتِ پاکستان سب کو آباد کرنا چاہتی تھی اور اس نے ہر بے وطن کو جو افسروں تک پہنچ سکا تھا، وہ مکان الاٹ کر دیا جس پر اس نے ہاتھ رکھا۔ جائیداد اتنی آسانی سے بٹتی دیکھ کر لوگ سارے غم بھول گئے اور رشوت اور جھوٹ کے ذریعے حصولِ دولت کا کلچر پھیل گیا۔ یہیں سے پاکستان میں لوٹ مار کی ابتدا ہوئی جو ہر شعبے میں جاری وساری تھی۔ پولیس اور غنڈوں کا اتحاد پہلے ہی ہو چکا تھا۔ مولوی ابھی چپ تھے۔ انہوں نے تنظیمی طور پر پاکستان کی ڈٹ کر مخالفت کی تھی۔ اب وہ شرمندگی کے مارے بول نہ سکتے تھے۔ ویسے بھی مولوی ابھی تک اپنے آپ کو کمتر ہی سمجھتے تھے۔

افسروں نے دیکھا کہ انگریز چلا گیا ہے اور مسلم لیگ کے لیڈر جو کل تک ہمارے دروازے پر کھڑے رہتے تھے۔ آج بھی کھڑے ہیں کیونکہ انہیں حکومت چلانی نہیں آتی۔ وزیر کبیر سب ہماری ہی زلف کے اسیر ہیں۔ وہ بلا سوچے سمجھے فیصلے کرنے لگے۔ ابھی انہوں نے لوٹ مار میں حصہ بٹانا شروع نہ کیا تھا۔ ابھی ان کے لیے طاقت کا نشہ کافی تھا۔

قائداعظم کو کچھ پتہ نہ تھا کہ نیچے کیا ہو رہا ہے۔ خزانہ خالی تھا۔ کاروبار بند تھے۔ ٹیکس ملتے نہ تھے اور پنجاب اور بنگال کی مذہبی بنیادوں پر تقسیم اور تبادلہ آبادی کے صدموں نے ان کی کمر توڑ دی تھی۔ مہاجرین کی آبادکاری کے سوا انہیں کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ کشمیر کے بارے میں وہ فی الحال فکرمند نہ تھے۔ مہاراجہ کشمیر نے پاکستان اور ہندوستان کے ساتھ ایک سال کے لیے حالات کو علیٰ حالہ جامدر کھنے کا معاہدہ کر لیا تھا اور فی الحال ہندوستان کا کشمیر سے کوئی زمینی رابطہ بھی نہ تھا۔ اس کے باوجود مہاراجہ کی ڈوگرہ فوج نے راشٹریہ سیوک سنگھ کے مسلح سیواداروں کی مدد سے جموں کے مشرقی حصوں سے مسلمانوں کا صفایا شروع کر دیا تھا اور اس کا تجربہ انہوں نے مشرقی پنجاب میں حاصل کر لیا تھا۔ جموں شہر میں اضطراب کی لہر دوڑ چکی تھی۔

## باب 16

جمال کے رشتے کے چچا جموں میں سکول ماسٹر تھے اور وہ وہاں بے پناہ ہر دلعزیز تھے۔ ان کی مالی حالت بھی اچھی تھی۔ ان کے بڑے بھائی مہاراجہ ہری سنگھ کے سٹینو گرافر تھے اور اس وجہ سے بھی ماسٹر صاحب جموں میں بااثر سمجھے جاتے تھے۔

اگر وہ اتنے بااثر نہ ہوتے تو شاید ان کی جان بچ گئی ہوتی۔

جموں سے سیالکوٹ پندرہ بیس میل سے زیادہ نہیں مگر راستے بند ہو چکے تھے۔ ریلیں اور بسیں رک چکی تھیں۔

جموں شہر میں سکھ اور ہندو شرنارتھی جو سیالکوٹ سے بھاگے تھے، مسلمانوں کو للکارتے پھرتے تھے۔ پولیس میں سے عبوری حکومت کے ہوم منسٹر سردار پٹیل کی ہدایت پر مسلمان افسروں کو نکالا جا چکا تھا۔ ڈوگروں کی آنکھوں سے خون ٹپکتا تھا۔ جموں کے مسلمانوں کو پتہ تھا کہ کوئی دم کی بات ہے، پھر ہمارا خون کتے چاٹیں گے۔

جموں کے مسلمانوں نے مہاراجہ ہری سنگھ کو درخواستیں بھیجیں جو مختلف مراحل سے گزرتی رہیں۔ بالآخر ڈپٹی کمشنر نے اعلان کر دیا کہ مہاراجہ بہادر اپنی مسلمان رعایا کے لیے نیک خواہشات رکھتے ہیں اور وہ ان کی ہر ممکن حفاظت کریں گے۔ ان کے اطمینان کی خاطر فی الحال تیس بسوں کا انتظام کر دیا گیا ہے، تاکہ اگر مسلمان کچھ دیر کے لیے سیالکوٹ جانا چاہیں تو سرکاری نگرانی میں سرحد پار کرا دی جائے۔

### تیس بسیں

تیس بسوں میں جموں کے سارے مسلمان بٹھائے نہ جا سکتے تھے۔ جگہ حاصل کرنے کے لیے بھاگ دوڑ، آہ وزاری اور رشوت، سفارش کی لہر چل پڑی۔ قافلے کو اگلے ہی دن روانہ ہو جانا تھا۔ مہاراجہ کی حکومت کی طرف سے سامان پر بھی کوئی پابندی نہ تھی۔ جانے والوں کے لیے یہ فیصلہ مشکل ہو رہا تھا کہ کیا لے جائیں اور کیا چھوڑ جائیں۔ مجبوراً سب نے یہی فیصلہ کیا کہ صرف زیورات، نقدی اور قیمتی کپڑے ساتھ رکھ لیں کیونکہ جلد ہی ہمیں واپس آ جانا ہے۔

ماسٹر صاحب پھرتیلے اور بااثر آدمی تھے۔ انہوں نے اپنے خاندان کے لیے سیٹیں مخصوص کروا لیں۔

رات بھر کوئی نہ سویا۔ گھر چھوڑنے کا دکھ اور پاکستان جانے کا اشتیاق دونوں ہی بے اختیار جذبے تھے۔

رات بھر جو غریب اور بے سہارا تھے، روتے رہے کیونکہ وہ پاکستان کے دارالامان نہ پہنچ سکتے تھے۔ وہ رات جموں کے غریب اور بے سہارا مسلمانوں پر بھاری گزری۔

ماسٹر صاحب نے رات کو دیر تک اپنے ہندو اور ڈوگرے دوستوں سے ملاقاتیں کیں۔ پڑوسیوں سے رخصت لی اور ان سے درخواست کی کہ تم میرے گھر کی دیکھ بھال کرتے رہنا۔

ماسٹر صاحب کی بیوی نے آدھی رات کو اٹھ کر بچوں کو نہلایا۔ نئے کپڑے پہنائے اور صبح کی اذان کے وقت انہیں ناشتہ کھلا کر فارغ ہو گئی۔ بسوں کو دو گھنٹے کے بعد روانہ ہو جانا تھا۔

ماسٹر صاحب سیانے آدمی تھے۔ انہوں نے زیورات کو ایک ہی پوٹلی میں باندھنے کے بجائے بیوی اور بچوں کے کپڑوں کے اندر سی دیا۔ نقدی بھی اسی طرح چھپا دی۔ بڑے نوٹ البتہ انہوں نے اپنی خفیہ جیبوں میں رکھ لیے۔

ماسٹر صاحب بہت دور اندیش تھے۔ مہاراجہ بہادر نے اپنی مسلمان رعایا کی سلامتی کے سلسلے میں پورے انتظامات کر دیئے تھے مگر اس زمانے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس لیے ماسٹر صاحب نے تانبے کی بڑی بڑی رکابیاں جن میں مسلمان پلاؤ کھاتے ہیں، اپنے پیٹ، سینے اور کمر پر رکھ کر کپڑے سے باندھ لیں تاکہ اگر کوئی موذی برچھا مار دے تو ان کا کچھ نہ بگڑے۔

چھوٹی رکابیاں اسی طرح انہوں نے اپنے بچوں اور بیوی کے جسموں پر باندھ دیں اور یوں بکتر بند ہو کر وہ وقت سے پہلے ہی اڈے پر پہنچ گئے۔

### میدانِ کربلا

اڈے پر ایک جمِ غفیر تھا۔ بوڑھے، عورتیں اور بچے جن کے پاس پرمٹ نہیں تھے، ایک ایک کے آگے ہاتھ جوڑ رہے تھے کہ کسی طرح ہمیں بھی بٹھا لو۔ بس کے اندر بیٹھنے والوں کو ان سے پوری پوری ہمدردی تھی مگر وہ ان کے لیے کیا کر سکتے تھے۔ انہوں نے انہیں تسلی دی کہ تم دوسرے پھیرے میں آ جانا۔

مگر مہاراجہ کے پہریدار ڈوگرے اور سکھ ڈرائیور بڑے رحمدل تھے۔ انہوں نے بعض کو کچھ پیسے لے کر بسوں کی چھتوں پر بٹھا لیا۔ سارے ڈوگرے اور سکھ شقی القلب نہیں ہوتے۔

بسیں چلیں تو مسافروں کے چہروں پر رونق آ گئی۔ جموں سے نکلتے ہی انہوں نے پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ وہ گھنٹے بھر میں دارالامان پہنچنے والے تھے اور بال بچے اور زیور

کپڑا ان کے ساتھ تھا۔

بیشتر کی رشتہ داریاں سیالکوٹ میں تھیں۔ وہ اپنے اپنے عزیزوں کی باتیں کرنے لگے۔ کچھ نے قرآن شریف کی تلاوت شروع کردی۔ کچھ کلمے کا ورد کرنے لگے جسے سن کر عورتوں نے سر ڈھانپ لیے اور بچوں کو گود میں بٹھالیا۔

شہر سے نکلتے ہی سڑک سنسان ہوگئی۔ چاول کی ہریالی پھوٹ رہی تھی۔ مگر کسان کوئی کام کرتا دکھائی نہ دیتا تھا۔ دیہات کے کنوؤں پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تھانوں پر بندھے بیلوں کی گھنٹیوں اور لاریوں کی گھرر گھرر کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ آسمان پر بھی کوئی چیل اڑتی نہ تھی مگر کسی نے اِدھر دھیان نہ دیا۔ سب آگے کی طرف دیکھتے تھے۔ بوڑھے، بچے، جوان اور عورتیں ایک ایک میل بچی کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے دیوانے ہوتے تھے۔ یااللہ تیرا شکر! یااللہ تیرا شکر!

سوچیت گڑھ کے قریب جہاں سے پاکستان کی سرحد بہت زیادہ دور نہیں تھی۔ بسیں سیدھی سیالکوٹ کی طرف جانے کی بجائے اچانک بائیں طرف کی کچی سڑک کی طرف مڑ گئیں تو لاریوں میں ہاہاکار مچ گئی۔ مرد چلانے لگے، عورتیں رونے لگیں۔ ان کی چادریں سروں سے اُتر گئیں۔ ہمیں کدھر لیے جارہے ہو۔ کہاں لیے جارہے ہو کا شور مچ گیا۔

مگر کسی ڈرائیور نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بسوں کو درختوں کے ایک جھنڈ میں لے گئے یہاں سیکڑوں سکھ ڈوگرے سپاہیوں اور راشٹریہ سیوا سنگھی سیواداروں کا ایک ہجوم کھڑا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں، ننگی تلواریں تھیں اور لمبے پتلے نیزے تھے۔ چوڑے پھل والی کلہاڑیاں تھیں جنہیں چھوی کہتے ہیں اور جن کی دھاریں تازہ تازہ سان پر لگی ہوئی تھیں۔

گاؤں کے کتے کچھ فاصلے پر کھڑے بھونک رہے تھے۔

## جے بجرنگ بلی

بسوں کے رکتے ہی ہجوم نے جے بجرنگ بلی، ست سری اکال۔ پاکستان بنے گا قبرستان اور محمد علی جناح مردہ باد کے نعرے لگانے شروع کردیئے۔ وہ ڈھول بجا بجا کر اپنے اوپر جنون طاری کررہے تھے۔

ان کو دیکھتے ہی مسلمان مرد جی ہار گئے۔ بعض نے چھلانگیں لگا کر بھاگنے کی کوشش کی مگر جس طرح پنجاب میں سانسیوں کے بولی کتے کمادی بلوں پر جھپٹتے ہیں اسی طرح ایک ایک بھگوڑے کے پیچھے کئی کئی بلمیں اور تلواریں گنے کے کھیتوں میں گھس گئیں۔ بس میں بیٹھی ہوئی عورتوں اور بچوں نے کسی کو گرتے نہ دیکھا فقط ان کی چیخیں اور پکاریں سنیں۔

بھاگنے والوں کا تعاقب کرنے والے گھیرا ڈال کر ان کا راستہ روک دیتے۔ پھر کچھ کرپانیں اور نیزے اٹھ اٹھ کر زمین میں گڑ جاتے اور بولے سونہال اور ہر ہر مہادیو کے شور اور مٹی کے غبار میں سب کچھ گم ہوجاتا۔

اتنے میں کوئی اور بلا کچھ اور کتوں کے آگے بھاگنے لگ جاتا۔ دیر تک شکار کی یہ کیفیت جاری رہی۔ زیادہ تر مسافر بسوں کے اندر ہی بیٹھے رہے۔ روتا کوئی نہ تھا۔ منہ سے کوئی کچھ بولتا نہ تھا۔ کوئی دعائیں بھی نہ مانگتا تھا۔ کلمہ شہادت بھی نہ پڑھتا تھا۔

جموں کے بااثر مسلمانوں کا قتلِ عام ڈوگرہ فوج، سکھوں اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے منصوبے کا ایک حصہ تھا۔ مشرقی پنجاب کی ریاستوں میں بھی مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا تھا مگر ان میں ایسا مکر، ایسا کمینہ پن نہ ہوا تھا جیسا مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنی مسلمان رعایا سے کیا۔ ٹھیک ہے نابھہ پٹیالہ اور جنید کے قاتل ریاستی فوجوں کے مسلح سپاہی تھے، مگر انہوں نے مسلمانوں کو کسی جل کے ذریعے گھروں سے نہ نکالا تھا۔ وہ سیدھے سبھاؤ جتھے بنا کر مسلمان گھروں، محلوں، کیمپوں اور قافلوں پر حملے کرتے تھے مگر مہاراجہ سری سنگھ کا اپنا سٹائل تھا۔ اس نے مسلمانوں کے سربرآوردہ لوگوں کے قتلِ عام کے ساتھ ساتھ دھوکے اور مکاری کی لذت بھی لی تھی۔

جب بھاگنے والے قتل ہوگئے اور شکار ختم ہوگیا تو سانسیوں کے بلی کتوں نے بسوں کو گھیرے میں لے لیا اور حکم دیا کہ سب نیچے اتر آئیں۔

مگر کوئی بھی سیٹ سے نہ ہلا۔ اس پر وہ مردوں اور جوان عورتوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر نیچے اتارنے لگے اور اسی میں بعض نیزے اور بلمیں بعض انتڑیوں تک اتر گئیں۔ چیخوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ شور مچا تو قاتلوں کی دیوانگی کمال تک پہنچ گئی۔

## ماسٹر صاحب کی معاملہ فہمی

ماسٹر صاحب بہت زیرک اور معاملہ فہم آدمی تھے۔ انہوں نے کہا ''ٹھہرو بھائیو میں خود نیچے اتر آتا ہوں۔''

ان کا لہجہ پرسکون تھا۔ ان کی بات سن کر اٹھی ہوئی تلواریں رک گئیں۔ ماسٹر صاحب نہایت اطمینان سے نیچے اتر آئے۔ نیچے اتر کر انہوں نے کہا ''میں سب کو بسوں سے اتار دیتا ہوں اور ہم سب زیور، کپڑا، نقدی اور گھڑیاں تمہارے حوالے کردیں گے۔ جھگڑے کی کوئی بات ہی نہیں۔''

پھر انہوں نے قاتلوں کے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا ''بسوں سے نیچے اتر آؤ سب لوگ مگر عورتیں اور بچے بیٹھے رہیں۔''

ہجوم میں کچھ لوگ کتوں کی طرح غرائے مگر اتنے میں مرد مسافر کود کود کر بسوں سے نیچے اترنے لگے۔ جن کی جیبیں بھری ہوئی تھیں۔ قاتلوں نے ایک ایک کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔

ماسٹر صاحب اپنے سینے اور پیٹ پر بندھی ہوئی تانبے کی بڑی بڑی رکابیوں اپنی پتلون میں سلے ہوئے اور جیبوں میں چھپائے ہوئے نوٹوں کے باوجود بہت سبک رفتار تھے۔ انہوں نے ہجوم کو یوں مصروف پایا تو اچانک ایک جنگلی تیتر کی سی پھرتی سے کماد کے کھیت کی طرف بھاگے۔ یہ جا وہ جا!

مگر انہیں بھاگنے کون دیتا تھا۔ من چلے سیواداروں نے ان کا چیلنج قبول کر لیا اور تلواریں اور بلمیں ان کے پیچھے لپکیں۔

ماسٹر صاحب کی بیوی بس کی کھڑکی میں سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اپنے میاں سے اپنے بچوں سے اور اپنی زندگی سے اس کے رشتے کٹ چکے تھے۔ وہ نہ ہلی نہ سرکی۔ بت بنی دیکھتی رہی جیسے اس منظر سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

آن کی آن میں شکاری کتوں نے شکار کو جا لیا۔ ایک نیزہ کھا کر ماسٹر جی کھیت میں گر گئے۔ ان کے سینے پیٹ اور پیٹھ پر بندھی ہوئی تانبے کی رکابیاں ایک وار بھی نہ روک سکیں۔ گرے ہوئے ماسٹر جی پر کرپانیں اور بلمیں برستی رہیں مگر ماسٹر صاحب کی بیوی کچھ نہ دیکھ سکی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پھر کسی نے اس کو کلائی سے پکڑ کر نیچے اتار لیا۔ اس کی دودھ پیتی بچی اس کے سینے سے چمٹی ہوئی تھی۔

اس کے چار سال کے بیٹے نے بھی چھلانگ لگا دی۔ اس کی پانچ سال کی بیٹی سوٹ کیس کے اوپر بیٹھی تھی۔ ایک سیوادار نے سوٹ کیس کھینچا تو وہ لڑھک کر زمین پر آ رہی۔ اس کی چھ سال کی بچی بس کے دروازے میں کھڑی تھی جب اس نے اسے آخری مرتبہ دیکھا۔

قاتلوں نے یہ دیکھ کر کہ بسوں میں سامان بہت ہے، عورتوں اور بچوں کی بجائے سوٹ کیسوں اور ٹوکریوں جھپٹنا شروع کر دیا مگر بعض نے جوان عورتوں کی چوٹیاں بھی پکڑ لیں۔ بوڑھی عورتوں کو جو کسی کام کی نہ تھیں، انہوں نے ایک ایک دو دو ضربوں میں ختم کیا۔ نہ کوئی روئی نہ کسی نے آواز نکالی۔

آتے جاتے اکتائے ہوئے نیزوں نے بعض بچوں کو بھی پرو لیا۔ بچوں کا اور کوئی کیا کر سکتا تھا۔

میدان میں ابھی کام بہت تھا۔ سارے مرد ابھی مرے نہ تھے۔ ان کو قتل کرنا ضروری تھا...... سامان تو جہاں تھا وہیں تھا۔

عورتیں بھی اندھا دھند بھاگ رہی تھیں مگر وہ کہاں جا سکتی تھیں۔ مردوں سے فارغ ہو کر ان سے نمٹا جا سکتا تھا۔

بھاگتے بھاگتے جو لڑکھڑا کر گر جاتیں ان میں اٹھنے اور پھر بھاگنے کی ہمت نہ ہوتی۔ سیوادار ان زندہ لاشوں پر بے دلی سے ایک آدھ بلم مار کر انہیں مردہ لاشوں میں تبدیل کر دیتے۔ بعض نے ان پر اتنی توجہ بھی نہ کی کیونکہ بسیں سامان سے بھری کھڑی تھیں۔

## دودھ پیتی بچی

جمال کی چچی کو پتہ نہ تھا کہ میری دودھ پیتی بچی میرے سینے سے چمٹی ہوئی ہے۔ وہ زمین پر اوندھے منہ گر گئی۔ فوراً ہی ایک بوڑھی عورت اس کے اوپر آن پڑی۔ اس کے پیٹ سے خون کا فوارہ بہہ رہا تھا۔ جمال کی چچی کے کپڑے بھی لال ہو گئے۔ مگر وہ اسی طرح بے حرکت پڑی رہی۔

دو تین گھنٹے بعد میدان میں خاموشی چھا گئی۔ اوندھی لیٹی ہوئی چچی نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بہت تھکی ہوئی تھی۔ وہ سو جانا چاہتی تھی مگر نیند اس سے کوسوں دور تھی۔ وہ سامان گھسیٹنے، چھینی ہوئی عورتوں کی سسکیوں اور قاتلوں کے بھاری قدموں کی آوازیں سنتی تھی مگر اسے پتہ نہیں تھا کہ میں زندہ ہوں یا مُردہ۔

پتہ نہیں پھر کس وقت ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

اس نے آنکھ کھول کر سورج کی طرف دیکھا۔ اس کی روشنی نرم تھی۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ صبح کا وہی وقت ہے جب میں گھر سے نکلی تھی۔ کسی کو کچھ بھی نہیں ہوا۔ یہ سب واہمہ ہے۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ میں اٹھ کر ذرا دیکھوں میرے ماسٹر جی کہاں ہیں؟ ان کے پیٹ پر بندھی ہوئی رکابیاں اپنی جگہ پر ہیں یا نہیں۔ میرے بچے کیا کر رہے ہیں؟ انہوں نے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں۔ ان سے پوچھوں تو سہی۔

مگر اس میں اٹھنے کی طاقت نہ تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ جب اس نے ایک مرتبہ اور آنکھیں کھولیں تو میدان خالی پڑا تھا۔ جگہ جگہ لاشیں، ٹوٹے ہوئے سوٹ کیس اور کٹے ہوئے ہاتھ پیر بکھرے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ خون کے سیاہی مائل لوتھڑے پڑے ہوئے تھے جنہیں گاؤں کے کتے سونگھ سونگھ کر چاٹ رہے تھے۔

اس نے سوچا جھٹپٹے کا ایسا ہی سماں تھا جب میں اپنے بچوں کو ناشتہ کھلا رہی تھی۔

اس نے سوچا تھوڑی دیر میں ہم لاری میں بیٹھ کر آرام سے پاکستان پہنچ جائیں گے۔ یا اللہ تیرا شکر! یا اللہ تیرا شکر!

اللہ کا شکر کر کے اس کے دل کو کسی قدر تقویت پہنچی اور اس کے حواس بجا ہوئے۔ اب اس کو یاد آیا کہ میری بچی تو میرے سینے سے چمٹی پڑی ہے اور وہ بھوکی ہے۔ اسے دودھ پلانا چاہیے۔

اس نے آہستہ سے اپنی بچی کو اپنے نیچے سے نکالا تو اسے پتہ چلا کہ میرے اوپر ایک بوڑھی عورت کی لاش پڑی ہے۔ اس کا خون میرے چہرے پر جم گیا ہے۔ تب اسے یاد آیا کہ میں نے ماسٹر جی کو نیزہ کھا کر گرتے دیکھا تھا۔ میرا پانچ سال کا بیٹا اور چار سال کی بیٹی بس کے پاس گرے ہوئے تھے مگر میری چھ سال کی بیٹی کہاں ہے، میں نے اسے بس کے دروازے میں کھڑی دیکھا تو تھا!

اس کو یہ سوچ کر قرار آ گیا کہ وہ سب مر چکے ہیں۔ اس نے رونے کی کوشش کی مگر اس کی آنکھ سے ایک قطرہ بھی نہ نکلا۔

اس نے اپنی دودھ پیتی بچی کو ہولے ہولے پیار کرنا شروع کر دیا۔ اس نے اسے دودھ پلانے کی کوشش کی۔ وہ ایک لمحے کے لیے سارے دکھ بھول گئی۔

اس کی بچی نے اس کی چھاتی کے چھیچھڑے کو چوسنا شروع کیا تو وہ حیران ہوئی کہ میرے سینے کو کیا ہو گیا ہے، کیوں اس میں سے دودھ کی نہر نہیں بہتی۔

# تاروں بھری رات

آسمان پر ستارے نکل آئے تھے۔ میدان میں ہُو کا عالم تھا۔ زخمیوں نے سسکنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ مر چکے تھے۔

عین اس وقت اسے بڑے زور کی پیاس لگی۔ اس نے بڑی مشکل سے تھوک نگلا تو اسے لگا کہ میرے حلق میں کانٹے اُگ آئے ہیں۔ یہ کانٹے اسے تکلیف دینے لگے۔ اسے لگا کہ پیاس سے بڑا دنیا میں کوئی دکھ نہیں، وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

بیٹھ کر اس نے حواس درست کیے۔ دن کے سارے واقعات ایک ایک کر کے اسے یاد آنے لگے۔ وہ ساری بات سمجھ گئی۔

اسے یاد آیا کہ درختوں کے اس جھنڈ کی طرف مڑتے ہوئے بسوں نے ریلوے لائن پار کی تھی۔ ریلوے لائن جو جموں سے سیالکوٹ کو جاتی ہے۔

سیالکوٹ یعنی پاکستان، امن، سلامتی اطمینان!

اس خیال سے اس کے جسم میں یکدم طاقت آ گئی۔ بچی کو اس نے سینے سے لگا لیا اور لڑکھڑاتی ہوئی لاشوں کو پھلانگتی ہوئی آہستہ آہستہ وہ اندازے سے ریلوے لائن کی طرف بڑھی۔

کتے خون سونگھتے اور اسے چاٹتے تھے۔ کسی لاش کو بھی انہوں نے کھایا نہ تھا۔ ان میں سے موت کی سڑاند بھی اٹھنا شروع نہ ہوئی تھی۔ وہ شبہ میں تھے اور ہلکے ہلکے بھونکتے تھے۔

ریلوے لائن کے قریب ہی سٹیشن پر بتیاں روشن تھیں مگر چونکہ گاڑیوں کی آمدورفت بند تھی اس لیے سٹیشن ماسٹر قلی اور کانٹے والے گھروں میں آرام کر رہے تھے۔ کوئی موقع پر موجود نہ تھا۔

اس نے ایک چھپڑی سے پانی پیا۔ کیچڑ اور کائی کے باوجود پانی اسے بہت میٹھا لگا۔ پھر وہ اپنے بالوں میں خون کے جمے ہوئے لوتھڑے دھونے لگی۔

خوف اس کے دل سے دور ہو چکا تھا۔ اب وہ جلد سے جلد پاکستان پہنچ جانا چاہتی تھی مگر اس کو شمال جنوب کا پتہ نہ تھا۔ کچھ دیر وہیں سوچتے رہنے کے بعد اس نے ادھر کو چلنا شروع کر دیا جدھر پہاڑ نہیں تھے۔

پٹڑی کے دونوں طرف بچھے ہوئے سنگریزوں پر چلنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ اس کی سینڈل کی ایڑی اونچی تھی۔ اس نے اسے اتار کر پھینک دیا مگر اس سے چلا نہ جاتا تھا۔ بچی کے وزن سے اس کے دونوں کندھے شل ہو چکے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے جھٹکا دے کر اسے اپنی ڈھاک پر بٹھایا۔ اس کے بازوؤں میں اسے سنبھال کر رکھنے کی طاقت نہ تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کے پنجے ایک دوسرے میں پھنسا کر ایک قفل بنا لیا۔

**اتنا بھی نہ کر سکے!**

اسی طرح چلتے چلتے وہ سوچنے لگی۔ سکھوں اور ڈوگروں کے خلاف نفرت کا ایک اُبال اس کے دل میں اٹھا۔ وہ کتنے سنگدل تھے۔ اس نے سوچا میرے لیے وہ اتنا بھی نہ کر سکے کہ مجھے مار ہی ڈالتے!

بچی خاموش رہی۔ اس نے ہلنے جلنے کی کوشش نہ کی، شاید وہ مر چکی ہے اور مجھے پتہ بھی نہیں۔ اس نے سوچا پھر وہ پتھر کی طرح وزنی ہے۔ اس پتھر کو اٹھا کر پاکستان پہنچنا ناممکن ہے۔ اگر یہ مری نہیں تو بھی میں پاکستان جا کر اسے کس طرح پالوں گی اور یہ جی کر کیا کرے گی۔ اس کو زندگی اور موت کا پتہ بھی نہیں۔ کیوں نہ میں اسے یہیں چھوڑ دوں۔ اگر یہ مری نہیں تو تھوڑی دیر میں آپ ہی مر جائے گی اور میں پاکستان پہنچ جاؤں گی۔ اس نے تو میرا راستہ روک رکھا ہے۔

اس نے بیزاری سے بچی کی طرف دیکھا۔ زندگی کا کوئی آثار اسے اس میں نظر نہ آیا۔ وہ سانس لیتی تھی مگر اس کو اپنی ماں کی مصیبتوں کا کوئی احساس نہ تھا۔ بعض اوقات اولاد کتنی سنگدل ہو جاتی ہے!

اس نے سوچ لیا کہ بچی میری دشمن ہے، یہ مجھے راستے میں مروا دینے پر تلی ہوئی ہے۔

تھکاوٹ کی وجہ سے اس کے پنجوں کے قفل کھل گئے۔ اس کے ہاتھوں میں طاقت نہ رہی۔ بچی لڑھک کر زمین پر گری تو اس نے اسے لڑھک جانے دیا۔

اس کا بدن یکدم ہلکا ہو گیا۔ وہ بہت آسانی کے ساتھ چلنے لگی۔ سیم کے پانی میں سڑی ہوئی گھاس کی باس اس کے دماغ میں بھری ہوئی خون کی بو کو نہ نکال سکی تھی۔ وہ اس بو سے دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔

ہوا کی خنکی اسے اپنے گالوں پر بڑی اچھی لگی۔ درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ہوا سیٹیاں بجا رہی تھی۔ گیدڑ بول رہے تھے مگر اندھیرے کے باوجود وہ چلتی رہی۔

گیدڑوں سے اسے بہت ڈر لگا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ تیز چلنے کی کوشش میں اس کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ ایک درخت کے پاس وہ بیٹھ گئی تو اس کے لیے اٹھنا ناممکن ہو گیا۔ بیٹھے بیٹھے اس نے ہوا کی سیٹیوں اور گیدڑوں کی چیخوں کو الگ الگ سننے کی کوشش کی۔ اسے لگا کہ ہوا کی سیٹیوں اور گیدڑوں کی چیخوں کے ساتھ ساتھ کہیں سے ایک چھوٹی بچی کے رونے کی آواز بھی آ رہی ہے۔ بچی کے رونے کی آواز پر اس نے کان لگا دیئے۔

اچانک اسے یاد آیا کہ جب میں بس سے اتری تھی تو میری بچی میرے سینے کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے سینے پر ہاتھ مارا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ اس کے لیے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ میں نے اپنی بچی کو جنگل میں پھینک دیا ہے۔

ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ بچی کے رونے کی ایک آواز پھر آئی تو وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کر ادھر کو بھاگی۔

اس کا ہاتھ لگتے ہی بچی نے رونا بند کر دیا۔ اس نے ماں کو پہچان لیا تھا۔ وہ اس کے سینے سے لگتے ہی پُرسکون ہو گئی مگر پاکستان؟ پاکستان تو ابھی بہت دور تھا!

پٹڑی کے روڑوں نے اس کے پیر بری طرح زخمی کر دیئے تھے۔ خون اس کے تلوؤں سے بہہ رہا تھا۔ وہ پٹڑی سے اتر کر کچے میں آ گئی جہاں سیم کی وجہ سے زمین گیلی اور نرم تھی۔

اس نے اپنے ہاتھ پر بندھی گھڑی دیکھنے کی کوشش کی مگر اندھیرے میں اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ یوں پیدل چلنے کا اسے کوئی تجربہ نہ تھا مگر اس کے قدم نہ رکے۔

وہ بہت تھک گئی تھی۔ ستانے کے لیے بیٹھی تو اسے سخت بھوک کا احساس ہوا۔ زیور ماسٹر جی نے اس کی شلوار کے نیفے میں سلوا دیئے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ کوئی اس کے سارے زیور لے کر ایک سوکھی روٹی اور ایک چارپائی دے دے مگر یہ سودا کرنے والا کوئی وہاں موجود نہ تھا۔

وہ پھر اٹھ کر چلنے لگی۔ چلتے چلتے اچانک کسی گاؤں پر اس کی نگاہ پڑ جاتی تو وہ فوراً درختوں کی اوٹ میں ہو جاتی۔ اگرچہ رات کے اس سمے اور اس ویرانے میں اسے دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ کہیں کہیں گھروں میں دیئے ٹمٹماتے تھے۔ کبھی گایوں اور بھینسوں کے ڈکرانے کی ڈراؤنی آوازیں آ جاتی تھیں۔

وہ اپنے دل کی ڈھارس بندھاتی کہ پاکستان اب آیا ہی چاہتا ہے اور وہ پھر چل پڑتی۔

چلتے چلتے اسے خیال کہ میری بچی صبح سے بھوکی ہے اور میری چھاتیوں میں دودھ کا ایک قطرہ بھی نہیں......شاید میں زندہ ہوں مگر میری چھاتیاں یقیناً مر چکی ہیں۔

## مُردہ چھاتیاں

وہ دھان کے ایک کھیت کے قریب رُک گئی۔ اس نے ایک سٹہ توڑا۔ اس میں سے چاول کے کچے دانے نکالے۔ پھر انہیں دونوں ہتھیلیوں کے بیچ رکھ کر ملا تو بھوسی الگ ہو گئی۔ ان کچے دانوں کو اس نے چبایا تو اس کا منہ دودھ سے بھر گیا۔ اس دودھ میں مامتا کا ذائقہ بھی تھا۔ اس میں زندگی کی خوشبو بھی تھی۔ یہ دودھ اس نے بچی کے منہ سے لگا کر قطرہ قطرہ اس کے حلق میں ٹپکا دیا۔

دودھ پی کر بچی نے آنکھیں کھول دیں اور ماں کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔ رات اندھیری تھی اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا مگر نجانے مائیں بچوں کی مسکراہٹیں کیسے دیکھ لیتی ہیں۔

بچی کو مسکراتے دیکھ کر ماں کی سوکھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور دریا بہہ نکلا۔ پھر اس نے گلا پھاڑ پھاڑ کر بین کرنے شروع کر دیئے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے آنسو پونچھ لیے اور دھان کے کچھ سٹے توڑ کر جانوروں کی طرح جگالی کرنے لگی۔ اس نے بچی کو سینے سے لگایا اور پھر چل پڑی۔ اسے پاکستان پہنچ کر ہی دم لینا تھا۔ اس کے پیروں سے خون بہتا تھا مگر اسے درد نہیں ہوتا تھا۔ وہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ کچی زمین پر چلتی رہی۔

جب وہ ریل پر سیالکوٹ سے جموں آتی تھی تو اسے کبھی اندازہ نہ ہوا کہ سیالکوٹ کتنا دور ہے۔ وہ آن کی آن میں جموں پہنچ جاتی تھی۔ اسے راستے کا پتہ بھی نہ چلتا تھا۔ اسے قائداعظم پر بہت غصہ آیا جنہوں نے پاکستان جموں سے اتنی دور جا کر بنا دیا تھا۔

اچانک اسے محسوس ہوا کہ افق پر روشنی ہونے لگی ہے۔ کیا اس ویرانے میں پو پھٹنے والی تھی؟ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی مگر وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔

قریب کے گاؤں سے بھینسوں کے گلوں میں پڑی گھنٹیاں باقاعدہ لے کے ساتھ بجنے لگیں۔ اس نے اندازہ لگایا کہ ان کے آگے صبح کا چارہ ڈال دیا گیا ہے جسے وہ گردنیں ہلا ہلا کر کھا رہی ہیں۔ جموں میں اس کی بھینس چارہ کھاتے ہوئے اسی طرح گردن ہلایا کرتی تھی۔ اسے خیال آیا کہ کاش میری بچی کے لیے گاؤں سے کوئی دو گھونٹ دودھ لا دے!

ایک لمحے کے لیے وہ بھول گئی کہ میں قتلِ عام سے بچ کر نکل آنے والی ایک مسلمان عورت ہوں اور میرا خاوند میری آنکھوں کے سامنے مار دیا گیا ہے۔ وہ یہ بھی بھول گئی کہ میری دو چھوٹی بیٹیاں اور ایک ننھا سا بیٹا اسی قتل گاہ میں میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ کیا وہ اب تک زندہ ہوں گے؟ کیا وہ اپنی ماں کو ڈھونڈتے ہوں گے یا رات بھر میں کتوں کا نوالہ بن گئے ہوں گے۔ اسے اس وقت صرف اپنی بھوکی بچی کا خیال تھا۔ کسی انسان کی تلاش میں اس نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔ انسانیت سے اب بھی اس کا بھروسہ اُٹھا نہ تھا!

دور ریلوے لائن پر پو پھٹنے کے اندھیرے اجالے میں اس نے دو آدمیوں کا ہیولا دیکھا۔ اسے خیال آیا کہ مجھے اپنی بچی کو لے کر کہیں چھپ جانا چاہیے۔ پاس ہی دھان کا ایک چھوٹا سا کھیت تھا۔ اس کے پودے جوان نہیں ہوئے تھے۔ وہ ان میں بیٹھ کر چھپ نہیں سکتی تھی مگر لیٹ جاتی تو کسی کو شک نہ پڑتا۔ چارپایوں کی طرح رینگتی ہوئی وہ اس کھیت کی طرف بڑھی۔

کھیت کو حال ہی میں سینچا گیا تھا۔ ٹھنڈا اور نرم کیچڑ اس کے پھوڑا سے جسم کو بہت اچھا لگا۔ آگے جا کر وہ زمین پر لیٹ گئی۔ بچی کو اس نے سینے پر لٹا لیا اور لمبے لمبے پرسکون سانس لینے لگی۔ اوپر آسمان کس قدر کھلا، کتنا خوبصورت اور کیسا نیلا تھا!

کچے دھان کی باس فرحت بخش تھی۔ دور کہیں کسی جوہڑ پر بیٹھی ہوئی مرغابیاں کڑائیں کڑائیں بولیں تو اسے بہت سکون ملا۔ اس نے سوچا کہ وہ دو آدمی اب اس کے سامنے سے گزر چکے ہوں گے۔ اس نے ان کے قدموں کی چاپ سننے کی کوشش کی مگر اسے کچھ پتہ نہ چلا۔

اسی طرح لیٹے لیٹے اس نے قریب کے پودوں پر لگے ہوئے ہرے ہرے سٹے گننے شروع کر دیئے۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ۔

ہم گھر کے چھ فرد تھے۔ یہ سوچ کر وہ بے اختیار رونے لگی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ میں زور زور سے چیخوں، اونچے اونچے بین کروں اور چھاتی پیٹوں۔

مگر اس کی چھاتی پر اس کی ننھی سی بچی پڑی تھی جسے کل سے دودھ کا ایک قطرہ بھی نہ ملا تھا۔ اس نے دھان کے پودے اکھاڑ کر کیچڑ پر بچھا دیئے اور ان پر بچی کو لٹا دیا۔

آسمان پر چیلیں تیر رہی تھیں۔ زمین پر تیتر بول رہے تھے۔ ہلکی ہلکی دھوپ چمک رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا سے اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے ہوگئے۔ ایسا آرام اسے زندگی میں کبھی نہ ملا تھا۔ اس نے سوچنا بالکل بند کر دیا تھا۔ اس کا کوئی دکھ باقی نہ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اچانک اس کی بچی نے رونا اور تڑپنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ سورج سر پر آ دھمکا تھا۔ گرمی سے اس کا منہ جل رہا تھا۔ سیم کے پانی میں سڑے ہوئے گھاس پھوس کی سڑاند میں سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر بچی پر نگاہ ڈالی جو ہرے ہرے دستوں کی پچکاریاں مار رہی تھی۔ پیٹ کے درد نے اس کا برا حال کر رکھا تھا۔ وہ ڈر گئی، ابھی کوئی اس کی چیخیں سن لے گا تو آ کر دونوں کو مار ڈالے گا۔

بچی کو چپ کرانے پر اس کی ساری زندگی موقوف تھی۔ جلدی سے اس نے اپنی سوکھی چھاتی بچی کے منہ میں ڈال دی۔

بچی چپ ہوگئی مگر اس کی چیخیں قریب کے کھیت میں کام کرتے ایک کسان نے سن لی تھیں۔ آن کی آن میں وہ ماں بیٹی کے سر پر آ دھمکا، ہاتھ میں ننگی کرپان لیے۔

''کون ہو تم؟ کہاں سے آئی ہو؟'' اس نے حیرت اور غصے کے ملے جلے انداز میں پوچھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بچی کو اس نے سینے سے چمٹا کر کہا ''میرے پاس زیور ہیں، وہ لے لو اور ہمیں چھوڑ دو۔''

''مسلمان ہو؟'' سکھ کسان نے پوچھا۔

''ہاں بھائی، میں مسلمان ہوں۔''

''سوچیت گڑھ کے قتلام سے آئی ہو؟''

''انہوں نے میرے تین چھوٹے بچے مار ڈالے۔ میرا میاں بھی قتل کر دیا۔ ہم چھ تھے، اب صرف دو ہیں۔ میری بچی کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہیں۔ تم میرا سارا زیور لے لو بھائی میں کسی سے بات نہیں کروں گی۔''

''کہاں ہے زیور؟''

''یہ رہا میرے نیفے میں۔''

پھر اس نے بچی کو کیچڑ پر لٹایا اور شلوار کے نیفے کو پھاڑنے کی کوشش کرنے لگی۔

ماسٹر صاحب بہت دور اندیش آدمی تھے۔ انہوں نے نیفے پر دوہری سلائیاں کروا رکھی تھیں۔ اس بیچاری کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں انہیں کھولنے کی طاقت نہ تھی۔ کسان نے کہا: ''میں خود نکال لیتا ہوں۔''

پھر اس نے کرپان کی نوک سے نیفہ چیر دیا اور اس میں سے نکلی ہوئی کڑوں کی سلاخیں جو ماسٹر صاحب نے سیدھی کر دی تھیں، کانٹے، گلے کا ہار اور انگوٹھیاں اپنی ڈاب میں رکھ لیں۔

''اور کچھ ہے تیرے پاس؟'' سکھ نے پوچھا۔

''میرے پاس سو سو کے کچھ نوٹ بھی ہیں بھائی صاحب۔'' اور یہ کہہ کر اس نے اپنی بنیان میں دایاں ہاتھ ڈال کر سو سو کے نوٹ بھی نکال کر سکھ کے حوالے کر دیئے۔

تھوڑی دیر دونوں چپ رہے۔

پھر سکھ نے کہا ''سنا ہے ادھر سوچیت گڑھ میں بڑا ظلم ہوا ہے۔ کتنے آدمی مارے گئے ہوں گے؟''

''پتہ نہیں۔'' عورت بولی ''جموں سے کل تین بسیں چلی تھیں اور کچھ لوگ چھتوں پر بھی بیٹھے تھے۔ سارے مارے گئے۔ ایک میں بچی ہوں اور دوسری میری بچی۔ اسے کل سے دودھ نہیں ملا۔ اس کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔''

بچی نے ہرے دست کی ایک اور پچکاری ماری۔

سکھ نے کہا ''یہ تو بہت ماندی ہے۔ شام تک مر جائے گی۔''

''شام تک مر جائے گی میری بچی!'' وہ بولی۔

''ہمارے گاؤں میں ایک حکیم تھا مگر مسلمان تھا، وہ سیالکوٹ چلا گیا۔ اب یہاں کوئی نہیں۔''

''مجھے بھی سیالکوٹ جانا ہے بھائی۔''

''تو جا چلی جا۔ روکتا کون ہے۔ کل چار کوس کا تو فاصلہ ہے۔''

''کوئی مار ڈالے گا ہم ماں بیٹی کو راستے میں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''تمہیں کوئی نہیں مارتا۔ تم تو ابھی جوان ہو، تمہیں کوئی ساتھ ضرور لے جائے گا۔''

## مار ڈالو بھائی

''مجھے تم ہی مار ڈالو بھائی۔ مار ڈالو، خدا تمہارا بھلا کرے۔'' یہ کہہ کر وہ کسان کی ننگی کرپان کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔

سکھ ہنسا اور بولا ''میں عورت جات کو نہیں مارتا۔ یہ کوئی بہادری کی بات نہیں ہے۔''

''مجھ پر رحم کر دو۔ ایک ہاتھ تلوار کا میری گردن پر مار دو۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ میں جی کے کیا کروں گی۔''

وہ اس کے قدموں کی طرف جھک گئی۔

سکھ پیچھے ہٹا اور بولا ''میں تمہیں نہیں مار سکتا کسی صورت۔ میرے گھر میں عورت نہ ہوتی تو میں ہی تم پر چادر ڈال دیتا مگر میرے گھر میں عورت ہے، بال بچے دار۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔''

''اپنے بال بچوں کا صدقہ مجھے مار ڈال بھائی۔'' وہ بولی۔

''بھائی بھائی نہ کر۔'' سکھ نے ڈانٹ کر کہا۔

وہ چپ ہوگئی۔ اس کی ایک ہی آرزو تھی کہ سکھ مجھے مار ڈالے۔

سکھ بے یقینی کے عالم میں تھا۔ اس کو اس دکھیا پر رحم آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا ''تو شام تک یہیں انتظار کر۔ اندھیرا ہو جائے گا تو میں تمہیں سرحد پار کروا دوں گا، سمجھ گئی۔ شام تک چھپی رہ یہیں۔ تجھے اور کسی نے دیکھا نہیں ابھی۔''

پھر سکھ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کھیت سے نکل گیا۔ دکھیاری کیچڑ میں لیٹ کر آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ دستوں کے بعد بچی کے پیٹ میں کچھ سکون ہو گیا تھا۔ کچے دھان اس کا نازک معدہ ہضم نہ کر سکا تھا۔

کیچڑ میں لیٹ کر ماسٹر صاحب کی بیوہ نے پھر سوچنا شروع کر دیا۔ کیا میں شام تک یہیں پڑی رہوں یا کسی اور جگہ چھپنے کی کوشش کروں؟ ہو سکتا ہے کہ شام کو وہی سکھ آ کر مجھے بے آبرو کر دے یا مجھے کسی ایسے آدمی کے حوالے کر دے جس کے گھر میں عورت نہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ واقعی مجھے سرحد پار کرا دے......

چٹے دن کھیت سے نکل کر کسی اور جگہ چھپنے کی کوشش کرنا بھی دشوار تھا۔ اگر کسی اور نے دیکھ لیا تو؟

اسی اُدھیڑ بُن میں وہ شام تک وہیں پڑی رہی۔ وقت گزرنے کا اسے احساس ہی نہ ہوا۔ وہیں پڑے پڑے اس نے بکریوں کی جھانجھروں کی جھنکار سنی تو اسے پتہ لگا کہ سورج ڈوبنے والا ہے۔ کوؤں کی ڈاریں بسیرا کرنے کے لیے جا رہی ہیں۔ آسمان سنولا گیا ہے۔ رات قریب ہے اور اگر سکھ نے دن بھر کسی کو نہیں بتایا تو شاید وہ رات کو مجھے سرحد پار کرا دے۔ وہ اچھا آدمی لگتا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے رات ہوگئی اور جھینگر بولنے لگے۔ خوف نے اسے پھر آن دبوچا۔ اسے اب یہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ ریلوے لائن میرے دائیں طرف ہے یا بائیں طرف۔ اگر میں بھاگنے کی کوشش بھی کروں تو کدھر جاؤں۔ وہیں کیچڑ میں پڑے پڑے اس نے دیکھنے کی کوشش کی کہ جموں کے پہاڑ کس طرف ہیں مگر دھان کے پودوں نے اس کی آنکھوں کے آگے پردہ تان رکھا تھا۔

بہت سا وقت اسی طرح گزر گیا۔ اس نے سوچ لیا کہ سکھ اب نہیں آئے گا۔ میری بیمار بچی ابھی تک تو مری نہیں۔ اسے اٹھا کر مجھے خود ہی رات بھر چلنا ہوگا۔ اس خیال سے اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ اس نے سوچا، ہاں رات تھوڑی اور گزر جائے۔ لوگ گھروں میں سو جائیں۔ پھر......

## مکھن سنگھا مہاں سنگھا

دور سے دو آدمی چلے آ رہے تھے۔ ان کی باتوں کی آواز سن کر اس نے سانس روک لی۔

قدموں کی چاپ کھیت کے پاس آ کر رُک گئی۔

''اسی کھیت میں تھی مکھن سنگھا''...... ایک آواز آئی ''مائی تو یہیں ہے نا؟'' کوئی زور سے بولا۔

آواز بیچاری کے حلق میں رک گئی۔

''مائی او مائی بولتی کیوں نہیں؟'' پھر آہستہ سے آواز آئی ''بیچاری بہت ڈری ہوئی تھی مکھناں!''

پھر کوئی زور سے بولا ''ڈرنے کی کوئی بات نہیں مائی، ہم تجھے سرحد پار کرانے آئے ہیں۔''

اس پر اس کی کچھ ڈھارس بندھی۔ وہ پھٹی ہوئی آواز میں بولی ''میں یہیں ہوں بھائی جی......''

''جا کر اسے نکال لا مہاں سنگھا!''

''کیچڑ بہت ہے۔ اسے کہہ آپ ہی آ جائے باہر۔''

''آ جا مائی۔'' مہاں سنگھ بلند آواز سے بولا۔

''میں خود ہی آ جاتی ہوں بھائی جی۔'' یہ کہہ کر عورت نے بچی کو سینے سے لگایا اور گرتی پڑتی کھیت سے باہر نکل آئی۔

مہاں سنگھ کے ہاتھ میں وہی ننگی کرپان تھی۔ مکھن سنگھ ایک سفید ریش بزرگ تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بلم تھی اور دوسرے میں مٹی کی واہٹری جس سے مسلمان وضو کرتے ہیں۔

مکھن سنگھ بولا ''ہم تیرے لیے دودھ بھی لائے ہیں۔ روٹی تو تو ہمارے ہاتھ کی پکی نہ کھائے گی۔ لوٹا بھی مسجد کے ملاں کا ہے۔''

''مجھے بھوک نہیں بابا جی۔'' اس نے جواب دیا۔

''نخرہ نہ کر۔'' ایک نے کہا ''تو بھوکی تو ہے۔''

دوسرا بولا ''پی لے پی لے۔ دودھ پئے گی تو تیرے شریر میں طاقت آ جائے گی۔ ابھی چار کوس تجھے ریاست میں بھی چلنا ہے اور آگے پاکستانی علاقے میں بھی تیرا باپ گھوڑا لے کر نہیں کھڑا۔ دودھ پی لے۔ ضد نہ کر۔''

''تیری کاکی کا کیا حال ہے؟'' مہاں سنگھ نے پوچھا ''مر گئی کہ نہیں؟''

''اب ٹھیک ہے جی۔''

''اس کو بھی دو گھونٹ پلا دے۔ کل سے بھوکی ہے۔'' مکھن سنگھ نے کہا۔

''کل سے بھوکی ہے بابا جی!'' عورت نے آہ بھر کے جواب دیا۔

''ڈرمت زنانی۔ حوصلہ رکھ۔ آرام سے بیٹھ کر اسے دودھ پلا۔ کسی مائی کے لال کی طاقت نہیں کہ تیری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ مکھن سیاں ہمارا نمبردار ہے۔ پانچ پانچ کوس تک اس کے آگے کوئی بول نہیں سکتا۔''

عورت کی آنکھوں میں ممنونیت کے آنسو اُمڈ آئے۔ بھوک اسے واقعی نہیں تھی مگر وہ نمبردار کے آگے بول نہ سکتی تھی۔ اب اس کے لیے مشکل تھی کہ میں بچی کو مٹی کے لوٹے سے دودھ کیسے پلاؤں۔ اس نے زمین پر بیٹھ کر دودھ کا ایک گھونٹ اپنے منہ میں ڈالا اور قطرہ قطرہ کر کے بچی کے حلق میں ٹپکانے لگی۔ سکھ حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

مکھن سنگھ نے حیران ہو کر کہا۔

''مسلی عورتیں کتنی سیانی ہوتی ہیں مہاں سیاں!''

''بہت سیانی ہوتی ہیں مسلی عورتیں۔ ہمارے گھروں میں تو سورنیاں ہی بندھی ہیں۔ نہ عقل نہ موت۔ آدمی شادی کرے تو کسی مسلی کے ساتھ کرے مکھن سیاں۔''

اس پر دونوں نے قہقہہ لگایا۔ پھر مکھن سیاں بولا ''تو بڑا خبیث ہے مہاں سیاں۔ تیری نیت خراب لگتی ہے۔''

''رب کی سوں، میرا ایسا کوئی خیال نہیں۔'' مکھن سنگھ نے کہا ''میں نے تو اسے مائی کہا ہے۔ مائی کہہ کر تو کوئی ایسی بات سوچ نہیں سکتا۔''

''ارے میں تو مخول کر رہا تھا تیرے ساتھ!''

پھر مہاں سیاں نے کہا ''جلدی نہ کر مائی آرام سے دودھ پلا کا کی کو اور خود بھی پی اور لوٹا خالی کر دے۔ خبردار جو تو نے ایک گھونٹ بھی باقی چھوڑا۔''

عورت نے بڑی مشکل سے دودھ کے کچھ گھونٹ حلق سے اتارے۔ پھر بولی ''اور نہیں پیا جاتا۔''

''تو لوٹا ساتھ لے لے۔ راستے میں پی لینا۔''

پھر چاروں اٹھ کر ریل کی پٹڑی کی طرف چل دیئے۔ آگے آگے دونوں سکھ اور پیچھے پیچھے ماں بیٹی۔

سکھ بہت تیز چلتے تھے مگر وہ بار بار رک کر ماں بیٹی کا انتظار کر لیتے۔ بیچاری کو کچھ پتہ نہ تھا کہ میں کدھر جا رہی ہوں۔ اس کو لگا کہ مجھے عمر بھر اسی طرح چلتے رہنا ہے۔

## رب راکھا مائی

رات پتہ نہیں کتنی نکل چکی تھی۔ اچانک مکھن سیاں نے کہا ''اب تو ذرا دم لے لے مائی۔ تو تھک گئی ہوگی۔ تم مسلی عورتوں کو چلنا بھی نہیں آتا۔ ہماری عورتیں اتنے میں پانچ کوس طے کر لیتی ہیں۔''

''نہیں بابا جی میں تھکی نہیں۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولی۔

''کیوں نخرہ کرتی ہے۔'' مہاں سنگھ بولا ''بیٹھ جا تھوڑی دیر۔''

یہ سن کر وہ مٹی کی بوری کی طرح گر گئی۔ سکھ اس سے دور ہٹ کر لائن پر بیٹھ گئے۔ وہ چاہتی تھی کہ میں جلد سے جلد سرحد پار کر لوں۔ اس نے دل میں فرض کر رکھا تھا کہ ماسٹر صاحب میرے سارے بچے، سارے رشتے دار سرحد پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اسے اپنے پیاروں پر گلہ ہونے لگا جو اتنی دور جا کر بیٹھ رہے تھے۔

مکھن سنگھ نے کہا ''اب چل بھی پڑ!''

پھر وہی اندھیرا۔ وہی ٹھوکریں اور پھر وہی کبھی ختم نہ ہونے والا سفر۔ ایسا تو نہیں کہ کہیں اسی کا نام پاکستان ہو۔ وہ عورت جو اپنے بال بچوں کے ساتھ خوشگوار زندگی گزارتی تھی، وہ تو سیجیت گڑھ میں ماری گئی تھی، پھر میں کون ہوں؟

مکھن سنگھ رک گیا اور بولا ''مائی رب راکھا۔ اب اجازت دے۔ یہاں سے تیرا پاکستان شروع ہوتا ہے۔ وہ جو سامنے گاؤں ہے نا، جس میں چراغ ٹمٹما رہے ہیں وہی سرحد ہے۔ سیدھی چلی جا۔ فاصلہ زیادہ نہیں مگر تو راستے سے ہٹی تو عمر بھر بھٹکتی پھرے گی۔''

مہاں سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر اسے ست سری اکال کے بعد کہا ''مائی چلی جا روشنی کی طرف۔ رات ہم نے تیری سیوا میں گزار دی۔ اب ہمیں جانے دے۔ گھر پہنچ نہ پہنچ، مگر کہا سنا معاف کر دینا۔ تیرے ساتھ ظلم بہت ہوا ہے مگر تیرے بھاگوں میں اس طرح لکھا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ پیچھے مڑ گئے۔

اس نے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں پر نظر جما دی۔ گاؤں کے اوپر قطبی ستارہ چمک رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ مجھے پہلے کیوں نظر نہ آیا۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ مٹی کو اٹھا کر اس نے اپنے گالوں پر ملا۔ اسے زور زور سے سونگھا، پھر اس نے دیکھا کہ سرحد پر میرا اپنا کوئی منتظر نہیں۔ اس نے وہیں بیٹھ کر زور زور سے بین کیے۔

## ختم شریف

کچھ دنوں کے بعد ماسٹر جی کی بیوہ اپنی ننھی سی بچی کو لے کر سیالکوٹ کیمپ سے نور پور پہنچ گئی۔ شہر میں کہرام مچ گیا کیونکہ فسادات میں نور پور کا کوئی مسلمان باشندہ کوئی مرد عورت کسی قسم کے ظلم کا شکار نہ ہوا تھا۔ جو ہوئے وہ ہندو تھے اور وہ جا چکے تھے۔

عورتوں نے چھاتیاں پیٹ لیں اور جموں سے لٹ پٹ کر آئی ہوئی ماسٹر صاحب کی بیوہ اور بچی کو آنکھوں پر بٹھایا۔

پھر شہر کے اشرافوں نے فیصلہ کیا کہ مرحوم ماسٹر صاحب اور ان کے بچوں کے ایصالِ ثواب کے لیے ختم شریف کروایا جائے۔ ماسٹر صاحب کی بیوہ کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر وہ لوگوں کی محبت سے بے بس ہوگئی۔ پھر اللہ کا نام لینے اور مرحومین کو قرآن شریف بخشنے میں برکت ہی برکت تھی۔

ختم شریف کے لیے باہر سے قاری اور یتیم خانے سے بچے منگوائے گئے۔ کسی گھر میں اتنی جگہ نہ تھی کہ اس میں شہر کے سارے لوگ اکٹھے بیٹھ سکیں۔ اس لیے بچوں کے سکول میں ٹینٹ لگوائے گئے۔ جن میں عورتوں کے لیے پردے کا خصوصی انتظام ہوا۔ پلاؤ کی دیگیں چڑھیں، پھلوں کے ٹوکرے آئے۔ ان کے

ساتھ صندل شربت کی بوتلیں۔ ان سب پر ختم شریف پڑھ کر دعا کروائی گئی جس میں شہیدوں کے لیے بلند درجات، پاکستان کے لیے عروج اور عالم اسلام کے اتحاد کی دعائیں مانگی گئیں۔ اس کے بعد کھانا تقسیم ہوا۔ مردوں کے لیے الگ، عورتوں کے لیے الگ۔

"بڑا ظلم ہوا۔" ایک بولی۔

"بے شک۔ ان ظالم ہندوؤں اور سکھوں کو خدا غارت کرے۔"

"خدا جانے اب بیچاری مظلوم کس کے سہارے زندگی بسر کرے گی۔"

"اور ننھی بچی کس طرح پالے گی...... بہن ذرا یہ پلاؤ ادھر بڑھانا۔"

"سالن میں مرچیں بہت ہیں مگر ہے مزیدار۔"

"مگر اس کے پاس کچھ تو ہوگا۔ آخر جموں سے خالی ہاتھ تو نہیں چلی آئی۔"

"ارے کہاں۔ اس کے پاس جو کچھ تھا، وہ سکھوں کو دے آئی۔"

"ہاں سنا ہے سکھوں نے کرپان سے اس کا نیفہ پھاڑ کر سارا سونا نکال لیا تھا۔"

"توبہ توبہ!" کئی عورتیں بیک زبان بولیں۔

پھر ایک نے کہا "مگر ایک بات سوچنے کی ہے۔ سکھوں نے نیفہ پھاڑ کر کیا رانی بی بی کو ویسے ہی چھوڑ دیا ہوگا؟ رات اس نے جنگل میں ان کے ساتھ ہی گزاری!"

"سوچنے کی بات تو ہے مگر بیچاری کیا کرتی؟"

"کنوئیں میں چھلانگ لگا دیتی، ڈوب کر مر جاتی۔ کالا منہ لے کر تو گھر نہ آتی۔"

"چھوڑو اس بات کو۔ مٹی ڈالو......"

"حلوے میں خالص دیسی گھی کیسا مزہ دیتا ہے۔"

## اچھا سٹارٹ

جمال کی مفتی کے ہاں بڑے مزے سے گزر رہی تھی۔ وہ صبح اٹھ کر چائے پیتا، سگریٹ کے مرغولے اڑاتا، الٹی سیدھی باتیں کرتا، اخبار پڑھتا اور دن ڈھلتے ہی مفتی کے ساتھ ایک مکتبے پر چلا جاتا جہاں لاہور کے ادیب اکٹھے ہوتے، کڑک چائے کے جگ پیتے، غزل اور افسانے پر بحث کرتے اور شام ہوتے ہی گھروں کو لوٹ جاتے۔ بے فکری کا یہ موسم جمال بھرپور لذت لے کر گزار رہا تھا۔ اس کو کچھ پتہ نہ تھا کہ مجھے زندگی میں کیا کرنا ہے۔ کچھ کرنا بھی ہے یا نہیں۔ اس کا خیال تھا زندگی اس طرح ہنستے کھیلتے گزر جائے گی۔

مفتی جمال کے بارے میں بہت فکر مند تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جمال کسی کام پر لگ جائے۔ ترقی کرے اور اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکے مگر سوال یہ تھا کہ وہ کیا کرے۔ تجارت کے وہ اہل نہیں تھا کیونکہ روپے پیسے سے اسے نفرت تھی۔ کلرکی کی نوکری اسے مل سکتی تھی مگر کلرکی جمال کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ کوئی ہنر نہ جانتا تھا، جس کے بل پر وہ زندگی میں اچھا سٹارٹ لے سکتا۔ یہ بات مفتی نے کبھی جمال سے کی نہ تھی۔

## چلو صحافی بنو

نجانے کس بات پر اس نے سوچا کہ جمال کو صحافت کے شعبے میں قسمت آزمائی کرنی چاہیے۔ جمال تھوڑا بہت لکھ لیتا تھا مگر وہ ادیب شمار نہ ہوتا تھا۔ رہی صحافت تو اس کے بارے میں اس کا علم صفر کے برابر تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی اخبار کا دفتر دیکھا بھی نہ تھا۔

انہی دنوں "آج کل" کے نام سے ایک نیا اخبار نکلنے والا تھا۔ جس کے مدیر ایک نامی گرامی آدمی تھے۔ ان کے علم اسلوب، تحریر زبان دانی اور طنز و مزاح کی بڑی دھوم تھی۔ جمال نے ان کا نام سنا تھا مگر کبھی دیکھا نہ تھا اور دیکھتا بھی کیسے جب کہ وہ جنگ کے زمانے میں میجر ہو کر فوجی اخبار نکالنے کے لیے ملایا میں تعینات تھے۔

جمال بمبئی کے تجربات کے باوجود لاہور کے نابغوں کے لیے اجنبی تھا۔ نئے ادیب تو اس کو مفتی کے حوالے سے پہچانتے تھے مگر بڑے بزرگ خاص طور پر وہ جو اخبار نویس تھے، جمال کی سرحد ادراک سے باہر تھے۔ مفتی نے جمال کو روزنامہ "آج کل" کے مدیر مولانا چراغ حسن کے پاس ملازمت کے لیے بھیج دیا۔ اخبار نکلنے میں تین دن باقی تھے۔

مولانا ساڑھے چھ فٹ کے لحیم آدمی تھے۔ سر پر گھنگھریالے بال، ماتھا چوڑا، آنکھیں بڑی بڑی مگر کثرتِ مطالعہ سے سرخ، رنگ سانولا، ہاتھ میں سگریٹ، آواز بھاری اور رعب دار، شکل سے معلوم نہیں ہوتا تھا کہ ادب وصحافت سے ان کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ وہ کرسی میں ٹھسے بیٹھے تھے اور اپنے کالم کا پروف پڑھ رہے تھے۔

اگر مولانا کو اکیلے شراب پینے اور گانا سننے کا شوق ہوتا تو وہ جمال کو فوراً ہی کمرے سے نکال دیتے کیونکہ نہ تو اس کا صحافت میں کوئی تجربہ تھا نہ کوئی تحریر اس کے پاس دکھانے کو تھی۔ وہ کسی تعارف کے بغیر ان کے دفتر میں گھس گیا تھا۔ اس نے کبھی ٹیلی پرنٹر بھی نہ دیکھا تھا۔

مولانا چراغ حسن نے سر اٹھا کر کہا "فرمائیے جناب۔"

وہ الفاظ کو کھینچ کھینچ کر بولتے تھے۔ فرمائیے کو انہوں نے "فرما آئیے" کہا تھا۔

جمال نے ایک گنوار کی سی سادگی سے کہا "جناب میں نے سنا ہے کہ آپ کوئی اخبار نکال رہے ہیں۔"

"جی ہاں نکال رہے ہیں۔" انہوں نے جواب دیا۔

"جی میں نوکری کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

"آپ دیر سے آئے۔" مولانا بولے۔

جمال نے کہا "جناب سگریٹ کا گل آپ کی انگلیوں تک پہنچ رہا ہے۔"

مولانا نے گل جھاڑ دیا اور حیرت سے جمال کو تکنے لگے۔ پھر بولے ''کس قسم کی نوکری آپ کریں گے۔ کلرک کی ایک جگہ خالی ہے۔''

''جی نہیں، میں کلرکی کے قابل نہیں۔'' جمال نے کہا۔

''تو آپ کس قابل ہیں؟'' مولانا نے پوچھا۔ ''کبھی کچھ لکھا بھی آپ نے؟''

''جی ہاں۔ مگر اچھا نہیں لکھتا میں۔'' جمال نے جواب دیا۔

''اور پڑھا آپ نے کیا ہے...... یا کچھ بھی نہیں پڑھا؟''

''کچھ نہیں پڑھا جی۔ چھٹی جماعت میں اپنے ابا کی آنکھ بچا کر الہلال کی فائل پڑھا کرتا تھا۔ آٹھویں جماعت میں میں نے کوک شاستر باتصویر پڑھ لی تھی مگر اس کے 84 آسنوں کی ڈرائنگ سے کوئی بات واضح نہ ہوئی۔ دسویں جماعت میں مجھے ہر عورت پدمنی لگتی تھی مگر مجھے کسی کا بدن سونگھنے کا تجربہ نہ ہوا۔ اسی زمانے میں میں نے ترقی پسند ادیبوں کا بیشتر ادب پڑھ لیا تھا۔ کالج میں میں نے زیادہ وقت کرکٹ کھیلی مگر کچھ انگریزی فکشن بھی پڑھا۔ مطلب یہ ہے جناب کہ میں پڑھے لکھے آدمیوں میں گنا نہیں جا سکتا۔ آوارہ گردوں میں البتہ میرا اشمار ہو سکتا ہے۔''

مولانا حیرت سے جمال کی طرف دیکھتے رہے۔ اتنے میں سگریٹ کا گل پھر ان کی انگلیوں کے قریب پہنچ گیا۔ مولانا نے ایک لمبا کش لگایا اور بولے ''آپ اخبار نویس کا کچا مواد تو لگتے ہیں۔ کیا کسی اخبار میں کام کرنے کا تجربہ ہے آپ کو؟''

''جی نہیں۔'' جمال نے جواب دیا۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔ تجربہ کار آدمی کی ہمیں ضرورت نہیں۔''

''پھر کس قسم کے آدمی کی آپ کو ضرورت ہے؟'' جمال نے پوچھا۔

مولانا سوچنے لگے پھر بولے ''ہمیں ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جو روشن طبع ہوں، بامذاق ہوں، آوارہ گرد ہوں، محنت سے جی نہ چراتے ہوں اور انہیں زندگی میں کچھ سیکھنے کا شوق ہو۔ ہمیں ایسے نوجوانوں کی تلاش ہے جو بک نہ سکیں۔ جھک نہ سکیں اور سماجی تبدیلیوں پر یقین رکھتے ہوں۔''

**برگِ آوارہ**

جمال نے کہا ''جی پھر تو آپ کو میری بہت سخت ضرورت ہے۔ میں روشن طبع ہوں۔ راگ داری کا مجھے مذاق ہے۔ آوارہ گردی میں نے قریب قریب پورے ہندوستان میں کی ہے۔ محنت سے میں جی نہیں چراتا۔ کام سیکھنے کا بھی مجھے بہت شوق ہے۔ بک میں نہیں سکتا کیونکہ میرا کوئی خریدار نہ ہوگا۔ جھک بھی نہیں سکتا کیونکہ میری کمر میں لچک ہی نہیں۔ جس بات کو غلط سمجھتا ہوں، اس کو غلط کہنے سے نہیں ڈرتا۔ ہندوستان کے بڑے ادیبوں میں سے اکثر کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ حالانکہ خود میں ان کے قبیلے سے نہیں...... اور صحبت اچھی ہو تو شراب بھی پی لیتا ہوں۔ آپ کو اور کیا چاہیے مولانا؟''

مولانا چراغ حسن' جمال کی بات بڑی توجہ سے سنتے رہے۔ جس اعتماد کے ساتھ وہ بولا تھا، اس سے وہ متاثر تھے۔

''کیا آپ کو سیاست سے دلچسپی ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی نہیں۔ میں لیڈروں کے پیچھے نہیں پھر سکتا۔''

''میں نے سیاست کی بابت پوچھا تھا مولوی صاحب، لیڈروں کے بارے میں نہیں۔''

''جی ہاں، مجھے دلچسپی ہے کہ یہ لوگ کیا کرتے ہیں...... ابھی تک تو انہوں نے کچھ نہیں کیا۔''

''سیاست تو ان کی آپ کو سمجھنی پڑے گی مولانا...... اگر ہم نے آپ کو ملازم رکھ لیا تو...... تعلیم آپ نے کہاں پائی؟''

''جی ابتدائی تعلیم اپنے قصبے میں، بی اے سرینگر سے پاس کیا۔ ہمارا کالج تھرڈ کلاس تھا اس لیے میں فرسٹ آ گیا۔''

سرینگر کے ذکر سے مولانا کو کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ''کتنا عرصہ وہاں رہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''پانچ سال۔ جی۔''

''کیا کرتے تھے وہاں؟''

''جی وادیوں میں گھومتا تھا۔ ریچھوں سے لڑتا تھا...... لڑا نہیں جی۔ کوئی ریچھ جنگل میں ملا ہی نہیں۔ جب ہم ان کی تلاش میں گئے...... ناشپاتیاں کھاتا تھا۔ کبھی کبھی پڑھتا بھی تھا جب بے موسمی سے بور ہو جاتا تھا۔''

''مزاح نویسی میں آپ کو کون پسند ہے؟''

''پطرس بہت پسند تھا مگر بعد میں جب میں نے جیروم کے جیروم کو پڑھا تو پتہ چلا کہ حضرت اسی کے خوشہ چین ہیں۔ مزاح میں' میں نے آپ کی شہرت بھی بہت سنی مگر میں نے آپ کو پڑھا نہیں ابھی تک......''

''عجیب و غریب آدمی ہیں آپ......'' مولانا بے اختیار ہو کر بولے ''آپ اپنی تعلیم کو معمولی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ آپ نے ہندوستان میں آوارہ گردی کی ہے۔ ترقی پسند ادیبوں کو پڑھا ہے۔ قدیم جنسی علوم سے آپ آشنا ہیں۔ جدید فکشن پر بھی آپ نے نظر ڈالی ہے۔ راگ داری کا مذاق بھی آپ رکھتے ہیں اور شراب بھی پی لیتے ہیں...... اگر صحبت اچھی ہو تو...... کرکٹ آپ نے کس کس کے ساتھ کھیلی؟''

''جی نواب پٹودی کے ساتھ، مہاراجہ بھوپندر سنگھ کے ساتھ، لالہ امرناتھ، نذر محمد گلو اور جتنے بھی سٹارز گرمیوں میں کشمیر آتے تھے سب کے ساتھ۔ اب آدمی کس کس کا نام لے۔''

مولانا کچھ دیر چپ رہے، پھر تاسف سے بولے ''مگر ہمارے ہاں جگہیں پُر ہو چکی ہیں۔ اگر آپ پہلے آگئے ہوتے تو کچھ ہو سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ آپ اخبار نویس بن سکتے ہیں۔''

جمال نے لاپرواہی سے جواب دیا ''جی جانے دیجیے پھر۔ نہ سہی۔ تو پھر اجازت دیجیے۔''

یہ کہہ کر جمال کرسی سے اٹھا۔

مولانا نے پوچھا ''اب کہاں جائیں گے آپ؟''

''جی گھر جاؤں گا مولانا۔''

## گھر سے نکلنے کا وقت

''شام ہو رہی ہے اور یہ وقت گھر جانے کا نہیں مولانا۔ گھر سے نکلنے کا ہے۔ گھنٹہ بھر ہمارے ساتھ اور رہیے والگا ہوٹل میں...... اور اگر آپ کو ہماری صحبت اچھی لگے تو ایک دو پیگ پی لیجیے ہمارے ساتھ۔ آپ دلچسپ آدمی ہیں۔''

والگا میں مولانا اور جمال نے جی بھر کر شراب پی۔ حجاب جاتے رہے مگر مولانا نے وضعداری نہیں چھوڑی۔ دس بج گئے تو بولے ''اب ذرا اِدھر کی بھی خبر لی جائے۔ مالکونس کیا آپ کو پسند ہے؟ مجھے تو بہت پسند ہے۔''

## بلو بائی کا چوبارہ

مولانا بلو بائی کے چوبارے پر بے کھٹکے چڑھ گئے۔ پیچھے پیچھے موتیے کے ہار بیچنے والے اور بھکاری بچے۔

بائی جی ادب سے کھڑی ہو گئیں۔ استاد جی، طبلے والے اور خادم سب مولانا کو پہچانتے تھے اور ان کا ازحد احترام کرتے تھے۔

گاؤ تکیے پر بیٹھتے ہی مولانا کے منہ میں گلوری ڈالی گئی۔ حالانکہ مولانا کے دانت گواہی دیتے تھے کہ وہ صرف سگریٹ پیتے ہیں۔ پان انہوں نے بائی جی کی دلجوئی اور کوٹھے کے کلچر کو ملحوظ خاطر رکھ کر کھا لیا تھا۔ جمال نے پان کھانے کے بعد دو سگریٹ سلگائے اور ایک مولانا کی طرف بڑھا دیا۔

''تو مالکونس چھیڑو ذرا......'' مولانا نے کہا۔

سارنگی روں روں کرنے لگی۔ بائی جی نے بول اٹھایا۔ مکھ موڑ موڑ مسکات جات......!

کچھ دیر مولانا سنجیدگی کے ساتھ سنتے رہے۔ پھر مونچھوں میں مسکرانے لگے۔ آہستہ سے بولے ''مکھ موڑ موڑ مسکات جات! کمبخت نے کیا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ ہمارے ہاں صرف میر کے ہاں ایسی تصاویر ملتی ہیں......''

''...... انیس میں بھی۔'' جمال نے گرہ لگائی۔

''مولوی صاحب۔ آپ نے انیس کو پڑھا ہے؟'' جمال سے انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کیا آپ شیعہ ہیں؟''

''جی نہ تو میں نے انیس کو پڑھا ہے نہ میں شیعہ ہوں نہ سنی...... کچھ بھی نہیں ہوں۔''

''کچھ کچھ تو آپ ہیں۔ کون ہیں آپ؟'' مولانا نے انتہائی توجہ سے کہا۔

''جی میں کوئی نہیں۔ نوشت و خواند سے زیادہ کچھ جانتا نہیں اور آج ایک بڑے آدمی کی مہربانی سے راگ مالکونس سننے آیا ہوں۔ آپ کا کیا لیتا ہوں جناب؟''

مولانا ہنس کر خاموش ہو گئے۔ بائی جی نے تان اٹھائی ''اک چھبیلی نار کرت سولہ سنگار......''

مولانا نے جمال سے پوچھا ''مولوی تو بتا یہ سولہ سنگار کیا ہوتے ہیں؟''

جمال نے کہا ''جناب کوک شاستر میں عورت کے سولہ مقاماتِ حسن کا ذکر ہے۔ مثلاً آنکھیں، ماتھا، رخسار، ہونٹ، گردن، ناف...... آگے کچھ یاد نہیں۔ اصل میں ناف کے بعد آدمی کچھ دیکھ بھی نہیں سکتا......''

اس پر مولانا خوب ہنسے۔

''تو آپ کو ان باتوں کا تجربہ بھی ہے۔''

''تجربہ تو مجھے کسی بات کا بھی نہیں۔ یہ سب تو سنی سنائی باتیں ہیں۔ میں خود تو بڑا معصوم آدمی ہوں۔''

''کوک شاستر تو مولوی تو نے چھوٹی عمر میں پڑھ لیا تھا۔''

''جی ہاں اور کچھ لٹریچر میں نے انگریزی کا بھی دیکھا ہے مگر گارڈن آف ایول اور کام سوترا والی بات کہاں۔''

''یہ کتابیں آپ کو کہاں سے مل گئیں؟'' مولانا نے متعجب ہو کر پوچھا۔

## کوک شاستر کام سوترا

''جی کوک شاستر تو میں نے اپنے گاؤں میں ہی پڑھ لی تھی۔ کام سوترا سرینگر میں مل گئی تھی اور گارڈن آف ایول لاہور میں پڑھی تھی۔ یہ غالباً مراکو کے وزیر کی ذاتی ریسرچ ہے۔ جس کے لیے اس نے وزارتِ عظمیٰ چھوڑ دی تھی تاکہ جنسی مطالعات کے لیے اسے کافی وقت مل سکے مگر وہ کمبخت بھی بار بار کام سوترا کے حوالے دیتا ہے۔ ٹھیک سے یاد نہیں رہا کہ وہ وزیرِاعظم مراکو کا تھا یا کسی اور عرب ملک کا مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ کتاب عربوں کی جنسی ترجیحات پر کچھ روشنی ڈالتی ہے۔ اس لحاظ سے پڑھی جا سکتی ہے۔ اس مضمون میں مولانا آپ نے تو بہت کچھ پڑھا ہوگا۔''

''بہت کچھ تو نہیں پڑھا یار' مولوی تم لوگ خوش بخت ہو کہ تم پر سوسائٹی کی طرف سے کوئی دباؤ نہیں۔ کتابوں کی بھی بہتات ہے۔ ہم پر دباؤ بہت تھے۔ گھر والوں کے، رشتہ داروں کے اور اخلاقی معیاروں کے۔

ہماری نسل کو روایت کی تنگنائے میں رہنا پڑتا تھا۔"

"مگر مولانا راگ داری کا تو آپ کو بھی شوق ہے اور کتھک اور مجرے بھی آپ لوگ بڑی آزادی سے دیکھتے تھے، شرماتے بالکل نہیں تھے۔"

"وہ ایک طبقے کی بات تھی مولوی۔ عام لوگوں کو آزاد زندگی گزارنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ جاگیردار تھے جو حرام کی کمائی پر عیش کرتے تھے۔ اب دیکھیے آپ لوگ کدھر کو جاتے ہیں۔ خالی روایت تک رہنا تو مُردہ دلی کی بات ہے مگر روایت کو یکسر چھوڑ دینا بھی بدن کو روح سے خالی کر دینا ہے۔"

"پھر کیا کیا جائے مولانا؟" جمال نے پوچھا۔

"اس کا فیصلہ تو آپ کو خود کرنا ہے۔ اگر آپ آگے نہیں گئے تو وہیں کھڑے نہیں رہیں گے بلکہ پیچھے جائیں گے۔ اس صورت میں پاکستان بے معنی ہو جائے گا۔ جو روایات مفید اور اچھی ہیں، ان کو ساتھ لے کر آگے چلیے۔ ہمارے اخبار کی پالیسی یہی ہوگی...... مگر مولوی صاحب میں نے ابھی تک فیصلہ نہیں کیا کہ آپ ہمارے ساتھ ہوں گے یا نہیں۔"

"جی کوئی بات نہیں مولانا۔ میں ناکامیوں سے ڈرتا نہیں۔ آپ سے نیاز مندی ہوگئی یہی بہت ہے۔" جمال نے سنجیدگی سے کہا۔

اس کے بعد چوبارے پر بلو بائی نے تلی ہوئی مچھلی اور نان منگوا لیے۔ گانا بند ہو گیا اور بائی جی مولانا سے باتیں کرنے لگیں مگر نہایت احترام کے ساتھ۔ آخر میں انہوں نے کہا "یہ آپ کے ساتھ جو لڑکا آیا ہے، پہلے نہیں دیکھا۔"

"لڑکا نہیں بلو بائی۔ بہت ذہین شخص ہے۔ جہاندیدہ ہے، باخبر ہے۔ اسے لڑکا نہ سمجھو۔ میں اسے ساتھی سمجھ کر ساتھ لایا، تمہیں کیسا لگا۔"

بلو بائی نے شرما کر کہا "جی خوبصورت نوجوان ہے۔"

"اوہو بلو بائی تم بات کو نہ سمجھیں۔ خوبصورت ہے تو کیا میں اندھا ہوں۔ دیکھ نہیں سکتا؟ میں پوچھتا ہوں یہ تمہیں گہرا لگتا ہے یا نہیں۔ کہتے ہیں خاندانی طوائفیں بڑی مردم شناس ہوتی ہیں۔ آدمی کو ایک نظر میں بھانپ جاتی ہیں......"

"جی مولانا میں نے بھی ایک نظر میں بھانپ لیا تھا کہ اس نوجوان کے پلے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ ماں باپ نے اسے گھر سے نکالا ہوا ہے اور یہ ان دنوں نوکری کی تلاش میں ہے، چونکہ اس کے پاس ان دنوں فقط چہرہ ہی چہرہ ہے، اس لیے میں نے اسے خوبصورت کہہ دیا تو کیا غلطی کی؟"

مولانا لاجواب ہو گئے مگر منہ سے کچھ نہ بولے۔ جمال بھی شرمسار ہوا۔ بات سُنی اَن سُنی کر کے وہ دانتوں میں سے مچھلی کا کانٹا نکالنے لگا۔

اب تقریباً بارہ بج رہے تھے اور یہی وقت ہیرامنڈی سے رخصت کا ہوتا ہے۔ مولانا بہت کم خوراک تھے۔ ایک آدھ لقمے کے بعد انہوں نے کھانا چھوڑ دیا۔ سفر دالوگ دسترخوان پر جھپٹ پڑے تو مولانا نے کہا "یار مولوی اٹھو اب چلیں۔ دفتر دس بجے لگ جاتا ہے۔ تنخواہ تیری دو سو دس روپے ماہوار ہوگی۔ میں لیٹ آنے والوں کو برداشت نہیں کرتا۔"

## باب 17

صبح سویرے ہی جمال کی آنکھ کھل گئی۔ اسے بڑے زور کی پیاس لگی ہوئی تھی۔ بدن کسلمند اور ٹوٹا ہوا تھا۔ رات اس نے مولانا کے ساتھ بہت پی لی تھی۔ کوٹھے پر کھائی ہوئی مچھلی اور پان کے ریزوں سے اس کا منہ بدمزہ ہو رہا تھا مگر وہ کچھ تیز باتیں کرنے اور راگ کے کومل تیور سُروں کے راز بتا کر مولانا کے اخبار میں دو سو دس روپے ماہوار پر سب ایڈیٹر ہو چکا تھا اور اسباب کے ڈھنگ نرالے ہوتے ہیں۔

دفتر پہنچ کر اسے کسی قدر حیرت ہوئی۔ ایڈیٹر صاحب رات کے بے فکر، خوش طبع مولانا نہ تھے بلکہ ایک نہایت سنجیدہ اور وضعدار بزرگ تھے۔ انہوں نے جمال کے ساتھ انتہائی رکھ رکھاؤ اور تکلف سے بات کی۔ رات کے واقعات کی طرف کوئی اشارہ نہ کیا اور اسے خبروں کی میز پر بھیج دیا۔

### اخبار کا مندر

خبروں کی میز پر صدیقی صاحب حکمران تھے۔ انہیں اخبار نویسی کی کچھ شُد بُد تھی مگر ان کے چہرے پر بھی سہم تھا۔ باقی کوئی بھی لکھنے والا نہ تھا۔ عرفان صاحب ایم اے کی تیاری کر رہے تھے۔ شاکر دہلی میں فارسی پڑھایا کرتے تھے۔ کاظمی صاحب دہلی کے ایک سیاسی اور مذہبی خاندان کے چشم و چراغ تھے جن کے بڑے بھائی کمیونسٹ شمار ہوتے تھے اور اخبار کی انتظامیہ سے تعلق رکھتے تھے۔

یہاں جمال کے سوا سب سفارشی تھے مگر یہ مولانا کا کمال تھا کہ ان کے شاگردوں میں سے خالی کوئی بھی نہ نکلا۔

اخبار ابھی نکلا نہ تھا مولانا سخت کھچاؤ کی حالت میں تھے۔ وہ کالموں کی نشست' لکھائی چھپائی' اخبار کی ترتیب، اس کی پالیسی اور اس کی فروخت کے بارے میں پریشان رہتے تھے۔ حاجی بقل بطورا نے کہا ''مولانا کم سے کم لڑکوں کو تو میں سنبھال لوں گا۔ باقی امور پر آپ توجہ دے لیں۔''

حاجی بقل بطورا پرانے اخبار نویس تھے۔ کسی زمانے میں وہ مولانا کے ساتھ کام کر چکے تھے اور اب اس تعلق کی بنا پر مولانا کے پاس نوکری کے لیے آئے تھے۔

مولانا نے انہیں ٹالنے کی کوشش مگر وہ سخن شناس نہیں تھے۔ اصرار کرنے لگے تو مولانا اکھڑ گئے اور بولے ''حاجی صاحب لڑکوں کو تو میں کسی نہ کسی طرح کام سکھا لوں گا' مگر میرے پاس اتنا وقت کہاں کہ اب تک آپ نے جو کچھ سیکھا ہے، اسے آپ کے ذہن سے نکالوں اور پھر آگے چلاؤں۔ آپ کی تختی صاف ہوتے ہوتے اخبار بند ہو جائے گا۔ حاجی صاحب میں جس قسم کا اخبار نکالنا چاہتا ہوں' اس کے راستے میں آپ کا تجربہ رکاوٹ ہے۔ یہ لڑکے جو میں نے لیے ہیں، ان کے دودھ کے دانت ٹوٹیں گے تو ان کے منہ میں تیر اُگیں گے، مگر یہاں سے نکل کر انہیں کہیں کام نہ ملے گا۔ کوئی حکومت ان کا وجود برداشت نہ کر سکے گی۔ خدا نے چاہا تو میں ان کا مستقبل تباہ کر ڈالوں گا۔ آپ کا دبستانِ فکر تو آپ کو کہیں بھی کام کر لینے سے نہیں روکتا۔ اس کچے لوہے کو جب میں نے بھٹی میں گلایا تو پھر اس کی کاٹ دیکھیے گا' مگر آپ کا زنگ کون کھرچے گا۔ کیا میں کسی اور اخبار میں آپ کی سفارش کر دوں؟''

### میاں غنچہ

جمال کو صدیقی صاحب نے خبروں کے ترجمے پر لگا دیا۔ سرخیاں لگانے کے اصول بتائے اور سگریٹ پینا سکھایا۔ دفتر کا ماحول انتہائی برادرانہ تھا۔ اس بات کا کوئی سوال نہ تھا کہ کون مقامی ہے اور کون مہاجر۔ مولانا البتہ اہلِ زبان شاگردوں کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اگرچہ غلطیاں ان کی بھی انہیں درست کرنی پڑتیں۔ کام نہایت دلچسپ تھا اور سبھی شوق سے کام سیکھتے اور کرتے تھے۔ اگر کسی کو بیماری کی وجہ سے یا سینما جانے کے لیے دفتر سے چھٹی لینی پڑ جاتی تو کوئی دوسرا ساتھی کہے بغیر اپنی ڈیوٹی کے علاوہ اس کی شفٹ بھی کر دیتا۔ جمال نے سامنے کے ہوٹل میں حساب کھول رکھا تھا۔ سبھی غیر شادی تھے اور سبھی کو اجازت تھی کہ وہ کھانا کھا کر جمال کے حساب میں بل لکھوا دیں۔

جمال زبان کے بارے میں تو کودن تھا مگر اس میں بعض اور خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے وہ مولانا کا شاگرد خاص سمجھا جانے لگا۔ وہ محنتی تھا، منچلا بھی تھا اور وفادار بھی۔ اس لیے مولانا کی شام کی آوارگی کا ساتھی بن گیا۔

اس آوارگی کے ساتھی کو مولانا نے ہر طرح آزمایا۔ اسے رپورٹنگ کے لیے مشکل مہمات پر بھیجا۔ کام کے سلسلے میں ہمیشہ سخت ڈانٹ پھٹکار کی' مگر ادھر دن ڈھلتا ادھر مولانا کی نظریں میٹھی ہو جاتیں۔

اس سے پہلے اخبارات میں فیچر لکھنے کی کوئی روایت نہ تھی اور چونکہ کسی کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا، اس لیے اس کی ذمہ داری جمال کو سونپی گئی۔ کسی نے اس کی راہنمائی نہ کی تھی۔ اس لیے اس نے جو کچھ اس کے جی میں آیا لکھ دیا۔ مضمون میں تصویریں لگیں تو صفحہ سج گیا اور اخبارات میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ حالانکہ مولانا نے فیچر پر جمال کا نام تک نہ چھاپا تھا۔ مولانا اخبار کی حد تک جاگیردار تھے اور مزارعہ کے وجود کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ وہ ہر ایک بات کا کریڈٹ خود لینا چاہتے تھے۔ اس لیے جب اخبار کے مالک نے ان سے آ کر پوچھا کہ یہ کس نے لکھا ہے تو مولانا نے جمال کی موجودگی میں کہا ''میاں صاحب! یہ ہم نے لکھا ہے'

یعنی ادارے نے لکھا ہے اور ابھی ہم بہت کچھ کریں گے۔''

فیچر لکھنا جمال کے فرائض میں شامل ہوگیا۔ ایک دن اس نے مولانا سے کہا، جناب میرا نام بھی چھپنا چاہیے تو مولانا بولے ''اخبار ایک واحدہ ہوتا ہے۔ اس کے کارکنوں کے نام نہیں ہوتے اور جن کو نام کی خواہش ہوتی ہے، وہ کبھی بڑے اخبار نویس نہیں بن سکتے۔ پھر میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ کا دماغ ابھی سے خراب ہوجائے۔''

## جوابی حملہ

جمال اس زمانے میں اخبار کی کاپی بھی جوڑتا تھا۔ اس روز اس نے مولانا کے مشہور کالم سے ان کا نام اڑا دیا۔

اگلی صبح اخبار دیکھ کر مولانا آگ بگولہ ہوگئے۔ سب کی طلبی ہوگئی۔ جمال نے مسمسی صورت بنالی۔

''کاپی دھیان سے نہیں جوڑتے مولوی تم؟''

''جی دھیان ہی سے جوڑتا ہوں اُسی لیے میں نے آپ کا نام کاٹ دیا۔'' جمال نے ادب سے کہا۔

''آپ کی یہ جرأت؟''

''آپ ہی نے تو کہا تھا مولانا کہ اخبار ایک واحدہ ہوتا ہے۔ اس میں نام نہیں ہوتے۔''

''مگر اس نام کی تو کوئی اہمیت ہے...... اس کے کچھ معنی ہیں۔''

جمال بولا ''جب یہ نام اول اول چھپا تھا تو اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ مولانا چھپتے چھپتے اس کی اہمیت ہوگئی اور اب بہت سے لوگ صرف آپ کے کالم کی خاطر اخبار خریدتے ہیں......''

مولانا نے تھوک نگلا اور کہا ''تو آپ اپنے آپ کو تیس برس پہلے کا چراغ حسن سمجھ رہے ہیں جبکہ آپ کو ابھی تک املا لکھنی بھی نہیں آتی۔''

''میری کیا مجال مولانا۔ میں تو اپنے آپ کو آج سے تیس برس پہلے کے چراغ حسن کا ادنیٰ شاگرد سمجھتا ہوں مگر املا مشکل کام ہے مولانا۔ آپ کے علاوہ اور کس کو اس پر عبور ہے؟''

''مجھ کو ابھی عبور کہاں۔ آپ ہی مجھے سکھا دیا کریں کچھ۔'' مولانا نے جل کر کہا۔

مگر مولانا اس بات پر خوش ہوگئے تھے کہ جمال اپنے آپ کو آج سے تیس برس پہلے کے چراغ حسن کا شاگرد سمجھتا ہے۔

پھر جمال کا نام چھپنے لگا مگر مولانا یہ بھی سمجھتے تھے کہ کچی اور فوری شہرت نوجوانوں میں محنت کی لگن کے لیے سم قاتل ہے۔

## دفتر میں آگ

اخبار کا دفتر کوپر روڈ پر ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے ایک پرنٹنگ پریس کے برآمدے میں قائم تھا جس پر ٹین کی چھت تھی۔ پریس دو مسلم لیگی رپورٹروں کو الاٹ ہوچکا تھا مگر ابھی مشینوں، کاغذ کی ریلوں، سکے کے سٹوروں، سیاہیوں اور پرنٹنگ کے دیگر سامان کی جو پریس میں پڑا تھا، فہرست نہ بنی تھی۔

صبح جب جمال دفتر آیا تو سارے پریس میں کیچڑ ہورہا تھا۔ چھپی ہوئی ہزاروں کتابیں جن کی ابھی سلائی نہ ہوئی تھی گلے ہوئے سکے کے ڈھیر، سیاہیوں کے ڈبے اور کاغذ کے بنڈل اس کیچڑ میں گڈمڈ تھے اور پولیس کھڑی تھی۔

جمال بڑی مشکل سے اندر گیا تو اسے پتہ چلا کہ رات کو پریس میں آگ بھڑک اٹھی اور سب کچھ جل کر راکھ ہوگیا ہے۔ آنکھ بچا کر جمال پرنٹنگ شاپ میں گھس گیا۔ تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ مشینوں کے گرد پرانے زمانے کی نائٹریٹ فلم جو فوراً آگ پکڑ لیتی ہے، ڈوری کی طرح لپٹی ہوئی ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ آگ سامان کی فہرست بننے سے بچنے کے لیے لگائی گئی ہے۔

بعد میں پتہ چلا کہ ان مسلم لیگی رپورٹروں نے جو تقسیم سے پہلے بے ننگ و نام مسلم لیگی لیڈروں کے بیانات چھاپتے تھے، پاکستان بننے کے بعد جب وہ حکمران بن گئے۔ پرانے تعلقات کی بنا پر مشرقی پنجاب میں چھوڑے ہوئے اپنے زرعی یونٹ جو مرلوں اور کنالوں میں تھے، شہری یونٹوں میں تبدیل کرا لیے اور بڑی بڑی شہری جائیدادیں اپنے نام لگوالیں۔ پرنٹنگ پریس شہر کی سب سے قیمتی زمین پر واقع تھا، اسے انہوں نے کھنڈر ثابت کردیا۔ حالانکہ تمام کی تمام مشینیں صحیح وسالم حالت میں موجود تھیں کیونکہ نائٹریٹ فلم کی آگ لوہے کو پگھلا نہ سکی تھی۔ بعض جگہ تو اس نے آگ پکڑی ہی نہ تھی۔

یہ دونوں مسلم لیگی رپورٹر بڑے جی دار تھے۔ ان میں سے ایک نے تو پانچ دس برس تک کام کیا اور کوٹھی پر کوٹھی الاٹ کروائی مگر جب متروکہ املاک ختم ہوگئی تو اس نے صحافت چھوڑ دی۔ داڑھی بڑھالی، حج کیا اور اللہ اللہ کرنے لگا۔ دوسرے نے کوئی کام نہ کیا۔ فقط جائیدادیں الاٹ کروائیں۔ علامہ اقبال کا کلام ازبر کیا اور جلسوں میں تقریریں کیں۔ کوئی پچاس برس کام دھندے کے بغیر وہ بیکار مگر خوشحال زندگی گزار کر مرگیا۔ پرنٹنگ پریس کی قیمتی زمین اور مشینیں دونوں دوست بیچ کر پہلے ہی کھا چکے تھے۔

## بیس تیس کا ٹائر

مولانا کا چپڑاسی گھبرایا ہوا نیوز روم میں آیا اور جمال سے کہنے لگا ''میاں صاحب بہت پریشان ہیں، شاید دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ چلیے اندر چلیے۔''

مولانا کرسی پر ڈھیر تھے۔ سگریٹ کا گل ان کی انگلی تک پہنچ رہا تھا مگر انہوں نے جھاڑا نہ تھا۔

ان کے سامنے ایک میلی دھوتی والا مزدور ڈرا ہوا کھڑا تھا۔ مولانا جمال کو دیکھ کر بے بسی سے بولے

''ذرا اُن سے بات کیجیے مولوی صاحب......''

مزدور کا رنگ زرد تھا۔ اس نے کہا ''زناب آلی استاد نے کہا ہے اندر سے بیس تیس کا ایک ٹائر لے

آدَ۔ میں نے ٹائر مانگا تو میاں صاحب چپ ہو گئے۔ بات بھی نہیں کرتے۔ ٹائر بھی نہیں دیتے۔''

مولانا بولے ''ان سے کہیے کہ یہاں بیس تیس کا کاغذ ہوتا ہے، ٹائر نہیں ہوتا۔''

''کاغذ نہیں چاہیے جی، ٹائر چاہیے۔'' وہ بولا۔

''اب آپ ہی انصاف کریں مولوی جمال صاحب' میں بیس تیس کا ٹائر کہاں سے لاؤں۔ ذرا میاں صاحب سے فون ملایئے۔ مالک شاید کوئی راستہ نکال لے۔''

اخبار کے دروازے کے ساتھ ایک کوٹھڑی جالندھر کے مسلم لیگی الائی نے جالندھر کے ایک مہاجر دکاندار کو کرائے پر دے رکھی تھی جس میں وہ پرانے ٹائر بیچا کرتا تھا۔ جالندھر کا مسلم لیگی مہاجروں کی آبادکاری کو بہت عزیز رکھتا تھا۔

مولانا نے کہا ''آئندہ اخبار بیس تیس کے کاغذوں پر نہیں بیس تیس کے ٹائروں پر چھپے گا۔ کاتبوں کے قلم ذرا جلی کروا دیجیے مولوی صاحب!''

## مولانا کا طریق کار

مولانا اپنے کالم سے فارغ ہو کر نیوز روم میں آ بیٹھے اور شاگردوں کے ساتھ خبریں بنانے لگے۔ کام ختم کرنے کے بعد بھی گھر جانے کو ان کا جی نہ چاہتا۔ وہ بار بار چائے پیتے، سگریٹ سلگاتے اور ادب و شعر پر گفتگو کرتے۔ اسی طرح باتوں ہی باتوں میں وہ اپنے شاگردوں کو معلومات سے بھر دیتے اور ان میں کلچر کا شعور بیدار کراتے۔ جمال ان کی باتیں بڑی توجہ سے سنتا مگر انہیں کبھی یقین نہ آیا کہ جمال میں کچھ سیکھ لینے کی صلاحیت ہے اور ان کی مایوسی کی بڑی وجہ اس کا پنجابی نژاد ہونا تھی۔

یہ اور بات ہے کہ جمال نے جو کچھ مولانا سے سیکھ لیا وہ اور کسی کو نصیب نہ ہوا۔

بالآخر مولانا کو دفتر سے اٹھنا پڑتا۔ شفٹ ختم ہو چکی ہوتی مگر جمال ان کے ساتھ ساتھ رہتا۔ مولانا آہستہ آہستہ چلتے اور اس بات پر خوش ہوتے کہ میرے شاگرد میرے ساتھ ہیں۔ دفتر سے نکل کر وہ کافی ہاؤس جاتے اور ادیبوں اور شاعروں سے گپ شپ کرتے۔ واپسی پر وہ ایک چکر دفتر کا اور لگاتے۔ کام کی رفتار دیکھتے اور کہیں آدھی رات کو گھر جاتے۔ جب سڑکیں سو چکی ہوتیں۔ آٹھ بجے وہ پھر دفتر پہنچ جاتے۔ لگتا تھا ان کو گھر سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔

ایک دن جمال نے ان سے پوچھا ''مولانا آپ شام کو گھر کیوں نہیں جاتے؟'' تو وہ بولے ''اب تو وہ بھی تقاضا نہیں کرتیں۔''

''مگر شروع شروع میں تو کرتی ہوں گی۔'' جمال نے کہا۔

''نہیں صاحب۔'' مولانا بولے ''جس روز ہماری شادی ہوئی ہم بھول گئے کہ وہ ہماری منتظر ہوں گی۔ آدھی رات کو حسبِ عادت گھر پہنچے تو بڑی ندامت ہوئی اور ہم نے ان سے عرض کیا کہ آئندہ ہم سے کوتاہی نہ ہوگی مگر اگلی رات ہمیں پھر دیر ہو گئی۔ وہ کچھ ناراض ہوئیں مگر زیادہ نہیں۔ تین چار روز اسی طرح گزر گئے تو انہوں نے رات کو دروازہ بند کر لیا۔ ہم نے کھٹکھٹایا تو انہوں نے کہا وہیں چلے جایئے جہاں سے آپ اس وقت آتے ہیں۔ ہم نے کہا، اچھا صاحب اور ہم واپس دفتر آ گئے۔''

''پھر کیا ہوا مولانا؟'' جمال نے بے تابی سے پوچھا۔

''اگلی رات ہم گئے تو وہ لالٹین لیے دروازے میں بیٹھی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے کبھی ہمارے دیر سے آنے پر منہ نہیں بنایا اور اب تو اگر ہم کبھی جلدی پہنچ جائیں تو پریشان ہو جاتی ہیں کہ خدا خیر کرے۔''

## للوا کے ہڑتالی

کافی ہاؤس سے اُٹھ کر وہ جمال کے ساتھ دوسرے چوتھے تانگے سے تھانے کے سامنے والے اڈے پر اترتے اور بلو بائی کے چوبارے تک جھومتے ہوئے پیدل جاتے۔ ان کو ہیرا منڈی کی تمام طوائفیں پولیس والے اور تانگے والے پہچانتے تھے اور ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ جانتے تھے کہ بڑا آدمی ہے۔

مولانا بھی ہیرا منڈی میں جا کر اپنے وقار کا نقاب اتار پھینکتے اور ہنس ہنس کر باتیں کرتے۔ بعض اوقات راہ چلتی طوائفوں سے ہنسی مذاق بھی کر لیتے۔

ایک روز وہ بہت مستی میں تھے۔ تانگے سے اتر کر بھنگڑا ڈالنے لگے۔ لوگ جمع ہو گئے۔ تھانے سے سپاہی نکل آئے اور سب نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ مولانا کالی اچکن پہنے ہوئے ناچ رہے تھے اور گا رہے تھے۔ ''ہم ہیں للوا کے ہڑتالی...... ہم ہیں للوا کے ہڑتالی......''

جمال بھی تالی سے تالی ملاتا رہا مگر اسے مولانا کی فکر رہی۔ مولانا ایک بچے کی سی سادگی سے ناچتے گاتے رہے۔ ہجوم اکٹھا ہو گیا مگر مولانا کی معصومیت پر کوئی اثر نہ پڑا۔ یہاں سے وہ بلو بائی کے چوبارے پر گئے۔ ایک آدھ راگ سنا، پھر انہیں کسلمندی نے آ لیا۔

صبح جمال نے مولانا سے پوچھا ''جناب یہ للوا کے ہڑتالی کون تھے؟''

''آپ کو نہیں پتہ؟'' مولانا بولے ''میں جانتا تھا کہ آپ جاہلِ مطلق ہیں۔ آپ کو کچھ معلوم نہیں۔''

''بے شک مولانا۔'' جمال نے جواب دیا۔ ''اسی لیے تو آپ سے پوچھا ہے......''

''بھئی 1927ء میں جب میں عصرِ جدید کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ کام کرتا تھا تو للوا کے مزدوروں نے ہڑتال کی تھی۔'' مولانا نے جواب دیا۔ ''للوا کلکتے کے نواح میں ایک مل تھی۔ اس کے مزدوروں کے لیے میں نے گیت لکھا تھا مگر آپ کو مزدور تحریکوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں واحسرتا!''

''مگر مولانا 1927ء میں تو میں چار برس کا تھا۔'' جمال نے معصومیت سے کہا ''پھر اس ہڑتال کا

کہیں ذکر بھی نہیں۔ میرے خیال میں یہ کوئی مقامی تحریک ہوگی۔''

مولانا چمک کر بولے ''مگر آپ کو خیال کے راہوار دوڑانے کا کیا حق ہے؟ اور یہ بھی آپ نہیں جانتے کہ مزدور تحریکیں شروع میں مقامی ہی ہوتی ہیں۔ اصل میں آپ کچھ بھی نہیں جانتے۔ جائیے اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کیجیے۔''

## بادہ نوشوں کی خانہ خرابی

حکم ہوا کہ ہوٹلوں میں شراب پیش نہ کی جائے گی' کیونکہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے۔

قائداعظم ابھی زندہ تھے مگر وہ کاروبارِ حکومت انہوں نے نوابزادہ لیاقت علی خاں کے سپرد کر رکھا تھا۔ یوں بھی شراب کوئی اچھی چیز نہیں اور اس کی بندش میں خوبی ہی خوبی ہے مگر لوگوں نے یہ بھی سنا کہ ایک مسلم لیگی وزیر کی ہمشیرہ صاحبہ مری میں ایک ہوٹل کے سامنے سڑک پر مدہوشی کی حالت میں گری ہوئی پائی گئیں۔ اس پر انہوں نے ہوٹلوں میں شراب پینے پر پابندی لگادی کہ باجی پیئے تو گھر کے اندر پیئے۔ سڑکوں پر گر کر خراب نہ ہو۔

مولانا گھر میں پیتے نہ تھے اور دفتر کا تقدس بھی وہ برقرار رکھتے تھے۔ ہوٹل والے بھی پریشان ہوگئے۔ ان کی آمدنی کم ہوگئی تو انہوں نے شراب چائے کی پیالیوں میں مہیا کرنی شروع کر دی۔ ایکسائز انسپکٹروں کو ان کا حصہ باقاعدگی سے مل جاتا تھا۔ اس لیے بادہ نوشوں کو کوئی خاص تکلیف نہ ہوتی۔ وہ چینی کی پیالی میں وہسکی انڈیلتے۔ اس میں ذرا سا پانی ملاتے اور چسکیاں لیتے۔ اس طرح ہوٹلوں میں شاعروں اور ادیبوں نے بسیرا کر لیا اور غزل پر بحث اب اور بھی نشیلی ہوگئی۔

ایک ہوٹل نے میلہ لوٹ لیا جب اس نے ایک پڑھی لکھی حسین لڑکی اپنی منیجر رکھ لی۔ پھر کچھ جام اس کے نام پر بھی پیئے جانے لگے اور کچھ غزلیں اس پر بھی کہی جانے لگیں مگر مولانا نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ یہ ان کے وقار کے خلاف تھا۔ ان کے کلچر میں فقط پیشہ ور رنڈی کی طرف دیکھا جا سکتا تھا اور وہ بھی نہایت احترام کے ساتھ۔

پھر مسلم لیگی حکومت کو پتہ چل گیا کہ لوگ اب چائے کی پیالیوں میں شراب پیتے ہیں۔ کچھ کو یہ احساس بھی تھا کہ لوگ ہماری کارکردگی سے خوش نہیں ہیں اور انہیں اسلام کے نام پر چپ کرایا جا سکتا ہے۔ اس لیے اس نے شراب نوشی پر پابندی لگادی مگر ایک کھڑکی بھی کھلی رکھی۔ اگر ڈاکٹر لکھ دے کہ شراب کے بغیر مریض کی جان کو خطرہ ہے تو پھر پرمٹ پر شراب مل سکتی تھی۔ اس کھڑکی سے ڈاکٹروں نے بہت کچھ کمایا۔

اب مولانا کی شخصیت ایسی تھی کہ وہ کسی ڈاکٹر کے پاس شراب کا سرٹیفکیٹ لینے نہ جا سکتے تھے۔ اس طرح اخبار کی بھی بدنامی ہوتی اس لیے انہیں بڑی تکلیف ہوئی۔

اس تکلیف کا جمال کو شدت سے احساس تھا۔ وہ مولانا کا ساقی تھا۔ خود بھی پیتا تھا مگر شراب اس کو کبھی نہ لگی۔ وہ مولانا کا عقیدت مند تھا اور ان کا ذاتی خدمت گزار بھی۔ وہ صبح دفتر آتا تو ایک جیب میں شراب کی چھوٹی بوتل اور دوسری میں گلاس ڈال کے آتا۔

## سجے سجادہ رنگین

شام کو شفٹ ختم ہوتی تو استاد شاگرد تانگے میں بیٹھ کر اپر مال کے ویرانوں کو نکل جاتے۔ چلتے چلتے جمال جیب سے بوتل اور گلاس نکالتا۔ پیگ بناتا اور اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر مولانا کو پلا دیتا۔ اس ترکیب میں ایک خرابی تھی۔ مولانا کو شراب پانی کے بغیر پینی پڑتی اور بعض اوقات انہیں بے مزہ کر دیتی۔

پھر جمال نے ایک اور ترکیب نکالی۔ استاد شاگرد شام کو لارنس باغ کی سیر کو نکل جاتے۔ سات بجے جب باغ بند ہو جاتا تو وہ کسی کونے میں چھپ جاتے۔ اندھیرا ہو جاتا تو اپنی ہاؤ ہو میں مصروف ہو جاتے۔

مگر ایک تکلیف یہاں بھی تھی۔ پانی کیسے لایا جائے اور بے فکری کا ماحول کیسے بنایا جائے۔ شراب پینے کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ یہ روٹی نہیں کہ بھوک لگے تو پیٹ میں ڈال لی جائے۔ اس کے لیے موڈ چاہیے۔ روشنی چاہیے، رونق چاہیے۔ بے تکلف دوستوں کی صحبت چاہیے اور پھر نقل چاہیے۔

مولانا اور جمال شملہ پہاڑی کے دامن میں بیٹھے تھے۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ بوتل کھل چکی تھی۔ گلاس سنہری ہو چکے تھے۔ مولانا نے اداس ہو کر کہا ''یار مولوی کہیں سے پانی کا بندوبست کر۔''

پانی کا کوئی نلکا قریب نہ تھا اور یوں بھی اس اندھیرے میں اپنی کمین گاہ سے نکلنا اور پانی تلاش کرنا عقلمندی کی بات نہ تھی مگر جمال نے کہا ''بہتر مولانا۔''

اسے یاد آیا کہ ساتھ ہی کسی بزرگ کا مزار ہے جہاں عشاء کی نماز ہو چکی ہے اور نیک لوگ گھروں کو جا چکے ہیں۔ اب صبح تک یہاں بوڑھے بڑ سے الٹی لٹکنے والی بڑی چمگادڑوں کے سوا کوئی نہ آئے گا۔ وہ دبے پاؤں مزار سے مٹی کا لوٹا جسے واہڑی کہتے ہیں، اٹھا لایا۔ اس لوٹے میں جمال نے شراب انڈیلی تو وہ پانی سے مل کر سریلی ہوگئی۔

مولانا جمال کی اُپج سے بہت خوش ہوئے اور دونوں نے بھر بھر کے گلاس پیئے۔

واپس جانے کو اٹھے تو مولانا نے کہا ''جمال صاحب مزار کی امانت کا کیا کریں۔''

جمال نے واہڑی وہیں رکھ دی جہاں سے وہ اٹھا کر لایا تھا۔

## شی وازاین آرٹسٹ!

بلو بائی کے کوٹھے پر مولانا کچھ بے قرار ہو رہے تھے۔ پہلو بدلتے تھے اور زور زور سے سگریٹ کے کش لگاتے تھے۔ بلو بائی اور اس کی دو نوچیاں راگ بہار گا رہی تھیں۔ پھلواری کنتھ رت بسنت۔ گجرا مول لے دے رے...... وہ خوش گلو تھیں۔ راگ کا برتاوا بھی ان کا درست تھا۔ ہارمونیم پر ان کا استاد بیٹھا تھا۔ موتیے کے ہار فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔

مولانا کا دھیان گانے میں نہیں تھا اور یہ دیکھ کر بلو بائی کی نوچیاں زیادہ سریلا گانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اچانک مولانا نے جمال کے کان میں کہا ’’ظہور کی والدہ کی طبیعت آج کل ٹھیک نہیں۔‘‘

ظہور ان کے بیٹے کا نام تھا۔

’’بہت افسوس ہے مولانا۔‘‘ جمال نے دبی آواز میں جواب دیا۔ ’’خیر تو ہے؟‘‘

’’ہاں خیر ہی ہے۔‘‘ مولانا مونچھوں میں مسکرا کر بولے ’’اصل میں وہ امید سے ہیں۔‘‘

’’ماشاءاللہ۔‘‘ جمال نے کہا۔

’’سات ماہ گزر چکے ہیں۔‘‘

لڑکی سرگم کہہ رہی تھی۔ اس کی بول بانٹ بہت خوشنما تھی۔

مولانا بولے ’’سات ماہ سے میں تنہائی کا شکار ہوں۔ احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ حاملہ خاتون کو تنگ نہیں کیا جا سکتا، اس لیے......‘‘

مولانا خاموش ہو گئے۔ جمال کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

مولانا لڑکیوں کی طرف دیکھنے لگے۔ اچانک انہوں نے استاد کو اشارے سے بلایا۔ گانا بند ہو گیا اور کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

مولانا نے ایک سگریٹ سلگایا۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور بڑی آہستگی سے استاد سے پوچھا ’’اس کمرے کا کرایہ کیا ہوگا۔ میرا مطلب ہے ہم دونوں کے لیے۔ جمال میرا شاگرد ہے۔ ہم دونوں یہاں رات بسر کریں گے۔‘‘

جمال سمجھ گیا اور چیخ کر بولا ’’مولانا میرے لیے نہیں۔‘‘

’’کیوں صاحب؟‘‘ مولانا بولے ’’آپ ماشاءاللہ نوجوان ہیں۔ آپ کو بھی حاجت تو ہوگی۔‘‘

’’جی نہیں مولانا، مجھے حاجت نہیں۔‘‘

’’اچھا صاحب۔‘‘ مولانا بے بسی سے بولے ’’تو استاد صاحب قبلہ میں نے پوچھا تھا کہ اس کمرے کا کرایہ کیا ہوگا ایک شخص کے لیے؟‘‘

لڑکیاں چپ چاپ بیٹھی گفتگو سن رہی تھیں۔ بلوبائی پان پر کتھا لگانے لگی۔ جمال ہمہ تن گوش ہو گیا مگر وہ بات سن نہ سکا۔

مگر تھوڑی دیر میں سودا طے ہو گیا۔ مولانا کو بلوبائی دوسرے کمرے میں لے گئی۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک چلبلی نوچی۔

راگ بہار پھر شروع ہو گیا۔ پھل داری کنتھ۔ رُت بسنت......

مگر جمال کا دھیان راگ میں نہیں تھا۔ اسے مولانا کا خیال تھا۔ انہیں کوئی گزند نہ پہنچ جائے کیونکہ ہیرا منڈی میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

کوئی آدھے گھنٹے میں مولانا واپس آ گئے۔ ان کے بال کھلے ہوئے تھے۔ چہرے پر کسی قدر ندامت تھی۔ آتے ہی کہنے لگے ’’چل مولوی۔‘‘

جمال نے ان کا ہاتھ پکڑ کر تنگ اور اندھیری سیڑھیوں سے نیچے اتارا۔ تانگہ لیا اور مولانا کے گھر کی راہ لی۔ وہ ہمیشہ تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتے تھے۔ ہیرا منڈی سے راوی روڈ اور راوی روڈ سے مال روڈ پر پہنچتے ہوئے مولانا نے کوئی بات نہ کی۔ جمال بھی چپ رہا۔

گھر پہنچ کر مولانا نے جمال سے کہا ’’شی واز این آرٹسٹ!‘‘

## موسم گدرایا

مولانا نے اپنے کمرے میں سے نعرہ مارا۔ ’’اِدھر آئیے مولوی جمال صاحب۔ آپ کا فون ہے۔‘‘

جمال نے فون اٹھایا تو ایک لچکدار آواز آئی۔ ’’بھلا ہم کون ہیں آپ کے؟‘‘

جمال کو اخبار کے دفتر میں کبھی کسی عورت نے فون نہ کیا تھا۔ وہ خاتون کو پہچان نہ سکا، سوچنے لگا۔

’’بھول گئے آپ ہمیں؟ اتنی جلدی؟ ارے میں سعیدہ ہوں۔ سعیدہ حق۔‘‘ وہ بولی ’’کمال ہے بھئی!‘‘

جمال نے سعیدہ کو پہچان لیا۔ وہ خوش بھی ہوا مگر مولانا کی موجودگی میں وہ زیادہ بے تکلف نہ ہو سکتا تھا۔

فوراً ہی جمال کو یاد آیا کہ دو برس پہلے جب مفتی ریڈیو میں نوکر ہوا تھا تو سعیدہ پروڈیوسر عبدالحق کی دوست تھی۔ اس زمانے میں وہ گورنمنٹ کالج میں بی اے کی طالبہ تھی۔ اسے ریڈیو پر کام کرنے اور اس حوالے سے مشہور ہونے کا بہت شوق تھا مگر وہ کچھ لکھ سکتی تھی نہ گا سکتی تھی اور نہ ہی اسے ایکٹنگ آتی تھی کہ کسی ڈرامے میں کام کر سکے۔

عبدالحق کو سعیدہ کا شوق تھا اور جمال کو ان دس روپوں کا شوق تھا جو اسے پروڈیوسر عبدالحق سعیدہ کے نام کی تقریر لکھنے کے دلواتا تھا۔ جمال تقریر لکھ کر دس روپے وصول کر کے خوش، سعیدہ پروگرام وصول کر کے خوش اور عبدالحق سعیدہ وصول کر کے خوش۔ حق نے یہ بات کبھی ظاہر نہ ہونے دی مگر جمال کو اس عجیب وغریب اور خیال انگیز تکون کے سارے زاویئے معلوم تھے۔

## کوئلیا بولی رے

’’جی میں پہچان گیا۔‘‘ جمال نے جلدی سے کہا۔

مولانا بیزار ہو رہے تھے۔ وہ انتظار کر رہے تھے کہ جمال اس مہمل گفتگو سے فارغ ہو کر کمرے سے نکلے تو وہ اپنا کالم مکمل کریں۔

’’میں نے عبدالحق سے شادی کر لی تھی۔‘‘ سعیدہ بولی ’’پیچھے پڑ گئے تھے وہ جیسا کہ آپ مردوں کا قاعدہ ہے۔ میرے شوہر تو آپ کے دوست تھے۔‘‘

''جی ہاں جی ہاں...... آپ نے بہت اچھا کیا۔ مبارک ہو۔''

مولانا نے کہا ''مولوی جمال صاحب خواتین سے بات مختصر کرنی چاہیے اور یہ اخبار کا دفتر ہے، یادرہے۔''

سعیدہ بولی ''ایک مدت سے ملاقات کے لیے بے قرار ہورہی تھی مگر آپ کا کچھ پتا ہی نہ تھا۔ آج اتفاق سے اخبار میں لنڈے بازار پر فیچر دیکھا تو دل نے گواہی دی کہ یہ آپ ہی ہوسکتے ہیں' اتنے شریر!''

''جی جی۔ شکریہ۔''

''یوں نہیں۔'' وہ اِٹھلا کر بولی۔ ''شکریہ ادا کرنے کے لیے آپ کو گھر آنا پڑے گا۔ ماڈل ٹاؤن جی بلاک میں لیٹر بکس کے سامنے کالے گیٹ والی کوٹھی......''

''جی ضرور ضرور۔''

مولانا نے جلتا سگریٹ بجھا کر دوسرا سلگالیا اور کرسی سے ٹیک لگا کر جمال کو گھورنے لگے۔

''تو کب آؤ گے جمال یار؟''

''کسی وقت۔ دو ایک روز میں۔''

''آج ہی کیوں نہیں۔ اللہ دل بے قرار ہے! میں پانچ بجے حق کو بھیج دوں گی۔ وہ آپ کو ساتھ لے آئیں گے۔ رات کو کھانا کھا کر چلے جانا۔''

''اچھا جی۔'' جمال اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔

''ہم راہ ہی نہ دیکھتے رہ جائیں کہیں۔ اللہ دل ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گا ہمارا!''

ٹیلی فون رکھ کر جمال سوچ میں پڑ گیا۔ حق نے اس سے کئی تقریریں لکھوائی تھیں مگر سعیدہ سے ملاقات کبھی نہ کروائی تھی۔

اب دو برس کے بعد جب اس کی شادی ہوچکی ہے، اسے اچانک مجھ سے ملنے کا اتنا شوق کیوں ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے فرض کرلیا کہ وہ مجھ سے پھر کوئی تقریر لکھوانا چاہتی ہے۔

شام کو ٹھیک پانچ بجے عبدالحق ایک لمبی چوڑی گاڑی میں جمال کو لینے کے لیے آ گیا۔ دو برس میں اس کے بدن پر کچھ چربی آ گئی تھی۔ اس نے جمال کو گرمجوشی سے گلے لگایا۔ گاڑی میں بیٹھ کر بولا ''یار زمانہ گزر گیا!''

''ہاں یار۔'' جمال نے سنجیدگی سے کہا۔ ''پاکستان بننے سے پہلے تم دہلی ٹرانسفر ہو گئے تھے اور میں بھی اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔''

''عجیب زمانہ تھا مگر تم کہاں رہے۔ کیا کرتے رہے؟''

''آوارہ رہا اِدھر اُدھر۔''

''آوارگی سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔'' حق نے حسرت سے کہا ''افسوس ہمیں اس کا موقع ہی نہ ملا۔ چھوٹتے ہی کام دھندے میں لگ گئے......''

''ہاں یار۔ آوارگی نعمت تو ہے۔'' جمال نے جواب دیا۔

''مجھے تو پتہ ہی نہ تھا تمہارا۔ سعیدہ نے کہیں تمہارا کوئی مضمون پڑھ لیا۔ بہت اچھا لکھتے ہو ماشاءاللہ۔''

''اللہ کا شکر ہے۔''

''پھر پتہ چلا کہ تم اخبار میں باقاعدہ ملازم ہوگئے ہو۔''

جمال نے اکتاہٹ سے جواب دیا۔ ''دھندا تو کرنا ہی پڑتا ہے کوئی نہ کوئی۔''

''بہت اچھا۔ بہت اچھا۔ پاکستان کو اچھے صحافیوں کی بہت ضرورت ہے۔ تمہی لوگ عوام کو راستہ دکھا سکتے ہو ورنہ وہ تو جاہل ہیں۔ ہمیں پاکستان کو تعمیر کرنا ہے اور اس کے لیے ملک کو جوہرِ قابل کی ضرورت ہے جو مخلص ہو اور جانثار ہو......''

اس بات سے اختلاف نہیں ہوسکتا تھا اور جواب دینے کی کوئی بات بھی نہ تھی۔

جمال نے پوچھا ''مگر حق تم کیا کرتے رہے؟''

''میں نے نوکری چھوڑ دی تھی۔ نوکری میں کیا رکھا ہے؟''

''بے شک مگر نوکری چھوڑ کر کرتے کیا ہو؟''

## پاکستان کی ترقی

حق نے دانائی سے جواب دیا۔ ''کاروبار ہے تھوڑا سا۔ کاروبار ہی سے پاکستان ترقی کرے گا۔ دہلی میں مجھے گلاب بائی نے لکس صابن کی ایجنسی دلوادی تھی۔''

''کون گلاب بائی؟'' جمال نے پوچھا۔

''تھی ایک ریڈیو پر گانے والی......''

''تو اس نے تمہیں لکس صابن کی ایجنسی کیسے دلوادی؟''

حق ہنس کر بولا ''اس کا دہلی کے سول ایجنٹ سے تعلق تھا۔ بہت اچھا گاتی تھی۔ میں اس کو بہت پروگرام دیتا تھا اس لیے اس نے میری مدد کردی۔''

''مگر تم اب کیا کرتے ہو؟ ایجنسی تو وہیں چھوٹ گئی ہوگی۔''

حق مسکرا کر بولا ''تمہیں پتہ ہے ہم جالندھر کے رہنے والے ہیں اور ہمیں حق ہے کہ یہاں کوئی کاروبار الاٹ کرالیں۔ کاروبار کے بغیر تو پاکستان چل نہیں سکتا ناں۔ ہندو تو سب کچھ بند کر کے چلے گئے' تاکہ ہم تباہ ہوجائیں مگر ہمیں بھی اپنا فرض یاد رکھنا ہے۔ فی الحال میں نے انارکلی بازار میں بھلہ اینڈ سنز کی انگریزی دوائیوں کی دکان الاٹ کرائی ہے۔ نیا لائسنس ملنے کی امید بھی ہے۔''

"انگریزی دوائیوں کی دکان؟" جمال نے حیران ہو کر پوچھا۔ "ریڈیو کے پروڈیوسر اور صابن کے ایجنٹ کا کیمسٹ کی دکان سے کیا لینا دینا؟"

وہ کھلکھلا کر ہنسا اور بولا "تم بودم کے بودم ہی رہے۔ اتنا بڑا انقلاب آ گیا۔ ہم نے اپنا ملک بنا لیا مگر تم کچھ نہ سمجھے۔ بھائی ہم لٹ پٹ کر پاکستان آئے ہیں تو ہمیں کچھ ملنا بھی چاہیے۔"

"مگر تم تو لٹ پٹ کر نہیں آئے۔" جمال نے کہا "جالندھر میں تو فساد ہوا ہی نہیں تھا۔ لوگ سلامتی سے پاکستان پہنچ گئے تھے۔"

"مگر میرا اجدی پشتی مکان؟ وہ تو وہیں رہ گیا نا۔ امام صاحب کے مزار کے قریب رہتے تھے ہم۔"

"وہ تو بہت تنگ جگہ ہے۔" جمال بولا۔

"ہاں۔" حق نے کہا "تھا تو تین مرلے کا مگر تین منزلہ تھا۔ بڑی قیمتی زمین تھی اس کی......"

"تو یہاں آ کر تم کوئی مکان الاٹ کرا لیتے۔"

"وہ بھی کرا لیا ہے اور اب ہم وہیں جا رہے ہیں۔ کوٹھی ذرا پرانی ہے مگر اچھی حالت میں ہے۔"

"مگر دوائیوں کی دکان تو تمہارے بس کی بات نہیں، تمہیں تو یہ بھی پتہ نہ ہوگا کہ اسپرین اور کونین میں کیا فرق ہے۔"

"مجھے ان کا فرق جاننے کی ضرورت نہیں۔ میں تو سارا مال بیچ رہا ہوں، جو بھی مل جائے۔ کون آنے ٹکے کی مصیبت میں پڑے۔ دکان خالی ہو جائے گی تو وہ بھی بیچ دوں گا۔"

"مگر تمہیں دوائیوں کی دکان مل کیسے گئی حق؟"

حق ہنسا اور دھیمی آواز میں بولا "ادھر ہمارے جالندھر کے ایک خان صاحب بحالیات کے افسر ہیں۔ انہوں نے عنایت کر دی اور بنگلہ بھی دے دیا۔ آخر ان لوگوں کو آباد بھی تو کرنا ہے جو پاکستان کی وجہ سے برباد ہوئے۔"

"مگر تم کب آئے، کیسے پہنچے لاہور تک؟" جمال نے پوچھا۔

"ہمارے سارے رشتہ دار تو پہلے ہی لاہور میں آباد تھے۔ کوئی بیس برس پہلے میرے دادا نے جالندھر چھوڑ دیا تھا۔ ایک میں دہلی میں تھا جب پاکستان بنا۔ دو ماہ بعد جب فسادات کی آگ ٹھنڈی ہوئی تو ہم بھی ریل گاڑی میں آرام سے آ گئے یہاں......"

"ہم؟ یعنی تم اور سعیدہ؟"

"میں اور سعیدہ اور ہمارا ننھا راحیل۔ ہم تینوں۔"

اتنے میں گاڑی ماڈل ٹاؤن کی ایک بہت بڑی کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ کوئی چار کنال کا تو اس کا لان ہی تھا۔ بہت بڑا پورچ، دونوں بازوؤں پر چھوٹے چھوٹے گنبد جن پر عشق پیچاں کی سبز بیلیں شام کے جھٹپٹے میں عجب بہار دے رہی تھیں اور پورچ کے اندر ڈرائنگ روم کے دروازے کے سامنے چپٹی ناک اور بھرے ہوئے سڈول جسم والی ایک دراز قد لڑکی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ جمال کو اس کی صورت آشنا لگی۔

"ہم تو سوکھ گئے انتظار کرتے کرتے۔" اس نے اٹھلا کر کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

جمال نے کبھی کسی جوان عورت کے ساتھ ہاتھ نہ ملایا تھا اور وہ بھی اس کے خاوند کے سامنے مگر کیا کرتا۔ ہاتھ پکڑ کر وہ جمال کو ڈرائنگ روم میں لے گئی اور کہنے لگی "بڑی مشکل سے ڈھونڈا ہے تمہیں......"

جمال کسی قدر بے یقینی سے بولا "جی جی۔ بڑی مہربانی آپ کی۔"

اتنے میں حق اندر چلا گیا۔

"توبہ ہے!" سعیدہ بولی "کیا تم کوئی غیر ہو؟ کوئی بات کرو یار!"

"جی؟ جی نہیں۔" جمال بولا "یہ تو میرا اپنا گھر ہے۔"

سعیدہ اس کے ساتھ لگ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ جمال کچھ اور ہٹ گیا۔

سعیدہ اس کی گھبراہٹ کو بھانپ کر بولی "ارے گھبراؤ نہیں۔ تکلف نہ کرو۔ کیا کوئی جوان اور خوبصورت عورت تم نے پہلے کبھی نہیں دیکھی؟"

"جی نہیں۔" جمال نے کہا "ایسے ہی سوچ رہا تھا کچھ......"

"کیا سوچ رہے تھے ہم سے چوری چوری؟" سعیدہ نے شرارت سے کہا۔

"یہی کہ اس سے پہلے آپ سے ملاقات کیوں نہ ہوئی......"

"مگر میں نے تمہیں بھلایا نہیں کبھی۔ ہمیشہ تمہیں دیکھتی رہی، چک کے پیچھے سے۔"

"کب۔ کہاں؟ کیسے؟" جمال نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ قہقہہ مار کر بولی "تم بتاؤ کہاں؟"

"میں تو عمر بھر آوارہ رہا۔ کہیں رُکا ہی نہیں۔ آپ نے کہاں دیکھا ہوگا مجھے۔"

"تو پھر بتا دوں؟" سعیدہ شرارت سے بولی۔

"بتا دیجئے پلیز!"

## بریانی اور ساگ

"پہلے میں تمہیں یہ بتا دوں کہ میں نے آج بھی بریانی اور ساگ پکوایا ہے تمہارے لیے۔ تمہیں بہت پسند ہے نا؟"

"ہے تو مگر آپ کو کیسے پتہ ہے؟"

"پتہ ہے نا۔" وہ لاڈ سے بولی "جب تم شیخوپورہ میں آئے تھے ہمارے ہاں......"

"آپ کے ہاں؟" جمال نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ کیا آپ آپ لگا رکھی ہے۔" سعیدہ چڑ کر بولی "میرا نام آپ نہیں سعیدہ ہے یار...... میرے بھائی جان ہیں تمہارے رانا صاحب۔ ان کی پوسٹنگ ابھی وہیں ہے، کچھ یاد آیا کہ نہیں؟"

"تو تم وہ والی سعیدہ ہو!" جمال نے حیران ہو کر کہا "مگر تم شیخوپورے میں مجھ سے پردہ کرتی رہیں؟"

"کب کیا تھا پردہ؟" وہ ہنس کر بولی "کیا میں چک کے پیچھے بیٹھ کر کیا شوقیہ ہی چوڑیاں توڑا کرتی تھی؟ تم ہی چوروں کی طرح نکل جاتے تھے......"

"تم نے کبھی کوئی واضح اشارہ ہی کیا ہوتا......"

"شریف لڑکی اور کس طرح واضح اشارے کرتی ہے۔ اتنے بدھو نظر آتے تھے تم......"

"اب بھی میں بدھو ہوں سعیدہ۔ اب بھی میں نے تمہیں نہ پہچانا۔ حالانکہ ٹیلی فون پر تمہاری آواز آشنا لگی تھی۔"

"اب کیوں پہچاننے لگے میاں مٹھو۔ چُوری کھانے کا شوق پورا ہو گیا ہو گا۔"

"جی نہیں۔ ہمیں کون پوچھتا ہے اس دنیا میں۔"

سعیدہ بولی "ہم پوچھتے ہیں جناب۔ مگر کوئی یاد رکھے، کوئی پہچانے تب نا......"

"ایمان سے میں تمہیں کبھی بھولا نہیں سعیدہ۔ ہمیشہ تمہیں یاد رکھا مگر...... اب کیا کہوں؟ اب تو بہت دیر ہو گئی......"

## ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

سعیدہ نے آہ بھر کر کہا "دیر تو بے شک ہو گئی۔ رانا صاحب تمہیں بہت پسند کرتے تھے۔ تمہیں نہیں تمہاری رومانیت، تمہارے لاابالی پن اور تمہاری آوارہ مزاجی کو پسند کرتے تھے......"

"اور تم؟"

"اب تو بہت دیر ہو گئی کہا نا رانا صاحب کا تو کچھ اور بھی ارادہ تھا۔ انہوں نے مجھ سے بات بھی کر لی تھی۔"

"پھر کیا ہوا؟" جمال نے پوچھا۔

"میں تمہارے لیے بڑے شوق سے بریانی اور ساگ پکاتی تھی اور مہینے کی پہلی تاریخ کا انتظار کرتی تھی۔ مگر پھر تم اچانک غائب ہو گئے۔ غائب کیوں ہو گئے تھے؟ بہت دیر ہم نے تمہارا انتظار کیا، مگر جو بات نہ ہونے والی ہو وہ ہوتی نہیں میاں مٹھو۔ یہ بات ہونے والی نہیں تھی۔ قدرت کو منظور نہیں تھا کہ تم چُوری کھاؤ۔"

"بے شک۔ آدمی تو کھلونا ہوتا ہے دراصل۔"

"کھلونا ہوتا ہے مگر کھیلتا بھی ہے۔"

"میں تو تم کو نہیں کھیلا۔"

"کھیلنے نہیں توڑنے کی کوشش کرتے رہے۔ کچھ دن میں ٹوٹی پھوٹی رہی۔ پھر میں نے سوچا روؤں کس بات پر، تم نے مجھ سے کوئی وعدہ تو نہیں کیا تھا۔ مجھے آنکھ بھر کر دیکھا بھی نہ تھا۔"

جمال نے کہا "میں محتاط رہا کہ رانا صاحب کو شک نہ پڑ جائے اس لیے......"

"جن کے گھروں میں کنواری بہنیں ہوتی ہیں، وہ برا نہیں مانتے۔ اگر دیکھنے والے کی نیت بہت ہی بری نہ ہو۔"

"مگر میری نیت تو ہمیشہ بہت ہی بری تھی، ہے نا سعیدہ۔" جمال نے ہنس کر کہا۔

"ارے تم کیا اور تمہاری نیت کیا۔ تم میں اتنی توفیق کہاں۔" وہ بولی...... "پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھا لیا۔ لڑکی کو بالآخر سنبھلنا ہی پڑتا ہے۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔"

"اس سلسلے میں حق نے بھی میری بہت مدد کی۔ وہ میرے پیچھے پڑ گئے تو میں مان گئی آخر۔"

"بہت اچھا!" جمال بولا۔

"ہاں بہت اچھا جمال۔" وہ اداس ہو کر بولی۔ "اللہ کا شکر ہے!"

اتنے میں عبدالحق کپڑے بدل کر واپس آ گیا۔ سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر بولا "اور سناؤ جمال...... مگر یار تمہیں بھی کچھ سوچنا چاہیے اپنے لیے۔ نیا ملک ہے، نئے کاروبار ہیں......"

"فقیروں کو کیا چاہیے۔ روٹی، کپڑا اور کچھ پیارے دوست اور یہ اسباب مہیا ہیں۔"

"جمال کو کبھی ہوش نہ آئے گا حق۔" سعیدہ بولی "شیخوپورے میں بھی اس نے کچھ نہ کمایا۔"

"مجھے کچھ کمانے سے دلچسپی نہیں۔" جمال بولا۔

"بے وقوف ہو تم۔" حق نے کہا۔

"بہت زیادہ بے وقوف۔" سعیدہ سنجیدگی سے بولی "جب شکار کا موقع آتا ہے تو یہ غائب ہو جاتا ہے۔"

"حالانکہ تم ایک ذہین آدمی ہو۔" حق نے کہا۔

"تمہیں قلم کی طاقت کا پتہ نہیں جمال۔ تم جس چیز پر ہاتھ رکھ دو، وہ تمہاری ہو جائے مگر یہ بات تو تمہارے بارے میں پہلے بھی کہی جا سکتی تھی!"

یہ بات سعیدہ نے جمال کو انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہی اور کہہ کر دوپٹہ دانتوں میں لے لیا۔

جمال نے سعیدہ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اٹھ کر سعیدہ کا منہ چوم لے۔

حق نے کہا "کوئی لائسنس وغیرہ لے لو۔ ملک میں ہر چیز کی کمی ہے......"

''کس چیز کا؟'' جمال نے پوچھا۔

''بھئی کسی چیز کا۔ ربر کے سامان کی، ریشمی دھاگے کی، کچی موم کی، ان میں کسی کا لائسنس لے کر دام کھرے کرلو۔ اس طرح ملک کی خدمت بھی ہوجائے گی اور لوگوں کو اشیائے ضرورت بھی مل جائیں گی۔''

اتنے میں آیا سعیدہ کے بچے کو لے آئی۔ پلپلا گول مٹول جمال کو بہت پیارا لگا۔ بڑی ادا سے سعیدہ نے لٹ جھٹک کر اسے جمال کی گود سے لے لیا۔ ''کپڑے خراب کردے گا۔'' وہ بولی ''بڑا نٹ کھٹ ہے۔''

''جمال شادی کی کہ نہیں تم نے؟'' حق نے پوچھا۔

''میں شادی کے قابل ہی نہیں حق!''

''ایمان سے سچ کہتا ہے جمال۔ یہ واقعی شادی کے قابل نہیں۔''

حق کھسیانا ہوکر ہنسنے لگا۔

شام ہوچکی تھی۔ حق نے اُٹھ کر بتی جلادی اور سعیدہ سے کہنے لگا۔ ''بھئی آج کی شام ضائع نہ کرو۔''

## تم تو خوش ہو

سعیدہ مٹکتی ہوئی اٹھی اور الماری میں سے سکاچ وہسکی کی ایک بوتل اور دو خوبصورت گلاس نکال لائی۔ اس نے بڑی مہارت سے جام بھرے۔ جام پکڑتے ہوئے جمال کی انگلیاں اس کی انگلیوں سے ٹکرا گئیں تو جمال کے جسم میں بجلی کی ایک رو سی دوڑ گئی۔ وہ سنجیدہ ہوکر بیٹھ گیا۔

پھر باتیں ہونے لگیں اِدھر اُدھر کی......

اچانک حق نے کہا ''تو تم اخبار نویس بن کر خوش ہو۔''

''بہت خوش۔'' جمال نے جواب دیا۔

''تعلقات بھی تمہارے وسیع ہوئے ہوں گے......''

''ہاں کسی حد تک۔'' جمال نے کہا۔

حق بولا ''پاکستان میں لوگ لوٹ کر سب کچھ گھروں میں ڈال چکے ہوں گے جب تمہیں ہوش آئے گا۔''

''میں تو اس امید پر زندہ ہوں کہ مجھے کبھی ہوش نہ آئے گا' مگر میں کیا کروں آخر؟''

''ارادہ شرط ہے۔'' حق نے کہا۔ ''میں نے ارادہ کیا تو انارکلی میں دوائیوں کی سب سے بڑی دکان الاٹ کروائی' حالانکہ دوائیوں کے بارے میں میرا علم صفر ہے اور گھر بھی لے لیا اور اب آگے کی سوچ رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ میکلوڈ روڈ پر کوئی سینما الاٹ کروالوں......''

''ہاں ان کو بہت شوق ہے فلمیں دیکھنے کا۔'' سعیدہ بولی۔

''نہیں بھائی۔'' حق نے بےزار ہوکر کہا۔ ''یہ کاروبار کا معاملہ ہے۔''

''تم سینما کا کام جانتے ہو؟'' جمال نے پوچھا۔

''بھائی آخر میں ریڈیو میں رہا ہوں۔''

''ریڈیو کا سینما سے کیا تعلق؟'' جمال نے سوال کیا۔

''گانا بجانا تو دونوں میں ہوتا ہے۔'' سعیدہ بولی۔

''مگر یہ کاروبار کی بات ہے سعیدہ۔'' جمال نے دانائی سے کہا۔ ''پھر حکومت حق کو سینما کس استحقاق کی وجہ سے الاٹ کرے گی۔''

''اسی لیے تو تمہیں تکلیف دی ہے جمال۔'' حق پیگ خالی کر کے بولا۔ ''تم اخبار نویس ہو۔ مسلم لیگ کے لیڈروں کو تو کوئی جانتا نہیں۔ افسروں سے تمہارے تعلقات ضرور ہوں گے۔ اس میں چار آنے حصہ تمہارا، پھر مزے سے اخبار نویسی کرتے رہنا۔ تعلقات سے فائدہ نہ اٹھاؤ تو کس کام کے؟''

''مگر حق جمال کو تعلقات کے معنی ہی نہیں آتے۔'' سعیدہ بولی۔ ''یہ تو بریانی کھا کر خوش ہوجاتا ہے اور کچھ مانگتا ہی نہیں۔''

''سوچ لو۔'' حق بولا۔ ''پھر موقع نہ ملے گا۔''

''جمال کو موقع کھونے کی عادت ہے۔ گھر بیٹھے تو کوئی کسی کو چوری نہیں کھلاتا نہ......'' سعیدہ بولی۔

''گھر بیٹھے بھی رحم دل لوگ چوری کھلا دیتے ہیں۔'' جمال نے ہنس کر جواب دیا۔

''لو ایک پیگ اور لو۔'' یہ کہہ کر حق نے جمال کے خالی گلاس میں وہسکی انڈیلی۔ جمال پریشانی میں مبتلا تھا۔ اسے حق سے کراہت ہونے لگی تھی۔ سعیدہ پر بھی افسوس ہوا جو جمال سے ہلکے سے جذباتی تعلق کے بعد اسے استعمال کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور اپنے جسم کے ایسے زاویے دکھا رہی تھی جو دل پذیر تھے۔

تین تین پیگ ہوچکے تھے اور بات رُک گئی تھی۔ کچھ دیر بعد نفسیات کا مضمون کھلا۔

سعیدہ نفسیات کی طالبہ رہ چکی تھی۔ اس نے خالص علمی انداز میں ہیوپلاک ایلس کی کیس ہسٹریاں سنانی شروع کردیں اور کچھ اپنے مشاہدے سے ان کی وضاحت کی۔ اس نے کہا، لوگوں کے سماجی رشتے اور ترغیبات جنسی ایک ہی ہوتی ہیں۔ اگرچہ مختلف کلچروں میں اس کے مظاہر مختلف ہوتے ہیں۔ بات کرتے کرتے وہ جمال پر بھی چوٹ کر جاتی جو اسے چبھتے نہیں مگر بیدار کر جاتے۔

اس کے علمی اندازِ بیان میں ذاتی احساس کا کوئی رنگ نہ تھا۔ حق ہمہ تن گوش گھونٹ گھونٹ پیتا رہا۔

سعیدہ بار بار ہاتھ لہراتی اور مسکراتی رہی۔

جمال محتاط ہوگیا۔ یہ لڑکی زبردستی اس کے اندر اُتر رہی تھی۔ شیخوپورے میں بات تاک جھانک سے آگے نہ بڑھی تھی۔ اب اس کے لیے ایک ارادہ مند اور ہوشیار عورت بساط بچھا رہی تھی۔

جمال کوحق کا بھی خیال تھا۔اس کے اندر جو خواہش کسمسانے لگی تھی۔اس پر اسے اپنے سفلہ پن پر شرم آنے لگی تھی۔

آخر میں بات سیاست پر آ کر رکی۔

سعیدہ مسلم لیگی لڑکیوں کے اس گروہ میں شامل تھی جس نے خضر حیات کے خلاف تحریک کے زمانے میں پنجاب سیکریٹریٹ کے گیٹ سے کود کر چھت پر مسلم لیگ کا جھنڈا لہرایا تھا' مگر بعد میں مسلم لیگ کی حکمران خواتین جاگیرداروں کی بیٹیاں اور بیویاں پاکستان میں ایں وآں پر قادر ہو گئیں اور سعیدہ کو کسی نے نہ پوچھا۔حالانکہ مہاجر کیمپوں میں اس نے بڑا کام کیا تھا۔

## سیاسی کارکن

حق کو مخلص ورکروں کی ناقدری اور پاکستان میں بڑے لیڈروں کی احسان فراموشی پر بہت افسوس تھا۔اس نے کہا ''ذرا دیکھو جمال! وہ کس بے شرمی سے لوٹ مار کر رہے ہیں۔کارکنوں کا ان کو کوئی خیال ہی نہیں......''

''کارکنوں کا واقعی کسی کو خیال نہ ہوا۔'' جمال نے سوچا۔

رات گئے سب نے مل کر بریانی اور ساگ اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کھایا۔حق بہت نشے میں تھا' اس لیے جمال کو گھر چھوڑنے کی ذمہ داری ڈرائیور پر آن پڑی۔

پورچ میں جہاں روشنی ذرا کم تھی۔سعیدہ نے جمال کا ہاتھ دبایا اور آہستہ سے کہا ''پھر بھی کبھی آجانا ظالم!''

جمال نے ادھ کھلی آنکھوں سے اس کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور کہا ''تم اتنی چاہے جانے کے قابل لڑکی ہو، مجھے پتہ نہ تھا سعیدہ!''

''مگر مجھے پتہ تھا جمال کہ تمہیں کچھ پتہ نہ تھا۔''

گاڑی چلی تو جمال سوچنے لگا کہ سعیدہ نے اچانک مجھے کیوں بلایا؟ کس لیے؟

میاں بیوی کے تعلقات خوشگوار تھے' مگر سعیدہ میرے ساتھ اتنی بے تکلف کیوں تھی ار وہ بھی حق کے سامنے۔یہ تو میں مان نہیں سکتا کہ سعیدہ مجھ پر عاشق ہے۔ایسا جوان رعنا تو میں ہوں نہیں کہ مجھے دیکھ کر عورتیں سیب چھیلتی ہوں تو انگلیاں کاٹ لیں اور اگر ہوں تو شیخوپورے میں موقعے بہت تھے مگر شیخوپورے میں میں اچھی طرح سعیدہ کو دیکھ بھی نہ سکا تھا۔جمال نے سعیدہ کی بے تکلفی کو گھرانے کی جدیدیت پر محمول کیا۔

حق نے' اگرچہ وہ بہت معمولی پس منظر رکھتا تھا، پاکستان کی لوٹ میں خوب ہاتھ رنگے تھے اور اب وہ مغربی تمدن کی گھٹیا اقدار کی نقالی کر رہا تھا۔لوٹ کے پیسے سے لوگ دلیر ہو جاتے ہیں اور یہی دلیری سعیدہ کو پردے سے باہر نکال کر پورچ میں لے آئی تھی مگر کیا یہ فقط کاروبار کا معاملہ تھا؟



جمال کو سعیدہ کا جسم سعیدہ کی باتوں کی طرح بہت دلفریب لگا۔اس کی گولائیاں بہت خیال انگیز تھیں۔اس کے دل میں شرارت چٹکیاں لینے لگی، پھر اسے شرم آنے لگی۔آخر وہ ایک بیاہتا عورت اور اس کے پرانے دوست کی بیوی تھی۔دوستوں کی بیویوں اور بہنوں کے بارے میں اس کے خیالات بڑے دقیانوسی تھے۔

## دلوں کے بھید

گھر پہنچ کر مفتی کو اس نے ساری کہانی سنائی۔مفتی حق کو ریڈیو کے زمانے سے جانتا تھا۔اس نے کہا ''جمال سعیدہ تمہیں دل دے بیٹھی ہے اور حق کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔مان یا نہ مان۔''

''تم ہمیشہ ہی بکواس کرتے ہو مفتی۔'' جمال نے اکتا کر کہا۔

''حق ایک کاروباری آدمی ہے اور ایک لالچی آدمی ہے۔'' مفتی نے منہ پکا کر کے کہا۔

''مگر کیا کاروباری اور لالچی آدمی میں غیرت نہیں ہوتی؟'' جمال نے چمک کر کہا۔

''ہوتی ہے۔'' مفتی بولا۔''مگر پیسہ پہلے۔پیسے اور غیرت میں انتخاب ہو تو پیسہ پہلے۔''

''مگر میرے پاس تو پیسہ بھی نہیں۔'' جمال نے کہا۔

''چونکہ تمہارے پاس پیسہ نہیں۔اس لیے حق تمہارے ساتھ اخلاص کا جذبہ رکھ سکتا ہے۔اس میں اس کا کچھ جاتا تو نہیں' پھر شاید تم سینما کی الاٹمنٹ میں اس کی کچھ مدد کر سکو......''

''مگر سعیدہ مجھ پر اتنی کیوں کھلی؟'' جمال نے سوال کیا۔

''سعیدہ ایک بھرپور عورت ہے اور بھرپور عورت جس کو پسند کرتی ہے اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔پھر سینما کی الاٹمنٹ میں اس کا فائدہ بھی تو ہے۔''

''مگر حق کو شک پڑ جائے تو؟'' جمال نے کہا۔

''تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔اسے تم سے کام نکلوانے ہیں۔''

''نہیں یار شک پڑ گیا تو وہ اس کی زندگی حرام کر دے گا۔''

''اس کی اپنی زندگی بھی حرام ہو جائے گی پھر۔ایسی منافع بخش بیویاں بازار میں نہیں بکتیں اور مردوں کو بھی سوچنا پڑتا ہے کسی اقدام سے پہلے۔دونوں کا رسک برابر ہوتا ہے مگر حق کو شک پڑ ہی نہیں سکتا۔چاہے شہزادی اس کی رانوں پر بیٹھ کر تمہیں اشارے کرے۔گوری گھونگھٹ کے اندر جلتی ہے۔شعلہ باہر نکلنے نہیں دیتی!''

''بکواس کرتے ہو ہمیشہ کی طرح۔''

''کرتا ہوں مگر سعیدہ چاہے تو حق کو کبھی شک نہ پڑے۔پیسہ بنانے میں اسے دوسری طرف دیکھنے کی فرصت کہاں۔پھر سعیدہ کی بدولت اس کے تعلقات کا دائرہ مکمل ہوتا ہے۔لائسنس ملتے ہیں۔کاروبار کھلتا

ہے۔ تھوڑے بہت شک کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ وسیع تر کاروباری مفادات کے پیشِ نظر......''

''مگر مجھ سے حق کو کیا دلچسپی؟''

''ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو خوش کرنا چاہتا ہو۔ وہ اپنے میاں سے رچاؤ کے باوجود تم جیسے لاابالی، بےفکرے، آوارہ اور احمق شخص کے ساتھ تعلق کی آرزو کرسکتی ہے۔ دلوں کے بھید نہیں جانتے تم!''

''وہ حق جیسے ذہین، ذمہ دار اور کامیاب شخص کو چھوڑ کر مجھ جیسے لاابالی، بےفکرے، آوارہ اور احمق شخص کی آرزو کیوں کرے گی۔'' جمال نے کہا۔

''اس لیے کہ ہر عورت بنیادی طور پر ماں ہوتی ہے۔'' مفتی نے کہا ''دو سال کی ہوتی ہے تو اپنے باپ سے' اپنے بھائیوں سے ماتا کا سلوک کرتی ہے۔ ان سے کھیلتی ہے۔ ان کا دل بہلاتی ہے۔ ان کو خوش کرتی ہے۔ جب بڑی ہوتی ہے تو ان کے کام کرنے لگتی ہے۔ کپڑے جوتے لا کر دیتی ہے۔ کھانا کھلاتی ہے، پانی پلاتی ہے۔ ان کی دیکھ بھال کرنے لگتی ہے۔ جوان ہوتی ہے تو جنسی لذت بہم پہنچاتی ہے اور یہ بھی ماتا ہی کا ایک روپ ہے۔ پھر بچے جنتی ہے تاکہ زندگی کی یکسانیت سے تم بور نہ ہو جاؤ بلکہ مزید پھنس جاؤ۔ تم جیسے لاابالی، بےفکرے، آوارہ اور آتشِ نمرود میں بےخطر کود جانے والے احمق کو دیکھ کر کسی بھی نارمل عورت کی ماتا جوش میں آسکتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ تم میری حفاظت کے بغیر مر جاؤ گے۔ تمہارے بغیر سعیدہ کی ماتا پیاسی ہے۔ حق کی بات اور ہے وہ اپنی دیکھ بھال کرسکتا ہے اور سعیدہ کو اس کا غم نہیں مگر مجھے کیا پڑی ہے کہ میں بھینس کے آگے بین بجاتا پھروں۔ تم تو مانو گے نہیں......''

جمال نے کہا'' بکواس! اور یہ تمہاری عادت ہے۔''

تھوڑے دنوں میں سعیدہ' جمال کے خیالوں سے دور کسی جنگل میں جا بیٹھی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

CSCSCSCSCSCSCSCSCSCS



## باب 18

اخبار میں سب کو معلوم تھا کہ بمبئی والے سید صاحب جو ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکریٹری بھی تھے، مہاجر بن کر پاکستان آگئے ہیں اور انقلاب کی تیاری کر رہے ہیں مگر یہ کسی کو پتہ نہ تھا کہ کلکتے میں تقسیم ہند کے بعد کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا نے تقسیم ہند کا کیا تجزیہ کیا تھا۔

کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کے بعض اکابرین سے جمال کی شناسائی تھی اور سید صاحب بھی اسے پہچانتے تھے۔ لاہور میں ان کے جاننے والے بہت کم تھے مگر لاہور کے ادبی حلقوں میں سید صاحب کا بہت احترام تھا اور کیمونسٹ پارٹی کی طرف بھی سب امید بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان میں صرف کیمونسٹ پارٹی تھی جس نے پاکستان کی حمایت کی تھی اور اس کے کارکن سوہن سنگھ جوش اور دادا منصور نے انتخابات کے زمانے میں مسلم لیگ کی پبلسٹی کا دفتر سنبھالا تھا اور دانیال لطیفی نے پاکستان کا منشور لکھا تھا۔ فسادات کے باوجود تیجا سنگھ سوتنتر کیس کٹوا کر پاکستان میں رہنا اور یہاں کے مزدوروں، کسانوں کو منظم کرنا چاہتا تھا مگر تقسیم پنجاب کی وجہ سے بات بگڑ گئی تھی اور اب کیمونسٹوں پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان پر بھروسہ کیوں نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس لیے کہ کلکتہ کانفرنس جس میں کیمونسٹ پارٹی آف پاکستان قائم کرنے کا فیصلہ ہوا تھا، تقسیم ہند کو انگریزوں کی سازش کا نتیجہ سمجھتی تھی۔ اگر سنٹرل کمیٹی میں ہندوستان کی تاریخی مادیت اور طبقاتی جدلیات کا کوئی نکتہ ور ہوتا تو سمجھ جاتا کہ ہندوستان کی تقسیم دراصل برطانوی ہندو سرمائے کے گٹھ جوڑ، جس کے مہاتما گاندھی نمائندہ تھے اور ان کے سناتن دھرمی رام راجیہ کے خواب کا نتیجہ تھی، جس میں ابھرتے ہوئے مسلمان سرمایہ داروں کے وجود کی کوئی گنجائش نہ تھی اور اس محاذ پر محمد علی جناح اُن کے حریف تھے جو اونچے مسلمان طبقے کے نمائندہ تھے۔ پنڈت نہرو مہاتما جی کے برابر کے شریک کار تھے۔ انگریز تو آخر دم تک کوشش کرتے رہے کہ ہندوستان ایک رہے اور جناح نے بھی کیبنٹ مشن پلان مان لی تھی مگر پنڈت نہرو نے اس کو تسلیم کرنے کے بعد اس سے انکار نہ کیا ہوتا تو ہندوستان ایک واحدے کی شکل میں رہ سکتا تھا۔ یہ بات کیمونسٹ پارٹی کے اکابرین سے چھپی نہ تھی مگر ان کی ہندو عصبیت نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور وہ کانگریس کے طویل پروپیگنڈے کی وجہ سے جناح کو برطانوی ایجنٹ سمجھ کر تقسیم ہند کو انگریزوں کی حرام زدگی

سمجھتے رہے اور آج بھی وہ اسی طرح سوچ رہے ہیں۔ ہندو اور مسلمان کے طبقاتی تضاد کو انہوں نے مذہبی تضاد سمجھ لیا اور اس میں قائد اعظم کی وفات کے بعد پاکستانی حکمرانوں کے سیاسی مفادات کو بھی بڑا دخل ہے، جو کہتے ہیں کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا۔ یعنی اس پر حق حکومت صرف مولویوں اور جاگیرداروں کو ہے۔

مذہبی منافرت کی جو فضا پیدا ہو چکی تھی اس میں کسی غیر مسلم کا خاص طور پر کسی سکھ کا پاکستان میں رہ کر کوئی انقلابی کام کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے تیجا سنگھ سوتنتر اور دیگر غیر مسلم انقلابی ترک وطن کر گئے تھے۔

پرانے کمیونسٹوں میں فضل الٰہی قربان باقی تھے جو تاشقند کے تربیت یافتہ تھے۔ کامریڈ مجید میر تھے، کامریڈ عبدالسلام تھے، مرزا ابراہیم تھے، بشیر بختیار تھے مگر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کو ان پر بھروسہ نہ تھا۔

## کمیونسٹ پارٹی

سید صاحب کی کمیونسٹ پارٹی نے دادا منصور کو تو قبول کر لیا گرچہ ان کو کارکنوں کی نچلی سطح پر ہی رکھا۔ مرزا ابراہیم ریلوے مزدوروں کے ہندوستان گیر لیڈر تھے مگر ان کو بھی عملی طور پر شریکِ سفر نہ کیا گیا اور آگے چل کر انہیں گرانے کی کوشش بھی کی گئی۔ فضل الٰہی قربان سے تو کسی نے ہاتھ بھی نہ ملایا۔ کامریڈ عبدالسلام اوکاڑہ تک محدود رہ گئے اور اس کی بھی وجوہات تھیں۔ یہ لوگ باکردار کمیونسٹ تھے۔ انہوں نے بڑی قربانیاں دی تھیں مگر وہ پاکستانی قومیت پر یقین رکھتے تھے اور پنجابی تھے۔

شروع میں تو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا پاکستان کو پسماندہ علاقوں کے عوام کے حق خود ارادیت کے حوالے سے جائز سمجھتی تھی مگر جولائی میں جب پنڈت نہرو نے مسلم لیگ کی قراردادوں کے برعکس پنجاب اور بنگال مذہبی بنیادوں پر تقسیم کروانے کا فیصلہ کروا لیا اور ماسٹر تارا سنگھ اور سردار پٹیل نے مذہبی جنون کی آگ بھڑکا دی تو برٹش لیبر پارٹی نے جو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی نظریہ ساز تھی، رجنی پام دت کو ہندوستان بھیجا تا کہ ہندوستان کی تقسیم رکوائی جائے' مگر جولائی میں پانی پلوں کے نیچے سے بہہ کر معصوم خون کے سمندر میں گر چکا تھا اور اب کچھ نہ ہو سکتا تھا۔

کلکتہ کانفرنس میں یہ بھی فیصلہ ہوا تھا کہ دوبارہ ہندوستان کو متحد کر لیا جائے۔ وہیں سید صاحب کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے جنرل سیکریٹری مقرر ہوئے تھے۔ وہیں پارٹی بنی تھی اور قدرتی طور پر اس کے عہدیدار وہی لوگ تھے جن پر بمبئی کی پارٹی بھروسہ نہ کر سکتی تھی۔

پارٹی قیادت میں ایک آدھ ہی پنجابی تھا۔ باقی سب اردو بولنے والے تھے جو بنیادی طور پر ادیب تھے۔ ان کا طور طریقہ اپر مڈل کلاس کا تھا۔ رویہ ان کا جاگیردارانہ تھا اور اس کی وجہ ان کا یوپی کا تہذیبی اور معاشرتی پس منظر تھا۔ اس پس منظر کو گود میں بٹھا کر وہ پاکستان کے سندھی، بلوچی، پٹھان اور پنجابی مزدوروں اور کسانوں کو بظاہر طبقاتی انقلاب کے لیے اور اصل میں ہندوستان کو دوبارہ متحد کرنے کے لیے آئے تھے۔

مزید یہ کہ مشرقی پاکستان کے برعکس کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان تنظیمی طور پر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے



ماتحت رہی یعنی اس کی پالیسیاں اور رویئے پاکستان سے نہیں بلکہ بمبئی سے تشکیل پاتے تھے مگر مشرقی پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کو آزاد اور الگ رکھا گیا۔ اس کا کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس طرح بنگلہ دیش کی بنیاد بھی رکھ دی گئی تھی۔

اب یہ بات کہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا مقصد پاکستان کا خاتمہ کرنا ہے، کھلے عام کہی نہ جا سکتی تھی۔ اس کے مقامی کارکن پاکستانی قومیت کے ابھار کا بہتر ادراک رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ تاریخ کا پہیہ موڑا نہیں جا سکتا۔ اس لیے ان پر بھروسہ نہ کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ کمیونسٹ پارٹی کے اصولوں کے برعکس سینٹرل کمیٹی کے اندر ایک خفیہ صیغہ بن گیا جس کی رکنیت صرف ہندوستان سے آنے والے آزمودہ کمیونسٹوں اور سید صاحب کے ذاتی دوستوں اور حواریوں تک محدود تھی۔ بنیادی پالیسیاں بمبئی سے آتیں جن پر اندرونی کمیٹی غور کر کے سنٹرل کمیٹی کو پیش کر دیتی اور ارکان سے کانوں کان کہہ دیا جاتا کہ یہ سید صاحب کا حکم ہے، پھر کوئی بول نہ سکتا تھا۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور رویہ کمیونسٹ پارٹی میں پیدا ہو گیا اور وہ تھا مقامی کارکنوں پر شک، دوستوں پر شک اور ہر ایک پر شک۔

سید صاحب ابنِ مقنع کی طرح برقعے میں رہتے تھے۔ حالانکہ وہ خوبصورت اور دلدار آدمی تھے مگر چونکہ وہ ایک سازشی گروہ کے لیڈر تھے، اس لیے زیادہ تر انڈر گراؤنڈ ہی رہتے تھے۔ وہ پارٹی کے عام کارکنوں کو ہدایت کرتے کہ کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کی تاریخ پڑھو۔ مارکس کے پیچھے زیادہ نہ پھرو کیونکہ اگر تم انٹلیکچوئل بن گئے تو مزدوروں، کسانوں میں کام نہیں کر سکو گے۔ ہندوستان کی تاریخ اس کی زراعت، صنعت اور دستکاری پر انہوں نے کبھی کسی کو متوجہ نہ کیا۔

مگر کمیونسٹ پارٹی کی عزت بہت تھی۔ ایک تو اس کے بعض ارکان اعلیٰ پائے کے ادیب تھے، دوسرے وہ طبقاتی انقلاب کے علمبردار تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ عام پاکستانیوں کی طرح بھوکے ننگے تھے۔ پائپ پیتے تھے مگر تمباکو اس میں چلم کا ڈالتے تھے۔ انگریزی ٹوپ پہنتے تھے مگر زیادہ تر گنجے تھے اور پتلونیں اس زمانے میں بھی لنڈے بازار سے مل جاتی تھیں جو روز بروز دھلوانی بھی نہ پڑتی تھیں۔ وہ انگریزی بولتے تھے مگر باتیں ان کی بڑی میٹھی ہوتی تھیں۔ ان کا بڑا گلیمر تھا۔ ان کی منفرد شناخت تھی۔ وہ اشاروں کنایوں میں بھی بات کر جاتے تھے اور چائے خانوں میں بیٹھ کر انقلاب کی آمد کی تاریخیں بھی بتا دیتے تھے۔ وہ بڑے بھلے مانس لوگ تھے۔ آخری تجزیئے میں انہوں نے پاکستان کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ انقلاب کا بیڑا انہوں نے خود غرق کیا کیونکہ وہ ایک انقلابی پارٹی کے بجائے جو مزدوروں، کسانوں اور دیگر محنت کشوں کی حکمرانی کی جدوجہد کرتی ہے، ایک سازشی گروہ میں ڈھل گئے۔ پاکستان صحیح بنا تھا یا غلط، اسے انگریزوں نے بنایا تھا یا قائد اعظم نے۔ یہ گاندھی کے رام راجیہ کا ردِعمل تھا یا ہندوستان کے مسلمانوں کی چیخ، اب سوچنا بیکار

تھا۔ لینن نے کہا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کو جیسا بھی اس کا ملک ہو، اس کی حدود میں رہ کر طبقاتی انقلاب لانے کی کوشش کرنی ہے، مگر لینن کو پڑھا کس نے تھا۔

## فردِ جرم

اخبار میں جتنے بھی لوگ بھرتی ہوئے تھے جمال کے سوا سب کے سب سفارشی اور اہلِ زبان تھے، جو زیادہ تر کمیونسٹ پارٹی کے اہم ارکان کے بھائی بھتیجے تھے کیونکہ پارٹی ان پر بھروسہ کر سکتی تھی۔ اہلِ زبان ہونا سونے پر سہاگہ والی بات تھی' کیونکہ مولانا کے نزدیک زبان کی صحت پنجابیوں کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ اس کے باوجود کہ ان کی اپنی مادری زبان اردو نہ تھی' پھر وہ مولانا ظفر علی خان کو اردو کا سب سے بڑا زبان دان سمجھتے تھے جو خالص پنجابی تھے۔ پنجاب نے اردو زبان کی بڑی خدمت کی تھی اور اگر اردو میر و غالب پر ختم نہیں ہوگئی تو اس کی وجہ پنجاب ہے' مگر مولانا پنجابیوں کو مانتے نہ تھے۔

جمال کو انہوں نے اس کی صاف گوئی، پھرتی اور شوخی کی وجہ سے ملازم رکھ لیا تھا اور اس نے ان سے وفاداری بھی خوب نبھائی تھی مگر مولانا کمیونسٹ پارٹی سے بہت ڈرتے تھے حالانکہ وہ خود کمیونسٹ نہیں تھے۔ ایک صاحب طرز ادیب اور طنز نگار تھے جس کو صحافت سے عشق ہوگیا ہو۔ وہ جانتے تھے کہ اخبار پر میری ادارت کمیونسٹ پارٹی کو پسند نہیں اور کمیونسٹ پارٹی اخبار کے مالک پر نظریاتی قدرت رکھتی ہے۔ میاں افتخار کو کلکتہ کانفرنس کی قراردادوں کا پتہ ہوگا' مگر وہ یہ نہ جانتے تھے کہ اس کا پاکستان میں مشن کیا ہے۔ وہ اخبار میں مداخلت نہیں کرتے تھے کیونکہ مولانا نے ایک ایسا اخبار نکال کر دکھا دیا تھا جس نے اردو تو کیا انگریزی صحافت کا بھی دھرا بدل دیا تھا اور اب وہ ناگزیر ہو گئے تھے مگر ان کو خود پر کبھی اعتماد نہ ہوا اور وہ اپنے رعب داب اور اپنی مسلمہ قابلیت کے باوجود لرزاں ہی رہے۔

## جاسوسی کا الزام

جمال سے ان کے تعلقات میں محبت اور نفرت کا امتزاج تھا۔ وہ اس کی شوخی اور بے باکی سے شاکی رہے۔ اس لیے جب انہیں پتہ چلا کہ کمیونسٹ پارٹی کے ایک مہاجر دوست کا مسودہ دفتر سے گم ہوگیا ہے تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ کمیونسٹ پارٹی کے لوگ جو اخبار میں آتے جاتے تھے اور جن سے جمال اوکھے تیکھے سوال کیا کرتا تھا، چاہتے تھے کہ جمال کسی طرح نکل جائے اور ہمارا کوئی بھائی بھتیجا اس کی جگہ پر آ جائے۔ مسودے کی گمشدگی کا انہوں نے جمال پر الزام دھرا۔ اس کے مہاجر مصنف سرکاری ملازم تھے اور اسی دفتر میں کام کرتے تھے جس میں مفتی ملازم تھا۔ جمال اسی کے گھر میں رہتا تھا۔

کہا یہ گیا کہ جمال جاسوس ہے اور گمشدہ مسودہ اس نے چوری کر کے حکومت کو پہنچا دیا ہے تاکہ بائیں بازو کے اس نابغے کو گرفتار کرایا جا سکے جس نے یہ مضمون لکھا تھا۔ اس میں کوئی باغیانہ بات نہ تھی۔ قائداعظم ابھی زندہ تھے اور کسی میں ہمت نہ تھی کہ وہ آزادیٔ اظہار پر کسی کو گرفتار کر سکے مگر کہنے والے کو کون



روک سکتا ہے۔ جب وہ پیٹھ پیچھے چغلی کھائے۔ یہ بات دفتر میں پھیل گئی کیونکہ پارٹی لائن یہی تھی اور کچھ ارکان کو اہلِ زبان کی عصبیت بھی اکساتی تھی کہ وہ جمال جیسے بے مہار پنجابی کی دریدہ دہنی سے چھوٹ جائیں اور ان کی جگہ کمیونسٹ پارٹی کے بھروسے کا کوئی اہلِ زبان آ جائے۔

جب کھسر پھسر بہت بڑھ گئی تو جمال نے سوچا، میں مولانا سے بات کروں۔

مولانا بیچارے پہلے ہی ڈرے بیٹھے تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ دفتر کے بعد جمال مولانا کی ساقی گری کرتا ہے۔ ہیرا منڈی گانا سننے جاتے ہیں تو جمال ان کا ہم جلیس ہوتا ہے۔ سب کو معلوم تھا کہ اگرچہ دفتر کے اوقات میں مولانا جمال کو ڈانٹ پھٹکار کرتے رہتے ہیں مگر اِدھر سورج ڈھلا اُدھر جمال کو ساتھ لے کر وہ دشتوں کو چل دیتے۔ اب وہ یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ میرا جمال سے کوئی تعلق نہیں۔ میری جان بخشی ہو جائے۔

انہوں نے کہا "لوگ کہتے ہیں تو کوئی بات تو ہوگی مولوی صاحب!"

"مگر آپ تو مجھے جانتے ہیں، کیا ایسا ممکن ہے؟"

بولے "مگر وہ مضمون دفتر سے غائب کیسے ہوگیا؟"

"مجھے کیا پتہ؟"

"آپ اپنے دوست مفتی کے ہاں رہتے تھے۔"

"جی اب بھی رہتا ہوں۔"

"یہ مضمون ان کے ذریعے آپ نے حکومت کو دے دیا ہوگا۔"

مولانا کا استدلال بیہودہ تھا۔ جمال نے فوراً استعفیٰ لکھ دیا۔

ہفتے بھر کے بعد اخبار کا حیدرآبادی اسسٹنٹ ایڈیٹر جمال کو راستے میں ملا تو اس نے کہا "یار جمال تم بہت جلد باز ہو، تم نے استعفیٰ کیوں دے دیا۔ مضمون تو میرے کاغذوں میں دب گیا تھا، واپس آ جاؤ۔"

"اب نہیں۔ کبھی نہیں۔" جمال نے جواب دیا۔

"بھوکے مرو گے۔ نوکری ہے کہاں۔"

"نہ ملے اور بھوکا تو میں مرنے کا عادی ہوں۔"

اصل میں اس بیچارے کو جمال کے خلاف سازش کا علم نہ تھا۔ یہ کرامات پارٹی کے اندرونی گل رخوں کی تھی۔

## جگہ مل گئی

جمال کو بھوکا مرنا نہ پڑا۔ ایک مشہور ادارہ اپنے اردو روزنامے کے ساتھ ساتھ ایک ہفتہ وار پرچہ نکالنے کی سوچ رہا تھا۔ جمال کو اس میں جگہ مل گئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ صاحب جن کے مضمون کی چوری کا الزام جمال پر لگا تھا، کنٹریکٹ ختم ہونے پر سرکاری محکمے سے فارغ ہو گئے تو انہیں بھی وہیں رکھ لیا گیا۔ تیسرے

بزرگ ایک افسانہ نگار تھے جن کا خیال تھا کہ میں نفسیات میں کمال رکھتا ہوں۔

پرچے کے مالک پرانے مسلم لیگی تھے اور مسلم لیگی لیڈروں کو جو اس زمانے میں برسرِ اقتدار تھے، ان کی حمایت کی ضرورت تھی۔ اس لیے کہ وہ ایک طاقتور شخص تھے۔ اخبار نویس بھی اچھے تھے مگر وہ بنیادی تبدیلیوں کی بات نہ کرتے تھے۔ اس لیے راج پاٹ میں دخیل تھے۔

مولانا کے اخبار سے حکومت نفرت کرتی تھی کیونکہ وہ جاگیرداری کے خاتمے، استعمار سے نجات، سوشلسٹ ملکوں سے دوستی اور ایشیائی لاطینی امریکی اور افریقی قوموں کے اتحاد کا علمبردار تھا۔ وہ پاکستان پر یقین رکھتا تھا اور اس پر کیمونسٹ پارٹی کے رفیق کو جس کا مسودہ گم ہو گیا تھا، اب کوئی اعتراض نہ ہوا اور نہ پارٹی نے انہیں ایک رجعت پسند اور مسلم لیگی اخباری نوکری سے روکا۔ ان کے کردار پر شبہ نہ کیا جا سکتا تھا کیونکہ وہ اردو بولتے تھے اور بقول ان کے وہ بھی لٹ پٹ کر آئے تھے۔

## غنڈہ گردی

جمال دفتر سے نکلا تو گلزارے نے اس کا راستہ روک لیا۔ اس نے لیڈی ہملٹن کی سبز قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کا دایاں کان ٹوٹا ہوا تھا۔ اس کے بازو لمبے اور ہاتھ بڑے بڑے تھے۔

''جمال کون ہے جی؟'' اس نے کہا ''اس سے اک بات کرنی ہے۔''

جمال اس کے لہجے سے سمجھ گیا کہ میں نے دو روز پہلے لاہور کے سب سے قدیم اور بڑے مزار کی آمدنی پر پلنے والے مجاوروں کی حرام کاری پر ایک فیچر لکھا تھا۔ ایک رات وہ ان کے حلقہ خاص میں گزار کر آیا تھا اور اسے اندر کے بھید، آمدنی کی تقسیم اور آمدنی کے استعمال کا علم ہو گیا تھا۔

وقف کی آمدنی میں سے شراب خوری، جوئے، چرس فروشی اور رنڈی بازی کی ساری داستان اس نے اپنے نام سے لکھ دی تھی تاکہ عقیدت مند مزار پر سلام کو آئیں تو پیسے نہ لٹائیں اور خیرات کرنے پر تلے ہوئے ہوں تو یتیموں، بیواؤں کی مدد کریں۔

گلزارا ایک ہٹا کٹا اور زشی مجاور اب اس کی گردن ناپنے کے لیے آیا تھا۔

جمال نے کہا ''میں اندر دیکھ کر بتاتا ہوں کہ وہ ہے یا چلا گیا ہے۔''

اندر جا کر اس نے اپنے مینجنگ ایڈیٹر کو خبر کی۔ اس نے ایڈیٹر کو فون کیا۔ ایڈیٹر نے ڈی ایس پی سے رابطہ قائم کیا۔

تھوڑی دیر میں سپاہی آ گئے اور گلزارے کو سمجھا بجھا کر لے گئے۔

مگر جمال غنڈوں کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ پولیس اس کی حفاظت کی ضمانت نہ دے سکتی تھی اور کوئی واردات ابھی ہوئی نہ تھی کیونکہ پولیس تو واردات کے بعد ہی حرکت میں آتی ہے۔

دفتر سے نکل کر اسے سیدھا بیڈن روڈ کے بابو بدمعاش کے پاس جانا پڑا۔ بابو بدمعاش نے



گلزارے کی طرف آدمی بھیج دیا کہ جمال ہمارا آدمی ہے۔ اگلے ہی روز گلزارے نے دفتر میں آ کر جمال سے معافی مانگی اور کہا کہ بندہ ہتھ بندھا غلام ہے۔

## پبلک سیفٹی ایکٹ

جمال کے دن بڑے مزے سے گزر رہے تھے۔ اس نے ہفتہ وار اخبار کو پہلی مرتبہ ہفتہ وار اخبار کی طرح چلایا۔ پہلے یہ رواج تھا کہ ہفتہ وار اور ماہوار پرچوں میں مواد تو ایک جیسا ہوتا تھا اور لکھنے والے شوقیہ لکھتے تھے مگر سائز کا فرق ہوتا تھا۔ جمال نے سارا پرچہ سٹاف کے لکھے پر مرتب کرنا شروع کر دیا جو ہفتہ وار پرچے کی خصوصیت ہوتی ہے۔ اس میں نئے نئے کالم اور نئے نئے زاویے متعارف کرائے اور پہلی مرتبہ اردو میں پنجابی شاعری کو چھاپنا شروع کیا۔ پرچے کا رنگ ایسا تھا کہ لوگ پڑھنے لگے اور جمال کی شہرت اور اچھی ہو گئی۔

حکومت کے حکمران دھڑے کے اخبارات دوسرے دھڑے کی مخالفت کرتے تھے۔ دونوں دھڑوں میں کوئی اصولی اختلاف نہ تھا۔

برسرِ اقتدار دھڑا اطمینان سے حکومت کر رہا تھا مگر اندر خانے سازشیں جاری تھیں۔ تنقید ہونے لگی تھی جسے حکمران پسند نہ کرتے تھے۔ ان کو بائیں بازو کے دانشوروں، طالب علموں اور مزدوروں سے بھی خوف آتا تھا جو بنیادی تبدیلیوں کی بات کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے پبلک سیفٹی ایکٹ کے نام سے ایک نیا قانون نافذ کر دیا جس کے ذریعے وہ ہر تحریر پر گرفت کر سکتے تھے۔ حکومت سمجھتی تھی کہ جو لوگ عوام کی بات کرتے ہیں وہ پاکستان کے وفادار نہیں۔ وہی لوگ پاکستان کے وفادار ہو سکتے ہیں جو بھیڑ بکریوں کی طرح خاموش ہیں۔ جمال نے جو اوپر کی سازشوں سے بے خبر تھا، اس پر سخت تنقید کی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اخبارات جو کہتے ہیں کہ ہم ریاست کا چوتھا ستون ہیں، دراصل حکومت کا چوتھا ستون ہوتے ہیں اور اقتدار کی جنگ میں اپنے گھوڑے بڑھاتے ہیں۔

اور عوام کالا نام کو لدو جانور ہی سمجھتے ہیں۔

اخبار کے مالک نے جمال سے بڑا شریفانہ سلوک کیا۔ پبلک سیفٹی ایکٹ ان کے دھڑے کے حکمران نے بنایا تھا اور وہ اس کے آگے شرمندہ نہ ہونا چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا ''اخبار میں چھاپ دو، ہم سے غلطی ہوئی۔'' مگر جمال نہ مانا۔ اس کے دونوں ساتھی بھی نہ مانے۔ تینوں نے کہا ''ہمارا نام پرچے پر چھپتا ہے، ہم تھوک کر نہیں چاٹیں گے۔''

مالک نے کہا ''اچھا میرے نام سے معذرت کر دو۔''

جمال نے کہا ''نہیں۔'' اس کے ساتھی نے جس کے مضمون کی گمشدگی کے الزام میں جمال نے مولانا کے اخبار سے استعفیٰ دیا تھا، کہا ''کبھی نہیں جناب۔''

اگلے روز جمال اور اس کے ساتھی کی میز پر ایک لفافے میں تنخواہ اور شکریے کی چٹھی پڑی تھی۔ میرا

نفسیات دان ساتھی رات کو مالک کے بنگلے کو سلام کر آیا تھا۔

## دوسرا تھپڑ

چند دن اسی طرح گزر گئے۔ ترقی پسند مصنفین نے جو کمیونسٹ قیادت کے قریب تھے اور زیادہ وقت شعر کہنے اور انقلاب کا حقہ پینے میں گزارتے تھے، جمال کی اصول پسندی کی بڑی تعریف کی۔ جمال کو بھی پتہ نہ چلا کہ میں بیروزگار ہو گیا ہوں کیونکہ فوراً ہی ملک صاحب کے اخبار نے اسے بلا لیا۔

یہ اخبار دوسرے دھڑے کا ترجمان تھا اور نئی سوسائٹی کے تقاضوں کو بالکل سمجھتا نہ تھا۔ جمال کی ناتجربہ کاری اس کے لیے قابلیت ثابت ہوئی۔ اس نے اخبار میں بھی بڑی جدتیں پیدا کیں۔ ایڈیٹر اور مالک تو بہت خوش ہوئے مگر باقی ساتھی ان کی جان کے دشمن ہو گئے۔

سب سے زیادہ اخبار کا چیف رپورٹر، جو کسی زمانے میں لاہور میں ہاکر ہوتا تھا۔ آدمی ذہین تھا۔ جلد سمجھ گیا کہ اخبار نویسی اصل میں ایک لیڈر کی خوشامد اور دوسرے کی کردار کشی کا کھیل ہے اور اگر حکمران دھڑے کو خوش کر لیا جائے تو من کی مراد مل جاتی ہے۔

اس کے من کی مراد دو مربعے زمین تھی۔ وہ بنیادی طور پر گوجر تھا۔ زندگی اس نے بھینس دوہنے اور گلی گلی دودھ بیچنے سے شروع کی تھی۔

پہلا حکمران دھڑا پلٹا کھا چکا تھا اور اب دوسرا دھڑا حکمران تھا۔ چیف رپورٹر اور اخبار کے مالک اس کے حواری تھے۔ سیاست ان کی یہیں تک محدود تھی۔

ملک صاحب کو صرف سرکاری اشتہارات اور پبلک ریلیشنز کے ذریعے خفیہ رقوم سے دلچسپی تھی۔ نظر وہ ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی جائیدادوں پر بھی رکھتے تھے۔ مہاجر نہیں تھے مگر اچھی طرح جانتے تھے کہ اخبار کے ذریعے کیا کیا فائدے اٹھائے جا سکتے ہیں۔

جمال نے کوشش کی کہ وہ اخبار کو کسی اصولی اور قابل احترام پالیسی پر لائے مگر گوجر چیف رپورٹر وزیراعظم پنجاب کی کوٹھی پر سلامی کے لیے باقاعدہ جاتا تھا۔ اس لیے بھی اس کی اخبار میں بڑی اہمیت تھی۔ اس نے جمال کو مسلسل طنز اور طعنہ زنی کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔

گوجر چیف رپورٹر نے ابھی پنجاب کے وزیراعظم کی سفارش سے سندھ کے وزیراعظم سے دو مربعے زمین مفت حاصل نہ کی تھی۔ ابھی وہ اس کی تگ و دو میں تھا۔ جمال کے لیے زندگی اس نے مشکل کر دی، کیونکہ دفتر کے دیگر لوگ اس سے ڈرتے تھے۔

## پھر وہی دشمن ایمان و آگہی

ایک دن جب وہ ایڈیٹوریل لکھ کر فارغ ہوا تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ''میں سعیدہ ہوں اے دشمن جان! دیکھو میں نے تمہیں یہاں بھی ڈھونڈ نکالا۔''



''دشمن جان تو تم ہو۔'' جمال نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ ''کہو کیا حال ہے۔''

وہ بولی ''میرے سوا تمہیں پوچھتا کون ہے۔ شکر کرو......''

''شکر کرتا ہوں۔'' جمال نے جواب دیا۔ ''مگر تم بھی کب یاد کرتی ہو۔''

''ایمان سے کبھی نہیں بھلایا تمہیں مگر تم کسی جگہ ٹکو بھی۔''

''ہاں یار نوکری بڑی ذلیل چیز ہے۔''

''میری نوکری کرو تو تمہارے سر پر مکٹ سجاؤں۔ دل پر راج کراؤں اور ہر دم مورچھل کیا کروں۔''

''جانے دے یار۔'' جمال شرما کر بولا۔

''میرے پاس آؤ تو تمہیں چائے اور پیار دوں، ابھی آ جاؤ۔ مجھے تم سے کام بھی ہے۔ نہیں ابھی نہیں۔ سات بجے جب ذرا سورج ڈھلے اور عقل کی چادر میلی ہو جائے۔''

شام کے سات بجے سعیدہ پورچ میں کھڑی تھی۔ اس نے چھوٹے بلاؤز والی پیلی ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ اس کے گول گول بھرے بھرے کولہوں کی ڈھلانیں واضح ہو رہی تھیں۔ وہ جمال کو بغل میں لے کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔ بولی ''حق کو اچانک کراچی جانا پڑ گیا۔ وہاں لائسنس کی اچھی قیمت مل جاتی ہے۔ اس لیے میں نے سوچا، میں شام کیوں خراب کروں۔ کچھ تم جلو کچھ ہم جلیں تو روشنی ہو۔ مگر ایک پیگ وسکی کا پیو پہلے۔''

سعیدہ الماری میں سے سکاچ کی بوتل نکال لائی۔

جمال حق کو موجود نہ پا کر کسی قدر پریشان ہو گیا تھا مگر تین پیگ پی کر اس کی پریشانی جاتی رہی۔ حرف مطلب پر پہنچنے کے خیال سے اس نے کہا ''حق بہت عمدہ آدمی ہے سعیدہ!''

''بے شک۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔''

''اور تم؟'' جمال نے پوچھا۔

''میں بھی بہت چاہتی ہوں اسے۔ وہ میرا خاوند نہیں دوست ہے۔''

''اور میں؟''

''تم صرف دوست ہو۔ خاوند نہیں اس لیے تم زیادہ پیارے ہو۔''

جمال نے سعیدہ کے گال پر چٹکی بھری۔ سعیدہ نے مسکرا کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''اور وہ کام کیا تھا جس کے لیے تم نے مجھے بلایا تھا؟'' جمال نے خفت مٹانے کے خیال سے پوچھا۔

## پاکستان کی خدمت

''کوئی خاص نہیں۔ تمہیں پتہ ہے کہ میں پاکستان کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔ غریبوں کی، بے

سہاروں کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔ اس لیے مجھے سیاست میں دلچسپی ہے۔''

''پتہ ہے۔'' جمال نے کہا۔

''مگر مسلم لیگ کی بیگمات مجھے آگے نہیں آنے دیتیں۔'' سعیدہ مایوس ہو کر بولی۔

''بڑی خراب ہیں جاگیردارانیاں ساری کی ساری!'' جمال نے جواب دیا۔ ''سب کی سب موقع پرست!''

''سب کی سب۔ پاکستان سے دراصل انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ بیگم لیاقت علی خان کے آگے پیچھے پھرتی ہیں۔ یہی ان کا کام ہے۔''

''میں خوب جانتا ہوں۔'' جمال بولا۔

## سیاسی کارکن

سعیدہ نے جلدی سے پیگ بنایا اور بولی ''میں اتنا کام کرتی ہوں۔ کیمپوں میں جا کر نادار عورتوں میں کپڑے تقسیم کرتی ہوں۔ راشن بانٹتی ہوں' مگر میری خبر نہیں چھپتی کسی اخبار میں۔ حالانکہ تم وہاں بیٹھے ہوئے ہو۔ اگر میری خبر نہ چھپے گی، میرا بیان نہ آئے گا تو کیسے پتہ لگے گا بیگم صاحبہ کو میری خدمات کا۔''

''اچھا؟'' جمال نے حیرت سے کہا ''تو پہلے کیوں نہ مجھے کہا تم نے؟''

''اب کہہ رہی ہوں نا۔ رپورٹر بڑے طاقتور ہوتے ہیں۔ جس کو چاہیں بنا دیں، جس کو چاہیں تباہ کر دیں۔''

''تو بیان لکھ دو کوئی۔ کیا کہنا ہے تمہیں۔'' جمال نے پیگ خالی کر کے کہا۔

''تمہی بتاؤ کہ مجھے کیا کہنا ہے۔'' سعیدہ بولی۔

''سیاسی لیڈر تم ہو کہ میں؟'' جمال نے کہا۔

''بیگمات کے بیان رپورٹر ہی لکھتے ہیں۔ تمہیں لیڈروں کا بیان تو لکھنا آتا ہی ہوگا!''

پھر سعیدہ نے کہا ''لکھو پاکستان کے دانشوروں کو عوام کی راہنمائی کرنی چاہیے۔'' یہ فضول بات تھی مگر جمال نے لکھ دی۔ سیاستدانوں کے اکثر بیان فضول ہی ہوتے ہیں۔

سعیدہ نے پڑھ کر کہا ''اس سے بہت فائدہ ہوگا میری سیاست کو' مگر میرا خیال ہے کہ ایک بیان کافی نہیں۔ کچھ اور بھی ہونا چاہیے۔''

''اور کیا؟'' جمال نے پوچھا۔

''میری تصویر بھی چھپنی چاہیے۔ جب میں بے سہارا عورتوں میں کپڑے تقسیم کر رہی ہوتی ہوں۔ میرے پاس پورا البم ہے۔''

''پھر تو تمہاری دو چار تصویریں بھی چھپ سکتی ہیں۔'' جمال نے زور دے کر کہا۔ ''پورے صفحے کا فیچر بھی لکھا جا سکتا ہے تم پر۔''



''یہی تو میں چاہتی ہوں بدھو۔'' سعیدہ نے ادا سے مسکرا کر کہا۔

''ہو جائے گا اور مانگو کیا مانگتی ہو۔'' جمال نے ایک جھوٹے نبی کی شان سے کہا۔

''میں چاہتی ہوں کہ ملک میں میرا نام گونجے اور بیگم لیاقت علی کو بھی کچھ پتہ چلے۔ اپوا کی بیگمات سعیدہ حق کو دیکھ کر جلیں، اس میں حق کو بھی فائدہ پہنچے گا۔''

''حق کو کیا فائدہ پہنچے گا سعیدہ؟''

''بیویوں کو خاوندوں کے کاروبار میں ان کی مدد کرنی چاہیے۔ وہ بیچارہ کیا کر سکتا ہے میرے بغیر؟''

حق کے نام سے جمال کے دو پیگوں کا نشہ ہرن ہو گیا۔ وہ اس وقت اس رقیب روسیا کا نام لینا نہ چاہتا تھا۔ ''حق بہت اچھا آدمی ہے۔'' اس نے کہا۔

''بہت اچھا۔'' سعیدہ بولی۔

جمال نے سنجیدہ ہو کر پوچھا ''حق کو پتہ چلے گا کہ تم نے اس کی عدم موجودگی میں مجھے شراب پلائی تو کیا وہ برا نہ مانے گا؟ مردوں میں رقابت بہت ہوتی ہے۔ اس کو کوئی شک پڑ سکتا ہے۔''

''شک پڑ بھی جائے تو وہ برا نہیں مانے گا۔ اس کو پتہ ہے کہ تم میرے پیارے دوست ہو۔ خطرناک آدمی نہیں ہو۔''

''مگر سعیدہ میں خطرناک ہو سکتا ہوں۔ عذر مستی رکھ کر ہی سہی!''

''یہ تو میں جانتی ہوں۔ وہ تمہیں اتنا نہیں جانتا جتنا میں جانتی ہوں۔ میں تمہاری بھوکی نگاہوں کو پہچانتی ہوں۔ مجھے اچھا لگتا ہے تمہارا للچا کر میرے انگ انگ کو دیکھنا۔ میری نسائیت کو تقویت ملتی ہے تم سے۔''

''اور اگر میری مردانگی کو بھی تقویت مل گئی تو؟''

''یہ کوئی ایسی بری بات بھی نہ ہو گی۔'' سعیدہ نے لہرا کر کہا ''پکڑ لے پھر قوت تمہاری مردانگی۔''

پھر وہ ہنسنے لگی۔ چاندی کے کٹورے بجنے لگے۔ اس کی جرأت نے جمال کو چیلنج دیا تو اس نے اچانک اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنی طرف کھینچا۔

سعیدہ یکدم سنجیدہ ہو کر ہٹ گئی اور غصے سے بولی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''ذرا ساتھ لگ جاؤ پیاری۔'' جمال نے ڈھٹائی سے کہا۔

''کیوں؟'' سعیدہ جھجک کر بولی۔ ''مجھے کوئی ایسی ویسی سمجھا ہے تم نے؟''

جمال یکدم ٹھنڈا ہو گیا۔

وہ بولی ''مجھے اپنے میاں سے محبت ہے جمال۔ میں اس کی وفادار بیوی ہوں مگر تم جیسے معمولی حیثیت کے لوگ دوستانہ شفقت کو پتہ نہیں کیا سمجھ لیتے ہیں۔ پرے ہٹ کر بیٹھو ذرا۔''

تھوڑی سی خاموشی کے بعد جمال نے کہا ''سعیدہ میرے خیال میں مجھے اب چلنا چاہیے۔''

''ابھی نہیں جا سکتے تم۔'' سعیدہ تحکمانہ بولی۔ ''ایک پیگ اور لو۔ موڈ ٹھیک کر کے جانا ہوگا یہاں سے۔''

''نہیں سعیدہ۔'' جمال بولا ''بہت دیر ہوگئی ہے۔ میرا موڈ بالکل ٹھیک ہے۔''

''بکواس کرتے ہو۔'' وہ لاڈ سے بولی ''شکل تم نے بھوکے بندر کی سی بنالی ہے۔ اتنی عمدہ شام گزری ہے تمہارے ساتھ اب کھانا کھا کے جانا اچھے بچوں کی طرح۔''

پھر سعیدہ نے بیرے کو کھانا لانے کا آرڈر دیا اور پہلے کی طرح صوفے پر جمال کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

جمال چپ چاپ بیٹھا گلاس کے کنارے چوسنے لگا۔

''گلاس چوسنے میں تمہیں بہت مزہ آتا ہوگا۔'' وہ شرارت سے بولی۔

''اب گلاس چوسنے کی بھی اجازت نہیں مجھے۔'' جمال نے رونی صورت بنا کر کہا۔

''بلکہ گلاس کھانے کی بھی اجازت ہے۔'' سعیدہ مسکرا کر بولی۔

پھر اس نے گلاس توڑ دیا۔ کانچ کے ٹکڑے پلیٹ میں ڈالے، ان پر نمک چھڑکا اور اس کے آگے رکھ کر بولی ''شوق فرمایئے۔''

جمال کا دل چاہا کہ وہ سعیدہ کے منہ پر چانٹا مار دے۔ اس کی ساڑھی نوچ کر پھینک دے اور اسے پلنگ پر ڈال لے مگر اس میں حرکت پیدا نہ ہوسکی۔

پورچ میں رخصت کرتے وقت اس نے پہلے کی طرح اس کا ہاتھ دبایا اور کہا ''بیان ضرور چھپ جائے اور فیچر کے بارے میں بھی بھول نہ جانا۔ اب جب میں مہاجر کیمپ میں جاؤں گی تو تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گی۔''

## نیا دور

اگلے روز خبر اڑی کہ میاں ممتاز کی حکومت برخاست کر دی گئی ہے۔ ملک صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ انہوں نے میاں صاحب کی حمایت میں غلو کیا تھا۔ اب کدھر جائیں کیونکہ ابھی انہیں میاں صاحب سے خدمات کا انعام لینا تھا۔

وہ نمبر گھماتے چلے جا رہے تھے۔ میاں صاحب کا پرائیویٹ سیکریٹری ہاتھ نہ آتا تھا۔ بڑی مشکل سے نمبر ملا تو انہوں نے چیخ کر کہا ''عثمان یار وہ برف خانے کی فائل نکلی کہ نہیں۔ خدا کے لیے فوراً دستخط کروا لو۔ دیر نہ کرو۔ رسول کا واسطہ میرے بال بچوں پر رحم کرو۔ تمہارا حق تمہیں مل جائے گا قرآن کی قسم۔''

گوجر چیف رپورٹر نے اپنی فائل بروقت نکلوالی تھی اور دو مربعوں کا قبضہ لینے کے لیے میرپور خاص



روانہ ہو چکا تھا۔

جمال نے سعیدہ پر فیچر لکھنے کے بعد اخبار سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کی کوئی فوری وجہ نہ تھی۔ اس کی جیب میں ایک مہینے کی تنخواہ تھی اور گلی میں اندھیرا۔

## بے ہنر شخص

جمال کو اب بھی سمجھ نہ آئی کہ اخبار نویس کو کبھی استعفیٰ نہ دینا چاہیے کیونکہ اخبارات میں خالی آسامیاں نہیں ہوتیں۔ اب لاہور میں کوئی اخبار نہ تھا جس کو اس کی ضرورت ہوتی۔ اس کے ذاتی سیاسی مسلک کی بھی شناخت ہو چکی تھی۔ وہ گلی بازار کا گھٹیا آدمی تھا۔ افسروں اور سیاستدانوں سے نفرت کرتا تھا اور ملک میں بنیادی تبدیلیوں کا علمبردار تھا اور یہ بات کسی کو گوارا نہ تھی۔ اپنا دو ٹکے کا قلم لے کر وہ ایک مار کھائے ہوئے کتے کی طرح گھر بیٹھ گیا۔

دو ماہ بعد شرمندہ اور کمزور ہو کر اس نے اپنے وقار کو پرانے سامان کی طرح گلی میں پھینکا اور ایک مرتبہ اور مولانا چراغ حسن کے پاس گیا۔ اسے نوکری تو نہ ملی مگر سات روپے فی کالم کے بھاؤ پر مضمون لکھنے کی اجازت مل گئی۔ مولانا نے صاف کہہ دیا کہ یاد رہے مضمون ڈیڑھ کالم سے زیادہ نہ ہو۔ ڈیڑھ کالم یعنی ساڑھے دس روپے فی مضمون۔

دو تین مہینے اس طرح بھی گزر گئے۔ مکان کا کرایہ وہ دیتا نہ تھا، سگریٹ وہ چھوڑ سکتا تھا۔ آمد و رفت کے لیے اس کے پاس ایک بائیسکل تھی۔ پینتالیس روپے مہینے میں وہ روکھی سوکھی کھا سکتا تھا مگر پھر جمال کا جوتا ٹوٹ گیا اور جوتا بیس روپے کا آتا تھا۔ بیس روپے اور کمانے کے لیے اس نے ہیڈ کاتب سے سازش کی۔

مولانا مسودے کے حجم کو آنکنے کے لیے ہیڈ کاتب سے مشورہ کرتے تھے۔ ہیڈ کاتب نے جمال کی خاطر ڈیڑھ کالم کے مسودے کو ڈھائی کالم بتانا شروع کر دیا۔

مہینے بھر میں جمال نے جوتا کما لیا اور نئے جوتے میں وہ اِترا اِترا کر بیڈن روڈ پر چلنے لگا۔

## مادری زبان

مولانا جنگ کے زمانے میں میجر بن کر فوجی اخبار نکالنے کے لیے ملایا چلے گئے تھے۔ جنگ کے بعد انہیں جی پی فنڈ کی جو رقم ملی تھی، اسے وہ شراب کباب میں اڑا چکے تھے اور جو تنخواہ ان کو اخبار سے ملتی تھی، اس میں ہیرا منڈی جا کر گانا سننا ممکن نہ تھا۔ یوں بھی پاکستان کے نو دولتیوں کو راگداری کا مذاق نہ تھا۔ اس لیے گانے والیاں گانا چھوڑ کر مجرے کی طرف دھیان دے رہی تھیں۔ پیسہ اب سُر میں نہیں تال میں رہ گیا تھا۔

مولانا کو شام کا وقت صرف چائے پر گزارنا پڑتا تھا اور اس کے لیے انہیں جمال کی رفاقت کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کام کے سوائے اس کا اب کوئی مصرف نہ تھا اور کام وہ اچھا کرتا تھا۔ ایک جگہ خالی ہوئی تو اسے باقاعدہ نوکر رکھ لیا گیا۔

اخبار میں کچھ نئے لوگ آ گئے تھے مگر وہ جن کی شناخت اردو سے تھی، جمال کی اردو واجبی سی تھی اور وہ گھامڑ بھی ایسا تھا کہ مولانا سے بھی پنجابی میں بات کر لیتا تھا۔ اردو مولانا کا مذہبی عقیدہ بن چکی تھی مگر جمال کی ڈھٹائی کے آگے انہوں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے تھے اور وہ بھی جمال کے ساتھ پنجابی بولنے لگے تھے اور اس پر ان کے جاننے والے حیران تھے۔

دراصل مولانا اپنی شناخت کے بارے میں دوبارہ غور کرنے لگے تھے۔ انہوں نے اپنے بچپن کے بارے میں کبھی کسی سے بات نہ کی تھی۔ مگر ان کے پرانے دوستوں کا کہنا تھا کہ پونچھ کے رہنے والے ہیں۔ جمال نے یہ بھی سنا کہ وہ کشمیر کی تحصیل بارہ مولا کے باشندے ہیں مگر کشمیری انہوں نے کبھی نہ بولی۔ پتہ نہیں جانتے بھی تھے یا نہیں۔

مولانا کا ڈیل ڈول ایسا تھا کہ وہ کشمیری نہ ہو سکتے تھے۔ رنگ سانولا، چہرہ بھاری آواز گھنی اور گھنڈی دار۔ زبان ان کی ثقہ اور سند یافتہ مگر شین قاف کی ادائیگی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پنجابی لہجے پر مجبور ہیں۔ غالباً وہ بکروال کشمیر کے پہاڑوں میں آوارہ پھرنے والے گوجروں کی اولاد تھے جن میں سے ان کا خاندان پڑھ لکھ گیا اور مولانا نے تو ایسا کمال حاصل کیا کہ وہ پنجاب میں بھی استاد تسلیم کیے گئے اور یوپی کے مہاجر صحبتِ زبان کے معاملے میں ان کے چرنوں میں پانی بھرنے لگے تھے۔ قدرت نے انہیں محنت کا ذوق دیا تھا اور ان کے سماجی پس منظر نے طنز لکھنے کی بے مثل صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ اردو کے تین چار فنکار نثر نگاروں میں ایک وہ بھی تھے۔

کالم لکھتے تو ایک ایک فقرے کو کاٹ کاٹ کر کئی کئی بار لکھتے اور جب لکھ چکتے تو لگتا کہ الہام ہوا ہے۔ منہ آئی بات وہ روک نہ سکتے تھے اور بعض اوقات کسی حریف یا کسی قابلِ احترام ہستی پر چوٹ کرنے کے بعد خوف کی وجہ سے بے ہوش ہو جاتے تھے۔

مولانا کو جمال کی اردو میں نارسائی پر بڑا غصہ آتا تھا۔ جمال بھی شرمندہ ہوتا مگر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں کیا کروں، کس طرح اردو سیکھوں۔

مولانا نے کہا کہ ''اردو تو صرف انہی کو آتی ہے جن کی یہ مادری زبان ہو۔''

''مگر مولانا آپ کی مادری زبان تو اردو نہیں، آپ کو کیسے آ گئی؟'' جمال نے پوچھا۔

''آ نہیں گئی، آ رہی ہے۔ دیکھتے نہیں مولوی صاحب کہ میں ہر روز مطبع نولکشور کی کتابیں پڑھتا ہوں تا کہ آپ جیسوں کی صحبت میں رہ کر میری زبان خراب نہ ہو جائے۔''

''مولانا یہ بات تو میر تقی میر نے کہی تھی۔ جب وہ دہلی سے اکے میں لکھنؤ چلے تھے۔'' جمال نے طنز کیا۔

''آپ کو کیسے پتہ ہے؟ کیا آپ نے میر کے سوانح پڑھے ہیں؟''



''تھوڑا بہت مولانا۔''

''آپ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ آپ کو پڑھنا بھی آتا ہے، لکھنے میں تو میں نے آپ کو بہت کوتاہ پایا۔''

''تو مولانا میں اردو سیکھوں کیسے؟''

مولانا نے سگریٹ کا لمبا کش لیا۔ مونچھوں کی اوٹ میں مسکرائے اور بولے ''طلسم ہوشربا آپ نے نہیں پڑھی۔ محمد حسین آزاد سے آپ کو صحبت نہیں رہی۔ غالب کے خطوط پر آپ کی نظر نہیں گئی۔ ابوالکلام سے آپ کی آشنائی نہیں اور نواب نصیر حسین خاں خیال کا نام بھی آپ نے نہیں سنا۔ اب تو ایک ہی ترکیب ہے جس سے آپ اردو میں کمال پا سکیں۔ آپ دلی کی کسی مہاجر لڑکی سے شادی کر لیں تا کہ اردو آپ کی مادری زبان بن جائے۔''

اخبار کا بہت اونچا مقام تھا اور اس میں بڑا حصہ مولانا کے اعلیٰ معیاروں کا تھا مگر سٹاف کے کچھ لوگوں نے بھی ان کی راہنمائی میں بڑے تیر مارے تھے۔ لوگ ان کی تعریف کرتے تو مولانا برا مانتے اور کہتے کہ دراصل آپ کو میری مشکلات کا علم نہیں۔ ورنہ ان میں سے تو کسی کو املا بھی نہیں آتی۔ ایک ایک لفظ مجھے خود لکھنا پڑتا ہے۔

مولانا ایک تو اس روایت کے امین تھے جس کے مطابق شاگردوں کی تعریف ان کے بگڑنے کا سبب بن جاتی ہے۔ دوسرے وہ صاحبِ کمال تھے مگر چونکہ پنجابی اور لاہوری نہیں تھے اس لیے حریفوں نے انہیں زندگی کے ہر مقام پر گرانے کی کوشش کی تھی اور اب ان کے لیے کسی شاگرد کو بھی تسلیم کرنا مشکل تھا۔ وہ کسی کو کچھ سکھاتے بھی نہ تھے۔ تحریر کا ایک آدھ جملہ پڑھتے اور کہہ دیتے۔ یہ آپ کیا لکھ لائے ہیں اور مضمون پھینک کر کہتے ''جائیے کچھ کیجیے۔'' پھر تھوڑی دیر کے بعد وہی چھاپ دیتے۔

وہ کبھی یہ نہ بتاتے کہ تحریر میں یا مضمون میں کیا خرابی ہے اور اسے کس طرح دور کیا جائے۔ دراصل ان کے معیار اتنے بلند تھے کہ کوئی تحریر ان کی نظروں میں جچ ہی نہ سکتی تھی مگر وہ کامل فن تھے اور اگر کسی نے ان سے کچھ سیکھا تو ان کو دیکھ کر سیکھا۔ خود اپنی زبان سے انہوں نے اپنے شاگردوں کو فن، علم اور زبان کے معاملے میں ڈانٹ ڈپٹ ہی کی۔ بتایا کچھ نہیں۔

ان کے شاگردوں کے جذبے ان کے لیے بیک وقت محبت اور نفرت کے رہے۔ اپنے سینئرز کے لیے ان کے دل میں احترام کی کوئی حد نہ تھی۔ یہاں تک کہ ایک روز جمال نے کہا، کہ مولانا آپ نے جس لفظ کے استعمال پر مجھے پنجابی ہونے کا طعنہ دیا ہے، وہ آپ کے فلاں ممدوح نے بھی اپنی تحریر میں استعمال کیا ہے۔

تو وہ بولے ''بھئی ان کو تو حق ہے کہ جو چاہیں لکھیں مگر آپ کو کیا حق ہے کہ اردو میں پنجابی لکھیں۔''

شاگردوں کی تعریف سن کر وہ کہتے تھے کہ میرے سٹاف میں فلاں کی جدید پر نظر ہے۔ قدیم کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا۔ فلاں قدیم سے باخبر ہے مگر جدید سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ رہا جمال تو اس نے

بھاگ دوڑ کر کے کچھ نام پیدا کرلیا ہے مگر اسے نہ جدید کی خبر ہے نہ قدیم سے کوئی تعلق ہے۔ وہ مطالعہ ہی نہیں کرتا تا کہ کہیں میری جودتِ طبع اور میرے سٹائل پر کوئی کاملِ فن خراش نہ لگا جائے۔

مولانا مجلسی رکھ رکھاؤ کو جزو ایمان سمجھتے تھے مگر طنزیہ فقرے کو روکنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اخبار کے مالک میاں صاحب بائیں بازو کے ایک ثقہ لیڈر تھے۔ مدتوں کانگریس میں رہے تھے پھر جب کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے ہندوستان کے اٹھارہ علاقوں کے حق خود اختیاری کو تسلیم کرلیا تو اس تجزیے کی روشنی میں وہ پاکستان کے زبردست حامی ہوگئے۔ اخبار انہوں نے پاکستان میں استحصالی قوتوں کو ختم کرنے، استعمار سے جان چھڑانے اور تیسری دنیا اور عالمِ اسلام کو متحد کرنے کے خیال سے نکالا تھا مگر بائیں بازو کی تحریک کمیونسٹ پارٹی کی سیاسی اور نظریاتی غلطیوں کی وجہ سے دریا برد ہوگئی تو وہ پریشان ہوئے۔ اگرچہ اپنے نظریات پر محکم رہے۔ جب چین میں ماؤزے تنگ کی آٹھویں فوج نے چیانگ کائی شیک کو امریکی حمایت کے باوجود مار کر تائیوان بھگا دیا تو میاں صاحب نے مولانا سے چہک کر پوچھا ''مولانا چیانگ کائی شیک اب کیا کرے گا؟''

مولانا سگریٹ کا ایک لمبا کش لگا کر بولے ''میاں صاحب وہ بھی کوئی اخبار نکال لے گا۔ اس کی سیاست بھی چلی نہیں!''

## گورنر صاحب سے مکالمہ

جمال مولانا کے پاس بیٹھا جھاڑیں کھا کر ان کے سگریٹ کا دھواں اڑا رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

مولانا نے کچھ دیر تو خاموشی سے بات سنی پھر بولے ''مولانا گورمانی صاحب میں مزدور آدمی ہوں۔ دن بھر کنواں کھودتا ہوں تو رات کو پانی نکلتا ہے۔ میرے پاس آپ کے ساتھ چائے پینے کی فرصت کہاں۔ ہاں کسی روز آپ ادھر رتن چند روڈ سے گزریں تو گھڑی بھر کے لیے اوپر آ جائیں، اخبار کا دفتر سب کے لیے کھلا ہوتا ہے...... ویسے شام کو کافی ہاؤس میں بھی ملاقات ہوسکتی ہے۔''

ٹیلی فون رکھ کر مولانا ہانپنے لگے۔ کال میاں مشتاق احمد گورمانی نے کی تھی اور یہ ان کی شرافت کی مثال ہے کہ انہوں نے کسی سیکریٹری کے ذریعے مولانا کا نمبر نہ ملایا تھا بلکہ خود زحمت اٹھائی تھی۔ وہ پنجاب کے انتہائی مضبوط گورنر تھے اور پاکستان کی سیاست میں ان کا بڑا مقام تھا۔ وہ مولانا کے سامنے حکومت کی پالیسیوں کی وضاحت کرنا چاہتے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ بات کچھ اور بھی تھی۔

ٹیلی فون رکھ کر مولانا سخت پریشان ہوئے اور انہوں نے چپڑاسی کو آواز دی ''میاں رمضان ایلکا سلزر کی ایک گولی لانا۔''

جمال نے کہا ''مولانا ایک گولی ایلکا سلزر کی نواب صاحب کو بھی بھجوا دیجیے۔ انہیں بھی آپ جیسے ایڈیٹر سے پالا نہ پڑا ہوگا۔''



اس زمانے میں پنجاب کے سارے اخبارات حکومت کے خوشامدی تھے یا شریکِ اقتدار۔ سیدھا کھڑا ہو کر بات کرنے والا کوئی نہ تھا۔ مولانا کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ان کا حکم تھا کہ سرکاری پریس نوٹ پڑھے بغیر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیے جائیں۔ ہندوستانی پالیسی پر حکومت کی حمایت کی جائے گی مگر امریکہ کی غلامی پر سخت تنقید کی جائے اور مسلمان اور سوشلسٹ ملکوں سے رابطے بڑھانے کی مہم چلائی جائے۔

گورنر صاحب مولانا کو کیا سمجھانے چلے تھے۔ اس کا اندازہ کسی کو نہ تھا مگر بعد میں پتہ چلا کہ اخبار کے خلاف ایک زبردست سازش ہورہی ہے۔ حکومت اس کی تنقید سے تنگ آ کر اسے اندر سے تباہ کرنا چاہتی ہے اور مولانا کو پاکستان کی سلامتی کے نام پر شیشے میں اتارنے کی کوشش کی جارہی تھی۔

## مولانا کی بے چینی

مولانا اس روز سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ انہوں نے سٹاف کے ایک کارکن کو جو زیادہ تر خاموش رہتے تھے اور اس لیے انہیں بڑا عاقل سمجھا جاتا تھا، کمرے میں بلایا مگر ان سے کوئی بات کیے بغیر واپس بھیج دیا۔

مولانا بہت بےزار تھے۔ بات بات پر جھلا رہے تھے۔ وقفے وقفے کے بعد انہوں نے سب کو بلایا اور باری باری سب کو ذلیل کر کے بھگا دیا۔ آخر میں جمال کی باری بھی آ گئی۔

جمال کا خیال ان کو سب سے پہلے آیا تھا مگر وہ سمجھتے تھے کہ وہ کم و بیش ان پڑھ ہے۔ اردو میں کم مایہ ہے اور تلفظ تو اس کا ناقابل برداشت ہے مگر جب ان کی نظر میں کوئی بھی نہ جچا تو انہوں نے اس کو طلب کرلیا۔

جمال نے باادب کھڑے ہو کر ان کا ایک سگریٹ سلگایا۔ مولانا کچھ سوچتے رہے، پھر بولے

''تشریف رکھیے مولوی صاحب۔ کاش آپ ہمارے ہاں نہ آئے ہوتے۔''

''مجھ سے کیا خطا ہوئی مولانا؟'' جمال نے عاجزی سے کہا۔

## رئیس الاحرار

''آپ کا یہاں ہونا ہی آپ کی خطا ہے۔ مجبوری ہے ورنہ میں آپ کو ہرگز تکلیف نہ دیتا کیونکہ آپ کسی قابل نہیں ہیں۔ آپ نے تو رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی کا نام بھی نہ سنا ہوگا۔''

''سنا ہے مولانا۔'' جمال نے ادب سے جواب دیا۔ ''وہ آزادیٔ ہند کے مجاہد ہیں۔ ہندوستان کے سب سے پہلے سیاسی قیدی ہیں۔ وہ کبھی کسی کے آگے نہیں جھکے۔''

''غنیمت ہے۔'' مولانا کسی قدر اطمینان سے بولے ''مگر آپ کو کیسے پتہ ہے؟''

''میں نے ان کے بارے میں پڑھا ہے۔''

''یعنی آپ کو پڑھنا بھی آتا ہے!''

''جی میں تو آپ کا کالم بھی پڑھ لیتا ہوں۔''

مولانا سنی اَن سنی کر کے بولے ''کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ بہت بڑے شاعر بھی ہیں۔ بہت بڑے

عالم بھی ہیں۔ وہ کل صبح کراچی سے لاہور پہنچیں گے۔''

''جی بڑی خوشی کی بات ہے۔''

''خوشی کی بات نہیں مولوی صاحب۔ رونے کا مقام ہے۔ وہ کچھ روز لاہور میں قیام کریں گے اور انہیں ایک سیکریٹری کی ضرورت ہوگی۔ اب آپ میری مشکلات کا اندازہ لگا لیجیے۔ میں ایسا آدمی کہاں سے لاؤں جو ان کی خدمت کے قابل ہو۔ آپ کے دل میں تو بزرگوں کا احترام ہی نہیں۔''

''مگر مجھے آپ کی مشکلات کا اندازہ ہے مولانا۔'' جمال بولا ''میرے دل میں بزرگوں کی واقعی کوئی عزت نہیں اور املا لکھنا میں نے ابھی تک نہیں سیکھا۔ حالانکہ آپ نے مجھ پر بہت محنت کی۔''

''تو آپ کو میں نے بامرِ مجبوری رئیس الاحرار کی خدمت کے لیے منتخب کیا ہے۔ ہائے غلطی ہائے مضامین مت پوچھ!''

''میں کس قابل ہوں مولانا۔ پھر میں انہیں جانتا بھی نہیں۔''

مولانا بولے ''میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تیس برس میری ان سے اچھی یاد اللہ رہی۔ کیا آپ نے ان کا دیوان دیکھا ہے؟''

''جی نہیں مولانا۔''

''مجھے پہلے ہی پتہ تھا۔ آپ دفتر سے اسی وقت چلے جائیں اور پنجاب پبلک لائبریری میں بیٹھ کر ان کا دیوان پڑھیں اور صبح آ جائیں پونے گیارہ بجے ریلوے سٹیشن پر۔ وہ میاں صاحب کے ہاں قیام کریں گے۔ آپ باادب رہیں۔ افسوس میرے پاس کوئی معقول آدمی نہیں۔ آپ کم سے کم بھاگ دوڑ تو کر لیں گے۔''

جمال نے رئیس الاحرار کا دیوان نہ پڑھا مگر اگلی صبح دس بجے ہی ریلوے سٹیشن پر پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر میں مولانا بھی آ گئے۔ ان کے ساتھ کانپور کے جمیل میاں جو حسرت موہانی کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ مولانا ان کے ساتھ رئیس الاحرار کے بارے میں باتیں کرنے لگے جن سے جمال کی معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔

گاڑی کی آمد ہوئی تو مولانا کچھ گھبرا گئے اور جمیل صاحب سے پوچھنے لگے ''آپ حضرت کو اچھی طرح پہچانتے تو ہیں نا؟''

گاڑی رکی تو تینوں فرسٹ کلاس کے ڈبے کی طرف لپکے مگر رئیس الاحرار قسم کا کوئی آدمی انہیں نظر نہ آیا۔

پھر انہوں نے سیکنڈ کلاس کے ڈبے دیکھے۔ تھرڈ کلاس اتنے میں خالی ہو چکی تھی۔ مولانا جمیل میاں اور جمال مایوس ہو کر پلیٹ فارم سے نکلنے ہی والے تھے کہ جمیل میاں نے نعرہ مارا ''وہ رہے حضرت سلامت!''

دور ایک چھوٹے قد کا منحنی بوڑھا جس کی سفید داڑھی کسی جنگلی جھاڑی کی طرح بکھری ہوئی تھی، بغل میں چھوٹا سا بستر اٹھائے ہاتھ میں مٹی کا بدھنا لیے چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتا آ رہا تھا۔



بوڑھے نے پیلے کھدر کا کرتہ پہن رکھا تھا۔ سر پر لال پھندنے والی ٹوپی جس کے کناروں پر کالی میل جمی ہوئی تھی، آنکھوں پر پیتل کے فریم والا چشمہ۔

ایسے آدمی کو زندگی میں ایک مرتبہ دیکھ لینا کافی ہوتا ہے۔

جمیل صاحب کی آواز سن کر تینوں ان کی طرف لپکے۔ جمال نے بستر ان کی بغل سے چھین لیا تو وہ حیران ہو کر پوچھنے لگے ''میاں صاحبزادے! تم کون ہو اور میرا بستر کیوں چھینتے ہو؟''

ان کی آواز بہت باریک تھی جیسی غصیل عورتوں کی ہوتی ہے۔

''یہ ہمارے اخبار میں کام کرتے ہیں۔'' مولانا چراغ حسن نے کہا۔

''اور آپ کون ہیں؟''

''جی میں اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ کلکتے میں میری آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ جب میں عصر جدید میں کام کرتا تھا۔''

''اچھا اچھا۔''

''ہم آپ کو تلاش کر رہے تھے۔'' مولانا بولے۔

''میں ہمیشہ تھرڈ کلاس میں سفر کرتا ہوں۔ تو اب جانا کہاں ہوگا؟''

ان کا وزن کل تیس پینتیس سیر ہوگا۔ آواز ان کی کسی قدر کرخت تھی۔ وہ کسی طرح بھی رئیس الاحرار جیسے بھاری بھرکم لقب کی تصویر نہ تھے۔ لگتا تھا کہ بلھے شاہ کے مزار سے کوئی فقیر اٹھ کر آیا ہے۔ یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ گاندھی جی ان سے گھبراتے تھے اور قائداعظم انہیں طرح دے کر نکل جاتے تھے۔ کانپور کے کانگریس اجلاس میں انہوں نے سب سے پہلے مکمل سوراج کی قرارداد پیش کر دی تھی۔ حالانکہ گاندھی جی ابھی داخلی خودمختاری کا مطالبہ کرتے تھے۔ انہیں پھانسی کی سزا ہوئی تو انہوں نے معافی نہ مانگی۔ کانپور میں پنڈت نہرو کو ان کی بیگم نے تھپڑ مار کر راستے سے ہٹا دیا تھا جب انہوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تھی۔ ہندوستانی دستور پر انہوں نے احتجاجاً دستخط نہ کیے تھے اور اجلاس کے خاتمے پر سپیکر ماؤلنکر کو انہوں نے ایوان کے اندر بے نقط سنائی تھیں۔

رئیس الاحرار کانگریسی بھی تھے اور مسلم لیگی بھی تھے۔ وہ سخت سامراج دشمن تھے۔

ان کے ہاتھ میں مٹی کا جو بدھنا تھا، اس سے مکوڑے چمٹے ہوئے تھے۔ اس میں رس گلے تھے اور کراچی سے وہ یہی تحفہ لے کر کانپور جا رہے تھے۔

جمال نے مکوڑوں والا بدھنا بھی ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ اسٹیشن کے باہر میاں صاحب کی گاڑی کھڑی تھی۔

میاں صاحب کے گھر پہنچ کر جمال نے حضرت کا بستر کھولا۔ ادب سے ان کے ہاتھ دھلائے اور

جب وہ آرام سے لیٹ گئے تو جمال چپکے سے کونے میں بیٹھ گیا۔ اس کو رئیس الاحرار سے بات کرنے سے منع کر دیا گیا تھا اس کی فطری بدتمیزی کے ڈر سے۔

گھنٹے بھر کے بعد حضرت نے کروٹ لی تو جمال کو دیکھ کر حیرت سے بولے ''میاں صاحبزادے آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

جمال نے منمنا کر کہا ''جناب میں آپ کی خدمت میں دست بستہ ہوں۔''

''آپ میری خدمت میں دست بستہ کیوں ہیں۔ مجھے آپ کی خدمت کی کوئی ضرورت نہیں۔ جائیے آپ بھی گھر جائیے۔''

جمال نے ادب سے کہا ''مولانا مجھے حضوری کا حکم ہے۔ میں آپ سے کوئی بات نہ کروں گا۔''

''آپ مجھ سے کوئی بات نہ کریں گے۔ کیوں بھلا؟''

''جی نہیں میں بات کروں گا۔ جب آپ چاہیں گے ورنہ نہیں جناب۔''

مولانا کسی قدر محظوظ ہوئے پھر بولے ''مگر آپ کرتے کیا ہیں؟''

''جی میں میاں صاحب کے اخبار میں لکھتا ہوں۔''

''یعنی اخبار نویس ہیں آپ! مگر میاں صاحب نے آپ کے بارے میں مجھ سے بات نہ کی۔''

''جی اس لیے کہ میں بہت چھوٹا آدمی ہوں۔''

''میاں دنیا میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔''

''ہوتا بھی ہے جی۔'' جمال نے ڈھٹائی سے کہا۔

''ہوتا ہے تو غلط ہوتا ہے۔''

''غلط بھی ہوتا ہے جی۔''

''دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں آپ۔ اچھا اب آپ بھی لیٹ جائیے۔ آرام کیجیے ذرا۔''

''جی مجھے بہت آرام ہے آپ کی خدمت میں۔''

''بالکل غلط! بھلا دوسرے آدمی کی خدمت میں آرام کیسے ہو سکتا ہے۔''

''ہو سکتا ہے حضرت میں دو گھڑی آپ کی خدمت میں بیٹھوں گا۔ آپ کی خوشبو سونگھوں گا۔''

''ایسی لغو بات شاعر ہی کر سکتے ہیں۔ کیا آپ شاعر ہیں؟''

''جی نہیں۔'' جمال نے جواب دیا۔ ''شعر نہیں کہتا مگر شاعروں جیسی لغو باتیں کر لیتا ہوں۔''

''شاعری سراسر لغویت ہے۔'' وہ بولے۔

''مگر مولانا آپ خود شعر کہتے ہیں۔'' جمال نے حیران ہو کر کہا۔

''وہ بھی لغویت تھی۔'' مولانا بولے ''میرا آدھا کلام جاہلانہ ہے۔''



''اور باقی آدھا مولانا؟ کیا آپ نے اس پر کبھی نظر نہیں ڈالی؟''

مولانا مسکرا کر بولے ''آپ بہت شوخ ہیں۔ اچھا بیٹھے رہیے میرے پاس۔''

## قرار داد مقاصد

شام کو جمال نے مولانا چراغ حسن کو حضرت کی ساری گفتگو لفظ بلفظ سنا دی جو انہوں نے دو مرتبہ سنی۔ بیچ بیچ میں انہیں جمال کے طرزِ عمل پر غصہ بھی آیا مگر انہوں نے یہ سوچ کر چھوڑ دیا کہ بالآخر حضرت نے جمال کو پاس بٹھا لیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ کل صبح ہوائی جہاز کی سیٹ کا پتہ کر کے آنا۔ جاتی دفعہ انہوں نے پھر کہہ دیا ''جمال احتیاط رہے مولانا بہت تنک مزاج آدمی ہیں۔ آپ کی گستاخیوں پر انہیں غصہ بھی آ سکتا ہے۔''

اگلے روز میاں صاحب کراچی سے آ گئے۔ مولانا کی موجودگی میں قرار دادِ مقاصد کا ذکر چھڑ گیا تو حضرت بولے ''لیاقت علی خاں پاکستان سے دھوکہ کر رہا ہے۔ یہ لوگ انگریز کے غلام ہیں اور پاکستان کو پھر گروی رکھنا چاہتے ہیں تا کہ ان کی جاگیریں محفوظ رہیں۔ ادھر ہندوستان میں کانگریس کا بھی یہی حال ہے۔ دونوں ملکوں کے عوام کے ساتھ دھوکہ ہو رہا ہے۔ کچھ روز یہ اور کھا کما لیں۔ آزادی کی منزل ابھی دور ہے۔''

جمال چپ رہا تھا۔ جب میاں صاحب اور مولانا چلے گئے تو جمال نے پوچھا ''مولانا آپ قرار دادِ مقاصد کے کیوں خلاف ہیں؟''

''آپ نے پڑھی ہے؟'' مولانا نے پوچھا۔

''جی پڑھی ہے۔''

''اور سمجھی بھی ہے۔''

''جی کچھ سمجھی بھی ہے۔ اس میں پاکستان پر اللہ کی حاکمیت تسلیم کی گئی ہے اور اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔''

''بے شک مگر یہ خارجیوں کا نعرہ ہے۔ خارجی قبائلی لوگ تھے اور کوئی خود کار ریاستی ڈھانچہ قائم کرنا نہ چاہتے تھے۔ وہ اپنی سرداریاں قائم رکھنے کے لیے اللہ کی حاکمیت کا سہارا لیتے تھے۔ اب اس زمانے میں جب آپ اس ارفع نظریئے کو ریاستی ڈھانچے کا راہنما اصول بناتے ہیں تو بے ایمانی کرتے ہیں۔ یہ ارفع نظریہ زمان و مکان کی قید سے ماورا ہے۔ اسے کسی ریاستی دستور کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ دستور زمان و مکان کا پابند ہوتا ہے اور تبدیل ہوتا رہتا ہے اور اس کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ قرار دادِ مقاصد یعنی لا الحکم الا اللہ۔ جانتے ہو لا حکم الا اللہ کے جواب میں حضرت علیؓ نے کیا کہا تھا؟ انہوں نے کہا تھا یہ حق ہے جسے باطل کے استحکام کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ جناح زندہ ہوتے تو اس کی نوبت کبھی نہ آتی۔ لیاقت علی خاں، زمینداروں اور مولویوں کی مدد سے حکومت کرنا چاہتا ہے۔ پاکستان کے عوام کے حق حاکمیت کو تسلیم کر لے تو پھر وہ استحصالی طبقوں کو بچا نہیں سکتا اور اس میں مولوی اس کو مذہبی جواز مہیا کریں گے۔''

"مولوی تو آپ بھی ہیں مولانا۔" جمال نے شرارت سے کہا۔

"میں مسلمان ہوں۔ مولوی نہیں اور کمیونسٹ ہوں خدا کے فضل سے۔"

"کیا آپ کی مسلمانی اور آپ کی کمیونزم میں کوئی تضاد نہیں؟"

"اس میں تضاد کہاں ہے؟"

"مگر مولوی کہتے ہیں کہ کمیونسٹ لادین ہوتے ہیں۔"

"میں تو ابھی گیارہواں حج کر کے آیا ہوں مگر مولوی کب خدا کو مانتے ہیں۔ وہ زبانی جمع خرچ کرتے ہیں۔ ان کی زندگی خدا سے خالی ہوتی ہے۔ الا ماشاءاللہ!"

مولانا جوش میں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ بات ختم کر کے لیٹ گئے۔

## انٹرویو

جمال کو حکم تھا کہ وہ مولانا سے اخبار کے لیے انٹرویو لے۔ جب وہ بات چیت کے موڈ میں ہوں۔ جمال نے حماقت کی اور کہہ دیا کہ "مولانا مجھے آپ کا انٹرویو لینا ہے۔ آپ کی طبیعت حاضر معلوم ہوتی ہے۔"

"میں کسی اخبار والے سے بات نہیں کرتا اور میری طبیعت حاضر نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ بستر پر لیٹ گئے اور منہ دیوار کی طرف کر لیا۔

جمال بہت پریشان ہوا۔ انٹرویو تو اسے ضرور لینا تھا مگر اس نے بے وقوفی سے بات خراب کر ڈالی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد جمال نے کہا "مولانا مجھے آپ کا انٹرویو نہیں لینا۔ میرے خیال میں آپ کا بچپن دوسرے بچوں سے مختلف گزرا ہے۔ شروع ہی سے کڑوے زہریلے ہوں گے آپ۔"

"کیوں صاحب ہمارا بچپن دوسرے بچوں جیسا کیوں نہ ہوتا۔" مولانا تنک مزاجی سے بولے۔ "آپ نے ہمیں کیا سمجھ رکھا ہے؟"

"مجھ جیسی پوچ حرکتیں تو بہرحال آپ نے نہیں کی ہوں گی مثلاً پتنگ بازی، گلی ڈنڈا، کبڈی، گلی بازار میں مار پیٹ۔"

"کیوں نہیں کی۔ موہان ندی کے کنارے ہم نے برسوں پتنگ اڑائی۔ ہمارے کانپور میں اس کا بڑا رواج تھا اور مار پیٹ بھی ہم لوگ کر لیتے تھے۔"

جمال نے چپکے سے پنسل نکال لی۔

ڈیڑھ گھنٹے اسی طرح چھوٹے چھوٹے سوال کرنے کے بعد اس نے انٹرویو مکمل کر لیا۔

رئیس الاحرار نے باتوں باتوں میں اپنی ساری زندگی کی داستان بیان کر دی جو دراصل ہندوستان کی آزادی میں گاندھی جی کی ہندو قوم پرستی کے شر، اپنی انگریز دشمنی اور غیر طبقاتی معاشرے کے قیام کی جدوجہد کی تفصیلات پر مبنی تھی۔ بیچ بیچ میں انہوں نے اپنے کامیاب اور ناکام معاشقے بھی



بیان کر دیئے اور ادب و شعر اور مشاعروں اور مجادلوں کا حال بھی سنا دیا۔ ایسی تفصیلات ان کے بارے میں آج تک کبھی چھپی نہ تھیں۔

## انعام واکرام

انٹرویو پڑھ کر مولانا بہت خوش ہوئے اور زندگی میں ایک ہی بار انہوں نے جمال کی تعریف کی۔ انہوں نے کہا "میرا انتخاب غلط نہیں ہوتا۔ میں جانتا تھا کہ تم ہی ہو جو رئیس الاحرار کا منہ کھلوا سکو گے۔ تمہاری اعلیٰ کارکردگی پر تمہیں دس روپے انعام دیا جاتا ہے۔"

اگلی صبح جمال نے مولانا کو رقعہ بھیجا کہ چائے پانی کی تنگی ہے۔ وہ دس روپے عطا ہوں جو میرے آپ کے پاس محفوظ ہیں۔ اسی رقعے پر مولانا نے جواب لکھ بھیجا۔ میری جیب میں کل بیس روپے تھے جو ظہور کی والدہ نے چوری کر لیے۔ اگر انہوں نے مجھے یوں لوٹا نہ ہوتا تو میں بھی زندگی میں اپنی غلط بخشیوں کی بدولت کنگال ہو گیا ہوتا مگر آپ نے کون سے دس روپوں کا تقاضا کیا ہے۔ آپ نے ہمیں مضمون سے خوش کیا۔ ہم نے آپ کو وعدے سے خوش کیا۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد!

## جمال کی فضیلت

جمال مولانا کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ مولانا کی تعریف سے خوش تو ہوا مگر اپنے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوا۔ جب دو چار روز کے بعد اپنا نیا مضمون لے کر مولانا کے سامنے حاضر ہوا تو پہلا پیرا پڑھ کر مولانا بولے "صاحب! آپ کو مجھ پر بہت بڑی فضیلت حاصل ہے۔"

"کون سی فضیلت مولانا۔" جمال نے عاجزی سے کہا "میں تو کچھ بھی نہیں آپ کے سامنے۔"

مولانا سنجیدگی سے بولے "نہیں صاحب آپ تو......" جمال نے بات کاٹ لی۔ "جناب میں تو آپ کے قدموں کی خاک بھی نہیں ہوں۔"

"عرض کیا نہ کہ آپ کو مجھ پر بہت بڑی فضیلت حاصل ہے اور یہ اللہ جسے دے۔"

"مولانا کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ مجھ پرکاہ میں کون سی فضیلت ہو سکتی ہے؟"

"نہیں جناب۔ آپ کو مجھ پر بہت بڑی فضیلت حاصل ہے اور وہ یہ کہ آپ مکمل طور پر ان پڑھ ہیں جبکہ میں اساتذہ کے اسالیب تحریر میں الجھا رہتا ہوں۔ آپ جو چاہیں لکھ دیں۔"

## ٹھمری لکھا کریں

جمال کے ساتھیوں میں ایک خواجہ صاحب بھی تھے۔ بہت سادہ اور معصوم۔ وہ ایم اے فارسی کا امتحان دے رہے تھے مگر فارسی ان کی واجبی ہی تھی۔ جب مولانا نے ایک دن ان کو بتایا کہ فارسی کی فلاں فلاں کتاب پر بھی نظر ڈال لیجیے تو بولے "مولانا ہمارے ممتحن بھی فارسی کم ہی جانتے ہیں۔ اس لیے میرا ان کتابوں کے مطالعے کے بغیر ہی پاس ہو جانا یقینی امر ہے۔"

جمال سے خواجہ کی دوستی اس لیے بھی تھی کہ خواجہ صاحب اپنے زمانے کے مشہور کرکٹر تھے اور انہوں نے آل انڈیا کرکٹروں کے ساتھ سرینگر میں جمال کے ساتھ کرکٹ کھیلی تھی۔

خواجہ صاحب کو شعر کہنے کا بھی بہت شوق تھا۔ مولانا کے اخبار کا علمی وادبی ایڈیشن بہت موقر تھا اور اس میں وہی چھپتے تھے جو منتخب روزگار ہوتے تھے۔ اپنی ایک غزل خواجہ صاحب نے مولانا کو اشاعت کے لیے دی مگر اگلے ہفتے کے ایڈیشن میں وہ نہ چھپی۔ خواجہ صاحب نے سوچا کہ جگہ نہ ہوگی مگر اگلا ہفتہ بھی یونہی نکل گیا۔ غزل تیسرے ہفتے بھی نہ چھپی تو خواجہ صاحب نے مولانا سے کہا ''مولانا کیا میری غزل آپ کی نظر سے نہیں گزری؟''

''گزری ہے۔ گزری ہے خواجہ صاحب۔'' مولانا نے سنجیدگی سے کہا۔

''تو جناب کب چھپے گی؟''

مولانا عینک اتار کر بولے ''خواجہ صاحب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ غزل تو آپ کے بس کی بات نہیں۔ اگر ٹھمری وغیرہ تصنیف کر سکیں تو علم موسیقی پر بڑا احسان ہوگا۔''

اچانک خبر اڑی کہ پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے بچالیا ورنہ دشمن تو اسے لے ہی ڈوبے تھے۔ اس سے دہشت پھیل گئی۔

پریس نوٹ کے مطابق فوجی افسروں کے ایک جتھے نے پاکستان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی تھی مگر مملکت خداداد کی سلامتی اور استقرارِ خدائے بزرگ وبرحق کو منظور تھا اس لیے غدار عین وقت پر پکڑے گئے۔

جو لوگ پکڑے گئے تھے ان کے ناموں سے اندازہ ہوا کہ وہ ایسے فوجی افسر ہیں جو کشمیر کے محاذ پر رضا کارانہ لڑے تھے اور جنہیں حکومت پاکستان کی کشمیر سے بے وفائی کا ذاتی طور پر علم تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے جنرل سیکریٹری سید صاحب بھی شامل تھے۔

مہاراجہ کشمیر ہری سنگھ ڈوگرہ نے ہندوستان اور پاکستان سے حالات کو علی حالہ رکھنے کا معاہدہ کر رکھا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ کشمیر کے الحاق کا فیصلہ ایک سال کے بعد کیا جائے گا۔

مہاراجہ ہندوستان سے ڈرتا تھا اور اس کے وزیراعظم رام چند کاک کی رائے بھی یہی تھی کہ کشمیر پاکستان میں شامل ہو مگر مہارانی کٹر ہندو تھی اور اپنے سیوک سنگھی سرکاری پروہت کے زیرِاثر ہندوستان میں شامل ہونا چاہتی تھی۔ پھر ماؤنٹ بیٹن، مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کا بھی مطالبہ یہی تھا۔

## قبائلیوں کی چڑھائی

نوابزادہ لیاقت علی نے سرحد کے خان عبدالقیوم کی مدد سے قبائلیوں کا ایک لشکر کشمیر پر مظفر آباد کے راستے ہول دیا تھا۔ اس میں پاکستانی فوج کے کچھ رضا کار افسر اور جوان شامل تھے مگر قائداعظم کو اس مہم کا علم



اخبارات کے ذریعے ہوا۔ جب انہوں نے شروع میں لیاقت علی خان کو حکم دیا تھا کہ بڑھ کر سیالکوٹ سے جموں پر قبضہ کر لو تو نوابزادہ نے انکار کر دیا تھا۔ یہی نہیں اس کی شکایت انہوں نے پاکستان کے انگریز کمانڈر انچیف جنرل گریسی سے کر دی تھی اور اس نے اسی وقت لارڈ آکن لیک کو دہلی میں خبردار کر دیا تھا۔

ابھی پٹھانکوٹ سے کشمیر کا کوئی زمینی رابطہ نہ ہوا تھا اور پاکستانی فوج گھنٹے بھر میں سیالکوٹ سے جموں جا سکتی تھی مگر نوابزادہ صاحب پاکستان کو ایک خالص اسلامی ریاست بنانا چاہتے تھے اور جموں کے ہندوؤں کی ان کو کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے سرینگر جانے کے لیے مظفر آباد اور بارہ مولا کا مشکل اور لمبا راستہ چنا۔ اس مہم میں جو جو دھوکے ہوئے ان کی تفصیل بتانا مورخ کا کام ہے۔ یہاں اتنی ہی کافی ہے کہ جب نوابزادہ لیاقت علی خاں نے مجاہدین کی اس درخواست کے باوجود کہ معرکہ جنگ میں صرف تین دن کی مہلت دی جائے تا کہ ہم پونچھ فتح کر لیں۔ نوابزادہ نے ان کی بات نہ مانی تو وہ بگڑ گئے اور انہوں نے سوچا کہ حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے اور پاکستان کو تبدیلی کے راستے پر ڈالا جائے۔

وہ سیکولر لوگ تھے۔ پاکستان میں اونچ نیچ مٹا کر وہ عوام کو جدید قوموں کی صف میں لانا چاہتے تھے مگر وہ امورِ مملکت جانتے نہ تھے۔

مسلم لیگ کے سوا پاکستان کی کوئی سیاسی پارٹی نہ تھی اور مسلم لیگ پرانے نظام میں کوئی تبدیلی نہ چاہتی تھی۔ قائداعظم کے افکار کو اس نے اسلام کے نام پر رد کر دیا تھا اور فلسفہ یہ تھا کہ پاکستان اللہ تعالیٰ نے خود بنا کر دیا ہے اور وہی اس کی پالیسیاں بناتا ہے۔ جو اِن پر اعتراض کرتا ہے وہ اللہ کی نافرمانی کرتا ہے۔ اس لیے باغی فوجی افسروں کو کمیونسٹ پارٹی کی ضرورت پڑ گئی تھی۔

## بنیادی تضاد

مگر کمیونسٹ پارٹی کو فوجی افسروں کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کلکتہ سے ہندوستان اور پاکستان کو پھر سے متحد کرنے کے لیے آئی تھی مگر اس کے نظریہ سازوں کو پاکستان اور ہندوستان کے بنیادی تضاد کا علم نہ تھا۔ ہندوستان کی تقسیم کی بنیاد ہندو مسلمان کا مذہبی تضاد نہ تھی۔ وہ دونوں تو کم وبیش ایک ہزار سال سے ایک ہی ملک اور ایک ہی قوم کی شکل میں رہ رہے تھے۔ تقسیم بھی ان کی طے تھی۔ مسلمان بادشاہوں کی سیکریٹریٹ کائستھ اور بنئے مل کر چلاتے تھے۔ نظم ونسق کے لیے راجپوت اور ترک افواج موجود تھیں۔ ہندوستانی نومسلموں کو کوئی پوچھتا نہ تھا' پھر کرنا خدا کا کیا ہوا کہ مغلوں کے دور میں ہندو اور برطانوی سرمائے کا گٹھ جوڑ شروع ہو گیا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں کمال کو پہنچ گیا۔ اس کی بہترین نمائندگی بنگال کے جگت سیٹھ، سندھ کے ناؤمل اور ان کے سارے عالم میں پھیلے ہوئے گماشتے کرتے تھے۔ مغلوں کے زوال کے زمانے میں مسلمانوں کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ پھر سرسید کی تحریک کے بعد جب انہوں نے جدید تعلیم کی طرف دھیان دیا تو ان میں ایک چھوٹی سی مڈل کلاس پیدا ہو گئی۔ اس ابھرتی ہوئی کمزور بورژوای کی نمائندگی

محمد علی جناح کرتے تھے مگر مہاتما گاندھی کی ہندو قوم پرستی نے مسلمانوں کو ان کا جائزہ حصہ دینے سے انکار کر دیا۔ جناح آخر دم تک مسلمانوں کے لیے تحفظات مانگتے رہے، مگر گاندھی جی پنڈت نہرو اور کانگریس کے دیگر اکابرین جمہوریت کے نام پر ہندو برٹش سرمائے کے ابدی عروج کے نظریئے پر قائم رہے۔ انہوں نے ہندوستان تقسیم کروا لیا مگر مسلمانوں کو تحفظات نہ دیئے۔ یہ بات مارکسی لوگوں کو فوراً سمجھ جانی چاہیے تھی مگر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نہرو کے جھوٹے سوشلزم اور ترقی پسندی کے سحر میں اندھی ہو کر یہ بھی بھول گئی تھی کہ پنجاب اور بنگال میں خون کی ندیاں بہہ چکی ہیں اور مشرقی پنجاب میں کوئی ایک مسلمان بھی باقی نہیں رہا کیونکہ اکالیوں سے کانگریس کا وعدہ تھا کہ تم مشرقی پنجاب سے مسلمان مار کر نکال دو تو صوبہ تمہارا ہوا۔ ان حالات میں جب روحوں سے خون رستا ہو اور نفرت کے جذبے چنگھاڑتے ہوں دونوں ملکوں کے متحد ہونے کے کیا امکان ہو سکتے تھے۔ خاص طور پر جب ہندو قوم پرستی کے جنون نے مہاتما گاندھی تک کو بھرے بازار میں قتل کر دیا ہو۔

مگر ہمارے سید صاحب بڑے شریف آدمی تھے۔ ان کے دل کا آئینہ صاف تھا۔ وہ اصول پسند بھی تھے، جی دار بھی تھے، پڑھے لکھے بھی تھے مگر وہ حالات کو ان کے صحیح تناظر میں نہ دیکھ سکتے تھے۔ سال دو سال کی کاوش کے بعد وہ مایوس ہو گئے اور انہوں نے ان فوجی افسروں کا دامن پکڑ لیا جو لیاقت علی خان کی کشمیر پالیسی سے ناراض تھے۔ سید صاحب کا خیال تھا کہ فوجی افسر لیاقت علی خاں کا تختہ الٹ کر حکومت ہمارے حوالے کر دیں گے تو پھر ہمارے لیے ہندوستان اور پاکستان کو متحد کرنا آسان ہو جائے گا۔ انہیں یہ بھی خبر نہ تھی کہ جن بغاوتوں کی کمان پیشہ ور فوجی افسروں کے ہاتھ میں ہو وہ سماجی اور سیاسی انقلاب پر منتج نہیں ہوتیں۔

باغی افسر بڑبولے اور شیخی خورے تھے۔ اس لیے انٹیلی جنس کو فوراً ہی ان کے ارادوں کی خبر ہو گئی مگر بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ یہ کام ہم سے نہ ہو گا اور اس بات کی بھی سب کو خبر تھی۔

مگر لیاقت علی خان کو جو بڑی تیزی سے نامقبول ہو رہے تھے، ایک زبردست ڈرامے کی ضرورت تھی۔ اس لیے انہوں نے اس امر کے باوجود کہ سازش ترک ہو چکی تھی، باغیوں کو گرفتار کر لیا۔ ایک مقصد امریکہ کو یہ بتانا بھی تھا کہ پاکستان پر کیمونسٹ چڑھے آ رہے ہیں اس لیے راہ مولا کچھ بخششیں!

جمال کے دو ساتھی جن کے کیمونسٹ رشتہ داروں نے انہیں پارٹی میں بھرتی کروا دیا تھا اسی سلسلے میں گرفتار کر لیے گئے حالانکہ ان معصوموں کو کچھ بھی پتہ نہ تھا۔ کیمونسٹ پارٹی کی خوشنودی ان کی ملازمت اور ترقی کی سیڑھی تھی۔ تاریخ کی مادیت اور مادے کی جدلیات کے بارے میں پارٹی کے قائدین بھی بڑی حد تک بے گناہ تھے۔ وہ ہندوستان کی تاریخ سے بھی واقف نہ تھے۔ انہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ پاکستان کی تخلیق کے محرکات کیا ہیں۔ اس میں مہاتما گاندھی کی منفی سیاست کا حصہ کتنا ہے اور انہوں نے قائداعظم کو کیسے مار گرایا ہے۔

ایک بات صاف ہے۔ انگریز پاکستان کے بہت خلاف تھے اور کانگرسی پروپیگنڈا تھا کہ جناح انگریزوں کا گماشتہ ہے جو آزادی نہیں چاہتا۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق مل جاتے تو



جناح اول درجے کا ہندوستانی قوم پرست ثابت ہوتا اور دونوں ملکوں کی حالت بدل کے رکھ دیتا۔ مسلمانوں میں ہندوستانی قوم پرست صرف جناح، ابوالکلام آزاد اور حسرت موہانی تھے۔ ہندوؤں میں گوکھلے، سی آر داس اور سبھاش چندر بوس، گاندھی، نہرو اور پٹیل ہندو قوم پرست تھے اور یہی وجہ تقسیمِ ہند کی ہوئی۔

## سازش

ملک عبدالمجید مولانا چراغ حسن کے نہایت محترم دوست تھے۔ وہ صحافت میں ان سے سینئر تھے اور ان کا کمال یہ تھا کہ صحافت میں مزاحیہ کالم کی ابتدا انہوں نے کی تھی۔ اس لیے مولانا ان کا از حد احترام کرتے تھے۔ وہ صبح دس گیارہ بجے دفتر میں آ بیٹھتے۔ مولانا سے گپ شپ کرتے اور بیچ بیچ میں کوئی فقرہ ایسا لگا جاتے جس سے معلوم ہوتا کہ مولانا چراغ حسن میاں صاحب کے اخبار میں کوئی غلط کام کر رہے ہیں۔ بعض اوقات وہ مولانا سے کہتے ''اٹھ مولوی تو یہاں کیا کر رہا ہے۔ بچوں کی زندگیاں تباہ نہ کر۔''

ملک عبدالمجید کا لاہور کے ادیبوں اور شاعروں پر بڑا اثر تھا۔ راج دربار میں بھی ان کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ وہ مشرقی علوم میں کسی قدر دسترس رکھتے تھے مگر کوئی گہری بات ان سے کبھی سرزد نہ ہوئی۔ ان کی ہر دلعزیزی سے ثابت ہوتا تھا کہ اگر آدمی عام گفتگو میں مزاحیہ انداز رکھتا ہے تو اس کے لیے بہت سے بند دروازے اپنے آپ کھل جاتے ہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اس کا مزاح اعلیٰ درجے کا ہو۔

ملک عبدالمجید صحافت سے ریٹائر ہو چکے تھے اور گزارے کے لیے حکومت کے خفیہ فنڈ پر بھروسہ کرتے تھے۔ گھر انہوں نے جوانی میں بنا لیا تھا۔ بچے ان کے برسر روزگار تھے۔ پنجاب کے گورنر صاحب سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی اور افسر بھی ان کی بات مان لیتے تھے۔

شروع شروع میں تو کسی نے کچھ خیال نہ کیا مگر آہستہ آہستہ جمال کو شبہ ہوا کہ ملک عبدالمجید کسی خفیہ مشن پر ہیں اور وہ مشن ہے اخبار کا اندر سے خاتمہ۔ ایک تو اس کی وجہ اس کی مسلم لیگ حکومت پر تنقید اور پاکستان میں زندگی کا دھارا بدلنے کی مہم تھی، دوسری اخبار کے اعلیٰ معیاروں پر ملک عبدالمجید کے دل کی جلن۔ ان کا اپنا اخبار مدت سے بند ہو چکا تھا مگر وہ چاہتے نہ تھے کہ مولانا چراغ حسن جو عمر میں ان سے چھوٹے اور علم میں ان کے بزرگ ثابت ہوئے تھے، بڑے استاد شمار ہوں۔

پنجاب کے گورنر نے ملک عبدالمجید کو جاسوس مقرر کر رکھا تھا اور ان کے ذریعے وہ مولانا کو غلط سلط پیغامات دیتے تھے۔

مولانا ایک ڈرپوک آدمی تھے۔ وہ ایک فنکار صحافی تھے جو جوڑ توڑ کی اہلیت نہ رکھتے تھے۔

## خون خرابہ

محبوب حیدر آبادی ایک عمدہ اداریہ نویس تھے اور کیمونسٹ قیادت کے قریب ہونے کی وجہ سے اخبار میں مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ مولانا ان کو طرح دے کر نکل جاتے تھے اور وہ بھی مولانا کا بے حد احترام

کرتے تھے مگر کچھ دنوں سے وہ بجھے بجھے سے تھے۔ وہ پہلے بھی ہر ایک سے کبھی کھلے نہ تھے مگر اپنے خاص حلقے میں ہنسی مذاق ان پر حرام نہ تھی۔ وہ لسانی تعصبات سے بالا تھے۔ سوشلزم پر یقین رکھتے تھے۔ اب یکدم ان کی طبیعت بدل گئی اور ایک تیوری ان کے ماتھے پر کنڈلی مار کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے مولانا سے بات چیت چھوڑ دی۔ اپنے کمیونسٹ دوستوں سے بھی پردہ کر لیا اور وہ بھی ان سے بچ کر نکلنے لگے۔ پھر کونوں کھدروں میں پراسرار باتیں ہونے لگیں۔ جمال کو کچھ پتہ نہ لگا مگر اس پر ظاہر تھا کہ اندر کوئی بہت گہرا گھاؤ لگ گیا ہے۔

اچانک محبوب حیدر آبادی نے اعلان کیا کہ آج میں اخبار کے مالک میاں صاحب کو گولی مار دوں گا۔ پستول انہوں نے سب کے سامنے ہوا میں لہرایا۔ اس پر سب گھبرا گئے مگر کوئی محبوب صاحب کے منہ نہ لگا۔

میاں صاحب اتفاق سے اس دن لاہور سے کہیں دور کسی گاؤں میں جلسہ کی تیاری کر رہے تھے، اس لیے بات اگلے روز پر ٹل گئی۔

## بات کھل گئی

مگر اگلے روز بات کھل گئی۔ میاں صاحب کراچی سے سن کر آئے تھے کہ محبوب حیدر آبادی لیاقت علی خان کے جاسوس ہیں اور کمیونسٹ پارٹی کے راز محکمہ داخلہ کو باقاعدگی کے ساتھ بتاتے ہیں اور اس بات پر محبوب صاحب میاں صاحب کو گولی مارنے پر تل گئے تھے۔

مگر اخبار کی تباہی کی یہی ایک وجہ نہ تھی۔ پنجاب کے گورنر نے مولانا کو ٹیلی فون کر کے چائے پر کچھ روز پہلے اسی سلسلے میں بلایا تھا۔

اخبار کی انتظامیہ بھی صحافیوں سے جلی بھنی رہتی تھی جو خبروں کے لیے اشتہار اتار کر پھینک دیتے تھے اور منیجر کی پروا نہ کرتے تھے۔

میاں صاحب بھی صحافیوں سے جلے ہوئے تھے کیونکہ اخبار ابھی تک گھاٹے میں چل رہا تھا۔ میاں صاحب نے اخبار ایک سیاسی مقصد کے لیے نکالا تھا مگر امیر آدمی، ترقی پسند اور انقلابی ہو کر بھی سرمایہ کاری پر منافع کا طلبگار ہوتا ہے۔ پھر انہیں بھڑکانے والے بھی بہت تھے۔

میاں صاحب نے انتظامیہ کے مشورے پر عمل کیا اور کہا کہ اب کے کارکن اپنی سالانہ ترقی نہ مانگیں اور اپنے اعلیٰ مقصد اور انقلاب کے لیے اسی تنخواہ پر کام کریں۔

اس ایثار کی کل میزان بیس روپے ماہوار فی کس کے حساب سے کل 180 روپے بنتی تھی۔ انتظامیہ نے میاں صاحب کو پڑھایا کہ اگر کارکنوں نے سالانہ ترقی چھوڑ دی تو اخبار منافع دینے لگے گا اور انقلاب کی منزل قریب آ جائے گی۔ کیسے کیسے سیانے لوگ بیس روپے میں اپنی سیاسی بصیرت بیچ دیتے ہیں!

کارکن شاید مان جاتے مگر دیکھا دیکھی سب نے کہا، ہم تو مزدوروں کے حقوق کے لیے لڑتے ہیں، اس لیے سالانہ ترقی ہم نہ چھوڑیں گے۔ انہوں نے دبی زبان میں بات کی تھی مگر انتظامیہ نے میاں



صاحب سے کہا ''کارکن دھمکیاں دے رہے ہیں۔'' اس پر میاں صاحب بگڑ گئے۔

مولانا سے ملک عبدالمجید نے کہا ''بچوں کو انتظامیہ سے مت پٹواؤ۔ ان کا ساتھ دو۔ یہ تمہارے شاگرد ہیں۔ انہوں نے تمہاری خدمت کی ہے۔''

مولانا نے کہا ''بے شک میں بچوں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔''

محبوب حیدر آبادی بولے ''میں نے تو میاں صاحب کو گولی مارنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔''

شام کو ملک عبدالمجید نے مولانا کے کان میں کہا ''تم لڑکوں کی روٹی کا فکر نہ کرو۔ میں نے اوپر بات کر لی ہے۔ حکومت ان کے لیے ایک نیا محکمہ کھول دے گی۔ جوہر قابل کی پاکستان کو سخت ضرورت ہے۔''

ملک عبدالمجید کو اس بات کا بھی غصہ تھا کہ مولانا نے اتنا اچھا اخبار کیوں نکالا ہے۔ وہ ایک مدت سے مولانا کے دل میں سیندھ لگا رہے تھے۔ اب اسباب پیدا ہو گئے تھے۔

مولانا کے شاگرد بے حد وفادار تھے اور ان کے کہنے پر کٹ مرنے پر تیار۔ مولانا بے حد معصوم اور ڈرپوک۔ میاں صاحب ایک مالک کی حیثیت سے احمق اور حکومت بے حیا اور بدنیت۔ ملک عبدالمجید کو بہت زیادہ کاوش نہ کرنی پڑی۔

اسی شام اخبار کے سارے کارکنوں نے استعفے دے دیئے۔ مولانا جانتے تھے کہ کوئی بہت بڑی غلطی ہو رہی ہے مگر ان میں ہمت نہ تھی کہ وہ محبوب حیدر آبادی اور ملک عبدالمجید کے ساتھ بات کر سکیں۔ یہ ایک مرگِ انبوہ تھا اور اس میں جشن کی سی کیفیت تھی۔ اندر سب کے دل بیٹھے ہوئے تھے۔ اوپر سب کے چہروں پر بشاشت تھی۔

ملک عبدالمجید کا کام ہو چکا تھا۔ وہ دوپہر ہی کو گھر چلے گئے تھے۔

وہ ایک دور تھا جو اچانک ختم ہو گیا۔ کارکن کچھ روز مولانا کے گھر بیٹھے رہے، بالآخر مولانا جھلا گئے اور کہنے لگے ''نوکریاں کیا درختوں پر اُگی ہیں؟ استعفے آپ لوگوں نے اپنی مرضی سے دیئے تھے۔'' حکومت نے کارکنوں کے لیے کوئی محکمہ نہ کھولا۔

## پس چہ باید کرد

جمال کے پلے پھوٹی کوڑی نہ تھی اور یہی حال بالعموم سب کا تھا۔ کچھ دن جذبے اور جنون میں گزر گئے مگر پھر بھوک نے آ لیا۔ مولانا اپنے شاگردوں کو انگلی لگا کر بعض بڑے پبلشروں کے ہاں گئے اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ اگر وہ اخبار نکالیں تو اس میں منافع ہو گا۔

''کتنی رقم درکار ہو گی؟'' ایک نے پوچھا۔

مولانا نے حساب لگا کے بتایا کہ شروع میں پانچ لاکھ......اور منافع کتنا ہو گا اور کب؟

''چھ ماہ کے بعد۔ انشاء اللہ ایک لاکھ ماہوار۔'' مولانا بولے۔

پبلشر نے سنجیدگی سے کہا ''مولانا آپ کو حساب کتاب کا تجربہ نہیں۔ میں آپ کو ایک ایسی ترکیب بتا دوں جس سے آپ چھ ماہ کے بعد چھ لاکھ روپیہ کما لیں۔''

''جی فرمایئے۔''

''آپ اخبار نکالنے کا خیال چھوڑ دیں اور پانچ لاکھ روپے تو آج ہی کما لیں۔ باقی ایک لاکھ جو آپ چھ ماہ کے بعد کمائیں گے، وہ اس میں جمع کر لیجیے۔''

کچھ عرصے کے بعد مولانا کو ریڈیو پاکستان نے کراچی بلوا لیا۔ انہیں ایک قومی پروگرام کی ضرورت تھی۔ مولانا کی حد تک گورنر صاحب سرخرو ہو گئے تھے۔ تھوڑے عرصے کے بعد ملک عبدالمجید خان کی تبدیلی بھی کراچی میں ہو گئی۔

تھوڑے دن اور گزرے تو جمال کو بھی ریڈیو پاکستان نے تار دے کر بلوا لیا اور یہ مہربانی مولانا نے کی تھی۔

مولانا کو ریڈیو کے لیے لکھنے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ جمال بھی اسے سمجھتا نہ تھا مگر چونکہ وہ اخبار میں فیچر لکھنے کا بانی تھا اور ریڈیو میں بھی فیچر لکھے جاتے تھے۔ اس لیے مولانا نے اسے نوکری دلوا دی مگر ریڈیو اور اخبار کے فیچر میں فرق ہوتا ہے۔ یہ بات استاد شاگرد دونوں نہ سمجھے۔



## باب 19

جمال بیوی، ایک بچی، بستر اور ایک ٹرنک لے کر کراچی جا پہنچا۔ شہر کشادہ اور ہوادار تھا۔ اندر کی آبادیاں کچھیوں، میمنوں، خوجوں اور مکرانیوں پر مشتمل تھیں جو اپنے آپ کو سندھی نہ کہتے تھے۔ پارسی صدر کے اردگرد آباد تھے۔ ہندو کونوں کھدروں میں رہتے تھے۔ کراچی کے پرانے باشندوں میں کوئی تضاد نہ تھا۔ مہاجرین اس زمانے میں گاڑی کھوکھرا پار کے راستے یا بحری جہاز میں بمبئی سے ہو کر معہ ساز و سامان بڑے اطمینان سے کراچی آ رہے تھے۔

**اے کراچی شاد باد!**

مہاجرین کا پہلا ریلا تو پنجاب نے بڑی خوش اسلوبی سے سینے پر سہار لیا تھا اور متروکہ جائیدادیں، مکان، دکانیں اور زرعی رقبے ان کے حوالے کر دیئے تھے۔ کراچی میں ابھی ہندو سکھ چین سے بیٹھے تھے مگر ان پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک بڑی تعداد کراچی میں مہاجرین کی بھی تھی جنہیں پنجاب میں جائیدادیں الاٹ ہو گئی تھیں، مگر وہ انہیں بیچ بیچ کر کراچی آ رہے تھے تاکہ دوبارہ الاٹمنٹ کروا سکیں۔ ہندوستان سے عزیز و اقارب کو بلوایا جا رہا تھا کہ یہاں آؤ۔ نوکری بھی ہے اور گھر بھی ہے۔

کراچی کے چیف کمشنر نے جو یو پی کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے، کراچی میں ایک چھوٹا سا فساد کروا دیا اور ہندو آن کی آن میں شہر خالی کر گئے۔ وہ کالی دیوی اور شوجی کے پجاری بھی تھے مگر اکثریت ان کی گورو نانک کو اوتار مانتی تھی اور گرنتھ صاحب کا پاٹھ کرتی تھی۔ وہ سکھ نہیں تھے۔ وہ کیس بھی نہ رکھتے تھے۔ وہ وحدت پرست تھے اور شاہ عبداللطیف، میر معصوم بھکری، سیہون شریف اور مخدوم نوح کے عقیدت مند بھی تھے۔

ان کے مقابلے میں مہاجرین مغرور تھے۔ سندھی بولنے والوں کو کمتر سمجھتے تھے اور اپنی الگ شناخت پر اصرار کرتے تھے۔ ہندوؤں کا فساد کے ذریعے کراچی سے نکالا جانا سندھیوں کو برا لگا۔

سندھیوں نے مہاجرین کو کھلے دل سے قبول کیا تھا مگر ان کے تہذیبی احساس برتری اور سیاسی غلبے کی وجہ سے دلوں میں کدورت پیدا ہو رہی تھی۔ سندھی وزیر وڈیرے تھے جو نوابزادہ لیاقت علی خاں کی علی گڑھی

افسر شاہی کو کسی طور ناراض کرنا نہ چاہتے تھے۔

جس طرح پاکستان زمینداروں کی جاگیر بن گیا تھا، اسی طرح ریڈیو پاکستان پر سید ذوالفقار علی شاہ صوبیدار تھا۔ اس نے مولانا چراغ حسن کو پوری آزادی اور ناکام ہونے کا پورا موقع دیا۔ ریڈیو کے لکھنے والوں کو سب سے پہلے ذاتی اسلوب ترک کرنا پڑتا ہے۔ مولانا جو نہیں جانتے تھے کہ کاغذ پر لکھے ہوئے لفظ اور بولے ہوئے لفظ میں کیا فرق ہوتا ہے، فوراً ہی گھبرا گئے اور انہوں نے جمال اور اس کے ساتھ کے دونوں لکھنے والوں کو ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی۔

## پاکستانی کلچر

اس زمانے میں پاکستانی کلچر پر بحث جاری تھی۔ ایک وفاقی سیکریٹری نے کتاب لکھی تھی، جس میں کہا تھا کہ پاکستانی کلچر انڈو اسلامک کلچر کا تسلسل ہے جس کے مراکز اب دہلی اور لکھنؤ سے اٹھ کر لاہور اور کراچی میں آ بسے ہیں اور یہی بات صحیح تھی مگر نوابزادہ لیاقت علی خاں کے ارادے کچھ اور تھے۔ وہ پاکستان کو ایک اسلامی ملک بنانا چاہتے تھے تاکہ نجی ملکیت کے تقدس کی آڑ میں مسلم لیگیوں کی جاگیرداریاں محفوظ ہو سکیں اور پاکستان میں بنیادی تبدیلیاں روکی جا سکیں۔ انہوں نے کہہ دیا کہ یہ مملکت خداداد پاکستان ہے۔ اسی لیے اس کے کلچر سے ہندو روایت کو خارج کر دینا چاہیے۔ ذوالفقار علی نے ریڈیو پاکستان کے افسروں کی ایک میٹنگ بلا کر تجویز پیش کی کہ سب سے پہلے ٹھمری کی گائیکی ختم کر دینی چاہیے کیونکہ اس کے بول زیادہ تر ہندو ثقافتی روایات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اسلامی کلچر سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اس پر حاضرین مجلس نے واہ واہ کی۔

پھر ایک دل جلا بولا ''مگر حضور کیوں نہ ہم ٹھمریوں کے بول بدل دیں؟''

سید ذوالفقار نے کہا ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

جمال کو سرکاری نوکری کے آداب کا پتہ نہ تھا۔ وہ اچانک بول اٹھا کہ ''جناب یہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً بھیرویں کی ٹھمری ہے۔ موری بہیاں نہ مرورو کرشن مراری۔ اس کو یوں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ موری بہیاں نہ مرورو میاں عبدالباری......''

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔ سید صاحب نے جمال پر غصے کی نظر ڈالی مگر منہ سے کچھ نہ کہا اور یہ بات خطرناک تھی کیونکہ سید صاحب کینہ دل میں رکھتے تھے۔

پھر جمال نے دیکھا کہ سید صاحب نے ریڈیو پاکستان کے ایک سٹوڈیو پر قبضہ کر لیا ہے جس کے اندر جانے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ اس میں ان کے ساتھ ایک طبلے والا ٹھیکہ لگاتا ہے اور ایک میوزک ڈائریکٹر ٹھمری کے ہندوانہ بولوں کے ماترے گن کر بتاتا ہے۔ اس پر سید صاحب جو شاعر بھی تھے، ٹھمری کے لیے بول تصنیف فرماتے۔ اپنا تخلص انہوں نے سدا رنگ کے مقابلے میں خوش رنگ رکھ لیا تھا۔ جب تک وہ رہے ریڈیو پاکستان کے ملازم گویے اور کمپوزر ان کی کہی ہوئی ٹھمریاں لگاتے رہے مگر ٹھمری اکال پاکستانی کلچر



بھی ان کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ اس پر رفیق غزنوی ان کے لتے لیتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ سید صاحب کو موسیقی کا کچھ پتہ نہیں۔ اگر سید صاحب اس سے جھگڑا کرتے تو وہ ان کا پول کھول سکتا تھا۔ اس لیے وہ اس کے سامنے چپ رہتے۔

لیاقت علی خاں کے تصورات کو مہاجر انتظامیہ نے پلے باندھ لیا تھا اور پاکستانی کلچر کی ایجاد کی مہم جاری ہو گئی۔

پھر ایک بڑا بحران پیدا ہو گیا۔ قائداعظم کی برسی پر محترمہ فاطمہ جناح نے جو پیغام بھیجا اس میں انہوں نے حکومتِ پاکستان پر کھلے لفظوں میں تنقید کی تھی۔ اب یہ جرأت کسی میں نہ تھی کہ وہ محترمہ کو تقریر تبدیل کرنے کی درخواست کرے مگر جو کچھ انہوں نے کہا تھا، وہ بھی حکومت کے لیے قابلِ برداشت نہ تھا۔

سید صاحب نے کہا ''اس تقریر کے دوران میں ریکارڈنگ کو خود کنٹرول کروں گا۔ خبردار کوئی سٹوڈیو کے قریب بھی نہ آئے۔'' پھر سید صاحب نے تقریر کے قابلِ اعتراض حصے کو نشر کرتے ہوئے گھنڈی مروڑ دی اور چند لمحوں کے لیے ریڈیو خاموش ہو گیا مگر محترمہ نے شور مچا دیا اور اخبارات میں خبر لگ گئی کہ محترمہ فاطمہ جناح کی تقریر سنسر کر دی گئی ہے۔

جمال کو درباداری کا مذاق نہیں تھا۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ سید صاحب سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ کسی بات پر وہ ان سے دلیل بازی کرنے لگا۔ سید صاحب نے تو کچھ نہ کہا مگر ریڈیو کے سارے افسر اس کے دشمن ہو گئے۔

ذوالفقار علی نے جمال کو گھر میں طلب کیا اور کھرج کی آواز میں اسے زندگی کی اونچ نیچ سمجھانا شروع کر دی۔

ذوالفقار بڑے شاندار اور وضع دار بزرگ تھے۔ لباس ان کا بانکا ہوتا تھا۔ وہ اعلیٰ درجے کے ایکٹر تھے۔ بات کٹیلی کرتے تھے۔ جمال نے اچانک ان کی بات کاٹ کر کہا ''اب آپ اتنا بھی نہ بنیے۔ اتنی گھمبیر آواز نہ بنایئے۔ آپ کی دی ہوئی عقل سے میں بھر پایا۔ زیادہ سے زیادہ آپ مجھے نوکری سے برخاست کر سکتے ہیں تو اتنا سمجھ لیجیے کہ میں اتنا مردہ دل نہیں کہ ریڈیو میں پچیس برس نوکری کر کے ریٹائر ہو جانے کی سوچوں۔ آپ سیدھے سیدھے چائے بنا کر پیش کیجیے، میں آپ کا مہمان ہوں......''

ذوالفقار علی چلتا تھا تو ریڈیو پاکستان کی زمین کانپتی تھی۔ وہ جمال جیسے معمولی آدمی سے اس قسم کے جوابی حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ گھبرا گیا مگر گرگِ باراں دیدہ تھا۔ فوراً ہی پینترا بدل کر پنجابی میں کہنے لگا ''یار توں میرے توں وڈا بدمعاش ایں۔''

مولانا روزانہ اخبار کے آدمی تھے۔ وہ پیشگی پلاننگ نہ کر سکتے تھے۔ پروگرام میں گڑبڑ ہوئی تو پروڈیوسر سے ان کی تو تو میں میں ہونے لگی۔ پھر مولانا نے کہنا شروع کر دیا ''میرے سیکشن میں کوئی املا لکھنا بھی

نہیں جانتا۔ میں اکیلا کیا کیا کروں۔''

ذوالفقار علی نے کہا ''تو ان کو نکال دیا جائے؟''

''جی ہاں۔'' مولانا بولے ''ایسے آدمی لائیے جو ریڈیو کے مزاج سے واقف ہوں۔''

ذوالفقار علی نے جمال کی چھٹی کرادی۔

اس لیے بھی کہ ایک اقلیم میں دو بدمعاش نہ رہ سکتے تھے۔ جمال کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی مگر وہ کٹ کھنا اور بڑبولا تھا۔ کسی بھی جگہ ذوالفقار علی کے آگے بول سکتا تھا مگر مولانا سنبھل نہ سکے اس کے جانے کے بعد۔ ایک دن جب میٹنگ میں ان پر تنقید ہوئی تو بولے ''جمال ہی ایک کام کا آدمی تھا اسے آپ نے نکال دیا۔ اب میں اکیلا کیا کیا کروں......''

کچھ دنوں کے بعد مولانا نے بھی استعفیٰ دے دیا، پھر لاہور چلے گئے۔ گھر میں وقت انہوں نے کبھی گزارا نہ تھا۔ زندگی دشوار ہوگئی۔ دوستوں سے میل ملاقات چھوٹ گئی۔ بیروزگار شخص بہت ہی اکیلا ہوتا ہے، چاہے وہ مولانا جیسا منتخب روزگار ہی کیوں نہ ہو۔ پھر انہیں دل کے عارضے نے آ لیا۔ سگریٹ چھوٹے' شراب چھوٹی اور ہیرا منڈی کا راستہ چھوٹا۔ یوں بھی اب وہاں کوئی گانے والی باقی نہ رہی تھی۔

ان کی اچانک موت ان کی نجات بن گئی۔

ان کے جنازے پر کوئی بہت بڑا ہجوم بھی نہ ہوا۔ ان کے پرانے دوست ہی کندھا دینے کے لیے آئے۔ جمال کو اتنی توفیق بھی نہ ہوئی۔ وہ ان دنوں کراچی میں گدھا گاڑی چلاتا تھا۔

## گدھا گاڑی چلی

گدھا گاڑی چلانے کا کام جمال نے از خود اختیار نہ کیا تھا۔ اس نے اپنے ایک دور کے چچا کی دکان پر قلی اور بالآخر منیجر بن جانے کی نوکری کی تھی، فی الحال وہ شاگرد پیشہ تھا۔

خواجہ یٰسین کے کچھ دوست ان دنوں حکومتِ پاکستان میں بااثر تھے۔ ملک میں ہر چیز کی قلت تھی اور مال تجارت کی درآمد کے لیے لائسنس ملتے تھے۔ خواجہ یٰسین نے اپنے دوستوں کی مدد سے موٹروں کے پرزے درآمد کرنے کے لیے ایک ہزار روپے کا لائسنس لے لیا۔ انہیں اس کام کا تجربہ نہ تھا اس لیے وہ اپنے ایک عزیز کے پاس گئے۔ اس نے کہا ''تم کہاں دھکے کھاتے پھرو گے۔ لاؤ اس پر ایک ہزار منافع لے لو۔ میں دکاندار ہوں، پرزے بیچ لوں گا۔'' خواجہ یٰسین بہت خوش ہوئے مگر وہ بہت سادہ لوح تھے۔ انہیں یہ بھی پتہ نہ چلا کہ یہ لائسنس مستقل ہے، اس پر ہر سال مال منگوایا جا سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی اس بزرگ نے خواجہ یٰسین سے کہا ''سنا ہے تمہارا جمال بالکل نکما ہے۔ اسے میرے حوالے کر دو، میں اسے کام سکھا دوں گا۔''

وہ چالاک دکاندار شروع زندگی میں ایک بس کنڈیکٹر تھا۔ پھر اس نے بس خرید لی، پھر پرزوں کی



دکان کھول لی۔ وہ انگریزی سے نابلد تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی ایسا آدمی اس کے ہاتھ لگ جائے جو انگریزی میں خط و کتابت کر سکے۔

جمال کو سب سے پہلے ٹائپ سیکھنی پڑی۔ اس پر فرم کا ٹائپسٹ اس کا دشمن ہو گیا کہ یہ مجھے نوکری سے فارغ کرائے گا۔

ٹائپ سیکھنے کے ساتھ ساتھ جمال کو سال بھر کے حسابات کی میزان چیک کرنے پر لگا دیا گیا۔ شام کو جب وہ سر اٹھاتا تو اس کی گردن اکڑی ہوئی ہوتی۔

اس پر اکاؤنٹنٹ اس کا دشمن ہو گیا کہ کل کا لونڈا چلا ہے میری غلطیاں نکالنے۔ وہ دبی زبان سے مالک سے اس کی شکایتیں کرنے لگا۔

کام سیکھنے کے سلسلے میں جمال کو مال بندرگاہ سے چھڑانے اور ریلوے سٹیشن پر بک کروانے کے لیے گدھا گاڑی پر جانا پڑتا۔ بلٹی، بل آف لینڈنگ اور اس قسم کے الم غلم اس کی سمجھ میں نہ آتے تھے مگر اس نے کام سیکھنے کی پوری کوشش کی۔ وہ گدھا گاڑی پر بیٹھ کر کیماڑی اور بندر روڈ کے چکر لگاتا اور ریڈیو کی بلڈنگ کے سامنے سے گزرتا جس میں وہ سٹاف آرٹسٹ کے عہدے پر فائز پاکستانی کلچر کی گتھیاں سلجھایا کرتا تھا۔ جب کبھی گدھا گاڑی والا چھٹی کر لیتا تو جمال کو مال لاد کر گدھا گاڑی خود بھی ہانکنی پڑ جاتی۔ گدھا بہت بلند اخلاق کا مالک تھا۔ کبھی کبھار جمال کے کپڑوں پر اچانک پیشاب کے چھینٹے اڑا دینے کے علاوہ اس نے جمال کے ساتھ ہمیشہ تعاون کیا۔

وہ اپنی بیوی اور ایک بچی کے ساتھ ایک کمرے میں رہتا تھا۔ دونوں میاں بیوی زندگی سے مطمئن تھے۔

جمال شاید کام سیکھتا رہتا مگر اس کی بدنصیبی کہ مالک کی اس کے حصہ دار سے صلح ہو گئی۔ جمال اب غیر ضروری ہو گیا اور اس کے دور کے چچا جس نے خواجہ یٰسین کے ایک ہزار روپے کے لائسنس سے ستر ہزار کمائے تھے اور یہ چکر جاری تھا جمال کی توہین کرنا شروع کر دی۔ ایک دن جب پیٹی اٹھاتے ہوئے موبل آئل کا ایک ڈبہ پھٹ کر جمال کی پتلون پر بہہ گیا تو اس نے کہا، تم بے وقوف اور تمہارا باپ بھی بے وقوف۔ اس کو پتہ ہی نہ چلا کہ میں نے اس سے لائسنس ہتھیا لیا ہے۔ جمال نے مہینے کی تنخواہ چھوڑی اور کود کر دکان سے باہر نکل گیا۔

## لٹ پٹ کر آئے

یہ دکان ریڈیو پاکستان کے دفتر کے سامنے واقع تھی۔ جمال سڑک پر آ کر سوچنے لگا کہ میں کیا کروں، کدھر جاؤں اور گھر کے اخراجات کیسے پورے کروں۔ بندر روڈ اس زمانے میں اتنی پر شور نہ تھی۔ اِکا دُکا ہی بسیں اُدھر سے گزرتی تھیں۔ لوگ چار پہیوں والی گھوڑا گاڑی استعمال کرتے تھے مگر اس روز جمال کے

کھڑے کھڑے گھوڑا گاڑیوں کا تانتا بندھ گیا۔ ان میں گندے میلے مسافر تھے جن کے چہرے ہشاش بشاش تھے۔ وہ ٹرنک، بستر، بھانڈے، برتن اور الم غلم ساتھ لائے تھے۔ جمال سمجھ گیا کہ یہ لوگ بمبئی سے جہاز میں بیٹھ کر بڑے سکون سے کراچی پہنچے ہیں۔ ایک گھوڑا گاڑی اسے بہت دلچسپ لگی۔ اس میں بے شمار بچے تھے۔ گٹھڑی پر گٹھڑی چڑھی ہوئی تھی مگر طوطے کا ایک پنجرہ بھی سامان پر رکھا ہوا تھا۔ جمال نے سوچا کہ میں تو جنم سے مہاجر ہوں۔ کاش کہ مجھے بھی سر چھپانے کو کہیں ٹھکانہ مل جائے مگر اسے پتہ تھا کہ میں ہندوستانی نہیں۔

## جھگی میں بسیرا

اگلے روز جمال کے ایک جاننے والے نے کہا، گولی مار کے علاقے میں مہاجرین جھگیوں میں مقیم ہیں۔ برسات میں یہ علاقہ ڈوب جاتا ہے۔ حکومت نے ان کے لیے پکی پناہ گاہیں بنا رکھی ہیں۔ ان میں سے ایک میں عارضی طور پر تمہارے لیے کھلوا دیتا ہوں۔

اس زمانے میں چنیل پاڑے سے آگے کا علاقہ ایک بہت بڑا ویرانہ تھا۔ ندی کے پل سے اترتے ہی جھگیوں کا جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ ان میں رہنے والے اس امید میں کہ ہمیں بھی کوئی جائیداد یا پلاٹ مل جائے گا، یہاں بسیرا کرتے تھے۔ وہ دن میں ٹھیلہ لگاتے تھے یا سائیکل رکشہ چلاتے تھے۔

بیچ میں کھارے پانی کا ایک کچا کنواں تھا جس میں سے پناہ گیر عورتیں پانی نکالتی تھیں۔ بچے ننگے بدن گلیوں میں کھیلتے تھے۔

جمال کی بیوی ایک نیک سیرت عورت تھی۔ وہ گندے بچوں سے شفقت کا سلوک کرتی اور جب کھارے پانی کے کنویں سے ڈول کھینچتی تو غریب مہاجر عورتوں سے ہنس کر بات کرتی۔ اس نے ان میں بعض ہم عمر لڑکیوں کو سلائی کا کام سکھانا شروع کر دیا۔

جس بیرک میں وہ آباد تھے، اس میں کوئی دروازہ نہ تھا مگر جمال کے ہاں لٹنے کو کچھ تھا بھی نہیں۔ ایک سٹوو، ایک صندوق میں باورچی خانے کا سامان اور دو چار پائیاں چوروں کے لیے سب بیکار۔

بیرک کے پچھواڑے میں جنگل تھا جس میں رات کو گیدڑ شور مچاتے اور کتے بھونکتے۔ درختوں پر عجیب سی تھوتھنی والے چوہے پھدکتے اور ہلکی ہلکی چیخیں مارتے۔ سانپوں کی سیرگاہ تو یہ جگہ تھی ہی، انہیں کے ڈر سے چوہے درختوں پر رہتے تھے۔

اتوار کے دن بیدل جمال کے گھر آ جاتا اور شام تک گپ شپ چلتی۔

بیدل صحرائی مشرقی پنجاب کا مہاجر تھا۔ پاکستان لٹنے کے بعد مفتی کے گھر ترقی پسند مصنفین کی ترتیبِ نو کے لیے میٹنگ ہوئی تو اس میں صحرائی بھی شامل تھا۔ ان دنوں وہ ریڈیو پاکستان کے شعبۂ خبر میں ملازم تھا۔ ابھی اس نے کھل کر لکھنا شروع نہ کیا تھا اور کسی کو اندازہ نہ تھا کہ یہ خاموش اور سنجیدہ دیہاتی آگے چل کر کیسا جوگی نکلے گا۔ شعر میں منفرد راستہ نکالے گا۔ مزاح نویسی میں یکتا ہوگا اور [illegible]



چرنوں میں پانی بھریں گے۔

بیدل اندر سے بہت دکھی تھا۔ جب اس کی شادی ہوئی تو وہ چھٹی جماعت کا طالبِ علم تھا۔ جوان ہوا تو اس پر چھوٹی بہن بھائیوں کی پرورش کا بوجھ پڑ گیا۔ اس لیے اسے دو دو نوکریاں کرنی پڑتیں۔

دو دو نوکریوں کے باوجود وہ پڑھنے کے لیے وقت نکال لیتا اور پیارے پیارے اداس کر دینے والے شعر کہتا۔

ادھر جمال حال مست دنیاداری سے بے پروا، بے فکر اور مہم جو، ہر حال میں خوش!

## خواجہ نعیم پدھارے

جھونپڑیوں کے نام پتے نہ تھے۔ گلیاں بھی خودساختہ تھیں مگر بارش کے لیے بنی ہوئی بیرکیں پکی تھیں جن میں جمال رہتا تھا۔ اس کا کوئی ایڈریس نہ تھا مگر ایک روز سیالکوٹ والے خواجہ نعیم پوچھتے پچھاتے جمال کی جھونپڑی تک آ پہنچے۔ انہوں نے نیا سوٹ پہن رکھا تھا۔ بوٹ ان کے چم چم کرتے تھے جن پر دھول جم چکی تھی۔ بیوی نے جلدی سے چائے بنائی۔ ان میں دوستوں کی تمام صفات تھیں۔ وہ میٹھی میٹھی باتیں کرتے تھے مگر پیٹھ پیچھے ہر ایک میں کیڑے ڈالنا ان کی سرشت میں شامل تھا۔ جن کی مالی حالت خراب ہوتی ان کو وہ بڑی حقارت سے دیکھتے مگر جمال کو کسی اونچ نیچ کی پرواہ نہ تھی۔

خواجہ نعیم اس کے اکھڑپن سے واقف تھے۔ انہوں نے اس کی انا کو کوئی ٹھیس نہ پہنچائی۔ حالات زمانہ پر انہوں نے لعنت بھیجی۔ جمال کی اصول پسندی اور عزتِ نفس کی بے حد تعریف کی۔ جس کی وجہ سے اس نے پاکستان میں لوٹ مار نہ کی۔ جمال منتظر تھا کہ خواجہ نعیم کب بر سرِ مطلب آتے ہیں۔ اسے پتہ تھا کہ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس میں ان کا فائدہ نہ ہو مگر خواجہ صاحب نے اس دن کوئی ایسی بات نہ کی جس میں ان کا فائدہ ہو۔ جمال اس بات پر حیران تھا کہ ان کو مجھ سے اتنی محبت تو نہیں کہ وہ اس کی خاطر گولی مار کے غریب اور گندے علاقے میں آئیں۔ بات کیا ہے؟

خواجہ صاحب اٹھتے ہوئے بولے ''بھئی مجھ سے تمہارا یہ حال دیکھا نہیں جاتا۔''

جمال نے کہا ''کیا فرق پڑتا ہے جی؟ یہ وقت بھی گزر ہی جائے گا۔''

''یقیناً۔'' خواجہ صاحب بولے ''وقت سدا ایک سا نہیں رہتا اور تم تو بہت بہادر اور مغرور آدمی ہو مگر میں ایک کمزور آدمی ہوں۔ مجھے تمہارا رہن سہن دیکھ کر بڑی تکلیف ہوئی ہے۔ اگر تمہاری ناراضگی کا خوف نہ ہوتا تو میں تمہیں کچھ رقم بھی پیش کرتا مگر ہمت نہیں پڑتی۔''

''جی آپ کا شکریہ خواجہ صاحب۔'' جمال نے کہا۔

''اب چونکہ تم رقم لینے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہو اس لیے میں کچھ کہہ نہیں سکتا مگر میری ایک بات تم ضرور مان لو۔''

''جی میں تو ہر بات مانتا ہوں خواجہ صاحب۔''

خواجہ نعیم بولے''بھئی تم برا نہ ماننا۔ کم سے کم تم یہ جھونپڑی چھوڑ دو۔ تمہارے چاروں طرف مجرم اور غنڈے رہتے ہیں اور تمہاری معصوم بیوی اور چھوٹی بچی اکیلے ہوتے ہیں دن بھر......''

''جی نہیں یہ غنڈے اور مجرم نہیں ہیں، مہاجر ہیں۔ بال بچے دار ہیں اور مصیبت زدہ ہیں۔''

''تو غنڈے اور مجرم ہی ہوئے نا۔ جن کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ وہ غنڈے اور مجرم ہی ہوتے ہیں۔ نہ گھر نہ جائیداد، نہ ذات نہ پہچان۔ ان کا کیا بھروسہ۔ یہاں سے جائیں گے تو کہیں اور جھگی ڈال لیں گے۔''

''جی نہیں۔ یہ لوگ بہت شریف ہیں خواجہ صاحب۔''

''مگر میرا دل بہر حال ڈرتا ہے۔ میری خاطر تم......''

جمال چڑ گیا اور بولا''مگر میں کہاں جاؤں آخر۔ پگڑی کہاں سے لاؤں۔ کرایہ کیسے دوں۔ میرے پاس تو کچھ ہے نہیں۔''

''اسی لیے تو میں آیا ہوں برخوردار۔''خواجہ نعیم بڑی محبت سے بولے''میں تمہاری خدمت کے لیے آیا ہوں۔ میں نے یہاں بندر روڈ پر ایک بلڈنگ خریدی ہے۔ اس میں ایک فلیٹ خالی پڑا ہے۔ اسی میں تم اٹھ آؤ۔''

خواجہ نعیم کی بات میں بڑا خلوص تھا۔ جمال کی آنکھوں میں ممنونیت کے آنسو آ گئے۔ اس نے کہا

''آپ نے مجھ پر بڑی مہربانی کی۔ بڑا احسان کیا۔''

''احسان کی کوئی بات نہیں۔''خواجہ صاحب بولے''یہ تو میرا فرض تھا۔ آخر میں تمہارا بزرگ اور دوست بھی تو ہوں اور دوستوں کو دوستوں کے کام آنا ہی چاہیے۔ تو میرے خیال میں تم آج ہی اٹھ آؤ۔''

''مگر میں جگہ تو دیکھ لوں پہلے۔''

''ہاں ہاں میرے ساتھ چلو۔ پھر سامان لے آؤ آج ہی۔ ابھی پورا دن پڑا ہے۔''

''بہتر خواجہ صاحب۔''

''تم فی الحال مجھے چالیس روپے ماہوار کرایہ دے دینا۔ ایڈوانس تو تمہارے پاس ہوگا نہیں۔''

جمال کچھ ٹھٹھکا۔ کراچی میں ان دنوں فلیٹ کا کرایہ پندرہ بیس روپے ماہوار ہی ہوتا تھا مگر ان کی پگڑی دینی پڑتی تھی۔ اس لحاظ سے چالیس روپے ماہوار بہت زیادہ تو نہیں تھا مگر جمال کی جیب خالی تھی۔ پھر خواجہ صاحب کی اتنی ڈھیر ساری ہمدردی کے کیا معنی؟ مگر وہ بلڈنگ دیکھنے کے لیے ان کے ساتھ چلا گیا۔

راستے میں اس پر کھلا کہ خواجہ نعیم کو بلڈنگ کی حفاظت کے لیے چوکیدار رکھنا پڑتا تو اسے تنخواہ دینی پڑتی اور رہنے کو جگہ بھی۔ جمال کے وہاں ہونے سے بلڈنگ کی حفاظت بھی ہو سکتی تھی۔ چوکیدار کی تنخواہ بھی بچ



جاتی اور کرایہ بھی آنے لگتا۔

مگر خواجہ نعیم نے اتنی مہربانی اور کر دی کہ جمال کرایہ اس وقت دے جب وہ دے سکے اور پھر بقایا جات یکمشت ادا کر دے۔

فلیٹ میں تین کمرے تھے۔ جمال کو یہ خواب کی طرح حسین لگا مگر وہ فوراً منتقل نہ ہو سکتا تھا۔ اس کے پاس سامان اٹھوانے کے پیسے نہ تھے۔ اس نے چابی لے لی کیونکہ خواجہ صاحب کو اسی روز سیالکوٹ روانہ ہو جانا تھا۔ رخصت ہوتے وقت انہوں نے جمال کو بلڈنگ کی حفاظت کے سلسلے میں ہدایات دیں۔ خط لکھتے رہنے کی تاکید کی اور ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔

ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے انہوں نے کہا''میری صرف ایک شرط ہے جمال۔ کرایہ باقاعدگی سے ملے اور جب میں کہوں تم یہ فلیٹ اسی وقت خالی کر دو۔ جب میں کہوں چاہے تمہیں پھر کسی جھگی میں جانا پڑے۔''

''بہت بہتر۔''

''وعدہ کرو۔''

''وعدہ جی۔ پکا وعدہ۔''

''اچھا خدا حافظ۔''

## انڈر گراؤنڈ کمیونسٹ

نذر محمد بہاولپور کا ایک ٹھیکیدار تھا۔ جمال کو یاد نہ تھا کہ اس سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی۔ وہ بہت اچھے کپڑے پہنتا تھا اور لگتا تھا کہ بہت امیر آدمی ہے۔ وہ اچھے شعر کہتا تھا، اچھی باتیں کرتا تھا۔ بے تکلف تھا، ہمدرد تھا، دوستوں پر فدا ہوتا تھا۔

نذر محمد کراچی میں کوئی مشاعرہ پڑھنے آیا تھا مگر اس نے دوستوں کو بتا دیا کہ میں کمیونسٹ پارٹی کے حکم پر انڈر گراؤنڈ ہوں۔ میرے ذمہ کچھ اہم فرائض ہیں جن کی خاطر مجھے کبھی نظروں سے اوجھل بھی ہو جانا پڑتا ہے مگر بہاولپور میں میرا گھر ہی پاکستان کمیونسٹ پارٹی کا ہیڈ کوارٹر ہے۔

کمیونسٹ پارٹی کی جمال کے دل میں بہت زیادہ عزت تھی۔ وہ اسے انسانیت کا مستقبل سمجھتا تھا مگر اس کا خیال تھا کہ اس کا ہیڈ کوارٹر لاہور میں ہے۔ اب اسے معلوم ہوا کہ اس کا صدر دفتر نذر محمد کے گھر بہاولپور میں واقع ہے۔ لاہور میں جو کچھ ہے، وہ محض دکھاوا ہے۔

نذر محمد نے کہا''انقلابی کام سے مجھے فرصت نہ تھی مگر بیدل سے تمہارے حالات سن کر چلا آیا۔ میرے پاس اس وقت چالیس روپے ہیں۔ یہ تم لے لو۔ ان سے فی الحال روٹی چلاؤ۔ میں انقلابی فرائض سے فارغ ہو جاؤں تو تم میرے ساتھ بہاولپور چلے جانا۔''

اس نے جمال کی بچی کو بہت پیار کیا اور باورچی خانے میں جا کر پیڑھی پر بیٹھ گیا۔ جس طرح گھر

کے لوگ بیٹھتے ہیں۔ آلو کے قتلے اور پھلکے اس نے مزے لے لے کر کھائے۔

مگر جمال بہاولپور جانے کا فیصلہ نہ کر سکا۔ وہ اندھیرے میں چھلانگ لگا سکتا تھا مگر چھوٹے شہر کی زندگی اس کے لیے قابل قبول نہ تھی۔ وہ نذر محمد کی اجازت سے خواجہ نعیم کے فلیٹ میں اٹھ آیا۔

## ماموں جان کی دستگیری

جمال کی چھوٹی بچی گلی میں کھیلتی تھی۔ اسی عمر کی ایک توتلی بچی اس کی سہیلی بن گئی۔

اس بچی کی والدہ لکھنؤ کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور یہاں بھی اس کے عزیز بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ کراچی میں ان کا ڈنکا بجتا تھا۔ وہ خود مقابلتاً غریب تھی۔ اس کا بھائی ایکسائز کے محکمے میں کوئی افسر تھا۔ دونوں میاں بیوی نہایت شریف اور غمگسار تھے۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ جمال کا کسی طرح بھلا ہو جائے۔ ان کی چھوٹی بیٹی ڈالی نے توتلی زبان میں جمال سے کہا، آپ کو ہمارے ماموں بلاتے ہیں۔

جمال خواہ مخواہ کی ملاقاتوں کو پسند نہ کرتا تھا مگر وضع داری کا تقاضا تھا کہ وہ انکار نہ کرے۔

ڈالی کے ماموں سمندری کسٹم میں ایس پی تھے۔ وردی پہنتے تھے اور وردی والوں سے جمال نفرت کرتا تھا مگر وہ چلا گیا۔

صدیقی صاحب لکھنؤ والوں کے روایتی تپاک سے ملے۔ ان کی بہن گھونگھٹ نکالے چائے لے آئی۔ تھوڑی دیر میں گھر کا سا ماحول بن گیا۔ سب لوگ ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ جمال آسودہ ہو گیا۔

اچانک ایس پی صاحب نے کہا ”آپ سے مجھے ایک سنجیدہ بات کرنی ہے۔“

”جی فرمائیے۔“ جمال ادب سے بولا۔

”بات یہ ہے کہ......“ وہ گلا صاف کر کے بولے ”کہ آپ جیسے ذہین اور خاندانی آدمی کو اس حال میں دیکھ کر مجھے بہت صدمہ ہوا ہے۔ آپ کیوں نہیں کوئی تجارت وغیرہ کر لیتے۔ کوئی ایکسپورٹ امپورٹ کا کام؟“

”جی میرے پاس سرمایہ نہیں جناب۔“

”تجارت کے لیے سرمائے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ارادہ ہونا چاہیے اور پاکستان میں تو اللہ کے فضل سے بڑے عمدہ مواقع ہیں۔“

”مجھے تجارت نہیں آتی جی۔“

”کس کو آتی ہے۔“ وہ چمک کر بولے ”پاکستان میں کسی کو تجارت نہیں آتی تھی مگر لوگوں نے سیکھ لی۔ سیکھنے سے سب کچھ آ جاتا ہے۔“

”درست ہے جی۔“ جمال بولا ”مگر میں نے عرض کیا ناں کہ میرے پاس پیسہ نہیں۔ میرے لیے تو آج کی روٹی ہی سب سے بڑی مہم ہے۔“



”اسی لیے تو ہم آپ سے کہتے ہیں۔ آپ کی تمام مشکلیں آسان ہو جائیں۔ زندگی میں کبھی آپ کو پیسے کی تکلیف نہ ہو۔“

”مگر کس طرح جی؟“ جمال نے سوال کیا۔

ایس پی صاحب دانائی سے ہنسے۔

”اماں! آپ بات بھی تو سنیں۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا ”ہانگ کانگ چلے جائیں ایک مرتبہ ہمارے کہنے پر۔“

”ہانگ کانگ؟ کیا کرنے؟“

”ہم آپ سے مذاق نہیں کرتے۔ آپ ہانگ کانگ چلے جائیں، کچھ مال لے کر۔“

”کون سا مال؟“

”آپ پتھر کی چکیوں کے کچھ پاٹ لے جائیں ہانگ کانگ۔“

”کیا فرماتے ہیں صدیقی صاحب۔ پتھر کی چکی کے پاٹوں کو کوئی ہانگ کانگ میں کیا کرے گا؟“

”یہ ہمارا ذمہ۔ کسٹم سے چھڑانے کے بعد ان کے خریدار آپ کے پاس خود پہنچ جائیں گے۔“

”کیا ہانگ کانگ میں پتھر نہیں ہوتا؟“

”وہاں ایسا پتھر نہیں ہوتا جیسا آپ لے کر جائیں گے۔ اندر سے کھوکھلا مگر بھرا ہوا۔“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا جی۔“

”آپ سمجھنے کی کوشش بھی نہ کریں۔ بس دو سو پاٹ لے جائیں یہاں سے۔“

”مگر دو سو پاٹ کتنے میں بکیں گے اور ان میں میرا کرایہ، سفر خرچ اور منافع کتنا ہو گا؟“

”بہت ہو گا۔ آپ ہم پر بھروسہ تو کریں۔“

”کتنا ہو گا آخر؟“

”دس ہزار روپے آپ کو مل جائیں تو کیسا رہے؟ جہاز کا کرایہ اور خرچہ اس کے علاوہ۔ کیا آپ کو منظور ہے؟“

جمال کچھ پریشان ہو گیا۔ بولا ”مجھے منظور تو ہے مگر یہ بات گپ لگتی ہے جناب والا۔ چکی کے پاٹ زیادہ سے زیادہ چار پانچ ہزار کے ہوں گے۔ کرایہ بھاڑا الگ۔ آپ دس ہزار کس طرح دلوائیں گے اس سودے میں؟“

”آپ سمجھتے نہیں حالانکہ ماشاءاللہ آپ ذہین آدمی ہیں۔“

”جی میں واقعی نہیں سمجھا۔“

”آپ کو پتہ ہے کہ ہم منشیات کے ایس پی ہیں؟“

''جی ہاں۔''

''تو پھر آپ کی سمجھ میں بات کیوں نہیں آتی؟''

''تو سمجھا دیجیے جناب۔''

''اگر آپ واقعی ایسے کودن ہیں تو سنیے۔ چکی کے پاٹوں میں محض پتھر نہیں ہوگا۔ کچھ اور بھی ہوگا۔''

''اور کیا یعنی......''

''جی ہاں۔ کاروبار اسی طرح چلتے ہیں۔''

''جی میں سمجھا۔ چرس وغیرہ ہوگی ان کے اندر۔''

''آپ کو اس سے کیا۔ ہم آپ کو یہ پاٹ دلوا دیں گے۔ آپ کو فقط انہیں کسٹم سے نکلوانا ہے۔ پھر فوراً ہی ہمارا آدمی آپ سے ان کو وصول کر لے گا۔ آپ کو خود کچھ بھی کرنا نہیں ہے۔''

''جی مگر میں پکڑا گیا تو؟''

''کون پکڑے گا آپ کو؟''

''کوئی کسٹم کا افسر، کوئی منشیات کا انسپکٹر۔''

''یہ سب ہمارے آدمی ہیں۔ ان کو اطلاع ہوگی۔''

''مگر جہاز میں بھی تو چھاپہ پڑ سکتا ہے۔''

''جہاز میں بھی ہمارے آدمی آپ کے ساتھ ہوں گے۔ یہاں سے وہاں تک آپ پر ہمارا پہرہ ہوگا۔ آپ کو مال چھونا بھی نہیں پڑے گا۔ سارے کام اپنے آپ ہو جائیں گے۔''

''جی......''

''یہ ساری تکلیف ہم آپ کی خاطر اٹھا رہے ہیں جمال بھائی۔ آپ تکلیف میں ہیں نا......''

''جی۔ ہوں تو......''

''تو پھر تیاری کیجیے۔ جہاز منگل کو جاتا ہے۔ تصویریں آج ہی کھنچوا لیجیے۔ پاسپورٹ ہمارا آدمی ایک دن میں بنوا دے گا۔ ہیلتھ سرٹیفکیٹ آپ کو کیماڑی میں مل جائے گا مع ٹکٹ۔ تین روز ہیں ابھی۔''

''جی......''

''کچھ رقم کی بھی آپ کو ضرورت ہوگی۔ فی الحال یہ پانچ سو روپے رکھ لیجیے۔''

نوٹ انہوں نے میز پر رکھ دیئے۔ جمال گھبرا گیا۔ اس نے کہا ''صدیقی صاحب یہ کام مجھ سے نہ ہوگا۔''

''کیوں نہیں ہوگا صاحب!'' صدیقی صاحب بولے۔ ''کس بات سے ڈرتے ہیں آپ؟ کوئی خطرہ ہوتا تو ہم آپ جیسے شریف آدمی کو اس میں نہ ڈالتے۔ ویسے آدمیوں کی ہمارے پاس کوئی کمی نہیں۔ محض



آپ کا خیال ہے۔''

''جی نہیں صدیقی صاحب۔ شکریہ۔''

''عجیب ہونق آدمی ہیں آپ؟'' صدیقی صاحب خفگی سے بولے۔

''جی ہاں۔ میں ایسا ہی ہونق ہوں۔''

''تو آپ کی کوئی کیسے مدد کر سکتا ہے؟'' صدیقی صاحب نے دردمندی سے کہا۔

''واقعی جی۔ کوئی مدد نہیں کر سکتا میری۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔'' یہ کہہ کر جمال اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ پیسے تو رکھ لیجیے فی الحال۔'' صدیقی صاحب نے کہا۔

''جی نہیں شکریہ۔''

## سندھ اور سندھی کلچر

محبوب حیدرآبادی نے کمیونسٹ پارٹی کی چغلی کی تھی یا نہیں مگر وہ بہت شریف آدمی تھے۔ اک ذرا خود پسند تھے مگر کوئی لسانی عصبیت ان میں نہ تھی اور اگر انہوں نے کمیونسٹ پارٹی کی کوئی چغلی کر بھی دی تھی تو دل سے وہ ترقی پسند اور عوام دوست تھے۔ نوابزادہ لیاقت علی خان نے انہیں سندھ گورنمنٹ میں ڈائریکٹر انفارمیشن مقرر کروا دیا تھا۔

جمال کی محبوب صاحب سے اخبار کے زمانے میں تو زیادہ بے تکلفی نہ تھی مگر وہ جانتے تھے کہ جمال اچھا کارکن اور بھروسے کے لائق شخص ہے۔ جمال کو برے حال میں دیکھ کر انہوں نے عارضی طور پر اسے اپنے محکمے میں رکھوا لیا۔

محکمے کا کام کلرکوں کی طرح تھا۔ اخبارات کا مطالعہ اور پریس نوٹوں کا اجراء۔ جمال کو یہ بات بہت دلچسپ لگی کہ اگر میں دفتر میں اخبار پڑھتا نہ پایا گیا تو کام چور سمجھا جاؤں گا۔

بیشتر کارکن سندھی تھے مگر اپنی روایات کے مطابق کاہل، خوشامدی اور نااہل، پراپیگنڈے کا کسی کو تصور نہ تھا۔ انگریزوں کے زمانے میں اور ان سے پہلے میروں کے زمانے میں ان کے حواس پر ہندو عامل سوار رہے۔ اب انہیں نوکریاں مل گئیں تو وہ حرکت کیے بغیر تنخواہ کھانے پر لگ گئے۔

اس زمانے کے اخبار نویس، جن کو گانٹھنا مطلوب تھا، زیادہ تر اردو بولنے والے مہاجر تھے۔ ان کو محبوب صاحب شراب پلا کر خوش رکھتے تھے۔ خبروں کی تیاری، پریس نوٹوں کا اجرا ماہوار پرچے کی ادارت اور چھپائی ان کے اسسٹنٹ چوہدری صاحب کی ذمہ داری تھی۔

چوہدری صاحب اردو بڑی کڑی بولتے تھے مگر تھے پٹیالے کے پنجابی مہاجر۔ وہ کام کے معاملے میں بڑے جوشیلے تھے۔ ہر وقت ہنستے رہتے۔ رپورٹر انہیں بہت چاہتے تھے کیونکہ ان کی باتوں میں خلوص ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ رپورٹروں کو خبریں خود ہی لکھ کر دے دیا کرتے تھے۔ سرکاری سطح پر رائے عامہ کو گمراہ

کرنے، غلط راستوں پر ڈالنے اور جھوٹ کو سچ بتانے کا رواج ابھی شروع نہ ہوا تھا۔ جمال بھی صاف گو اور کھرا آدمی تھا۔ دونوں میں دوستی ہوگئی۔

وڈیروں کو اور سندھی وزیروں کو عوام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ فقط نوابزادہ لیاقت علی خان کی خوشامد کرتے تھے۔ نوابزادہ صاحب نے ایک طرف تو یو پی کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ہجرت کرنے کی دعوت عام دی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ یہاں تمہیں نوکریاں بھی ملیں گی اور مکان بھی ملیں گے۔ دوسری طرف انہوں نے سندھ گورنمنٹ کو حکم دیا کہ ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی تمام آسامیاں ہندوستان کے مہاجروں کو دی جائیں اور یوں سیکریٹریٹ کے دروازے ان کے لیے کھول دیئے گئے تھے۔ وہ آئے تو چڑھ کر آئے۔ کچھ ان کو اپنی تہذیبی برتری کا مان تھا، کچھ حکومت میں ان کی پذیرائی کی دھونس۔ وہ سندھیوں کو حریف جان کر ان سے نفرت کرتے تھے مگر ان کو بہت کچھ مل گیا۔ اگر وہ واقعی کچھ چھوڑ کر آئے تھے تو اس سے کہیں زیادہ انہیں ملا ٹھٹھے کی مزروعہ زمینیں انہیں دو روپے فی ایکڑ کے حساب سے الاٹ کر دی گئیں اور سندھی کسان جو پہلے ہندو جاگیرداروں کے غلام تھے، اب مہاجر جاگیرداروں کے غلام ہوگئے۔

سندھ کی لوٹ مار میں سندھی وزیروں اور وڈیروں کی رضامندی بھی شامل تھی۔ وہ حکومت پاکستان کی مرکزی افسر شاہی کے آگے جس پر غلبہ اردو بیوروکریسی کا تھا، دم نہ مار سکتے تھے پھر وہ پنجاب کے وزیروں اور وڈیروں کی طرح رشوت خور اور بے ایمان بھی تھے۔ انہیں بھی اپنے صوبے یا اپنے ملک کا کوئی خیال نہ تھا۔ سوال یہ تھا کہ صوبائیت کے نام پر کون کتنے مزے میں ہے۔

سندھ کا کلچر جاگیردارانہ تھا۔ سندھی مسلمانوں نے تجارت نہ سیکھی تھی۔ پہلے اس پر ہندو اجارہ دار تھے، اب ان پر مہاجر دکانداروں نے قبضہ کر لیا۔ درمیانہ طبقے کا خود کاشت کسان راجہ داہر کے وقت سے سندھ میں نمودار نہ ہوا۔ انہیں تغلقوں، ترکھانوں، مغلوں، کلہوڑوں، میروں اور سکھوں نے جب چاہا لوٹا اور ساہوکاروں اور انگریزوں نے تو ان کی کمر ہی توڑ دی۔ ان کے پیروں، فقیروں اور صوفی شاعروں نے انہیں زندگی میں بغاوت کرنے کی بجائے ہمیشہ قناعت کرنا، ظلم سہنا اور انسانوں کی دی ہوئی تکلیفوں کو رضائے الٰہی سمجھنا ہی سکھایا۔ کراچی، حیدرآباد، نوابشاہ اور سکھر میں ان کی کوئی آواز نہ تھی۔ سندھ اور سندھیوں سے جمال کو فوراً ہی محبت ہوگئی۔

## سفارش

دو چار مہینے کے بعد نوکریوں کے باقاعدہ انٹرویو ہوئے تو جمال تو منتخب ہوگیا مگر چودھری صاحب کی چھٹی ہوگئی۔ وہ بعد میں پاکستان کے انتہائی قابل اخبار نویس ثابت ہوئے مگر اس وقت گورنر جنرل غلام محمد کے حیدرآبادی معالج نے سندھ پبلک سروس کمیشن کے صدر کو ٹیلیفون پر ہدایت کر دی کہ یہ نوکری ان کے عزیز کو دی جائے۔



نو وارد ذہنی طور پر مجہول تھے۔ سر ان کا گنجا تھا اور اندر سے بھی خالی تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ان کی بیوی روزانہ انہیں مارتی ہے۔ اس سے بھی کچھ ثابت نہیں ہوتا کیونکہ بیویاں بعض اوقات نہایت معقول اور عمدہ خاوندوں کو بھی مارتی ہیں مگر ان صاحب کے بھیجے میں کچھ بھی نہیں تھا۔

اس نے آتے ہی جمال سے سندھ کے حالات پوچھے۔ دراصل وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ نوکری کے معاملے میں اسے اور کن کن سفارشوں کی ضرورت پڑے گی۔ مگر جمال نے سندھ اور سندھ کے عوام کے ابتر حالات، ان کی بے کسی اور ذلت، ان پر وڈیروں اور مہاجرین کے دباؤ کے بارے میں ایک لمبی تقریر کر دی۔ سن کر انہوں نے کہا ''میں سمجھا آپ اِدھر والے ہیں!''

''اِدھر والے یعنی چہ؟'' جمال نے پوچھا۔

''بھئی صاف ظاہر ہے آپ کمیونسٹ وغیرہ ہیں۔ لادین ملحد۔ خدا پاکستان کو آپ لوگوں سے امان میں رکھے۔''

جمال نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ بولا ''میں جانتا ہوں۔ آپ لوگ نہایت چرب زبان ہوتے ہیں۔''

جمال نے فوراً ہی اسے گالی دے دی۔

## سیکریٹریٹ سروس

جمال اخبار پڑھ رہا تھا جب ایک وضعدار نوجوان جس کی اچکن کے سارے بٹن بند تھے، سر پر جناح کیپ سجائے اس کے پاس آیا اور اجازت لے کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ ایک تمیزدار اور مہذب آدمی تھا۔

جمال نے اس کے لیے چائے منگوائی اور پوچھا ''جی میرے لیے کیا حکم ہے؟''

وہ بولے ''حکم تو کچھ نہیں جناب، یہاں آپ ہی غیر سندھی ہیں۔ اس لیے ہماری تنظیم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو رکن بنا لیا جائے۔''

''کون سی تنظیم؟'' جمال نے پوچھا۔

وہ مسکرا کر بولے ''جی سندھیوں کو تو آپ جانتے ہی ہیں کس قدر موذی لوگ ہیں۔ مہاجروں اور پنجابیوں کو تو برداشت ہی نہیں کرتے۔ ہم سب ان کی وجہ سے خطرے میں رہتے ہیں کیونکہ ان کا چپڑاسی بھی اپنے وزیر تک بے کھٹکے پہنچ سکتا ہے۔ اپنے دفاع کے لیے ہم نے ایک تنظیم بنائی ہے جس کا صدر دفتر سیکریٹریٹ میں ہے۔''

''جی، تو آپ اپنا دفاع کیسے کرتے ہیں؟'' جمال نے پوچھا۔

وہ گلا صاف کر کے بولے ''وہ یوں کہ ہر محکمے میں ہم نے ایک آدمی مقرر کر رکھا ہے جو ہمیں تمام اہم

فائلوں کے بارے میں باخبر رکھتا ہے۔کون کہاں کیا کر رہا ہے؟ کون سے پراجیکٹ زیرِغور ہیں۔کس کی ترقی ہو رہی ہے، کس کا تبادلہ ہو رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔دفتر کے جتنے اہم معاملات ہیں، ان کے بارے میں مرکز کو باخبر رکھا جاتا ہے۔''

''تو پھر؟'' جمال نے بے چینی سے پوچھا۔

''پھر ہماری ورکنگ کمیٹی ان کیسوں کا فیصلہ کرتی ہے اور متعلقہ اہلکاروں کو ہدایت دیتی ہے کہ کس کیس کو کس طرح نمٹایا جائے۔ مقصد ہمارا صرف سندھیوں کے شر سے بچنا ہے۔مہاجروں اور پنجابیوں کے حقوق کا تحفظ بھی کرنا ہے۔ہم نہیں چاہتے کہ سندھی ابھر کر اوپر آ جائیں اور ہمیں تنگ کریں۔''

''جی اس سلسلے میں' میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' جمال نے نرمی سے پوچھا۔

''جی ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس محکمے میں ہمارے کارکن بن جائیں۔ہم نے تحقیق کی ہے کہ آپ ہی یہاں کے سب سے اہم آدمی ہیں اور آپ کی بات مانی جاتی ہے۔آپ ہمارے کارکن بن جائیں تو ہم یہاں کسی سندھی کو سر اٹھانے کی اجازت نہ دیں۔باقی سیکریٹریٹ ہمارے قبضے میں ہے۔''

''مگر آپ نے مجھ پر بھروسہ کیوں کیا۔میں تو مہاجر نہیں ہوں۔'' جمال نے عاجزی سے کہا۔

''وہ اس لیے جناب کہ کم از کم آپ سندھی تو نہیں ہیں اور سندھی نہیں ہیں تو مہاجروں سے آپ کو لازمی ہمدردی ہوگی۔آپ کی ہماری زبان ایک، کھانا پینا ایک، رہن سہن ایک۔''

جمال نے چائے کی پیالی جو اس نے پی نہ تھی، اٹھا کر اچانک اس کے سر پر انڈیل دی۔وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔پان کی پیک اس کے منہ سے نکل کر ٹھوڑی پر بہہ گئی۔

''اجی یہ کیا حرکت ہے؟'' وہ چمک کر بولا۔

جمال مسکراتا رہا۔

پھر وہ اپنی شیروانی جھاڑنے لگا۔اس کی ٹوپی میں سے چائے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔جمال نے اپنا رومال نکال کر اسے پیش کیا۔''لیجیے کم سے کم رخِ روشن تو صاف کر لیجیے۔'' جمال نے کہا۔

''آپ کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔'' اس نے غصے سے کہا۔

جمال نے ایک روپیہ نکال کر میز پر رکھ دیا۔اس زمانے میں ڈرائی کلیننگ کا یہی بھاؤ تھا۔''یہ رہی قیمت جناب والا۔'' اس نے کہا ''شیروانی دھلوا لیجیے گا۔''

''اب آپ ہماری توہین کر رہے ہیں۔ہم آپ کو کسی اچھے خاندان کا چشم و چراغ سمجھے تھے مگر آپ پنجابی ڈھگے ہی نکلے۔خیر اب آپ تیار رہیے۔''

وہ مڑ کر جانے لگا تو جمال نے کہا ''ذرا ٹھہریئے، مجھے بھی کچھ عرض کرنے دیجیے۔ایسی بھی بے رخی کیا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم اول درجے کے حرامزادے ہو۔صرف تم نہیں بلکہ تمہاری تنظیم کے تمام ارکان۔''



''لاحول ولاقوۃ!'' اس نے کہا۔

''اور جا کر سب سے کہہ دینا۔'' جمال نے جواب دیا۔''میرے محکمے میں کوئی آیا تو ٹانگیں توڑ دوں گا، سمجھے؟''

تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ جمال کو ہوم ڈیپارٹمنٹ سے چٹھیاں آنے لگیں۔اس کا کیا ثبوت کہ تمہارا نام واقعی وہ ہے جو تمہارے سرٹیفیکیٹ پر لکھا ہے۔اپنی تاریخ ولادت کا ثبوت پیش کرو اور ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ کی تصدیق لاؤ۔اپنے والد کی تاریخ ولادت کا بھی دستاویزی ثبوت پیش کرو۔تیس دن کے اندر اندر ورنہ سمجھا جائے گا کہ تم اور تمہاری پاکستانی شہریت مشکوک ہے۔

جمال نے کاغذات ہنس کر ٹال دیئے مگر پھر اسے یاد دہانی کی چٹھیاں آنے لگیں۔ وہ ہوم ڈیپارٹمنٹ کے سیکریٹری کے پاس گیا۔اسے خفیہ تنظیم کے وجود کا علم تھا مگر اس کے پاس اس کا کوئی دستاویزی ثبوت نہ تھا۔اس نے جمال کو مشورہ دیا کہ تم کسی نہ کسی طرح مطلوبہ کاغذات پیش کر ہی دو اور یہ کہ تمہیں اپنے مزاج پر قابو رکھنا چاہیے۔دفتر میں مہمان اہلکاروں کے سروں پر چار چمچے چینی والی چائے کی پیالی انڈیلنا قوانین کی خلاف ورزی ہے۔اگر کہیں وہ شخص تمہاری تحریری شکایت کر دیتا تو تمہاری انکوائری ہو جاتی اور ثبوت ملنے پر سزا بھی مل جاتی۔ مثلاً عہدے میں تنزلی، سالانہ ترقی کی بندش اور شاید برخاستگی۔ اس کے علاوہ بھی ہوم سیکریٹری صاحب نے جمال کو زندگی سکون سے گزارنے کی بہت سی ترکیبیں بتائیں۔

## ہاتھی میرے ساتھی

نوازش علی صدیقی لکھنؤ کے کسی مالی کا بیٹا تھا اور لکھنؤ کے مضافات کا رہنے والا خالص پوربیا تھا۔ وہی کالا بھجنگا رنگ، وہی بھدی ناک۔ کسی طرح اس کے باپ نے اسے بی اے پاس کرا دیا تھا۔پھر نوکری کی امید میں وہ کراچی آ گیا تھا۔وہ ایک چھوٹا اہلکار تھا مگر اپنے محروم ماضی کی وجہ سے ہمیشہ لڑنے جھگڑنے پر تیار رہتا' یا شیخیاں مارتا۔انگریزی یا اردو دونوں میں اس کی استطاعت نہایت معمولی تھی۔دفتر کے لوگ اس کے منہ لگنے سے ڈرتے تھے۔کوئی سفارش اس کے بھی کام آ گئی تھی۔

دفتر میں دوسرا انفارمیشن افسر رحیم بخش سلطان بخش سندھی تھا۔ وہ ریونیو کے محکمے سے آیا تھا۔ کتابیں جمع کرنے کا شوق رکھتا تھا اور بعض اوقات پڑھتا بھی تھا۔سندھی سلیس لکھتا تھا مگر اردو اور انگریزی میں لکھنے کا شوق رکھتا تھا۔نہایت ڈرا ہوا آدمی تھا مگر اندر سے شریر تھا۔ جمال سے اس کی دوستی تھی کیونکہ جمال سندھیوں کی عزت کرتا تھا۔

تیسرا انفارمیشن افسر استاد شوق کانپوری تھا۔استاد صاحب تھرڈ کلاس شاعر تھے۔اردو اور انگریزی سے تقریباً نابلد تھے۔ جھوٹ بولنے میں دلیر اور سازش کرنے، چغلی کھانے، خوشامد کرنے میں مشاق تھے۔ ان کو پبلک سروس کمیشن سندھ نے اس لیے نوکر رکھ لیا تھا کہ ان کے قول کے مطابق وہ مولانا حسرت موہانی کے

ساتھ کام کرتے تھے۔ کون سا کام کرتے تھے، نہ انہوں نے ان سے پوچھا اور نہ انہوں نے کبھی وضاحت کی۔

مولانا حسرت موہانی کے بارے میں ان کی معلومات جمال سے بھی کم تھیں۔ دراصل انہوں نے مولانا کو فقط دور سے دیکھا تھا اور اسی پر انہوں نے ان کے ساتھ کام کرنے کی حکایت گھڑ لی تھی۔

مگر استاد شوق کانپوری اپنی مثال آپ تھے۔ بعد میں انہوں نے مولانا حسرت موہانی کے نام کو خوب بیچا اور پاکستان کی جاسوسی کے الزام میں ایک سال کی قید کاٹنے کے بعد نہایت شاندار سیاسی کیریئر بنایا حتیٰ کہ ملک گیر لیڈر تسلیم کیے جانے لگے۔ جھوٹ کی ہنڈیا اتنی دیر چڑھتی کسی نے نہ دیکھی ہوگی مگر یہ بعد کی باتیں بعد ہی میں اچھی لگتی ہیں۔ فی الحال وہ محکمۂ اطلاعات سندھ میں تیل اور تیل کی دھار دیکھتے تھے۔

جمال چونکہ ایک پھرتیلا اور نڈر آدمی تھا۔ کام میں بھی مستعد تھا اور سندھیوں اور مہاجروں دونوں کو اصولی طور پر پسند کرتا تھا اس لیے استاد شوق کانپوری نے نہ تو کبھی اسے اپنی غزل سنا کر بور کیا اور نہ کبھی مولانا حسرت موہانی سے اپنی رفاقت کی حکایات سنائیں، یعنی اس کے ساتھ استاد کے تعلقات اچھے تھے۔ رحیم بخش سے بھی اچھے تھے مگر چونکہ وہ سندھی تھا اور اپنے آپ میں غرق رہتا تھا اس لیے استاد اسے حریفانہ نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ خود اس قدر نااہل تھے کہ مہاجروں کی خفیہ تنظیم نے بھی ان پر بھروسہ نہ کیا تھا اور وہ جمال تک جا پہنچے تھے۔

سندھی اپنے مزاج میں ریشم کے کیڑے تھے۔ حرکت میں آ کر بھی وہ اپنے گرد ریشمی دھاگوں کا غلاف ہی بُن سکتے تھے۔ پہلے سکھر بیراج میں انگریزوں نے پنجابی کاشتکاروں کو آباد کر دیا تھا تاکہ وہ مردوں کا راستہ روک سکیں۔ پھر سندھ ہاری کمیٹی نے سندھی کسانوں کو نااہل اور کام چور لکھ دیا تھا کیونکہ اس کے ارکان ہندو اور مسلمان زمیندار تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ سندھ میں کسی بھی قسم کی زرعی اصلاحات کی بات ہو۔ اس کمیٹی کا ایک رکن پنجابی بھی تھا۔ اس نے اپنے اختلافی نوٹ میں اس سازش کی قلعی کھول دی تھی مگر اس کے اختلافی نوٹ کو حکومت نے دبا دیا تھا۔ سندھی نہ صرف محروم تھے بلکہ ان کی توہین بھی کی جا رہی تھی اور اب پاکستان بننے کے بعد ان پر ملازمتوں کے دروازے بھی بند ہو رہے تھے۔

مہاجر تنظیم کے واقعے کے بعد جمال سندھیوں کا اور بھی پرجوش حامی ہو گیا۔ اس نے سندھ کی تاریخ اور کلچر کے بارے میں کھل کر لکھنا شروع کر دیا۔ سندھ کو پاکستان کی ایک منفرد تہذیبی اکائی ثابت کرنے والی شاید اس کی آواز پہلی تھی۔ خود سندھی خود رحمی کا شکار تھے اور بولتے نہ تھے۔



# باب 20

محکمۂ اطلاعات کی بغل میں، جس کی بلڈنگ چارلس نیپیئر کے وقت سے کھڑی تھی، محکمۂ صنعت اپنا سوت کاتتا تھا۔ جمال کا وہاں آنا جانا تھا۔ کبھی کسی خبر کے سلسلے میں، کبھی کسی تصویر کی تلاش میں اور کبھی اس کے خوش پوش ڈائریکٹر سے گپ مارنے کے لیے۔ وہ جمال کی بڑی آؤ بھگت کرتا۔ ایک تو اس لیے کہ جمال تھا ہی دلچسپ آدمی، دوسرے اس خیال سے کہ اس کے ذریعے ان منصوبوں کو جو کبھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکتے تھے، اچھی پبلسٹی مل جائے اور اچھی پبلسٹی مل جائے تو اوپر والے خوش ہو جاتے ہیں۔ چاہے کام ہوا ہی نہ ہو۔

## بھونچال

چارلس نیپیئر کے وقت کی بنی ہوئی بیرک میں اچانک بھونچال آ گیا۔ اس کے زرد پتھر سنہرے ہو گئے۔ پرانی جھاڑیوں میں سے خوشبو آنے لگی اور تاڑ کے درخت جھک جھک کر دیکھنے لگے۔ حالانکہ وہ تیر کی طرح سیدھے کھڑے رہنے کے عادی تھے۔

رحیم بخش سے بیٹھا نہ جاتا تھا۔ وہ ایک اخبار اٹھاتا اور بن پڑھے رکھ کر دوسرا اٹھا لیتا۔

نوازش علی صدیقی پان پر پان کھائے جا رہا تھا۔ وہ پیک کا گھونٹ نگل کر مراد آبادی تمباکو کی ایک اور چٹکی منہ میں ڈال لیتا۔ استاد شوق کانپوری بار بار زانو پر ہاتھ مارتا اور کہتا ”کمبخت غالب بھی کیا شاعر تھا!“

اچانک رحیم بخش نے پوچھا ”سائیں آہو کے کیا معنی ہیں؟“

”آہو کے معنی ہیں ہرن۔“ جمال نے جواب دیا۔ ”کیوں؟“

”بہت عجیب نام ہے!“

”کس کا نام ہے؟“

رحیم بخش مسکرا کر چپ ہو رہا۔

نوازش علی بولا ”اپنے نکھلو کی ہیں۔“

”کون نکھلو کی ہیں؟“ جمال نے پوچھا۔

نوازش علی کو زبان مل گئی، مضطرب ہو کر بولا۔ ”مس آہو انڈسٹری کے دفتر میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہو

کرآئی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں نہایت خاندانی خاتون ہیں۔"

"اچھا؟" جمال نے پوچھا۔ "آپ ملے ان سے؟"

"انہوں نے بلایا تو تھا۔ کہتی تھیں کچھ کام ہے آپ سے۔"

"ملنا بھی نہیں سائیں۔" رحیم بخش بولا "تمہیں دیکھ کر وہ ڈر جائے گی۔ شاید نوکری ہی چھوڑ جائے۔"

نوازش کو اپنے بدشکل ہونے کا احساس بھی تھا۔ پان کھا کھا کر اس کے دانت سیاہ ہو چکے تھے۔ اس کی کالی اچکن پیک کے چھینٹوں سے داغدار رہتی تھی۔ رحیم بخش کی بات سن کر وہ آپے سے باہر ہو گیا اور رحیم بخش کو اور سندھیوں کو صلواتیں سنانے لگا۔ پھر بکتا جھکتا اور دھمکیاں دیتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

آہو بڑا انوکھا نام تھا اور اس سے جمال کے دل میں بھی گدگدی ہوئی مگر اس نے بات وہیں چھوڑ دی۔ تھوڑی دیر میں اسے معلوم ہوا کہ دفتر میں سب نے کام چھوڑ دیا ہے اور سب لوگ اسی کی باتیں کر رہے ہیں۔ وہ اپنے دفتر میں بے خبر بیٹھی ہو گی مگر اس کے لائے ہوئے بھونچال کی لرزشوں سے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کانپنے لگ گیا تھا۔

چھٹی کے وقت جمال گھر جانے کے لیے نکلا تو انڈسٹری ڈیپارٹمنٹ سے کبوتری کی طرح لہراتی ہوئی ایک لڑکی گھوڑا گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ اس نے نہایت خوبصورت ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس کی ناف گول گلابی اور بہت گہری تھی۔ چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ اور بالوں کا جوڑا گردن کی بجائے سر پر رکھا ہوا تھا جیسے اجنتا کے غار سے کوئی مورتی اُٹھ کر آ گئی ہو۔

اگر وہ معمولی وضع قطع اور چال ڈھال کی مالک ہوتی تو بھی لوگوں پر آسان نہ گزرتی' مگر وہ تو واقعی قیامت تھی۔ اسے دیکھنے والے دیوانے نہ ہو جاتے تو کیا کرتے۔ وہ قمری تھی، کوئل تھی یا ہرنی تھی۔ جمال پر اس نے سرسری سی نظر ڈالی اور گاڑی والے سے کہا "چلو۔"

اگلے دو تین روز جمال نے اس کے بارے میں طرح طرح کی خبریں سنتے گزارے۔ وہ بظاہر بے توجہی کا اظہار کرتا مگر اس کے کان اِدھر ہی کو لگے رہتے۔ نوازش علی کو اس پر بڑا اطمینان تھا کہ جمال آہو کے معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ رحیم بخش سے وہ اس سلسلے میں بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ استاد شوق کانپوری اہلِ زبان تھا۔ اس پر نوازش علی اسے رقیب سمجھ کر نظر انداز کرتا تھا۔ دوسرے لوگ کسی گنتی میں شمار نہ تھے۔ وہ آہو کی بات کچھ اس انداز سے کرتا جیسے وہ بلا شرکت غیرے اس کا مالک ہو۔

نوازش علی نے جمال کو بتایا کہ آہو کے آباؤ اجداد چکوال سے گھوڑوں کی تجارت کے سلسلے میں لکھنؤ منتقل ہوئے تھے مگر وہ کہتا کہ یہ تو دو سو برس پہلے کی بات ہے۔ جب بہت سے پنجابی لکھنؤ جا کر مہذب ہوئے تھے۔ جمال کی رعایت سے وہ یہ بھی کہتا کہ اگر سارے پنجابی دو سو برس پہلے لکھنؤ جا چکے ہوتے تو آج وہ کسی مہذب مجلس میں بیٹھ سکنے کے قابل ہوتے۔ یہ بات وہ رواداری میں کہہ جاتا تاکہ جمال کو چوٹ کا پتہ نہ لگے۔



اس نے یہ بھی بتایا کہ نکھلو (لکھنؤ) کے شاہی دربار میں آہو کے آباؤ اجداد کی بڑی تعظیم ہوئی۔ انہیں جاگیر ملی جس میں آموں کے باغات تھے۔ پھر وہ وہیں کے ہو رہے۔ اچھا خاصا ان کا اثاثہ تھا جب انہوں نے پاکستان میں ہجرت کی۔ بھگدڑ میں وہ اپنے خاندانی جواہرات کے سوا کچھ نہ لا سکے۔ شریف لوگ تھے اس لیے انہوں نے یہاں آ کر بھی ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی جائیداد پر کوئی حق نہ جتایا اور یہ ان کی حماقت تھی' کیونکہ ہم سب لوگ پاکستان کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دے کر آئے ہیں اور یہاں کی جائیدادوں پر ہمارا حق ہے۔ محل کے بدلے محل، باغات کے بدلے باغات اور جاگیر کے عوض جاگیر مگر......

"اور سائیں وہ جو ہاتھی تم نے پیچھے چھوڑ دیئے تھے، اب وہ ہاتھی ہم کہاں سے لائیں؟" رحیم بخش بولا "سندھ میں تو ہاتھی ہوتے ہی نہیں۔"

نوازش علی نے جواب دیا "اگر تم سندھیوں میں شرافت ہوتی تو ہماری قربانیوں کی قدر کرتے اور ہمیں ہاتھی بنگال سے منگوا کر دیتے اور اب تم بکواس بند کرو۔ بات کرنے دو۔ تو جمال بھائی میں آپ کو بتا رہا تھا کہ آہو کے والدین نے پرلے درجے کی حماقت کی اور پاکستان پر اپنا حق خواہ مخواہ چھوڑ دیا۔ انہوں نے اپنے خاندانی جواہرات بیچ بیچ کر گزارہ کیا۔ ختم ہو گئے تو ان کی لڑکی نوکری کرنے چلی۔" پان کی پیک چوس کر وہ بولا "خاندانی خاتون ہیں۔ ایسے ویسوں کی تو کیا مجال کہ ان کے قریب بھی پھٹک جائیں۔"

اس کا اشارہ رحیم بخش اور استاد شوق کانپوری کی طرف تھا۔

استاد شوق کانپوری نے آہ بھری۔ رحیم بخش چپ رہا مگر اپنے بے بس سندھی ہونے پر اسے سخت غصہ آیا۔ جمال نے بات ٹال دی۔

کچھ روز اسی شوق اور شدت میں گزر گئے۔

## آہو کی میلی چوکڑی

جمال بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا اور کمرے میں اکیلا تھا۔ اچانک کمرہ خوشبو سے بھر گیا۔ اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو آہو اس کی میز کے سامنے کھڑی تھی۔ بانکی اور تیکھی' طرحدار مگر سراپا انکسار۔ "میں اندر آ سکتی ہوں جناب؟" اس نے بڑی عاجزی سے پوچھا جیسے وہ بہت ڈری ہوئی ہو۔

اس نے گلابی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ پیروں میں چپل اور ہاتھ میں سورج مکھی کا ایک بہت بڑا پھول۔ وہ تن کر کھڑی تھی، تمکنت سے نہیں۔ نسائیت کے مان سے۔ اس کی ٹھوڑی اونچی تھی۔ سینہ جنگلی کبوتر کے گھونسلے جیسا۔ لگتا تھا کہ وہ کتھک کے بھاؤ بتانے کے لیے تیار کھڑی ہے۔

جمال فوراً سمجھ گیا کہ اس بظاہر معصوم چہرے کے پیچھے جو لڑکی کھڑی ہے اسے اپنے آپ پر بہت بھروسہ ہے۔ اسے اپنی طاقت کا علم ہے۔ وہ لوگوں کو کانچ کے ٹکڑے سمجھتی ہے۔

جمال نے اپنی متانت کو برقرار رکھا اور لاپرواہی سے پوچھا "اب تو آپ اندر آ ہی چکیں۔"

’’واپس چلی جاؤں جی؟‘‘ اس نے معصومیت سے پوچھا ’’اور دروازے میں کھڑے ہو کر اندر آنے کی اجازت مانگوں؟‘‘

’’جی نہیں۔ آپ یہیں کھڑی رہیں۔‘‘ جمال نے کہا۔

’’یعنی مجھے بیٹھنے کی اجازت نہیں؟‘‘ وہ بولی ’’ٹھیک ہے میں اجازت کے بغیر اندر چلی آئی۔ غلطی کی سزا تو ملنی ہی چاہیے۔ اب باہر جانے کی اجازت مل جائے۔‘‘

’’تشریف رکھیے۔‘‘ جمال نے خشکی سے کہا۔

’’شکریہ۔‘‘ وہ بولی ’’میرا نام صابرہ سلطانہ ہے۔ سلطانہ تو میں ہوں مگر صابرہ نہیں ہوں۔ گھر والے مجھے آہو کہتے ہیں۔ آپ کے پڑوس میں کام کرتی ہوں۔‘‘

’’بہت انوکھا نام ہے آہو۔‘‘

’’ہے نا؟ اسی لیے مجھے پسند نہیں۔‘‘ وہ بولی ’’میں نہیں چاہتی کہ میں جنگل جنگل پھرتی رہوں۔ جنگل میں بھیڑیے کھلے پھرتے ہیں۔ جنگل میں اندھیرا ہوتا ہے۔‘‘

’’یہاں کیسے آ گئیں پھر؟‘‘

’’یہاں اندھیرا نہیں روشنی ہے۔‘‘

’’اور بھیڑیے؟‘‘

’’ابھی تو میں نے آپ سے بات بھی نہیں۔ ابھی کچھ کہہ نہیں سکتی۔ ویسے کتے اِدھر بہت ہیں۔‘‘

’’میرے لیے کیا حکم ہے مس صابرہ سلطانہ؟‘‘

’’جی مجھے آپ آہو بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں نے ان چند دنوں میں بہت کچھ جان لیا ہے۔ آپ بہت قابل آدمی ہیں۔ ایسے نہیں جیسے دوسرے، مجھے آپ کا غرور پسند آیا۔ یہ دوسروں کو اعتماد بخشتا ہے۔ آپ سے مجھے خوف نہیں آتا۔ خوف تو مجھے کسی سے بھی نہیں آتا، رحم آتا ہے بعض اوقات مگر آپ پر مجھے رحم نہیں آتا۔ آپ رحم کے حق دار نہیں ہیں جی۔‘‘

’’کمال ہے۔‘‘ جمال بولا ’’میں تو آپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا مگر آپ......‘‘

’’جان جائیں گے جی۔ سب کچھ جان جائیں گے۔ فی الحال مجھے آپ سے ایک کام ہے۔ سندھ کی گھریلو صنعت کے بارے میں مجھے ایک پبلسٹی سکیم کی ضرورت ہے۔‘‘

’’ضرور یہی تو میرا کام ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوگی آپ کی خدمت کر کے۔‘‘ جمال نے جواب دیا۔

’’شکریہ سر!‘‘

’’آپ دراصل بہت تیز خاتون ہیں۔‘‘

’’تیز نہیں جی۔‘‘ آہو بولی۔ ’’بے تکلف، مگر ہر ایک سے نہیں۔ کسی کسی سے جو میرے من کو شانتی دے۔‘‘



’’کیا میں نے آپ کے من کو شانتی دی؟‘‘

’’پتہ نہیں جی۔ ویسے میرے من میں شانتی ہی شانتی ہے۔‘‘

’’آپ کو میرے پاس کس نے بھیجا؟‘‘

’’کسی نے نہیں جی۔ مجھے کام تھا۔ میں نے پوچھ گچھ کی۔ نوازش صاحب نے آپ کا پتہ بتا دیا۔ کہا آپ کو کچھ نہیں آتا۔ آپ سفارشی آدمی ہیں۔ پھر آپ کو بات کرنے کی تمیز بھی نہیں۔ میں سمجھ گئی کہ ضرور آپ میں چمک ہوگی۔ نوازش صاحب کی بڑی مہربانی۔‘‘

’’مجھ میں تو کوئی چمک نہیں۔ آپ نے کیسے فرض کر لیا؟‘‘

’’میں نے آپ کو دیکھ بھی لیا تھا جی۔ آپ کی شکل بولتی ہے۔ بلاتی بھی ہے۔ ذہانت آپ کے منہ پر لکھی ہے اور ذوق بھی آپ کی آنکھوں سے ہویدا ہے۔ ایسے آدمی مجھے اچھے لگتے ہیں۔ اسی لیے چلی آئی کسی تعارف کے بغیر۔‘‘

ایک ہلکی سی مسکراہٹ جمال کے چہرے پر اتر آئی۔ جیسے سردیوں میں دھوپ منڈیر سے اترے۔

آہو نے جمال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ’’میں نے کچھ غلط تو نہیں سمجھا سر؟‘‘

’’اصل میں، میں آپ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔‘‘ جمال بے قرار ہو کر بولا۔

’’کوشش نہ کریں جی۔ بس سمجھ لیں۔ میں کوئی راز کی بات نہیں ہوں۔ تو پھر مجھے اجازت ہے سر؟ پھر کب آؤں؟‘‘

’’آ جایئے گا جب دل چاہے۔‘‘ جمال نے اداس ہو کر کہا۔

’’یا نہ آؤں کبھی؟‘‘ آہو نے شرارت سے جواب دیا۔

’’نہ آیئے تو بھی میں آپ کی سکیم تیار کر دوں گا۔‘‘

’’یعنی مجھے آنا ہی ہوگا۔ اچھا، یہ ہمارا منصوبہ ہے۔ اسے پڑھ لیں اور مجھے اجازت۔‘‘

جواب کا انتظار کیے بغیر وہ کمرے سے نکل گئی۔

جمال چاہتا تھا کہ وہ اور کچھ دیر بیٹھے۔ اس کے کولہے گول اور بھرے ہوئے تھے۔ اس کے سینے سے تازہ دودھ کی مہکار آتی تھی۔ اس کے لب گلاب کی پنکھڑی تھے مگر اس کی آنکھوں میں ایک ہرنی کی سی معصومیت تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایسی چالاک نہیں جیسی کہ وہ ظاہر کرتی ہے۔ وہ ایک پیاری معصوم اور مخلص لڑکی تھی۔

جمال سمجھ نہ سکا کہ اس کا ارادہ کیا ہے۔ اس نے میرے ساتھ اتنی بے تکلفی کیوں کی۔ ایسا تو میں جاذب نظر نہ تھا۔ رات بھر وہ اس کی سوچوں پر چھائی رہی۔

## ٹھٹھہ میں رات

صبح سٹاف میٹنگ کے بعد محبوب حیدر آبادی نے جمال سے کہا تم رک جاؤ۔

جب سب چلے گئے تو اس نے اسے کہا ''تم گھر چلے جاؤ کیونکہ دوپہر کے بعد تمہیں ٹھٹھہ جانا ہے۔ ہمارے ساتھ کراچی کے دو تین اخبار نویس ہوں گے۔ رات ہم ریسٹ ہاؤس میں قیام کریں گے۔ کھانے کا بندوبست میں نے کر دیا ہے۔''

محبوب حیدر آبادی بہت سنجیدہ آدمی تھا مگر وہ اپنے خاص کام جمال ہی سے کرواتا تھا۔

پھر اس نے کہا ''اکاؤنٹنٹ کے پاس میری چٹ لے جاؤ اور اس سے دو ہزار روپے لے لو۔ میرے خیال میں شراب کی دو بوتلیں کافی ہوں گی۔''

اس زمانے میں سندھ کے گورنر دین محمد تھے۔ انہوں نے یکایک وہ جاگیریں چھین لی تھیں جو چارلس نیپیئر نے اپنے ان حواریوں کو دی تھی' جنہوں نے میر نصیر خاں فرمانروائے سندھ سے جنگ میانی میں غداری کی تھی۔ زمینیں تو بہت لوگوں کو ملیں مگر غداری کا انعام چند ہی لوگوں کو ملا تھا۔ ان کو مالیہ بھی معاف کر دیا گیا تھا۔ اب سارے وڈیرے پریشان ہو گئے تھے کیونکہ آگے چل کر زمینداری کا خاتمہ بھی ہو سکتا تھا۔ انہوں نے خواجہ ناظم الدین سے فریاد کی' مگر دین محمد نہ مانے اور اخبارات میں جاگیرداری کے حق میں اور برخلاف بحث چھڑ گئی یعنی مرکزی محکمہ اطلاعات اور سندھ محکمہ اطلاعات میں۔ اخبار نویس بالعموم جاگیرداری کے خلاف تھے مگر بعض کو اس کی حمایت کرنی پڑ گئی' وہ بھی بالواسطہ۔ وہ صرف گورنر دین محمد کے اختیارات کو چیلنج کرتے تھے۔

محبوب صاحب نے کمیونسٹ پارٹی سے غداری کی تھی یا نہیں مگر اصلاً وہ ترقی پسند اور جاگیرداری نظام کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے رپورٹروں کو شرابیں پلا پلا کر ساتھ ملا لیا اور اس طرح سندھ کا پلہ مرکز پر بھاری ہو گیا۔ ٹھٹھہ کا یہ سفر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔

اکاؤنٹینٹ نے چٹ دیکھ کر دو ہزار روپے دے دیئے مگر وہ روہانسا ہو کر بولا ''ڈائریکٹر صاحب کیا کر رہے ہیں۔ ان کی اپنی تنخواہ صرف سات سو روپے ماہوار ہے اور اب تک وہ چھ ہزار روپے ایڈوانس لے کر اخبار والوں کو شراب پلا چکے ہیں۔ ان کا انجام کیا ہوگا؟ اس چٹ پر آپ بھی دستخط کر دیں۔''

جمال ٹھٹھہ جانے کے لیے اپنے کاغذات سمیٹنے لگا تو نوازش علی کلے میں پان کا بیڑا دبائے اس کے کمرے میں آ کر بولا۔

''سنا ہے مس صابرہ سلطانہ کل آپ کے پاس آئی تھیں، کیا بات ہوئی؟''

جمال نے کہا ''کچھ نہیں۔ وہ ایک منصوبے کی پبلسٹی کروانا چاہتی تھیں۔''

''ہاں اسی سلسلے میں وہ پہلے میرے پاس آئی تھیں۔ میں نے کہہ دیا کہ مجھے فرصت نہیں، پھر میں نے انہیں آپ کے پاس بھیج دیا۔''

''شکریہ۔'' جمال نے کہا۔

''مگر منصوبے کے علاوہ بھی بات چیت تو ہوئی ہوگی۔ انہوں نے میرے بارے میں کچھ کہا؟''



''نہیں۔ آپ کا ذکر نہیں آیا۔'' جمال بولا۔

''اور کیا کہتی تھیں؟''

''کہتی تھیں کہ مجھے بخار ہے۔ کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلیے۔'' جمال نے جل کر کہا۔

''جانے بھی دیجیے۔ وہ آپ سے بھلا کیوں ایسی بات کہنے لگیں۔'' نوازش علی بولا۔

''جناب مجھے صاحب کے ساتھ دورے پر ٹھٹھہ جانا ہے۔ اس لیے واپسی پر بات ہوگی۔''

یہ کہہ کر جمال کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

ٹھٹھہ ایک عجیب و غریب جگہ ہے۔ کسی زمانے میں سندھ کا دارالحکومت ہوتا تھا۔ امیر خسرو نے اس پر ایک نظم بھی کہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا قبرستان پچیس میل کے پھیلاؤ میں تھا مگر اب زیادہ تر ویرانہ ہے۔ عیسیٰ خان ترکھان کا مقبرہ بھی دیدنی ہے۔ زرد پتھروں پر نقاشی کا کام بے مثل ہے اور صدیاں گزر جانے کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ کل ہی مکمل ہوا ہوگا۔

شام کو محبوب حیدر آبادی اور کراچی کے تین رپورٹر آ گئے۔ آتے ہی بوتل کھل گئی۔ ان کی مدارات کے لیے ٹھٹھے کی ایک حسین عورت اپنے میاں کے ساتھ شامل حال ہو گئی۔ جمال کو وہ بہت اچھی لگی مگر اسے پتہ تھا کہ میرا افسر دیکھ رہا ہے۔ اس لیے اس نے اس کی طرف دیکھنے کی آرزو بیدار نہ ہونے دی۔

وہ عورت اور اس کا میاں عجیب لوگ تھے۔ وہ اپنے تعلقات بڑھانے کی خاطر ہر افسر سے ملاقات کے لیے آ جاتے جو ریسٹ ہاؤس میں قیام کرتا۔

تکلفات کی کچھ باتوں کے بعد رپورٹروں نے اس حسین عورت سے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ ایک جام تم بھی پی لو۔ آخر کو تو یہ بھی انگور کا رس ہی ہے اور ایک جام سے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس کا میاں ڈھٹائی سے مسکراتا رہا مگر وہ نہ مانی۔ اس کے بعد کباب آ گئے۔ خوش گپیوں میں لوگ بہت زیادہ پی گئے۔ جمال کا سر بھی گھومنے لگا مگر اسے پتہ تھا کہ میں ڈیوٹی پر ہوں اور مجھے ان کو سنبھالنا اور بستر پر لٹانا ہے۔ آدھی رات تک وہ اسی ڈیوٹی پر رہا۔

جب سب مدہوش ہو گئے تو حسین عورت نے جمال سے کہا ''آپ نے تو میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ آپ اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اب مجھے گھر تک تو چھوڑ آئیں۔ میرے میاں تو دوپہر تک ہوش میں نہ آئیں گے۔''

جمال نے کہا ''نہیں بی بی میں اچھا آدمی نہیں۔ ڈرائیور آپ کو گھر چھوڑ دے گا۔'' اس نے ضد کی مگر جمال نہ مانا۔

''ہماری قسمت ہی خراب ہے!'' وہ بولی۔

محبوب حیدر آبادی ایک معقول اور معزز آدمی تھا۔ بہت کم بولتا تھا۔ وہ دل کا برا نہیں تھا مگر وہ شراب

اس طرح پیتا تھا جیسے پیاسے کتے پانی پیتے ہیں۔ایک دو تین چار پانچ اور جب تک اس کے ہاتھوں میں دم رہتا وہ جام چڑھاتا رہتا۔معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل میں کوئی گہرا گھاؤ ہے۔

عورتوں سے اسے بظاہر کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ ان سے نہایت وضعداری سے ملتا مگر وہ دل میں اس بات پر سخت شرمندہ تھا کہ میں نے کمیونسٹ پارٹی کے راز حکومت کو بتا دیئے ہیں اور اس کے پرانے دوست اور رفیق اس سے چھوٹ گئے ہیں۔وہ اپنی نگاہوں میں گر گیا تھا اور ضمیر کی خلش اسے جینے نہ دیتی تھی مگر جمال کا خیال تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کے راز اس نے کسی لالچ میں نہیں بتائے۔ایسے شیخی خوری میں بات کر دی تھی اور اب وہ جب تلک زندہ تھا' شرمندہ تھا۔وہ اپنے دل کی بات بھی کسی سے نہ کر سکتا تھا۔اس کی ذات کے غرور کی شکست تھی۔جمال اس کی الجھن کو سمجھتا تھا مگر اس نے محبوب سے اس سلسلے میں کبھی کوئی بات نہ کی۔وہ اس کی صحبت سے ڈرتا تھا کیونکہ شراب کی میز پر وہ بھوت بن جاتا اور جمال کو پلا پلا کر بے حال کر دیتا۔

اگلی صبح وہ سب ٹوٹے پھوٹے واپس کراچی آ گئے۔جاگیرداری کے خلاف ایک اور مہم تیار ہو چکی تھی۔جمال نے میز سے کاغذات نکالے اور صابرہ سلطانہ کے منصوبے پر غور کرنے لگا۔وہ دل ہی دل میں اس دشمن جان کا منتظر تھا مگر وہ نہ آئی۔اگلے روز بھی نہ آئی۔

تیسرے دن جمال اخبار پڑھ رہا تھا کہ وہ کمرے میں داخل ہوئی۔جمال نے اسے دیکھ لیا مگر نظریں نہ اٹھائیں۔

## جاگ سوزِ عشق جاگ

وہ بولی ''میں اجازت لے کر نہیں آئی جی' اس لیے کہ اب مجھ میں اور آپ میں ایک رشتہ قائم ہو چکا ہے۔''

جمال نے کہا ''کون سا رشتہ؟''

''ضروری تو نہیں کہ ہر رشتے کا کوئی نام بھی ہو مگر آپ کو حق ہے کہ ہر رشتے سے انکار کر دیں۔''

''میں انکار کیوں کر دوں؟'' جمال نے پوچھا۔

''تو پھر اقرار کر لیں اس بات کا جس کا آپ انکار نہیں کرتے۔''

''کوئی بات ہو بھی آہو۔''

''میں یہاں بیٹھی ہوں۔آپ کے سامنے اکیلی آپ کے کمرے میں اور آپ کو مجھ سے ڈر بھی نہیں لگتا، یہ رشتہ نہیں تو کیا ہے۔''

''ڈر مجھے؟'' جمال نے تعجب سے کہا۔''بھیڑیئے کو ہرنی سے؟''

''میں تو ہرنی بے شک ہوں اور آپ کی آنکھوں میں بھی اس وقت جنگل ہے مگر بھیڑیئے آپ مجھے نہیں لگتے۔''



''تو میں آپ کو کھا جاؤں۔تب آپ کو یقین آئے گا۔''

''ہائے ایمان سے پھر کتنا مزہ آئے۔'' آہو تالی بجا کر بولی۔

''بھیڑیئے کو چیلنج نہیں کرتے مس آہو۔''

''آپ مجھے آہو بھی کہہ سکتے ہیں۔'' وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی ''یہ مس وِس کیا ہے؟''

''آہو کہوں یا ناگن؟''

''ہائے اللہ پھر آپ کہیں گے کہ میں آپ کو ڈسوں بھی۔''

''ڈسو بھی۔میرے تن بدن میں زہر تو تم نے بھر ہی دیا ہے۔ڈسو تو بین بجے۔ناگ لہرائے۔''

''بین بجے تو ناگن جھومے ناگ پر گر جائے۔''

''ناگن ناگ پر گر جائے تو دھرتی ناچنے لگے۔''

''ہوئی نا بات! میں تو آپ جناب سے گھبرا گئی تھی' مگر کیا ناگ دیوتا کو ڈسنا آتا بھی ہے۔جادو کرنا تو آتا ہے۔غریبوں کی جان لینی تو آتی ہے۔اوئی اللہ اب کیا ہوگا۔میرے تن میں تو زہر کی سرسراہٹ ابھی سے محسوس ہو رہی ہے۔اوئی اللہ! ذرا دیکھنا میرے ہونٹوں کا رنگ نیلا تو نہیں پڑ گیا۔''

یہ کہہ کر آہو نے اپنے ہونٹ بوسے کی شکل میں آگے بڑھا دیئے۔

جمال نے اس کی کلائی پکڑ لی۔اس کا سر گھومنے لگا جیسے دیسی شراب کی بوتل کسی نے اس کے دماغ میں انڈیل دی ہو۔وہ بولا ''تم مجھے پاگل نہ کرو آہو، دیکھ میرے ہونٹ جل رہے ہیں۔''

''اتنی تیز رفتاری؟'' آہو بولی۔''اتنی تیز رفتاری سے گردن ٹوٹ جاتی ہے۔میں تو آپ کو بہت مضبوط آدمی سمجھتی تھی۔ایک ہی جھٹکے میں گر گئے؟''

جمال نے آہو کی کلائی پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔وہ گھبرائی نہ تھی مسکراتی رہی۔جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔پھر جمال کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔وہ آہستہ سے بولا ''کھیلتی ہو؟''

''کھلاڑی سے کھیلتی ہوں۔'' وہ بولی ''تاکہ وہ مجھے کھیل کی باریکیاں سکھا دے۔یہ نہیں کہ خود کھیلنے لگے۔کھلاڑی بنو، کھلونا نہ بنو۔اگرچہ اس طرح بھی تم مجھے اچھے لگتے ہو۔تو اب کچھ کام کی بات کریں مگر پہلے پسینہ پونچھ لو۔''

اس نے اپنے پرس سے ایک خوشبو میں بسا ہوا رومال نکالا۔

جمال خفیف ہو کر بولا۔''سکھا دوں گا تمہیں کھیل کی باریکیاں۔تختی لے آنا کل۔میں تمہیں اچھا تو لگتا ہی ہوں۔''

''ایمان سے اچھے لگتے ہو۔'' آہو بولی۔''اور یہ بات بہت خطرناک ہے۔ٹیچر سے محبت ہو جاتی ہے اکثر۔مجھے اس کا تجربہ ہے۔اس لیے میں ڈرتی بہت ہوں۔''

وہ کچھ دیر جمال کو گھورتی رہی۔ اس کا چہرہ جذبات سے خالی تھا۔ پھر بولی ''تم اتنے سنجیدہ تو نہیں جتنے بنتے ہو۔ بن کیوں رہے ہو جناب عالی۔''

''میں بن نہیں رہا۔'' جمال بولا۔ ''تم مجھے بے بس کیے دیتی ہو۔''

''لو اب یہ بھی میرا قصور ہے۔ چلی جاؤں پھر؟''

''نہیں۔ بیٹھی رہو۔'' جمال نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''نجانے لوگ اپنی کمزوریوں کی سزا دوسروں کو کیوں دیتے ہیں۔''

''میں کمزور نہیں ہوں آہو۔'' جمال بولا۔ ''تھوڑی دیر اور رکو۔ میں نے تمہاری سکیم تیار کر دی ہے۔ اس پر ایک نظر تم بھی ڈال لو۔''

جمال نے کچھ کاغذات اس کے آگے ڈال دیئے۔

وہ بولی ''مجھے کیا پتہ ان میں کیا لکھا ہے۔ آپ ہی بتا دیجیے گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اب جاتی ہوں۔ میرا ڈائریکٹر میری راہ دیکھتا ہوگا۔ ندیدہ' گنجا' سالا۔''

''وہ بھی تمہاری راہ دیکھتا ہے؟''

''ارے سبھی دیکھتے ہیں مگر اپنی طرف کوئی نہیں دیکھتا۔ اب میں کس کس کا دل توڑوں۔ کل آؤں گی پھر اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔ آپ بہت مضبوط آدمی ہیں نا اس لیے۔''

اس نے مسکرا کر پرس اٹھایا اور ساڑھی سے اپنا بدن لپیٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ جمال اس کے چھوڑے ہوئے رومال کو چہرے پر ملتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ لڑکی آسانی سے قابو میں آنے والی نہیں۔ اسے اپنی طاقت اور دوسروں کی کمزوریوں کا بخوبی ادراک ہے۔ وہ پھندا لگا کر بھاگ جانے والی لڑکی ہے۔ وہ لذیذ خیالوں سے تڑپنے لگا۔ اس روز اس نے دفتر کا کوئی کام نہ کیا۔ گھر پہنچا تو چاند نکلا ہوا تھا۔

## آج کا سبق

اگلے روز وہ حواس مجتمع کر کے کرسی پر بیٹھا تھا جب وہ آئی۔ اس نے گرے رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی جس پر گیندے کے پھول کھل رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں پرس کی بجائے ایک تختی تھی۔ مٹی کی دوات اور سرکنڈے کا قلم میز پر رکھ کر وہ بولی ''کھارادر سے لائی ہوں۔ لو دو مجھے آج کا سبق۔''

جمال نے ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ جو گھر سے سوچ کر آیا تھا، یکدم بھول گیا۔ ایسی لڑکی سے اس کا کبھی پالا نہ پڑا تھا۔ وہ جو اس کے قریب آئیں، ہاتھ لگتے ہی ڈھیر ہو گئیں یا بھاگ گئیں مگر آہو نہایت سنجیدہ تھی جیسے واقعی تختی لکھنے کے لیے آئی ہو۔ پلو سے اس کا ماتھا ڈھکا ہوا تھا۔

''بڑی حرامزادی ہو۔'' جمال نے چھوٹتے ہی کہا۔

''ارے ارے آپ کو کیا ہو گیا'' آہو بولی۔ ''میں تو آپ کو شریف آدمی سمجھ کر آئی تھی۔''



مگر اس کے لہجے میں غصہ نہیں تھا، پیار تھا۔

جمال نے کہا ''لاؤ ہٹاؤ تکلف۔ میں فتح ہو گیا چاروں شانے چت۔ تم چاہو تو میرے دل پر پیر رکھ دو۔''

''اونہہ! مزہ نہ آیا۔'' وہ بولی۔

''تمہارے مزے کی ایسی تیسی۔''

''ایمان سے مزہ نہ آیا۔ میں تو سمجھتی تھی کہ مجھے داؤ پیچ کھیلنے پڑیں گے۔ آگے پیچھے پھرنا پڑے گا۔ لبھانا پڑے گا مگر......''

جمال نے کہا ''صاف کہو میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ تم مجھے کیوں ستاتی ہو۔''

''آپ نے یہاں مکتبِ عشق کھول رکھا ہے اس لیے آتی ہوں یہاں کہ کچھ مجھے بھی عطا ہو جائے۔ میں آپ کو ستانے کے لیے نہیں دیکھنے کے لیے آتی ہوں۔ پبلسٹی تو محض بہانہ ہے دیدار کا۔ پبلسٹی کے لیے یہاں استاد شوق کانپوری، جناب رحیم بخش، جناب نوازش علی لکھنوی بھی ہیں مگر مجھے دیکھتے ہی ان کے منہ سے رال ٹپکنے لگتی ہے۔ آپ کی بات ہی اور ہے۔ ایسا خوشبودار آدمی ملتا کہاں ہے۔ میں تو مجبور ہو کر آئی ہوں۔ لگا لیجیے اپنی قیمت۔ کیا بھاؤ ہے آپ کا آج کل؟''

''یہی باتیں تم استاد شوق کانپوری، نوازش علی لکھنوی اور رحیم بخش سے بھی کہہ سکتی ہو۔''

''کہہ تو سکتی ہوں مگر کہوں گی نہیں۔''

''کیوں بھلا؟''

''مجھے بے وقوف عاشقوں کا البم نہیں بنانا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ عورت کے نزدیک کسی مرد کی اہم ترین خوبی اس کی صورت ہے۔ اس کے کمالاتِ فن نہیں' جناب کم سے کم شروع شروع میں، پھر اہمیت اس کی سوشل پوزیشن کی ہے جس میں اس کی مالی حیثیت بھی شامل ہے۔ سب سے بڑھ کر اس کی حسِ مزاح ہے۔ مرد ہنسنے ہنسانے کا فن جانتا ہو تو زندگی سہل ہو جاتی ہے۔''

''میرے بارے میں کیا رائے ہے؟''

''تھوتھنی آپ کی دیکھ کر ابکائی نہیں آتی۔ سوشل پوزیشن آپ کی کچھ نہیں اور مالی حیثیت بھی معلوم۔ حسِ مزاح آپ میں خوب ہے اور رومانٹک باتیں بھی آپ کر لیتے ہیں۔ مگر ابھی پھل پکنے میں بہت دیر لگے گی اور اتنی فرصت مجھے ہے نہیں۔''

## یہ عالم شوق کا

''پھر تم میرے پاس کیوں آئیں؟'' جمال نے چڑ کر کہا۔

"سیدھی طرح کہیے کہ آپ اپنا سراپا سن کر خوش نہیں ہوئے۔ تعریف سننا چاہتے ہیں تو جناب آپ نہایت بانکے اور خوبصورت جوان ہیں۔ آپ کی ان گھنی زلفوں کے چھلوں میں ہم جیسی کئی دکھاریوں کے دل اٹکے پڑے ہوں گے۔ لِلّٰہ انہیں اپنی لمبی مخروطی انگلیوں میں مسل ڈالیے تو یہ کنیز اس لیے آئی ہے کہ آپ کو دیکھتے ہی اس کے ہوش وحواس جاتے رہے تھے۔"

"یعنی تم مجھ پر عاشق ہو گئیں؟"

"مگر اتنی بھی نہیں۔ سندھ گورنمنٹ میں تم غنیمت ہو۔"

"تمہاری شادی نہیں ہوئی غالباً۔"

"ممکن ہے سال بھر میں ہو جائے۔"

"کس سے؟"

"اس کا تو ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا۔"

"مگر میری شادی تو ہو چکی ہے۔" جمال نے اداس ہو کر کہا۔

"پتہ ہے پتہ ہے۔ ایسے خوشنما آدمیوں کو خالی کون چھوڑتا ہے۔"

"مجھے موقع ملتا تو میں تمہیں کبھی نہ چھوڑتا۔"

"کیا کرتے؟"

"اٹھا کر لے جاتا تم سے پوچھے بغیر۔ اس دنیا سے بہت دور۔ کسی گہری گپھا میں۔ آسمانوں کے اوپر۔ سمندر کی تہہ میں۔"

"ہائے ایمان سے کتنا مزہ آتا!"

"تو تم چاہتی ہو کہ تمہیں کوئی اٹھا کر لے جائے۔"

"ہر کوئی نہیں۔ کوئی خاص آدمی جسے میں چاہوں۔ وہ اٹھا کر لے جائے مجھے۔ آسمانوں کے اوپر کسی سمندر کی تہہ میں مگر لوگ بدھو ہیں، خوشامدیں کرتے ہیں۔ تحفے لا کر دیتے ہیں اور پھر ادب سے کونے میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بھیک مانگتے ہیں۔ جوراجوری کوئی نہیں کرتا۔ ایسوں کو کیا کوئی بھاڑ میں ڈالے۔"

"مگر میں تو تمہاری خوشامدیں نہیں کرتا۔"

"یہی ادا تو مجھے آپ کی پسند ہے۔ آپ کونے میں کھڑے ہو کر تھر تھر کانپنے والے نہیں۔ ایک بات تو ہے آپ میں، مگر مجھے کام کا آدمی جب بھی ملا شادی کیا ہوا ملا سالا!"

"بہت افسوس ہے!"

"خیر مگر میں اتنی جلدی میں بھی نہیں۔"

"تمہاری نظر میں ہے کوئی؟"



"ہے تو۔ ذرا عمر میں مجھ سے بڑا ہے اور شادی اس کی بھی ہو چکی ہے۔"

"تو تم دوسری بیوی ہو گی؟"

"ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔"

"کیسا ہے وہ؟"

"تھوتھنی اس کی تم جیسی نہیں۔ یہ لمبی ناک اور بہت چوڑا ماتھا مگر اس میں اور بہت سی خوبیاں ہیں۔ بڑا نفیس آدمی ہے۔ بہت پڑھا لکھا ہے۔ شیکسپیئر اور غالب اس کو منہ زبانی یاد ہیں۔ رومانٹک بھی بہت ہے۔ حسِ مزاح بھی رکھتا ہے اور سوشل پوزیشن بھی اس کی بہت اچھی ہے مگر مجھے سو فیصد پسند نہیں۔"

"پھر کیوں اس کی طرف راغب ہو تم؟"

"ارے وہ میری مامتا کو جوش دلاتا رہتا ہے۔ کہتا ہے تمہارے بغیر میں مر جاؤں گا۔ جوگی ہو جاؤں گا۔ کپڑے پھاڑ کر جنگل کو نکل جاؤں گا اس لیے۔"

"تم جیسی غنڈی کو دیکھ کر اور کیا کرے کوئی۔ دل تو پاگل ہوتا ہی ہے!"

"وہ پاگل وغیرہ نہیں۔ بڑا چالاک ہے۔ جانتا ہے کہ میں کسی کا دل نہیں توڑ سکتی۔"

"تو یوں کہو کہ تم اس پر رحم کھاتی ہو۔"

"رحم بھی کھاتی ہوں مگر اس کا پیروں میں لوٹنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اگلے روز ہمارے گھر سے رخصت ہو کر رات اس نے سیڑھیوں میں بیٹھ کر گزار دی۔ صبح مجھے پتہ چلا تو بڑا دکھ ہوا۔ بیچارہ دل سے کتنا مجبور ہے!"

"تو تم اس سے محبت بھی کرتی ہو۔ اصل بات یہ ہے۔"

"ٹھیک سے کہہ نہیں سکتی۔ کرتی بھی ہوں اور نہیں بھی کرتی۔ بڑا نفیس آدمی ہے اور ہر طرح سے چاہے جانے کے لائق۔ کاش عمر میں کچھ چھوٹا ہوتا۔ تمہارے جتنا۔"

"عمر سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اصل بات تو شخصیت کی ہوتی ہے اور شخصیت اس کی بہت عمدہ ہے۔ تم کہتی ہو۔"

"شخصیت اس کی بچوں جیسی ہے اور بچے مجھے بڑے اچھے لگتے ہیں۔ تم بھی تو بچے ہی ہو۔"

"میں بچہ نہیں، میرا مزاج بھی بچوں کا نہیں۔"

"اچھے آدمی اندر سے بچے ہی ہوتے ہیں ورنہ ان کو کوئی عورت بھی نہ چاہے۔"

"تو عورت کیا فقط بچوں کو چاہتی ہے۔"

"ٹھیک سمجھے۔ بچے عورت کی تکمیل کرتے ہیں۔ وہ اس کو کچھ دے سکتے ہیں۔ مرد عورت کو کیا دے سکتا ہے، بچوں کے سوا؟"

"جذباتی سی باتیں" جمال بولا

"ارے یہ تو کمزور سوسائٹی کی پہچان ہے۔ عورت کی فطرت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مرد اگر بچہ نہیں تو مشین ہے۔ جیسے میرے ڈائریکٹر صاحب' یہ مشین روزانہ مجھ پر ٹھرک جھاڑتی ہے۔ کھٹ کھٹ۔ کھٹ کھٹ۔"

"تمہیں کیسے پتہ ہے کہ وہ مشین ہے؟"

"مشین ایک روبہ ہوتا ہے۔ آٹومیٹک ہوتا ہے مگر وہ ٹھرک ضرور جھاڑتا ہے۔ بے وقوفوں کی طرح۔ دیکھتے ہی وہ میری خوشامد کرنے لگا اور تحفے دینے لگا۔ کوئی عطر کی شیشی، کوئی موتیوں کا ہار۔ اب مشینوں سے تو محبت نہیں کی جاسکتی نا؟"

جمال ڈر گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا" پتہ نہیں اب تم میرا کیا حال کرو گی۔"

"پتہ نہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔"تم میرے نشانے پر تو آ گئے ہو۔"

جمال کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی' مگر اس کا دل چاہتا تھا کہ آہو اس کے پاس بیٹھی رہے۔ اسے چھوئے اور جسمانی طور پر اسے مغلوب کرنے کی آرزو اس کے دل کو سلگتی تھی اور اس کو اس میں اپنی بیوی سے بے وفائی کا شائبہ تک نظر نہ آتا تھا۔ وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ میں کیا کروں۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ آہو زیادہ مزاحمت نہ کرے گی۔ رات بھر وہ اس کے بارے میں سوچتا رہا۔

اگلے روز وہ آئی مگر اس نے کوئی ذاتی بات نہ کی۔ وہ جلدی میں تھی۔ سکیم کی پبلسٹی کے بارے میں اس نے کچھ باتیں نوٹ کیں اور اٹھ کر چلی گئی۔

دو چار روز اسی طرح گزر گئے۔ پھر جمال نے اس کی راہ دیکھنی شروع کر دی۔ وہ بہانے بہانے سے برآمد میں ٹہلنے لگا کہ شاید کہیں وہ آتی جاتی نظر آ جائے۔

پھر جس دن اس نے اپنے دل کو سمجھا لیا کہ آہو کسی بڑی عمر کے امیر آدمی سے پھنسی ہوئی ہے اور مجھے صرف اپنے کام کے سلسلے میں استعمال کرتی ہے، اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہیے تو اچانک اس کا فون آ گیا۔

"میں مانتی ہوں کہ میں ایک بے وفا اور چالاک لڑکی ہوں۔" آہو بولی۔"میں کام سے تمہارے پاس آتی تھی اور کچھ نہیں تھا۔"

"مگر میں نے تو کوئی شکایت نہیں کی آہو۔" جمال بولا۔

"تم نے تو کچھ بھی نہیں کہا ابھی تک۔ کوئی سکینڈل بھی نہیں بنایا حالانکہ بہت گنجائش تھی۔"

"مگر تمہیں کیسے پتہ ہے کہ میں نے سکینڈل نہیں بنایا۔"

"کل نوازش علی لکھنوی آیا تھا۔ پھر استاد شوق کانپوری پدھارے۔ دونوں نے کہا، تم بہت خطرناک آدمی ہو۔"



"تم نے کیا کہا اس پر؟"

"میں نے کہا اس لیے تو میں جمال سے ملتی ہوں۔ مجھے بڑے اچھے لگتے ہیں خطرناک آدمی۔ وہ مجھے سمجھانے لگے۔ آخر میں دونوں نے کہا، اگر مجھے کوئی اعتراض نہ ہو تو وہ مجھے اپنی بہن سمجھ لیں۔ دونوں نے یہ بات الگ الگ کہی۔"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا، میں تم دونوں کو بھائی ہی سمجھتی ہوں۔ اس پر سالوں کے منہ اتر گئے۔"

"بڑی کمینی ہو آہو۔"

"وہ تو میں ہوں۔ کیا تمہیں کمینی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں؟"

"بہت اچھی لگتی ہیں۔"

"میں بھی اچھی لگتی ہوں؟"

"تم بھی۔"

## گھر بلایا

"یہ تو طے ہوا۔ اب کہنا یہ ہے کہ تم آج شام کسی وقت ہمارے گھر آ کر چائے پی جاؤ۔ میرے ابا تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"مگر تقریب؟"

"تمہارا آنا ہی تقریب ہے۔"

"مگر تمہارے ابا مجھے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔"

"میں نے کہا تھا کہ تم بہت خوبصورت آدمی ہو اور خوبصورت آدمی آج کل کم ہی دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا مجھے بھی یہ خوبصورت آدمی دکھا دو۔"

"اور کیا کہا میرے بارے میں؟"

"اور کہا تھا کہ ساری دنیا کی لڑکیاں تم پر مرتی ہیں۔ ٹھیک کہا تھا نا؟"

"بکواس مت کرو آہو کی بچی۔"

"اور سنو۔ اپنی بیوی کو بھی ساتھ لانا۔ میں بھی ذرا اس مظلوم عورت کی صورت دیکھوں۔"

"بیوی یعنی اپنی شرافت کا سرٹیفکیٹ۔"

"ارے نہیں۔ دیکھوں تو وہ کیسی ہے جو تمہیں لیے بیٹھی ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"رقابت کی وجہ سے۔ میں اس سے جلتی جو ہوں۔"

''بڑی حرامزادی ہو تم آہو۔''

''ارے یہی بات تو تمہاری اچھی لگتی ہے۔''

شام کو جمال نے اپنی بیوی کو عمدہ کپڑے پہنوائے۔ اس کو پتہ تھا کہ میری بیوی بہت بانکی عورت ہے مگر اس کے باوجود آہو اس کے کلیجے میں کھبی جا رہی تھی۔

آہو کے والد بہت حلیم، خوش مزاج اور دانا آدمی تھے۔ پاکستان میں انہیں کسی سے کوئی شکایت نہ تھی۔

آہو کے علاوہ انہیں اپنے کتے سے محبت تھی جسے وہ لکھنؤ سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کی ایک بیوہ بہن ان کے چھوٹے سے کنبے کی دیکھ بھال کرتی تھی۔

آہو نے مودی کا بڑے خلوص سے استقبال کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں دونوں خواتین کپڑوں اور فلموں کی دلچسپیوں میں محو ہو گئیں۔ آہو کے والد اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اپنے کتے کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔ لگتا تھا کہ اصحاب کہف کے غار پر اس کے پردادا کا پہرہ تھا۔

جمال کو کتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مگر بڑے میاں کی خاطر اس نے چاہا کہ میں بھی دنیا کے اس لاثانی کتے کی زیارت کرلوں۔

بڑے میاں نے آہو سے کہا ''ذرا پیٹر جان کو لے آئیں۔ جمال میاں ان سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔''

اس گھر میں تہذیب بہت زیادہ تھی اور گفتگو ایسی ملائم کہ جمال کو لگا میں آہو کے گھر میں نہیں کسی خانقاہ میں بیٹھا ہوں۔ جہاں کوئی زور سے نہیں بولتا۔ تمیزداری کی اس فضا میں اس کا قد بہت چھوٹا ہو گیا۔

## پیٹر جان دودھ پی رہے ہیں

تھوڑی دیر میں آہو آ کر بولی ''پاپا۔ پیٹر جان دودھ پی رہے ہیں۔ ابھی نہیں آسکتے۔''

''پیٹر جان دودھ پی رہے ہیں۔'' سن کر جمال کا رنگ اڑ گیا۔ اس گھر کی لڑکی کو اس نے حرامزادی، کمینی اور نہ جانے کیا کیا کہہ دیا تھا جس کے کتے کو بھی اس قدر احترام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آہو کتنی عظیم لڑکی تھی جس نے اس کی بدتمیزی کا احساس کبھی نہ ہونے دیا۔ یقیناً اسے آج تک کسی نے اس طرح مخاطب نہ کیا ہوگا۔ اس کا جی چاہا کہ میں اٹھ کر آہو کے والد کے قدموں میں گر جاؤں اور پھر جوتے پہنے بغیر بھاگ جاؤں مگر وہ ہل نہ سکا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب آہو چادر اوڑھ کر نماز کے لیے کھڑی ہو گئی تو جمال کو اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ اس نے ایک خداپرست اور نیک چلن خاتون کے بارے میں کیسے کیسے ذلیل ارادے باندھے تھے!



آہو نے گھر میں کسی شوخی کا مظاہرہ نہ کیا تھا۔ آہو پر اپنے والد کا دباؤ نہیں تھا۔ شرافت اور حیا اس کی فطرت میں تھی جس نے چلبلے پن کا برقع پہن رکھا تھا۔

مودی میں ایک خاص قسم کا سلجھاؤ اور سلیقہ تھا۔ وہ کسی لڑکی پر شبہ کر ہی نہ سکتی تھی۔ گھر آ کر اس نے آہو کی بہت تعریف کی۔ جمال نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی مگر اس نے اس کے ایک ایک لفظ کو دھیان سے سنا۔ جمال کو اس بات پر خوشی ہوئی کہ آہو اور مودی سہیلیاں بن گئیں۔ دو حسین عورتوں کی دوستی کسی کو بھی بری نہیں لگتی' جب کوئی ان میں سے ایک کا شوہر اور دوسری کا چاہنے والا ہو۔

اگلے روز آہو جمال کے کمرے میں آئی تو اس نے بڑی تمیزداری دکھائی۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ آہو۔'' جمال نے کہا۔ ''آپ لوگوں نے ہماری بہت پذیرائی کی۔ آپ کے والد گرامی ایک عظیم شخص ہیں۔''

''چھوڑو یار۔'' وہ بولی۔ ''پاپا کو تم بہت پسند آئے۔''

''یہ ان کی عنایت ہے۔'' جمال نے کہا۔

''مجھے تمہاری بیوی اچھی لگی۔ بہت معصوم عورت ہے۔ اچھا ہاتھ مارا تم نے مگر مجھے یہ بتاؤ کہ سوروں ہی کو ہمیشہ پونڈے کیوں ملتے ہیں۔''

''سور تو میں واقعی ہوں۔'' جمال بولا ''اور پونڈے بھی مجھے ملتے ہیں۔ تم خود کتنی شیریں اور رس کی بھری ہو۔''

''سور تو تم واقعی ہو۔''

جمال سنجیدہ رہا۔ اس نے کہا ''آہو میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔''

''کس بات کی؟'' اس نے پوچھا۔

''یہی کہ میں نے تم سے بہت بدتمیزی کی۔ بے تکلفی میں تمہیں گالیاں دیں۔ خدا کی قسم میں دل میں تمہیں بہت عمدہ خاتون سمجھتا ہوں۔''

## حرامزادی کمینی

''یعنی تم نے مجھے حرامزادی کمینی وغیرہ کہا؟''

''ایمان سے میں بہت شرمندہ ہوں۔ میرا دل بیٹھ رہا ہے۔''

''ذرا نبض تو دکھاؤ'' یہ کہہ کر اس نے جمال کی کلائی پکڑ لی اور گھڑی نکال کر دھڑکنیں گننے لگی۔

جمال کے بدن میں بجلی دوڑ گئی۔ اس کا رنگ لال ہو گیا۔ اس نے کہا ''چھوڑو مجھے تنگ نہ کرو آہو۔'' حالانکہ اس کا جی چاہتا تھا کہ آہو اس کا ہاتھ پکڑے رہے۔ وقت تھم جائے اور دنیا کا خاتمہ ہو جائے۔ اس کے لمس کی لذت سے اس کا دماغ سنکنے لگا۔

''بہت بیمار ہو تم۔'' اس نے متانت سے کہا۔

''معاف کر دو آہو جی۔''

سنجیدگی آہو کے چہرے پر طاری رہی۔ اس نے آنکھیں جمال کی آنکھوں میں ڈال کر کہا ''تو واقعی میں تمہیں معاف کر دوں جمال؟''

''واقعی پلیز!''

''یعنی تم وعدہ کرتے ہو کہ آئندہ مجھے حرامزادی کمینی وغیرہ نہیں کہو گے؟''

''وعدہ کرتا ہوں۔''

''افسوس مسٹر جمال میں آپ کو غلط سمجھی۔ میرا خیال تھا کہ آپ دوستی کے لائق ہیں کیونکہ آپ سچے آدمی ہیں مگر آپ بھی بالآخر محض بھائی جان ہی نکلے۔ نوازش علی اور استاد شوق کانپوری کی طرح۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ آئندہ آپ کا مجھ سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔''

''یہ نہیں کہا، میں نے آہو۔''

''یہی کہا ہے تم نے جمال۔ حرامزادی کمینی کہہ کر مجھے جو کچھ تم نے دیا تھا، واپس لے لیا کسی وجہ کے بغیر۔''

''میں نے کچھ واپس نہیں لیا' اپنے الفاظ کے سوا۔''

''تم نے وہ تعلق واپس لے لیا جسے میں لذت سے دیکھتی تھی۔ حرامزادی اور کمینی تو بہت اپنائیت کی بات تھی!''

آہو واقعی اداس ہو گئی۔ اس نے اپنی ساڑھی بدن کے گرد لپیٹ لی۔

جمال کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ اچانک اس نے کہا ''میں تم سے محبت کرتا ہوں آہو۔''

''اب حد سے نکل چلے تم۔'' آہو بولی۔ ''توازن قائم رکھو۔ محبت وغیرہ مت کرو مجھ سے۔ روؤ گے۔ ٹکریں مارتے پھرو گے۔ راستہ نہ ملے گا۔''

''بڑی حرامزادی ہو خدا کی قسم!'' جمال نے بے چین ہو کر کہا۔

''یہ ہوئی نا بات۔'' اس نے کہا۔ اس کے ہونٹوں کے کونے پھیل کر چمکنے لگے۔

''جینے نہیں دیتیں کسی طور!'' جمال نے ہارتے ہوئے کہا۔

''جینے تو نہ دوں گی۔ اسی طرح تڑپاؤں گی۔ سوچ لو۔''

''سوچنے کب دیتی ہو تم؟''

''سوچنا چھوڑ دو۔ جینا شروع کرو۔''



''تم بے بس کر دیتی ہو۔ بہت خوبصورت ہو۔''

''خوبصورت نہیں اتنی۔ دلفریب ہوں، من کو بھاتی ہوں، لذیذ ہوں۔ تمہیں تعریف کرنی بھی تو آئے۔''

''سکھا دو پھر۔''

''کبھی نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم وہی رہو جو کہ تم ہو۔ اپنی اصلیت پر رہو۔ تم جس دائرے میں ہو اس میں سچائی ہے، خلوص ہے، گرمی ہے۔ مجھے تم اسی طرح اچھے لگتے ہو۔ من چلے، جوشیلے، بے وقوف!''

''مگر میں تمہیں اپنے ساتھ لپٹانا چاہتا ہوں۔''

''مجھے اچھا لگا تمہارا اس طرح چاہنا۔ میرا بدن دلکش ہے۔ چاہے جانے کے لائق۔ جسم کے حوالے کے بغیر مرد و عورت میں تعلق ہو ہی نہیں سکتا۔ کاش کہ لوگ سچ بولنے لگیں تمہاری طرح۔''

''کیا تم میرے قریب آنا نہیں چاہتیں آہو؟''

''چاہتی ہوں۔ کیوں نہیں چاہتی مگر......''

''مگر کیا۔ اس وقت کمرے میں کوئی نہیں۔''

''یہ اور بات ہے جمال۔''

''اور کیا بات ہے؟''

''قریب آنے کا مطلب عہد کرنا ہوتا ہے اور عہد برابر کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ ہم تم آپس میں برابر نہیں ہیں۔''

''کیوں نہیں برابر؟'' جمال نے پوچھا۔

''اس لیے کہ تم نے مجھ سے ملنے سے پیشتر شادی کر لی۔ ہم برابر نہیں رہے اب۔''

اس پر جمال کو کسی قدر افسوس ہوا مگر اس نے کہا ''یہ تو ٹھیک ہے۔''

''تمہاری بیوی ہر طرح سے تمہاری حقدار تھی۔ وہ ایک پیاری لڑکی ہے۔ تم پر کوئی ظلم نہیں ہوا۔''

''یہ میں مانتا ہوں۔''

## جسم کی لذت کے بغیر

''ہم دونوں میں دوستی ہو سکتی ہے۔ جسم کی لذت کے بغیر۔''

''مگر مجھے تمہارے جسم کی شدید آرزو ہے۔''

''مجھے بھی ہے گو اتنی شدید نہیں۔''

''کیوں بھلا؟''

''اس لیے کہ میں اس لذت سے ابھی تک آشنا ہی نہیں۔''

"واقعی؟ تمہیں اس کا تجربہ نہیں ابھی تک؟"

"نہیں۔ تمہیں بہت حیرت ہوئی؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"میں سمجھتا تھا کہ تمہیں تھوڑا بہت اس لذت کا تجربہ ہوگا۔ اس کے بغیر اتنا اعتماد پیدا نہیں ہو سکتا جتنا کہ تم میں ہے۔"

"شاید مجھ میں اتنا اعتماد نہ ہو جتنا کہ تم سمجھتے ہو۔"

"پتہ نہیں۔" جمال نے بے یقینی سے کہا۔

"اگر میں تمہارے آگے کبھی کمزور پڑ جاؤں تو فائدہ نہ اٹھالینا۔ میرا نقصان ہو جائے گا۔"

"وعدہ نہیں کرتا۔"

"تمہارا یہ کہنا بھی مجھے اچھا لگا۔ اگر تم آزاد ہوتے تو فوراً تم سے شادی کر لیتی۔ ایمان سے سوچتی بھی نہیں۔"

"جینے بھی دو گی کسی طرح؟" جمال نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے عشق کرو۔ میرے جسم کی آرزو تمہیں پاگل کر دے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں چاہتی۔"

"میں تمہیں چومنا چاہتا ہوں آہو۔"

"کہاں پر؟"

"تمہارے ہونٹوں پر، تمہاری گردن پر، تمہاری خوبصورت ناف پر، جو تمہارے جسم کے سمندر میں بھنور لگتی ہے۔ میں تمہارے جسم کی ایک ایک پور چومنا چاہتا ہوں۔ سر سے پیر تک۔ بار بار۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

"جہاں جہاں میں چوموں گا۔ وہاں وہاں گلاب کے پھول نکل آئیں گے۔"

"یعنی میں محض گلاب کی ایک جھاڑی بن جاؤں گی؟"

"ہاں۔"

"تم ایک اچھی بھلی خوبصورت لڑکی کو بگاڑنا چاہتے ہو، کس لیے؟"

"بکواس بند کرو۔ ادھر آؤ میرے قریب۔"

"صبر کرو۔ ٹھہرو ذرا۔"

"میرے دل میں آگ بھڑک رہی ہے آہو۔"



"اچھے بچے بنو۔ کوئی دیکھ لے گا، بدنام ہو جاؤ گے بیکار!"

"اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔"

آہو نے ہاتھ بڑھا کر جمال کے منہ پر رکھ دیا۔ تو اس نے چوم لیا۔ وہ اپنے ہاتھ کو غور سے دیکھ کر بولی "اس پر تو کوئی گلاب نہیں کھلا۔ یہ الٹا جلنے لگا ہے۔ تمہارے ہونٹوں میں کرنٹ تو ہے!"

"ایک دفعہ اور آہو۔" جمال نے منت کی۔

"نہیں جی۔" وہ اٹھلا کر بولی۔ "جھٹکا لگے گا ہمیں۔"

"تمہاری ناف بہت خوبصورت ہے۔"

"جانتی ہوں مگر کیا تم نے کلاسیکی ہندو جمالیات کا مطالعہ کیا ہے؟ ضرور کیا ہے۔ ہندوؤں کو پتہ تھا کہ ناف کا حسن کیا ہے۔"

"میں نے کلاسیکی ہندو جمالیات کا مطالعہ نہیں کیا' فقط تمہیں دیکھا ہے۔"

"ٹھیک ہے ذوق مطالعے کا محتاج نہیں ہوتا۔"

"اب تم مجھے ٹالتی ہو۔"

"ٹالتی بھی ہوں۔"

"مگر میں تمہاری ناف کے لیے بے قرار ہوں۔"

"میں چاہتی ہوں کہ تم میرے لیے بے قرار رہو۔ ناف چومنے کے بعد تمہارا شوق آسودہ ہو جائے گا۔"

"یا بڑھ جائے گا۔"

"یہ امکان بھی ہے۔ اگر زندگی میں' میں نے کبھی تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو ایک بار تم میری ناف چوم لینا۔ فی الحال میں تم سے تعلق توڑنا نہیں چاہتی۔ تمہیں اپنے آس پاس دیکھنا چاہتی ہوں اس لیے۔"

"تو بالآخر تم مجھے چھوڑ دو گی۔"

"چھوڑنا ہی ہوگا ایک دن مگر اچھی یادوں کے ساتھ۔ پیاری یادوں کے ساتھ۔"

جمال اداس ہو گیا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ آہو ایک خوشبودار جھونکے کے سوا کچھ بھی نہیں اور خوشبودار جھونکے کسی کا ساتھ نہیں دیتے۔ اس نے ایک آہ بھری اور کہا "جب تم مجھے چھوڑو گی تو ایک دفعہ مجھے اپنی ناف کو چومنے کا موقع دو گی۔ اچھی یادوں سے تمہارا یہی مطلب ہے؟"

"ہاں جب میں نے کہیں دور جانے کا فیصلہ کر لیا۔"

"وعدہ کرو۔"

"وعدہ' کیونکہ میری یہ اپنی خواہش بھی ہے۔ میرے ہاتھ پر تمہارے ہونٹوں کا لمس مجھے اچھا لگا۔

میری ناف چومنے کے بعد تم مجھے یاد کرو گے اچھے جذبوں کے ساتھ۔''

''اور تم؟ جذبوں کی تکمیل کے بغیر؟''

''جذبوں کی تکمیل ہو جائے تو جذبے مر جاتے ہیں۔ جذبے زندہ رہنے چاہئیں۔ یہ کیا کم ہے کہ یہاں بیٹھے ہیں ہم دونوں ساتھ ساتھ اور کمرے میں کوئی اور نہیں۔''

''یہ بھی بہت ہے مگر۔''

## کام کی بات

''یہی بہت ہے۔ آگ سلگتی رہے تو اچھا ہے۔ بھڑک جائے تو بجھ جاتی ہے۔ لو اب کچھ کام کی بات کریں۔ اگلے اتوار تم فارغ ہو؟''

''کیوں؟''

''ہم جا رہے ہیں سمندر پر۔ ہم گھر کے لوگ۔ پاپا نے کہا تمہیں اور تمہاری بیوی کو بھی ساتھ چلیں، اچھا وقت گزرے گا۔''

جمال ہنس کر بولا ''تو پاپا نے ہمیں انٹرویو کے لیے بلایا تھا۔ اب سمجھا، ہم پاس ہوئے!''

''ایمان سے نہیں۔'' آہو بولی ''اس وقت تو کوئی پروگرام ہی نہیں تھا۔ تو چلو گے نا؟''

''کیوں نہیں۔ ضرور چلیں گے۔''

''شکر ہے کہ تم مان گئے۔ میں تو اس کے لیے کچھ قیمت دینے پر بھی تیار تھی۔''

آہو نے اٹھ کر اپنا ہاتھ جمال کے گالوں پر لگایا اور مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد استاد شوق کانپوری غصے میں بھرے ہوئے جمال کے کمرے میں داخل ہوئے اور آتے ہی بولے ''میں نہ کہتا تھا، یہ سندھی بڑے حرامزادے ہیں۔''

رحیم بخش چوکنا ہو گیا۔

نوازش علی لکھنوی بولے ''تمہیں تو کچھ خبر ہی نہیں۔ تم دفتر میں لڑکیاں لے کر بیٹھے رہا کرو اور یہاں لٹیا ہی ڈوب گئی ہے۔''

جمال سخت پریشان ہوا۔ اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ کیا ہوا ہے۔ سندھیوں کو کیوں گالی پڑ رہی ہے اور کس کی لٹیا ڈوب گئی ہے۔ اس نے بے قرار ہو کر پوچھا ''کیا ہوا، کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔''

''اجی ہونا کیا ہے۔'' استاد شوق کانپوری بولا ''ایک سندھی سالے نے ہمارے محبوب صاحب کو ہوٹل کی چوتھی منزل سے دھکا دے دیا۔''

''اور ان کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں۔'' نوازش علی بولا۔ ''میں خود انہیں دیکھ کر آیا ہوں۔''



''مگر سندھی نے انہیں دھکا کیوں دیا؟'' جمال نے پوچھا۔

''یہ تم سندھی سے پوچھ لینا۔''

''کیا وہ گرفتار ہو گیا ہے؟''

''اجی کہاں۔ سندھی کہیں گرفتار ہوتے ہیں؟'' نوازش علی نے جواب دیا۔

''مگر ہوا کیا؟'' جمال نے پوچھا۔

## مشٹنڈا سندھی

''اجی ہونا کیا تھا۔ محبوب حیدر آبادی صاحب دھان پان آدمی ہیں۔ کھانا کھا کر ذرا ہوٹل میں ستا رہے تھے کہ ایک مشٹنڈا سندھی کمرے میں آیا اور اس نے انہیں اٹھا کر کھڑکی سے پھینک دیا۔ جان شاید بچ جائے ان کی مگر لنگڑے تو عمر بھر کے لیے ہو گئے۔'' نوازش علی نے کہا۔

''مگر سندھی کون تھا۔ اسے محبوب صاحب سے کیا دشمنی تھی؟'' جمال نے پوچھا۔

''سندھی تو سندھی ہوتا ہے۔'' استاد شوق کانپوری بولے ''میں نے اسے پہلے بھی ہوٹل کے اورے تورے پھرتے دیکھا ہے۔ سور کی طرح ہٹا کٹا۔ سر پر اجرک کی پگڑی، بھاری شلوار، رنگ کالا اور آنکھوں میں سرمہ۔ شکل ہی سے قاتل لگتا تھا۔''

''مگر محبوب صاحب سے اس کی کیا دشمنی تھی۔ محبوب صاحب تو سندھیوں سے بڑی محبت کرتے ہیں۔'' جمال نے حیرت سے پوچھا۔ بات کچھ اس کے پلے نہ پڑتی تھی۔

نوازش علی بولا ''سیدھی بات ہے۔ سندھیوں کو مہاجروں سے نفرت ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ کوئی مہاجر کسی محکمے کا افسرِ اعلیٰ بن جائے۔ یہاں میر محمد شاہ ڈائریکٹر تھا۔ ضرور یہ بدمعاش بھی اسی نے بھیجا ہو گا۔''

جمال کو بہت تکلیف ہوئی۔ ایک تو محبوب حیدر آبادی اس کے پرانے اخبار نویس ساتھی تھے۔ دوسرے وہ اس کا بڑا خیال رکھتے تھے اور اپنے خاص کام اسی کو تفویض کرتے تھے۔

بیچارہ رحیم بخش کھسیانا اور شرمندہ ایک لفظ بھی نہ بولا۔

جمال نے دفتر سے گاڑی لی اور فوراً ہسپتال جا پہنچا۔ محبوب صاحب ابھی بے ہوش تھے۔ دونوں ٹانگوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ڈرپ سے گلوکوز ان کے اندر جا رہا تھا۔ نرس حیران کھڑی تھی۔

جمال کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ محبوب حیدر آبادی کے سینے، چہرے اور سر پر کوئی زخم نہیں آیا تھا اور یہ کہا جا سکتا تھا کہ ان کی جان بچ جائے گی۔

تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ چلا آیا۔ محبوب صاحب کا ڈرائیور اور چپڑاسی دروازے کے باہر بنچ پر بیٹھے تھے۔

ان کے دوست عقیل صاحب جو حیدر آباد کے رہنے والے تھے، پنجوں پر چلتے ہوئے باہر آئے اور

انہوں نے سرگوشی کے انداز میں کہا ''میں نے سندھی کو ہوٹل کی سیڑھیاں اترتے خود دیکھا۔اس کے بڑے بڑے ہاتھ تھے۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ وہ محبوب کو دھکا دے کر جا رہا ہے ورنہ میں سالے کو وہیں پکڑ لیتا۔ہم نے پولیس کو اطلاع کر دی ہے مگر وہ پوچھتے ہیں کہ تم بتاؤ، وہ کون ہے۔اس کا کیا نام تھا۔اس کا پتہ کیا ہے۔اب ہماری جوتی جانے۔سندھی تو سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ایک دم سب مجرم، پھر کسی ایک کو کیسے پہچانا جائے۔تم ہی بتاؤ کیا تمہیں کسی پر شبہ ہے؟ دفتر میں کون آتا جاتا ہے۔اس میں رحیم بخش کا ہاتھ تو نہیں؟''

جمال گھبرا گیا۔اس نے کہا ''اس میں رحیم بخش کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔وہ تو بہت سیدھا آدمی ہے اور محبوب صاحب اس پر مہربان بھی ہیں۔''

''محبوب تو سبھی پر مہربان ہے۔اس کی بات نہ کرو۔'' نوازش علی بولے۔

''بہرحال مجھے کسی پر شبہ نہیں اور رحیم بخش پر تو بالکل نہیں۔'' جمال نے کہا۔

''خیر ذرا ہوش میں آ جائے تو پوچھ لیں گے۔محبوب ضرور کچھ نہ کچھ بتا سکے گا۔''

جمال کا دل نہ مانا کہ رحیم بخش اس واقعے میں ملوث ہو سکتا ہے۔یہ یقین کرنا بھی مشکل تھا کہ سندھی سارے کے سارے مجرم ہوتے ہیں یا وہ کسی محکمے کی سربراہی پر کسی مہاجر کو برداشت نہیں کر سکتے۔یہ بات تو اس نے مہاجروں کی خفیہ تنظیم میں دیکھی تھی جس نے چاہا تھا کہ جمال اس کا رکن بن جائے۔وہ سندھیوں کو برداشت نہیں کرتی تھی۔ پھر محبوب حیدر آبادی ایک مہربان افسر تھا۔اسے سندھیوں سے اور سندھیوں کو اس سے کوئی شکایت نہ تھی۔شراب پی کر جب وہ کبھی جمال سے کھلتا تو نوازش علی، استاد شوق کانپوری اور مہاجروں کو بالعموم گالیاں دیتا جن کی حرص کی کوئی انتہا ہی نہ تھی۔

گھر لوٹتے ہوئے وہ اسی اُدھیڑبن میں رہا مگر یہ گتھی اس سے سلجھتی نہ تھی کہ محبوب حیدر آبادی کو کسی سندھی نے دن دیہاڑے ہوٹل میں جا کر چھت سے نیچے کیوں پھینکا۔

اگلے روز بھی دفتر میں یہی چرچا رہا۔رحیم بخش کے کان کھلے تھے مگر لبوں پر مہر تھی۔استاد شوق کانپوری اور نوازش علی اس کے سامنے سندھیوں کو بے نقط سناتے رہے۔جمال چپ رہا کیونکہ اس کو کچھ معلوم نہ تھا اور اس کے لیے استاد شوق کانپوری اور نوازش علی کی چشم دید شہادتوں پر یقین کرنا مشکل تھا۔

اگلے روز وہ دفتر سے فارغ ہو کر ہسپتال گیا تو محبوب حیدر آبادی ہوش میں آ چکے تھے اور اگرچہ ان کا رنگ زرد تھا مگر وہ آہستہ آہستہ بات کر سکتے تھے۔جمال کا دل چاہا کہ وہ ان سے واقعے کی تفصیلات پوچھے مگر اسے ہمت نہ ہوئی۔اس کے پاس اس کے اردو بولنے والے دوست بیٹھے تھے اور بڑھ چڑھ کر سندھیوں کو گالیاں دے رہے تھے جنہوں نے مہاجروں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔بیچ بیچ میں وہ محبوب حیدر آبادی کے دھکے کا ذکر کر جاتے تھے مگر خود محبوب صاحب اس معاملے میں چپ رہے۔انہوں نے سندھیوں کا نام تک نہ لیا اور

[illegible]



یہی رپورٹ اوپر ہوم ڈیپارٹمنٹ کو بھیجی گئی کہ کس طرح ایک کالا بھجنگ سندھی اچانک محبوب حیدر آبادی کے ہوٹل کے کمرے میں آیا اور اس نے اسے بستر سے اٹھا کر چوتھی منزل سے نیچے گرا دیا۔ چونکہ اس رپورٹ کے علاوہ کوئی دوسری رپورٹ پیشِ نظر نہ تھی اس لیے حکومت نے اسے درست تسلیم کر لیا اور پولیس کو حکم دیا کہ وہ ملزم کو گرفتار کر کے قانون کے سامنے پیش کرے۔محبوب حیدر آبادی کو بیماری کی چھٹی مل گئی۔ان کی جگہ خوجہ صاحب کو عارضی طور پر انچارج مقرر کر دیا گیا تھا۔

وہ اسمٰعیلی خوجہ تھے اور سخت خوفزدہ آدمی تھے۔مہاجروں سے تو ان کی جان جاتی تھی۔جمال سے ان کے تعلقات بہت اچھے تھے کیونکہ جمال ان کا کام بھی کر دیتا تھا اور اسے کسی سے نفرت بھی نہ تھی۔

اس بات پر سب کو دکھ تھا کہ کسی بدبخت سندھی بدمعاش نے محبوب صاحب کی جان لینے کی سوچی تھی مگر جمال کو اس بات پر سخت حیرت ہوئی کہ ایف آئی آر میں محبوب صاحب نے کسی سندھی کا نام نہ لکھوایا تھا۔وہ ایسے ہی شریف اور دردمند آدمی تھے۔اس امر کے باوجود کہ انہیں کسی سندھی نے چوتھی منزل سے زمین پر پٹخ دیا تھا، انہوں نے سندھیوں سے کوئی بغض نہ رکھا اور لکھوایا کہ میں کھڑکی سے باہر کو جھکا تو مجھے چکر آ گیا اور پھر مجھے پتہ نہ چلا کہ کیا ہوا ہے۔میرے گرنے میں کسی کی خطا نہیں۔یہ محض ایک حادثہ تھا مگر ان کے اردو بولنے والے دوست قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ انہیں کسی سندھی نے دھکا دے دیا تھا۔استاد شوق کانپوری تو اس کو پہچانتے بھی تھے اور نوازش علی لکھنوی اس کا نام تک جانتا تھا۔

دو روز کے بعد محبوب صاحب پوری طرح سنبھل گئے مگر اب اصل بات یہ تھی کہ وہ کب چلنے پھرنے کے قابل ہوتے ہیں۔یہ تو طے تھا کہ ان کی چال ہموار کبھی نہ ہوگی کیونکہ ایک ٹانگ کی ہڈی بیچ میں سے ریزہ ریزہ ہو گئی تھی اور تندرستی کے بعد بھی اس میں لنگ لازمی تھا۔

چند دنوں کے بعد بات آئی گئی ہو گئی مگر ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ چلنے پھرنے میں کم سے کم چار ماہ اور لگیں گے۔چیف سیکریٹری ان پر بہت مہربان تھا۔اس نے ہسپتال والوں کو چٹھی لکھ دی تھی کہ حکومت سندھ محبوب حیدر آبادی کے علاج میں گہری دلچسپی رکھتی ہے۔

آہو کو پتہ چلا تو وہ بھی جمال سے ہمدردی کرنے کے لیے آئی۔پکنک پر جانے کا پروگرام اس نے ملتوی کر دیا تھا۔وہ اس بات پر سخت حیران تھی کہ محبوب حیدر آبادی کو کسی سندھی نے چوتھی منزل سے دھکا دے کر مار ڈالنے کی کوشش کی تھی۔اس کا دل نہ مانتا تھا مگر استاد شوق کانپوری اور نوازش علی اس بات کی سچائی پر قسمیں کھاتے تھے۔

رحیم بخش اس معاملے میں چپ تھا مگر لگتا تھا کہ اسے اس خبر پر شک ہے۔شک تو جمال کو بھی تھا۔وہ سندھیوں کو ایسا نہ سمجھتا تھا، پھر ڈائریکٹر اطلاعات سندھ کی نوکری ایسی نہ تھی کہ سندھ کو اس سے نقصان پہنچے۔سندھی ویسے ہی بے جان تھے۔ان میں مڈل کلاس پیدا نہ ہوئی تھی اور جو حکومت میں بھرتی ہو سکے تھے، ڈر ڈر کر

وقت گزارتے تھے مگر شہادتوں کا کیا کیا جاسکتا تھا۔ جمال کو کبھی کبھی خیال آتا کہ محبوب صاحب نے ایف آئی آر میں سندھیوں کا نام نہ لکھوا کر غلطی کی۔ مجرم کو سزا تو بہر حال ملنی چاہیے تھی۔

خوجہ صاحب چاہتے تھے وہ کام جس طرح چلتا ہے، چلتا رہے۔ وہ کسی سے کچھ نہ کہتے تھے۔ دل کے صاف تھے اور دماغ بھی ان کا خالی تھا۔ ایک دن انہوں نے جمال کو بلایا۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا ''حکومت کی آڈٹ ٹیم آنے والی ہے اور وہ ہمارا حساب دیکھے گی۔ میں نے تو کوئی غلطی نہیں کی مگر پتہ نہیں ہمارا کیا بنے گا۔''

جمال نے کہا ''جب ہم نے کوئی غلطی نہیں کی تو ہمیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

خوجہ صاحب بولے ''مگر تم ذرا شفیق امروہی سے بات کرو۔ اکاؤنٹس کا اسی کو پتہ ہے۔ اگر کہیں کوئی غلطی ہے تو ابھی درست کرلیں۔''

## آڈٹ والے

شفیق امروہی ایک سڑیل آدمی تھا۔ برا آدمی نہیں تھا۔ مگر قاعدے قانون کی پابندی میں بڑا سخت گیر تھا اور حسابات کے معاملے میں وہ کسی سے بات نہیں کرتا تھا مگر اسے ہومیوپیتھی کا شوق تھا اور ہومیوپیتھی میں جمال کو بھی دلچسپی تھی۔ اس لیے وہ اس سے کسی قدر بے تکلف ہو جاتا تھا۔

آڈٹ کی خبر پر وہ بھی پریشان ہوا مگر بولا ''صاحب ہمارا کیا ہے۔ محبوب صاحب البتہ پھنس جائیں گے۔''

''محبوب صاحب کیوں پھنس جائیں گے؟'' جمال نے پوچھا۔

وہ بولے ''ہمارے پاس تو ایک ایک روپے کی رسید ہے۔ یہ ان کی عادت تھی کہ وہ چٹ لکھ کر دفتر سے روپیہ نکلوا لیتے تھے اور دوستوں کو شرابیں پلا دیتے تھے۔ میں نے انہیں بہت سمجھایا مگر وہ سنتے ہی نہ تھے۔ اب سات سو روپے ماہوار ان کی تنخواہ اور سولہ ہزار کا ایڈوانس وہ لے چکے ہیں۔ میرے پاس ان کے دستخط موجود ہیں۔ کیش بک بھی میں نے مکمل رکھی ہے۔ اب وہ چوتھی منزل سے کودیں یا سمندر میں ڈوب مریں۔ آڈٹ والے تو انہیں چھوڑیں گے نہیں۔ نوکری بھی گئی اور عزت سادات سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ برے کاموں کا برا انجام۔''

''مگر شفیق صاحب انہیں تو کسی سندھی نے دھکا دیا تھا۔'' جمال نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اجی چھوڑیئے جمال صاحب۔ یہ سب کہانیاں ہیں۔'' شفیق امروہی بولے۔

''مگر استاد شوق کانپوری اور نوازش علی نے تو اس سندھی کو دیکھا بھی ہے۔ وہ یہی کہتے ہیں۔''

''جھوٹ بولتے ہیں، بکواس کرتے ہیں۔ سندھیوں کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے جو میں نے آپ کو بتائی ہے۔ محبوب صاحب سرکاری مال کھا گئے۔ اب سر پر پڑی تو چھلانگ لگا دی۔



مر جاتے تو شاید بات نہ کھلتی۔ اب تو انہیں حساب دینا ہی پڑے گا مگر میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کہاں سے حساب پورا کریں گے۔ سرکار میں بڑی رقمیں کھائی جاسکتی ہیں مگر محض پندرہ سولہ ہزار ہو تو اُگلنا ہی پڑتا ہے۔''

''یہ تو عجیب بات آپ نے کہی۔'' جمال حیران ہو کر بولا۔ ''آپ نے انہیں سمجھایا نہیں کبھی؟''

''اجی بہت سمجھایا مگر وہ کب کسی کی مانتے تھے۔ ہم نے وہ ڈسکشن بھی ریکارڈ کر رکھے ہیں جو اس سلسلے میں ہم نے کیے۔ ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اب تماشہ ہوگا تو دنیا دیکھے گی۔ بظاہر معقول آدمی تھے، مگر جو کچھ کرتے تھے اپنے آپ کو تباہ کرنے کے لیے کرتے تھے۔''

# باب 21

ڈنمارک کے موزسکاف اوراول یول کو کسی نے سوئٹزرلینڈ میں بتادیا تھا کہ پاکستان کے نام سے ایک نیا ملک معرضِ وجود میں آیا ہے جس کی تہذیب آٹھ دس ہزار سال قدیم ہے اور ابھی اس کے شواہد موجود ہیں مثلاً موہنجوڈارو۔ یہاں کے لوگ ہزاروں سال پہلے پکے مکانوں میں رہتے تھے، شہروں کی منصوبہ بندی کرتے تھے۔ گندے پانی کے نکاس کے لیے زمین دوز نالیاں کھودتے تھے۔ کپاس اُگاتے تھے، کپڑا بنتے تھے، سونے کے زیور پہنتے تھے۔ کانٹے سے مچھلی پکڑتے تھے اور شطرنج کھیلتے تھے۔ یہاں کے لوگ مہذب تھے۔ یہاں کوئی بھوکا نہ سوتا تھا۔ کوئی لڑتا بھڑتا نہ تھا۔ تعلیم کے لیے درسگاہیں اور نہانے کے لیے تالاب تھے جن کی پکی اینٹوں کو آری سے کاٹ کر ہموار کیا جاتا تھا اور ہزاروں سال پرانے جپسم کے پلستر کی چمک ابھی تک ماند نہیں ہوئی۔ پھر اسی ملک میں ہڑپہ نامی ایک ویرانہ ہے جس کی پکی اینٹوں کو اکھاڑ کر انگریزوں نے پنجاب میں ریل کی پٹڑی بچھائی تھی مگر شہر کی بنیادیں ابھی تک قائم ہیں۔

اول یول اور موزسکاف کو کسی نے بتادیا کہ چینی بھکشو ہیون سانگ اب بھی اپنی زعفرانی ردا میں لپٹا ٹیکسلا کے کھنڈروں میں آوارہ پھرتا ہے۔ اس کے علم کی پیاس ابھی نہیں بُجھی۔ سری کپ میں اب تک راتوں کو بدھ کے نام کے چراغ جلتے ہیں اور یہیں کہیں اشوک اپنے راج سنگھاسن پر بیٹھ کر عوامی بھلائی کے فرمان جاری کرتا ہے۔ دور پہاڑی کے اوپر اندھا کنال جس کی خوبصورت آنکھیں اس کی سوتیلی ماں نے محبت سے انکار کی سزا دینے کے لیے نکلوادی تھیں، من کی جوت لگائے بیٹھا ہے۔

''یہ ہماری تاریخ نہیں۔'' مولانا مودودی نے خشونت سنگھ سے کہا۔ ''ہماری تاریخ محمد بن قاسم کے حملے سے شروع ہوتی ہے۔''

اس سے پہلے جو کچھ تھا، وہ نہیں تھا۔ ہمارے زمیندار حکمران بولے' تاکہ وہ تاریخ کے تسلسل اور زمین کے رشتوں سے انکار کرسکیں تاکہ لوگ پیچھے نہ دیکھ سکیں اور آگے بھی انہیں کچھ نظر نہ آئے۔

جاگیردارانہ مرکزیت کو انہوں نے پاکستان کی تہذیب بنایا تھا۔ انگریزوں کے چھوڑے ہوئے



موزسکاف اوراول یول کوپن ہیگن کے دوالہڑ نوجوان یہ باتیں سن کر واپس وطن جانے کی بجائے پاکستان کی طرف چل دیئے۔ ان کے پاس پیسے تھوڑے تھے۔ انہیں راستے کا بھی پتہ نہ تھا مگر وہ کراچی آپہنچے۔ انہیں آج کے پاکستان کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ گزرے ہوئے ہزاروں سالوں کی تلاش میں آئے تھے اور جوانی میں یہی خوبی ہوتی ہے، آدمی سوچتا نہیں صرف جیتا ہے۔ وہ دونوں جمال کے پاس آن پہنچے کہ ہمیں راستہ بتادو۔

## آمدن دُرمحمد ک میندرو

انہی دنوں دُرمحمد میندرو کراچی آیا ہوا تھا۔

اس کی تعیناتی سکھر میں تھی۔ وہ محکمۂ اطلاعات سندھ کا ایک چھوٹا سا افسر تھا۔ نہایت دھیما، نہایت ذہین، مکار، شریر اور غصہ تو اس کو آتا ہی نہ تھا۔

سب کو پتہ تھا کہ دُرمحمد اول درجے کا بدمعاش ہے۔ کوئی کام نہیں کرتا۔ دفتر کے پیسے چوری کرتا ہے۔ لوگوں کو بلیک میل کرتا ہے۔ اس کی پشت پر کوئی وزیر بھی نہیں۔ مگر اس کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ وہ مسمسی صورت بنالیتا اور اسے گالیاں دے کر افسر خوش ہوجاتے۔ وہ افسروں کی احمقانہ تعریف کرتے ہوئے نہایت سنجیدہ شکل بنالیتا۔

محبوب حیدرآبادی لمبے عرصے کے لیے ہسپتال میں پڑے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں کام چلانے کے لیے محکمۂ تعلیم کے گیلانی صاحب کو ڈائریکٹر مقرر کردیا گیا تھا۔ وہ متعلقہ وزیر کے درباری تھے۔ سندھ اور سندھی کو جانتے تھے۔ فارسی بول سکتے تھے اور پنجابی ان کی مادری زبان تھی مگر تھے سخت خوشامدی۔ دُرمحمد سے ان کا پالا نہ پڑا تھا۔

انہوں نے آتے ہی دفتر کو الٹ پلٹ کردیا۔ کارکنوں کے کمرے بدلے۔ فرنیچر کی ترتیب تبدیل کی' جو لوگ ساتھ بیٹھتے تھے، ان کو الگ کیا۔ وہ سندھ کی روایات کو خوب سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ دفتروں میں اہلکاروں میں نفاق پیدا نہ کیا جائے تو وہ خطرناک ہوجاتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ماتحتوں میں اتفاق اور اتحاد سے بڑا کوئی خطرہ سربراہ محکمہ کے لیے نہیں ہوتا۔

گیلانی صاحب نے ایک ایک کرکے افسروں اور ماتحتوں کو کمرے میں بلا کر محکمے کے داخلی تضادات کی تحقیق کرلی تو سندھی افسروں کی طرف متوجہ ہوئے۔

اس چھان بین میں انہیں پتہ لگا کہ دُرمحمد میندرو کوئی کام نہیں کرتا۔ وہ چور اور بدمعاش ہے اور سکھر میں رنڈی بازی کے لیے بدنام ہے۔ حالانکہ وہ کسی وزیر کا آدمی بھی نہیں۔ دُرمحمد میندرو کو انہوں نے تار دے کر کراچی بلوایا تھا۔

درمحمد نے مسمسی صورت بنالی۔ ڈائریکٹر صاحب گرجے برسے مگر وہ سر جھکا کر خاموش بیٹھا رہا۔ اس

پر ڈائریکٹر صاحب خوش ہوئے۔ ''کچھ تو بولو۔'' انہوں نے مصنوعی غصے سے کہا۔
درمحمد غمزدہ ہو کر بولا ''صاحب کا حکم ہے کہ میں ایسا ہی برا آدمی ہوں تو اب میں کیسے صاحب کے سامنے بول سکتا ہوں۔''

ڈائریکٹر صاحب ڈھیلے ہو گئے۔ ''تمہیں اپنی صفائی میں جو کچھ کہنا ہے، بے کھٹکے کہو۔ ڈرو نہیں۔''

''پر ہم گریب آدمی ہے۔ گریب آدمی صاحب کے آگے کیا بولے گا۔''

''میں کسی پر ظلم نہیں کرتا میندرو۔ میں سندھ ایجوکیشن سروس کا آدمی ہوں۔ میں اخلاقی آدمی ہوں۔''

''سر میں بھی اخلاقی آدمی ہوں۔ اگرچہ سندھ ایجوکیشن سروس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ سر میں نماز پانچ وقت پڑھتا ہوں۔ اللہ سے اور آپ سے بہت ڈرتا ہوں۔ آنے سے پہلے میں نے دعا مانگی تھی کہ اللہ صاحب کو مجھ پر مہربان کرے۔ اللہ نے ہماری دعا سن لی۔''

''اللہ سب کی سنتا ہے درمحمد۔ تم اپنی بات کرو۔''

''صاحب جو حکم کرو جو بولو، ہم تو فقیر آدمی ہے۔''

''میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم کام کیوں نہیں کرتے؟'' ڈائریکٹر صاحب بولے۔

''کرتا ہوں صاحب میں تو بہت کام کرتا ہوں۔''

''کیا کام کرتے ہو؟''

## تعلقاتِ عامہ

''صاحب یہی تعلقاتِ عامہ کا کام۔ میرے تعلقاتِ عامہ بہت وسیع ہیں بلکہ میں تو خاص خاص آدمی سے بھی تعلقاتِ عامہ قائم کر لیتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ یہ خلافِ قانون ہے۔ تعلقاتِ عامہ کے دائرے سے خارج ہے۔ پر آدمی کیا کرے۔''

ڈائریکٹر صاحب بوکھلا گئے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اور ایک لمبے لیکچر کے ذریعے درمحمد کو تعلقاتِ عامہ کے معنی سمجھائے اور اس کے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کی کہ تعلقاتِ عامہ کے اصل معنی تعلقاتِ خاصہ ہی ہیں۔

درمحمد لیکچر کے بیچ بیچ سر ہلاتا رہا جیسے ایسی حکمت کی بات اس نے پہلے کبھی سنی نہ ہو۔ ڈائریکٹر صاحب تھک کر چپ ہو گئے تو درمحمد نے کہا ''صاحب نے جو کچھ فرمایا میں نے سنا اور سمجھ لیا۔ محبوب حیدرآبادی صاحب نے کبھی ہم کو کچھ بتایا ہی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کو پتہ ہی نہ تھا کہ تعلقاتِ عامہ کیا ہوتے ہیں۔''

''اسی لیے تو حکومت سندھ نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔'' ڈائریکٹر صاحب تن کر بولے ''ویسے میرا اصول نہیں کہ اپنے پیش رو کی برائی کروں' مگر سنا ہے کہ وہ اخبار والوں سے گپ شپ کے سوا کچھ نہیں کرتے تھے اور پیتے بھی بہت تھے۔''



''صاحب نے ٹھیک سنا۔'' درمحمد بولا۔ ''وہ خود اخبار والے تھے اور بہت پیتے تھے۔ اخبار والے اور کیا کرتے ہیں۔ اخبار والوں کو تعلقاتِ عامہ کا کیا پتہ۔''

''تعلقاتِ عامہ اصل میں سندھ ایجوکیشن سروس کا کام ہے۔'' ڈائریکٹر صاحب بولے ''ہم نے برسوں بچوں کو پڑھایا ہے اور انہیں عقل سکھائی ہے۔ یہ صرف ہم جانتے ہیں کہ تعلقاتِ عامہ کے کیا معنی ہیں اور رائے عامہ کو حکومت کے حق میں کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔''

''صاحب اس کے بارے میں بھی کچھ بتائیں۔'' درمحمد نے بڑی عاجزی سے کہا۔

''بھئی رائے عامہ کو تبدیل کرنے کے بے شمار طریقے ہیں مثلاً جو اخبار تنگ کرتا ہے، اس کے اشتہارات بند کر دو۔ وہ اس کے مالک کو ڈی سی' ایس پی کے ذریعے دباؤ اور اگر وہ نہ مانے تو اسے پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت بند کروا دو یا اس سے ضمانت مانگو یا اس کا کاغذ کا کوٹہ کم کر دو۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے طریقے ہیں درمحمد! رائے عامہ اصل میں کوئی چیز ہوتی ہی نہیں۔ حکومت پر لوگ عادتاً نکتہ چینی کرتے ہیں اور ہماری یہ عادت انگریز کے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ تم نے تاریخ تو پڑھی ہوگی۔''

''ہاں سر۔'' درمحمد بولا ''بہت پڑھی ہے۔ آٹھویں جماعت میں تاریخ میں فرسٹ آیا تھا۔''

''شاباش!'' ڈائریکٹر صاحب بولے ''قوموں کو ترقی کرنے کے لیے اپنی تاریخ پڑھنی چاہیے اور اگرچہ تم اب پڑھ لکھ کر فارغ ہو چکے ہو، کبھی کبھی تمہیں اپنی پرانی کتابوں پر نظر ڈال لینی چاہیے۔ پرانی کتابیں ہیں تمہارے پاس؟''

''جی ہاں۔ دسویں تک کے سارے کورس میں نے سنبھال کر رکھے ہیں سر۔''

''کبھی کبھی انہیں پڑھ بھی لیا کرو۔''

''بہتر سر۔ آج ہی سے پڑھنا شروع کر دوں گا۔''

درمحمد ڈائریکٹر صاحب کا دل جیت کر چلا گیا۔ اس نے ڈائریکٹر صاحب کو یقین دلا دیا تھا کہ محبوب حیدرآبادی کے مقابلے میں وہ زیادہ کامیاب ہوں گے اور ڈائریکٹر صاحب کا صرف ایک مقصد تھا اپنے وزیر کو خوش کرنا جس نے انہیں یہاں پوسٹنگ دلوائی تھی۔

مہینے بھر میں درمحمد کے خلاف ڈائریکٹر صاحب کے پاس سکھر سے بے شمار شکایتیں پہنچنے لگیں۔ اس پر سنگین الزامات تھے۔ ڈائریکٹر صاحب نے اسے فوراً کراچی پہنچنے کی ہدایت کی۔

اس وقت ڈنمارک کے اول بیول اور موزنسکاف اپنی ویگن میں کراچی پہنچ چکے تھے اور محکمۂ اطلاعات سے راہنمائی چاہتے تھے۔

## چارج شیٹ

درمحمد کمرے میں داخل ہوا تو ڈائریکٹر صاحب اس پر برس پڑے۔ ''تم لوگوں کو تنگ کرتے ہو۔

ہندوؤں سے پیسے لیتے ہو، جھوٹے ٹی اے بل بناتے ہو، دن میں شراب پیتے ہو، رات کو سرکاری جیپ پر بازار جاتے ہواور رنڈیوں سے مفت گانا سنتے ہو۔"

"صاحب یہ جھوٹ ہے۔" درمحمد نے کہا "ایک بات بھی سچ نہیں۔ میں لوگوں کو تنگ نہیں کرتا۔ ہندو دکانداروں سے پیسے نہیں لیتا بلکہ ادھار بھی کچھ نہیں خریدتا۔ جھوٹے ٹی اے بل نہیں بناتا بلکہ سچے بل بناتا ہوں۔ دن میں شراب بھی نہیں پیتا۔ رات کو بازار میں رنڈی کے مفت گانے نہیں سنتا اور سرکاری جیپ میں وہاں سے کبھی نہیں گزرتا۔ میں بہت کام کرتا ہوں سر۔ یہ سب جھوٹ ہے، کوئی ثبوت لاکر بھی آپ کو دیوے سر!"

ڈائریکٹر صاحب اس طویل کہانی سے گھبرا گئے۔ انہوں نے بے زار ہو کر کہا "اگر میں یہ ساری سرکاری چٹھیاں حکومت کو بھجوادوں تو تم تو ڈسمس ہو جاؤ گے مگر میں بھی بدنام ہو جاؤں گا کہ میں اپنے آدمیوں سے کام نہیں لے سکتا۔ مختصر بات یہ کہ تم کوئی کام کرتے نہیں ہو۔"

"جو بولو جو حکم سرکار۔ اب گریب کیا بولے۔"

ڈائریکٹر صاحب نے کہا "کوئی کام نہیں کرتے نا؟"

"ابھی ہم کیا بولے سر۔ اگر بولے کہ بہت کام کرتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ صاحب جھوٹ بولا۔ یہ گستاخی بھی ہے اور رولز کی خلاف ورزی بھی اور رولز کی ہم ہمیشہ تابعداری کرتا ہے۔ اگر بولے کہ صاحب ٹھیک بولتا ہے تو ہم قصوروار۔ اب گریب کدھر جائے۔ افسر کا بات مانو تو بھی مرو، نہ مانو تو بھی مرو۔"

ڈائریکٹر صاحب بے بس ہو کر بولے "میندرو تم بہت مکار ہو۔ بہت چالاک ہو۔ تم کوئی کام نہیں کرتے۔ تم سکھر کی طوائفوں کی فہرست بھی نہیں بنا سکتے۔ تعلقاتِ عامہ کا کام نہیں کر سکتے۔"

"صاحب طوائف بھی تعلقاتِ عامہ میں آتی ہے کیا؟" میندرو نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "میں سمجھتا ہوں آتی ہے۔ وہ تعلقاتِ عامہ نہ نبھائے تو کھائے گی کیا مگر طوائف تعلقاتِ عامہ میں بھی آتی ہے۔ بعض وڈیرے اور بڑے افسر انہیں ماہوار تنخواہ دیتے ہیں۔"

"بکواس مت کرو۔" ڈائریکٹر صاحب گرجے۔

"کیا صاحب طوائف کو تعلقاتِ عامہ نہیں سمجھتے؟"

"گیٹ آؤٹ یو ایڈیٹ۔" ڈائریکٹر صاحب کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"سر آپ نے بتایا تھا کہ تعلقاتِ عامہ اصل میں تعلقاتِ خاصہ ہوتے ہیں' یا نہیں بتایا تھا سر؟"

"نکل جاؤ میرے کمرے سے۔ میری آنکھوں سے دور ہو جاؤ اسی وقت۔"

ڈائریکٹر صاحب نے پیپر ویٹ اٹھا لیا۔

میندرو پرسکون رہا۔ وہ آہستہ سے کرسی سے اٹھا اور حیران ہو کر بولا۔ "صاحب کس بات پر اتنا ناراض ہے۔ ہم جاتا ہے۔ جاتا ہے بھائی۔ غصہ کاہے واسطے ہوتا ہے۔ ہم آپ کو اپنے کام کی رپورٹ بھیج



دے گا سکھر جا کر۔"

میندرو کے جانے کے بعد بھی ڈائریکٹر صاحب کے منہ سے جھاگ نکلتی رہی۔ انہوں نے سپرنٹنڈنٹ کو حکم دیا کہ میندرو کی سالانہ خفیہ رپورٹیں پیش کرو مگر ان سب پر تسلی بخش لکھا ہوا تھا۔ ڈائریکٹر صاحب کو اسے ڈسمس کرنے کے لیے مواد نہ ملا۔

## کام کی رپورٹ

ہفتے بھر کے بعد درمحمد میندرو کی طرف سے ایک کانفیڈینشل خط ڈائریکٹر صاحب کو ملا۔

خط درمحمد میندرو اسسٹنٹ انفارمیشن افسر سکھر کی طرف سے ڈائریکٹر محکمۂ تعلقاتِ عامہ حکومت سندھ نیپیئر بیرکس کراچی کے نام تھا اور اس میں سکھر کی طوائفوں کی مکمل فہرست تھی جس میں طوائف کا نام، اس کی والدہ کا نام باپ کا نام اگر کوئی ہے۔ پیشہ موروثی ہے یا شوقیہ، روزانہ آمدنی، ماہوار آمدنی، اخراجات، انکم ٹیکس ادا کرتی ہے یا نہیں۔ موجودہ پتہ خانہ وار درج تھے۔ ٹائپنگ ذرا گندی تھی اور صفحے کے دونوں طرف تھی۔

اس فہرست پر سکھر میونسپلٹی کے چیئرمین، ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر اور متعلقہ ایس ایچ او کے تصدیقی دستخط موجود تھے۔

اس فہرست کے ساتھ جو کورنگ لیٹر تھا اس میں بعد از ادائے آداب لکھا تھا۔ بحوالہ ہدایات جو جناب ڈائریکٹر محکمۂ تعلقاتِ عامہ حکومت سندھ نے اپنے اس ہمبل سرونٹ کو اپنے دفتر میں طلب کر کے زبانی دی تھیں۔ عرض ہے کہ فدوی نے حسب الحکم سکھر کی طوائفوں کی فہرست مع تفصیلاتِ ضروری بذریعہ رجسٹری روانہ کر دی ہے۔ رسید سے مطلع کیا جاوے۔

فدوی نے کوشش کی ہے کہ ایسی کوئی تفصیل رہ نہ جاوے جس میں حضور دلچسپی رکھتے ہوں۔ حضور نے عندیہ ظاہر کیا تھا کہ حضور کسی مناسب وقت پر سکھر کا دورہ کریں گے۔ کمترین کو پروگرام سے بروقت مطلع کر دیا جائے تاکہ سرکٹ ہاؤس میں حضور کے قیام و طعام و دیگر ضروریات کا جو حضور کے ذوق کے مطابق ہوں، بندوبست کر دیا جاوے۔ یہ بھی ہدایت فرمائی جاوے کہ حضور کو ڈبل بیڈ درکار ہو گا یا نہیں۔ میں ہوں حضور کا انتہائی ہمبل سرونٹ درمحمد میندرو اسسٹنٹ انفارمیشن افسر سکھر محکمۂ تعلقاتِ عامہ سندھ۔

خط پر سرکاری فائل کا نمبر لگا ہوا تھا اور ڈاک بک کا حوالہ بھی تھا۔ ڈائریکٹر صاحب تقریباً رو پڑے۔ دو تین دن گزرے تو درمحمد میندرو کراچی آ گیا۔ ڈائریکٹر صاحب نے اسے ملنے سے انکار کر دیا تو وہ جمال سے کہنے لگا "تم بولو، ہم نے کیا غلطی کی۔"

درمحمد میندرو جمال سے بہت مخلص تھا اور یہ عجیب بات تھی۔

---

## سیر و شکار

ڈائریکٹر صاحب نے جمال کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ ڈنمارک کے سیاحوں کو موہنجوداڑو کی سیر کرا دے

اور درمحمد کو ساتھ لے جائے تا کہ اس کی منحوس صورت کراچی میں نظر نہ آئے۔ ڈائریکٹر صاحب کے دل میں یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں درمحمد اس چٹھی کی نقل ہوم ڈیپارٹمنٹ کو نہ بھیج دے مگر درمحمد نے جمال سے کہا ''ہم غریب آدمی ہے، ہم شریف آدمی ہے۔ ہم شرارت نہیں کرتا۔ ڈائریکٹر صاحب نے سکھر کی طوائفوں کی فہرست مانگی تھی، وہ ہم نے دے دی۔ بات ختم۔''

اول پول اور موزسکاف اپنی گاڑی میں درمحمد اور جمال کی گاڑی کے پیچھے پیچھے چلے جو پیچھے سے کھلی تھی۔ ٹھٹھے میں عیسیٰ خان ترکھان کے مزار پر سب نے چائے پی۔ ماتلی کا وسیع قبرستان یہیں سے شروع ہوتا تھا۔ بکریاں اور گدھے سوکھی گھاس چرتے تھے۔ میل ہا میل تک ویرانہ تھا۔

## چوری ڈاکہ

چائے پیتے ہوئے جمال نے درمحمد سے پوچھا ''سنا ہے تم بڑے چور ہو۔''

''ہاں سائیں۔ تم نے ٹھیک سنا۔'' وہ بولا۔

''مگر تم چوری کس طرح کرتے ہو۔ چھوٹے ٹی اے بل میں کتنا ہو سکتا ہے آخر؟''

''ٹی اے بل میں، میں کچھ نہیں کرتا سائیں۔'' درمحمد بولا ''پھر میں سمجھتا ہوں اب ہماری اپنی حکومت ہے، اب دفتر میں چوری نہیں کرنی چاہیے۔''

''پھر کیا کرتے ہو؟'' جمال نے پوچھا۔

''لوگوں سے پیسہ چھینتا ہوں۔ جیسے ہماری حکومت چھینتی ہے۔ اس کا طریقہ ہم کو آتا ہے۔''

''مگر کیسے؟''

''بتائیں گے سائیں کسی وقت۔'' پھر وہ بیڑی سلگا کر جنگل میں چرتے ہوئے گدھوں کی طرف دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر میں گاڑی چلی تو درمحمد نے ڈرائیور سے کہا ''روکو ذرا، مجھے پیشاب آ رہا ہے۔ جمال سائیں آپ اتنے میں اخبار پر نظر ڈالیں۔''

یہ کہہ کر اس نے سندھی کا ایک اخبار جمال کے ہاتھ میں تھما دیا۔

جمال کو سندھی پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ سندھی پنجابی سے ملتی جلتی زبان ہے۔ گاڑی کے پچھلے حصے میں جو کھلا تھا، ذرا سی آہٹ ہوئی مگر جمال نے ادھر دھیان نہ دیا۔ درمحمد پیشاب کر کے واپس آ گیا تو ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔

حیدر آباد میں ریسٹ ہاؤس پارٹی کے لیے بک ہو چکا تھا۔ درمحمد نے کہا ''سائیں پہلے گھاس منڈی کی طرف چلیں گے۔''

''گھاس منڈی کیوں چلیں گے درمحمد؟'' جمال نے پوچھا۔



''گدھا بیچنا ہے سائیں۔'' درمحمد نے کہا ''دس منٹ لگیں گے۔''

''کون سا گدھا؟'' جمال نے حیران ہو کر پوچھا۔

''یہ جو پیچھے ہے گاڑی میں۔''

جمال نے پیچھے نظر ڈالی۔ ایک گدھا سر جھکائے کھڑا تھا۔ ''یہ گدھا کہاں سے آ گیا درمحمد؟'' جمال نے پوچھا۔

''ٹھٹھے سے سائیں۔ میں لایا تھا اٹھا کر۔'' اس نے جواب دیا۔

پیر بخش ڈرائیور ہنسنے لگا۔

''میں نے اور پیر بخش نے اٹھا کر گاڑی میں ڈال لیا تھا۔ ٹھٹھے میں جب ہم پیشاب کرنے کے لیے اترے تھے۔''

''تو تم گدھا چرانے کے لیے اترے تھے؟'' جمال نے غصے سے کہا۔

''سائیں وہاں بہت تھے۔ پھر آپ جاننا چاہتے تھے کہ میں چوری کس طرح کرتا ہوں۔ اب افسر کا حکم تو ماننا ہی پڑتا ہے نا سائیں۔''

''الو کے پٹھے۔ خبیث۔ یہ تم نے کیا کیا؟'' جمال گرجا۔

''کاہے واسطے ناراض ہوتے ہو سر۔'' درمحمد نے ایک بچے کی سی معصومیت سے کہا ''افسر کا حکم مانے تو بھی لپھڑا۔ نہ مانے تو بھی لپھڑا۔ غریب آدمی کدھر جائے؟''

''یہ میں نے کہا تھا تم گدھا چراؤ؟'' جمال نے ڈانٹ کر کہا۔

''سائیں آپ نے کہا تھا پیر بخش کے سامنے، اب مکرتے ہو؟''

''میں نے کب کہا تھا اور میں تمہاری رپورٹ کروں گا۔''

''سائیں اتنا غصہ نہ کرو۔ یہ انگریز کیا سمجھیں گے۔ ملک کا کچھ خیال کرو۔''

''تم اول درجے کے بدمعاش ہو۔''

''نہ سائیں اس طرح پاکستان کا نام خراب ہوگا۔ ان کو کچھ مت بتانا۔ وہ پوچھیں تو کہہ دینا درمحمد ٹھٹھے کا وڈیرا ہے اور وڈیرے تو چور ہوتے ہی ہیں۔''

''بکواس بند کرو۔'' جمال نے کہا۔

جمال کو پتہ تھا کہ درمحمد پر میری ڈانٹ پھٹکار کا کچھ اثر نہ ہوگا۔ وہ بے بس ہو کر سگریٹ پینے لگا۔ درمحمد نے گدھے کو کان سے پکڑا اور اسے گھسیٹتا ہوا ایک طرف کو چلا گیا۔

## خرچہ پانی

رات کے کھانے کے بعد جب جمال نے سونے کے لیے کپڑے بدل لیے تو درمحمد چھوٹے چھوٹے

قدموں سے چلتا ہوا اس کے پاس آ کر بولا ''یہ لو سائیں آپ کے پچیس روپے ہیں۔''

''یہ کیا ہے؟'' جمال نے پوچھا۔

''سائیں یہ آپ کا پیسہ ہے۔''

''کیا میرے پیسے کہیں گر گئے تھے؟''

''نہیں سائیں یہ آپ کا حصہ ہے۔''

''کیسا حصہ؟''

''سائیں گدھا ستر روپے کا بکا۔ اس میں سے پندرہ روپے میں نے لے لیے۔ دس روپے پیر بخش کے ہو گئے۔ پچیس؟ باقی بیس کا خرچہ پانی۔ آپ بڑا افسر ہے، آپ کا حصہ بھی بڑا ہونا چاہیے ہم گریبوں سے۔''

''درمحمد کیا بکواس کر رہے ہو؟'' جمال نے حیران ہو کر پوچھا۔

''سائیں افسر کا حصہ زیادہ ہوتا ہے۔ پر آپ کو افسری بالکل نہیں آتی۔ ایمان سے ہم سچ بتاتا ہے۔''

''بکواس مت کرو۔'' جمال نے کہا ''میں چوری کے مال میں سے حصہ نہیں لے سکتا۔''

جمال کے کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں۔ اس نے کڑک کر کہا ''میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔''

درمحمد کسی قدر حیران ہوا۔ پھر سانس کھینچ کر بولا۔ ''سائیں آپ کس بات پر اتنا غصہ کرتے ہیں۔ ابھی آپ نے جو شراب پی اور کباب کھائے، وہ کہاں سے آئے تھے؟''

''کہاں سے آئے تھے؟''

''سائیں وہ بیس روپیہ جو میں نے خرچہ پانی بتایا شراب کباب پر خرچ ہوا، ایمان سے میں نے کوئی بے ایمانی نہیں کی۔ آپ ناراض ہوتے ہیں تو میں اپنا پندرہ روپیہ بھی آپ کو دیتا ہوں۔ افسر کا کیا ہے۔ پہلے شراب پیوے، کباب کھاوے، پھر غصہ ہو جاوے!''

### موہنجوڈارو

موہنجوڈارو کے کھنڈرات کو دیکھ کر اول یول اور مونز سکاف کی باچھیں کھل گئیں۔ شہر ہزاروں سال کی مار کھانے کے باوجود ابھی تک اچھی حالت میں تھا۔ بنیادیں دیواریں اور کوچے سب سلامت۔ جب سیاحوں نے مختلف زاویوں سے اس کی فلم بنائی تو جمال کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ اسے خیال آیا کہ کاش پاکستان کے موجودہ شہروں میں گندے پانی کے نکاس اور صفائی ستھرائی کا انتظام پانچ سات ہزار قبل کے موہنجوڈارو جیسا ہوتا۔

موہنجوڈارو کے لوگ رہنے بسنے کے ڈھنگ سے واقف تھے۔ ان کی غلام بستیاں بھی آج کے لاہور کے گلی کوچوں سے کشادہ تھیں اور اب ہمارے حکمران اس سے کوئی رشتہ تسلیم کرنا نہیں چاہتے۔ تاریخ کے تسلسل کو قبول کر لینے سے ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں اور جھوٹ بولنا مشکل ہو جاتا ہے۔



موہنجوڈارو کے علاقے میں ابھی تک ویسی ہی بہلیاں چلتی تھیں جیسی آج سے ہزاروں سال پہلے چلتی تھیں۔ لباس بدل گئے تھے مگر صورتوں میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ سوئی، سلائی، چکی، چولہا، فصل، کھیتی سب کچھ وہی تھا۔ دریائے سندھ بھی اسی طرح بہتا تھا۔ اس کا پانی ویسا ہی گدلا، ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ وہی کشتیاں، وہی مچھلی پکڑنے کے کانٹے، وہی جال اور وہی ماہی گیر اور ملاح۔ لگتا تھا ہم پانچ ہزار سال پرانے اور ٹھہرے ہوئے معاشرے میں داخل ہو رہے ہیں۔

مونز سکاف اور اول یول اس حیران کن تہذیب کے جادو میں کھو گئے۔ وہ ایک ایک روڑا اٹھا کر دیکھتے تھے۔ واپسی پر انہوں نے موہنجوداڑو کی پانچ ہزار سال پرانی پکی ہوئی کچھ اینٹیں جمال کی اجازت سے گاڑی میں رکھ لیں۔ وہ انہیں کوپن ہیگن کے عجائب گھر کی نذر کرنا چاہتے تھے۔

### کیا آپ زندہ ہیں؟

محبوب صاحب کی ٹانگ کی ہڈی ٹھیک ہو چکی تھی مگر وہ ابھی لنگڑا کر چلتے تھے۔ جمال موہنجوداڑو سے واپس آیا تو وہ ڈیوٹی جوائن کر چکے تھے۔ حکومت میں ان کے کچھ مداح بھی تھے۔ انہوں نے سولہ ہزار روپے کی ادائیگی قسطوں میں منظور کر لی تھی اور پولیس کیس رفع دفع کروا دیا تھا۔ آتے ہی انہیں ایک مہینے کی تنخواہ مشروط طور پر مل گئی تھی۔ اس قلیل رقم میں انہوں نے اپنی فوری ضروریات پوری کرنی تھیں مگر بیماری کی چھٹیوں کے سلسلے میں دو چار ماہ کی مزید تنخواہ کے بھی حقدار تھے۔

جمال سے ان کے تعلقات دوستانہ بھی تھے۔ اسے ساتھ لے کر وہ کنٹرولر سندھ کے دفتر گئے۔ کاغذات مکمل تھے۔ حکومت کا حکم بھی منسلک تھا مگر کلرک نے کہا ''آپ کو بقایا جات ادا نہیں کیے جا سکتے۔ رولز کے مطابق گورنمنٹ کو اس بات کا ثبوت ملنا چاہیے کہ آپ زندہ ہیں۔''

''میں آپ کے سامنے زندہ کھڑا ہوں۔'' محبوب صاحب نے تحمل سے کہا ''اور ایک مہینے کی تنخواہ آپ مجھے دے چکے ہیں۔ کیا آپ کا مطلب ہے کہ میں چار ماہ پہلے زندہ نہیں تھا، اور اب زندہ ہوں؟''

''وہ تو ٹھیک ہے سر مگر گورنمنٹ کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ آپ زندہ ہیں۔ اگرچہ میں مانتا ہوں کہ آپ زندہ ہیں مگر میں گزیٹڈ افسر نہیں ہوں اور آپ کو جانتا بھی نہیں کہ آپ اصل میں کون ہیں۔ محبوب حیدرآبادی ہیں یا کوئی اور۔''

جمال رولز کی بوالعجبی اور کلرکوں کی مجہولیت سے واقف تھا۔ گزیٹڈ افسر تو وہ خود تھا مگر اس کے پاس محکمے کا فارم اور مہر نہیں تھی۔ اس نے کہا ''سر چلیے خوجہ صاحب سے سرٹیفکیٹ لے لیتے ہیں۔''

خوجہ صاحب محکمۂ تعلقاتِ عامہ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر اور محبوب صاحب کے ماتحت تھے۔ بڑے شریف، بڑے مسکین اور بڑے تابعدار۔ خوجہ صاحب محبوب صاحب کو دیکھتے ہی کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ادب سے ان کی بات سنی پھر کہا ''مگر میں گریب آدمی ہوں۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''آپ تصدیق کر دیجیے کہ محبوب حیدر آبادی زندہ سلامت ہیں ماشاءاللہ۔'' جمال نے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے سائیں پر میرے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟''

''عقل کی بات کرو خوجہ۔'' محبوب صاحب نے جھلا کر کہا۔

''آپ کو کس قسم کا ثبوت چاہیے خوجہ صاحب؟'' جمال نے پوچھا۔ ''آپ دیکھ رہے ہیں کہ محبوب صاحب زندہ ہیں اور آپ کے سامنے کھڑے ہیں اور کیا چاہیے آپ کو؟''

محبوب صاحب جل گئے۔

خوجہ صاحب بولے ''پن سائیں میری عرض تو سنو۔ میں اندھا نہیں اور محبوب صاحب میرے سامنے کھڑے ہیں، پن میرے ہاتھ میں ان کی زندگی کا کوئی ثبوت نہیں اور گورنمنٹ کاغذ مانگتی ہے۔ کل اگر ہوم ڈیپارٹمنٹ نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارے پاس محبوب صاحب کی زندگی کا کیا ثبوت ہے تو میں تو مارا ہی جاؤں گا۔ تم ایسا کرو جمال سائیں کہ تم محبوب صاحب کے ساتھ سول سرجن کے پاس جاؤ۔ وہ ٹیسٹ کر کے لکھ دے گا کہ محبوب صاحب زندہ ہیں تو میں تصدیق کر دوں گا۔ مجھ پر رحم کرو، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ مجھے گلت کام میں مت پھنساؤ۔''

## امریکی امداد

اچانک اخبارات میں خبر چھپی کہ پاکستان کی ترقی کے لیے امریکہ سے امداد آئی ہے۔ اس پر وزیروں اور سیاستدانوں کے تعریفی بیانات بھی جاری ہوئے مگر مدتوں کسی کو پتہ نہ چلا کہ امریکی امداد کا مطلب امریکی سودی قرضہ ہے جس سے ہم امریکہ کا وہ سارا فالتو مال ہی خرید سکیں گے جو جنگ کے بعد بچ رہا تھا، چاہے وہ دوسرے ملکوں کے مال سے دگنا چوگنا مہنگا ہو۔

ادویات کی خرید میں بعض امریکی فرموں نے اٹلی کے مقابلے میں بارہ سو گنا زیادہ رقم وصول کی مگر اس کا پتہ بعد میں چلا۔ ابھی تو پاکستان کو اتنا ہی معلوم تھا کہ کراچی میں گندم سے لدی ہوئی جو گاڑیاں چلیں ان کے کھینچنے والے اونٹوں کی گردنوں میں تھینک یو امریکہ کی تختیاں لٹکی ہوئی تھیں، حالانکہ یہ گندم ہم نے قیمتاً خریدی تھی۔ ہماری انتڑیاں پہلے ہی قل ھواللہ پڑھ رہی تھیں، اب ان میں سے تھینک یو امریکہ کا ورد بھی سنائی دینے لگا۔

امریکی امداد آئی، ٹیپ ریکارڈر آئے، ایئر کنڈیشنر آئے، گاڑیاں آئیں، چیونگ گم کے ڈبے آئے۔ ان کے ساتھ آزادی، بے رحمی، عیاشی، منافع خوری، فضول خرچی اور تشدد بھی۔

آزادی کا مطلب تھا لوٹ مار، شراب نوشی، کلب بازی، عریانی اور رشوت خوری۔ گھٹیا تفریحات اور یہ روایات افسروں کے گھروں سے شروع ہوئیں۔ وہ امریکی کلچر کا اشتہار بن گئے۔ پھر یہ انگریزی سکولوں کا مزاج بن گئی جن میں افسروں اور امیروں کے بچے بچیاں پڑھتی تھیں۔ پھر درمیانہ طبقے نے رنگ پکڑا۔



امریکی کلچر میں بعض خوبیاں بھی ہیں، مثلاً محنت، وقت کی پابندی، صاف گوئی، سوچ بچار، علم کی جستجو، مشاہدہ کائنات اور بہتر سے بہتر کی تلاش مگر ایسی کوئی خوبی امریکی امداد میں نہ آئی۔

امریکی امداد ہی کے سلسلے میں جمال کو پتہ چلا کہ دیہات کی ترقی کے لیے بھی امریکہ سے کوئی اچھوتا پروگرام آیا ہے۔ وہ ایک جوشیلا اور مہم جو شخص تھا۔ سندھ اور سندھیوں سے اسے گہری محبت تھی۔ وہ دیہات کی ترقی کے منصوبے کو جاننا چاہتا تھا۔ وہ حکومتِ پاکستان کی وزارتِ اقتصادیات کے ولیج ایڈ کے صیغے میں جا پہنچا۔ اس کے انچارج پاکستان کے بہت بڑے شاعر ابوالاثر تھے جو جنگ کے زمانے میں سانگ پبلسٹی کے مدارالمہام ہوتے تھے۔ وہ ایک بٹیر کی طرح پر پھیلا کر کرسی پر پڑے تھے۔

## ابوالاثر کے حضور میں

ان کے سامنے ایک بہت بڑی میز رکھی تھی جسے دفتری زبان میں بائیس گریڈ ٹیبل کہتے ہیں۔

کمرہ بہت بڑا تھا مگر ابوالاثر کے علاوہ اس میں اور کوئی نہ تھا۔ میز کے اردگرد کچھ کرسیاں، دیوار پر قائداعظم کی تصویر، جس کے نیچے ان کے خادمِ خاص اور قریبی دوست کی نشست تھی۔ یہ انہوں نے جمال کو جاتے ہی بتا دیا کہ قائداعظم اہم سیاسی امور میں ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

ابوالاثر نے جمال کو گھور کر دیکھا۔ پھر منہ پھیر کر آنکھوں کے کونوں میں سے اس پر ایک ٹیڑھی اور شکی نظر ڈالی۔

نام، موجودہ پتہ، تعلیم اور تجربے کے بارے میں جمال ان کو سب کچھ بتا چکا تو انہوں نے اس کے بچپن، جوانی، ذات، برادری اور مشاغل کی تفصیل چاہی۔ کشمیر کا ذکر سن کر ان کی آنکھیں چمک اٹھیں اور انہیں بہت سے اہم واقعات یاد آ گئے۔ شیخ عبداللہ سے باتیں، پنڈت نہرو سے گھاتیں، پاکستان کی تخلیق پر ان کا پنڈت جی سے اصرار۔ پنڈت جی کا انکار اور بالآخر اقرار جس میں قائداعظم کی فراست سے قطع نظر انہوں نے بھی کانگریس کے اکھنڈ بھارتی موقف کی دھجیاں اڑا دی تھیں مگر وہ یہ مانتے تھے کہ اگر قائداعظم نہ ہوتے تو اکیلا ابوالاثر پاکستان نہ بنا سکتا تھا۔

''مگر اس عظیم خدمت کے عوض ملی شاعر کو کیا ملا؟'' انہوں نے جمال کی کلائی پکڑ کر پوچھا۔

اور جب انہوں نے جمال کو بتایا کہ فسادات میں میرے انتالیس رشتہ دار تہِ تیغ ہوئے۔ میری دادی رانی رحیم بی بی کی حویلی لٹی۔ میرے رانگڑ راجپوت بزرگوں کے خاندانی آثار، نوادرات منقش، طنچے، کھانڈے اور برچھے جن پر سورماؤں کے نام کندہ تھے، لوٹ لیے گئے تو ابوالاثر کی آنکھیں موم بتی کی طرح بہنے لگیں اور اس پر جمال کی آنکھوں میں بھی آنسو تیرنے لگے۔

ابوالاثر سینے پر دوہتڑ مار کر بار بار پوچھتے تھے کہ پاکستان کے لیے جدوجہد تو ایک میں نے کی تھی۔ ان انتالیس زن و بچہ کا کیا قصور تھا جن کو ذبح کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جمال کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

خواجہ یٰسین کا نام سن کران کا موڈ یکدم بدل گیا جیسے مطلع صاف ہو گیا ہو۔ انہوں نے فوراً جمال کو بتادیا کہ میاں تم میرے بھتیجے ہو، کیونکہ جب میں شیخ عبداللہ کے بلاوے پر کشمیر جاتا تھا تو خواجہ یٰسین مجھے روزانہ ملتے تھے۔ افسوس اب تو انہیں ملے مدت ہو چلی، وہ کیسے ہیں؟ کیا کرتے ہیں، خوش تو ہیں؟

اس پر جمال کا دل اور پسیجا۔

تھوڑی دیر کے بعد ابوالاثر پھر رو دینے لگے۔ میرا کوئی فرزند نہ ہوا۔ میں نے تین شادیاں کیں مگر میری قسمت میں سات بیٹیاں لکھی جا چکی تھیں۔

اتنی ڈھیر ساری قربانیاں کے بعد انہیں لاہور کے اردو بازار میں ایک خالی دکان ہی الاٹ ہوئی تھی اور اگر چودھری محمد علی ان کے قدموں پر کلاہ رکھ کر یہ نہ کہتے کہ پاکستان کو بچالو تو میں ساری عمر دریا کے کنارے بیٹھ کر شعر کہتا، مگر پاکستان کی خدمت کے جذبے نے کمر کس لینے پر مجبور کر دیا۔

ان کی کہانی سن کر جمال پر رقت طاری ہو گئی۔ اس کو شرم آئی کہ قوم نے ایسے ایثار پیشہ اور مخلص شخص کو تنہا چھوڑ دیا ہے جس نے ''شاہنامۂ اسلام'' لکھا۔ قومی ترانہ تصنیف کیا اور جس کے بوڑھے جسم میں ارادے اس قدر جوان ہیں کہ وہ صدیوں کے سوئے ہوئے دیہات کی تقدیر بدلنا چاہتا ہے۔

اپنی ذاتی وفاداری کا عہد لے کر ابوالاثر نے جمال کو ولیج ایڈ کے بارے میں اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ امریکی منصوبہ انہوں نے دیکھا نہ تھا۔ انہیں اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ انہوں نے جنگ کے زمانے میں سانگ پبلٹی کے ذریعے فسطائیوں کو شکست دے دی تھی مگر وہ مانتے تھے کہ جنگ جیتنے کے اور اسباب بھی تھے اور پاکستان کی تعمیر بھی جنگ کا میدان تھا۔ جس میں ان کے انتالیس عزیز کٹ گئے۔

محکمہ ابھی بنانہ تھا مگر ابوالاثر کو جوہرِ قابل کی ضرورت تھی۔ جمال ان کی میزان میں پورا تل گیا۔ اس نے وعدہ کر لیا کہ میں حکومت سندھ کو چھوڑ کر ان کے محکمے سے منسلک ہو جاؤں گا۔ فی الحال اجازت۔

پاکستان میں محمد علی بوگرہ امریکہ سے وزیراعظم مقرر ہو کر آئے تھے۔ وہ کھلنڈرے آدمی تھے۔ کسی بات میں سنجیدہ نہ تھے اور امریکہ کو بہت پسند تھے۔ اس زمانے میں پاکستان کی اسمبلی میں کانگرس پارٹی حزب اختلاف تھی۔ اس کے لیڈر جناب چٹو پادھیا نے اسمبلی میں کہہ دیا کہ موہنجوڈارو مرے ہوؤں کا ڈیرہ نہیں بلکہ موہنجوڈیرو یعنی موہن کا ڈیرہ ہے۔

محمد علی بوگرہ نے کہا، قصہ زمین برسرِ زمین چلو، چل کر دیکھ لیتے ہیں۔

## کاروانِ شوق

چنانچہ ایک پوری ٹرین اسمبلی کے ممبروں کے لیے ریزرو ہوئی اور موہنجوڈارو کا سفر شروع ہوا۔ چونکہ اس سفر سے سندھ کے محکمۂ تعلقاتِ عامہ کا خاص تعلق تھا، اس لیے جمال کی ڈیوٹی اس گاڑی پر لگ گئی۔

پہلا پڑاؤ حیدرآباد تھا جہاں سندھ کے وزیراعلیٰ نے دوپہر کے کھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ریسٹ



ہاؤس کے باغیچے میں بیسیوں قالین بچھے تھے، گاؤ تکیے لگے تھے اور باوردی بیرے انواع واقسام کے کھانے لیے مہمانوں کی تواضع میں مصروف تھے۔ کھانے کے بعد گانے کا پروگرام تھا اور استاد بڑے غلام علی خاں کو گانا سنانے کے لیے بلایا گیا تھا۔

جمال استاد بڑے غلام علی خاں کو ریڈیو پاکستان کے زمانے سے پہچانتا تھا۔ اسے بڑی خوشی ہوئی کہ ہمارے سیاسی نمائندے بدذوق نہیں ہیں اور پکا راگ شوق سے سنتے ہیں۔ گانا شروع ہونے سے پہلے جمال کی آنکھیں استاد سے دوچار ہوئیں تو مسکرائے۔ محفل بھری تھی۔ استاد نے راگ سارنگ کا الاپ شروع کیا۔

تھوڑی دیر میں جمال نے دیکھا کہ اسمبلی کے ارکان اور ان میں بنگالی ارکان بھی شامل تھے، آہستہ آہستہ کھسکنے لگے۔ جگہیں خالی ہونے لگیں۔ جمال بہت پریشان ہوا کہ یہ لوگ کدھر گئے اور استاد بڑے غلام علی خاں کیا سوچیں گے۔ وہ اٹھ کر استاد کے سامنے آبیٹھا۔ گویئے عموماً سننے والوں میں سے ایک دو کو خاص طور پر مخاطب کر کے گاتے ہیں۔ جمال کو متوجہ دیکھ کر استاد نے اسی کو گانا سنانا شروع کر دیا۔ میدان تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ نوکر چاکر ڈرائیور اور بیرے جمال کے ساتھ شریکِ محفل رہ گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد استاد نے درت لے پکڑی اور دو تین چکروں کے بعد گانا ختم کر دیا۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ سننے والے کھسک گئے ہیں اور وہ بیکار کو منہ بگاڑ رہے ہیں۔

جمال کو وہ تحسین بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔

گھنٹے بھر کے بعد اسمبلی کے ارکان ایک ہجوم کی شکل میں ریسٹ ہاؤس کے بڑے ہال میں سے برآمد ہونے لگے۔

جمال کو معلوم ہوا کہ اندر حیدرآباد کی طوائفیں مہمانوں کی دلداری کی خاطر فلمی گیتوں پر مجرا کر رہی ہیں اور یہی پارلیمنٹ کے ممبروں کے ذوق کا معیار تھا۔

## پھر محبوب حیدرآبادی

محبوب حیدرآبادی نوکری پر بحال ہو گیا مگر لگتا تھا کہ وہ اپنی جان بچ جانے پر شرمندہ ہے۔ اس کا ضمیر اس کو جینے نہ دیتا تھا۔ بے شک اس نے کمیونسٹ پارٹی کی کارگزاریوں کی خبر انٹیلی جنس والوں کو پہنچا دی تھی مگر غالباً اسے اس کی اہمیت کا اندازہ نہ تھا اور وہ زندگی سے بیزار تھا۔ دوست یار اس کے چھٹ چکے تھے۔ اب وہ بے تحاشہ پینے لگا تھا۔ جمال نے دو چار روز اس کا ساتھ دیا مگر وہ عادت شرابی نہ تھا۔ دو تین پیگ اس کے لیے بہت تھے مگر محبوب صاحب کی پیاس کسی صورت بجھتی نہ تھی۔ اس نے دوبارہ دفتر سے ایڈوانس لینا شروع کر دیا۔ رپورٹر اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اب وہ اپنے ڈرائیور کو ساتھ بٹھا کر پیتے تھے حتیٰ کہ دونوں ہوٹل میں گر جاتے۔ دفتر میں انہوں نے دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔ اب انہیں بات بات پر غصہ آتا تھا اور وہ واہی تباہی

بکنے لگتے تھے۔

اکاؤنٹنٹ امروہی نے جمال سے کہا ''محبوب حیدرآبادی ایک مرتبہ اور خودکشی کرے گا۔ اگر تم بچا سکتے ہو تو بچالو۔''

مگر ابھی محبوب حیدرآبادی کے چھٹی منزل سے کود کر مرجانے میں دو تین سال باقی تھے۔ جمال کو صدمہ تو ہوا مگر وہ اس پر حیران ہوا کہ اگر محبوب حیدرآبادی کو خودکشی ہی کرنی تھی تو چھتوں سے کودنے کے علاوہ اور بھی طریقے تھے۔ وہ زہر کھا کر آرام سے مر سکتے تھے، سمندر میں ڈوب سکتے تھے۔ گاڑی کے نیچے آ کر کٹ سکتے تھے مگر دراصل محبوب حیدرآبادی کا ضمیر کچوکے دیتا تھا اور وہ مرنے کے علاوہ اپنے آپ کو اذیت دینا چاہتے تھے۔ ان کے ان دوستوں نے جن کو انہوں نے شرابیں پلا پلا کر موٹا کیا تھا، ان کا مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا۔ وہ تنہائی کا شکار ہوگئے تھے۔ ان کی پوری زندگی میں کسی عورت سے ان کی دلچسپی ثابت نہ ہوئی۔ ان کا اگر کوئی رشتہ دار تھا تو وہ ان سے ملتا نہ تھا۔ جب بالآخر کود کر مرنے میں کامیاب ہوگئے تو ان کی تقریباً تمام ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ ڈاکٹروں نے انہیں ہوش میں لانے اور پولیس نے بیان لینے کی پوری کوشش کی مگر وہ کراہتے ہوئے یکدم خاموش ہوگئے اور اب تو یہ بھی پتہ نہیں کہ ان کی قبر کہاں ہے؟

## تورے نین کجر بن کارے

خیر ابھی تو محبوب صاحب زندہ تھے اور لاٹھی لے کر چلتے تھے مگر دفتر میں دلچسپی لینی انہوں نے چھوڑ دی تھی۔ تنخواہ انہیں مل چکی تھی اور بظاہر زندگی ان کی رواں دواں تھی۔ لگتا تھا ان کے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہے۔ وہ اسمبلی کے ممبروں کے ساتھ موہنجوڈارو بھی نہیں گئے تھے۔ حالانکہ یہ ان کے فرائض میں شامل تھا۔

اس سفر سے جمال بھی آزردہ تھا۔ استاد بڑے غلام علی خاں کی جو توہین ہوئی تھی وہ اس سے ہضم نہ ہوتی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ پاکستان کے سیاسی راہنماؤں کا کلچر کیا ہے۔ فقط مجرا، شراب، رنڈی بازی اور لوٹ مار۔

استاد بڑے غلام علی خاں بالآخر پاکستان کو چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے جہاں ان کے فن کی قدر تھی۔ جمال نے بعد میں ہندوستانی ٹی وی پر دیکھا کہ بمبئی میں استاد گانے کے لیے سٹیج کی طرف بڑھ رہے ہیں اور ان کا تانپورہ بمبئی کے وزیراعلیٰ مرار جی ڈیسائی نے اٹھا رکھا ہے۔ یہی مرار جی ڈیسائی بعد میں ہندوستان کے وزیراعظم بھی ہوئے۔

## آہو جمال کی بیوی

آہو جمال سے ملنے کو آئی تو استاد کے ساتھ حیدرآباد میں جو بیتی تھی سن کر بہت رنجیدہ ہوئی۔ ان دنوں وہ ستار سیکھتی تھی۔ اس نے کہا ''میں نے استاد بڑے غلام علی خاں کا گانا سامنے بیٹھ کر کبھی نہیں سنا۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے؟''



''کوشش کرتا ہوں۔'' جمال نے سوچتے ہوئے کہا۔

ریڈیو پاکستان سے اس نے استاد کے گھر کا نمبر لیا۔ وہ باتھ آئی لینڈ کے کسی بنگلے کے سرونٹ کوارٹر میں رہتے تھے۔ ٹیلی فون پر مل گئے۔ جمال نے کہا ''استاد میں حاضری کی اجازت چاہتا ہوں۔''

''آپ کون ہیں برخوردار؟'' انہوں نے نہایت شفقت سے پوچھا ''اور مجھ سے کیا کام ہے؟''

''جی میرا نام جمال ہے۔ حیدرآباد میں راگ سارنگ آپ نے مجھ ہی کو مخاطب کر کے سنایا تھا۔ ویسے بھی اس سے پہلے ریڈیو پاکستان میں میں نے آپ کا انٹرویو لیا تھا۔ شاید آپ کو کچھ یاد آ جائے۔''

''ہاں ہاں مجھے یاد آ گیا۔ آپ کا ذوق بہت اچھا ہے۔ آپ نے صحیح مقامات پر مجھے داد دی تھی۔ آج کل اچھا سننے والا ملتا کہاں ہے۔ تو آپ اس اتوار کو آ جائیں۔''

''جی میں گانا سننا چاہتا ہوں۔ اگرچہ یہ میرا مقام نہیں۔''

''آپ بارہ بجے آ جائیں اور کھانا بھی میرے ساتھ کھائیں۔''

''جی بہت عنایت۔ میری بیوی بھی میرے ساتھ ہوگی۔ وہ تھوڑی بہت ستار بجالیتی ہے۔''

''بہت اچھی بات ہے۔ ہم ان سے ستار بھی سنیں گے۔''

آہو نے الٹے ہاتھ سے ایک ہلکا سا تھپڑ جمال کے منہ پر مارا اور بیزار ہو کر بولی ''کیا میں تمہاری بیوی ہوں؟''

''ہو تو سکتی تھیں نا۔'' جمال ڈھٹائی سے بولا۔

''مگر ہوں تو نہیں۔''

''اس میں میرا کیا قصور؟''

''قصور تو تمہارا ہی ہے۔'' وہ ہنس کر بولی۔ ''اور یہ ستار کی بات تم نے کیوں کہہ دی۔ ابھی تو مجھے چابیوں پر ہاتھ رکھنا بھی نہیں آیا اور تم چلے مجھے لے کر استاد بڑے غلام علی خاں کے سامنے۔ میں تو بالکل نہیں جاؤں گی تمہارے ساتھ۔ تم اکیلے ہی گانا سن آنا۔''

''کیا غضب کرتی ہو۔ تمہارے لیے تو میں نے یہ سب بندوبست کیا اور اب تم انکار کرتی ہو۔''

''میرے لیے نہیں، اپنی بیوی کے لیے کیا۔'' اس نے شرارت سے کہا۔ ''اسی کو ساتھ لے جانا۔''

''تھوڑی دیر کے لیے تم میری بیوی بن جانا۔ آخر میں اتنا برا بھی نہیں۔''

''تو چلو بن گئی ورنہ استاد بڑے غلام علی خاں کا گانا میں سن نہیں سکتی۔ اتوار کو صبح دس بجے میں یہاں آ جاؤں گی اور یہیں سے ہم دونوں باتھ آئی لینڈ چلے جائیں گے۔ ٹھیک ہے؟''

''ٹھیک۔''

اتوار کو دونوں سائیکل رکشا پر بیٹھ کر باتھ آئی لینڈ جا پہنچے۔ دونوں ٹھس کر بیٹھے تھے۔

آہو کی ٹانگیں جمال کی ٹانگوں سے گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

جمال نے چپکے سے اس کی بغل میں ہاتھ دے ڈالا۔

''یہ کیا حرکت ہے؟'' آہو بولی۔

''کچھ نہیں اس طرح رکشے کا توازن ٹھیک رہتا ہے اور میرا بھی۔'' جمال نے ہنس کر جواب دیا۔

''چلو ہٹاؤ اپنا ہاتھ فوراً ہٹاؤ۔ نہیں تو میں یہیں اتر جاؤں گی۔''

جمال نے ہاتھ ہٹالیا۔

استاد اپنے سالے کے گھر رہتے تھے۔ دونوں نے بڑے تپاک سے جمال اور آہو کا استقبال کیا۔
استاد بولے ''بی بی آپ کا ستار کہاں ہے۔ ہم کچھ سننا چاہتے تھے۔''

آہو شرما کر بولی ''جی مجھ میں یہ جرأت نہیں کہ آپ کے سامنے بجا سکوں۔ اس لیے میں لے کر ہی نہیں آئی۔''

استاد نے کہا ''بچے تو بچے ہوتے ہیں۔ ہم آپ کو بچہ سمجھ کر سنتے۔ خیر اب آپ نہیں لائیں تو نہ سہی۔ میرے خیال میں پہلے ہم لوگ کھانا کھالیں۔''

دسترخوان بچھ گیا اور استاد کے سالے نے پلاؤ کی قاب اور شوربے کے پیالے چُن دیئے۔ بیچ بیچ میں استاد جمال اور آہو کے بارے میں پوچھتے رہے۔ آپ کے بچے کتنے ہیں، شادی کب ہوئی۔ کرتے کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔

جمال نے کہا ''جی بچہ تو ابھی کوئی نہیں۔ شادی ہماری اسی سال ہوئی ہے۔ نوکری کرتے ہیں دونوں۔''

آہو کا رنگ سرخ ہو گیا مگر وہ کچھ نہ بولی۔

کھانے کے بعد استاد نے دھیمی لے میں راگ شروع کیا۔ تورے نین کجر بن کارے۔

ان کی تانیں بہت میٹھی مگر بہت مشکل تھیں۔ لے قابو میں نہیں آتی تھی۔ جمال سوچ سوچ کے داد دیتا رہا۔ خوف کے مارے اسے گانے کا کوئی مزہ نہ آیا۔ کہیں استاد کو شک پڑ گیا کہ میں لے میں کوڑھ ہوں تو کیا ہوگا۔ اس نے سوچا۔

آہو نیک بیبیوں کی طرح ساڑھی کا پلو سر پر ڈالے نظر نیچی کیے بیٹھی رہی۔ استاد کا دھیان اس کی طرف نہ تھا۔ ویسے بھی عورتیں حیا کا عذر رکھ کے بہت سی مصیبتوں سے بچ جاتی ہیں۔

ایک گھنٹے کے بعد دونوں نے اجازت لی۔ ''پھر بھی کبھی آجانا۔'' استاد نے محبت سے کہا۔

''آج کل بچے گانا سنتے کب ہیں۔ ضرور آپ لوگ کسی اچھے خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ خدا جب تم لوگوں کو اولاد کی نعمت عطا کرے تو مجھے گھر بلانا۔ میں آکر گانا سناؤں گا۔''



رکشے میں بیٹھ کر جمال نے آہو سے پوچھا ''خدا ہم لوگوں کو اولاد کی نعمت کب عطا کرے گا؟''

''بکواس مت کرو۔'' وہ بولی۔

''گانا کیسا لگا؟''

''ارے یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ یہ تو میری زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ میں اس کی وجہ سے تمہیں کبھی بھول نہ سکوں گی۔''

''ورنہ بھول جاؤ گی؟''

''تم میں یاد رکھنے والی اور کون سی بات ہے۔ ذرا ٹانگیں سکیڑ لو اپنی۔''

جمال نے ٹانگیں سکیڑ لیں اور گنگنانے لگا۔ تورے نین کجر بن کارے۔

آہو بولی ''کیا بیل کی طرح ڈکرا رہے ہو۔ جب تمہارے گلے میں رس نہیں تو کیوں تکلیف کرتے ہو؟''

جمال بولا ''ذرا آنکھیں دکھاؤ اپنی۔''

''کیوں؟'' آہو بولی ''کیا ہے میری آنکھوں میں؟''

جمال اس کی آنکھوں کو دیکھ کر بولا۔ ''تورے نین کجر بن کارے گوری!''

## رقیبِ روسیا

دو چار دن گزر گئے مگر آہو نہ آئی۔ دو چار دن کے بعد جب وہ آئی تو بولی۔

''جلدی چلو۔ وہ باہر کھڑا ہے۔''

''وہ کون؟'' جمال نے پوچھا۔

''تمہارا رقیب روسیاہ وہی لمبی ناک والا جس سے میں شادی کرنے والی ہوں۔ وہ تمہیں دیکھنا چاہتا ہے۔''

''مجھے؟ کیوں بھلا؟'' جمال نے گھبرا کر پوچھا۔

''اب اٹھو بھی۔ میں نے اس کے سامنے تمہاری بہت تعریف کر دی تھی۔ کہا تھا تم نہ صرف دیکھنے میں بانکے چھبیلے ہو بلکہ ذہین اور باذوق بھی ہو۔ چلو وہ باہر کار میں بیٹھا جل رہا ہے۔''

جمال نے کہا ''آہو یہ کیا غضب کیا تم نے۔ میری تعریف کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''میں اسے جلانا چاہتی تھی اس لیے۔'' آہو بولی۔ ''عقل کی بات کرنا اس سے، وہ پڑھا لکھا بہت ہے۔''

''اب تم مجھے ڈرا رہی ہو۔''

''ارے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ تم بہت شریف آدمی ہو اور تمہاری بیوی بہت خوبصورت ہے۔'' وہ اسے گھسیٹتے ہوئے بولی۔

''یہ تو تم نے اچھا کیا۔''

''مگر وہ جلے گا ضرور۔تم میرے ہم عمر ہو اس لیے۔وہ مجھ سے بیس سال بڑا ہے۔''

''تو اب تک اس نے شادی نہیں کی تھی؟''

''کی تھی یار۔میں اس کی دوسری بیوی بنوں گی۔''

''مگر تم دوسری بیوی کیوں بنو گی؟''

''اس لیے کہ یہی ہو کر رہے گا۔وہ نہایت نفیس آدمی ہے اور مجھ سے بے حد محبت کرتا ہے۔''

جمال اور آہو برآمدے میں سے ہو کر نکلے تو ایک نئی کالی کار میں وہ لمبی ناک والا بامذاق آدمی بیٹھا تھا۔دونوں کو دیکھتے ہی وہ گاڑی سے اتر آیا اور ہنس کر بولا''آپ کو دیکھنے کی بڑی آرزو تھی۔آہو کسی ایسے ویسے سے متاثر ہونے والی لڑکی نہیں۔رحمان میرا نام ہے اور میں اسلامیہ کالج کا پرنسپل ہوں۔''

''جی بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔یقیناً آپ ایسے ویسے نہیں۔آہو آپ سے بہت متاثر ہے۔آپ کی باتیں کرنے کے لیے میرے پاس آ جاتی ہے ہر روز۔آپ سے بہت محبت کرتی ہے۔''

''میں تو سب سے محبت کرتی ہوں۔''آہو بولی۔''اور ہر ایک سے متاثر بھی ہو جاتی ہوں۔''

''یہی ادائیں تو اس کی ہمیں مارے ڈالتی ہیں۔''رحمان ہنس کر بولا''اور جھوٹ کس اعتماد سے بولتی ہے۔چلو ذرا کافی پئیں مل کر۔میں جمال صاحب کو زیادہ جاننا چاہتا ہوں۔کوئی بات تو ہو گی ان میں جو آہو ان کے پاس بیٹھی رہتی ہے۔''

''میں نہیں بیٹھی رہتی کسی کے پاس!''آہو بولی۔''لوگ بٹھا لیتے ہیں خود۔''

اتنے میں کار چل دی۔جمال کو رحمان نے اپنے ساتھ آگے بٹھا لیا۔

''تو کل آپ بڑے غلام علی خاں کا گانا سننے گئے تھے!''رحمان نے پوچھا۔

''تو یہ بھی آہو نے آپ کو بتا دیا۔''جمال کھسیانا ہو کر بولا۔

''آہو مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتی۔''

''کوئی بات نہیں چھپاتی؟''جمال نے فکرمند ہو کر کہا''میں تو اس سے بڑی خطرناک باتیں کر لیتا ہوں۔''

''وہ بھی مجھے بتا دیتی ہے لفظ بلفظ!''

''جمال مجھ سے کوئی خطرناک بات نہیں کرتا۔''آہو بولی''کرتا ہے مگر میں انہیں خطرناک نہیں سمجھتی۔جمال اصل میں تھوڑا سا ذہین بھی ہے اس لیے۔''

جمال کی سمجھ میں نہ آیا کہ میں آہو سے رحمان کی موجودگی میں کیا بات کروں۔وہ کھسیانی ہنسی ہنستا رہا۔اتنے میں میٹروپول ہوٹل آ گیا۔

عبدالرحمان نے کافی کا آرڈر دیا اور جمال سے پوچھا''خاں صاحب نے آپ کو کیا سنایا تھا؟''

''[illegible]'' جمال بولا۔



آہو نے کہا''بول بڑے پیارے تھے۔تورے نین کجر بن کارے!نین کاجل بنا کالے ہو سکتے ہیں نا؟''

رحمان بولا''میں نے تو کبھی دیکھے نہیں۔تمہارا کیا خیال ہے جمال؟''

''میں نے بھی کبھی نہیں دیکھے۔''جمال بولا۔

''جھوٹ بالکل جھوٹ۔''آہو چمکی۔''جمال مجھ سے بات کرتا ہے تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کرتا ہے۔''

''ہم نے بھی کوشش تو بہت کی مگر ہمیشہ دیکھا کہ ساری مستی شراب کی سی ہے۔اس لیے کچھ دیکھ نہ سکے۔''رحمان نے کہا۔

''تو میرؔ آپ کو بہت پسند ہے۔''جمال نے داد دی۔

''مجھے بھی۔''آہو بولی۔

''مجھے غالبؔ بھی بہت پسند ہے۔''رحمان نے کہا''اور فیضؔ بھی اور اقبالؔ بھی مگر وہ ذرا گہرا آدمی ہے۔آسانی سے پلے نہیں پڑتا۔''

''گہرا تو شیکسپیئر بھی بہت ہے۔''آہو بولی۔''مگر اس کے تو تم حافظ ہو۔''

''وہ عقل کی بات بھی کر جاتا ہے جو ہر ایک کی سمجھ میں آ جاتی ہے۔''رحمان نے کہا''جیسے سعدیؔ''

''جیسے وارث شاہ۔''جمال نے ٹانکا لگایا''وارث شاہ کی نفسیات چھوٹی مالکی کے کسان کی نفسیات تھی۔محبت میں وہ جسم کو بہت اہمیت دیتا تھا۔مسلک کے اعتبار سے وہ بام واری تھا۔''

''بام واری کیا؟''آہو نے پوچھا۔

''بام واری ایک قدیم ہندو فلسفہ روحانیت ہے۔بام واری گورو اپنے مریدوں سے کہتے ہیں جاؤ دنیا دیکھو،شراب پیو،جوا کھیلو،رنڈی بازی کرو۔جب جی بھر جائے تو ہمارے پاس آ جانا،پھر ہم تمہیں معرفت کا راستہ بتا دیں گے۔اسی لیے وارث شاہ نے رانجھے کو گورو بالناتھ کے ٹلہ جوگیاں بھیجا۔کسی مسلمان فقیر کے پاس نہیں بھیجا کیونکہ اسے ایک بیاہتا عورت سے عشق تھا اور یہ بات شریعت کے خلاف تھی۔''

''وارث شاہ بے شک بڑا آدمی تھا مگر شاعری کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ نہیں ہو سکتا۔''

''یہ تو درست ہے۔''آہو بولی۔''میں نے عبداللطیف بھٹائی کے ترجمے پڑھے مگر ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ اتنا بڑا پیغمبر تھا جتنا بڑا اسے سندھی سمجھتے ہیں۔''

''وہ واقعی بہت بڑا تھا مگر پیغمبر وغیرہ نہیں تھا۔عام لوگوں کے دکھوں کی عام لوگوں کی زبان میں بات کرتا تھا۔محبت کا درس دیتا تھا۔''

''محبت بڑی فضول چیز ہے۔''آہو بولی۔''آدمی کہیں کا نہیں رہتا۔دوسرے کا غلام ہو جاتا ہے اور دوسرے کو پتہ بھی نہیں چلتا۔''

''جیسے میں......'' رحمان نے سینے پر ہاتھ باندھ کر کہا۔ ''غلام بے دام!''

''تم نہیں جیسے میں۔'' آ ہو بولی۔ ''مجھے تم نے لوٹ کے ویران کر دیا۔ حالانکہ تم میں کوئی خاص بات نہیں ہے نہ شکل نہ عقل۔''

''دل تو ہے۔'' رحمان نے عاجزی سے کہا ''مگر مجھے ڈر لگتا ہے کہ تم ایک دن مجھ سے اکتا جاؤ گی آ ہو۔ مجھے چھوڑ جاؤ گی۔''

''کبھی نہیں۔ میں تمہاری ہوگئی تو ہوگئی البتہ تمہارے بارے میں کہا نہیں جا سکتا۔ تم کھلاڑی ہو۔ لڑکیوں کو پھانسنے کا ڈھب جانتے ہو مگر خیر میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔''

جمال نے کہا ''مگر سیانے کہتے ہیں کہ عورت ہمیشہ اعلیٰ آدمی کو چھوڑ کر گھٹیا آدمی کی طرف جاتی ہے۔''

''کون سے سیانے؟'' رحمان نے پوچھا۔

''مثلاً سامرسٹ ماہم۔ اس کا فلسفہ یہی ہے اور اس نے ہمارے ادیبوں کو بھی متاثر کیا ہے ورنہ ہمارے ادیبوں کا اپنا تو کوئی سوشل تجربہ تھا ہی نہیں۔ بیچاروں نے عورت کبھی دیکھی نہ تھی چنانچہ شاعر بچیوں ہی سے دل بہلاتا ہے۔ ابھی کمسن ہو رہنے دو، کہیں کھو دو گی دل میرا۔ تمہارے ہی لیے رکھا ہے۔ لے لینا جواں ہو کر۔ سامرسٹ ماہم سے پہلے یہاں فکشن نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ لوگ مغ بچوں سے دل بہلاتے تھے۔ منشی پریم چند نے جدید فکشن کی بنیاد رکھی مگر وہ مروجہ اخلاقیات کی حدود سے باہر کبھی نہ نکلے۔ یہ سانچہ منٹو نے توڑا۔ وہ سامرسٹ ماہم کی جائز اولاد ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ وہ انگلستان، فرانس اور روس کے ادب سے زیادہ متاثر تھے۔ سامرسٹ ماہم نے ہمیں عورتوں کی فطرت سے روشناس کرایا۔''

''مگر ہماری عورتیں انگلستان کی عورتوں سے بہت مختلف ہوتی ہیں۔ ہماری روایات، ہماری لوک کہانیاں، ہمارا کلچر ہمارا اپنا ہے۔'' آ ہو بولی۔

''تو تم مجھے چھوڑ کر کبھی کسی گھٹیا آدمی کی طرف نہیں جاؤ گی؟'' رحمان نے کہا۔

''اگر تم سے زیادہ گھٹیا کوئی آدمی ملا تو دیکھوں گی۔'' آ ہو نے جواب دیا۔

اس پر ایک زور کا قہقہہ پڑا۔

پھر آ ہو بولی ''جمال تم تو منٹو کو ذاتی طور پر جانتے ہو۔ کیسا آدمی ہے کنجری باز۔ لفنگا شرابی۔''

''کنجری باز۔ لفنگا تو وہ بالکل نہیں۔ شرابی ضرور ہے مگر وہ دنیا کا سب سے سچا اور سب سے دلیر آدمی ہے اور اس کے فن کے تو کیا ہی کہنے۔ وہ ایک لفظ بھی فالتو نہیں لکھتا۔ اس کی صاف گوئی سے بمبئی کے سارے ادیب ڈرتے تھے۔ کوئی اس سے بحث نہ کرتا تھا۔ کرشن چندر کی تو اس نے میری موجودگی میں کئی دفعہ بھد اڑائی۔ اس زمانے میں کرشن چندر کو اردو کا سب سے بڑا ادیب مانا جاتا تھا مگر اب تو افق پر منٹو ہی منٹو ہے۔''



آ ہو بولی ''ارے یہ تو رہتا ہی اس کے گھر میں تھا اور جانتے ہو اس کا روم میٹ کون تھا؟ کسی کی سمجھ میں نہ آنے والا شاعر میرا جی...... اور ہر ایک کی سمجھ میں آ جانے والا ممتاز مفتی...... مگر وہ سامرسٹ ماہم کا مرید ہے۔ وہ فرائیڈ کا نواسہ ہے۔ تو جمال کی ایسے لوگوں کے ساتھ گزری۔ رحمان...... ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک حد تک بدمعاش تو ہوگا۔''

''نہیں میں بالکل بدمعاش نہیں۔'' جمال بولا۔

''تو یہ لوگ تمہیں اللہ واسطے پاس بٹھاتے تھے؟'' آ ہو نے چمک کر پوچھا۔

''تم بھی تو مجھے اللہ واسطے ہی پاس بٹھاتی ہو۔'' جمال نے جواب دیا۔

''ہرگز نہیں۔'' وہ بولی۔ ''میں ایسی اللہ والی نہیں۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ تم میں بارود ہے۔''

عبدالرحمان بولا ''تو آپ اور کس کس کو جانتے ہیں؟''

''اب کس کس کا نام لوں؟ میں بہت لوگوں کو جانتا ہوں۔''

''کسی چھوٹی لڑکی کو بھی جانتے تھے؟ ضرور جانتے ہوں گے۔''

''بہت زیادہ تو نہیں مگر ایک چھوٹی لڑکی میری دوست تھی۔ کامنی ہندی میں افسانے لکھتی تھی۔''

''اس سے بہت باتیں ہوئی ہوں گی۔'' آ ہو بولی۔

''بالکل نہیں۔ ہمارا دونوں کا حیا کا زمانہ تھا۔'' جمال نے کہا ''ہم گھنٹوں چپ چاپ ریت پر بیٹھ کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے اور اس طرح بھی بہت سی باتیں ہو جاتی تھیں۔''

''بے شک۔ جب میرا اور آ ہو کا حیا کا زمانہ تھا تو اسی طرح ہوتا تھا۔'' رحمان نے ہنس کر کہا۔

''میرا تو اب بھی حیا کا زمانہ ہے۔'' آ ہو بولی۔

''واقعی۔'' جمال نے کہا ''میرے پاس آتی ہے تو اشاروں میں بات کرتی ہے۔''

رحمان بولا ''مجھ سے تو اشاروں میں بھی بات نہیں کرتی مگر میں اس کا ہوں کون!''

''ارے واہ۔'' آ ہو بولی ''تم ہی تو میرے سب کچھ ہو۔ کیا مجھ سے اپنی تعریف سننا چاہتے ہو؟ دیکھو جمال یہ ہیں اس شخص کی چالاکیاں...... اس سے زیادہ میل ملاقات خطرناک ہے۔ جادوگر ہے، من باتوں میں موہ لیتا ہے۔''

اس پر رحمان بہت خوش ہوا۔ پھر اس نے گھڑی دیکھی اور کہا ''لو بھئی یہ خوبصورت محفل بھی ختم ہوئی۔ کالج کا ٹائم ہو گیا مگر یہ ہماری پہلی ملاقات ہے جمال، آخری نہیں۔ انشاء اللہ جلد ملیں گے اور پھر ملتے ہی رہیں گے۔''

## باب 22

اگلے روز آہو جمال کے پاس آئی تو بولی ''یار یہ تمہارا وارث شاہ عجیب شخص تھا۔ میں رات بھر اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔''

''کیا سوچتی رہیں؟'' جمال نے پوچھا۔

''یہی کہ روح تک پہنچنے کے لیے جسم کی سیڑھی چڑھنی پڑتی ہے۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے جسم کو چھوڑ کر اسے ترک کر کے اسے بھوکا مار کر روحانیت تک پہنچے بھی تو کیا پہنچے۔ کیا جسم کی لذت خود روحانیت کی لذت سے کم ہے، اگرچہ مجھے اس کا تجربہ نہیں۔''

''مگر تمہیں روحانیت کا بھی تو کوئی تجربہ نہیں۔'' جمال نے جواب دیا۔

''تمہیں بھی تو نہیں۔''

''مگر مجھے جسم کی لذت کا تو علم ہے۔ میرے لیے یہی کیف روح کا کیف ہے۔ اس کے بعد کیا لینا دینا۔''

''مگر ایک سوال ہے جمال۔ اگر آدمی سیڑھی کے کیف ہی میں کھو جائے تمہاری طرح؟ اگر گورو بالناتھ اور وارث شاہ کی بات مان لی جائے تو رانجھے کو ہیر تو مل گئی مگر نروان نصیب نہ ہوا۔ رہا وہ جسم ہی کے چکر میں۔''

''یہ بات ایک مسلمان صوفی نے گورو بالناتھ سے بھی پوچھی تھی۔'' جمال نے کہا۔

''پھر گورو صاحب نے کیا کہا؟''

''گورو صاحب نے کہا، اگر روحانیت کا متلاشی جسم کی سیڑھی ہی سے اوپر نہ اٹھ سکے۔ زندگی کے کھیل کھیلے، شراب پیے، جوا کھیلے، رنڈی بازی کرے، شریف عورتوں سے عشق بازی میں دل لگائے اور واپس نہ آئے تو پھر وہ ہمارا آدمی نہ تھا۔ اسے روحانیت کی لگن نہ تھی پھر وہ وہیں رہے جہاں اسے خوشی ملتی ہے۔ ہم کیوں اس پر اپنا وقت ضائع کریں۔ روحانیت کا مقصد بھی تو دل کا نشاط ہے۔ اللہ ہے یا نہیں، انسان اسے پا سکتا ہے یا نہیں۔ یہ باتیں دامِ خیال میں آتی ہیں۔ آہو تم نے تو ابھی جسم کی سیڑھی پر پیر بھی



نہیں رکھا۔ ان جنجالوں میں کیوں پڑتی ہو۔ رحمان تمہارے لائق ہے۔ وہ تمہیں وہ خوشی دے گا جو بالناتھ نے رانجھے کو دلوائی تھی۔''

''ہاں یار تم بھی رحمان کو بہت پسند آئے۔ حالانکہ تم بے تکی بکواس کرتے ہو۔ کہتا تھا جمال خوب آدمی ہے۔ بڑے اعتماد سے بات کرتا ہے۔''

''بس یہی کہا؟''

''اور بھی بہت کچھ کہا جس سے میں سمجھی کہ تم سے کچھ جل گیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ میں جو تمہیں اتنا پسند کرتی ہوں، یہ خطرناک بات ہے۔ حالانکہ میں تمہیں اتنا پسند نہیں کرتی۔''

''کیوں خطرناک بات ہے؟''

''بھئی وہ عمر میں مجھ سے دگنا ہے۔ تمہاری طرح پاٹھا تو نہیں اور پھر تم جس بے شرمی سے بات کرتے ہو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم بہت نڈر آدمی ہو۔ تو نڈر آدمی سے اس کا ڈرنا قدرتی بات ہے۔ وہ یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ شاید تم مجھے لے اڑو کسی وقت۔'' یہ کہہ کر آہو شرارت سے ہنس پڑی۔ ''مگر بے وقوف یہ نہیں سوچتا کہ تم مجھے کیسے لے اڑو گے۔ جب میں اس کی ہو چکی مگر جلنے جلانے میں بھی ایک مزہ ہوتا ہے!''

جمال خوشی سے پھول کر کپا ہو گیا۔ ایسی بات اس سے کسی لڑکی نے کہی نہ تھی مگر منہ بنا کر بولا۔ ''یہ نہ تھی ہماری قسمت!''

آہو بولی ''اب بکواس بند کرو۔ گرمیاں جا رہی ہیں اور اگلے سنڈے کو ہم نے پروگرام بنایا ہے کہ ساری فیملی مل کر سیر کو جائیں۔ فیملی کے ساتھ فرینڈز بھی ہوں گے مثلاً تم اور تمہاری بیوی بچے۔ یار تم میرے ابا کو بھی بہت پسند آئے۔ ایسی کیا بات ہے تم میں کہ جو مجھ سے محبت کرتا ہے وہ تمہیں بھی پسند کر لیتا ہے۔ مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا تم میں۔ تو سنڈے کو صبح دس بجے ہمارے ہاں پہنچ جانا۔ ٹھیک ہے؟ رحمان کو ہم نے جان بوجھ کر نہیں بلایا، خواہ مخواہ سکینڈل بنے گا۔''

### ٹیلے اور سمندر

سینڈز سپٹ اگرچہ کراچی کا مشہور پکنک پوائنٹ تھا مگر کم ہی لوگ اُدھر کا رخ کرتے تھے۔ عام لوگ بال بچوں کو لے کر کلفٹن پر دن گزار لیتے تھے جہاں کا سفر بھی آسان تھا۔ دال چاٹ بھی آسانی سے مل جاتی تھی اور سمندر بھی پایاب تھا۔

پاکستان میں سمگلنگ شروع ہو چکی تھی۔ رشوت کا رواج بھی عام تھا اور لائسنس پرمٹ بھی خریدے جا سکتے تھے، جن کی بدولت پاکستان میں ایک مراعات یافتہ طبقہ پیدا ہو چکا تھا جو عوام کو اور پاکستان کو حقارت سے دیکھتا تھا۔ اس طبقے کا پکنک پوائنٹ ہاکس بے تھا جہاں بعض نے حرام کی کمائی سے اپنے عیش و آرام کے لیے جھونپڑیاں بنا رکھی تھیں جنہیں وہ ہٹس کہتے تھے۔ ان ہٹس میں بستر، کھانے پینے کا امریکی سامان، شراب

کی بوتلیں، تولیے اور ڈریسنگ گاؤن رکھے رہتے تھے جنہیں یہ نو دولتیے سمندر میں اپنی بیویوں یا دوسروں کی بیویوں کے ساتھ کھیل تماشے کے بعد استعمال کرتے تھے۔ وہ ہفتے کی رات کو اپنی پارٹیوں کے ساتھ وہاں چلے جاتے اور لوگوں کی نظروں سے دور غسل مہتابی اور غسل آفتابی کے بعد اتوار کی شام کو واپس آ کر لوٹ مار میں جت جاتے۔ ان کے خیال میں ان کی بدولت پاکستان ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو چکا تھا۔

پاکستان ایک قلت کا ملک تھا۔ ہر شے ہمیں باہر سے منگوانی پڑتی تھی اور یہیں بڑے بڑے افسروں کو کھلا پلا کر اور نہلا دھلا کر بڑے بڑے لائسنس حاصل کر لیے جاتے تھے۔ ان کی خدمات کا معاوضہ انہیں باقاعدگی سے مل جاتا تھا۔ بڑے افسر، بڑے تاجر اور بااثر سیاستدان کی تکڑم جڑ پکڑ چکی تھی۔ ابھی پولیس والوں اور غنڈوں کا اِدھر آنا جانا نہ ہوا تھا۔ ابھی لوگ بلیک میلنگ اور غنڈہ گردی کے فن سے واقف نہ ہوئے تھے اور عورتوں کی ابھی بہت عزت تھی۔ عورتوں والی پارٹی سے لوگ چھیڑ چھاڑ نہ کرتے تھے مگر سینڈز پٹ کی بات ہی اور تھی۔ یہاں چند ماہی گیر خاندانوں کے سوا کوئی رہتا نہ تھا اور ماہی گیر اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔

سینڈز پٹ جانے کے لیے بادبانی کشتی کرائے پر لینی پڑتی تھی۔ جمال اپنی بیوی اور آہو کے درمیان ایک طرف بیٹھ گیا۔ دوسری طرف آہو کے والدین ان کی کچھ عزیز خواتین اور پیٹر جان۔ کچھ دور جا کر مانجھی نے بادبان کا رخ تبدیل کیا تو کشتی ایک طرف جھک گئی اور سب کچھ لڑھک کر جمال پر آن پڑا تھا حتیٰ کہ آہو بھی۔ پانی کی ایک لہر نے سب کے کپڑے بھگو دیئے اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ جمال آہو کے اوپر آ پڑنے سے ذرا گھبرایا تو وہ اپنے ابا کو مخاطب کر کے بولی ''دیکھیے یہ جمال میاں پانی میں کس قدر شرما رہے ہیں، حالانکہ خشکی پر کسی کو بات بھی کرنے نہیں دیتے۔''

جمال کی معصوم بیوی اس پر کھلکھلا کر ہنسی۔

بولی ''واقعی یہ بہت شرمیلے ہیں۔''

بڑے میاں نے نرمی سے کہا ''آہو جمال میاں کو تنگ نہ کرو۔''

کنارے پر ریت کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یہاں بمبئی کے ساحل جوہو والی بات نہ تھی۔ وہاں تو ناریل اور تاڑ کے درختوں کی چھاؤنی چھائی رہتی تھی اور بیچ بیچ میں اور تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر جوار کے وقتوں کے آئے ہوئے پانیوں سے بھرے تالاب جن کی گہرائیوں کا پتہ نہ چلتا تھا۔ سینڈز پٹ میں مٹیالے پانی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ جب پارٹی ساحل پر اتری تو بھاٹے کی وجہ سے پانی دور ہٹا ہوا تھا اور لاکھوں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں کیچڑ کے وسیع میدانوں میں تڑپ تڑپ کر گزوں اچھل رہی تھیں۔

''سمجھو گے نہیں تو اسی طرح تڑپ تڑپ کر کیچڑ میں مر جاؤ گے۔'' آہو نے آہستہ سے جمال کو کہا مگر کسی نے اس کی بات نہ سنی۔

جمال بڑی خاموشی سے بولا ''پانی کے لیے تڑپ رہی ہیں۔ پانی آ جائے گا تو ان کا تڑپنا بھی بند



ہو جائے گا۔''

آہو کے والد نے یہ بات سن لی۔ ''بے شک۔'' وہ بولے۔ ''مچھلیوں کو وقت کا پتہ ہوتا ہے۔ وہ انتظار کر سکتی ہیں۔''

''مگر جمال صاحب کو جوار بھاٹے کے بھید نہیں معلوم ابا۔''

''جمال میاں تم اپنا سوئمنگ سوٹ تو لے نہ آئے۔ میں تو نہیں بھولا۔''

''جی مجھے تو خیال نہیں آیا۔''

''یہ بڑے تیراک ہیں ابا۔'' آہو شرارت سے بولی ''تیر کر نکل جائیں گے۔ اگر کوئی بڑی لہر آ گئی تو پتہ نہیں ہمارا کیا حشر ہو۔''

''انہیں تیرنا نہیں آتا جی۔'' جمال کی بیوی بولی ''غسلخانے میں بھی چوکی سے نہیں اٹھتے۔''

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

ایک اچھی جگہ پر دریاں بچھ گئیں۔ کھانا کھلا اور جلدی جلدی کھا کر لڑکیاں ریس لگانے لگیں۔ جمال آہو کے ابا کے ساتھ شطرنج کھیلنے لگا مگر جمال کا دھیان لڑکیوں ہی کی طرف تھا۔ وہ ساحل کے قریب جا کر چھینٹے اڑانے اور پانی میں کودنے لگیں۔ دور سے لگتا تھا کہ سمندر کے شور میں جلترنگ کی موسیقی شامل ہو گئی ہے۔

## چال چوکتا ہے

تھوڑی دیر کے بعد آہو بھاگتی ہوئی آئی اور بولی ''ابا اب اٹھیں اور سمندر میں ڈبکی لگائیں۔ جمال صاحب کو شطرنج بالکل نہیں آتی۔ چال چوک جاتے ہیں وقت پر۔''

''تو چلیے جمال میاں آپ بھی ذرا کنارے تک۔'' قبلہ بولے۔ ''آپ بھی آ جائیں بیٹا۔'' انہوں نے مودی سے کہا۔

''میں آپ کو ڈوبنے نہ دوں گی۔'' آہو نے جمال کی بیوی سے کہا۔

جمال سمندر میں نہاتے ہوئے محتاط رہا۔ اس نے کوئی ایسی حرکت نہ کی جس سے کسی کو شک پڑ جائے مگر آہو بے تکلف اسے گھسیٹ گھسیٹ کر گہرے پانیوں میں لے جاتی رہی۔ ایک بڑی لہر آئی تو جمال نے اچھل کر اسے گزر جانے دیا مگر مڑ کر دیکھا تو آہو اور مودی کا کچھ پتہ نہ تھا۔ پانی ہٹا تو مودی زمین پر گری ہوئی تھی اور آہو چوکڑی مار کر بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے کپڑوں میں سے پانی کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ بال کھل کر بکھرے ہوئے اور آہو کی چولی بدن کے ساتھ چپکی ہوئی۔

''تم لوگ تو ڈوب ہی گئی تھیں۔'' جمال نے کہا۔

''میں ڈوبتی نہیں۔ تیز لہر کے آگے بیٹھ جاتی ہوں۔ تیز لہروں کا بھید تم نہیں جانتے جمال۔''

مودی نے کہا ''بھئی میں تو چلی باہر۔ مجھے نہیں اچھا لگتا سمندر میں ڈوبنا۔ میں ذرا کپڑے سکھا لوں۔''

''کپڑے سکھانے ہیں تو ریت پر لیٹ جاؤ۔ پانی خشک ہو جائے تو ریت جھڑ جائے گی۔'' آہو بولی۔

''نہ بھئی تمہی لیٹو ریت پر۔ میں تو چلی۔''

آہو ریت پر لیٹ گئی۔ جمال بھی آ گیا۔ دونوں لوٹ پوٹ ہونے اور قہقہے لگانے لگے۔ جمال نے کہا ''اب کیا ارادہ ہے جل پری۔ چلو ٹیلوں کی طرف ذرا ریس لگائیں گے۔''

''ابا کیا سوچیں گے؟'' وہ بولی۔

''ابا کچھ بھی نہیں سوچیں گے۔ ریس لگانے میں سوچنے کی بات کیا ہے۔ اگرچہ تم ایک جوان اور خوبصورت لڑکی ہو۔''

''تم بھی تو ایک جوان اور خوبصورت آدمی ہو۔''

''یہ بات تو سوچنے کی ہے۔''

''ابا کو تم پر پورا بھروسہ ہے۔ پھر تمہاری بیوی بھی تو ایک جوان اور خوبصورت عورت ہے۔ تم میرے لیے خطرناک نہیں ہو سکتے بظاہر!''

''میں تمہارے لیے بہت خطرناک ہو سکتا ہوں۔ انہیں تم پر بھروسہ ہونا چاہیے مجھ پر نہیں۔''

''میں تو تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتی مگر تم مجھے ٹیلے کی اوٹ میں پکڑ نہ لینا۔ کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ چلو دوڑو اب۔ میں آگے بھاگتی ہوں، تم مجھے پکڑو مگر جلدی نہ کرنا۔''

## ٹیلے کے پیچھے

جمال آہو کے پیچھے بھاگتا ہوا ٹیلے کے پیچھے پہنچ گیا۔ وہ ہانپ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ ریت اڑ رہی تھی مگر دونوں ادھ کھلی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے، پھر ہنسنے لگے۔ جمال نے اچانک اسے گھور کر دیکھا اور کہا ''مجھے تمہارے جسم کی شدید آرزو ہو رہی ہے آہو۔''

''مجھے پتہ تھا، اسی لیے میں تمہیں اِدھر لائی ہوں۔''

''تم مجھے جان بوجھ کر اِدھر لائی تھیں؟ تمہیں پتہ تھا میری آرزو کا؟ میرے قریب آ جاؤ ذرا یا میں تمہیں خود ہی اٹھا کر سینے سے لپٹا لوں؟''

''میں تمہیں جان بوجھ کر اِدھر لائی تھی تاکہ میں تمہیں سمجھا دوں ورنہ تم رات بھر بے قرار رہتے۔ بھٹی میں جلتے رہتے۔''

''سمجھنے سمجھانے کی بات نہیں آہو۔ ایک مرتبہ میرے سینے سے لگ جاؤ۔''



''پھر کیا تمہیں قرار آ جائے گا۔'' آہو بولی۔ ''نہیں آئے گا۔''

''تمہارے ہونٹ کچنار کی کلی کی طرح کھل رہے ہیں تو میں اپنے ہونٹ ان پر رکھ لوں؟ ڈرو مت۔''

''میں کیوں ڈرنے لگی ایسے شخص سے جو پیار کے بھاؤ نہیں جانتا۔ جو عورت کو بالکل نہیں سمجھتا۔ جو بندر نچا کر خوش ہوتا ہے۔ ایسا شخص مجھے ڈرا نہیں سکتا۔ مجھے تم اچھے لگے مگر تم بندر نچانے والے آدمی تو نہیں ہو۔''

''اس وقت میں ایسا ہی ہوں آہو۔''

''یہ ایک لمحہ بہت جلد گزر جائے گا جمال۔ میں وقت کا انتظار کر لوں گی۔ ان تڑپتی ہوئی مچھلیوں کی طرح۔''

''میں تم سے زبردستی بھی کر سکتا ہوں اس وقت۔''

''بے شک مگر پھر تمہیں میرے ہونٹوں سے کیا ملے گا۔ رس کی ایک بوند بھی نہیں۔ کیا تم مٹی کو چوسنا چاہو گے؟ محبت خیرات میں مل سکتی ہے، اسے خریدا جا سکتا ہے۔ اسے تحفے میں بھی پایا جا سکتا ہے مگر اسے چھینا نہیں جا سکتا۔ اے میرے نادان عاشق! اگر تم واقعی مجھے چاہتے ہو تو کیا یہ کم ہے؟ تھوڑا اور حاصل کر لینے کے پاگل پن میں سارا نہ گنوا دو۔ یہ بھی سوچو کہ میرے پاس تمہیں دینے کے لیے پھر کیا رہ جائے گا۔ میرا بھید میرے پاس رہنے دو۔ کیا آج کا دن تمہیں عمر بھر یاد نہیں رہے گا؟ میں تو کبھی نہ بھولوں گی آج کا دن!''

''میں بھی آج کا دن کبھی نہ بھولوں گا۔ اگرچہ میرے جسم کی سیڑھی تنی ہوئی ہے۔''

''مگر جسم کی سیڑھی کے بغیر بھی تو اڑا جا سکتا ہے۔ رحمان مجھے ساتویں آسمان کی سیرا کرا دیتا ہے۔ جسم کی سیڑھی کا اس نے کبھی نام نہیں لیا۔''

''کس طرح سیر کرا دیتا ہے۔'' جمال نے طنز کیا۔ ''کیا اس کے پر نکل آتے ہیں تمہیں دیکھ کر؟''

''بے شک پر نکل آتے ہیں۔ وہ بہت نفیس آدمی ہے، بے حد مہذب اور بے حد رومانٹک۔ وہ مجھ سے پیاری پیاری باتیں کرتا ہے اور میں ہوا میں اڑنے لگتی ہوں۔ تم اس کیفیت کو نہیں جانتے نا۔ تم فقط جسم کی سیڑھی پر کھڑے ہو۔ اوپر نہیں اٹھ سکتے۔''

جمال خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر میں پیٹر جان کے بھونکنے کی آواز آنے لگی۔ ''کھانا لگ گیا ہے۔'' آہو بولی۔ اگلے روز وہ جمال کے دفتر میں آئی تو اس نے اس واقعے کا کوئی ذکر نہ کیا۔ جمال کو یقین تھا کہ میں اس چھوٹی سی دیوار کو پھلانگ سکتا ہوں جو آہو نے اپنی حفاظت کے لیے کھڑی کر رکھی ہے مگر آہو کی بات میں اتنا خلوص تھا کہ اس نے اسے حاصل کرنے کا ارادہ چھوڑ دیا۔

آہو اسے اپنے راستے پر لے آئی تھی اور اس پر وہ بہت خوش تھی۔ اس نے جمال سے صاف کہہ دیا تھا کہ میں نے رحمان کو پسند کر لیا ہے۔ میں تمہارے آگے شاید انکار نہ کر سکوں مگر پھر میری منزل کھوٹی ہو جائے گی۔ وہ باتوں میں شہد ٹپکاتی تھی مگر ایک خاص حد سے آگے نہ وہ بڑھی نہ اس نے جمال کو بڑھنے دیا۔ دونوں دفتر سے فارغ ہو کر بازار میں گھومتے۔ آئس کریم کھاتے، سینما دیکھتے۔ کسی اجنبی گروہ میں لوگ انہیں میاں بیوی سمجھ لیتے تو وہ انکار نہ کرتی۔

جمال کی بیوی کو دونوں کی دوستی کا علم تھا مگر وہ برا نہ مانتی تھی۔ دونوں خواتین ایک دوسرے کو دل سے پسند کرتی تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ جمال دونوں کی قدرِ مشترک ہو۔ اس خیال سے اس کی انا کو بہت تقویت پہنچتی تھی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ جمال نے اس کے جسم کی آرزو چھوڑ دی تھی اور اس بات کا آہو کو بھی پتہ تھا۔ اگر جمال اس کے جسم کی آرزو ترک کر دیتا تو شاید وہ بے لطف ہو جاتی۔ وہ جس طرح جمال کو سنبھالتی تھی اسی طرح اپنے آپ کو بھی سنبھالتی تھی اور یہ بات بھی اس نے جمال کو خود ہی بتادی تھی کہ تمہارا جسم مجھے بلاوا دیتا ہے مگر میں تمہاری ہو نہیں سکتی۔ اتنی شدت میں سہار نہ سکوں گی۔ کیوں مجھے ہر وقت لذت بھری نگاہوں سے دیکھ دیکھ کر راستہ بھلانے کی کوشش کرتے ہو۔ تم نے میری مدد نہ کی اور مجھے اسی طرح اپنی طرف کھینچتے رہے تو میں ٹوٹ سکتی ہوں۔ تم مجھے ضرور توڑنا چاہتے ہو؟

''نہیں آہو۔'' جمال بولا۔ ''میں تمہیں اسی طرح جلتا دیکھنا چاہتا ہوں۔''

جمال پیچھے ہٹنے لگا مگر وہ آگے بھی کہاں تک بڑھا تھا۔ آگ کو بھڑکانا اور ٹھنڈا کرنا تو آہو کے قبضے کی بات تھی۔

آہستہ آہستہ آہو دفتر سے غائب رہنے لگی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ وہ دفتر گئی ہی نہیں۔ سیدھی جمال کے پاس آئی، گپیں لگائیں اور وہیں سے سیدھی گھر چلی گئی۔

استاد شوق کانپوری اور نوازش لکھنوی نے شروع شروع میں بڑی باتیں بنائیں مگر پھر وہ اس کے عادی ہو گئے۔ کریم بخش اس کا بھائی بن کر چپ ہو گیا۔

پھر آہو اچانک غائب ہو گئی۔ جمال کسی سے اس کے بارے میں پوچھ بھی نہ سکتا تھا اور بن بلائے اس کے گھر جانا بھی اچھا نہ لگتا تھا۔ آخر وہ اس کا کون تھا مگر نوازش لکھنوی بہت بگڑا۔ اس کا خیال تھا کہ آہو نے اس کے نکھٹو کے حق شفع کو رد کر دیا ہے۔ وہ ساری دنیا کا دشمن ہو گیا۔

## مکھ موڑ مکات جات

جمال کو کام سے عشق تھا۔ کراچی کے رپورٹر اس کے پاس دیر تک بیٹھے رہتے۔ گپ شپ، سیر دنیا، ہنسی مذاق۔ بعض اوقات دفتر خالی ہو جاتا مگر مجلس جاری رہتی۔



ایک دن جب جمال سب کو رخصت کر کے گھر جانے کو اٹھا تو آہو ہانپتی ہوئی اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ پیشتر اس کے کہ جمال اس سے پوچھتا کہ تم کہاں رہیں۔ وہ بولی ''یار ایک تو تمہاری گپ شپ مصیبت ہو گئی ہے۔ تمہیں کس نے کہا ہے کہ شام تک لوگوں کو بٹھائے رکھو۔''

''اگر شام تک نہ بیٹھتا تو تم سے ملاقات کیسے ہوتی پیاری۔ تم کہاں غائب ہو گئی ہو؟''

''میں تو بارہ بجے سے چکر لگا رہی ہوں مگر تم نے یہاں میلہ لگا رکھا تھا۔''

''بارہ بجے سے؟ تو تم کیوں نہ آ گئیں اندر؟''

''میں اس وقت آنا چاہتی تھی جب تم کمرے میں اکیلے ہو۔''

''اچھا! کیوں؟'' جمال نے پوچھا۔

''وہ بھی میرے ساتھ دھکے کھا رہا ہے صبح سے رحمان۔''

''اچھا تو اس وقت کہاں ہے؟''

''باہر گاڑی میں بیٹھا ہے مگر اسے وہیں رہنے دو۔ میں نے اس سے اجازت لے لی ہے۔''

یہ کہہ کر وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی ناف کا بھنور جمال کے ہونٹوں کے سامنے آ گیا اور زیادہ گہرا اور گول ہو گیا۔ اس میں سے شعائیں نکلنے لگیں۔ جمال کی نظریں اس پر جم گئیں۔ وہ ایک قدم اور آگے بڑھی اور بولی ''لو چوم لو اسے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا نا؟''

جمال کا جی چاہا کہ وہ اپنی جان دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اس بھنور میں اتر جائے مگر وہ گھبرا گیا۔

آہو بولی ''جلدی کر و یار۔ وہ انتظار کر رہا ہے۔''

''کیا اسے معلوم ہے کہ تم مجھ سے اپنی ناف چھوانے کے لیے جا رہی ہو؟ بڑی حرامزادی ہو۔''

''میں اس سے کچھ نہیں چھپاتی یار۔'' آہو بولی۔

''تو اس نے کیا کہا؟''

''وہ کیا کہتا۔ کہتا تھا جمال بہت اچھا آدمی ہے۔ حالانکہ تم ذرا بھی اچھے آدمی نہیں ہو۔ بالکل بچے ہو۔ پرلے درجے کے احمق ہو۔ ویسے تن کا ہر لو بھی ایسا ہی ہے۔ تم جیسا بے وقوف اگرچہ سٹائل میں فرق ہوتا ہے۔ لو اب دیر نہ کرو۔''

اس نے اپنی ناف جمال کے ہونٹوں سے لگا دی مگر جمال کے ہونٹ مٹی کے بن گئے۔ وہ اس لڑکی کی جرأت، اعتماد اور سچائی پر حیران تھا۔ اس میں مروت اور معصومیت کس قدر تھی۔ وہ جمال سے عشق کرنے نہ آئی تھی مگر وہ اسے حسرت میں چھوڑ کر جانا نہ چاہتی تھی۔

تھوڑے دنوں کے بعد اسے پتہ چلا کہ آہو نے رحمان سے شادی کر لی ہے اور کسی ایسے شہر میں چلی گئی ہے جہاں اسے کوئی بھی نہیں جانتا

جب پچیس برس کے بعد وہ اسے ملی تو اس کا جمال کو دیا ہوا رنگ کا چھینٹا مدہم پڑ چکا تھا مگر خوشبو اب بھی برقرار تھی۔

## نیا موسم

آہو کے اچانک چلے جانے کے بعد جمال کا دل دفتر سے اچاٹ ہو گیا۔ جس طرح اس کے بچپن میں کشمیر میں بہار آتی تھی اور مٹی کی چھتوں پر راتوں رات پھولوں کا اجالا ہو جاتا تھا۔ وہ اسی طرح اس کی زندگی میں آئی اور موسم کے باسی ہو جانے پر اسی طرح چلی گئی تھی۔

کام میں اس کا دل نہ لگتا تھا۔ اس کو آہو سے رسمی عشق نہ ہوا تھا مگر وہ اس کی زندگی میں ایک اور طرح کی رونق تھی۔ ایسی سچی، ایسی دلیر، ایسی شریف لڑکی اس نے کبھی دیکھی نہ سنی۔ اس نے جمال کو بہت ڈھیل دی مگر حدود کو کبھی پار کرنے نہ دیا۔ رحمان بھی عمدہ آدمی تھا مگر اپنی تمام تر شائستگی کے باوجود آہو کے لائق نہ تھا۔ آہو نے اس کو دل نہ دیا تھا۔ وہ کالج میں اس کا استاد تھا۔ مروت میں آ کر اس سے ہاں کر دی تو ہاں کر دی۔

کراچی میں آہو کے چاہنے والے بہت تھے۔ اس کا سٹائل ہی ایسا تھا کہ جہاں سے گزرتی ٹریفک رک جاتی۔ وہ جس کو چاہتی اسے حاصل کر سکتی تھی مگر نہ تو اسے دولت کی پرواہ تھی اور نہ کسی سے سماجی مرتبے کا خیال اور اگرچہ رحمان ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے کا چشم و چراغ تھا اور کراچی کی ایک معزز شخصیت تھا مگر آہو نے اس حوالے سے اس کی بات نہ مانی تھی۔ جب وہ چلی گئی تو جمال کو اس کی کمی بہت محسوس ہوئی۔

جمال اپنے اپنے خیالوں میں بیٹھا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ جمال سے کسی نے کہا ''جی میں ابوالاثر کا پی۔ اے ہوں۔ وہ بیمار ہیں۔ انہوں نے آپ کو بلایا ہے اسی وقت۔''

جمال جب ولیج ایڈ کے دفتر پہنچا تو ابوالاثر صاحب کرسی پر نڈھال پڑے تھے۔ انہوں نے ایک آنکھ کھول کر اسے دیکھا اور پھر بے ہوش ہو گئے۔ جمال بہت گھبرایا۔ پی اے کا رنگ زرد ہو گیا۔ اس نے کہا ''صاحب ٹھیک ٹھاک تھے مگر اِدھر آپ آئے، اُدھر ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ عمر کا تقاضا بھی ہے۔''

ابوالاثر نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور بولے ''ابھی تو میں جوان ہوں۔ چودھری محمد علی نے جب میری منت سماجت کر کے ولیج ایڈ کا کام سونپا تو میری عمر اس وقت بھی 65 برس تھی۔ برخوردار 65 برس کی عمر تک تم تو کئی مرتبہ مر چکے ہو گے۔''

جمال کے لیے یہ پینترا کسی قدر حیران کن تھا۔ پھر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے۔

''برخوردار تم تو پھر لوٹ کر آئے ہی نہیں۔ مجھے تو نوکری کا کچھ خیال نہیں مگر سوچا تھا کہ تم میرے بھتیجے ہو۔ یہاں آؤ گے تو اچھا کھائیں گے، مندا بولیں گے اور زندگی خوشگوار گزرے گی۔ یہ لوگ مجھے بجٹ دیتے نہ تھے مگر میں نے چودھری محمد علی سے بجٹ لے لیا۔ اب آؤ اور کام شروع کریں۔''

''بہت جناب مگر مجھے پہلے آپ سندھ گورنمنٹ سے [illegible] لیں۔''



''تو لکھو خط۔ پنسل نکالو۔ گورنر کے نام لکھو، میں تمہیں ڈکٹیشن دیتا ہوں۔''

ابوالاثر صاحب کو انگریزی نہ آتی تھی۔ ان کی ایک بیوی انگریز تھی۔ اس کو وہ مارتے تو وہ چیختی اور انہیں بے تحاشا گالیاں دیتی۔ اس کے ساتھ رہتے رہتے ابوالاثر تھوڑی بہت گٹ مٹ کرنے لگے تھے اور اب وہ جمال کو اپنی بے ربط انگریزی میں ڈکٹیشن دینے لگے۔ جمال بہت گھبرایا۔ اس نے کہا ''جناب آپ آرام کریں۔ میں ڈرافٹ کرلاتا ہوں۔ اسے آپ دیکھ لیجیے گا۔''

''نہیں۔ تم نہیں جانتے کہ میں کیا لکھنا چاہتا ہوں۔ اس لیے جیسا میں بولوں ویسا ہی لکھتے جاؤ۔''

جمال نے سر جھکا لیا۔

وہ خط اس قابل نہ تھا کہ اسے کہیں بھیجا جائے۔ بیچ بیچ میں ابوالاثر صاحب نے فارسی اور اردو کے محاورے لکھوائے۔ مثلاً جب یہ لکھا کہ میرے پاس کوئی آدمی نہیں اور کام بہت زیادہ ہے تو انگریزی میں لکھوایا۔ ع قیاس کن ز گلستان من بہار مرا!

تھوڑی دیر میں پی۔ اے خط ٹائپ کر کے لے آیا اور کچھ غلطیاں اس نے خود بھی اس میں شامل کر دیں۔ جمال نے کہا ''جناب یہ خط ٹھیک نہیں ہے۔''

ابوالاثر صاحب بولے ''نیچے کس کے دستخط ہوں گے، میرے یا تمہارے؟''

بہرحال جیسا کیسا خط تھا، گورنر کے نام بھیج دیا گیا۔ اس میں یہ بات تو سمجھ میں آتی تھی کہ پاکستان کی تعمیر کے سلسلے میں قائداعظم نے مجھے کچھ فرائض سونپے تھے مگر میں اسی زمانے میں تاریخِ افواج پاکستان منظوم کر رہا تھا۔ فارغ ہوا تو چودھری محمد علی نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں ولیج ایڈ کا کام سنبھالوں۔ اس کے لیے مجھے ہونہار نوجوان درکار ہیں۔ فی الحال میں نے جمال کو منتخب کیا ہے جو سندھ گورنمنٹ کے محکمۂ تعلقاتِ عامہ میں انفارمیشن آفیسر ہے۔ یہ جوہرِ قابل وہاں ضائع ہو رہا ہے۔ اسے میرے محکمے میں ٹرانسفر کر دیا جائے تاکہ میں کام شروع کر سکوں۔ پاکستان مزید تاخیر کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

ہفتے بھر میں جمال کو حکم مل گیا کہ تمہیں عارضی طور پر مرکزی حکومت کے محکمہ ولیج ایڈ میں متعین کیا جاتا ہے۔

ابوالاثر مرکزی حکومت کی سیکریٹریٹ کے ایک بڑے کمرے میں بیٹھتے تھے۔ یہ کمرہ انہیں بڑی مشکل سے ملا تھا۔ انہوں نے افسروں کو دھونس دے دے کر نیم مردہ کر ڈالا تھا۔ وزارتِ اقتصادیات کے سیکریٹری مسٹر ڈین پیرزادہ اللہ والے بزرگ تھے۔ شاہنامۂ اسلام کی وجہ سے وہ ان کے بڑے معتقد تھے اور ابوالاثر ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے ان کے پاس پہنچ جاتے تھے۔

جمال ابوالاثر کے کمرے میں بیٹھ گیا۔

## یارانِ سیر پل

پہلا مسئلہ یہ تھا کہ سٹاف کہاں سے حاصل کیا جائے۔

مفتی ان دنوں راولپنڈی میں پریشان حال تھا۔ اپنے افسر سے پہلے اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اس نے کہا ''مفتی یار تم دورے پر جاتے ہو تو تھرڈ کلاس میں سفر کر کے فرسٹ کلاس کے پیسے لے لیا کرو۔ تنخواہ میں تو کچھ بنتا نہیں کسی کا۔''

مفتی کا واقعی تنخواہ میں گزارہ نہیں ہوتا تھا۔ اس نے دو تین ٹی اے بل فرسٹ کلاس کے وصول کر لیے۔ پھر کسی بات پر افسر اور ماتحت میں تکرار ہو گئی تو مفتی کے افسر نے شکایت کر دی کہ وہ تھرڈ کلاس میں سفر کر کے فرسٹ کلاس کے ٹکٹ کے پیسے وصول کرتا ہے۔ اس پر ایک انکوائری کمیشن بیٹھ گیا۔ مفتی معطل ہو گیا اور تنخواہ بند ہو گئی۔

اس پر مفتی سخت پریشان ہوا۔ کتابوں کی رائلٹی بہت کم ہوتی تھی اور دوسرا کوئی ذریعہ آمدنی اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ دفع بلیات کے لیے مزاروں پر ماتھے رگڑتا اور پیروں کے حجروں میں جھاڑو دیتا مگر کوئی پیر اس کی دست گیری پر تیار نہ ہوا۔ دراصل پیروں اور مزاروں کو جھوٹے ٹی اے بل کے گناہ کی سنجیدگی کا علم نہیں ہوتا۔

جمال نے مفتی کو خط لکھا کہ نوکری سے استعفیٰ دے کر میرے پاس کراچی آ جاؤ۔ اس سے پہلے اس نے ابوالاثر کے سامنے اس کی شرافت، قابلیت اور وفاداری کی بڑی تعریف کی تھی اور وہ اس کی تعیناتی پر راضی ہو گئے تھے۔ وہ جمال پر پورا بھروسہ کرتے تھے۔

تھوڑے دنوں میں مفتی کراچی پہنچ گیا۔ اس کی نوکری سکرپٹ رائٹر کی تھی۔ ولیج ایڈ کے منصوبے میں دیہات کی ترقی کے لیے فلمیں بنانا شامل تھا اور مفتی اس کے لیے موزوں تھا۔

مگر ولیج ایڈ کو ایک ماہوار پرچہ بھی نکالنا تھا اور اس کے لیے کسی موزوں ایڈیٹر کی ضرورت تھی۔
جمال کو یاد آیا کہ بیدلؔ صحرائی آج کل بیکار ہے۔ وہ اسمبلی میں ٹرانسلیٹر تھا اور اسمبلی برخاست ہو چکی ہے۔

بیدلؔ بڑا محتاط اور خوفزدہ آدمی تھا۔ وہ ابوالاثر کو جالندھر سے جانتا تھا اور اسے ان پر بھروسہ نہ تھا۔ یوں بھی انہی دنوں اس نے ابوالاثر پر ''ڈان'' کے ایک مضمون میں جملہ بازی کی تھی اور اسے ڈر تھا کہ ابوالاثر اس کو برداشت نہ کریں گے۔

جمال نے موقع پا کر بیدل کی بات کی تو ابوالاثر صاحب بولے ''وہ شاعر اچھا ہے۔ نثر بھی لکھ لیتا ہے مگر میں اسے ذاتی طور پر جانتا نہیں۔''

جمال نے کہا ''میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ نہایت شریف اور وفادار آدمی ہے۔''

''کہاں کا رہنے والا ہے؟'' ابوالاثر نے پوچھا۔

''جالندھر کا مہاجر ہے جناب۔ آپ اس کا انٹرویو کر لیں۔''

انٹرویو میں بیدل پاس ہو گیا اور اسے نوکری کا پروانہ مل گیا۔

بیدل بہت شرمیلا آدمی تھا۔ اس کے چھوٹے بہن بھائی اور بوڑھے والدین لاہور میں رہتے تھے



اور وہ بیدل کی اس آدھی تنخواہ پر گزارہ کرتے تھے جو وہ انہیں ہر ماہ باقاعدگی سے بھیجا کرتا تھا۔ خود وہ اے جی آفس کے کسی ہوسٹل کے ایک لمبے ہال میں، جس میں بے شمار چارپائیاں بچھی رہتی تھیں، نہایت قلیل کرائے پر رہتا تھا۔ اسے چھپکلیوں کا بہت خوف تھا جو چھت پر ہزاروں کی تعداد میں پھرتی لڑتی جھگڑتی اور کبھی کبھی نیچے بچھے ہوئے بستروں پر آرام کرتی تھیں۔ بیدل جب رات کو پڑھنے کو بیٹھتا تو سر پر چھتری تان کر بیٹھتا اور اسی طرح ساری زندگی وہ احتیاط کی چھتری کے نیچے بیٹھا رہا۔ وہ شاعر بہت اچھا تھا مگر شرمیلا تھا، اس لیے مشاعروں میں نہ جاتا تھا۔ مزاح نویس بھی نہایت عمدہ تھا مگر ابھی اس کی کوئی کتاب چھپی نہ تھی۔ صرف اس کے قریبی دوست ہی اسے اچھی طرح جانتے تھے۔

پروانہ ملنے پر بیدل بہت حیران تھا۔ جب ابوالاثر نے اس کے کوائف پوچھ لیے، اسے سیدھی اور ٹیڑھی آنکھ سے بار بار دیکھ لیا، قائداعظم سے ناشتے پر اپنی سیاسی ملاقاتوں کی تفصیل سنا دی تو بیدل بے چین ہو گیا۔ بولا ''جناب پہلے میری بات سن لیجیے۔ میں نہیں چاہتا کہ بعد میں آپ کو کوئی اور بتا دے۔ میں نے کچھ عرصہ قبل ڈان میں آپ کے بارے میں کچھ لکھا تھا۔ آپ کی شاعری کے متعلق۔''

## نروس بریک ڈاؤن

ابوالاثر نے منہ پھرا کر اپنی ٹیڑھی آنکھ اس پر جما دی اور ہمہ تن گوش ہو گئے۔ ''کیا لکھا تھا؟ کیا لکھ سکتے ہو تم میرے بارے میں؟''

''اصل میں مجھے یہ بات قبلہ سالک صاحب نے لاہور میں بتائی تھی جو مَیں نے مذاق مذاق میں لکھ دی۔'' بیدل بولا۔

''صاف کہو برخوردار۔ کون سی بات؟''

''جی جب آپ نروس بریک ڈاؤن کے سلسلے میں کسی ڈاکٹر کے پاس گئے تھے۔''

''نروس بریک ڈاؤن تو سوچنے اور محسوس کرنے والے شاعر کو ہمیشہ رہتا ہے۔'' ابوالاثر اپنی نبض پر ہاتھ رکھ کر بولے ''بلکہ اس وقت بھی ہے۔''

''......تو ڈاکٹر صاحب نے آپ سے کہا تھا کہ آپ دماغی کام کچھ وقت کے لیے چھوڑ دیں، آرام کریں۔ یہی کہا تھا نا سالک صاحب کے قول کے مطابق؟''

''مگر بیدل برخوردار زندگی میں آرام کہاں۔ فرصت ہی نہیں دیتے افکار معیشت کے! پھر پاکستان کا غم۔ ان انتالیس پیاروں کا رونا جو تقسیم پنجاب کے سلسلے میں جالندھر میں ذبح کر دیئے گئے۔ ان سات بیٹیوں کا دکھ جن میں سے ابھی کوئی بھی بیاہی نہیں گئی۔ پھر فکرِ سخن کا عارضہ ایسے میں نروس بریک ڈاؤن نہ ہو تو کیا ہو برخوردار!''

''جی۔ میری ایک گزارش سن لیجیے۔'' بیدل بولا۔

ابوالاثر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''بات یہ ہے قبلہ میں نہیں چاہتا کہ بعد میں کوئی آپ کو بتا دے۔ ڈاکٹر سے آپ نے کہا تھا کہ دماغی کام نہ کروں تو زندہ کیسے رہوں۔ یہی کہا تھا نا۔''

''یہ حقیقت ہے۔ دماغی کام نہ کروں تو زندہ کیسے رہوں اور ایسی زندگی کا فائدہ کیا؟''

''پھر ڈاکٹر صاحب نے پوچھا تھا کہ آج کل آپ کون سا دماغی کام کر رہے ہیں؟ اس پر آپ نے کہا تھا کہ آج کل میں بہت مصروف ہوں۔ آج کل میں شاہنامۂ اسلام کی چوتھی جلد مکمل کر رہا ہوں۔ مسلمان غازیوں کی فتوحات کو اشعار میں رقم کر رہا ہوں۔ اقبالؔ تو یہی کہہ کر تھک گیا ہوگا کہ بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے۔ افواجِ پاکستان کے بارے میں تو اسے کچھ لکھنے کی توفیق نہ ہوئی۔ اگرچہ شاعر وہ بے مثل تھا۔ قادر الکلام تھا۔''

''مگر قبلہ وہ پاکستان سے پہلے ہی چل بسے تھے۔ انہیں موقع کہاں ملا؟'' جمال نے کہا۔

''اسی بات کا تو رونا ہے۔ پاکستان میں کسی کو موقع ہی کب ملتا ہے۔''

''میں تو یہی عرض کر رہا تھا۔'' بیدل بولا۔ ''شاہنامۂ اسلام کے ذکر پر ڈاکٹر نے کہا۔ اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔ میں نے تو فقط دماغی کام سے منع کیا ہے اور یہی بات میں نے ڈان میں لکھ دی تھی۔ مجھے اس کا بہت افسوس ہے جناب۔''

ابوالاثر پتھر کا بت بن گئے۔ بیدل نے نظریں جھکا کر فرش پر جما دیں۔ جمال گھبرا گیا۔

تھوڑی دیر میں ابوالاثر کو اسی حالت میں چھوڑ کر بیدل رخصت ہو گیا۔ جمال نے اس کو بہت برا بھلا کہا اور بنے بنائے کھیل کے بگڑ جانے پر بیدل بھی بہت پشیمان ہوا۔

واپس آ کر بھی جمال نے ابوالاثر کو اسی کیفیت میں پایا۔ ان کے چہرے پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ بولے تو فقط ان کے ہونٹ ہلے۔ چہرے کے خطوط اسی طرح ساکت رہے۔ منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ پھر انہوں نے پہلو بدلا اور بولے ''جمال بیدل تمہارا دوست ہے اور میں ذاتی تنقید پر ناراض نہیں ہوتا مگر وہ سالک کا آدمی ہے۔''

''جی نہیں۔ وہ سالک کا آدمی نہیں۔'' جمال نے اعتماد سے کہا۔

''یہ آگے جا کر تمہیں تنگ کرے گا جمال۔'' وہ بولے۔

''نہیں کرے گا جی۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''کیا تمہیں پتہ ہے بیدل رانگڑ ہے۔ راجپوت ہے اور کیا تم رانگڑوں کو جانتے ہو؟ نہیں جانتے نا؟''

''رانگڑ راجپوت ہے تو وہ قول کا دھنی ہوگا۔'' جمال نے جواب دیا۔



''میں بھی رانگڑ ہوں۔ ہم راجپوت کسی کے دشمن ہو جائیں تو عمر بھر معاف نہیں کرتے۔''

''مگر جناب ابوالاثر بیدل میں کسی سے دشمنی کی اہلیت ہی نہیں۔ میں رانگڑ نہ ہو کر بھی اس سے زیادہ خطرناک ہو سکتا ہوں۔''

''خیر وہ تمہارا دوست ہے۔ تمہاری خاطر مجھے وہ بھی منظور ہے۔ ویسے رانگڑ ہے تو کچھ خوبیاں بھی ہوں گی اس میں۔ دوابے کے لوگ دل کے بڑے صاف ہوتے ہیں میری طرح۔ یقیناً اسے سالک نے بہکایا ہوگا۔ تم سالک کو نہیں جانتے۔''

## نوکری لگی

جب بیدل کی میز ابوالاثر کی میز کے ساتھ لگ گئی تو وہ اس پر بے پایاں شفقت کرنے لگے۔ فضا خوشگوار ہو گئی۔ جمال بیٹھا دیہات میں پبلسٹی کے منصوبے بناتا رہتا۔ ابوالاثر اور بیدل جالندھر کی باتیں کرتے اور ہنستے رہتے۔

کھانا کھانے کے بعد بیدل نے پوچھا۔ ''جمال پتہ ہے میری نوکری کیسے لگی؟''

''بھئی تم ایک قابل آدمی ہو۔ ابوالاثر کو پسند آ گئے بس۔''

## رانگڑ ہونے کے فائدے

''یہ بات نہیں جمال۔ ابوالاثر کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ کون کتنا قابل ہے۔ میری نوکری صرف اس وجہ سے لگی کہ میں رانگڑ ہوں اور اگر سالک صاحب نے مجھ سے ابوالاثر کے خلاف کچھ لکھوا لیا تو وہ بھی مجھ سے سالک صاحب کے خلاف جو چاہیں لکھوا سکیں گے۔ مثلاً یہ کہ وہ جوانی میں میرزائی تھے۔ اب تو اس بات کا کسی کو پتہ نہیں نا، تو ابوالاثر نے سوچا کہ میں جالندھر کا رانگڑ ہوں اور یہی میرا کمال ہے۔''

''مگر رانگڑ ہونے کی وجہ سے تو وہ تمہیں رکھنے میں لیت ولعل سے کام لے رہے تھے۔''

''وہ صرف دکھاوے کی بات تھی۔''

''ابوالاثر ایسے نہیں بیدل پیارے۔ بڑے نیک دل اور بڑے دکھی آدمی ہیں۔ قائداعظم کے خاص مشیروں میں تھے مگر انہوں نے یہاں آ کر کچھ حاصل نہیں کیا۔ انتالیس خون کے رشتے ان کے جالندھر میں کٹے، یہ نوکری بھی انہوں نے چودھری محمد علی کے اصرار پر قبول کی اور وہ بھی محض پاکستان کی تعمیر کے جذبے سے مجبور ہو کر۔ ایسا عظیم اور اصولی آدمی عامیانہ قبائلی عصبیتوں میں گرفتار نہیں ہوتا۔ تم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، بکواس کرتے ہو۔''

اس پر بیدل ہلکے سے مسکرا کر بولا۔ ''فسادات کے زمانے میں تو وہ شملے میں مقیم تھے۔ جالندھر میں ان کا کوئی رشتہ دار تھا تو بھی اس کو آنچ نہ آئی کیونکہ مشرقی پنجاب میں جالندھر واحد شہر ہے جس میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہی نہیں۔ وہاں ابوالاثر کے بزرگوں کا ترکی ٹوپیاں دھونے کا ایک اڈا خلافت کے زمانے سے

چلا آتا تھا مگر پھر جناح کیپ کا رواج ہوگیا۔ لال ٹوپی کوئی پہنتا ہی نہ تھا۔ ان کی مہارانی دادی کی کون سی حویلی لٹی اور وہ ہاتھی گھوڑے کون لے گیا جو اس بڑھیا دھوبن کے محل کے سامنے جھولتے تھے اور وہ قیمتی نوادر، پتھر، تاج، منقش تلواریں، گپت خنجر اور سنہری ڈھالیں کہاں گئیں۔ جمال ابوالاثر نے جھوٹ بولنے میں کمال پایا ہے۔ وہ بڑے دھڑلے سے گپ مارتے ہیں اور کبھی کبھی وہ خود اس پر یقین بھی کر لیتے ہیں مگر یہ میں مانتا ہوں کہ وہ اردو کے چند اوپر کے شاعروں میں سے ہیں اور اپنا ایک اسلوب رکھتے ہیں۔ ان کی غنائیت اور قافیہ پیمائی کے تو کیا ہی کہنے۔ یہ اسلوب پھر کسی کو نصیب نہ ہوا۔''

''یہ تو سچ ہے مگر شاعری کے علاوہ پاکستان کی انہوں نے جو خدمات انجام دیں، اس کے بدلے تو انہیں کچھ نہ ملا۔'' جمال نے کہا۔

بیدل بولا ''اگر تم مجھے ناشکرانہ سمجھو اور احسان فراموش نہ گردانو تو میں محض تمہاری غلط فہمی دور کرنے کے خیال سے کہہ دوں کہ اردو بازار میں جو دکان انہیں ملی تھی وہ مال سے بھری تھی۔ پھر لاہور میں ان کی پہلے سے دو کوٹھیاں موجود تھیں ماڈل ٹاؤن میں۔ حکومت مغربی پاکستان نے ان کی تاعمر پنشن لگا دی ہے اور بینک بھی ان کا کبھی خالی نہیں رہا۔ ابوالاثر اتنے بھوکے ننگے نہیں جتنے وہ بنتے ہیں اور شاید ایسے بے کس اور مظلوم بھی نہ ہوں۔ مجھے ان سے بہت محبت ہے اور یہ شاید تم نہ مانو گے مگر سچی بات یہ ہے کہ ابوالاثر بہت ہوشیار اور دنیادار آدمی ہیں۔ ہم جیسے بدھو نہیں۔ ماڈل ٹاؤن کی کوٹھیاں بھی انہیں مفت ہی ملی تھیں۔''

''وہ کیسے؟ وہ تو ہندوستان کی آزادی سے بہت پہلے کی تعمیرات ہیں۔'' جمال نے کہا۔

## دو بیویاں دو کوٹھیاں

بیدل نے جواب دیا ''ماڈل ٹاؤن سوسائٹی نے اپنے نقشے میں جا بجا نہریں، تالاب، پارکس اور باغ دکھائے تھے۔ ابوالاثر چونکہ بڑے شاعر تھے اور رام لیلا کے موقع پر لہک لہک کر راجہ رام چندر اور راون کے معرکوں پر نظمیں سنایا کرتے تھے اس لیے ماڈل ٹاؤن سوسائٹی نے جس کے مدارالمہام ہندو تھے، ابوالاثر سے کہا آپ بھی ماڈل ٹاؤن میں گھر لے لیں اور قیمت قسطوں میں چکاتے رہیں۔ ابوالاثر کی اس زمانے میں دو بیویاں تھیں۔ انہوں نے کہا، میری بیویاں تو آپس میں لڑتی رہتی ہیں۔ ان کے لیے مجھے دو گھروں کی ضرورت ہوگی۔ سوسائٹی نے انہیں دو عمدہ پلاٹ الاٹ کر دیئے۔ پہلی قسط ابوالاثر نے ادا بھی کر دی اور ٹھیکے پر کوٹھیاں بنوانی شروع کر دیں جن کے لیے انہوں نے سوسائٹی سے قرضہ بھی لے لیا کیونکہ شاعر کے پاس پیسہ تو ہوتا نہیں۔ جب اگلی قسطوں کا وقت آیا تو ابوالاثر خاموش ہوگئے۔ انہوں نے کسی خط کا جواب ہی نہ دیا۔ سوسائٹی نے ان پر دعویٰ کر دیا تو ابوالاثر نے سوسائٹی پر الٹا دعویٰ کر دیا کہ میں نازک مزاج شاعر، مجھے ماڈل ٹاؤن سوسائٹی نے باغات اور نہریں بنا کر دینے کے وعدے کیے تھے ورنہ میں کیوں یہاں گھر بنواتا۔ میں نے سوچا تھا کہ پرفضا جگہ میں بیٹھ کر شعر کہوں گا مگر سوسائٹی نے مجھے دھوکا دیا اور کچھ بھی بنا کر نہ دیا۔ نہ نہریں، نہ تالاب۔ الٹا میرا سکون برباد کر گئی۔ اس لیے مجھے ذہنی اذیت کا ہرجانہ دلوایا جائے۔ سوسائٹی پیشیاں بھگتے بھگتے پریشان ہوگئی۔ اتنے میں پاکستان بن گیا اور ابوالاثر نے انہیں کوٹھیوں کو جالندھر کے مہاجر کی حیثیت سے باقاعدہ الاٹ کروا لیا۔ تو پیارے تُو ابوالاثر کے غم میں اتنا نہ رو۔ زندگی آسانی سے گزار۔ یہ اگر کسی سے مخلص نہیں تو ان کا بھی دنیا میں کون ہے مگر مجھ پر یقین کر میں ان کی ساری برائیوں کو ایک طرف رکھ کر دل سے ان کا عقیدت مند ہوں۔''



## دفتر کے ساتھی

جمال، مفتی اور بیدل ابوالاثر کے حاشیہ نشین اور تابعدار تھے مگر سیکریٹریٹ میں انہیں سب حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی کسی باقاعدہ سروس کا آدمی نہ تھا۔ منہ پر کوئی کچھ نہ کہتا کیونکہ سیکریٹریٹ میں منہ پر کچھ کہنے کا رواج ہی نہیں مگر پیٹھ پیچھے سب ان کی برائیاں کرتے اور کسی بات میں تعاون نہ کرتے تھے۔ سارا محکمہ ایک ابوالاثر کے کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ نہ کلرک، نہ ٹائپ رائٹر، نہ چپڑاسی اور ایسے دفتر کو کون دفتر کہہ سکتا ہے۔

جمال سرکاری نوکری کر چکا تھا مگر اسے سرکاری کاموں کی سائنس کا علم نہ تھا۔ اس فن میں ابوالاثر اپنی گونگی انگریزی کی وجہ سے طاق تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دفتر میں کام کرنا یا نہ کرنا برابر ہوتا ہے مگر عمارت، فرنیچر، ٹائپ رائٹر، کلرک، چپڑاسی اور گاڑی کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس کام کی ذمہ داری ابوالاثر نے خود لے لی اور انہوں نے اپنی غلط انگریزی میں جمال کو لمبے لمبے خطوط لکھوانے شروع کر دیئے۔ اس پر دونوں میں چھوٹی چھوٹی رنجشیں پیدا ہونے لگیں۔ جمال بار بار قائداعظم کے حوالے دینے کو پسند نہ کرتا تھا مگر ابوالاثر یہ کہہ کر اسے چپ کرا دیتے کہ جو کچھ میں جانتا ہوں، تم نہیں جانتے اور مفتی اس پر ان کی تائید کرتا۔

مفتی سے ان کی پہلے ملاقات نہ ہوئی تھی مگر وہ اعلیٰ درجے کا نفسیات دان شخص تھا اور مشکل لوگوں کو شیشے میں اتار لینے کا فن جانتا تھا۔ ابوالاثر اس پر بھروسہ کرنے لگے تھے۔ بیدل نے ابھی تک کوئی رانگڑ پن نہ دکھایا تھا۔ شعر وہ عمدہ کہتا تھا اور ہنسی مذاق میں ایسے جملے کہہ جاتا تھا جو تیز ہوتے مگر ان کی ضرب سے کسی کا خون نہ بہتا۔

موہڑہ شریف راولپنڈی کی ایک مشہور زیارت گاہ ہے۔ ابوالاثر نے کہا ''میرے ٹکٹ کا بندوبست کرو۔ مجھے دورے پر جانا ہے، مگر دراصل مجھے کسی دورے وغیرہ پر نہیں جانا موہڑہ شریف کے عرس پر قوالی سننی ہے۔''

''مگر آپ تو کسی پیر فقیر کو نہیں مانتے۔'' جمال نے کہا۔

''کون کسی پیر فقیر کو ماننے چلا ہے۔ میرے پیر تو مسٹر ڈین پیرزادہ ہیں۔ سیکریٹری وزارت اقتصادیات جو ہمارے آقا ہیں۔ وہ موہڑہ شریف کے مرید ہیں اور مجھے ان سے دفتر کے کام نکلوانے ہیں۔

موہڑہ شریف میں ان سے جو کچھ مانگوں گا فوراً مل جائے گا۔''

## وزارت خالی ہو گئی

اگلے روز جمال نے دیکھا کہ پوری وزارت ہی خالی ہے۔ صرف ایک پارسی افسر بیٹھا ہے۔ باقی سب مسٹر ڈین پیرزادہ کے ہمراہ حق کی تجلی دیکھنے کے لیے سرکاری خرچ پر راولپنڈی چلے گئے ہیں۔ ساری وزارت کے باطن ایک دم روشن ہو گئے تھے!

موہڑہ شریف سے لوٹ کر بعض نے داڑھیاں چھوڑ دیں۔ کچھ دفتر کے اوقات میں اذان دینے اور نماز پڑھنے لگے۔ وزارت اقتصادیات میں چاروں طرف نور پھیل گیا۔

مسٹر ڈین پیرزادہ پرانے آئی سی ایس افسر تھے۔ انہوں نے کسی وزیر کے کہنے پر موہڑہ شریف کی بیعت کر لی تھی اور اس بیعت کی برکت سے وہ وقت سے کچھ پہلے ہی سیکریٹری کے عہدے پر پہنچ گئے تھے۔ پھر انہوں نے اپنے افسروں کو تزکیۂ نفس کی تعلیم دینی شروع کر دی۔ قضا و قدرت پر پیر صاحب موہڑہ شریف کے اختیارات کے مشاہدے سن سن کر افسروں کے دل آب آب ہونے لگے۔

خاص طور پر ان کے جن کی ترقیاں رکی ہوئی تھیں یا جو بہتر پوسٹنگ چاہتے تھے۔

عرس کے موقعے پر سبھی نے قصد نیکی کا کیا اور راولپنڈی کے ٹی اے بل بنوا کر موہڑہ شریف جا پہنچے۔

بعد میں ابوالاثر نے بتایا کہ موہڑہ شریف کے مریدوں کے ہجوم میں ایک کونہ مسٹر ڈین پیرزادہ کے لیے مخصوص ہوا۔ انہیں صاحب مزار کی طرف سے سبز پگڑی باندھی گئی اور ایک لمبی عبا پہنائی گئی جو ان کی قبولیت کی شہادت تھی۔

باقی افسر بھی عقیدت کے مارے انہیں جھرمٹ میں لیے رہے کہ اگر اوپر سے تجلی پڑے تو شاید اس کی کوئی کرن ان کے دل کو بھی منور کر جائے۔ قوالی کی مجلس میں بھی وہ مسٹر ڈین پیرزادہ سے چپکے رہے اور جب کسی شعر پر ان کی آنکھیں احساسِ ندامت سے بھر آتیں تو ان کے افسر ڈھاریں مار مار کر رونے لگے۔ بہتوں کی خطائیں تو فوراً ہی معاف ہو گئیں اور ان کی رکی ہوئی ترقیاں جاری ہو گئیں۔ ابوالاثر کو رونے کی بڑی مشق تھی۔ وہ جب چاہتے اور جہاں چاہتے آنسو بہا سکتے تھے مگر ان کے آنسوؤں کا احساس سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ انہوں نے بھی رومال بار بار گیلا کیا۔ واپس آ کر ابوالاثر نے جمال مفتی اور بیدل کو سارا احوالِ مفصل سنایا اور کہا، جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں۔ اب ہمیں بجٹ کی رقوم، کرسیاں، میزیں، سٹاف اور باقاعدہ دفتر کے دیگر لوازمات جلد مل جائیں گے اور یہ سب موہڑہ شریف کا اعجاز ہے جہاں سے کوئی سائل اگر ڈین پیرزادہ سیکریٹری وزارت اقتصادیات ہوں تو خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔ انہوں نے بالآخر راز کی بات بھی بتا دی اور وہ یہ کہ میں یہ سب کھکھڑیں تم جیسے بھوکے ننگوں کے لیے اٹھا رہا ہوں جنہیں کوئی ایک منٹ کے



لیے بھی پاس بٹھانے کو راضی نہ ہوگا مگر میرے دل میں خدا نے رحم ڈالا ہے تو ڈالا ہے۔

## گنوار افسر

ایک روز ابوالاثر نے یاد دہانی کے لیے ڈپٹی سیکریٹری کو چٹھی لکھوانے کا فیصلہ کیا تو چپڑاسی غائب تھا اور ٹائپنگ روم سے ٹائپ مشین اٹھا کر لانے والا کوئی نہ تھا۔ جمال لپک کر گیا اور مشین خود اٹھا لایا۔ اس پر وزارت میں قیامت مچ گئی۔ ایک سے ایک افسر چائے کا پیالہ میز پر چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آیا اور ایک کلاس ون افسر کو چپڑاسی کا کام کرتے دیکھ کر شرم سے زمین میں گڑ گیا۔ پھر منسٹری کے سارے کلاس ون افسروں کی میٹنگ ہوئی جس میں قرارداد پاس ہوئی کہ آئندہ کوئی باہر کا شخص منسٹری میں کلاس ون افسر مقرر نہ کیا جائے اور اگر کوئی مجبوری ہو تو پہلے ایک ماہ تک اسے کلاس ون افسری کے آداب سکھائے جائیں۔ یہ بھی طے ہوا کہ محکمۂ ویلیج ایڈ کے چاروں افسر چونکہ آدابِ خسروی سے ناآشنا ہیں۔ وفاقی حکومت کے وقار کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں، اس لیے اس محکمے کو سیکریٹریٹ کی بلڈنگ میں سے باہر نکال دیا جائے۔

اور یوں فائل پر فائل چلنے لگی۔

ابوالاثر پہلے ہی یہ چاہتے تھے اور وہ نظام کو خوب سمجھتے تھے۔ جمال کو بلا کر بولے ''تم حرکتی آدمی ہو اور میں نے تمہیں رکھا بھی اسی لیے ہے کہ دفتر قائم کرنے میں تم میرا ہاتھ بٹاؤ گے۔ اس لیے آج ہی کہیں سے دو تین میراثی پکڑ لاؤ۔ تمہیں ان غریبوں کے بارے میں بھی کچھ سوچنا چاہیے۔ وہ بھی آرٹسٹ ہیں اور ہمارے بھائی ہیں۔''

''میراثی یعنی چہ؟'' جمال نے پوچھا۔

''میرا مطلب ہے ایک طبلے والا ہو، ایک ہارمونیم بجانے والا اور ایک ستار نواز۔''

''فی الحال یہی کافی ہوں گے۔''

''مگر یہاں ان سے کیا کام لیا جائے گا؟'' بیدل نے پوچھا۔ ''پھر نہ بجٹ نہ گرانٹ۔''

## تین میراثی

''لو بھائی مفتی تم اس کا جواب دو۔'' ابوالاثر صاحب نے اسے مخاطب کیا۔ ''تم تو جانتے ہو کہ گورنمنٹ پر خرچ ڈال دو تو پھر دو ایک جواب طلبیوں کے بعد بجٹ مل جاتا ہے۔ نوکریاں مستقل ہو جاتی ہیں اس طرح۔ پہلے کچی اور عارضی پھر پکی اور مستقل۔ لطف یہ ہے کہ پبلک سروس کمیشن میں کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا جو طبلے کے توڑے تروٹ کو سمجھتا ہو۔ ہارمونیم کی چوتھی اور پانچویں کالی کے فرق کو جانتا ہو یا ستار کی مینڈ اور جھالے کی باریکیاں جانتا ہو۔ ہمارے امیدوار تو بلا مقابلہ ہی کامیاب ہو جائیں گے۔ خصوصاً اس لیے کہ کمیشن میں وزارت کی نمائندگی بھی مجھ ہی کو کرنی ہوگی۔ تو جمال تمہارا کمال یہ ہے کہ آج کل میں تین میراثی کسی طرح پیدا کرو۔''

"مگر کیا یہاں طبلہ بجے گا، ہارمونیم کا الاپ ہوگا، ستار کے نغمے گونجیں گے۔ کس طرح جناب عالی؟" بیدل نے پوچھا۔

"تم بھی رانگڑ کے رانگڑ ہی رہے یعنی بے وقوف کے وقوف! کیا ہمیں ولیج ایڈ کی پبلسٹی نہیں کرنی؟ گیت نہیں بنانے؟ بڑھا دو کھیت کی پیداوار لونگ کا لشکارا دیکھ کر۔ بھئی کوئی حسین جٹی ناک میں لونگ پہن کر اپنے آدمی کو دوپہر کے وقت لسی اور چپڑی روٹی کی چنگیر لا کر دے گی تو کیا دوسرے کسان اس کے لونگ کا لشکارا دیکھنے کے لیے تیز ہل نہیں چلائیں گے۔ بڑھ جائے گی پیداوار اس طرح یا نہیں؟ تو برخوردار ہمیں ولیج ایڈ کا منصوبہ چلانا ہے اور ہمیں اسی قسم کے گیت لکھنے ہیں۔ غزل تم بری بھلی کہہ لیتے ہو مگر دیہات کی ترقی کے لیے تمہارا دل اس طرح گداز نہیں جس طرح میرا۔ خیر سیکھ جاؤ گے میرے ساتھ رہے تو اور تم بھی سنو جمال یہ عوامی شعور کی بیداری کا مسئلہ ہے۔ اخبار نویسی نہیں ہے کہ جس کی ٹانگ چاہو کھینچ لو۔"

"جی میں نے تو کبھی کسی کی ٹانگ نہیں کھینچی۔" جمال بولا۔

"اچھا اچھا۔" ابوالاثر نے کہا "اب وقت ضائع نہ کرو اور جو کام تمہیں سونپا گیا ہے، وہ کرو۔ زیادہ سے زیادہ تین دن میں تمہیں دیتا ہوں۔ چوتھے دن ہمیں منسٹری سے باہر اپنا دفتر مل جائے گا۔"

"مگر منسٹری کی بلڈنگ کے باہر کوئی دفتر خالی نہیں جی۔" جمال نے کہا "میں نے ڈپٹی سیکرٹری ایڈمنسٹریشن کاؤس جی کی ساری فائلیں دیکھ لی ہیں۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" ابوالاثر بولے۔ "منسٹری چاہے تو بنی بنائی بلڈنگ زمین میں سے برآمد کر لیتی ہے۔ تم منسٹری کے اختیارات سے واقف نہیں۔ دیکھو میں نے تمہیں تین دن دیئے ہیں۔"

ابوالاثر نے ایک پرچہ "پاکستان سرزمین" کے نام سے مرتب کرنا شروع کر دیا۔ کیا تو جمال نے تھا مگر ابوالاثر نے اسے کہا "کہ میاں تمہیں سرکاری نوکری کرنی ہے تو کامیابی کا ڈھنگ چیل سے سیکھنا چاہیے۔"

## چیل سے سیکھو

"چیل سے کیا مطلب جناب؟" جمال نے حیران ہو کر پوچھا۔

"چیل جب مزے میں ہوتی ہے تو درخت کی شاخ پر بہت زور سے چیختی ہے۔ سب سمجھتے ہیں کہ اس وقت بیچاری بہت مشقت اٹھا رہی ہے۔ تو برخوردار تمہیں مشقت کم اٹھانی چاہیے، مگر چیخنا زیادہ چاہیے۔ سرکاری ملازمت میں کامیابی کا راز یہی ہے۔ ہر وقت روتے رہو اور اپنی مصیبتیں گنواتے رہو۔ ہر وقت کسی نہ کسی کو کسی بات کا الزام دیتے رہو۔ انشاء اللہ میں بہت جلد ہی تمہیں نوکری کے سارے گُر سکھا دوں گا۔ لو اب تم میراثیوں کی تلاش میں جاؤ اور میں اتنے میں چیل کی طرح چیختا اور منسٹری کو پریشان کرتا ہوں۔"

## چوری یاری

جمال نے پرچہ مرتب کر لیا تھا مگر اس کے پاس نہ تو کاغذ تھا اور نہ چھپائی کے پیسے مگر ایک گورنمنٹ



پریس میں اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ کی اوپل کار کے پہیوں کے کیپ بازار میں ملتے نہ تھے مگر جس سرکاری کار پر جمال سندھ گورنمنٹ میں نوکری کے زمانے میں پریس آتا اور سرکاری مواد چھپواتا تھا اس کے وہیل کیپ سلامت تھے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے کہا "صاحب ان کیپوں کی حکومت سندھ کو تو ضرورت نہ ہوگی۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اتروا لوں؟"

جمال نے کہا "جی فاروقی صاحب، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

فاروقی صاحب نے ڈرائیور سے کہا "ارے داد محمد تو صبح سے بھوکا کھڑا ہے۔ چل اوپر جا کر کھانا کھا، یہاں کسی بھوکے آدمی سے ڈیوٹی نہیں لی جا سکتی۔"

داد محمد ڈرائیور کھانے کے لیے فاروقی صاحب کی دوسری منزل میں جہاں ان کا مطبخ تھا، چلا گیا۔

اس کی غیر حاضری میں فاروقی صاحب نے سرکاری گاڑی کے چاروں وہیل کیپ اتروا لیے اور جمال کو بتا دیا۔ یہ ان کی نیک دلی اور شرافت کا ثبوت تھا ورنہ اس کی ضرورت نہ تھی۔

تھوڑی دیر میں داد محمد قریباً روتا ہوا جمال کے پاس آیا اور بولا "صاحب غلطی ہو گیا۔ ہمیں فاروقی صاحب نے حکم دیا، اوپر جا کر کھانا کھا لو۔ ہم کھا لیا۔ پر نیچے آیا تو دیکھا وہیل کیپ چوری ہو گیا ہے۔ سر اب کیا کرے گا۔"

"یہ تو بہت بری بات ہے۔" جمال نے کہا۔ "خیر اب تم لکھ کر مجھے رپورٹ کر دو۔"

تھوڑی دیر میں داد کسی سے رپورٹ لکھوا لایا۔ جمال نے وہ رپورٹ فاروقی صاحب کو بھجوا دی۔ فاروقی صاحب سراسیمہ ہو کر نیچے اترے اور کہنے لگے "میں نے انکوائری کا حکم دے دیا ہے۔ آپ فکر نہ کریں، چور پکڑا جائے گا۔"

یہی جواب جمال نے اپنے محکمے کو بھجوا دیا اور دو چار دن میں بات آئی گئی ہو گئی۔ مطلب یہ کہ اس پریس سے جمال کے ذاتی تعلقات تھے اور چونکہ فاروقی صاحب ایک پارسا شخص تھے اور پریس کی بلڈنگ کے پچھلے دروازے سے گورنمنٹ ہاؤس میں جا کر خواجہ ناظم الدین کے ساتھ نماز پڑھنے کے عادی تھے، اس لیے ان کے بڑے اختیارات تھے۔ کاغذ کے گوداموں، مشینوں کی مرمت، سیاہی کے ڈبوں اور ملازموں کی حاضری کے بارے میں انہیں پوچھنے والا کوئی نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے جمال سے کہا کہ پرچہ ہم چھاپ کر آپ کے اکاؤنٹ میں ڈال دیں گے۔ کاغذ ہمارے پاس بہت پڑا ہے اور آپ کا کام بھی آخر سرکاری کام ہے۔

تو یوں پرچہ مفت چھپنے لگا اور اس پر بیٹھ کر ابوالاثر نے چیل کو چیخنے میں کئی دفعہ مات دی۔ چھپائی خوبصورت اور آرٹ پیپر چمکدار تھا۔ اس کو دیکھ کر مسٹر ڈین پیرزادہ بہت خوش ہوتے اور ولیج ایڈ کے امریکی ایڈوائزر ڈاکٹر گرین نے اس کی کچھ کاپیاں واشنگٹن بھیج دیں یعنی چیل کی چیخ نے سات سمندر پار تک مار کی۔

اس سے فاروقی صاحب کی عزت بڑھی اور جمال کی گڈی بھی خوب چڑھی کہ اپنا کام خوب جانتا ہے۔

## پیا رنگ

پریس میں جمال کا روز کا آنا جانا تھا۔ مزدور بھی اسے پہچانتے اور اس کی عزت کرتے تھے کیونکہ وہ ان سے شفقت سے بات کرتا تھا۔ منگل کو دن کے ایک بجے ریڈیو پاکستان سے پکے گانے نشر ہوتے تو وہ بھی مزدوروں کی ٹولی میں بیٹھ جاتا۔ ایک دن کوئی شخص راگ درگا گا رہا تھا۔ یہ ایک مشکل اور نا آشنا راگنی ہے۔ اچانک ایک مزدور کے منہ سے ایک جوابی تان نکل گئی۔ جمال حیران ہوا۔ اس نے مزدور کو دیکھا۔ وہ کوئی پینتالیس برس کا سوکھا سڑا آدمی تھا جو پیٹیاں اٹھاتا تھا۔ وہ بیچارہ گھبرا گیا اور بولا ''صاحب غلطی ہوگئی۔ بھول گیا کہ سرکار بیٹھی ہے۔''

''مگر تم ہو کون؟'' جمال نے اسے گھور کر پوچھا۔

''کوئی بھی نہیں سرکار۔ میں تو ایک مزدور ہوں۔ آئندہ ایسی حرکت کبھی نہیں ہوگی۔''

''تمہیں راگداری آتی ہے۔ آتی ہے نا؟ کون ہو تم؟''

''جی نہیں۔ جی نہیں سرکار۔''

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''جی یہاں تو مجھے قادر خان کہتے ہیں۔ دیہاڑی دار مزدور ہوں۔ ہندوستان میں میرا نام پیا رنگ تھا۔''

''تو تم راگ جانتے ہو؟''

''نہیں سرکار۔ کچھ دن استاد جھنڈے خان کا شاگرد رہا۔ کچھ عمر استاد ولایت خان کی خدمت میں گزاری مگر اب تو میں فقط ایک مزدور ہوں۔ منگل کے روز یہاں گانا سننے کو آ جاتا ہوں۔ اب نہیں آؤں گا سرکار۔ ایک دفعہ معافی مل جائے۔''

''معافی تو اب نہیں ملے گی۔'' جمال نے ترش روئی سے کہا۔

''نہیں سرکار۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور مشکل سے چالیس روپے ماہوار کماتا ہوں۔ میری نوکری چلی جائے گی۔ میری توبہ۔''

اور یہ کہہ کر اس نے کان پکڑ لیے۔

جمال سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ ایک محنتی آدمی تھا۔ ماتھے پر محراب بھی تھا مگر شکل سے وہ ایک غصیل آدمی لگتا تھا۔ اگرچہ وہ بہت عاجزی سے بات کر رہا تھا۔ جمال نے کہا ''اب تمہاری نوکری تو چھوٹے گی۔''

''نہیں سرکار۔ ایسا ظلم نہ کیجیے۔ مجھے پتہ ہے گانا بجانا گناہ ہے۔''



تمہیں ڈسمس کراتا ہوں۔''

قادر خان نے جمال کے پاؤں پکڑ لیے مگر وہ اسے دھکا دے کر فاروقی صاحب کے کمرے میں گھس گیا اور ان سے کہا ''اس ایک مزدور قادر خان کو آپ فوراً ڈسمس کر دیں۔''

فاروقی صاحب نے ہنس کر پوچھا ''کیا خطا کی اس نے؟ اتنے ناراض آپ کیوں ہیں اس غریب پر؟''

''ناراض نہیں فاروقی صاحب۔'' جمال نے مسکرا کر کہا۔ ''میں اس سے خوش ہوں اس لیے آپ اسے ڈسمس کر دیں۔ ابھی اسی وقت۔''

قادر خان دروازے کے باہر کھڑا تھا۔

تھوڑی دیر میں فاروقی صاحب کا سٹینو آ گیا اور بولا ''صاحب اسے لیٹر دینے کی ضرورت نہیں۔ اسے مزدوری دلوا دی گئی ہے اور زبانی کہہ دیا گیا ہے کہ وہ کل سے نہ آئے۔ وہ دیہاڑی دار مزدور ہے مگر سر وہ پوچھتا ہے کہ میرا قصور کیا ہے۔ سر وہ رو رہا ہے۔''

جمال باہر نکلا تو وہ بدستور کھڑا رو رہا تھا۔ اس نے اس کی طرف دیکھا نہیں۔ اشارہ کیا کہ میرے ساتھ آؤ۔ قادر خان بیچارہ دامن سے آنسو پونچھتا اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ جمال نے اس سے کہا۔ ''تم آگے بیٹھو ڈرائیور کے ساتھ۔''

قادر خان چپ چاپ آگے بیٹھ گیا۔

دفتر پہنچ کر جمال کی کرسی کے سامنے قادر خان تھر تھر کانپتا ہوا کھڑا رہا۔

''بیٹھ جاؤ کرسی پر۔'' جمال نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

## پہلا میراثی

پھر اس نے سٹینو کو بلا کر چٹھی ڈکٹیٹ کروائی کہ قادر خاں کو فوری طور پر ہارمونیم ماسٹر مقرر کیا گیا ہے جس کی تنخواہ الاؤنس ملا کر 215 روپے ماہوار ہوگی۔ اسے حکم دیا جاتا ہے کہ وہ آج ہی ڈیوٹی جوائن کرے۔ وغیرہ وغیرہ۔

پھر اس نے چپڑاسی سے کہا ''قادر خان کے لیے چائے اور بسکٹ لاؤ۔'' وہ اتنے میں جا ابوالاثر سے چٹھی پر دستخط کروا لایا۔

قادر خان حواس باختہ تھا۔ جمال نے ناراض ہو کر اس کی چالیس روپے ماہوار کی مزدوری چھڑوائی۔ پھر اسے کار میں بٹھا کر دفتر لایا، چائے پلائی، بسکٹ کھلائے اور اب اسے 215 روپے ماہوار کی شاہانہ تنخواہ دے رہا ہے اور مزدوری بھی کرنی نہیں بلکہ صرف گانا ہوگا۔

ادھر اسی روز جمال نے اپنے بھائی کو لاہور میں تار دیا کہ خان صاحب عنایت علی خان کو کرایہ دے

کر آج ہی کراچی بھجوادو۔

عنایت خاں غضب کا ستاریا تھا مگر لاہور میں گلی گلی گھوم کر رنگ بیچتا اور یوں بال بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ الاپ میں اس کا کوئی جوڑ نہ تھا مگر پاکستان میں موسیقی کا خانہ خراب تھا اور باکمال لوگ جن پر ہندوستان فخر کرتا تھا، اب گلیوں میں رنگ بیچ رہے تھے۔

عنایت خاں نے بیٹوں کو ستار نہیں سکھائی تھی کہ بھوکے مریں گے۔ قادر خاں کے بیٹے بھی گاتے نہیں تھے، الٹا اسے گالیاں دیتے تھے کہ ہمیں بھوکا مار دیا۔ ان دنوں وہ حیدرآباد میں بیڑی کا کام کرتے تھے اور باپ کو انہوں نے گھر سے نکال دیا تھا کہ تم گانا بجانا نہیں چھوڑتے تو بھاڑ میں جاؤ۔

دو روز کے بعد خان صاحب عنایت خاں اپنا بڑا ستار لے کر تھرڈ کلاس میں سفر کرتا ہوا کراچی پہنچ گیا۔ اسے بھی جمال نے نوکری کا پروانہ دلوا دیا۔

اب ایک طبلے والے کی ضرورت تھی۔ طبلے والے نیپیئر روڈ میں عام مل جاتے تھے کیونکہ پاکستان میں اگرچہ گانے بجانے کو خلاف اسلام سمجھا جاتا تھا مگر مجرے پر کوئی قدغن نہ تھی۔ مجرا بالعموم سندھ کے وڈیرے اور کراچی کے نودولتیے دیکھتے تھے اور ان کو بھی گانے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ جوان لڑکیوں کے ٹھمکے دیکھنے یا جسم خریدنے کے لیے جاتے تھے اور اس پر کسی نظریہ ساز کو کوئی اعتراض نہ تھا۔

تیسرے دن قادر خاں محمود طبلیے کو پکڑ لایا۔

محمود کو کوٹھے پر طبلہ بجانے میں کافی آمدنی ہو جاتی تھی مگر اس کا اصل کاروبار یہ نہ تھا۔ اس کا اصل کاروبار بنگال سے غریب دیہاتی لڑکیوں کو مغربی پاکستان میں نوکری کا جھانسہ دے کر کراچی لانا اور نیپیئر روڈ کے بالاخانوں پر بیچ دینا تھا۔ اس بات کا قادر خاں کو پتہ نہ تھا اور جمال پر بھی یہ بات بہت بعد میں کھلی۔

مگر محمود بہت اچھا طبلیہ تھا، تابعدار تھا، وقت کا پابند تھا اور بہت کم بولتا تھا۔

جب تین دن میں یہ تینوں نابغے جمع ہو گئے تو جمال نے ابوالاثر سے کہا ”حکم کی تعمیل ہو گئی۔ آگے کیا ارشاد ہے۔“

## چیل کی چیخ

ابوالاثر صاحب بولے ”آگے ہمیں چیل کی طرح چیخنا ہے۔ لو میں نے گیت لکھ دیا ہے، بڑھا دو کھیت کی پیداوار قادر خاں سے کہو اسے سیٹ کرے اور اس میں تر وٹیں اور توڑے لگائے۔ سرگم فٹ کرے۔“

دو گھنٹے میں قادر خاں نے گانا تیار کر لیا۔ کڑاں دھادھا دھادھا۔ تٹ کٹ گدگھن دھا۔ بڑھا دو کھیت کی پیداوار۔ آہا جی بڑھا دو۔ بڑھا دو۔ کڑان دھادھا دھادھا۔

ابوالاثر نے کہا ”دفتر کے دروازے کھول دو تا کہ چیل کی چیخ ساری سیکریٹریٹ میں گونجے۔“

تھوڑی دیر میں چیل کی چیخ ساری سیکریٹریٹ میں گونجنے لگی۔ افسر کمروں سے باہر نکل آئے۔



مسٹر ڈین پیرزادہ بھی ادھر کو ہی دیکھنے لگے۔ آج تک وفاقی حکومت کی سیکریٹریٹ میں نہ تو کسی نے طبلہ بجایا تھا نہ تر وٹ اور سرگم کہی تھی۔ افسروں کے رنگ زرد ہو گئے۔ انہوں نے کھڑے کھڑے برآمدے میں میٹنگ کی۔ پھر وفد کی شکل میں جا کر مسٹر ڈین پیرزادہ سے کہا ”سر ابوالاثر اور ان کے محکمے کو نکال دیا جائے کیونکہ ان کا وجود وفاقی حکومت کے وقار پر دھبہ ہے۔“

ابوالاثر اپنے کمرے میں بیٹھے محمود طبلیے سے کھلے ہاتھ کی دھا بجواتے رہے اور برآمدے میں پھٹ پھٹ پھٹاہ پھٹاہ کے شور سے گونجتے رہے۔

چند ہی منٹ میں فیصلہ ہوا کہ ولیج ایڈ کے محکمے کو صدر کے قریب ایک بلڈنگ میں شفٹ کر دیا جائے جو خالی پڑی تھی آج ہی۔

جمال کو ابوالاثر کی بصیرت اور دفتری نظام کے بارے میں ان کے ادراک پر بڑا رشک آیا جو فائل موہڑہ شریف کی بیعت کے باوجود سرے سے نہ چڑھ سکی۔ کھلے ہاتھ کی دھا نے کہیں سے کہیں پہنچا دی۔ پلاننگ کمیشن میں بھی امریکن ایڈ کے افسروں کے سامنے کوئی کھلے ہاتھ کی دھا بجا دیتا تو پاکستان کبھی اس حال کو نہ پہنچتا۔

## گلشن کا کاروبار

نئی بلڈنگ میں دفتر قائم کر لینے کے باوجود جمال اور ابوالاثر کو وزارت اقتصادیات کی میٹنگوں میں حاضری دینی پڑتی تھی اور کام میٹنگوں ہی تک محدود تھا۔ ملک کے اقتصادی حقائق کا کسی کو پتہ نہ تھا۔ مگر رپورٹیں آتیں اور ہدایات جاتی تھیں۔ جو دوسرے دفتروں میں، دوسرے لوگ، دوسری میزوں پر بیٹھ کر دوسرے لوگوں کی راہنمائی کے لیے لکھ دیتے تھے۔ پھر ان پر تنقید اور ملاحظے کے لیے دوسرے ماہرین بیٹھتے تھے جنہوں نے غلطیاں کی تھیں، انہیں مزید غلطیاں کرنے کی مہلت دی جاتی۔

امریکی قرضوں کی لہر تازہ تازہ اٹھی تھی۔ وزارت میں لوگ انہیں یو ایس ایڈ کے پیارے نام سے یاد کرتے تھے اور اس سلسلے میں بڑے جذباتی تھے۔ ایڈ دراصل ایگری کلچرل اینڈ انڈسٹریل ڈویلپمنٹ کا مخفف تھا یعنی اے آئی ڈی۔ اسے یار لوگ ایڈ پڑھتے تھے جس کا اردو ترجمہ امداد ہوا اور پاکستان میں یہ تاثر پھیلا دیا گیا کہ امریکہ ہماری فی سبیل اللہ امداد کر رہا ہے۔ اس فلسفے سے لوٹ مار مچی اور منصوبے غیر سنجیدہ ہو گئے۔ حالانکہ یہ ایڈ نہ تھی سودی قرضہ تھا جو اس لیے دیا گیا تھا کہ جنگ کا بچا ہوا بیکار امریکی مال ہم غریب ملکوں کے ہاتھ بیچ کر دام کھرے کر لیے جائیں اور اپنی منڈیاں مستحکم کر لی جائیں۔

امریکہ نے ایڈ کے استعمال کے لیے اپنے ایڈوائزر بھی بھیج رکھے تھے جو ہمیں بتاتے تھے کہ ہمارے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ پاکستان کے ایڈوائزر ڈاکٹر گرین نے ایک میٹنگ میں کہا کہ پاکستانی کسانوں کو ایسی فصلیں اُگانی جائیں جن سے زر نقد ان کے ہاتھ آئے۔ مثلاً ہلدی کاشت کریں۔ ان دنوں پاکستان میں

گندم کا توڑا تھا۔ جمال نے جو اپنی حماقت کی وجہ سے چپ نہ رہ سکتا تھا میٹنگ میں کہہ دیا کہ ہمیں زرنقد کی فصلوں سے کہیں زیادہ گندم کی پیداوار بڑھانے کی ضرورت ہے۔

مسٹر ڈین پیرزادہ صاحب جو صدارت کر رہے تھے، چمک کر بولے ''مسٹر جمال تم ذرا کم بولا کرو، بکواس نہ کیا کرو۔ ڈاکٹر گرین ناراض ہو گیا تو ہماری امداد بند ہو جائے گی۔''

ڈاکٹر گرین مشفقانہ انداز میں بولے ''نوجوان ذرا جوشیلے ہوتے ہیں اور یہ نئے ملک کے لیے ایک خوش آئند بات ہے۔ آہستہ آہستہ یہ بھی سمجھ جائے گا کہ کسان کو اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے زرنقد کی ضرورت ہے۔ پاکستان کو سڑکوں، پلوں، ٹریکٹروں اور ٹرانسسٹروں کی بھی شدید ضرورت ہے تاکہ کسان اپنا مال منڈیوں تک آسانی سے پہنچا سکے۔''

جمال نے اردو میں بکواس کی ''مگر سر ہم کھائیں گے کہاں سے۔ گندم کے بغیر تو ہمارا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ ٹرانسسٹر ریڈیو کے بغیر تو ہم جی لیں گے۔''

مسٹر ڈین پیرزادہ نے مسکرا کر ڈاکٹر گرین سے کہا ''نوجوان کی تسلی نہیں ہوئی۔ حالانکہ اسے بتا دیا گیا ہے کہ گندم ہمارا عظیم دوست امریکہ ہمیں دیتا رہے گا نا۔''

''ہاں۔ امریکہ آپ کو گندم کی کمی محسوس نہ ہونے دے گا۔'' ڈاکٹر گرین نے خوشدلی سے کہا۔

اصل بات یہ تھی کہ امریکہ کو اپنی فالتو گندم، انڈے، دودھ اور سور جلانے یا سمندر میں پھینکنے پڑتے تھے اور اس پر خرچ آتا تھا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ پاکستان جیسے بھوکے ملک اس کی گندم خرید لیں اور ادائیگی کے لیے نقد آور فصلیں کاشت کریں اور یوں بیکار مال منافع پر بک جائے۔

وزارت اقتصادیات کے افسر بے وقوف نہ تھے۔ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے مگر مسٹر ڈین پیرزادہ کے موڈ کے مطابق چپ رہتے تھے۔ سیکریٹری صاحب کا موڈ ہمیشہ حکومت پاکستان کی پالیسی کے مترادف ہوتا ہے اور سیکریٹری صاحب یعنی حکومتِ پاکستان کی پالیسی یہ تھی کہ کوئی کام کیے بغیر ڈالر کے خزینے ہاتھ لگیں۔ ترقی کے نام پر اخراجات اور بجٹ بڑھائے جائیں۔ محکمے بڑے ہو جائیں۔ نئی پوسٹیں نکلیں اور ان کے عہدے بڑے ہو جائیں۔ اس ساری پالیسی میں افسروں، بڑے زمینداروں اور ابھرتے ہوئے سرمایہ داروں کا مفاد تھا۔ خود کفالتی کی بات کرنا غیر ذمہ داری اور وطن دشمنی کی بات تھی اور سیکریٹری صاحب کی بات سے اختلاف کرنا حکومت پاکستان کی مخالفت کے مترادف تھا اور حکومت کی مخالفت کا مطلب تھا ریاست سے غداری۔ یہ بات جمال بے وقت بول بول کر اور جھاڑیں کھا کھا کر بڑی دیر میں سمجھا۔



## باب 23

نئے دفتر میں کام کھلے ہاتھ کی دھا بجانے سے شروع ہوا مگر اب اس محکمے کے پھیلاؤ کا مسئلہ تھا۔ تین آدمیوں میں سے تو کوئی محکمہ، محکمہ نہیں کہلایا جا سکتا۔ ابوالاثر نے جمال سے کہا کہ تم محکمے کے لیے آسامیاں نکالو، بجٹ بناؤ اور وزارت کو نوٹ لکھو کہ ہم کام کر کر کے مر رہے ہیں، ہمیں مزید آدمیوں کی ضرورت ہے۔

بیدل کو انہوں نے پرچے کی ادارت سونپی۔ مفتی کے پاس ابھی کوئی کام نہیں تھا۔ اسے انہوں نے مصاحبت کے لیے اپنے کمرے میں بٹھا لیا۔

مفتی مزاج شناس آدمی تھا۔ اس نے ابوالاثر کی ہاں میں ہاں ملا کر اور ان کی عظمت کے ترانے گا گا کر انہیں اپنا مرید بنا لیا۔ وہ منافق نہیں تھا۔ اسے ابوالاثر سے کچھ مطلب بھی نہیں تھا۔ اس کی طبیعت ہی ایسی تھی۔ وہ جس شخص سے گہری محبت نہ کرتا اس سے کبھی اختلاف نہ کرتا اور ابوالاثر سے اسے گہری محبت نہ تھی۔

محکمے کو جمال اور بیدل پر چھوڑ کر ابوالاثر شاہنامۂ اسلام اور تاریخ افواج پاکستان منظوم کرنے میں لگ گئے۔

مفتی زندگی سے بہت مطمئن تھا۔ ایک تو اس کا افسر اس کا دوست جمال تھا جو چوہڑے کی طرح کام میں لگا رہتا یا بیدل اور مفتی کی خوشامد کرتا رہتا جو اس کے جگری یار تھے۔ ابوالاثر رائٹر ہونے کے ناطے بیدل سے کچھ زیادہ ہی خوش تھے۔ مفتی ان کا درباری تھا اور جمال ان کا کارندہ۔

### گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوئی

ایک روز جمال کو کہیں شراب پینے جانا تھا۔ اس نے سوچا بیوی کو اطلاع کر دوں شاید واپسی میں دیر ہو جائے۔ ٹیلی فون پر اس نے سارا پروگرام اپنی بیوی کو بتا دیا۔ جواب میں وہ ایک لفظ بھی نہ بولی۔ شاید بولنے کی کوئی بات بھی نہ تھی۔

تھوڑی دیر میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور آواز آئی۔

''زیادہ نہ پینا اور جلدی گھر آ جانا۔''

مگر یہ آواز اس کی بیوی مودی کی تو نہ تھی۔ جمال نے کہا ''جی۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔''

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ اس کا قہقہہ بڑا ذائقے دار تھا۔

''آپ کون ہیں محترمہ۔ شاید کہیں غلط نمبر لگ گیا ہے۔'' جمال نے کہا۔

''نمبر تو صحیح لگا ہے۔'' وہ بولی۔

''مگر آپ ہیں کون؟''

''ہیں کوئی آپ کے چاہنے والے۔''

''محترمہ یہ سرکاری دفتر ہے۔'' جمال نے کہا۔ ''آپ مجھے تنگ نہ کریں۔''

وہ پھر ہنسی اور ٹیلی فون بند کر کے چلی گئی مگر دو چار منٹ کے بعد اس نے پھر ٹیلی فون کیا۔ جمال ایک ضروری نوٹ لکھ رہا تھا۔ اس نے کہا ''محترمہ مجھے تنگ نہ کریں۔ میں مصروف بہت ہوں۔ کچھ خیال کیجیے۔''

''یہ کیسی مصروفیت ہے جو ہم سے بات کرنا بھی نہیں چاہتے۔ ہمیں آپ کا خیال ہے تو ٹیلی فون کر رہے ہیں نا۔''

جمال نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

تھوڑی دیر میں پھر گھنٹی بجی اور وہ بولی ''اللہ اب ایسی بے رخی بھی کیا؟''

''میرا جان چھوڑتی ہو کہ نہیں۔ تم ہو کون؟''

''جان تو ہماری آپ نے لے لی۔ اللہ آزاد کر دیجیے نا۔''

''دفع ہو جاؤ۔ مجھے کام کرنے دو۔'' یہ کہہ کر جمال نے پھر ٹیلی فون رکھ دیا۔

مگر وہ ارادہ بند خاتون تھی۔ تھوڑی دیر بعد گھنٹی پھر بجی۔ جمال نے فون اٹھاتے ہی کہا ''تم بڑی حرامزادی ہو۔ کتے کی بچی ہو۔ تمہاری ماں کی، تمہاری بہن کی......''

''کیا ہوا کیا ہوا۔'' ادھر سے جمال کی بیوی کی آواز آئی۔ ''پاگل تو نہیں ہو گئے تم۔ کیسی گندی گالیاں بک رہے ہو۔ شرم نہیں آتی۔''

''ارے یار یہ تم ہو؟'' جمال شرمندہ ہو کر بولا۔ ''ایک حرامزادی مجھے بڑی دیر سے تنگ کر رہی تھی۔''

''نام تو پوچھ لیا ہوتا۔'' مودی بولی۔ ''بس فون اٹھا کر گالیاں بکنے لگے۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ تمہیں اتنی گندی گالیاں آتی ہیں۔ تم میرے خاوند نہ ہوتے تو ایمان سے مجھے بھی اچھے لگتے اور میں بھی تمہیں ٹیلی فون پر خوب ستاتی۔''

''اب وہ ٹیلی فون نہ کرے گی انشاءاللہ۔'' جمال بولا۔ ''کہنا یہ تھا کہ شام کو میں ذرا لیٹ آؤں گا اور کھانا کھا کر آؤں گا۔ اچھا۔''

تھوڑی دیر بعد ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی۔ ''توبہ ہے اتنی لمبی بات کرتے ہو تم۔'' وہی لڑکی بولی۔

''کون تھی وہ؟''

جمال کے ہاتھ پیر ڈھیلے ہو گئے اور وہ روہانسا ہو کر بولا ''میری جان چھوڑ دو پلیز۔''



''اچھا اچھا مگر اتنا تو بتا دو کہ وہ کون تھی؟''

''تمہیں کیسے پتہ کہ وہ تھی اور کوئی تھا نہیں تھا۔''

''کوئی ہو گی تمہاری زخم خوردہ۔ لمبی فریاد کرتی ہو گی۔''

''ارے وہ میری بیوی تھی۔''

''ارے بیویوں سے کون بات کرتا ہے اتنی لمبی؟''

''اچھا اب تم دفع ہو جاؤ۔''

''اتنا اور بتا دو کہ وہ کیسی ہے۔ کیا بہت خوبصورت ہے؟ گوری چٹی ہے؟ دبلی پتلی ہے؟''

''تم تو کوئی کتی کی بچی ہو۔ کنجری لگتی ہو، کوئی بے شرم۔''

''میں واری جاؤں۔ کتنے شیریں ہیں تیرے لب مگر چکھوں تو پتہ لگے۔''

''تمہاری ماں کی، تمہاری بہن کی، تم۔ تم۔''

جمال اول فول بکنے لگا۔ پنجابی کی جتنی گالیاں اس نے بچپن سے اب تک سنی تھیں۔ اس نے فرفر اسے سنا دیں اور پھر ٹیلی فون کا چونگا میز پر رکھ دیا۔

بیدل نے کہا ''اے کاش ہمیں بھی کوئی تمہاری طرح ستائے۔ مگر یہ ہے کون؟''

''مجھے کیا پتہ۔'' جمال نے جل کر کہا۔

''ضرور تمہیں جانتی ہو گی۔''

''پتہ نہیں مگر یار بڑی بے شرم ہے۔ اتنی گندی گالیاں میں نے اسے دیں!''

''تم نے غلط کیا۔'' بیدل نے کہا۔ ''یہ شرافت کی بات نہیں۔ آئندہ احتیاط کرنا۔ اچھا! مگر اب وہ شاید فون نہ کرے۔''

اگلی صبح جمال آ کر کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ جمال اسے گندی گالیاں دے چکا تھا۔ اس کی منت کر چکا تھا۔ اب بے بس تھا۔ اس نے کہا ''پلیز مجھ پر مہربانی کرو۔ اتنا بتا دو کہ تم ہو کون؟''

''یہ تو میں کبھی نہ بتاؤں۔'' وہ بولی۔

''کیا تم مجھے جانتی ہو۔ کہیں دیکھا ہے مجھے؟''

''کچھ کچھ!'' اس نے کہا۔

''کیا چاہتی ہو؟ میں کیا کروں تمہارے لیے؟''

''صلح کر لو ہم سے کچھ کچھ!''

''اچھا صلح کچھ کچھ بی بی اور کہو۔''

''اور میری ایک سہیلی ہے بہت پیاری۔ اس سے ذرا بات کر لو۔''

"کیا بات کروں۔"

"وہی جو مجھ سے کی تم نے۔"

"تم سے میں نے کون سی بات کی۔"

"گالیاں نہیں دیں مجھے؟ اتنے لذیذ وعدے تم نے کر دیئے مجھ سے۔ خواب دکھا دیئے۔ کیا گالیاں اتنی میٹھی بھی ہو سکتی ہیں؟ میں فون اسے دیتی ہوں۔ گالیاں کھانے کو اس کا دل بھی للچا رہا ہے۔"

جمال کو اس عجیب بات چیت میں کچھ کچھ مزہ آنے لگا تھا۔ اس نے کہا "مگر تم وعدہ کرو کہ پھر مجھے تنگ نہ کرو گی۔"

"فون تو میں تمہیں ضرور کروں گی۔۔ جب تمہیں فرصت ہو۔ وقت تم مقرر کر دو۔"

پھر اس نے چونگا اپنی سہیلی کے ہاتھ میں دے دیا۔ جمال نے اس کو بھی بے نقط سنائیں جن میں اس کے ساتھ قریبی تعلقات کے بہت سے وعدے شامل تھے۔

گالیاں سن کر وہ ہنستی رہی۔

پھر پہلی لڑکی نے کہا "بہت بہت شکریہ۔ اب کل بارہ بجے تک تمہیں فرصت ہے۔"

اگلے روز بارہ بجے سے پہلے ہی اس نے بیدل کو بلا کر پاس بٹھا لیا اور دونوں ٹیلی فون کا انتظار کرنے لگے۔

ٹھیک بارہ بجے گھنٹی بجی۔ اس نے کہا "فرصت ہو گئی یا نہیں؟"

"ہاں۔ کہو۔"

"کل میں تمہارے دفتر کے سامنے کھڑی تھی۔ جب تم گھر جانے کو نکلے مگر تم عجیب ہونق آدمی ہو۔ لڑکیاں دیکھنے کا شوق ہی نہیں تمہیں۔ حالانکہ میں نے قہقہہ لگا کر تمہیں متوجہ بھی کیا تھا۔ تمہارے ساتھ کون تھا؟"

"میرا یار بیدل بہت کمال کا شاعر ہے۔"

"اسے کہو مجھ پر بھی کوئی غزل لکھ دے۔"

"تم سے عشق کرے گا تو لکھے گا ضرور۔"

"میں تو تم سے عشق کرنا چاہتی ہوں۔ اسے کہو وہ میری سہیلی سے عشق کر لے۔ آج کل خالی ہے۔ منڈیر پر بیٹھے کوے اڑاتی ہے۔ ایمان سے بڑے مزے کی لڑکی ہے۔"

تھوڑی دیر میں وہ آپس میں کھسر پھسر کرتی رہیں۔ پھر وہ بولی "اپنے یار سے کہو کہ میری سہیلی سے بات کرے۔"

"مگر وہ گالیاں نہیں دے سکتا۔ بڑا شریف آدمی ہے۔"



"شریف آدمی ہے تو کس کام کا۔ خیر تم ٹیلی فون تو دو اس کو۔"

## شریف آدمی

جمال نے ٹیلی فون بیدل کو پکڑا دیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا مگر اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

بیدل نے بڑے ادب سے سلام کیا۔ پھر قاعدے سلیقے سے لڑکی سے بات کرنے لگا۔ جیسے خواب میں کسی پری زاد سے ہم کلام ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد پہلی نے جمال سے کہا "یہ تمہارا یار تو بڑا تمیزدار ہے۔ میری سہیلی ڈر گئی ہے۔ مزہ نہ آیا بالکل۔"

"مزے کے لیے میں جو ہوں۔" جمال نے کہا۔

"تم تو میرے مزے کے لیے ہو۔ میری سہیلی کیا کرے بیچاری؟"

"تو میں تمہاری خاطر اسے بھی گالیاں دے دیا کروں گا۔"

"تم اپنے یار کو کیوں نہیں سکھا دیتے دو چار۔ وہ دو چار ہی میں گزارہ کر لے گی۔"

"وہ نہیں سیکھتا گالیاں۔" جمال نے کہا۔

"سچ سچ! اگر میری سہیلی کو تمہارا یار برا نہیں لگا۔ صورت بھی اس کی بری نہیں مگر تم جیسا غنڈہ نہیں، وہ بھی چلے گا۔"

"بکواس مت کرو۔"

"تم غنڈے ہو مگر مزے کے ہو۔ میں نے تمہیں اچھی طرح دیکھا ہے ایمان سے۔"

"میں نے تمہیں نہیں دیکھا نا۔ نام تو بتا دو۔"

"کبھی نہیں۔ نام کبھی نہیں بتاؤں گی۔ مجھے مس ٹیلی فون کہہ لیا کرو۔"

"اور تمہاری سہیلی کو کیا کہوں؟"

"یہ بیدل کا اور اس کا معاملہ ہے۔"

"اچھا مس ٹیلی فون۔ کل تک کے لیے خدا حافظ۔"

اگلے روز بیدل ہنستا ہوا جمال کے کمرے میں آیا اور کہنے لگا "یار اس نے مجھے خود ہی فون کر دیا۔"

"اور کیا کہتی تھی؟"

"یار وہ بڑی شائستہ لڑکی ہے۔ کہتی تھی میں نے تمہارا کلام پڑھا ہے۔ بڑی تعریف کرتی تھی اور میرے کچھ شعر بھی سنا دیئے اس نے۔"

"کمال ہے۔" جمال بولا۔

"پر مجھے تم سے خطرہ ہے جمال۔" بیدل نے کہا۔ "مجھے چھوڑ کر وہ تمہارے پیچھے لگ جائے گی ایک

دن ۔لڑکیاں تمہیں بہت پسند کرتی ہیں ۔تمہاری شخصیت میں سحر ہے ۔''

''بکواس کرتے ہو بیدل ۔یہ کبھی ہو نہیں سکتا۔''

''تم وعدہ کرو میرے ساتھ ۔''

''کیسی فضول باتیں کرتے ہو۔''

''مگر تم وعدہ کرو کہ تم اسے مجھ سے کبھی نہیں چھینو گے ۔''

''بیدل ۔ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔''

اس پر بیدل کی کچھ تسلی ہوگئی ۔ جمال کو اس کی بات بچوں کی سی لگی مگر بیدل نے کبھی کسی لڑکی سے کھل کر بات نہ کی تھی اور کسی لڑکی نے براہِ راست اس کی تعریف بھی نہ کی تھی ۔ اس کو اپنے آپ پر یقین نہیں تھا۔

دونوں لڑکیاں دونوں کو دن کے ٹھیک بارہ بجے فون کرنے لگیں اور ان میں خاصی بے تکلفی ہوگئی ۔

بیدل نے اپنی والی کا نام چاند رکھ دیا۔

ایک دن بیدل نے کہا''آج میں نے دونوں کو دفتر میں بلایا ہے، ٹھیک دو بجے ۔''

ٹھیک دو بجے دونوں دفتر میں آ گئیں ۔ مس ٹیلی فون موٹی تھی ۔ رنگ گورا مگر چہرے پر ہلکے ہلکے چیچک کے داغ عمر کوئی پچیس برس ۔ چاند دبلی پتلی ، نین نقش کی تیکھی ، سانولی ، نمکین اور عمر میں مس ٹیلی فون سے کم ۔

دونوں بیدل کو چھیڑتی رہیں ۔ کبھی وہ سرخ ہو جاتا، کبھی زرد اور کبھی اس کے چہرے پر چاند نکل آتا۔

انہوں نے اپنے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا۔

تھوڑی دیر بعد وہ رخصت ہونے لگیں تو بیدل نے بڑی مشکل سے چاند کے گالوں کو ہاتھ لگایا۔

''مجھے بھی چھیڑو۔''مس ٹیلی فون بولی ۔

''تم جمال سے کہو۔''بیدل نے کہا۔

''جمال کے ہاتھ بہت ٹھنڈے ہیں ۔تم ہی لگا دو نا۔''وہ لاڈ سے بولی اور اس نے اپنا گال آگے بڑھا دیا۔ بیدل نے اس پر ایک ہلکی سی چٹکی لے لی ۔اس نے منہ کھول کر آہ بھری ۔

جب وہ چلی گئیں تو بیدل نے کہا''میرے دل میں آیا کہ میں اسے چوم لوں ۔''

''کون سی والی کو؟''جمال نے پوچھا۔

''چاند کو۔ وہ مجھے لوٹ کر چلی گئی ۔اس کی آنکھیں بھنورا سی کالی اور مچھلی کی طرح لمبوتری ہیں ، جسم کے قافیے بھی چست ۔تمہیں کیسی لگی؟''

''اچھی ہے ۔''جمال نے کہا۔



''خیر اتنی اچھی بھی نہیں ۔''بیدل نے سنبھل کر کہا۔

''موٹی کے بارے میں کیا خیال ہے ۔''

''ذرا کم کھائے تو اچھی لگے ۔''

پھر دونوں ہنسنے لگے ۔

کچھ دنوں میں چاند کا سلسلہ بیدل سے جاری ہو گیا۔ اس نے اس کے لیے بے شمار غزلیں لکھیں ۔ وہ دن رات آہیں بھرنے اور دفتر میں بیٹھ کر رونے لگا۔

## دفتر سہانا

اب دفتر میں تین افسر تھے ۔ جمال، بیدل اور مفتی اور تینوں آپس میں پکے دوست تھے ۔ ابوالاثر کو جب اپنے ماتحتوں کی گہری وفاداریوں کا علم ہوا تو وہ کسی قدر چڑ گئے ۔ وہ تینوں میں پھوٹ ڈالنے میں ناکام ہو چکے تھے ۔ بطور افسرِ اعلیٰ ان کو اپنی ناکامی کا بہت رنج تھا۔ دفتروں میں افسرِ اعلیٰ کے اشارے پر پھوٹ پڑ جاتی ہے مگر یہاں تینوں ماتحت متحد تھے ۔

دفتر میں کرنے کا کوئی کام نہ تھا۔ نوٹ لکھے جاتے تھے جو جمال کی ڈیوٹی تھی ۔ منصوبے بنتے تھے جو ابوالاثر کی قائد اعظم سے کیے ہوئے وعدوں کی داستان ہوتے تھے ۔ بجٹ پیش ہوتے تھے ۔ فائلیں موٹی ہوتی جا رہی تھیں ۔ دفتر چل نکلا تھا اور وزارتِ اقتصادیات کے سیکریٹری ڈین پیرزادہ اور امریکی ایڈوائزر ڈاکٹر گرین اس پر بہت خوش تھے ۔

ابوالاثر اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہ سکتے تھے ۔ کچھ کرنے کے اختیارات اسسٹنٹ سیکریٹری کے پاس ہوتے تھے جو ڈپٹی سیکریٹری کی مرضی کا پابند ہوتا تھا جسے جوائنٹ سیکریٹری کا موڈ دیکھنا پڑتا تھا جس پر سیکریٹری نگران تھا جس کی راہنما حکومت پاکستان کی پالیسی تھی جو امریکی ماہرین مرتب کرتے تھے ۔

جمال کو کلاسیکل راگ سے عشق تھا۔ وہ دفتر میں بیٹھ کر قادر خاں، عنایت خاں ستار نواز اور محمود طبلیے سے دن بھر راگ سنتا۔

طبلے کی آواز سن کر ابوالاثر کو اپنی سانگ پبلسٹی کا زمانہ یاد آ جاتا اور وہ گنگنانے لگتے''میں تو چھورے کو بھرتی کرائی آئی رے ۔ یہ اڑوس پڑوس جیسے جو کہے''اور اس گیت کو وہ کبھی درباری میں اور کبھی ملہار میں مرتب بتاتے ۔ بیدل غزل سناتا۔ مفتی اپنے بے مثل نفسیاتی تجزیوں سے سب کا جی بہلاتا۔ دوپہر کے وقت تینوں مل کر جارج کیفے ٹیریا میں تلی ہوئی پامفریٹ مچھلی، نان اور نسرواں جی کی جنجر کا لطف اٹھاتے ۔ زندگی بہت خوشگوار تھی ۔ اس کے باوجود کہ بیدل چاند سے عشق میں سنجیدہ ہو کر دفتر میں روتا اور سب کو پریشان کیا کرتا۔

## چاند اور چکوری

چاند بہت چنچل اور ہوشیار لڑکی تھی ۔ اسے پتہ تھا کہ عاشقوں کو محروم رکھنے میں زیادہ فائدہ ہوتا ہے ۔

اس نے اپنے بال کٹوا کر چھوٹے کروا لیے۔ اپنی کالی آنکھوں میں کاجل کی تحریر کچھ اور لمبی کر لی۔ قمیص چست کر لی تو اس کے سینے پر جنگلی کبوتروں کے گھونسلے صاف نظر آنے لگے۔

وہ بیدل سے شادی کرنا نہ چاہتی تھی کیونکہ وہ پہلے سے شادی شدہ تھی اور بیدل اس راز سے واقف تھا۔ اس کو اس لڑکی سے دکھ اور درد مطلوب تھا اور اس میں چاند نے کبھی ہاتھ تنگ نہ رکھا۔ وہ اس کی نصف تنخواہ کھا جاتی۔ اس سے گھر کے کام کرواتی۔ سامان منگواتی اور طرح طرح کے ناجائز فائدے اٹھاتی۔ اس نے بیدل سے اپنے خاوند کی ملاقات بھی کروادی تھی اور غالباً وہ بیدل کے عشق سے بے خبر نہ تھا مگر بیدل کی ذات سے دونوں میاں بیوی کو جو فائدے پہنچے تھے، ان کے گھر کے سکون کو خراب نہ ہونے دیتے تھے۔

## وصال یار

جمال اور مفتی نے سوچا کہ کسی طرح ایک دفعہ بیدل کا اس خود غرض لڑکی سے وصال ہو جائے تو شاید اس کا بھوت اتر جائے۔ بیدل اس پر راضی ہو گیا مگر اصرار کرنے لگا کہ چاند اس سلسلے میں خود سلسلۂ جنبانی کرے ورنہ میں اپنے جذبہ صادق کی توہین نہ کروں گا۔

جمال نے چاند کو سمجھایا کہ میرا دوست دیوانہ ہو چکا ہے۔ تم اس پر مہربانی کر دو۔ تمہارا کیا جاتا ہے مگر وہ نخرے کرنے لگی۔ پھر مفتی نے بیدل کو سمجھایا کہ لڑکی پہل کبھی نہیں کرتی۔ پہل کرواتی ہے۔ وہ اس انتظار میں ہے کہ تم کب اس کو پکڑ لیتے ہو۔ تم اس بات کو نہ سمجھے تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔

یہ بات بیدل کی سمجھ میں آ گئی مگر جب موقع آیا تو بیدل نے نہ اس کا منہ چوما نہ اس کو سینے سے لپٹایا بلکہ خودکشی کی باتیں کرنے لگا۔ گھبرا کر چاند کمرے سے باہر نکل آئی اور مفتی اور جمال کو کوسنے لگی۔

جمال نے بیدل کے سامنے جب وہ رو رہا تھا چاند کو بہت گندی گالیاں دیں اور اس سے ان تمام رشتوں کا اعلان کیا جو پنجابی گالیوں میں قائم کیے جاتے ہیں۔

جمال نے کہا ''تم میرے یار کو مارے ڈالتی ہو۔ وہ اپنی جان پر کھیل جائے گا حرامزادی۔''

''تو میں کیا کروں۔ تم اسے سمجھاؤ۔'' وہ بولی۔

''اس کے ساتھ ایک رات گزار لو بس یا اس کو چھوڑ دو۔ غائب ہو جاؤ ایک دم۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے، وہ اتنا پیارا آدمی ہے۔''

''تم کتے کی بچی ہو۔ ذلیل۔'' جمال نے غصے سے کہا۔

''تم تو مجھے گالیاں دیتے رہتے ہو ہر وقت۔ اس کو نہیں سمجھاتے کچھ۔'' وہ بولی۔

بیدل روتے روتے بولا۔ ''تم چاند کو گالیاں مت دیا کرو جمال۔''

''ارے وہ برا نہیں مانتی۔'' مفتی نے کہا۔

''تمہاری گالیوں کا برا کیوں نہیں مانتی جمال؟'' بیدل نے احتجاج کیا ''تمہاری طرف مائل ہے



اس لیے نا؟''

جمال گھبرا گیا بولا ''ایسی کوئی بات نہیں بیدل۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔''

''مجھے تم پر بھروسہ ہے مگر یہ کیوں تمہاری گالیاں سن کر بے مزہ نہیں ہوتی۔''

''تم بھی اسے گالیاں دو۔ وہ بے مزہ نہیں ہو گی۔ گالیاں بھی دو اور اس کی چولی بھی پھاڑ ڈالو بے وقوف۔''

پھر جمال اور مفتی نے بیدل اور چاند کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور خود امید لگا کر باہر بیٹھ گئے مگر تھوڑی دیر کے بعد بیدل آنسو پونچھتا ہوا باہر نکل آیا اور جمال کے گلے لگ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔

مفتی نے اسے بچکارا۔ تسلی دی تو وہ بولا ''وہ مجھے خود کیوں نہیں کہتی۔ خود کہے تب نا......''

جمال نے کہا ''تم نے کیوں نہیں اس کو پکڑ لیا۔ کمرے میں بند ہونے پر رضامند ہونے کے بعد اب کیا وہ انکار کرے گی تمہارے آگے؟''

بیدل آنسو روک کر بولا ''میں زبردستی نہیں کر سکتا۔ یہ میرے جذبوں کی توہین ہے۔''

اور وہ شام یونہی نکل گئی۔

## خودکشی کے تقاضے

پھر بیدل نے خودکشی کی تیاریاں کرنی شروع کر دیں۔ پوٹاشیم سائی نائیڈ کی ایک بوتل اس نے کہیں سے حاصل کر لی۔ جمال اور مفتی بہت پریشان ہوئے مگر وہ جانتے تھے کہ بیدل کو سمجھایا نہیں جا سکتا۔

جمال نے بوتل دیکھ کر اس کی زود اثری کی تعریف کی اور کہا ''بیدل واقعی جب زندگی دکھ کے سوا کچھ نہ دے تو خودکشی کرنے میں کوئی عیب نہیں۔ خودکشی اصل میں جوان مردوں کا کام ہے۔''

اس پر بیدل کو جمال پر بھروسہ ہو گیا۔

پھر جمال نے کہا ''بیدل ہماری سوشل ذمہ داریاں بھی ہیں۔ تمہارے چھوٹے چھوٹے بہن بھائی ہیں۔ بوڑھے ماں باپ ہیں۔ تمہاری خودکشی کے بعد پولیس انہیں گلی گلی گھسیٹے گی۔ اس کا بھی کچھ بندوبست کر لینا چاہیے۔''

''مگر کیا کیا جائے۔'' بیدل نے پوچھا۔

''میرے خیال میں جب تم فیصلہ کر لو تو پہلے مجھے بتا دینا تاکہ میں تم سے کچھ کاغذات لکھوا لوں۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد میرے گھر والوں کو کوئی تکلیف دے۔''

''تو پھر وعدہ کرو کہ مجھے بتائے بغیر تم زہر نہیں کھاؤ گے۔ یہ ذمہ داری کی بات ہے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں جمال۔''

اس بات کو چاند نے کوئی اہمیت نہ دی۔ اس کے دل میں یہ غرور بھی تھا کہ کوئی میرے لیے جان بھی

دے سکتا ہے۔ وہ دل سے اس کی موت بھی نہ چاہتی تھی مگر جمال کی زندگی حرام ہوگئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بیدل کی عریاں لاش ہسپتال کے برآمدے میں پڑی رہنے لگی۔ مفتی کی ساری دانائی ہوا میں اڑ گئی۔ ایسے واقعات کا اسے کوئی تجربہ نہ تھا اور اس میں وہ کوئی نکتہ بھی پیدا نہ کرسکتا تھا۔

کچھ روز اسی وسوسے میں گزر گئے۔

ایک رات کوئی دو بجے بیدل نے جمال کو جگایا۔ بالآخر وہ وقت آن پہنچا تھا جس کا جمال کو اندیشہ تھا۔

بیدل نے کہا ''چلو لکھوا لو جو کچھ بھی لکھوانا ہے۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔''

جمال نے سادگی سے پوچھا ''زہر کہاں ہے؟''

''یہ رہا میرے ہاتھ میں۔''

''اور مرنا کہاں ہے؟''

''گھر ہی میں ٹھیک رہے گا۔ سب لوگ سو رہے ہیں۔ جان زہر کھانے کے بعد کتنی دیر میں نکل جاتی ہے؟''

''پتہ نہیں شاید دس پندرہ منٹ میں۔''

''میں کپڑے بدل لوں۔ کاغذات لکھوا کر تمہارے تکیے کے نیچے رکھ دوں گا۔'' جمال نے کہا۔ ''یوں بھی یہ آخری لمحے میں تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔''

تھوڑی دیر کے بعد دونوں جمال کے سولجر بازار والے گھر سے نکلے۔ چلتے چلتے بیدل نے اچانک آہ بھری۔

''کیا چاند بہت یاد آ رہی ہے؟'' جمال نے پوچھا۔

''تمہارا ہمارا وقت بہت اچھا کٹا جمال۔'' بیدل نے کہا۔

وہ گورومندر کے قریب پہنچ چکے تھے اور انہیں مارٹن کوارٹرز کی طرف جانا تھا جہاں بیدل رہتا تھا۔

''زندگی مجھے پسند تھی۔'' بیدل نے کہا ''افسوس کہ اتنی مختصر نکلی۔''

جمال اداس ہوگیا۔ اس نے کہا ''کاش وہ حرامزادی ہمیں کبھی ملی نہ ہوتی۔''

''ایسا مت کہو۔'' بیدل نے تڑپ کر کہا۔

''مگر اس نے تمہارے ساتھ سخت بے وفائی کی۔''

بیدل بولا ''شکر ہے وہ میرے لیے بے قرار نہیں ہوئی۔ میں اس کا دکھ برداشت نہ کرسکتا۔ میں نے اسے خوش رکھا۔ میں ایک کامیاب زندگی گزار کر جا رہا ہوں۔''

تھوڑی دیر دونوں چپ رہے۔ اچانک بیدل نے جمال کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''مجھے تم سے



کوئی گلہ نہیں جمال۔ میرے دل میں کوئی ملال نہیں۔''

''کیسا ملال بیدل؟'' جمال نے پوچھا۔

''بلکہ میں تو تمہارا بہت ممنون ہوں۔ تم ہی نے چاند سے میری ملاقات کروائی تھی۔''

''تو پھر کیا بات ہے؟''

''بات کچھ بھی نہیں۔ دل کے معاملوں میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ تم پشیمان نہ ہونا ورنہ مجھے قبر میں بھی چین نصیب نہ ہوگا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو بیدل؟''

''بعد میں اسے بتا دینا کہ آخری وقت مجھے اس سے بھی کوئی گلہ نہ تھا...... اور یہ میری گھڑی اسے دے دینا۔''

اب وہ بیدل کے گھر کے قریب پہنچ چکے تھے۔

بیدل نے کہا ''میں کوئی بات ساتھ لے کر جانا نہیں چاہتا۔ تم میرے پیارے دوست ہو مگر مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔''

''کس بات کی امید نہ تھی بیدل؟ میں نے کیا کیا؟''

''تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا نا کہ تم چاند سے دور رہو گے، کیا تھا نا؟''

''بے شک کیا تھا۔'' جمال نے جواب دیا۔

''مگر آج تم اسے ساتھ لے گئے گاڑی میں۔ مجھے بتایا بھی نہیں، کہاں گئے تھے تم دونوں؟''

''میں نے تو آج اس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔'' جمال نے مجرمانہ عاجزی سے کہا۔

''جھوٹ بولتے ہو اب۔؟''

''خدا کی قسم یہ سچ ہے۔ تم کیا کہہ رہے ہو۔''

''مجھے حمید ڈرائیور نے سب کچھ بتا دیا۔ اب اتنے بھولے نہ بنو۔''

''کیا بتا دیا تھا حمید ڈرائیور نے؟''

''تم اسے ساتھ لے کر کہیں گئے تھے۔ پچھلی سیٹ پر وہ تمہارے ساتھ جڑ کر بیٹھی تھی کہ نہیں؟''

''بیدل عقل کی بات کرو۔ یہ کیا بکواس ہے۔''

''حمید ڈرائیور نے بتایا تھا کہ تم اسے لے کر کہیں چلے گئے تھے کلفٹن کی طرف۔''

جمال نے کچھ سوچا، پھر اس کی ہنسی نکل گئی۔

اب وہ بیدل کے گھر کے سامنے کھڑے تھے۔ جمال نے کہا ''تم الو ہو، میں اس بات پر ہنستا ہوں بس۔''

''بے شک میں الو ہوں۔ اسی لیے مجھے تم جیسے پیارے دوست بھی لوٹ لیتے ہیں۔''

’’میں نے تمہیں نہیں لوٹا بیوقوف۔ وہ میں نہیں تھا۔ کوئی اور تھا جس کے ساتھ وہ گئی تھی۔‘‘

’’اور کون؟‘‘ بیدل نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

’’اس کے دیور کا نام بھی جمال ہے۔ وہ اس کے ساتھ گئی ہوگی۔‘‘

بیدل نے کچھ سوچا۔ پھر اس کے چہرے کا کھچاؤ دور ہو گیا۔ ہلکی سی مسکراہٹ افق پر پھیل گئی حالانکہ سورج ابھی نکلا نہ تھا۔ بیدل سنجیدہ شکل بنا کر بولا ’’تو واقعی تم سچ کہتے ہو؟‘‘

’’تمہیں پتہ ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ اب لاؤ مجھے دو وہ زہر کی شیشی۔ میں اسے پھونک لوں تاکہ تم ساری عمر پشیمانی میں تڑپتے رہو۔‘‘

’’یہ نہیں ہو سکتا جمال۔‘‘ بیدل نے زہر کی شیشی سڑک پر پٹخ دی اور کہا ’’لاؤ میری گھڑی مجھے واپس کر دو۔‘‘

## اقبال شناس

شیخ ممتاز حسین ایک ریٹائرڈ افسر تھے اور موہڑہ شریف کے مرید۔ پیر صاحب کی دعا سے وزارت اقتصادیات میں انہیں دوبارہ ملازمت مل چکی تھی۔ مسٹر ڈین پیرزادہ اپنے پیر بھائیوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ شیخ صاحب کو جمال کی کوئی ادا بھا گئی تھی اور وہ اس سے بہت شفقت کا سلوک کرتے تھے۔

چائے منگوا کر انہوں نے جمال سے کہا ’’برخوردار تم کمال کے آدمی ہو۔ کمال ایک تغیر کو ہے زمانے میں!‘‘

شیخ صاحب کو بہت سے اشعار زبانی یاد تھے اور وہ انہیں گفتگو میں استعمال کرنے کے عادی تھے۔ چاہے ان کا حوالہ بے معنی ہی کیوں نہ ہو۔

جمال نے کہا ’’مگر میں تغیر نہیں شیخ صاحب۔ جمال ہوں کمال نہیں۔‘‘

شیخ صاحب مصرعہ پڑھ کر خلا میں گھورنے لگے۔ متوجہ ہو کر بولے ’’تم جیسا افسر ہم نے اپنی چونتیس سالہ ملازمت میں تو نہیں دیکھا۔ ماننا پڑتا ہے کہ تم بہت نڈر آدمی ہو۔‘‘

’’جی نہیں۔ میں تو بہت ڈرتا ہوں افسروں سے۔‘‘ جمال نے کہا۔

شیخ صاحب نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا...... ’’یا پھر ناتجربہ کار اور بے وقوف آدمی ہو۔ آگے پیچھے نہیں دیکھتے۔ حالانکہ اقبال فرماتے ہیں: کھول آنکھ زمین دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ۔ مگر تم نے اقبال کو شاید نہیں پڑھا۔ تم زندگی گزارنے کے فن سے ناواقف ہو۔‘‘

’’یہ تو درست ہے شیخ صاحب۔‘‘ جمال نے کہا۔

’’مگر میں تمہیں زندگی کے راز بتانا چاہتا ہوں جمال۔ اگر سمجھدار ہوتے تو تم ایسی حرکت کبھی نہ کرتے۔‘‘



’’کون سی حرکت جناب؟‘‘

’’یہی جو تم نے بیدل اور مفتی کو اپنے محکمے میں ملازم رکھوا کر کی ہے۔ وہ دونوں تم سے زیادہ مشہور ہیں۔ اگرچہ جانتے وہ بھی کچھ نہیں۔ شاعر فرماتا ہے: آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک!‘‘

’’جی وہ دونوں بہت لائق ہیں اور میرے دوست بھی ہیں۔‘‘ جمال نے کہا۔

’’برخوردار وہ تم سے آگے نکل جائیں گے۔ نوکری کا اصول یہ ہے کہ آدمی ایسے کسی آدمی کو دفتر میں آنے نہ دے جو اس سے زیادہ مشہور اور قابل ہو۔ آ جائے تو اسے تنگ کر کے بھگا دے۔ اقبال فرماتے ہیں: تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن!‘‘

’’مگر شیخ صاحب۔ وہ مشہور اور قابل ہیں تو اس میں دفتر ہی کا فائدہ ہے۔‘‘ جمال نے کہا۔

شیخ صاحب بولے ’’کل کلاں وہ مسٹر ڈین پیرزادہ کی نظر میں آ جائیں گے اور تمہارا فیوچر تو تباہ ہو جائے گا۔ رہا دفتر کا فائدہ تو سرکاری کام کبھی رکتا نہیں۔ فائل ہر حال میں چلتی رہتی ہے۔ صحیح یا غلط اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اپنا مقام بناؤ، خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے اور عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔ تو مفتی اور بیدل کے معاملے میں عمل کرو اور اپنی زندگی بناؤ برخوردار!‘‘

## للہ مجھے پاجی کہو

ابوالاثر بعض معاملات میں بہت بدنصیب تھے۔ ان کا ڈرائیور ہر مہینے نوکری چھوڑ جاتا تھا۔ وہ پورا مہینہ اس سے شفقت کا سلوک کرتے مگر آخر میں کوئی خرابی نکل آتی اور ابوالاثر کو موقع نہ ملتا کہ وہ اسے تنخواہ دے کر رخصت کریں۔

اب کے انہوں نے جو ڈرائیور رکھا تھا، اس کی انہوں نے بہت خوشامد کی تھی۔ اللہ اور رسول کے نام پر اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ انہیں اتنی بڑی دنیا میں تنہا چھوڑ کر نہ جائے گا۔

اللہ داد جہلم کا ریٹائرڈ فوجی ابوالاثر کا غلام ہو گیا اور ان کو بھی اس سے کوئی شکایت پیدا نہ ہوئی۔ سب کو امید ہو چلی کہ اللہ داد اپنی باقی زندگی ابوالاثر کے در پر کاٹ دے گا مگر ایک دن اچانک ابوالاثر کو یاد آیا کہ ایمپرس مارکیٹ میں مچھلی بہت سستی ملتی ہے۔ جیپ میں وہ خود آگے اللہ داد کے ساتھ بیٹھ گئے۔ جمال بیدل اور مفتی نے پچھلی سیٹ سنبھال لی۔

وکٹوریہ روڈ کے چوک سے ڈرائیور نے گاڑی کسی قدر تیزی سے نکالی۔ ابوالاثر نے کڑک کر کہا۔

’’گاڑی روکو۔‘‘

گاڑی رک گئی۔ ابوالاثر باہر نکلے۔ مفتی جمال اور بیدل بھی نکل آئے۔ اللہ داد دست بستہ تھا ’’کیا حکم ہے سر؟‘‘ اس نے پوچھا۔

ایک معزز شخص جس کی شیروانی کے سارے بٹن بند تھے، پاس سے گزر رہا تھا۔ ابوالاثر نے نہایت لجاجت سے کہا ''حضرت ذرا رک جایئے گا۔''

معزز شخص رک گیا۔

''جناب مجھے پہچانتے تو ہوں گے؟'' ابوالاثر نے کہا۔

''الحمدللہ حضور کو کون نہیں پہچانتا؟''

''کون ہوں میں بھلا؟''

''حضور جناب ابوالاثر ہیں ماشاءاللہ۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت......''

''شعر بے موقع نہ پڑھیے حضرت۔'' ابوالاثر نے بیزاری سے کہا۔ ''مجھے وحشت ہوتی ہے۔''

''تصحیح فرما دیجیے قبلہ......''

''ہم پنجابی ڈھگے بھلا کس قابل ہیں آپ اہلِ زبان کے سامنے۔ اگرچہ میں بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں۔'' ابوالاثر نے اپنے سوکھے سڑے بازوؤں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''استغفراللہ جناب فدوی کی کیا مجال۔'' معزز شخص بولا۔

''اہلِ زبان کا شیوہ ہے۔ کسی کو مان کر نہیں دیتے چاہے وہ کیسا ہی زبان دان کیوں نہ ہو۔''

''اے حضور میں تو سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔ دل و جان حضور پر نثار۔ ماشاءاللہ کیا کہنے جناب کے!''

''قبلہ شاید امروہے کے ہیں۔'' ابوالاثر نے پوچھا۔

''جی نہیں، بندہ کانپور سے ہے۔'' وہ بولا۔

''کانپور کے لوگ باذوق ہوتے ہیں۔ حسرت موہانی کا تو وطن ہے نا۔''

''عنایت ہے حضور کی۔''

''مجھے آپ پہچانتے ہیں۔ کون ہوں میں بھلا؟''

''جناب ہمارے قابلِ فخر قومی شاعر۔''

''ابوالاثر کہیے۔ یہ خطاب مجھے گرامی جالندھری نے دیا تھا اور ان کی وجہ شہرت بھی یہی ہے۔''

''جناب ابوالاثر۔'' معزز آدمی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''لسان العصر کا خطاب مجھے مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد نے دیا تھا۔ اپنے حیدرآباد دکن والے۔''

''جناب لسان العصر۔''

''حسان الملک بھی کہیے۔ نواب بہاولپور مجھے حسان الملک کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔''

''جناب حسان الملک۔''

''بنارس میں مجھے کہتے تھے اردو کا بنسری بجیا......''



''بجا ارشاد۔ اردو کا بنسری بجیا۔''

''علی گڑھ میں میرا خطاب تھا شہنائی نوازِ اردو۔''

''جناب شہنائی نوازِ اردو۔''

''مصنف شاہنامۂ اسلام۔ آج کل آخری جلد زیرِ تصنیف ہے مگر فرصت ہی نہیں دیتے افکارِ معیشت کے!''

''جناب والا شان۔''

''میں مصنف ترانہ ہوں۔ پتہ ہے جناب کو؟''

''ماشاءاللہ۔''

''اس کی تصنیف کا حکم مجھے قائداعظم نے دیا تھا جب انہوں نے آخری بار میرے ساتھ ناشتہ کیا۔''

''سبحان اللہ!''

''تو اب یہ ہیچ مداں، آپ سے ایک دستِ بستہ درخواست کرتا ہے۔ آپ میر صاحب ہیں نا؟''

''جی نہیں جناب۔''

''تو میرزا ہوں گے۔ یو پی کا آدمی کچھ نہ کچھ تو ہوتا ہی ہے۔''

''جی بندے کو علی حسن صدیقی کہتے ہیں۔''

''تو جناب علی حسن صدیقی صاحب، آپ سے دست بستہ گزارش ہے۔''

''ارشاد ہو۔''

''بس ایک مرتبہ کہہ دیجیے ابوالاثر تم اول درجے کے پاجی ہو۔''

''لاحول ولاقوۃ۔ حضرت کیا فرماتے ہیں؟''

''للہ ایک مرتبہ کہہ دیجیے میری خاطر۔''

''حضور میں ایسی گستاخی نہیں کر سکتا۔''

''آپ کو شہدائے بدر کی آبرو کی قسم کہہ دیجیے۔'' ابوالاثر نے گرج کر کہا۔

علی حسن صدیقی تھرتھر کانپنے لگا۔ جمال بیدل اور مفتی کا رنگ زرد ہو گیا۔

''کہیے کہ ابوالاثر تم اول درجے کے پاجی ہو۔ کہیے کہیے۔''

علی حسن صدیقی نے بکری کی طرح منمنا کر کہا ''ابوالاثر صاحب آپ اول درجے کے پاجی ہیں۔'' پان کی پیک اس کی ٹھوڑی تک بہہ گئی۔

ابوالاثر مسکرائے اور کچھ توقف کے بعد بولے۔

''اب پوچھیے کہ میں نے آپ سے ایسی بے ہودہ درخواست کیوں کی؟''

''جی جناب والا نے مجھ بدنصیب کو ایسا حکم کیوں دیا؟''

''یوں نہیں صدیقی صاحب قبلہ! کہیے اے ابوالاثر لسان العصر حسان الملک اردو کے بنسری بجا شہنائی نواز اردو جس نے قائداعظم کے ساتھ ناشتے کی میز پر ترانہ تصنیف کرنے کا وعدہ کیا تھا، تم نے مجھ علی حسن صدیقی کانپوری سے کیوں درخواست کی کہ میں تمہیں اول درجے کا پاجی کہوں۔''

''جناب والا ابوالاثر تم نے مجھ سے کیوں درخواست کی کہ میں تمہیں اول درجے کا پاجی کہوں'' صدیقی صاحب نے پوچھا۔

ابوالاثر نے کڑک کر جواب دیا۔''اس لیے کہ میں نے اس شخص کو ڈرائیور رکھا ہوا ہے۔''

گاڑی پھر چلنے لگی۔ علی حسن صدیقی کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

ایمپریس مارکیٹ کے چوک میں اللہ داد سے پھر کوئی غلطی ہوئی۔ ابوالاثر نے پھر گاڑی روک لی اور نیچے اتر گئے۔ پیچھے پیچھے جمال، بیدل اور مفتی ڈرائیور کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

ابوالاثر نے پاس سے گزرتے ہوئے ایک شریف آدمی سے نہایت عاجزی سے کہا''جناب والا مجھ عاجز پر رحم کریں اور میری ایک گزارش سن لیں۔ کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟''

بات ختم کر کے ابوالاثر گاڑی کی طرف لوٹے تو ڈرائیور غائب تھا۔ اس کی چپلیں سڑک پر پڑی ہوئی تھیں۔

جمال نے بیدل سے پوچھا''آج کیا تاریخ ہے؟''

بیدل نے معصومیت سے کہا''آج انتیس ہے۔ مہینہ کل ختم ہوگا۔ ڈرائیور کی تنخواہ ابوالاثر نے پھر بچا لی۔''

## ناراضگی

پھر ابوالاثر جمال سے ناراض ہو گئے اور اس میں وہ سراسر قصوروار تھا۔

''میں تو تمہیں گپ شپ کے لیے لایا تھا تم افسر بن بیٹھے ہو۔'' ابوالاثر نے کہا''کیا میری جگہ لینے کا ارادہ ہے؟''

مگر اصل وجہ ان کی ناراضگی کی یہ تھی کہ مفتی اور بیدل اس کے خلاف بات نہ سنتے تھے۔ جمال نے ابوالاثر کی لکھوائی ہوئی غلط انگریزی درست کرنی شروع کر دی تھی۔ ہر نوٹ میں قائداعظم اور چودھری محمد علی کے حوالے کاٹنے شروع کر دیئے تھے اور اس سے ابوالاثر کو یقین ہو گیا کہ جمال میری جڑیں کاٹ رہا ہے مگر اس کے بغیر دفتر کا چلنا بھی محال تھا۔ مفتی اور بیدل دفتری کام میں کوئی دلچسپی نہ لیتے تھے۔ جب ابوالاثر کے لیے جمال کا وجود ناقابل برداشت ہو گیا تو انہوں نے سوچا کیوں نہ اسے ایک برس کے لیے امریکہ فلم کی ٹریننگ کے لیے بھجوا دیا جائے جس کے وظیفے میز پر رکھے رہتے تھے۔



مگر ابوالاثر یہ تحفہ جمال کو تڑپائے بغیر تھالی میں رکھ کر بھی دینا نہ چاہتے تھے۔ انہوں نے آخری تاریخوں تک کاغذ کو اپنی دراز میں چھپا کے رکھا۔ پھر مفتی اور بیدل سے منتیں کروائیں۔ جمال پر اپنے لاکھوں احسانات کا ذکر کیا۔ ہاں پھر بھی نہ کی حتیٰ کہ وہ دن آ گیا جس دن جہاز کو پرواز کرنی تھی۔

کوئی تین بجے امریکی ایڈوائزر سٹپٹایا ہوا آیا۔ اس نے انڈیانا یونیورسٹی کو جمال کی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ اب اس کی ہیٹی ہوتی تھی۔ اس کے آنے پر ابوالاثر نے جمال کو منظوری دے دی۔ جہاز کو اسی شام سات بجے اڑنا تھا۔

جمال نے بھاگ دوڑ کر کے بڑی مشکل سے ڈالر حاصل کیے اور شام کو پانچ بجے بیوی کو بتا سکا کہ مجھے سات بجے شام گھر سے نکلنا ہے۔

ایک مسلم لیگی خاتون نے وزیراعظم سے وعدہ لے لیا تھا کہ جمال کو نکال کر میرے بیٹے کو اس کی جگہ رکھا جائے اور امریکہ بھی اسی کو بھیجا جائے۔

مگر وزیراعظم کے دفتر سے اس روز کوئی چٹھی نکل نہ سکی اور مسلم لیگی خاتون نے ابوالاثر کو وارننگ دے دی کہ زنہار کل تک کسی کو امریکہ نہ بھیجا جائے۔ اس پر ابوالاثر چڑ گئے اور انہوں نے جمال کو اجازت دے دی اور اس میں ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ مسلم لیگی خاتون کا بیٹا جمال کی جگہ لے کر ابوالاثر کے رنگ میں بھنگ نہ ڈالے۔

مگر عدن سے نکل کر ہی جمال کو یقین آیا کہ مسلم لیگی کی والدہ اب میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔

# باب 24

ان دنوں امریکی فلائٹ ایک رات لندن میں قیام کے بعد بوسٹن جاتی تھی جو پورٹ آف انٹری تھی۔ لندن کے ایئرپورٹ پر پاکستان کی بوڑھی چوہڑیاں بانس کے جھاڑو اور لمبے سوتی رسیوں والے جھاڑو ہاتھوں میں لیے صفائی پر مامور تھیں اور آتے جاتے پاکستانی مسافروں سے کہتی تھیں ڈارلنگ ایدھروں نہ لنگ! سویٹ ہارٹ توں کتھے جانا ایں۔

بوسٹن میں کوئی خاص بات نہ ہوئی مگر اس روز بے شمار ایشیائی لڑکے لڑکیاں جن کو امریکی حکومت نے وظیفے دیئے تھے، مختلف جہازوں سے اترے۔ ان میں ویتنام کی ایک دبلی پتلی کم چی بھی تھی جو بہت کم عمر تھی اور ہر چیز کو حیرت سے دیکھتی تھی۔ وہ بالکل ہماری دیہاتی لڑکیوں کی طرح شرمیلی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ویتنام کی دو تین اور لڑکیاں بھی تھیں جو کسی قدر زیادہ تجربہ کار اور کم چی پر بڑی بہنوں کی طرح نظر رکھتی تھیں۔ پتہ نہیں کس طرح اس کی جمال سے آنکھ لڑ گئی اور وہ بار بار اس کو دیکھنے اور ملنے کے لیے قاہرہ ہوٹل کے برآمدوں میں آنے لگی۔

جمال کو بھی اس میں بڑا حسن نظر آیا مگر ویتنام کی بڑی لڑکیوں نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کر کمرے میں بند کر دیا۔ اس نے وہیں سے جمال کو اس کے کمرے میں ٹیلی فون کیا مگر رونے کے سوا کچھ کہہ نہ سکی۔ دو روز کے بعد وہ اور اس کی ساتھی لڑکیاں اپنی اپنی یونیورسٹی کو روانہ ہو گئیں۔ بوسٹن تو صرف ایک جنکشن سٹیشن تھا مگر کم چی جمال کو برسوں یاد رہی۔

امریکیوں کا سلوک طالب علموں کے ساتھ بہت اچھا تھا، بعض رضا کار لڑکیاں ان کا دل بہلانے کو شام کو آ جاتیں۔ ایک ان میں سے لڑکوں کو ناچ سکھاتی تھی۔ جمال سے لڑکی نے کہا "دایاں ہاتھ میرے اٹھے ہوئے بائیں ہاتھ میں دے دو۔ بایاں ہاتھ میرے کولہوں پر رکھ لو اور گنتی کرو۔ ایک دو تین۔ ایک دو تین۔ اس گنتی کے ساتھ وہ ناچ کے قدم لیتی۔"

جمال نے اس کے کولہے پر ہاتھ رکھتے ہی اٹھا لیا جیسے اسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو اور اس سے کہا "تم مجھے ڈانس نہیں سکھا سکتیں۔"



"کیوں نہیں سکھا سکتی؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"کیوں کہ تمہارے کولہے بہت گول اور ابھرے ہوئے ہیں۔ میں ایسی دلفریب عورت کے اس قدر قریب رہ کر گنتی بھول جاؤں گا۔"

وہ ہنس کر بولی "تم ایشیائی کس قدر رومانٹک ہو۔ ہم امریکی تو بڑی خشک زندگی گزارتے ہیں۔ ہمیں تو حسن کا پتہ ہی نہیں۔"

## بلومنگٹن

اگلے روز ان طالب علموں کو جنہیں بلومنگٹن جانا تھا ایک ریل گاڑی میں سوار کرا دیا گیا۔ ہمارے ہاں تو لوگ زیادہ تر کھڑے ہو کر سفر کرتے ہیں۔ وہاں پر ایک کو دو دو بنچ الاٹ ہوتے ہیں۔ رات کو کھانے کے بعد گارڈ نے آ کر بنچوں کے نیچے سے پھٹے اور بستر نکالے۔ انہیں برابر کیا۔ اس پر نہایت آرام دہ بستر بچھایا۔ نیلی روشنی کا بلب روشن کیا اور پردے کھینچ کر کمرہ بند کر دیا۔

اب اس میں آپ اکیلے سوئیں یا کسی لڑکی کو ساتھی بنا لیں۔ آپ کی مرضی۔

مگر صبح ہوئی تو بلومنگٹن کے ریلوے سٹیشن پر یونیورسٹی کے کچھ لوگ طالب علموں کے استقبال کو کھڑے تھے مگر عجیب بات تھی کہ جو لڑکا یا لڑکی گاڑی سے اترتی ایک پروفیسر اس کا نام پکارتا "تم سونفیا تو ہو نا؟ انڈونیشیا کے رہنے والے۔ تم شرما ہو انڈین۔ تم پاکستانی جمال ہو۔"

اس پر جمال بہت حیران ہوا کیونکہ زندگی بھر اس نے اپنے میزبانوں کی صورت نہ دیکھی تھی۔ انہوں نے کیسے ہر ایک کو پہچان لیا۔

بعد میں اسے پتہ چلا کہ پروفیسر صاحبان نے ہر شخص کی تصویر غور سے دیکھ کر اس کا حلیہ ذہن میں بٹھا لیا تھا۔ صرف اس لیے کہ آنے والوں کی جھجک دور ہو اور وہ سمجھیں کہ ہم دوستوں میں ہیں۔

گاڑی سے سامان اترا تو ایک گورے نے جمال کا سوٹ کیس سر پر اٹھا لیا اور آگے آگے چلنے لگا۔ جمال نے اپنے ہاتھ کا تھیلا بھی اس کے سر پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ کیمپس پہنچ گئے اور قلی نے جمال کا سامان اس کے کمرے میں رکھ دیا۔ پھر کہا "اب صبح ملیں گے۔"

"صبح ملیں گے؟" جمال کچھ دیر سوچتا رہا۔ قلی مجھے صبح کیوں ملے گا۔ مجھے تو اس سے کوئی کام نہیں۔

مگر صبح یہ دیکھ کر اس کی سٹی گم ہو گئی کہ جسے وہ قلی سمجھتا تھا وہ اس کا کلاس ٹیچر تھا۔

ایسے ہی چھوٹے چھوٹے بہت سے واقعات ہوئے جن کی وجہ سے جمال کا امریکیوں کے بارے میں تصور بدلنے لگا۔ وہ ذاتی زندگی میں بہت دھیمے مزاج کے تھے، وقت کے پابند تھے، صاف گو تھے اور دنیا کے بارے میں عموماً بے خبر تھے۔ انہیں فٹ بال سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ بہت محنتی تھے اور انہیں حکومت سے ڈر لگتا تھا۔

جمال کو یہاں کسی دشواری کا سامنا کرنا نہ پڑا۔ اس نے اپنے آپ کو پاکستان کے مقابلے میں زیادہ آزاد محسوس کیا۔

اس کی جماعت ساری کی ساری غیر ملکی طالب علموں پر مشتمل تھی۔ وہ جلد ہی سمجھ گیا کہ عرب، ہندوستانی، یونانی اور مشرق بعید کے طلبہ ذہنی طور پر شوخ نہیں ہوتے۔ ایرانی عیاش اور غیر سنجیدہ ہیں اور امریکن بڑی آسانی سے بے عزتی برداشت کر لیتے ہیں۔ اس ماحول میں وہ آپ ہی آپ سب کا لیڈر تسلیم کیا جانے لگا اور امریکی استاد جو بظاہر بدھو تھے مگر ان کے کچھ سیاسی مقاصد بھی تھے جن کا جمال کو آہستہ آہستہ ہی پتہ چلا۔ جمال کو سیاسی طور پر شیشے میں اتارنے لگے تا کہ وہ دوسرے طالب علموں کو متاثر کر سکے۔

جماعت میں دو اسرائیلی میاں بیوی بھی تھے۔ آدمی نہایت ذہین اور سیانا، لڑکی نہایت حسین اور ملنسار مگر اندر سے گانٹھ کی پکی۔ امریکی چاہتے تھے کہ اسرائیلی اور عرب طالب علم ایک دوسرے کے قریب آ جائیں اور جمال جو عرب نہیں مگر مسلمان ہونے کے ناطے عربوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے، انسانی سطح پر ان میں برداشت پیدا کرے۔

جنوبی کوریا کا لی پانگ بہت ذہین اور بہت عقل مند نوجوان تھا۔ وہ لیڈر شپ کے معاملے میں جمال کا حریف تھا مگر انگریزی میں اس کی استعداد کم تھی اس لیے وہ بالآخر اس کا دوست بن گیا۔ اگرچہ رقابت اس نے آخر تک نہ چھوڑی۔ زیادہ تر لڑکے عرب تھے۔ مصری، لیبیائی، سوڈانی اور ہندوستانی صرف دو تھے۔ ایک مکار اور دوسرا احمق۔ دونوں پاکستان سے جلتے تھے اور جمال کی عدم موجودگی میں مسلمانوں کا چار بیویوں کے حوالے سے ٹھٹھا اڑاتے تھے۔

## بنگالی بھائی کا غصہ

نور الحسن کو ان پر بہت غصہ آتا تھا۔

نور الحسن مشرقی پاکستان کا ایک نمازی پرہیزگار نوجوان تھا۔ پاکستان کا عاشق، پکا مسلمان مگر اس کی انگریزی بہت کمزور تھی اور جسم بھی سوکھا سڑا۔ امریکہ میں گناہ کے خوف نے اس کی اپنی زندگی حرام کر رکھی تھی۔ وہ ہر وقت جمال کے ساتھ چمٹا رہتا اور درود شریف کا ورد کرتا رہتا۔

ایک روز رات کے دس بجے اس نے جمال سے مطالبہ کیا کہ تم راج کو جا کر مارو اسی وقت۔

راج مدراسی تھا مگر پاکستان سے سخت نفرت کرتا تھا۔

نور الحسن نے کہا" راج شالا مسلمانوں کا بہت بے اجتی کیا۔ پاکستان کو گالی دیا۔ بولا قائداعظم گدار تھا انگریزوں کا ایجنٹ۔ ابھی چلو تم۔ وہ جنرل روم میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا ہے۔"

راج کو جمال بھی گھٹیا آدمی سمجھتا تھا مگر رات کے دس بجے جنرل روم میں جا کر اسے مارنے کا خیال اسے اچھا نہ لگا۔ اس نے بڑی مشکل سے نور الحسن سے جان چھڑائی اور وعدہ کیا کہ کسی روز میں راج کو



سبق سکھاؤں گا۔

رمضان کے روزے مصریوں، ایرانیوں اور جمال کے سوا تمام مسلمانوں نے باقاعدگی سے رکھے۔

پھر فیصلہ ہوا کہ عید کی نماز کیمپس کے میدان میں پڑھی جائے کیونکہ بلومنگٹن میں کوئی مسجد نہ تھی۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ امامت جمال کرے کیونکہ جمال پاکستان کا رہنے والا ہے جس کے ریڈیو سے قرآن شریف کی قرأت بڑی سریلی اور سہانی ہوتی ہے۔

جمال پریشان ہو گیا۔ اس کو تو اچھی طرح نماز بھی نہ آتی تھی اور اذان تو قطعی طور پر یاد نہ تھی مگر جب عرب لڑکوں نے اس کی گزارشات کو کسر نفسی پر محمول کیا تو اس کے لیے کوئی چارہ نہ رہا۔

مجبور ہو کر جمال نے نور الحسن سے نماز سیکھی۔ امامت کے راز معلوم کیے اور سنجیدگی سے امامت کی تیاری کر لی۔

عید کے دن مسلمان لڑکوں نے اپنے اپنے قومی لباس پہنے۔ لیبیا کے بلعید سلیمان اور عبدالسلام الشریف نے پتلون پیش قبض اور خنجر اٹکائے، احرام باندھے اور گھاس کے ایک سرسبز تختے پر قبلہ رو ہو گئے۔

جمال امامت کے لیے کھڑا ہو گیا مگر گھبراہٹ میں اسے نماز بھول گئی۔ اس نے پنجابی میں خدا سے مغفرت کی دعائیں مانگنی شروع کر دیں۔ اس نے کہا اللہ تو غفور الرحیم ہے۔ خیر و بصیر ہے۔ تو جانتا ہے کہ حافظے پر کسی کا زور نہیں۔ میں نے تو نماز سیکھی تھی، اب بھول گیا تو میرا گناہ معاف فرما دے۔ میں گنہگار آدمی ہوں۔ مجھے لوگوں نے امامت پر مجبور کر دیا تو میں کیا کرتا۔

## مسلمانوں کا پادری

کسی طرح نماز ختم ہوئی۔ اس نے سلام پھیرا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چاروں طرف امریکی طالب علم لڑکے اور لڑکیاں کھڑے نماز کا منظر دیکھ رہے ہیں۔

دن بھر یونیورسٹی میں مسلمانوں کی نماز کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ نور الحسن خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔

رات کو جنرل روم میں امریکی لڑکوں اور لڑکیوں نے جمال کو گھیر لیا۔ راج اور شرما بھی وہیں ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

نینسی نے پوچھا۔"ہمیں پتہ نہ تھا جمال کہ تم مسلمانوں کے پادری ہو۔"

جمال نے کہا" اسلام میں کوئی پادری نہیں ہوتا۔ ہم سب، سب کچھ کر سکتے ہیں۔"

"مگر تمہارا گرجا تو ہوتا ہے یا نہیں ہوتا؟"

"ہماری مسجد ہوتی ہے مگر ہم جہاں چاہیں پاک و صاف جگہ پر عبادت کر لیں۔ ہمارے لیے ساری دھرتی مسجد ہے۔"

''عجیب بات ہے!'' نینسی بولی۔

''ان کے مذہب میں کوئی پابندی نہیں۔'' راج بولا ''یہ چاہیں تو چار شادیاں کر لیں۔ لونڈیاں رکھیں۔ ان کے علاوہ جتنی چاہیں ہزاروں، لاکھوں۔ ان میں سیکس بہت ہوتی ہے۔''

جمال کو بہت غصہ آیا۔ نورالحسن کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جمال نے ذرا بلند آواز میں کہا ''بعض حالات میں ہم چار تک شادیاں کر سکتے ہیں مگر سیکس اس کی وجہ نہیں۔ لونڈیوں کا رواج ملوکیت کے زمانے میں تھا اور یورپ اور امریکہ میں بھی تھا۔ جارج واشنگٹن تو اس سلسلے میں بہت مشہور ہے۔ خود میری ایک ہی بیوی ہے۔ ہمارے مذہب میں سیکس پر بہت پابندیاں ہیں مگر خدا کو یاد کرنے اور عبادت کرنے میں کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں سوائے پاکیزگی اور صفائی کے۔''

راج کوئی جملہ چست کرنا چاہتا تھا مگر سوچتا ہی رہ گیا۔

جمال بولا ''مگر میرے یار راج کو بلومنگٹن میں بہت تکلیف ہے۔ وہ شولنگ کی پوجا کرتا ہے اور شولنگ اسے یہاں دستیاب نہیں۔''

راج نے گھبرا کر کہا ''جمال بھائی کیا کرتے ہو؟''

''شولنگ کیا کسی دیوتا کا نام ہے؟'' ایک لڑکی نے پوچھا۔

جمال نے ایک سائنسدان کے انداز میں سمجھایا ''شولنگ دیوتا کو نہیں دیوتا کے عضو تناسل کو کہتے ہیں۔ یہ عضو تناسل کی پوجا کرتے ہیں اس کا بت بنا کر۔''

راج شرما بولا ''جانے دے یار۔''

جمال نے کہا ''میرا یار راج بہت پریشان ہے امریکہ میں۔''

راج نے کہا ''نہیں، میں بالکل پریشان نہیں۔''

جمال چڑھائی پر تھا۔ اس نے کہا ''راج اور میں چند سال پہلے ایک ہی ملک کے باشندے تھے۔''

''مگر ان کے قائداعظم نے انگریزوں کے کہنے پر ملک کو تقسیم کرا دیا۔ ورنہ ہم ہندو اور مسلمان بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔'' راج بولا۔

''میں تو راج کو اب بھی اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔'' جمال نے کہا ''کئی مرتبہ میں نے اس کی مدد کرنے کی کوشش کی۔''

''تم نے میری کون سی مدد کی؟'' راج نے جھلا کر پوچھا۔

جمال نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا ''میں نے ہمیشہ راج کو پیشکش کی کہ امریکہ میں تو پوجا کے لیے شولنگ کا بت دستیاب نہیں مگر مردے سے زندہ بہتر ہے۔ میں نے اسے ہمیشہ کہا کہ میری ناف حاضر ہے۔ تم اس پر سیندور لگاؤ، پھول چڑھاؤ۔ دودھ بہاؤ۔ دیا جلاؤ۔ سر جھکاؤ۔ شولنگ ہندو یا مسلمان نہیں ہوتا، اس کی



پوجا یوں بھی ہو سکتی ہے۔''

اس پر ایسا قہقہہ پڑا کہ چھت اڑ گئی۔ لڑکیاں اور لڑکے زمین پر لوٹنے لگے۔ نورالحسن کے چہرے پر گلاب کھل گئے۔ شرما نے سر جھکا لیا۔

راج نے اردو میں کہا ''کیا کرتے ہو جمال بھائی۔ یہ ہماری آپس کی بات ہے۔''

''شالا تم کیوں مسلمان کو گالی دیتا ہے۔'' نورالحسن بولا ''شالا۔ کمینہ۔ ہندو۔''

## نینسی لوگن

جمال کی کلاس میں کچھ امریکی طالب علم بھی تھے اور تعلیم کے علاوہ غالباً وہ غیر ملکی طالب علموں کی جاسوسی پر مامور تھے۔ انہی میں ایک لڑکی نینسی لوگن بھی تھی۔ عمر کوئی تیس برس۔ شکل معمولی۔ چھاتی سپاٹ مگر تھی بلا کی ذہین اور فکرمند۔ وہ غیر ملکی طالب علموں کو سمجھاتی تھی کہ دیکھو امریکہ کتنا انسان دوست ہے۔ ساری دنیا کی مدد کرتا ہے۔ جمہوریت پر یقین رکھتا ہے اور پسماندہ ملکوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس پر جمال کہتا۔ امریکہ نے جاپان پر دو ایٹم بم مارے۔ ویت نام میں خون بہا رہا ہے اور ہم غریب ملکوں کی مدد نہیں کرتا بلکہ ان کو ادھار دے کر اپنا فالتو مال بیچتا ہے۔ اس پر نینسی پریشان ہو جاتی۔ اس کو کوئی جواب نہ سوجھتا مگر یہ بھی سچ ہے کہ وہ دل سے امریکہ کی نکتہ چینی پر ناراض نہ ہوتی بلکہ دکھی ہو جاتی۔ وہ امریکہ کے معاملے میں بہت جذباتی تھی۔ اس کی شادی کی عمر تقریباً گزر چکی تھی اور اس کی سادگی اور فکرمندی کی وجہ سے اب اسے شادی کی زیادہ امید نہ تھی۔

یونیورسٹی کی دیگر لڑکیاں بھی اس زمانے میں بہت محتاط اور سنجیدہ رہتی تھیں۔ ان میں زیادہ تر کوشش کرتیں کہ کسی عرب لڑکے سے ان کی دوستی ہو جائے اور وہ تیل پیدا کرنے والے کسی ملک میں چلی جائیں مگر انہیں یہ خطرہ بھی رہتا تھا کہ اگر وہ کسی عرب لڑکے کے بہت قریب دیکھی جائیں اور وہ لڑکا ان سے شادی نہ کرے تو پھر امریکی لڑکے اس کی طرف نہ دیکھیں گے۔

یونیورسٹی کو بھی احساس تھا کہ لڑکیاں اسی عمر میں خصم ڈھونڈتی ہیں۔ اس لیے انہیں اجازت تھی کہ وہ اتوار کا دن اپنی پسند کے لڑکے کے کمرے میں گزار لیں۔

مگر سب ایک دوسری پر نظر رکھتی تھیں۔ امریکی سوسائٹی اس زمانے میں بہت قدامت پسند تھی۔

تعلیم بہت مہنگی تھی مگر یونیورسٹی نے اس کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ دفتری کام طالب علم ہی کرتے تھے اور انہیں ان خدمات کا اتنا معاوضہ دے دیتی تھی جس سے وہ فیس دے سکیں اور دیگر ضروریات کھینچ تان کر پوری کر لیں۔ بعض لڑکوں نے شادیاں کر رکھی تھیں۔ ان کی بیویاں نوکری کر کے انہیں پڑھاتی تھیں مگر غیر ملکی لڑکے وظیفہ خوار تھے اور انہیں حکومت کی طرف سے معقول رقم مل جاتی تھی۔

جمال کی کلاس آڈیو وژول کی کلاس تھی اور اس میں ایسے تمام ہنر سکھائے جاتے تھے جن کے

ذریعے اشتہار بازی اور پروپیگنڈے ہو سکے۔ تعلیم میں تمام حوالے اور تمام ساز و سامان کوڈک کمپنی کے تھے۔ غالباً وہ اپنے سامان کی فروخت کی خاطر نو آزاد ملکوں کے طالب علموں کو تعلیم دینے کے لیے یونیورسٹی کو کچھ مالی امداد دیتی تھی۔

بلومنگٹن ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس میں کیمپس کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ یہاں طالب علم پڑھائی ہی کر سکتے تھے۔ زندگی بہت دلچسپ تھی۔ یونیورسٹی مہینے میں ایک دوبار موسیقی اور ڈانس ڈرامے فنکشن منعقد کراتی تھی جن میں امریکہ کے بڑے بڑے آرٹسٹ بلائے جاتے تھے۔ اساتذہ میں طالب علم تقسیم کر دیئے گئے تھے جو انہیں باری باری گھر بلا کر بال بچوں سے ملواتے اور ان کا جی بہلانے کی کوشش کرتے تھے اور غالباً اس کے لیے بھی اساتذہ کو الاؤنس ملتا تھا۔

طالب علموں کو امریکی طرزِ زندگی بھی سکھایا جاتا تھا اور ان سے ان کے سماجی حالات کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی جاتی تھیں۔ مثلاً تمہارے ہاں اہم فیصلے کس طرح ہوتے ہیں۔ معاشرے کی تنظیم کی شکل کیا ہے۔ حکومت اور عوام کے تعلقات کیسے ہیں۔ سیاسی پارٹیاں کس طرح کام کرتی ہیں اور مذہب کے بارے میں قوموں کے رویئے کیا ہیں۔ اس زمانے میں تو جمال کو اندازہ نہ ہوا کہ آڈیو وژول کلاس سے سوشیالوجی کے پراجیکٹس کا کیا تعلق ہے مگر بعد میں وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ امریکہ تیسری دنیا کے ملکوں کا پشتارا باندھنے کے خیال سے انہیں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کا بنیادی مقصد اپنی منڈی، اپنے نظریئے اور طرز زندگی کی توسیع ہے۔ نینسی سے وہ کبھی کبھی ہر بات کر لیتا تھا۔ وہ ایک سوچنے والی لڑکی تھی اور اگرچہ ان دونوں میں زیادہ تر جھگڑا ہی ہوتا تھا مگر دونوں میں دوستی بھی تھی۔ نینسی نے کبھی اس سے اپنی نسائیت کا اظہار نہ کیا تھا اور یہی اس کی غلطی تھی۔ جمال مذاق مذاق میں اسے کہتا، نینسی آئی لو یو اور وہ اس پر مسکرا دیتی۔

## ہفتے کی رات

عید کی نماز اور شولنگ پوجا کے واقعے کے کچھ دن بعد نینسی نے جمال سے کہا ”ہفتے کی رات تم میرے ساتھ گزارو۔ میں تمہیں تلی ہوئی مچھلی کھلاؤں گی اور شراب بھی ہم دونوں مل کر پیئیں گے۔ تیسرا کوئی نہ ہوگا۔ میں شام کو سات بجے آ کر تمہیں اپنے فلیٹ میں لے جاؤں گی۔“

نینسی کا فلیٹ بہت سادہ مگر با سلیقہ تھا۔ وہ باورچی خانے میں گئی تو جمال کو بھی ساتھ لے گئی۔ ڈرائنگ روم میں اس نے امریکی میوزک کے ریکارڈ لگا دیئے جن کی ہلکی ہلکی موسیقی دور سے اچھی لگتی تھی۔ نینسی مچھلی تلتی اور باتیں کرتی رہی۔ شراب کے دو جام اس نے پاس کی تپائی پر رکھ دیئے تھے جن میں سے دونوں گھونٹ گھونٹ پیتے رہے۔ نینسی نے اس روز بھی سادہ اور بے رنگ کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس روز بھی اس کا چہرہ میک اپ کے بغیر تھا۔ اس نے کوئی ایسی بات نہ کی جس سے جمال کو یاد آئے کہ فلیٹ میں وہ ایک لڑکی کے ساتھ اکیلا [illegible] نینسی کو اس قسم کی باتیں آتی ہی نہ تھیں۔ اسے صرف



امریکہ کا دنیا میں برے امیج کا غم تھا۔ اس کے سارے جذبات امریکہ پر مرتکز تھے۔

مچھلی تل کر دونوں کھانے کی میز پر چلے گئے۔ وہاں انہوں نے اور شراب پی اور مچھلی کھائی۔ پھر وہ باتیں کرنے لگے۔ زیادہ تر بے معنی۔

اچانک نینسی خاموش ہوگئی۔ پھر بولی ”جمال تم کہتے تھے نینسی آئی لو یو..... کیا تم سچ کہتے تھے؟“

جمال بات کو بالکل نہ سمجھا۔ بولا ”ایمان سے نینسی میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو؟“

نینسی بولی ”یہ تو میں نے تمہیں کبھی نہیں کہا، مگر کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو یا ایسے ہی مذاق تمہاری عادت ہے؟“

”تم کیوں آج مجھ پر شک کرتی ہو؟“

نینسی نے بے خیالی میں اپنے بلاؤز کے بٹن ڈھیلے کرنے شروع کر دیئے۔

”آج گرمی بہت ہے۔“ جمال نے کہا۔

”ہاں۔ تم بستر پر لیٹ کیوں نہ جاتے؟“

جمال نے ثابت کیا کہ میں بالکل الو کا پٹھا اور پرلے درجے کا بے وقوف ہوں۔ اس نے کہا۔ ”میرے خیال میں دیر بہت ہو رہی ہے۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔“

نینسی کا منہ اتر گیا۔ بولی ”دیر تو ہوگئی ہے مگر اتنی بھی نہیں۔ کیا تمہیں بہت نیند آ رہی ہے؟ کل تین پیگ تو تم نے پیے ہیں۔ اگر بہت نیند آ رہی ہے تو یہیں سو جاؤ۔“

جمال پھر بھی کچھ نہ سمجھا۔ اس نے کہا ”نہیں نینسی پیاری اب مجھے چلنا چاہیے۔“

کچھ دیر نینسی اسے گھورتی رہی۔ پھر بے دلی سے بولی ”چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔“

اس نے بلاؤز کے بٹن دوبارہ بند کیے۔ بالوں میں برش پھیرا اور جمال کو ساتھ لے کر نیچے اتر آئی۔

کیمپس میں پہنچ کر نینسی نے کہا ”جمال تم بڑے بے وقوف ہو۔ اینڈ آئی لو یو فار دیٹ! ایسا بھولا آدمی میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔ تمہیں ایک لڑکی اکیلی کمرے میں لے گئی اور تم نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ تمہاری جگہ کوئی امریکی ہوتا تو مجھے کبھی نہ چھوڑتا۔“

جمال کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ نینسی مجھ سے کیا چاہتی تھی۔ شرم سے وہ پانی پانی ہوگیا۔ اس بیچاری کی جسمانی ضروریات بھی ہوں گی اور اس نے جمال سے جی بھی لگا لیا تھا مگر یہ اس کی بھی غلطی تھی کہ اس نے جنسی رغبت کا کبھی اشارہ تک نہ کیا تھا۔ وہ ایسی ہی شریف اور وضع دار لڑکی تھی!

## فلم کی تربیت

جمال امریکہ میں یہ سوچ کر آیا تھا کہ مجھے یہاں فلم کی تربیت ملے گی مگر انڈیانا یونیورسٹی میں

فوٹوگرافی ساؤنڈ ریکارڈنگ اور ایڈیٹنگ سے کہیں زیادہ فن اشتہار بازی امریکی سماجی تصورات اور فرد کی آزادی کے حوالے سے عمرانیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ فلم اور فن کی جمالیات کا نصاب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جمال اپنے ملک کے عوام کو ذہنی طور پر مجہول نہ سمجھتا تھا۔ ان کو نئے نظریات کی نہیں بلکہ وسائل اور جدید تعلیم کی ضرورت تھی۔ اس نے سوال اٹھا اٹھا کر اپنے استادوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔

اتنے میں کراچی سے امریکی ایڈوائزر ڈاکٹر گرین یہ دیکھنے کے لیے انڈیانا آ گئے کہ پاکستانی طلبہ خصوصاً جمال کی تعلیم کا کیا حال ہے۔ وہ بگڑا بیٹھا تھا۔ اس نے ڈاکٹر گرین سے کہہ دیا کہ میں اپنی تعلیم سے مطمئن نہیں۔ مجھے فلم کی ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر گرین فوراً اسے یونیورسٹی آف سدرن کیلی فورنیا لاس اینجلس بھجوانے پر رضامند ہو گئے۔ لاس اینجلس یعنی ہالی وڈ جس کے تصورات سے دنیا رنگین تھی۔

پھر ڈاکٹر گرین نے کہا ''اب تم پس ماندہ اقوام میں پبلسٹی کے فن سے بخوبی واقف ہو گئے ہو گے۔''

''بخوبی۔'' جمال نے کہا۔

''تم نے کراچی میں ٹیلی ویژن کے منصوبے کی مخالفت کی تھی جو امریکہ پاکستان کو دینا چاہتا تھا۔ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ پس ماندہ اقوام کی ترقی کے لیے ٹیلی ویژن کس قدر ضروری ہے۔''

کراچی میں جمال کو ڈاکٹر گرین نے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اسے کافی پینے کے لیے گھر بھی بلایا تھا اور اس کی طرح دار بیوی نے اس سے بڑی دلداری کا سلوک کیا تھا مگر جمال اپنے خچرپن سے نہ ٹلا تھا۔ مسٹر ڈین پیرزادہ اس کے نوٹ کو مسترد کر چکے تھے مگر حکومت پاکستان میں کسی چھوٹے افسر کے نوٹ کو مسترد کرنے کی روایت نہ تھی۔ اس لیے حکومت کی پالیسیاں چھوٹے افسروں کی بنائی ہوئی ہوتی تھیں۔ ٹیلی ویژن کا منصوبہ معطل ہو گیا۔

ڈاکٹر گرین نے اب اسے اپنی حماقت یاد دلائی مگر جمال اپنی بات پر اڑا رہا۔

پھر ڈاکٹر گرین کے ساتھی نے کہا ''جمال اس منصوبے میں تمہاری پروموشن بھی ہو سکتی ہے۔''

جمال نے کہا ''میری تنخواہ کافی ہے اور پروموشن کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔''

ڈاکٹر گرین اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ وہ بولا ''تم شاید پروموشن کے معنی نہیں سمجھتے۔ یہ ایک تجارتی ترکیب ہے مگر آپ لوگوں کو تجارت آئے تب نا۔''

''تجارت تو واقعی ہمیں نہیں آتی۔''

''امریکی تجارت کے فن سے واقف ہیں۔ دنیا ہمارے پروں کے نیچے ہے مگر اسے ہم نے بندوق سے فتح نہیں کیا۔ ہم نے تجارت کی اور اس میں ہمیشہ اپنے گاہکوں کے فائدے کو بھی ملحوظ رکھا۔''

''یہ عقل کی بات ہے۔ شرافت کی بات ہے۔''

''پروموشن کا مطلب یہی ہے ہم کمائیں تو تم بھی کماؤ مسٹر جمال۔''



''کس طرح؟ میں کس طرح کماؤں؟''

''تمہیں منافع میں سے حصہ ملے گا یعنی پروموشن۔ تم ٹیلی ویژن کے منصوبے کی حمایت کر دو۔ دنیا کے کام اسی طرح چلتے ہیں دوست۔ تم جس بینک میں چاہو گے رقم جمع ہو جائے گی۔ امریکی تاجر بہت بااصول اور ایماندار ہوتے ہیں۔''

جمال نے صاف جواب دے دیا اور کراچی میں مسٹر ڈین پیرزادہ کو ساری گفتگو کی روداد لکھ بھیجی۔ چنانچہ ٹیلی ویژن کا منصوبہ کئی سال تک رکا رہا۔

## لاس اینجلس

لاس اینجلس پہنچنے سے پہلے وہ امریکی طرز زندگی کو کسی حد تک سمجھ چکا تھا۔ مگر یہاں آ کر اس کی آنکھیں دکھنے لگیں۔ دھند اور دھوئیں نے ہوا مستقل طور پر زہریلی کر رکھی تھی۔

جمال نے ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ یہاں بھی سینما کی کلاس میں سوڈان کا ہاشم اور تیونس کا عبدو ہی اس کے دوست بنے۔ شام کو پڑھائی کے بعد وہ مل کر سڑکوں پر گھومتے۔ چھوٹے مے خانوں میں بیئر پیتے، پھر رات گئے ہاشم کسی رنڈی سے معاملہ کرتا اور فارغ ہو کر اپنی ننھی بچی کو یاد کر کے روتا۔

جمال بھی تنہائی سے اکتا گیا تھا۔ اس نے صرف کلاس کے دوران لیکچر دھیان سے سنے۔ کورس کے خاتمے پر اسے فلم بنانے کی کچھ شُد بُد ہو گئی تھی۔ مگر کیا واقعی اس نے فلم سازی سیکھ لی تھی؟

یہاں غیر ملکی طلبہ کے لیے خصوصی سینما کلاس تھی مگر انہیں بلومنگٹن کی طرح کوئی پوچھتا نہ تھا۔ تنہائی کا احساس یہاں بہت ہوتا تھا۔ اگرچہ لاس اینجلس بہت بڑا شہر تھا۔ اس کا موسم بھی کراچی جیسا تھا نہ گرمی نہ سردی اور اس کے بازار بہت پُررونق تھے اور یہ احساس کچھ جمال ہی پر موقوف نہ تھا۔ خود مقامی امریکی بھی سناٹے میں رہتے تھے۔ انہیں آپس میں بات چیت کرانے کے لیے یہاں کئی انجمنیں تھیں جو لوگوں کو بلا کر انہیں کہتیں کہ کوئی اس پر بولے کہ محبت ڈالروں سے زیادہ قیمتی ہے یا یہ کہ ہم امریکی بہت بے وقوف لوگ ہیں یا اس پر کہ امریکہ کے پاس سب کچھ ہے اس لیے اسے دنیا کے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ لوگ وہاں جا کر بھی چپ رہتے۔ پھر اس کی مہتمم جو عموماً کوئی عورت ہوتی خود بات چھیڑتی اور حاضرین کو بلا بلا کر پوچھتی کہ تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے۔ مگر لوگ بالعموم چپ ہی رہتے۔ جمال کے لیے یہ ایک عجیب تجربہ تھا۔

پھر وہ حیران ہوا جب اس نے اخبارات میں اشتہار پڑھے کہ 85 برس کی خاتون جس کے پاس بھیڑوں کے گلے ہیں، اپنا مکان ہے، سوئمنگ پول ہے اور جس کی صحت اچھی ہے۔ بر مانگتی ہے جو 80 اور 90 کے درمیان ہو۔ جاز موسیقی کا شوقین ہو، سگریٹ نہ پیتا ہو اور پیدل چلنا پسند کرتا ہو۔ اس کو جائیداد میں سے نصف حصہ بھی دیا جائے گا اور جیب خرچ بھی مگر اسے بعد میں پتہ چلا کہ 85 سالہ بڑھیا کو عائلی زندگی مطلوب نہیں تھی۔ اسے ایک ساتھی کی ضرورت تھی جس سے وہ بیٹھ کر باتیں کرے۔ اس قسم کے اشتہارات اخبارات

میں روزانہ چھپتے تھے۔ غریب بوڑھے اولڈ پیپلز ہوم میں رہتے تھے اور ان کے بچے سنڈے کے سنڈے یا مہینے کے مہینے ایک گھنٹہ انہیں دیکھنے کو آ جاتے تھے۔ امیر بوڑھے اور بوڑھیاں فی گھنٹہ کرائے پر بھی دوست ڈھونڈتی تھیں۔

غیر ملکی طلبہ سے پوچھا گیا کہ تمہارے خیال میں سب سے بڑے تین امریکی کون ہیں۔ زیادہ تر نے لکھا جارج واشنگٹن، ابراہیم لنکن اور روز ویلٹ۔ جمال نے لکھا والٹ ڈزنی، مارک ٹوئن اور چارلی چپلن۔

مارک ٹوئن کو بہت کم امریکی جانتے تھے۔ چارلی چپلن کو کمیونزم کا حامی اور امریکی اقدار کا دشمن سمجھ کر ملک سے نکال دیا گیا تھا اور اس پر کوئی بات کرنا نہ چاہتا تھا۔ روز ویلٹ نے دوسری جنگ لڑی تھی اور امریکہ کو اسلحہ جات کی تجارت اور صنعتی ترقی کے ذریعے دنیا کی عظیم طاقت بنا دیا تھا۔

## ابھی تو تم جوان ہو

جمال کو والٹ ڈزنی سے ملاقات کا بہت شوق تھا۔ اسے پتہ چلا کہ والٹ ڈزنی اپنے سٹوڈیو میں فلاں دن اپنی نئی فلم ''سلیپنگ بیوٹی'' پر کتاب بیچے گا تو اس نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ قیمت سے زیادہ دو ڈالر دینے والے کو وہ اپنی دستخطی کتاب بھی دیتا اور اس سے ہاتھ بھی ملاتا۔ جمال نے اس کا ہاتھ چھوڑنے سے پہلے کہا ''والٹ میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ تم ابھی جوان ہو۔''

''تو کیا تم مجھے بوڑھا سمجھ کر آئے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا خیال تھا تم بوڑھے ہو گے ورنہ اتنی پختگی تمہارے فن میں نہ ہوتی۔ مگر شکر ہے کہ تم جوان نکلے۔''

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے دوست، میں جوان نہیں۔''

''نہیں تم جوان ہو والٹ مارلین منرو نے مجھے تمہارے بارے میں یہی بتایا تھا۔''

والٹ ڈزنی کو یہ بات پسند آئی۔ اس نے ہنس کر کہا ''میں تو کئی برس سے اس کے خواب دیکھ رہا ہوں مگر تم نے آتے ہی اس سے دوستی کر لی۔ بہت چالاک لگتے ہو۔ کس ملک سے آئے ہو؟''

''پاکستان سے۔''

''ہندوستان میں ہے نا؟''

''ہندوستان میں نہیں۔ ہندوستان کے شمال مغرب میں ہے۔''

''مجھے تو ابھی تک پاکستان کا بھی صحیح طور پر پتہ نہیں اور تم مارلن منرو کے بیڈ روم تک کی باتیں کر آئے!''

''وہ تمہاری جوانی کی شہادت دے تو تم انکار نہیں کر سکتے والٹ۔'' جمال نے ہنس کر کہا۔



''تم نے تو ابھی کہا تھا کہ میرے پاس وقت نہیں ہوتا۔''

والٹ بولا ''مگر مارلن منرو کے لیے میرے پاس بہت وقت ہے۔ تم بہت دلچسپ آدمی ہو۔ کیا تم نے میرا اسٹوڈیو دیکھا ہے؟''

''نہیں دیکھا۔'' جمال نے کہا۔

''کاش کہ میں تمہیں خود چل کے دکھا سکتا مگر اس کو دیکھنے میں کم سے کم دو دن لگتے ہیں۔ فی الحال مجھے یہ کتاب بیچنی ہے۔''

''تم یہ کتاب خود کیوں بیچتے ہو؟''

''اس طرح مجھے دو ڈالر زیادہ ملتے ہیں۔''

''تمہیں دو ڈالروں کی کیا ضرورت ہے؟''

''یہ دو ڈالر جب ہزاروں ڈالر ہو جائیں گے تو میں کسی ہونہار طالب علم کو وظیفہ دوں گا۔''

والٹ ڈزنی کا سٹوڈیو بے حد لمبا چوڑا تھا اور واقعی اسے دیکھنے کے لیے کم سے کم پورے دو دن درکار تھے۔ بڑے بڑے ہال کمروں میں دو دو تین تین منزلہ کیمرے لگے تھے۔ پھر روشنیوں کے بڑے بڑے سٹینڈز، شوٹنگ کی میزیں، پس منظروں کی ڈرائنگز اور دیگر سامان رکھا تھا جسے مختلف طریقوں سے تصویروں میں شامل کیا جاتا تھا۔

دو چار ہال دیکھ کر جمال اکتا گیا۔ اب کون ایکڑوں میں پھیلے ہوئے سٹوڈیو میں پھر پھر کر جان کھپائے۔

جمال نے لاس اینجلس میں دیگر سٹوڈیو بھی دیکھے۔ ان کی وسعت، پھیلاؤ اور نظم و نسق کا بیان مشکل ہے۔ جس علاقے میں یہ سٹوڈیو واقع ہیں اسے ہالی وڈ کہتے ہیں۔ یہ کسی خاص جگہ کا نام نہیں۔ یہاں فلمیں بالعموم دو ہفتے میں بن جاتی ہیں۔ بعض تین ہفتوں میں اور اس سے زیادہ ایسی فلموں میں وقت لگتا ہے جن کی شوٹنگ کے لیے غیر جگہوں یا دور دراز کے مقامات پر جانا پڑتا ہے۔

فلم کے سارے سیٹ ایک ہی دفعہ لگ جاتے تھے اور شوٹنگ کے لیے سارا سٹوڈیو مخصوص ہو جاتا تھا۔ ان کی لائٹنگ کے نقشے بھی ایک ساتھ بن جاتے تھے۔ ایکٹروں کو تمام مکالمے زبانی یاد ہوتے تھے۔ بڑی سے بڑی ایکٹریسز کو بھی پورے میک اپ کے ساتھ آٹھ بجے سیٹ پر پہنچنا پڑتا تھا اور لازم تھا کہ پہلا شاٹ ساڑھے آٹھ بجے تک ہو جائے۔

لاس اینجلس میں کوئی کسی کو جانتا نہ تھا۔ جمال امریکہ میں تنہائی کی وجہ سے اکتا گیا تھا۔ اس کی نیند اڑ گئی۔ اس نے احتیاطاً شام کی شفٹ لی ہوئی تھی۔ رات کو پڑھ کر آتا تو نہایت ٹوٹے دل سے کھانا پکاتا اور برتن مانجھ کر بستر میں گر جاتا۔ کروٹیں بدلتے بدلتے کہیں رات صبح کے پانچ بجے اسے نیند آتی اور وہ دن کے دو بجے جاگتا۔

لاس اینجلس میں رات کی تفریح بڑی گھٹیا تھی اور آسانی سے دستیاب تھی۔ کبھی کبھی ہفتے کی رات کو وہ سوڈان کے ہاشم کے ساتھ گھٹیا علاقوں کے چکر لگاتا۔ جمال کو رسماً اس کے ساتھ بیئر بھی پینی پڑ جاتی۔

رنڈیاں باروں میں باقاعدہ بیٹھتی تھیں اور بار والے ان سے کمیشن لیتے تھے۔ ان کے پاس اپنی کاریں اور اپنے فلیٹ تھے۔ وہ معاملے کے بعد گاہکوں کو اپنی کاروں میں لاد کر اپنے فلیٹوں میں لے جاتیں اور بھگتا کر واپس چھوڑ جاتیں۔ ایسے شریفانہ تجارتی اصول جمال نے اور کہیں نہ دیکھے۔

امریکہ کے غیر ملکی طلبہ کی تعلیم میں ان کو امریکی طرز زندگی اور امریکہ سے متعارف کرانا بھی شامل تھا۔ اس سلسلے میں طلبہ کو امریکہ کے مختلف مقامات کی سیر کرائی جاتی تھی۔

## میامی کا ساحل

میامی کے ساحل پر جمال کو کراچی بہت یاد آیا۔ یہ کیوبا سے قریب ترین امریکی شہر ہے اور اپنی تفریحات کے لیے دنیا بھر میں مشہور۔ کراچی کے پانیوں کی طرح یہاں بھی سمندر گندا تھا۔ اس کے ساحل پر بمبئی کے جوہو بیچ کی طرح تاڑ کی قسم کے بڑے بڑے درخت جھولتے تھے۔ موسم بھی ویسا ہی تھا۔ گیلا اور بدبودار مگر آگے دیکھیے تو دنیا ہی دوسری تھی۔

میامی امریکی روسا اور تاجروں کی تفریح گاہ بھی تھی۔ کمپنیوں کے ڈائریکٹر اور مالک سال میں ایک بار اپنے اجلاس اسی شہر میں کرتے تھے۔ یہاں بوڑھے امراء کے ساتھ جتنی حسین اور چھنال سیکریٹری لڑکیاں ہوتی تھیں اتنی شاید ہالی وڈ میں بھی نہ ہوتی ہوں گی۔ ان لڑکیوں کے فرائض منصبی بھی بہت وسیع ہوتے تھے اور کسی سے کسی بات کا پردہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ لڑکیاں بعض سودوں میں رکاوٹ دور کرنے کے لیے یا اچھا سودا ہو جانے کی صورت میں بطور اظہار تشکر یا دانہ ڈالنے کے لیے فریق مخالف کو مستعار بھی دی جاسکتی تھیں۔ دنیا میں سب سے اہم قدر منافع ہے اور منافع معقول ہو یا تنخواہ بھاری دی جائے تو ملازمین کسی بھی خدمت سے انکار نہیں کرتے۔ امریکی تاجر تنخواہیں دینے میں ہاتھ کھلے رکھتے تھے اور تنخواہوں کے تعین میں شخصیت کا معاوضہ الگ سے شمار کر لیتے تھے یعنی لڑکی جتنی حسین ہوگی اتنی ہی اس کی تنخواہ زیادہ ہوگی اور اتنی ہی اس کی خدمات وسیع ہوں گی۔

## تالاب کے کنارے

وہ چھنال جمال کو ہوٹل مانٹ مارلو کے تالاب کے کنارے ملی۔ وہ نہانے کا کچھا پہنے اکیلی اور اداس بیٹھی تھی۔ لڑکی کسی کمپنی کے ڈائریکٹر کے ساتھ آئی تھی۔ اس کا بدن نہایت چست تھا اور اس کے سوئمنگ سوٹ میں سے پھٹا پڑتا تھا۔

جمال کو بڑی حیرت ہوئی جب اس نے اس کے پاس آ کر کہا ''ایکسکیوز می۔ کیا تم ہندوستانی ہو؟''



''اوہ! ایک ہی بات ہے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''کیا میں تھوڑی دیر کے لیے تمہارے پاس بیٹھ جاؤں؟''

جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کا بدن گیلا تھا۔ ٹانگیں خوبصورت جو شام کی نرم دھوپ کے سونے میں چمک رہی تھیں۔ جمال نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ پھر منہ موڑ لیا۔ پھر دیکھا اور پھر اس کی نظریں اسی پر جم گئیں۔

''تم ہندوستانی اور پاکستانی بچوں کی طرح لڑتے ہو۔ تمہیں بالغوں کی طرح سوچنا چاہیے۔'' اس نے مشفقانہ سرزنش کے انداز میں کہا۔

جمال بولا ''تم ہمارے تضادات کو نہیں سمجھ سکتیں۔''

''کیوں نہیں سمجھتی۔ میں کلکتے میں پیدا ہوئی تھی۔ مجھے ہندوستانی بڑے اچھے لگتے ہیں اور پاکستانی بھی۔ آخر تم لوگ ایک ہی نسل سے ہو۔ بڑے عاشق مزاج ہوتے ہو تم لوگ۔''

''تمہارا باپ کلکتے میں کیا کرتا تھا؟''

''میرا باپ امریکی تجارتی مشن میں تھا۔ مجھے اب بھی کلکتے کی کچھ جھلکیاں یاد ہیں۔ بعض تصویریں ذہن سے کبھی نکلتی نہیں۔''

''کلکتہ بہت خوبصورت شہر ہے۔'' وہ بولی۔

''اتنا خوبصورت تو نہیں۔'' جمال نے کہا ''گندا اور غریب بہت ہے۔ ویسے دلچسپ ہے۔''

''امریکہ تمہیں کیسا لگا؟'' لڑکی نے بچوں کے سے اشتیاق سے پوچھا۔

''بہت خوبصورت۔ جی چاہتا ہے آدمی دیکھتا ہی رہے۔''

''تم نے ابھی تک کیا کیا دیکھا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی تو میں دیکھ ہی رہا ہوں۔'' جمال بولا۔

اچانک لڑکی کی نظریں جمال کی نظروں کا پیچھا کرتے ہوئے اپنی چڈی پر جا پہنچیں۔ بولی ''بہت شریر ہو تم۔ شکل سے ایسے نہیں لگتے۔''

جمال بھی کسی قدر شرما گیا۔ اس کی چوری پکڑی گئی تھی۔ مگر جب پکڑی ہی گئی تو اس نے کہا ''تم بہت دلربا لڑکی ہو۔ آدمی کو بے بس کر سکتی ہو۔ مسافروں کو راستہ بھلا سکتی ہو اور منزلیں کھوٹی کر سکتی ہو۔''

''کیا واقعی؟'' وہ بولی۔ ''ہندوستانی تعریف کے معاملے میں بہت جوشیلے ہوتے ہیں۔ تم لوگ اصل میں سارے کے سارے شاعر ہو۔ محبت کرنا تو کوئی تم سے سیکھے۔''

''میں ہندوستانی نہیں، پاکستانی ہوں اور تعریف کرنے میں اتنا جوشیلا بھی نہیں مگر تم جادوگر ہو اور اپنے جادو کو جانتی بھی ہو۔''

''انگریزی تعریف کے معاملے میں گونگی زبان ہے۔تھینک یو کے سوا اس کے پلے کچھ نہیں مگر تم لوگ بات کرتے ہو تو تمہارے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔کیا تمہارے اندر کے چمن ہمیشہ کھلے رہتے ہیں؟تم بہت عمدہ آدمی ہو۔میں بس اتنا ہی کہہ سکتی ہوں۔''

''مگر یہاں ہر حسین لڑکی کسی بوڑھے بازو سے لپٹی دکھائی دیتی ہے۔کیوں بھلا؟''

وہ کسی قدر حیرت سے بولی''کیا تمہاری گرل فرینڈ نہیں تمہارے ساتھ؟اکیلے آئے ہو؟''

''مجھے کون پوچھتا ہے۔'' جمال نے کہا''پھر میں کوئی امیر آدمی نہیں۔کسی کمپنی کا ڈائریکٹر نہیں۔ محض ایک طالب علم ہوں۔اکیلا ہوں یہاں۔''

''آئی ایم سوری۔'' وہ بولی۔''میرے خیال میں تم یہاں اکیلے ہو کیونکہ تم ذرا شرمیلے ہو۔اگرچہ تم ایسے لگتے نہیں۔یہاں حسین لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں جن کو حسین ساتھیوں کی تلاش ہوتی ہے۔تم کیوں نہیں کسی کا بازو تھام لیتے۔کوئی لڑکی تمہارے آگے انکار نہیں کرے گی۔میامی میں لوگ کام کے علاوہ محبت کے لیے بھی تیار ہو کر آتے ہیں۔''

''آتے ہوں گے۔'' جمال بولا''میں واقعی بہت شرمیلا آدمی ہوں۔یہ بے باکی تو محض میرا سوئمنگ سوٹ ہے۔''

''تم ہندوستانی پراسرار باتیں کرتے ہو۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''میں ہندوستانی نہیں ڈارلنگ۔''

''آئی ایم سوری۔تمہاری باتیں ذو معنی ہوتی ہیں۔جو کچھ کہتے ہو اس کے باطن میں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔''

''میرے اندر تو تمہارے لوبھ کے سوا کچھ بھی نہیں اس وقت،مگر تم مشکل سے یقین کرو گی۔''

''بے شک میں مشکل سے یقین کروں گی۔'' وہ بولی۔''کیا میں تمہیں بہت پیاری لگتی ہوں۔''

''بہت پیاری۔اپنے گرد لپیٹ لینے والی،پاگل کر دینے والی اور مار ڈالنے والی۔''

''چلو تھوڑی دیر کے لیے تالاب میں کھیلیں ذرا۔''

جمال نے کہا''چلو۔''

دونوں نے ایک ساتھ چھلانگیں لگا دیں۔پانی گہرا تھا اور جمال کو تیرنا زیادہ نہ آتا تھا۔گھبرا کر اس نے لڑکی کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔

وہ بولی''اب اتنے بے قرار نہ ہو جاؤ۔میرے پاس کے کمرے کی کھڑکی بھی ادھر کو کھلتی ہے۔میں شام کو تمہارے کمرے میں آ جاؤں؟کیا خیال ہے؟''

''کمرہ نمبر 918۔شام کو آٹھ بجے۔'' جمال نے غوطہ کھاتے ہوئے کہا۔



''اب مجھے چھوڑ دو۔میری انگیا کا فیتہ ٹوٹ جائے گا۔'' وہ مچھلی کی طرح پھسل کر اس کے ہاتھ سے نکلی اور سر کے بل پانی میں غوطہ لگا گئی۔جمال کنارے کی طرف بھاگا۔

## شام کا رنگ

شام کو سات ہی بجے جمال نے دوبارہ شیو کی۔قمیص تبدیل کی اور خوشبو لگا کر انتظار میں بیٹھ گیا۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ میں نے لڑکی کا نام نہ پوچھا۔یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ کس کمرے میں ٹھہری ہوئی ہے۔ اگر وہ میرے کمرے کا نمبر بھول جائے تو میں جا کر اسے لا سکتا تھا۔

شام سنولا چکی تھی۔میامی کی شاہراہ پر دونوں طرف بڑے بڑے عالیشان ہوٹل بنے تھے جن میں روشنی ہو رہی تھی۔ڈانس ہالز میں سے ہلکی ہلکی موسیقی کی آوازیں آ رہی تھیں۔اسے پتہ تھا کہ میں تو ایک معمولی طالب علم ہوں۔شاید وہ لڑکی سمجھتی ہو گی کہ میں بھی کوئی بے وقوف ایشیائی امیرزادہ ہوں۔دل ہی دل میں اسے لڑکی کی سادگی پر افسوس ہونے لگا۔

میامی میں موسم معتدل،ہوا کھلی اور نرم دھوپ کے سوا کوئی خاص بات نہ تھی مگر امریکی امرا اس شہر کے دیوانے تھے۔وہ یہاں آ جاتے تو ان کی ڈھلتی عمر کی باذوق بیویاں دونوں جیبیں ڈالروں سے بھر کر روم اور کوپن ہیگن چلی جاتیں جہاں کے بانکے پیسے لے کر انہیں لذت کے چند لمحے مہیا کر دیتے۔

کیونکہ اس زمانے میں موسم وہاں بھی شریر ہو جاتے تھے۔

میامی میں میٹنگ کرنے والے امیر امریکی تاجروں کو جو اپنے ساتھ حسین اور چست سیکریٹری لڑکیاں لاتے تھے،اپنی بیویوں کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا مگر وہ اس پر شکر کرتے تھے کہ چند ہفتوں کے لیے انہیں اپنی بوڑھی بلیوں سے نجات مل گئی۔اس پر طرہ یہ کہ واپسی پر ان کی گھریلو زندگیاں کسی قدر خوشگوار ہو جاتیں کیونکہ دونوں کے پاس گفتگو کے لیے موضوعات ہوتے اور یہی امریکہ کی بالائی سوسائٹی کا رونا تھا ورنہ کوئی کسی سے بات ہی نہ کرتا تھا۔

اس روز آٹھ بج ہی نہ رہے تھے۔جمال سوچنے لگا کہ یہ لڑکی نہ تو بات کرنے میں ہچکچائی اور نہ اس نے تالاب میں جمال کے ساتھ خلط ملط ہونے کا برا منایا بلکہ اس نے کہا ہم جوان لڑکیاں اپنے بوڑھے مالکوں کی دلجوئی کرتے کرتے تھک جاتی ہیں اور میامی میں آ کر ہمارا بھی دل چاہتا ہے کہ کوئی ہم عمر نوجوان،کوئی جوشیلا،کوئی من چلا ایک شام ہمارے ساتھ گزارے۔پھر اس نے خود ہی اس کے کمرے میں آنے کی پیشکش کر دی۔یہ بہت عجیب لڑکی ہے۔کیوں اس نے ایک غریب ملک کے اجنبی کو شام کا رس سمجھ لیا۔

اس نے لیموں رنگ کا خوشنما فراک پہنا ہوا تھا۔اس کے گال چمک رہے تھے۔اس کے ہاتھوں میں سفید دستانے تھے۔وہ ٹھیک آٹھ بجے آئی۔جمال نے اس سے پوچھ لیا کہ''تم نے مجھ میں دلچسپی کیوں لی؟ مجھ میں تو کوئی خاص بات نہیں۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''مجھے پتہ ہے کہ میں خوبصورت ہوں۔ مجھے بڑی اچھی تنخواہ ملتی ہے اور میری منگنی بھی ہو چکی ہے مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ تو ایک خوشگوار اتفاق ہے۔ میامی میں ہر ایک کو خوش وقتی کا حق ہے اور ٹام بہت معاملہ فہم آدمی ہے۔ تمہیں دیکھ کر مجھے کلکتہ یاد آ گیا تھا۔''

''مگر میں ہندوستانی نہیں ڈارلنگ۔'' جمال نے اسے ٹوکا۔

''اوہ آئی ایم سوری۔ ہندوستانی اور پاکستانی بہت دلچسپ لوگ ہوتے ہیں۔ ان سے ہر مضمون پر بات کی جا سکتی ہے۔ تم لوگ بڑے جذباتی ہو اور یہ اچھی بات ہے۔ امریکہ جذبات سے عاری ہو چکا ہے اور ہم لوگ اس کمی کو بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ ایک تم ہو کہ لمحہ لمحہ جیتے ہو۔ تمہیں یہ بھی برداشت نہیں کہ میں تمہیں ہندوستانی کہہ دوں۔ حالانکہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''کچھ فرق نہیں پڑتا ڈارلنگ۔'' جمال نے کہا۔ ''تم مجھے جو چاہے کہہ سکتی ہو۔''

پھر اس نے اسے سر سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تاکہ اس کا منہ چوم لے۔

وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی، بولی ''ڈارلنگ میرے بالوں کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ میں نے ابھی بیس ڈالر دے کر سیٹ کروائے ہیں۔''

جمال کا عشق ایک دم ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ میں اس کے ہلکے پیازی ہونٹ چوس کر سفید کر دوں مگر پھر اسے سوچنا پڑ گیا کہ اگر میں اس کا منہ چوموں گا تو اس کے گالوں کا میک اپ خراب ہو جائے گا۔ اگر میں اسے بستر پر لٹاؤں گا تو اس کے کپڑوں پر سلوٹیں پڑ جائیں گی۔ سوچ سوچ کر جمال نے فیصلہ کیا کہ میں اس کا ہاتھ چوم لوں۔ دستانے وہ اتار چکی تھی۔ اس کی انگلیاں بہت لمبی تھیں۔

''تمہارے ہونٹ بہت گرم ہیں ڈارلنگ۔ ایک دفعہ اور مجھے چومو۔'' اس نے کہا۔

جمال نے ایک دفعہ اور اس کے ہاتھ چومے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اس کی کلائی اور بازوؤں کی طرف بڑھا مگر فراک پر استری ابھی تازہ تھی۔ جمال کو خیال آیا کہ میں بہت بے وقوف ہوں۔ امریکی لڑکیوں سے محبت کرنے کے بھید نہیں جانتا۔ شام کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے خیال سے اس نے اسے کہا ''ڈارلنگ ایک جام وہسکی کا لو گی؟''

''ضرور۔'' اس نے کہا۔ ''مگر میں شام کو صرف شیمپین پیتی ہوں۔ اس سے سُرور آ جاتا ہے۔ نشہ نہیں ہوتا۔ وہسکی بہت گھٹیا چیز ہے۔ چلو نیچے بار روم میں۔''

بار روم میں امریکی امراء اپنی جوان سیکریٹریوں کی بغلوں میں ہاتھ ڈالے ہلکی ہلکی موسیقی پر جھوم رہے تھے۔ تیز لے پر وہ ناچ نہ سکتے تھے۔

جمال نے کرسی پر بیٹھتے ہی کہا ''مگر ڈارلنگ میں نے تو تمہارا نام بھی نہیں پوچھا۔ کیسا احمق ہوں میں!''



''میں نے بھی تو نہیں پوچھا۔ ناموں میں کیا رکھا ہے ڈارلنگ۔ کیا یہ بات رومانٹک نہیں کہ ہم تم اتفاق سے ملے۔ میں سوئمنگ کاسٹیوم میں اتنی خوبصورت نہ لگتی تو کیا ہم تم اس وقت ان کرسیوں پر بیٹھے ہوتے؟ تم کہاں ہوتے بھلا؟''

''میں، اپنے کمرے میں۔'' جمال بولا ''اور تم؟''

''میری شام آج خالی تھی۔'' وہ بولی ''مگر میں اپنے کمرے میں نہ ہوتی۔ یہیں ہوتی کسی نوجوان اجنبی کے ساتھ۔ نوجوان آدمی یہاں میامی میں کم ہی ہوتے ہیں۔ دیکھو ہے کوئی اردگرد؟''

جمال نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ان میں کچھ منجھلی عمر کے آدمی بھی تھے۔ کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے جن کی آنکھوں کے گرد کالے کالے حلقے پڑے ہوئے تھے۔ نوجوان کوئی بھی نہیں تھا ان میں۔

''جوان آدمی تمہیں دلچسپ لگتے ہیں ڈارلنگ؟'' جمال نے بے معنی سی بات کی۔

''مجھے بوڑھے زیادہ دلچسپ لگتے ہیں۔ وہ بچوں کی طرح مضحکہ خیز مطالبے کرتے ہیں۔ عاشقوں کی طرح ناز اٹھاتے ہیں اور باپوں کی طرح پیسے دیتے ہیں۔ تم جوانوں کو تو فقط چومنا ہی آتا ہے اور وہ بھی فقط ہاتھوں اور کلائیوں پر۔''

ایک ایک شیمپین کا جام دونوں نے ٹکرا کر پیا۔ سنہری شیمپین کے پیالے پر سمندر جیسی سفید سفید جھاگ جمال کو بڑی خوشنما لگی۔ اس نے کہا ''تمہارے خیال میں ڈارلنگ مجھے چومنا تو آتا ہے نا۔''

''ہاں، کیونکہ تم ہاتھوں اور کلائیوں کو چوم کر بھی پوری لذت کشید کر لیتے ہو۔ ایشیائی محبت کے فن میں بڑے مشاق ہیں۔ امریکی تو بس کتے کی طرح جھپٹ پڑتے ہیں۔ اصل میں ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔''

جمال کا جی چاہا کہ میں اس پر کتے کی طرح جھپٹ پڑوں مگر بار روم میں ایسا ممکن نہ تھا۔ اس نے کہا ''تمہیں کیسے پتہ ہے کہ ایشیائی محبت کرنے کے فن میں بڑے مشاق ہوتے ہیں؟''

''میں نے کتابوں میں یہی پڑھا ہے۔'' وہ بولی۔ ''اور ایشیائیوں کو دیکھ کر میرا اپنا خیال بھی یہی ہے۔ گو مجھے ان کا کوئی عملی تجربہ نہیں۔ تمہارا امریکی لڑکیوں کا تجربہ کیا کہتا ہے؟''

''مجھے امریکی لڑکیوں کا کوئی تجربہ نہیں۔'' جمال نے کہا۔

''یہ میں کیسے مان لوں؟'' وہ بولی۔

''میں جھوٹ نہیں بولتا۔''

''کیا تم بہت مذہبی آدمی ہو؟''

''نہیں، ایسا بھی نہیں۔''

''پھر کیا وجہ ہے؟''

''کوئی خاص وجہ نہیں۔ کسی امریکی لڑکی نے مجھے لفٹ ہی نہیں کرائی۔ ایک نے کرائی تھی تو میں اس کی بات کو سمجھ نہ سکا۔ یہ بلو ہنگٹن کی بات ہے۔''

''تم اتنے دلچسپ آدمی ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی امریکی لڑکی تمہیں لفٹ نہ کرائے اور بلو ہنگٹن والی لڑکی کے لیے تمہارے پاس وقت ہی نہیں ہوگا۔''

''میرے پاس وقت بہت ہوتا ہے۔ میں کوئی کام نہیں کرتا ڈارلنگ۔'' جمال نے کہا۔

''کیا مطلب؟ کیا دن بھر سوتے رہتے ہو؟''

''بے شک۔ میں دن بھر سوتا ہوں۔ رات کو مجھے نیند نہیں آتی۔''

''مگر تم کون ہو۔ ممکن ہے تم طالب علم نہ ہو اپنے ملک کے سفیر ہو۔ ممکن ہے کوئی بہت بڑے تاجر ہو۔ ممکن ہے کہ تم کوئی راجا ہو اور میامی میں سیر کے لیے آئے ہو۔ تم کوئی بھی ہو، میں جاننا نہیں چاہتی کیونکہ اس طرح شام کا رنگ خراب ہو جاتا ہے۔ یہ بات کیا کم ڈرامائی ہے کہ تم مجھے اتفاق سے ملے۔ یہ بات جب میں اپنی دوست لڑکیوں کو بتاؤں گی تو وہ مجھ پر رشک کریں گی۔ خاص طور پر یہ سن کر امریکہ میں تمہیں کوئی گرل فرینڈ نہیں ملی۔''

''ملی تو ہے۔'' جمال نے ہنس کر کہا۔ ''کیا یہ شام میں اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ نہیں گزار رہا۔''

''یہ شام تم واقعی اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ گزار رہے ہو جو تمہیں پھر کبھی نہ ملے گی۔ یہ شام بڑی پرلطف ہے ڈارلنگ۔''

دونوں نے ایک ایک جام شیمپئن کا پیا مگر دونوں اداس تھے۔

کچھ دیر خاموشی سے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر لڑکی نے کہا ''چلو ایک ڈانس کر لیں۔''

جمال نے کہا ''ڈارلنگ مجھے ناچ نہیں آتا۔''

''تعجب ہے۔'' وہ بولی۔ ''تم نے سیکھا نہیں ابھی تک!''

''مجھے گنتی کرنی نہیں آتی۔'' جمال بولا۔

''فاکس ٹراٹ میں تین ہی قدم ہوتے ہیں۔ ایک دو تین۔'' وہ بولی۔

''جس کا ایک ہی قدم میں کام ہو جائے اسے تین قدم چلنے کی کیا ضرورت؟''

''یہ ٹھیک ہے۔'' وہ ہنس کر بولی۔ ''تم نے ایک ہی قدم میں مجھے جا لیا۔ ایک جام اور لو ڈارلنگ۔''

جمال کے منہ سے شیمپئن کے کچھ قطرے بہہ گئے۔ لڑکی نے رومال سے اس کا منہ صاف کر دیا۔

جمال نے کہا ''بس ایک قدم اور ڈارلنگ۔ ایک آخری قدم!''

''تم شاعرانہ اشارے کرتے ہو۔''

''میں شاعر نہ تھا۔ تم نے بنا دیا۔''



''اگرچہ یہ جھوٹ ہے مگر بعض جھوٹ بڑے پیارے ہوتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اسی طرح جھوٹ بولتے رہو۔''

''تم بہت پیاری لڑکی ہو مگر یہ جھوٹ نہیں۔''

''کیا میں واقعی پیاری لڑکی ہوں۔'' اس نے تصدیق چاہی۔

''تم رنگین آگ کا گولہ ہو۔ دیکھو تمہارے قرب میں میرا جسم کیسا تپ رہا ہے۔''

لڑکی نے جمال کے گالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا ''واقعی تمہارا جسم بہت تپ رہا ہے۔ کیا اس کی وجہ میں ہوں؟''

''تم ایک کشتی ہو جس میں میرے خواب سوئے ہوئے ہیں۔ یہ کشتی کدھر جا رہی ہے؟ محبت کے کسی سہانے جزیرے کی طرف جس میں الف لیلہ کی ایک رات اُتر رہی ہے۔ میرے دل میں تمہاری خواہش کا الاؤ بھڑک رہا ہے۔ لگتا ہے کہ میں ابھی ققنس کی طرح جل کر راکھ ہو جاؤں گا اور میری راکھ میں سے تمہارے پیار کے گیت نکلیں گے۔ شعلہ ذرا اور بھڑکا۔ روشنی ذرا اور بڑھا پیاری لڑکی۔''

لڑکی مبہوت ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں کے اوپر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو گئے۔ وہ چھوٹے چھوٹے گرم گرم سانس لینے لگی۔

جمال نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ بولی ''کاش یہ لمحے کچھ لمبے ہو جائیں۔ تمہیں پیار کا فن آتا ہے۔ اُف کس قدر اعلیٰ اور مکمل مرد ہو تم! آج کی بلائنڈ ڈیٹ مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ اندھی ملاقات کتنی دلکش ہوتی ہے۔ اس کا مجھے اندازہ نہ تھا۔''

## ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے

عین اس وقت سفید سوٹ اور کالی بوٹائی والے ایک بیرے نے جھک کر لڑکی کے کان میں کچھ کہا۔ وہ گھبرا کر اٹھی اور ابھی آئی کہہ کر چلی گئی۔

بہت دیر تک جمال نے اس کا انتظار کیا بالآخر وہی بیرا آیا اور اس نے کہا میڈم نے کہا ہے کہ آپ میرا انتظار نہ کریں۔ بورڈ کی اہم میٹنگ کے سلسلے میں مجھے میامی سے ایک رات کے لیے جانا پڑ گیا ہے۔ کل آپ میرا یہیں انتظار کریں۔ کل ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے۔

مگر کل ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے جمال کو واپسی کا جہاز پکڑنا تھا۔

## مولوی صاحب نہ آئے

ہالی وڈ پہنچے تو کسی مولوی صاحب کا فون آیا۔ ان کے پاس مفتی کی چٹھی تھی کہ مولوی صاحب میرے دوست ہیں۔ تبلیغ کے سلسلے میں ہالی وڈ کا دورہ کر رہے ہیں۔ انہیں ذرا سیر کرا دو۔ امریکہ دکھا دو۔

مولوی صاحب نوجوان آدمی تھے اور کسی اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ نمازی، پرہیزگار اور پاک

صاف۔ جمال نے سوچا کہ مولانا کو اصل دلچسپی یہاں کے نچلے طبقے کے بازاروں سے ہوگی جس کا ارادہ یہ ظاہر نہیں کر سکے۔

پہلے تو وہ انہیں ایک گھٹیا پب میں لے گیا جہاں بار میں نو جوان رنڈیاں بیٹھی تھیں اور میزوں پر لوگ بیئر پی رہے تھے۔ موسیقی کی لے تیز تھی۔ تھوڑی دیر میں ایک شرابی اٹھا۔ ایک لڑکی کے پاس گیا۔ ایک منٹ بات کی۔ پھر دونوں گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ مولانا نے انہیں حیرت سے دیکھا۔ جمال نے کہا ''مولانا یہ کاروبار کا وقت ہے۔ اس میں دیر نہیں لگتی۔''

مولانا بولے ''میاں۔ یہ تو گناہ کی دنیا ہے۔ کسی ایسی جگہ چلیے جہاں جوان لوگ ہوں مگر پیشہ ور نہ ہوں۔''

جمال انہیں اپنے کالج کے کیفے ٹیریا میں لے گیا۔ وہاں لڑکے لڑکیاں بے تحاشہ پی رہے تھے۔ ناچ رہے تھے۔ گا رہے تھے اور خوش ہو رہے تھے۔

ایک ہٹے کٹے طالب علم نے جمال سے پوچھا ''کس ملک کے رہنے والے ہو؟''

جمال نے کہا ''پاکستان سے۔''

اس نے اچانک جمال کو ایسی پلٹی دی کہ وہ اچھل کر دور جا گرا۔ پھر وہ لڑکا ہنستا ہوا اس کے پاس آیا اور اسے اٹھنے میں مدد دے کر بولا ''میں نے سنا تھا پاکستان کے لوگ بڑے پہلوان ہوتے ہیں مگر تم تو کچھ بھی نہیں ہو۔''

مولانا صاحب کچھ گھبرا گئے۔

جمال نے جلدی سے ایک میز پر بیٹھ کر بیرے کو آرڈر دیا کہ وہ دو جگ بیئر کے لائے۔

''دوسرا جگ آپ کے لیے مولانا صاحب۔''

''لاحول ولاقوۃ۔''

''ارے پی لیجیے۔ یہاں کون دیکھتا ہے۔''

''اللہ تو دیکھتا ہے۔''

''اللہ تو مہربان اور ستار العیوب ہے۔ اللہ سے کیا ڈرنا۔''

''ارے نہیں صاحب۔ یہ دوسرا جگ بھی آپ ہی پی لیں۔''

جمال نے دونوں جگ اپنے سامنے رکھ لیے اور ایک کو منہ سے لگا کر آدھا خالی کر دیا۔

''آپ تو بلانوش ہیں۔'' مولانا نے کہا۔

''یہ تو میں آپ سے ملاقات کی خوشی میں پیتا ہوں ورنہ میں شرابی نہیں۔''

''یہ بھی اچھی رہی۔'' مولانا صاحب بولے۔



موسیقی کی لے کافی تیز تھی۔ لڑکیاں لڑکوں پر اچھل اچھل کر گر رہی تھیں۔ مولانا اس تماشے میں محو تھے۔ جمال نے کہا ''مولانا ایمان اور عقیدے کی بات اور ہے مگر بطور انسان کیا آپ کا دل نہیں چاہتا کہ کبھی شراب پی کر دیکھیں۔''

''اب دل کی پوچھتے ہو تو عرض ہے کہ دل چاہتا ہے، کیوں نہیں چاہتا۔ ہم میں بھی انسانی کمزوریاں تو ہوتی ہیں۔''

''اور کوئی حسینہ آپ کی بغل میں ہو۔ آپ پر کودے، آپ کو مسلے جیسے وہ نیلے فراک والی لڑکی۔''

مولانا نے سرد آہ بھری۔ ''ہاں وہ بہت جاذبِ نظر ہے۔ بے شک دل چاہتا ہے مگر وہ آگے والی بات! گناہ وثواب۔ حساب وکتاب۔ اس چکر سے نکلا نہیں جاتا۔ یہاں ہم نے لذاتِ دنیا چھوڑیں اور وہاں کی خبر خدا جانے کیا عجب کہ موت کے بعد کچھ بھی نہ نکلے۔ ہم کیڑوں کی خوراک بن کر ختم ہو جائیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آپ اچھے رہے۔ کچھ تو حاصل کیا آپ نے جسم کو تو پالا۔ اس موذی کو کھلایا چٹایا اس کو پیاسا رکھو تو جان کو آ جاتا ہے۔ اچھا ہے آپ عاقبت کے غم میں نہیں پڑے۔ جب حشر کا دن آئے گا اس وقت دیکھا جائے گا، مگر آپ تو دوسرا جگ بھی خالی کر چکے! اب کیا اور پینے کا ارادہ ہے؟ اور ہوش بھی آپ کا قائم ہے؟''

''جی نہیں۔ اب ذرا سا سرور ہے۔ کسی لڑکی سے بات کرتے ہیں۔''

مولانا اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''چلیں اب۔ ورنہ ہمارا دل قابو سے نکلا جا رہا ہے۔ اتنی سرمستی ہم سے برداشت نہیں ہو رہی۔''

ٹیکسی میں سوار ہونے تک مولانا سنبھل چکے تھے۔ انہوں نے کہا ''بھائی جمال آج کی صحبت بہت عمدہ رہی مگر پاکستان واپسی کب تک ہوگی؟''

''ابھی کچھ مہینے اور میں یہاں ہوں۔''

''جلدی نکلیے اس گناہ کی دلدل سے۔''

''مگر مولانا آپ تو ابھی اس پر للچا رہے تھے۔''

''یہی تو بات ہے۔ یہاں آ کر آدمی اپنے آپ کو بھول جاتا ہے اور میں بھی خدا جانے کیا واہی تباہی بک گیا۔ یہ شیطان کا کارخانہ ہے جو کچھ مجھ سے سرزد ہوا لللہ اس کا کسی پاکستانی بھائی سے ذکر نہ کیجیے گا اور اللہ بھی اس کے لیے مجھے معاف کرے۔''

''مگر مولانا آپ سے کچھ سرزد ہوا ہی نہیں۔''

''جو ہوا وہ بھی بہت ہے جمال بھائی۔''

''مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ امریکی صرف شراب پیتے اور ناچتے گاتے ہیں۔ وہ کام بھی کرتے ہیں۔ وقت کے پابند بھی ہیں۔ سچ بولتے ہیں اور دنیا کو فتح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر اگر وہ بشر کی

فطرت کو ذرا سی ڈھیل دے لیں تو کیا برا ہے۔''

''مگر مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا۔''

''مذہب جن باتوں کی اجازت دیتا ہے۔ ان کے بارے میں آپ کا رویہ کیا ہے مثلاً سائنس، ریاضی، کائنات کے اصول حرکت کا مطالعہ مشاہدہ روز و شب۔ مساوات، کفالت عامہ۔ آپ لوگ مذہب والے ہیں مگر فرقہ پرستی میں گرفتار ہیں۔ جہالت اور ماضی پرستی کے چنگل سے نہیں نکلے۔ غربت کو رضائے الٰہی سمجھتے ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں مگر دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ پھر آپ کے ہاں چھپ چھپا کر ہی سہی مے نوشی بھی ہوتی ہے اور چھپ چھپا کر ہی سہی ہمسائے میں یا کھلے عام بازارِ حسن میں زنا بھی ہوتا ہے۔''

''مگر ہمارا فرض تو یہی ہے کہ نیکی کو پھیلائیں اور بدی کو روکیں۔''

''مگر پہلے آپ کو یہ بتانا پڑے گا کہ آج کے حوالے سے نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے۔ آپ انفرادی حوالے سے سوچتے ہیں۔ حالانکہ اسلام ایک اجتماعی ضابطۂ حیات ہے۔ مثلاً میں نے آج آپ کے سامنے شراب پی۔ ناچتے گاتے نوجوان لڑکے لڑکیاں بھی دیکھے مگر کیا اس کا مطلب ہے کہ میں ایک گنہگار آدمی ہوں؟''

## ہالی وڈ میں فلمسازی

ہالی وڈ میں فلمسازی کا جنون اسی طرح تھا جس طرح لاہور میں، اگرچہ معیاروں کا فرق تھا۔ یہاں بھی نوجوان لڑکے لڑکیاں بغلوں میں کہانیوں کے مسودے لیے چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں اور شراب خانوں میں بیٹھ کر بڑے بڑے منصوبے بناتے تھے۔ ہر ایک کڑھتا تھا کہ امریکہ میں جوہر قابل کو کوئی آگے آنے نہیں دیتا مگر ہر ایک امریکی طرزِ زندگی اور انفرادی مسابقتی جدوجہد پر یقین رکھتا تھا۔ کامیابی کو سب قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کے لیے ہر حربہ جائز سمجھا جاتا تھا مگر امریکہ میں کوئی بھوکا نہیں مرتا تھا۔ اس لیے کسی کو سرمایہ دارانہ نظام سے بیر نہ تھا۔ سوشلزم اور کمیونزم کو وہ دور کے ایشیائی امراض سمجھتے تھے اور ان سے نفرت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے خیال کے مطابق وہاں کسی کو دولت مند ہونے کا موقع نہیں ملتا۔

سوشلزم ابھی ناکام نہیں ہوئی تھی بلکہ سوشلزم ہی کی وجہ سے انیسویں صدی کی میکانکی سرمایہ داری سوشل ویلفیئر، یعنی فلاحی ریاست کے تصور کی طرف آئی تھی اور اب مغربی ممالک اور امریکہ میں بھی بھوکوں، بیروزگاروں کو الاؤنس ملتے ہیں۔

سستے ہوٹلوں اور شراب خانوں میں کم خرچے کی فلمیں بنانے کی بات بھی ہوتی ہے اور یہ ممکن بھی تھا کیونکہ تربیت یافتہ ایکٹر، ہنرمند کارندے، کیمرے اور لائٹیں معمولی کرایوں پر مل جاتی تھیں۔ چوری چھپے کی فلم بندی کا رواج بھی تھا۔ جنسی لذت کی فلمیں جنہیں درمیانہ طبقے کے مرد عورت بھی دیکھ لیتے تھے پھر جنسی بداعمالیوں کی فلمیں، ایذا رسانی کی فلمیں اور ان میں پیسہ بھی وافر مل جاتا تھا۔ مناسب اجرت پر کسی کو بھی کسی



کام میں اعتراض نہ تھا۔

ہالی وڈ میں فیچر فلم بنانے کا چسکہ ایسا نہ تھا جو کسی کو چین کی نیند سونے دے۔ امریکہ کے دور دراز علاقوں سے حسین لڑکیاں ہیروئن بننے کے شوق میں ہالی وڈ آتیں اور ٹخیائیاں بن کر غائب ہو جاتی تھیں۔ اعلیٰ فلمی سوسائٹی میں سازش، جوڑتوڑ، چغلی، حسد اور قاتلانہ مسابقت اصولِ زندگی تھی۔ کسی لڑکی کا کسی کے ساتھ رات گزار دینا یا اپنے خاوند کو جُل دے جانا کوئی خبر نہ تھی۔ خبر یہ تھی کہ اس نے ایک رات میں کس کو کتنا چونا لگایا۔

## بچوں کے بغیر

گلوریا نے فوراً ہی جمال سے پوچھا ''تمہاری شادی ہو چکی ہے؟''

گلوریا ایک موزوں اعضا والی گائیڈ لڑکی تھی جسے یونیورسٹی نے غیر ملکی طلبہ کو ایک عجائب گھر کی سیر دکھانے کے لیے ساتھ کر دیا تھا۔

جمال نے کہا ''ہاں بارہ برس ہوئے۔''

''بچے بھی ہیں۔''

''میرے تین بچے ہیں۔''

''میرا کوئی بچہ نہیں۔ میری شادی کو بھی بارہ برس ہو چلے۔'' گلوریا حسرت سے بولی۔ غم کی گھٹا نے اس کا چہرہ سنولا دیا۔ پھر وہ کہنے لگی ''ڈینی بچوں کے خلاف ہے۔ وہ کہتا ہے مجھے چھوٹے شیطان اچھے نہیں لگتے۔ اصل میں وہ خود ایک بڑا شیطان ہے۔''

''مجھے افسوس ہے۔'' جمال نے کہا۔

گلوریا بولی ''ایشیائی بہت دانشمند ہوتے ہیں۔ کیا تم میرے گھر آ کر ڈینی کو سمجھا نہیں سکتے؟ ویسے سارے امریکی اتنے احمق نہیں ہوتے۔''

گلوریا ایک بچے کے لیے مری جا رہی تھی۔ لگتا تھا وہ ایک بچے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ جمال نے سوچا کہ میں اس کے گھر جا کر اسے گابھن کر دوں تاکہ اس کی حسرت پوری ہو جائے۔

گلوریا اسے ایک اپاہج بھکارن لگتی تھی۔ وہ اسے خیرات دینا چاہتا تھا مگر غالباً وہ جمال کے کالے بالوں اور کالی آنکھوں والے بچے کو امریکی سوسائٹی میں کھپا نہ سکتی تھی۔

امریکہ میں شرح پیدائش بہت کم ہے کیونکہ ماں باپ دونوں کمائی پر لگے ہوتے ہیں اور انہیں بچے پالنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ اگر کوئی ماں اپنا شیر خوار بچہ لے کر سڑک پر آ جا رہی ہو تو راہگیر رک رک کر اسے دیکھتے اور پیار کرتے ہیں۔

## واپسی

جمال کے کورس کی تکمیل میں ابھی دو ماہ باقی تھے اور اس کے بعد اسے برازیل جا کر فلم بنانے کا عملی تجربہ

حاصل کرنا تھا مگر ابوالاثر نے چٹھی لکھ دی کہ جمال کو فوراً واپس بھیج دیا جائے۔ ہمارے کام رکے ہوئے ہیں۔

رخصت ہونے سے پہلے جمال اپنے پرنسپل کا شکریہ ادا کرنے گیا۔ اس نے کہا ”میں نے یہاں آ کر بہت کچھ سیکھا۔ آپ لوگ خوش قسمت ہیں کہ جب تک چاہیں پڑھیں، مجھے اچانک واپس جانا پڑ رہا ہے۔“

بوڑھا ہنسا اور بولا ”خوش قسمت تو تم ہو تم نے سال بھر میں جو کچھ سیکھا، وہ کچھ بھی نہیں مگر تم اپنے وطن جا کر بڑے ایکسپرٹ بنو گے۔ بڑی بڑی فلمیں بناؤ گے حالانکہ تمہیں کچھ بھی نہیں آتا۔ مجھے دیکھو میں چالیس برس سے فلم کا سکول چلا رہا ہوں مگر کسی نے آج تک مجھے سٹوڈیو کے اندر گھسنے نہیں دیا۔“

اور یہ بات سچ تھی۔

پھر جمال نے کہا ”دمِ رخصت کوئی نصیحت جو میرے کام آئے۔“

بوڑھا بولا ”ہاں، دھیان سے سنو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ فلم چاہے کیسی ہی ہو، خون پسینے سے بنتی ہے۔ اگر تم سیٹ پر جانے سے پہلے پسینہ نہیں بہاؤ گے تو سیٹ پر جا کر خون بہاؤ گے۔ تمہیں تمام امکانات پر پیشگی غور کر لینا چاہیے۔“

یہ بات جمال نے پلے باندھ لی۔

”دوسری بات۔ کامیاب ڈائریکٹر کو اپنی ہیروئن کے ساتھ لازماً سونا چاہیے مگر کب؟ اگر تم نے شوٹنگ کے دوران اس کے ساتھ رات گزار لی تو وہ تمہیں باقی کام کے دوران تنگ کرے گی اور اگر تم نے فلم کی تکمیل کے بعد اس کے ساتھ ہم بستری نہ کی تو وہ تمہیں اگلی فلم میں تنگ کرے گی۔ اس کام کی ٹائمنگ کا بھی اسی طرح خیال رکھنا۔ جس طرح دوسرے کاموں کی ٹائمنگ کا خیال رکھو گے مگر یہ بات تم تجربے ہی سے سیکھو گے۔“

### واپسی کا راستہ

جمال کو خیال آیا کہ واپسی میں جہاز کوپن ہیگن کی روٹ والا کیوں نہ لیا جائے۔ جہاں اس کے پرانے دوست اول پول اور مونز سکاف رہتے ہیں اور جن کی مہمانداری اس نے پندرہ برس پہلے تقریباً چار ماہ تک کراچی میں کی تھی۔ جب وہ موہنجوڈارو کی سیر کے لیے آئے تھے مگر اس کے پاس ان کا ایڈریس نہیں تھا۔ اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے کوپن ہیگن کے پولیس ہیڈ کوارٹر کو لکھا کہ اس نام کے دو شخص فلاں سال پاکستان آئے تھے۔ مجرم ہوتے تو تم فوراً انہیں ڈھونڈ لیتے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا ڈنمارک کی پولیس کسی شریف آدمی کو بھی تلاش کر سکتی ہے؟

ایک ہفتے کے بعد جواب آیا کہ تمہارے دوستوں کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ تمہیں خط لکھیں۔ دو تین دن کے بعد ان کا خط بھی آ گیا۔ انہوں نے جمال سے اصرار کیا تھا کہ وہ راستے میں ان کے ہاں ٹھہرے۔



## باب 25

جمال اب ایک دن بھی امریکہ میں رکنا نہ چاہتا تھا مگر نیویارک کے بارے میں اس کے تصورات بڑے رومانی تھے۔ نیویارک بہت سستا شہر تھا۔ اس کے ٹائم سکوائر کی بڑی شہرت تھی۔ مین ہٹن کی بلڈنگیں بھی اشارے کرتی تھیں اور اس کی ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کا بھی بڑا چرچا تھا۔ جرائم کا مرکز ہارلم بھی ٹائم سکوائر کے سامنے واقع تھا جس کی قدیم اور تاریک بلڈنگوں میں نیگرو، ہسپانوی اور برازیلی باشندے اندھیری گلیوں میں چرس اور کوکین بیچتے، راہگیروں کو لوٹتے، لوہے کے مکے مارتے اور کوچوں میں غائب ہو جاتے تھے۔ حکم تھا کہ جو شخص ٹائم سکوائر سے گزرے کار کے شیشے بند رکھے۔ پولیس کے دستے گھڑ سوار ہوتے تھے کیونکہ گلیوں میں مجرموں کا پیچھا کرنے کا کوئی اور طریقہ نہ تھا۔

### کوئی غنڈہ کوئی قاتل؟

انڈر گراؤنڈ ریلوے سٹیشنوں کی گندگی کو دیکھ کر جمال کو لاہور بہت یاد آیا۔ ٹائم اخبار کی تیسویں منزل پر لکھی ہوئی عالمی خبروں کی سرخیاں چلتی تھیں۔ جمال نے یہاں کسی جیب کترے، کسی غنڈے، کسی قاتل کا انتظار کیا مگر اس کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ تھوڑی دیر میں وہ اکتا کر ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کی طرف چلا گیا۔ آخری منزل پر ایک ریسٹورنٹ تھا جو بادلوں میں گھرا ہوا تھا۔ یہاں سے اس نے نیویارک شہر پر نگاہ ڈالی۔ حدِ نظر تک آبادی ہی آبادی تھی۔ پاس ہی دریائے ہڈسن بہتا تھا جو دریا نہیں تھا۔ سمندر کا ایک بازو تھا جو ادھر نکل آیا تھا۔ جمال ابھی اس سمندر کے نیچے ایک سرنگ سے ہو کر نکلا تھا اور اسے اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ ایک یہ ہیں کہ سمندر کے نیچے سے سرنگ نکال لیتے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ٹپکتی ہوئی چھتوں کو بھی نہیں سنبھال سکتے۔

جمال نے سوچا وہ میامی والی لڑکی اپنے باس کے ساتھ واپس نیویارک پہنچ چکی ہوگی اور شاید اسی بلڈنگ کے کسی کمرے میں بیٹھی ہو مگر یہ بات بے معنی تھی۔ اوپر سے لگتا تھا کہ نیچے سڑکوں پر چھوٹے چھوٹے جھینگر، مکوڑے اور سنڈیاں رینگ رہی ہیں۔

ہاؤس بھی اسی قطب مینار کی روشنی میں جگمگاتا تھا۔ دنیا کی اقتصادی اور سیاسی پالیسیاں وہیں تعمیر ہوتی تھیں۔ یہاں فیصلہ ہوتا تھا کہ غریب قوموں میں سے کس کو جینے کا حق دیا جائے اور کس کی روح قبض کر لی جائے۔

یہ جنگل تھا جس کا قانون طاقت تھا اور طاقت خون کے دریا پیتی ہے۔ ابلیس بیچارے نے تو فقط انسان کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا۔ ڈالر نے انسان کو درندوں کا کھاجا نہ بنا ڈالا۔ اگر اعمال کی سزا ان کی شدت اور وسعت کے حوالے سے ہوگی تو اللہ میاں کو ڈالر کے لیے ایک الگ جہنم بنانا پڑے گا۔

102 ویں منزل پر ہوا بڑی شتیل تھی۔ لگتا تھا امریکہ ہر قسم کی آلائش سے پاک ہے۔ بڑی دیر تک وہ 102 ویں منزل پر کھڑا رہا۔ جب وہ اترا تو سورج ڈھل رہا تھا اور روشنیوں کا طوفان آیا ہوا تھا۔ گلیوں میں چھوٹے چھوٹے گروہ نکل آئے تھے جیسے سرِشام بھیڑیے شکار کو نکلیں۔ ان میں زیادہ تر لڑکیاں تھیں۔ گوروں کے گروہ بالعموم کالوں کے گروہوں سے الگ کھڑے تھے۔ برازیلی، ہسپانوی اور گندمی لوگوں کی اپنی ٹولیاں تھیں مگر ایک آدھ نیگرو ہر گروہ میں موجود تھا۔ ان کے ساتھ تیز لپ سٹکیں، سبز مسکارے اور اونچی اونچی فراکیں پہنے طوائفیں راہگیروں کو روک روک کر پوچھتی تھیں۔ ''وانٹ اے ڈیٹ ڈارلنگ؟ وانٹ اے ڈیٹ؟''

جمال وائی ایم سے نکلتے ہوئے جہاں وہ مقیم تھا، اپنے ساتھ بیس ڈالر لایا تھا اور یہ وہ کسی بھی راہزن کو خوشی سے دے سکتا تھا مگر اسے کسی نے نہ پوچھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہارلم میں اس بے تکلفی اور بے فکری سے پھرتا کہ اسے برازیلی یا ہسپانوی سمجھا جا سکتا۔ ان کے چہرے مُہرے اور رنگ روپ ایشیائیوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔

فروخت بڑھانے کے لیے دکاندار عجیب عجیب تماشے کرتے تھے۔ اشتہار لگاتے تھے، ہم دیوالیہ ہو گئے۔ تیس تاریخ کو ہمیں دکان خالی کرنی ہے۔ مال کوڑیوں کے مول لے جاؤ بلکہ مفت لے جاؤ یا میری پیاری بیوی اچانک مر گئی اور دنیا سے میرا دل اچاٹ کر گئی۔ خدا کے واسطے میری دکان خالی کرا دو تاکہ میں اس کی قبر پر بیٹھ سکوں یا میں عمدہ پینٹر تھا۔ غلطی سے دکان کر بیٹھا۔ میرا مال خرید و اور مجھے آرٹ کی خدمت کا موقع دو یا میں ڈرٹی امریکن ہوں، میرا کوئی حق نہیں کہ میں شرفاء سے میل جول رکھوں۔ میرا مال اٹھا لو جس بھاؤ چاہو یا میرا مال اٹھا لو نہیں تو میں باہر پھینک کر ٹریفک روک دوں گا اور نیویارک پہلے ہی بہت گندا شہر ہے۔ سات دن کی مہلت دیتا ہوں۔

## ہیرے کی نیلامی

فروخت کے علاوہ نیلامی کا کاروبار بھی بہت وسیع تھا۔ ہیرے پہننے کا امریکیوں کو بہت شوق ہے مگر ہیرے کی پہچان کسی کو ہوتی نہیں۔ نیلامی کرنے والے بہت چرب زبان ہوتے ہیں۔ وہ ہیروں کی طلسماتی خوبیوں کا ذکر بڑے دلچسپ پیرائے میں کرتے۔ فقیروں کے قصے سناتے، جنہیں ہیروں کی لائی ہوئی خوش



ان تہذیبوں میں جتنے بادشاہ گزرے، ہیروں کی وجہ سے تخت نشین ہوئے۔ وہ کہتے صرف مشرق ہی کو ہیروں کی روحانی طاقتوں کا علم ہے۔ ہم امریکی مطلق جاہل ہیں۔ دولت کے پیچھے پاگل ہوئے جاتے ہیں۔ حالانکہ انگلی پر صرف ایک ہیرا پہن کر بیٹھ رہنا کافی ہے۔ یہ نہ صرف کسی کے دن پھیر سکتا ہے بلکہ منافع پر بک بھی سکتا ہے۔

نیلام کنندے نے کہا ''مگر بعض ضرورت سے زیادہ سیانے لوگ کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے یہ ہیرے اصلی نہ ہوں اور سچ یہ ہے کہ امریکہ میں بے ایمانی بہت ہے مگر ہماری کمپنی گزشتہ ایک سو ننانوے سال سے یہی کاروبار کر رہی ہے اور تب امریکہ کا دستور بھی نہیں بنا تھا۔ تو کیا ہم اپنی عظیم تاریخی ساکھ کو چند ذلیل ڈالروں کے بدلے گنوا سکتے ہیں؟ کبھی نہیں۔''

''کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔'' ہجوم میں سے بعض لوگ بولے۔

''ہم اپنی عظیم کاروباری ساکھ کو چند ذلیل ڈالروں کی خاطر گنوا نہیں سکتے۔ پھر آپ سب محنت کی کمائی کھانے والے شرفاء ہیں۔ آپ جیسے معزز دوستوں کے ساتھ ہم دھوکہ کبھی نہیں کر سکتے۔''

''نہیں کر سکتے۔ نہیں کر سکتے۔'' ہجوم سے آوازیں آئیں۔

''تو میرے دوستو یہ چھوٹا سا ہیرا جو میرے ہاتھ میں ہے۔ آج ہی افریقہ سے آیا ہے۔ اس کی ٹکر کا کوئی ہیرا کسی کے پاس نہیں ہو سکتا۔ یہ ہیرا میں اپنی بیٹی کو اس کی شادی کی موقع پر دینا چاہتا تھا مگر وہ شادی ہی سے منکر ہو گئی۔ پھر آپ کی آنکھوں میں آرزو کی جو چمک ہے اس نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ اس کی بولی ایک ہزار ڈالر۔ صرف ایک ہزار...... بولو......''

''پندرہ سو۔'' ایک آواز آئی۔

''سولہ سو۔'' دوسرا بولا۔

''لو بھئی میرا دوست صرف سولہ سو ڈالر میں افریقہ کا بہترین ہیرا ہتھیانا چاہتا ہے۔ ذرا اس کی شکل تو دیکھو۔ کیا یہ ٹھگ نظر نہیں آتا؟''

''دو ہزار ڈالر۔'' ایک آواز آئی۔

''دو ہزار۔ دو ہزار۔ ہے کوئی ہیرے کا قدردان۔''

''اکیس سو۔'' ایک بولا۔

''بائیس سو۔''

''بائیس سو پچاس۔''

بائیس سو پچاس پر بولی ٹھہر گئی۔

نیلام کنندہ بولا ''ایک بات میں بھول ہی گیا تھا۔ اصل میں میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ وہ بات یہ تھی کہ ہم ہیرے کے ساتھ گارنٹی اور سرٹیفکیٹ بھی دیتے ہیں کہ یہ اصلی ہے۔ اگر نقلی نکلے تو ہم دس لاکھ ڈالر تاوان بھر

دیں گے۔ لواب بولو۔ یہ ہیرا جس کے بدلے میں دس لاکھ کا تاوان بھرنے پر تیار ہوں، کیا کوئی مجھ سے بائیس سو پچاس ڈالر کی حقیر رقم میں چھین لے گا؟''

''پچیس سو۔'' ایک آواز آئی۔

''تین ہزار۔'' دوسرا بولا۔

''اکتیس سو۔'' تیسرے نے کہا۔

آگے سب چپ رہے۔ نیلامی والے نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ بعض کو اس نے آنکھوں سے اکسایا، پھر اس نے نعرہ لگایا۔ ''اکتیس سو۔ اکتیس سو۔ اکتیس سو۔ ہے کوئی اور جسے ہیروں کی پہچان ہو؟''

''اکتیس سو ایک۔ اکتیس سو دو۔ ہے کوئی؟ کوئی بھی نہیں صرف ایک جنٹلمین کے سوا جسے ہیروں کی پہچان ہے۔''

''اگر اور کوئی نہیں جسے ہیروں کی پہچان ہے تو میں اپنے جنٹلمین دوست کو امید و بیم میں مزید مبتلا نہیں کروں گا اور اس کے ذوق کے اعتراف میں یہ نایاب ہیرا صرف اکتیس سو ڈالر میں جو دراصل اس کی قیمت کا ایک اعشاریہ بھی نہیں دے دوں گا۔'' پھر اس نے جمال پر نگاہ ڈالی اور پوچھا ''اے میرے اجنبی دوست تم تو ایسی تہذیب سے تعلق رکھتے ہو جو ہیروں کی طلسماتی قوتوں کا ادراک رکھتی ہے۔ کیا تمہیں کچھ نہیں کہنا؟''

جمال چپ رہا۔

''بتیس سو۔'' ایک منحنی سی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی نیلامی والے نے اپنا ہتھوڑا مار کر کہا ''مبارک ہو خاتون۔ آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ گارنٹی میں آپ کا نام کیا لکھوں؟''

## بوڑھی کتیا

کچھ دیر گھڑیوں کی نیلامی ہوتی رہی۔ پھر اچانک نیلام کنندہ کے ساتھی نے آکر اس کے کان میں کچھ کہا جسے سن کر وہ مسکرانے لگا۔ پھر کھنکار کر بولا ''میرے مددگار ساتھی نے بتایا ہے کہ ابھی ابھی افریقہ سے ہمیں ایک اور پارسل آیا ہے جس میں سے اس ہیرے کی جوڑ کا ایک اور نگ نکلا۔ جیسا ابھی اس خوش قسمت خاتون کے ہاتھ ہم نے ساڑھے بتیس سو ڈالر میں بیچا تھا۔ کہاں ہے وہ خوش قسمت خاتون؟''

خوش قسمت خاتون مسکرا کر کھڑی ہوگئی۔

''اس خوش قسمت خاتون کی شان میں تالیاں بجائی جائیں۔'' نیلام والا بولا۔

سب لوگ تالیاں بجانے لگے۔

پھر اس نے کہا ''خاتون اس میز کے قریب آؤ۔ میرے پردادا نے بتایا تھا یہ میز ابراہیم لنکن کو بھی بہت پسند تھی۔ خاتون دوسرے ہیرے پر بھی سب سے پہلا حق آپ کا ہے مگر اب آپ ساڑھے بتیس سو ڈالر سے کچھ بڑھیں۔ پہلی مرتبہ تو آپ نے ہمیں لوٹ ہی لیا تھا۔''



خاتون نے مسکرا کر کہا ''میرے پاس اب صرف سات ڈالر ہیں۔''

''افسوس پھر آپ کی قسمت خاتون!''

''تو لیجیے صاحب ساڑھے بتیس سو ڈالر سرکاری بولی رہی۔ اس ہیرے کی جوڑ کا کوئی اور ہیرا کان میں نہ ہوگا۔''

مجمع تھک چکا تھا اور لوگوں کی جیبیں بھی خالی ہوگئی تھیں۔ ساڑھے بتیس سو ڈالر کی رقم بھی بھاری تھی۔ سب چپ رہے۔

''بولیے بولیے۔ کچھ تو بولیے۔ شرمانے کی کوئی بات نہیں۔ جو جی میں آئے کہیے۔''

''پانچ ڈالر۔'' ایک کونے سے آواز آئی۔

پانچ ڈالر کی آواز سن کر نیلامی والا قہقہے پر قہقہے لگانے لگا۔ ''پانچ ڈالر! لو بھئی اس عظیم شاہی ہیرے کی بولی صرف پانچ ڈالر! بھئی اتنا ظریف شخص میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔ حالانکہ ہم ایک سو ننانوے برس سے یہی کام کر رہے ہیں۔ جب امریکہ کا دستور بھی وجود میں نہ آیا تھا۔ بھئی بڑا ظریف شخص ہے!''

مجمع مسکرا مسکرا کر ظریف شخص کو دیکھنے لگا مگر وہ ثابت و سالم بیٹھا رہا۔

نیلامی والا بولا ''مذاق ہو چکا جناب، اب بولیے ساڑھے بتیس سو ڈالر اس عظیم شاہی ہیرے کی قیمت ہے جو اس خوش قسمت خاتون نے لگائی ہے۔ یہ عقلمند عورت ہیرے کی پہچان رکھتی ہے۔'' کوئی نہ بولا۔

مگر نیلامی والا گھبرایا نہیں۔ سنجیدہ منہ بنا کر بولا۔ ''اگرچہ میرے کونے میں بیٹھے ہوئے دوست نے فقط مذاق کیا ہے مگر ہم ایک سو ننانوے برس سے اس کاروبار میں ہیں۔ جب بھی امریکی دستور بھی نہیں بنا تھا اور گھاٹا کھانے کے عادی ہیں۔ اس لیے اس دوست نے جو قیمت لگا دی سو لگا دی۔ چلو بولو اس عظیم شاہی ہیرے کی سرکاری بولی پانچ ڈالر۔ لو اس سے آگے بڑھو۔''

جمال کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

''چھ ڈالر۔'' ایک آواز آئی۔

''چھ ڈالر پچاس سینٹ۔''

''چھ ڈالر ساٹھ سینٹ۔''

آگے کوئی نہ بولا۔

نیلامی والے نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر اس نے چھ ڈالر ساٹھ سینٹ والے سے پوچھا ''سات ڈالر دیتے ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تو میڈم یہ ہیرا بھی آپ ہی کی قسمت میں لکھا ہوا ہے۔'' اس نے کہا اور اس کی طرف بڑھا دیا

جس نے پہلا ہیرا ساڑھے بتیس سو ڈالر میں خریدا تھا۔ ''آپ کے پاس سات ہی ڈالر تھے نا؟ ایک دو تین!''

میڈم گھبرا گئی۔ اسے پتہ لگ گیا کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ جو ہیرا میں نے ساڑھے بتیس سو ڈالر میں خریدا ہے، وہ سات ڈالر سے بھی کم کا شیشہ ہوگا۔ وہ بولی ''تم بددیانت اور بے ایمان ہو۔ لاؤ میرے ساڑھے بتیس سو ڈالر واپس کرو۔ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔''

''دھوکا دیا ہے؟'' نیلامی والے نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کب؟''

''ابھی تم نے میرے آگے ایک معمولی کانچ کا ٹکڑا بتیس سو ڈالر کی خطیر رقم میں بیچا ہے۔ یقیناً تم کوئی بحری قزاق ہو!''

''نہیں میڈم! میں ایک شریف دکاندار ہوں اور کھلے دل سے کاروبار کرتا ہوں۔ ایک سو ننانوے سال تین مہینے سے جب ابھی امریکی دستور بھی وجود میں نہیں آیا تھا۔ ہم ساکھ والے لوگ ہیں میڈم۔''

عورت شور مچانے لگی۔ ''تم دھوکے باز اور ٹھگ ہو۔ میں پولیس میں تمہاری شکایت کروں گی۔''

''مگر میڈم آپ نے خود اس ہیرے کی قیمت لگائی۔ میں نے تو کچھ مطالبہ نہیں کیا تھا۔ پولیس سے کیا کہیں گی آپ؟''

''کہوں گی تم ٹھگ ہو۔ لاؤ میرے پیسے واپس کرو اسی وقت۔''

اس پر نیلامی والے نے مجمعے سے مخاطب ہو کر کہا ''میرا خیال تھا یہ بڑھیا ہیروں کی سوجھ بوجھ رکھتی ہے مگر یہ تو محض ایک بھونکنے والی کتیا نکلی جس کے بچے مر گئے ہوں۔ ذرا شکل تو دیکھو اس کی۔ کیا اس کے دادا نے بھی کبھی ہیرا دیکھا ہوگا؟''

''میں تمہیں گرفتار کرا دوں گی۔'' بڑھیا نیم پاگل ہو کر بولی۔ ''میں تمہیں تباہ کر دوں گی۔'' اور یہ کہہ کر وہ چیختی چنگھاڑتی دکان سے باہر نکل گئی۔

ہجوم میں کچھ کھچاؤ پیدا ہو گیا تھا مگر نیلامی والے نے بالکل نارمل ہو کر چھ ڈالر ساٹھ سینٹ والے سے کہا ''تو تم سات ڈالر اس شاہی ہیرے کے نہیں دیتے؟ بڑے بدقسمت ہو! لاؤ چھ ڈالر ساٹھ سینٹ۔ ایک دو تین۔ گارنٹی پر کس کا نام لکھوں؟''

## والٹر ہکس

والٹر ہکس نے کہا، اٹھنے سے پہلے میری ایک بات اور سن لو اور اس پر برا مانو گے تو میرا دل ٹوٹ جائے گا کیونکہ میں آج کا امریکی نہیں بلکہ پرانے زمانے کا آدمی ہوں۔ جب امریکہ میں بڑے چھوٹے کا لحاظ ہوتا تھا۔

جمال حیرت سے والٹر ہکس کا منہ تکنے لگا۔ اس طرح کی بات تو فقط پاکستان کے چھوٹے قصبوں



والٹر ہکس ساٹھ برس کا صحت مند، خوش مزاج اور شفیق آدمی تھا۔ اس کے سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ وہ ریو ساؤنڈ کمپنی کا چیئرمین تھا جو امریکہ کی بڑی کمپنیوں میں شمار ہوتی تھی۔ پاکستان میں جو فلم لیبارٹری امریکی سودی قرضوں کی مد میں لگی تھی اس کا سامان ہکس نے مہیا کیا تھا اور اسی نے کراچی میں لڑکوں کو تکنیکی تربیت بھی دی تھی۔ یہ سارا اہتمام ولیج ایڈ منصوبے کا ایک حصہ تھا مگر لیبارٹری پر محکمہ فلم و مطبوعات نے قبضہ کر رکھا تھا۔ جسے امریکی فلم ایڈوائزر جان سوول کی حمایت حاصل تھی۔ وہ فلم سازی کا فن سکھانے کے لیے آیا تھا مگر اندھوں میں کانا راجا ہی تھا۔ پھر بھی حکومت پاکستان اس کے کہے کو الہام سمجھتی تھی۔

والٹر ہکس ایک تاجر شخص تھا۔ کراچی میں اس نے کوشش کی تھی کہ ولیج ایڈ کے زیادہ سے زیادہ افسروں کے ساتھ تعلقات ہو جائیں تاکہ وہ ان کے ذریعے اپنا مزید مال بیچ سکے۔

نیویارک میں جمال نے ازراہِ اخلاق والٹر ہکس سے ملاقات کی تو دونوں نے مل کر جان سوول کی بہت ساری چغلیاں کیں۔

جان سوول نے والٹر ہکس کو پاکستانیوں سے ملنے نہ دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ولیج ایڈ میں کوئی انگریزی نہیں جانتا اور سب کے سب امریکیوں سے سخت نفرت کرتے ہیں۔

والٹر ہکس کو امریکی افسر شاہی سے بہت نفرت تھی۔ وہ دوسرے ملکوں میں کام کرنے والے امریکیوں کو نالائق، بدتمیز اور گنوار سمجھتا تھا جو ہر ملک میں شہزادوں کی طرح رہتے ہیں مگر کچھ جانتے نہیں۔ وہ کہتا تھا کہ امریکی حکومت جاہلوں کے قبضے میں ہے۔ اگر وہ دنیا پر راج کرنا چاہتی ہے تو انگریزوں سے سیکھے جو دوسرے ملکوں میں اپنے بہترین دماغ بھیجتے ہیں مگر امریکہ اپنا کوڑا جو یہاں کسی کام نہیں آ سکتا ایشیائیوں پر ڈال دیتا ہے۔

اس قسم کی ایک رپورٹ اس نے امریکہ کے متعلق محکمے کو بھیجی تھی جس پر جان سوول کو پاکستان سے انڈونیشیا تبدیل کر دیا گیا تھا مگر والٹر کہتا تھا کہ جو پاکستان میں برا وہ انڈونیشیا میں بہت برا۔ اب میں یہ سوال سینٹ میں اٹھاؤں گا۔

والٹر نے اگلے اتوار جمال کو گھر آنے اور دن گزارنے کی دعوت دی تھی۔ اس کا رویہ بزرگانہ تھا۔ جمال انکار نہ کر سکا۔

اور اب وہ جمال کو اپنے گھر کا راستہ سمجھانے کے بعد اس سے آخری بات کر رہا تھا۔

''جی نہیں جو کہنا ہے بے کھٹکے کہیں۔'' جمال نے جواب دیا۔

''لانگ آئی لینڈ تک ریل کا کرایہ ایک ڈالر ہے۔'' والٹر نے کہا۔ ''یہ تمہیں مجھ سے لینا پڑے گا۔ جب میرے بیٹے مجھ سے ملنے آتے ہیں تو میں انہیں بھی ریل کا کرایہ ضرور دیتا ہوں۔ یہ ڈالر لے لو۔ میرا دل نہ توڑو۔''

اتوار کے دن بہت گرمی تھی۔ جب جمال ریل سے اترا تو والٹر ہکس کی بیٹی گلوریا سٹیشن پر اس کی منتظر تھی۔ وہ بھرے بھرے جسم کی ایک معصوم لڑکی تھی۔ جمال کو اس نے اندازے سے پہچان لیا کیونکہ اس ٹرین سے جنوبی ایشیا سے اترنے والا وہی ایک شخص تھا۔

دھوپ خوب چمک رہی تھی۔ جمال نے اپنا کوٹ اتار کر کندھے پر ڈالا ہوا تھا اور کوٹ کے نیچے کندھے سے کیمرہ لٹکا رکھا تھا۔

سڑک پار کر کے دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔

والٹر ہکس یوں تو کروڑ پتی تھا مگر اس کا گھر زیادہ سے زیادہ پندرہ مرلے کا ہوگا۔ ایسے گھر لاہور اور کراچی میں ڈپٹی سیکریٹریوں کے ہوتے ہیں۔ گھر میں فرنیچر اور آرائش کی سادگی تو ایک سٹائل کہی جا سکتی ہے مگر گلوریا، گلوریا کی ماں اور والٹر کے دونوں بیٹوں میں سادگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

جاتے ہی لڑکے اس کے ساتھ گیند کھیلنے لگے جس میں ہکس بھی شامل ہوگیا۔ گلوریا نے جمال کی بیوی کی تصویر دیکھ کر اس کے حسن کی بہت تعریف کی۔ گلوریا کی ماں جمال کے بچوں کے نام یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

سہ پہر کو جب سورج سر سے اترا تو جمال نے سوچا کہ میں اس خاندان کی تصویریں بنالوں مگر اسے اپنا کیمرہ کہیں نظر نہ آیا۔

والٹر بہت پریشان ہوا۔ اس نے کہا ''کہیں راستے میں گر گیا ہوگا۔ ذرا سٹیشن تک چل کر دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اگرچہ امریکی بہت بے ایمان ہوتے ہیں۔ گری پڑی چیز کو چھوڑتے نہیں۔''

یہ حماقت کی بات تھی۔ جمال کو گاڑی سے اترے چار گھنٹے ہو چکے تھے مگر وہ والٹر کے اصرار کی وجہ سے چلا گیا۔

اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ ریلوے سٹیشن کے صدر دروازے کے سامنے فٹ پاتھ پر اس کا کیمرہ پڑا ہے۔ چار گھنٹوں میں ہزاروں راہگیروں کی اس پر نظر پڑی ہوگی مگر کسی نے اسے چھوا نہ تھا۔

نیاگرا فال کی سیر کے سلسلے میں بھی اسے اسی قسم کا جھٹکا لگا تھا۔ جب بس میں اس کا بٹوہ گر گیا تھا جس میں اس کی کل پونجی تھی۔ تین روز کے بعد جب وہ دوبارہ اسی بس میں بیٹھا تو ڈرائیور نے جمال کو اس کا بٹوہ واپس کر دیا۔ اس نے کہا ''یہ صفائی کرنے والے نے مجھے دیا تھا۔''

''حیرت ہے کہ میرا بٹوہ تین روز کے بعد تم مجھے واپس کر رہے ہو۔ حالانکہ سروس سٹیشن والوں نے بھی اسے دیکھا ہوگا۔''

''کسی کو کیا پڑی ہے کہ کسی کا گرا ہوا بٹوہ اٹھا لے جبکہ اس پر تمہارا نام لکھا ہے۔''



کیمرہ ملنے کے بعد اس امر کی تصدیق ہوگئی کہ امریکی بے ایمان ہوں یا نہ ہوں مگر وہ نجی ملکیت کا احترام بہت کرتے ہیں۔

شام کو گلوریا نے کہا ''جمال تم ہمیں پاکستانی کھانا کھلاؤ۔'' جمال نے سوچ سوچ کر مسور کی دال کی ہنڈیا چڑھا دی اور بڑا گھٹیا سالن اتارا جسے کھا کر سب انگلیاں چاٹنے لگے۔ گلوریا نے حسرت سے کہا ''ہم تو مسور کی دال اپنے گھوڑوں کو صرف پانی میں بھگو کر کھلا دیتے ہیں۔ پاکستانی گھوڑوں کے تو عیش ہوتے ہوں گے۔''

## یاد یار مہرباں

جمال جب کوپن ہیگن کے ہوائی اڈے پر اترا تو اول یول اور مونز سکاف دونوں پھولوں کے گلدستے ہاتھوں میں لیے اس کے منتظر تھے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔

کوپن ہیگن میں کار خال خال ہی نظر آئی۔ لوگ بسوں پر سفر کرتے تھے۔ ایک پرشباب حسینہ بس میں جمال کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔ جمال نے شرارت سے اس کی طرف دیکھ کر انگریزی میں اول سے کہا ''بڑے مزے کی لڑکی ہے!''

لڑکی لٹو کی طرح گھومی اور بولی ''تم بھی کافی لذیذ معلوم ہوتے ہو۔ کیا مجھے چکھ کر دیکھنے کا موقع دو گے۔''

جمال کھسیانا ہوگیا۔ اسے پتہ نہ تھا کہ کوپن ہیگن میں انگریزی عام فہم زبان ہے۔

اول نے کہا ''ہماری لڑکیاں بڑی خوش دل ہوتی ہیں۔ تم چاہو تو اس کی ران پر چٹکی لے سکتے ہو۔''

لڑکی بولی ''بے شک مگر میری ران بڑی بھری ہوئی ہے۔ اس میں چٹکی بھر نہ سکو گے۔ ارے تم تو شرما رہے ہو۔ کہاں سے آئے ہو؟''

''پاکستان سے۔''

''یہاں کہاں ٹھہرو گے؟''

اول نے اسے بتا دیا اور جمال کے بارے میں اپنی زبان میں بہت کچھ کہہ ڈالا۔ موہنجوڈارو کا ذکر کیا۔ وہ جمال کو تعجب سے دیکھنے لگی جیسے وہ چاند نگر سے اتر کر آیا ہو۔

رخصت ہونے سے پہلے اس نے اول کو اپنا ٹیلی فون نمبر دیا اور وعدہ لیا کہ وہ اسے اس شرمیلے اور دلچسپ ایشیائی سے ایک دفعہ اور ملوائے گا۔

پہلی رات کے لیے مونز جمال کو اپنے گھر لے گیا۔ اس کا بوڑھا باپ جوانی میں بالٹک کے جمے ہوئے سمندر میں مچھلیاں پکڑا کرتا تھا۔ اب اسے حکومت کی طرف سے بڑھاپے کی پنشن ملتی تھی۔ حالانکہ وہ سرکاری ملازم نہ تھا۔ اب وہ سارا دن اپنی مہمات کی کہانیاں سناتا اور شراب پیتا۔

ڈنمارک میں ابھی انسانی رشتے قائم تھے اور جوان بیٹے بوڑھے باپوں کو اولڈ پیپلز ہوم میں نہیں بھیجتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ سرمایہ داری کے عروج کے باوجود یہاں تقسیم دولت میں ایک قسم کا اعتدال تھا۔

## رات کا سورج

جمال دس بجے ہی سو گیا کیونکہ تھکا ہوا تھا۔ کوئی دو بجے اسے پیشاب کی حاجت نے تنگ کیا۔ کمرے میں کوئی باتھ روم نہ تھا اور باتھ روم کے بارے میں اس نے موئز سے کچھ پوچھا نہ تھا۔ اس نے سوچا اتنی رات گئے کون دیکھتا ہے۔ میں دروازہ کھول کر گلی میں پیشاب کر لوں گا مگر دروازہ کھول کر وہ دہشت زدہ ہو گیا۔ دوپہر کی سی تیز دھوپ سے در و دیوار روشن تھے اور گلی میں ایک گلہ جنگلی بارہ سنگھوں کا بیٹھا جگالی کر رہا تھا۔ سارا شہر سویا ہوا تھا اور ہُو کا عالم تھا۔

جمال کچھ دیر حیرت زدہ ہو کر اس منظر کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے جلدی سے ازار بند باندھا اور دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے خیال آیا کہ ڈنمارک قطب شمالی کے دائرے میں ہے جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے مگر اسے اس کا کوئی تصور نہ تھا۔

موئز کا بوڑھا باپ صبح اس کی بات سن کر اتنا ہنسا کہ اس کے ہاتھ سے شراب کا گلاس گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

موئز نے اسے بتایا کہ کوپن ہیگن میں کتے صرف پالتو اور پٹہ بند ہوتے ہیں مگر بارہ سنگھے کھلے عام پھرتے ہیں۔ حکومت ان کی حفاظت کرتی ہے اور لوگ ان سے پیار کرتے ہیں کیونکہ ہرنیاں اور ان کے بچے ہمارے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ شام کو سارے کے سارے شہر سے باہر ایک بڑے طویلے میں پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کے لیے گھاس کے گٹھے اور تازہ پانی مہیا ہوتا ہے۔ پیٹ بھر کر بارہ سنگھے اور ہرنیاں پھر شہر میں آ جاتے ہیں اور گلیوں میں بیٹھ کر جگالی کرتے ہیں۔

اگلی صبح جمال نے دیکھا کہ بارہ سنگھوں اور ہرنیوں کے گلوں کے علاوہ کوپن ہیگن کی ندیوں اور چمن زاروں میں ہزاروں لاکھوں مرغابیاں دھوپ تاپتی ہیں۔ انہیں بھی کوئی کچھ نہیں کہتا تھا اور وہ انسانوں کے ساتھ ایسی ملی ہوئی تھیں کہ ہاتھ سے چوگا لے جائیں۔ ان ندیوں کو دیکھ کر جمال کو سرینگر بہت یاد آیا۔

کوپن ہیگن کے گھر چھوٹے چھوٹے اور خوشنما تھے۔ لوگ سادہ اور ہنسوڑ تھے۔ زیادہ تر شہری سائیکل کی سواری کرتے تھے اور کار والوں کو ٹریفک پولیس کا حکم تھا کہ وہ پیدل چلنے والوں کو سلام کر کے آگے بڑھیں اور ہر وقت مسکراتے رہیں۔

کوپن ہیگن ایک عجیب شہر تھا۔ اس کے اندر ہر تین چار میل کی آبادی کے بعد گھنے جنگل اور لمبے لمبے درختوں کے خودرو ذخیرے تھے۔ جن میں پگڈنڈیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ شہر رومیو جولیٹ سے پہلے سے آباد چلا آتا تھا مگر اس کے باسیوں کے جمالیاتی ذوق نے اسے کچھ اس طرح بچھا دیا تھا کہ آبادیوں کے درمیان



فطرت اپنا ننگا حسن دکھا سکے۔

جنگلوں کے اندر گھستے ہی اندھیرا ہو جاتا تھا اور وقت کا کوئی تصور باقی نہ رہتا تھا۔ ان میں بائیسکلوں پر لدے جوان لڑکے لڑکیاں کُنجوں کی تلاش میں ہنستے گاتے چلتے پھرتے۔

ڈنمارک میں دونوں جنسیں مکمل طور پر آزاد اور خود مختار تھیں جیسے اس کے بارہ سنگھے اور مرغابیاں۔ نہ مردوں پر وفاداری شرط تھی اور نہ بیویوں کے لیے عصمت کے آہنی جانگیے پہننا ضروری تھا۔ دونوں میں ایک فلسفیانہ سمجھوتہ تھا۔ کبھی کبھی وہ جنسی اضطرار یا اشتیاقِ باہمی میں اِدھر اُدھر نکل جانے کو قابلِ فہم سمجھتے تھے۔ اس قسم کی وارداتوں سے ان کی گھریلو زندگیاں خراب نہیں ہوتی تھیں۔ ان کی سماجی قدریں جمال کے نزدیک ناقابل تصور تھیں مگر وہ انہی میں خوش تھے۔

اگلے روز اول جمال کو اپنے گھر لے گیا۔ جہاں وہ اپنی بوڑھی ماں اور چھوٹی بہن کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی ماں انگریزی نہ جانتی تھی مگر اس نے جمال سے شفقت کا سلوک کیا۔ اس کی بہن کوئی اٹھارہ برس کی شرمیلی لڑکی تھی۔ معصوم اور خاموش۔ اس کا رنگ بہت گورا تھا جس میں سے گائے کے دودھ کی خوشبو آتی تھی۔ لگتا تھا کہ یہ لوگ اپنی فطرت میں ایشیائی ہیں۔ کم سے کم یورپ کے رہنے والے نہیں ہیں۔

## توانا غد

مگر اس گھر میں ایک صحت مند بے باک اور توانائی سے بھرپور مرغابی بھی تھی۔ غد اول یول کے بڑے بھائی کارل کی بیوی۔ غد کو انگریزی میں روتھ لکھتے ہیں مگر ڈینش زبان میں رغ اور تو کو د پڑھا جاتا ہے۔ روتھ یعنی غد۔

غد کے قہقہے گہرے اور سریلے تھے۔ اپنے میاں سے اس کی بنتی نہ تھی مگر دونوں میں سمجھوتہ تھا اور زندگی ان کی ہموار تھی۔

اول نے جمال کی شان میں ایک بڑا جلسہ کیا۔ اس نے مختلف قسم کی شرابیں ایک خاص ترکیب سے ملا کر جو محلول بنایا وہ مزیدار بھی تھا اور ہلکا ہلکا سُرور بھی دیتا تھا۔ اس جلسے میں اول نے اپنے گھر کے لوگوں کے علاوہ سوفی کو بھی بلا لیا تھا جو جمال کو پہلے دن بس میں ملی تھی اور اس لڑکی کو بھی جس کے ساتھ وہ شادی نہ کرنا چاہتا تھا۔

جلسہ شروع ہونے سے پہلے اول یول نے جمال کو ایک لمبی میز کے سرے پر بٹھایا۔ پھر سب لوگ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے جام ہاتھ میں لے کر جمال کی عظمت کے اعتراف میں نو نعرے مارے جو صرف ڈنمارک کے بادشاہ کے لیے مخصوص ہیں۔

لڑکیاں جمال کو جام بھر بھر کر دینے لگیں۔ اول یول کی والدہ نے باورچی خانے سے طرح طرح کے پکوان بھجوائے۔ نغمے بجنے لگے۔ گٹار کی جھنجھناتی ہوئی نغمگی نے فضا کو مستی اور بے خودی کی پھوار سے بھگو

دیا اور سب لوگ آہستہ آہستہ جھوم جھوم کر لٹک لٹک کر ہلکے ہلکے قدموں سے ناچنے لگے۔

جمال کو ناچنا نہ آتا تھا وہ چپ چاپ اپنی کرسی پر بیٹھا تماشہ دیکھتا رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد گول گول کولہوں والی غد چہرہ شراب سے درخشاں کیے جھومتی ہوئی اس کے پاس آئی اور بولی ''چلو اٹھو ناچو میرے سینے سے لگ کر۔''

جمال نے کہا ''آئی ایم سوری، مجھے ناچنا نہیں آتا۔''

''تمہیں سینے کے ساتھ لگنا تو آتا ہے۔'' وہ بولی۔ ''یا یہ بھی نہیں آتا۔''

وہ اصرار کرنے لگی تو سب نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ ''اٹھو اٹھو'' سب کہنے لگے۔

غد نے کھینچ کر جمال کو اپنے سینے پر ڈال لیا۔ اس کی چھاتیاں رس سے بھری ہوئی تھیں۔ جمال نے شرما کر ہٹنے کی کوشش کی مگر غد نے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور کہا ''ڈارلنگ تم اپنی دونوں بانہیں میری گردن میں ڈالو تا کہ نشے میں گرو تو مجھ پر گرو۔''

جمال نے اپنے دونوں بازو اس کی گردن میں ڈال دیئے۔

''......اور اب اپنے گال میرے گالوں کے ساتھ لگا لو۔'' وہ بولی۔

جمال نے اپنے گال اس کے گالوں کے ساتھ لگا لیے۔

''......اور اب اپنے سر کو ڈھیلا چھوڑ کر میرے کندھے پر رکھ دو۔''

جمال نے اپنے سر کو ڈھیلا چھوڑ کر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

''......اس طرح کہ تمہارے ہونٹ میرے ہونٹوں کے قریب رہیں تا کہ میں جب تمہیں چومنا چاہوں چوم لوں۔ میرے ہونٹ بڑے رسیلے ہیں۔ ہیں نا؟''

جمال کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ اس نے اشارے سے کہا ''بہت رسیلے ہیں تمہارے ہونٹ!''

غد جمال کو ایک بچے کی طرح سینے سے لپٹا کر موسیقی کی خیال انگیز لے پر آہستہ آہستہ جھولنے لگی۔ اس طرح کہ اس کے قدم زمین پر قائم رہیں مگر کولہوں کے لٹو گھومتے رہیں۔

جمال کا دل چاہتا تھا کہ وقت تھم جائے اور دنیا ختم ہو جائے اور وہ اسی پر سرور کیفیت میں مر جائے۔

مگر اچانک ریکارڈ ختم ہو گیا۔ سب لوگ بیٹھ کر پھر جام بھرنے لگے۔ غد نے جمال کو اپنی گود میں ڈال لیا۔ وہ کسی قدر شرمایا کیونکہ اور لوگ بھی تھے۔ اول یول کی بوڑھی ماں، معصوم بہن اور سخت رانوں والی حسینہ۔

وہ غد کی گود میں سے نکل کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس پر سب لوگ تالیاں بجانے اور ہنسنے لگے۔ غد نے اٹھ کر جمال کے گالوں پر ہاتھ پھیرے۔ پھر جام ہاتھ میں لے کر اس کی گود میں آ گری ''اچھا۔ یوں ہی سہی۔'' وہ بولی۔



''بہت معصوم آدمی ہے!'' سوفی بولی۔ ''بہت لذیذ ہوتے ہیں معصوم آدمی مگر ملتے کہاں ہیں ایسے!''

''پرندہ سا ہے۔'' غد بولی ''ڈرپوک!''

اول یول بولا ''تنگ نہ کرو میرے یار کو حرامزادیو!''

جمال نے ایک جام جلدی سے اور پی لیا۔

''میں سمجھتی ہوں اسے کوئی تجربہ ہی نہیں زندگی کا۔'' سوفی بولی۔

''جانے نہ پائے۔'' غد نے کہا۔

''امریکہ میں کیا کرتے رہے تم ڈارلنگ؟'' سوفی نے جمال کے ہونٹ ہلکے سے چوم کر کہا۔

جمال نے جلدی سے منہ پر ہاتھ پھیر لیا جیسے وہ بوسے کی جلن دور کرنا چاہتا ہو۔ پھر بولا۔ ''امریکہ میں مجھے فرصت ہی نہ تھی۔ میں پڑھنے میں مصروف رہا۔''

''حالانکہ یہ جھوٹ ہے۔''

''ہائے ہائے۔'' غد بولی۔ ''یہ کالی آنکھیں اور کالے گھنگھریالے بال دیکھ کر لڑکیاں مرتی تو ہوں گی تم پر!''

''امریکہ میں لڑکیاں کسی پر نہیں مرتیں۔ وہ فقط خصم ڈھونڈنے میں لگی رہتی ہیں۔''

''سچ سچ۔'' سوفی بولی۔ ''امریکی لڑکیاں بہت کاروباری ہوتی ہیں۔''

''سارے امریکی کاروباری ہوتے ہیں۔ بدتہذیب اور حیوان۔'' غد نے کہا ''شکر ہے تم وہاں سے سلامت نکل آئے۔''

''ایشیائی بہت مہذب ہوتے ہیں۔'' اول یول بولا۔ ''خاص طور پر پاکستانی، عورتوں کی بہت عزت کرتے ہیں۔''

''ہمارے ہاں تو کوئی کسی غیر عورت سے بات بھی نہیں کر سکتا۔'' جمال نے کہا۔

غد بدستور اس کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی۔

وہ اٹھ کر بولی ''اگر کوئی راستہ بھول جائے تو؟''

''ہمارے ہاں لڑکیاں کبھی راستہ نہیں بھولتیں۔'' جمال نے فخریہ انداز میں کہا۔ جمال چار جام سے زیادہ نہیں پیتا تھا، مگر اب اسے گنتی بھول گئی تھی۔

اول یول نے نیا ریکارڈ لگا دیا اور سب پہلے کی طرح ناچنے لگے۔ جمال کا حجاب اب کسی قدر دور ہو چکا تھا۔ اس نے پہلے کی طرح غد کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ سر ڈھیلا کر کے اس کے کاندھے پر رکھ دیا۔ ہونٹ اس کے ہونٹوں کے قریب کر لیے اور آنکھیں بند کر لیں۔ مسلسل مسکراہٹ سے اس کے گالوں میں درد ہونے لگا تھا۔

اس کے بدن میں سے اچانک آگ کا ایک فوارہ اچھل کر سر تک پہنچا۔ اس کی رگیں تن گئیں۔ دل دھڑکنے لگا۔ اس نے غد کو زور سے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ پھر دونوں زمین پر گر گئے۔

وہ صبح اٹھا تو اس کے ذہن میں سنہری دھوپ کی کچھ جھلکیاں تھیں۔ کچھ پھول تھے۔ مرغابیوں کے رنگین پر تھے۔ ہری ہری دوب تھی۔ ندی کا ٹھنڈا پانی تھا اور غد تھی۔ اس کے ذہن میں اور کچھ بھی نہ تھا جب وہ صبح سو کر اٹھا۔

رات اس نے بہت پی لی تھی مگر اس کا جسم کسل مند نہیں تھا۔

''ڈنمارک بہت خوبصورت ملک ہے۔'' اس نے ناشتے پر اول یول سے کہا۔

''تمہیں غد نے بلایا ہے۔'' اول بولا ''ٹیلی فون پر بات کر لو اس سے۔''

## بچھو بوٹی

''آج تم دن میرے ساتھ گزارو گے۔'' غد بولی۔ ''میں نے اول سے کہہ دیا ہے۔''

''بہت اچھا۔'' جمال نے جواب دیا۔ ''اور کون ہوگا۔''

''اور کوئی نہیں ہوگا۔ صرف ہم دونوں ہوں گے دن بھر۔ دوپہر کا کھانا ہم جنگل میں کھائیں گے۔ دھوپ تاپیں گے۔ خوبصورت پرندے دیکھیں گے اور شام کو میں تمہیں واپس چھوڑ دوں گی۔ ٹھیک بارہ بجے تم مجھے ریلوے سٹیشن پر ملو گے۔'' اور ریلوے سٹیشن کا نام بتا کر اس نے فون بند کر دیا۔

غد ریلوے سٹیشن سے نکلتے ہوئے جمال کو بڑی پروقار لگی۔ اس نے ہلکے گاجنی رنگ کا چست فراک پہن رکھا تھا جو اس کے گلابی جسم پر بہت زیب دیتا تھا۔ آنکھوں پر اسی رنگ کا چشمہ تھا۔ اس کے ہونٹ گلاب کی سرخ پتیوں کی طرح کٹے ہوئے اور شاداب تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری تھی جس میں کھانے پینے کا سامان تھا۔

''رات تم نے بہت مزہ کیا۔'' اس نے بات چلانے کے خیال سے کہا۔

''بہت!'' جمال بولا ''یہ میری زندگی کی یادگار رات تھی مگر شاید میں بہت پی گیا تھا غد۔ مجھے نیند آ گئی تھی۔''

غد شرارت سے مسکرائی اور بولی ''یعنی تمہیں اور کچھ یاد نہیں؟''

''سب کچھ یاد ہے۔ رات ہم نے بہت مزہ کیا۔''

''یہ تو سب کو معلوم ہے مگر جب تم سو گئے تھے تب کیا ہوا؟''

''تب کیا ہوا؟ آدمی سو گیا تو سو گیا۔''

''سو کر بھی بہت کچھ ہو جاتا ہے۔'' وہ بولی۔

''کیا ہو سکتا ہے؟'' جمال نے پوچھا۔



وہ کوپن ہیگن کے سرکاری باغ میں سے گزر رہے تھے۔

''کچھ ہوا ہی نہیں۔ تم سو گئے بس۔'' وہ بولی۔

باغ بہت خوبصورت تھا۔ روشوں کی ایسی خراش تراش اور پھولوں کا ایسا بانکپن جمال نے اس سے پہلے کبھی دیکھا نہ تھا مگر ایک بات اسے بڑی عجیب لگی۔ سڑک کے دونوں طرف باغ کے کناروں پر بچھو بوٹی کی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ''ایسے خوبصورت باغ میں ایسی جلا دینے والی زہریلی جھاڑیاں کیوں ہیں غد؟ تم لوگ انہیں صاف کیوں نہیں کروا دیتے؟'' اس نے پوچھا۔

غد سنجیدگی سے بولی ''ہم نے بہت کہا مگر حکومت نہیں مانتی۔ کہتی ہے کہ اگر بچھو بوٹی کی جھاڑیاں کٹوا دی گئیں تو عشق باز بے باک ہو جائیں گے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اب تو انہیں باغ میں لذت کوشی کے لیے ذرا اندر جانا پڑتا ہے۔ پھولوں کے تختوں میں جہاں کسی کی نظر نہ پڑے۔ بچھو بوٹی کی وجہ سے وہ باغ کے کنارے پر ہی کھیل شروع نہیں کر سکتے۔''

''مگر باغ کے کنارے پر ہی کیوں؟''

''بھئی ہمارے ملک میں موسم بہار بہت دلکش ہوتا ہے۔ آٹھ مہینے کی خوفناک سردی اور اندھیرے سے جب ہم نکلتے ہیں تو صبر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ پھر ہمارے نوجوان لڑکے لڑکیاں باغ کے کنارے پر ہی لیٹ جاتے ہیں۔ بچھو بوٹی حکومت نے خود لگوائی ہے مگر حکومتیں ہمیشہ بے وقوف اور بے احساس لوگ چلاتے ہیں۔ ان میں اپنے عوام کی خوشیوں کا احترام بالکل نہیں ہوتا۔''

''یعنی بالکل سڑک کے ساتھ ہی؟''

''یہاں گھاس بہت نرم ہوتی ہے مگر حکومت نے پابندی لگا دی ہے۔ حالانکہ محبت کرنا انسان کا پیدائشی حق ہے۔''

''مگر سرِعام تو مناسب نہیں۔'' جمال نے کہا۔

''کیوں مناسب نہیں؟ ہمارا اپنا ملک ہے۔ ہم جس طرح چاہیں جئیں۔''

''یہ تو ٹھیک ہے مگر یہ بات چھپ چھپا کر ہی اچھی لگتی ہے۔''

''مجھے تو اس میں کوئی برائی دکھائی نہیں دیتی مگر میری بات مانو، یہ بچھو بوٹی تمہارے لیے نہیں لگائی گئی۔''

## جنگل میں پادری

جنگل بہت ہی گھنا اور وحشیانہ حد تک خوبصورت تھا۔ لمبے لمبے درختوں نے اندھیرا کر رکھا تھا۔ اگرچہ دھوپ چمک رہی تھی۔

غد نے پگڈنڈی سے ہٹ کر ایک ایسا گوشہ بیٹھنے کے لیے منتخب کیا جس کے چاروں طرف جھاڑیوں اور درختوں کے پردے تنے تھے۔

اس نے ٹوکری میں سے ایک ریشمی قالین کا ٹکڑا نکالا اور پھر تلی ہوئی مچھلی' پنیر کے ٹکڑے اور سرخ شراب کی ایک بوتل کھول کر سامنے رکھ لی۔ جنگلی چڑیاں شور مچانے لگیں۔ غد نے اپنا ٹیپ ریکارڈ چلا دیا۔

''دھوپ بہت پیاری ہے۔'' وہ خوش ہو کر بولی۔

''ہاں بہت اچھی لگ رہی ہے۔'' جمال نے جواب دیا۔ ''سنہرے اور سبزے کا امتزاج روح افزا ہے۔'' کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔

پھر غد شراب کا جام چوستے ہوئے بولی ''تو تمہیں کچھ پتہ نہیں کہ رات جب تم سو گئے تھے تو کیا ہوا۔''

''نہیں' اول نے مجھے بستر پر ڈال دیا ہوگا۔''

''اول نے اور میں نے مل کر تمہیں بستر پر ڈالا تھا۔ ہم تمہیں ندی کے کنارے سے اٹھا کر لائے تھے۔ چلا بھی نہیں جاتا تھا تم سے!''

''میں ندی پر بھی گیا تھا کیا؟''

''تمہیں میں لے کر گئی تھی جب تم باورچی خانے میں مجھ پر گر گئے تھے۔ تم لڑکھڑا رہے تھے۔''

''اچھا؟'' جمال نے کہا۔ ''مجھے تو کچھ یاد نہیں۔''

غد نے اپنا فراک اتار دیا۔ ''دھوپ بہت اچھی لگ رہی تھی۔'' اس نے کہا ''ذرا ہاتھ پیر سک جائیں اور بدن کو تازہ ہوا لگے۔''

اس کا جسم بہت صحت مند تھا۔ گولائیاں سب درست۔ گیند ہی گیند!

جمال نے منہ دوسری طرف کر لیا مگر اس کی آنکھیں ادھر کو لوٹ جاتی تھیں۔ غد اول یول کی بھابھی تھی اور وہ اپنے دوست کے ساتھ بے وفائی نہ کر سکتا تھا۔

غد کے پیٹ کا رنگ ہلکا نسواری تھا۔ اس کے بدن پر ہلکے جامنی رنگ کی انگیا اور جانگیے کے سوا کچھ نہ رہا۔

غد مسکراتے ہوئے بولی ''پہلے میں تمہیں باورچی خانے میں لے گئی۔ جب تم بہت بے چین ہو گئے......''

''کیا سب کے سامنے؟'' جمال نے گھبرا کر پوچھا۔

''مگر سب ہم دونوں کے پیچھے باورچی خانے میں نہیں گئے...... سرخ شراب مزیدار ہے نا؟''

''بہت مزیدار۔'' جمال نے جلدی سے کہا۔ ''رنگ بھی کیا سرخی مائل جامنی ہے!''



''مگر ایسے کاموں کے لیے باورچی خانہ تو موزوں نہیں ہوتا۔ تم نے تو مجھے فرش پر لٹا ہی لیا تھا۔ ایسے تم گرے تھے مجھ پر......''

''میں بہت شرمندہ ہوں غد۔ مجھے اتنی پینی نہ چاہیے تھی۔''

''پھر میں نے اور اول نے سوچا کہ تمہیں ٹھنڈی ہوا میں ہوش آ جائے گا۔ رات کے بارہ بجے تھے اس وقت۔''

''کیا سبھی لوگ مجھے دیکھ رہے تھے؟'' جمال نے پوچھا ''دروازہ کھلا تھا؟''

''دروازہ کھلا تھا۔'' غد بولی۔ ''میں نے تمہیں بڑی مشکل سے اٹھا کر کھڑا کیا۔ مجھے بڑی محنت کرنی پڑی۔ اول سے میں نے کہا تم یہیں ٹھہرو۔ اس کو میں اکیلی سنبھال لوں' پھر میں نے تمہیں سینے سے لگا لیا اور قدم قدم گھسیٹ کر ندی پر لے گئی۔ باقی لوگ تماشا دیکھتے رہے۔ اول کی والدہ اور بہن سو گئی تھیں اس وقت...... ندی گھر کے سامنے ہی بہتی ہے نا...... مگر کسی جوان آدمی کو جب وہ مدہوش ہو اکیلے کھینچ کر لے جانا کوئی آسان کام نہیں۔''

اچانک غد اپنی انگیا اتار کر قالین پر دراز ہو گئی۔ جمال نے پیٹھ موڑ لی۔

''خیر اس طرح سے کسی پیارے آدمی کو لے کر ندی کے کنارے جانے میں ایک مزہ بھی ہے۔'' وہ بولی۔

جمال نے گھبرا کر کہا ''کیا کرتی ہو غد؟''

''دھوپ دیکھو کیسی پیاری ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ دھوپ میرے سارے بدن کو لگے۔ میرا جسم آٹھ مہینے اندھیرے میں رہا ہے۔ اس میں بھی کچھ روشنی ہو جائے ورنہ بہار کا کیا فائدہ؟ تم بھی اپنا کوٹ اتار دو۔''

''نہیں نہیں غد۔ میں ٹھیک ہوں۔''

''تو رات کے دو بجے ندی کے کنارے لیٹ گئے ہم دونوں۔ میں نے تمہیں جگانے کی بڑی کوشش کی۔ تمہارے گال تھپتھپائے۔ مرغابیاں بھی ہمارے چاروں طرف جمع ہو کر کڑکڑانے لگیں مگر تم نے آنکھیں نہ کھولیں۔''

''پھر؟'' جمال نے پوچھا۔

''پھر میں نے تمہارے کپڑے بھی اتارے۔ اپنا جسم تمہارے جسم سے ملایا مگر تم تو کسی سوکھے شاہ بلوط کی طرح بے حس و حرکت پڑے تھے۔ تمہیں پتہ ہی نہیں چلا کہ میری رانیں کتنی سڈول ہیں۔''

''یہ میں کبھی مان نہیں سکتا۔'' جمال نے کہا۔

غد نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنی چڈی بھی اتار کر جمال پر پھینک دی۔ اس کے بھرے ہوئے کولہوں پر چڈی کا ہلکا سا نشان تھا۔ باقی جسم سینے سے رانوں تک مرمر کا بنا ہوا تھا۔ جیسے گلاب پر کوئی چاندی چھڑک دے۔

جمال نے اپنی نظریں اس کے بدن پر جماتے ہوئے کہا ''کیا کر رہی ہو غد۔ خدا کے لیے۔ کوئی آ جائے گا۔ کوئی دیکھ لے گا۔''

''ڈنمارک کے لوگ بہت شریف ہیں۔ وہ کسی کے عیش میں دخل نہیں دیتے۔ تم بھی کپڑے اتار دو اور دھوپ کا لطف لو...... ایسا موسم پھر کہاں آتا ہے۔''

''یہ کبھی نہیں ہوسکتا غد۔ تم میرے دوست کی بھابھی ہو آخر۔''

''تو ہمارے گھر کے آدمی ہوئے نا؟ میرے رشتہ دار! لاؤ ایک جام اور بنا دو مجھے۔''

ایک گھونٹ پی کر وہ پھر لیٹ گئی اور منہ جمال کی طرف کر کے بولی ''تم جب تک رہے ندی کے کنارے بےسدھ ہی رہے۔''

''اول کو پتہ ہے اس بات کا؟'' جمال نے گھبرا کر پوچھا۔

''ہاں پتہ تھا مگر وہ جان بوجھ کر ندی پر نہیں آیا۔ اس کا خیال تھا کہ میرا یار شرمندہ ہوگا۔ ایشیائی بہت شرمیلے ہوتے ہیں نا۔ جیسے کہ تم ہو۔ حالانکہ اس میں شرم کی بات کون سی ہے۔ یہ تو ہمارے جسموں کے حقوق ہیں جو ہم سب کو خوشی سے دینے چاہئیں۔ کیا میں غلط کہتی ہوں؟''

''بالکل غلط!'' جمال بولا۔

غد بولی ''مگر تمہیں اپنے پاؤں پر کھڑا رکھنا میرے بس میں نہ تھا۔ ایک راہگیر کو میری حالت پر رحم آ گیا۔ اس نے میری مدد کی۔''

''راہگیر نے؟''

''کوئی شریف آدمی سیر کو جا رہا تھا۔ ساڑھے چار بجے ہوں گے اس وقت۔ سورج چمک رہا تھا۔ بارہ سنگھے پھر رہے تھے۔''

''سورج چمک رہا تھا یعنی سب کچھ کھلے عام روشن تھا؟''

''سورج تو یہاں تین ہی بجے نکل آتا ہے مگر لوگ ابھی سوئے ہوئے تھے۔''

''تو پھر راہگیر سے مل کر تم نے مجھے کھڑا کیا؟''

''جب تم کھڑے ہو گئے تو میں نے تمہیں سینے سے لگا لیا۔ بازوؤں کے حصار میں لے لیا اور قدم قدم تمہیں گھر کی طرف لانے لگی۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا نے تمہیں ہوش میں لانے کی بجائے اور بھی مست کر دیا۔''

''مجھے بہت افسوس ہے غد اگر واقعی ایسا ہوا۔'' جمال سر جھکا کر بولا۔

''واقعی ایسا ہی ہوا۔'' وہ بے پروائی سے کروٹ بدلتے ہوئے بولی ''ہم دونوں ناکام لوٹے ندی کے کنارے سے۔ حالانکہ فضا بہت اکسانے والی تھی مگر اس میں میرا کچھ قصور نہیں تھا۔ تمہارا بھی کچھ قصور نہ تھا۔ ہم نے بہت پی لی تھی۔ میں نے تمہیں جام بھر بھر کے پلائے تھے۔ دراصل شروع میں میرا تمہارے بارے میں



کچھ ارادہ نہیں تھا ورنہ میں تمہیں اتنا بےسدھ تو نہ ہونے دیتی۔''

''میں نے بہت ذلیل حرکت کی۔ مجھے معاف کر دو غد!''

''تم بہت اچھے بچے ہو۔ بالکل معصوم۔'' وہ بولی۔

اب وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا سارا بدن ننگا تھا اور دھوپ میں چمک رہا تھا۔ وہ جمال کو شریر نظروں سے دیکھنے لگی۔ جمال نے آنکھیں جھکا لیں حالانکہ وہ اس کے عریاں بدن کو جی بھر کے دیکھنا چاہتا تھا۔

''تمہاری یہ بات مجھے بہت پیاری لگتی ہے جمال۔'' وہ بولی۔

''کون سی بات؟''

''یہی کہ تم شرمیلے بہت ہو۔ لگتا ہے کہ تمہیں سیکس کا کوئی تجربہ نہیں۔ ان ٹچڈ بائی ہیومن ہینڈز! جراثیم سے پاک!''

''یہ بات تو نہیں غد۔'' جمال بولا۔ ''مگر میں نے کسی عورت کا ننگا بدن اس طرح دیکھا نہیں۔ جنگل میں دھوپ میں۔''

''تو اب کیوں نہیں دیکھتے؟'' غد بولی ''دیکھو تو سہی۔''

اور وہ اٹھ کر جمال کے اور قریب آ گئی۔ جمال اور سمٹ گیا۔

''میں نے رات ہی فیصلہ کر لیا تھا۔'' وہ بولی۔

''کس بات کا غد؟''

''یہی کہ میں تمہیں ہاتھ سے جانے نہ دوں گی۔ تم جیسے سویٹ آدمی ملتے کہاں ہیں جمال؟''

''یہ ناممکن ہے غد۔'' جمال بولا۔ ''میرا دوست کیا کہے گا؟''

''کیا کہے گا؟''

''یہی کہ میں بہت بےحیا آدمی ہوں۔ اس کی خاندانی عزت کا مجھے کچھ خیال نہیں۔''

''ارے اس کو تو میں بتا کے آئی تھی۔ اسے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔''

''بتا کے آئی ہو؟ اف! اب میں اس کا سامنا کیسے کر سکوں گا۔''

غد نے جھپٹ کر جمال کا منہ چوم لیا۔

''غد خدا کے لیے۔'' جمال منمنایا۔

''اول یول تو میرا ممنون ہوگا۔ وہ چاہتا ہے کہ میرا دوست کوپن ہیگن سے خوش ہو کر جائے واپس......''

''اس نے پاکستان میں بڑی شرافت سے وقت گزارا۔ کسی لڑکی پر نظر نہ ڈالی اس نے۔''

''وہ پاکستانی قدروں کی بہت عزت کرتا ہے۔ تم لوگ بہت مہذب ہو۔''

”ہم لوگ بہت غریب ہیں۔ پسماندہ' بے علم۔“

”تمہاری تہذیب بہت قدیم ہے۔ تمہیں سماجی رشتوں کا علم ہے اور تم ان کی حفاظت بھی کرتے ہو۔“

”......مگر تم ذرا پیچھے ہٹ جاؤ غد......!“

غد نے جمال کے گلے میں بانہیں ڈال لیں اور اس کے کوٹ کے بٹن کھولنے لگی۔

”پلیز غد!“ جمال نے التجا کی۔

”......اور تم عورتوں کی بہت عزت کرتے ہو۔ یہ بہت اچھی بات ہے تم میں۔ اچھی ہے نا؟“

اب وہ جمال کی قمیص کے بٹن کھول رہی تھی۔ اس نے اس کے سینے پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیئے۔

”اف تمہارا دل کیسا دھڑک رہا ہے!“ وہ بولی۔ ”دھک دھک! دھک دھک! پاکستان اور ڈنمارک کے تعلقات کتنے اچھے ہیں!“

”مگر یہ تم کیا کر رہی ہو غد؟“

”تمہارے کپڑے اتار رہی ہوں۔“

”یہ پروگرام میں نے رات ہی کو طے کر لیا تھا۔“

”کب؟ کس وقت؟ کیا ندی کے کنارے؟“

”نہیں اس سے پہلے جب اچانک تم نے میرے گھٹنے کے نیچے گدی رکھ دی تھی۔ تم مجھے بہت سویٹ لگے۔ بہت ہمدرد' بہت پیارے۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا' پھر میں تمہیں ندی پر لے گئی۔ مگر تم سخت نشے میں تھے۔ عورتوں کی تو تم بہت عزت کرتے ہو نا۔“

اس نے جمال کی پتلون پر ہاتھ ڈالا۔ جمال کود کر پیچھے ہٹ گیا۔ حالانکہ اس میں سکت نہ تھی۔

”یہ نہیں ہو سکتا غد!“ اس نے کہا۔ ”یہ بہت بری بات ہے۔“

غد مسکرائی اور بولی ”کیا ڈنمارک اور پاکستان کے تعلقات دوستانہ نہیں ہیں؟“

”یہ بداخلاقی ہے۔ میں ایسی ذلیل حرکت نہیں کر سکتا۔ تم میرے دوست کی بھابھی ہو جس کے گھر میں مہمان ہوں۔“

”یہ بداخلاقی کی بات نہیں۔ پیار کی بات ہے۔ انسانیت کی بات ہے۔“

”غد پلیز!“ جمال نے التجا کی۔ ”مجھے گراوٹ پر مجبور نہ کرو۔ ہم رشتوں کو بہت مقدس جانتے ہیں۔“

”اسی لیے تو میں کہتی ہوں۔ کچھ میرا بھی احترام کرو۔ آ کر میرے سینے سے لگ جاؤ۔ یہ سیکس نہیں ہے ڈارلنگ۔ تمہاری معصومیت کا خراج ہے۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”میں تمہارا از حد احترام کرتا ہوں۔“



”عورت کے احترام کا ثبوت اس کے ساتھ سونا ہے' جب وہ چاہتی ہے۔ کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے؟“

”اگر تم میرے دوست کی بھابھی نہ ہوتی تو میں تمہاری آرزو کو زندگی کا حاصل سمجھتا۔ تم بے حد پیاری عورت ہو۔ جان ہار دینے کے لائق۔“

”کتنی پیاری باتیں کرتے ہو تم۔ تمہاری ہر بات شعر ہے گویا۔“

”لو اب کپڑے پہن لو غد۔ بیٹھ کر آرام سے باتیں کرتے ہیں۔ دیکھو دھوپ ڈھل رہی ہے۔“

”تو تم باتیں بنا کر نکل جانا چاہتے ہو۔“ غد بولی۔

وہ سرو قد کھڑی ہو گئی۔ اس کا ننگا بدن اور بھی سنہری ہو گیا۔ وہ بہار کی ڈلی بن گئی۔

اس نے کہا ”اگر تم پیچھے ہٹتے رہے تو میں اسی طرح سڑک کے پار تک تمہارے پیچھے آؤں گی۔ اسی طرح برہنہ اور یہاں کوئی بچھو بوٹی بھی نہیں۔ سوچ لو۔“

”خدا کے لیے ایسا نہ کرنا' لوگ کیا کہیں گے؟“

”لوگ کہیں گے کہ تم ایک شریف اور عزت دار خاتون کی توہین کر رہے ہو۔ لوگ کہیں گے کہ تم ایک بدتمیز ایشیائی ہو' حالانکہ تم بدتمیز بالکل نہیں ہو۔ لوگ اسی حال میں ہماری تصویریں کھینچیں گے۔ دیکھ لو۔ آج چھٹی کا دن ہے اور جنگل دل والوں سے بھرا پڑا ہے۔“

جمال لاجواب ہو کر ہانپنے لگا۔ اس کے قدم بوجھل ہو گئے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ غد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے قالین پر ڈال دیا اور انگلیوں سے اسے ٹٹولنے لگی۔

جمال نے مستی بھری آواز میں کہا ”کوئی محض اتفاق سے بھی ادھر آ سکتا ہے۔“

”آ تو سکتا ہے مگر تم کوپن ہیگن سے اتنے بدظن کیوں ہو۔ آئے گا تو آپ ہی پشیماں ہو گا کہ میں نے دو محبت کے کھلاڑیوں کا لطف خراب کیا۔“

”میں کوپن ہیگن سے بدظن نہیں۔ کوپن ہیگن کے لوگ تو بہت من موہنے ہیں مگر اس طرح کھلے آسمان کے نیچے۔ دن دیہاڑے؟“

”کھلے آسمان کے نیچے۔“ غد بولی۔ ”فطرت کے حسین گہوارے میں۔ دن دیہاڑے۔ کیوں نہ ہم دونوں اس جنگل کے پھول بن جائیں۔“ پھر اس نے جمال کی چوری کو ہاتھ میں پکڑ لیا اور ہنس کر بولی ”اے مکار ایشیائی راہب۔ جب تمہارا اپنا بدن تمہاری بات نہیں مانتا تو پارسائی کا بہروپ کیوں بھرتے ہو۔ تم بھاگ سکتے بھی نہیں۔ دیکھو بارہ سنگھوں کے ایک ریوڑ نے تمہارا راستہ روک لیا ہے اور مرغابیاں پھڑ پھڑا پھڑ پھڑا کر تالیاں بجا رہی ہیں۔ کیا تم ان سب کو مایوس کرو گے؟“

جمال زور زور سے سانس لینے لگا۔ درخت اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ ہوا نے بنسری

بجائی اور دھیمے سُروں میں کہا ''مان جاؤ۔ مان بھی جاؤ۔'' تیتر نے کہا ''جاؤ گے کہاں جاؤ گے کہاں؟'' نیلی دم والا ہُد ہُد بولا ''ٹھک ٹھک! ٹھک ٹھک! ٹھک ٹھک!''

## بدن کا عطر

''کاش تمہارے بدن کا عطر کھینچا جا سکے۔ کاش اس کی ایک شیشی بھر کر میں ساتھ لے جا سکوں!'' جمال نے کپڑے پہنتے ہوئے کہا۔

''سنا ہے پاکستان میں گلاب بڑا خوشبودار ہوتا ہے۔ تم میری خوشبو کا کیا کرو گے؟''

''بھاڑ میں گیا گلاب!'' جمال بولا۔ ''گلاب میں وہ بات کہاں!''

غدنے ہلکا سا قہقہہ لگایا' پھر بولی ''ڈنمارک اور پاکستان کے تعلقات ہمیشہ اچھے رہیں گے!''

''پاکستان ڈنمارک کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

جمال نے کہا ''پتہ نہیں ہمارے فارن آفس کو کچھ خبر بھی ہے کہ نہیں۔''

''تم جا کر بتا دینا سب کچھ! میں پاکستان آؤں گی ایک دن!''

''میرے پاس؟''

''تمہارے پاس رات دن۔ کراچی میں بھی کوئی جنگل تو ہوگا۔''

''کراچی سارے کا سارا ایک جنگل ہے مگر اس میں خوبصورت بارہ سنگھے اور تم جیسی حسین مرغابیاں نہیں رہتیں۔ اس میں فقط کُتے رہتے ہیں۔''

''تم لوگ کیا کتوں سے بہت پیار کرتے ہو؟''

''کتے ہم پر راج کرتے ہیں' ہمیں نوچتے اور بھنبھوڑتے ہیں۔''

''مگر تم اتنا تیز کیوں چل رہے ہو ڈارلنگ۔ کیا پاکستان قریب ہے۔''

''پاکستان ڈنمارک کی سرحد پر واقع ہے۔ بیچ میں کچھ نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ لمحے کبھی ختم نہ ہوں مگر لمحے کبھی رکتے نہیں۔ افسوس!''

''کیا تم زندگی سے خوش ہو؟'' غدنے پوچھا۔

''میں ساری زندگی تمہیں یاد رکھوں گا۔ ایسی خوشی مجھے کبھی نصیب نہیں ہوئی۔''

''میں بھی تمہیں بھلا نہ سکوں گی۔ شکر ہے تم نے میری بات مان لی مگر پہلے تم نے مجھے اتنا کیوں ستایا؟''

''میں نے تمہیں ستایا تھا۔ میں تو دل سے چاہتا تھا!''

''تمہیں ٹھنڈ تو نہیں لگ رہی جمال؟''

''تمہارے سینے کے ساتھ لگ کر بھی؟''



''اب کہو میرا سینہ نرم ہے یا سخت؟''

''نرم بھی ہے اور سخت بھی! کہو میرا سینہ کیسا ہے؟''

''بہت سخت!''

''میں نے مدت سے ورزش نہیں کی۔ امریکہ میں کھانا بھی کم ہی کھایا۔''

''مگر تمہاری پکڑ مضبوط ہے۔ میرا تو دم گھٹنے لگا تھا۔''

''اچھا؟ تو تم نے مجھے کہا کیوں نہیں؟''

''میں چاہتی تھی کہ میرا دم گھٹ جائے اس لیے۔''

''یہی تو میں بھی چاہتا تھا۔''

''کیوں؟ تم کیوں چاہتے تھے؟''

''کیونکہ مجھے پھر ایسی لذت نصیب نہ ہوگی۔''

''تو پھر یہیں کیوں نہیں رہ جاتے ڈنمارک میں؟''

''یہاں بے فکری اور آزادی بہت ہے۔'' جمال نے کہا ''میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ میں ظلم سہنے کا عادی ہوں۔ میں یہاں کیسے رہ جاؤں' جہاں کوئی کسی پر ظلم نہیں کرتا۔''

''تم ایشیائی اذیت پسند بہت ہو۔ کیوں نہیں تم ظلم کا خاتمہ کر دیتے؟''

''ہم پر صدیوں کا بوجھ ہے پیاری۔ ہم سیدھے کھڑے نہیں ہو سکتے!''

## فلسفیانہ سمجھوتہ

''اب میرے خیال میں گھر چلیں۔'' غد بولی۔ ''ٹھنڈ ہو چلی ہے۔ میں نے کارل سے کہہ دیا تھا کہ وہ چھ بجے سے پہلے گھر نہ آئے۔''

''اس نے پوچھا نہیں کیوں؟ وہ تمہارا خاوند ہے آخر۔''

''اسے پتہ ہے کہ میں آج تمہارے ساتھ جا رہی ہوں۔''

''اس نے اعتراض نہیں کیا؟'' جمال نے پوچھا۔

''اس نے اپنی گرل فرینڈ کو بلا لیا تھا۔ وہ مجھ پر اعتراض کیوں کرتا۔''

''اور تم نے بھی برا نہیں مانا؟''

''میں کیوں برا مانتی۔ جب میں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ جا سکتی ہوں تو وہ کیوں نہیں جا سکتا؟''

''تم نے اسے بتا دیا تھا کہ میں تمہارا بوائے فرینڈ ہوں۔''

''اسے پتہ تھا کہ میں تمہیں اپنا بوائے فرینڈ بنا کے چھوڑوں گی۔ اسے پتہ تھا کہ کسی ایشیائی کے ساتھ سونا میرے لیے ایک دلچسپ تجربہ ہوگا۔''

"اب تم گھر جا کر اسے سب کچھ بتا نہ دینا۔"

"ہم آپس میں میاں بیوی ہیں۔ ہم آپس میں کچھ بھی نہیں چھپاتے۔"

"میری خاطر چپ رہنا پلیز غدا!" جمال نے التجا کی۔

غد بولی "تو تم ہماری زندگی کا توازن بگاڑنا چاہتے ہو؟"

شام کو گھر پہنچ کر جمال کی آنکھیں اول یول کے آگے اُٹھ نہ سکیں۔ اس نے ہنس کر پوچھا "اداس کیوں ہو" کیا تمہارا دن ٹھیک نہیں گزرا؟"

جمال کوئی جواب نہ دے سکا۔

اول نے کہا "میری بھابھی بڑی حرامزادی ہے۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ تمہیں چھوڑے گی نہیں۔"

"اول۔ یار میں بہت شرمندہ ہوں۔" جمال نے کہا۔

"کیوں بھئی؟ تم نے تو پہل نہیں کی۔"

"سارا قصور میرا تھا اول۔ میں تمہیں منہ نہیں دکھا سکتا۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ تمہارا کچھ قصور نہیں۔"

"سارا قصور میرا ہے۔" جمال بولا۔ "کیوں کہ میں نے کل شام کی پارٹی میں غد کے گھٹنے کے نیچے گدی لگا دی تھی!"

## بادشاہ سلامت

جمال کی روانگی میں دو روز رہ گئے تھے۔ اول اور مونزا اسے کوپن ہیگن کے پرانے قلعے دکھانے کے لیے چلے۔ چوک سے نکل کر جس سڑک پر وہ چڑھے وہ اتنی کشادہ نہیں تھی۔ ٹریفک بھی کم تھا۔ لوگ بال بچوں کو ساتھ لے کر چہل قدمی کر رہے تھے۔ دور سے پچاس برس کا ایک صحت مند آدمی اپنی بیوی کے ساتھ ادھر کو آ رہا تھا۔ ان کی چھوٹی سی سفید پستہ قد کتی ان کے آگے آگے دوڑ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اول نے کہا "اس شخص سے کوئی بات کرو۔"

جمال بڑے مزے میں تھا۔ اسے دیکھ کر بولا "ہیلو۔ گڈ ایوننگ۔"

"گڈ ایوننگ۔" اس نے اپنے ہیٹ کو ہاتھ لگا کر کہا اور رک گیا۔ پوچھنے لگا "کس ملک سے آئے ہو؟"

"پاکستان سے۔" جمال نے مسکرا کر کہا جیسے اس نے ڈنمارک پر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہوا۔

"اوہ! تم دنیا کے دوسرے نصف کرے سے آئے ہو۔ افسوس مجھے ایشیا دیکھنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ کہو ہمارا ملک تمہیں پسند آیا؟"

اس کی چھوٹی کتی اس کے بوٹوں کو چاٹنے لگی۔ اس کی بیوی خوش اخلاقی سے مسکراتی رہی۔

اول اور مونزا خاموش مگر باادب پیچھے کھڑے رہے۔



"ڈنمارک بہت خوبصورت ملک ہے۔" جمال نے گرم جوشی سے کہا۔ "میں یہاں آ کر بہت خوش ہوا۔"

"شکریہ شکریہ۔ تو کچھ روز رہو گے نا؟"

"میں تو یہاں سے جانا ہی نہیں چاہتا۔"

"تو یہیں رہ جاؤ۔"

"یہاں کون رہنے دے گا جناب۔"

"اس کا انتظام ہو سکتا ہے۔ اگر تم واقعی رہنا چاہو تو ہم ڈینش لوگ ایشیاؤں کو پسند کرتے ہیں۔"

"شکریہ۔ مگر مجھے جانا ہی پڑے گا۔"

"اچھا؟ جیسا تم چاہو۔ لو پھر اجازت دو۔ گڈ ایوننگ!"

اس کی بات چیت پر وقار تھی۔ اس کے قدم نپے تلے تھے۔

جمال نے اول سے کہا "یہ میرے یہاں رہنے کا انتظام کیسے کر سکتا ہے؟ ویسے نیک دل آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

"کر سکتا ہے۔ کر سکتا ہے۔" اول بولا۔ "اس لیے کہ یہ ہمارا بادشاہ ہے۔"

"یہ تمہارا بادشاہ تھا؟" حیرت سے جمال کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ "تم نے مجھے پہلے سے بتا دیا ہوتا۔ اگر میں کوئی بدتمیزی کر بیٹھتا تو؟"

"تو کر بیٹھتے۔ وہ کچھ خیال نہ کرتا۔ وہ بہت شریف آدمی ہے۔ وہ ہمارا دوست ہے۔"

"تو اس وقت کہاں جا رہا ہے اکیلا؟ پولیس کے بغیر۔"

"اس وقت یہ ٹہلتے ٹہلتے کافی ہاؤس جاتا ہے جہاں ہمارے ادیب' شاعر اور مصور بیٹھتے ہیں۔ ان سے گپ لگاتا ہے' بحث کرتا ہے اور گھنٹے بھر کے بعد لڑ جھگڑ کر واپس آ جاتا ہے۔ یہی اس کی تفریح ہے۔ وہ لکھتا پڑھتا بہت ہے۔ پولیس سے اس کو کیا کام؟"

## معزز خاتون

جمال کو راستے میں ہیمبرگ رکنا تھا جہاں سے کراچی کی فلائٹ ملتی تھی۔ اس نے سوچا تھا جرمنی بھی دیکھ لیتے ہیں۔

شہر بہت خوبصورت اور بہت گنجان تھا۔ لوگ خوش خلق تھے مگر جمال کو جرمن نہ آتی تھی اور جرمن ابھی انگریزی سے آشنا نہ تھے۔ اس لیے اس کی بات چیت کم ہی ہوتی تھی۔ وہ شام کو ٹرام پر بیٹھ کر نامعلوم جگہوں پر گھومنے چلا جاتا اور جہاں ٹرام خالی ہو جاتی وہیں اتر جاتا۔

یہ شہر کا سب سے بارونق علاقہ تھا۔ سڑک کے دونوں طرف نائٹ کلب تھے جن میں الٹرا وائلٹ

یا عاشقوں کے ساتھ ان پر تبصرے کرتیں۔ انہی کلبوں میں ایشیائی طلبہ کی ٹولیاں بھی ہوتی تھیں جن میں زیادہ تر عرب ہوتے۔ ننگی لڑکیاں اپنے شو کے بعد ان کے پاس بیٹھ جاتیں اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہتیں ''مجھے پیاس لگی ہے ڈارلنگ!''

جو لڑکی جمال کو اکیلا جان کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی اس نے کہا ''ڈارلنگ! میں صرف شیمپئن پیتی ہوں۔''

جمال ان لڑکیوں کے چلتروں کو خوب جانتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ ان کو کلب والوں نے خود چھوڑ رکھا ہے تاکہ وہ ایشیائیوں اور عربوں کو بے وقوف بنائیں۔ انہیں گھٹیا شراب پلائیں۔ خود کوکا کولا پئیں اور ہوٹل کو شیمپئن کے پیسے دلوائیں جو اس زمانے میں بھی بہت مہنگی تھی۔

جمال نے کہا ''مگر میں تو ایک غریب طالب علم ہوں۔''

لڑکی سرد مہری سے بولی ''تم کنجوس بھی ہو ذلیل بھی ہو۔ تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ ایک معزز خاتون کی پیاس بجھا سکو۔''

پھر وہ بولی ''یہاں کمرہ بھی مل سکتا ہے۔ ایک گھنٹے کے پچھتر مارک۔ اس سے زیادہ تم کتنا وقت لو گے اور اس میں سارے مزے شامل ہیں۔ پیکج ڈبل!''

''اس عزت افزائی کا شکریہ۔'' جمال نے کہا۔

لڑکی بولی ''تم ویسے تو میرے جسم کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہو اور شکر کرو کہ میں اس کا کچھ معاوضہ نہیں لیتی۔ مگر تم غبی معلوم ہوتے ہو۔ شاید بات کو نہیں سمجھے۔''

''نہیں اے نازک اندام حسینہ۔'' جمال نے کہا ''اصل میں، میں نامرد ہوں۔''

لڑکی نے اسے غصے سے گھورا۔ دبی زبان میں کہا ''کمینہ حرامزادہ۔'' اور اٹھ کر عربوں کی طرف چلی گئی۔

## ہیمبرگ میں ہیرا منڈی

کلب سے نکل کر جمال آوارہ گھومنے لگا۔ چوک میں سے ایک تنگ گلی نکلتی تھی جس کے ناکے پر عورتوں اور مردوں کا بہت ہجوم تھا۔ جمال اندر جا کر حیران رہ گیا۔ یہاں لاہور کی ہیرا منڈی کی گلی شیخوپوریاں کا نقشہ تھا بلکہ اس سے بدتر۔ جسم فروشی کا وہ انداز حکومت پاکستان نے بند کر دیا۔ اگرچہ جسم فروشی عمومی اخلاقی گراوٹ اور بڑھتی ہوئی غربت کی وجہ سے بعد میں شہر کے عزت دار علاقوں میں روز افزوں ترقی کرنے والا کاروبار بن گئی مگر لاہور میں یا پاکستان کے کسی شہر میں اس قسم کے مناظر اب کہیں نظر نہ آتے تھے جیسے ہیمبرگ کی اس تنگ گلی میں دعوتِ عام تھے۔ گلی شیخوپوریاں جس زمانے میں بہتا دریا تھا' اس زمانے میں بھی یہاں مزدور' چھوٹے دکاندار' میلے کچیلے دیہاتی اور گھبرائے ہوئے طالب علم ہی نظر آتے تھے مگر ہیمبرگ کے اس بازار میں ہر عمر کے شرفاء اور ہر عمر کی گھریلو عورتیں شوق دیدار میں دھکے دیتی اور دھکے کھاتی تھیں۔ سودا کرنے کا



رواج بھی گلی شیخوپوریاں سے زیادہ بے تکلف تھا۔ پیشہ ور خواتین اسی طرح کھڑکیوں اور برآمدوں میں نیم برہنگی کے عالم میں بیٹھتی تھیں۔ اگر گاہک ظاہر کے علاوہ باطن پر بھی ایک نظر ڈالنا چاہے تو کھڑے کھڑے اس کا انتظام بھی ہو جاتا تھا۔

ہمارے ملکوں میں تو عورتیں مجبوری کے عالم میں اپنے بچوں بوڑھے والدین یا کمسن بہن بھائی کا پیٹ پالنے کے لیے پیشہ کرتی ہیں یا کہیں سے اغوا ہو کر آتی ہیں اور دلالوں کے ہاتھ پڑ جاتی ہیں جو ان سے نکاح کے کاغذ بھروا کر انہیں ہمیشہ کے لیے غلام بنا لیتے ہیں۔ پھر ان کی خون پسینے کی کمائی سے تھانے والوں کو باقاعدہ حصہ ملتا ہے مگر جمال کی سمجھ میں نہ آیا کہ ترقی پذیر اور مغرور جرمنی میں عورتیں اس درجہ مجبور کیوں ہیں۔ انہیں کام ملتا ہے اور جرمن دستور کے مطابق جرمن سرزمین پر کوئی شخص چاہے وہ غیر ملکی ہی کیوں نہ ہو رات کو بھوکا اور چھت کے بغیر نہیں سو سکتا تو پھر یہ جرمن عورتیں بازار میں کیوں بیٹھتی ہیں۔ یہ سمجھنا جمال کے لیے دشوار تھا۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ بعض مرد کسی گہرے احساس کمتری کے باعث کسی نارمل عورت کے ساتھ رات نہیں گزار سکتے اور ان کو ہمیشہ کسی ٹھنڈی پتھریلی بے حس پیشہ ور عورت کی ضرورت ہوتی ہے مگر عورتوں کا ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ وہ کیوں بیٹھ کر اپنے آپ کو نچواتی ہیں جب کہ ان کے حقوق بھی محفوظ ہوتے ہیں۔

مگر مغربی ملکوں میں بھی غمخوار عورتوں کو جنہیں انگریزی میں Masochist کہتے ہیں' ایسے مردوں کی ضرورت ہوتی ہے جو انہیں دکھ دیں، انہیں لوٹیں، انہیں جسمانی طور پر ذلیل کریں تو شاید ہیمبرگ کی یہ پیشہ ور عورتیں کسی ایسے ہی کمپلیکس میں گرفتار تھیں۔ پیٹ کی بھوک ان کا مسئلہ نہ ہو سکتا تھا۔ جمال ان سے بات کرنا چاہتا تھا مگر افسوس اسے جرمن نہ آتی تھی اور ایسی بات رواداری میں ہو بھی نہ سکتی تھی۔

عام جرمن اس بازار کے خلاف تھے مگر ہیمبرگ کی میونسپلٹی نے اسے اپنے شہر کا قدیم کلچر سمجھ کر برقرار رکھا ہوا تھا اور غالباً یہ اس کی اپنے شہر سے محبت کی علامت تھا۔

یورپ میں ویسے تو چکلے کی ضرورت نہ ہونی چاہیے مگر وہاں دولت اندوزی اور کاروبار کے تشدد نے انسانی رشتے ختم کر ڈالے ہیں اور یہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جن کے جذبوں میں صرف میکانکی عمل کا ذوق ہی باقی رہ گیا ہو۔ افسوس دولت کی غیر مساوی تقسیم نے انسان کو جب وہ مشین کی بے پناہ استعداد تخلیق کا غلام ہو گیا تو اس کے نازک جذبے کچل ڈالے۔ انہیں دولت کے ہونے نے مارا ہمیں دولت کے نہ ہونے نے مارا۔

# باب 26

پاکستان میں مارشل لاء لگے چند مہینے ہو چکے تھے اور اس کا اندازہ اسے کراچی ایئرپورٹ پر اترتے ہی ہو گیا۔ بیدل، مفتی اور دیگر تمام دوست اسے لینے کے لیے آئے ہوئے تھے اور وہ بھی پیاسی نظروں سے انہیں دیکھتا ہوا جہاز سے اترا۔ اس سے چلا نہ جاتا تھا کیونکہ وہ سال بھر امریکہ میں قریباً بھوکا رہا تھا۔ اس سے کچھ کھایا نہ گیا تھا اور کم خوابی نے بھی اس کا خون پی لیا تھا مگر کراچی میں وہ جوش و جذبے سے اترا۔

سیاستدان اور اسمبلیوں کے ممبر گھروں کو جا چکے تھے۔ مشینی بیٹ مین جگمگاتی ہوئی وردیوں اور افسروں کے بوجھ کمروں پر لادے پھر رہے تھے اور فوجی بوٹوں کی ایڑیاں سیکرٹریٹ کے فرش پر طبل بجاتی تھیں۔ فوجیوں کو پتہ تھا کہ ہم شہریوں کے مسائل حل نہیں کر سکتے۔ شہری افسروں نے انہیں طاقتور جان کر ان سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ حکومت ڈنڈے کی اور حکمت قانون کی۔ چکی کے ان دونوں پاٹوں میں عوام پس رہے تھے مگر پرانے سیاستدانوں کو کوئی یاد نہ کرتا تھا کیونکہ انہوں نے بھی انہیں کچھ نہ دیا تھا۔

## لوٹ مار اور افراتفری

غنڈے بلوں سے نکل آئے تھے۔ لائسنس پرمٹ کی ریس جاری تھی اور راوی لٹیروں کے لیے چین ہی چین لکھتا تھا۔ لوگوں کو فوج سے اور ایوب خان سے بڑی امیدیں تھیں۔ اس نے بعض زیادہ بدنام افسروں کو نکال کر ان کی جگہ فوجی بٹھا دیئے تھے جنہیں رشوت کھانے کے بھید ابھی شہری افسروں سے سیکھنے تھے۔

جو بدعنوان مگر بدنام نہیں تھے یا جن کی فوجی افسروں سے رشتہ داریاں تھیں یا جو بڑے زمینداروں کے بیٹے تھے یا جن کی امریکی سفارت تک رسائی تھی یا جن کا جتھہ مضبوط تھا، انہیں کوئی گزند نہ پہنچا تھا۔ انہیں نہ نکالے جانے پر نیک ہونے کا سرٹیفکیٹ مل گیا تھا۔

مفتی اور بیدل کو جمال کی واپسی کا بڑا انتظار تھا۔ وزارت میں اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ خدمتِ ملی کے جذبے ابھی اپنی گہری نیند سے بیدار نہ ہوئے تھے۔ اگرچہ مارشل لاء انہیں جگانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ ہر شخص دوسرے کو وعظ کر رہا تھا۔ ہر تان مجاہدِ اعظم حضرت ایوب خاں پر ٹوٹتی تھی۔ ہر راگ کا سم اسی کے نام پر آتا تھا۔



ابوالاثر اپنے چھوٹے سے دفتر کو صاف بچا کر لے گئے تھے۔ بیدل غزل اچھی کہتا تھا اور اس سے پاکستان یا فوج کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ مفتی گھریلو عورتوں کی تہ دار نفسیات کے بھید کھولتا تھا اور اس سے بھی فوج کا کچھ نہ بگڑتا تھا۔ جمال سال بھر ملک سے باہر رہ کر آیا تھا۔ فوج اسے جانتی نہ تھی۔

## خالص فوجی محاذ

ابوالاثر فوج کا حق بھی مارنا نہ چاہتے تھے۔ وہ اسے پاکستان کی آخری امید بتاتے تھے۔ انہوں نے ایک فوجی دوست کو جو مزاحیہ شعر کہتا تھا' کچھ فوج کا حق دینے کے خیال سے جمال کے توڑ پر اور کچھ اس منصوبے کے تحت کہ مفتی' بیدل اور جمال کی تکڑم کے مقابلے میں ایک خالص فوجی محاذ بنایا جا سکتا ہے' محکمے میں نوکر رکھوا لیا تھا۔ اس کا عہدہ جمال سے بڑا تھا اور اس میں بھی حکمت پوشیدہ تھی۔

ابوالاثر کو فوج سے بڑی محبت تھی۔ اچانک انہیں یاد آیا کہ انہیں فوج کے حوصلے بلند کرنے کے لیے قائداعظم نے اپنے بیڈروم میں بلا کر کچھ ہدایات دی تھیں اور ابوالاثر کے تنِ ناتواں سے اس سے زیادہ کی توقع نہ کی جا سکتی تھی۔ یہ بات انہوں نے بر سبیلِ تذکرہ سیکریٹری وزارت اقتصادیات کو بتا دی جو حاضر سروس بریگیڈیئر تھے۔ ابھی نجانے اور کتنے فوجی راز ان کے سینے میں دفن تھے۔

ابوالاثر نے بریگیڈیئر صاحب کو یہ بھی بتا دیا کہ مارشل لاء کے اعلان کے فوراً بعد جنرل ایوب خاں نے بھی سب سے پہلے مجھ ہی کو طلب کیا تھا اور گلوگیر ہو کر کہا: اے شاعرِ ملتِ اسلامیہ۔ اے طوطیِ شکر شکن۔ اے فردوسیِ پاکستان' شاہنامۂ اسلام تم نے خوب لکھا مگر کیا افواجِ پاکستان محافظِ اسلام نہیں ہیں؟ کیا عجب کہ تم ان کی طرف بھی توجہ فرماؤ اور انہیں دلیر بناؤ کہ فوج ہے تو پاکستان ہے اور پاکستان کی ترقی اے درویشِ بے ریا میرا اور تمہارا فرض ہے۔

فوج اور پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے ابوالاثر ہچکیاں لے لے کر رونے لگے۔ بریگیڈیئر صاحب ان کے لیے پانی کا گلاس خود لائے۔

چنانچہ جن دنوں جمال کراچی پہنچا ابوالاثر جنرل ایوب خاں کی درخواست پر اور پاکستان کی ابدیت کو یقینی بنانے کے خیال سے شاہنامہ افواجِ پاکستان نظم کر رہے تھے۔ اس کا ایک ٹکڑا انہوں نے بریگیڈیئر صاحب کو بر سرِ زمین سنا بھی دیا۔ ان کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ حالانکہ لوگ تو قائداعظم تک کو فراموش کر چکے تھے۔

بر سبیلِ تذکرہ ابوالاثر نے بریگیڈیئر صاحب کو یہ بھی بتا دیا کہ وزارت اقتصادیات کا سیکریٹری مقرر کروانے میں انہوں نے ایوب خاں سے جھگڑا کر لیا تھا۔ اس آسامی پر وہ اپنا ایک رشتہ دار مقرر کرنا چاہتا تھا۔ اس پر ابوالاثر روٹھ گئے تھے اور ان سے صاف کہہ دیا تھا کہ میاں جرنیل صاحب پاکستان میں اقربا پروری اب نہیں چلے گی۔ پاکستان کو بچانا ہے تو وزارت اقتصادیات کو بچاؤ اور وزارت اقتصادیات کو بچانا ہے تو بریگیڈیئر کو لاؤ جو فوج میں ضائع ہو رہا ہے۔ وہ موذی نہ مانا تو میں سلام کیے بغیر چلا آیا مگر اگلے روز ایوب خاں نے

بریگیڈیئر صاحب کی تقرری کا پروانہ جاری کر دیا۔

اس پر بریگیڈیئر صاحب نے ابوالاثر کے ہاتھ چومے' آنکھوں سے لگائے اور تشکر کے آنسو پی کر کہا ''آپ پر اور آپ کے محکمے پر میری جان تصدق! میں عاجز کس قابل ہوں۔ آپ ہی ہیں جو پاکستان کی اقتصادیات کے بارے میں میری راہنمائی کر سکتے ہیں۔''

یہ تفصیلات جمال کو ابوالاثر نے آتے ہی بتا دیں۔

## آمدنِ سہراب مانک جی

وزارت اقتصادیات کے سابق سیکریٹری کو رخصت ہوئے کچھ ہی روز ہوئے تھے۔ وہ بہت نیک نفس محتاط اور ذمہ دار افسر تھے۔ انہوں نے حکومت کی ہر بات مانی تھی مگر یہ ان کے ضمیر کا سوال تھا۔

مسٹر ڈین پیرزادہ سابق سیکریٹری وزارت اقتصادیات ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ جمعرات کے جمعرات ان کے ہاں قوالی ہوتی تھی جس میں بعض اوقات وہ امریکی ماہرین کو بھی مدعو کر لیتے تھے کہ کیا جانے کب حضرت پیر صاحب کی نظرِ کرم ہو جائے۔ امریکی دلوں پر کوئی شعر اثر کر جائے اور وہ اسلام قبول کر لیں۔ ان کے ساتھ ہی ساتھ وزارت کے کچھ افسر' کچھ سیٹھ' ساہوکار محفل کی رونق بڑھانے کے لیے آ جاتے اور بعض اوقات ایک آدھ پر حالت کی کیفیت وارد ہو جاتی۔

قوالی کی یہ محفلیں مسٹر ڈین پیرزادہ کے لیے قلب کی صفائی اور سلوک کا وسیلہ تھیں مگر امریکیوں کے لیے یہ ایک قابل دید تجربہ تھا۔ سیٹھ ساہوکار اور ہم پلہ افسر یہاں آ کر ضمناً اپنے کاروباری تعلقات کا دائرہ وسیع کر لیتے تھے۔

سیٹھ مانک جی باٹلی والا ایک روشن خیال محبِ وطن پارسی تھے۔ انہوں نے کئی منصوبے برائے ترقی پاکستان وزارت اقتصادیات کی خدمت میں گزار رکھے تھے مگر کبھی تخمینے میں نقص نکلا' کبھی پروگرام واضح نہ ہوا۔ اسسٹنٹ سیکریٹری' ڈپٹی سیکریٹری' جوائنٹ سیکریٹری...... ہمیشہ کوئی نہ کوئی افسر شروع ہی سے پاکستان کی ترقی میں رکاوٹ ڈال رہا تھا۔

مسٹر ڈین پیرزادہ مانک جی سیٹھ کی صنعتی بصیرت کے معترف تھے مگر قوالی کی مجلس میں انہیں کبھی بلایا نہ گیا تھا۔ مسٹر ڈین پیرزادہ کے حنفی مسلک کے بریلوی مذہب میں قوالی کی مجلسوں میں کسی پارسی صنعتکار کی موجودگی کی سند فقہ کی کتابوں میں ملی نہ تھی۔

مگر مسٹر ڈین پیرزادہ کی دختر نیک اختر کانونٹ کی تعلیم کی بدولت ایسے فقہی نظائر سے بالا ہو چکی تھی۔ پھر سیٹھ مانک جی کا ایک نوجوان بیٹا بھی تھا۔ سہراب جی مانک جی جو دختر کا ہم جماعت تھا اور وزارت اقتصادیات میں اس کا ایک منصوبہ بھی زیرِ غور پڑا تھا۔

مسٹر ڈین پیرزادہ کی دختر نیک اختر کو بھی پاکستان کی ترقی سے ایسی ہی دلچسپی تھی جیسی کہ سہراب



مانک جی کو۔ اب اسے حسنِ اتفاق کہیے یا روحوں کی مساوی اڑان۔

پارسی سیٹھ کے منصوبہ ساز فرزند اور سیکریٹری اقتصادیات کی روشن خیال دختر نے جب وزارت کے ڈپٹی سیکریٹریوں سے بالا بالا پاکستان کی ترقی کے لیے بقائے باہمی کی انگوٹھیوں کا تبادلہ کر لیا تو مسٹر ڈین پیرزادہ بہت سٹپٹائے۔ ان کو دونوں نادان بچوں کے تبادلہ خیال پر تو کوئی اعتراض نہ تھا اور ترقی یافتہ ملکوں میں اس کی بڑی پختہ اور قابل تقلید روایت موجود ہے مگر جھگڑا کفر و اسلام کا بیچ میں آن پڑا اور حنفی العقیدہ بریلوی مذہب میں اسلام مسلمان بی بی کو کفر کے گھر میں آباد ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔

مسٹر ڈین پیرزادہ اپنا مسئلہ لے کر مرشد کی دہلیز پر پہنچے تو حضور نے ایک زوداثر وظیفہ برائے دفع بلیات مرید باصفا کو مرحمت فرمایا، مگر عورتوں کی کھوپڑی الٹی ہوتی ہے اس لیے مسٹر ڈین پیرزادہ کی دختر نیک اختر کے سر کا بھوت وہ وظیفہ اتار نہ سکا۔

## کچھ عشق کیا کچھ کام کیا

ادھر ہونہار سہراب جی بھی اپنے ارادوں میں کاٹھے اخروٹ کی طرح پختہ تھا۔ اس نے اپنا منصوبہ بڑی محنت اور نفع نقصان کی میزان نکال کر بنایا تھا۔ وہ سیکریٹری وزارت اقتصادیات کی بیٹی سے بھی بے وفائی نہ کر سکتا تھا کیونکہ آگے بھی کام نکلنے تھے۔ وہ مسلمان ہونے پر تیار ہو گیا۔

اس پر خاتون منصف مزاج نے کہا کہ یہ بات اس کو دل و جان سے چاہنے والے مرد وفا شعار سہراب جی کے بنیادی انسانی حقوق پر حملہ نظر آتی ہے۔ پھر یہ قائداعظم کے اس فرمان کی بھی نفی ہوگی جس میں انہوں نے کہا تھا کہ پاکستان میں ہر شخص کو اپنے عقیدے کے مطابق زندگی گزارنے کا حق ہوگا۔ اب کون ہے جو قائداعظم کے فرمودات کی خلاف ورزی کرے۔ میں تو یہ جرأت نہیں کر سکتی!

حُبِ وطن کے حساب سے بچی کا موقف درست تھا مگر مسٹر ڈین پیرزادہ پرانے خیالات کے آدمی تھے اور اس ذرا سی بات پر جذباتی ہو رہے تھے۔ بچی نے صاف کہہ دیا کہ ڈیڈی یہ اصول کی بات ہے۔ اگر آپ کو اپنے دقیانوسی خیالات پر اصرار ہے تو میں بھی اپنا انسانیت نواز موقف تبدیل نہیں کر سکتی۔ زندگی اور خیالات ہر شخص کے پرائیویٹ ہوتے ہیں۔ اگرچہ جدید کو قدیم نے کبھی قبول نہیں کیا مگر جدید کے بغیر انسانی معاشرہ ابھی تک پتوں سے تن ڈھانکتا یا مادرزاد پھرتا اور درختوں اور چٹانوں پر بسیرا کرتا۔ بغاوت ہی انسانی معاشرے کی ترقی کی تحریک ہے۔ بغاوت ہی مستقبل کا راستہ ہے اور سہراب اور میں دونوں ہی مستقبل کے راستے پر گامزن ہیں۔

باپ بیٹی میں جھگڑا ہوا۔ ممی بہت روئیں اور انہیں دمے کا دورہ بھی پڑ گیا۔ اس پر لڑکی کا دل کچھ ڈولا اور وہ اس بات پر رضامند ہو گئی کہ ایک مرتبہ میرا نکاح سہراب جی سے اسلامی طریقے سے بھی ہو جائے تو کچھ حرج نہیں۔ مگر محلے میں سہراب جی کے پارسی آتش کدے میں جاؤں گی تاکہ اس کا وقار مجروح نہ ہو۔ اس نے

یہ اعلان بھی کر دیا کہ پھر ہمارے ہاں جتنی لڑکیاں پیدا ہوں گی وہ مسلمان ہوں گی' مگر لڑکے پارسی ہوں گے کیونکہ یہ ان کے باپ کا حق ہے۔

مسٹر ڈین پیرزادہ کا ذہنی سکون بگڑا تو وزارت اقتصادیات تلپٹ ہو گئی۔ کسی کا کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ پاکستان کی ترقی کی ساری فائلیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ دفتر چائے خانے بن گئے۔ شیخ ممتاز حسین خاص طور پر گھبرائے کیونکہ وہ اپنے آپ کو منسٹری کا ضمیر سمجھتے تھے اور پورا اقبال بھی صرف انہی کو یاد تھا جو ہر گام پر ان کی راہنمائی کرتا تھا۔ بعد از نماز عشاء وہ مسٹر ڈین پیرزادہ کے بنگلے پر گئے۔

## یزدانم آرزوست

انہوں نے مسٹر ڈین پیرزادہ کو سمجھایا کہ پارسی کافر نہیں ہوتے' زنداوستا ان کی مذہبی کتاب۔ اقبال ایسے ہی نہیں فرماتا کہ یزدانم آرزوست! یعنی مسلمان بھی یزدان کی تلاش میں ہیں اور اس حقیقتِ منتظر کے انتظار میں ان کی جبینِ نیاز میں ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں۔ اقبال یہی فرماتا ہے اور بے وجہ نہیں فرماتا۔ اگر پارسی اہرمن کو یزداں کا حزب مخالف سمجھتے ہیں تو ناہنجار ابلیس بھی تو اپنی ابدی لعنت سے قبل ملائیکہ کا سردار تھا۔ گویا مسلمان اور پارسی دونوں ہی خدا کی راہ میں اہرمن سے مبارزت طلب کرتے ہیں۔ لڑکی نے کوئی غلطی نہیں کی۔ اگر اس نے سہراب کی آرزو کی ہے تو دراصل یزداں کی آرزو کی ہے۔ اقبال فرماتا ہے یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ! رہی نکاح کی بات تو اس کے لیے صرف لڑکے اور لڑکی کی باہمی رضامندی کافی ہے۔ جگہ کا کوئی سوال نہیں۔ گواہوں کی بھی کوئی شرط نہیں' وہ کسی بھی وقت کسی بھی جگہ باہم رضامند ہو سکتے ہیں۔ ویسے آتش کدے اور مسجد میں فرق کیا ہے۔ دونوں ہی پاکیزہ مقامات ہیں۔ دونوں میں حسن ازل کی جلوہ گری یکساں ہوتی ہے۔

اقبال فرماتا ہے ''آتش کدہ ہے سینہ مرا راز نہاں سے...... تو آتش کدے میں کوئی خرابی ہوتی تو اقبال فرماتا مسجد ہے مرا سینہ راز نہاں سے...... اور مسجد ہی میں وہ اس راز کو معرضِ اظہار میں لاتا۔''

''مگر نبیوں میں حضرت زرتشت کا ذکر نہیں آتا۔'' مسٹر ڈین پیرزادہ نے کہا۔

''کمال کرتے ہیں جناب۔'' شیخ صاحب بولے ''اب قرآن شریف میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کے نام تو نہیں آسکتے۔ زرتشت' گوتم بدھ' کرشن مہاراج ان میں سے کسی کا نام نہیں۔''

شیخ صاحب نے اس رات نہایت مدلل گفتگو کی اور مسٹر ڈین پیرزادہ کا ذہنی سکون کچھ بحال کر دیا۔ اس پر انہوں نے شیخ ممتاز حسین کی ملازمت کے کنٹریکٹ میں ایک سال کی توسیع کر دی کہ ایسے اقبال شناس اسلام اور زرتشت کا ادراک رکھنے والے کہاں ملتے ہیں۔ انہیں تو اس کا کچھ خیال نہ تھا جب وہ اس شام مسٹر ڈین پیرزادہ کو جو تسکین کو رو رہے تھے' تسکین دینے گئے مگر ترقی اور تنزلی تو خدا کی دین ہے۔ جیسے کہ اقبال نے کہا: پتہ بھی نہیں ہلتا بغیر اس کی رضا کے اور شیخ صاحب نے تو خودی کو اتنا بلند کر لیا تھا کہ مسٹر ڈین پیرزادہ نے



خود پوچھ لیا کہ آپ کی رضا کیا ہے شیخ صاحب!

جب سہراب جی کے انسانی حقوق صاحبزادی کے فلسفۂ بغاوت' مسجد و آتشکدے یزدان و اہرمن میں کامن فیکٹر نکل آیا تو نکاح کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی جو لڑکے اور لڑکی نے پہلے ہی سے طے کر رکھی تھی۔

## شادی خانہ آبادی

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ آتش کدے میں تو صرف منسٹری کے لوگ ہی گئے جنہوں نے سہراب جی کو کالے ٹوپے' لمبے سفید کرتے اور کھڑے پاجامے میں اور لڑکی کو پیچھے سے پلو لینے والی ساڑھی میں دیکھا۔ وہ جوڑی کی خوبصورتی پر نہال تھے مگر سہراب جی نے مسجد میں نکاح کے بعد سنہری اچکن' کلے والی بوسکی کی پگڑی اور قمیص شلوار میں گھوڑے پر سوار ہو کر بینڈ باجوں کے ساتھ جب مسٹر ڈین پیرزادہ کے گھر بارات اتاری تو شہر میں دھوم مچ گئی۔ مقابلے کے لیے میر چھاؤنی سے فوج کے تین بینڈ باوردی آئے اور کھانوں کا تو کوئی حساب ہی نہ تھا۔ پارسی کمبخت مرچ نہیں کھاتے صرف ٹماٹو کیچ اپ میں ہر چیز لتھڑ لیتے ہیں۔ اس لیے مسٹر ڈین پیرزادہ کا سالن چکھتے ہی ان کی زبانیں سوج کر موٹی ہو گئیں اور وہ العطش العطش پکارنے لگے۔ اس پر شیخ صاحب نے ٹھنڈے سوڈے کی سیکڑوں بوتلیں یکدم کھلوا دیں تو بارے کچھ ٹھہراؤ آیا۔

تحفے تحائف کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا۔ مسٹر ڈین پیرزادہ کو پانچ تو کاریں ہی ملیں۔ سیٹھوں نے جن کے منصوبے رکے ہوئے تھے یا لشتم پشتم چل رہے تھے' لڑکی کے لیے جواہرات کے کئی کئی سیٹ' بلجیم کے ڈنر سیٹ' فرانس کے عطر اور لباس' اٹلی کے فرنیچر اور امریکہ کی گھریلو ضروریات کی مشینیں' کراچی میں دلہا دلہن کے لیے دو ہزار گز کا ایک پلاٹ اور مری میں ایک کوٹھی رونمائی کے موقع پر نذر کیں۔ ایسی چھوٹی موٹی چیزوں کا ذکر فضول ہے۔ اصل میں تحفے دینے اور لینے میں خوشی ہوتی ہے اور خوش رہنا یا خوشی کے پیچھے بھاگنا یا اس کے تعاقب میں اوندھے منہ گر جانا انسان کے بنیادی حقوق کا مسئلہ ہے۔

مسٹر ڈین پیرزادہ نے بھی اپنی طرف سے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ انہوں نے قوالوں کی منڈلیاں' موہڑہ شریف سے منگوائیں اور سیٹھوں' ساہوکاروں اور دیگر اہلِ ایمان نے رات رات بھر حال کھیلے۔ حق ہو۔ حق ہو۔ حق ہو......!

لڑکی دو چار ہی دن میں پارسی خانوادے میں رچ بس گئی اور اس نے اپنا ایمان بھی نہ چھوڑا۔ دو چار ہی دن میں سہراب مانک جی کے پراجیکٹ بھی منظور ہو کر آ گئے۔ اسسٹنٹ سیکریٹری' متعلقہ ڈپٹی سیکریٹری اور جوائنٹ سیکریٹری نے کاغذات پر ''آئی ایگری'' لکھ دیا۔ سب کو پتہ تھا کہ سہراب مانک جی مسٹر ڈین پیرزادہ کا سب سے ہونہار داماد مضبوط اور محب وطن کاروباری ہے۔

مگر مسٹر ڈین پیرزادہ با اصول بزرگ تھے۔ اگر وہ اپنے داماد کے سو فیصد پراجیکٹ پر ''اوکے'' لکھ دیتے جیسا کہ انہیں دفتر نے ایڈوائز کیا تھا' تو پلاننگ کمیشن میں کوئی ان کا ہم پلہ افسر یا مخالف یہ نہ کہہ سکتا کہ مسٹر

ڈین پیرزادہ نے اپنے داماد سے کوئی رعایت نہیں کی۔ پوری ملازمت میں ان پر اقربا پروری کا کوئی الزام نہ آیا تھا۔ ان کی قابلیت کے امریکی ماہرین بھی معترف تھے مگر احتیاطاً انہوں نے اپنی پوسٹنگ پہلے ہی بینکاک میں کروالی تھی جہاں پسماندہ ممالک کے باہمی تبادلہ استعداد کے اصول پر ان کی صلاحیتوں کی اشد ضرورت تھی۔

مسٹر ڈین پیرزادہ بچی کی شادی کے فوراً بعد بینکاک چلے گئے۔ گھر کا بہت سا سامان اور تحفے میں ملی ہوئی گاڑیاں انہوں نے کراچی ہی میں بیچ دیں۔ ان کے سیٹھ کرم فرماؤں نے جنہوں نے یہ گاڑیاں دی تھیں' واپس لے کر ان کو نقد رقم ادا کر دی۔

## بیٹی سب کی بیٹی

بریگیڈیئر خان ان کی جگہ پر تعینات ہوئے تھے۔ انہوں نے اس خیال سے کہ بیٹی سب کی بیٹی ہوتی ہے' مسٹر سہراب جی کے منصوبے جوں کے توں منظور کر لیے اور وہ اس کے علاوہ کچھ کر بھی نہ سکتے تھے کیونکہ نیچے سے ان کی افادیت کے نوٹ آ چکے تھے اور ان کو توڑنا دفتری روایت کے خلاف تھا مگر ایک ذرا سی دشواری یہاں بھی آن پڑی۔

وہ رسالے کے افسر تھے۔ پاکستان کی اقتصادی ترقی سے ان کا پیشہ ورانہ کوئی تعلق نہ تھا۔ چلتے کاموں کو روکنا بہر حال ان کی فوج سے سول میں تبدیلی کا مقصود نہیں تھا۔ پھر ان کی اپنی بھی جوان بیٹیاں تھیں اور سیٹھوں کے بیٹوں کے پاس ایک سے ایک اچھا ترقیاتی منصوبہ برائے منظوری تیار تھا۔ ان کی پوسٹنگ کے موقع پر ایوب خان نے ان سے صاف کہہ دیا تھا کہ میں پاکستان کی ترقی کے بارے میں کوئی دیر سویر برداشت نہیں کر سکتا۔

ابوالاثر نے انہیں اور سمجھا دیا تھا کہ حکومت آنی جانی چیز ہے مگر مارشل لاء لافانی ہے کیونکہ فوج ہے تو پاکستان ہے اور پاکستان کو تا ابد رہنا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ زندگی کوئی ایک واحدہ نہیں ہے بلکہ لمحوں کا جڑا ہوا ایک تار ہے۔ زیرک فہم آدمی کو چاہیے کہ وہ اس تار پر وقت کی بھیروی بجائے تاکہ بے وقوف منہ دیکھتا رہ جائے اور وہ آگے نکل جائے۔

## قافیہ پیمائی

ابوالاثر جمال کی واپسی پر بہت خوش تھا۔ ایک دن انہوں نے اسے محبت سے بلا کر بٹھایا اور کہا ''برخوردار میں ایک مشکل میں گرفتار ہوں۔ تم بھی ادیب ہو۔ میری کچھ مدد کرو۔ مجھے ''ڈوبنے'' کے کچھ قافیے سوچ کر بتاؤ' میں ایک نظم میں الجھا ہوا ہوں۔''

جمال نے ایک لمحہ سوچا اور کہا ''جناب ''ڈوبنے'' کا کوئی قافیہ اردو میں نہیں ہے۔ جو وزن میں برابر ہو اور مضمون بھی نکالے۔''

ابوالاثر مسکرائے اور بولے ''کچھ نہیں [illegible] برخوردار شاعری [illegible] کام نہیں [illegible]!''



جمال نے عرض کیا ''مصرعہ کیوں نہیں بدل دیتے جناب؟''

ابوالاثر نے قہقہہ لگایا اور آنکھ کے کونے سے اسے دیکھ کر بولے ''گویا تم بھی مجھے نہیں جانتے! وہ بیدل کہاں ہے' بڑا شاعر بنا پھرتا ہے۔ چپڑاسی! بیدل اور مفتی دونوں کو پکڑ کر لاؤ' کہو صاحب یاد کر رہے ہیں۔ جلدی۔''

تھوڑی دیر میں دونوں آ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ ابوالاثر نے سنجیدہ شکل بنالی۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی پھر انہوں نے سر اٹھایا اور کہا ''آپ دونوں کا ادب میں بڑا مقام ہے۔ ایک کا شعر میں اور دوسرے کا افسانہ نویسی میں۔ اگرچہ اردو میں ان دونوں اصناف کا موجد ابوالاثر ہی تھا۔ ادب و شعر میں جو کچھ باقی ہے ابوالاثر ہی کے دم سے ہے۔ مانتے ہو؟''

بیدل اور مفتی نے بیک آواز کہا ''مانتے ہیں جی۔''

''مگر یہ جمال نہیں مانتا۔ اخبار نویس ہے نا۔''

''جی نہیں میں تو آپ کو بہت مانتا ہوں۔''

''دراصل بیدل بھی کسی کو نہیں مانتا۔ کتا کتے کا بیری ہوتا ہے نا......''

بیدل بولا ''جی میں کتا ہرگز نہیں۔''

اس پر ابوالاثر مسکرا دیئے اور بولے ''تمہاری چوٹ مجھ تک صحیح سلامت پہنچ گئی برخوردار!''

بیدل بھی مسکرا دیا۔ وہ ابوالاثر پر اس قسم کے جملے کس دیا کرتا تھا۔ مفتی چپ چاپ مزے لیتا تھا۔ خود کچھ کہتا نہ تھا۔

ابوالاثر پھر سنجیدہ ہو گئے اور انہوں نے مفتی اور بیدل سے وہی سوال کیا۔ ''ہے کوئی تم میں جو مجھے ''ڈوبنے'' کا قافیہ بتا سکے؟''

بیدل نے کہا ''قافیہ تنگ تو ہے۔''

مفتی بولا ''جی میں ادیب ہوں' زبان دان نہیں۔ قافیے اور ردیف سے میرا کیا تعلق۔''

بیدل بولا ''جناب ابوالاثر میں قافیوں کی فہرست بنا کر نہیں لکھتا مگر آپ ڈوبنے کے چکر میں کیوں پڑ گئے۔ آپ کا تو کوئی پروگرام ایسا ہے نہیں اگرچہ موقع بھی ہے دستور بھی ہے۔''

ابوالاثر نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا ''ڈوبنے کا ایک قافیہ میرے پاس ہے جو کسی کے پاس نہ ہوگا۔ سنو گے تو پھڑک کر یہیں مر جاؤ گے۔ میرے دوستو! انا للہ وانا الیہ راجعون!''

''فرمائیے۔ ہم نہیں مریں گے۔'' جمال بولا ''کون سا قافیہ آپ کھود کر لائے ہیں۔''

''لاکھ روپے کا قافیہ ہے۔ ہے تمہارے پاس لاکھ روپیہ؟''

''کچھ کہیے بھی۔'' جمال بے چین ہو گیا۔

ابوالاثر بولے ''ڈوبنے کا قافیہ ہے۔ ''ایوب نے'' ...... ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی!'' یہ کہہ کر ابوالاثر نے اپنا سوکھا ہوا ہاتھ بڑھا دیا اور خی خی کر کے ایک قہقہے کے گہرے غوطے میں اتر گئے۔

جمال نے کہا ''قافیہ واقعی اچھوتا ہے مگر آپ اسے کہاں استعمال کریں گے۔ کیا ایوب خاں کا قصیدہ لکھنے کا ارادہ ہے؟''

''قیصدہ کیوں؟'' ابوالاثر چڑ کر بولے۔ ''کیا وہ افواج پاکستان کا سپہ سالار نہیں ہے؟ کیا وہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نہیں؟ کیا وہ حاکم کل نہیں۔ کیا وہ پاکستان کی ابدیت کا ضامن نہیں؟ کیا وہ اسلام کا غازی نہیں ہے؟''

''بے شک بے شک!'' سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

''جھوٹ۔ سب جھوٹ۔'' ابوالاثر بولے اور کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ ہنسی تھمی تو بولے ''ایوب خاں کچھ بھی نہیں۔ آپ سب لوگ جھوٹ بول رہے ہیں۔ وہ ایک خوبصورت آدمی ہے۔ دھاندلی کر کے آیا ہے' چور ہے اور پاکستان کا بیڑا غرق کرے گا۔ فوج اب ہماری گردنوں سے کبھی نہیں اترے گی! انشاءاللہ۔''

سب کو جھٹکا لگا۔

پھر ابوالاثر بولے ''یہ جمال ٹھیک کہتا ہے۔ یہ بات کو خوب سمجھتا ہے۔ دراصل میں ایوب خاں کا قصیدہ ہی لکھنے والا ہوں۔ جمال ہمیشہ ٹھیک کہتا ہے اور یہی ایک عیب ہے اس میں ورنہ سونے میں تولے جانے کے لائق تھا۔''

''تو پھر ایوب خاں کا قصیدہ لکھیے۔ ڈوبنے کے ساتھ ایوب خاں کا قافیہ نگینے کی طرح بیٹھے گا۔'' جمال بولا۔

''میں قافیہ ہمیشہ نگینے کی طرح بٹھاتا ہوں۔ تم نے میرا کلام نہیں پڑھا تو پھر کیا پڑھا؟''

''جی نہیں میں نے آپ کا سارا کلام پڑھا ہے۔''

''میں تمہیں خوب جانتا ہوں جمال مگر تمہیں نہیں معلوم کہ میں یہ قصیدہ محض تم لوگوں کی خاطر لکھ رہا ہوں ورنہ مجھے ایوب خاں سے کیا لینا دینا۔''

''جی ہاں آپ کے پاس بہت کچھ ہے۔'' بیدل نے گرہ لگائی ''اور جانتے ہیں کہ آپ کو کرنا کیا ہے۔''

''یہ سب تمہارے لیے ہے۔ بیدل اور مفتی کو یہاں سے نکل کر کہیں نوکری نہ ملے گی۔ جمال شاید جوتیاں گھسیٹتا سندھ گورنمنٹ میں واپس چلا جائے گا۔ یہ سب اس لیے کہ ایوب خاں خوش ہو جائے محکمہ چلتا رہے۔ تمہاری نوکریاں لگی رہیں ورنہ تمہیں پوچھتا کون ہے پاکستان میں؟''

''جی کوئی نہیں پوچھتا۔'' مفتی بولا۔



''پوچھتا تو ابوالاثر کو بھی کوئی نہیں۔'' بیدل نے کہا۔

''بے شک جوہر قابل کو اس ملک میں کوئی پوچھتا نہیں۔'' ابوالاثر بولے ''تم کہو تو ابھی استعفیٰ لکھ دوں؟''

''چپڑاسی!'' انہوں نے نعرہ مارا۔

چپڑاسی بھاگتا ہوا اندر آیا تو اس سے بولے ''سٹینوگرافر کو بلاؤ۔'' پھر گھنٹیاں بجانے لگے جیسی کہ ان کی عادت تھی۔ ٹن ٹن۔ ٹن ٹن۔ ٹن ٹن۔

جمال نے ہر چند کہ وہ ابوالاثر کی اداکاریوں سے واقف تھا کہا ''جانے دیجیے جناب۔ کس بات پر استعفیٰ؟''

بیدل بھی کچھ گھبرا گیا۔ ''ہم نے مانا کہ نوکری آپ صرف ہم تینوں یتیموں کی خاطر کرتے ہیں۔ اپنی تنخواہ کا آپ کو لالچ نہیں ہرگز۔ جائیداد آپ کے پاس بہت ہے مگر......''

''جائیداد؟ وہ تو سب کی سب جالندھر میں چھوٹ گئی تھی برخوردار کیا تم جانتے نہیں؟''

''جانتا کیوں نہیں؟'' بیدل نے آہستہ سے کہا ''حویلیاں' مربعے' ہاتھی' گھوڑے' رتھیں اور جو کچھ آپ کے باپ دادا نے چھوڑا تھا۔''

''تم مذاق سمجھ رہے ہو؟'' ابوالاثر نے تن کر کہا۔

''جی نہیں جناب۔ بکواس کرتا ہے بیدل۔'' مفتی نے سہارا دیا۔ ''جیسے کہ آپ نے ابھی کہا کتا کتے کا بیری!''

''اس بات پر میں نے استعفیٰ دینے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اگر تم کہتے ہو...... ورنہ......''

پھر ابوالاثر نے ایوب خاں کا قصیدہ لکھا اور اسے سرکاری رسالے میں چھپوا کر اس کی ایک نقل ملٹری سیکریٹری کو بھجوا دی۔ ایک کاپی بریگیڈیئر خان کے پی اے کو بھی دلوا دی اور ساتھ ہی کہلوا دیا کہ میں تو خیر کیوں ایوب خاں کو شہرت دوام بخشتا مگر اس نے میرا نمبر کہیں سے لے کر خود ٹیلی فون پر گلہ کیا کہ قوم صرف مرے ہوئے خادموں کی قدر کرتی ہے۔ زندوں کو نہیں پوچھتی۔ یہ اشارہ سمجھ کر میں نے اس کی شکایت دور کر دی۔

## شاہنامۂ مارشل لاء

پی اے فرائض میں مستعد ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایوب خاں نے ابوالاثر کو از خود ٹیلی فون کر کے قصیدہ لکھنے کی جو فرمائش کی تھی اس کا ساری منسٹری میں چرچا ہو گیا۔ افسران کی اور بھی خوشامد کرنے لگے۔ بریگیڈیئر خان کی تو ان سے جان ہی نکلنے لگی۔ ابوالاثر نے انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ ایوب خان نے مجھ سے کہا ہے کہ میں شاہنامہ مارشل لاء بھی رقم کروں۔ اس سلسلے میں میں ایک ماہ مری میں قیام کروں گا۔ میرے لیے سرکاری ریسٹ ہاؤس میں قیام و طعام کا انتظام کر دیا جائے اور ٹی اے اور ڈی اے کے بل پیشگی دلوا دیے جائیں کیونکہ

غریب شاعر کے پاس سوائے فقر کے کچھ نہیں ہوتا۔

## سستا لدو جانور

اگلے روز خدا بخش چپڑاسی ہانپتا کانپتا جمال کے کمرے میں آیا اور کہنے لگا ''چلیے حضور صاحب نے بلایا ہے اور حکم دیا ہے کہ آپ بھاگ کر آئیں۔ آرام سے چل کر نہ آئیں۔''

''کیوں بھائی کیا ہو گیا۔'' جمال نے کرسی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''پتہ نہیں جناب مگر آپ کو بھاگ کر پہنچنے کا حکم ہے۔''

جمال آرام سے چلتا ہوا ابوالاثر کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ کہنیاں میز پر رکھے پریشان بیٹھے تھے۔ جمال کو دیکھتے ہی بولے ''تم مجھے بتاؤ کہ دنیا میں سب سے سستا لدو جانور کون سا ہے' مگر تم بتا نہیں سکتے۔ بتا سکتے ہو؟''

جمال نے کرسی پر بیٹھ کر پوچھا۔ ''آپ کو اس کی جستجو کیوں ہوئی۔ ہم سب آپ کے لدو جانور ہی تو ہیں۔''

''مگر تم سستے نہیں ہو۔ سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست! تم بڑی بڑی تنخواہیں لیتے ہو۔ مجھے دنیا میں سب سے سستے لدو جانور کا نام مطلوب ہے۔''

جمال نے کچھ سوچا اور کہا ''دنیا کا سب سے سستا لدو جانور اونٹ ہے۔''

''وہ کیسے؟'' ابوالاثر نے پوچھا۔

جمال نے جواب دیا ''وہ بہت وزن اٹھا سکتا ہے۔ کانٹے کھا کر پیٹ بھر لیتا ہے۔ دس دس دن پانی پیے بغیر چلتا رہتا ہے۔''

''یہ تو ٹھیک ہے۔'' ابوالاثر بولے ''مگر وہ دنیا کا سب سے سستا جانور نہیں۔ ذرا سوچو اور سوچو۔''

جمال نے کہا ''جی پھر گدھا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''گدھا کا غذ اور پرانے کپڑے کھا کر بھی پیٹ بھر لیتا ہے اور وزن جتنا چاہے لاد دیجیے۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے مگر گدھا بھی دنیا کا سب سے سستا لدو جانور نہیں۔''

جمال نے کہا ''جناب اور میں نہیں سوچ سکتا۔''

ابوالاثر ہنسے اور کہنے لگے ''نہیں جانتے نہ کچھ۔ پھر یہ بندۂ کمینہ' ہمسایہ خدا ہے اور جانتا ہے کہ دنیا کا سب سے لدو جانور انسان ہے۔ ہاتھ لا اُستاد......''

اور یہ کہہ کر انہوں نے اپنا سوکھا سڑا ہاتھ آگے پھیلا دیا۔

جمال نے پوچھا ''مگر انسان دنیا کا سب سے سستا لدو جانور کیسے ہوا؟''



''وہ ایسے کہ وہ مفت بوجھ اٹھاتا ہے۔ تھکتا بھی نہیں۔ کھانے کو بھی کسی سے کچھ نہیں مانگتا۔ سوتا بھی نہیں۔ جب تک حکم دو چلتا رہتا ہے۔ تم نے دفتر میں اونٹ گدھے کی پوسٹیں نکالی بھی نہیں اور اب بھی کوشش نہ کرنا کیونکہ فنانس منسٹری کہے گی جب ہم نے تمہیں کلرکوں اور چپڑاسیوں کی شکل میں اتنے لدو جانور دے رکھے ہیں' تمہیں اونٹ گھوڑے کی کیا ضرورت ہے۔ انہی سے کام چلاؤ۔''

یہ کہہ کر وہ کھی کھی کر کے ہنسنے لگے۔

مری جانے سے پہلے انہوں نے دفتر کا انتظام جمال کی بجائے اس فوجی افسر کے حوالے کر دیا جسے وہ جمال' مفتی اور بیدل کے اتحادِ ثلاثہ کے توڑ پر لائے تھے۔ انہوں نے کہا ''مارشل لاء نے کہہ دیا ہے کہ سول افسر نالائق اور کام چور ہوتے ہیں۔''

کپتان صاحب اعلیٰ پائے کے مزاحیہ شاعر تھے۔ ڈرل وغیرہ ان کو آتی نہ تھی مگر وردی ان کے بھاری جسم پر سجتی تھی۔ انہوں نے فوجی نوکری بھی مزاحیہ نظموں اور قصیدوں کے زور پر کی تھی مگر ہنسی مخول کی بھی ایک حد ہے۔ وہ حکم کا غلام' ڈرپوک' نمائشی اور مسخرا آدمی تھا۔

دفتری نظام اس کو سونپنے کا مطلب یہ تھا کہ ایک تو بریگیڈیئر خان کو خوش رکھے گا' دوسرے جمال بیدل اور مفتی میں پھوٹ ڈالے گا اور دیگر کچھ تبدیل نہ ہوگا۔

ابوالاثر نے جمال سے کام چھین لیا تھا۔ اس کی بہت بڑی میز خالی رہتی تھی اور وہ ہاتھوں پر ہاتھ دھرے بیکار بیٹھا رہتا تھا۔ دفتر کے چھوٹے ملازموں نے بھی سایہ گزراں سمجھ کر اسے سلام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ سارا دن بیٹھا بور ہوتا رہتا۔ مفتی اور بیدل سے گپ لڑاتا' قادر خاں' عنایت خان اور محمود سے راگ سنتا۔ کیفے ٹیریا میں جا کر مچھلی کھاتا اور نسرواں جی کی جنجر پیتا۔ اس کی فلم کی ٹریننگ کسی کام نہ آئی۔

مارشل لاء نے آتے ہی دفتروں میں چھانٹی کر کے سیکریٹریٹ میں فوجی افسر دھکیل کر گلیوں میں صفائیاں کرا کے اور کچھ بدعنوان تاجروں کو پکڑ کر نیک نامی کمائی تھی اور لوگ اس سے فی الحال خوش تھے۔

## واپسی

ادھر امریکی ماہرین نے رپورٹ دی کہ ولیج ایڈ کا منصوبہ بیکار ثابت ہوا۔ دراصل ان کا فالتو جنگی مال بک چکا تھا اور اب انہیں ضرورت تھی سیاسی نظام کی جو امریکی اثر و رسوخ کو دوام بخشے۔ انہوں نے ایوب خان کو مشورہ دیا کہ تم بنیادی جمہوریتوں کا تجربہ کرو تاکہ تمہارے عوام کی تربیت ہو اور اخراجات گھٹاؤ تاکہ بنیادی جمہوریتوں کے لیے تمہارے پاس رقم ہو۔ ان حالات میں پرچہ لگا کہ فوراً ہی وزارت اقتصادیات ولیج ایڈ کو ختم کر رہی ہے۔

ابوالاثر خوف کے مارے کٹ کھنے ہو گئے۔ انہیں پتہ تھا کہ میں تو گیا۔ میں جو پیدا ہی ولیج ایڈ کے لیے ہوا تھا اور ولیج ایڈ جو پیدا ہی میرے لیے ہوئی تھی' ہم دونوں کا کیا بنے گا۔ وہ کسی سے مشورہ نہیں کرتے

تھے۔ کمرہ بند کر کے اپنے بچاؤ کی ترکیبیں سوچتے رہتے تھے۔ جب بالآخر انہیں ایک ترکیب سوجھ گئی تو وہ سیدھے بریگیڈیئر صاحب کے پاس گئے اور ان سے کہنے لگے کہ ولیج ایڈ تو بے شک فضول ہے مگر ولیج ایڈ پبلسٹی کا محکمہ بڑے کام کی چیز ہے۔ اسے کسی طرح رکھ لو۔

''پہلے بھی سارا کام میں ہی کرتا تھا اور آگے بھی میں ہی کروں گا۔ قائداعظم نے انتقال سے پہلے مجھے جو کام سونپے تھے' ابھی مکمل نہیں ہوئے۔ اس لیے مجھے فقط ایک کمرہ' ایک سٹینوگرافر' ایک بل کلرک جو تنخواہ اور ٹی اے کے بل بنا سکتا ہو' درکار ہوں گے۔ سرکاری کوٹھی' ٹیلی فون اور گاڑی جو مجھے سرکار نے دے رکھی ہے وہ تو ہے ہی۔''

بریگیڈیئر خان جسے ایوب خاں سے لڑ کر انہوں نے سیکریٹری وزارت اقتصادیات لگوایا تھا' ٹال مٹول کرنے لگا۔ ابوالاثر حیران تھا کہ یہ میرا پروردہ شخص اتنا چھوٹا سا معقول مطالبہ کیوں نہیں مانتا۔ جب انہوں نے بہت اصرار کیا تو بریگیڈیئر صاحب نے کہا ''آپ خود ہی ایوب خان سے بات کر لیں۔ آپ کے آگے تو وہ بول نہیں سکتا۔''

''اب میں اپنے بارے میں کیسے بات کروں۔'' ابوالاثر نے سر جھکا کر کہا ''آپ کو پتہ ہے کہ میں نے ساری عمر اپنے بارے میں کبھی بات نہیں کی۔ قائداعظم بھی میری انا کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ اب میں ان کی روح سے شرمندہ ہو رہا ہوں۔ رات ہی انہوں نے خواب میں آ کر مجھے کہا ابوالاثر تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ پاکستان کو میرے بعد صحیح راستے پر ڈال دیتے۔ گلا ان کا ذرا بیٹھا ہوا تھا۔''

''قائداعظم کا گلا بیٹھا ہوا تھا؟'' بریگیڈیئر صاحب نے پوچھا۔

''لگتا تو ایسا ہی تھا۔ ان کی آواز رندھی ہوئی تھی جیسے روئے ہوئے ہوں۔ ان کی بات کا میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ خود میری آنکھوں میں بھی آنسو امڈ آئے۔''

اس کے ساتھ ہی ابوالاثر ہچکیاں لے لے کر رونے لگے۔ اس پر موذی کا دل بہت پسیجا مگر وہ کچھ کرنے پر راضی نہ ہوا۔ الٹا پوچھنے لگا ''جناب والا قائداعظم خود ہی ایوب خاں سے بات کیوں نہیں کر لیتے۔ اسے کمانڈر انچیف تو انہی نے بنایا تھا۔''

ابوالاثر نے ناک صاف کی اور کہا ''بات آپ کی معقول ہے۔ وہ پھر خواب میں آئے تو ان سے پوچھوں گا۔ فوج اور خاص طور پر بریگیڈیئروں سے وہ بہت محبت کرتے تھے۔ بارہا انہوں نے فوج کے بارے میں مجھ سے مشورہ کیا حالانکہ میں عاجز کسی قابل نہ تھا۔ ہمیشہ انہوں نے کہا بریگیڈیئر ہیں تو فوج ہے۔ بریگیڈیئر نہ ہوں تو کوئی جرنیلی تک نہ پہنچے۔''

ابوالاثر کو پتہ تھا کہ بریگیڈیئر مذکور میانوالی سے سپاہی بھرتی ہوئے تھے مگر بھلا ہو جنگ عظیم کا' جس



دفتر میں ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ میں نہ ہوتا تو بریگیڈیئر خان ابھی تک خچر یاتری ہوتے۔ کم سے کم وزارتِ اقتصادیات کے سیکریٹری تو کبھی نہ بن سکتے اور اب ان کے غرور کا یہ عالم! تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!

بریگیڈیئر خان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ابوالاثر کی ایوب خاں تک رسائی نہیں۔ اس نے اپنی ملازمت کے کاغذات بھی دیکھ لیے تھے جو بریگیڈیئر ریٹائر ہو کر گھر جانے والے تھے، مارشل لاء نے ان کی فہرستیں کیبنٹ سیکریٹریٹ کو مع اسناد اور احوالِ ملازمت بھیج دی تھیں کہ ان کو کہیں سول محکموں میں کھپایا جائے۔ وہ نظم و ضبط کے پابند ہوتے ہیں۔ حکم عدولی نہیں کرتے۔ وقت پر دفتر آتے ہیں۔ انہیں ماتحتوں کو سیدھا کرنا بھی آتا ہے اور سیاستدانوں سے بھی ان کا کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔

ایوب خاں کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ وزارتِ اقتصادیات میں کون برسرکار ہے مگر ابوالاثر نے اپنا رنگ جمانے کی پوری کوشش کی تھی۔

## الوداع

اگلے روز ان کپتان صاحب نے جنہیں ابوالاثر' بیدل' مفتی اور جمال کے توڑ پر لائے تھے اور جو وردی پہن کر دفتر آتے تھے اور اپنا فوجی اردلی اور اپنی چھڑی ساتھ لاتے تھے۔ ابوالاثر سے کہہ دیا کہ جناب کل سے دفتر تشریف لانے کی تکلیف نہ کریں۔

وہ صبح سویرے آ کر ابوالاثر کی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے کہا ''حکم اوپر سے آیا ہے۔''

''کس کا حکم ہے۔؟'' ابوالاثر نے کڑک کر پوچھا اور کہا ''اٹھو میری کرسی سے۔''

''بریگیڈیئر خان کا حکم ہے سر۔ میں فوجی ڈسپلن کا پابند ہوں۔ میں کرسی سے نہیں اٹھ سکتا۔''

''تم کو شرم آنی چاہیے۔ کس چاؤ سے میں تم کو لایا تھا! اس کا بھی تم نے خیال نہ کیا۔''

''جی اس کا مجھے بہت خیال ہے مگر......''

''مگر میں نے تمہارے لیے خود نوٹ لکھے۔ بریگیڈیئر خان کو شیشے میں اتارا۔ وزارتِ خزانہ میں جوتیاں گھسیٹیں۔ میں نے اسے دھونس نہ دی ہوتی تو تم میانوالی کے کسی گاؤں میں بکریاں چراتے نظر آتے' مگر آج تم میری کرسی پر بیٹھ گئے ہو۔''

''جی بریگیڈیئر خان میرے عزیز ہیں۔ انہوں نے خود مجھے بلایا تھا۔ آپ کے نوٹ کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ وزارت خزانہ میں بھی انہوں نے ہی فون کر دیا تھا۔'' کپتان صاحب تحمل سے بولے ''کوئی کسی کا عزیز نہیں ہوتا نوکری میں۔'' ابوالاثر بولے۔

''جی میرا ان کا گاؤں بھی ایک ہے۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے۔''

''جی ہماری پلٹن بھی ایک تھی۔''

’’مگر تم کو یہاں نوکری کس نے دلوائی تھی؟‘‘

’’بجا ارشاد مگر میری نوکری بریگیڈیئر خان کی اپنی حکمتِ عملی تھی۔ انہوں نے آپ سے نوٹ لکھوا لیا۔ بڑے افسر چھوٹے موٹے کام اس طرح کرواتے ہیں۔ آپ شکریئے کے مستحق بہرحال ہیں مگر فوجی آدمی صرف فوجی افسر کا حکم مانتا ہے۔ اب کل سے آپ دفتر تشریف نہ لائیں۔ ڈرائیور آج آخری دفعہ آپ کو گھر چھوڑ دے گا۔ اتنی رعایت میں آپ کو دے سکتا ہوں۔‘‘

ابوالاثر کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ غصے کے مارے ان کا رنگ پہلے کالا اور پھر زرد ہو گیا۔ جل کر بولے ’’میں بریگیڈیئر خان کو دیکھ لوں گا۔ جنرل ایوب خاں کے عہد میں اقربا پروری نہیں چلے گی۔ اب تو میں جاتا ہوں مگر کل دفتر آنے سے مجھے کوئی روک نہیں سکتا کیونکہ اس کرسی پر جس پر تم بیٹھے ہو مجھے قائداعظم نے خود بٹھایا تھا۔‘‘

کپتان صاحب نے جنبش نہ کی۔ انہوں نے کہا ’’یہ مارشل لاء ہے سر اور قائداعظم محض ایک سویلین تھے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے آپ کی برخاستگی کا غم نہیں۔ برسوں ہم ساتھ رہے۔ مل کر مشاعرے پڑھتے رہے اور رات ہی میں نے آپ کے لیے الوداعی نظم لکھی۔ ذرا سن کر جائیے گا۔‘‘

یہ کہہ کر کپتان صاحب نے جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگایا اور ترنم سے ابوالاثر پر کہی ہوئی الوداعی نظم پڑھنے لگے۔

ابوالاثر اپنا بیگ اٹھا کر جا چکے تھے مگر کپتان صاحب نے ان کے جانے کے بعد بھی خالی کمرے میں نظم جاری رکھی اور ختم کر کے ہی دم لیا۔

تھوڑے دنوں کے بعد کپتان صاحب‘ مفتی‘ بیدل‘ جمال‘ چپڑاسیوں اور کلرکوں کی بھی چھٹی ہو گئی۔ ابوالاثر کو سرکاری کوٹھی خالی کرنے کی کچھ مہلت مل گئی مگر دل ان کا دنیا سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ وہ لاہور واپس چلے گئے اور انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

جمال ان سے پھر کبھی نہ ملا۔ بادل نخواستہ وہ بہت سارے سال اور جئے مگر زیادہ تر گھر ہی میں رہے۔

آخری وقت آیا تو انہوں نے وصیت کی کہ میں چونکہ قائداعظم کا شریک کار رہا اور اقبالؔ نے بھی مرنے سے پہلے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں ان کی موت پر نظم لکھوں گا اس لیے مجھے ان کے قدموں میں دفن کیا جائے تاکہ شاہی مسجد کی اذان سے میری روح کو سکون پہنچتا رہے۔

ان کا دم نکلتے ہی بیگم صاحبہ نے حکومت کو تار بھجوائے کہ وہ اقبال کے قدموں میں دفن ہونا چاہتے تھے اس لیے انہیں ان کے پہلو میں قبر دی جائے۔

اب ابوالاثر کو تو پتہ تھا کہ حکومت کے کام کس طرح چلتے ہیں مگر بیگم صاحبہ کو پتہ نہ تھا۔ ایک دو روز



کے بعد جب لاش بو دینے لگی اور حکومت کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو انہوں نے انہیں امانتاً دفن کرا دیا۔ تار کا جواب آتے آتے دو تین ماہ لگ گئے مگر حکومت کو ان کی خدمات کا پاس نہ رہا اور انہیں بالآخر مینار پاکستان کے پاس قبر کی جگہ مل گئی اور ان کا تابوت وہاں منتقل ہو گیا۔

وہاں بھی ابوالاثر کی روح بے سکون نہ ہو گی کیونکہ شاہی مسجد کی اذان تو وہاں بھی پہنچتی ہو گی۔

## آبادکاری

بیدل کو یونیسکو کے کتابوں کے ایک ادارے میں نوکری مل گئی کیونکہ کوئی فوجی افسر مدمقابل نہ تھا۔

مفتی راولپنڈی چلا گیا۔ وہاں کے ریڈیو والے اس کی آخری امید تھے۔ پھر وہاں وہ پرانی اور خستہ قبریں تھیں جنہیں وہ دستِ خدا سمجھتا تھا۔ جمال کو محکمہ فلم و مطبوعات میں تعینات کر دیا گیا۔ وہ محکمہ کم و بیش اسی کا تعمیر کردہ تھا۔ ولیج ایڈ کے زمانے میں اس نے اس کے لیے سامان منگوایا تھا اور بھی بہت کچھ کیا تھا۔

اس نے جن لوگوں کو ملازمت دلوائی تھی۔ اب وہ اس کے افسر ہو گئے تھے۔

جمال منہ پھٹ بھی تھا اور وہی تھا جس نے فلم بنانے کی تربیت لی تھی۔ اسے فلم سازی کی بجائے فلموں کے بجٹ چیک کرنے پر لگا دیا گیا۔

حساب کتاب سے جمال کو کبھی دلچسپی نہ ہوتی اور یہاں بجٹ چیک کرنے کی زیادہ گنجائش بھی نہ تھی۔ سبھی پروپیگنڈہ فلمیں ایک جیسی ہوتی تھیں کیونکہ ان کا موضوع ایوب خان کے ترقیاتی کارناموں کی تعریف تک محدود ہوتا تھا۔ جگہ جگہ کارخانے لگ رہے تھے۔ مال تیار ہو کر دساور کو جا رہا ہے۔ ملک ترقی کر رہا ہے۔ سیلاب آتے ہیں تاکہ حکومت کو ڈوبے ہوؤں کو آباد کرنے کا موقع ملے۔ بھونچال بھی حکومت کو عوام کی خدمت دینے کو آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سیاست اور سیاستدانوں کو گالی پڑتی تھی جنہوں نے ملک کا بیڑا غرق کر ڈالا تھا۔

جمال نچلا نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اس نے چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ کمیشن کے پھیر میں پروڈیوسر سٹوڈیو والوں کو زیادہ پیسے دلواتے تھے۔ جمال کا گزارہ فوراً ہی مشکل ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ میں کچھ دنوں کے لیے لاہور چلا جاؤں۔ خواجہ نعیم جیل میں تھے کیونکہ وہ سیالکوٹ کے مشہور بلیک مارکیٹ آرٹسٹ تھے اور دوہرے تہرے حساب رکھتے تھے‘ پکڑے گئے تو انہیں ایک سال کی قید اور تین لاکھ روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔ ان سے اظہار ہمدردی بھی ضروری تھا۔

اس کے علاوہ بھی جمال کو لاہور میں بہت سے کام تھے۔

# باب 27

سیالکوٹ میں اداسی چھائی ہوئی تھی۔ جمال کی امیر طبع اور طرح دار خالہ نے پھٹے پرانے کپڑے پہن رکھے تھے۔اس نے جمال کو سیڑھیاں چڑھتے دیکھا تو اس کا چہرہ لٹک کر اور بھی لمبا ہوگیا۔

وہ سرد مہری سے ملی۔اس لیے نہیں کہ اسے جمال کو مل کر کوئی خوشی نہ ہوئی۔اس لیے کہ اس کی زندگی میں اب کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ یہ دکھاوے کی بات تھی ورنہ ان کی بلیک مارکیٹ کی کمائی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ وہ اب بھی رات کے کھانے میں تلے ہوئے بٹیرے کھاتے تھے مگر دروازے بند کر کے۔ دوسروں کے سامنے اور جمال کی موجودگی میں خالہ نعرے مارتی تھی' اے لڑکیو کپڑے سنبھال کر پہنو، پھٹ گئے تو کہاں سے آئیں گے۔اے لڑکیو جیب خرچ مت مانگو' یہاں آٹے کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔

دوہری زندگی خواجہ نعیم کے گھرانے کی پرانی روایت تھی مگر اب اس نے کمال پالیا تھا۔

مگر خواجہ نعیم کا گھرانہ دل سے پریشان بھی تھا۔ تین لاکھ جرمانے کی رقم معمولی رقم نہ تھی۔ خواجہ نعیم کی جائیداد کافی تھی۔ سیالکوٹ کے علاوہ کراچی کی بندر روڈ پر ان کی ایک بڑی بلڈنگ تھی۔ جس میں کئی سال پیشتر جمال کرائے دار رہا تھا، مگر اب تین لاکھ جرمانے سے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے۔

ابھی تک یہ جرمانہ بھرا نہ گیا تھا۔ خواجہ نعیم نے اس کے خلاف اپیل کی ہوئی تھی مگر فوجیوں پر بھروسہ نہ کیا جا سکتا تھا۔ پھر رشوت کا رواج بھی چل نکلا تھا مگر خواجہ نعیم رشوت کے سخت خلاف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ رشوت گناہ ہے۔ فریاد سے کام نکالنے کی کوشش کرو۔

جمال کی خالہ پنجاب کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جرنیل کی بیوی کے سامنے رو رو کر فریاد کرتی' وہ پھٹی ہوئی قمیص پہنتی۔ سر پر میلی چادر کی بُکل مارتی اور پرانے سلیپر پاؤں میں پہن کر جرنیل صاحب کے گھر میں فرش پر بیٹھ جاتی اور روتی کہ جرنیل صاحب جرمانہ معاف کردو۔ جرنیل صاحب کی بیوی اس کو تسلی دیتی اور چائے پلا کر رخصت کر دیتی۔

یہاں سے اٹھ کر جمال کی خالہ ہوٹل میں جاتی' کپڑے تبدیل کرتی' سنگھار کرتی' زیور پہنتی اور انارکلی میں شاپنگ کے لیے چلی جاتی۔



سیالکوٹ کے جیلر خواجہ نعیم نے کچھ دے دلا کر اور کچھ شہرداری کا واسطہ دے کر ساتھ ملا لیے تھے اور پلاؤ قلیہ ان کو گھر سے باقاعدہ پہنچتا تھا۔

پاکستان میں کارخانے لگ رہے تھے۔ کپڑا بن رہا تھا مگر ملک کو ملوں کے قرضے اور ان پر سود ادا کرنے کے لیے فارن ایکسچینج کی سخت ضرورت تھی مگر اس کے لیے مزید قرضے لینے پڑتے تھے۔

مگر خواجہ نعیم سے کسی فوجی افسر نے رشوت نہ لی تھی۔اس لیے کہ وہ پہلے ہی ہلے میں پکڑے گئے تھے اور ابھی فوجی افسروں کو رشوت لینے کے طریقے نہ آتے تھے۔

جمال کو خواجہ نعیم سے ایک گونہ ذاتی تعلق بھی تھا۔ کشمیر میں وہ اس کے ساتھ رہے تھے۔ پھر دونوں نے مل کر کلکتے تک کاروبار کیا تھا مگر جمال کو خواجہ نعیم کے جرمانے کا غم نہ تھا۔ اسے افسوس تھا کہ اتنا خوش خوراک خوش پوشاک رنگیلا آدمی جیل کی گندی کوٹھڑی میں زندگی کے دن کاٹ رہا ہے۔

جیل میں کھانے پینے کی انہیں کوئی تکلیف نہ تھی۔ خواجہ نعیم نے میٹھے بولوں سے جیل والوں کے من موہ لیے تھے۔ وہ تو ہاتھ کے کھلے نہ تھے مگر ان کا چھوٹا بھائی خواجہ سلیم خرچ شہزادوں کی طرح کرتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی سخاوت صرف اپنے گھر کے لوگوں ہی تک محدود تھی۔ خواجہ سلیم کے کھلے ہاتھوں اور جیل والوں کی انسان دوستی کے سبب خواجہ نعیم کو جیل میں دو وقت مرغ پلاؤ مل جاتا تھا۔

## خواجہ نعیم اور مہاتما گاندھی

جیل میں ملاقات کے وقت خواجہ نعیم نے جمال کے سامنے رونی صورت بنالی۔ روہانسے ہو کر بولے ''مصیبت کس پر نہیں آتی بھائی۔ تقدیر کے آگے کس کو چارہ ہے۔ مارشل لاء لوگوں کے کاروبار ختم کرنے پر تلا ہوا ہے۔ عزت داروں کی پگڑیاں اچھل رہی ہیں۔ میں پوچھتا ہوں' پاکستان کیا ہم نے اس لیے بنایا تھا کہ شرفاء ذلیل و خوار ہوں؟''

''اس لیے تو نہیں بنایا تھا جی۔'' جمال نے شرمندہ ہو کر کہا۔

''خدا لگتی کہنا۔ مجھے آخر کس قصور کی سزا مل رہی ہے۔ کیا میں نے کسی کا مال چرایا ہے؟ کہیں ڈاکہ ڈالا ہے؟ کسی پر ظلم کیا ہے۔ میں نے کاروبار کیا اور جس کو وارا کھایا اس نے میرا مال خرید لیا۔ کاروبار کا یہی اصول ہے۔''

''جی ہاں کاروبار کا اصول تو یہی ہے۔''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ اب میں نے اپنی محنت سے چار پیسے کما ہی لیے ہیں تو مارشل لاء کو تکلیف کیوں ہو رہی ہے۔ میں اپنی خون پسینے کی کمائی میں سے تین لاکھ کا جرمانہ کیوں بھروں؟''

''میں تو اتنا چاہتا ہوں کہ آپ قید سے چھوٹ جائیں کسی طرح۔'' جمال بولا ''روپے کا کیا ہے۔ روپیہ تو ہاتھ کا میل ہوتا ہے۔''

''کمال کرتے ہو جمال!'' خواجہ نعیم نے خفگی سے کہا ''میں اپنی محنت کی کمائی حرام کی راہ میں لٹا دوں؟''

''مگر جیل جانے سے آپ کی عزت خراب ہوئی۔ مجھے اس کا غم ہے۔'' جمال نے کہا۔

''جیل جانے سے کیا ہوتا ہے۔ جیل تو مہاتما گاندھی کئی مرتبہ گئے۔ مولانا آزاد گئے۔ پنڈت نہرو گئے۔ پھر کیا ان کی عزت چلی گئی؟ یہ پیسہ ہے جو جاتا ہے تو لوٹ کر نہیں آتا۔ عزت انسان کی پیسے سے ہوتی ہے اور پیسے کے ساتھ ہی چلی جاتی ہے۔''

**ہمدم دیرینہ**

لاہور میں اسے فدا محمد بہت یاد آیا۔ مدت سے دونوں دوستوں کی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ بچپن اور لڑکپن انہوں نے ہنسی خوشی گزارا تھا۔ جمال کو خبر تھی کہ وہ بہت خوشحال ہے اور بی اے ایم اے بھی اس نے پاس کر لیا ہے مگر وہ کہاں تھا؟

وہ ایمپریس روڈ پر تو پہنچ گیا مگر فدا محمد کی کوٹھی کہاں تھی۔ جغرافیہ وہی تھا۔ اس نے غور سے دیکھا تو وہ کوٹھی کہیں نظر نہ آتی تھی جس پر فدا محمد نے تقسیم کے زمانے میں قبضہ کیا تھا۔ جس کوٹھی کے سامنے وہ کھڑا تھا اس کے بوسیدہ آؤٹ ہاؤس کا یہاں کوئی نشان نہ تھا۔ جس کا اس نے تالا توڑا تھا۔ سامنے کا بڑا پورچ اور اس کے موٹے موٹے چورس ستون بھی غائب تھے۔ یہ ایک جدید طرز کی بانکی کوٹھی تھی جس کی دوسری منزل پر ایئر کنڈیشنر لگے ہوئے تھے جو اس زمانے میں ایک نامانوس شے تھے۔

فدا محمد اور جمال کے گہرے رشتے تقسیم کے زمانے میں ہی کمزور ہو گئے تھے۔ پھر معطل ہو گئے۔ ان میں کبھی جھگڑا نہ ہوا۔ وہ کسی بات پر لڑے نہیں۔ ان کے راستے بدل گئے۔ ان کے دلوں میں کدورت نہیں تھی۔ وہ اچانک اجنبی ہو گئے۔ جب فدا محمد کی کلاس بدل گئی۔

فدا محمد نے اس کوٹھی کو حاصل کرنے میں چھ چھ غنڈوں کا اکیلے مقابلہ کیا تھا۔ چاقو لہرائے تھے۔ چھریوں کا سامنا کیا تھا اور پھر یہاں سکول کھول کر اس کی الاٹمنٹ کروالی تھی۔ اصل میں وہ پاکستان کی تعمیر میں تعلیم کی اہمیت کو خوب سمجھتا تھا اور تعلیم ہماری پسماندہ تھی۔ فدا محمد نے اپنے سکول میں ذریعہ تعلیم نرسری ہی سے انگریزی کو رکھا۔ اس سے بچے فر فر انگریزی بھی بولنے لگے اور سکول کی آمدنی بھی بڑھ گئی۔ اس کو پتہ تھا کہ بچے انگریزی بولیں گے تو آگے چل کر افسر اور صنعتکار بنیں گے۔ اگر بچے فر فر انگریزی بولنے لگیں تو زیادہ فیس پر والدین اعتراض نہیں کرتے۔

فدا محمد ایک محنتی اور حوصلہ مند شخص تھا۔ اخلاق جلالی اور دفتر ابوالفضل کے سہارے وہ یہاں تک آ پہنچا تھا۔ وہ خوشحال تھا۔ اس سے زیادہ جمال کو کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ پرانے زمانوں کے حوالے سے دل میں شوق ملاقات لیے اس کی تلاش میں آیا تھا۔ مشتاق سے بھی جمال کی ملاقاتیں کم ہو گئی تھیں، مگر فدا محمد سے اس



کی بدستور گہری چھنتی تھی۔ اس میں تو کچھ کلام نہیں کہ فدا محمد ایک انتہائی مخلص اور وفادار شخص تھا مگر مشتاق میں بھی ایک کمزوری دونوں کی دوستی میں سیمنٹ کا کام دیتی تھی۔ مشتاق بالعموم ہر شخص کو جو اس کے ہم پلہ نہ ہو کسی وجہ کے بغیر حقیر جانتا تھا اور اس کا مذاق اڑاتا تھا مگر اس میں ایک کمزور رگ بھی تھی۔ وہ ہر امیر اور کامیاب آدمی کے ناز اٹھانے پر فطرتاً مجبور تھا اور اس میں نفع نقصان کی کوئی بات نہ ہوتی۔ وہ ایک معشوق صفت آدمی تھا اور لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے جن کی وہ ان کی حیثیت دیکھ کر پوجا کرتا اور پیٹھ پیچھے ان کا مذاق اڑاتا۔

مشتاق کے ساتھ ہونے سے فدا محمد کا بھی مان بڑھتا تھا۔ ان کے رومانی مشاغل بھی بدستور جاری تھے اور اب تو ارمان خریدے بھی جا سکتے تھے۔ روپے کے بغیر بھی، محض ملازمت کے بہلاوے سے۔ شان و شوکت سے، کیونکہ مڈل کلاس کے گھرانے بہت ہی کمزور مال پیدا کرتے ہیں۔

فدا محمد سوسائٹی کا ایک معزز رکن بننا چاہتا تھا اور اس کے لیے بھی پردہ داری شرط ہے مگر مشتاق بالغ ہونا بھی نہ چاہتا تھا۔ اگرچہ ذہانت اس میں بلا کی تھی اور اچھی کتاب بھی اسے بری نہ لگتی تھی۔ اگر وہ اسے زندگی کی حقیقتوں سے بھگا کر دور لے جائے۔ ایسے آدمی کو کسی محبوبہ سے تھپکی ملے تو وہ بالغ ہونے پر اصرار نہیں کرتا۔

مگر مشتاق دراصل کوئی جسمانی سانڈ نہیں تھا، وہ محض ایک بے یقین شخص تھا جسے اپنی تلاش تھی۔

ویسے مزاج کے اعتبار سے مشتاق جمال کے زیادہ قریب تھا مگر کامیابی کا کرشمہ اس کے دامنِ دل کو فدا محمد کی طرف زیادہ کھینچتا تھا۔

جب جمال فدا محمد کے دوارے پہنچا تو وہ اپنا زیادہ وقت اقبال کے مطالعے اور تعلیم کی تجارت کو دیتا تھا۔ سکول اس کی استانیاں چلاتی تھیں۔ وہ خود ان دنوں فارغ اوقات میں لاہور کے اشرافوں کے ساتھ جو پاکستان کی پیداوار تھے، ٹینس کھیلتا یا دور دراز تیتر کے شکار پر چلا جاتا۔

جمال کو نامراد ہی لوٹ جانا پڑا کیونکہ وہ گھر پر موجود نہیں تھا۔ یہ حالات اسے بعد میں ان لوگوں سے معلوم ہوئے جو یا تو اس کی کامیابی کا دکھ بھرتے تھے یا کامیابی کی وجہ سے اس کی پوجا کرتے تھے۔ کامیابی سے بڑی کوئی بدعت یا صنعت دنیا میں ہے بھی نہیں۔

**پرانے کمیونسٹ**

لاہور ہی میں اس نے سوچا کہ اپنے غریب دوست وحید کو دیکھوں کس حال میں ہے۔ وہ مشرقی پنجاب کا مہاجر تھا اور لدھیانے سے قافلے کے ساتھ پیدل چلتا ہوا راستے میں حملہ آور اکالیوں اور جن سنگھیوں کی بلموں، کرپانوں اور کلہاڑیوں کو طرح دیتا ہوا دو ماہ میں اپنے کچھ خونی رشتے راستے میں مروا کر لاہور پہنچا تھا۔ وہ ایک سچا اور مخلص کمیونسٹ تھا۔ یہاں آ کر اس نے ایک معمولی مکان کے سوا کچھ الاٹ نہ کروایا تھا۔ لاہور میں اسے کوئی جانتا نہ تھا کیونکہ اس کے شعور نے بمبئی میں آنکھ کھولی تھی۔ وہیں وہ کمیونسٹ پارٹی کا کل وقتی کارکن بنا تھا۔ جمال کی اس سے وہیں ملاقات ہوئی تھی مگر اس سے دوستی لاہور ہی میں پکی ہوئی تھی۔

پاکستان میں اس نے پارٹی کا کام بڑی تندہی سے کیا۔ مارکسی فلسفہ اس نے نہیں پڑھا تھا (اور کس نے پڑھا تھا) مگر مارکسی دانشوروں کی محبت میں وہ سمجھ گیا تھا کہ میری غربت اور کسمپرسی کا علاج طبقاتی انقلاب ہے۔ طبیعت اس کی میٹھی تھی۔ اس نے کبھی کسی کا دل نہیں توڑا۔ حالانکہ کمیونسٹ کڑوے زہریلے ہوتے ہیں۔

اس کی گرفتاری پر جمال کو بہت صدمہ ہوا تھا۔ چھوٹا تو ہر شخص کے دل میں اس کی اور اس کے ساتھیوں کی عزت بڑھ گئی۔ جمال کو اس سے ملے مدت ہو چلی تھی۔

وہ ملا تو اس کے ایک ہاتھ میں کار کی چابی' منہ میں پائپ اور دوسرے ہاتھ میں خوشبودار تمبا کو آرن مور کا پیلا ڈبہ تھا۔ یہ اس کے ٹریڈ مارک تھے۔

یعنی وحید کے حالات پہلے سے بہت بہتر ہو چکے تھے چونکہ وہ ایک مخلص آدمی تھا۔ اس لیے اس کے ایک دوست نے جو ریس کا رسیا تھا' اپنے سارے گھوڑے اس کے نام رجسٹرڈ کروا دیئے تھے اور آہستہ آہستہ اسے ریس کھیلنے کے بھاؤ تاؤ بھی بتا دیئے تھے۔

وحید ایک ذہین شخص تھا' جلد ہی وہ گھوڑوں کے اوزان، نسب ناموں اور ہار جیت پر مہارتِ تامہ سے بات کرنے لگا اور شراب بھی اس کی اعلیٰ سے اعلیٰ ہوتی چلی گئی۔

جمال کو ہر شراب کی بو اور ذائقہ ایک ہی جیسا لگتا تھا مگر وحید جام کو سونگھ کر ہی بتا سکتا تھا کہ اس میں جو سکاچ ہے وہ کتنے برس پہلے تیار ہوئی تھی۔ مطلب یہ کہ وہ ایک بامذاق اور خوشحال شخص تھا۔ اگرچہ کمیونزم کو وہ اب بھی اٹل اور انسانیت کی نجات آخری کہتا تھا۔

پھر اس کے ایک دوست نے جو نوابزادہ لیاقت علی خاں کا رشتہ دار تھا اور اپنے قدیم جاگیردارانہ کلچر کی وجہ سے کسی جسمانی محنت کے قابل نہ تھا' لوہے کی درآمد کی ایک ایجنسی لے کر شراکت داری پر وحید کو دلوا دی کہ کام تم کرو نفع آدھا آدھا۔

**ملاقات**

''میں تمہیں ڈھونڈنے سنت نگر چلا گیا تھا جہاں تمہیں مکان الاٹ ہوا تھا۔'' جمال نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''ارے سنت نگر میں کوئی شریف آدمی رہ سکتا ہے بھلا؟ مدت ہوئی میں نے چھوڑ دیا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''یار بڑا گندا علاقہ ہے۔ ہر وقت شور' چھوٹی چھوٹی تنگ گلیاں' وہاں کیسے رہا جا سکتا ہے بقول بنے بھائی!''

''یہ تو ہے مگر آج کل کہاں رہتے ہو؟'' جمال نے پوچھا۔

''فی الحال تو ریواز گارڈن میں ہوں مگر مال روڈ پر میں نے ایک کوٹھی دیکھی ہے۔ چار پانچ رائل اوک بھی ہیں اس کے لان میں۔ اس کے مالک نے لندن سے منگوائے تھے۔ یار بڑا باذوق آدمی تھا۔ بقول بنے بھائی!''



''تو تم مزے میں ہو آج کل؟'' جمال نے کہا۔

''خدا کا شکر ہے۔ دال روٹی چل جاتی ہے بقول بنے بھائی۔ اخبار کی تنخواہ میں تو گزارہ نہیں ہوتا۔ تھوڑا بہت کاروبار ہے' اسی کا آسرا ہے۔''

''ریس کی کمائی بھی تو ہو گی۔'' جمال نے کہا۔

''ریس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ بقول بنے بھائی ریس کی کمائی کو شراب کا خرچہ سمجھو۔ کبھی کبھی انسان ہار بھی جاتا ہے۔ انسان کو سوچ سمجھ کر چلنا چاہیے بقول بنے بھائی۔''

وحید دوستوں سے بڑی محبت کرتا تھا اور مخلص ایسا کہ جس دوست کی بات اسے اچھی لگتی اسے اپنے نام سے کبھی بیان نہ کرتا۔ دوسروں کے لیے بھی آسانی ہو جاتی۔ ان کو پتہ لگ جاتا کہ آج کل وہ کس کا مرید ہے۔ وہ ہمیشہ ہی بنے بھائی کی شہادت نہ دیتا بلکہ جو بھی اس زمانے میں اس کا ممدوح ہوتا اس کا نام لیتا مثلاً بقول رحمان بجلی والے' بقول قاسمی صاحب' بقول فیض صاحب' بقول اخلاق احمد دہلوی وغیرہ اور اس سے اس کے اوصافِ حمیدہ اور خلوص دل کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے مگر حیرت کی بات ہے کہ اس نے کبھی اپنے کسی غریب یا ناکام دوست کی کوئی بات سند نہ سمجھی۔

جمال نے کہا ''مگر تم اخبار کی نوکری چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ جب اس کی تنخواہ میں گزارہ بھی نہیں ہوتا۔''

وہ بولا ''اخبار کی نوکری میں کچھ فائدے بھی ہیں۔ اخبار کے دفتر سے ٹیلی فون کرو تو کام ہو جاتے ہیں ورنہ ہم ٹھہرے کمیونسٹ۔ ہماری کون سنتا ہے۔ پھر یہ بھی پتہ چلتا رہتا ہے کہ کون وزیر بننے والا ہے۔ کس کی پوسٹنگ کہاں ہے۔ کون سا ٹینڈر کھلنے والا ہے۔ کوٹہ کب آ سکتا ہے۔ بقول بنے بھائی انسان کو حالاتِ حاضرہ سے غافل نہ رہنا چاہیے۔ اخبار کی ملازمت نہیں چھوڑی جا سکتی۔ انقلاب کے آنے تک تو بالکل نہیں مگر تم ایک شام میرے ساتھ بھی گزارو۔ میرے پاس آج سم تھنگ سپیشل ہے۔''

''سم تھنگ سپیشل؟'' جمال نے پوچھا۔ ''یعنی؟''

''ارے تم سم تھنگ سپیشل کو نہیں جانتے؟ یہ ایک خاص بوتل ہے جو گزشتہ سٹاک میں سے جو میچور ہونے کے لیے تہ خانوں میں رکھا جاتا ہے اتفاقاً نکل آتی ہے۔ اسے اپنی مرضی سے تیار نہیں کیا جا سکتا اور ہر ایک کو ملتی بھی نہیں۔ ویسے بھی اعلیٰ شراب کی پہچان کس کو ہے۔''

''ہاں یار۔ ایک جام پلاؤ۔ انقلاب کا انتظار آسان کام نہیں۔'' جمال نے کہا۔ ''مگر انقلاب کب آئے گا؟''

''پہلے ہمارا خیال کچھ اور تھا۔'' اس نے سیانے پن سے کہا ''مگر اب حالات بہت خراب ہیں۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے سامراج سے سمجھوتہ کر لیا ہے اور اب ایوب خان نے مارشل لاء لگا کر

انقلاب کے راستے بند کر دیئے ہیں۔"

"مگر ایسے حالات میں تو کام کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے۔" جمال نے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے مگر اس ملک میں کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"تم انقلابی عمل کو نہیں سمجھتے نا۔ میں تمہیں کیسے پارٹی کے راز بتا دوں۔"

"یہاں کے حالات انقلابی نقطہ نظر سے بہت اچھے ہیں۔" جمال نے کہا "یہ تو کوئی راز نہیں۔"

"مگر حکومت کا جبر کسی کو کچھ کرنے بھی دے۔ حکومت نے عوام کی توجہ ہندوستان کی نفرت میں لگا رکھی ہے۔"

"مگر ہندوستان کی حکومت نے بھی اپنے عوام کو پاکستان کی نفرت میں لگا رکھا ہے۔"

"یہ تو ردعمل ہے۔ سارا قصور پاکستان کا ہے۔"

"یہ تو میں نہیں مانتا۔ کشمیر کو کس نے غصب کیا؟"

وحید بولا "تم اصل میں مسلم لیگی ہو جمال!"

"ایک زمانے میں کانگرس کیونسٹ پارٹی کو بھی مسلم لیگ کہتی تھی۔"

وحید نے ایک کیلا چھیلا اور بولا "یہ ہماری سیاسی سوچ تھی۔ اس کا خمیازہ ہم بھگت رہے ہیں بقول بنے بھائی۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔

جمال نے پوچھا "سید حسن صاحب آج کل کہاں ہیں؟"

"وہ کراچی میں سیٹھ روشن جی بھیم جی کی انشورنس کمپنی میں ملازم ہیں۔ کیا تم انہیں وہاں نہیں ملے؟"

"وہ اتنے پختہ کیونسٹ ہو کر انشورنس کا کام کیسے کرتے ہیں؟ جو سرمایہ دارانہ سامراجی نظام کا ستون ہے۔"

"مگر وہاں وہ انقلاب ہی کا کام کرتے ہیں۔"

"کیا کام کرتے ہیں؟"

"اب انقلاب کے راز تمہیں تو نہیں بتائے جا سکتے۔ تم پارٹی کے رکن نہیں ہو۔"

"ملک امید علی کا کیا حال ہے۔ وہ تو تم سے بھی پہلے کا کیونسٹ ہے۔ وہ بھی انقلابی کام کرتا ہوگا۔"

"آج کل بہت مصروف ہے۔ ماڈل ٹاؤن میں کوٹھی بنوا رہا ہے۔"

"اچھا؟ اتنے پیسے ہیں اس کے پاس؟"



"کیوں نہیں۔ وہ سٹاک ایکسچینج میں روپیہ لگاتا ہے۔ وہ خاندانی لوگ ہیں بھائی۔ مالدار ہیں عزت دار ہیں۔"

"اور ہاشمی صاحب کی سناؤ؟"

"وہ بھی کراچی میں ہیں۔ تعجب ہے تم نے پرانے دوستوں کو بالکل ہی چھوڑ دیا۔ وہ ایک گھی مل چلاتے ہیں آج کل۔"

"انہیں کاروبار کی سوجھ بوجھ تھی؟"

"بھئی وہ ایک کاروباری خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ کوئی بھوکے ننگے آدمی نہ تھے تمہاری ہماری طرح۔ دہلی میں ان کے کارخانے چلتے تھے۔"

"تو سبھی کراچی چلے گئے؟" جمال نے کہا۔

"لاہور میں تو کاروبار کی کوئی گنجائش ہے نہیں۔ بڑی جگہ بڑے کاروبار! جب تک انقلاب نہیں آ جاتا روٹی تو کما کھائے کسی طور قلندر! بقول بنے بھائی اور جہان خاں بھی وہاں ہے۔ اس نے ہوٹل کھول رکھا ہے۔ وہاں۔"

"ہاں خوب یاد آیا۔" جمال بولا "محبوب حیدر آبادی اور میں ایک دفعہ وہاں گئے تھے تو اس نے شراب کے پیسے نہ لیے تھے۔"

وحید نے خوش ہو کر کہا۔ "انقلابی آدمی کی آنکھ میں شرم ہوتی ہے جمال۔ اس کے ہاں شراب میں ملاوٹ بھی نہیں ہوتی۔ خالص بیچتا ہے۔"

"حسن ناصر کی سناؤ۔" جمال نے کہا "میں نے سنا ہے کہ وہ پٹھان مزدوروں میں کام کرتا ہے۔ وہی حلیہ وہی لباس وہی جھگی کی زندگی!"

"ہاں یار دیکھو وہ کتنے بڑے خاندان کا بیٹا تھا۔ نوکروں اور خادموں کے جھرمٹ میں پلا تھا مگر انقلاب کی خاطر عوامی ہو گیا۔ کیونسٹ پارٹی اسی طرح لوگوں کی کایا پلٹ دیتی ہے مگر وہ کراچی پارٹی کا آدمی ہے۔"

"کراچی پارٹی؟" جمال نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ کوئی دوسری پارٹی تو نہیں مگر سید صاحب کے جانے سے لوگ تتر بتر ہو گئے تھے۔ وہی تو پارٹی کا مرکزی وظیفہ تھے۔ شخصیت کے بغیر پارٹی نہیں بنتی۔"

"میں نے سنا ہے کہ انہوں نے خواجہ احمد عباس کو لکھا کہ پنڈت نہرو سے میری واپسی کی اجازت لے لو۔ ایسا نہ ہو کہ میں الہ آباد پہنچ کر بھی جیل میں سڑتا رہوں۔"

"ہم نے تو نہیں سنا۔ پارٹی کو بدنام کرنا تم مسلم لیگیوں کی عادت ہے۔" وحید جل کر بولا۔

''ہم نے تو یہ بھی سنا ہے کہ پنڈت جی نے کہا' بھائی وہ الہ آباد کے رہنے والے ہیں اور ہمارے دوست ہیں۔ اگر وہ بلوچوں کو مارکسزم پڑھا چکے ہیں تو واپس آ جائیں۔ ہندوستان ان کا وطن ہے اور کرنے کو کام یہاں بھی بہت ہے...... مگر...... میرے خیال میں تو سید صاحب کو یہیں رہنا چاہیے تھا۔'' جمال نے کہا۔

''وہ اس بنجر زمین میں رہ کر زندگی ضائع کیوں کرتے؟'' وحید بولا' 'بقول اخلاق احمد دہلوی' یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زبان میری۔''

''تو کیا تم سمجھتے ہو کہ حکومت پاکستان تمہیں انقلاب لانے کا پرمٹ دے گی؟''

وحید جل ہی گیا۔ بولا ''تم اصل میں تماشبین ہو۔ تم چاہتے ہو کہ ہم لاٹھی گولی کھائیں۔ حکومت سے ٹکر لے کر جیل جائیں اور تم تماشہ دیکھو باہر بیٹھ کر۔ جب تک لوگ اندر سے نہیں بدلیں گے انقلاب نہیں آئے گا۔ بقول اخلاق احمد دہلوی یہ تاریخ کا فیصلہ ہے۔''

''پارٹی کو بھی اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہیے۔''

''پارٹی ان حالات میں کیا کرے' جب لوگ ہی جاہل اور بے شعور ہوں۔ اس ملک میں کچھ ہو ہی نہیں سکتا بقول اخلاق احمد دہلوی۔''

## رگوں میں کیچڑ

اختر بھیا ایک ہنسوڑ خوش مزاج' بے فکرا اور اردو کا منفرد مزاح نگار۔ اپنی ستار ہاتھ میں لے کر اسی طرح خالی ہاتھ لندن کے جہاز سے اتر آیا جس طرح آج سے تین برس پہلے وہ لندن گیا تھا۔ وہاں اس نے اچھی زندگی گزاری۔ وہ جمال سے چار برس چھوٹا اور گھر کا سب سے لاڈلا بچہ تھا۔

خواجہ یٰسین کا خاندان اگرچہ تجارت پیشہ تھا مگر وہ پیسے کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔ خواجہ صاحب اور ان کے بزرگ سال میں آٹھ مہینے یوسف زلیخا کا قصہ سنتے۔ قادری بابا کی خانقاہ میں چوسر کھیلتے یا بھینس کا کچا دودھ پی کر خراٹے لیتے۔ چار مہینے وہ چاول کی آڑھت کرتے۔ بھیڑوں کے گلوں کی خرید و فروخت کرتے یا گپیں مارتے مگر خواجہ یٰسین سے اتنا بھی نہ ہو سکا تھا۔ ان کو شوقِ مطالعہ کھا گیا اور اس میں قصور جمال کی والدہ کا بھی تھا۔

وہ ایک ذہین اور بامذاق عورت تھی۔ گھر کا سارا کام خود کرتی مگر بولتی بہت تھی۔ خواجہ یٰسین اس کی باتوں سے بچنے کے لیے بھی کتابوں کا سہارا لیتے تھے مگر انہیں اپنی بیوی کی باتوں کا سنے بغیر بھی ہنکارا بھرنا پڑتا تھا۔

جمال کی والدہ اور والد نہایت شریف النفس اور سیدھے لوگ تھے۔ آگے کا انہوں نے کبھی کچھ سوچا ہی نہ تھا اور معاشرے کی تبدیلیوں کو وہ غیر فطری اور ڈراؤنی شے سمجھتے تھے۔ وہ اپنے آپ میں چھپے ہوئے بادشاہ لوگ تھے۔



اختر بھیا کی لندن سے واپسی پر سب کے دل باغ باغ ہو گئے۔ جمال کا تو گھر میں کسی سے رشتہ ہوا ہی نہ تھا مگر وہی تھا جس سے سب کو امیدیں تھیں۔ جمال کا بچپن نافرمانی میں گزرا تھا۔ بڑا ہوا تو اور بھی خودسر ہو گیا۔ دین مذہب سے بیگانہ اسے گھر کی عزت کا کبھی خیال آیا اور نہ اس نے کسی کے دکھ درد میں شرکت کی۔

اختر خود جمال کے بارے میں ایسا سوچتا نہ تھا۔ آتے ہی اس نے فیصلہ کیا کہ جمال اپنی چھٹی میں ایک مہینے کی توسیع کرائے مگر کراچی سے اخراجات کے لیے جو رقم وہ ساتھ لایا تھا اس میں سے اس کے پاس صرف پچپن روپے رہ گئے تھے۔

دونوں بھائی شام کو گھر سے نکلتے تو رعنا بہن دونوں کو دروازے میں کھڑی دور تک دیکھتی۔ اس کی شادی ہو چکی تھی اور وہ خوش تھی۔ اس کو ایک مدت اور چار بچوں کے بعد پتہ چلا کہ میں خوش نہیں ہوں۔ میرا میاں ایک بدکار اور سنگدل شخص ہے اور اس کی زندگی میں اس کی ذات اور اس کی جسمانی لذتوں کے سوا کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں۔

حالانکہ رعنا اپنے وقت کی نہایت حسین اور دلفریب عورت تھی۔

رعنا کا دل اس موم کا بنا ہوا تھا جو شہد سے نکالا جاتا ہے۔ اس کا دل ہر وقت کسی نہ کسی بات پر جلتا اور روشنی دیتا رہتا۔ بچپن میں سرینگر کے گول باغ میں جمال کے پاس بیٹھی وہ نرگس کے پھولوں اور تتلیوں کے ساتھ کھیلتی رہی۔ جوان اور مردود ہو کر جمال جب گھر سے آوارہ گردی کے لیے نکل گیا تو رعنا اختر بھیا کی آرتی اتارنے لگی۔ ماں باپ اس کو جان سے بھی زیادہ عزیز تھے۔ اصل میں اس لڑکی کے ہاں محبت تقسیم کرنے کا جذبہ بہت زیادہ تھا۔

دو تین ہی دن میں اختر بھیا نے اپنے دوستوں سے مل لیا مگر اس کی جیب خالی تھی۔ اس لیے وہ گھر بیٹھ گیا۔ اگلے دو روز میں اس کی انگلستان کی کہانیاں ختم ہو گئیں۔ اس کو بحری قزاقوں کے کارنامے پڑھنے کا شوق تھا۔ گھر کے پچھلے کمرے میں اس نے چارپائی ڈال لی۔ جمال اُدھر سے گزرا تو اس نے کہا ''میرے سینے میں درد ہے۔ مجھے لگتا ہے میری موت کسی عوامی اور کھلے مقام پر ہو گی۔''

جمال نے بات کو ہنس کر ٹال دیا اور کہا ''یہ تو بڑی منفرد بات ہو گی کیونکہ ہمارے خاندان کے سارے لوگ گھروں میں مرے ہیں۔''

مگر اختر بھیا اس روز کسی قدر سنجیدہ تھا۔ اس نے بچے کی سی معصومیت سے پوچھا ''عوامی مقام پر مرنے میں کیا خوبی ہے؟''

جمال نے ہنس کر جواب دیا ''ایسی جگہوں پر موت سے ہر ایک کو خبر ہو جاتی ہے۔ اخبارات میں تصویریں بھی چھپ جاتی ہیں کبھی کبھی۔''

اختر بھیا مسخرے پن کا عادی تھا مگر اس روز وہ سنجیدہ تھا۔ وہ ایسا تو کبھی نہ تھا۔ جمال ڈر سا گیا۔

جمال کو پتہ تھا کہ اختر بھیا کی جیب خالی ہے مگر اسے کوئی عارضہ بھی نہیں۔ اس کی اپنی جیب میں صرف پچپن روپے تھے۔ اتنے میں ڈاکٹروں کی فیس، ٹیسٹ، دوائیوں کی قیمت پوری ہو ہی نہیں سکتی تھی اور اسے دو روز بعد کراچی جانا تھا۔ اختر بھیا کو اور خود کو مطمئن کرنے کے لیے وہ کرشن نگر کے ایک حکیم سے ہاضمے کی گولیاں لے آیا۔

شام کو اختر بھیا حسب معمول کافی ہاؤس چلا گیا۔ سینے کے درد کی بات انہوں نے گھر میں اور کسی سے نہ کی۔ وہ کسی کو پریشان نہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ لاہور میں ان دنوں ہیضہ پھیلا ہوا تھا۔

اس روز گرمی بہت تھی۔ رات کے گیارہ بجے بھی لو چلتی تھی۔ اختر کی چارپائی جمال نے اپنے ساتھ لگوائی تھی۔ آسمان صاف تھا۔ چاند نکلا ہوا تھا۔ اختر کا کھانا منڈیر پر رکھ کر والدہ لیٹ گئیں۔

رات کے ٹھیک گیارہ بجے جمال نے نیچے صحن میں اختر بھیا کے آنے کی آواز سنی۔ اس نے کہا ''اختر کنڈی لگا کے آنا۔''

اختر نے کوئی جواب نہ دیا۔

آن کی آن میں جمال کی آنکھ لگ گئی مگر وہ کوئی دو منٹ سویا ہو گا جب اس نے ایک خوفناک چیخ سنی۔ اختر چیخ مار کر زمین پر گر گیا۔

اختر کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ کراہ رہا تھا۔ لگتا تھا اسے شدید درد ہے۔ وہ کسی بات کا جواب نہ دیتا تھا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔

جمال نے بڑی مشکل سے اسے گود میں اٹھا کر بستر میں ڈالا۔ وہ بڑا جوان اور بڑا بھاری تھا۔

اختر بھیا لنگی باندھ کر سویا کرتا تھا۔ گرا تو اس کی لنگی کھل گئی۔ اسے اپنی برہنگی کا کچھ خیال نہ آیا اور اس پر جمال کو کسی قدر حیرت ہوئی۔

پھر اختر بھیا کے جسم سے پانی کے دریا بہنے لگے۔ دری اور تکیہ بھیگ کر نچڑنے لگے۔ اس کا جوان جسم اس گرمی کے باوجود برف کی سل کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھر گئیں۔ ماں رونے لگی۔ رعنا زمین پر لوٹنے لگی۔ خواجہ یٰسین کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ سب کی صرف ایک ہی آرزو تھی۔ اختر بھیا کچھ بتائے، کچھ منہ سے بولے۔

جمال نے اس افراتفری میں پانی گرم کروایا۔ بوتل بہت گرم تھی۔ جمال نے اس کے جسم سے جان بوجھ کر لگا دی کہ جلے تو کچھ بولے۔

## فیملی ڈاکٹر

اختر بھیا کا جسم جلا تو وہ نشے کی حالت میں بولا ''اسے ہٹا لے یار۔''

جمال کو یاد آیا کہ ساتھ کے محلے میں ایک ڈاکٹر بھی رہتا ہے جو ہمارے خاندان کو جانتا ہے۔



اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ڈاکٹر کا دروازہ کھٹکھٹاتے کھٹکھٹاتے جمال نے اسے تقریباً توڑ ہی ڈالا۔ وہ تھک کے چور ہو گیا مگر ڈاکٹر نے دروازہ نہ کھولا۔ بالآخر اس نے کہا ''کچھ خدا کا خوف کرو۔ ڈاکٹر بھی آخر انسان ہوتے ہیں۔ دن بھر محنت کر کے رات کو دو گھڑی کا آرام بھی ان کا حق نہیں کیا؟''

''ڈاکٹر صاحب میں جمال ہوں۔''

''جی میں نے آپ کو پہچان لیا۔''

''جی اختر کی زندگی خطرے میں ہے۔''

''اسے ہسپتال لے جائیے۔ زندگی اور موت خدا کے اختیار میں ہوتی ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔''

''دیکھیے جمال صاحب میں اس وقت آپ کے لیے کلینک تو نہیں کھول سکتا۔ وقت ضائع نہ کریں اور اسے ہسپتال لے جائیں اور صبح مجھے اطلاع دیں۔ آخر میں آپ کا فیملی ڈاکٹر ہوں۔''

''ڈاکٹر صاحب میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں۔ میرا بھائی موت کے شکنجے میں ہے۔''

''میں نے عرض کر دیا نا کہ میں رات کو مریض نہیں دیکھتا۔ اس گرمی میں آپ نے خواہ مخواہ مجھے کھڑا کر رکھا ہے۔ خدا حافظ!''

رات کے بارہ بجے کرشن نگر میں سواری کہاں ملتی تھی اور کار کسی پڑوسی کے پاس نہیں تھی۔

مگر اتنے میں خواجہ یٰسین ایک اور ڈاکٹر کو قریب کے محلے سے لے آئے۔ اس نے ایک نظر تڑپتے ہوئے اختر بھیا پر ڈالی اور یہ سنتے ہی کہ اسے ایک قے بھی آئی تھی، کہا ''اسے متعدی امراض کے ہسپتال لے جائیے۔ ہیضے کا علاج وہیں ہو سکتا ہے۔'' خود اس نے اس کی نبض بھی نہ دیکھی۔

اب رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔

جمال بھاگتا ہوا نیلا گنبد گیا اور جب وہ تانگہ لے کر واپس آیا تو رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ اختر بھیا بستر پر اچھل اچھل کر گر رہا تھا۔ اس کے جسم میں برف بھری ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں سفید ہو چکی تھی۔ جمال نے بڑی مشکل سے اسے کندھے پر اٹھا کر سیڑھیوں سے اتارا۔ خواجہ یٰسین زیادہ تجربہ کار تھے۔ انہوں نے کہا ''اسے کہاں لیے جا رہے ہو جمال یہ تو تھوڑی دیر میں ختم ہو جائے گا۔''

جمال کو پہلی مرتبہ اپنے باپ کی بے بسی کا احساس ہوا۔ اس کو یہ کمزور بوڑھا بہت پیارا لگا مگر اس کو یقین تھا کہ میں اپنے اختر بھیا کو متعدی امراض کے ہسپتال لے جا رہا ہوں جہاں اس کا علاج ہو گا اور وہ اگلی صبح ہنستا کھیلتا واپس آ جائے گا۔ پھر میں اسے شرمندہ کروں گا کہ تم نے رات ہمیں بہت ستایا۔

ہسپتال پہنچتے پہنچتے اختر بھیا کی حالت اور خراب ہو گئی۔ اس کے جسم کو مروڑ آنے لگے۔ اس کی آنکھوں کے ڈیلے مستقل طور پر اوپر کو چڑھ گئے۔ وہ بہت خوفناک طریقے سے کراہنے لگا۔

نرسیں اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئیں۔ ڈاکٹر نے کہا ''آپ فکر نہ کریں۔ اس کے جسم سے پانی نکل گیا ہے۔ میں ابھی ڈرپ لگا دیتا ہوں۔ خون کیچڑ ہو چکا ہے اور ہیضے میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔''

ڈاکٹر نے ڈرپ لگائی مگر سوئی رگ میں نہ لگی۔ پانی جلد کے اندر ایک بلبلے میں بھر گیا۔ پندرہ منٹ اور گزر گئے۔

ڈاکٹر نے گھبرا کر ڈرپ دوسری رگ میں لگائی۔ اختر بھیا کے حلق میں آواز اٹکنے لگی۔ وہ ایک طاقتور شخص تھا۔ اس کا مضبوط جسم سانس لینے کی کوشش میں پھڑک رہا تھا۔

مگر یہ ڈرپ بھی غلط لگی۔ دوسرے بازو میں بھی پانی کا بلبلہ ابھر آیا۔ پندرہ منٹ اور ضائع ہو گئے۔

ڈاکٹر نے پاؤں کی رگ چیری مگر خون کا ایک قطرہ بھی اس میں سے نہ نکلا۔ تھوڑی سی سرخ کیچڑ سوئی اور ربر کی نالی پر لگ گئی۔

اختر بھیا کی جان پھڑک رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ پیروں پر مضبوط پٹیاں باندھ دیں تا کہ وہ چارپائی سے اچھل کر نیچے نہ گرے۔ اب اس کی سانس رکنے لگی تھی مگر جمال کو ابھی تک زندگی پر یقین تھا اور اس کا خیال تھا کہ تکلیف کوئی دم کی بات ہے۔ جب میں اسے اس کی حالت کی خرابی کی بات سناؤں گا تو وہ کبھی نہ یقین کرے گا۔

مگر اچانک اس نے دیکھا کہ اختر بھیا سانس بالکل نہیں لے رہا۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ سانس بند ہو جائے تو منہ سے ہوا دینی چاہیے۔ اس نے اپنا منہ اختر بھیا کے منہ میں ڈال کر زور سے ہوا دی مگر اختر بھیا کے پھیپھڑے حرکت میں نہ آئے۔ اس نے پھر پھونک ماری۔ پھر' پھر اور مگر اختر بھیا نے ضد کر لی تھی۔ جمال کو اس پر غصہ آنے لگا۔ بچپن میں بھی وہ بعض اوقات اسی قسم کی بے ہودہ ضدیں باندھ لیتا تھا۔

پھر اس نے دیکھا کہ سامنے کھڑی ہوئی نرس کے آنسو بہہ رہے ہیں۔ جمال نے غصے سے اسے جھڑک دیا ''تم کس بات پر رو رہی ہو؟''

ڈاکٹر نے آہستہ سے جمال کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو پہلی مرتبہ بات جمال کی سمجھ میں آئی۔

ابھی تک اس کے گمان میں نہ تھا کہ اختر بھیا درخت جیسی تنی جوانی میں مر سکتا ہے۔ وہ تو زندگی کے شہد سے بھرا ہوا چھتہ تھا۔ اس کی ظرافت زندگی کے فوارے چھوڑتی تھی۔ وہ کیسے مر سکتا تھا اور یوں اچانک؟ کسی کو بتائے بغیر؟

اور ایک عوامی مقام پر؟

اگر اسے پتہ تھا کہ میں ایک عوامی مقام پر مروں گا تو اس نے صاف صاف کیوں نہ کہا۔

اور وہ پچپن روپے جو جمال نے اختر کے ٹیسٹوں پر خرچ نہ کیے تھے' اختر کی موت کے تاروں پر خرچ ہو گئے۔ صبح سویرے جب پو پھٹ رہی تھی!



وہ ڈاکٹر جس نے اختر بھیا کو متعدی امراض کے ہسپتال بھجوایا تھا اب کفِ افسوس ملتا تھا کیونکہ اب پتہ چلا کہ اختر بھیا کو دل کا مرض تھا۔ وہ ڈاکٹر بھی پشیمان ہوا جس نے اس رات دروازہ نہ کھولا تھا۔ اسے اس بات کا افسوس تھا کہ اختر بھیا کو دن میں دورہ نہ پڑا۔ رات کو پڑا جب کسی مریض کو دیکھنا اس کے اصولوں کے خلاف تھا۔

اختر کا دل اپنے آپ بند نہ ہوا تھا۔ اس کو تین ڈرپیں غلط لگی تھیں۔ اس کا خون کیچڑ ہو کر گردش کے قابل نہ رہا تھا اور وہ پھڑ پھڑا کر بند ہو گیا۔

جمال کا دل کسی نے آہستہ آہستہ قینچی سے لیر لیر کر دیا تھا۔ یہ سوچ کر اس کے کلیجے پر ہتھوڑے چلتے تھے کہ وہ پچپن روپے جو میری جیب میں تھے' میں نے اس کے ٹیسٹوں پر کیوں خرچ نہ کر دیئے۔ کاش کہ مجھے بروقت معلوم ہو جاتا کہ اختر بھائی کو عارضہ دل ہے اور شاید میں اس کو بچا سکتا۔

پھر جمال کو اپنی یادداشت پر شبہ ہونے لگا۔ اس کو یقین نہیں آتا تھا کہ اختر بھیا مر گیا ہے۔ وہ بار بار اس کے کمرے میں جاتا اور اس کو تلاش کرتا۔ پھر اس کو یاد آتا کہ میں نے تو خود اس کو قبر میں اتارا تھا۔ میں نے تو اس پر مٹی ڈالی تھی...... پھر کرشن نگر کے قبرستان میں جو لیٹا ہے' وہ کون ہے۔

جمال کراچی واپس آیا تو اسے حکم ملا کہ تمہاری تبدیلی واپس سندھ گورنمنٹ کے محکمہ اطلاعات میں ہو چکی ہے۔

اصل میں اسے سات ماہ تنخواہ نہ ملی تھی اور اس نے اس کی خبر ڈان اخبار میں چھپوا دی تھی۔

اس کی پوسٹنگ حیدر آباد میں ہوئی تھی۔ وہاں اس کا دل لگ نہ سکتا تھا۔ کچھ روز وہ کراچی میں بیٹھا سوچتا رہا کہ میں کیا کروں۔ میں پاکستان کا واحد تربیت یافتہ فلم پروڈیوسر ہوں مگر کسی کو میری ضرورت ہی نہیں۔

## چلو چلو فلم بناؤ

جمال کی چھوٹی بہن رعنا کو بھیا کی بیکاری کا غم کھائے جاتا تھا۔ چھوٹے کی اچانک موت کے بعد اس نے اپنی ساری توجہ جمال پر مرکوز کر دی تھی اور اس کے پاس محبت کے فالتو ذخیرے بھی تھے۔ اب شاید یہ رعنا کا چلتر تھا یا اس کے میاں کی سوچے سمجھے بغیر پانسہ پھینکنے کی عادت کہ دونوں نے اسے لکھ دیا کہ کیا اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑے ہو۔ اٹھو اور اٹھ کر فلم بناؤ۔ ابتدائی اخراجات کے لیے تمہیں ڈرافٹ بھیجا جا رہا ہے۔ آگے کا غم نہ کرو۔

جمال بہنوئی کا پیسہ لینا نہ چاہتا تھا۔ اس نے نیم دلی سے اسے روکنے کی کوشش کی مگر میاں بیوی کے غرور کو یہ بات اچھی نہ لگی۔

## ساڑھ ستی

اب یہاں ایک بات غیر متعلق ہے مگر سن لیجیے کیونکہ آخری تجربے میں یہی ایک بات متعلقہ ثابت ہوئی۔

ہر شخص کی زندگی میں دو مرتبہ ساڑھ ستی آتی ہے۔ ممکن ہے آپ نے یہ ترکیب سنی ہو مگر اس کا مطلب نہ جانتے ہوں۔ اس سے مراد لی جاتی ہے انتہائی مصیبت مگر یہ ستاروں کی نشست کا مسئلہ ہے جس میں زحل کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ زحل تیس برس میں دنیا کا چکر پورا کرتا ہے اور اگر اوسط عمر ساٹھ برس شمار کی جائے تو دنیا کے گرد اس کے دو چکر ہوئے۔ اس کا ایک درجہ ڈھائی برس میں پورا ہوتا ہے۔ اب جو لوگ زیادہ بد قسمت نہیں ہوتے اور سعد ستارے مثلاً سورج مشتری اور زہرہ ان کے مددگار ہوتے ہیں تو زحل ان کے لیے اتنا منحوس ثابت نہیں ہوتا، یا ہوتا ہے تو ڈھائی برس کے بعد ان کے گھروں سے نکل جاتا ہے مگر جو لوگ اس کی زد پر پوری طرح آجاتے ہیں' ان کو یہ تین ڈھائے یعنی ساڑھے سات برس تک ایسا ذلیل اور بے بس کرتا ہے کہ وہ مرنے کی دعا مانگتے ہیں مگر موت نہیں آتی۔

ساڑھے سات برس کے بعد اچانک ان کی زندگیاں روشن ہو جاتی ہیں اور وہ نئی قوت سے جینا شروع کر دیتے ہیں۔ جمال کو جب رعنا کا ڈرافٹ ملا تو اسے نہیں پتہ تھا کہ میں زندگی کے پاتال میں اتر رہا ہوں۔

ڈرافٹ لے کر وہ بہت خوش ہوا۔ سیدھا اپنے افسر اعلیٰ کے پاس گیا اور کہا کہ میں فلم بنانے جا رہا ہوں۔ مجھے چھٹی دے دو۔ افسر اعلیٰ جمال سے بہت شفقت کا سلوک کرتا تھا اور اس کی وجہ وہ فحش نظمیں تھیں جو وہ کبھی کبھی جب افسر میٹنگ سے اکتا جاتے تو سنا کر ان کو پھر سے تازہ دم کر دیتا تھا۔ اس نے کہا "چار مہینے کی چھٹی با تنخواہ مل جائے تو میں واپس نہیں آؤں گا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اس نے پوچھا۔

"آپ فائل پر لکھ دیں کہ جمال کو ایک مہینے کی چھٹی دی جاتی ہے اور یہ فائل اس کی واپسی پر پھر پیش کی جائے۔" مطلب یہ کہ نہ جمال آئے اور نہ فائل پیش ہو اور یہ بات رولز کے خلاف نہیں تھی۔

جمال کو فلم سازی کی مبادیات کا علم ہو گیا تھا مگر اسے ایک بات کا پتہ نہ تھا اور وہ تھی فلم کی مارکیٹنگ۔

اسے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ ڈسٹری بیوٹر کس قسم کی فلمیں خریدتے ہیں اور فلم بین کس قسم کی فلم دیکھتے ہیں۔ اس نے سن رکھا تھا کہ فلم چار پانچ ریل بن جائے تو بک جاتی ہے تو اسے صرف چار پانچ ریل کے اخراجات کی ضرورت تھی اور ان کا انتظام رعنا اور اس کا میاں کر سکتے تھے۔

فلم سازی کے دیگر مقامات کا بھی اسے کوئی علم نہ تھا۔ سٹوڈیو کے مالک ایکٹر' ایکٹریس' ٹیکنیشنز' ڈسٹری بیوٹر' فلمی اخبار نویس' سینما والے کس قسم کی نفسیات کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کی بھی اسے کچھ خبر نہ تھی اور نہ اسے اس کی اہمیت کا پتہ تھا۔

## ہوا

سب سے بڑھ کر وہ اس خاص قوت سے ناواقف تھا جسے فلمی دنیا میں "ہوا" کہتے ہیں۔ ہوا کا مطلب ہے کسی فلم کی تیاری کے دوران گیٹ کیپروں' بیروں' ایکسٹرا اداکاروں اور چائے والوں کی رائے جس



پر فلم کی فروخت کا دارومدار ہوتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ فلم انڈسٹری کسی بہت ہی انوکھی فلم کے انتظار میں ہے' جس کی تھیم اور پلاٹ میں جدت ہو جس کی موسیقی میں گہرائی ہو۔ جس میں مکالمے کم سے کم ہوں۔ کہانی کیمرہ کہے' ایکٹر اور ساؤنڈ ریکارڈسٹ نہ کہے۔

مفتی نے اسے ایک عجیب کہانی لکھ دی۔ وہ ادیب تھا مگر فلم لکھنا نہ جانتا تھا۔ کہانی اس کی بہت اونچے ادبی معیار کی تھی۔ اس کے کردار انوکھے اور واقعات حیران کن تھے۔ اگر یہ کسی ناول کے عناصر ترکیب ہوتے تو وہ اردو کا عظیم ترین سرمایہ ہوتا مگر فلم کو لوگ ٹیک لگا کر دیکھتے ہیں اور ٹیک لگا کر دیکھنے والے دماغ سے کام نہیں لیتے۔

پھر اس نے چن چن کر گیت جمع کیے اور پیارنگ سے کہا کہ وہ دھنیں تیار کرے۔

پیارنگ بہت گنی آرٹسٹ تھا۔ وہ راگ راگنی کا خیالی ترانہ خود تصنیف کر سکتا تھا۔ لے میں پیچ ڈال سکتا تھا۔ تان میں درجے بنا سکتا تھا۔ طبلے والے سے کان پکڑوا سکتا تھا مگر فلمی موسیقی اس کا کھاجا نہیں تھی۔

فلم کی بسم اللہ اس نے روشن آرا بیگم سے گوڑ ملہار کے ایک چھند سے کی جسے قادر خاں نے تصنیف کیا تھا۔ جمال کی ہوا پہلے ہی روز سے بگڑنے لگی تھی۔

اچھی "ہوا" بنانے کے بھی کچھ اصول ہیں۔ مثلاً سٹوڈیو کے کیمرہ مین سے نیاز مندی کے تعلقات اور بروقت اس کی خوشامد' کیمرہ مین کو اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ ڈائریکٹر کس طرح شاٹ بناتا اور جوڑتا ہے بلکہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ ڈائریکٹر نے ایک شفٹ میں کتنے شاٹ لیے اور ایک ایک شاٹ کو کتنی کتنی مرتبہ فلم بند کیا۔ اس پر وہ کہتا ہے کہ ڈائریکٹر بہت محنت کر رہا ہے۔

پھر فلم کا پروجیکشنسٹ ہوتا ہے جو دھلی ہوئی فلم کے ٹکڑوں کو چلاتا ہے۔ اسی طرح اور لوگ جو ڈسٹری بیوٹر کے آگے فلم کی تعریف کر دیں تو وہ فلم کے اخراجات کا حساب لگا کر اس میں سے پچیس فیصد کم پر فلم خرید لیتا ہے۔ چنانچہ فلم سازوں اور ڈائریکٹروں کا زیادہ وقت اپنی ہوا بنانے یا اپنی ہوا درست رکھنے میں خرچ ہوتا ہے۔ سکرپٹ اور شوٹنگ کے لیے ان کے پاس اتنا ہی وقت ہوتا ہے جتنا سٹار ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی خوشامد اور لیپا پوتی سے بچے۔

ہوا بنانے پر زیادہ خرچ بھی نہیں آتا۔ صحیح وقت پر ایک پوّا دیسی شراب' ناجائز اوور ٹائم کی فوری ادائیگی' گندے لطیفے' دوسرے ڈائریکٹروں کی چغلیاں اور ناجائز پستولوں کی گاہے گاہے نمائش سے توشۂ آخرت بن جاتا ہے۔

اچھی ہوا کا مطلب یہ ہے کہ پرڈیوسر کے پاس روپیہ بہت ہے اگر وہ ان پڑھ ہو تو اور بھی اچھا۔ بشرطیکہ وہ سمگلر سمجھا جاتا ہو۔ سبزی منڈی کا آڑھتی ہو۔ بن باپ کا نوجوان زمیندار ہو اور ہیرا منڈی جاتا ہو۔ تے کے تھانیدار تک اس کی رسائی ہو تو سبحان اللہ' کیونکہ غنڈے سارے کام خود نہیں کر سکتے۔ ان کو پولیس

کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔

یہ لوگ فلم کی جمالیاتی قدریں بھی متعین کرتے ہیں جو فلم ان کے ذوق سے بلند ہوگی وہ بازار میں ڈبہ کہلائے گی مگر یہ راز جاننے کے لیے جمال کو ساڑھے سات برس اپنا خون چاٹ چاٹ کر گزارنے پڑے۔

جمال سٹوڈیو میں کسی کو نہ جانتا تھا' مفتی کی کہانی عمدہ تھی مگر ایک ادیب کی لکھی ہوئی تھی اور اس کی حرکت داخلی تھی جبکہ فلم میں حرکت خارجی ہوتی ہے۔

مفتی کی کہانی کو فلم کے لیے موزوں کرنے میں جمال کو اس کا سارا اسکرین پلے دوبارہ لکھنا پڑا۔ اس پر مفتی بہت ناراض ہوا۔ مفتی جو اس کا جان و جگر تھا۔

اس کی ہوا تو روشن آراء کے گانے ہی سے بگڑنے لگی تھی۔ پھر سٹوڈیو کا مالک اس کے پیچھے پڑ گیا۔ وہ ایک رئیس زادہ تھا۔ تھائی رائیڈ گلینڈ میں خرابی کی وجہ سے اس کی طبیعت بچپنے پر رک گئی تھی اور وہ ایک ایسا بچہ بن گیا تھا جو کتے کے پلوں کو نالی میں گھسیٹ کر خوش ہوتا۔ اس کے امیر خاندان نے اسے بیکار سمجھ کر سٹوڈیو کھول دیا تھا کیونکہ اس کی کل مشینری اس کے بھائی کو جو آسٹریلیا میں سفیر تھا' کولمبو پلان کے تحت مفت ملی تھی۔

سٹوڈیو کے مالک کو آمدنی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنے گاہکوں کو تنگ کر کے خوش ہوتا تھا اور جو پروڈیوسر اپنے وقار کا خیال رکھتے ہوں یا علمی لحاظ سے بہتر ہوں جیسے جمال تو وہ ہرڈسٹری بیوٹر کے دفتر جا کر اس کی فلم کی ہوا بگاڑ دیتا۔

جمال نے جس نوجوان کو ہیرو لیا اس کی پہلی فلم ناکام ہو چکی تھی اور اب اسے کوئی پوچھتا نہ تھا مگر اس میں جوہر دیکھ کر جمال نے اس کو رول دے دیا تھا۔ اس سے اس کی ہوا اور بگڑی۔ یہ اور بات ہے کہ وہی ناکام ہیرو بعد میں پاکستان کا صف اول کا ایکٹر بنا اور تیس برس اس نے فلم انڈسٹری سے ناز اٹھوائے۔ کاریں اور کوٹھیاں خریدیں' کارخانے لگائے پھر سیاسی لیڈر بن کر نظروں سے غائب ہو گیا۔

## سانپوں کی جوڑی

جمال کی ہوا فلم شروع کرنے سے پہلے ہی بگڑ چکی تھی۔ سٹوڈیو کے مالک نے یہ سوچ کر کہ ہالی وڈ سے تربیت لے کر آیا ہے' اس کو دفتر کے لیے جو کمرہ دیا اس میں سانپوں کی ایک جوڑی رہتی تھی اور سٹوڈیو کا مالک منتظر تھا کہ کب جمال ڈسا جائے اور بھاگتا ہوا علاج کے لیے آئے یا ڈر کے بھاگ جائے اور وہ دوسری منزل پر کھڑا ہو کر اس کی ہنسی اڑائے۔ ویسے اسے جمال سے کوئی دشمنی نہ تھی۔ وہ اس کی روشن خیالی اور حوصلہ مندی سے جلتا تھا۔

کمرے میں مچھر بھی بہت تھے۔ صبح جمال آ کر اس میں جھاڑو دیتا پھر شام تلک سکرین پلے لکھتا اور



ہالی وڈ سے آیا ہے اور جھاڑو خود دیتا ہے۔ اس نے غالباً وہاں سے یہی کام سیکھا ہوگا۔ پھر وہ دو سانپوں سے نہیں ڈرتا' کسی سے بات نہیں کرتا' کسی سے ملتا جلتا بھی نہیں اور گندے لطیفے بھی کسی کو نہیں سناتا۔

یہ سب باتیں سچ تھیں۔ سانپوں سے اس نے صلح کر لی تھی۔ وہ میز پر پاؤں رکھ کر بیٹھا رہتا جب سانپ بلوں سے نکلتے، چوہے یا مینڈک پکڑ کر کھاتے۔ وہ اس کے قریب نہیں آتے تھے۔ مالک نے کہہ دیا تھا کہ اور کوئی کمرہ خالی نہیں اور سانپوں نے کبھی کسی کو کچھ نہیں کہا۔ یہ سٹوڈیو کے ایکسٹرا ایکٹر ہیں مگر اس کی تنہائی' خاموشی اور کام سے لگن بجائے خود دلچسپی کی بات تھی اور فلمی اخبار نویس اس کے پاس آنے جانے لگے۔ جمال سے بے وقوفی یہ ہوئی کہ اس نے کہہ دیا کہ ساری فلم انڈسٹری لغو ہے۔ کسی کو کوئی کام نہیں آتا۔ کوئی کیمرے کو نہیں سمجھتا اور یہاں کسی کو حق نہیں کہ وہ کام کرے۔ میں آیا ہوں تاکہ فلم سازی کا کینڈا تبدیل کر دوں' نئی کہانیاں لاؤں' نئے سٹائل متعارف کرواؤں۔ نئی موسیقی سے لوگوں کے مذاق تبدیل کروں اور وہ کام کروں جو پہلے کسی نے نہ کیا ہو۔ ایک اخبار نویس نے جو رومانی فقرے لکھنے کا بادشاہ تھا' جمال کی ان شیخیوں کو بانس پر چڑھا دیا اور اس پر ایسے ایسے عمدہ فیچر لکھے جن سے یہ ثابت ہوا کہ جمال کوئی بہت بڑا تجربہ کر رہا ہے جس سے یا تو سینما گھروں میں بھونچال آ جائے گا یا وہ شہر کو آگ لگا دے گا۔ اس کی نیت نیک تھی مگر اس کی تحریروں سے جمال کی ہوا اور بگڑی اور سٹوڈیو کے کارکن دوسرے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر اور ایکسٹرا اس سے کترا کر نکلنے لگے۔

## ہوا اور چڑیا

ایک روز سٹوڈیو کا ریکاڈسٹ ہاشم شاہ اس کے دروازے پر آیا اور نہایت ادب سے بولا "جناب کیا مجھے اندر آنے کی اجازت ہے؟"

جمال اپنے شاٹس کی ڈرائنگز بنا رہا تھا۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔ پھر بولا "لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ آپ واقعی چڑیا ہیں۔ ان معنوں میں نہیں جن میں لوگ کہتے ہیں بلکہ جینئس کے معنوں میں۔ بھلا کون ہے جو آپ جتنی محنت کرے اور شاٹس کی تصویریں بنا کر رکھ لے مگر آپ کی ہوا بہت خراب ہے اور بے وجہ خراب ہے۔ اس کو کیسے ٹھیک کیا جائے۔ آپ لوگوں سے ملا جلا کریں۔"

"مگر میرے قریب کوئی پھٹکتا ہی نہیں ہاشم بھائی۔"

"میں بتاتا ہوں۔" وہ بولا۔ "آپ کسی وقت سیٹ پر آیئے۔ جب کسی کی شوٹنگ ہو رہی ہو۔ مجھے کام کرتا دیکھیے۔ میری مشینوں پر نظر ڈالیے اور میری غلطیاں نکالیے پھر مجھے سخت ڈانٹیے۔ میں تھر تھر کانپوں گا اور آپ کے پیروں کو ہاتھ لگاؤں گا۔ اس سے آپ کی ہوا بن جائے گی۔"

جمال اسے مذاق سمجھا اور بولا "اول تو مجھے ساؤنڈ ریکارڈنگ کی سمجھ نہیں اور مشینوں کو تو میں بالکل نہیں جانتا۔ پھر میں آپ کو کیوں ڈانٹوں۔"

"کہا نا اس سے آپ کی ہوا ٹھیک ہو جائے گی۔ لوگ سمجھیں گے کہ جمال بڑا زبردست ٹیکنیشن

ہے۔ ہاشم شاہ جیسے اس کے چرنوں میں پانی بھرتے ہیں۔ آپ کو شاید پتہ نہیں کہ اس سٹوڈیو میں ہاشم شاہ کا بڑا مقام ہے۔ اگر آپ اسے ڈانٹ دیں گے تو آپ کے آگے کوئی بول نہ سکے گا۔"

ہاشم شاہ نے اس کی تعریف شروع کر دی مگر اس کے گناہ بے شمار تھے۔ روشن آراء بیگم سے گانا گواتا ہے' پیارنگ سے گیت لکھواتا ہے' دلن کو ہیرو لیتا ہے۔ کوٹھڑی میں جھاڑو دیتا ہے۔ سانپوں سے نہیں ڈرتا اور ہالی وڈ سے آیا ہے۔ چریا سالا!

عین وقت پر اس نے جس خاتون کو ہیروئن کے لیے منتخب کیا تھا' اس نے لاہور سے کراچی آنے سے انکار کر دیا۔ ان دنوں اس کا ایک کامیاب ڈائریکٹر کے ساتھ معاشقہ چل رہا تھا۔ اس نے منع کر دیا تھا۔ ایڈوانس کی رقم وہ کھا گئی۔ کراچی میں اور کوئی لڑکی نہ تھی۔ جمال نے اپنے ایک دوست کو تار دیا کہ کوئی معقول لڑکی بھیج دو۔ اس نے شیتل کو بھیج دیا۔

شیتل کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ پشاور کی ایک ان پڑھ ٹخیائی تھی اور ایک نائیکہ کے قبضے میں تھی۔ وضع قطع سے وہ بھوک کی ماری معلوم ہوتی تھی مگر تصویر اس کی عمدہ آتی تھی۔ اسے بمبئی کے ایک بھگوڑے پروڈیوسر نے جس نے وہاں ناکام ہو کر پاکستان میں ڈیرے ڈال لیے تھے اور جو فلم سے زیادہ ریس کے گھوڑوں کے شجروں کو سمجھتا تھا۔ اپنی فلم میں ہیروئن لے لیا تھا۔ دیکھا دیکھی جمال کے یار نے اسے کراچی بھجوا دیا۔

پاکستان میں بمبئی سے ناکام ہو کر آنے والوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ یہاں آ کر کوئی محبوب کا اسسٹنٹ بن جاتا۔ کوئی شانتا رام کا ماموں اور کوئی کاردار کا سالا۔ ایک نہایت نالائق ڈانسر نے جسے تین تال کی گنتی بھی مشکل سے آتی تھی' اپنا نام برجو مہاراج رکھ لیا۔ برجو مہاراج کتھک کے ایک قدیم خاندان کا نام لیوا لکھنؤ میں ابھی زندہ تھا۔ اس کا نام سب جانتے تھے۔ برجو مہاراج کے نام سے ہمارے نالائق ڈانس ڈائریکٹر نے بے شمار فلمیں حاصل کر لیں۔ نہ ناچنے والوں کو پتہ نہ نچوانے والوں کو خیال......

شیتل کو سٹوڈیو میں دیکھ کر جمال کی ہوا کچھ اور بگڑی۔

حسینہ کو جو اس کی دوسری ہیروئن تھی' اس نے ایک کوٹھی لے دی تا کہ وہ اپنے میاں اور اپنی ماں کے ساتھ آرام سے رہے۔

حسینہ طوائف زادی نہیں تھی مگر اس کے والد کو تاش کے سوا کچھ آتا نہ تھا۔ وہ اپنی ساری پونجی فلاش میں ہار چکا تو بیٹی اس نے فلم انڈسٹری میں لگا دی۔ وہ ایک بچے کے رول میں آئی تھی مگر جلد ہی سٹوڈیو اونر کے نوجوان بیٹے نے ایک کونے میں اس کو جوان کر دیا تھا۔ وہ خوش شکل تھی۔ انگریزی بول لیتی تھی۔ کام بھی کر لیتی تھی۔ اگر وہ فلم میں نہ آتی تو ایک اچھی بیوی بن سکتی تھی اور خوشاب کے اس نوجوان زمیندار کی اچھی بیوی بننے



خدمت کی اجازت دے دی اور اس کی کمائی سے خود ریس کھیلنے لگا کہ گھر بیٹھا آدمی اچھا نہیں لگتا۔

شوٹنگ سے ایک دن پہلے سٹوڈیو کے مالک نے جمال سے وہ کیمرہ مین چھین لیا جو اس نے پسند کیا تھا اور اس کی جگہ جو کیمرہ مین اسے ملا اس نے کام قلی کی حیثیت سے شروع کیا تھا۔ اس کی تعلیم صفر کے برابر تھی مگر وہ چکی کے پاٹ میں سے باریک ہو کر نکلا تھا مگر جمال کو وہ بھی چریا ہی سمجھتا تھا۔

## مکالمہ ایکٹریس سے

جمال کا پہلا سیٹ ایک ویران حویلی کا کھنڈر تھا جس پر کہانی کا اختتام ہوتا ہے۔ زمین کچی دیواریں بوسیدہ' روشندان اندھے اور فرنیچر کے نام پر ایک پرانی تخت نما کرسی۔ سیٹ میں ظاہری شکوہ کا نام ونشان نہ تھا مگر یہ فلم کا سب سے اہم سیٹ تھا۔ اسی میں ایک بوڑھے اور وضع دار جاگیردار کو جو اپنے نوجوان دوست کی لے پالک بیٹی سے لاشعوری طور پر عشق کرتا ہے اور نیند میں چلتا رات کو اس کے بیڈروم کی طرف جاتا ہے۔ راز کھل جانے پر متعلقہ لوگوں کو مزے لے لے کر قتل کرنے کے بعد خودکشی کرتا ہے۔ وہ لڑکی کو کچھ نہیں کہتا جسے وہ اٹھا کر لایا ہے مگر اس سے محبت کا اظہار کچھ اس دردمندی سے کرتا ہے کہ لڑکی اس کی خودکشی کے بعد اس کو قبول کر لیتی ہے۔ مفتی ایسی ہی کہانیاں لکھتا تھا۔

مگر ایسی کہانیاں ہماری ہیروئنوں کو پسند نہیں۔ حسینہ بیگم نے کہانی سنتے ہی شور مچا دیا کہ لو اور سنو۔ بوڑھے کے عشق میں کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ اور یہ لاشعور کیا ہوتا ہے۔ پھر بوڑھے کے ساتھ نہ کوئی گانا نہ کوئی ناچ۔ ہماری سمجھ میں تو یہ فلم آتی نہیں اور اس کے چلنے کا کوئی امکان بھی نہیں۔

جمال کی ہوا اور بگڑی۔

جمال نے کہا "بے بی! ذرا صبر تو کرو۔"

اس کے ابھی صرف دو ہی بچے تھے اور وہ بے بی کہلا سکتی تھی۔

"بہت خشک فلم ہے۔ نہ کوئی باغ میں ملاقات نہ کہیں وفا کا وعدہ۔ نہ کوئی چھیڑ چھاڑ۔"

"بے بی محبت کے سو روپ ہوتے ہیں۔" جمال نے کہا۔

"میرے خیال میں چونکہ آپ کو تجربہ نہیں' میں آپ کو بتاتی ہوں۔ بوڑھے جاگیردار کے ساتھ میرے دو تین عشقیہ مناظر ڈال دیں۔ وہ پیار سے میرا ہاتھ پکڑے تو میں جھٹک دوں۔ پھر میں مسکرا مسکرا کر اسے دیکھوں۔ آنکھوں سے بلاؤں۔ قریب آئے تو بھاگ جاؤں۔ اس طرح وہ ولن بھی بن جائے گا۔ آپ کی کہانی میں ولن تو کوئی ہے نہیں۔ ولن کے بغیر فلم کیسے چلے گی؟"

"مگر اس کہانی میں اس قسم کے مناظر کی گنجائش نہیں ہے بے بی۔"

"کیوں نہیں۔ عشقیہ مناظر تو جتنے بھی ہوں کم ہوتے ہیں۔ ان کو جہاں چاہیں فٹ کر لیں۔ ان کا کہانی سے تو کوئی تعلق ہوتا نہیں۔"

''یہ نہیں ہوسکتا بے بی۔'' جمال نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کام آپ کو بالکل نہیں آتا۔''

جمال میں غصے کا ایک ابال آیا مگر وہ جان گیا تھا کہ ایکٹروں کے آگے بولا نہیں جاتا۔

پھر حسینہ بولی۔''اب یہ سیٹ ہے؟ آپ اپنی ہیروئن کو کچی زمین پر لٹائیں گے۔اس کے لیے کم سے کم ایک بیڈروم ہی بنوا دیا ہوتا۔مگر شاید آپ بھوکے ننگے ہیں۔سیٹ پر کچھ خرچ کرنا نہیں چاہتے۔کتنے دن کا کام ہے اس سیٹ پر؟''

جمال نے خون کے گھونٹ پی کر آہستہ سے کہا''پانچ چھ روز تو لگیں گے۔''

''اوئی توبہ!'' وہ بولی۔''اور مکالمے کتنے ہیں میرے؟''

''آپ کا کوئی مکالمہ نہیں۔چہرے کے اتار چڑھاؤ سے بھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے بے بی!''

''یہ تو ٹھیک ہے مگر اس طرح کلیپ نہیں ملتی۔فقرہ اچھا ہو تو لوگ تالیاں بجاتے ہیں۔کام اچھا ہو تو سروں سے گزر جاتا ہے۔آپ نے مجھے کوئی فقرہ دیا ہی نہیں۔میری مارکیٹ خراب کرنا چاہتے ہیں آپ؟''

جمال لاجواب ہوگیا۔

وہ بولی''اور میں پانچ چھ روز ایک ہی کالا سوٹ پہنوں گی؟''

''دراصل یہ ایک ہی منظر ہے بے بی۔''

''میرا لباس تبدیل کروا دیں پلیز!'' وہ لجاجت سے بولی۔

''یہ نہیں ہوسکتا۔'' جمال نے جواب دیا۔

''کیوں نہیں ہوسکتا۔ہم تین منٹ کے گانے میں چھ لباس تبدیل کر لیتے ہیں۔''

''دراصل یہ گانا نہیں۔ایک المیہ منظر ہے۔''

''تو اس میں ایک سیڈ سانگ ڈال دیں تاکہ میرا ڈریس تبدیل ہوسکے اور ٹریجڈی بھی جاندار ہو جائے۔''

جمال سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

حسینہ بولی''جمال صاحب آپ کی کہانی ساری کی ساری بوگس ہے۔آپ کو فلم بنانی نہیں آتی دراصل۔''

جمال کا ہیرو اور بوڑھا زمیندار کریکٹر کہانی سے بہت متاثر تھے۔وہ حسینہ کو الگ لے جا کر سمجھانے لگے۔

## دوسری بے بی

شیتل دور کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔حسینہ ہٹی تو اس نے چھوٹتے ہی کہا''اس منظر میں میرا کام نہیں ہے؟''

''نہیں جی۔'' جمال بولا۔



''کیوں نہیں۔کیا یہ فلم کا آخری سین نہیں؟ آخری سین میں ساری کاسٹ دکھائی جاتی ہے مگر آپ نے مجھے جان بوجھ کر نکال دیا تاکہ حسینہ کی مراد پوری ہو۔مجھ سے جلتی ہے وہ۔آپ مجھے گرانا چاہتے ہیں جان بوجھ کر۔''

''جانے دو بے بی۔'' شیتل کی نائیکہ بولی''ہمارے ساتھ اسی طرح زیادتی ہوتی ہے مگر ہمارا بھی وقت آئے گا۔''

جمال کا دل چاہا کہ میں اس کے ایک چانٹا ماردوں مگر شوٹنگ کے پہلے دن یہ بہت برا شگون ہوتا۔ اس کی ہوا اور بگڑ جاتی۔

ہاشم شاہ مائیکروفون کھولے ساری گفتگو سن رہا تھا۔اس نے آ کر جمال سے کہا''سر آپ کو ان عورتوں سے کام لینے میں بڑی تکلیف ہوگی۔آپ ان میں سے کسی کو بھی عزت سے مخاطب نہ کریں۔اس لیے کہ یہ بہت گھٹیا عورتیں ہیں۔دلالوں اور بدمعاشوں کے سوا ان کا کسی سے پالا نہیں پڑتا۔شرافت کا انہیں کوئی تجربہ نہیں۔آپ اپنا رویہ درست کریں۔ان کو گالی سے مخاطب کریں۔''

## کیمرہ مین

سیٹ پر حسین کیمرہ مین چاک و چوبند تھا اور احکامات کی بڑی تندی سے تعمیل کرتا تھا مگر اس کے انداز مصنوعی تھے۔لگتا تھا کہ وہ غلط کام کو ڈھیل دے رہا ہے۔

جمال کا کام سب کو غلط لگتا تھا۔اس کے زاویئے اس کی روشنیاں اس کے سایوں کی گہرائیاں دیکھ کر سب سمجھے تھے کہ چریا اپنے آپ کو تباہ کر رہا ہے۔اس کے مکالموں میں زور نہیں۔اس کے ایکٹر منہ نہیں بگاڑ سکتے۔ان کے ڈریسز میں کوئی گلیمر نہیں۔

تین دن کے بعد جمال نے ایک انوکھا شاٹ بنایا تو حسین کیمرہ مین بندر کی طرح اچھل کر اس کے پیروں سے لپٹ گیا۔بولا''ہماری ماں کو صاحب' ہماری بہن کو صاحب......''

جمال نے پیچھے ہٹ کر سوچنا شروع کیا کہ مجھ سے کون سی غلطی ہوئی ہے۔

حسین بولا''ہم کو معاف کر دو سر۔ہم آپ کو چریا سمجھا تھا۔تین دن آپ جو شاٹ بناتے رہے' ہمارے خیال میں غلط تھے۔آج پتہ چلا کہ آپ استاد آدمی ہیں۔ہم نے نو برس کام کیا' پر آج پتہ لگا کیمرہ کیا ہے۔ہم الو کا پٹھا ہے۔ہم بہن......''

شاہ ہاشم نے آگے بڑھ کر ہاتھ باندھ لیے۔''سر آپ اونچا کام کرتے ہیں۔استاد ہیں۔''

سب لوگ حیرت سے جمال کی طرف دیکھنے لگے ورنہ کیمرہ مین اور ساؤنڈ ریکارڈسٹ کے آگے کبھی کوئی ڈائریکٹر بولا نہ تھا۔

مگر اس دن سے جمال کی ہوا اور بگڑی [illegible] لوگوں نے کہنا شروع کر دیا'' بہت اونچا کام کرتا

ہے۔اس کی فلم چلے گی نہیں۔''

کچھ دنوں کے بعد جب شیتل کو پتہ چل گیا کہ فلم کافی بن چکی ہے اور جمال مجھے کاٹ نہیں سکتا تو اس نے لباس اور زیورات کے جھگڑے ڈال دیئے۔اس کے کلوز اپ حسینہ کے مقابلے میں کم تھے۔اس کے ہیرو کے ساتھ عشقیہ مناظر کافی نہیں تھے۔حسینہ کو کھانا بھی اس سے ایک منٹ پہلے ملتا تھا۔یہ اس کی شکایات تھیں۔

خدا خدا کر کے شوٹنگ کا پہلا سیشن ختم ہوا۔

فلم دھلنے کے لیے لیبارٹری چلی گئی۔لاہور کے ایکٹر لاہور لوٹ گئے۔

## مہارانی کا راج

اب کچھ دن کے لیے فرصت تھی۔ان دنوں ایک نوجوان خوش مزاج لڑکی سٹوڈیو میں ہرنی کی طرح اچھلتی کودتی پھرتی تھی۔آغا حشر والی مشہور طوائف زادی نے اسے اس کے غریب والدین سے معمولی رقم پر لے کر تیار کر دیا تھا اور اس کی کوشش سے مہارانی کو فلموں میں کام ملنے لگا تھا۔وہ بظاہر بہت چنچل اور بہت آزاد تھی۔اس کو اجازت تھی کہ پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں سے آنکھیں لڑائے مگر اس کی طوائف نائیکہ ہر وقت اس پر نظر رکھتی تھی۔

مہارانی ایک ذہین' خوش دل اور طرح دار لڑکی تھی۔اس کی نائیکہ نے ایسٹرن سٹوڈیو کے بے وقوف مالک کو شیشے میں اتارنے کے لیے اسے کھانے کی دعوت دی مگر طوائف کے ہاں اکیلے جانے کی اس میں ہمت نہ ہوئی۔ناچار وہ جمال اور سٹوڈیو میں آنے والے جمال کے دو دوستوں کو بھی ساتھ لے گیا۔بابر اور اعجاز کو۔

ایسٹرن سٹوڈیو کا مالک کھانا کھانے میں روحانی لذت لیتا تھا مگر طوائف کے گھرانے کے کھانے کی لذت سے صرف وہی لوگ واقف ہیں جو طوائف کے گھرانوں میں آتے جاتے ہیں۔ایسٹرن سٹوڈیو کا مالک تو طوائف کے مرغ پلاؤ پر ایسا گرا کہ پھر اٹھ نہ سکا۔اعجاز کو امید تھی کہ مجھے فلم کی ڈائریکشن کا چانس ملے گا۔اس نے پہلے مالک کی ٹانگیں سیدھی کیں پھر اس کے پپوٹے بند کرنے لگا۔بابر تماشبین چپ رہا۔

جمال اپنے بوجھ سے ابھی تک دبا ہوا نہیں تھا۔شوٹنگ کے تجربے کے باوجود زندگی اس کے اندر رقص کرتی تھی۔

مہارانی کو طوائف نے ضیافت کے دوران چھوٹی بچیوں کی طرح اِدھر اُدھر بھگایا کہ کسی مہمان کے پاس بیٹھ نہ سکے۔دور سے لبھائے' رنگ اچھالے اور اچھے سودے اسی طرح ہوتے ہیں۔

جمال نے بھانپ لیا کہ مہارانی کے الہڑ جسم کے اندر کی اگربتی خوشبودار دھواں دے رہی ہے۔

جمال اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چل دیا۔



''ہم تو ہیں ہی بائیں طرف کے لوگ باغی' نہ ماننے والے۔'' جمال نے کہا۔

''مجھے بھی باتھ روم جانا ہے۔'' بابر بولا۔

''اس کے بعد مہارانی کے ہیرو سے ڈاک بنگلے میں ملاقات ہوتی ہے۔اعجاز نے اپنی فلمی کہانی کو جاری رکھتے ہوئے کہا......''

طوائف ہمہ تن گوش تھی۔

کاریڈور میں مہارانی چپ چاپ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی۔

''تم اندر کیوں نہیں بیٹھتی ہمارے ساتھ؟'' جمال نے مہارانی کو کندھوں سے پکڑ کر کہا۔

''امی ناراض ہوتی ہے۔'' وہ آہستہ سے گنگنائی۔

''یہ تمہاری امی ہے؟''

''جی ہاں۔''

''یہ تمہاری امی نہیں ہے۔'' جمال نے زور سے کہا۔

''جی ہاں۔جی نہیں۔وہ میری امی ہے۔''

''بکواس کرتی ہو۔'' جمال نے اس کے دونوں گال اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔وہ ادا سے پیچھے ہٹی مگر نہ ہٹی۔

''امی ایسی باتوں کو پسند نہیں کرتی۔'' وہ بولی۔

جمال نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔''تم تو پسند کرتی ہو نا؟'' اس نے کہا۔

مہارانی مسکرا کر بولی ''میں بھی پسند نہیں کرتی۔'' اس کی آنکھوں میں خلوص کی رطوبت تھی مگر دکاندار خلوص کی وجہ سے سودا مفت نہیں دے دیتا۔جمال کی شوخی اور جرأت مہارانی کو اچھی لگی مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

''تم امی سے بہت ڈرتی ہو۔'' جمال نے پوچھا۔

''بہت۔'' وہ بولی ''امی بہت ہوشیار ہے۔''

''تم بھی کم نہیں ہو۔''

''ایمان سے مجھے تو کسی بات کا پتہ نہیں۔''

''تم بہت چالاک ہو۔تم اس بڑھاپے میں بھی اسے پیشے پر بٹھاؤ گی ایک دن!''

''توبہ توبہ۔کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔''

''جب تم اسے بڑھاپے میں پیشے پر بٹھاؤ گی تو میں تمہیں ملوں گا۔''

"کہاں ملوں تم سے؟"

"سٹوڈیو میں مجھے کسی سے بھی ملنے کی اجازت ہے۔"

"مگر میں تمہیں اجازت کے بغیر ملنا چاہتا ہوں۔"

"امی کی اجازت کے بغیر؟ کبھی نہیں۔"

"تم اول درجے کی حرامزادی ہو۔ ایک نمبر چھنال۔ اب اگر یہاں میں تمہارے رس بھرے گلابی ہونٹ چوس لوں تو تم کیا کرلوگی؟"

"کچھ بھی نہیں جی۔ امی سے شکایت کردوں گی بس۔"

"تم امی سے کچھ نہیں کہوگی۔ کہوگی کچھ؟"

مہارانی آہستہ سے بولی "کہوں گی۔ کہوں گی۔" مگر اس نے سر کو اس طرح ہلایا جس سے ظاہر ہو کہ میں کچھ بھی نہیں کہوں گی تم چاہے ابھی میرے ہونٹ چوم لو۔

عین اس وقت طوائف کاریڈور میں داخل ہوئی۔ صورتحال اس نے بھانپ لی اور یہ اس کے منصوبے سے خارج نہیں تھی۔ ہنس کر بولی "بچی بہت شرماتی ہے۔ بہت بھولی ہے۔ اگر اسے آپ جیسے استاد مل گئے تو......"

"دراصل ہمیں بھی ایک استانی کی تلاش ہے۔" جمال بولا "ہمیں بھی کوئی کچھ سکھادے۔"

"آپ کے لیے میں جو ہوں......چل لڑکی برتن اٹھا ادھر سے۔"

مہارانی بلی کی طرح کھسک گئی۔

"سیٹھ صاحب سوگئے۔" وہ بولی۔ "بہت نیک آدمی ہیں۔ شراب بالکل نہیں پیتے؟"

"بالکل نہیں۔ وہ صرف خون پیتے ہیں۔"

"آپ کی طبیعت ماشاءاللہ بڑی رنگیلی ہے۔"

"آپ کے بھی کیا کہنے!"

"آغا حشر بھی مجھ سے ہمیشہ اسی طرح بات کرتے تھے۔ کہتے تھے تم تو بجلی کا کوندا ہو لپک جاؤ تو سمندر جل اٹھے!"

"سبحان اللہ! اس میں کیا کلام ہے۔"

"مگر چھوڑیے جی کس زمانے کی بات کرتے ہیں آپ۔ آپ کا گلاس تو ابھی آدھا بھی خالی نہیں ہوا۔"



# باب 28

جمال کے پاس پیسے ختم ہو رہے تھے اور کوئی ڈسٹری بیوٹر بھی فلم کا سودا کرنے کے لیے نہ آیا تھا۔ معاہدے کے مطابق وہ سب کو قسطیں ادا کر چکا تھا جن کی رسیدیں سب نے کہا بعد میں لے لینا۔ جمال کو پتہ نہیں تھا کہ یہ رسیدیں نہ دینے کی بات ہے تاکہ ایکسٹرا انکم ٹیکس بچا سکیں۔ وہ ابھی کچھ دن اور کام کرسکتا تھا مگر ریس کے گھوڑوں نے اس کا پروگرام تباہ کرڈالا تھا۔

ریس کے گھوڑے حسینہ کے زمیندار خاوند کو باقاعدہ پخنی دینے لگے تھے۔ ایک دن حسینہ کے ہاں سے پیغام آیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ میں شوٹنگ پر نہیں آسکتی۔

سیٹ پر ایک لڑکی کی غیر حاضری کا مطلب ہزاروں روپے کا نقصان تھا۔ جمال ایک ڈاکٹر کو ساتھ لے کر سیدھا حسینہ کے ہاں جا پہنچا۔ وہ واقعی بیمار تھی۔ اس کا رنگ زرد تھا مگر اس کی غیر حاضری کی وجہ اس کی بیماری نہ تھی۔ اس کے میاں کو آج کی ریس کے لیے دو ہزار روپوں کی ضرورت تھی اور کراچی میں جمال کے سوا ان کا تھا بھی کون؟

یہی حسینہ نے جمال سے کہا۔

جمال کی بیوی نے اپنے کڑے، بندے اور چوڑیاں فوراً اتار دیں۔ ان کو بیچتے بیچتے دو بج گئے۔ حسینہ کا میاں بڑی مشکل سے اور عین وقت ہی پر ریس کورس پہنچ سکا۔

دو ایک دن خیریت سے گزر گئے۔

پھر حسینہ کو ہسٹریا کے دورے پڑنے لگے۔ شوٹنگ کا سلسلہ ٹوٹنے لگا۔

حسینہ کے زمیندار خاوند نے جمال سے کہا کہ اسے صدر میں نفسیاتی امراض کے ڈاکٹر فاضل کے ہاں لے چلو۔ بیمار حسینہ کو جمال کے حوالے کر کے وہ ریس کورس چلا گیا۔ اس وقت دن کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔

ہسٹریا کے دورے

حسینہ پورے میک اپ میں تھی۔ جب جمال نے اسے گاڑی میں ڈالا۔ اس نے نہایت بھڑکیلا کالا لباس پہنا ہوا تھا جس میں وہ موم کی زرد گڑیا لگتی تھی۔ خود جمال نیلی جین میں ملبوس تھا کیونکہ وہ آسانی سے میلی

نہیں ہوتی اور یہ امریکی مزدوروں کا پہناوا ہے۔ اس کے سر پر الجھے ہوئے گھنگھریالے بالوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ وہ ایک خوبصورت آدمی تھا مگر مٹی میں ملا ہوا۔ وہ کسی صورت بھی شریف آدمی نہ لگتا تھا۔ حالانکہ اس کے اندر مردوں والی کوئی حس باقی نہ رہی تھی۔ دیکھنے میں وہ ایک بگڑا ہوا رئیس زادہ لگتا تھا جو پہلو میں ایک طرحدار معشوق سرعام لیے دوسروں کے دل جلائے۔

مگر ابھی دو ہی بجے تھے جب وہ صدر پہنچا۔ ڈاکٹر کا کلینک بند تھا اور ڈاکٹر کو تین بجے آنا تھا۔ کلینک کے سامنے کاریڈور میں مریضوں کے بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ حسینہ کچھ دیر کھڑی رہی' پھر زمین پر بیٹھ کر جمال سے جھگڑا کرنے لگی۔ ''آپ کا رول ہی مشکل ہے۔ آپ کی بیوی بڑی لاڈ صاحب کی بچی ہے۔ آپ کو کام نہیں آتا۔ آپ نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔''

جمال نے ہر بات سے اتفاق کیا۔

## بچاؤ بچاؤ

اچانک حسینہ کے دماغ میں کوئی لہر اٹھی اور وہ چیختی ہوئی باہر کو بھاگی جہاں بسیں رکتی ہیں اور کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔

''بچاؤ بچاؤ......لوگو! اس شخص نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ یہ مجھے مار ڈالے گا۔ میرا گلا دبا دے گا۔'' وہ چیخنے لگی۔

جمال اس کے پیچھے لپکا۔ اس کو پتہ تھا کہ حسینہ ہجوم کے ہاتھ پڑ گئی تو اس کے پرزے اڑ جائیں گے۔

حسینہ بس سٹاپ پر پہنچ گئی۔ وہ ایک جنگلی بلی کی طرح چیخ رہی تھی۔ لوگ جمع ہو گئے۔ جمال نے حسینہ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا تاکہ اس کو نقصان نہ پہنچے۔

حسینہ مچل مچل کر اس کے ہاتھوں سے نکل رہی تھی۔ پھر کوئی بولا ''سالا بدمعاش ہے۔ لڑکی سے زبردستی کر رہا ہے۔''

''مارو مارو سالے کو۔'' اور لوگ بولے۔

''کون ہے بے تو؟ یہ کیا لگتی ہے تیری؟'' ایک آواز آئی۔

جمال کچھ بھی بتا نہ سکا۔ اس پر بے تحاشہ گھونسے تھپڑ اور لاتیں برسنے لگیں۔ حسینہ اس کے ہاتھوں سے نکل کر زمین پر گر گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

کچھ لوگ اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔ کسی نے کہا ''ایکٹریس ہے سالی۔ سڑکوں پر بدمعاشی کرتے ہیں یہ لوگ۔ مارو مارو سالی کو۔'' مگر وہ دوبارہ جمال کو نوچنے اور اس کے کپڑے پھاڑنے لگے۔ حسینہ کو گھسیٹ کر انہوں نے فٹ پاتھ پر ڈال دیا۔



جمال بھی زمین پر گر گیا۔ سڑک پر ٹریفک رک گئی۔ بے شمار بسیں ہارن بجانے لگیں۔ پھر ایک سپاہی آگے بڑھا اور اس نے ڈنڈے مار مار کر لوگوں کو ہٹایا۔ جمال کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔

''کیوں بے کون ہے تو؟'' سپاہی نے جمال کی گردن میں ہاتھ ڈال کر پوچھا۔ ''اور یہ کون ہے تیری؟''

جمال نے ادب سے کہا ''میرا نام جمال ہے جناب۔ میں ایک فلم پروڈیوسر ہوں۔''

''فلم والا ہے سالا۔'' ایک آواز آئی۔ ''مارو اس کو۔''

دو تین گھونسے جمال کی پسلیوں میں لگے لیکن پولیس والے نے انہیں روک دیا۔ ''مگر یہ تیری کیا لگتی ہے ابے؟'' اس نے حسینہ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''ایکٹریس ہے۔'' آواز آئی۔ ''یہ لوگ سڑک پر رنگ رلیاں منا رہے تھے۔''

''بوسے لے رہے تھے جناب! بغلگیر ہو کر۔''

''کیوں بے تجھے شرم نہیں آتی۔ قانون کا بھی تم لوگوں کو کوئی خوف نہیں۔ سڑک پر بوسے لیتے ہو؟ چلو تھانے۔''

پھر اس نے ٹیکسی روکی اور جمال بے ہوش حسینہ کو اس میں ڈال کر سپاہی کے ساتھ تھانے کو چلا۔

''مگر تم سڑک پر اس کی چُمیاں کیوں لے رہے تھے؟'' سپاہی نے ڈنڈے سے اس کی بکھی میں کچوکا دے کر پوچھا۔

''میں چُمیاں بالکل نہیں لے رہا تھا جناب۔ میں تو اسے ڈاکٹر فاضل کے کلینک لے کر آیا تھا۔ لڑکی بہت بیمار ہے۔ دیکھیے ابھی تک ہوش میں نہیں آئی۔ اسے دیوانگی کے دورے پڑتے ہیں۔''

''کوئی ثبوت؟ کوئی ڈاکٹری سرٹیفکیٹ؟''

''جی میں اسے پہلی مرتبہ لایا ہوں۔''

''پھر گورنمنٹ تمہاری بات پر یقین کیسے کرے؟''

''آپ خود دیکھ لیں جناب۔''

سپاہی نے گردن موڑ کر حسینہ پر نظر ڈالی۔ اس کا گریبان پھٹا ہوا تھا۔ اس کی چھاتی ننگی ہو رہی تھی۔ جمال نے اس پر رومال ڈال دیا۔ ''ڈرام لگا رہی ہے۔'' سپاہی بولا ''مگر قانون سے بچ نہ سکے گی۔''

''خدا کی قسم جناب وہ بہت بیمار ہے۔''

''ہم اس کا طبی معائنہ کروائیں گے۔ تب تک تم حوالات میں رہو گے اور اس میں دو تین دن تو لگ ہی جائیں گے۔ کراچی میں تمہارا کوئی ضمانتی ہے؟''

حوالات اور ضمانتی کے ذکر سے جمال گھبرا گیا۔ پھر اس کی شوٹنگ بھی رک جاتی۔ اخبار والے اس کے سکینڈل چھاپتے۔ گھر میں اس کی ہوا بگڑتی۔ اس نے کہا ''جناب کچھ مہربانی کریں۔ لڑکی واقعی بیمار ہے اور

میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔"

"ہوں۔" سپاہی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "مگر اس کا فیصلہ تو عدالت میں ہوگا۔ پولیس کا کام تو صرف تفتیش کرنا ہے۔ بدکاری کو روکنا ہے۔"

"مگر خدا کی قسم جناب میں نے کوئی بدکاری نہیں کی۔"

سپاہی سوچتے ہوئے بولا "لگتے تو شریف شہری ہو مگر کہا کچھ نہیں جا سکتا۔"

"جناب میں بہت شریف شہری ہوں۔ پہلے میں وزارت اقتصادیات میں کلاس ون افسر تھا۔ میں رائٹر بھی ہوں جناب۔"

"رائٹر ہو تو بدمعاش بھی ہو گے۔ آوارہ گرد بھی ہو گے اور شرابی کبابی بھی ہو گے۔"

"نہیں جناب میں بال بچے دار آدمی ہوں۔ میری تین چھوٹی چھوٹی بیٹیاں ہیں۔"

"خیر قانون کسی پر ظلم نہیں کرتا۔"

"میں قانون کا بڑا احترام کرتا ہوں جناب۔"

"اچھی بات ہے تو پچاس روپے ہوں گے تمہارے پاس؟ بلکہ کچھ کچھ زیادہ کیونکہ ٹیکسی کا بل بھی تو دینا ہے۔ اگر تم تھانے تک پہنچ گئے تو پانچ سو میں بھی چھٹکارا نہ پا سکو گے۔"

جمال نے پچاس روپے سپاہی کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور جمال کو بھی پلایا۔ پھر ٹیکسی والے سے کہا "بی بی واقعی بیمار ہے۔ چلو اسے واپس کلینک تک چھوڑ دیں۔"

## آیئے ڈاکٹر صاحب

ڈاکٹر فاضل نے پورے تین بجے کلینک کھولا۔ تب تک حسینہ ہوش میں آ چکی تھی۔ وہ دروازے کے سامنے زمین پر پڑی تھی۔

جمال نے جلدی جلدی ڈاکٹر کو کیفیت بتائی اور حسینہ کو اٹھا کر کلینک کے اندر لے آیا۔ ڈاکٹر نے اسے بنچ پر لٹا کر جمال سے کہا "آپ ذرا باہر چلے جائیں۔"

پندرہ منٹ کے بعد اس نے جمال کو اندر بلایا۔ حسینہ ساتھ کے اندھیرے کمرے میں میز پر لیٹی سٹرا سے سیون اپ پی رہی تھی۔

ڈاکٹر نے کہا "حسینہ پر شیزوفرینیا کا دورہ پڑا ہے۔ اس کے گھر کے حالات کیسے ہیں؟"

"جناب مجھے معلوم نہیں مگر اس کا میاں ریس کا رسیا ہے اور شراب بھی روزانہ پیتا ہے۔"

"ریس کھیلنے اور شراب پینے میں تو کوئی برائی نہیں مگر کیا وہ اپنی بیوی سے محبت کرتا ہے؟"

"پتہ نہیں جی۔"

"آپ نے اسے کام کا کتنا معاوضہ ادا کیا؟"



"ابھی تک پندرہ ہزار دے چکا ہوں۔"

"اور کراچی میں اس کے قیام کے اخراجات بھی آپ کی ذمہ داری ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"آپ کی فلم کا بجٹ کیا ہے؟"

"قریباً پانچ لاکھ جی۔"

"تو آپ پانچ لاکھ کے آدمی ہیں!"

"جی نہیں۔ میں تو بہت غریب آدمی ہوں۔"

"پانچ لاکھ والا آدمی آج کل غریب ہی شمار ہوتا ہے۔ اگر حسینہ ٹھیک نہ ہوئی تو آپ کا کتنا نقصان ہوگا؟"

"جناب میرا بہت نقصان ہوگا۔ پچاس ہزار سے زیادہ۔" جمال عاجزی سے بولا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اگر حسینہ ٹھیک ہو جائے اور آپ کا پروگرام جاری رہے تو آپ کو تقریباً پچاس ہزار کا فائدہ ہوگا۔"

جمال ریاضی کے اس چکر سے بوکھلا گیا۔

"جی ہاں۔ یونہی سمجھ لیجیے مگر کسی طرح اسے ٹھیک کر دیجیے۔" اس نے کہا۔

ڈاکٹر بڑے اعتماد سے مسکرایا اور بولا "آپ کولڈ ڈرنک لیں گے؟ گرمی بہت ہے!"

"جی آپ کسی طرح سے بے بی کو ٹھیک کر دیں۔"

"ٹھیک ہو جائے گی۔" ڈاکٹر صاحب بولے۔ "اصل میں اس کی طبیعت میں بچپنا بہت ہے۔ اس کا خاوند اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ نفسیاتی گھٹن کا شکار ہے مگر میں آپ کا پروگرام خراب نہ ہونے دوں گا۔"

"بڑی مہربانی جناب۔"

"بس اسے ایک ڈرائیور کی ضرورت ہے۔"

"جناب میں نے اسے اپنی کار مع ڈرائیور دے رکھی ہے۔"

اس پر ڈاکٹر دانائی سے مسکرایا۔ "اسے ایک ذہنی اور نفسیاتی ڈرائیور کی ضرورت ہے جناب جو دن بھر اس کو لیے لیے پھرے۔ وہ خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ وہ بچہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کا نقصان ہو۔ آپ کی خاطر میں روزانہ اس کے ساتھ رہنے پر تیار ہوں جب تک آپ کی شوٹنگ ہو۔"

"یہ تو آپ کی بہت ہی عنایت ہوگی۔"

"اس کے عوض میں آپ سے ایک ہزار روپیہ یومیہ لوں گا۔ پانچ ہزار ایڈوانس آن دی ٹیبل!"

جمال کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

ڈاکٹر بولا ''مگر پانچ ہزار شاید آپ کی جیب میں نہیں ہوں گے۔ میں حسینہ کو یہیں بٹھاتا ہوں۔ آپ گھر سے لے کر آجائیے۔''

''جناب اس وقت تو بینک بند ہیں اور گھر میں اتنی رقم نہیں ہے۔'' جمال نے کہا۔

''افوہ! تو پھر خواہ مخواہ آپ نے میرا وقت ضائع کیا۔ صبح آجائیے رقم لے کر۔''

جمال نے حسینہ کو ٹیکسی میں ڈالا۔ جب وہ کوٹھی کے سامنے پہنچے تو وہ پھر بے ہوش ہوگئی۔

حالانکہ جمال خود بے ہوش جانا چاہتا تھا۔ اس کا میاں ریس کھیل کر واپس آچکا تھا اور اب لان میں بیٹھ کر وسکی پی رہا تھا۔ اس نے گاڑی میں پڑی ہوئی حسینہ پر ایک نظر ڈالی اور کہا ''آپ کی شوٹنگ نے اسے بیمار کر دیا ہے۔ اب نکالیے اسے گاڑی میں سے۔''

## لڑکی اوندھی ہوگئی

جمال میں یہ حوصلہ نہ تھا کہ وہ کسی جوان عورت کو اس کے میاں کی موجودگی میں گود میں اٹھائے مگر چارہ نہ تھا۔ بڑی احتیاط سے اس نے حسینہ کو ٹیکسی سے نکالا مگر وہ اس کے ہاتھ سے پھسل کر اوندھی زمین پر گر گئی۔

''ذرا احتیاط سے اٹھائیے۔'' اس کے میاں نے جمال کی سرزنش کی۔

جمال نے اوندھی پڑی ہوئی حسینہ کو اس کے پیٹ اور سینے پر ہاتھ رکھ کر اٹھایا تو اسے دربار خاں کی بہن بلقیس یاد آگئی۔ ''پتہ نہیں وہ اس وقت کہاں ہوگی۔'' اس نے سوچا۔

رات کو حسینہ کی زبان کھینچ کر تالو کے ساتھ لگ گئی۔ منہ سے جھاگ بہنے لگی۔ جمال اسے ہسپتال چھوڑ آیا۔

حسینہ کو شیزوفرینیا وغیرہ بالکل نہیں تھا۔ ڈاکٹر فاضل بکواس کرتا تھا۔ کراچی آنے سے پہلے اس نے کسی نالائق ڈاکٹرنی سے بچہ نکلوایا تھا اور کوئی آلائش اس کے رحم میں لگی رہ گئی تھی۔ اب اس کے جسم میں اس کا زہر پھیل رہا تھا۔

## کڑان دھا دھا دھا

شوٹنگ کا پروگرام درہم برہم ہوگیا۔ سیٹ اُکھڑ گیا۔ جمال نے سوچا کہ میں فی الحال دوسرا سیٹ شوٹ کر لوں؛ جس میں شیتل کا کام تھا۔

شیتل کو ویسے بھی گلہ تھا کہ مجھے ہیرو کے ساتھ محبت کے منظر کم دیئے گئے ہیں۔ یہ سیٹ ایک ناچ کا تھا جس میں بول نہیں تھے۔ تروٹ تھی کڑان دھا دھا دھا۔ تٹ کٹ گدگھن دھا! کل سات ماترے۔

اول تو شیشل کو سات ماترے ہی گننے نہ آتے تھے اور یہ حماقت جمال کی تھی جس نے اپنے ذوق کو



شیتل کے لیے جمال نے ریہرسل کا انتظام کیا مگر شیتل رات کو دیر سے سوتی۔ صبح دیر سے اٹھتی اور دن بھر تھکی تھکی رہتی۔ اسے پتہ تھا کہ نہ میں پڑھی لکھی ہوں نہ طوائفوں کے کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہوں نہ میرے جسم میں کوئی بلاوا ہے نہ مجھے بولنا آتا ہے نہ مجھے گانا آتا ہے۔ فقط میری تصویر اچھی آتی ہے۔ وہ کمتری کے احساس میں مبتلا تھی۔ وہ بے حد غریب بھی تھی۔ اس کی نائیکہ بڑی سنگدل تھی۔ وہ اسے کراچی میں رات کو سو دو سو روپے میں بک کرتی اور اپنا پرانے برقعے کی طرح مروڑا ہوا جسم لے کر وہ صبح ریہرسل کے لیے آجاتی۔ فلم میں وہ فقط اپنا بھاؤ بڑھانے کے لیے آئی تھی۔ آگے اس کا ایک مشکل فلم سے پالا پڑ گیا تھا۔

جمال صبح سے شام تک طبلہ لیے اس کا انتظار کرتا اور کڑھتا۔ شام ڈھلے جب وہ ریہرسل کے لیے آتی تو طبلے والا اور ڈانس ماسٹر تھک کر چُور ہو چکے ہوتے۔ کیمرہ مین ساؤنڈ والے قلی اس کو سُنا سُنا کر چوٹیں کرتے جس سے اس کا موڈ اور بگڑتا۔

آوازے کسنے کے بعد جمال کے کہنے پر سب لوگ شیتل کا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے۔ تب کہیں جا کر طبلے پر تروٹ کا ایک آدھ بول بجتا اور وہ ناچ کا ایک قدم سیکھنے کی کوشش کرتی۔ پھر کھانے کا وقت ہوجاتا۔ پھر چائے کا وقت ہوجاتا۔

ریہرسل کا وقت دو بجے مقرر ہوتا مگر شیتل بہت جلدی بھی آتی تو شام سات بجے آتی۔ دو بجے تو وہ سو کر ہی اٹھتی تھی۔ پھر وہ میک اپ شروع کرتی' بال بناتی' آئینہ دیکھتی اور دوبارہ میک اپ شروع کر دیتی۔ چار گھنٹے اس کی تیاری میں لگ جاتے۔ میک اپ مین اور ہیر ڈریسر جمال کے خرچ پر دن بھر اس کے ہاں حاضر رہتے۔ پھر کہیں جمال کے اسسٹنٹ اسے بہلا کر منت سماجت کر کے سٹوڈیو میں لا سکتے۔

شیتل نے جمال کو تنگ کرنا شروع کیا تو اس کی ہوا بھی بگڑی۔ سٹوڈیو میں شور مچ گیا کہ اس دو ٹکے کی ٹخیائی کو کوئی پروڈیوسر بک نہ کرے۔ اس کا اثر جمال کی شہرت پر بہت خراب پڑا کہ کیسی کالی کتیا کو بک کرلایا ہے۔ شیتل کو بھی معلوم ہوگیا کہ کراچی میں مجھے اب کوئی کام نہ دے گا اور ہیرو بھی جو ناچ میں شریک ہے' مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ شام کو وہ جب بڑی مشکل سے سٹوڈیو میں لائی گئی تو وہ جلی ہوئی تھی۔

بڑی مشکل سے اس نے ناچ کا لباس پہنا اور سنہری تاج سر پر سجایا۔

جمال کا خون کھول رہا تھا۔ جب وہ ریہرسل روم میں آئی۔

جمال نے ہر بات پر چپ رہنا سیکھ لیا تھا تاکہ کام نہ رکے مگر یہاں تو کام جاری ہی نہ ہوتا تھا۔ اس نے غصہ پیتے ہوئے شکایت کے انداز میں کہا ''شیتل تم پھر دیر سے آئی ہو۔''

''تم ہمیں بدنام کرتے ہو۔'' اس کی نائیکہ نے چیخ کر کہا! ''بے بی کی ہوا خراب کرتے ہو؟''

جمال چپ رہا۔

''تیری ماں کی...... تیری بہن کی......'' شیتل نے زبان کھولی۔

جمال بھونچکا رہ گیا۔ سٹوڈیو کے کارکنوں کے رنگ زرد ہو گئے۔ ایسی گندی گالیاں کسی عورت کے منہ سے کسی نے سنی نہ تھیں۔ آخر میں شیتل نے اپنا تاج سر سے اتار کر جمال کے منہ پر دے مارا۔ جمال کا اسسٹنٹ مجید احمد تھر تھر کانپنے لگا۔ جمال کی بیوی اور اس کی رعنا بہن جو وہاں موجود تھیں، پتھر کے بت بن گئیں۔

## چلو کرو خودکشی

اس روز جمال نے سوچا کہ میں خودکشی کرلوں۔

کیونکہ نہ تو میرے پاس اور پیسے ہیں کہ میں اس عورت کو نکال کر دوبارہ شوٹنگ کروں اور نہ میں اس کے ساتھ مزید کام کرسکتا ہوں۔ اس کو اپنی بے عزتی کا غم نہ تھا۔ رعنا بی بی کے پیسوں کا غم تھا جو اب اس کے سامنے نالی میں بہہ رہے تھے۔ اسے پتہ تھا کہ بالآخر سب لوگ مجھ پر الزام دھریں گے۔ ضرور میں نے شیتل کو ناراض کردیا ہوگا۔

خودکشی کو آخری راستہ قرار دینے کے بعد اس نے اپنی زندگی پر غور کرنا شروع کردیا۔ محروم اور گھٹا ہوا بچپن، بے لذت جوانی اور ناکام زندگی سب بیکار! سب بے معنی! اسے اپنے آپ پر رحم آنے لگا۔ اس کی بیوی غم سے نڈھال ہو کر سو گئی۔ جمال نے اس پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی۔ وہ ایک اچھی لڑکی تھی مگر افسوس بدنصیب نکلی۔ اس کا فلیٹ چوتھی منزل پر تھا۔ اس کی تین معصوم بیٹیاں بے خبر سو رہی تھیں۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی کی طرف جانے کی کوشش کی مگر اس کے پاؤں من من کے ہو چکے تھے اور وہ اٹھنے کے قابل نہ تھا۔ اسی کشاکش میں دن نکل آیا۔ اس نے سوچا کہ میں تو مقروض ہوں، اس لیے زندہ رہنے پر مجبور ہوں۔ اس میں فیصلہ کر لینے کی صلاحیت جاگ اٹھی۔ اس نے سوچا کہ میں شیتل کو فلم سے نکال دوں اور مہارانی سے کہوں کہ وہ میرا کام کردے۔

سٹوڈیو میں ہاشم شاہ جمال کا منتظر تھا۔ اس نے کہا ''سر فلموں میں ایسا ہو جاتا ہے۔ سالی آپ ہی تباہ ہوگی۔ ہمارا کیا بگڑے گا۔''

جمال نے مسکرانے کی کوشش کی۔

ہاشم بولا ''مگر سر آپ نے حرامزادی کتیا کو تھپڑ کیوں نہیں مار دیا۔ اس سے بڑا فائدہ ہوتا، اگر آپ تھپڑ مار دیتے تو سب کہتے صاحب کو ایکٹریسوں سے ڈیل کرنا آتا ہے۔ سر کی ہوا ٹھیک ہو جاتی اور فلم کا سودا بھی ہو جاتا۔''

''عجیب بات کرتے ہو ہاشم۔'' جمال نے کہا۔

ہاشم شاہ بولا ''سر آپ کو پتہ نہیں۔ یہ عورتیں پٹنا پسند کرتی ہیں۔ انہیں ذلیل کیا جائے تو خوش ہوتی ہیں بلکہ ذلیل کرنے والے پر عاشق ہو جاتی ہیں۔ شیتل یہی چاہتی تھی کہ آپ اسے ماریں، اسے ذلیل کریں۔



شریف آدمی ہیں اور آپ کو کام واقعی نہیں آتا۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا ہاشم۔''

''یہی تو میں کہتا ہوں، اگر آپ اسے تھپڑ مار دیتے، گالیاں دیتے، اسے بالوں سے پکڑ کر سیٹ پر گھسیٹتے تو وہ آپ کی غلام بن جاتی۔ آپ نے گالیاں کھا کر کام خراب کر ڈالا۔''

''ٹھیک ہے ہاشم۔ میں نے اسے فلم سے کاٹ ڈالا ہے۔''

''یہ آپ دوسری غلطی کریں گے۔ دوبارہ شوٹنگ کے لیے آپ کے پاس پیسے نہیں ہوں گے۔''

''پیسے تو واقعی نہیں ہیں۔ جب تک فلم کا سودا نہ ہو جائے۔''

''شیتل کو کاٹ دینے سے فلم کا سودا کبھی نہ ہوگا۔ ہوا آپ کی پہلے ہی خراب ہے۔ ڈسٹری بیوٹر سمجھیں گے کہ آپ فلم مکمل نہ کرسکیں گے، اس لیے ہم کیوں سودا کریں۔''

''مگر میں کیا کروں ہاشم؟ کدھر جاؤں۔''

''میرا خیال ہے کہ ابھی آپ کچھ بھی نہ کریں۔ ڈانس کا سیٹ لگا رہنے دیں۔''

''یعنی میں اس کی واپسی کا انتظار کروں اور پھر اس کے ساتھ کام کروں؟''

''میں آپ کو مجبور نہیں کرسکتا سر مگر ابھی کچھ نہ کیجیے۔''

جمال نے کچھ نہیں کہا۔ چپ چاپ آ کر اپنے سانپوں والے دفتر میں بیٹھ گیا۔

## لَے اور لچک

دہلیز پر کھڑی ہو کر مہارانی نے کہا ''کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟''

جمال نے زبردستی مسکرا کر کہا ''ضرور۔''

مہارانی کو رات کے واقعے کا علم تھا اور وہ اس کا دل بہلانے کے لیے آئی تھی مگر مہارانی نے ظاہر کیا کہ مجھے کچھ معلوم ہی نہیں۔ وہ گیندے کے پھول کی طرح شگفتہ تھی۔ بڑی ادا سے اس نے کہا ''میں نے سنا ہے آپ کے گیت میں سات ماترے کی لَے ہے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتی، ذرا ہم بھی تو سنیں۔''

جمال کو سات ماترے کی لَے سے نفرت ہو چکی تھی۔ اس نے کہا ''چھوڑو مہارانی۔ دفع کرو سات ماترے کو۔''

''اللہ ہمارا بہت جی چاہتا ہے۔ کہاں ہے آپ کا ٹیپ ریکارڈر۔ سنایئے ورنہ ہم رو پڑیں گے۔''

پھر اس نے ٹیپ ریکارڈر کھول کر تروٹ سننی شروع کردی۔

جمال نے کہا ''مہارانی میں تمہیں ماروں گا۔''

''اجی ہم غریبوں پر اتنی مہربانی کون کرتا ہے مگر آپ نے فلمی ڈانس کے لیے سات ماترے کی تروٹ چُنی۔ مار تو آپ کو پڑنی چاہیے۔ آپ فلم بنا رہے ہیں یا کتھک کا سکول چلا رہے ہیں؟''

ثروت کی لے وہ برابر دے سکی۔ ختم ہوئی تو بولی ''خوبصورت ہے مگر مشکل ہے۔ آپ کو طبلہ ضرور آتا ہوگا۔''

''مجھے کچھ نہیں آتا مہارانی۔''

''نہیں آپ کو طبلہ آتا ہے۔ ایسی خوبصورت ثروت تو کسبیوں کو بھی نصیب نہیں۔ آپ ضرور کوئی گپت آرٹسٹ ہیں۔ اللہ آپ کون ہیں۔ کدھر سے یہاں آنکلے۔''

مہارانی کی تعریف سن کر جمال کی کلفت دور ہوگئی۔ وہ مسکرانے لگا۔ اس نے کہا ''مہارانی میں جو کوئی بھی ہوں، مگر تم نے لے کیسے بتادی۔ تم بڑی لے کار ہو۔''

''مجھے کچھ بھی نہیں آتا جی۔ ابھی میں کچی ہوں۔''

''کتنی کچی؟''

''بہت کچی جی۔ ہاتھ لگائیں تو میں پرزے پرزے ہوجاؤں!''

جمال نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ کر کہا ''مہارانی کبھی تمہیں مار پڑی ہے؟''

''بہت مرتبہ جی۔ امی نے مجھے کئی بار مارا۔ پھر استاد جی نے مارا جو مجھے ناچ سکھاتے تھے مگر مار کھانے سے آدمی ذلیل ہوجاتا ہے۔ مجھے نہیں مار پیٹ پسند۔''

تھوڑی دیر دونوں چپ رہے۔ پھر جمال نے کہا ''میں نے سنا ہے۔ بعض عورتیں مار کھانے اور ذلیل ہونے سے خوش ہوتی ہیں۔''

''عورتوں کے بارے میں لوگ عجیب عجیب باتیں سوچتے ہیں۔ میں تو اس کے قریب بھی نہ جاؤں جو مجھے مارے اور ذلیل کرے۔''

''میرے تو تم بہت قریب بیٹھی ہو۔ میں چاہوں تو تمہیں چھو بھی لوں۔''

''لیجیے چھو لیجیے۔'' مہارانی نے اپنا گول دودھیا بازو آگے بڑھا دیا اور ہنسنے لگی۔

''تو تم کسی کے قریب نہ جاؤ گی؟ کب تک؟''

''جب تک مجھے کوئی شریف آدمی نہ ملے۔''

''شریف آدمی یعنی بیکار آدمی۔''

''شریف آدمی جو مجھے چاہے، میری شہرت کو نہ چاہے۔ کبھی میری بات مانے کبھی نہ مانے۔ جسے سات ماترے کی ثروت سے عشق نہ ہو، مجھ سے ہو۔''

''تمہاری بات میں بڑی چترائی ہے مہارانی! پھر ہمیں تو تم نے نکال باہر کیا۔ ہمیں تو سات ماترے کی لے سے عشق ہوا تھا۔''

''آپ بالکل بیکار آدمی ہیں ورنہ میں آپ کے پیر پکڑ لیتی۔''



''میں کیوں بیکار آدمی ہوں۔'' جمال نے پوچھا۔

''بیکار نہیں بیوقوف۔ آپ کا خیال ہے کہ آپ لوگوں کو کلاسیکی گانے سنائیں گے۔ کلاسیکی ناچ دکھلائیں گے اور آپ کی فلم چلے گی؟''

''کیوں نہیں چلے گی؟''

''فلم ایک تجارت ہے اور تجارت وہی کامیاب ہوتی ہے جو منافع دے۔ آپ کا خیال ہے کہ جو لوگ فلم دیکھنے جاتے ہیں انہیں اعلیٰ درجے کے آرٹ سے دلچسپی ہے؟''

''بے شک۔''

''غلط۔ اعلیٰ درجے کے آرٹ کو لوگ پسند نہیں کرتے۔ اس کے چاہنے والے خاص لوگ ہوتے ہیں اور وہ فلم نہیں دیکھتے۔ ہندوستان میں بھی کتھک ناچ کوئی نہیں دیکھتا۔ ہالی وڈ میں بھی گھٹیا کام ہوتا ہے اور میرا اپنا تجربہ بھی یہی ہے۔''

''تمہارا تجربہ کیا ہے۔ تم تو ابھی گھر سے نکلی بھی نہیں۔''

''یہ بات نہیں جی۔ میری ماں بہت اونچی طوائف ہے۔ اس نے مجھے کتھک ناچ سکھایا۔ میں نے بھی بڑی محنت کی مگر جب وہ مجھے بڑی بڑی پارٹیوں میں بھیجتی ہے تو کتھک ناچ کوئی نہیں دیکھتا۔ سب کو مجرا اور ٹھمکا پسند ہے اور اس میں بعض تعلیم یافتہ لوگ بھی شامل ہوتے ہیں۔ آپ کی فلم چلے گی نہیں۔ آپ کا جنازہ نکلے گا تو میں روؤں گی بہت! اس لیے کہ آپ بے گناہ آدمی ہیں اور بے گناہ آدمی آج کل ملتا کہاں ہے۔''

## خاک چاٹو خون تھوکو

شیتل کو فوراً کراچی چھوڑ کر لاہور چلے جانا چاہیے تھا مگر وہ ابھی تک وہیں تھی۔ ہاشم شاہ نے بھی ناچ کا سیٹ توڑنے نہ دیا تھا۔ وہ روزانہ جمال سے ملتا اور شیتل کو گالیاں دیتا۔

ایک دن اس نے کہا ''سالی معافیاں مانگتی ہے۔''

''نہیں ہاشم! اس کا تو تم ذکر ہی نہ کرو۔'' جمال نے کہا۔

''نہیں جی میں نے کب کیا اس کا ذکر۔ سالی حرامزادی، کتے کی بچی ہے جو بات مجھ تک پہنچی وہ میں نے آپ تک پہنچادی۔''

''کیا وہ خود تمہارے پاس آئی تھی؟'' جمال نے پوچھا۔

''اجی اس میں اتنی جرأت کہاں۔ میں تو اسے مار ہی ڈالتا۔ آدمی بھیجا تھا اس نے مگر سر اب پروگرام کیا ہے۔ پروگرام جلدی نہ بنا تو ہوا خراب ہوجائے گی۔''

''پروگرام کیسے بنے ہاشم۔'' جمال نے روہانسا ہوکر کہا ''پیسوں کا بندوبست...... ہو کوئی کام کی لڑکی ملے۔ ایکٹر تاریخیں دیں۔''

''یہ بات تو ہے سر...... ویسے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اب جو لڑکی ملے گی اس سے بہتر ہوگی۔ فلم میں ساری کی ساری کتیاں ہیں مگر مجبوری کی حالت میں زہر کھانا پڑتا ہے سر!''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے سر کہ آپ چاہے برا مانیں مگر شیتل کے بغیر چارہ نہیں۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ ویسے آپ کی مرضی۔ اگر وہ سٹوڈیو آ کر سب کے سامنے آپ سے معافی مانگ لے تو آپ اسے معاف کر دیں' اپنا کام نکالیں۔ آخری شوٹنگ کے بعد میں قلیوں کو اس پر نہ چھوڑ دوں تو ہاشم میرا نام نہیں۔ کیا یاد کرے گی سالی!''

جمال سوچ میں پڑ گیا۔ ہاشم کی بات معقول تھی۔

ہاشم نے کہا ''سر وقت ضائع نہ کریں۔ جو کام کل ہونا ہے آج ہی کیوں نہ ہو جائے۔ پھر جتنے دن وہ اور کراچی میں رہے گی اتنے دن کا ہوٹل کا خرچہ بھی آپ پر پڑے گا اور پیسے آپ کے پاس ہیں نہیں سر۔''

شام کو وہ وقت پر آ گئی۔ جمال نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ وہ بھی چپ رہی۔ آئندہ دو دنوں میں اس نے اس کا کام مکمل کر لیا۔ سات ماترے کی لئے آخر تک اس کی سمجھ میں نہ آئی۔

## آخری شاٹ

حسینہ ہسپتال سے واپس آ چکی تھی۔ اس کا ایک شاٹ باقی تھا۔ وہ بہت کمزور تھی اور اگرچہ اس کے دورے رک گئے تھے مگر اسے یقین تھا کہ میں پاگل ہو چکی ہوں۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ کراچی میں دماغی امراض کا صرف ایک ہی ڈاکٹر ہے جو ہزار روپے روزانہ فیس لیتا ہے۔

حسینہ دل کی بری نہ تھی۔ اسے پروڈیوسروں سے کوئی ہمدردی نہ تھی مگر جمال اسے پروڈیوسر نہ لگتا تھا۔ وہ اسے ایک بے وقوف اور نالائق آدمی سمجھتی تھی۔ اس لیے نہیں چاہتی تھی کہ وہ ہزار روپے روز کے بھرے۔

ڈاکٹر اعجاز اصل میں آنکھوں کا ڈاکٹر تھا مگر اس پر فلم سازی کا بھوت سوار تھا۔ وہ عمدہ کپڑے پہنتا' انگریزی بولتا اور تیز تیز چلتا۔ لندن کے کسی سکول سے اس نے فلم کا ڈپلومہ لیا ہوا تھا اور اس کا خیال تھا کہ مجھے فلم بنانی آ گئی ہے اور اب تو اسے سٹوڈیو کے پلپلے سیٹھ نے ایک فلم کا فنانس دینے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔

ڈاکٹر اعجاز نے کہا ''میں راستہ نکالوں گا جمال۔''

پھر منصوبے کے مطابق جمال حسینہ کے پاس گیا اور اس سے کہنے لگا ''بے بی کراچی میں ان دنوں امریکہ سے دماغی امراض کا ایک سپیشلسٹ آیا ہوا ہے۔ وہ خود تو نہ آتا مگر ڈاگ ہیمر شولڈ نے اسے مطالعاتی دورے پر پاکستان بھیج دیا ہے۔''

''کون ڈاگ ہیمر شولڈ؟'' حسینہ نے پوچھا۔

''ڈاگ ہیمر شولڈ اپنا یونائیٹڈ نیشنز کا سیکریٹری جنرل۔''

ڈاگ ہیمر شولڈ کو مرے ہوئے کئی برس ہو چکے تھے مگر جمال کو جلدی میں اسی کا نام سوجھا۔



''ڈاگ ہیمر شولڈ؟'' حسینہ بولی۔ ''میں نے اس کی بڑی تعریف سنی ہے۔ بڑا اچھا آدمی ہے۔''

''تو ڈاگ ہیمر شولڈ نے اپنا آدمی بھیجا ہے تاکہ وہ پاکستان کی مدد کرے۔ ڈاکٹر پاکستانی ہے اس لیے۔''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہو گئی مگر وہ بھاری فیس لیتا ہوگا۔''

''فیس تو وہ بھاری لیتا ہے۔ ہر مریض کو وہ دیکھتا بھی نہیں مگر اس کی آپ کوئی فکر نہ کریں۔''

''اس کی فکر کیوں نہ کروں۔ ڈاکٹر کسی کا لحاظ نہیں کرتے اور سب جانتے ہیں کہ آپ ایک بھوکے ننگے پروڈیوسر ہیں۔''

''مگر وہ میرا لحاظ کرتا ہے۔''

''آپ کیا چیز ہیں کہ اتنا بڑا ڈاکٹر آپ کا لحاظ کرے؟''

''یہ تو آپ ٹھیک کہتی ہیں۔'' جمال نے کہا ''مگر ڈاگ ہیمر شولڈ سے میری ملاقات ہے۔''

''چھوڑیئے چھوڑیئے۔ ڈاکٹر ہیمر شولڈ سے آپ کی ملاقات کیسے ہو سکتی ہے مگر وہ ہے کون بچہ؟''

''آپ کو میرا پتہ نہیں نا بے بی۔'' جمال نے کہا۔

''مجھے کیا پڑی ہے کہ میں آپ کا پتہ لگاتی پھروں۔''

''یہی تو بات ہے۔ آپ کو پتہ نہیں کہ فلم بنانے سے پہلے میں ایک مشہور صحافی تھا۔ صحافیوں کی واقفیت بہت ہوتی ہے۔''

''یہ تو میں مانتی ہوں۔ ہوتی تو ہے۔''

جمال بولا ''ڈاگ ہیمر شولڈ چند برس پہلے پاکستان آیا تھا۔ یاد ہے؟''

''ہاں۔ خوب یاد ہے۔ اس نے لاہور میں کوئی تقریر بھی کی تھی۔''

''اس کی تقریر میں نے ہی لکھی تھی!''

''اچھا اچھا۔ تو یہ آپ تھے؟''

''جی ہاں' اس تقریر سے وہ بہت خوش ہوا تھا۔''

''ضرور ہوا ہوگا۔ کتے کا بچہ۔'' ''کتے کا بچہ'' حسینہ کا تکیہ کلام تھا۔

جمال بولا ''واپس جا کر اس نے مجھے شکریے کا خط بھی لکھا تھا جو میری بیوی نے سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ کل میں وہ خط لے کر ڈاکٹر سے ملا تھا۔''

''اچھا؟'' حسینہ حیران ہو کر بولی۔

میں نے اسے کہا ''حسینہ ہمارے ملک کی سب سے بڑی آرٹسٹ ہے اور خوبصورت بھی ایسی کہ مس یونیورس اس کے چرنوں میں پانی بھرے۔''

''پھر کیا بولا کتے کا بچہ؟ مجھے دیکھنا چاہتا ہوگا۔''

''میں نے کہا آپ جس وقت چاہیں میں آپ کو بے بی کے پاس لے چلوں۔''

''ہاں اسے لے آئیں بے شک۔''

''مگر وہ کہتا تھا کہ چونکہ مریضہ کو کام کے دوران دورہ پڑتا ہے اس لیے میں اسے کام کے دوران دیکھوں گا تا کہ یہ جان سکوں کہ اس کے مرض کی وجہ آپ تو نہیں۔''

''ایمان سے وہ بات سمجھ گیا ہے۔ بیمار تو میں آپ کی وجہ سے ہوئی۔ آپ کا کام بھی ایسا ہے۔ نہ کوئی گانا نہ کوئی عشقیہ منظر!''

''ڈاکٹر کہے گا تو میں گانا اور لو سین ڈال دوں گا۔'' جمال نے کہا۔

''یہ ہوئی نا بات۔ تو کب کرنی ہے شوٹنگ؟''

''کل۔ کیا خیال ہے۔''

## ڈاکٹر کی تشخیص

اگلے روز ڈاکٹر اعجاز نے بہت بڑی بوٹائی لگائی۔ چمڑے کے بوٹ پہنے۔ ایک آنکھ کا چشمہ لگایا۔ دواؤں کا کالا بکس اٹھایا اور آ کر جمال کے سانپوں والے کمرے میں چھپ گیا۔

حسینہ میک اپ گھر ہی سے کر کے آئی تھی۔ آتے ہی بولی ''کہاں ہے وہ کتے کا بچہ ڈاکٹر؟''

جمال نے کہا ''ڈاکٹر پہلے کیمرے کے پیچھے کھڑا ہو کر آپ کے لاشعوری دباؤ کو سمجھنے کی کوشش کرے گا۔''

''تو بلاؤ اس کو۔'' حسینہ بولی۔

''شاٹ ریڈی؟'' جمال نے نعرہ مارا۔

''ریڈی سر۔'' ہاشم نے کہا۔

''ریڈی سر۔'' حسین کیمرہ مین بولا۔

''سائی لینس پلیز۔'' جمال نے حکم دیا۔

حسینہ نے میک اپ مین کو اشارے سے بلایا اور آئینہ دیکھ کر بولی ''آئی ایم ریڈی۔''

''کیمرہ!'' جمال نے آرڈر دیا۔

''سین 17۔ شاٹ 11۔ ٹیک ون۔'' اسسٹنٹ بولا۔

حسینہ مکالمہ بولنے لگی۔

''او کے او کے۔'' سب نے نعرہ مارا۔ سب کے اعضاء کا تناؤ دور ہو گیا کیونکہ کسی کو اس پاگل چیخنے والی جنگلی بلی کا بھروسہ نہ تھا۔

## کتے کا بچہ

''مگر کہاں ہے وہ کتے کا بچہ؟'' حسینہ بولی۔



''آہستہ بولو بے بی۔ وہ دفتر میں بیٹھا ہے۔'' جمال نے کہا۔

حسینہ دفتر کو چلی گئی۔ جمال چھوٹے موٹے کاموں میں لگ گیا۔

آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ جمال کا اسسٹنٹ بھاگتا ہوا آیا اور بولا ''جی بے بی پھر پاگل ہو گئی۔ کمرے سے بھاگ کر باہر نکل گئی ہے۔''

جمال جلدی سے باہر نکلا۔ حسینہ چیخ رہی تھی۔ ''مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ میں پاگل ہو گئی ہوں۔''

ڈاکٹر اعجاز کے بال نچے ہوئے تھے۔ قمیص پھٹی ہوئی تھی اور بوٹائی زمین پر پڑی تھی۔ وہ سخت پریشان تھا۔ اس نے بتایا کہ میں نے اس کے ساتھ نرم گفتگو کی۔ اس کی نبض دیکھی۔ اس کی داستان سنی پھر اچانک اس کے سر میں درد کی ایک لہر اٹھی اور وہ چیخنے لگی۔ اصل میں اس کے رحم میں گڑبڑ ہے۔ معمولی علاج سے ٹھیک ہو سکتی ہے مگر تمہارا شاٹ تو ہو گیا نا؟

## آگے کچھ نہیں

خدا خدا کر کے فلم کی شوٹنگ کا پہلا مرحلہ ختم ہوا اور اس ایک مہینے نے جمال کی ساری زندگی الٹ کر رکھ دی تھی۔ فلم چار پانچ ریل بن چکی تھی اور اتنے میں اس کا سودا ہو جانا چاہیے تھا مگر جمال کی طرف کسی ڈسٹری بیوٹر نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

اس کے اخبار نویس دوستوں نے فلم کی تعریف میں انتہا کر دی۔ سٹوڈیو کے پلپلے سیٹھ نے بھی ڈسٹری بیوٹروں کے دفتروں میں جا جا کر کہا ''جمال ایک تجرباتی فلم بنا رہا ہے جو انڈسٹری کی کایا پلٹ دے گی۔'' اور یہی بات جمال کو لے ڈوبی۔

جمال کے پاس پیسے ختم ہو چکے تھے اور سیٹھ کو اس بات کا پتہ تھا۔ وہ جگہ جگہ جمال کی غریبی کا مخول اڑانے لگا۔ کہتا جمال جیسا ڈائریکٹر تو پاکستان میں کوئی نہیں۔ کاش وہ بھوکا ننگا نہ ہوتا اور فلم کو مکمل کر سکتا۔

رعنا کا خیال تھا کہ جمال کو کاروباری گفتگو نہیں آتی۔ وہ اشارے اشارے سے اسے میٹھے بولوں کی ترغیب دینے لگی۔

مگر کنارے پر بیٹھے ہوئے لوگ ڈوبتے کو صحیح مشورہ نہیں دے سکتے۔ ڈاکٹر اعجاز نے کہا ''تمہاری فلم سخت ڈرامائی ہے۔ اس میں ریلیف نہیں اس میں کچھ مزاح ڈال دو۔ کہو تو میں لکھ دوں۔''

اسے لکھنا نہ آتا تھا مگر جمال نے بے یقینی کے عالم میں کہا ''لکھ دو اور شوٹ بھی کر دو۔ اس کہانی میں مزاح کی گنجائش ہی نہیں۔''

ڈاکٹر نے راتوں رات بیٹھ کر نہایت بوگس مزاحیہ مناظر لکھے اور اگلے روز سیٹ لگوا کر ان کو شوٹ بھی کر دیا۔ پھر جمال کئی روز تک سٹوڈیو نہ آیا۔ ڈاکٹر اعجاز کو ابھی فلم ملی نہ تھی۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں بہت لائق آدمی ہوں۔ جمال کی بگڑی ہوئی خشک فلم کو فوری طور پر سنوار سکتا ہوں۔ یہ تصور لے کر وہ ڈسٹری

بیوٹروں کے دفتروں کے چکر لگانے لگا۔اس سے یہ ظاہر ہوا کہ جمال کو تو کچھ آتا ہی نہیں۔اس کا کام تو ڈاکٹر اعجاز کر رہا ہے۔

سٹوڈیو کے پلپلے مالک نے جمال کی کھلم کھلا برائی شروع کر دی۔یہ اس کی نفسیاتی ضرورت تھی۔

وہ جمال' بابر اور ڈاکٹر اعجاز کو ایک ساتھ دیکھتا تو کہتا' بابر اور ڈاکٹر تم میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھو۔ ہم جا کر ہوٹل سلاطین سے بھنا ہوا تیتر کھا کر ابھی آتے ہیں۔جمال تم یہیں ٹھہرو۔تم سے باتیں کرنی ہیں۔وہ ڈسٹری بیوٹروں سے کہتا' دیکھو بیچارے جمال کی فلم لٹک رہی ہے۔اگر کچرا نہ ہوتی تو ضرور بک جاتی۔اب کچرے پر کون پیسے لگائے۔پھر وہ جمال کو مخاطب کر کے کہتا'' بل کب چکاؤ گے جی۔میں نے کوئی یتیم خانہ تو کھول نہیں رکھا۔''

جمال کے گھر میں روٹی کے لالے پڑ گئے مگر وہ نہایت حوصلے اور صبر کے ساتھ سٹوڈیو جاتا اور جتنی فلم شوٹ ہو چکی تھی' اس کی ایڈیٹنگ کرواتا رہا۔لوگ اس سے کم ہی بات کرتے تھے۔کچھ تو اس سے ڈرتے تھے اور کچھ اسے ایک ناکام آدمی سمجھ کر کنی کاٹ جاتے تھے۔جمال نے بالآخر سوچا کہ جب زمین تنگ ہو جائے تو حرکت کرنی چاہیے۔کم سے کم لاہور میں میری ہوا ابھی اتنی خراب نہ ہوئی ہوگی۔ویسے بھی ڈسٹری بیوٹر کراچی کے مقابلے میں لاہور کی بنی ہوئی فلم کو ترجیح دیتے تھے مگر سٹوڈیو وہ باقاعدگی سے جاتا رہا۔

## قسمت کا لکھا

اچانک پتہ چلا کہ مہارانی اپنی نائیکہ داری امرتسر والی کو جس پر آغا حشر فریفتہ تھے' چھوڑ کر لاہور فرار ہو گئی ہے اور جو زیور کپڑا اس کے ہاتھ لگا وہ بھی لے گئی ہے۔جمال کو خوشی ہوئی مگر افسوس بھی ہوا کہ وہ مل کر نہ گئی۔داری کا برا حال تھا۔اس نے اسے اپنے بڑھاپے کا سہارا سمجھ کر پالا تھا اور اب جب پھل کھانے کا وقت آیا تو وہ اپنا دامن چھڑا کر بھاگ گئی مگر وہ اپنے مسائل میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ جلد ہی وہ اس کے خیالوں سے محو ہو گئی۔

فلم کا کوئی گاہک نہ آیا تھا اور وہ اداس پھرتا تھا۔روزانہ سٹوڈیو جانا ضروری تھا کیونکہ کوئی ڈسٹری بیوٹر اس سے وہیں مل سکتا تھا۔

ایک روز رات کے دس بج گئے۔سٹوڈیو سنسان تھا مگر جمال کا گھر جانے کو دل نہ چاہتا تھا۔اچانک امرتسر والی داری گھومتی ہوئی آئی اور لان میں پڑے ہوئے بنچ پر جمال کے ساتھ بیٹھ گئی اور بولی'' کہیے کیا حال ہے۔کوئی ڈسٹری بیوٹر آیا کہ نہیں؟''

'' جی نہیں کوئی نہیں آیا۔'' جمال نے اداس ہو کر کہا۔'' خدا کامیاب کرے۔'' اس نے جواب دیا اور خاموش ہو گئی کیونکہ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔تھوڑی دیر کے بعد جمال کو خیال آیا کہ مجھے [illegible] اخلاق کا تقاضا ہے۔اس نے کہا'' مجھے بہت افسوس ہوا سن کر کہ



مہارانی فرار ہو گئی ہے۔''

'' جی ہاں۔میں نے اسے خریدا تھا پھر پالا' پڑھایا اور کتھک ناچ سکھایا۔بڑی محنت کی میں نے اس پر مگر وہ غدار نکلی۔کم اصل نکلی۔''

'' جی ہاں۔یہ لڑکیاں!۔ ایسی ہی ہوتی ہیں۔'' جمال نے کہا'' مگر میں نے اور بھی بہت سی لڑکیاں بنائیں' مثلاً نور جہاں۔جو مجھے پہلی مرتبہ کلکتے میں ملی' پھر فریدہ تھی۔فریدہ سے تو آپ ملے ہیں۔''

1951ء میں جب پاکستان کی شکل واضح نہیں تھی اور کلچر کے بارے میں الجھا دی۔جمال اور اس کے ایک دوست خواجہ سعید نے امرتسر والی داری سے ہیرا منڈی میں اس کے گھر پر ملاقات کی تھی۔اس زمانے میں فریدہ نامی ایک اٹھی ہوئی جوانی کا بڑا چرچا تھا جو امرتسر والی داری کے قبضے میں تھی۔جمال اور خواجہ سعید داری سے یہ کہنے آئے تھے کہ پاکستان میں موسیقی کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔اس لیے وہ پلازہ کلب میں ایک شام مفت گانا سنائے تاکہ لوگوں کا ذوق بیدار ہو۔اس قسم کی محفلیں وہ عموماً کروایا کرتے تھے۔امرتسر والی داری نے ان کی بات سنی مگر وہ فریدہ کی تعریفوں کے پل باندھنے لگی۔وہ خوبصورت بہت ہے۔غزل گائیکی میں اس کا بڑا مقام ہے۔بڑے بڑے رئیس اس پر مرتے ہیں۔گانا اس نے استاد عاشق علی خاں اور مجھ سے سیکھا ہے اور میں نے اسے آغا حشر کی تمام غزلیں زبانی یاد کروا دی ہیں اور انہیں پکی کروا دی ہیں۔اب یہ سنا رہی ہے۔آپ ذرا یہ پراٹھا ختم کریں۔اب وہ میک اپ کر رہی ہے۔کپڑے اس نے بدل لیے ہیں۔وغیرہ وغیرہ۔

جمال اور خواجہ سعید کو فریدہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر امرتسر والی داری اس کا بھاؤ بڑھاتی چلی جا رہی ہے۔حتیٰ کہ ان دونوں کے دلوں میں فریدہ کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا مگر پراٹھا ختم ہو گیا۔چائے بھی پی جا چکی مگر فریدہ کی تیاریوں پر رننگ کمنٹری جاری رہی اور تجربہ کار نائیکائیں اس طرح اپنی نوچیوں کے بھاؤ بڑھاتی ہیں۔بالآخر وہ بھی تنگ آ گئی اور جل کر بولی۔'' اری آ جا فریدہ۔یہ تو بیچارے معمولی اخبار والے ہیں۔''

تو اس وقت ایسٹرن سٹوڈیو کے لان میں رات کے دس بجے مایوسی اور نامراد داری امرتسر والی جس کا بڑھاپے کا اب کوئی سہارا نہ تھا۔جمال کو بھی ملاقات یاد دلا رہی تھی۔جمال بڑی بے اعتنائی سے اس کی بات سنتا رہا۔اس نے کہا'' جی ہاں آپ نے ہمیں چوکور پراٹھے کھلائے تھے' مجھے یاد ہے۔''

'' مگر جب وقت آیا تو آپ نے مجھ سے گانا گنوانے کی بجائے روشن آراء بیگم کو بلا لیا۔''

'' مگر آپ تو غزل گاتی ہیں۔'' جمال نے کہا'' مجھے راگداری مطلوب تھی اس لیے......''

'' تو کیا مجھے راگداری نہیں آتی؟''

'' جی میں نے آپ کو سنا نہیں۔''

'' کمال کرتے ہیں۔آغا حشر تھیٹر میں مجھ سے غزلیں سنتے تھے مگر جب اکیلے ہوتے تھے ہم دونوں

تو وہ مجھ سے راگ ہی سنتے تھے۔ آپ تو ملے ہیں نا آغا صاحب سے۔''

''جی نہیں۔ وہ بہت جلد فوت ہوگئے۔'' جمال نے بے رخی سے کہا۔

''بہت زبردست آدمی تھے آغا صاحب۔ میری تو ایک ایک بات پر قربان ہوتے تھے راجے مہاراجے نواب جاگیردار میرے پیچھے پھرتے تھے' مگر میں کسی کو منہ نہ لگاتی تھی۔ آغا صاحب کہتے تھے میں نے کتوں میں شیرنی چھوڑ رکھی ہے' جی ہاں۔''

''آغا صاحب تو اس وقت بھی میرے سامنے کھڑے ہیں۔ دو گھوڑا بوسکی کی قمیص' اوپر کی جیب میں ہزار روپے کا نوٹ' کمر میں سرخ ریشمی ازار بند کا پٹکا اور ریشمی لنگی۔ پان میں چونا ڈبل لگواتے تھے اور صرف میرے ہاتھ سے کھاتے تھے۔ اُف وہ بھی کیا زمانے تھے!''

جمال نے سن رکھا تھا کہ امرتسر والی داری نے آغا صاحب کو ایک تھیٹر کی سٹیج پر لوگوں کے سامنے تھپڑ مارا تھا اور ان کے کسی بھانجے' بھتیجے کے ساتھ بھاگ گئی تھی مگر وہ چپ رہا۔ امرتسر والی داری بولی ''لوگ اپنی بیٹیوں کو چھوڑ جاتے تھے میرے ہاں تاکہ میں ان کی تربیت کروں۔ پڑھاؤں لکھاؤں۔ ناچ گانا سکھاؤں۔ یہ مہارانی بھی میں نے تیار کی تھی۔ افسوس غدار نکلی!''

''مگر آپ کیوں لڑکیوں پر وقت ضائع کرتی رہیں۔'' جمال نے پوچھا۔

''میری اپنی کوئی اولاد نہیں۔'' وہ اداس ہو کر بولی۔ ''پھر زندگی میں سہارے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ آخر کوئی کب تک کمائے۔''

''تو آپ لڑکیوں کو کمائی کے لیے تیار کرتی تھیں؟''

''جی ہاں۔ مگر اب پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو سب بیکار نظر آتا ہے۔ اب مہارانی مجھے چوٹ دے گئی۔ اس کی نتھ میں نے 75 ہزار میں کھلوائی تھی۔ پھر فلموں میں کام دلوایا اور اب جب اس کے کمانے کے دن آئے تو وہ بھاگ کر لاہور چلی گئی۔''

جمال کو اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ بے خیالی سے سنتا رہا۔ اچانک امرتسر والی داری کے ضمیر نے کچوکا دیا اور وہ بولی ''اجی ہماری تو قسمت ہی میں وہ گود کھانا لکھا ہے۔''

## بے وقوف آدمی

جمال جس فلیٹ میں رہتا تھا اس کی پگڑی ڈیڑھ لاکھ کی تھی اور اگر جمال اس کو بیچ کر ڈیڑھ لاکھ روپے کے ساتھ لاہور جاتا تو اس کی فلم بھی مکمل ہو جاتی اور وہ ذلیل و خوار بھی نہ ہوتا مگر یہ تو اس کا ساڑھ ستی کا دور تھا اور اسے ذلیل و خوار ہونا ہی تھا۔ وہ ایک نیک دل آدمی تھا اور نیک دل آدمی آنکھوں پر پٹی باندھ کے دنیا میں آتا ہے۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ وہ فلیٹ کو بیچ کر فلم مکمل کرتا اس نے فلیٹ مفت ایک دور کے ... جس کی تنخواہ کم تھی اور گزارہ مشکل سے ہوتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں اس دور کے



دوست نے کہا' میں نے جمال سے کب کہا تھا کہ فلیٹ مجھے مفت دے دو اور اس پر تو کئی مہینے کا کرایہ واجب الادا تھا جو مجھ پر پڑ گیا مگر چند مہینوں کے بعد اس نے یہ فلیٹ بیچ کر نئی آبادی میں ایک نیا فلیٹ اپنے نام سے خرید لیا اور بالآخر اسی میں مرا۔

جمال نے لاہور پہنچ کر کچھ اور پیسے اکٹھے کیے اور شوٹنگ کا شیڈول بنایا۔ شیتل کی پہلی فلم ناکام ہو چکی تھی' اس لیے وہ فلم کے بکنے میں رکاوٹ بن گئی۔ وہ بدتمیز بھی بہت تھی۔ مکالمے بھی پڑھ نہ سکتی تھی اور وقت کے زیاں کا اسے کوئی احساس نہ تھا۔ صبح دیر سے اٹھتی اور راتوں کو غائب ہو جاتی۔ دراصل وہ سبزی منڈیوں کے آڑھتیوں' شرابیوں اور جواریوں کی راتوں کی رانی تھی۔ دوسری ایکٹرسوں کے مقابلے میں جو زیادہ تر خاندانی طوائفیں ہوتی تھیں' اسے کمتری کا شدید احساس تھا جس کا ازالہ وہ شریف آدمیوں کو تنگ کر کے کرتی تھی۔

اسے سٹوڈیو لانے کے لیے جمال کی بیوی اور اسسٹنٹ مجید احمد کو روزانہ اس کے گھر جانا پڑتا۔ وہ اور جمال کے اسسٹنٹ گاڑی لے کر اس کے دروازے پر کھڑے رہتے اور کہیں دن ڈھلے اسے خوشامد کی کشمش کھلا کھلا کر بڑی مشکل سے سیٹ پر لا سکتے جہاں اسے صبح نو بجے آنا ہوتا تھا۔ اس پر بعض اوقات حسینہ بگڑ جاتی کہ ایک دو ٹکے کی ٹخیانی کے تو اتنے نخرے کہ جمال اسے لانے کے لیے اپنی بیوی کو بھیجے اور مجھ اتنی بڑی آرٹسٹ کو جس کا مقابلہ بمبئی کی کوئی ایکٹرس نہیں کر سکتی' خود آنا پڑے۔

مرد ایکٹر جمال سے ہمدردی کرتے۔ حسینہ کا دل بہلاتے' اسے گندے لطیفے سناتے اور اس کو خوش رکھتے۔ اس طرح روتے پیٹتے جمال نے کچھ کام اور کر لیا۔

## تلاشِ گمشدہ

جب ایک سیشن کا آخری منظر رہ گیا تو شیتل لاہور سے غائب ہوگئی۔ اس کی نائیکہ بھی اسی کے ساتھ گئی تھی مگر اس کا دلال وہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ بے بی کو لائلپور کا ایک زمیندار رات کے لیے لے گیا ہے۔ جمال لائلپور پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ بے بی لاہور واپس چلی گئی ہے۔

مگر زمیندار نے جمال کی بڑی تواضع کی۔

لاہور میں شیتل کے دلال نے جمال کو بتایا کہ بے بی تمہیں آج کسی طرح بھی مل نہیں سکتی۔ اگرچہ ہے وہ لاہور ہی میں کیونکہ وہ کسی جگہ پر بک ہے اور پیسے پیشگی لے چکی ہے۔

جمال نے کہا ''صرف ایک منٹ کے لیے اس سے بات کروا دو۔''

''ناممکن!'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا ''بے بی کو ایک بہت بڑی پارٹی نے رات بھر کے لیے بک کیا ہے۔ وہ بہت شریف لوگ ہیں۔''

جمال نے اس کی خوشامد شروع کر دی۔ پھر اسے ایک سو روپے کا نوٹ دیا۔ نوٹ کو جیب میں ڈالتے ہوئے وہ بولا ''آپ بے وقوفی کی بات کر رہے ہیں۔ وہاں بڑے بڑے افسر ہوں گے۔ آپ سے کہا

جو ہے کہ وہ بڑی خاص پارٹی ہے۔''

جمال نے اس کے پیر پکڑ لیے۔ اسے اس پر کچھ رحم آنے لگا۔ وہ صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ شیتل اگلے روز بھی شوٹنگ پر آ سکے گی یا نہیں۔ دلال نے کہا ''جناب کوٹھی کے اندر تو میرا بھی گزر محال ہے۔ چوکیدار ریوالور لیے پہرے پر کھڑا رہتا ہے۔''

جمال نے کہا ''مجھے کوٹھی کا اتا پتا بتادو۔ میں بے بی کو باہر بلا کر بات کرلوں گا۔''

دلال بولا ''جناب آپ سے کہا ہے کہ وہ کسی ایرے غیرے کا ڈیرہ نہیں۔'' مگر بالآخر اس نے جمال کو کوٹھی کا اتا پتا بتادیا۔

## خنجری کی لَے

کوٹھی بہت عالیشان تھی۔ خوش رنگ پھولوں کی کیاریاں دور تک بچھی تھیں۔ اگرچہ اندھیرے میں صاف کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ ریوالور والا چوکیدار بھی نہیں جو آہنی گیٹ کے اندر سنتری بکس میں چھپا کھڑا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک ٹیکسی گیٹ کے سامنے رکی اور اس میں سے ایک شخص اتر کر ڈھولک' ہارمونیم' گھنگھرو اور سارنگی اتار اتار کر ایک طرف رکھنے لگا۔

ساز اٹھانے کے لیے اسے مدد کی ضرورت تھی۔ جمال نے لپک کر سارنگی اور گھنگھرو اٹھا لیے۔

سازندے نے کہا ''یہاں صاحب نے کہہ دیا تھا کہ تم گیٹ پر ملو گے۔ کہاں کھڑے تھے تم؟''

''یہیں تو تھا۔'' جمال نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''صاحب لوگ پہنچ گئے؟'' اس نے پوچھا۔

''جی۔''

''مجھے انہوں نے گیارہ بجے آنے کا حکم دیا تھا۔ گیارہ ہی بجے ہیں نا؟''

گیٹ کیپر نے چپ چاپ دروازہ کھول دیا۔

دبے پاؤں چلتے ہوئے لمبے برآمدے میں سے نکل کر وہ ایک خوشنما ڈرائنگ روم میں داخل ہوگئے۔ آگے آگے سازندہ۔ پیچھے پیچھے جمال سارنگی اور گھنگھرو اٹھائے ہوئے۔

کمرے کے اندر قالین پر شیتل بیٹھی تھی۔ جمال کو دیکھ کر اس کا رنگ فق ہوگیا۔ بولی ''آپ کیسے اندر آ گئے؟ آپ چلے جائیں مہربانی کر کے۔''

''ایک منٹ! کیا تم کل شوٹنگ کے لیے آؤ گی؟''

''آؤں گی ضرور۔ آپ فوراً چلے جائیں بس۔''

اتنے میں ایک باوردی بیرا آیا اور شیتل سے کہنے لگا ''صاحب لوگ یاد کر رہے ہیں۔''



شیتل جلدی جلدی گھنگھرو باندھنے لگی۔ جمال نے اس کے بکل بند کیے۔ بیرا سر پر کھڑا تھا۔ شیتل بات نہ کر سکتی تھی۔

دیگر نوکر آ کر ساز اٹھانے لگے۔ انہوں نے جمال کو شیتل کے گھنگھرو باندھتے دیکھا تو سمجھے کہ وہ بھی سفردا ہے یعنی طوائف کے ساتھ ساز بجانے والا کنجر۔ ڈھولک انہوں نے جمال کو پکڑا دی۔ وہ کسی قدر پریشان تھے کیونکہ خنجری بجانے والا ابھی تک نہ پہنچا تھا اور صاحب لوگ مجرا دیکھنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔

شیتل کے پیچھے چلتا ہوا جمال جب گول کمرے میں پہنچا تو عجیب و غریب قمقموں میں سے چھنتی ہوئی روشنی میں صاحب لوگوں کو اس نے ہاتھی دانت کی نقش تپائی پر تاش کھیلتے ہوئے پایا۔ ان کے جام بھرے تھے۔ وہسکی کی ایک خوبصورت بوتل فرش پر رکھی تھی۔

سازندے ساز ملانے لگے۔ شیتل آہستہ سے بولی ''آپ کھسک جائیں۔ کسی نے دیکھا نہیں آپ کو۔''

جمال نے کہا ''مگر تم کل شوٹنگ پر آؤ گی نا؟''

''خاموش بھئی۔'' میاں صاحب گرجے۔ سازندوں نے لبوں پر انگلی رکھ کر جمال کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

## ایک چال اور چلی

شیتل نے کان میں کہا ''اب آپ چپ چاپ یہیں بیٹھ جائیں۔ آپ میں عقل بالکل نہیں۔''

میاں صاحب کی پشت جمال کی طرف تھی۔ جمال نے ان کے پتوں پر نظر ڈالی۔ پان کا پنجہ' چڑیا کا چھکا اور حکم کا اٹھا۔ فلاش بننے کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔

''ایک ہاتھ اور۔'' جج صاحب بولے۔ ہزار روپے کی چال تھی۔

''چلیے سیکریٹری صاحب۔'' میاں صاحب نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

سیکریٹری صاحب اور میاں صاحب کے پتوں پر جمال کی نگاہ نہ پڑ سکی مگر وہ یقیناً میاں صاحب سے بہتر ہوں گے۔

سیکریٹری صاحب نے کہا ''دو ہزار کی ایک چال!''

ٹھیکیدار صاحب نے ڈبل کہا ''چار ہزار!''

پتہ نہیں ان کے ہاتھ میں کیا تھا۔

سازندوں نے ساز سر کر لیے اور حکم کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ شیتل نے کہا ''جمال صاحب ذرا قریب آ جائیں تاکہ سفردا تو لگیں۔ اب یہ ہماری عزت کا سوال ہے۔''

میاں صاحب نے جن کے ہاتھ کے پتے بہت کمزور تھے' چال بیس ہزار تک بڑھا دی۔

جج صاحب نے پتے پھینک دیئے۔ ''اس سے آگے تو ہمارے پر جلتے ہیں۔'' وہ بولے۔

سیکریٹری صاحب نے بولی چالیس ہزار تک بڑھادی۔ جمال سوچنے لگا' الو کا پٹھا ہے۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار ماہوار تنخواہ لیتا ہوگا۔ ہار گیا تو کیا کرے گا۔

''کیوں بھئی ساز سر ہو گئے؟'' میاں صاحب نے پیچھے دیکھے بغیر پوچھا ''لڑکی تیار ہے؟ اسی ہزار۔'' انہوں نے کہا۔

سیکریٹری صاحب بولے ''میاں صاحب کیا ارادہ ہے' کیوں ہم غریبوں کو مارتے ہو۔'' پھر ہنس کر انہوں نے چال دگنی کردی۔

''اب ان سانڈوں کے بیچ میں آ کر کون اپنی ہڈیاں تڑوائے۔'' ٹھیکیدار صاحب بولے ''ہمارے ہاتھ میں یہی تین تکیاں تھیں۔ یہ لیجیے۔'' انہوں نے پتے پھینک دیئے۔

جمال کے دل کی ایک دھڑکن غائب ہوگئی کیونکہ ترے یعنی ایک جیسے تین پتے کسی خوش قسمت ہی کے ہاتھ آتے ہیں مگر ٹھیکیدار صاحب نے پتے پھینک دیئے تھے۔

میاں صاحب نے کہا ''اتنی پسلی تو ہماری بھی نہیں مگر جہاں ستیاناس وہاں سوا ستیاناس! سیکریٹری صاحب آپ کھائیے۔ دو لاکھ پر شو کیجیے۔''

سیکریٹری صاحب نے بہت گہرا قہقہہ مارا۔ نوٹوں کا پہاڑ سمیٹتے ہوئے ان کی باچھیں کھل گئیں۔ ایک گھونٹ وہسکی کا پی کر بولے۔ ''ہم تو بلف کھیل رہے تھے جج صاحب' ہمارے پاس صرف ایک یکہ تھا۔''

''بھئی کیا کہنے سیکریٹری صاحب۔'' ٹھیکیدار نے داد دیتے ہوئے کہا۔

''کمال کردیا۔ لگا گئے ناچونا ہم ساروں کو۔'' جج صاحب بولے۔

سیکریٹری صاحب بڑے لہر میں تھے' جھوم کر بولے ''جج صاحب اصل میں فلاش اعصاب کا کھیل ہے۔''

''بے شک جناب کے اعصاب کے کیا کہنے!''

''مگر آپ نے بھی تو بہتوں کو پھانسی دی ہوگی اور ان میں سے بعض بے گناہ بھی ہوں گے۔ اعصاب کے بغیر آپ بھی انصاف نہیں کرسکتے جج صاحب۔''

''جی فرائضِ منصبی تو پورے کرنے ہی پڑتے ہیں ورنہ کیا پاکستان اپنے قدموں پر کھڑا ہوسکتا تھا؟ پاکستان کے لیے تو کچھ کرنا ہی پڑتا ہے!''

''بجا فرمایا۔'' سیکریٹری صاحب بولے۔ ''پاکستان کے لیے ہم نے کیا نہیں کیا۔ نہریں بنائیں۔ پل بنائے اور سڑکیں بچھائیں۔''

سب نے یک زبان ہو کر کہا ''بے شک پاکستان سول سروس کی بدولت قائم ہے اور ترقی بھی کر



سیکریٹری صاحب نے پتوں کا ایک ہاتھ اور بانٹا۔ ایک گھونٹ وہسکی کا اور پیا اور منہ اونچا کر کے ایک کباب اور اندر ڈالا۔ پھر بولے ''آپ چال چلیں۔ میں تو بلائنڈ کھیلوں گا۔''

## اعصاب کی بات

''اعصاب کی بات ہے جناب۔'' ٹھیکیدار صاحب بولے۔

''سیکریٹری صاحب کے اعصاب کے کیا کہنے۔ پہلے بلف کھیلے اب بلائنڈ!''

''انسان میں کھیل کا مزاج ہونا چاہیے۔ روپیہ تو ہاتھ کا میل ہے۔ آتا ہے تو آنے دیجیے۔'' سیکریٹری صاحب بولے۔

''زندگی خود بلف اور بلائنڈ ہے۔'' جج صاحب نے کہا۔

''جی ہاں ہم نے زندگی کو ایسا ہی سمجھا۔ بلف اور بلائنڈ اور دیکھیے کس شان سے گزری!''

''بے شک بے شک اور ملک بھی بنادیا آپ لوگوں نے۔''

''سیاستدان تو سارے بے ایمان ہیں اور ہمارے اشاروں کے منتظر رہتے ہیں۔'' سیکریٹری صاحب بولے۔

''بے ایمان ہیں جی اور نالائق بھی! زمیندار انگریز کے کتے' گنوار اور ان کو سٹیٹ کرافٹ یعنی اصول جہانبانی کا کیا پتہ۔''

''اور تجارت کے بارے میں بھی وہ کیا جانتے ہیں؟ لیجیے چال ہوئی۔''

''جی ہاں۔ جب بندہ سیشن جج ہوا۔ یہ 1946ء کی بات ہے۔ میکناب صاحب راولپنڈی کے ڈپٹی کمشنر ہوتے تھے تو میں پھانسی کی سزا دینے سے بہت گھبراتا تھا مگر میکناب صاحب نے سمجھایا کہ انصاف اندھا ہوتا ہے۔ آنکھیں بند کر کے پھانسی کا حکم دے دیا کرو۔''

''واہ کیا بات کہی۔ اندھا کبھی غلطی نہیں کرتا۔ وہ جس راستے پر چلتا ہے' اسی پر چلتا رہتا ہے۔''

ٹھیکیدار صاحب بولے ''ہزار کی ایک چال جی۔ ہم بھی اندھے کے راستے پر چلیں گے۔''

سیکریٹری صاحب سنجیدہ ہو کر بولے ''جب پاکستان بنا تو ہماری کیفیت بھی اندھے کی سی تھی جسے گھر کا راستہ معلوم نہ ہو۔ لوگ جان کو آتے تھے کہ ہمیں یہ دو' وہ دو۔''

''جی ہاں ہمارے لوگ لالچی بہت ہیں۔''

''لالچی بھی اور کام چور بھی۔ کوئی کام نہیں کرتا۔ حالانکہ قانون ان کو کام پر مجبور کرتا ہے اور اسلام کا فرمان بھی یہی ہے۔''

''مگر قانون کو کوئی جانے بھی۔ رول آف لاء ہے تو سب کچھ ہے۔'' جج صاحب نے آہ بھری۔

''لیجیے دو ہزار ہمارے۔''

''شکر ہے کہ انگریز ایک نظام قانون بنا کر دے گئے۔ انگریزوں کے ہم پر بہت احسانات ہیں۔''

''یہی کیا کم ہے کہ وہ انگریزی سکھا گئے اور اس کی بدولت ہم دنیا کی ترقی پذیر قوموں میں شمار ہوتے ہیں۔ میں نے عرض کیا نا کہ میں بلائنڈ کھیل رہا ہوں۔ میاں صاحب ڈبل کریں۔''

''جی ڈبل جناب اور کوئی حکم؟''

''تو میں عرض کر رہا تھا کہ اردو میں تو عدالتی فیصلہ لکھا ہی نہیں جا سکتا۔''

''اچھا ہے ورنہ ہر پھچو پھتا سر کو آ جاتا۔'' جج صاحب بولے۔

''قانون کا احترام اٹھ جاتا۔ عوام تو ریاست ہی کو ختم کر دیتے۔ سیکریٹری صاحب! کیا اب بھی پتے نہیں دیکھیں گے؟''

''اعصاب کی بات ہے۔'' جج صاحب بولے۔

''اعصاب تو سیکریٹری صاحب کے بہت مضبوط ہیں۔''

''گزشتہ ماہ تک تو بہت مضبوط تھے۔ جب انہوں نے یہاں رات گزاری کیوں شیتل؟'' ٹھیکیدار صاحب شرارت سے بولے۔

سب نے شیتل کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ اس نے شرما کر منہ چھپا لیا۔

''خیر اب وہ جوانی والی بات تو نہیں۔'' سیکریٹری صاحب دھیمی آواز میں بولے ''مگر رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے۔'' جج صاحب بولے۔

## غالب غضب کا شاعر

جام چڑھا کر سیکریٹری صاحب نے کہا ''میں سمجھتا ہوں غالب بھی بہت غضب کا شاعر تھا!''

''بھوکا ننگا تھا مگر عیش کرتا تھا۔'' جج صاحب بولے۔

''اب اجازت ہو تو شیتل کچھ عرض کرے۔'' میاں صاحب بولے ''خالی شراب سے کیا ہوتا ہے جب شباب بھی موجود ہو۔''

ڈھولک پر تھاپ پڑی۔ سیکریٹری صاحب نے نوٹوں کا ایک اور پہاڑ سمیٹا۔ شیتل نے مصرعہ اٹھایا۔

''بڑے بے مروت ہیں یہ حسن والے!''

''کیا مصرعہ ہے۔'' جج صاحب بولے ''بڑے بے مروت ہیں یہ حسن والے۔ بھئی واہ!''

''غالب کے کیا کہنے جی!'' ٹھیکیدار صاحب نے داد دی۔ ''وہی ایسا مصرعہ لکھ سکتا تھا۔ ٹھیک مکمل ہونے کے بعد میں اس کی قبر پر مٹی ڈلوا دوں گا۔ ویسے تو سارے میانی صاحب قبرستان ہی کی حالت خراب ہے۔''

''یہ مصرعہ غالب کا نہیں ہے۔'' سیکریٹری صاحب بولے۔



''یہ مگر غالب سے کم نہیں جناب۔''

''مگر ان شاعروں کا ملک کو کیا فائدہ جناب؟'' ٹھیکیدار صاحب نے پوچھا۔

''فائدہ تو کچھ بھی نہیں۔ جنگ ہو تو کچھ نظمیں لکھ دیتے ہیں مگر ہم جنگ نہیں چاہتے۔''

شیتل نے مکھڑا کہہ کر انترہ پکڑا اور ایک بیہودہ سی پھیری لی اور کہا ''کبھی دل لگانے کی کوشش نہ کرنا۔''

''مگر سیکریٹری صاحب اس شاعر کو تو کچھ نہ کچھ ملنا ہی چاہیے۔ چوٹ کھایا ہوا لگتا ہے۔'' جج صاحب بولے۔

سیکریٹری صاحب نے شیتل کی طرف مسکرا کر دیکھا اور نشے میں ایک ہچکی لی۔ میاں صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ سارنگی رونے لگی۔ طبلے نے سر پیٹا۔ ہارمونیم کے بین آسمان تک پہنچنے لگے۔

جمال کا خوف اب دور ہو چکا تھا۔ اس نے خنجری ایک طرف ڈال دی اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ شیتل کے لٹو گھوم رہے تھے۔ کسی بات کے کوئی معنی نہ رہے تھے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ جمال سفر دا ہے یا نہیں۔ اخبار نویس' ادیب' ہالی وڈ کا تربیت یافتہ فلم پروڈیوسر' ویلیج ایڈ کا کلاس ون افسر اور ایک مجرا کرنے والی نوچی کا سازندہ۔ سب اس کی ایک ذات میں گڈمڈ تھے۔

کیا فرق پڑتا ہے۔ اس نے سوچا۔ سیکریٹری' ہائیکورٹ کا جج' ٹھیکیدار' مل مالک' میاں صاحب سب بلائنڈ' سب بلف!

میاں صاحب کے اشارے پر سازندوں نے سر جھکا کر آداب کیا تو جمال بھی فرشی سلام بجا لایا۔

بیرے نے ایک بوتل کھول کر سازندوں کے بیچ رکھ دی۔

## ہو گئی آدھی رات

آدھی رات گزر چلی تو میاں صاحب نے سیکریٹری صاحب کے اشارے پر کھانا لگانے کا حکم دیا۔ سازندے دوسرے کمرے میں جانے کو اٹھے تو شیتل بولی ''اب آپ کھسک جائیں۔ خدا نے عزت رکھ لی ورنہ آپ نے تو بیڑا غرق کر ہی دیا تھا۔''

''تو کل شفٹ پر آؤ گی نا؟''

''ضرور آؤں گی۔''

''وقت پر آؤ گی نا؟''

''شاید کچھ دیر ہو جائے مگر یہ راز راز ہی رہے۔''

اگلے روز شیتل سیٹ پر آ گئی۔ رات اس نے سیکریٹری صاحب کے اعصاب کے تماشے دیکھے تھے۔ آج اس کی آنکھوں کا رت جگا اور چہرے کا پیلا پن صرف جمال ہی سمجھ سکتا تھا۔

آج شیتل جمال کی ہر بات مانتی تھی۔ وہ لچک لچک کر چلتی تھی' حالانکہ اس کی کمر کھوکھے کی لکڑی کی

طرح سپاٹ تھی۔

دوپہر کے کھانے کی بریک میں وہ جمال سے بے تکلف ہوگئی اور کہنے لگی ''سیکریٹری صاحب کے اعصاب تو فوراً ہی ڈھیلے ہوگئے تھے۔ آپ جانتے ہیں جس سانپ کی پھنکار زیادہ ہوتی ہے وہ زیادہ زہریلا نہیں ہوتا۔''

''اور جج صاحب؟''

''جج صاحب محض تماشبین تھے۔ انہوں نے کہا' مجھے تہجد پڑھنی ہے۔ اصل میں آج ان کی باری نہ تھی۔''

''اور میاں صاحب؟''

''میاں صاحب کاروباری آدمی ہیں۔ ان کو تفریح کی فرصت کہاں۔ پھر ان کی اپنی خانگی ہے جسے وہ چھپا چھپا کر رکھتے ہیں۔ وہ کاروبار کے سلسلے میں افسروں کو خوش کرنے کے لیے دوسری نوچیوں کو بلا لیتے ہیں۔''

''اور کس کس کو بلاتے ہیں؟''

''آپ کو کسی کا کیا پتہ؟ آپ نے تو کبھی مجھے بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔''

## جوا کھیلو رشوت نہ لو

''بے شک' مگر کیا وہ ہمیشہ تم کو نہیں بلاتے؟''

''افسر نئی نئی لڑکیاں پسند کرتے ہیں۔ ٹھیکے اسی طرح ملتے ہیں۔ میاں صاحب ہاتھ کے بڑے کھلے ہیں۔ وہ ایک رات کے بھی اتنے پیسے دے ڈالتے ہیں جتنے آپ نے مجھے پوری فلم کے دیئے۔ اصل میں فلم سے ہماری قیمت بڑھتی ہے اور کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔''

''رات کو میاں صاحب کا کتنا خرچہ ہوا ہوگا۔ دس ہزار تو لگے ہوں گے۔''

''اتنا تو شراب ہی پر اٹھ گیا ہوگا۔''

''اور کہاں خرچ ہوا؟''

''آپ کو نہیں نا پتہ۔ میاں صاحب کے پانچ لاکھ سے اوپر ہی لگے ہوں گے۔''

''وہ کیسے؟''

''آپ کے سامنے تو افسر فلاش کھیل رہے تھے۔''

''مگر میاں صاحب کو فلاش بالکل نہیں آتی۔''

''میاں صاحب کو فلاش کھیلنی بہت آتی ہے جی۔'' شیتل دانائی سے بولی۔

''خاک آتی ہے۔ رات وہ ڈگی جوکی پر لاکھ لاکھ روپے کی چال چل رہے تھے۔ عقل ان کے



پاس نہیں پھٹکی۔''

''میاں صاحب عقل کے بادشاہ ہیں۔ ان کا کروڑوں کا کاروبار ہے۔ حالانکہ جب پاکستان بنا تو گڑ شکر کی چھوٹی سی دکان تھی!''

''رات کتنا ہارے ہوں گے تمہارے خیال میں۔''

''میاں صاحب کبھی ہارتے نہیں جناب!''

''رات کو تو وہ بہت ہارے۔''

''وہ تو انہوں نے سیکریٹری صاحب کو خوش کیا تھا۔ سیکریٹری صاحب بڑے ایماندار افسر ہیں۔ رشوت نہیں لیتے کبھی مگر کھیل کی بات اور ہے۔ کھیل میں تو ہار جیت ہو ہی جاتی ہے۔''

''تو میاں صاحب نے رشوت اس طریقے سے دے دی؟''

''آپ رشوت کہتے ہیں تو رشوت ہی سہی مگر کاروبار اسی طرح چلتے ہیں ورنہ افسروں کو کیا پڑی ہے کہ وہ مفت میں لوگوں کے کام کر دیں۔ اب میاں صاحب کے رُکے ہوئے سارے بل مل جائیں گے۔''

''شاٹ ریڈی سر!'' کیمرہ مین چلایا۔

''میک اپ! میک اپ!'' شیتل بولی۔

## باب 29

جمال نے تو تھمبو کر کے فلم آدھی سے زیادہ بنالی مگر کوئی ڈسٹری بیوٹر اس کے قریب نہ پھٹکا۔ سٹوڈیو میں اس کی دھوم مچی ہوئی تھی کیونکہ کیمرہ مین اور ساؤنڈ ریکارڈسٹ جنہوں نے سن رکھا تھا کہ جمال ہالی وڈ کا تربیت یافتہ ہے۔ اس سے چڑے ہوئے تھے اور اسے مجمع لگا کر ٹیکنیک کے بارے میں الٹے سیدھے سوال کرتے تھے جن سے ظاہر ہو کہ اسے کچھ نہیں آتا اور وہ محض انٹلیکچوئل ہے۔

### پڑھا لکھا یعنی نالائق!

انٹلیکچوئل کا مطلب تھا۔ پڑھا لکھا نالائق اور یہ ترکیب ایسے پروڈیوسروں کے لیے ایجاد ہوئی جو پڑھ کر باہر سے آئے اور تجارتی طور پر ناکام ہوئے اور واقعہ بھی یہی ہے۔ پاکستان میں کوئی پڑھا لکھا پروڈیوسر یا ڈائریکٹر کامیاب فلم نہ بنا سکا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سب کے سب سکرپٹ لکھ سکتے تھے۔ شاٹ بھی لے سکتے تھے اور فلم بھی جوڑ لیتے تھے مگر انہیں مارکیٹنگ کا پتہ نہ تھا اور وہ سینما دیکھنے والوں کی نفسیات سے واقف نہ تھے۔ وہ فلمیں سٹیج ڈراموں کی طرح ٹائٹ لکھتے تھے اور توقع کرتے تھے کہ اگر ہمارا منظر توجہ مانگتا ہے تو دیکھنے والے توجہ دیں گے مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ سینما دیکھنے والے سطحی لوگ ہوتے ہیں۔ دماغ پر زور دینا نہیں چاہتے۔ ہلکی پھلکی تفریح چاہتے ہیں۔ جمال کی شہرت یہ تھی کہ یہ آدمی فن تو جانتا ہے مگر کوئی تجرباتی فلم بنا رہا ہے۔ بھلا ایسوں کو ڈسٹری بیوٹر کیوں خریدے گا۔

گھر میں بھی اس کے حالات بہت خراب ہو گئے۔ بہن کا پیسہ وہ کھا گیا۔ اپنی نوکری سے بھی گیا اور برے کاموں میں پڑ گیا۔ والدین سے اس کے تعلقات کبھی اچھے نہ ہوئے۔ اب بہت خراب ہو گئے کیونکہ اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا کہ جب دوسروں کی فلم بک جاتی ہے تو تمہارے کیوں کوئی قریب بھی نہیں پھٹکتا۔ ضرور تم لوگوں سے بدتمیزی کرتے ہو۔

شیتل شفٹوں سے غائب ہو جاتی تھی۔ حسینہ کہتی پھرتی تھی کہ فلم آدھی سے زیادہ بن چکی ہے مگر ہمیں اپنے رول کا پتہ نہیں چلا‘ خدا جانے کیا بن رہا ہے۔

اگر کوئی بھولا بھٹکا ڈسٹری بیوٹر سٹوڈیو میں آ نکلتا تو مالک کہتا میرا بل تو بہرحال ڈوب ہی چکا تم بچ



جاؤ اور میرے پاس ایک سے ایک شرطیہ ہٹ فلم برائے فروخت موجود ہے جس کی کہانی ہندوستان کا چربہ ہے اور اس میں گیارہ گانے ہیں۔ باندراں والی حسینہ‘ بیڑا غرق ہو یا پنجاب دا جی۔ کنجری دا جٹ چھ۔ کوئی سی لے لو سستی دلا دوں گا۔

جمال نے شادا ملک ڈسٹری بیوٹر سے بات کی۔

شادا ملک ایک پڑھا لکھا آدمی تھا۔ ریلوے میں سپرنٹنڈنٹ تھا اور فلم ڈسٹری بیوشن اس کا سائیڈ بزنس تھا۔ وہ جمال کے پاس بیٹھنے اور اس کی باتیں سننے کا شوقین تھا۔ اس نے کہا۔ بھائی جمال تم نے فلم کی آٹھ ریلیں بنا لیں۔ فلم آٹھ ریلوں پر نہیں بکتی۔ چار ریلوں پر بکتی ہے۔ ڈسٹری بیوٹر سمجھتا ہے کہ باقی چار پانچ ریلیں بھی پروڈیوسر بنا لے گا تو پھر فلم دیکھ کر سودا کریں گے۔ چار ریل والے کو کہا جا سکتا ہے کہ فلاں سین کو تبدیل کرو۔ فلاں جگہ گانا ڈالو۔ کامیڈی بڑھاؤ مگر آٹھ ریل والے کے پاس تو گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ مطلب یہ کہ فلم میں ڈسٹری بیوٹر کی ضروریات کا اہتمام نہیں کیا جا سکتا تو پھر وہ کیوں روپیہ لگائے۔ جب فلم اس کی مرضی کی بنی ہی نہیں پھر جمال بھائی تمہاری ہوا بہت خراب ہے۔ تمہاری اپنی ہوا تو بہت اچھی ہے مگر تمہاری فلم کی ہوا خراب ہے۔ تم یہ بھی تو کہتے ہو کہ میری فلم چربہ نہیں ہے۔ ہندوستانی فلم چربہ ہوتی تو اطمینان ہوتا کہ فلم بزنس کرے گی۔ تم کسی نہ کسی طرح لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ اور پیدا کر کے فلم مکمل کر دو پھر میں کمیشن پر چلا دوں گا۔ سارا نفع تم ہی لے لینا۔ ویسے بھی میں دوستوں کے ساتھ کاروبار نہیں کرتا۔

### چوری کرو چربہ کرو

پاکستان میں ہندوستان کی کامیاب فلموں کا چربہ ہوتا تھا تو فوراً بک جاتی تھیں بلکہ بعض نے اپنی اوریجنل فلمیں چربہ کہہ کر بیچ لیں۔ فلم رائٹرز کا ایک نیا طبقہ وجود میں آ گیا تھا۔ وہ لوگ کابل جا کر ہندوستانی فلموں کے مکالمے لکھ لاتے اور منہ مانگے داموں پر بیچ لیتے۔ اس کے ساتھ ہی ایسے میوزک ڈائریکٹر بتا دیتے تھے جو ہندوستانی گانوں کی دھنیں چرا سکیں۔ ہاں اتنا فرق ضرور رکھتے تھے کہ ہندوستانی ہیروئن کا رول لڑکے کو دے دیا اور لڑکے کا رول لڑکی کو دے دیا۔

بڑے ایکٹر‘ ایکٹریسیں اور ان کی نانیاں دادیاں پروڈیوسروں کو خوب لوٹتی تھیں۔ کھانے پینے کے لیے بڑے ہوٹلوں کے آرڈر‘ اعلیٰ درجے کے سگریٹوں کی چار چار ڈبیاں اور سکاچ وہسکی کے علاوہ چار چھ گیلن پٹرول روزانہ۔ نوکروں اور نوکرانیوں کے روز ینے‘ ہیئر ڈریسروں اور میک اپ مینز کے الاؤنس اور ٹیکنیشنوں‘ کیمرہ مینوں اور ساؤنڈ والوں کے کھانے کے علاوہ کنوینس الاؤنس سیٹ لگانے کے لیے ناجائز اوور ٹائم اور اسی قسم کے سیکڑوں خرچے پروڈیوسروں پر پڑ جاتے جن کا جمال نے اپنے بجٹ میں کوئی حساب نہ لگایا تھا۔ ایکسٹرا ایکٹر بھوکے مرتے تھے۔ سارے دن کے کام کے عوض لڑکی کو پانچ روپے ملتے تھے جس میں دو روپے اس کا سپلائر کھا جاتا تھا۔ اور بعض اوقات ان کو جن کے جسموں پر بوٹی ہوتی‘ وہ ڈائریکٹروں کو ہاتھ میں رکھنے

کے لیے مفت کھلا دیتا تھا۔

سٹوڈیو کے ملازمین کو بہت کم تنخواہیں ملتی تھیں اور وہ بھی وقت پر کبھی نہیں مگر انہیں یہ اجازت تھی کہ وہ پروڈیوسروں کا خون نچوڑ لیں۔ دن بھر چائے پانی مانگیں' پان منگوائیں' سگریٹ پئیں اور بعض اوقات شراب کا آدھا جسے عرف عام میں ''کوٹا'' کہا جاتا تھا' طلب کریں ورنہ پروڈیوسر کا کوئی کام نہ ہو سکتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فلم کی ہوا یکدم خراب ہو جاتی تھی۔

## آدم خور کھلے پھرتے تھے

فلم ایک اندھیرا جنگل تھا جس میں آدم خور کھلے پھرتے تھے۔ جمالیاتِ فن' حسن کار اور کسی طرح کا کوئی معیار کسی طرح کا کوئی اصول اور کسی انسانی صفت کا اس جنگل میں گزر نہیں تھا۔ غنڈے پروڈیوسر جس ایکٹر کو چاہتے جس سیٹ سے چاہتے اٹھا لاتے' چاہے دوسرے کا کتنا ہی نقصان ہو جائے۔ پستولیں ہر ایک کی ڈاب میں ہوتی تھیں اور دو چار فائر روزانہ کی روایت تھی۔ اگرچہ یہ عجیب بات ہے کہ مرتا کوئی نہ تھا۔ لوگ آواز سن کر تھرا جاتے تھے۔ برابر کے غنڈوں میں کبھی جھگڑا نہ ہوا۔ ان کو سٹوڈیو کے مالک اور دوسرے غنڈے عین موقعے پر آ کر چھڑوا دیتے کیونکہ شریفوں میں کبھی لپاڈگی نہیں ہوتی۔

اس جنگل میں جمال اپنی فلم کے فوٹو سیٹ اٹھائے دفتر دفتر جانے لگا۔ بعض نے اس سے بڑی ہمدردی کی۔ بعض نے کہا یار تم خواہ مخواہ ہالی وڈ سے واپس آ گئے اور اگر آئے تھے تو وہیں سے کوئی فنانسر بھی پھنسا کر لاتے۔ بعض نے کہا' تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم فلم بناؤ۔ یہ بھی کوئی ملک ہے بھلا؟

جمال تھک گیا۔ اس کو اپنی بے عزتی کی پرواہ نہیں تھی۔ اس نے فرض کر لیا کہ بے عزتی کروانا ہی میرا پیشہ ہے اور مجھے روز کسی دفتر میں جا کر ذلیل ہونا ہے کیونکہ گھر میں تو بیٹھ نہیں سکتا۔

اس کے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا اور مانگنے والے بے شمار تھے۔ اس کے والدین جو شروع ہی سے اس منصوبے کے خلاف تھے' خون کے گھونٹ پینے لگے۔ اگر وہ اس کو گالیاں دیتے تو آسان ہوتا مگر انہوں نے چپ سادھ لی۔ سنگین آنکھوں سے گھورنا شروع کر دیا۔

جمال انتہائی کمتری اور خود رحمی کا شکار ہو گیا۔ اس نے پرانے دوستوں کو ملنا چھوڑ دیا کہ کوئی مجھے چائے نہ پلا دے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اس سے قرض مانگنے آیا ہوں اور بعض دوستوں نے اس سے سردمہری کا سلوک بھی کیا۔

مگر قرض اسے مانگنا پڑتا تھا۔ کبھی سو روپے' کبھی دس روپے' کبھی پانچ روپے تاکہ اس کے گھر میں سوکھی روٹی پک جائے۔

پھر اس کی پیاری اور وفادار بیوی کی آنکھیں چڑھنے لگیں۔ وہ اس سے بات بات پر جھگڑا کرنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ جمال ایک ضدی' خودسر اور بے وقوف آدمی ہے۔ اس کو کسی کا خیال نہیں۔ وہ اس طویل'



بے یقینی میں انتہائی خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جمال اپنی ناکامی کا خود ذمہ داری ہے۔ وہ بات بات پر اس کی توہین کرنے لگی۔

اس کی رعنا بہن اس سے ہمدردی کرتی رہی مگر جمال کو بے وقوف اور ضدی وہ بھی سمجھنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ جمال کو تجارت نہیں آتی۔ جب اتنے احمق اور جاہل پروڈیوسر اپنی فلمیں بیچ لیتے ہیں تو پھر قصور جمال کا ہوا۔

جمال کی بیٹی نے جو کالج جاتی تھی' ملیشیا کے گرے کپڑے پہن لیے تاکہ وہ انقلابی لگے اور یوں اپنی غربت کو چھپا لے۔ اس نے کنٹین پر جانا چھوڑ دیا تاکہ جراثیم سے آلودہ پیسٹریاں کھا کر میں بیمار نہ ہو جاؤں مگر دراصل وہ ڈرتی تھی کہ اس کی سہیلیاں کسی روز اسے کچھ کھلا دیں گی تو وہ ان کا بدلہ نہ اتار سکے گی۔ اس کا کالج گھر سے تین میل دور تھا اور اگرچہ گرمی میں چیل انڈا چھوڑتی تھی۔ اس نے پیدل آنا جانا شروع کر دیا' تاکہ چھ میل روزانہ چلنے سے اس کے جسم کے فاسد مادے نکل جائیں۔ جیب خرچ کی اسے ضرورت نہ تھی اور فیس بھی وہ سوچ سوچ کر ہی مانگتی تھی۔

گھر میں جمال مجرموں کی طرح رہنے لگا۔ بچے اس سے اور وہ بچوں سے ڈرنے لگا۔

## گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

جب آدمی کو کچھ نظر نہیں آتا اور علت و معلول کا منطقی رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو وہ دیواروں سے ٹکریں مارتا ہے' مزاروں کی خاک چاٹتا ہے۔ مسجدوں میں قلب پر ذکرِ سلطانی کی ضربیں لگاتا ہے اور گندے اور صاف ستھرے پیروں کے قدموں میں بیٹھتا ہے۔ جمال ایک منطقی اور عقلی شخص تھا مگر جنگل میں رات پڑ جائے تو بھی آدمی راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ وحید کے دفتر میں کسی نے اس کے سامنے ایوب خاں کے پیر کا ذکر چھیڑ دیا۔ جمال نے کہا ''وہ پیر فراڈ ہے۔ بھلا پیروں کا فیلڈ مارشلوں سے کیا تعلق؟''

وہاں ایک نہایت درماندہ حکیم صاحب بھی بیٹھے تھے جو اس زمانے میں اردو میں طبی ڈکشنری مرتب کر رہے تھے اور نہایت قابل اور نہایت عاجز بندے تھے۔

جمال کی بات سن کر حکیم صاحب کی آنکھوں سے چھم چھم آنسو برسنے لگے۔ انہیں روتے دیکھ کر جمال گھبرا گیا۔ وحید نے مسکرا کر کہا ''تم نے حکیم صاحب کا دل دکھایا اور بقول آفاق احمد دہلوی کسی کا دل نہ دکھانا چاہیے۔''

جمال نے معافی مانگی۔ حکیم صاحب نے آنسو پونچھ کر جمال کو سینے سے لگایا۔ ان کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ حکیم صاحب بولے ''کبھی آپ حضرت صاحب سے ملے بھی ہیں؟''

''جی نہیں' یہ سعادت مجھے نصیب نہیں ہوئی۔''

''کبھی آپ میرے ساتھ چلیں اور انوار کی بارش ہوتی اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔''

''آج ہی چل سکتے ہیں؟'' جمال نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔'' حکیم صاحب بولے۔

جمال نے کہا ''میں گھنٹے بھر میں آتا ہوں۔'' دراصل اسے مری جانے کے لیے بیس روپے ادھار کا بندوبست کرنا تھا۔

پیر صاحب کا بنگلہ مری میں سٹی بینک کے نیچے گھاٹی میں واقع تھا مگر سڑک کے ساتھ ہی ایک تین کمروں کا ڈاک بنگلہ انہوں نے مہمانوں کے لیے بنوا رکھا تھا۔ ڈاک بنگلے کو دیکھتے ہی حکیم صاحب کی آنکھیں عقیدت سے گیلی ہو گئیں حالانکہ یہاں ایک چوکیدار کے سوا کوئی نہ تھا۔

حکیم صاحب وضو کر کے نفل پڑھنے لگے۔ جمال دہلیز پر بیٹھ کر پہاڑ کا نظارہ دیکھنے لگا۔ شام ڈھل چکی تھی۔ جمال اپنے آپ کو معجزوں کے لیے تیار کرنے لگا۔ اب کے جمال کی پھوار اس پر پڑنے والی تھی جس سے وہ اور بھی اداس ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد حکیم صاحب نے اسے کندھے سے ہلا کر اندر بلایا۔ بولنے کی سکت ان میں نہ تھی۔ اندر ایک چنگیر میں موٹی موٹی روٹیاں اور دال کا ایک پیالہ رکھا ہوا تھا۔ حکیم صاحب اور جمال چپ چاپ کھانے لگے۔

حکیم صاحب نے کہا ''پیر صاحب قبلہ کو ہماری آمد کی اطلاع پہلے سے تھی۔ دراصل یہاں آنے کا ارادہ ہمارا نہیں تھا۔ ہمیں طلب کیا گیا ہے۔''

جمال نے کہا ''مگر مجھ گنہگار کی طرف حضور کی توجہ کیسے ہو گئی؟''

اس کا حکیم صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دانائی سے ہنس کر خاموش رہے۔ پھر اٹھ کر انہوں نے جمال کا بستر سیدھا کیا اور بولے ''آپ آرام کریں، میں ذرا نفل پڑھ لوں۔''

وضو کرتے ہوئے انہوں نے کہا ''آپ بڑے خوش قسمت ہیں۔ روحانیت سے آپ کا سینہ منور ہے مگر الاؤ کو بھڑکایا نہیں گیا۔ آج رات آپ پر توجہ ہو جائے گی انشاء اللہ!''

''کیا حضرت صاحب یہاں تشریف لائیں گے؟''

حکیم صاحب پھر مسکرائے اور بولے ''وہ تو یہیں ہیں۔''

''کہاں ہیں؟'' جمال نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پوچھا ''کہاں ہیں پیر صاحب۔''

''یہیں ہیں۔ مگر آپ کو نظر نہیں آتے۔ اندر کی آنکھ کھلے گی تو آپ کو بہت کچھ نظر آئے گا۔ ایک رات ہی کی تو بات ہے۔''

''یہ آپ کس طرح کہتے ہیں قبلہ؟''

''اس لیے کہ جس جگہ آپ کا بستر لگا ہے وہ مطلع انوار ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت نے چلہ



کاٹا تھا۔ چالیس روز وہ اپنے رب سے باتیں کرتے رہے تھے اسی جگہ۔''

جمال سہم گیا۔

حکیم صاحب بولے ''حضرت اپنے خاص خاص بندوں کو جب چاہتے ہیں بلا لیتے ہیں۔ آپ آ گئے کہ نہیں؟ کیا آپ کا ارادہ تھا؟''

''مگر حیرت ہے کہ انہوں نے مجھ جیسے بیکار شخص کو قابلِ توجہ سمجھا۔ روحانیت اور پاکیزگی تو میرے قریب بھی نہیں پھٹکی۔''

''یہ آپ کا خیال ہے۔ جب تک آنچ نہ لگے گیلی مٹی گیلی ہی رہتی ہے۔ اپنے رب کو یاد کریں اور سو جائیں آج کی رات!''

حکیم صاحب نفل پڑھنے لگے۔ کیف سے ان کا چہرہ زرد ہو گیا۔ جمال کی نیند بالکل اڑ گئی۔ وہ ڈرنے لگا کہ حضرت صاحب کہیں میری دنیا ہی مجھ سے نہ چھین لیں۔ اگر کہیں انہوں نے مجھے مجذوب بنا دیا تو میرے بال بچوں کا کیا بنے گا۔ میری فلم کیسے بکے گی اور میری رعنا بہن کا قرضہ کیسے اترے گا۔

بہت دیر کے بعد حکیم صاحب نے مصلّیٰ لپیٹا اور جمال کی طرف دیکھ کر بولے ''نیند نہیں آتی؟ یہ غفلتوں کے دور ہونے کے آثار ہیں۔ جمال میاں انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''انشاء اللہ۔'' جمال نے دبی زبان سے کہا۔

''جانتے ہو حضرت صاحب کون ہیں؟'' اچانک حکیم صاحب نے پوچھا۔ ''نہیں جانتے نا؟''

''جی نہیں۔''

''بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ حضرت صاحب اصل میں حضرت آدم علیہ السلام کا روپ ہیں۔''

جمال یہ سن کر کانپ گیا۔

حکیم صاحب نے چادر اوڑھ لی۔

—

جمال رات بھر سوتا جاگتا رہا۔ اس نے دور گھاٹی میں اذان کی گونج سنی تو گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ حکیم صاحب وضو کر رہے تھے۔ ہوا ٹھنڈی تھی۔ چڑیاں بول رہی تھیں مگر ابھی چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر میں ایک خادم نمکین چائے کے دو پیالے اور ایک نان لے آیا۔

روشنی پھیلنے لگی۔ جمال نے اچانک دیکھا تو ڈاک بنگلے کے صحن میں کچھ لوگ بیٹھے کلمے کا ورد کر رہے تھے۔ حکیم صاحب اور جمال چپ چاپ جا کر چٹائی پر بیٹھ گئے۔

''رات کیسی کٹی؟'' حکیم صاحب نے پوچھا۔ ''کوئی کیفیت پیدا ہوئی؟''

''جی نہیں۔'' جمال نے جواب دیا۔ ''میں بہت بے چین رہا۔''

''یہی تو کیفیت ہے۔'' حکیم صاحب بولے۔ ''آدمی کا دل قرار نہیں پاتا۔ شیطان اسے ادھر

جانے سے روکتا ہے جدھر کوئی مائلِ پرواز ہو۔ وہ اس پر جال پھینکتا ہے۔ ڈراتا ہے۔''

پھر دونوں جھوم جھوم کر کلمے کا ورد کرنے لگے۔

آٹھ بجے کے قریب جب دھوپ میں جنگل چمکنے لگا اک شور سا مچنے لگا۔ سب بے قرار ہو کر کھڑے ہو گئے اور اُچک اُچک کر گھاٹی کی طرف دیکھنے لگے۔ حضرت گھر سے نکل کر اوپر آرہے تھے۔ جمال کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

## پتا پتا بوٹا بوٹا

حکیم صاحب نے کہا ''آپ اولیا اللہ سے بات کرنے کے آداب سے واقف نہ ہوں گے۔ اگر حضرت آپ سے کھڑے کھڑے بات کریں تو دو زانو بیٹھ کر جواب دیجیے گا اور اگر حضرت بیٹھ گئے تو کھڑے ہو جائیے گا۔ صبح خیز دہمہ گر خسر و شام است ایں جا!''

حضرت پچاس کے پیٹے میں ایک خوبصورت اور صحت مند بزرگ تھے۔ گھنی کالی داڑھی جس میں کہیں کہیں سفید بال اُن کے چہرے کے نور میں اضافہ کرتے تھے۔ ہاتھ میں تسبیح لیے وہ رک رک کر دم لے لے کر اوپر چڑھ رہے تھے۔ مریدوں کا ایک ہجوم ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ کلمے شریف کے کورس نے ایک ساحرانہ جلال کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

حضرت ایک دو قدم چلتے اور کسی بوٹے یا کسی جنگلی پھول پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے' مسکراتے اور پوچھتے اے بوٹے کیا تو بھی اپنے رب کی ثناء کر رہا ہے؟ اے پھول کیا تجھے بھی اس کے نور نے رنگ دیا ہے؟

اس میں جمال کو کچھ بناوٹ لگی۔ شیطان واقعی اس کو بہکا رہا تھا۔

حضرت کو قریب پا کر سب نے السلام علیکم حضرت سلامت کہا۔ حضرت سلامت نے مسکرا کر وعلیکم السلام کہا اور ڈاک بنگلے میں گھس گئے۔ نہ انہوں نے کسی کی طرف غور سے دیکھا اور نہ کسی سے بات کی۔ ان کے سر پر جمال کو نور کا کوئی ہالہ نظر نہ آیا۔ ان کے گلے میں ترکِ دنیا کی کوئی مالا نہ تھی۔ کم سے کم حضرت آدم والی کوئی بات جمال کو ان میں نظر نہ آئی۔ شیطان کمبخت انسان کو کچھ دیکھنے بھی تو نہیں دیتا!

حاجت مندوں کا ہجوم بڑھ گیا۔ بعض بیمار اور پریشان تھے۔ بعض بیروزگار اور بھوکے تھے۔ بعض کو یہ گلہ تھا کہ جو لوگ اندر بلائے جاتے ہیں' وہ واپس آنے کا نام ہی نہیں لیتے اور ہو سکتا ہے کہ ان کی باری آنے سے پہلے حضرت کے کھانے کا وقت ہو جائے۔

حکیم صاحب کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ زور زور سے کلمہ پڑھتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ جمال زیرِ لب ہی ورد کرتا رہا' لفظ اس کے منہ سے اپنے آپ ادا ہو رہے تھے نہ ان کی ادائیگی میں اس کا ارادہ شامل تھا اور نہ وہ اپنی آواز کو سنتا تھا۔ دفعتاً اسے خیال آیا کہ اس میکانکی عمل سے رب اگر کوئی ہے تو راضی نہیں ہو سکتا اور خود میرے اندر بھی کوئی مشعل روشن نہیں ہوئی مگر حضرت میری فلم ہی بکوا دیں۔ میرا قرضہ ہی اتروا دیں۔ اگر



جیسا کہ حکیم صاحب کہتے ہیں' میں خود نہیں لایا گیا ہوں تو پھر حضرت صاحب مجھے طلب کیوں نہیں کرتے۔ دوپہر ہونے کو ہے اور رات تک مجھے لاہور پہنچنا ہے۔

حکیم صاحب نے کہا ''صبر کیجیے۔ ابھی آپ کی ملاقات کا وقت نہیں آیا۔''

جمال نے سوچا۔ شیطان مجھے بدستور ورغلا رہا ہے۔ وہ زور زور سے کلمہ پڑھنے لگا۔

## کتا سرائے میں

تھوڑی دیر میں اندر سے ایک خادم آیا اور بولا ''چلیے۔''

حکیم صاحب کے چہرے پر نور کی زردی چھا گئی۔ انہوں نے کہا ''جمال میاں آپ جائیں' میرے لیے تو حضور کی ایک نگاہ ہی کافی ہے۔''

جمال نے سوچا میرا آئینہ دھندلا ہے۔ خوف کے عالم میں وہ کمرے میں داخل ہوا۔ حضرت صاحب تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے زمین پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے جمال سے پوچھا ''آپ کو کیا مطلوب ہے؟'' ان کا لہجہ کافی دنیادارانہ تھا۔

جمال نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اپنی حاجت بتائی اور کہا ''آپ کے پاس میرے حصے کا کچھ ہے تو عنایت کر دیں مگر میں روحانیت کا طلبگار نہیں۔ فقر کا حوصلہ مجھ میں نہیں۔ دنیا کا کتا ہوں۔''

''تو آپ کو فقط دنیا درکار ہے۔'' حضرت صاحب نے حقارت سے پوچھا۔ ''دنیا آنی جانی چیز ہے۔ مسافر سرائے سے جی لگا لے تو منزل کھوٹی ہو جاتی ہے میرے عزیز!''

''مگر کتا سرائے کو چھوڑے تو کہاں جائے سرکار؟''

حضرت صاحب بولے ''مرضی مولا از ہمہ اولے!''

''یہ باتیں میں نے پہلے بھی سنی ہیں حضور۔'' جمال نے کہا۔

اس کے دل میں بغاوت کی ایک لہر اٹھی۔ اس نے کہا ''میں تو بہت تھوڑا مانگتا ہوں جناب!''

''آپ زیادہ مانگیں۔ اس کے خزانے میں کوئی کمی نہ آئے گی۔''

''مجھے زیادہ کی حاجت نہیں۔ دنیا کی آلائشوں میں رہنا چاہتا ہوں۔ میں تھک گیا ہوں حضور۔''

''ہم تو آپ کو بہت زیادہ دینا چاہتے ہیں۔'' حضرت بولے۔

''بہت زیادہ سے میری جھولی پھٹ جائے گی۔''

جمال کے دل میں بیزاری اور غصے نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے سوچا' یہ خوش فکر پیر مجھے کن باتوں میں لگا رہا ہے۔ اس نے عاجزی سے کہا ''مجھ پر نظرِ کرم ہو جائے۔''

حضرت صاحب خود بھی جمال کی ڈھٹائی سے کچھ خوش نہ تھے۔

انہوں نے رکھائی سے کہا ''بہتر جو اللہ کی مرضی۔ میں آپ کو ایک وظیفہ بتاتا ہوں۔ چالیس

روز کا ورد ہے۔"

جمال غصے سے ابل ہی پڑا اور سر اٹھا کر بولا "چالیس روز یا چالیس سال کے وظیفے کا ورد آپ کریں۔ آپ مجھ سے ڈرل کروانا چاہتے ہیں تا کہ اگر مجھے فائدہ نہ پہنچے تو آپ کہہ دیں تم نے وظیفہ غلط پڑھا۔ تمہارے کپڑے ناپاک تھے۔ تم نے یقین نہیں رکھا۔ میں ایسے امتحان میں نہیں پڑنا چاہتا۔ کچھ ہے تو دیجیے ورنہ میں جاتا ہوں۔"

حضرت صاحب کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ خدام پتھر کے بُت بن گئے۔ پھر وہ بولے "بہت بہتر مگر آپ اتنا تو کریں کہ یہ ایک پیسہ جو ہم آپ کو دیتے ہیں واپسی پر دریا میں پھینک دیں۔"

جمال کو فوراً یاد آیا کہ بنارس میں لوگ گنگا میں روپے پھینکتے تھے۔ کیا پیر اور پروہت ایک ہی طرح سوچتے ہیں؟

مگر پیسہ لے کر جمال اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے پوچھا "تو اب آپ میرا پیچھا کریں گے یا میں دوبارہ یاددہانی کے لیے حاضر ہوں گا۔"

"آپ کو حاضری کی ضرورت نہ پڑے گی۔ فی امان اللہ! ہوالشافی! اللہ کافی!"

حکیم صاحب نے جمال سے کوئی بات نہ کی، بولے "میرا کام تو یہیں بیٹھے بیٹھے ہو گیا ہے۔"

"آپ کا کیا کام تھا؟" جمال نے پوچھا۔

"مجھے سکونِ قلب کی تمنا تھی، وہ پوری ہو گئی۔"

جمال بولا "مگر آپ مل تو لیں۔"

حکیم صاحب نے کہا "آپ ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ آفتاب کے قریب کون جا سکتا ہے۔"

"مگر میں تو سلامت رہا۔" جمال نے کہا۔

حکیم صاحب بولے "آپ کو حضور نے تجلی برداشت کرنے کی طاقت دے دی۔ آپ دیکھیے کل کیا ہوتا ہے۔"

جمال نے حکیم صاحب کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے دل میں ایک گمان یہ بھی تھا کہ ممکن ہے حکیم صاحب ٹھیک ہی کہتے ہوں اور فلم ڈسٹری بیوٹر کل میرے گھر کا راستہ پوچھتے پھرتے ہوں۔

اس نے وہ ایک پیسہ جو حضرت صاحب نے دیا تھا، چناب کے پل سے دریا میں پھینک دیا۔

لاہور پہنچ کر اس نے اپنی بیوی سے کوئی بات نہ کی۔ صبح اٹھ کر وہ لکشمی چوک میں فلم ڈسٹری بیوٹروں کے دفتروں کے اور بے تورے پھرنے لگا مگر کسی نے اس کے ساتھ بات بھی نہ کی۔

گھر میں ہر شخص کے دل پر پتھر کی سِل رکھی تھی۔ بچوں نے مسکرانا چھوڑ دیا تھا۔ بیوی نے اس کی



سیدھے منہ بات نہ کی تھی۔ اس کی رعنا بہن اس پر بدستور جان چھڑکتی تھی مگر اب اسے فلم کی ٹریٹ منٹ میں نقائص نظر آنے لگے تھے اور جمال کو ایک مجرم کی طرح اپنے بیان کی وضاحت کرنی پڑتی تھی۔

بہت زیادہ گرمی میں اور ناکامی کی صورت میں اپنوں کا خون بھی پانی کی طرح پتلا ہو جاتا ہے۔

## روشنی کی ایک کرن

پھر اچانک روشنی کی ایک کرن پھوٹی اور جمال کا پرانا اور غم خوار یار نذر محمد لاہور آ گیا۔ اس نے آتے ہی کہا "غم نہ کرو۔ فلم بیچنا میرا کام ہے۔ وزارتِ اطلاعات پنجاب کے سیکریٹری پہلے بہاولپور میں ڈپٹی کمشنر تھے اور میرے بغیر رات کی روٹی نہ کھاتے تھے۔ وہ بہت مضبوط اور جابر افسر ہیں اور فلم انڈسٹری اور فلم سنسر بورڈ ان کے ماتحت ہے۔ ان کے آگے کوئی ڈسٹری بیوٹر بول نہیں سکتا۔"

دوسرے دن نذر محمد نے کہا۔ آج ہماری دعوت ہے۔ ملک صاحب کی بیگم ولایت گئی ہوئی ہیں اور انہوں نے ہمیں شام کو بلایا ہے۔ آج دن بھر میں ان کے ساتھ تمہاری باتیں کرتا رہا۔

جمال شدید کمتری کے احساس میں مبتلا تھا۔ وہ ملک صاحب سے اچھی طرح بات نہ کر سکا۔ اس کی کم گوئی کو ملک صاحب نے ذہانت پر محمول کیا۔ اگرچہ جمال ذہانت سے عاری بھی نہ تھا۔ عقل کی بات دوسری ہے۔

## آج کل انڈر گراؤنڈ ہوں

ملک صاحب نذر محمد سے بہت متاثر تھے۔ اس نے اسے بتا رکھا تھا کہ میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے حکم پر ایک مدت سے انڈر گراؤنڈ کام میں مصروف ہوں۔ کمیونسٹ پارٹی کے احترام کی وجہ سے ملک صاحب نے نذر محمد سے کبھی پوچھا نہ تھا کہ انڈر گراؤنڈ تم کون سا کام کرتے ہو مگر وہ تو کھلے عام چلتا پھرتا شخص تھا۔ ملک صاحب کبھی کبھی یہ بھی سوچتے تھے کہ شاید نذر محمد اس کا اصلی نام نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی اور شخص ہو جو انڈر گراؤنڈ کام کرتا ہے اور خفیہ رہنے کی خاطر اس نے اپنا نام نذر محمد رکھ لیا ہے۔ خود نذر محمد نے اس ابہام کو ہمیشہ گہرا ہی کیا۔ جمال نے جو جانتا تھا کہ کمیونسٹ پارٹی تتر بتر ہو چکی ہے، بات کبھی نہ کھولی۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ نذر محمد میرا غم خوار ہے۔

ملک صاحب نے دونوں کو شراب پلائی۔ تکے کباب کھلائے اور رات کو دونوں کو اپنی کار میں بٹھا کر سنت نگر کی تنگ گلیوں میں چھوڑ آئے۔ جہاں ان دنوں جمال رہتا تھا۔ رخصتی کے وقت انہوں نے کہا "جمال لاہور میں میرے دو کام ہیں۔ ایک پاکستانی فلم انڈسٹری سے ہندوستانی فلموں کی چربہ سازی کا خاتمہ کرنا اور دوسرا تمہاری فلم بیچنا۔ خوف دل سے نکال دو۔"

## گندی جرابیں

نذر محمد نے ملک صاحب کی شہ پر فلمی صنعت میں دہشت پھیلا دی۔ ڈسٹری بیوٹرز اور پروڈیوسرز اس

کے پیچھے پیچھے پھرنے لگے کیونکہ وہ ان کی چربہ فلمیں سنسر کروا سکتا تھا مگر جمال کی فلم کی بات جہاں تھی وہیں رہی۔

ملک صاحب اس سلسلے میں خود کسی سے کچھ کہہ نہ سکتے تھے۔ جب اسی تگ و دو میں کوئی چھ ماہ نکل گئے تو ملک صاحب نے جمال سے کہا ''کل تم میرے دفتر آ جانا۔ پونے بارہ تک۔''

جمال پونے بارہ بجے ان کے دفتر پہنچ گیا۔ ملک صاحب نے کہا ''چلو گپ شپ کرتے ہیں۔ مجھے آج کوئی خاص کام نہیں ہے۔''

ٹھیک بارہ بجے ان کا چپڑاسی ایک وزیٹنگ کارڈ لایا۔ اسے پڑھ کر ملک صاحب نے کہا ''میرے سامنے آ کر بیٹھو جمال۔''

جمال اٹھ کر ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ان کی بڑی سی چیئر کے سامنے۔

......''اور اپنے بوٹ اٹھا کر میری میز پر رکھ دو۔'' انہوں نے کہا۔

''میں ایسی حرکت نہیں کر سکتا ملک صاحب۔'' جمال نے کہا۔

''جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔''

''جی نہیں' یہ نہیں ہو سکتا۔''

''جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔'' وہ ڈانٹ کر بولے۔

جمال نے اپنے بوٹ اٹھا کر خاں صاحب کی لمبی میز پر رکھ دیئے۔ ان کے منہ کے سامنے مگر یہ بات اس کو اچھی نہ لگی۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

پھر ملک صاحب نے چپڑاسی سے کہا ''بلاؤ اسے۔'' اور جمال کو ہدایت کی ''ہلنا نہیں۔''

دوسرے لمحے جو شخص ملک صاحب کے کمرے میں داخل ہوا' وہ پنجاب اینڈ فرنٹیئر فلم ڈسٹری بیوٹرز ایسوسی ایشن کا صدر تھا۔ جمال اپنی جگہ پر میخوں سے جڑا ہوا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر صدر ایسوسی ایشن کی ٹانگیں بھی کانپنے لگیں۔

ملک صاحب نے چہرے پر خفگی کا نقاب پہن لیا اور اس کی سی ایس پی افسروں کو ٹریننگ کے دوران اچھی طرح مشق کرائی جاتی ہے بلکہ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کس سے کس طرح ہاتھ ملانا ہے۔ ڈھیلا کر کے گرم جوشی سے پورا آدھا یا نہیں ملانا یا فقط سر ہلانا کافی ہے۔ ملک صاحب نے صدر صاحب کو چربہ سازی پر ڈانٹنا شروع کر دیا۔ حالانکہ قانونی طور پر حکومت پاکستان چربہ سازی کو روکنے کی مجاز نہ تھی۔

صدر صاحب نے نیک چلنی کا وعدہ کیا اور گزارش کی کہ فلموں کی لمبائی کی حد پر پابندی ختم کر دی جائے۔ بارہ ہزار فٹ میں فلم بنائی ہی نہیں جا سکتی۔

ملک صاحب نے پوچھا ''کیوں جمال تمہارا کیا خیال ہے؟''

جمال منمنایا۔ ''جی بارہ ہزار فٹ میں فلم بنانا مشکل تو ہے۔''



''تو صدر صاحب ہم آپ کی درخواست پر ہمدردانہ غور کریں گے۔ جب جمال صاحب کی بھی یہی رائے ہے تو ٹھیک ہی ہے۔ یہ پاکستان کی سب سے اعلیٰ فلم بنا رہے ہیں۔ آپ کو تو پتہ ہی ہوگا۔''

''جی ہاں۔ ہم نے بھی بہت تعریف سنی ہے۔'' صدر صاحب بولے۔ ''ماشاء اللہ انڈسٹری کو ایسے ذہین آدمیوں کی بہت ضرورت ہے۔ یہ لوگ آئیں گے تو چربہ سازی کی لعنت بھی ختم ہو گی۔''

پھر ملک صاحب نے ہاتھ بڑھا کر صدر صاحب کو رخصت کر دیا حالانکہ وہ ابھی اور بیٹھنا چاہتے تھے اور اس بات کی بھی سی ایس پی افسروں کو خوب ٹریننگ دی جاتی ہے کہ کب کسی کا قد چھوٹا کر کے اسے کمرے سے باہر نکالنا ہے۔

جب صدر صاحب چلے گئے تو ملک صاحب نے کہا ''یار تمہاری جرابوں میں سے بڑی بو آتی ہے۔''

جمال نے بوٹ ہٹا لیے اور کھسیانا ہو کر ہنسنے لگا۔

دو چار روز ملک صاحب نذر اور جمال نے کسی ڈسٹری بیوٹر کا انتظار کیا مگر کسی نے دروازے پر دستک نہ دی۔ پھر نذر صاحب نے کہا ''جمال کا کوئی ایڈریس ہی نہیں۔ میں کوئی راستہ نکالتا ہوں۔''

نذر کو عمدہ کپڑے پہننے کا شوق تھا۔ وہ گنجا تھا۔ اس لیے انگریزی ہیٹ سر سے اتارتا نہ تھا۔ بات بڑے اعتماد سے کرتا تھا اور بولتے بولتے بڑے افسروں کے نام لے جاتا تھا جو اس کے جگری یار تھے۔ اس کو دھونس دینی خوب آتی تھی اور اب تو سب کو معلوم تھا کہ ملک صاحب اس کے بغیر ایک شام نہیں گزار سکتے۔ وہ کسی ڈسٹری بیوٹر کے دفتر میں جاتا تو سب اٹھ کر کھڑے ہو جاتے۔ اس کے لیے چائے دانی میں چائے منگواتے۔ سب کو پتہ تھا کہ ہماری فلمیں جو سب کی سب چربہ ہیں' نذر محمد ہی سنسر کروا سکتا ہے اور اس بات کا وہ چرچا زور و شور سے کرتا تھا۔

وہ ملک صاحب کے ساتھ گزاری ہوئی رنگین شاموں کے قصے بڑے تفصیل کے ساتھ اور لون مرچ لگا کر سناتا۔

نذر محمد فلم انڈسٹری کا مائی باپ بن گیا۔ اسے دیکھ کر لوگ ہٹو بچو کے نعرے لگانے اور منتیں کرنے لگے کہ وہ ان کی فلموں کے گیت لکھ دے۔

مگر جمال کی فلم جہاں پڑی تھی وہیں پڑی رہی۔

## نیک پارسا حاجی

ڈسٹری بیوٹر کی حیثیت سے حاجی صاحب کا نام لاہور میں بہت اونچا تھا جو بات منہ سے نکالتے تھے اس پر قائم رہتے تھے۔ پنج وقتہ نمازی' روزہ دار اور حاجی۔

حاجی صاحب انبالے کے مہاجر تھے مگر اس سے زیادہ کوئی ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ خود کہتے تھے' ہم سب پاکستانی ہیں۔ پاکستان مل گیا تو سب کچھ مل گیا۔

حاجی صاحب کے چار تو اپنے سینما تھے۔ پھر ان کا ڈسٹری بیوشن کا کاروبار جسے انہوں نے اپنے بیٹوں کے سپرد کر رکھا تھا' وہ زیادہ وقت یادِ الٰہی میں گزارتے تھے۔ دفتر میں بھی تسبیح ان کے ہاتھوں سے کبھی چھوٹی نہ تھی۔

فلم ڈسٹری بیوشن کا کاروبار ان کا بڑا بیٹا کرتا تھا مگر وہ اکھڑ اور بدتمیز تھا۔ جمال اپنی فلم کا فوٹوسیٹ لے کر حاجی صاحب کے پاس چلا گیا۔

حاجی صاحب نے جمال کو بڑے ادب سے بٹھایا' چائے منگوائی مگر اس کی فلم کی تصویریں دیکھنے پر رضامند نہ ہوئے۔ انہوں نے کہا ''میاں یہ گناہ کے کام ہیں۔ آپ چھوٹے میاں صاحب سے بات کر لیں۔ ویسے میں آپ کا خادم ہوں۔''

پھر انہوں نے جمال کو پاکستان کی برکات پر ایک لمبا لیکچر دیا۔ اس سے محبت کرنے کی تلقین کی۔ انہوں نے کہا ''میاں ذرا سوچیے پاکستان نہ ہوتا تو ہندو ہمارا کیا حشر کرتا۔'' یہ باتیں انہوں نے اس دردمندی سے کہیں کہ جمال کی آنکھوں میں حبِ وطن سے آنسو آ گئے۔

شام کو جمال نے ساری بات اپنے فلم ایڈیٹر سے کہہ دی۔ اسے حاجی صاحب سے کوئی گلہ نہ تھا۔ اس نے کہا ''چلو حاجی صاحب نے فلم میں دلچسپی نہ لی مگر ایسے نیک آدمی کی زیارت ہو گئی۔ یہی کیا کم ہے؟''

فلم ایڈیٹر مرزا دھیرے سے مسکرا کر چپ ہو گیا۔

اس کے پاس ایکسٹرا سپلائر بھی بیٹھا تھا۔ اس نے کہا ''صاحب جی ہم چھوٹے آدمی ہیں۔ ذلیل اور گنہگار۔ آپ اتنے نیک آدمی سے مل کر آئے ہیں تو ایک پیگ آج ہمارے ساتھ بھی پییں۔''

جمال بولا ''بھائی نوردین پھر کبھی۔''

ایکسٹرا سپلائر نے کہا ''ہمیں اپنی حیثیت معلوم ہے جناب۔ آپ ہم چوہڑے چماروں کے ساتھ کیوں پینے لگے۔ آپ کو تو کوئی حاجی چاہیے۔''

یہ کہہ کر نوردین کمرے سے اٹھ کر چلا گیا۔

فلم ایڈیٹر نے کہا ''نوردین بڑے کام کا آدمی ہے۔''

''ہو گا۔'' جمال نے بے پروائی سے کہا۔

اس کے بعد مرزا کام پر لگ گیا۔ وہ کام بہت محنت اور صفائی سے کرتا تھا۔ آج کوئی خاص مجبوری نہ تھی۔ وہ جلدی گھر جا سکتا تھا مگر ساتھ کے سیٹ پر اس کی محبوبہ کام کر رہی تھی۔ اس کا انتظار کرتے کرتے رات کے دس بج گئے۔ جمال کو گھر جانے میں ایسی کوئی دلچسپی نہ تھی۔

## ایک جوتے کا سوال ہے

اتنے میں نوردین ایکسٹرا سپلائر جھومتا جھومتا واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بوتل تھی۔



اس نے آتے ہی اپنے آپ کو ماں بہن کی گالیاں دیں اور آخر میں جمال سے کہا ''آپ ہمیں ایک جوتا مار دیجیے اور اس نے جوتا اتار کر میز پر رکھ دیا۔ آپ کو حسین کی قسم مار دیجیے۔ ایک جوتا اس منہ پر۔''

جمال نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا۔

اس نے کہا ''اگر آج آپ نے ہمارے سر پر جوتا نہ مارا تو ہم گاڑی کے نیچے یہی سر دے دیں گے۔'' پھر وہ رونے لگا۔ ''میرے چھوٹے چھوٹے یتیم بچے ہیں۔ انہیں کوئی روٹی نہ دے گا۔ ہائے ہائے!''

جمال پریشان ہو گیا۔

فلم ایڈیٹر نے کہا ''نوردین بک بک نہ کر۔ صاحب کو تنگ نہ کر۔''

مگر نوردین روئے جا رہا تھا۔ ''میرا گھر اجڑ جائے گا۔ میری بیوی لوگوں کے جھوٹے برتن مانجھے گی۔ صاحب جی آپ کو میری بیوی پر ترس نہیں آتا۔''

جمال نے کہا ''بھائی نوردین تم اتنے شریف آدمی ہو۔ میں تمہیں جوتا کیوں ماروں۔''

''نہیں جی۔ ہم بہت گنہگار ہیں۔ آپ کے در کے کُتے ہیں۔ ہم نے آپ سے کہا تھا کہ آپ ہمارے ساتھ شراب پییں۔ اس گستاخی پر آپ ہمارے سر میں ایک جوتا کیوں نہیں مار دیتے......؟''

''نوردین مجھے شرمندہ نہ کر بھائی۔ میں خود بہت پریشان ہوں۔''

''اسی لیے تو کہا تھا کہ آپ ہمارے ساتھ ایک پیگ پییں۔ پھر میں آپ کو بتاتا کہ یہ حاجی کون ہے۔ ہماری حیثیت نہیں کہ آپ کے سامنے بیٹھ سکیں مگر آپ کو دنیا کا کچھ پتہ نہیں جی۔''

جمال نے کہا ''نوردین اگر تمہارا حکم ہے تو میں پی لیتا ہوں۔''

''حکم؟ نوکر کی کیا مجال کہ وہ آقا کو حکم دے۔''

فلم ایڈیٹر نے ایک پیگ بنا کر جمال کو دیا۔ نوردین بولا ''حاجی بڑا غلط ہے۔ آپ کو کیا معلوم۔ سب غلط ہیں یہاں۔''

جمال نے کہا ''بھائی نوردین میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

نوردین نے پیگ حلق میں انڈیلا اور بولا ''سنئے صاحب جی۔ یہ حاجی دراصل پٹیالے کا کنجر ہے۔ وہاں کے ایک گھٹیا سے سینما میں پروجیکشن قلی تھا۔ شو کے بعد مشین کو تیل دیتا اور صفائی کرتا تھا۔ اس کی بہن کالی کلوٹی اور موٹی تھی۔ اس کا مجرا چلتا نہ تھا۔ پھر پاکستان بن گیا۔ پاکستان بن گیا تو وہ لاہور چلا آیا۔ یہاں لنڈے بازار میں اسے چائے کی ایک دکان الاٹ ہوئی۔ یہ بھی اس کی اصل حیثیت سے زیادہ تھی۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''یہ چائے خانہ اس سے چلا نہیں کیونکہ اسے دن بھر بیٹھنے کی عادت نہیں تھی اور پاکستان میں لوٹ

''یہیں تھا لاہور میں۔''

''اور آپ نے کچھ بھی نہ لوٹا؟''

''خدانخواستہ!''

''کیا بکواس کرتے ہو نوردین۔'' فلم ایڈیٹر بولا۔

''ٹھیک ہے جی۔'' نوردین نے کہا ''صاحب پوتڑوں کے شریف ہیں۔ اسی لیے دھکے کھاتے پھرتے ہیں ورنہ یہ بھی کوئی سینما الاٹ کرا لیتے۔''

''کون سا سینما میں الاٹ کراتا؟''

''تھا جی ایک سینما جس کی اوپر کی منزل میں سیٹھ رام پرشاد کا ڈسٹری بیوشن آفس تھا۔ شمالی ہند کا سب سے بڑا فلمی سیٹھ تھا جی وہ۔ دو سو فلمیں دفتر میں چھوڑ کر وہ پاکستان سے بھاگا تھا۔''

''اب جانے بھی دے نوردین۔'' فلم ایڈیٹر نے بیزاری سے کہا۔

سنی ان سنی کرتے ہوئے نوردین بولا۔ ''اس زمانے میں حاجی کو سب پھجا کنجر کہتے تھے۔ وہ برا نہیں مناتا تھا کیونکہ یہی اس کی پہچان تھی۔ ورنہ پھجے تو گلی گلی چنا جور گرم بیچتے پھرتے ہیں۔''

''پھر کیا ہوا؟''

## پھجا کنجر

''پھجے کنجر کی رسائی بہت تھی۔ ایک وزیر نے کنجری گھر میں ڈال رکھی تھی جو پھجے کی برادری دار تھی۔ پیشہ نہیں جی کیا تھا اس نے۔ اس کی ماں مجرا کرتی تھی۔ پھر اسے ایک رئیس نے گھر میں ڈال لیا مگر یہ لڑکی جو وزیر کی بیوی تھی اس رئیس کے نطفے سے نہیں تھی۔ پچھ لگ گئی یعنی غائب کا مال تھا۔ اس کے باپ کا اس کی ماں کو بھی پتہ نہ تھا مگر اسے وزیر صاحب نے اچک لیا کیونکہ اس کے منہ بولے رئیس باپ کے بہت سارے مربعے تھے مگر کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ یہ وزیر رسوخ والا آدمی تھا اور رئیس کو ووٹ دلوا سکتا تھا۔''

''دلچسپ بات ہے۔'' جمال نے کہا۔

## کنجریاں اور کامیابیاں

''جی ہاں یہ وزیر امیر جاگیردار اسی طرح بنے ہیں۔ زمینیں انہیں انگریزوں نے دے دیں اور کامیابیاں کنجریوں نے۔ ان عورتوں کا ستارہ بڑا پاور فل ہوتا ہے جس کے ساتھ لگ جائیں اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہیں۔ اپنے سٹوڈیو کے مالک کو دیکھ لیجیے۔ بھوکا مرتا تھا پہلے۔''

''اب تم اس کے پیچھے مت پڑ جاؤ۔'' فلم ایڈیٹر بولا ''بکواس بند کرو۔''

''وہ یتیم تھا۔ محلے والوں نے چندہ کر کے اسے کچھ تعلیم دلوائی۔ نیچ ذات کا تھا۔ بڑا ہوا تو شبیرے ایکٹر نے جو اس کی برادری سے تھا۔ اس کی بانہہ پکڑی۔ بمبئی میں شبیرے کی بدمعاشی کی بڑی دھوم تھی۔



شبیرے نے اسے بمبئی سے ڈسٹری بیوشن کے لیے دو فلمیں ادھار پر دلوا دیں تا کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو جائے اور وہ اسے بیٹی کا رشتہ دے دے۔ ایکٹروں کی بیٹیاں کوئی باعزت گھرانہ تو لیتا نہیں۔''

''یہ تو ہے۔''

''اس کی فلمیں خوب چلیں۔ جب وہ امیر ہو گیا تو اس نے شبیرے کی بیٹی کا رشتہ چھوڑ دیا۔''

''چچ چچ۔ کتنی بری بات ہے!''

''آگے سنیے جی' پھر اس نے ایک کنجری گھر میں ڈال لی۔ وہ دن اور آج کا دن! سونا اس کے گھر میں برسنے لگا۔ اس نے کسی سے وفا نہیں کی۔ کسی کو معاف نہیں کیا۔ مٹی کو ہاتھ لگایا تو سونا ہوئی اور اب وہ اتنا بڑا سٹوڈیو بنا کر بیٹھ گیا ہے مگر شبیرا ایکٹر بوڑھا ہو کر دانے دانے کو ترس رہا ہے۔''

''اس کی بیٹی کا کیا ہوا؟''

''آوارہ ہو گئی تھی۔ کسی کے ساتھ بھاگ گئی کیونکہ اس کی شادی کی کوئی امید نہ رہی تھی مگر یہ سالا سٹوڈیو بنا کر دندناتا پھرتا ہے۔ کہتا ہے ہم تو خاندانی رئیس ہیں۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔''

''جانے دے نوردین۔'' فلم ایڈیٹر بولا۔

''اور سنیے جی۔ یہ ہمارے میاں صاحب ہیں ناپاس والے سٹوڈیو کے مالک۔ یہ پہلے چپڑاسی تھے۔ انہوں نے بمبئی جا کر ایک مسلمان پروڈیوسر سے اس کی فلم ڈسٹری بیوشن کے لیے حاصل کر لی۔ پیسہ آیا تو کنجری بھی آئی۔ کنجری آئی تو پیسہ اُمڈ کر آیا۔ اب یہ بھی الحاج کہلواتے ہیں۔ پھجے کنجر کی طرح۔ پیسہ آیا تو وہ پھجے کنجر سے فضل دین بنا' فضل دین سے چودھری فضل دین' چودھری فضل دین سے حاجی فضل دین اور حاجی فضل دین سے الحاج فضل دین چودھری۔ یہ سب لوگ شریفوں کا خون چوس کر لاشیں باہر پھنکوا دیتے ہیں۔ ان کے بیٹے اچھے گھروں میں بیاہے جاتے ہیں۔ بیٹیاں کانونٹ سکول میں پڑھتی ہیں اور بر میں بریگیڈیئر مانگتی ہیں۔''

''بس کر یار۔'' فلم ایڈیٹر بولا۔

''تیسرے سٹوڈیو والے کی سنیے۔ وہ مراد آباد میں تالے بناتا تھا اور یہی مردہ تھا جو وہاں زندہ ہوا۔ وہ بھاگ کر بمبئی چلا گیا اور کسی ڈائریکٹر کا چپڑاسی بن گیا۔ آدمی تیز تھا۔ اس نے کسی طرح فلم ڈائریکشن کا چانس لے لیا۔ جس میں ایک نوعمر لڑکی کام کرتی تھی۔ اسے اس نے پٹا لیا۔ وہ ایک خاندانی طوائف تھی۔ بس پھر کیا تھا۔ تالے بنانے والا چپڑاسی ڈائریکٹر دن دگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ صاحب بس ایک پیگ تو اور لیجیے۔''

''ہاں نوردین۔ آگے سناؤ۔'' جمال نے کہا۔

''پاکستان بنا تو اس نے لاہور کے ایک بہت بڑے سٹوڈیو پر قبضہ کر لیا جو ہندو چھوڑ کر گئے تھے۔

الاٹمنٹ کے لیے یہ اپنی نونچی بیوی کو لے کر دفتر دفتر پھرا۔ دونوں میاں بیوی برابر کے حصے دار ہو گئے۔ یہ عورت کیا تھی کٹاری تھی۔ آپ نے دیکھی ہے صاحب جی؟''

کنجر کون ہوا؟

''ہاں بھئی وہ کٹاری ہی ہے۔''

''اصل میں وہ کنجری گرم مزاج کی تھی۔ کنجریاں عموماً گرم مزاج نہیں ہوتیں۔ بالآخر اس نے بوڑھے کو چھوڑ دیا اور ایک جوان یار کو لے کر بیٹھ گئی۔ سٹوڈیو میں اس کا بھی نام تھا۔ اس کے سید خاوند نے بیٹی کے بدلے اس کا حصہ خرید لیا۔ صاحب جی اس سودے میں کنجر کون نکلا؟''

''مگر تم تو حاجی صاحب کی بات کر رہے تھے نور دین۔'' فلم ایڈیٹر نے کہا۔

''اس کی بات بھی کرتا ہوں جی۔ پہلے اس کنجری کی بات تو سن لیجیے۔ سٹوڈیو تو اس نے پورے کا پورا لے لیا مگر وہ دن اور آج کا دن جب سے کنجری نے اس کا گھر چھوڑا اس کا سٹوڈیو نہیں چلا حالانکہ مشینری اس میں بہت ہے۔''

''مگر کنجری کا کیا بنا؟''

''کنجری نے ایک نوجوان ہیرو کو پکڑا جس کو کوئی گھاس نہ ڈالتا تھا۔ کنجری سے نکاح ہوا تو وہ لاکھوں میں کھیلنے لگا۔ کنجری نے جب اسے چھوڑ دیا تو وہ ڈبکوں ڈبکوں غوطے کھانے لگا۔ اس طرح کی کئی مثالیں ہیں۔ ہمارے سب سے بڑے ہیرو کے ہاں بھی کنجری آئی تو پھول کھلے۔ اس طرح مرد کو دولت مل جاتی ہے کنجری کو عزت۔ پوری انڈسٹری کا یہی حال ہے صاحب جی۔''

''مگر کیا جس کے ہاں کنجری نہیں آئی اس نے فلم انڈسٹری میں ترقی نہیں کی؟''

''نہیں کی جی۔ ہمارے ملک صاحب کو دیکھ لیجیے۔ سٹوڈیو ان کا بھی ہے مگر وہاں الو بولتا ہے کیونکہ کنجری ان کے گھر میں نہیں آئی۔ کراچی کا سٹوڈیو بھی اسی لیے نہیں چلا۔ جہاں کرشمہ ہے وہاں کنجری ہے۔''

''مگر حاجی صاحب کی بات تو بیچ ہی میں رہ گئی نور دین۔''

''بیچ ہی میں رہ گئی جی۔ وہ تو تھا ہی کنجر۔ اس سے چائے خانہ نہ چلا تو وہ وزیر کی کنجری بیوی کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے کہا بیٹی مجھ سے چائے خانہ نہیں چلتا۔ مجھے کچھ اور دلا دو۔''

''کیا چاہیے چاچا جی۔'' اس نے پوچھا۔

''بیٹا میں اپنی حیثیت سے بڑھ کر کچھ نہیں مانگتا۔ میں فلم کا آدمی ہوں اور ڈسٹری بیوشن کا کام یہاں کسی کو آتا نہیں۔ ہندو سیٹھ کا دفتر خالی پڑا ہے میں وہاں بیٹھ کر زندگی گزار لوں گا۔'' نور دین بولا ''اب یہ بھی کنجر کا قصور تو نہیں کہ ہندو سیٹھ کا دفتر ایک نئے سینما کے اوپر والی منزل پر واقع تھا جس میں دو سو فلمیں پڑی تھیں۔ [illegible] وقت الاٹ [illegible] سینما بھی الاٹ ہو گیا۔ پیچھے [illegible] نے شام کو اس پر قبضہ کر لیا۔ افسر [illegible] کو سامان اور فلموں کی



فہرست بنانے نہیں دی۔ رات کو دفتر میں آگ لگا دی اور صبح کہہ دیا کہ جی دفتر میں تو کچھ بچا ہی نہیں۔ پھجا کنجر چند ہی برسوں میں الحاج فضل دین چودھری بن گیا اور اب تو اس کی اصلیت کوئی جانتا ہی نہیں۔ ہمارے صاحب جی بھی اس کی نیکی اور شرافت کی تعریف کرتے آئے ہیں۔ حالانکہ اس نے جھوٹ بولا وہ کاروبار بھی خود کرتا ہے، شراب بھی پیتا ہے اور ایک کنجری بھی اس نے داشتہ رکھی ہوتی ہے۔ صاحب جی آپ کنجروں میں کہاں آن پھنسے۔ اب آ ہی گئے ہیں تو پھر کوئی کنجری گھر میں ڈال لو تا کہ کامیاب ہو سکو۔ علم لیاقت، شرافت اور نجابت کی یہاں کوئی جگہ نہیں۔ میرے بھولے بادشاہ! اب ایک جوتا اس کمینے کے سر پر مارتے ہو کہ نہیں۔ جو آپ کی گلی کے کتے سے بھی زیادہ گندا ہے۔''

پھر روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

ꕥꕥꕥꕥꕥꕥꕥꕥꕥꕥ

## باب 30

جمال صرف فلم والوں کی آنکھوں کے سامنے رہنے کے خیال سے سٹوڈیو جانے پر مجبور تھا مگر یہ اس کے لیے تھانے میں بلائے جانے سے کم اذیت ناک نہ تھا۔ وہ ایڈیٹنگ روم میں بیٹھا تو صلو سید اس کے پاس بھاگتا ہوا آیا اور بولا ''کام چھوڑیں گھر چلے جائیں فوراً۔''

''مگر کیوں؟'' جمال نے پوچھا۔

''کیا آپ نے توپوں کی آوازیں نہیں سنیں؟''

عین اس وقت دور سے توپ کی آواز آئی...... ٹھم...... ٹھم......

سید بولا ''ہندوستان نے حملہ کر دیا ہے۔''

ایک عجیب طرح کا اچھا لگنے والا اضطراب جمال میں ابھرا۔

سٹوڈیو میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ایکسٹرا رکنے پر تیار نہ تھے۔ سیٹھ اور عملے کے لوگ جلدی جلدی کیمرے اور شوٹنگ کا دیگر سامان تہہ خانوں میں بند کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان سب سے پہلے سٹوڈیو پر بمباری کرے گا (کاش کہ ایسا ہی ہوتا مگر ہندوستان نے پاکستان سے کبھی نیکی نہ کی۔)

### حملہ ہو گیا

جمال جوش اور جذبے کی عمومی کیفیت میں گھر کو چلا۔ لوگ ایک دوسرے کو خوش ہو کر دیکھتے تھے جیسے ایک سپاہی اپنی خندق میں دوسرے کو دیکھتا ہے۔ سٹوڈیو کے سامنے ڈبل ڈیکر بسیں بھری کھڑی تھیں مگر کنڈیکٹر مسافروں کا انتظار کر رہا تھا۔ ایسا تو پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

مسافر بھی ایک دوسرے کو خوشی سے جگہ دیتے تھے۔

ملتان روڈ پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بس چوبرجی کے چوک تک پہنچی تو کاریں، تانگے، سائیکلیں، ریہڑے اور گڈے ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے تھے اور راستہ بند تھا۔ ہجوم کے پیچھے فوج کے کئی ٹرک رکے کھڑے تھے اور ان کے اندر بیٹھے ہوئے جوان کوکا کولا پی رہے تھے۔ میلے کپڑوں والے دکاندار بھاگ بھاگ کر بوتلیں ... تڑ تڑ بوتلیں کھولتے اور جوانوں کے ہاتھوں میں تھما دیتے۔



گرمی تھی مگر اتنی نہ تھی کہ جوان محاذ پر پہنچنے کی بجائے راستے میں رک کر ٹھنڈا پینے پر مجبور ہو جاتے۔

مگر ہمارے فوجی اتنے بے فکرے نہ تھے۔ ان کو پیاس بھی نہ لگی تھی۔ وہ جلدی سے جلدی محاذ پر پہنچنا چاہتے تھے جو کچھ ہی میل دور تھا مگر چوبرجی کے لوگوں نے انہیں روک رکھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہمارے ہاتھ سے ٹھنڈا پی کر جاؤ ورنہ نہ جاؤ اور لاہور اسی لیے لاہور کہلاتا ہے۔ بالآخر ایک افسر نے لاؤڈ سپیکر پر کہا ''بھائیو غازیوں کا راستہ نہ روکو ہمیں شہادت کا موقع دو۔ دشمن پاکستان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ فتح کے بعد یہاں رک کر کوکا کولا بھی پییں گے اور پیڑے بھی کھائیں گے۔''

پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا ہجوم پیچھے ہٹنے لگا۔ بعض آنکھیں خوشی اور جوش سے بھیگی ہوئی تھیں۔ توپوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ٹھم...... ٹھم...... ٹھم......

### رعنا کی گھبراہٹ

جمال گھر پہنچا تو اس کی رعنا بہن جو حاملہ تھی، سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ بچوں کو اس نے چارپائی کے نیچے چھپایا ہوا تھا۔ اس کا میجر میاں ان دنوں افریقہ میں ہاکی کھیل رہا تھا۔ رعنا کو یقین تھا کہ عنقریب ہوائی حملہ ہو گا جس میں ہم سب مارے جائیں گے۔

جمال نے بہتیرا سمجھایا کہ ہوائی حملے کی صورت میں ہمارا نشانہ بن جانے کا چانس دس لاکھ میں ایک ہے اور اس صورت میں چارپائی بچوں کی حفاظت نہ کر سکے گی مگر رعنا نہ مانی۔ آئندہ چند دنوں میں اس کا بچہ ہونے والا تھا اور اس پر دیوانگی طاری تھی۔ وہ ایک ڈرا ہوا بچہ تھا۔

جمال کی والدہ سیڑھیوں میں سے گر کر اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھی تھی اور ہسپتال میں پڑی تھی۔

جمال کی جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا مگر اس وقت ایسے غموں کی کسی کو فرصت نہ تھی۔

زینو میر نے جو ایک باکمال شاعر تھا۔ ایک جیپ کرائے پر لی اور جگہ جگہ اپنی نظم سنانے اور لوگوں کا خون گرمانے لگا۔ موسیقاروں اور گویوں نے ریڈیو سٹیشن میں چھاؤنی ڈال دی۔ چور نمازیں پڑھنے لگے۔ غنڈوں نے تسبیاں پکڑ لیں۔ دکانداروں نے چیزیں سستی کر دیں۔ ہر شخص ہر شخص کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ انسانوں کی کایا پلٹ گئی۔ ایسا معجزہ کسی نے دیکھا نہ سنا۔

شام ہوتے ہوتے بلیک آؤٹ کا اعلان ہو گیا۔ لوگ گھروں میں گھسنے کی بجائے گلیوں اور تاریک بازاروں میں نکل آئے۔

### بلیک آؤٹ

جمال کے گھر میں بھی اندھیرا تھا۔ لوگ کسی کو سگریٹ بھی پینے نہ دیتے تھے۔ گاڑیاں لائٹ کے بغیر چلتی تھیں۔ جمال کے گھر میں مصیبت آ گئی جب خوف کی ماری رعنا کو آدھی رات کے وقت زچگی کا درد شروع ہوا۔ وہ نہایت کمزور تھی، خون کا ایک قطرہ بھی اس کے بدن میں نہ تھا۔ ایک ... گاڑی تھی ... بڑی مشکل ...

سے جمال اور اس کی بیوی اس اندھی رات میں گاڑی چلا کر ہسپتال پہنچے۔ وہاں ڈاکٹرنیاں اور نرسیں تو موجود تھیں مگر روشنی نہیں تھی۔ کوئی موم بتی جلانے پر بھی تیار نہ تھا۔

اندھیرے ہی میں رعنا نے بچی جنی مگر رعنا کا کیس خراب تھا۔ اس کو بعض دواؤں کی ضرورت تھی مگر بازار بند تھے۔ وہ کثرتِ خون بہہ جانے کی وجہ سے مر سکتی تھی مگر جمال بے بس تھا۔ ڈاکٹرنی دواؤں کے بغیر اپنے چاقو چھریوں کی مدد سے جو کچھ ممکن تھا کر رہی تھی۔

ہسپتال کے سارے ملازم رعنا کو خون دینے پر تیار تھے مگر اندھیرے میں انتقالِ خون اور خون کے گروپ کا معائنہ ممکن نہ تھا۔ رعنا کی قسمت اچھی تھی، صبح ہوتے ہوتے وہ سنبھل گئی مگر اس رات جمال پر قیامت گزر گئی۔

دن میں بھی وہ سو نہ سکتا تھا کیونکہ اس کی والدہ جس کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی، ہسپتال میں لاوارث پڑی تھی اور اسے دیکھنا ضروری تھا۔ اس کی ٹانگ ٹوٹے ایک ہفتہ ہو چکا تھا مگر ڈاکٹروں نے پرواہ نہ کی تھی اور اب تو اس کے جوڑنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ ڈاکٹروں کو فوج نے طلب کر لیا تھا اور ہسپتال میں کمپاؤنڈر بھی بڑی مشکل سے ملتے تھے۔

جمال کی والدہ موت سے بہت ڈرتی تھی۔ ہوائی حملے کا بھی اسے بہت خوف تھا۔ وہ بستر سے ہل نہ سکتی تھی۔ وہ بہت اداس اور پریشان تھی۔ اسے دیکھ کر جمال ایک عجیب طرح کے احساسِ جرم میں مبتلا ہو گیا۔ حالانکہ وہ اپنی ماں کی کوئی مدد نہ کر سکتا تھا۔

باہر خون دینے والے شہریوں کا ہجوم ہو رہا تھا۔ بچے ایڑیاں اونچی کر کے کھڑے ہوتے تا کہ ہمیں بڑا سمجھا جائے۔ جوان لڑکیاں سکول جانے کی بجائے ہسپتال میں جمع تھیں مگر کسی نے کسی کو نہ چھیڑا نہ گھورا۔

لاہور کے شاعروں، گویوں اور موسیقاروں نے رات بھر محنت کی تھی اور صبح ہی سے ریڈیو پر جنگی ترانے نشر ہونے لگے تھے۔ بعض مورچوں پر دست بدست لڑائی کا عالم تھا۔ حملہ آور جو شام کو لاہور جم خانے میں وِسکی پینے کے ارادے سے آئے تھے، خندقوں میں جم گئے۔ ان کے آگے آگ کا ایک دریا بہتا تھا۔ خون کی دھار نے ان کا راستہ بند کر رکھا تھا۔

محاذ بہت وسیع تھا اور پاکستانی فوج نے جنگ کے لیے خاطر خواہ تیاری نہ کی تھی۔ بعض مورچوں پر گولہ بارود کی کمی تھی۔ عام ٹرک ڈرائیوروں نے بموں کو تربوزوں کی طرح لادا اور طالب علم قلی بن کر محاذوں پر گولے تقسیم کرنے لگے۔ کوئی موت سے نہ ڈرا۔ جنگ شہر سے صرف دس میل دور تھی مگر لوگ دمامے بجا رہے تھے۔ حالانکہ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

جنگ کے اخراجات کے سلسلے میں ایوب خاں نے چندے کی اپیل کی تھی اور لوگوں نے گلی کوچوں



جمال ٹین کے ایک ڈبے کے پاس کھڑا سوچتا رہا۔ ماں کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔ بہن ہسپتال میں پڑی تھی۔ گھر میں کچھ پکا نہ تھا اور اس کی جیب میں فقط ایک پیسہ تھا۔ اس ایک پیسے سے کچھ بھی خریدا نہ جا سکتا تھا۔ پاکستان کو اس ایک پیسے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہ ایک بہت بڑا مذاق تھا مگر سب سے بڑا مذاق تو خود جمال کی ہستی تھی۔ اس نے آنکھ بچا کر یہ ایک پیسہ ڈبے میں ڈال دیا۔ ٹن کی آواز آئی تو جمال کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا۔

### لاہور سے فرار

شام کو رعنا بہن نے کہا "مجھے گھر لے چلو۔ یوں بھی ہسپتال میں علاج نہیں ہو سکتا۔" جمال اپنی بہن کی کسی بات کو رد نہ کر سکتا تھا۔ اسے گھر لے آیا۔

رعنا انتہائی کمزور تھی۔ گولوں کی آواز سے اس کا دل دہلتا تھا۔ بموں کی روشنی سے گھر کی دیواریں روشن ہو جاتی تھیں۔ اس کی ذہنی حالت بہت خراب تھی۔ ہندوستانی طیارے رات کو کرشن نگر کے اوپر سے اڑ کر دریائے راوی کے پل پر بم مارتے تو عجیب طرح کی قرمزی روشنی سے شہر روشن ہو جاتا۔ اس سے رعنا بہن اور بھی پریشان ہو جاتی۔ اس کا خیال تھا کہ قرمزی آگ کے یہ گولے میری تاک میں ہیں اور ہندوستانی فوج فقط مجھے مارنے کے لیے حملہ آور ہے یا میرے بھائی کی جان کے درپے ہے۔

جمال نے اسے بہت سمجھایا مگر اس کا ذہنی توازن خراب ہو چکا تھا۔ صبح ہوتے ہی اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "ہم آج لاہور سے نکل جائیں گے۔"

جمال لاہور کو کسی حالت میں چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ اس کی ماں ہسپتال میں بے سہارا پڑی تھی اور خود لاہور سے بھاگنا اس کے ذاتی وقار کے خلاف تھا، اس کو اس بات کی بھی کوئی پرواہ نہ تھی کہ کوئی ہندوستانی بم مجھے مار ڈالے۔

مگر رعنا سے کوئی بات نہ ہو سکتی تھی۔

گھنٹے بھر کے بعد جب وہ بادل نخواستہ اپنی والدہ سے رخصت ہو کر آیا تو رعنا گاڑی میں بستر بھانڈے رکھوا چکی تھی۔ جمال کی بیوی نے آلو کے قتلے تل لیے تھے۔ گھر کے تالے تلاش کر لیے تھے۔ جمال اپنی والدہ کو تنہا چھوڑ کر آیا تھا اور اگرچہ وہ اس کی کوئی مدد نہ کر سکتا تھا۔ اس کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔

جمال کی والدہ کو رعنا کی طبیعت کا علم تھا۔ وہ خود موت سے بہت زیادہ ڈرتی تھی مگر اب اس کو تنہا رہ جانے کا خوف دلگیر کرتا تھا۔ اس نے آہ بھر کے کہا "اچھا بچو تم اپنی جانیں بچاؤ، میرا کیا ہے۔" اس بات نے جمال کو کاٹ کے رکھ دیا تھا مگر وہ اپنی بہن کے پاگل پن کے آگے بے بس تھا۔

### کرش انڈیا

راوی روڈ پر دو رویہ ٹریفک میں راستہ نکالنا مشکل تھا۔ اُدھر اضلاع سے لوگ جنگ کا تماشہ دیکھنے

کے لیے لاہور کی طرف آ رہے تھے۔ ان کے لیے یہ ایک بہت بڑا میلہ تھا۔ کچھ اس کی سیر دیکھنے اور کچھ جنگ میں حصہ لینے کے خیال سے امڈے آتے تھے۔ راوی روڈ پر کھوے سے کھوا نہیں بس سے بس چھلتی تھی۔

لاہور سے باہر کو روانگی زیادہ تر کاروں کی تھی۔ خوبصورت کاروں میں خوبصورت خاندان' خوبصورت سامان' بید کی ٹوکریاں' چمڑے کے سوٹ کیس' نئے ٹفن' بکس لیے امیر لوگ لاہور سے دور بھاگ رہے تھے جہاں توپوں کی گھن گرج نہ ہو' ہوائی حملے نہ ہوں۔ سلامتی اور سکون ہو۔

ان خوبصورت کاروں کے پیچھے لکھا تھا ''کرش انڈیا۔''

یعنی ہم تو چلے امن کی وادیوں میں' تم اے لاہوریو! انڈیا کو کرش کر دو۔

جمال خود لاہور سے بھاگ رہا تھا۔ اگرچہ اس کے بھاگنے کی وجہ دوسری تھی۔ وہ تو اپنی بہن کی خاطر بھاگ رہا تھا مگر اس کا دل وہیں تھا۔ رعنا بہن موت سے زیادہ سائرن کی آواز سے ڈرتی تھی اور وہ اس کی آواز سے بھاگ رہی تھی۔ شرم کے باوجود اس نے کار دوسری کاروں کے پیچھے لگا لی۔

رات انہوں نے نور پور میں گزارنے کا فیصلہ کیا جہاں مشتاق ان دنوں مقیم تھا۔ وہ ایک سیانا آدمی سمجھا جاتا تھا۔

نور پور کی کوئی فوجی اہمیت نہ تھی۔ یہ قصبہ جمال کے لیے اجنبی ہو چکا تھا۔ اس کی گلیوں سے گزارے اسے اٹھارہ برس ہو چکے تھے۔

رات کو سب لوگ چھت پر سوئے۔ ہوا ٹھنڈی اور فرحت بخش تھی۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔

ابھی کوئی سویا نہ تھا کہ اچانک مشرق کی جانب سے تین ہندوستانی ہوائی جہاز غراتے ہوئے نکلے اور مغرب کی طرف چلے گئے۔ رعنا گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

مشتاق نے کہا ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ روزانہ اسی وقت سرگودھے پر حملے کے لیے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں لوٹ آئیں گے۔''

رعنا نے کہا ''کیا عجب کہ وہ جاتے ہوئے ہماری چھت پر بم مار دیں۔''

''جنگ میں ہوابازوں کو خاص نشانوں پر بم مارنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ وہ ادھر ادھر بم نہیں مارتے پھرتے۔'' جمال نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' رعنا بولی ''مگر ہندوؤں کا کیا بھروسہ۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ نور پور پٹھانکوٹ سے اتنا قریب ہے۔''

''اتنا قریب نہیں رعنا۔'' مشتاق بولا ''یہاں سے تو امرتسر ہی پچیس میل ہوگا۔''

''امرتسر صرف پچیس میل دور ہے یہاں سے؟'' رعنا بولی۔ ''مطلب یہ کہ وہ نور پور بھی آ سکتے ہیں ادھر سے۔ یہ تو سخت خطرناک جگہ ہے۔''



''ایسا خطرہ بھی نہیں۔ ایک پلٹن ان دنوں ان کا راستہ روکنے کے لیے نور پور آ گئی ہے۔''

''ایک پلٹن یہاں آ گئی ہے؟ پھر تو وہ ضرور ہم پر حملہ کریں گے۔ میرے خیال میں ہم سب کو نور پور فوراً [illegible]ڑ دینا چاہیے میں کسی کو یہاں رہنے نہ دوں گی۔''

رعنا نے اپنے ماموں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

صبح اٹھتے ہی مشتاق نے اپنی کار میں سامان لاد لیا۔ پھٹی پرانی دلائیاں' رضائیاں اور بھانڈے برتن۔

راولپنڈی پہنچ کر بھی وہ فیصلہ نہ کر سکے کہ ہم کہاں پناہ پکڑیں۔ انہیں پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ پاکستان [illegible]نا چھوٹا سا ملک ہے۔ ہر طرف سرحد ہی سرحد!

[illegible]فتی جو راولپنڈی میں مقیم تھا' رعنا سے کم بزدل نہیں تھا۔ وہ موت سے نہیں ڈرتا تھا موت کے ڈر سے ڈرتا [illegible]۔ اس نے رعنا کے ہر اندیشے سے اتفاق کیا۔ اس پر رعنا اس کی عقل و دانش پر عش عش کرنے لگی۔

[illegible]ات کو مفتی کے گھر کے سامنے کھدی ہوئی خندق میں بیٹھے ہوئے جب سرینگر سے پشاور جانے والے جہا[illegible] پس چلے گئے اور سائرن نے سکون کا اعلان کر دیا تو مفتی نے کہا ''تم لوگ ایبٹ آباد چلے جاؤ۔''

[illegible]بٹ آباد کا کسی کو خیال ہی نہ آیا تھا۔ مفتی واقعی بہت عقلمند آدمی تھا۔

[illegible]بٹ آباد سے سات میل دور جنگل میں ایک ریسٹ ہاؤس تھا جس میں ان شوقیہ پناہ گیروں کے قافلے کو جگ[illegible] تھی۔ اس کے قریب کوئی گاؤں بھی نہیں تھا۔ ایک چوکیدار تھا جو اِدھر اُدھر سے کھانے پینے کا سامان لا[illegible]

[illegible]ٹ ہاؤس پہاڑ کی کمر پر واقع تھا۔ اوپر سلیٹی رنگ کی چوٹی تھی۔ نیچے پگڈنڈیوں سے گزر کر ایک ندی بہتی تھی [illegible]ا کے پانی کا ہلکا ہلکا شور کانوں کو بھلا لگتا تھا۔ چاروں طرف پہاڑی لڑکیاں بکریاں چراتی تھیں۔ انہیں [illegible]ی نہیں تھا کہ ان دنوں لاہور میں میلہ لگا ہوا ہے اور ان کے ہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ ان کے کپڑوں' ا[illegible]شکلوں اور ان کے طور طریقوں سے انہیں بہت دلچسپی تھی مگر وہ ان کے قریب نہ آتی تھیں۔

[illegible] آ کر رعنا کے سارے غم دور ہو گئے۔ سائرن کی آواز یہاں سنائی نہ دیتی تھی۔

[illegible]لتے اور بکریوں کے پیچھے بھاگنے لگے۔ جمال کی بیٹیاں اور بیوی نیچے ندی پر جا کر کپڑے دھونے اور سکھا[illegible]تیں۔ اصل میں وہ جمال سے دور رہنا چاہتی تھیں۔

## نفرت

[illegible] عمدہ عورت تھی۔ نرم دل' خوش مزاج اور خوش دل۔ چھوٹی موٹی شاپنگ سے خوش ہو جاتی تھی۔ مددگا[illegible] [illegible]ں کے طرزِ احساس میں گہرائی نہ تھی۔ وہ ایک اچھی بیوی تھی اور جمال اس کو چاہتا بھی بہت تھا۔

بات مودی کی غیرت کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ سارا قصور جمال کا تھا جس نے ایک ناکام فلم بنانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے بہن اور ماں باپ کا پیسہ خراب کیا۔ وہ کاروبار کرنا نہیں جانتا اور ایک ضدی اور نکھٹو شخص تھا جو اپنے بچوں کا پیٹ نہیں پال سکتا۔ اس کا کوئی مستقبل نہیں اور وہ روزانہ اتنے سارے سگریٹ پی جاتا تھا۔

لاہور میں جمال اسے کسی نہ کسی طرح بہلائے رکھتا تھا مگر اب اس بہلاوے میں بھی تین برس گزر چکے تھے۔ اس کے پاس بھی اب کہنے کو کچھ نہ تھا۔ وہ بھی جلا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر میں بچوں نے شور مچا دیا کہ مودی پہاڑ کی چوٹی پر جا رہی ہے۔ وہاں سے ندی میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لے۔ جمال کی بیٹیاں اس کے پیچھے بھاگیں۔ پھر سب بیٹھ کر رونے اور جمال کو کوسنے لگے۔

رعنا نے اپنی شکل پتھر کی سی بنا لی۔ جمال کو سخت پشیمانی ہوئی کہ میں نے کراچی میں کیوں چھت سے چھلانگ نہ مار لی۔ جب شیتل نے مجھے مارا تھا' میں آخر کاہے کو زندہ رہا۔ میں بدقسمت ہوں' نالائق نہیں ہوں۔ محنت کرتا ہوں ذلت اٹھاتا ہوں۔ ایکڑیسوں سے مار کھاتا ہوں' ماں باپ سے ڈرتا ہوں۔ اب اگر میں گرداب میں پھنسا ہوں تو میری خطا کیا ہے۔ یہ تو میری ساڑھ ستی کا زمانہ ہے۔ زحل میرے کہنے پر تو نہیں چلتا۔

مگر دراصل جمال سے کوئی بھی نفرت نہ کرتا تھا۔ یہ اس کی ناکامی اور نارسائی تھی جو اس کی ذات میں مجسم ہو کر سب کی نفرت بن گئی تھی اور ناکامی اور نارسائی کو بیوی' بچے' ماں' باپ' بہن' بھائی اور عزیز ترین دوست بھی معاف نہیں کرتے۔

کچھ دن اسی طرح گزر گئے۔

جمال کے ساتھ کوئی ٹھیک سے بات نہ کرتا تھا۔ اس کو لاہور کی فکر بھی تھی۔ ماں باپ کی طرف سے بھی شرمندگی تھی۔ اس کو ڈر تھا کہ میری ماں کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کسی نے جوڑی نہ ہو گی اور میرے باپ کو کوئی کھانا نہ دیتا ہو گا۔

## سبز پوشوں کا نزول

جنگ کی خبریں وہ ریڈیو سے باقاعدہ سنتا تھا۔ لڑائی جہاں تھی وہیں رک چکی تھی۔ پاکستان نے کھیم کرن فتح کر لیا تھا اور اس ڈیڑھ میل کے رقبے پر قبضے کو پاکستانی پروپیگنڈے نے آسمان تک اچھال دیا تھا۔ لوگ افیون مانگ رہے تھے اور انہیں افیون دی جا رہی تھی۔ سرکاری ذرائع ابلاغ اور کچھ کرائے کے دانشوروں نے جن کی روٹی اسلام کی غلط تفسیر پر چلتی تھی' کہہ دیا کہ کچھ سبز پوش آسمانوں سے اتر آئے تھے۔ جنہوں نے ہندوستانی توپوں کے گولے کرکٹ کے گیند کی طرح ہوا میں کیچ کر کے واپس ہندوستانی فوج پر مار دیئے تھے۔



مقصد دراصل عوام کے اس بے مثال جذبے کی نفی کرنا تھا جس کا انہوں نے جنگ کے دوران مظاہرہ کیا تھا۔ اس بات پر بھی سب چپ تھے کہ پاکستانی ٹینکوں نے بیاس کی طرف جو پیش قدمی شروع کی تھی' وہ ہندوستان نے راستے میں ہی کس طرح چھین لیے۔

ہماری حالت دراصل اچھی نہ تھی۔ انڈونیشیا' ایران اور ترکی نے ہماری دل کھول کر مدد کی تھی مگر جب چین نے ہندوستان کو الٹی میٹم دے دیا کہ ہماری آٹھ سو بھیڑیں واپس کر دو ورنہ ہم تم پر چڑھائی کرتے ہیں تو امریکہ' برطانیہ اور روس کی سٹی گم ہو گئی۔

ریسٹ ہاؤس میں رہتے رہتے سبھی اکتا چکے تھے اور یہ بھی امید ہو چلی تھی کہ جنگ ختم ہونے والی ہے۔ اس لیے ایک دن سب نے بستر باندھ لیے۔

رعنا مکمل جنگ بندی کا انتظار کرنا چاہتی تھی۔ جمال اسے نور پور چھوڑ کر لاہور چلا گیا۔ وہ اپنی ماں سے جسے وہ رعنا بہن کی خاطر اکیلی اور بے آسرا ہسپتال میں چھوڑ آیا تھا' سخت شرمندہ تھا۔

وہ رات لاہور میں جنگ کی آخری رات تھی۔ لوگوں کو یقین ہو چکا تھا کہ ہندوستان نے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔ یکطرفہ پروپیگنڈے نے جنگ کی ایک دیومالا تیار کر لی تھی۔ خوش عقیدہ لوگوں نے ریڈیو پر اپنے خواب بیان کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ایک بزرگ نے کہا کہ میں نے حضرت حسینؓ کو کعبے میں سے زرہ پوش نکلتے دیکھا ہے۔ اُن کا رخ پاکستان کی طرف تھا۔ ایک محترم حکیم صاحب بولے کہ میں نے حضور سرور کائنات ﷺ کو مدینے میں تیغ بدست دیکھا' یہ خواب نہیں تھا رویائے صادقہ تھا۔

حقیقت یہ تھی جو بعد کے واقعات سے ظاہر ہوئی جس سے آج تک پاکستانی بے خبر رہنا چاہتے ہیں کہ اس جنگ میں پاکستان کو سخت شکست ہوئی اور اگر اسے روکا نہ جاتا تو پاکستان کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ ہندوستان کے آگے بند باندھے۔ ہمارے پاس گولہ بارود ختم ہو چکا تھا اور صرف حب الوطنی سے حملہ آوروں کو روکا نہیں جا سکتا۔

## عوامی جنگ کا خوف

پاکستانی فوج میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو جذبوں سے قطع نظر فتح و شکست کے مادی اسباب کے بارے میں سوچتے تھے۔ ایک موقعے پر انہوں نے ایوب خاں کو مشورہ دیا کہ عوام کو چھوٹے اسلحہ جات بندوقوں اور گرنیڈوں سے مسلح کر دیا جائے تا کہ ضرورت پڑے تو پیشہ وارانہ جنگ کو عوامی جنگ میں تبدیل کر دیا جائے۔

اس مشورے پر ایوان صدارت میں کھلبلی مچ گئی۔ نواب امیر محمد خاں کالاباغ نے ایوب خاں سے کہا "تمہاری مت ماری گئی ہے۔ ہندوستان نے پاکستان کو فتح کر لیا تو مجلس اقوام ہمارا علاقہ خالی کرا دے گی۔ مگر عوام کو مسلح کر دو گے تو جنگ کے بعد وہ ہمارا خون پی جائیں گے۔"

مسلح کرنے پر راضی نہ ہوئے۔

عوام کو یقین دلایا جا چکا تھا کہ ہم جنگ جیت چکے ہیں۔ سبز پوش فرشتے ہماری امداد کے لیے آسمانوں سے اتر آئے ہیں۔ حضور ﷺ تیغ بکف ادھر کو دیکھ رہے ہیں۔ حسینؓ نے واہگہ کی طرف اپنے سفید گھوڑے کی باگیں موڑ دی ہیں اور شہداء نے تیغیں نیام سے باہر نکال لی ہیں یعنی پاکستان کے دفاع کی ذمہ داری اللہ کی ہے۔ یہ مملکت اسی نے بنائی تھی۔ عوام کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا۔ اب وہی اس کی حفاظت کرے گا۔

جنگ کی آخری رات ہندوستان آخری چند گھنٹوں میں ایک زبردست حملے کے ذریعے پاکستان کا زیادہ سے زیادہ علاقہ مار لینا چاہتا تھا۔ جمال کے گھر کے در و دیوار پھٹتے ہوئے گولوں کی روشنی سے متواتر چمک رہے تھے۔ گھم...... گھم...... گھم......

جوانوں کے سر کٹ رہے تھے اور بڑے ایوانوں میں فتح کے جشن منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

مجلس اقوام نے جنگ بند کرا دی تھی۔

ذوالفقار علی بھٹو کے سر پر گِدھ منڈلا رہے تھے۔ حالانکہ وہ ابھی گھر سے نکلا بھی نہ تھا۔

## کولہو کا بیل

سترہ دن کے زناٹوں کے بعد خاموش راتوں میں سونا مشکل ہو رہا تھا مگر بھوک بچوں کو اب بھی لگتی تھی اور آگے بھی کچھ نظر نہ آتا تھا۔

فلم کی ہوا بگڑ کر بند ہو چکی تھی۔ اب اس کی کوئی برائی بھی نہ کرتا تھا۔ سوائے سٹوڈیو کے سیٹھ کے، جو جمال کو یاد دلاتا رہتا کہ اس کے ذمہ بل کی ادائیگی ہے۔

سارا دن گھر بیٹھ رہنا بھی جمال کے لیے ممکن نہ تھا۔ وہ باہر جاتا تو اس کی بیوی فرض کر لیتی کہ وہ فلم کا سودا کر رہا ہے۔ کئی بار اس نے اور رعنا بہن نے اسے ترغیب دی کہ وہ کسی اخبار میں نوکری کر لے اور جب فلم کا گاہک مل جائے تو واپس آ جائے مگر جمال کا اعتماد جاتا رہا تھا اور اسے پکا علم تھا کہ میں تو ایک خط بھی نہیں لکھ سکتا۔ اخبار میں کیا کروں گا۔ وہ خود رحمی میں مبتلا ہو گیا تھا اور گھنٹوں دیوار کی طرف منہ کیے ساکت بیٹھا رہتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اخبار خریدنا چھوڑا جو اس کے لیے المیے کی انتہا تھی۔

وہ اپنی بیوی کی تسلی کے لیے اور کچھ اس کی سنگین اور کبھی کبھی مظلوم نظروں سے بچنے کے لیے روزانہ باہر جاتا مگر چونکہ اس میں کسی کا سامنا کرنے کی ہمت نہ رہی تھی، اس لیے وہ ریگل سینما کے چوک میں بس سٹاپ پر دن گزار کر شام کو واپس آ جاتا۔

''آج بھی کچھ نہیں بنا؟'' اس کی بیوی بے چینی سے پوچھتی۔

''آج بھی کچھ نہیں بنا۔'' وہ جواب دیتا۔

خواجہ یٰسین ان دنوں کافی خوشحال تھے۔ نہر کے ایک ٹھیکے میں انہوں نے خاصی رقم کمائی تھی۔ کام



میں انہوں نے جمال کو شریک نہ کیا تھا کیونکہ ان کے خیال میں وہ ایک ناکارہ آدمی تھا۔ ان کو ساتھی کی ضرورت تھی اور انہوں نے جمال کی والدہ کے اصرار پر اس کے بھائی مشتاق کو حصہ دار بنا لیا تھا۔ اس لیے ان دنوں مشتاق بھی خوشحال تھا۔

جمال پر رحم کھا کر خواجہ یٰسین اور جمال کی والدہ اپنا گھر چھوڑ کر اس کے ہاں آ بسے تھے اور اس کی روزانہ روٹی کی ذمہ داری انہوں نے لے لی تھی مگر خواجہ صاحب جمال سے بات نہ کرتے تھے۔ انہوں نے رعنا بہن کی کچھ رقم لوٹا دی تھی جو فلم پر اٹھی تھی۔

کیونکہ داماد صرف منافع میں حصہ دار ہوتے ہیں۔

گھر میں والدین کی موجودگی سے جمال کا سارا بدن کانپنے لگا۔ رات کو اسے نیند نہ آتی اور بہت سویرے اس کی آنکھ کھل جاتی مگر وہ بے حس و حرکت پڑا رہتا۔ جمال کی والدہ نے کہا ''خواجہ صاحب ہمیں واپس چلے جانا چاہیے کیونکہ جمال ہمارے سامنے چل پھر نہیں سکتا۔''

یہ مشورہ خواجہ صاحب کو پسند آیا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر وہ واپس اپنے گھر چلے گئے۔ جمال کی جیب اس روز بالکل خالی تھی۔

## صحرا اور سراب

نذر محمد جمال کے سلسلے میں بہت فکرمند تھا اور خاں صاحب بھی بہت دلگیر تھے۔ نذر محمد نے کہا ''خاں صاحب نے تمہیں بلایا ہے۔''

شام کو نذر محمد جمال کی انگلی پکڑے خاں صاحب کے بنگلے پر پہنچا تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

نذر محمد نے کہا ''تو پھر ہم دونوں مر جائیں؟ خودکشی کر لیں مگر بال بچوں کا کیا کریں؟''

بال بچوں کا ذکر کرتے ہوئے نذر محمد کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہچکیاں لیتے ہوئے وہ بولا ''میرا یار بے آسرا اور اکیلا ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو میں زہر کھا لوں گا اور بال بچوں کو بھی زہر دے دوں گا۔''

جمال ساکت بیٹھا رہا جیسے یہ اس کی بات نہ ہو۔ خاں صاحب جذباتی آدمی تھے مگر جذبات کا اظہار نہ کرتے تھے۔ خشک لہجے میں انہوں نے کہا ''کل صبح تم دونوں دفتر آ جانا۔ میں نے آرڈر جاری کر دیا ہے۔ جمال مغربی پاکستان کے صحراؤں پر ایک ڈاکومنٹری بنائے گا۔ کل تمہیں ایڈوانس مل جائے گا۔ چلو اب پیگ بناؤ۔''

صبح سویرے جب وہ متعلقہ افسر کے پاس پہنچے تو وہ جلا بیٹھا تھا۔ اس نے کہا ''تم اوپر ہی اوپر کام کروا لیتے ہو۔ حکومت کو تو یہ بھی پتہ نہیں کہ تم کون ہو اور تمہارا ایڈریس کیا ہے۔''

''ایڈوانس کتنا ملے گا۔'' جمال نے پوچھا۔

''پچاس ہزار! جیسے تمہیں کچھ خبر ہی نہیں۔''

پچاس ہزار اس زمانے میں ایسا تھا جیسے پچاس لاکھ ہوں۔

افسر نے کہا ''عرضی لکھو اور پچھلے مہینے کی تاریخ ڈال دو۔''

جمال کو یاد نہیں آ رہا تھا کہ پچھلا مہینہ کون سا تھا۔

افسر متعلقہ نے کیشیئر کو بلایا۔ اس نے پچاس ہزار کے نوٹ دو مرتبہ گنے اور کہا ''اسی پیسے نکا لیے جناب اور رسید دے دیجیے۔''

جمال کے پاس اسی پیسے نہیں تھے۔ نذر محمد نے ایک روپیہ نکال کر کہا ''لائیے رسید میرے نام کی کر دیجیے۔''

راستے میں نذر محمد نے کہا ''میں تمہاری خاطر کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ رات مجھے تمہاری خاطر خان صاحب کے سامنے رونا پڑا۔ میں گھر ہی سے سوچ کر گیا تھا۔''

جمال کو یہ بات اچھی نہ لگی مگر وہ چپ رہا۔

نذر محمد نے کہا ''پاکستان کے آدھے سی ایس پی افسر میرے دوست ہیں اور ان سب سے ڈاکومنٹری فلمیں لی جا سکتی ہیں۔''

شام ڈھلے وہ خاں صاحب کے بنگلے پر پہنچے۔ وہ اکیلے بیٹھے تھے اور وہسکی کی بند بوتل ان کے سامنے رکھی تھی۔ انہوں نے کہا ''جمال بوتل کھولو۔''

خان صاحب نے حکومت کو لکھ دیا تھا کہ پانچ لاکھ روپے کی ایک خصوصی سینکشن فلمیں بنانے کے لیے کی جائے۔

زندگی یکدم رنگین اور مزے کی چیز ہو گئی۔ گھر میں مونگ کی دال پکی تھی مگر نذر محمد سیخ کبابوں کا ایک تھال لے کر جمال کے گھر اٹھ آیا۔ اب دونوں دوست ایک رات کی جدائی برداشت نہ کر سکتے تھے۔

صبح اٹھ کر نذر محمد نے بینک میں اپنے نام سے اکاؤنٹ کھلوایا۔ پھر اچانک اسے یاد آیا کہ آج سے پندرہ برس پہلے جب میں نے شادی کی تھی تو اپنی دلہن کو بری نہیں دے سکا تھا۔ اسے زیور کا بھی بہت شوق تھا۔ اس کے کپڑے بھی پرانے ہو چکے تھے۔ مکان کی مرمت بھی ہونے والی تھی اور بہاولپور میں اس کے بچے لاہور کے تحفوں کے منتظر بیٹھے تھے۔

جمال اس کی بیوی اور نذر محمد نے اسی شام نذر محمد کی بیوی کے لیے زیور کپڑے اور بچوں کے لیے تحفے خریدے۔ نذر محمد نے نیا سوٹ' نیا ہیٹ اور نئے بوٹ لیے اور سارا کام چند ہزار میں ہو گیا۔ ابھی بہت رقم باقی تھی اور پچاس ہزار اور ابھی حکومت کے خزانے میں ان کے نام کے رکھے تھے۔

## پاکستان کے صحرا

جمال نے پہلے بہاولپور اور بلوچستان کے صحراؤں کی فلمبندی کا پروگرام بنایا۔ نذر محمد اس کے تخمینے



سے ہوتا ہوا بگڑاؤں کے صحرا کی طرف نکل گیا۔

گرمی شدید تھی کیونکہ یہ مئی کا مہینہ تھا مگر صحرائی بچے اب بھی جلا دینے والی ریت پر ننگے پاؤں چلتے تھے۔ کیمرہ مین کے لیے بیئر کی بوتلیں' برف کی سلیں اور اپنے لیے پانی کا گھڑا جیپ میں رکھ کر جب وہ صحرا میں پہنچا تو ٹمپریچر 115 کے قریب تھا اور اس ٹمپریچر میں کچی مچھلی بھی پک جاتی ہے۔ جمال پر کام کا بھوت سوار تھا۔ اب اس کی کلفتیں دور ہونے والی تھیں۔ دوسری قسط میں منافع ہی منافع تھا جس میں وہ نصف کا حقدار تھا۔ اب اس کی بیٹی کو پیدل کالج جانے کی ضرورت نہ ہو گی۔ پھر اس فلم میں سرکاری پروپیگنڈے کی کوئی بات نہ تھی۔ اسے صرف یہ دکھانا تھا کہ صحرائی لوگ کتنے سچے' کتنے بہادر اور کتنے صابر ہوتے ہیں۔

جمال کو تخلیق کی لذت کا بھی خیال تھا۔ وہ آزاد تھا مگر شوٹنگ کرتے ہوئے اسے محسوس ہوا کہ میرا کیمرہ مین سختی برداشت نہیں کر سکتا۔ اسے سٹوڈیو کے آرام دہ حالات میں کام کرنے کی عادت ہے۔ وہ نخرے کرنے لگا تھا۔ ''مجھے ناشتے میں برفی کھانے کی عادت ہے۔ دوپہر کے کھانے میں میں مرغی کا تازہ سوپ پیتا ہوں۔ رات کو ٹھنڈی بیئر نہ ہو تو مجھے نیند نہیں آتی۔ آپ نے بستروں کا بندوبست نہیں کیا۔ آپ کو کام کا تجربہ نہیں۔ آپ کو کچھ نہیں آتا۔''

اسی قسم کی باتیں اس کی ایکٹریسیں بھی کیا کرتی تھیں۔

بگڑاؤں کے سراب بڑے دلفریب تھے لگتا تھا چاروں طرف پانی کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور درختوں کے عکس پانی میں جھلمل جھلمل کر رہے ہیں مگر آگے بڑھو تو ریت ہی ریت۔

رات کو جھونپڑوں سے کچھ دور انہیں صحرائی خانہ بدوشوں نے چارپائیاں بچھا دیں۔ جب جمال سب کو کھلا پلا کر لیٹا تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہاں ستارے اتنے موٹے اور روشن ہوتے ہیں۔ چاند نکل آیا اور چاندنی رات پر ستانے لگی جس سے کروڑوں چھوٹے چھوٹے ستارے زمین پر اتر آئے۔ جمال بہت تھکا ہوا تھا مگر وہ سو کر اتنی خوبصورت رات ضائع کرنا نہ چاہتا تھا۔ اس کی ٹیم کے لوگ خراٹے لینے لگے۔ اس کا کیمرہ مین ٹھنڈی بیئر کی کئی بوتلیں پی کر تقریباً بے ہوش پڑا تھا۔ فضا میں بہت ہی خاموشی تھی۔ کبھی کبھی کوئی بھٹکا ہوا پرندہ آسمان پر تیر کر نکل جاتا تھا۔

## بھورے کتے

اچانک جمال نے دیکھا کہ میری چارپائی کے چاروں طرف عجیب سے بھورے رنگ کے پندرہ بیس کتے کھڑے غرا رہے ہیں۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چارپائی کے گرد گھومنے لگے۔ جمال نے سوچا' انہوں نے اس طرح کھلے میدان میں پڑے ہوئے آدمی نہیں دیکھے۔ اس لیے پریشان ہیں۔ وہ چارپائی پر بیٹھ کر کتوں کو پچکارنے لگا۔

اس پر وہ کتے اچھلنے کودنے اور دانت نکوسنے لگے۔ جمال ساکت ہو گیا مگر کتوں کی گھبراہٹ کم نہ ہوئی۔ وہ بار بار اس کے قریب آتے اور ایک آدھ نے اس کی دری بھی دانتوں سے کھینچی۔ ان کے قد عام کتوں

کے سے تھے مگر تھوتھنیاں ذرا لمبوتری تھیں۔ وہ بے حد پھرتیلے تھے۔ ان سب کا رنگ ایک سا تھا۔ ان کے دانت بہت تیز اور چمکیلے تھے۔ جمال کسی قدر ڈرا۔ اس نے اپنے اسسٹنٹ ارشد کو آواز دی۔ اتنے میں باقی لوگ بھی جاگ گئے۔ کیمرہ مین بے سدھ پڑا رہا۔

سب اٹھ کر بستروں پر بیٹھ گئے۔ کسی کے پاس کوئی لاٹھی بھی نہ تھی اور ریت کے اس طویل صحرا میں کوئی اینٹ روڑا بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔

ارشد نے تکیے کے نیچے سے ٹارچ نکال کر کتوں پر ماری نہ اِن کی آنکھیں شعلہ بار تھیں۔ ایسی جلتی ہوئی آنکھیں جمال نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ کتے روشنی سے ڈر کر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے۔ وہ غرا رہے تھے۔ ان کی لمبی لمبی زبانیں باہر لٹک رہی تھیں۔

انہیں ہٹتے دیکھ کر ارشد ٹارچ لے کر ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ اس نے کتوں کی ماں بہن کو گندی گالیاں دینی شروع کر دیں۔ وہ ایک طرف سے ٹارچ مارتا تو وہ دوسری طرف سے اس پر بھونکتے۔ جمال کو یہ صورتحال تشویشناک لگی۔ اس نے کہا۔ ''ارشد آگے مت جاؤ۔ آہستہ آہستہ واپس آ جاؤ۔ بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔''

ارشد نے کہا ''صاحب جی کتوں نے مجھے گھیر رکھا ہے۔ پیچھے کیسے ہٹوں؟''

''کیا میں تمہاری مدد کو آؤں؟''

''آپ نہ آئیں جی۔ یہ جنگلی کتے ہیں۔''

جمال گھبرا گیا مگر وہ ارشد کی کوئی مدد نہ کر سکتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ ایک کتے نے اچھل کر اس کی آستین پھاڑ ڈالی۔ وہ ٹارچ کی روشنی کتوں کی آنکھوں میں ڈالتا ہوا چارپائیوں کے قریب آ پہنچا۔ کتے اس کے سامنے رک کر زور زور سے بھونکنے لگے۔

ادھر جھونپڑوں میں سے اونٹوں کے بلبلانے اور بکریوں کے ہنہنانے کی آوازیں آنے لگیں۔ مرد ایک دوسرے کو آوازیں دینے لگے مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔

ارشد جمال کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کتوں نے چارپائی کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ٹارچ کی روشنی کی اب انہیں کوئی پرواہ نہ تھی۔ وہ بستروں پر پڑے ہوئے تکیوں اور چادریں نوچنے لگے۔ جمال نے اپنی ٹیم کو بیچ کی دو چارپائیوں پر بٹھا کر باقی چارپائیاں دیوار کی طرح ان کے گرد کھڑی کر دیں۔ پھر اس نے ایک چارپائی کو اکھیڑنے کی کوشش کی کہ اس کی پٹی نکال کر کتوں کو ماروں مگر چارپائی نہ کھل سکی۔ کیمرہ مین نے آنکھیں کھول دیں مگر نشے میں اسے صاف کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

اتنے میں جھونپڑوں میں سے دس بارہ آدمیوں کا ایک جتھہ ہاتھ میں لٹھ لیے للکارتا اور نعرے



آگے نہ نکلتے تھے۔

آن کی آن میں انہوں نے صحرائی کتوں کو آ لیا۔ وہ انہیں دیکھتے ہی اِدھر اُدھر ہو گئے۔ خانہ بدوشوں نے انہیں میدان سے بھگا دیا۔ پھر واپس آ کر وہ جمال کی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ بعض کو پسینہ آ رہا تھا۔ اور ہانپ تو سبھی رہے تھے۔ جمال نے پوچھا ''یہ کتے کہاں سے آئے تھے؟''

ان میں جو بوڑھا تھا' وہ مسکرایا اور بولا ''وہ کتے نہیں تھے صحرائی بھیڑیے تھے۔ ہم سے غلطی ہوئی۔ ہم نے آپ کو خبردار نہ کیا۔''

کیمرہ مین جواب ہوش میں آ چکا تھا' جل کر بولا ''اور اب ہمیں بھیڑیوں کے آگے ڈالا جا رہا ہے!''

کیمرہ مین نے صبح ہوتے ہی واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر ڈرائیور نے کہا ''یہاں صحرا میں سڑکیں نہیں ہوتیں۔ ہم تو سورج کو دیکھ کر چلتے ہیں۔ اگر راستہ بھول جائیں تو پیاس سے مر جائیں۔''

''اب ہمیں پیاسا مروا دو۔'' کیمرہ مین بولا۔

''بک بک مت کرو۔'' جمال نے غصے سے کہا ''اگر اب تم نے بکواس کی تو تمہیں اتنے جوتے ماروں گا کہ تمہارا دم نکل جائے۔''

''مار ڈالو مار ڈالو ہمیں۔'' وہ بولا ''اور لیٹ کر اس نے چادر سے منہ ڈھانپ لیا۔''

صبح اٹھ کر بھی وہ سخت غصے میں تھا۔ ناشتے میں اسے صرف بسکٹ اور ڈبے کا مکھن ملا تھا۔ جمال اس سے بہت خوفزدہ تھا۔ اگر وہ کسی طرح واپس لوٹ جاتا تو جمال کا کام بھی رک جاتا اور سب کہتے کہ تمہیں اپنے سٹاف سے کام لینا نہیں آتا۔

## پانی کی جاگیرداری

صبح اٹھ کر جمال نے ڈھاب سے گھڑے بھر لیے۔ پانی گدلا تھا مگر نمکین نہیں تھا اور یہ بڑی بات تھی۔

ڈھاب کا مالک دو آنے فی گھڑا لیتا تھا اور چار آنے فی جانور۔ اس نے کہا ''صحرائی گرمی آپ برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ ہمارا ہی کام ہے۔''

اس کے پاس چالیس اونٹ تھے۔ وہ علاقے کا امیر آدمی تھا۔

جمال نے کہا ''ہم اتنے نازک بدن نہیں۔ اسی پنجاب کے رہنے والے ہیں۔''

سردار ہنسا اور بولا ''اگر تم شام تک اسی ٹوبے پر بیٹھے رہو۔ پانی نہ پیو اور زندہ رہو تو یہ چالیس اونٹ تمہارے۔''

جمال کو کام کرنا تھا ورنہ شاید وہ اس کی شرط قبول کر لیتا۔ ڈھاب سے ہٹ کر وہ ٹیلوں اور ٹبوں کے

شاٹ بنانے لگا۔ اتنے میں سورج سر پر آ دھمکا اور زمین سے گرمی کی لرزشیں نکلنے لگیں۔ باریک ریت کے ذرے ہوا میں تھرتھرانے لگے۔ ہوا کی گرم لہریں آنکھوں کو دکھائی دینے لگیں۔

پانچ آدمی بارہ بجے تک پانی کے تین گھڑے پی چکے تھے۔ اچانک جمال نے کیمرہ مین کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے خون رسنے والا تھا۔ اس کے رخساروں پر چھائیاں پڑ چکی تھیں۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ پھر کسی بات کے بغیر کیمرہ مین کے دونوں اسسٹنٹ آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔

ارشد کی زبان باہر کی طرف لٹک رہی تھی مگر وہ پرسکون تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے لڑتے ہوئے دونوں اسسٹنٹس کو چھڑوایا تو وہ چپ چاپ کیمرہ فٹ کرنے لگے۔ کیمرہ لگ چکا تو ارشد نے جمال سے کہا
"صاحب جی ذرا منہ صاف کر لیجیے۔"

اس نے آستین سے منہ صاف کیا تو وہ خون سے لتھڑ گئی۔ جانے کب سے اس کی نکسیر پھوٹ رہی تھی مگر اسے پتہ نہ تھا۔ خون دیکھ کر بھی اسے کچھ محسوس نہ ہوا۔ اس کی قمیص خون سے لت پت ہو رہی تھی مگر وہ نارمل تھا۔ گرمی کی شدت نے سب کے احساسات اور توازن بدل ڈالے تھے۔ اونٹ والے نے شرط جیت لی تھی۔ پانی پیے بغیر کوئی شخص ڈھاب کے کنارے دن نہ کاٹ سکتا تھا۔

یہ بہاولپور کے صحراؤں میں کام کا آخری دن تھا۔ پھر انہیں آگے جانا تھا۔ سندھ اور بلوچستان۔

آخری شارٹ جمال نے غروب ہوتے ہوئے سورج کا بنایا۔ افق سے اوپر ہی اس کی روشنی غائب ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پیتل کی طرح لال تھال بن گیا اور پھر وہیں نظروں سے غائب ہو گیا۔

شوٹنگ ختم کر کے وہ جلد جلد صادق آباد پہنچے جہاں ایک پرانی مسجد تھی۔ جمال نے سوچا کہ میں مسجد کے غسل خانے میں نہا لوں، ٹھنڈا پانی پھر نجانے کب نصیب ہو۔

کپڑے اتارتے ہوئے اس کا جسم یکدم آسودہ ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں میں سرور بھر گیا۔ دل و دماغ سکھ کی روشنی سے دمکنے لگے۔ اسے لگا کہ میں ایک نرم اور گداز مسہری پر پڑا ہوں۔ فرشتے مجھے مورچھل کر رہے ہیں اور حوریں کتھک ناچ رہی ہیں۔ ہر طرف سکھ کے دریا ٹھاٹھیں مارنے لگے۔

جب اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ غسل خانے کے ٹھنڈے کیچڑ میں پڑا تھا۔ بے ہوش ہونے کی فرصت اسے کام ختم کرنے کے بعد ہی ملی تھی۔

لاہور واپس پہنچ کر جمال فلم کا نیگیٹو دھلوانے، اسے پرنٹ کروانے اور ایڈیٹنگ میں مصروف ہو گیا اور اس کی کارکردگی پر خاں صاحب بہت خوش ہوئے۔ نذر محمد اس کی عدم موجودگی میں اس کا گھر چھوڑ کر جا چکا تھا اور جمال کی بیوی کو اس نے اخراجات کے لیے کچھ نہ دیا تھا۔ اس نے اپنے بال بچے بہاولپور سے منگوا لیے تھے جنہیں لاہور کی سیر کا بہت شوق تھا اور نذر محمد ان کے شوق پورے کرنے میں مصروف تھا۔



## نذر محمد کے شب و روز

شام کو سارا خاندان لکشمی چوک سے تکے کباب اور قلفیاں اڑانے کے بعد سینما میں دوسرا شو دیکھتا اور عیش کرتا۔ دن میں نذر محمد نے ایک ڈسٹری بیوٹر کے دفتر میں میز لگوا لی تھی اور وہ دوستوں کے ہمراہ ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر برف میں لگی ہوئی بیئر پیتا اور اپنے اشعار سناتا۔ اس نے اپنے گرد ناکام فلم ڈائریکٹر اور بیکار ایکٹر جمع کر لیے تھے جو اس کے خرچ پر تنوری مرغے اور نان کھاتے۔ وہ نذر محمد کے انڈر گراؤنڈ مشن سے بڑے متاثر تھے اور نذر محمد کی محنت سے آنے والے سوشلسٹ انقلاب کا انتظار کرتے جو ان کی روٹی اور روزگار کے مسائل حل کر سکتا تھا۔ ان کے دلوں میں نذر محمد نے کمیونسٹ پارٹی کے انقلابی کام کی دھاک بٹھا دی تھی۔ انقلاب کے بعد اچھی اچھی فلمیں بنیں گی اور شراب سستی ہو جائے گی۔ اس روشن مستقبل کے وعدے نے ڈاکومنٹری کے فنڈ کو اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔

پھر نذر محمد کو خیال آیا کہ میری خوشحالی اور کاروباری صلاحیت سے میرے کراچی کے دوست واقف نہیں۔ انہیں اپنی نئی زندگی کی ایک جھلک دکھانے کے لیے وہ کراچی چلا گیا۔ اس کے نمائشی اخراجات کو جمال پسند نہ کرتا تھا مگر اس نے سوچ لیا کہ اگر نذر محمد اپنے حصے کے منافع کو اڑانا چاہتا ہے تو اڑا لے۔

خاں صاحب کو بھی نذر محمد کے اللے تللے پسند نہ تھے مگر وہ دوستی کا پاس کر کے چپ رہے۔ دراصل انہیں بھروسہ تھا کہ جمال کام مکمل کر لے گا۔

نذر محمد کراچی سے واپس نہ آتا تھا۔ جمال کو اب ایک چھوٹی رقم خاں صاحب نے اس کی سرکاری نوکری کی معطلی کے حساب میں دلوا دی تھی۔ بالآخر جب نذر محمد کراچی سے واپس آیا تو بینک میں کچھ بھی باقی نہ تھا۔

جمال نے بھانپ لیا کہ نذر محمد وہ نذر محمد نہیں رہا۔ وہ شان و شوکت سے رہنے کا عادی ہو گیا ہے اور جمال کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس نے خاں صاحب سے الگ ملنا شروع کر دیا تاکہ جمال ان کو سارے حالات نہ بتا سکے۔ ان کے تعلقات بدل گئے۔ اب ان کی حیثیت مالک اور ملازم کی سی ہو گئی۔ بات کرتے ہوئے جمال کو نذر محمد کا موڈ دیکھنا پڑتا مگر شوٹنگ تو ابھی ہونی تھی اور اس کے لیے پیسوں کی ضرورت بھی تھی مگر اس کا انتظام نذر محمد نے کر دیا تھا۔

جمال کی فلم کی فروخت اور نذر محمد کی خان صاحب سے دوستی کے نام پر اس نے بعض ڈسٹری بیوٹروں سے گہرے تعلقات قائم کر لیے تھے مگر دراصل انہیں خیال تھا کہ نذر محمد ان کی چربہ فلمیں سنسر کرا دے گا۔ شوٹنگ پر روانگی سے ایک روز قبل اس نے ایک ڈسٹری بیوٹر سے دس ہزار اور دوسرے سے پانچ ہزار روپے مانگ لیے جو انہوں نے نذر محمد کے خاں صاحب سے گہرے تعلقات کی وجہ سے ادا کر

دیئے۔ دس ہزار اس نے جمال کو شوٹنگ کے اخراجات کے لیے دے دیئے۔ باقی پانچ ہزار اس نے جیب میں ڈال لیے کیونکہ اسے اپنی گرم دوپہروں کو بھی چارہ ڈالنا ہوتا تھا تاکہ مارکیٹ میں اس کی ہوا اچھی رہے۔ جمال سے باتیں کرتے ہوئے اس نے فلم سازی کی زبان بھی سیکھ لی تھی اور اب وہ لانگ شاٹ، مڈشاٹ اور کلوز اپ کا ذکر بڑی روانی سے کر سکتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے وہ اپنے آپ کو بہت بڑا فلم ڈائریکٹر بھی سمجھنے لگا، جس کی اس کے پاس بیٹھ کر مفت کی بیئر پینے والے اور بھنے مرغے اڑانے والے بے فکرے زور و شور سے تائید کرتے تھے۔ اس چھوٹی سی رقم نے جو ابھی نذر محمد نے کمائی بھی نہ تھی، اس کی سائیکی بدل ڈالی تھی۔



## باب 31

جمال کی اگلی منزل حیدر آباد تھی۔ وہاں اس نے اپنے پرانے یار میندرو کو ڈھونڈ نکالا، جس کی پوسٹنگ اب وہاں تھی۔ اس سے پکا وعدہ لے کر کہ اب میں راستے میں کسی غریب آدمی کا گدھا نہ چراؤں گا جمال مٹھی کے صحراؤں کی طرف چلا۔ اصل صحرا میر پور خاص سے شروع ہوتا تھا۔ لاہور کے احسان اخبار کا ہاکر رپورٹر سردار محمد، جسے یہاں دولتانہ نے کھوڑو سے دو مربعے اراضی دلوائی تھی یہیں آباد تھا مگر جمال نے اسے ملنے کی کوئی کوشش نہ کی۔

میر شیر محمد خاں کے قلعے کو دیکھ کو جمال کچھ آگے بڑھا تو ایک ریتلے کھیت میں ہل کے آگے ایک گدھے کے ساتھ ایک عورت جتی تھی۔ اس کا میاں دونوں کو ڈنڈے سے ہانک رہا تھا۔ ہلوں۔ ہلوں.....

جمال کو حیران ہو دیکھ کر میندرو بولا ''ادھر گدھا بہت مہنگا ہے اور ہاری غریب کی قوتِ خرید سے باہر۔ دوسرا گدھا وہ کدھر سے لائیں گا، تم خود سوچو سائیں۔''

''اگر ایسی بات ہے تو مرد کو خود گدھے کے ساتھ جتنا چاہیے۔ یہ تو ظلم ہے۔'' جمال نے کہا۔

### زنانہ سستا ہے

''سائیں جب عورت ہے تو مرد کیا واسطے جتے گا اور جو گدھا نہیں خرید سکتے وہ دوسری شادی کر لیتے ہیں۔ ایک بیوی گھر کا کام کرتی ہے۔ دوسری ہل کھینچتی ہے۔ کام کے بنا تو مانی کسی کو نہیں ملتی نا۔ پھر اس میں فائدہ بہت ہے۔ دوسری عورت جوان ہوتی ہے۔ ہل چلانے کے بعد وہ اپنے مرد کو بستر میں بھی خوش رکھتی ہے اور عورت اتنا نہیں کھاتی جتنا گدھا کھاتا ہے۔ اب کیا کرے گا جب پیسہ نہیں گریب کے پاس۔ ملک بہت گریب ہے اور وڈیرے کو بٹائی پوری دینی پڑتی ہے۔ پھر پولیس والا ہے، تپے دار ہے، مختیار کار ہے اور دوسرے افسر۔''

''اور تم بھی ان سے کچھ لیتے ہو گے میندرو۔''

''ہم ہاری سے کچھ نہیں لیتا سائیں۔ ہم صرف ہندو دکانداروں سے لیتا ہے۔ سالے بڑے امیر ہیں

''وہ بھی بہت کچھ لیتے ہیں۔''

''تو بس یہ سارے ملک کا رواج ہے۔ میں سمجھتا ہوں آپ پاکستان کے بہت خلاف ہیں۔ اس کے رواج پر اعتراض کرتے ہیں۔''

جیپ کو دیکھ کر گدھے کے آگے جتی عورت بھاگ گئی۔ ہل رُک گیا۔ جب جیپ چلی تو ہاری نے جمال کو ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔

## مٹھی کا راستہ

میرپور سے مٹھی کا راستہ بہت دلچسپ تھا۔ ریت کی بڑی بڑی دیواریں میل دو میل کے بعد سڑک کے آگے کھڑی ہو جاتی تھیں۔ ان کی کانٹے دار جھاڑیوں میں بکریاں چرتی تھیں۔ کہیں کہیں ٹوبوں اور ڈھالوں میں پچھلی برسات کا پانی کھڑا تھا جس کا رنگ ہلکا خاکی ہو چکا تھا۔ کناروں پر سفید اور ریتلے کیچڑ کی پیڑیاں جمی تھیں۔ یہ ٹوبے اور ڈھابیں وڈیروں کی ملکیت تھیں۔ ان کے اپنے جانور اور اپنے ہاری ان کا پانی پی سکتے تھے مگر کوئی راہگیر چلو بھر پانی نہ لے سکتا تھا۔ پانی کی جاگیرداری جمال نے بگڑاؤں کے صحرا میں بھی دیکھی تھی مگر وہاں کا پانی اتنا گندا نہ تھا۔

جیپ میں رکھے ہوئے گھڑے اب خالی ہو چکے تھے۔ جمال نے ان کو ایک ڈھاب میں سے بھروایا تو چوکیدار نے کچھ نہ کہا۔ وہ جمال کو کوئی افسر سمجھا تھا اور افسروں کا پانی صحرا میں بھی بند نہیں کیا جا سکتا۔

مٹھی رن کچھ کے حاشیے پر سندھ کا آخری آباد قصبہ ہے۔ اس کی ساری آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ جمال اب یہاں کی زندگی فلمبند کرنے آیا تھا۔

## صندلیں عورتیں

مٹھی کی عورتیں جمال کو بہت دلچسپ لگیں۔ وہ چولی نہ پہنتی تھیں۔ ٹخنوں سے اونچے پھولدار سرخ گھاگھروں کے اوپر وہ ایک دوپٹہ اوڑھ کر اپنے بدن کا ستر کرتی تھیں مگر ان کے بھرے ہوئے سانولے سینے چھپائے نہ چھپتے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ ان پر صندل کی لکڑی کے بنے ہوئے گیند رکھے ہوں۔

اجنبیوں کو دیکھ کر وہ لمبا گھونگھٹ نکال لیتی تھیں جن سے ان کے سانولے سینے اور کھل جاتے تھے۔ حیا کا تصور صرف ان کے چہروں تک محدود تھا۔ ستر پوشی ہی کے خیال سے کلائی سے کاندھے تک انہوں نے سفید مصالح کی منقش چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ پیٹ اور جوبن کا پردہ ان کے نزدیک اہم نہ تھا۔

مٹھی میں ایک کنواں بھی تھا جس سے پانی نکالنے کے لیے عورتوں کو ایک لمبا چرسہ کھینچنا پڑتا تھا، جو امیر تھے وہ چرسے کے آگے اونٹ جوت لیتے تھے مگر اس کنویں کا پانی کھاری تھا۔ پینے کے لیے مٹھی میں ایک گندا جوہڑ تھا جو میٹھا تھا۔ اس میں سے کسی کو بھی دو گھڑے سے زیادہ بھرنے کی اجازت نہ تھی۔



کنویں کے پاس جا کر جمال نے جیپ روک دی۔ عورتیں چرسہ کھینچ رہی تھیں۔ ناند کے اردگرد کھڑے پانی پر پرندے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

میندرو نے جیپ کو کینوس سے ڈھانپ دیا تاکہ اس کے اندر کسی کی نظر نہ جائے۔ کیمرہ ایک سوراخ میں فٹ کر لیا گیا تھا۔

پھر میندرو اکیلا جیپ سے باہر نکلا اور بونٹ اٹھا کر پرزوں کو چھیڑنے لگا۔ عورتوں کی طرف اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ انہوں نے گھونگھٹ کھینچ لیے تھے مگر تھوڑی دیر بعد یہ سوچ کر کہ جیپ میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے، وہ پانی کھینچنے اور گاگریں بھرنے میں مصروف ہو گئیں۔

میندرو کے اشارے پر جیپ کبھی آگے اور کبھی پیچھے سرکتی ہوئی کنویں کے پاس آ کر رک گئی۔ میندرو پرزوں کو گندی گالیاں دینے لگا۔

عورتوں نے کیمرے کی گھرر گھرر کی آواز سن لی تھی۔ انہیں پتہ لگ گیا تھا کہ ان کی تصویریں کھینچی جا رہی ہیں۔ دبے دبے، ہنسنے شرمانے جھکنے مڑنے اور ایک دوسری کو آگے پیچھے دھکیلنے کے سوا انہوں نے ایسی حرکت نہ کی جس سے پتہ چلے کہ ہمیں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔

جمال نے ان کے پانی کھینچنے کے تال میل میں کھچے ہوئے اور ڈھلکے ہوئے آنچل، سفید چوڑیوں میں چھپے ہوئے گول بازو، سانولے سلونے ہموار پیٹ اور ابھری ہوئی آدھی چھپی ہوئی چھاتیوں کی تصویریں اطمینان سے اتاریں۔ وہ کھڑی رہیں، بعض نے اور رک جانے کے خیال سے اپنی گاگریں دو دو بار بھریں۔

جمال کو فلم سازی کے دوران اتنا بھرپور تعاون کبھی نہ ملا تھا۔ اصل میں پیشہ ور ایکٹریس عورتیں نہیں ہوتیں ورنہ اپنے حسن کی نمائش میں عورتیں کوپن ہیگن سے مٹھی تک ایک جیسی ہوتی ہیں مگر سب کو گدھوں کے ساتھ جتنا پڑتا ہے۔

جمال کو مٹھی میں کوپن ہیگن جیسا کوئی واقعہ پیش نہ آیا مگر میندرو نے کہا ''سائیں اس کا انتظام بھی ہو سکتا ہے۔''

مٹھی اس قسم کے امکانات کے لیے بہت مشہور تھا۔ یہ ہندو ساہوکاروں کی بستی تھی جو سال بھر کراچی، حیدرآباد، سکھر اور اس سے آگے کابل اور تہران تک کاروبار کرتے تھے اور صرف برسات کے دو مہینے گھروں میں گزارتے تھے۔ دس مہینے مٹھی میں کوئی مرد نہ ہوتا تھا۔ وہ سونا ڈھونڈنے کے لیے پردیسوں کی خاک چھانتے تو پیچھے مسلمان وڈیرے اور افسران کے گھروں میں سیندھیں لگانے لگ جاتے۔

میندرو نے کہا ''اس ملک کا رواج ہے سائیں۔''

جوان وڈیرے، چھوٹے اہلکار ہرنوں اور تیتروں کے شکاری مٹھی کا نام سن کر ہونٹوں پر زبانیں پھیرنے لگ جاتے۔ بعض کی زبانیں کتوں سے بھی لمبی ہو جاتیں۔

وڈیرے ان کی عزت لوٹتے، ان کی توہین بھی کرتے اور یہ بھی اس ملک کا رواج تھا۔ سندھ کے بعض میروں اور کلہوڑوں کو سونف کی شراب پینے، امرد پرستی اور بھنگ کی ترنگ میں رہنے اور ہاریوں اور ساہوکاروں کی عورتوں کے استحصال کے سوا زندگی سے کوئی سروکار نہ ہوا۔

## سویا ہوا قصبہ

مٹھی ایک سویا ہوا قصبہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہمارا ملک اب پاکستان کہلاتا ہے مگر اس میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ لوگ ایوب خاں کو بادشاہ سمجھتے تھے۔ اس نے بھی میروں اور کلہوڑوں کی طرح ان کے لیے کچھ نہ کیا تھا۔ وہ اسی میں خوش تھے کہ ہم بادشاہ کی نگاہ میں نہیں ورنہ وہ بھی ہم سے سب کچھ چھین لیتا۔

دو میل کے فاصلے پر ریت کے ایک پہاڑ کے دامن میں کوہلی ہندوؤں کے پندرہ چھپر جمال کو بہت دلچسپ لگے۔ کوہلی نیچ ذات کے ہندو تھے جنہیں مٹھی کے ساہوکار اپنے قصبے کے اندر رہنے نہ دیتے تھے۔ انہوں نے ریت پر ڈنڈے گاڑ کر جھگیاں بنالی تھیں جن پر پھوس کی چھتیں تھیں مگر ان کے یہاں کرنے کو کوئی کام نہ تھا اور پینے کے پانی کی بھی کوئی صورت نہ تھی۔ مرد مٹھی میں جاکر محنت مزدوری کرتے۔ بعض اوقات انہیں دیہاڑی بھی نہ ملتی۔ ان کی عورتیں جھونپڑوں میں بیٹھی ان کی راہ تکتی رہتیں۔ بچے ریت پر لوٹ لوٹ کر جوان ہو جاتے تو خاک چھاننے لگ جاتے۔

کانٹے دار جھاڑیوں کے چھپروں میں لو آر پار چلتی۔ دھوپ سے کسی قدر بچاؤ کے باوجود گرمی سے جسم جھلستے رہتے۔ یہی اس ملک کا رواج تھا۔

کسی جھونپڑی میں ایک آدھ بکری بندھی ہوتی۔ جوہڑ سے ان کو کوئی پانی پینے نہ دیتا تھا کیونکہ وہ اونچی جاتی کے اچھوت ساہوکاروں کے پانی کو بھرشٹ کر سکتے تھے۔ انہیں کنویں کے کڑوے اور بدبودار پانی پر زندہ رہنا پڑتا جو اونچی جاتی کی ہندو عورتیں بڑی اونچائی سے ان کی گاگروں میں انڈیل دیتیں۔

## ایک ہی روٹی

جمال کو یہ گاؤں اگر اسے گاؤں کہا جا سکتا ہے تو بہت انوکھا لگا۔ اس روز سارے گاؤں میں کوئی مرد نہ تھا۔ جمال کی کیمرہ ٹیم کو دیکھ کر بچے ماؤں کی گودیوں میں چھپ گئے۔ عورتوں نے جمال کو افسر سمجھ کر گھونگھٹ کاڑھ لیے اور کسی ناگہانی کے لیے جو افسروں کے ساتھ آتی ہے، تیار ہو کر بیٹھ گئیں۔ انہیں پتہ نہیں تھا کہ کس کو آج رات کس کے بستر میں جانا ہے۔

''کون سا زنانہ مانگتا ہے۔'' میندرو نے جمال سے پوچھا ''یہ ہمارے ملک کا رواج ہے۔ بولو سائیں کون سی عورت چاہیے۔''

جمال کے کہنے پر میندرو اور جیپ کے ڈرائیور نے عورتوں کی تسلی کرا دی۔ انہوں نے کہا ''ہمارا افسر گریبوں کا دوست ہے۔ تمہارے لیے پانی کا بندوبست کرنے کے لیے اسلام آباد سے آیا ہے۔''



جمال جب ان کی خالی چاٹیوں میں ریت ڈال کر دودھ بلونے کے شاٹ لے چکا تو اس نے کہا ''ایک عورت اپنی بیٹی کی جوئیں نکالے اور ایک بچہ چنگیر میں سے روٹی کھائے۔''

''کیمرہ ریڈی۔'' اس نے کہا۔

مگر بچہ روٹی پر ٹوٹ ہی پڑا اور شاٹ ختم ہونے سے پہلے ہی چنگیر خالی ہو گئی۔

جمال نے ایک روٹی اور لانے کو کہا۔

عورتوں نے سر جھکا لیے اور کھسر پھسر کرنے لگیں۔

میندرو دانائی سے مسکرایا اور بولا ''چلو سائیں بہت کام ہو گیا۔ اس گاؤں میں آج ایک ہی روٹی تھی، کسی گھر میں دوسری نہیں۔''

واپسی کے سفر میں راستے کی کلفت دور کرنے کے خیال سے جمال نے پھر میندرو سے گدھے کے ساتھ جُتنے والی عورت کا ذکر چھیڑ دیا۔

میندرو بولا ''یہ تو کچھ بھی نہیں سائیں۔ ظلم مردوں پر ہوتا ہے۔''

''کیا ہوتا ہے مردوں سے؟''

''سب سے نہیں۔ ان سے جن کے زنانے وڈیرہ پسند کر لیتا ہے۔ خوبصورت عورت سے اِدھر کوئی شادی نہیں بناتا۔''

''کیوں نہیں بناتا؟''

''اس لیے کہ وڈیرہ چھین لے گا۔ پن میرے خیال سے اِدھر پنجاب میں بھی وڈیرے خوبصورت زنانے اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔ یہ ملک کا رواج ہے۔''

''کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔'' جمال بولا۔

''پن اِدھر بہت ظلم ہوتا ہے۔ زنانہ چھین کر وڈیرہ اس کے مالک کو خصی کروا دیتا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ بیچارہ مر بھی جاتا ہے۔''

''ارے یہ کیوں؟''

''اس خیال سے سائیں کہ پھر وہ اپنے زنانے کا پیچھا نہ کرے گا۔''

''پولیس کچھ نہیں کرتی اور پیر، فقیر، مولوی اور سیاستدان؟''

''پولیس میں مقدمہ درج کروانے کے پیسے کون دے۔ پھر حوالات جائے مار کھائے...... جو عقل والے ہیں وہ اپنا زنانہ خود ہی وڈیرے کے ڈیرے پر چھوڑ آتے ہیں۔ باقی سارے خود وڈیرے ہیں۔ پیر، فقیر، مولوی اور سیاستدان، وہ کہتے ہیں یہ تقدیر ہے۔ پن ہم کدھر جائیں گے گریب سندھی۔''

''جدھر غریب پنجابی، پٹھان اور بلوچی جائے گا اِدھر غریب سندھی کو بھی جانا چاہیے۔ زمین ... کی

مالک وہ ہیں جو ہل چلاتے ہیں۔ وڈیرے تو حرام خور ہیں۔'' جمال نے کہا۔

''سائیں تم تو کمیونسٹ ہو۔ غریب ایک ہوئیں گے تو اللہ کو ناراض نہیں کریں گے کیا؟ اللہ نے وڈیرے کو عزت دی ہے۔''

''نہیں یہ اللہ کی مرضی نہیں ہے۔''

''چھوڑو سائیں۔ تم پنجابی بڑے چالاک ہو۔ تم ہم گریب سندھیوں کو جوش دلاتے ہو کہ ہم وڈیرے سے لڑیں اور وہ ہماری خوبصورت زنانے بھی چھین لے اور ہمیں خصی بھی کر دے۔ سائیں تم نے اپر سندھ دیکھا ہے۔ اب لوئر سندھ بھی دیکھ لو۔ یہ مفت کا مال ہے۔ تمہیں کدھر زمین چاہیے۔ ہاری ہم لا کے دیں گے، ان سے کام کرواؤ۔ ان کے زنانیاں بھی کھاؤ۔''

## واپسی

جمال لاہور واپس پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ نذر محمد نے خاں صاحب سے فلم کی دوسری قسط وصول کر لی ہے اور ان دنوں وہ اپنے باوردی شوفر کے ساتھ عمدہ لباس میں سٹوڈیو سٹوڈیو اور دفتر دفتر پھرتا ہے۔ گاڑی اس نے رعنا کے شوہر سے ادھار لے لی تھی۔

نذر محمد کے خاندان کی ساری حسرتیں نکل رہی تھیں۔ ایک اور قسط کی وصولی کے بعد بینک پھر جگمگ جگمگ کرنے لگا تھا۔

جمال کے گھر میں ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ جب وہ شوٹنگ کر کے واپس آیا۔ نذر محمد نے اپنے گھر کے لیے جو فرنیچر خریدا تھا، اس کے بارے میں جمال کی بیوی سے اس نے بات بھی نہ کی۔

جمال کو بہت صدمہ ہوا۔ اتنا پیارا دوست اتنی حقیری رقم کی وجہ سے اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔

جمال فکر مند تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ نذر محمد اخراجات پر نظر ڈال لے، جو فلم کی شوٹنگ پر اُٹھے تھے۔

نذر محمد نے ایئر کنڈیشنڈ دفتر میں کاپی پر ایک ساہوکار کی سی نظر ڈالی اور طنزاً مسکرا دیا۔ مطلب یہ تھا کہ تم نے رقم غبن کر لی ہے۔ اب مجھے کیا دکھاتے ہو۔ اس پر بات کرنا فضول ہے۔

اس پر جمال نے کسی کے آگے آنکھ نہ جھپکی تھی، رو پڑا۔ نذر محمد نے کہا ''مگر مچھ کے آنسو میں نے بہت دیکھے ہیں۔''

مگر ابھی فلم کی شوٹنگ باقی تھی۔ بلوچستان کے صحراؤں کی فلمبندی کے بغیر فلم مکمل نہ ہو سکتی تھی۔ یہ بات نذر محمد بھی سمجھتا تھا۔ اس نے بڑا سخی بن کے پوچھا ''اب تمہیں اور کیا چاہیے۔ ٹھیک ٹھیک بتانا۔ میرے پاس ضائع کرنے کو اب کوئی پیسہ نہیں اور نہ فلم تمہارے عیش و آرام کا بوجھ اٹھا سکتی ہے۔''

جمال کے منہ پر اس ذلت کی وجہ سے چپ لگ گئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے بجٹ بتایا اور نذر محمد



## صحرا میں پانی

بلوچستان جمال کو بہت خوبصورت لگا۔ ایسے بھورے بے رنگ اور بے آبرو پہاڑ اس نے اس سے پہلے دیکھے نہ تھے۔ بے آبرو اس لیے کہ ان پر کوئی درخت کوئی سبزہ، کوئی پرندہ دکھائی نہ دیتا تھا نہ گاؤں نہ دریا۔

اس نے بڑی مشکل سے دو جیپیں حاصل کیں اور کوئٹہ میں صبح سویرے ناشتہ کر کے وہ چاغی کی طرف چل دیا۔ جہاں سے ایک کچی پکی سڑک دالبندین اور نوکنڈی سے ہو کر ایران کو جاتی تھی۔ شیعہ زائرین زیارات کے لیے اسی راستے سے جاتے تھے۔

جمال نے کھانے پینے کا بہت سا سامان خرید لیا۔ پنیر بسکٹ، مربے کی بوتلیں اور برفی۔ کیمرہ مین کا موڈ اچھا تھا۔ اس نے پنیر کا ڈبہ تو فوراً ہی کھول لیا، پھر وہ شور مچانے لگا ''چھری کہاں ہے۔ چھری کے بغیر کوئی پنیر کیسے کھائے۔ آپ چھری نہیں لائے تا کہ کوئی کچھ کھا ہی نہ سکے۔''

جمال اب اس کی بیہودگیوں کا عادی ہو چکا تھا۔ کیا فلم والے سبھی اسی قسم کے لوگ ہوتے ہیں؟ اس نے سوچا۔ بلاضرورت بھی پیٹ اور پیسے کی فکر۔ ازلی بھوکے بدلحاظ، ہوتے سوتے بھکاری۔

جمال نے اس فلم سے پہلے صحرا نہ دیکھے تھے اور وہ کہانی کا کوئی واضح تصور لے کر گھر سے نہیں نکلا تھا مگر بگڑاؤں، ڈاہر اور مٹھی کی شوٹنگ کے دوران اس نے صحراؤں میں انسانی رشتوں اور انسان اور فطرت کے مسلسل جدل کو مرکزی تھیم بنا لیا۔ وہ انسانوں، حیوانوں اور کیڑے مکوڑوں کی مشترکہ زندگی اور اس میں وحدت کو دریافت کرنا چاہتا تھا۔

سنگِ موسیٰ کے کالے کوئلہ سے پہاڑوں کے دامن میں کالی ہموار زمین پر پھیلی ہوئی سنہری ریت اسے بڑی دلکش لگی۔

بلوچستان کے فاصلے بہاولپور کے مقابلے میں بہت طویل تھے۔ یہاں تین برس سے بارش نہیں ہوئی تھی اور کہیں بھی پانی کی کوئی ڈھاب نہیں تھی مگر زمین کے نیچے ٹھنڈے پانی کی ندیاں بہتی تھیں۔ اوپر سے کھود کر کنویں بنائے جاتے ہیں اور ساری بستیاں ان کنوؤں کے اوپر آباد ہوتی ہیں۔

## پیاسے سانڈھے

پارٹی کا پانی راستے ہی میں ختم ہو گیا۔ بکریاں اِدھر اُدھر چرتی پھرتی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی بستی قریب ہی ہے مگر کس طرف، ریت کے ٹیلوں اور کالے پتھریلے پہاڑی سلسلوں میں کسی انسان کا کوئی وجود نہ تھا۔ جمال ان باتوں پر پریشان نہ ہوتا تھا اور اس کی لیڈری کا تقاضا بھی یہی تھا۔ حالات کو نارمل ظاہر کرنے کے خیال سے اس نے کہا ''جیپ روکو میں ذرا پیشاب کر لوں۔''

اس نے بے خیالی میں پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ اچانک دو موٹے موٹے بھورے سانڈے پیشاب کی دھار میں اچھلنے لگے۔ پھر ایک نے پیشاب کا ایک قطرہ پی لیا۔ جمال کو گھبرا کر پیچھے ہٹ جانا چاہیے

تھا مگر اسے سوچنے کا وقت ہی نہ ملا۔ اس عمل میں زیادہ سے زیادہ پانچ سیکنڈ لگے ہوں گے مگر کب اس کے پیشاب کے پانی کی خوشبو پھیلی۔ کب اسے سانڈوں نے سونگھا اور کب وہ اس کے اندر اپنے آپ کو سیراب کرنے کے لیے آن پہنچے۔ پانچ سیکنڈ میں کیا کیا ہو گیا!

ان سانڈوں نے پیشاب میں اپنا بدن تر کر کے نہ معلوم اپنی کتنی نسلیں محفوظ کر لی ہوں گی!

زندگی کے اسرار پر غور کرتا ہوا وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ واقعی حشرات الارض میں انسان سب سے کمزور صنف ہے!

## بلوچی گڈریا

ریت کے ٹیلے کے عقب سے اچانک ایک پختہ عمر کا بلوچی گڈریا نمودار ہوا جیسے وہ ریت میں سے نکل آیا ہو۔ اس کی داڑھی گھنی تھی۔ جسم مضبوط اور اس کے چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ تھی۔ اس نے کہا ”میرے ساتھ آؤ۔“

جیپ اور سامان کو چھوڑ کر سب اس کے پیچھے ہو لیے۔ چوری وہاں ہوتی ہے جہاں تہذیب ہوتی ہے۔ صحرا میں چوری نہیں ہوتی۔

کالے پہاڑ کے عقب میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی بوڑھے کی کل کائنات تھی۔ چھت زیادہ سے زیادہ پانچ فٹ کی ہو گی۔

جھونپڑی کے اندر اون کا بنا ہوا ایک قالین بچھا تھا۔ سب لوگ اس پر بیٹھ گئے۔ بوڑھا پچھلے دروازے سے غائب ہو گیا۔ دس منٹ کے بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چائے کی ایک چینک تھی اور کچھ پیالیاں۔

بوڑھے نے جو اردو، بلوچی اور فارسی کی ملی جلی زبان میں گفتگو کرتا تھا، کہا ”تم گرمی سے آئے ہو۔ پہلے چائے پی لو۔ پھر میں تمہیں پانی بھی پلاؤں گا۔“

چائے خوشبودار تھی۔

جمال نے پوچھا ”بابا تم یہ چائے کہاں سے لائے ہو؟“

اس نے کہا ”اس جھونپڑی کے ساتھ جو کانٹوں کا چھپر ہے، وہ میرا گھر ہے۔ میری بیوی بچے وہیں رہتے ہیں، یہ جھونپڑی ہمارا مہمان خانہ ہے۔“

”تم ماشاءاللہ اتنے دراز قد ہو مگر تم نے اس کی چھت اتنی نیچی کیوں رکھی ہے۔ تم تو اس میں سیدھے کھڑے بھی نہیں ہو سکتے۔“

”ہاں ہم اپنے گھروں میں بھی سیدھے کھڑے نہیں ہو سکتے۔“ اس نے دانائی سے کہا ”ہمیں گھروں میں بھی جھکنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ یہ زمین سردار کی ہے اور اس کا حکم ہے کہ ہم چھت نیچی رکھیں تا کہ



اس کی طرح کبھی سیدھے کھڑے نہ ہو سکیں۔ یہ ہمارا رواج ہے۔“

”کیا تم نہیں چاہتے کہ یہ زمین تمہاری ملکیت ہو اور تم بھی سیدھے کھڑے ہو سکو۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسی بات منہ سے بھی نہ نکالنی چاہیے۔ سردار کو پتہ لگ گیا تو ہم کو مروا دے گا۔“

”مگر تم کرتے کیا ہو بابا؟“

”سردار کی بکریاں چراتا ہوں، سردار کا دودھ پیتا ہوں، سردار کا کھانا کھاتا ہوں اور جدھر پانی ہوتا ہے ادھر وہ ہمیں رہنے کو جگہ بھی دے دیتا ہے۔ یہ سب کچھ سردار کا دیا ہے۔“

## صحرا میں آندھی

دالبندین میں انہیں صحرائی آندھی نے آ لیا۔ یہ بادِ سموم نہ تھی مگر ساربانوں نے اونٹوں کے نتھنوں پر ڈھاٹے باندھ دیئے۔ پگڑیوں کے شملوں سے اپنی آنکھیں ڈھانپ لیں اور ریت پر بیٹھ گئے۔ آن کی آن میں ریت کی تہیں جھونپڑیوں کی چھتوں پر جمنے لگیں۔ دن کے دس بجے تھے اور دالبندین میں ہر روز اسی وقت آندھی آتی تھی۔ جہاں کوئی ہوتا وہیں رُک جاتا۔

آندھی کا رنگ سنہرا تھا۔ دھوپ میں چمکتی ہوئی ریت کے موٹے موٹے ذرے سنہری ہی لگتے تھے۔ بیچ بیچ میں بیسیوں سبز، سرخ، گلابی، زرد اور نیلے گرد باد گھومتی ہوئی لمبی چمنیوں کی صورت اٹھتے رکتے اور اچانک مختلف سمتوں میں غائب ہو جاتے۔ ہوا کا رخ یک سمتی نہ تھا۔ دالبندین میں آندھی چاروں طرف چلتی ہے۔ ایک لمحے میں مشرق اور مغرب کے بہاؤ کی لہریں آپس میں ٹکرا کر گھومنے لگتیں اور نئے نئے گرد باد جنم لینے لگتے۔

زمین پر حدِ نظر تک کالی بجری بچھی ہوئی تھی جس پر ہلال کی شکل کے ہزاروں ریتلے ٹیلے لیٹے ہوئے تھے۔ جیسے کسی ماہر فنکار کے پرکار نے نصف دائرے بنائے ہوں۔

یہ ہلال تقریباً پچاس گز لمبے تھے۔ جھونکا آتا تو ایک ہلالی نصف دائرے سے ریت اُڑ کر کچھ دور جا کر ہلال ہی کی صورت میں زمین پر بیٹھ جاتی اور ایک نیا ہلال جنم لینے لگتا کیونکہ اڑتی ہوئی ریت کسی طرح ایک اقلیدی ترتیب کے ساتھ پہلی ریت کے اوپر بیٹھ جاتی۔

کچھ شاٹ جمال نے اس آندھی کے بھی بنائے مگر کیمرہ مین نے بڑے نخرے دکھائے۔ کبھی وہ اپنی آنکھیں ملنے لگتا۔ کبھی کیمرے کے لینز کو ہاتھوں سے ڈھانپنے لگتا اور فقرہ بازی کرتا سوا الگ۔ ہمیں اب اندھا کیا جا رہا ہے۔ ہمیں پیاسا مارا جا رہا ہے، ہمیں ذلیل کیا جا رہا ہے۔ وغیرہ۔

## افق کہاں گیا

اگلے روز جب وہ سنہری ریت ان کے سوئے ہوئے پرسکون نصف دائروں میں سے نکل کر

نوکنڈی پہنچے تو شام ہونے والی تھی۔ زمین سے آسمان تک ایک گدلی چادر نے فضا کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ یہاں اُفق نہیں تھا کیونکہ اُفق زمین اور آسمان کے درمیان حدِ فصیل ہوتا ہے اور درختوں کے ذریعے بھوری زمین کو نیلے آسمان سے الگ کرتا ہے مگر نوکنڈی میں حدِ نظر تک کوئی درخت نہیں تھا اور لگتا تھا کہ زمین آسمان کی طرف اٹھ گئی ہے یا آسمان تھک کر زمین میں گھل گیا ہے۔ یہ بھی گمان ہوتا تھا کہ دو چار میل کے فاصلے پر زمین ختم ہو کر کسی گہرائی میں گم ہو گئی ہے۔ زمین کی گولائی اور تسلسل کا تصور نوکنڈی میں بہت مشکل تھا۔

نوکنڈی سے قریب ترین پانی کا چشمہ چالیس میل کی دوری پر تھا۔ میٹھے پانی کی ایک زیرِ زمین ندی سے ریل کا ایک انجن روانہ اپنے ٹینک میں پانی بھر کر لاتا تو لوگ زیادہ تر عورتیں اور بچے اپنے اپنے کنستر گھڑے اور ایران جانے والے مسافروں کے پھینکے ہوئے ٹین کے ڈبے بھر کر گھروں کو لے جاتے۔ پانی اور نمک کے علاوہ نوکنڈی کے لوگوں کو باہر سے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔

جس روز جمال نوکنڈی پہنچا اس روز ریل کا انجن پانی لے کر نہ آیا تھا اور یہ بات نوکنڈی کے لوگوں کو پریشان نہ کرتی تھی۔ وہ پیاسے بھی رات گزار لینے کے عادی تھے۔ کیمرہ مین نے بہت شور مچایا، ہمیں لاہور سے لا کر جنگل میں پیاسا مارا جا رہا ہے۔ یہاں جنگلی بستے ہیں اور حکومت یزید کی ہے۔ جب اس نے سنا کہ نوکنڈی میں کھانے کو بھی ایک جنگلی گھاس کی جڑوں کے سوا کچھ نہ ملے گا تو وہ غصے سے پاگل ہو گیا اور جمال سے جھگڑا کرنے لگا کہ وہ لاہور سے مرغیاں کیوں نہ لایا۔ یہاں گھی، نمک، مرچ باورچی کچھ بھی نہیں۔ ایسا ظالم پروڈیوسر میں نے زندگی بھر نہ دیکھا۔

جمال نے مقامی تحصیلدار سے پانی، آٹا، گھی اور باورچی مانگ لیا جو اس نے اس کی مسافری پر رحم کر کے مفت ہی دے دیا۔ اس کے ہاں سے مونگ کی دال بھی مل گئی جو تھوڑی تھی۔ جمال نے اپنے لیے گھاس کی جڑیں ہی پکوا لیں۔

گرمی کے خوف سے صبح سویرے اٹھ کر افق پر طلوعِ آفتاب اور عجیب و غریب گرگٹوں، کیڑوں اور ریت کے ٹیلوں، کالے پتھروں، رنگین گردبادوں، سرابوں اور چٹانوں کی فلمیں تصویریں لیتے ہوئے جمال اور اس کی ٹیم کوہِ سلطان پہنچ گئی۔ نوکنڈی سے کوئی تیس میل دور۔

## الف لیلہ کے کھنڈر

ایک قدیم نالے کے سوکھے ہوئے پاٹ میں جیپ چلاتے ہوئے جسے خشک ہوئے ہزاروں سال ہو چکے ہوں گے، وہ کوہِ سلطان پر جا پہنچے۔ یہاں وقت کا تعین نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہاں کی چٹانیں اور چہرے صدیوں سے اسی طرح چلے آئے تھے۔ زندگی غاروں سے ابھی ابھی نکلی تھی مگر نوکنڈی میں تو کوئی غار بھی نہ تھا۔ قبائلی معاشرتی نظام اور دولت کی ڈاکوؤں والی تقسیم ابھی اپنی ابتدائی شکل میں تھی۔ نہ



پیداواری آلات بدلے تھے اور نہ پیداواری وسائل میں کوئی تبدیلی آئی تھی۔ یہاں صدیاں کان لپیٹ کر اسی طرح نکل گئی تھیں۔

کوہِ سلطان میں گندھک کی کانیں تھیں مگر دور سے جمال کو پہاڑوں کا یہ سلسلہ الف لیلہ کا ایک شہر لگا جو یکا یک کسی جن نے جادو کے زور سے منجمد کر دیا ہو۔ کیا اس کے اندر کوئی شہزادی بھی کسی چھپر کٹ میں محوِ خواب ہو گی؟ کیا کوئی قوی ہیکل زنگی غلام تیغ برہنہ لیے فصیل پر پہریدار ہو گا؟

کروڑوں برس پہلے کوہِ سلطان ایک آتش فشاں سلسلہ تھا۔ پھر لاوا ٹھنڈا ہو گیا اور لاکھوں سال کے عمل نے عجیب و غریب شکلیں اختیار کر لی تھیں۔ اس میں ہموار فصیلیں، چوکور اور ہشت پہلو برج لمبے اونچے مینار، گنبد، محرابیں، دروازے اور ستون متشکل ہوئے۔ ان کی گولائیاں بتاتی تھیں کہ ان کی شکل پذیری میں وقت بوڑھا ہو گیا ہو گا۔ لاکھوں سالوں کے عمل کے بعد یہ موم کا پگھلا ہوا شہر نمودار ہوا۔ گندھک اور تانبے کے زیرِ زمین ذخیروں نے جو آتش فشاں کا لازمہ ہوتے ہیں، اس میں طرح طرح کے رنگ بھر دیئے۔ بنیادی طور پر گہرے مگر اس کے اندر بسنتی، سبز، گہرے نیلے سرخ جوگیا، گلابی، زعفرانی اور براؤن دھاریاں کھچ گئی تھیں۔ کہیں بڑی بڑی شفاف چٹانیں قرینے سے کاٹ کر دھری تھیں۔ کہیں رنگا رنگ سنگریزے دمکتے تھے۔ نالے کا ایک کنارہ گہرے نیلے رنگ کا تھا۔ دوسرا دودھیا سفید۔ ان رنگین کناروں کے بیچوں بیچ جمال کی جیپ چلی۔ ایک چھوٹا سا ہرن پہلے اس عجیب سی سرکتی اور شور مچاتی ہوئی چیز کو حیرت سے دیکھتا رہا۔ پھر چوکڑی بھر کر رنگوں کے اس طلسم خانے میں غائب ہو گیا۔ یہ کون لوگ تھے جو اللہ کی زمین میں فساد کرنے آئے تھے؟

زاویے اس قدر خوبصورت اور متنوع تھے کہ جمال کے لیے شاٹ لینا مشکل ہو گیا۔ ایک ایک فٹ پر منظر اور موڈ بدلتا تھا۔

گندھک کی کانوں پر پنجاب کا ایک ٹھیکیدار کراچی کے سرمائے اور بلوچی مزدوروں کی محنت سے قادرِ مطلق تھا۔ بلوچی مزدور کوہِ سلطان کے کڑوے پانی کے عادی تھے۔ تانبے کا زہران کے بدنوں میں آہستہ آہستہ سرایت کر رہا تھا مگر وہ جن میں ابھی کس بل تھا گندھک کے بسنتی پتھر کندھوں پر لاد لاد کر ٹھیکیدار کے ٹرک میں ڈال رہے تھے جن کو تانبا بالآخر بستر پر ڈال دیتا تھا۔ وہ کسی علاج کے بغیر ہی سو جاتے تھے۔ ان پر گندھک کی کچی سلیں رکھ دی جاتی تھیں۔ یہی ان کا قبرستان بھی تھا۔

ٹھیکیدار کے آدمی کیمرہ ٹیم کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے سب کو ٹھنڈا اور میٹھا پانی پلایا اور فلم کی شوٹنگ میں ہر طرح کی امداد کی۔ جمال کی خاطر انہوں نے بلوچی مزدوروں سے پہاڑ کھدوایا اور ان کے سروں پر بڑے بڑے پیلے پتھر رکھوا کر انہیں ٹرکوں کی طرف بھگوایا تاکہ فلم کے شاٹ اچھے بنیں۔ ٹھیکیدار کی مشہوری ہو اور دنیا کو بلوچی مزدوروں کے روزگار کے بارے میں اطمینان ہو جائے۔

اس طرح اس روز ٹھیکیدار کی پیداوار بھی پہلے سے بہت بڑھ گئی۔

کوئی دو بجے یکدم کالے کالے بادل اٹھے اور اندھیرا چھا گیا پھر ہلکی ہلکی بوندیاں برسنے لگیں اور ہوا میں خنکی پیدا ہوگئی۔ یہ عجیب بات تھی کیونکہ بلوچستان میں تین برس سے بارش نہ ہوئی تھی مگر ٹھیکیدار نے کہا، یہ عجیب بات نہیں۔ یہاں ہر روز اللہ کی رحمت ہو جاتی ہے۔ ہر روز ٹھیک دو بجے بادل آتے ہیں اور ہمیں کام بند کرنا پڑتا ہے مگر ہم دن بہت جلد شروع کرتے ہیں۔ کوئی چار بجے جب رات ابھی آدھی ہوتی ہے، تاکہ ہمارے کاروبار میں خلل نہ پڑے۔ رات کو مطلع پھر صاف ہو جاتا ہے۔ صبح چلچلاتی دھوپ نکل آتی ہے۔ کوہِ سلطان کا بلوچستان سے کوئی تعلق نہیں، یہ موسم اس کا اپنا موسم ہے۔

ٹھیکیدار کوہِ سلطان میں تانبے کی کثرت سے بہت پریشان تھا کیونکہ گندھک سے اس کی علیحدگی پر بڑا خرچ آتا تھا۔

جمال نے کہا ''تانبا تو بڑی قیمتی دھات ہے۔ آپ اس کو الگ کر کے فروخت کیوں نہیں کرتے؟''

ٹھیکیدار نے جواب دیا ''ہمارے پاس آدمی نہیں۔ ہمارا پورا کنبہ گندھک کے کاروبار میں مصروف ہے اور اس میں بہت منافع ہے۔ ہمیں کیا پڑی ہے کہ اب تانبے کی مصیبت بھی مول لے لیں۔ کیوں نہیں حکومت کسی غیر ملکی فرم کو اس کا ٹھیکہ دے دیتی!''

کوہِ سلطان میں پتھر ٹن ٹن بجتے تھے۔ ان میں لوہا، مینگنیز اور سیسہ ملے ہوئے تھے مگر حکومت پاکستان کو ان دھاتوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اب کون اسلام آباد اور مری سے اتنی دور ان زہریلے پہاڑوں میں مارا مارا پھرے۔ رہے بلوچی تو وہ مزدوری کے سوا کسی قابل نہ تھے۔

## پانی والا انجن

بارش کے باوجود جمال نے اپنا کام کسی طرح مکمل کر لیا تھا۔ اگرچہ ابھی شوٹنگ کے لائق بہت کچھ باقی تھا مگر اخراجات کی کمی ہو رہی تھی اور کیمرہ ٹیم کھانے کے بارے میں بہت جھگڑا کر رہی تھی۔ اس لیے جمال بمشکل شام تک نوکنڈی پہنچ سکا۔ پورے کا پورا قصبہ ریلوے سٹیشن پر کھڑا تھا کیونکہ اس روز سٹیم انجن اپنے ٹینک میں پانی بھر کر لایا تھا اور عورتیں بچے خوشی سے پاگل ہو رہے تھے۔

کچھ شاٹ جمال نے ان کے بھی بنا لیے مگر سب سے دلچسپ منظر ان چڑیوں کا تھا جو انجن کے نل سے ٹپکتے ہوئے پانی کے قطرے پی رہی تھیں۔ ان کو بھی عورتیں بار بار اڑا رہی تھیں کیونکہ پانی کو جمع کرنے کے خیال سے عورتوں نے ان کے نیچے بھی کنستر لگا رکھے تھے۔ یہ شاٹ جمال لے نہ سکا کیونکہ عورتوں کا ہجوم اکٹھا تھا اور وہ کیمرے کو موقع نہ دیتی تھیں۔

''کیسے جنگلی لوگ ہیں۔'' کیمرہ مین نے کیمرہ پیک کرتے ہوئے کہا۔



ابھی وقت تھا اور وہ شام تک کوئٹہ پہنچ سکتے تھے۔ اس لیے وہ جلدی سے دالبندین کو نکلے۔ کھانے کا سامان انہوں نے جیپ ہی میں رکھ لیا۔ دھوپ تیز تھی اور پانی بھی ختم ہو رہا تھا۔

دالبندین میں آندھی گزر چکی تھی اور اب دھوپ سے ریت کے نصف دائرے آگ کی طرح تپ رہے تھے۔ جمال نے سوچا کہ ان ریتلے ہلالوں کی کچھ اور تصویریں لے لوں مگر کیمرہ مین نے کہا، اتنی گرم ریت میں کون اُترے۔

جمال نے کہا، میں ٹھنڈی کرتا ہوں اور وہ اتر کر ایک ٹیلے پر گدھے کی طرح لیٹ لیٹ کر ریت ٹھنڈی کرنے لگا۔ کیمرہ مین بے شرمی سے انتظار کرتا رہا کہ کب جمال ریت ٹھنڈی کرے اور وہ اس پر پاؤں رکھے۔ جوں توں کام ختم ہوا تو وہ کوئٹہ کو چلے۔ جہاں سے کیمرہ ٹیم کو جہاز پکڑنا تھا اور جمال کو گاڑی لینی تھی۔

راستے میں کچھ دیر وہ میر صاحب کی سنگِ مرمر کی کانوں میں رُکے۔ وہاں بجلی بھی تھی۔ میر صاحب کے آدمی نے انہیں کھانا بھی کھلایا اور ٹھنڈا میٹھا پانی بھی پلایا۔ جمال نے پوچھا میر صاحب یہ مزدور بیچارے کہاں سے پانی پیتے ہوں گے۔

## سنگِ مرمر کے کوارٹرز

''یہ مزدور بہت خوشحال ہیں۔ یہ دنیا کے واحد مزدور ہیں جو سنگِ مرمر کے کوارٹروں رہتے ہیں۔'' وہ ہنس کر بولا۔

واقعی یہ سچ تھا۔ یہ واحد مزدور تھے جو سنگِ مرمر کے کوارٹروں میں رہتے تھے۔

کیونکہ یہ پہاڑ سارے کا سارا رنگین سنگِ مرمر کا تھا جس کی شہر میں اور دساور میں بڑی مانگ تھی۔ آس پاس کوئی بستی نہ تھی۔ اس لیے دور دراز کے دیہات سے مزدوروں کو بھرتی کر کے لایا جاتا اور مہینوں ان کو یہیں رکھا جاتا کہ وہ پہاڑ کاٹیں اور اونکس کی سلیں بناتے رہیں۔ ان کے رہنے کے لیے کوارٹر بھی یہیں تھے اور یہاں سنگِ مرمر کے سوا کوئی پتھر ملتا نہ تھا۔

مزدوروں کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ ان کے زخمی پیر پر ٹاٹ کے ٹکڑے لپیٹے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں سے خون بہتا تھا۔

جمال نے کہا ''مکران کی حالت بہت خراب ہے۔''

''ہم ان کو باقاعدہ مزدوری دیتے ہیں۔ دوسرے سردار تو اپنے آدمی سوات سے منگواتے ہیں۔''

''سوات سے کیوں منگواتے ہیں؟''

''اس لیے کہ یہ ایک قبائلی سوسائٹی ہے۔ ان کو کام ملے گا تو ٹریڈ یونین بنائیں گے۔ سردار کی حکم عدولی کریں گے۔ معاشرے کو درہم برہم کریں گے۔ یہاں وہ بہت سکون سے زندگی گزار رہے ہیں۔''

## خاتمہ بالخیر

خاں صاحب یہ سن کر تو بہت خوش ہوئے کہ فلم بالآخر ختم ہوگئی ہے مگر نذر محمد کے اللے تللوں اور بدلے ہوئے اندازِ گفتگو سے انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ خود میری عزت خطرے میں ہے۔ ابھی فلم کا پازیٹو تیار ہونا ہے، سٹوڈیو کے بل ادا کرنے ہیں اور ایڈیٹنگ کا خرچہ ہے۔ مگر نذر محمد سے کچھ وصول کرنا مشکل ہے۔

جمال نے حسابات کی کاپی خاں صاحب کے آگے رکھ دی۔ خاں صاحب اصل حقیقت کو سمجھ گئے۔ انہوں نے نذر محمد کو بتائے بغیر اسے گھر بلا لیا۔ جب جمال بھی وہیں تھا۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی جب نذر محمد نے دیکھ لیا کہ جمال بھی وہاں ہے تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ پاگل کتے کی طرح غرانے لگا۔ خاں صاحب کو اس نے دھمکی دی کہ سارے کاغذات میرے پاس ہیں۔ میرا آپ کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

جمال کی زبان گنگ ہوگئی۔ خاں صاحب کا رنگ اڑ گیا۔ ان کو اس انڈر گراؤنڈ کمیونسٹ سے ایسی دیدہ دلیری کی توقع نہ تھی مگر وہ ایک سی ایس پی افسر تھے۔ اگلے روز انہوں نے کنٹریکٹ کینسل کر دیا اور سٹوڈیو کا بل ادا کر کے فلم قبضے میں لے لی۔ اب جمال کا بھی اس سے کوئی تعلق نہ رہا۔

جمال بہت شرمندہ تھا۔ خاں صاحب اس سے بات کرنے کے بھی روادار نہ تھے۔

جمال نے کہا ''بے شک آپ نے پیسے مجھے دیئے تھے مگر میں نے آپ کے سامنے سارے پیسے نذر محمد کی جھولی میں ڈال دیئے تھے۔ بینک اور چیک اسی کے پاس تھے۔''

''بکواس کرتے ہو۔'' وہ بولے ''وہ پیسے میں نے تمہیں دیئے تھے۔ اسے دینے ہوتے تو اسی کو دیتا۔''

نذر محمد اب خاں صاحب اور جمال دونوں سے آزاد ہو چکا تھا۔ نئی قسط اس کے قبضے میں تھی۔ اس میں سے اس نے کچھ رقم بیوی بچوں کی آرزوؤں پر لگا دی جو بچ رہا تھا اس میں سے بہاولپور میں اس مکان کی قیمت ادا کر دی جو اسے الاٹ ہوا تھا۔

خاں صاحب مقدمہ پولیس کو دینے والے تھے کہ نذر محمد نے اپنا نیا ہیٹ ان کے گھر جا کر ان کے قدموں میں ڈال دیا اور آنسو تو وہ جب چاہے نکال سکتا تھا۔

سٹوڈیو کے بل ادا ہو چکے تھے۔ فلم جمال کے قبضے سے نکل چکی تھی اور اس کی اپنی فلم اسی طرح ڈبوں میں پڑی تھی۔ اسے والد اور رعنا بہن کی رقم واپس کرنی تھی اور خود زندہ رہنا تھا۔ ادھر اس کی بہن پریشان تھی کہ میرے میاں کو پیسے کی سخت ضرورت ہے۔ صحرا کی ڈاکومنٹری میں سے جو پچیس ہزار تمہیں ملیں گے، وہ ہمیں دے دو۔ اس نے یہ نہ سوچا کہ جمال اگرچہ ناکام ہے مگر کام تو وہ کر ہی رہا ہے۔ چنانچہ جب اسے پچیس ہزار



ملے تو رعنا پورا چیک لے گئی۔

خاں صاحب کی فلم ایک مشہور اور نالائق ڈائریکٹر نے کنٹری لگا کر مکمل کی جس پر جمال کا نام بھی نہیں تھا۔ جمال نے اسے صرف میوزک پر تعمیر کیا تھا۔ اس نے اس کی ساری سکیم تبدیل کر دی۔ اب کہا گیا دیکھو ایوب خاں نے دس برس میں سنگِ مرمر کے پہاڑ بنا دیئے اور ریت کے ٹیلوں کو نئے چاند کی شکل دے دی۔

جمال پھر اکیلا اور بے ہنر ہو کر گھر بیٹھ گیا جس میں اب ایسا کوئی بھی نہ تھا جو دکھ درد بانٹتا، سب سچے تھے۔ فقط وہ جھوٹا تھا۔

# باب32

جمال تو ہر طرح سے خالی ہو کر لوٹا تھا۔ اس کی سخت محنت، اس کی مشقت، اس کی قوت برداشت اس کے کسی کام نہ آئی۔ اس کی فلم بکی نہ تھی اور وہ عضوِ معطل کی طرح بے حس و حرکت تھا۔ اس کی پیاری بیوی اس سے سیدھے منہ بات نہ کرتی تھی۔ اس کے ماں باپ اس کی شکل دیکھنا نہ چاہتے تھے۔ اس کے دوست راستہ کاٹ جاتے تھے۔

مگر باہر زندگی ابلنے لگی تھی۔ تاریخ نے غرور کا کلاہ پہن لیا تھا۔ پاکستان نے تیوری چڑھالی تھی۔

## نیادور

سڑکوں پر آنسو گیس کا کڑوا دھواں پھیلنے لگا۔ گولی برسنے لگی۔ خون بہنے لگا۔ جنازے اٹھنے لگے۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں نے تاشقند میں جنگ ہار دی تھی اور ایک نوجوان سندھی مہتابیاں جلا رہا تھا جن میں سے ستارے ٹوٹتے تھے۔

نوجوان طالب علم، مزدور، محنت کش اور درمیانہ طبقے کے دانشور مشعلیں بن گئے۔ دھرتی میں سے شعلے نکلنے لگے۔

جمال کے دامن میں اپنے ارادوں کی راکھ کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ وہ ہجوم میں کھو کر اپنے آپ کو تلاش کرنے لگا۔ انقلاب سے اس کے زندہ رہنے کی آس کو تقویت ملتی تھی۔ جلوس میں وہ آگے آگے رہتا مگر اسے کوئی گولی نہ لگی۔ اس کا سر کسی لاٹھی نے نہ توڑا۔ کسی ہتھکڑی نے اس کی کلائی بھی نہ پکڑی۔ وہ کسی گنتی میں نہ آیا۔

تاشقند کو ایوب خاں نے اپنی سلامتی کی ضمانت سمجھا تھا مگر تاشقند ہی میں اس کی قبر بنی۔ اس کے پروپیگنڈے اور جھوٹے اردو پریس نے مشہور کر دیا تھا کہ ہمیں ہندوستان پر فتح حاصل ہوئی ہے اور اس کے ثبوت میں انفرادی بہادری اور دلاوری کی داستانیں لکھی جاتی تھیں مگر یہ کسی نے ثابت نہ کیا کہ ہم نے ہندوستان کو شکست دی ہے۔ اسی لیے آج تک وارڈ یپارٹمنٹ نے کوئی تجزیہ برائے استفادہ خاص و عام شائع



ذوالفقار علی بھٹو یہی کہتا تھا مگر وہ کہتا تھا دھوکا ہمیں ہمارے حاکموں نے دیا ہے۔ اس ملک کا مستقبل سوشلزم سے وابستہ ہے۔ گو اس نے اس کے ساتھ اسلامی کا لاحقہ لگا کر اس کی حقانیت ختم کر دی تھی مگر سوشلزم کو لوگ انصاف، عدل، اجتماعی مساوات اور ترقی کا راستہ سمجھتے تھے۔ اس لیے اس کے پیچھے جو کل کا لڑکا تھا جوق در جوق صفیں باندھنے لگے۔ ہندوستان نے کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ کہنا شروع کر دیا تھا۔ ان حالات میں دونوں ملکوں میں صلح نہ ہو سکتی تھی۔ امریکہ نے روس کو بیچ میں ڈالا تو مولوی بھی نہ بولے۔ مولانا مودودی نے کہا تھا کہ سوشلزم سے بڑا گناہ شیطان بھی ایجاد نہیں کر سکتا مگر جب امریکہ کا اشارہ دیکھا کہ وہ روس کے ذریعے سمجھوتہ کروانا چاہتا ہے تو وہ بھی چپ رہے۔

اور تاشقند میں ایوب نے لکھ کر دے دیا کہ ہم آئندہ کشمیر پر کبھی جنگ نہ کریں گے اور معاملہ پرامن مذاکرات کے ذریعے طے کریں گے۔ یہ پرامن مذاکرات سن 2003ء تک تو شروع نہ ہوئے۔

اسی رات الطاف گوہر بھاگا بھاگا ذوالفقار علی بھٹو کے سونے کے کمرے میں گیا اور کہنے لگا ”باسٹرڈ کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔“

بھٹو نے کہا ”کون سے باسٹرڈ کا؟ ایوب خاں کا یا لال بہادر شاستری کا۔“

اسی قسم کی باتوں نے بھٹو کی لو اونچی کر دی مگر اس کی سکیورٹی کونسل کی تقریریں بھی یہ ثابت کرتی تھیں کہ پاکستان کو ایک لیڈر مل گیا ہے۔

تحریک اور اس کے لیڈر کا رشتہ ہمیشہ جدلیاتی ہوتا ہے۔ اس بات کو بھٹو نہ اس وقت سمجھا نہ بعد میں۔ جب اسے پھانسی ملی۔

قاضی نذرالاسلام مشرقی پاکستان کا بہت بڑا شاعر جو ابھی زندہ تھا، چپ ہو گیا۔ وہ صرف ظلم سے نفرت کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں سوج گئے اور فالج نے اس کے ذہن کو کالی نیند سلا دیا۔ اس کو کسی بات کا پتہ نہ تھا۔ اس کے اندر نجانے کیسی کیسی چکیاں چلتی ہوں گی کیونکہ آزادی کے بعد بھی بنگالیوں کو روشنی کی کوئی کرن نصیب نہ ہوئی تھی۔ پاکستان کے مغرور جاگیردار حکمران اور ان کی محافظ بیوروکریسی ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی اور ان کے اخبارات بنگالیوں کو آدھے ہندو مشہور کرتے تھے اور خود پوری مسلمانی کے دعویدار تھے اور یہی سیاستدانوں کی سیاست تھی کہ ملک میں اسلامی نظام لاؤ، اس کی کوئی بھی عملی تصویر پیش نہ کر سکتا تھا جو آج کل کے حالات کا مقابلہ کر سکے مگر اتنی بات واضح تھی کہ اسلامی نظام کا مقصد انگریز کی دی ہوئی زمینداریوں اور سرمایہ دارانہ نظام کے لامحدود حقِ ملکیت کے تقدس پر مرجانا یا مار ڈالنا ہے۔ چونکہ مشرقی پاکستان کی آبادی زیادہ تھی اور وہ جاگیرداری کے خلاف بھی تھا اسی لیے اس کی مخالفت بلکہ اس کی علیحدگی ضروری تھی۔

مگر ابھی تو انہیں محض بدنام کیا جا رہا تھا۔ ان کے استاد ہندو ہیں، وہ پاکستان کے خلاف ہیں، وہ

اردو سے نفرت کرتے ہیں اور اس مہم میں مغربی پاکستان کے اسلام پسند اخبارات اور لیڈر پیش پیش تھے مگر حقیقت کچھ اور بھی تھی۔ بنگالی اور ان کے لیڈر ابھرتے ہوئے چھوٹی بورژاوی کے نمائندے تھے۔ مغربی پاکستان کے جاگیردار نہیں چاہتے تھے کہ اقتدار ریاست ان کے حوالے ہو جائے اور جاگیرداری کو ضعف پہنچے۔

## ایسا بھی ہوتا ہے

جس فلم کی تکمیل میں چار سال لگ جائیں، جس کا کوئی گاہک نہ ہو، جس کی ہوا قطعی طور پر خراب ہو۔ ایک دن وہ بک جاتی ہے اور یہ پاکستانی فلمی صنعت کا عجوبہ ہے۔

کراچی میں لاوارث فلموں کے گاہک بہت تھے۔ ان کے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہوتا۔ وہ ڈسٹری بیوٹرز سیٹھوں کے پرانے ملازمین ہوتے تھے جن کی کراچی اور سندھ کے سینما مالکان سے جان پہچان ہوتی تھی۔

وہ سال میں دو تین چکر لاہور کے لگاتے تھے اور پتہ لگاتے تھے کہ کون سا پروڈیوسر نا امید ہو کر خودکشی کی سوچ رہا ہے۔

پہلے کچھ ڈسٹری بیوٹروں کے گرگوں نے جنہیں وہ اپنے ساتھ تھرڈ کلاس میں کراچی سے ساتھ لائے تھے، جمال کی فلم کے ٹرائل دیکھے اور سخت بیزاری کا اظہار کر کے چلے گئے کہ یہ تو ڈبہ ہے، نہیں چلے گی۔ یہ تو موت کا پھندا ہے جو خریدے گا لٹک جائے گا۔ آپ اسے چھوڑ کر کوئی دوسری فلم شروع کریں۔ کسی ہندوستانی فلم کا سکرپٹ ہم سے لے لیں۔

بعض ٹرائل کے دوران بات کیے بغیر اٹھ کر چلے گئے۔ جب جمال کا حوصلہ بالکل ٹوٹ چکا تو وہ آدمی آیا جو فلم خریدنا چاہتا تھا۔

اس نے چکنی چپڑی باتیں بنائیں۔ جمال کو اس کی حماقتوں سے ایک مرتبہ اور آگاہ کیا۔ کانوں کو ہاتھ لگوائے کہ دوبارہ میں ایسی غلطی کبھی نہیں کروں گا۔ پھر کہا، آپ بہت شریف آدمی ہیں۔ مجھے آپ کے بال بچوں کا بھی خیال ہے۔ آپ کی فلم موت کا پھندا تو ہے مگر میں شاید بچ نکلوں۔ آپ کے لیے میرے پاس دس ہزار کا چیک ہے جو ایک مہینے کے بعد کیش ہوگا۔ اس عرصے میں معلوم کروں گا کہ آپ نے یہ فلم کسی اور کو تو نہیں بیچ رکھی۔ لاہور کے لوگ بے ایمان بہت ہوتے ہیں اور تجارت میں ہوشیار رہنا چاہیے۔ آپ کو حق ہے کہ میرے بارے میں تحقیقات کر لیں۔ دس ہزار پیشگی پر میں آپ کی فلم کراچی اور سندھ کے لیے خریدتا ہوں۔ اصل قیمت ایک لاکھ پچیس ہزار جو آپ کو اس وقت ملے گی، جب آپ اس کے پرنٹ ہمارے حوالے کر دیں گے۔ ہم کاروبار میں غلطی کرنے کے قائل نہیں اور اگرچہ آپ ایک شریف آدمی ہیں، مگر ممکن ہے آپ ہمارے دس ہزار روپے کھا کر بیٹھ جائیں۔ ممکن ہے آپ ڈھاکہ میں فلم پہلے چلا دیں اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں۔ ممکن ہے آپ گلگت کے علاقے میں فروخت کر دیں اور ہمارا خانہ خراب ہو جائے۔ اس لیے آپ لکھ دیں کہ دس ہزار پیشگی پر آپ نے اپنی فلم کے عالمی حقوق ہمارے نام لکھ دیئے۔ ہمارا اللہ مالک ہے۔ فلم سارے کا سارا



اندھیرے کا دھندا ہے مگر آپ کا کسی طرح بھلا ہو جائے ہمارا چاہے خانہ خراب ہو جائے۔

جمال نے پڑھے بغیر کنٹریکٹ پر دستخط کر دیئے۔ سارا دن سٹوڈیو کے لوگ اس کو مبارکبادیں دیتے اور مٹھائی طلب کرتے رہے۔

اگلے مہینے چیک بھی کیش ہو گیا اور جمال نے شوٹنگ بھی مکمل کر لی۔

حسینہ کے آگے اس نے جھوٹ بولا۔ اسے اپنے رول کا پتہ ہی نہ تھا کہ وہ سمجھ نہ سکی کہ فلم مکمل ہو رہی ہے۔ اس لیے مجھے کنٹریکٹ کی باقی رقم کے بغیر شوٹنگ نہ کرنی چاہیے۔ اس کے دو تین ہزار باقی تھے۔ شیتل کا تھوڑا سا کام باقی تھا مگر وہ رات کی کمائی میں مصروف تھی۔ جمال نے اس کی جگہ ایک ایکسٹرا لڑکی کھڑی کر کے پیچھے سے اس کے شاٹ لے لیے۔ نوردین ایکسٹرا سپلائر اس کے بہت کام آیا۔

مرد ایکٹروں سے اس نے صاف کہہ دیا کہ میرے پاس کچھ نہیں۔ تمہارے پیسے میں بعد میں ادا کر دوں گا۔ انہوں نے مہربانی کر دی۔ ان کے رول اور طرح کے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ فلم کسی طرح مکمل ہو جائے مگر فلم پر ابھی بہت سے اخراجات باقی تھے۔

دوسری قسط کے لیے اس نے کراچی کے ڈسٹری بیوٹر کو خط لکھ دیا مگر اس نے چپ سادھ لی۔ دو ماہ کے بعد اس کا کراچی سے ٹیلی فون آیا کہ دوسری قسط کے لیے آپ کراچی آ کر بات کریں۔

## رو کڑا واپس کرو

کراچی میں اس کے ڈسٹری بیوٹر نے کہا، میرا حصہ دار اس سودے سے خوش نہیں اس لیے آپ ہمارے دس ہزار روپے واپس کر دیں کیونکہ از روئے معاہدہ آپ بروقت فلم مکمل نہیں کر سکے۔

جمال نے اب احتجاج کرنا اور حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے کہا ''بھائی صاف کہو کہ تم کیا چاہتے ہو۔''

''ہمارا روکڑا واپس کرو۔'' وہ بولا ''آپ کی فلم سالا ڈبہ ہے ایک دم۔ نہیں چلے گی۔''

''روکڑا تو میرے پاس نہیں ہے۔ آپ کو پتہ ہے۔''

''فلم مکمل ہو چکی ہے۔ اسے کہیں اور بیچ دو۔''

''آپ کنٹریکٹ منسوخ کر کے چھٹی دے دیں تو میں کسی سے بات کروں۔''

''آپ پہلے روکڑا لائیں پھر ہم اسے بکوا دیں گے۔ یہ ہمارا ذمہ کیونکہ اگرچہ آپ کو فلم بنانی نہیں آتی مگر آپ آدمی شریف ہیں اس لیے......''

''آپ فلم بکوا کر اپنا روکڑا وصول کر لیں۔'' جمال نے کہا۔

''ٹھیک مگر ہمارا کمیشن کیا ہوگا؟''

''آپ کا کمیشن؟ کیسا کمیشن؟''

''آپ کو پتہ ہے آپ کی فلم

بدلے ہمیں کچھ ملنا چاہیے۔ پھر آپ نے دو ماہ ہمارا روپیہ استعمال کیا، کیا کہ نہیں؟''

جمال بے بس تھا۔ اس کی فلم کچھ کم قیمت پر ایک اور ڈسٹری بیوٹر نے خرید لی۔ پہلی پارٹی نے دس ہزار اصل اور دس ہزار کمیشن اس سے وصول کر لیا اور یہ کراچی کا ایک کاروباری طریقہ تھا۔ دراصل وہ خود محض ایک دلال تھا اور اسی طرح پھنسے ہوئے پروڈیوسروں کی جیبیں کاٹتا تھا۔

نئے ڈسٹری بیوٹر نے جمال کی قیمت گھٹانے کے علاوہ اپنے نقصانات کی تلافی کی شرط بھی لکھوالی اور عالمی حقوق اس نے بھی گروی رکھ لیے۔

لاہور کے ڈسٹری بیوٹر نے یہ جان کر کہ کراچی میں فلم کا سودا ہو گیا ہے، پنجاب کے سینما والوں سے ایڈوانس لے کر جمال کو تھوڑی سی رقم دے دی اور باقی پیسے جیب میں ڈال لیے۔

ڈھاکہ کے دلال نے کہا ''ڈھاکے میں تو اردو فلم چلتی ہی نہیں مگر آپ بہت شریف آدمی ہیں۔ پیسہ میرے پاس نہیں مگر میں آپ کی فلم چلا کر تھوڑی سی کمیشن پر ساری رقم آپ کو دے دوں گا۔ ہم بنگالی اتنے بے ایمان نہیں ہوتے جتنے پنجابی ہوتے ہیں۔''

جمال کی فلم پورے پاکستان میں بک چکی تو لوگ جمال کی کاروباری ذہانت کی داد دینے لگے جس نے کچرا بیچ کر دام کھرے لیے تھے۔

بیک گراؤنڈ میوزک ڈائریکٹر کے پیسے باقی تھے۔ جمال نے تین سازندے بلا کر خود ہی بیک گراؤنڈ میوزک ریکارڈ کروا لیا کیونکہ وہ اس کو مزید پیسے نہ دے سکتا تھا۔ اس سے جمال کی قابلیت کی دھوم مچ گئی کیونکہ میوزک ترتیب دینے کی جرأت آج تک کسی بڑے سے بڑے ڈائریکٹر کو بھی نہ ہوئی تھی۔

اس کی فلم کی ہوا یکدم بہتر ہو گئی اور اس کے مقابل اپنی فلمیں چلانے والے سوچ میں پڑ گئے کہ کہیں ہمارے تختے ہی نہ الٹ جائیں۔

عین وقت پر کراچی کے ڈسٹری بیوٹر کا آدمی روتا پیٹتا لاہور آیا کہ میرے مالک کا خانہ خراب ہو گیا ہے۔ وہ طے شدہ رقم ادا نہیں کر سکتا کیونکہ اس نے سالی کا زیور گروی رکھ کر آپ کو روکڑا دیا تھا اور اب اس کا خاوند اسے طلاق دینے کی سوچ رہا ہے، اس لیے آپ لاہور ہی میں فلم ریلیز کرنے کی کوشش کریں۔ سیٹھ صاحب کو دل کا دورہ پڑا ہوا ہے اور وہ ہسپتال میں ہیں، جناح ہسپتال میں......

لاہور کے ڈسٹری بیوٹر نے کہا ''میں پیسوں کا بندوبست نہیں کر سکا۔ اب جہاں آپ نے اتنی ہمت کی ہے وہاں ایک چھپن ہزار سٹوڈیو بل کا اور انتظام کر لیں۔ دو چار دن بعد پیسہ برسنے لگے گا۔''

پھر وہ بھتیجے کی شادی کے لیے راولپنڈی چلا گیا۔

اور ابھی جمال کو فلم کی نمائش کے اشتہارات کے لیے رقم درکار تھی۔

جمال نے اپنی رعنا بہن کو ساری بپتا سنادی تو اس نے رو پیٹ کر روپے جمع کر دیئے کیونکہ اس نے



ہمیشہ جمال کا ساتھ دیا تھا اور دو چار ہی دن کے بعد روپیہ برسنے والا تھا۔

## دونوں کا حاصل خانہ خرابی

ریلیز کے دن جمال پریشان نہیں تھا۔ اس کو پتہ تھا کہ فلم انوکھی ہے، ضرور چلے گی۔

مگر اس کو پتہ نہیں تھا کہ فلم کے تماشائی انوکھی فلموں کو پسند نہیں کرتے۔

تجربہ کار ڈسٹری بیوٹر کوئی خطرہ مول نہیں لیتے۔ وہ پہلے شو عموماً اپنے آدمیوں سے بھر دیتے ہیں تاکہ اس کی تعریف ہو جائے۔

جمال کے ڈسٹری بیوٹر کا کچھ لگتا ہی نہ تھا۔ اس لیے جمال اپنی فلم کی رپورٹ لینے کے لیے خود تھرڈ کلاس میں جا کر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔

فلم شروع ہوئی مگر ڈاکوؤں کے ساتھ مقابلہ کرنے، ماں باپ کے سامنے نماز پڑھنے اور ان کی آنکھ بچا کر نیم عریاں ناچ کرنے والی لڑکی کہیں نظر نہ آئی۔ لغو حرکتیں کرنے والے مسخرے بھی نہ آئے۔ ہوش اڑا دینے والے مکالمے بھی نہ آئے جن کی آواز کان پھاڑ دے اور اس پر طرہ روشن آرا بیگم کا گوڑ ملہار اور منی پوری کتھک بھارت ناٹیم اور شوٹا نڈو کے بھاؤ۔

کچھ لوگ فوراً ہی اٹھ کر نکل گئے۔ کچھ لوگ جو زیادہ باحیا تھے وہ ایک دوسری قسم کا ناچ دیکھ کر اٹھ گئے جس میں لڑکی کا جسم پوری طرح ڈھکا ہوا تھا۔ دھن بولوں سے عاری اور صرف موسیقی پر مرتب تھی مگر اس میں لڑکی لذت بھرے قہقہے اور چیخیں مارتی اور مستی میں ڈولتی ناچتی تھی۔

یہ ناچ اپنی اثر انگیزی میں بے مثل تھا۔ اسے دیکھ کر ایک نیک خاتون نے جسے ذومعنی فقروں پر کبھی اعتراض نہ ہوا منہ پر برقعہ ڈال لیا حالانکہ تصویر میں کوئی عریانی نہ تھی۔ اسے جمال نے اپنے لیے بہت بڑی داد جانا۔ تعجب ہے کہ روزانہ گھٹیا فلمیں دیکھنے والی برقعہ پوش خاتون جنسی طور پر اتنی حساس نکلی۔

اس ناچ پر تھرڈ کلاس نے زبردست تالیاں پیٹیں۔

اس کے بعد کے مناظر دیکھ کر لوگ کسمسانے لگے۔ پھر انہوں نے سیٹیاں بجانی شروع کر دیں اور پھر وہ چیخنے، گالیاں دینے اور کتے کی آوازیں نکالنے لگے۔ فلم کا مرکزی کردار ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جسے ایک جوان لڑکی سے عشق ہو جاتا ہے اور وہ نیند کی حالت میں اس کے بستر کی طرف چلتا ہے۔ یہ بوڑھا کردار لوگوں کو سخت ناگوار گزرا حالانکہ اس نے بداخلاقی کی کوئی حرکت نہ کی تھی۔ لوگوں کو یہ بات برداشت نہ ہوئی کہ کوئی ادھیڑ عمر کا آدمی کسی نوخیز حسینہ سے عشق کرے۔ چاہے لاشعوری طور پر کرے۔ لوگ جمال کو ماں بہن کی گالیاں دینے لگے۔ ان کی گندی گالیوں سے ہال گونجنے لگا۔ اگر انہیں پتہ ہوتا کہ جمال پاس ہی کھڑا ہے تو وہ اس کی تکہ بوٹی کر ڈالتے۔ لاہور کے لوگ بہت بے تکلف ہوتے ہیں۔

جمال کھڑا رہا۔ جب کتھک بھارت ناٹیم منی پوری کی باری آئی اور روشن آرا بیگم کی

چراغ روشن کیے تو کچھ اور لوگ جمال کو گالیاں دیتے ہوئے ہال سے اٹھ گئے کہ یہ کیا بنایا ہے ماں کا سر؟

ہم کیا یہاں ہندوؤں کے ناچ دیکھنے کے لیے آئے ہیں؟

جمال بھونچکارہ گیا۔ شو ختم ہوا تو ڈسٹری بیوٹر نے جس کا ایک دھیلہ بھی نہ لگا تھا، کہا ''بہتر ہے کہ تم یہاں سے غائب ہو جاؤ ورنہ لوگ تم کو ماریں گے۔'' اس کے چہرے پر ایک زہریلی سی مسکراہٹ تھی مگر جمال وہیں کھڑا رہا۔ وہ دوسرے اور تیسرے شو میں بھی اپنا انجام دیکھنا چاہتا تھا۔

مگر دوسرے شو میں جب وہ سینما کے لاؤنج میں کھڑا تھا۔ کچھ لوگ جو فلم دیکھنے آ رہے تھے، ان میں سے ایک نے دوسرے کو بے تکلفی سے گالی دے کر کہا ''یہ فلم خاص الخاص ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے تمیز چاہیے۔''

مگر اس سے جمال کی ڈھارس نہ بندھی۔ یہاں معاملہ آرٹ کا نہیں تھا، تجارت کا تھا اور تجارتی طور پر جمال تباہ ہو چکا تھا۔ سب کہہ رہے تھے فلم ڈبہ ہے، ڈسٹری بیوٹر تباہ ہو گیا مگر اس کا تو کچھ لگا ہی نہ تھا۔ جمال سے کسی نے بھی ہمدردی نہ کی۔

رات کو ڈسٹری بیوٹر نے فلم کے ایسے حصے کٹوانے شروع کر دیے جو اس کے خیال میں لوگوں کو ناپسند تھے۔ اس سے کہانی کا تسلسل خراب ہو گیا۔ اب کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔

اگلے روز جمال ڈسٹری بیوٹر کے دفتر گیا تو سب نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ کوئی اس کو فلم کی آمدنی کا حساب نہ بتاتا تھا۔

اس کی جیب میں اس روز فقط سات روپے تھے اور گھر میں کچھ بھی نہ تھا۔ روپیہ برسا نہ تھا۔ بادل آئے تھے مگر برسے بن گزر گئے تھے۔

فلم ناکام ہو کر بھی ہفتوں چلی۔ روپیہ ڈسٹری بیوٹر کی جیب میں آتا رہا مگر اب وہ چاہتا تھا کہ جمال اب دفتر نہ آئے۔ وہ کہتا تھا کہ سینما والوں نے تمہیں دیکھ لیا تو پیسے روک لیں گے۔ پانچ دن کے بعد اس نے اخبارات میں اشتہار دینا بھی بند کر دیا۔ اب پنجاب میں کسی کو پتہ نہ تھا کہ فلم چل رہی ہے یا نہیں اور چل رہی ہے تو کہاں۔ ڈسٹری بیوٹر نے کہا، فلم پٹ چکی ہے۔ اس پر مزید خرچہ ڈالنا حماقت ہے۔

جمال ڈسٹری بیوٹر کے دفتر جاتا تھا تاکہ اسے آمدنی کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ زیادہ وقت وہ سینما میں گزارتا۔ کبھی کھڑکی کے قریب کبھی گیٹ کے پاس۔ منیجر کے پاس جانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ وہ جمال کو فلم کی آمدنی کے بارے میں کچھ بتانے پر تیار نہ تھا مگر جمال دیکھتا تھا کہ ہر شو پر تھوڑی ہی دیر میں ہاؤس فل کا بورڈ لگ جاتا ہے اور اسے گمان ہوتا کہ شاید میری فلم فیل نہیں ہوئی مگر اس کا ڈسٹری بیوٹر اسے ذلیل کرتا حالانکہ اس نے فلم مفت لی تھی۔ اس کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ زیادہ وقت نیچے بازار میں کھڑا رہتا۔ جب چھوٹے شہر کا کوئی سینما والا فلم خریدنے کے لیے آتا تو وہ اس سے آدھی رقم کھڑے کھڑے جیب میں ڈال لیتا اور باقی آدھی رقم کا اوپر



جمال نے ڈسٹری بیوٹر کو بتایا کہ ایک ٹولی نے یہ بھی کہا کہ یہ فلم ادب سے دیکھنی چاہیے۔ حالانکہ اس میں کوئی پڑھا لکھا آدمی بھی نظر نہیں آتا تھا۔ مطلب یہ کہ میری کہانی تو عام آدمیوں کی سمجھ میں آ جاتی ہے۔

وہ بولا ''عام آدمی میں عقل نہیں ہوتی، ان کو کیا پتہ۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ کی فلم کسی کی سمجھ میں آتی ہی نہیں۔ آپ بہت لائق آدمی ہیں اور آپ جیسے لائق آدمیوں کی انڈسٹری کو ضرورت نہیں۔''

جمال بالکل مایوس ہو گیا۔ اس کی فلم ابھی تک ہر جگہ ہاؤس فل چل رہی تھی مگر ڈسٹری بیوٹر نے کہہ دیا تھا کہ اب دفتر آنے کی آپ کو ضرورت نہیں کیونکہ آپ کی فلم فیل ہو چکی ہے۔ میرے اخراجات ہی پورے ہو جائیں تو بہت ہیں (جو ہوئے ہی نہیں تھے) وہ دل شکستہ ہو کر گھر میں پڑا تھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

## دروازے پر دستک

جمال نے دروازہ کھولا تو نوارد نے پوچھا ''جمال صاحب آپ ہی ہیں؟''

''جی ہاں۔ حکم۔''

''جی میں نور سینما کا منیجر ہوں۔ بڑی مشکل سے آپ کا گھر ملا ہے۔''

''آیئے اندر آیئے۔'' جمال نے کہا۔

''جی نہیں۔'' وہ بولا۔ ''میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ یہ آپ نے کیا بنایا ہے؟ میری سمجھ سے تو باہر ہے یہ فلم جو آپ نے انڈسٹری کا وقت ضائع کرنے کے لیے بنائی۔''

جمال نے معذرت کی اور کہا ''آئندہ ایسی غلطی ہونے کا کوئی امکان نہیں جناب۔ آپ خفا نہ ہوں۔''

''میں خفا نہیں ہوں جی، حیران ہوں۔ میں واقعی یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے کیا بنایا ہے۔ آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ آپ کو تو پتہ ہوگا۔''

''جی مجھے بھی پتہ نہیں۔'' جمال نے جواب دیا۔

وہ بولا ''میرے پوچھنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک میاں بیوی گزشتہ دس روز سے باقاعدہ فلم کا آخری شو دیکھنے کے لیے آ رہے ہیں۔ کچھ تو اس فلم میں ہوگا۔ معلوم نہیں، وہ کون حرامزادے ہیں؟''

''جی شاید انہیں اس فلم میں کچھ نظر آ گیا ہو۔ آپ انہی سے پوچھ لیتے۔ میں ان کو نہیں جانتا۔''

وہ بولا ''آج تیسرے شو پر گیلری خالی تھی۔ ایک وہی جوڑا آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ ایسے بے وقوف کہاں ملتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا، آج سے تمہارا ٹکٹ معاف۔ آپ بہت شریف آدمی ہیں جی کاش کہ فلم بنانے سے پہلے ہم سے مشورہ کر لیتے۔ ویسے جی آپ نے بنایا کیا ہے؟''

پنجاب میں فلم فیل ہو جانے کے بعد ڈھاکہ کے دلال نے پرنٹ لے لیے۔ وہ کہتا تھا جلدی کرو

ورنہ شاید ڈھاکہ کا ڈسٹری بیوٹر صاف انکار کردے۔ ایک پیسہ لیے بغیر اس نے پرنٹ حوالے کر دیے۔ ڈھاکہ سے نمٹ کر جمال کراچی کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

کراچی کے ڈسٹری بیوٹر کو پھر دل کا دورہ پڑ گیا۔ اس کی سالی کو پھر طلاق کی دھمکیاں مل رہی تھیں اور اس کی بیوی کچھ کھا کر سو رہنے کی باتیں کر رہی تھی۔ معاہدہ کی رو سے اسے سوا لاکھ روپیہ جمال کو ادا کرنا تھا مگر بیچارے کی زندگی خطرے میں تھی اور اس کا گھر تباہ ہو رہا تھا۔ جمال نے اس کے آدمی کو پرنٹ دے دیئے کہ اگلے ہفتے آمدنی شروع ہو جائے گی۔

جمال کے اپنے سات روپے کب کے ختم ہو چکے تھے اور دس روپے کبھی بیس روپے اس کا لاہور کا ڈسٹری بیوٹر اس کو سارا دن بٹھانے کے بعد دے دیتا تھا جس سے اس کے گھر دال پک جاتی تھی۔

## کراچی میں

فلم ریلیز کرنے کے لیے اس کا کراچی جانا ضروری تھا تاکہ وہ اپنی رقم موقع پر وصول کر سکے۔

کراچی میں ڈسٹری بیوٹر نے اس کی بڑی عزت کی اور اسے کہا "ہر چند کہ فلم بیکار ہے مگر میں نے اچھے اچھے سینما بک کر لیے ہیں۔ آپ کو جو نقصان لاہور میں ہوا ہے، امید ہے اس کی تلافی یہاں ہو جائے گی۔"

کراچی کے سینما والے اپنی روزانہ آمدنی کا حساب کھلم کھلا بھیجتے تھے۔ پانچ روز میں ڈسٹری بیوٹر کے اخراجات پورے ہو گئے۔ جمال کو کچھ تسلی ہو گئی۔

مگر اب ڈسٹری بیوٹر نے دفتر آنا چھوڑ دیا تھا۔ جمال سارا سارا دن اس کے انتظار میں بیٹھا رہتا۔ شام کو کسی وقت وہ بہت برے موڈ میں ملتا اور کہتا "صبح بات کریں گے۔ صبح کہتا حساب ہم مہینے کے بعد کرتے ہیں۔ آپ کیوں میرا سر کھاتے ہیں۔"

"مگر مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے آغا صاحب۔"

"وہ تو مجھے بھی ہے۔"

"فی الحال مجھے کچھ دے دیں علی الحساب۔"

"آپ اپنی بوٹی کے لیے میرا بکرا تو نہ کاٹیں۔" آغا صاحب چڑ کر بولے "ہم روز روز پیسے دینے لگیں تو کر چکے بزنس!"

مہینہ گزر گیا پھر ڈیڑھ مہینہ...... جمال سمجھ گیا کہ آغا صاحب مجھے کچھ نہ دیں گے۔ اب اس کی آرزو تھی کہ مجھے واپسی کے لیے ریل کا کرایہ ہی مل جائے۔ کہاں کا لاکھ اور کہاں کا سوا لاکھ۔

جمال کے پیٹ میں السر ہو چکے تھے۔ اس کو رات کو نیند نہ آتی تھی۔ اس کے لیے پیدل چلنا بھی مشکل تھا مگر وہ میلوں چل کر آغا صاحب کے دفتر پہنچتا اور شام تک ان کا انتظار کر کے بھوکا پیاسا واپس آ جاتا۔



رہی تھی۔ جمال اپنی شرافت کی گٹھڑی اور پیٹ کے پھوڑے بغل میں دبائے لاہور آ پہنچا۔

ڈاکٹر کہتے ہیں پیٹ کا پھوڑا غم سے ہوتا ہے مگر جمال کو غم کا احساس کہاں تھا۔ وہ تو سُن ہو چکا تھا۔

## ڈھاکے سے محبت نامہ

لاہور پہنچتے ہی جمال کی بیوی نے ڈھاکے کے ایماندار ڈسٹری بیوٹر کے دو خط اور ایک تار اس کے سامنے رکھ دیا۔

لکھا تھا کہ تمہاری فلم کا ایک ناچ ڈھاکے کے سنسر بورڈ نے فحاشی کی ترغیب کے قانون کے تحت ممنوع قرار دیا ہے۔ از روئے معاہدہ تم فلم کو مکمل حالت میں میرے حوالے کرنے کے پابند ہو۔ تم نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس لیے تم فوراً ڈھاکہ آ کر اس ناچ کو سنسر سے پاس کراؤ ورنہ میں تم سے ہرجانہ وصول کروں گا۔

تار میں ہرجانے کی رقم درج تھی۔ ایک لاکھ روپیہ کیونکہ اس کی پبلسٹی پر اتنی ہی رقم خرچ ہو گئی تھی۔

جمال کو پتہ تھا کہ ڈھاکہ کے سنسر بورڈ کا چیئرمین ڈسٹری بیوٹر کا رشتے دار ہے۔ اس نے اعتراض خود کروایا تھا تاکہ جمال کی رقم اسے ادا کرنی نہ پڑے۔

جمال خاموش ہو گیا۔ اس کی بیوی نے بھی اس سے کوئی سوال نہ کیا۔ وہ اسی پر خوش تھی کہ اسے صرف پیٹ میں السر ہی ہوا ہے۔ دل اس کا سلامت ہے۔ رات کو وہ اسے بچوں کی طرح تسلیاں دیتی رہی۔ دونوں میاں بیوی ساری دنیا میں اکیلے رہ گئے تھے۔ جمال کے والدین اس کی صورت دیکھنا نہ چاہتے تھے اور اس کی رعنا بہن جو اس پر جان چھڑکتی تھی، وہ بھی ناراض تھی۔

## آخری گیت

صبح سویرے ہی لاہور کے ڈسٹری بیوٹر کا آدمی انکم ٹیکس والوں کا چٹھہ لے آیا۔ ایک ہفتے کی مہلت کے بعد اسے اپنے کل اخراجات، وسائل، سرمایہ کاری، آمد خرچ دستاویزی ثبوت کے ساتھ کہ جس رقم سے تم نے فلم بنائی اس پر انکم ٹیکس دیا جا چکا تھا۔ معاہدات کی تصدیق شدہ نقول، رسیدات، ادا شدہ اور غیر ادا شدہ بلوں کی نقول، ان بلوں کی تفصیل جو ابھی وصول نہیں ہوئے تھے اور دیگر دستاویزات جن سے جمال کے کاروبار کے قانونی تحفظات اور جواز ثابت ہوں۔ اس کے علاوہ مستقل ملازمین کی فہرست اور ان کی تنخواہوں کے گوشوارے وغیرہ وغیرہ اسے بحضور اسسٹنٹ انکم ٹیکس افسر صاحب بہادر بالمقابل جنرل پوسٹ آفس لاہور صبح ساڑھے سات بجے اصالتاً یا وکالتاً پیش کرنے کا حکم تھا ورنہ......

اس حکم نامے کو دیکھ کر جمال ہنس پڑا۔ اب کسی بات سے بھی کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ اس کے تمام رشتہ داروں نے اس سے تعلقات منقطع کر لیے تھے۔ اس کو جذباتی چرکے بھی لگے تھے۔ اس کی مالی بے کسی اور

ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے سب کچھ بھول جانا چاہا تھا مگر وہ بات بھولتی نہیں جسے کوئی بھلانے کی کوشش کرے۔ بعض زخم سل جاتے ہیں، بھرتے کبھی نہیں۔

مگر جمال میں شرمندگی کا احساس باقی تھا۔ اس نے اپنے پیاروں کو مایوس کیا تھا۔ اگر اس کا گوشت کسی کے کام آسکتا تو وہ اپنی بوٹیاں کاٹ کر دے دیتا۔ وہ واقعی ایک شریف آدمی تھا۔ سالم الو کا پٹھا۔ سر سے پاؤں تک گدھا۔ اس سے ڈسٹری بیوٹروں نے ساری فلم بالکل مفت ہتھیا لی تھی۔ ایک پیسہ بھی نہ دیا تھا۔ ایسوں کو کوئی رشتہ دار کیسے برداشت کرے۔

جمال کو یقین ہو چکا تھا کہ میں ایک بے ہنر آدمی ہوں۔ کچھ بھی نہیں جانتا۔ اس میں کسی سے بات کرنے کی ہمت نہ رہی۔ دوستوں سے ملنا تو اس کا کب کا چھوٹ چکا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ زندہ کیسے رہے۔

فلم اور رشتہ داروں سے چھوٹ کر جمال کا بدن ہلکا پھلکا ہو گیا۔ اس کے لیے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ بال بچوں کا پیٹ کیسے بھرے۔

کسی زمانے میں وہ ایک عمدہ اخبار نویس سمجھا جاتا تھا مگر اب اس کی ذہنی حالت ایسی تھی کہ خط بھی نہ لکھ سکے مگر مولانا کے اخبار میں جس پر حکومت نے قبضہ کر لیا تھا اور اس کا مزاج بدل گیا تھا، ابھی تک کچھ لوگ اسے پہچانتے تھے۔ وہ اسے کوئی نصیحت بھی نہ کرتے تھے۔ ہمدردی بھی نہیں جتاتے تھے۔ جمال نے وہاں جانا شروع کر دیا۔

## کون سے پانچ سو روپے

اسی اخبار میں میر صاحب بھی کام کرتے تھے جن سے جمال نے پانچ سو روپے قرض لیے تھے مگر وہ اسے بروقت واپس نہ کر سکا تھا اور وہ اس پر سخت شرمندہ تھا۔

میر صاحب نے اسے سیڑھیوں میں دیکھ لیا۔ اپنے کمرے میں لے گئے اور بولے میں اپنا کام ایک نظر اور دیکھ لوں، پھر دریا پر چلتے ہیں۔ آج میرا جی کشتی رانی کو چاہتا ہے۔

دریا پر جا کر میر صاحب نے کچھ ریوڑیاں، پکوڑے اور ملوک خریدے۔ جمال نے کہا ''میر یار میں تمہارے وہ پانچ سو روپے واپس نہیں کر سکا۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' میر نے لاپروائی سے جواب دیا ''وہ روپے میرے نہیں تھے، تمہارے تھے۔''

''میرے نہیں تھے، تم نے خود چیک کاٹ کر مجھے دیا تھا۔'' جمال بولا۔

''وہ میرے نہیں تھے، تمہارے تھے۔ میرے پاس فالتو تھے۔ مجھے ان کی ضرورت نہ تھی تمہیں ضرورت تھی اس لیے وہ تمہارے تھے۔ میں نے چیک کاٹ کر ضرور دیا تھا مگر روپے کسی کے بھی نہیں ہوتے۔ روپے اس کے ہوتے ہیں جس کو ان کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''خدا کے لیے اتنے بڑے صوفی نہ بنو۔''



''میں صوفی نہیں، مارکسی آدمی ہوں مگر تم علم کو عمل سے الگ سمجھتے ہو۔''

''علم پر بھی مجھے عبور نہیں میر یار۔''

''علم تمہارے پاس ہے مگر اس سے تمہاری سوچ نہیں بدلی۔ علم سماجی شعور سے زیادہ کچھ نہیں۔ سماجی شعور نئے راستے نہیں نکال سکتا تو بیکار ہے۔''

اس نے کشتی چلاتے ہوئے سویٹر اتار دیا۔

''میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔'' جمال بولا۔

''سیدھی بات ہے۔ فالتو روپیہ محنت کی قدر زائد ہوتا ہے۔ بشرطیکہ پیداواری محنت تخلیقی ہو یعنی اشیاء کی قدر میں اضافہ کرے۔''

''یہ تو میں نے مان لیا، مگر یہ جو پانچ سو روپے تم نے مجھے دیئے تھے، تمہاری محنت کی قدر زائد تھے۔ میری محنت کا معاوضہ نہیں تھے۔''

''تم نے محنت تو کی ہے زندگی میں یا نہیں کی؟ بھئی ابھی تم نے فلم بنائی ہے۔ اس سے پہلے تم اخبار کا سادہ کاغذ سیاہ کر کے اس کی قیمت میں اضافہ کرتے تھے۔ تمہاری محنت کی قدر زائد تمہیں نہیں ملی۔ انہیں ملی جنہوں نے فلم کی تخلیق میں ذاتی طور پر کوئی حصہ نہ ڈالا مگر وہی سب کچھ کھا پی گئے۔ یہ میں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔''

''سمجھ گیا مگر اس بات کا تمہارے پانچ سو روپوں سے کیا تعلق؟''

''یہ بھی اس نظام کی خرابی ہے۔ بعض کو اپنی محنت کے عوض ضرورت سے زیادہ مل جاتا ہے۔ روپیہ تم نے استعمال کر لیا، تمہارا تھا اسی لیے۔''

جمال خاموش ہو گیا۔ اس کا دل چاہا کہ میں دریا میں چھلانگ مار دوں مگر پھر اسے خیال آیا کہ پانی بہت ٹھنڈا ہو گا۔

''میر یار زندگی بہت بے معنی چیز ہے۔''

''اسے بامعنی بناؤ۔ زندگی کی پٹاری عجائبات سے بھری پڑی ہے۔ اس کا ڈھکنا اٹھاؤ۔ ہر روز نیا سورج طلوع ہوتا ہے، ہوتا ہے کہ نہیں؟''

میر زور زور سے چپو چلانے لگا۔ دوسرا چپو اس نے جمال کو پکڑا دیا۔

## زندگی کی پٹاری

جہلمی اخبار کا اداریہ نویس تھا۔ شریف اور کسی قدر شرمیلا مگر ظرافت کی اس میں کمی نہ تھی۔ وہ سلامتی اور رواداری کا قائل تھا۔ وہ اخبار کا سب سے بڑا الدو گدھا تھا۔

جمال اور جہلمی نے کبھی ساتھ کام نہ کیا تھا مگر جہلمی نے اخبار کے اولین شمارے دیکھے تھے اور وہ جمال...

کی اُپج اور طرزِ تحریر کو بہت پسند کرتا تھا۔

جمال کو جہلمی کے ہاں چائے، سگریٹ اور ہمدردی ملنے لگی۔ وحید نے جو اس کا کمیونسٹ دوست تھا اور اخبار میں کام کرتا تھا، اسے گھاس نہ ڈالی۔ اس کا طبقہ تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ ایک کامیاب کاروباری تھا اور ظاہر کرتا تھا کہ اگرچہ میں بہت امیر ہوں، میں کمیونسٹ بھی ہوں اور اس کے ثبوت میں وہ روسی اور مشرقی جرمنی کے سفارتخانوں کے افسروں کے نام روانی سے لیا کرتا تھا۔

مسکراہٹ کی اس کے ہاں کمی نہ تھی، مگر جذبے اس کے مر چکے تھے۔

ایڈیٹری پر جمال کا پرانا ساتھی ظہور الدین فائز تھا اور بہت کامیاب تھا۔ وہ کسی بات پر ہاں نہ کہتا تھا۔ اس لیے اس کا رعب بہت تھا۔ قلم اس کا شوخ اور گستاخ نہیں تھا۔ کچھ اسی وجہ سے اور کچھ اس لیے کہ وہ سرگودھا ضلع کا رہنے والا تھا اور گورنر صاحب اپنے ضلع کے لوگوں کا خاص طور پر جب وہ اعوان بھی ہوں، بہت خیال رکھتے تھے۔ اس کی پوزیشن بہت مضبوط تھی۔

جمال اپنی حیثیت کے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ تھا۔ فلم کی ساڑھ ستی نے اسے دو باتیں سکھا دی تھیں۔ ایک بے عزتی برداشت کرنے کی طاقت، جس کی اس کے ہاں پہلے بھی کوئی کمی نہ تھی۔ دوسرے انتظار اور یہ دو سبق آسانی سے نہیں ملتے۔

جمال ظہور الدین کو جو پیشے میں اس سے جونیئر تھا، مگر دوست اور ساتھی اس قدر تھا کہ جب شروع میں حکومت نے اسے کمیونسٹ سمجھ کر نظر بند کر دیا تھا تو جمال جیل میں اسے چھوٹے موٹے تحفے پہنچاتا تھا مگر اب وہ اسے جناب کہہ کر مخاطب کرتا، وہ اسے اپنا پرانا رفیق اور ساتھی سمجھ کر کبھی کبھی مسکرا بھی دیتا تھا۔

## چلو جینا شروع کرو

جمال کو پتہ نہ تھا کہ جہلمی آہستہ آہستہ اس دیوار میں سیندھ لگا رہا ہے۔ ایک دن اس نے اچانک سے کہا، آج سے آپ اخبار میں کالم لکھا کریں گے۔ ظہور الدین صاحب کہتے ہیں کہ ہفتے میں دو مرتبہ تیس روپے فی کالم روزانہ لکھنے سے اخبار کی مالیات پر بوجھ پڑ جائے گا۔

جمال کے مکان کا کرایہ ڈھائی سو روپے تھا اور چار ماہ سے واجب الادا تھا۔ ڈھائی سو روپے ان حالات میں بھی عطیۂ غیبی تھے مگر کالم لکھنے کا نام سن کر اس کا رنگ زرد ہو گیا کیونکہ اس میں تو خط لکھنے کی قابلیت بھی نہ تھی۔ اس کے لیے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ میں کبھی ایک صاحبِ طرز صحافی گنا جاتا تھا۔

جہلمی نے اس کی سابقہ تحریروں کے حوالے دیئے۔ اس کے پرانے کارنامے یاد دلائے مگر جمال کا قلم چلتا ہی نہ تھا۔

اسی جھگڑے میں سترہ دن گزر گئے۔

سترہ دن کے بعد ایک روز جب جہلمی اداریہ لکھ چکا تو گھر جانے کی بجائے اس نے فیروز الدین



چپڑاسی سے کہا ''میں باہر جاتا ہوں۔ جمال صاحب یہیں بیٹھیں گے۔ ان کے لیے چائے اور ایک سگریٹ کا پیکٹ لے آؤ اور باہر سے تالا لگا دو۔ رات کے نو بجے ہم دونوں کھانا یہیں کھائیں گے۔''

اس وقت چار بجے تھے۔

جہلمی نے کہا، جب تک کالم نہ لکھ لو گے، گھر نہ جا سکو گے۔

کمرے میں محصور ہو کر جمال نے گھنٹے بھر میں کالم لکھ لیا۔ اسے پتہ تھا کہ میری تحریر قابلِ اشاعت نہیں۔

جہلمی نے کالم پڑھا اور بیچ بیچ میں مسکراتا رہا۔ بولا ''اتنی سختیاں جھیلنے کے باوجود تم میں ظرافت باقی رہی۔ میں ظہور الدین صاحب کو دکھا دوں۔''

جمال نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ''خدا کے لیے مجھے ذلیل نہ کرواؤ۔ یہ بڑا فضول کالم ہے۔''

جہلمی ہاتھ چھڑا کر سیدھا ظہور الدین صاحب کے کمرے میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر میں جہلمی نے یہ کالم کاتب کے حوالے کر دیا۔ جمال کا دل چاہا کہ میں بھاگ جاؤں مگر اس کے قدم اُٹھتے نہ تھے۔

اگلے روز اس نے اپنا کالم اخبار میں پڑھا تو بہت شرمسار ہوا۔ اسے اپنی تحریر کبھی پسند نہ آتی تھی اور واقعہ یہ ہے کہ یہ بھی پسند نہ تھی مگر جہلمی بہت خوش تھا۔

جمال نے بے یقینی کے باوجود دوسرا کالم بھی لکھ دیا اور اسی طرح پانچ کالم اور گزر گئے۔

پھر ایک روز ایک نسبتاً جوان صحافی نے جو بڑے کینڈے کا رپورٹر سمجھا جاتا تھا، ظہور الدین سے پوچھا ''یہ جمال کون ہے۔ کدھر سے آیا ہے۔''

اس پر جمال کو شک پڑ گیا کہ شاید مجھے لکھنا آتا ہے۔ اس کی کھوئی ہوئی ذات آہستہ آہستہ واپس آنے لگی۔

جہلمی نے کوشش کی کہ جمال کے کالموں کی تعداد کچھ بڑھ جائے۔ اس نے ظہور الدین سے کہا: ''ڈھائی سو روپے تو جمال کے مکان کا کرایہ ہے۔ اس کے بعد کچھ بچتا نہیں کہ گھر میں روٹی پک سکے۔ ذہین آدمی کو ویسے بھی کام نہیں ملتا۔''

جواب میں ظہور الدین صاحب نے بڑی دانائی سے کہا ''ذہین آدمی کو اپنے اخراجات اپنی آمدنی کے اندر رکھنے چاہئیں۔''

خود ان کی اپنی مچھر دانیاں بنانے کی ایک فیکٹری اخبار کی ایڈیٹری کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور وہ اپنے اخراجات اپنی آمدنی کے اندر ہی رکھتے تھے۔ جیسا کہ ذہین آدمیوں کا دستور ہے۔ پھر ابھی ان کی کوٹھی بھی مکمل نہ ہوئی تھی۔

مگر اس ذرا سی کامیابی نے جمال کی زندگی تبدیل کرنی شروع کر دی اور وہ پھر سے ہاتھ چلا چلا کر

اور گردن گھما گھما کر بحثوں میں الجھنے لگا۔

## مارشل لاء کے اخبار نویس

اخبار میں پرانے کمیونسٹ کارکنوں نے جو اس کے پرانے مالکوں نے اخبار کو سیدھی راہ پر رکھنے کے لیے بھرتی کیے تھے، ایوب خاں کے مارشل لاء سے پورا تعاون کیا۔ عذر یہ تھا کہ اگر ہم نے نوکری چھوڑی تو ہماری جگہ دائیں بازو کے سرکاری لوگ بھرتی ہو جائیں گے۔ کہنے کو وہ انقلاب کے مورچے پر بیٹھے تھے، مگر انہوں نے اس موقعے سے فائدے اٹھائے۔ اہم لوگوں سے تعلقات بنائے۔ تجارتیں کیں اور واد کاسے بھی جی کو لگایا۔ ان کی بائیں بازو کی شہرت ان کو راج دربار میں کرسی دلوا دیتی تھی کیونکہ سوشلسٹ ہونے کی شہرت میں ایک گلیمر تو ہے مگر یہ لوگ نذر محمد کی طرح اپنے آپ کو انڈر گراؤنڈ نہ کہتے تھے۔

بائیں بازو کی شہرت کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ وہ متحرک لوگ تھے، یونین کے عہدے بھی ان کے پاس تھے۔ یونین کے کاموں کے سلسلے میں انہیں ادارے کے مینجنگ ڈائریکٹر شیخ صاحب سے اکثر ملنا پڑتا تھا اور چونکہ انتظامیہ کے خیال میں یہ لوگ سیاسی طور پر زیادہ باشعور تھے اس لیے شیخ صاحب سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اس سے کارکنوں پر بھی اچھا اثر پڑتا تھا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے لیڈر ذاتی سطح پر بھی یونین کے کام نکلوا سکتے ہیں۔ وہ یونین کے کاموں میں مصروف رہتے۔ اخبار میں کام کرنے کا وقت انہیں ملتا نہ تھا مگر انہیں چھٹی کے دن کا اوور ٹائم غیر حاضری کے باوجود بھی مل جاتا تھا۔

ایک ان میں سے سیاست کو بنیادی طور پر ایک سازش قرار دیتا تھا اور طبقاتی جدوجہد بھی اس کے نزدیک مقاصد کے حصول کی سازش تھی۔ دوسرا سیاست کو ذاتی سوشل تعلقات تک محدود سمجھتا تھا جس سے اپنے اور اپنے دوستوں کے کام ہو جائیں۔ تخلیقی کام میں کسی کو دلچسپی نہ تھی جو سیدھے سادے اخبار نویس تھے، وہ بھی محض کالم سے اخبار کا پیٹ بھرتے تھے۔ پھر نفری بڑھ گئی اور اس کی وجہ سرکاری خفیہ ایجنسیاں تھیں جو ہر جگہ سازشیوں کی تلاش میں رہتی تھیں اور کام کسی کے حصے میں نہ آتا تھا مگر ان میں جہلمی جیسے لدو گدھے بھی تھے۔

سیاسی خبروں پر گرفت ہو جاتی تھی۔ اس لیے اخبارات میں زیادہ تر پولیس کی سرگرمیوں کی اشاعت ہوتی۔ مثلاً مسماۃ شمیم اختر سکنہ کرشن نگر گلی نمبر 97 مکان نمبر 14 اور غلام علی دکاندار سوہا بازار میکلوڈ روڈ کے صنوبر سینما میں فلم دیکھ کر نکلے تو سڑک پر ہی بوس و کنار میں مصروف ہو گئے۔ چودھری فیروز دین ہیڈ کانسٹیبل تھانہ سول لائنز کو خبر پہنچی تو انہوں نے بھاری نفری کے ساتھ موقع پر پہنچ کر دونوں کو بوسہ بازی کرتے ہوئے گرفتار کر لیا۔

کچھ بدقماش مال روڈ پر شراب پی کر غل غپاڑہ کر رہے تھے کہ سید نور علی شاہ ایس ایچ او نے گشت کرتے ہوئے انہیں گرفتار کر لیا تاکہ اس مملکتِ خداداد میں بدکاری نہ پھیل جائے۔ بات اب چھوٹے پولیس والوں سے زیادہ تر تھانیداروں تک پہنچ گئی تھی جو اخبار نویسوں کے کہنے پر مجرموں کو چھوڑ دیتے۔ ان کے ذریعے رشوت لیتے یا شام کو ہوٹلوں سے مفت کی شراب اور کباب منگواتے۔



امیر جماعت اسلامی مولانا مودودی نے اسی زمانے میں ایک بیان میں فرمایا ''کیا ہم نے پاکستان اسی لیے بنایا تھا؟''

مگر مولانا آپ نے پاکستان کب بنایا تھا۔ آپ نے تو قائد اعظم کی وفات کے بعد قراردادِ مقاصد پاس ہوئی تو پاکستان پر مخالفانہ قبضہ کر کے اس کی تباہی کی بنیاد رکھ دی۔ آپ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی چھوڑی ہوئی تقسیم دولت کی سکیم کو برقرار رکھ کر صرف مسلمانوں کو نماز روزے پر لگانے اور حکومت پر قبضے کی تحریک چلائی۔ آپ نے جاگیرداروں کے ساتھ مل کر پاکستان کو امراء کی جاگیر بنا لیا۔ آپ نے پاکستان بنایا کب تھا؟

پاکستان میں تخلیقی خبر نویسی کا رواج شروع ہوا تو تھا مگر پھر وہ لوگ مارے باندھے گئے جو سوچتے تھے۔ اب جو بھرتی تھی، وہ عام طور پر صابر و شاکر اخبار نویسوں کی تھی جو اداریوں میں فقط افہام و تفہیم کی بات کرتے۔ عقل و ادراک کا جھنڈا لہراتے مگر حالات کا تجزیہ کبھی نہ کرتے نہ کسی کا سچ جھوٹ بتاتے۔ سلامتی اسی میں تھی کہ جو کچھ جس طرح چل رہا ہے چلنے دیا جائے۔

آج اخبار ابھی اتنا گندا نہیں ہوا تھا۔ اس میں ابھی کچھ صاف ستھرے لوگ بھی تھے اور ایک حد تک بائیں بازو کے حامی بھی تھے۔ مخبر تھے مگر ان کو پولیس سے حقیر تنخواہ کے علاوہ کچھ یافت نہ تھی۔ ہاں جو زیادہ حوصلہ مند تھے وہ مکان، دکان پلاٹ پر ہتھ مار لیتے تھے مگر جرائم کی خبریں ان کی بھی پولیس کی مرضی سے چھپتی تھیں۔ انہیں ''درخواستیں'' ٹیلی فون پر ملتی تھیں۔ لکھنے کا فقط ایک اصول تھا۔ اسے پڑھ کر حکومت کا کوئی ذمہ دار افسر ناراض نہ ہو جائے۔ حریفانہ بات صرف مزدوروں، کسانوں اور دیگر دانشوروں کی سرکشی کے بارے میں ہو سکتی تھی۔ امریکی سامراج کے غلبے کے خلاف کوئی پر عزم جدوجہد کسی منظم احتجاج کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

مزدوروں کی اجرت میں اضافے کے مطالبات پر تو ویسے ہی پابندی تھی۔ قیمتیں روز افزوں تھیں مگر کوئی بولتا تو پولیس کے ہاتھی اس پر کھول دیئے جاتے اور کہتے تم شر پسند ہو، صنعتی امن کے دشمن ہو، پاکستان کی ترقی کے مخالف ہو، کمیونسٹ ہو یا ہندوستانی ایجنٹ ہو۔

یہی حالت طالب علموں کی تھی مگر جماعت اسلامی کی طلبہ انجمنوں کو اجازت تھی کہ وہ جمہوریت پسند طلبہ پر گولی چلائیں۔ ولایتی ریوالور، سکوٹروں کی پلٹنیں، بسیں اور وکیلوں کی ایک فوج ان کی امداد کے لیے حاضر رہتی تھیں۔ پولیس کو ان کا راستہ روکنے کی اجازت نہ تھی۔ پولیس ہی تھی جو پاکستان کے ہر بدمعاش کا بیڑا پار لگاتی تھی۔ سیاستدان افسر، کارخانہ دار، جاگیردار اور مولوی سب پولیس کا حقہ بھرتے تھے۔

جمال بنیادی طور پر ایک بے وقوف آدمی تھا۔ ظہور الدین صاحب ایک دن اچھے موڈ میں تھے۔ انہوں نے جمال سے ایک آدھ مذاق بھی کیا۔ گویا ان کو یاد تھا کہ جمال میرا پرانا ساتھی ہے۔ اسی پر مطمئن ہو جانے کی بجائے جمال نے کہا ''ظہور صاحب صحافت کس قدر بدل گئی ہے۔ پرانی فائلیں دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے۔''

''واقعی۔'' ظہور الدین صاحب بولے۔ ''وہ بھی کوئی اخبار تھا جو مولانا چراغ حسن نے نکالا تھا؟''

مگر ابھی جمال کو کچھ روز اور اخبار میں رہنا تھا۔

جمال کو ساڑھ ستی کے زمانے میں جو اچھے تجربات ہوئے ان میں ایک یہ تھا کہ جب گہرے اور مساوی دوستوں میں ایک کا سماجی مرتبہ بدل جاتا ہے تو دوسرے سے اس کے تعلقات ختم ہو جاتے ہیں اور اس میں کسی کا قصور نہیں ہوتا۔ صرف وہی لوگ ثابت و سالم رہتے ہیں جو طبقاتی نظام کو سمجھتے ہوں اور سوچ سمجھ کر اس کے خاتمے کا عزم کریں اور اس کے لیے مصیبتیں اٹھائیں۔ جمال چونکہ اس فلسفے کو اچھی طرح سمجھتا تھا اس لیے جب اس کے گہرے دوستوں نے امیر ہونے کی بنا پر اس سے کنارہ کشی کر لی تو اسے کبھی صدمہ نہ ہوا۔

مگر اسی اصول کے تحت بعض بچھڑے ہوئے دوست واپس بھی آ جاتے ہیں۔ جب ان کا خمار گندم کسی وجہ سے اتر جائے یا گرا ہوا دوست اٹھ کھڑا ہو۔

## انور خاں کی واپسی

انور خاں نے جمال کو پھر سے پہچاننا شروع کر دیا تھا۔ وہ جمال کا لڑکپن کا دوست تھا۔ دونوں سرینگر میں ساتھ پڑھتے تھے اور ساتھ ہی کرکٹ کھیلتے تھے۔ اس زمانے میں بھی وہ ایک امیرزادہ تھا۔ نازک مزاج اور خود پسند آدمی تھا۔ اس کی ماں انگریزی بولتی تھی، مگر تقسیم کے بعد انہیں لاہور آنا پڑا اور اگرچہ انہیں کوئنز روڈ پر ایک عالیشان کوٹھی الاٹ ہو گئی مگر روٹی کمانے کے لیے اسے ایک انگریزی اخبار میں رپورٹری کرنی پڑی۔ اسے اس بات پر بہت تکلیف تھی کہ جمال جیسا معمولی خاندان کا آدمی بھی رپورٹری کرے۔ چاہے اردو ہی میں کرے مگر یہاں اسے نیوز ایڈیٹر کی تلخ ترش سب کے سامنے سننی پڑتی اور وہ آگے سے بول نہ سکتا تھا۔

پھر اچانک انور خاں مرکز کے محکمہ اطلاعات میں انفارمیشن افسر ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد جب جمال سندھ کے محکمہ اطلاعات میں انفارمیشن آفیسر ہو گیا تو اسے بڑی حیرت ہوئی کہ بھئی تم کس برتے پر؟ مگر خیر تم صوبائی حکومت کے ملازم ہو۔ مرکز اور صوبے کا بھلا کیا مقابلہ۔

وہ جمال کا پیچھا بھی نہ چھوڑتا تھا۔ اس کو اس سے پرانے وقتوں کے حوالے سے محبت بھی تھی۔ وہ اسے گھر بلاتا، کھانا کھلاتا اور اس کی توہین اور اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ ان دنوں اس کی پوسٹنگ لاہور میں تھی۔ اس نے اپنا نام اورنگزیب عالمگیر رکھ لیا تھا اور اسی رنگ میں رہتا تھا۔ انگریزی میں دستخط کرتا اے اے خان۔

## مولانا نیاز علی کوثر

اے اے خان نے ایک دن اصرار کر کے جمال کو دفتر بلوایا اور پوچھا ''کیا تم نے مولانا نیاز علی کوثر کا نام سنا ہے؟''

''سنا ہے۔'' جمال نے جواب دیا۔



''تو سنو۔ اوپر سے حکم آیا ہے کہ ملک میں رشوت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس لیے حکومت کسی معتبر مولوی سے فتوے لے کر شائع کروائے۔ تو جناب میں نے مولانا نیاز علی کوثر کو بلا بھیجا ہے کہ بیچارہ غریب آدمی ہے۔ راج گڑھ کے کسی ٹوٹے پھوٹے مکان میں رہتا ہے۔ بیس روپے اسی کو کیوں نہ مل جائیں۔ ہمارے ہاں مولویوں کا ریٹ یہی ہے۔ تو پتہ ہے بات سن کر مولوی نیاز علی کوثر نے کیا پوچھا؟''

''کیا پوچھا؟''

''پوچھا کہ جناب والا فتویٰ رشوت کے خلاف مطلوب ہے یا حق میں؟''

## غنڈہ راج

جمال جہلمی کے کمرے میں بیٹھا تھا کہ چپڑاسی ہانپتا ہوا اندر آیا اور بولا ''جی باہر بدمعاش سلیم صاحب کو ڈھونڈ رہے ہیں۔''

سلیم ایک معصوم نوجوان تھا۔ ایک پہلوان کی فلم پر اس نے تنقید کی تھی۔

بات سن کر جہلمی ایڈیٹر صاحب کے کمرے میں گئے۔ جمال باہر کو لپکا جہاں بدمعاش کھڑے تھے۔

''کیا بات ہے پہلوان؟'' جمال نے ترشی سے پوچھا۔

''اوئے سلیم نوں بھیج۔ پہلوان بلاتا ہے۔''

ایک نے حقارت سے جواب دیا۔

''کون پہلوان؟''

''تہانوں پتہ نہیں پہلوان کون اے؟''

''مجھے نہیں پتہ مگر تمہیں پتہ ہے کہ یہ اخبار کا دفتر ہے؟ تمہیں یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟''

اس پر ایک نے ہنس کر دوسرے سے کہا ''لو سنو! باؤ کیا کہتا ہے۔ کیا تم کسی پنڈ کے رہنے والے ہو باؤ؟''

''ہاں میں پنڈ کا رہنے والا ہوں۔ اس لیے تم جیسے چور بدمعاشوں کی پروا نہیں کرتا۔ اچھے وچھے سے کہو کہ ہمت ہے تو خود آئے۔''

اتنے میں کچھ ہجوم ہو گیا۔

''پرواہ ہم بھی کسی کی نہیں کرتے باؤ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ لاہور میں پہلوان کا راج ہے اور پہلوان کا حکم ہے کہ سلیم کو پکڑ کر اس کے سامنے پیش کرو۔''

جہلمی خدا خدا کر کے ایڈیٹر کے کمرے سے نکلا۔ پہلوان کو پتہ نہ تھا کہ ظہور الدین صاحب کے گورنر صاحب سے قبیلہ داری کے تعلقات ہیں۔ انہوں نے ٹیلی فون کر دیا اور پہلوان جو گورنر صاحب کے سیاسی رقیبوں کے ٹیٹوے دباتا تھا، پھر کبھی اخبار کے دفتر میں نہ آیا۔

## طوفانِ نوح

اسی زمانے میں گھٹائیں اُمڈ کر آئیں، بارش برسی، اولے پڑے اور سروں کے گنجے ہونے کا وقت آ گیا۔ پرانی بستیاں ڈولنے لگیں اور زمین سے فوارے اچھلنے لگے۔ لوگ گھروں سے نکل آئے۔ گلیوں بازاروں میں ہجوم ہو گیا۔ دودھ پیتے بچوں نے ماؤں کی چھاتیاں چھوڑ دیں اور حیران ہو کر اس میگھ ملہار کی طرف متوجہ ہو گئے۔

لوگ ایوب خاں کے طویل جبر، سرمایہ داری کی جان لیوا گرفت، پولیس کی سختیوں اور اپنی بے کسی اور بدحالی سے تنگ آ چکے تھے۔ انہیں سرکاری پروپیگنڈے نے اس بات کا یقین دلا دیا تھا کہ ہم نے سبز پوشوں کی مدد سے ہندوستان کو شکست دے دی ہے مگر نہ تو کشمیر آزاد ہوا تھا اور نہ ہندوستان نے گھٹنے ٹیکے تھے۔ الٹا ایوب خاں تاشقند میں کانوں کو ہاتھ لگا کر واپس آ گیا تھا اور ہندوستان نے نعرہ لگایا کہ "کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے۔"

تاشقند میں ایوب خاں نے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو سے اختلاف ظاہر کیا تھا۔ وہ نہایت ذہین آدمی تھا۔ سمجھ گیا کہ اب وقت ہے کہ ایوب خاں کو چلتا کیا جائے۔ اس نے ڈکٹیٹر کے خلاف ایک ملک گیر مہم چلا دی اور روٹی کپڑا اور مکان کا منشور پیش کر دیا۔ وہ آدمی نہیں آتش گیر مادہ تھا۔ اس نے چاروں طرف آگ لگا دی اور ملک نے عام بغاوت کر دی۔ ایوب خاں نے اسے سنبھالنے کی پوری کوشش کی مگر بالآخر وہ حکومت یحییٰ خاں کے حوالے کر کے گھر بیٹھ گیا۔

## رُت بدلی

ایوب خاں کے آخری زمانے میں اخبارات کو روزانہ اور بعض اوقات دن میں کئی کئی بار خبروں کی اشاعت میں زاویہ نگاری کی ہدایت ملتی تھی۔

مگر یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اخباری کارکنوں میں ایسے جو اصول پسند تھے، زندگی سے بیزار تھے مگر پاکستانی اخبار نویس چاہے وہ کیسا ہی ذہین اور مردِ میدان ہو عملی طور پر ایک بے ہنر اور آوارہ مزدور ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ بیروزگار ہو جائے تو پھر اس کا اللہ بیلی۔

یحییٰ خاں ایک نالائق جرنیل اور ایک شرابی کبابی حکمران تھا۔ اسے کسی بات کی پروا نہ تھی۔ اس نے اخبارات کو ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد کر دیا۔

ایسی بات کبھی ہوئی نہ تھی۔ آج اخبار میں سوشلزم کے جراثیم تو اسی کے بانیوں نے رکھ دیئے تھے۔ بھٹو نے اس کو نصب العین ٹھہرایا تو گرے ہوئے لوگ کپڑے جھاڑ کر اُٹھ بیٹھے۔

جمال کی اخبار میں کوئی حیثیت نہ تھی۔ اس کے کالموں کی تعداد بھی نہ بڑھی۔ مگر وہ عوام دشمن ... مولوی لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں اتر آئے اور مختلف



قسم کے ترقی پسند گروہ بھی۔ ان میں مارکسی کیمونسٹ بھی تھے۔ جمہوریت پسند آزاد خیال بھی اور نوجوان انارکسٹ بھی جو چی گویرا سے متاثر تھے۔ انہیں سماج کی اصلاح کی کوئی امید نہ تھی اور کیمونسٹ انقلاب کے لیے جس محنت اور قربانی کی ضرورت ہوتی ہے اس کا بھی ان میں حوصلہ نہ تھا مگر وہ بھی بھٹو کی کرشمہ سازی سے مسحور تھے۔

## نظریۂ پاکستان

انہی دنوں یحییٰ خاں کے ایک وزیر نوابزادہ شیر علی خاں نے جو امریکہ سے نازل ہو کر وزیر اطلاعات بنا تھا۔ نظریۂ پاکستان کی ترکیب رائج کی۔ جس کے معنی یہ تھے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے۔ اس لیے اصل اہمیت اس کی نظریاتی سرحدوں کی ہے۔ اس کی جغرافیائی سرحدیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ اصل میں وہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے لیے مغربی پاکستان کے عوام کو تیار کر رہا تھا کیونکہ جیسا کہ بعد میں ہنری کسنجر نے اپنی کتاب "دی وہائٹ ہاؤس ایئرز" (The White House Years) کے صفحہ 914 پر لکھا "پاکستان امریکہ نے توڑا۔" نوابزادہ شیر علی خاں امریکہ کا خدمتگار تھا، اگرچہ نام اسلام کا لیتا تھا۔ وہ وزیر اطلاعات تھا۔ اخبارات کو اشتہارات اسی کے اختیار کی بات تھی۔ اس کی بات کو اخبارات لے اڑے اور اسلام کے نام پر کفر بھی پھیلایا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مولویوں نے کلاسیکی راگ داری اور رقص کے خلاف محاذ کھول دیا مگر فلمی موسیقی اور مجروں پر انہوں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ شراب کی دکانوں پر حملے، ننگے سر چلنے والی عورتوں کی سر بازار چوٹیاں کاٹنے کی مہم اور ان پر گالی گلوچ اسلامی اخلاقیات کی بنیاد ٹھہری۔ اگرچہ فحاشی اور شراب خوری سے سارے مولوی بھی بے داغ نہیں نکلے۔ اصل مقصود اس مہم کے ذریعے عوام کی توجہ بنیادی مسائل سے ہٹانا تھا۔

مگر بھٹو ایک پشتی جاگیردار تھا اور وہ سوشلزم کی بات کرتا تھا تو اس پر مارکسی دانشور شبہ کرتے تھے مگر اس کی حمایت کرنے پر وہ بھی مجبور تھے۔ وہ کیمونسٹ نہیں تھا اور اس کے سوشلسٹ افکار بھی واضح نہیں تھے مگر تقریر اس کی دل پذیر ہوتی تھی کیونکہ زبان اس کی عوامی ہوتی تھی۔

# باب 33

ان دنوں شہری نوجوانوں میں مسلح جدوجہد کا بہت چرچا تھا۔ اگرچہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے لوازمات، اس کا نظریہ، اس کی سائنس اور اس کی تنظیم کیا ہوتی ہے۔ انہی دنوں لاہور میں خبر اڑی کہ سوات میں زمرد کی کانوں کے مزدوروں نے مسلح جدوجہد شروع کر دی ہے۔ سب لوگ اُچک اُچک کر شمال کی طرف دیکھنے لگے۔ جمال سے رہا نہ گیا اور وہ قصہ زمین کو بر سرِ زمین دیکھنے کے لیے سوات چل دیا۔

سیدو شریف میں وہ کسی کو جانتا نہ تھا مگر جانے سے پہلے اس نے ایک شخص کا ایڈریس لے لیا تھا جو سبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج کا کپتان تھا اور اب سیدو شریف سے دس میل دور اپنے گاؤں میں بے بسی کی زندگی کے دن گزارتا تھا۔ اس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تھا۔ وہ انقلابی تشدد پر یقین رکھتا تھا۔

سیدو شریف میں جمال کو مسلح جدوجہد کی کوئی علامت نظر نہ آئی۔ یہ درست ہے کہ زمرد کی کانوں میں گولی چلی تھی۔ کچھ مزدور مارے بھی گئے تھے مگر شہر میں ہاٹ کھلے تھے اور روزمرہ کی زندگی جاری تھی۔

زمرد کی کانیں سیدو شریف کے ساتھ ہی واقع تھیں جنہیں والیٔ سوات نے ٹھیکے پر دے رکھا تھا۔ وہ سارا مال خود ہی خورد برد کر لیتے تھے۔ مزدوروں کو مزدوری بھی برائے نام ہی ملتی تھی۔ گولی چلنے کے بعد کان بند پڑی تھی۔

جمال نے جاتے ہی سبھاش چندر بوس کے کپتان کی تلاش شروع کر دی۔ شام کے قریب وہ اسے سیدو شریف کے بازار میں مل گئے۔ وہ سخت غصے میں تھے۔ دن انہوں نے بھوکے پیاسے تحصیل میں گزارا تھا مگر ان کی بات کسی افسر نے سُنی نہ تھی۔

جمال سے مل کر وہ بہت خوش ہوئے۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ وہ رات گزارنے کے لیے اسے اپنے گاؤں لے گئے۔ انہوں نے کہا کہ وہاں بیٹھ کر صلاح کریں گے کہ اس ظالم نظام سے چھٹکارا کیسے حاصل کرنا ہے۔ نشانہ میرا بہت اچھا ہے اور ایک توڑے دار بندوق بھی میرے پاس ہے۔

### مینگورہ کی خندق



کر دی تھی کیونکہ والیٔ سوات ان کے داماد تھے مگر سڑک کے دونوں طرف پھیلے ہوئے دیہات پر ان کی نظر نہ پڑی تھی۔

جمال نے یہ سفر بہت مزے سے کاٹا۔ فطرت یہاں ابھی تک انسانی آلودگی سے پاک تھی۔ دریا کے دونوں کناروں پر دو عظیم بُت آمنے سامنے موجود تھے۔ ایک تو مہاتما بدھ کا تھا اور دوسرا ان کی بیوی یشودھرا کا۔ ان کی بلندی تین چار سو فٹ سے کیا کم ہوگی اور جمال کے لیے یہ حیرت کی بات تھی کہ اتنی بلندی پر ان بتوں کے بنانے والوں نے پراسپیکٹو کیسے صحیح رکھا ہوگا جبکہ اس زمانے میں آلات بھی نہیں ہوتے تھے مگر اس بلندی کے باوجود فرزندانِ توحید نے نجانے کس طرح مہاتما بدھ اور یشودھرا کے چہروں کو توڑ پھوڑ کر بگاڑ ڈالا تھا۔

کپتان صاحب نے فخر سے کہا ''یہ سواتی آرٹسٹ تھے جنہوں نے ایسی جادوگری دکھائی اور وہ بھی سواتی تھے جنہوں نے سکندرِ اعظم کو جو ادھر سے گزرا تھا، زخمی کیا مگر اب ہماری حالت دیکھو، آپ کے سفید کپڑے دیکھ کر ہر شخص تھر تھر کانپنے لگے گا کہ آیا ہے تو کچھ لے کر جائے گا۔ نہیں لے گا تو دو جوتے تو ضرور مارے گا۔ آپ کے لاہور میں ہیرا منڈی میں بیٹھنے والی بیشتر لڑکیاں سواتی ہیں۔ انہیں وادی کا ایک رشتہ دار اٹھا کر فروخت کر دیتا ہے۔ سب جانتے ہیں مگر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔''

''آپ آج تحصیل میں کیا کرنے گئے تھے؟'' جمال نے پوچھا۔

کپتان صاحب نے ایک موٹی گالی دے کر کہا ''ہمارے گاؤں میں ایک نوجوان نے دسویں پاس کر لی ہے۔ میں اسے تحصیل میں چپڑاسی کی نوکری دلوانے گیا تھا مگر کسی نے میری بات نہیں سنی۔ الٹا تحصیلدار نے مجھے چانٹا مار دیا اور کہا جب تمہارے پاس کسی کی سفارش نہیں تو کیوں آئے ہو وقت ضائع کرنے۔''

تانگہ گاؤں کے پاس سڑک پر رک گیا۔ بہت سے بچے اور عورتیں جمال کو دیکھنے لگیں۔ ایک بہت پیارے بچے کے سر پر جمال نے ہاتھ پھیرا تو اس کی ماں اسے اٹھا کر بھاگ گئی۔

کپتان کا گھر ایک تنگ اور گندی گلی میں واقع تھا جس میں پرانے گوبر کی سڑاند پھیلی ہوئی تھی جس چھوٹی سی کوٹھڑی میں کپتان نے جمال کو بٹھایا اس کی دیواروں پر انقلابی نعرے لکھے ہوئے تھے ان بائیس خاندانوں کے سربراہوں کے نام جن کے پاس پاکستان کی اسی فیصد دولت تھی، کپتان نے ان کے سر کاٹنے کی ترجیحی فہرست بھی وہیں لٹکا رکھی تھی۔ اس نے کہا، یہ نام میں نے سارے گاؤں کے نوجوانوں کو ازبر کرا رکھے ہیں تاکہ کوئی بچ کر نہ جائے۔

پھر کپتان نے اپنے بیٹے سے کہا ''ذرا میری بندوق اٹھا لاؤ۔''

بندوق کی نالی بہت لمبی تھی۔ اس کے ساتھ بارود بھرنے کی ایک سیخ لگی ہوئی تھی۔ کپتان صاحب

ڈالنے کی ترکیب بتائی۔

اتنے میں گاؤں کے کچھ نوجوان آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں پیپلز پارٹی کے جھنڈے اور ذوالفقار علی بھٹو کی تصویریں تھیں۔ کپتان صاحب نے کہا ''اب ہم سے انتظار نہیں ہوتا۔ ہم فوراً جنگ شروع کرنا چاہتے ہیں۔''

جمال ان کے جذبے سے گھبرا گیا۔ اس نے کہا '' کپتان صاحب! آپ کے پاس ایک توڑے دار بندوق ہے۔ پھر آپ کی کوئی تنظیم نہیں، آپ کس طرح اتنی بڑی جنگ لڑ سکتے ہیں؟''

کپتان صاحب اداس ہو گئے اور بولے ''ہم کب تک تنظیم کا انتظار کرتے رہیں گے۔ لوگ لڑیں گے تو مریں گے اور ان کی تنظیم بھی بن جائے گی۔ میں تو فقط یہ جانتا ہوں کہ جنگ کے سوا اب کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔''

''مگر آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ کپتان صاحب جب تک پاکستان کے محنت کش عوام جنگ کا فیصلہ نہیں کر لیتے۔''

''یہ فیصلہ تو انہوں نے کر لیا ہے۔''

''ابھی نہیں کپتان صاحب۔''

''میں جو کہتا ہوں۔''

## رات کی ضیافت

رات کے دس بج گئے۔ جمال کو بھوک ستانے لگی۔ خدا خدا کر کے کپتان صاحب کو خیال آیا اور انہوں نے کہا ''دریائے سوات کی مچھلی بہت لذیذ ہوتی ہے، میں نے آدمی بھیج رکھے ہیں کہ آپ کے لیے پکڑ کر لائیں۔''

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ کپتان صاحب اٹھ کر اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں وہ خفت سے ہنستے ہوئے واپس آئے اور بولے ''آج قسمت اچھی نہیں۔ لڑکوں کو صرف ایک ہی مچھلی ملی اور میری گھر والی نے تل بھی لی ہے۔ کیا آپ ہاتھ منہ دھوئیں گے؟''

تھوڑی دیر میں ایک بچہ تھالی میں تلی ہوئی مچھلی لے آیا جو زیادہ سے زیادہ چار انچ کی ہوگی۔ وزن میں بہت ہوگی تو ایک چھٹانک۔ اس کے ساتھ روٹی بھی تھی مگر سالن نہیں تھا۔

کپتان نے کہا ''ہم تو روز مچھلی کھاتے ہی ہیں۔ آپ مہمان ہیں، یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔'' جمال سمجھ گیا کہ گھر میں سالن نہیں پکا۔

انہوں نے کہا ''ہمارے ہاں پہلے مہمان کھاتا ہے۔ جب وہ ختم کر لے تو پھر گھر والے کھاتے ہیں۔''



مگر جمال کو یہ پتہ نہیں تھا کہ بعد میں کپتان صاحب اور گھر کے دیگر لوگ نمک کے ساتھ روٹی کھائیں گے۔

رات وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ سوات کے بارے میں، گندھارا کے بارے میں اور زمرد کے بارے میں۔ کپتان نے کہا ''مجھے زمرد کی ایک کان کا پتہ ہے جس کی کسی کو خبر نہیں۔ اگر تم اس کے کھودنے کے لیے کچھ رقم کا بندوبست کر سکو تو ہم کروڑ پتی ہو جائیں گے۔''

پھر کونے میں پڑے ہوئے ٹین کے صندوق میں سے اس نے ایک گندی جراب نکالی جس میں سبز سبز کنکریاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے کہا ''یہ دیکھو، یہ میں نے اسی کان میں سے نکالیں مگر مجھے ان کو بیچنا نہیں آتا۔ اگر میں کسی سے بات کرتا تو والی مجھے مروا دیتا۔ تم لاہور میں کسی جوہری سے بات کرنا۔''

جمال نے کہا ''یہ غیر قانونی کام ہے۔ مجھے بھی پولیس پکڑ لے گی۔''

## بودھی کھنڈر کے آثار

''اچھا تو یوں کرو۔'' کپتان صاحب بولے۔ ''ہمارے گھر سے دو میل کے فاصلے پر پہاڑوں کے بیچ ایک کھنڈر کے آثار ہیں۔ یہ کسی پرانے بادشاہ کا قلعہ ہے یا کوئی پرانا مندر یا کوئی بودھی استھان ہے۔ اس میں بے شمار نوادرات دفن ہیں۔ ذرا سا کریدو تو بت نظر آتے ہیں۔ اگر تم پانچ سو روپے لا سکو تو ہم اسے راتوں رات کھدوا لیں۔ اس میں سونے اور ہیرے کے جواہرات بھی ہوں گے۔ دونوں آدھے آدھے بانٹ لیں گے۔''

جمال کو آدھا آدھا تقسیم کرنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی مگر اسے گندھارا کے بت بہت لبھاتے تھے۔ اس نے کہا ''صبح چل کر دیکھیں گے۔''

''ٹھیک ہے مگر میں تمہیں نمونہ تو دکھا دوں۔'' اس نے پھر وہی ٹین کا صندوق کھولا اور اس میں سے ایک چھوٹی سی پتھر کی پلیٹ نکال لایا۔ اس میں ایک شیر ایک بھکشو کے آگے سرنگوں تھا۔ کپتان نے کہا ''یہ مجھے اسی ڈھیری سے ملی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ امریکی اس قسم کی چیزوں کی بڑی قیمت لگاتے ہیں۔''

''مگر یہ تو پاکستان کا مال ہے۔ ہم اسے امریکیوں کے ہاتھ کیوں بیچیں۔'' جمال نے کہا۔

کپتان صاحب بولے ''جب ہم نے پاکستان ہی بیچ ڈالا تو اس پتھر کا کیا ذکر۔ تم فقط پانچ سو روپے لے آؤ۔ ہمارے پاس ان چیزوں کے اتنے بڑے خزانے ہیں کہ کبھی ختم نہ ہوں۔ سو دو سو بت بک گئے تو پاکستان کا کچھ بھی نہ بگڑے گا مگر ہماری حالت سدھر جائے گی۔ روٹی کے بغیر پاکستان سے محبت بھی تو نہیں کی جا سکتی۔''

## نخل کی بو

چاہتا تھا۔ وہ کپتان پر مزید بوجھ نہ بننا چاہتا تھا۔

گلی میں سڑاند بے حد تھی۔

کپتان صاحب نے کہا ''ہمیں تو اس کی عادت ہے مگر بدبو ہے بہت۔ اس کی وجہ یہ نجحل ہے۔''

''نجحل یعنی؟'' جمال نے پوچھا۔

''نجحل ہمارے ہاں باڑے کو کہتے ہیں جس میں جانوروں کو سردی سے بچانے کے لیے رکھا جاتا ہے۔ فقیر بھی ان کے ساتھ ہی رہتا ہے۔''

''فقیر کون؟''

''فقیر ہمارے ہاں مزارع کو کہتے ہیں۔ وہ خان کی زمین جوتتا ہے۔ جب کوئی پہاڑ قابلِ کاشت نظر آئے تو علاقے کے معززین جرگہ کر کے اسے آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ پھر بے زمین کسان ان کے دروازوں پر ناک رگڑتے ہیں کہ ہمیں کاشت کی اجازت دو۔ وہ پہاڑی زمین سے پتھر ہٹاتے ہیں، چٹانیں توڑتے ہیں پھر اپنے پلے سے بیج ڈالتے ہیں۔ پانی کے نالے ادھر کو موڑتے ہیں۔ اپنے مویشی لاتے ہیں، پھر سارے خاندان کی محنت سے جو فصل تیار ہوتی ہے اس کے چار حصے خاں لے جاتا ہے اور پانچواں حصہ فقیر کو ملتا ہے۔''

''یہ تو ظلم ہے۔'' جمال نے کہا۔

''پوری بات تو تم نے سنی ہی نہیں۔'' کپتان نے کہا ''اسی زمین پر خان فقیر کو جھونپڑی بنانے کی اجازت دیتا ہے مگر جھونپڑی اس کی نہیں ہوتی۔ خان جب چاہے اسے نکال دے۔ پتھر لکڑی بھانڈا برتن چھین لے اور بیٹی بہن بیوی پر حق الگ۔''

جمال اور کپتان نجحل کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ سردی کا موسم تھا مگر برف پگھل چکی تھی۔ ٹھنڈی ہوا میں گرم گرم بدبو کی باس ناقابلِ برداشت تھی۔ حالانکہ نجحل کا دروازہ بھی بند تھا۔ کپتان نے پوچھا ''اندر چلو گے۔''

''ضرور ضرور۔'' جمال نے جواب دیا۔ اصل میں وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اندر کیا ہے۔

کپتان نے دروازہ کھلوایا تو سڑے ہوئے گوبر اور پرانے پیشاب کی بدبو سے اس کا دماغ پھٹنے لگا۔ اس کا جی متلایا، مگر قے کو روکتے ہوئے اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ اس اندھیرے طویلے میں کھڑکی روشندان قسم کی کوئی چیز نہ تھی اور یہاں سے وہاں تک بھینسیں بندھی کھڑی تھیں۔ ان کے بدن گوبر سے لت پت تھے۔ زمین پر گوبر اور پیشاب کا ملا جلا کیچڑ پھیلا ہوا تھا۔ پھر اس نے دروازے کے قریب نظر ڈالی۔

## پھر نہ سمجھانے کو آ جانا

دروازے کے پاس ایک کونے میں ایک میلی کچیلی دبلی پتلی زرد رو عورت اپنا شیر خوار بچہ لیے ایک



بوری پر بیٹھی تھی۔ بوری گیلی تھی۔ وہ ڈر کے مارے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا میاں بھی گھبرا گیا۔

سردیوں کا پورا موسم اس چھوٹے سے خاندان نے اس نجحل کے گوموت میں مویشیوں کے ساتھ گزارا تھا۔ دو تین ماہ قبل اسی نجحل میں ان کا بچہ پیدا ہوا تھا اور ابھی تک زندہ تھا۔ حالانکہ آکسیجن وہاں نام کو نہ تھی۔

''یہ حیوان کا بچہ ہے۔'' کپتان نے کہا ''کٹڑوں، بچھڑوں کی طرح پیدا ہوا، ان کے ساتھ ہی زندہ رہے گا اور ان کی طرح ایک دن مر جائے گا۔ اس کی زندگی بھی خان کی بھینسوں کی طرح اس گندے کیچڑ میں لیٹے ہوئے گزرے گی۔ یہ انسان نہیں مگر پھر بھی دوسرے بچوں سے اچھا رہا۔''

''وہ کس طرح؟'' جمال نے پوچھا۔

''اس لیے کہ اسے کم سے کم دودھ تو مل جاتا ہے۔ خان تو اس کو ایک قطرہ بھی نہ دے مگر یہ لوگ تھوڑا بہت چوری کر لیتے ہیں۔''

''مگر اس قدر بدبو میں؟'' جمال نے حیرت سے کہا۔

''جن کا پیٹ خالی ہو انہیں بدبو نہیں آتی۔ مولانا بھاشانی ٹھیک کہتا ہے گھیراؤ جلاؤ اور اقبال بھی یہی کہتا ہے جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی...... ایک مرتبہ اس مریل فقیر کے ہاتھ میں بندوق آ جانے دو اور اس کی مدقوق بیوی کو موقع دو تو یہ کسی ظالم کو زندہ نہ چھوڑے گی، پھر نہ ہمیں سمجھانے کو آ جانا۔''

## بودھی استھان

نجحل کے خوفناک تجربے سے گزر کر جمال اور کپتان اس ڈھیری کی طرف چل دیئے جس میں کسی بودھی سردار کا محل کسی بھکشو کی پاٹھ شالہ یا کوئی قلعہ دفن تھا۔ یہ شرف گندھارا کو حاصل ہے، کہ یہاں آج سے دو ہزار سال پہلے کردار سازی بذریعہ آرٹ فلسفہ تعلیم تھا اور ہر بچہ پیدا ہوتے ہی قلم دوات کی بجائے چھینی اور ہتھوڑی ہاتھ میں لے لیتا تھا۔ قلم دوات کی باری بعد میں آتی تھی۔

پگڈنڈیوں میں سے پگڈنڈیاں نکلتی گئیں۔ تھوڑی دیر میں پارٹی گھاٹیوں میں گھر گئی۔ چاروں طرف چٹانیں کھڑی تھیں اور بیچ میں ایک محفوظ جگہ پر ایک بہت بڑی ڈھیری۔ یہاں کوئی آدم ذات نظر نہ آتا تھا۔

''ادھر کوئی آتا جاتا نہیں۔'' کپتان نے کہا ''آگے راستہ بند ہے مگر وہ پگڈنڈی جس پر چل کر مارکو پولو چین گیا تھا، وہ رہی۔ ہمارا وقت آئے گا تو ہم ماؤزے تنگ کو ملنے کے لیے اسی راستے سے جائیں گے۔ سنا ہے ماؤزے تنگ ہماں شماں کو بھی مل لیتا ہے۔''

''ہاں اگر کوئی اس تک پہنچ جائے تو۔''

''اگر مارکو پولو پہنچ گیا تھا تو ہم بھی پہنچیں گے۔''

جمال ڈھیری کے اوپر کھڑا ہو گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ کسی بڑے آدمی کا مسکن تھا۔ پاٹھ شالہ وغیرہ نہیں ہے مگر ممکن ہے کہ محل کے ساتھ کوئی مٹھ بھی ہو اور طالب علم اس میں بت سازی کرتے ہوں یا پڑھتے ہوں اور رہتے بھی ہوں۔ چکی کا ایک بہت بڑا پاٹ مٹی میں دبا ہوا تھا مگر صاف نظر آ رہا تھا پتھر کی کچھ سیڑھیاں بھی مٹی میں گم ہو رہی تھیں۔ ضرور اس کے اندر نوادرات کے خزانے دبے ہوں گے۔

''تم فقط پانچ سو روپے کا بندوبست کر لو۔'' کپتان نے کہا۔

جمال کو اپنی بے بسی پر بہت افسوس ہوا۔ اس کے پاس پانچ سو روپے نہیں تھے اور یہ بات کپتان کے لیے قابلِ قبول نہ تھی۔ اسے جمال سے نفرت ہونے لگی۔

واپسی پر انہوں نے کوئی بات نہ کی مگر گھر پہنچتے پہنچتے کپتان کا موڈ بدل گیا۔ اس نے کہا ''تمہارے آنے کا شکریہ۔ مجھے بھی سیدو شریف جانا ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گا۔ تم وہاں سے لاہور کی بس پکڑ لینا۔''

''ہاں ضرور۔'' جمال نے کہا۔

''مگر میں تمہیں تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ گو میرے پاس کچھ ہے نہیں۔''

یہ کہہ کر وہ گھر کے اندر چلا گیا۔ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی اور ایک وہی گندی جراب جس میں زمرد کے کچھ سنگریزے رکھے تھے۔ اس نے کہا ''لاہور میں کسی جوہری سے بات کر کے مجھے لکھو، کس بھاؤ بکتے ہیں۔''

جمال نے وہ گندی جراب بیگ میں ڈال لی۔ پھر کپتان نے کہا وہ رات کو جو پتھر کی پلیٹ میں نے تمہیں دکھائی تھی، وہ میں نے کسی امریکن کے لیے رکھی تھی مگر گھر میں آج کل تنگی ہے۔ تم لے جاؤ صرف ڈھائی سو روپے میں!

جمال کی جیب میں کرائے کے علاوہ فقط چالیس روپے اور تھے۔ اس نے کہا ''میرے پاس تو فقط پچیس روپے ہیں۔''

''پچیس روپے میں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چلو تانگہ نکل نہ جائے۔''

تانگے میں اور سواریاں بھی تھیں۔ علیک سلیک کے بعد کپتان نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کر کے کہا ''یہ خداداد خان ہے۔ پولیس کا سپاہی!''

خداداد خان معمولی قد و قامت کا آدمی تھا۔

''کہاں جا رہے ہو خداداد خان؟''

''وردی کے ساتھ بوٹ بنوانے کے لیے۔'' اس نے کہا ''بڑی مشکل سے پیسے جمع ہوئے ہیں۔''



''ہمیں تو وردی بھی خود ہی بنوانی پڑتی ہے۔ سنا ہے ادھر پاکستان میں پولیس کو سب کچھ ملتا ہے۔''

''ٹھیک سنا ہے۔''

''ہمیں تو ڈیوٹی پر جانے کے لیے کرایہ بھی جیب سے دینا پڑتا ہے۔ والی ہمیں کچھ نہیں دیتا۔''

''تنخواہ تو دیتا ہوگا۔''

''دیتا ہے۔ بہت دیتا ہے۔'' کپتان نے ہنس کر کہا۔

## نظامِ حکومت

خداداد خان بولا ''دیتا ہے سال میں ایک بار چودہ من جوار، چار من گندم اور چالیس گولیاں۔ نقد کچھ نہیں ملتا اور چار من گندم بھی خزانے سے نہیں ملتی۔ اس کے لیے مختلف خوانین کے نام چٹھی مل جاتی ہے۔ جا کر وصول کر لو۔ خوانین ہمیں دس دس پھیرے لگواتے ہیں۔ ہم سے اپنے کام کرواتے ہیں۔ اپنے مزارعین کو پٹواتے ہیں۔ پھر کچھ دیتے ہیں تو پورا نہیں تولتے۔''

''مگر تم گزارہ کیسے کرتے ہو۔'' جمال نے پوچھا۔

''ہم بھی فقیروں کے گھر لوٹ لیتے ہیں۔ جو ہماری حکومت کا طریقہ وہی ہمارا۔''

''مگر فقیر زندگی کیسے گزارتا ہے۔ فصل کے پانچویں حصے سے وہ کیا کیا بچائے گا۔''

کپتان بولا ''پانچواں حصہ بھی اسے پورا کہاں ملتا ہے۔ اس پانچویں حصے میں سے وہ محل میں رہنے کا کرایہ بھی ادا کرتا ہے۔ پھر سال میں تیس سیر گھی، سو گٹھے لکڑی اور ایک جانور یا اپنا ایک بچہ یا بچی خان کی خدمت کے لیے دینا پڑتا ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ خان اس کا بچہ یا بچی کبھی اسے واپس کر دے۔ فقیر کی جوان بیوی بیٹی یا بہن مزارعت کے معاہدے میں شامل نہیں ہوتی۔ ہاں خان کی طبیعت مچل جائے تو کسی کو بھی لے جائے مگر ایسی باتوں کا چرچا نہیں کیا جاتا ورنہ پھر تھانے والے فقیر کا خون پی جاتے ہیں، کیوں بھائی خداداد خان؟''

سپاہی پھیکی ہنسی ہنسا اور بولا ''جی یہ تو اپنا اپنا رواج ہے۔''

''مگر کوئی عدالت، کوئی انصاف، کوئی مسجد اور کوئی مولوی؟'' جمال نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''عدالتیں یہاں نہیں ہوتیں خان۔'' کپتان نے جمال سے کہا ''یہاں صرف تھانے ہوتے ہیں مگر یہاں انصاف میں دیر نہیں لگتی۔''

''وہ کیسے؟''

''سیدھی بات ہے۔ ملزم جلد انصاف چاہے تو وہیں سپاہی کو رشوت دے کر چھوٹ جائے۔ قتل کا مقدمہ ہو تو تحصیلدار کے پاس جانا پڑتا ہے، وہ دو سو چار سو میں ملزم کو چھوڑ دیتا ہے۔ سودا نہ ہو تو افسر مال کو کچھ زیادہ دے کر گھر آ جائے۔ اس کے اوپر مشیر ریاست ہے مگر وہاں پانچ ہزار سے کم میں بات نہیں بنتی اور آگے چلو تو خود والی صاحب ہیں اور وہ دس ہزار سے کم پر کسی کو چھوڑتے نہیں۔

کھڑے کھڑے مقدمے کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔ قاتل کو ایک کھڈ کے کنارے کھڑا کر کے بندوق مقتول کے بیٹے یا بھائی کو پکڑا دی جاتی ہے۔ اس طرح والی کو جلاد کی تنخواہ بھی دینی نہیں پڑتی۔''

بس کے اڈے پر پہنچ کر کپتان نے جمال کو گلے لگایا۔ اپنی کوتاہیوں پر معذرت کی اور لاہور جلد آنے کا وعدہ کر کے بغل کی پوٹلی اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا ''یہ وہ تحفہ ہے جو میں تمہیں دینا چاہتا تھا۔ لاؤ پچیس روپے ہی لاؤ۔ گھر میں کچھ ہے نہیں ورنہ میں ڈھائی سو سے کم اس پلیٹ کے کبھی نہ لیتا۔ پھر یہ خیال بھی ہے کہ تم میرے انقلابی ساتھی ہو۔''

جمال نے پچیس روپے دے کر پتھر کی پلیٹ بھی بیگ میں ڈال لی۔

''اور ہاں۔'' کپتان نے پیٹھ موڑتے ہوئے کہا ''وہ چیز جس بھاؤ بک جائے اس کی اطلاع مجھے ضرور دینا۔ اس کان کی حکومت کو کوئی خبر نہیں۔''

## زمرد کا بھاؤ

لاہور پہنچ کر جمال نے اپنی بیوی سے کہا، زمرد کو بازار میں بیچ آؤ۔ وہ جانتی نہ تھی کہ یہ غیر قانونی کام ہے۔ شام کو تھکی ہاری نے واپس آ کر کہا ''جوہری کہتے ہیں یہ زمرد بہت بھربھرا ہے۔ کاٹا نہیں جا سکتا۔ اس کی قیمت پانچ روپیہ تولہ ہوگی۔ مگر ذرا سخت دانہ لے آؤ تو دو ہزار روپے تولہ کا بھاؤ ہم آپ کو دے سکتے ہیں مگر کسی سے بات نہ کریں۔ آپ کا نام پتہ ہم نہیں پوچھتے۔ غالباً آپ کسی بڑے افسر کی بیوی ہیں۔''

جمال نے اسی روز کپتان کو تمام کوائف لکھ دیے۔ اس کا جواب نہ آیا تو اس نے وہ گندی جراب اور زمرد کے سنگریزے ایک دن سڑک کوٹنے والے انجن کے آگے ڈال دیے۔

وزارت اطلاعات کو پتہ ہی نہ چلا ورنہ وہ کہتے کہ پاکستان کی سڑکوں پر تو زمرد کوٹا جا رہا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ لوگوں نے ترقی ہی نہیں کی۔

## سفید انقلاب

اچانک غل مچا کہ مشرقی پاکستان سے مولانا بھاشانی پنجاب کے دورے پر آئے ہیں اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کے مقام پر انہوں نے کسانوں کی ایک ریلی بلائی ہے اور ہدایت کی ہے کہ ہر شخص اپنا کھانا، ایک لاٹھی اور ایک لال ٹوپی یا پگڑی ساتھ لائے۔

مولانا مغربی پاکستان کے کسانوں کو یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ لڑائی شروع ہو چکی ہے جس میں خون بہے گا مگر کسان چپ چاپ مار نہیں کھائے گا بلکہ دشمن کے سر توڑے گا۔ اس اعلان نے مولویوں اور زمینداروں کو دہشت زدہ کر دیا۔ یحییٰ خاں کی حکومت بھی گھبرا گئی۔ اس کی اور اس کے مشیروں کی پختہ رائے تھی کہ الیکشن میں کسی پارٹی کو ایسی اکثریت نہ مل سکے گی جس سے جرنیلوں کے مفادات خطرے میں پڑ جائیں۔ یہ مولانا بھاشانی کوئی مصیبت کھڑی نہ کر دے۔



## لاٹھی اور لال ٹوپی

مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب کا سورج طلوع ہو رہا تھا اور وہ انتخابات کے لیے تیار تھے۔ بھاشانی بھی اس جنگل کے شیر تھے مگر انہیں اب دستوری جدوجہد سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ مولانا پاکستان کے عوام کو طبقاتی جدوجہد کی طرف لے جانا چاہتے تھے مگر حالات مددگار نہیں تھے۔ طبقاتی جدوجہد کے لیے جس قسم کے نظریے کی ضرورت ہوتی ہے، مولانا اس سے بے بہرہ تھے۔ خالی جذبہ تو کچھ نہیں کر سکتا اور خالی لڑائی میں غریب کسان ہی مارے جاتے ہیں۔

''ادھر مغربی پاکستان میں زمینداروں کا زور ہے اور مولویوں، غنڈوں اور تھانیداروں نے عوام کے حواس پر قبضہ کر رکھا ہے۔ پھر دائیں اور بائیں بازو کے دانشور طبقاتی انقلاب سے خوفزدہ ہیں اور ترقی پسند آزاد خیال نوجوانوں اور محنت کشوں کو بھٹو لے اڑا ہے۔ مولانا بھاشانی کا بوٹا یہاں نہ لگے گا۔ آتا ہے تو آنے دیجیے۔'' یحییٰ خاں کے مشیروں نے کہا۔

بھٹو سے یحییٰ خانی جرنیلوں کو زیادہ خطرہ تھا۔ مولانا بھاشانی اس کی اڈی ہوئی آندھی کا شور ثابت ہو سکتے تھے۔ شیخ صاحب سے ان کا خفیہ سمجھوتہ ہو چکا تھا۔ اصل میں شیخ صاحب کو صرف انتخابات سے دلچسپی تھی۔ پھر وہ اپنے چھ نکات کا زور باندھ سکتے تھے مگر یحییٰ خاں کے کچھ جرنیل اس تصور کے بھی خلاف تھے کہ شیخ مجیب الیکشن جیت کر پاکستان کے وزیراعظم بن جائیں۔ ان کو اپنی زمینداریوں کی بھی فکر تھی اور وہ اپنی خداوندی کے بھی عادی ہو چکے تھے۔ وہ طبقاتی کردار کے حساب سے جاگیردار تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ مشرقی پاکستان کی چھوٹی بورژوازی مملکت میں حاکم ہو کر ان کی زمینیں چھین لے۔

بھٹو چاہتا تھا کہ بعض نکات پر سمجھوتہ ہو جائے مگر وہ کھل کر کچھ کہتا نہ تھا۔ ولی خاں صوبائی خودمختاری کے حامی تھے۔ مسلم لیگی مسئلے کو سمجھے بغیر جوڑ توڑ میں لگے رہتے تھے۔ جماعت اسلامی اور اس کے زیر اثر دیگر مذہبی پارٹیاں، لامحدود انفرادی جائیداد کے تقدس، شہنشاہانہ مرکزیت، سرمایہ داری اور مغربی سامراج کی نظریاتی غلامی کو پاکستان کا مقصد بتاتی تھیں۔ ووٹر اس کے آس پاس کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ مغربی پاکستان میں شور بہت تھا۔ مشرقی پاکستان میں زور بہت تھا۔

## ہنگامے کی ابتدا

لاہور ایئرپورٹ پر ایک ہنگامہ بپا تھا۔ مولانا بھاشانی کو لوگوں نے دیکھا نہ تھا مگر وہ ان کے افکار سے واقف تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح بھٹو اور بھاشانی کا اتحاد بن جائے۔ پیپلز پارٹی کے جھنڈے اور نعرے لے کر کارکنوں نے ایئرپورٹ پر قبضہ کر لیا حالانکہ مولانا بھاشانی کا جہاز ابھی کراچی سے اڑا بھی نہ تھا۔ سروں پر تھالی چلتی تھی اور شور سے آسمان کے کان پھٹتے تھے۔ باہر ٹیکسیوں، سکوٹروں اور رکشاؤں کا کوئی شمار نہ تھا اور ابھی جیل روڈ سے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔

جمال کے دل سے سارے وسوسے دور ہو گئے۔ جب سانولے رنگ کے مولانا بھاشانی سر پر بانس کی تیلیوں کی ٹوپی، پاؤں میں چپل پہنے تہبند باندھے جہاز کے دروازے میں دکھائی دیتے۔ بھٹو بھاشانی بھائی بھائی کے نعروں سے آسمان گونجنے لگا۔ جھنڈوں کی رنگ برنگی جھنڈیاں لہرانے لگیں۔ چہرے جوش سے لال بھبوکا ہو گئے۔ لوگوں کو پتہ تھا کہ مولانا بھاشانی سوشلسٹ ہیں۔ وہ حکومت سے کوئی سودا نہیں کریں گے۔

ایئرپورٹ کی عمارت کے سامنے انہوں نے ایک چھوٹی سی تقریر کی۔ ان کی شخصیت جلالی تھی۔ ان کے ماتھے کا محراب گواہی دیتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بجلیاں لہراتی تھیں۔ ایک سچے انقلابی کی طرح وہ غصے سے بھرے ہوئے تھے۔

## جھومر اور بھنگڑے

جیسے جیسے 23 مارچ قریب آتی گئی لاہور کے دل میں اشتیاق بڑھتا گیا۔ سب کو ٹوبہ ٹیک سنگھ جانا تھا جہاں مولانا بھاشانی کسانوں سے خطاب کرنے والے تھے اور ایسا جلسہ پنجاب میں کبھی ہوا نہ تھا جس میں مقرر بھی کسان ہوں اور مخاطب بھی کسان ہوں اور کوئی چودھری، کوئی جاگیردار، کوئی مولوی سٹیج پر پھولوں کے گلدستوں والی میز پر بیٹھا نہ ہو۔

مگر جب بڑے کاموں کا حوصلہ کر لیا جائے تو ان کے چھوٹے چھوٹے اسباب خود پیدا ہو جاتے ہیں۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں غیاث الدین جانباز، چودھری فتح محمد اور دوسرے کسانوں، کارکنوں نے مقامی کسانوں میں بے دخلیوں کے خلاف مورچے لگا کر اور جیلیں کاٹ کر بغاوت کی فضا پیدا کر رکھی تھی۔ انہوں نے بھاگ دوڑ کر تنبو لگائے، پانی کا انتظام کیا۔ غسلخانے بنوائے اور شہروں سے آنے والے مہمانوں کے ٹھہرنے کے لیے ٹوبہ ٹیک سنگھ کے معزز گھرانوں میں انتظام کیا۔ یہ شہر کی عزت کا سوال تھا اور سارے شہر نے میزبانی کی بساط بچھا دی تھی۔

جو بھی جلسے میں حاضر ہوا لال ٹوپی پہن کر۔ ڈانگ ہاتھ میں لے کر اور کھانے کی پوٹلی ساتھ لے کر آیا۔ جمال نے بھی ٹوپی پہن لی اور ڈانگ ہاتھ میں لے لی۔

بسوں کے کارواں دو روز پہلے ہی سے چلنے لگے تھے۔ حکومت نے ایک گاڑی بھی خاص طور سے چلوا دی تھی۔ طالب علموں کے جتھے، اخبار نویس، شاعر، ادیب اور سیاسی کارکن سب کے سب سوار ہو گئے۔ شہر میں کوئی باقی نہ رہا جس میں دم ہو۔

گاڑی جھنڈوں سے سجی ہوئی تھی۔ ریلوے کا افسر گارڈ، ڈرائیور سب نشے میں تھے۔ وہ رک رک کر چلے تاکہ مسافروں کی کوئی ضرورت پوری ہونے سے نہ رہ جائے۔

## ٹوبہ ٹیک سنگھ چلو

گاڑی کی شہرت پورے پنجاب میں پھیل چکی تھی۔ لاہور سے ٹوبہ ٹیک سنگھ تک کا علاقہ سرسبز و



شاداب ہے۔ دیہات میں لوگ گاڑی کو دیکھتے ہی تالیاں پیٹنے اور نعرے لگانے لگتے۔ عورتیں اور بچے چھتوں پر بیٹھے تماشہ دیکھتے تھے۔

حکومت نے کانفرنس کو ناکام بنانے کے لیے طرح طرح کی شرارتیں کر لیں مگر طوفان نہ تھما۔ جماعت اسلامی اور اہلحدیث کے مولوی جیبوں میں کفر کے فتوے ڈالے لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈراتے تھے مگر بہتا دریا فتوؤں سے کبھی رُکتا نہیں۔

کچھ لوگ اس لیے بھی چلے گئے کہ اگر مولوی اس قدر گالیاں دے رہے ہیں تو کچھ بات تو ہو گی۔

گاڑی شام کو ٹوبہ ٹیک سنگھ پہنچی۔ جس شان سے مولانا بھاشانی کا استقبال ہوا اس کی تفصیل کے لیے وارث شاہ کا قلم درکار ہے۔ ہجوم کا یہ عالم تھا کہ آدمی آدمی سے الگ نظر نہ آتا تھا۔ لگتا تھا لاوے کا ایک دریا ابل رہا ہے جس کے لال لال انگاروں کے لالے کھلے ہوئے ہیں۔ نعروں سے گلے پھٹے جا رہے ہیں۔ زبانیں باہر کو لٹک رہی ہیں۔ بے شمار ڈھول اپنی اپنی تال پر بج رہے ہیں۔ کونجیں گا رہی ہیں۔ جھومر اور بھنگڑے تھرک رہے ہیں۔

ہر شخص اس بوڑھے کو ایک نظر دیکھنے کا مشتاق تھا جو پاکستان کے مصائب کا حل بتانے کے لیے بنگال سے آیا تھا اور جوان کو پاکستان کے نام پر بلاتا تھا جن کو وہ نظر نہ آتا تھا، وہ ان کو دیکھ رہے تھے جن کو وہ نظر آ رہا تھا۔

مولانا کا جلوس ایک دریا کی طرح بہنے لگا۔ بوڑھے اور جوان آگے آگے خون کی طرح دوڑ رہے تھے۔

اللہ رکھا کے باغ میں چھولداریوں کا ایک جہان آباد تھا۔ اونچ نیچ کا کوئی سوال نہ تھا۔ جس کے جہاں سینگ سمائے وہ وہیں گھس گیا۔

جس چھولداری میں جمال اور اس کے لاہور کے ساتھی اترے اس کے ساتھ کے خیموں میں بہاولپور، رحیم یار خاں، بہاولنگر، وہاڑی، بوریوالہ، کبیر والا، لودھراں، سرگودھا، لائلپور، کیمبل پور، ہزارہ، مردان، بنوں، کوہاٹ، پشاور، سوات، کوئٹہ، فورٹ سنڈیمان، کراچی اور لسبیلہ کے لوگوں نے قیام کیا۔ کوئی کتنوں کی گنتی کرتا۔ سندھ سے ہاری کمیٹی، بلوچستان سے طلبہ، کسانوں کی ڈرامہ اور لوک سنگیت پارٹیاں ڈھول بجاتی ناچتی گاتی میدان میں اتر رہی تھیں مگر لوگ تھے کہ آتے ہی جاتے تھے۔ شہر میں رت جگا تھا۔ گھروں کے دروازے کھلے تھے جس کے ہاں چاہو مہمان بن جاؤ۔ پکوان تیار، بستر بچھے ہوئے، حقے بھرے ہوئے نہ سلام کی ضرورت نہ تعارف کی شرط نہ شکریے کی کوئی رسم۔ کسان بولیاں گاتے تھے مگر کسی لب پر کوئی فحش بول نہ تھا اور کیوں نہ ہو انقلابی تحریک اصل میں تہذیبی اور اخلاقی تحریک ہوتی ہے۔

## رات کو اکیلی لڑکی

رات آدھی ہو چلی تھی۔ معاً اس بظاہر گنوار اجڈ اور کھردرے ہجوم میں جمال نے ایک نہایت بانکی اور طرحدار لڑکی دیکھی۔ وہ لڑکی مقامی ہرگز نہیں تھی۔ یقیناً لاہور سے آئی تھی۔ جمال کو ذرا خوف آیا کہ اتنی

گئے یہ پردیسی لڑکی اس اجنبی مقام پر اکیلی پھرتی ہے۔ اس کی سج دھج پر دیہاتی مشتعل ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ کوئی اس کو تنگ کرے۔

مرزا جمال کے ساتھ تھا۔ دونوں اس خیال سے کہ لڑکی کسی مصیبت میں نہ پڑ جائے۔ اس کے پیچھے چل دیئے مگر لڑکی جدھر سے گزرتی تھی لوگ راستہ چھوڑ کر ہٹ جاتے تھے۔ بعضوں نے اسے دیکھتے ہی بھنگڑا بند کر دیا اور وہ بڑے اطمینان کے ساتھ راستہ چلتی رہی۔

تھوڑی دیر کے بعد جمال نے لڑکی کو روکا اور پوچھا ''بی بی اتنی رات گئے تم اکیلی کدھر جا رہی ہو۔''

''میں ہوسٹل کی طرف جا رہی ہوں جہاں ہم لوگ ٹھہرے ہیں۔'' وہ بولی ''میں اکیلی نہیں ہوں۔ یہ سب لوگ میرے ساتھ ہیں۔'' اس نے ہجوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''مگر ان کا کیا بھروسہ؟''

''جی نہیں۔ یہ انارکلی بازار نہیں ہے جہاں کوئی دن میں بھی نہ نکل سکے۔ دراصل میں لاہور سے یہی دیکھنے آئی تھی۔ یہ لوگ نہایت بااخلاق اور شریف ہیں۔''

''مگر بھنگڑے کی ٹولیاں کبھی کبھی دھکم پیل کرتی ہیں۔''

''میرا تو دل چاہتا ہے کہ میں ان کے ساتھ بھنگڑا ڈالوں۔ اللہ کرے سارا پاکستان ٹوبہ ٹیک سنگھ بن جائے۔''

''آپ کی باقی سہیلیاں پریشان ہوں گی۔'' جمال نے کہا۔

''جی نہیں۔'' وہ بولی ''سب یہیں گھوم رہی ہیں۔ آپ کے نیک جذبات کا شکریہ!''

اور یہ کہہ کر وہ چلی گئی مگر اس کے شکریئے میں ایک عجیب طرح کا طنز تھا۔ وہ ایک آزاد ملک کی آزاد عورت کی طرح بے فکری سے قدم اٹھاتی ہوئی ہجوم میں گم ہو گئی۔ کیا مولانا بھاشانی نے پاکستان کو ایک رات میں شرافت سکھا دی تھی؟ کیا جھوٹے مولویوں کے جھوٹے وعظ خیالات کو سدھار سکتے ہیں! یا اس کے لیے کسی انقلابی کی ضرورت ہے؟

رات سب کی سوتے جاگتے کٹی۔ سوتے جاگتے اس لیے کہ جو سویا وہ بھی جاگتا رہا۔ رات بھر نعرے لگتے رہے جو بوئے سو کاٹے۔ بے زمینوں کو زمین بے گھروں کو گھر، بچوں کو مفت تعلیم، غیر ملکی قرضے ضبط، محنت کشوں کا راج ان باتوں میں اسلام کا بھلا کیا جاتا ہے مگر مولوی انہی باتوں پر کفر کے فتوے دیتے نہیں تھکتے۔

## ملکیتِ زمین

مگر اس سے کچھ ہی روز پہلے پاکستان کے 113 مولوی کہہ چکے تھے کہ نجی ملکیت آدھا قرآن ہے۔ جماعت اسلامی کے امیر سے ایک اسلام پسند اخبار کے رپورٹر نے ننکانہ صاحب میں پوچھا ''حضرت آپ کے نزدیک ملکیت زمین کا معیار کیا ہے؟''

مولوی صاحب بولے ''محکمہ مال کے ریکارڈ میں اندراج، جو چیز صدیوں سے کسی کی ملکیت چلی



آ رہی ہو، جب تک اسے ناجائز ثابت نہ کیا جائے، اس پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا۔''

رپورٹر چپ رہنے والا نہیں تھا۔ اس نے کہا ''کہ زمین پر ملکیت کا جواز اس پر قبضہ ہوا۔''

مولوی صاحب بھی چپ رہنے والے نہیں تھے، بولے ''تو اور کیا ہو؟''

''یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس؟''

مولوی صاحب بھنا گئے، بولے ''جو لوگ خدا کو نہ مانیں اور رسولؐ کی اتھارٹی کو تسلیم نہ کریں، ہم ان کو سمجھا نہیں سکتے۔''

## خدا سے مانگو

انہی دنوں حیدرآباد کی ایک مل میں اجرت کے معاملے پر مزدوروں کی ہڑتال طول پکڑ گئی تو سیٹھ صاحب نے کراچی کے ایک بڑے مولانا صاحب کو بلوایا جو ایوب خاں کے بازو پر امام ضامن باندھنے کی وجہ سے مشہور ہوئے تھے۔

مولانا سفید پوشاک پہن کر آئے۔ پہلے انہوں نے مزدوروں کو نماز پنجگانہ کے فضائل سے آگاہ کیا۔ پھر صبر و قناعت کی عظمت بیان کی۔ پھر کہا، یہ سرمایہ دار بڑے ظالم اور مکار ہیں مگر غور کیجیے تو عاجز محض ہیں۔ فرشتہ اجل آ جائے تو ان کی ساری دولت ان کو ایک سانس بھی خرید کر نہ دے سکتی۔ کوئی سیٹھ کسی کو کیا دے گا۔ اس کے پلے ہے کیا۔ اس سے کچھ مانگنے کی بجائے اس داتا سے مانگو جس نے اس کتے کو اپنی رحمتوں سے نوازا مگر حلال کا لقمہ اس پر حرام کر دیا۔ اس کی تو دنیا بھی بگڑی اور آخرت بھی خراب ہوئی مگر تمہارے لیے مولا نے دونوں جہان مسخر کر دیئے۔ صبر کرو صبر پیغمبروں کا شیوا ہے۔ ہر دم استغفار کا ورد کیا کرو۔ اس سرائے فانی سے دل لگانا اہلِ ایمان کا طریقہ نہیں۔ کام میں کوتاہی نہ کرو۔ ہڑتال اسلام میں حرام قرار دی گئی ہے۔

## ٹھاہ ٹھاہ!

اذان جانے کس وقت ہوگئی۔ جمال گہری نیند میں تھا مگر اچانک مودودی ٹھاہ کے نعرے گونجنے لگے۔

میدان میں بے شمار لال ٹوپیوں اور پگڑیوں کے چراغ جل رہے تھے۔ اردگرد کے دیہات کے بے شمار گھڑ سواروں اور پیدل جتھوں کی آمدآمد تھی۔ یہاں کے کسان نسلاً جانگلی ہیں۔ لانبے قد مضبوط جسم اور پھرتیلے۔ ان کے ہاتھوں میں جھنڈوں کے جُھنڈ تھے۔ ڈھول کی لے پر جوان بھی تھرکتے تھے اور گھوڑے بھی ٹاپیں مارتے تھے۔

جلسہ گاہ تین ایکڑ پر محیط تھی۔ اس رنگ کا اتنا بڑا ہجوم کسی نے کہاں دیکھا ہوگا۔ لگتا تھا پوری دھرتی جاگ اٹھی ہے۔

سٹیج پر کوئی میز کرسی نہ تھی۔ ایک بہت لمبی چوڑی دری بچھی تھی۔ جس پر چار پانچ سو آدمی چوکڑی مار کر بیٹھے تھے۔ بیچ میں بانس کی تیلیوں والی ٹوپی پہنے مولانا بھاشانی

کارروائی صبح سے شام کے پانچ بجے تک جاری رہی۔ مولانا بھاشانی نے بتایا کہ امریکہ نے پاکستان کو توڑنے کا منصوبہ بنایا ہے جس کی ایک نقل میں نے یحییٰ خاں کو بھیج دی ہے۔ یہاں کے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار سازشیں کر رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو اپنے زرخرید ملاؤں سے کافر بنواتے ہیں۔ اٹھو اور پاکستان کے تمام دشمنوں سے جنگ کرو۔ انقلاب کا ساتھ دو۔ گاؤں گاؤں تنظیم بناؤ۔

ان کی آمد پر قومی ترانہ بجایا گیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ لال ٹوپی کمیونزم کا نشان نہیں شہادت کی علامت ہے۔ میں دو برس میں سوشلزم لاؤں گا۔

مولانا بھاشانی انقلابی تو تھے مگر سوشلزم کی لوازمات سے واقف نہ تھے۔ ان کے پاس کوئی سائنسی لائحہ عمل نہیں تھا۔ ان کے کارکن تربیت یافتہ نہیں تھے۔ ان کی تنظیم جذباتی مزاج رکھتی تھی، پھر مغربی اور مشرقی پاکستان میں وحدتِ خیال نہیں تھی۔ دونوں کا کوئی ایک قائد بھی نہیں تھا۔ دونوں کی کوئی ایک موثر تنظیم بھی نہیں تھی۔ سوشلسٹ انقلاب کے راستے میں آگ اور خون کے جو دریا پاٹنے پڑتے ہیں مولانا بھاشانی کو ان کا اندازہ نہیں تھا۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ کانفرنس ایک طوفان کی طرح آئی اور انقلاب کی جھلک دکھا کر گزر گئی۔ ادھر مغربی پاکستان میں بھٹو کی اسلامی سوشلزم پھن اٹھا رہی تھی۔ عوام بگولے کی طرح اس کے گرد گھومنے لگے تھے مگر اسلامی یا سائنٹفک سوشلزم کسی کو بھی منظور نہ تھا۔ پنجاب اور سندھ کے زمیندار تھر تھر کانپ رہے تھے۔ سرمایہ داروں کا جو امریکی اور مغربی سرمائے کے مصلی تھے، خون خشک ہو رہا تھا۔ مولوی غصے سے کھول رہے تھے کیونکہ چند فانی انسان رضائے الٰہی کو تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ رہی بیوروکریسی تو وہ تو تھی ہی انتہا درجے کی قدامت پرست، جس کے تصورات اور نظریات ایسٹ انڈیا کمپنی کے وقت سے محکم چلے آتے تھے۔

وہ بنگالیوں سے بھی نفرت کرتے تھے۔ مغربی پاکستان کے حکمران طبقے سوچتے تھے کہ کیا ہم پر جو دراز قد اور گورے چٹے ہیں، اب کالے کلوٹے ٹھگنے بنگالی حکومت کریں گے۔ بنگالیوں سے مغل اور انگریز بھی نفرت کرتے تھے اور اس کی وجہ بنگالیوں کی خوئے بغاوت تھی۔ اگر مجیب الرحمان برسر اقتدار آ گیا تو وہ زمینداریاں توڑ کر اراضی بے زمین کسانوں میں بانٹ دے گا! یہ تھا سب کو خطرہ مگر بعد میں پتہ چلا کہ جب ہنری کسنجر نے اپنی کتاب ''دی وائٹ ہاؤس ایرز'' (The White House Years) لکھی کہ پاکستان کو امریکہ نے توڑا تھا اور پاکستان کے تمام سیاسی راہنما دراصل امریکی کھیل کھیل رہے تھے۔

## ہڑتال کا ہنگامہ

لاہور کے تمام اخبارات کے ملازمین نے حالات کار کے مسئلے پر مذاکرات سے ناامید ہو کر ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا مگر ہڑتال کے روز کسی اخبار کی یونین نے قول نہ نبھایا اور ایک اخبار کا ایک کارکن اپنی ذاتی حیثیت میں آج اخبار اور اس کے انگریزی ہم عصر کی ہڑتال میں شامل ہوا۔ اس کا مرکز پروگریسو پیپرز بن گیا۔ مطالبات میں ایسی کوئی بات نہ تھی جنہیں مان کر کسی بھی حکومت کو درد گردہ کی شکایت ہو جاتی۔



بنیادی مسئلہ آزادیٔ اظہار کا تھا اور یہی ہر حکومت کو تیر اٹھانے پر مجبور کر دیتا ہے مگر بیوروکریسی کو رولٹ ایکٹ سے آگے کچھ آتا نہیں۔ ہڑتال سے اس کو دیوانگی کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔ اس کا طریقہ ہے کہ اجتماعی مطالبے خاص طور پر محنت کشوں کے اجتماعی مطالبے چاہے کیسے ہی منصفانہ ہوں، مسترد کر دو۔ اس کے ساتھ ساتھ ہڑتالیوں میں اپنے دلال چھوڑ دو، جو انہیں ڈرائیں۔ ان میں پھوٹ ڈلوائیں اور افواہیں پھیلائیں۔ پھر بات چیت کو طول دیتے چلے جاؤ تاکہ ہڑتالیوں کے ارادے کمزور پڑنے لگیں۔ آج کی روٹی کا غم ان کی جان جلانے کو کافی ہوتا ہے۔ لاٹھی گولی اس کے بعد کا حربہ ہے اور بہت کم ہڑتالیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا نشانہ بھی بنیں۔

## سڑک پر بیٹھ گئے

پروگریسو پیپرز کے دفتر کے سامنے سڑک پر دریاں بچھ گئیں۔ تنبو تن گئے اور دن اور رات کے کارکن صبح سویرے آن کر ڈیوٹی پر بیٹھ گئے۔ ڈیوٹی یعنی سڑک پر بیٹھنا کام نہ کرنا۔

کارکنوں نے پہلا دن نعرے مارتے اور گیت گاتے ہوئے گزارا۔ چپڑاسی، ایڈیٹر، کالمسٹ اور پریس کے مزدور ایک ہی صف میں ایک ہی سوچ لیے ایک دوسرے کے زانو پر ہاتھ مار مار لطیفے سناتے مگر نظریں سب کی اوپر کی منزل پر لگی ہوئی تھیں جہاں چیئرمین صاحب کی سرکار بیٹھی تھی۔ اس عہدے پر عدالت عالیہ کے ایک ریٹائرڈ چیف جسٹس صاحب متمکن تھے۔ بڑے وضعدار، نرم خو، پروقار، مگر مجبور کیونکہ سرکاری ملازمت میں پہلا اصول یہ سکھایا جاتا ہے کہ تمہارا ضمیر سرکار کی ملکیت ہے۔

بھٹو نے تاشقند سے لوٹ کر جو آگ لگائی تھی، اس میں ایوب خاں تو بھسم ہو چکا تھا۔ اب عوام جوق در جوق کیمپ کی طرف آنے لگے۔ بھٹو گومگو کے عالم میں تھا۔ وہ ہڑتالیوں کو ناراض کرنا نہ چاہتا تھا اور یحییٰ خاں سے دوستی بھی اسے عزیز تھی۔ اس نے اپنی پارٹی کو ہڑتالیوں کا ساتھ دینے کی ہدایت جاری نہ کی تھی۔ وہ انتخابات میں بیس پچیس سیٹوں پر جیتنے کی امید رکھتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ سرکار اس سے بگڑ جائے۔

شام ہوئی تو بھی مورچہ کسی نے نہ چھوڑا۔ رات کی شفٹ کے لوگ وہیں زمین پر پڑ گئے۔ جمال ادارے کا باقاعدہ ملازم نہیں تھا مگر جوش و خروش میں کسی سے کم نہ تھا۔ اس روز پرچہ شائع نہ ہو سکا۔

اگلے روز دوپہر ہوئی، شام اتری پھر رات کی چھاؤنی چھا گئی مگر حالات نہ بدلے اور دن اسی طرح گزرنے لگے۔ حکومت اپنی ہٹ پر قائم تھی۔ ہڑتالی بھی کفن پہن کر میدان میں اترے تھے۔

پھر آہستہ آہستہ لوگ غائب ہونے لگے۔ نعرے ختم ہو چکے تھے۔ گندے لطائف بھی سنائے جا چکے تھے۔ مزدوروں کی بعض انجمنوں اور طالب علموں نے اجازت چاہی کہ ہم بھی ہڑتال میں شامل ہو جائیں مگر صحافی نہ مانے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ شہر میں بدامنی پھیل جائے۔

## اندر سے توڑ پھوڑ

خواہ مخواہ نوکریاں گنوانے سے کیا فائدہ۔ ہڑتال کامیاب بھی ہوگئی تو ہڑتال کے زمانے کی تنخواہ تو ہمیں کوئی نہیں دے گا۔ کچھ لوگ انہیں روکنے لگے تو وہ جھگڑا کرنے لگے اور یہی ان کا مقصد تھا، جھگڑا ہو جائے۔ ہڑتال ٹوٹ جائے۔

دل شکنی کی ایک وجہ یہ تھی کہ لاہور کے سارے اخبار نکل رہے تھے جنہوں نے ہڑتال کے حق میں فیصلہ کیا تھا۔ جماعت اسلامی اپنی نورانی داڑھی سمیت ہڑتال کے حق میں فیصلہ کرنے کے بعد غائب ہوگئی تھی۔ پھر ہڑتالیوں پر گالی پڑنے لگی۔ ملک دشمن ہیں، بغاوت پھیلاتے ہیں۔

کیمپ آہستہ آہستہ تین گروہوں میں بٹ گیا۔ ایک جو انتظامیہ سے مطالبات منوائے بغیر بات بھی کرنے کے خلاف تھا، دوسرا وہ جو چاہتا تھا کہ ہڑتال جاری رہے مگر مذاکرات بھی ہوں اور تیسرا بلا شرط ہڑتال توڑ کر انتظامیہ کی شرائط پر کام کرنا چاہتا تھا اور حکومت بھی یہی چاہتی تھی۔

سترہ دن گزر گئے اور ہڑتالیوں کا حوصلہ ٹوٹ گیا۔ یونین کے صدر یونین کی منظوری سے مذاکرات پر تیار ہوگئے۔

جسٹس صاحب نے کہا، میرے بس کی بات ہوتی تو میں نوبت یہاں تک پہنچنے نہ دیتا مگر آپ کے مطالبات کا تعلق پورے ملک سے ہے۔ میں یہی کر سکتا ہوں کہ آپ کے مطالبات منظوری کے لیے اسلام آباد بھیج دوں مگر پہلے آپ ہڑتال ختم کریں تاکہ بات چیت کا ماحول پیدا ہو۔

کارکنوں نے کہا ''بات معقول ہے۔''

سرکار کے دلالوں نے تسلی دی کہ اگر حکومت نے دھوکا کیا تو ہم پھر ہڑتال کر دیں گے اور اس پر سب نے صاد کیا۔ پڑھے لکھوں کی کوئی یونین زیادہ حوصلہ نہیں رکھتی۔ یہ ان پڑھ مزدور ہی تھے جو مہینے گزار سکتے ہیں۔

یونین نے بس ایک ہی شرط رکھی، کسی ہڑتالی کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہو۔

ہڑتال ختم ہوگئی۔ سب لوگ کام پر لگ گئے مگر انتظامیہ کا خون کھول رہا تھا۔ وہ ہڑتال رکوا نہ سکی تھی اور اس میں اس کی نااہلی کا پہلو نکلتا تھا۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ سرخوں، ملحدوں اور بے دینوں کی فہرستیں بننے لگیں۔ آزادیٔ اظہار کا مطالبہ سرخوں کی پہچان بن چکا تھا۔

انتظامیہ بے خبر تھی۔ اس نے چیف جسٹس صاحب کی یقین دہانی کے باوجود فوراً ہی سرکردوں کو برخاست کرنا شروع کر دیا۔ چیف جسٹس صاحب چپ رہے۔

جمال کی بھی چھٹی ہوگئی۔ حالانکہ وہ تو دیہاڑی دار کالم نویس تھا۔

ساڑھ ستی پوری ہو چکی تھی مگر اس کا وبال اٹھتے اٹھتے ہی اٹھتا ہے۔ جمال کو معلوم نہیں تھا کہ پار بست ہے دیس سنہرا!



## باب 34

اسے معلوم نہیں تھا کہ ابھی مجھے بہت کام کرنا ہے۔ مجھے انقلابی نظریے کی دھونکنی کو چلانا ہے جس سے بھٹو کی لگائی ہوئی آگ مزید بھڑکے۔

آخری تنخواہ کے کچھ پیسے جو اسے ملے تھے، ایک جیب کترے نے اس کی جیب سے نکال لیے۔

بھٹو انتخابات کے سلسلے میں پارٹی کا اخبار نکالنا چاہتا تھا۔ میر صاحب نے جمال کو اس اخبار میں اداریہ نویس رکھوا دیا۔

اخبار کا ایڈیٹر ایک پبلیشر خاندان کا چشم و چراغ تھا اور چہرے پر سیلز مین کی مسکراہٹ طاری رکھتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ نئے لوگ نظریاتی ہیں اور بھٹو اس زمانے میں بائیں بازو کا سیاستدان تھا۔ تنخواہ بہت کم تھی مگر جمال کو لکھنے کی بھرپور آزادی ملی۔ بھٹو کو دراصل کوئی بھی جانتا نہ تھا۔ وہ اردو نہیں پڑھ سکتا تھا، اسی لیے جمال نے پرچے کی ادارتی پالیسی خالص مارکسی بنا دی۔

بھٹو انقلابی نہیں تھا مگر تیز پالیسی اس کے لیے مفید تھی۔ ابھی کسی کو اس سے ڈر نہ لگتا تھا۔ ملک میں بگولے اٹھ رہے تھے۔ مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی کسانوں کی ریلیاں نکال رہے تھے اور لال ٹوپیوں اور لاٹھیوں کی بہار دیکھنے والوں کو نشہ پلاتی تھی۔ وہ سوشلسٹ انقلاب کا نعرہ لگاتے تھے مگر ان کے سامنے بنگالی قوم پرستی کی دیوار بھی اٹھ رہی تھی۔ شیخ مجیب کا ریلہ ان کے قدم جمنے نہ دیتا تھا۔ دونوں حصوں میں ہم آہنگی کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔

یحییٰ خاں چاہتا تھا کہ دونوں حصوں میں چھوٹی چھوٹی پارٹیاں جیت جائیں اور وہ ان سے سودا کر کے چین کی بنسی بجائے۔

جماعت اسلامی نے انتخابات کو کفر اور اسلام کا مسئلہ بنا دیا۔ ہلکے اور بھاری مولوی کچیلیوں میں زہر بھر کے بلوں سے باہر نکل آئے اور کھانڈے کھڑکانے لگے۔

شیخ مجیب کی دیکھا دیکھی اور مرکز کے ہاتھوں اپنی بے بسی کے باعث سرحد اور بلوچستان کے سرداروں اور جاگیرداروں نے بھی صوبائی خودمختاری کی بانگ لگا دی۔ بھٹو کی انقلابی تحریک کا توڑ بھی یہی تھا

بھٹو ایک طوفان کی طرح چڑھا آتا تھا جب اس کا اخبار نکلا۔

جمال کی بھٹو سے ایک ملاقات ہوئی۔

اور اس میں جمال کو پہلا جھٹکا لگا۔ حاضرین مجلس اسے سر سر کر کے مخاطب کرتے تھے۔ حالانکہ وہ اس کے سیاسی ساتھی تھے۔ وہ غرور و نخوت کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔

جب جمال نے بات کی کہ ہمیں مفتی محمود کی پارٹی کے ساتھ متحدہ محاذ بنا لینا چاہیے تا کہ ہمارا آپس میں مقابلہ نہ ہو تو وہ چپ رہا، پھر بولا "بلڈی رشین مولویز!" اس میں زور "مولویز" پر کم تھا اور "رشین" پر زیادہ۔

## نئی باتیں

پرچہ نکلتے ہی جم گیا اور اس کی وجہ وہ نئی باتیں تھیں جو بھٹو کرتا تھا اور جسے پرچے میں مارکسی انقلاب کے رنگ میں پیش کیا جاتا تھا مگر بھٹو مارکسی نہیں تھا۔ حالانکہ اس نے اس کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ وہ تاریخ کے جبر سے بھی واقف تھا مگر اپنی پشتی جاگیردارانہ پس منظر کی وجہ سے وہ سمجھتا تھا کہ میں تاریخ پر بھاری ہوں۔

اس کے مخالفین کے پاس نظریۂ پاکستان کے مبہم نعروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ کہتے تھے اور اخبار ان کا ڈھول پیٹتے تھکتے نہ تھے کہ پاکستان کی اصل طاقت اس کی نظریاتی سرحدیں یعنی اسلام ہیں۔ اگر جغرافیائی سرحدیں ٹوٹ بھی جائیں اور نظریاتی سرحدیں مضبوط ہوں تو انہیں واپس لیا جا سکتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مجیب کے چھ نکات، مولویوں کی بنگالیوں کے خلاف مہم، اخبارات کے ان پر غداری کے اثرات یحییٰ خاں کی سیاسی مستی اور بائیں بازو کے وہ دانشور جو کمیونسٹ پارٹی کی کلکتہ کانفرنس کے زیر اثر پاکستان کو حق خود اختیاری کی بنیاد پر توڑنا چاہتے تھے۔ سب کے سب امریکی کھیل کھیل رہے تھے۔ جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں۔

بھٹو صاحب نے انتخابات میں اسی سیٹوں پر جیت کر ایسا پھڈا ڈالا کہ ملک کے بچنے کی کوئی صورت نہ رہی۔ ان پر یہ الزام غلط ہے کہ اِدھر ہم اُدھر تم۔ ان کی سیاسی بصیرت کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے مجیب سے کہا تھا کہ چونکہ مغربی پاکستان میں ہم اکثریتی پارٹی ہیں اور مشرقی پاکستان میں تم تو کیوں نہ ہم دونوں پاکستان میں مخلوط حکومت بنائیں۔ یہ بات غیر جمہوری تھی اور بھٹو بے خبر نہ تھا۔

## اب بھوک ہڑتال

پروگریسو پیپرز سے نکلے ہوئے کارکن اب بھی اپنے ساتھیوں کے معاملات میں دلچسپی لیتے تھے۔ انہیں شدت سے احساس تھا کہ حکومت نے دھوکے سے ہماری ہڑتال ختم کروادی ہے۔ پھر وعدے کے برعکس فعال کارکنوں کو نکلوا دیا۔

روٹی بڑی بری چیز ہے۔ اب پرانی یونین کے لوگ میٹنگز میں بھی نہ آتے تھے۔ انتظامیہ کے شیخ صاحب شراب کی بوتل ہاتھ میں لے کر صحن میں آ کر للکارتے کہ سرخو! باہر نکلو پھر انہوں نے ایک بوتل ایک



چپڑاسی کے سر پر دے ماری۔ وہ بیچارہ تپ دق کا مریض تھا، زمین پر گر پڑا۔

یونین کا سیکریٹری نوکری سے برخواست ہو چکا تھا۔ قرعہ فال میر صاحب کے نام پڑا۔ وہ ایک جلالی فقیر تھا۔ مارکسی عالم تھا اور جس پر اڑ جاتا بس اڑ جاتا۔ فیصلہ ہوا کہ بھوک ہڑتال کی جائے۔

خبر نکلی تو چاروں طرف سے حمایت اور ہمدردی کے پیغام آنے لگے۔ بھٹو کی پارٹی کے کچھ لوگ بھوک ہڑتال میں شامل ہو گئے۔ بات بڑھ سکتی تھی۔ یحییٰ خاں پریشان ہو گیا۔

بھٹو کو اس کے مشیروں نے سمجھایا کہ یہ سارا سلسلہ روسی سوشلسٹوں کا ہے۔ حالانکہ اس لڑائی سے روسیوں اور چینیوں کے نظریاتی اختلافات کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ بھٹو یحییٰ خان کو پریشان کرنا نہ چاہتا تھا۔ اس نے اپنے لوگوں کو بھوک ہڑتال میں شامل ہونے سے روکا مگر دمامے بج چکے تھے اور اب کسی کا پیچھے ہٹنا محال تھا۔

## بھوک ہڑتال

صبح سویرے دفتر کے سامنے پھر دریاں بچھ گئیں۔ چھ آدمی بھوک ہڑتال پر بیٹھ گئے۔ آن کی آن میں سارا شہر اس چھوٹی سی سڑک پر امڈ آیا۔ نعروں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

شام کو جمال اپنے نئے دفتر سے فارغ ہو کر مورچے پر پہنچا تو میو ہسپتال کے گیٹ کے سامنے ایک بریگیڈیئر صاحب مسلح جوانوں کا دستہ لیے کھڑے تھے کہ ڈپٹی کمشنر صاحب کہیں تو سب کو بھون کر رکھ دوں۔

ڈپٹی کمشنر صاحب اپنی پولیس کی حفاظت میں ہجوم کے ریلوں کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے مگر سینوں میں آگ بھری ہوئی تھی۔ لوگ پولیس کا گھیرا توڑنا چاہتے تھے۔ ایک طرف سے لاٹھی چارج ہوتا تو وہ دوسری طرف سے نکل آتے۔ لوگ بھاگے تو جمال بھی بھاگا مگر وہ اچانک رک کر نعرۂ تکبیر کا غلغلہ بلند کرنے لگا۔ بھاگتے ہوئے قدم رک گئے۔ پولیس پر پتھر برسنے لگے۔ پھر گیس کے گولے پھٹنے لگے اور چاروں طرف سفید رنگ کا زہریلا دھواں پھیل گیا۔

جمال بہت دیر ایک چھوٹی سی گلی کے دہانے پر کھڑا رہا۔ پولیس جس کو دیکھتی تھی، مارتی تھی۔

پھر رات کو کسی وقت پولیس بھوک ہڑتالیوں کو ٹرکوں میں ڈال کر لے گئی اور وہ کیمپ جیل میں پہنچا دیئے گئے۔

ایک گاؤں سے پیغام آیا کہ ہم آ کر اپنے ہل جلاتے ہیں۔ ہم زمین کاشت نہیں کریں گے۔ اس آگ کو جمال نے اخبار کے ذریعے اور بھڑکایا۔ ایڈیٹر صاحب جمال کے اداریئے پڑھ کر شائع کرتے تھے۔ ان کا پیٹھ پیچھا ہے۔ انہوں نے بہت کھایا، کمایا اور اب امریکہ کے شہری ہو گئے ہیں مگر انہوں نے جمال کی تحریر اور تجزیوں سے کبھی اختلاف نہیں کیا۔ زبان کی بات اور ہے۔ لال پنسل سے وہ اس کی املا کی تصحیح کر دیتے تھے اور بعض اوقات صحیح کو غلط لکھ دیتے تھے۔

عوامی سطح پر لانا چاہتا ہوں۔

## جیل کے اندر

کیمپ جیل میں ہڑتالیوں کی بیرک میں کچھ مولوی حضرات بھی نظر بند تھے۔ پاکستان میں کسی زمانے میں کوئی کتاب چھپی تھی جس میں اکابرین اسلام کی فرضی تصویروں کے عکس شامل تھے۔ اب بھٹو کی انقلابی تحریک سے گھبرا کر علمائے کرام نے اس کتاب کے حوالے سے اسلام خطرے میں ہے کا نعرہ لگایا اور ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اس پر وہ گرفتار ہوئے تھے۔

ان علمائے کرام کے کچھ مریدانِ باصفا بھی ان کے ساتھ تھے۔ یہ بزرگوار قیدیوں اور مجرموں کو بتاتے کہ انقلاب کفر ہے کیونکہ یہ رضائے الٰہی سے بغاوت کے مترادف ہے۔ ان کے مرغ پلاؤ کے خوان باہر سے آتے تھے جن پر ہتھے مار کر وہ ڈکار مارتے تو بیرک گونجنے لگتی۔ جب انہیں پتہ چلا کہ جیل میں بھوک ہڑتالی آئے ہیں تو انہوں نے فتویٰ دیا کہ بھوک ہڑتال حرام ہے کیونکہ اس کا مطلب ہے کہ اللہ کی نعمتوں سے انکار۔

پھر انتظامیہ کے کارندے جیل میں بھیجے گئے کہ سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ تم بھوک ہڑتال چھوڑ دو۔ برخاست شدہ لوگ واپس لے لیے جائیں گے۔

بارہ روز اسی طرح گزر گئے۔

تحریک پھیل چکی تھی۔ شیخ مجیب نے بھی ہمدردی کا بیان دیا مگر رسمی۔ یحییٰ خاں سے براہِ راست کوئی بھی ٹکر لینا نہ چاہتا تھا۔

## یعنی ردِ انقلاب؟

شام کو جمال اداریہ لکھ کر اخبار دیکھ رہا تھا کہ ایڈیٹر صاحب گھبرائے ہوئے آئے اور بولے ''غضب ہو گیا۔ ردِ انقلاب ہو گیا۔''

جمال بھونچکا رہ گیا۔ اس نے کہا ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ عوام مزدوروں کے حق میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ فوجی حکومت پریشان ہے۔ کیا یہ ردِ انقلاب ہے۔''

''چیئرمین بہت غصے میں ہے۔'' وہ بولے۔ ''وہ نہیں چاہتا کہ ہمارا اخبار اس میں ملوث ہو۔ ہم نے اب تک جو کچھ لکھا ہے اس کی تلافی کرنی پڑے گی۔ عوام کو صحیح راستے پر لانا پڑے گا۔ انقلاب مرحلہ وار آتا ہے۔ شورش سے تحریک کو نقصان پہنچتا ہے۔ ان خطوط پر آپ ایک اداریہ لکھیں۔''

جمال نے آج تک اپنے ضمیر کے خلاف کچھ نہ لکھا تھا۔ اس نے کہا ''یہ اداریہ آپ خود لکھیں اور اس کے نیچے اپنے دستخط بھی کریں تاکہ چیئرمین کو آپ کی وفاداری کا یقین آ جائے۔''

ایڈیٹر صاحب نے اداریہ لکھا اور کہا ''بھوک ہڑتالی اصل میں انقلاب دشمن ہیں اور پارٹی کو نقصان پہنچانا ہی ان کا اصل مقصد ہے۔'' ایسی الٹی زقند کسی لیڈر نے چڑیا گھر میں بھی نہ لگائی ہو گی۔



بھٹو اگلے روز لاہور آیا تو ایک زبردست جلوس نے اس کا استقبال کیا۔ لوگ بھوک ہڑتالیوں کے حق میں نعرے لگانے لگے۔

اس نے کہا ''تم میری بات نہیں سنتے تو میں واپس جاتا ہوں۔'' اس پر لوگوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ نعروں نے لاٹھیاں پکڑ لیں۔ پہلے گارڈ ننگے ہو کر ناچنے لگے۔ بھٹو یہ دیکھ کر سیدھا کیمپ جیل کی طرف چل دیا۔

کیمپ جیل میں اس نے اپنے ایک معتمد بھوک ہڑتالی سے کہا ''تم بھوک ہڑتال چھوڑ دو کیونکہ تم نے پارٹی سے اس کی اجازت نہیں لی تھی۔''

اس نے کہا ''اب بارہ دن گزر چکے۔ ہم بہت دور آ چکے ہیں۔''

بات معقول تھی۔

بھٹو نے چیف سیکریٹری سے بات کی۔ اس نے اوپر بات کر کے برخاست شدوں کی بحالی کے احکامات جاری کر دیئے تو بھٹو نے اپنے ہاتھ سے اپنے لیڈروں کو مالٹے کا رس پلایا۔

میر صاحب نے گاڑی گھر سے منگوائی۔ اپنے ساتھیوں کو اس میں ڈال کر انہیں ہسپتال پہنچایا۔ اس کے چہرے پر نقاہت تھی مگر اس کے قدم مضبوط تھے۔

جمال کو چیئرمین اور پیپلز پارٹی کے لیڈروں کے بارے میں شبہ ہوا۔ جن لوگوں کو بھٹو نے اپنے گرد جمع کر رکھا ہے، وہ کون ہیں؟

مگر جمال خود بھی بے خبر تھا۔ بھٹو کے ساتھی اسے کوئی غلط مشورہ نہ دے سکتے تھے۔ وہ اسے وہی مشورہ دیتے تھے جو وہ چاہتا تھا۔

جمال نے بھٹو کو تو معاف کر دیا مگر ایڈیٹر اس کی نظروں سے گر گیا۔ بالآخر وہ ایک چھوٹا دکاندار ہی نکلا جو شام کو اپنا منافع گن لیتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس نے حمائل شریف بیچی ہے یا گناہ کی لذیذ راتیں۔ پاکستان میں ایسے ہی لوگ ترقی کر سکتے ہیں۔ جمال جیسوں کا تو نگری نگری دل بھٹکتا رہتا ہے۔

## نوبت بجتی ہے

بھٹو کو پاکستان میں تیس بتیس سیٹوں کی امید ہو چلی تھی، جب انتخابات کی نوبت بجی۔ اس نے سب جگہوں پر امیدوار بھی کھڑے نہیں کیے تھے مگر سب جگہوں پر کسی بھی پارٹی نے امیدوار کھڑے نہیں کیے تھے۔ پاکستان میں اتنے امراء کہاں کہ سب کی پوری پڑ جائے اور اس کی وجہ پاکستان کا فرسودہ زرعی نظام تھا جس میں کوئی نیا آدمی سیاسی اکھاڑے میں اتر ہی نہ سکتا تھا۔ وہی گنے چنے پانچ سو خاندان تھے جن پر قائداعظم کو بھروسہ کرنا پڑا تھا۔ انگریز کے بھروسے کے بھی وہی لوگ تھے۔ وہی اب بھٹو کی گود میں آ بیٹھے تھے مگر پیپلز پارٹی کو کچھ مڈل کلاسیوں، کچھ روشن خیال وکیلوں اور کچھ چھوٹے زمینداروں کو بھی جگہ دینی پڑی خاص طور پر پنجاب میں۔

تھا۔اردو اور مُلا کے بغیر مرکز ان کی گرفت سے نکل جاتا۔ پاکستان میں کراچی کا سیاسی کردار ہمیشہ کے رجعت پسندانہ اور کلچر کے حوالے سے جارحانہ رہا۔

انتخابات میں سب سے کم خرچ پیپلز پارٹی کا آیا۔ بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر انتخابات ایک نیا تجربہ تھے۔عورتوں کو بھی ووٹ کا حق حاصل تھا اور عورتوں پر بھٹو نے جادو ڈالا ہوا تھا۔معاشی مسائل کے علاوہ بھٹو کی مقبولیت میں اس کی شکل وصورت، اس کے انداز بیان اور اس کی شخصیت کا بھی دخل تھا۔انتخابات میں بھٹو کے دشمنوں کی بیویاں اپنے خاوندوں کی مرضی کے خلاف بھٹو کو ووٹ دے آئیں۔نتیجہ نکلا تو سب کی سٹی گم ہوگئی حتیٰ کہ بھٹو کی بھی۔اسے ہرگز گمان نہ تھا کہ میں مغربی پاکستان میں اکثریتی پارٹی کا لیڈر بن جاؤں گا اور اسّی سیٹیں لے جاؤں گا۔

## یادش بخیر!

اس احوال کے شروع میں ایک بے کس مولوی صاحب کا ذکر اس حوالے سے آیا ہے کہ ایوب خاں کی حکومت رشوت پر بیس روپے معاوضے پر ایک مضمون لکھوانا چاہتی تھی جس کے لیے مولوی نیاز علی کوثر سے رابطہ قائم ہوا تو انہوں نے افسر متعلقہ سے پوچھا تھا حضور مضمون رشوت کے حق میں مطلوب ہے یا اس کے خلاف؟

یہ مولوی نیاز علی کوثر بلند ارادے رکھتے تھے اور ہمارے ملک میں مذہب کے نام پر سیاست کرنے والے کبھی ناکام نہیں ہوتے۔انہیں کسی خاص اقتصادی یا سیاسی نظام کا وعدہ بھی کرنا نہیں پڑتا۔ چرب بیانی کے ساتھ اسوہ رسولؐ کے بیان پر گرفت ہو تو کامیابی اور مقبولیت پیچھے پیچھے پھرتی ہے تو مولوی صاحب چرب زبان بھی تھے، خطابت کے علاوہ حضور کی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات اور حضور کا حلم و نیاز بھی ان کی دسترس سے باہر نہ تھا مگر وہ ذرا زیادہ ذہین تھے۔ جانتے تھے کہ مولوی اگر منبر سے اترتا ہے تو اسے زمین ہموار ملتی ہے، مگر وہ اکیلا ہوتا ہے۔ وہ جماعت اسلامی سے نکالے جا چکے تھے۔اس لیے انہوں نے سیاسی جماعت کی تلاش میں شیخ مجیب الرحمان سے رابطہ کیا اور مغربی پاکستان میں ان کے نمائندے بن گئے مگر دونوں صوبوں میں بُعد بہت تھا۔ یہاں میدان غزل تنگ نظر آیا تو انہوں نے سوچا ملک بھٹو کے بائیں بازو کے نعروں کا دیوانہ ہو رہا ہے کیوں نہ پرانی کمیونسٹ پارٹی کے سماجی طور پر متحرک کارکنوں سے دوستی کی جائے۔

یہ بھی ہوا مگر جو لوگ ان کے ہاتھ لگے ان کی اپنی شہرت موقع پرستی کی تھی۔ پھر انہوں نے اور راستہ نکالا اور بھٹو کے اخبار کے ایڈیٹر سے دوستی لگائی اور کہا حضرت بھٹو کو ایک مولوی کی ضرورت سیاسی طور پر ہے کہ نہیں ہے؟ میں سارے مولویوں کے نقدِ علم سے واقف ہوں۔ بھٹو صاحب میرے سر پر ہاتھ رکھیں تو میں باقی سب کا ناطقہ بند کر دوں گا۔ کسی طرح ان کی شام کی محفل میں مجھے بھی لے چلو۔

## شام کی محفل

ایڈیٹر صاحب نے کہا ''شام کو وہ پیتے ہیں اور صرف اپنے خاص دوستوں ہی سے ملتے ہیں۔''



مولوی صاحب بولے ''حضرت میں تو دنیادار آدمی ہوں۔ مذہب تو میرا دوسرا روپ ہے۔ مجھے بھی ان کے ساتھ کبھی دو گھونٹ پلوا دو۔''

چنانچہ مولوی نیاز علی کوثر شام کی مجلسوں میں جا پہنچے۔ان کے لیے وہسکی کوکا کولا کی بوتل میں آتی تھی کیونکہ بھٹو کو مولوی کا بھرم تو رکھنا تھا۔

رفتہ رفتہ مولوی نیاز علی کوثر اپنی چرب زبانی اور اپنی ذہانت کے طفیل بھٹو صاحب کے مجلسی ہو گئے۔

بھٹو صاحب میں دو خامیاں تھیں۔ایک تو وہ پرلے درجے کے خوشامد پسند تھے، دوسرے وہ اپنے ساتھیوں کی توہین کرکے خوش ہوتے تھے۔مولوی صاحب دونوں میدانوں کے فرد تھے۔

دفتر میں بھی ان کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔لوگ ڈرنے لگے کیونکہ بھٹو صاحب کانوں کے کچے تھے اور سخت شکی آدمی بھی۔

بھٹو اور مجیب میں جھگڑا چلا آتا تھا۔یحییٰ خان اپنی شطرنج کھیل رہا تھا اور امریکی اپنی چالیں چل رہے تھے۔

## ملک ٹوٹا

یہ بہت دردناک داستان ہے اور اس کا بیان مورخ کا کام ہے جو اس کے تمام محرکات سامنے لائے اور اس کے مدارج بتائے کیونکہ ملک یکلخت نہیں ٹوٹا بلکہ اس کے ٹوٹنے کی بنیاد پہلے ہی دن رکھ دی گئی تھی۔

یہ تو سب کو پتہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں قتلِ عام جاری ہے مگر اس کی تفصیل کسی کو معلوم نہیں تھی۔ خبروں پر سخت سنسر تھا۔ یہ بھی کسی کو معلوم نہیں تھا کہ مکتی باہنی اور دیگر بے شمار باہنیوں نے مغربی پاکستان کے ان عورتوں اور بچوں کے گلے بھی بے دردی سے کاٹے جوان کے ہاتھ لگے مگر یہ سب کو پتہ تھا کہ ہندوستان نے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا ہے۔ جنرل نیازی ان کے چھکے چھڑا رہا ہے اور ہندوستانی فوجیوں کے کشتوں کے پشتے لگ رہے ہیں، مگر اچانک جب یہ خبر ملی کہ جنرل نیازی نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور ملک ٹوٹ گیا ہے تو لوگ سُن ہو گئے۔ رونے کی بھی کسی میں سکت نہ رہی۔

بھٹو سکیورٹی کونسل میں پاکستان کا مقدمہ پیش کر رہا تھا۔ جب پاکستان کو شکست ہوئی۔ دو روز کے بعد وہ واپس آیا تو یحییٰ خان نے اس سے کہا ''بھٹو! یہ ملک نہیں چلے گا۔ اسے اندرا کے حوالے کر دو۔'' بھٹو نے جواب دیا ''یحییٰ خاں یہ ملک چلے گا۔ میں ریزہ ریزہ اکٹھا کروں گا اور جلتی ہوئی کشتی کو کنارے پر لاؤں گا۔''

## جلتی ہوئی کشتی

اصل میں وہ امریکہ سے پاکستان کی صوبہ داری کی منظوری لے آیا تھا۔ امریکہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ ہندوستان اتنا طاقتور ہو جائے کہ بحرِ ہند کے اُس پار اس کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہ رہے۔ اندرا چاہتی تھی کہ وہ مغربی پاکستان کو بھی روند ڈالے اور اس نے لال قلعے کی دیوار پر تقریر میں کہا کہ ہم نے یعنی ہم ہندوؤں نے

ہزار سال کے دکھوں کا بدلہ لے لیا ہے۔

امریکہ نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی مگر وہ نہ مانی تو اس نے روس کو لکھا کہ اسے مغربی پاکستان پر ہاتھی کھول دینے سے منع کرو۔

وہ بحرِ ہند میں اپنے لیے ایک پائیدان محفوظ کرنا چاہتا تھا۔

روس کے کہنے پر اندرا رُک گئی۔ اس مختصر سی جنگ کے دوران پاکستانی جرنیلوں اور افسروں کی ذلیل حرکتوں کی خبریں عام ہو چکی تھیں۔

## شامتِ اعمال

عین اسی وقت جب بھٹو اسلام آباد میں پاکستان کی صدارت کا حلف لے رہا تھا، لاہور میں جمال جلے دل کے ساتھ جرنیلوں کے کردار پر اداریہ لکھ رہا تھا۔ قوم پرستی فرض شناسی، حُبِ وطنی اور ایثار کا اس کے معمولات میں کوئی مقام نہیں۔ فوج میں افسر اور جوان کا رشتہ آقا اور غلام کا ہے، جوانوں کو چاہیے کہ وہ ہمیں مغربی پاکستان کے محاذ پر اپنے مشاہدات سے آگاہ کریں۔ ہم ان کے نام حذف کر کے ان کے خطوط شائع کر دیں گے تاکہ قوم کو حقیقتِ حال کا کچھ پتہ چلے۔

اگلے روز جب جمال تانگے پر دفتر آ رہا تھا تو اسے ضلع کچہری کے پاس تین جوان ایک فوجی گاڑی میں مال کی طرف جاتے دکھائی دیئے۔ ایک ریہڑے والا جیسے کہ ریہڑے والوں کی عادت ہے، ٹریفک سگنل کی پرواہ کیے بغیر فوجی گاڑی کے آگے سے نکل گیا۔ جوانوں نے اپنی گاڑی چوک کے بیچ روک دی اور اتر کر ریہڑے والے کو ٹھڈے مارنے لگے۔ کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ ان کا ہاتھ پکڑ لے۔ ٹریفک کا سپاہی بھی ٹُر ٹُر تکتا رہا۔ فوج کی دہشت دلوں پر طاری تھی۔

جمال کا خون کھول رہا تھا۔ جب وہ دفتر پہنچا ابھی اس نے قلم کاغذ سیدھا نہ کیا تھا کہ دو میجر وردیاں پہنے پستول لگائے اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک ان میں سے بہت خوبصورت اور گٹھا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی پوچھا ''یہ اداریہ کس نے لکھا ہے؟''

جمال نے للکار کر جواب دیا ''میں نے لکھا ہے۔''

''آپ کو پاکستان کی مسلح افواج کی توہین کرنے کی جرأت کس طرح ہوئی۔'' اس نے غصے سے کہا ''کیا آپ جانتے ہیں کہ اس پر آپ کو گرفتار کیا جا سکتا ہے؟''

جمال پھٹ ہی پڑا۔ اس نے کہا ''تم دونوں اور تمہارے بڑے بڑے غلط لوگ ہیں۔ یحییٰ خاں خاص طور پر۔ تم کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تم اخبار کے دفتر میں آؤ اور بکواس کرو۔ تم کہ ہارے ہوئے کتے ہو۔''

خوبصورت افسر بوکھلا گیا۔ دوسرے نے بغل کی لکڑی جمال کی میز پر ماری اور کہا ''زبان سنبھال کر بات کرو۔ تم اس وقت پاکستانی افواج کے دو جنٹلمین افسروں سے مخاطب ہو۔''



جمال نے کہا ''تم جنٹلمین افسر نہیں، بزدل ہو اور تم ہو کون۔ نام بتاؤ اپنے؟''

خوبصورت افسر نے کسی قدر ملائمت سے جواب دیا۔ ''ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارے خلاف کیوں لکھا گیا ہے۔ ہم نہ ہوں تو پاکستان کی حفاظت کون کرے گا؟''

''کیا تم نے پاکستان کی حفاظت کی؟''

''ہم تو لاہور فرنٹ پر تھے۔''

''تم اب بھی لاہور فرنٹ پر ہو مگر تمہاری گولیوں کا رخ ہماری طرف ہے۔''

''ایسٹرن کمانڈر کا فیصلہ تھا۔ جی ایچ کیو کا حکم تھا۔ اس لیے جنرل نیازی نے ہتھیار ڈالے۔ ڈھاکے میں مزید لڑنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ آپ لوگوں کو فوجی امور کا کچھ پتہ نہیں ہوتا، جو جی میں آئے لکھ دیتے ہو۔'' وہ بولا۔

''ہم تمہیں کھول دیں گے۔ تمہارا نام کیا ہے بولو، کس پلٹن سے تعلق رکھتے ہو؟''

''چلو چلو'' بدصورت افسر نے اپنے ساتھی سے کہا ''ان سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

خوبصورت افسر بولا ''ہم تو بات کرنے آئے تھے۔ آپ لوگوں کو افسروں سے بات کرنے کی تمیز ہی نہیں۔''

پھر دونوں افسر منمناتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ جمال کی آخری گالی بھی انہوں نے نہ سنی۔

## یو آر ڈس مسڈ!

اسی شام اسلام آباد سے اچانک بھٹو صاحب کا فون آیا اور انہوں نے انگریزی میں جمال کو دھواں دھار ملاحیاں سنائیں۔ ایسی روانی کے ساتھ کہ وہ کسی بات کا جواب نہ دے سکا۔ آخر میں انہوں نے کہا ''یو آر ڈس مسڈ!''

جمال اس روز کا کام ختم کر چکا تھا مگر وہ بیٹھا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مجھ سے ایسی کون سی خطا ہو گئی ہے جو کچھ میں نے فوج کے بارے میں لکھا تھا، وطن اور عوام کے حوالے سے لکھا تھا۔ بھٹو صاحب اس سے اتنے بگڑ کیوں گئے؟

گھنٹے بھر کے بعد ایڈیٹر صاحب کسی قدر فکرمند چہرے کے ساتھ اس کے کمرے میں آئے اور بولے ''آپ کو اب ذرا احتیاط کرنی چاہیے۔ اب بھٹو صاحب پاکستان کے صدر ہیں اور فوج کی ساکھ ان کی ساکھ ہے۔ صاحب آپ سے بہت ناراض ہیں۔''

''مگر صاحب کیوں ناراض ہیں؟''

''آپ دیکھتے نہیں کہ ہم کس قسم کے حالات میں سے گزر رہے ہیں۔ پچھلے سو برس میں کسی کو یوں فوج کے خلاف لکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ آپ نے تو بیڑا ہی غرق کر دیا۔''

''اب یہ فوج ہماری ہے۔ ہم اس کا وقار گرا نہیں سکتے! پارٹی کو اس کی حمایت کی ضرورت ہے۔''

''ہمیں فوج کی حمایت کی نہیں عوام کی حمایت کی ضرورت ہے۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ پاکستان کیوں ٹوٹا؟'' جمال بولا۔

ایڈیٹر صاحب بولے ''آپ ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ آپ بہت ایماندار ہیں۔ بچوں کی طرح سچ بول دیتے ہیں۔ زندگی سے کچھ سیکھتے نہیں۔''

جمال کو سکتہ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں جواب میں کیا کہوں ایڈیٹر صاحب بظاہر بہت سنجیدہ تھے مگر ان کے چہرے پر تناؤ نہیں تھا۔ مسکرانے کی انہیں عادت تھی مگر وہ مسکرا بھی نہیں رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا ''صاحب کا ٹیلی فون مجھے بھی آیا تھا۔ انہوں نے کہا، مجھے فوج کے تعاون کی ضرورت ہے۔ فوج کے خلاف کچھ مت لکھو ورنہ......''

''ورنہ کیا؟''

کچھ رک کر وہ مسکرائے اور بولے ''جس وقت انہوں نے آپ کو ٹیلی فون کیا تھا اس وقت کمانڈر انچیف ان کے کمرے میں موجود تھا۔ اس نے اپنی ٹوپی صاحب کی میز پر پھینک کر کہا تھا۔ ایک طرف تو ہم آپ کو صدر بنواتے ہیں اور دوسری طرف آپ اپنے اخبار میں ہمیں گالیاں دیتے ہیں۔ پھر فوج سے تعاون کی مزید امید نہ رکھیے۔''

مگر بھٹو صاحب تو اردو نہیں پڑھ سکتے اور انہیں اداریئے کا کچھ پتہ نہ تھا اور جس وقت جمال اداریہ لکھ رہا تھا، اسے معلوم نہ تھا کہ بھٹو صاحب نے صدارت کا حلف لے لیا ہے اور یحییٰ خاں گرفتار ہو چکا ہے۔

''یہی میں نے بھٹو صاحب سے کہا تھا۔'' ایڈیٹر صاحب بولے ''ہم نے جو کچھ لکھا، یحییٰ خانی جرنیلوں اور فوج کے عمومی ڈھانچے کے بارے میں لکھا تھا مگر کمانڈر انچیف سخت غصے میں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اداریہ بھٹو صاحب نے لکھوایا ہے۔''

''تو پھر بھٹو صاحب کا کیا حکم ہے؟'' جمال نے پوچھا۔

ایڈیٹر صاحب نے مسکرا کر کہا ''جب انہوں نے آپ کو ٹیلی فون کیا تو کمانڈر انچیف ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کی تسلی ہو گئی۔''

''مگر میں تو ڈسمس ہو چکا۔'' جمال نے کہا۔

''صاحب نے کہا ہے آئندہ احتیاط!''

''تو میں ڈسمس نہیں ہوا؟''

''میرا خیال ہے کہ آپ ڈسمس نہیں ہوئے مگر احتیاط شرط ہے ورنہ بھٹو صاحب کو بھی گرفتار کیا جا سکتا ہے۔''



## خط ہمارے نام کے

دوسرے ہی دن دفتر میں جوانوں کے خطوں کا تانتا بندھ گیا۔ ان میں ایسے ایسے خوفناک واقعات کی تفصیلات تھیں جنہیں پڑھ کر ہوش اڑ جائیں۔ جوانوں کے دلوں میں افسروں کے خلاف سخت نفرت تھی۔ لاہور کے محاذ پر افسر مورچے چھوڑ کر گھروں میں جا کر سوتے تھے یا مورچوں میں شراب کے مٹکے پی کر بے ہوش ہو جاتے تھے۔ بعض نے مورچوں میں بازاری عورتیں بھی منگوا لیں۔ خندقوں سے کوئی نکلتا نہ تھا۔ سپاہی زخمی ہو کر گر جاتے تھے تو کوئی ان کو اٹھاتا نہ تھا۔ یہ سب باتیں سو فیصد صحیح نہ تھیں کیونکہ برے سے برے گروہ میں بھی ایک آدھ فرض شناس شخص نکل آتا ہے اور خط صرف وہی لوگ لکھتے ہیں جو ناراض ہوں۔

افسروں کے علاوہ بیگمات کے خلاف شکایات عام تھیں جو جوانوں سے گھریلو نوکروں کے کام لیتی تھیں مگر کہتی تھیں کہ کھانا میس میں جا کر کھاؤ۔

ظاہر ہے کہ یہ خط چھپ نہ سکتے تھے مگر ایڈیٹر صاحب نے بھٹو صاحب کو بتا دیا کہ آپ کی فوج کی اندرونی حالت کیا ہے۔ اب آپ فیصلہ کریں کہ آپ کو جرنیلوں کی مدد سے حکومت کرنی ہے یا جوانوں کے سہارے۔

جمال نے کہا ''آپ کو عوام پر بھروسہ کرنا چاہیے۔''

ایڈیٹر صاحب بولے ''عوام تو جذباتی ہوتے ہیں۔ وہ صاحب کی جیب میں ہیں ہی۔ اصل مسئلہ فوج کا ہے۔ تو بھٹو صاحب نے کہا ہے کہ تمہیں خط جتنے بھی آئیں وہ پیکٹ بنا کر مجھے بھیج دو اور پیکٹ پر لکھو کہ اسے صدر کے سوا کوئی نہ کھولے۔''

اس کے بعد بھٹو صاحب ماؤ کی ٹوپی پہن کر ہر چھاؤنی میں پلٹن پلٹن گھومے، جوانوں کو الگ دلاسہ دیا اور افسروں کو الگ لارا لگایا۔ تھوڑے ہی دنوں میں جن جرنیلوں نے ان کو صدارت دلوائی تھی، انہیں ذلیل و خوار کر کے بھگا دیا گیا اور بھٹو صاحب پاکستان کے ڈکٹیٹر بن گئے۔ اپنی صدارت کے پہلے ہی مہینے میں انہوں نے نوجوان طلبہ کو جوان کی ترقی پسندی پر دل و جان سے یقین رکھتے تھے اور ان کے جلوس میں نظام کو تبدیل کرنے کے وعدے یاد دلاتے تھے، کہا کہ سٹریٹ پاور ول بی مٹ ود سٹیٹ پاور یعنی تم ترقی پسندوں کی ایسی تیسی، میری پولیس تمہیں سیدھا کر دے گی۔

بھٹو صاحب نے پرانے ادارے برقرار رکھے۔ بعض افسروں کو تبدیل کیا اور ان کی جگہ اپنے حواری متعین کیے۔ اخبار کے ایڈیٹر صاحب پنجاب کے وزیر خزانہ ہو گئے۔ شیخ رشید کو صحت کی مرکزی وزارت ملی کہ یہاں بیٹھ کر کون سا انقلاب کر لیں گے۔

وزارتیں اصل میں انقلابیوں کا قبرستان ہوتی ہیں۔ انقلاب کھیت کھلیان سے آتا ہے۔ حکومت کے اندر تو پولیس گارڈ، عمدہ کوٹھیاں، خوشامدیوں کے لشکر اور حکمرانی کی لذتیں ہوتی ہیں۔ پرانے اداروں نے

انقلاب کا مطلب تھا پرانے نظام کی جھاڑ پونچھ۔

مولانا صاحب جمال سے بہت خوش تھے۔

خوش تھے یا نہیں مگر وہ جمال سے تعلقات خوشگوار رکھنا چاہتے تھے۔ وہ پارٹی کے اخبار کا اداریہ نویس تھا اور استعمال میں آ سکتا تھا۔

بھٹو صاحب دنیا کے مختلف ممالک میں دورے کر کے غلط فہمیاں دور کرنا چاہتے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے روس کے سفر کی ٹھانی جسے یحییٰ خان نے ضرورت سے زیادہ ناراض کر لیا تھا۔ اب وہ بھٹو کی پہلی منزل تھی۔ جنرل نیازی اور پاکستانی افواج جنہوں نے پلٹن میدان میں جنرل اروڑہ کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے، ہندوستان کی قید میں تھے اور ملک سرنگوں تھا۔

بھٹو صاحب نے فیصلہ کیا کہ پاکستان کے سرکردہ صحافیوں کو بھی جہاز میں بٹھا لیا جائے تا کہ وہ واپس آ کر ہمدردانہ تبصرے لکھ سکیں۔ جمال سرکردہ صحافی تھا یا نہیں مگر وہ پارٹی کے اخبار کا اداریہ نویس تھا اور اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جمال بھی اس دورے پر بڑا پر جوش تھا۔

سفر سات گھنٹے کا تھا۔ اسی دوران بھٹو صاحب ایک ایک صحافی کو اپنے کیبن میں بلواتے اور اس سے پوچھتے کہ میں کوسی جن سے کس طرح بات کروں۔ اس کا صحیح جواب کوئی بھی دے نہ سکتا تھا مگر ان کا اصل مقصد صحافیوں کو ٹٹولنا تھا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔

## بول کیا مانگتا ہے؟

جمال سے انہوں نے یہی سوال کیا تو اس نے اس سوال کا کوئی احمقانہ جواب دیا جس پر بھٹو صاحب خوش ہو گئے اور پوچھنے لگے، ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں۔

یہ سوال بھٹو صاحب ہر آدمی سے پوچھتے، جس کی ان تک رسائی ہو جاتی اور اگر وہ بے ضرر ہوتا تو اس کی خواہش پوری بھی کر دیتے۔

جمال نے کہا ''شکریہ جناب، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔''

یہ سن کر بھٹو صاحب مصنوعی جلال میں آ گئے اور بولے ''کیا تمہارے خیال میں پاکستان کا صدر تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا؟''

اس زمانے میں وہ پاکستان کے صدر تھے۔

''یہ بات نہیں جناب۔'' جمال نے متانت سے جواب دیا۔ ''دراصل میں نجی ملکیت پر یقین نہیں رکھتا۔''

یہ جواب سُن کر بھٹو صاحب ایک لمحے کے لیے سُن ہو گئے پھر بولے ''مجھے یہ بات اچھی لگی مگر دوست ایک دن تم پچھتاؤ گے ضرور۔''



خدا کا شکر ہے کہ جمال اس بات پر کبھی نہیں پچھتایا حالانکہ اس کا طبقاتی مقام 2002ء میں بھی وہی ہے جو 1947ء میں تھا یعنی نہ گھر، نہ باقاعدہ ملازمت، نہ باقاعدہ آمدنی، نہ کوئی بچت کہ کسی ناگہانی میں کام آئے۔

ماسکو میں سردی بہت تھی۔ وہ ننگے سر باہر نکلا تو لگا کہ دماغ جم گیا ہے مگر وہ روسیوں کی ہر حرکت کو توجہ اور دلجمعی سے دیکھتا تھا۔

اسے اس بات پر کسی قدر حیرت ہوئی کہ بازار میں کسی قسم کا کوئی اشتہار نہیں۔ اخبار میں خبر لگ جاتی تھی کہ فلاں سٹور پر فلاں شے دستیاب ہے اور لوگ قطار در قطار خریداری کر لیتے تھے۔

جمال کو یہ جان کر تعجب ہوا کہ روس میں اشیائے صرف کی سخت قلت ہے حالانکہ سائنس میں اس نے محیر العقول ترقی کی ہے۔ اس زمانے میں شرٹس کمیاب تھیں مگر اسے یہ دیکھ کر اور بھی حیرت ہوئی کہ نوجوان روسی اس سے جین پتلون منہ مانگی قیمت پر خریدنے پر تیار ہیں۔

پھر اس نے بازاروں میں لڑکوں لڑکیوں کے عجیب و غریب ہیئر سٹائل دیکھے۔ پاپ میوزک کا رواج بھی ہو رہا تھا یعنی مغربی کلچر روس میں در انداز تھا اور اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔

## ماسکو میں مایا کا فلسفہ

کوسی جن اور بھٹو کی بات چیت کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھی اور اس کی ٹیم سے بھی میزبانوں کا رویہ اچھا نہ تھا۔ اس لیے جب صحافیوں کو ماسکو پریس کلب میں چائے کی دعوت ملی تو سب لوگ کسی قدر محتاط تھے۔ جمال کو شدید احساس تھا کہ مارکسزم میں میرا مطالعہ ایسا نہیں کہ میں روسیوں سے ہم کلام ہو سکوں کیونکہ ان کی تعلیم کی بنیاد ہی جدلیاتی مادیت پر قائم ہے اور یہی وجہ ان کی سائنس ترقی کی ہے۔

وہ چائے کی پیالی لیے ہجوم کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے میزبانوں میں مقامی صحافیوں کے علاوہ جو مشرق وسطیٰ، یورپ، امریکہ، مشرق بعید اور دنیا کے دیگر منطقوں کے ڈسک انچارج بھی شامل تھے یعنی ماسکو کے دانشوروں کی کریم وہاں موجود تھی۔

اسے اکیلا دیکھ کر ایک روسی دانشور اس کے پاس آیا۔ ترجمان اس کے ساتھ تھا۔ اِدھر اُدھر کی بات کرنے کے بعد اس نے کہا ''چونکہ تم ہندوستانی ہو......''

''......میں ہندوستانی نہیں ہوں، پاکستانی ہوں۔'' جمال نے بات کاٹ کر کہا۔

''ایک ہی بات ہے۔'' وہ بولا۔ ''مجھے تم سمجھا دو کہ مایا کا فلسفہ کیا ہے۔ یہ ہندو فلسفی بلا کے لوگ ہیں۔''

''مگر میں ہندو فلسفی نہیں۔'' جمال نے کہا۔

''ایک ہی بات ہے۔ تم بہر حال بات تو سمجھتے ہو گے۔'' وہ بولا ''کل تک تم ایک ہی ملک تھے۔''

''مگر تم تو مارکسسٹ ہو۔ مارکسزم کیا کہتی ہے۔'' جمال نے جوابی حملہ کیا۔

وہ کھلکھلا کر ہنسا اور کہنے لگا ''مارکسزم بڑی اولڈ فیشنڈ بات

جمال چکرا گیا۔ یہ شخص جو ماسکو کا دانشور ہے مارکسزم کو اولڈ فیشنڈ کہتا ہے اور ہندو تصورِ کائنات کا فریفتہ ہے یعنی یہ مادی جدلیات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ مارکسی علم سے بے بہرہ ہے۔

جمال کے لیے اس بات کا یقین کرنا مشکل ہوا مگر صورتِ حال ایسی ہی تھی۔

اس نے کہا ''کہ مایا کا مطلب ہے حلقۂ دامِ خیال یا فریبِ نظر ہندو فلسفی کائنات کو مادی حقیقت نہیں سمجھتے بلکہ فریبِ نظر کہتے ہیں۔ کیا تم اس بات پر یقین کر لو گے؟ تم جو لینن کے بیٹے ہو؟''

''لینن نے جو بیٹے چھوڑے تھے وہ مر چکے۔ اس کا سسٹم بھی ناکام ہو چکا۔ ماسکو میں دکانیں خالی پڑی ہیں اور ہمارا بوڑھا صدر کرسی چھوڑتا نہیں۔'' اس نے کہا۔

اتنے میں جمال کے گرد ایک چھوٹا سا ہجوم ہو گیا۔ لوگ بات دھیان سے سن رہے تھے مگر کسی نے گفتگو میں مداخلت نہیں کی۔ مارکسی فلسفے کا دفاع کسی نے نہیں کیا۔ غالباً ان میں سے اکثر اس کی مبادیات سے بھی واقف نہ تھے۔ وہ اس کا اچھا برا حالاتِ حاضرہ کے حوالے سے دیکھتے تھے اور یہ بات جمال کے نزدیک حیرت ناک تھی۔ کیا ان کے نصاباتِ تعلیم کسی نظریئے سے لیس نہیں تھے؟

تھوڑی دیر کے بعد ایک سانولا سا شخص اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ جمال کے پاس آیا اور بولا

''السلام علیکم!''

## ازبکستان سے سلام

پھر اس نے فارسی میں بات کرنے کی کوشش کی۔ جمال اتنا تو سمجھ گیا کہ مسلمان ہے اور اس کا اعلان کرنے سے بھی نہیں گھبراتا مگر اس کا فارسی لہجہ جمال کے بس کی بات نہ تھی، ناچار اس نے ایک سفید روسی ترجمان کو بلایا جو فارسی کا انگریزی میں ترجمہ کر سکتا تھا۔

اس نے کہا ''میرا نام مراد ہے۔ میں ازبکستان پریس کلب کا صدر ہوں اور آج کل ماسکو میں ہوں۔ مجھے تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ تم پہلے پاکستانی ہو جس سے میری ملاقات ہوئی۔''

''ہاں ہمارے تمہارے تعلقات قدیم ہیں۔ ہمارا بابر بادشاہ ازبک تھا۔'' جمال نے جواب دیا۔

''ہمارے تمہارے تعلقات کی بنیاد یہ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔''

اور وہ یہ باتیں سفید روسی ترجمان کی وساطت سے کہہ رہا تھا۔

وہ بولا ''ہم مسلمان ہیں مگر ان لوگوں کے ساتھ ہیں کیونکہ ان کا نظامِ تقسیم دولت بہت اچھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ازبکستان کو مغربی پاکستان کی توسیع سمجھتے ہیں۔''

اور یہ بات زاروں کے اس فلسفے کی صریح تردید تھی جو انیسویں صدی میں ہندوستان کے گرم پانیوں پر حق شفع جتاتے تھے۔ کم سے کم انگریزوں نے اپنی کتابوں میں یہی لکھا ہے اور پاکستان کے حکمران بھی اسی کی گردان کرتے تھے۔ سرخ فوج کی نظر کراچی پر ہے اور یہ ایک وجہ تھی جو انگریز ہندوستان کی تقسیم کے خلاف



استعمال کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اکیلا پاکستان روسی افواج کی پیش قدمی کو روک نہ سکے گا۔ خود روسیوں نے کبھی ایسا اشارہ نہیں کیا تھا اور ہم خدا واسطے ان کے خون کے پیاسے رہے مگر یہ مراد عجیب بات کر گیا یعنی بجائے اس کے کہ وہ کہتا مغربی پاکستان ازبکستان کی توسیع ہے، اس نے سفید روسیوں کے سامنے کہہ دیا کہ ہمارے تعلقات کی بنیاد اسلام پر ہے اور ازبکستان پاکستان کی توسیع ہے۔

اس پر بھی روسی چپ رہے۔ وہ ہندوستان کے علم الاصنام کے رومان سے متاثر تھے اور پاکستان کو برخود غلط سمجھتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں پاکستان مذہب کی بنیاد پر تخلیق ہوا تھا۔

جمال نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ ایسا نہیں تھا۔ پاکستان کی تخلیق کی وجوہات مادی تھیں اور اگر ان میں مارکسی شعور ہوتا تو وہ تاریخ کی جدلیات کے حوالے سے سوچتے مگر ماسکو کے دانشوروں کو بھی تاریخ کا شعور نہ تھا اور دیومالا نے ان کو اپنے دامِ خیال میں الجھا رکھا تھا۔

واپس آ کر جمال نے ساری کیفیت بے کم و کاست اخبار میں لکھ دی۔ بھٹو صاحب اردو نہیں پڑھ سکتے تھے، ورنہ وہ جو روسیوں کا خون کرنے گئے تھے، جمال کا خون پی جاتے۔

## ایک راستہ بھولا

جمال نے جان بوجھ کر وہ کارنکل جانے دی جو اس کے سفر کے لیے ہوٹل سوویا سکیا میں اسے الاٹ ہوئی تھی۔ یہ بڑی جسارت کی بات تھی کیونکہ ہوٹل وہاں سے غالباً 23 میل کے فاصلے پر تھا۔ اس کی جیب میں ایک روبل بھی نہیں تھا۔ وہ روسی کا ایک لفظ بھی نہ جانتا تھا اور عام روسی انگریزی سے نابلد تھا۔ پھر عام روسی کو یہ خوف بھی ہو سکتا تھا کہ میں ایک اجنبی شخص سے بات کر رہا ہوں، ممکن ہے ایسا نہ ہو مگر جمال کو اور اس کے دیگر ساتھیوں کو یہ ذہن نشین کرا دیا گیا تھا کہ کے جی بی کے خفیہ ایجنٹ ہر جگہ تمہاری نگرانی کریں گے۔

اب سوال یہ تھا کہ جمال واپس کیسے جائے۔

پریس کلب خالی ہو رہا تھا۔ وہ اپنا اوورکوٹ لینے کے لیے ڈریس روم میں گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہاں الیگزانڈر کھڑا ہے۔

الیگزانڈر کسی زمانے میں کراچی میں تعینات تھا۔ وہ بہت خوبصورت آدمی تھا مگر اب بڑھاپے کے آثار اس کے چہرے پر ہویدا تھے۔ جمال نے اسے پہچان لیا اور اس نے بھی جمال کو پہچان لیا۔

وہ روسی ایجنسی طاس کا نمائندہ تھا۔ جمال نے اپنا مسئلہ بیان کیا تو اس نے اسے اپنے اسسٹنٹ کے حوالے کر دیا۔

یہ اسسٹنٹ تھوڑی سی انگریزی جانتا تھا۔ چلتے چلتے وہ جمال سے ماسکو کی آمریت کی شکایت کرنے لگا۔ یہاں مرکزیت بہت ہے۔ چھوٹے شہروں اور دیہات کے عوام کی حالت خراب ہے۔ کیمونسٹ پارٹی بیوروکریسی بن گئی ہے۔ رشوت کا رواج ہے اور سفارش کے بغیر کام نہیں ہوتا۔

سات میل وہ دونوں پیدل چلتے رہے۔

بالآخر دونوں تھک گئے۔ پھر انہوں نے ایک ٹیکسی لی۔ جمال نے سگریٹ سلگایا تو ڈرائیور نے اس کی طرف اشتیاق سے دیکھا۔ جمال نے پوری ڈبی اس کی طرف بڑھا دی جو اس نے جیب میں ڈال لی۔

اس سے پتہ چلا کہ محنت کش روسی کو جتنی اجرت ملتی ہے اس میں اس کا گزارہ مشکل سے ہوتا ہے مگر بیروزگاری کی ذمہ داری حکومت اٹھاتی ہے۔

## روس کا طبقاتی نظام

روس میں اس زمانے میں ایک انوکھا طبقاتی نظام تھا۔ سب سے خوشحال اور لاڈلا طبقہ ادیبوں' شاعروں' فلم اور تھیٹر کے فنکاروں کا تھا جنہیں وظیفے ملتے تھے۔ تعطیلات کے لیے صحت افزا مقام پر ان کے لیے بنگلے محفوظ ہوتے تھے اور ان کی تمام ضروریات پوری ہوتی تھیں۔

دوسرے درجے پر سائنسدان اور انجینئر ان کے بعد فوج پھر ٹریڈ یونین اور آخر میں کسان اور یہ سوشلزم کی نفی تھی۔

اس کے کچھ سالوں کے بعد دانیال لطیفی لاہور آئے۔ دانیال لطیفی پاکستان کی منشور کمیٹی کے بنیادی رکن تھے۔ انہوں نے جو منشور لکھا تھا اس میں سوہن سنگھ جوش کے مشورے بھی شامل تھے مگر کمیٹی کے سربراہ میاں ممتاز دولتانہ تھے۔ انہوں نے اس کی ہیئت بدل دی اور جو منشور بالآخر منظور ہوا وہ بڑی حد تک بے مغز تھا۔ اس میں قائداعظم کے نظریات شامل نہیں تھے۔

دانیال لطیفی نے آزادی کے بعد ہندوستان میں رہنا پسند کیا۔ یہاں تو جاگیرداروں کی بادشاہی تھی۔

جمال نے ان سے پوچھا "آپ چونکہ ایک نہایت باشعور کمیونسٹ ہیں اور مارکسزم کے بست وکشاد سے واقف ہیں۔ آپ بتائیں کہ روس میں ریاستی اقتدار کی مزدوروں اور کسانوں تک منتقلی کا عمل کب رکا؟"

دانیال لطیفی نے کہا "یہ عمل شروع ہی کب ہوا تھا۔"

تو پھر اس کا یہی انجام ہونا تھا جو ہوا۔ کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین ایک بند گلی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ سٹالین نے مخالفین کو قتل کرا دیا اور خوشامدی اور درباری پارٹی پر قابض ہو گئے۔

مگر اس زمانے میں جب جمال ماسکو کا مطالعہ کر رہا تھا' یہ تو ظاہر تھا کہ نظام زوال پذیر ہے مگر یہ بات اس کے وہم وخیال سے بھی دور تھی کہ یہ نظام بالآخر زمین بوس ہو جائے گا۔ سوشلزم جبر سے نافذ نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے عوام کو آزادی اظہار اور محنت کشوں کو ریاستی اقتدار کی منتقلی ضروری ہے۔ اب جب کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنے کمال کو پہنچ رہا ہے سوشلزم واپس آئے گی مگر اس کی شکل بہت بدلی ہوئی ہوگی۔

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے!



# باب 35

مولوی نیاز علی کوثر اپنی چرب زبانی کے سبب بھٹو صاحب کے وزیر اطلاعات ہو گئے۔ ایڈیٹر صاحب کی جگہ گورنر صاحب کے ایک منظورِ نظر کو ملی جو پان کے پتوں کی تجارت کرتے تھے۔ تھے ذہین آدمی مگر اخبار ہچکولے کھانے لگا۔

مولوی صاحب وزارتِ اطلاعات میں کھل کھیلے اور ان کی رنگین کہانیاں زبان زد خاص و عام ہونے لگیں۔

ساجدہ ان کی دلدار رپورٹر نخرے کرنے لگی۔

ساجدہ برقعے میں آئی تھی اور اخبار میں ملازمت چاہتی تھی۔ وہ بھری بھری عورت تھی۔ اہلیت کے حوالے سے اس زمانے میں تو سبھی امیدوار خواتین ایسی تھیں مگر جمال نے سوچا کہ برقعہ پوش لڑکی ہے اور باہر بھیڑیئے بیٹھے ہیں۔ کیوں نہ اس غریب کو چانس دیا جائے۔ جمال کی ہمدردی کی ایک وجہ اس کی شرمیلی اور لمبوتری آنکھیں بھی تھیں۔

کچھ ہی دنوں کے بعد اس نے برقعہ اتار کر ساڑھی پہن لی۔ اس کے بال کمر تک لمبے تھے۔ پہلے پہل اس نے ہلکے ہلکے قہقہے لگانے شروع کیے' جیسے کبوتری اپنی چھتری پر گٹکے' پھر بات بات پر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ مٹک مٹک کر چلنے لگی۔ اسے فوراً پتہ چل گیا کہ صحافت کا تعلق لیاقت سے نہیں بلکہ تعلقات سے ہے۔

پارٹی کی نچلی سطح کے لیڈروں تک اس کی رسائی ہو گئی تھی۔ سیاسی بیگمات بھی اس پر مہربان ہو گئیں' جو اخبار میں نام چھپوانے کی خاطر نمائشی کام کرتی پھرتی تھیں۔ وہ جلد راضی ہو جاتیں اور مڈل کلاس کی ایسی خواتین جن کو لیڈری کا چسکا ہو بالعموم جلدی راضی ہو جاتی ہیں۔

بھٹو صاحب کو اخبار سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور پارٹی کو بھی وہ کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔

مولانا صاحب ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی کوئی سیاسی بنیاد بھی نہ تھی۔ انہیں طاقت ملی تو اخبار والے چھوٹے چھوٹے مفادات کے لیے اُن کے گرد منڈلانے لگے۔ انہوں نے داڑھی مختصر کروائی' سوٹ پہن لیا۔ [illegible]

مولانا نیاز علی کوثر اخبار کی اہمیت سے واقف تھے۔ وہ ہر ہفتے مذہبی معاملات پر ایک مضمون اخبار میں چھپوایا کرتے تھے جس پر باالتزام لکھوایا جاتا 'از قلم ممتاز عالمِ دین مولانا نیاز علی کوثر!

وہ اس سلسلے میں جمال سے باقاعدہ ملاقات کیا کرتے اور رکھ رکھاؤ سے بات کرتے۔ جمال نے انہیں کہہ دیا کہ آپ کی شہرت خراب ہو رہی ہے اور ساجدہ ہر ایک کو آپ کے نام کی دھونس دیتی پھرتی ہے۔ اس پر مولانا صاحب خاموشی سے اُٹھ کر چلے گئے۔ بات آئی گئی ہوگئی مگر آئی گئی نہیں ہوئی کیونکہ مولانا صاحب کی چوری پکڑی گئی تھی۔

## مسکین صورت مہمان

جمال کام میں مصروف تھا کہ ایک مسکین صورت مہمان سلام کر کے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ ''آپ سے ایک کام ہے جی۔'' اس نے بڑی لجاجت سے کہا۔

''فرمایئے۔ میں حاضر ہوں۔'' جمال نے جواب دیا۔

کرسی کو اور آگے گھسیٹ کر آہستہ سے اس نے کہا ''آج کے اخبار میں حکومت کے خلاف ایک خط چھپا ہے۔ اس کے نیچے کسی کا نام نہیں' مجھے اس کا نام اور پتہ مطلوب ہے جناب عالی۔ میں آپ کا اپنا ہی آدمی ہوں۔ اس لیے جی......''

''اپنا یعنی؟ آپ کون ہیں؟'' جمال نے پوچھا۔

''آپ کا خادم جناب عالی۔ انٹیلی جنس سے آیا ہوں۔ یہ ہمارا اپنا اخبار ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ حکومت آپ کی' اخبار بھی آپ کا اور ہم انٹیلی جنس والے بھی آپ کے۔ ہمیشہ اسی طرح ہوتا آیا ہے جناب عالی۔ حکومت کے مخالفوں کی سرکوبی ہمارا بھی فرض ہے اور آپ کا بھی۔''

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جب انٹیلی جنس والا جمال کی گالیاں کھا کے باہر نکلا تو وہ بہت حیرت زدہ تھا۔

## کارِ جہاں!

انٹیلی جنس والے دفتر میں کھلم کھلا آنے لگے تھے مگر وہ زیادہ تر رپورٹنگ روم میں رہتے۔ جمال کی شہرت ان کے نزدیک بہت خراب تھی اور وہ ایک بدتمیز آدمی سمجھا جاتا تھا۔

پاکستان میں ایسے حالات کبھی پیدا نہ ہوئے جن میں رپورٹر اپنے طور پر جرائم کی تفتیش کر سکیں۔ چنانچہ انہیں پولیس کا سہارا لینے کی عادت پڑ گئی تھی اور وہ شام ڈھلے تھانوں میں ٹیلی فون کر کے پولیس کے زاویئے کی خبریں لکھنے لگے تھے۔ اس سے ان کے لیے ممکن ہوگیا کہ رشوت لے کر ملزموں کو چھوڑ دیں یا ان کے خلاف کمزور مقدمے بنائیں تاکہ عدالت انہیں آسانی سے چھوڑ سکے۔ رشوت کی رقم میں کچھ حصہ رپورٹروں کو بھی ملنے لگا۔ کبھی نقد اور کبھی شراب و شباب کی صورت میں کیونکہ ہیرا منڈی تو چلتی ہی پولیس کے سر پر تھی۔



ماہوار دیتے تھے۔ یہ رپورٹر بالعموم داڑھیاں رکھتے تھے۔ بعض نماز بھی باقاعدہ پڑھتے تھے۔ اسلام کا نعرہ بھی گلے پھاڑ پھاڑ کر لگاتے تھے اور بائیں بازو کے صحافیوں کو ہندوستانی اور روسی ایجنٹ مشہور کرتے تھے۔ یہ سسٹم ایوب خاں کے دور سے شروع ہوا تھا۔ جیسے جیسے نوکر شاہی کی طاقت قرضے کی معیشت اور لوٹ مار کی روش زور پکڑتی گئی پولیس' غنڈے اور کرائم رپورٹر کا تکڑم ترقی کرتا گیا۔ بعد میں کچھ دینی جماعتیں بھی اس کی سرپرستی کرنے لگیں۔ وہ جرم میں یقین نہیں رکھتی تھیں مگر تشدد ان کا اسلامی نظریہ تھا۔

اب غنڈوں نے جلسوں میں نعرے لگا لگا کر اپنے آپ کو بھٹو کا کارکن مشہور کر دیا اور رپورٹر وزیر اور امیدوار وزراء جو سیاسی طور پر تھوتھے تھے ان کی سرپرستی کرنے لگے۔ ان کو مفادات حاصل ہوئے تو پیپلز پارٹی کے مخلص کارکنوں نے بھی دھاندلی اور دھونس کی روش اختیار کر لی۔ ایک شخص دوسرے کو ترڑی دینے لگا۔ اس طرح پولیس سے تعلقات کو سیاسی اہمیت حاصل ہوگئی۔ اس کی ایک وجہ گورنر صاحب کی جو بھٹو صاحب کے معتمد جاگیردار تھے' پولیس پر خصوصی شفقت تھی۔ وہ اس کے ذریعے پارٹی میں اپنے مخالفوں کو بھی ہراساں کر سکتے تھے اور باہر بھی ان کے خلاف پرندہ پَر نہ مار سکتا تھا۔ جاگیرداروں کو حکومت کرنے کا کوئی اور طور طریقہ آتا بھی نہیں۔

## حاصل خانہ خرابی

حالت آناً فاناً ہی خراب ہوگئی۔ بھٹو نے عوام کے دل بے شک جیتے تھے مگر اس کے پاس سامان سفر نہیں تھا۔ نا اس نے اس کی ضرورت کبھی محسوس کی تھی۔

بھٹو صاحب امریکہ سے بھی مجبور تھے اور جس طرح یحیٰی خان ان کے مقاصد پورے کرنے کے لیے نوابزادہ شیر علی خاں کو لانے پر مجبور ہوا تھا' بھٹو صاحب بھی اپنے ساتھ امریکہ کے آدمی لائے تھے اور ان کو وزارتیں اور مشاورتیں بھی دے دیں۔ ان کا خیال تھا کہ میں بہت تیز دھار آدمی ہوں۔ اس طرح امریکی اور عرب آقاؤں کو تسلی رہے گی کہ بھٹو ہمارے نرغے میں ہے اور اگر یہ میری جاسوسی کریں گے تو میں ان کے سامنے ایسی باتیں کروں گا جس سے وہ میرے ارادوں کو بھانپنے میں غلطیاں کریں گے۔

سی آئی اے بھٹو صاحب کے زمانے میں پاکستان کے ہر ادارے میں گھسی بیٹھی تھی۔ کوئی توشہ خانہ ایسا نہ تھا جس میں اسکے آدمی نہ ہوں۔ پولیس پر عموماً لوگوں کی نظر نہیں جاتی مگر نوآبادیاتی ملکوں میں پولیس کے اعلیٰ افسران سی آئی اے کے بھروسے کے آدمی نہ ہوں تو بڑے عہدوں پر فائز نہیں ہو سکتے۔ بھٹو کے ہاتھ ان زنجیروں سے بھی بندھے ہوئے تھے۔

پارٹی عوام کی حد تک ساکت ہوگئی۔ غنڈوں نے زور باندھا اور وہ اخبار میں بیان دینے لگے کہ ہم بھٹو کے ساتھ ہیں۔ پھر وہ یہ چھپے ہوئے بیان لے کر بھٹو کی سیکنڈ لائن کے لیڈروں تک پہنچ جاتے اور ان سے اپنے ناجائز کام کرواتے۔ اگر کوئی رپورٹر ان کے بیان نہ چھاپتا تو وہ اس کی شکایت کرتے کہ فلاں کمیونسٹ

لفنٹسٹ ہے' پارٹی کا دشمن ہے۔ بھٹو صاحب کو گالیاں دیتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

جمال پارٹی کے منشور پر یقین رکھتا تھا اور وہ یہ تصور نہ کر سکتا تھا کہ پولیس پارٹی کے مخلصوں کے پیچھے لگ جائے گی۔ جب اسے پتہ چلا کہ میں انٹیلی جنس کی فائلوں میں درجہ دوم کا خطرناک دہشت گرد شمار ہوتا ہوں تو اس نے گورنر صاحب کو جو جدوجہد کے زمانے میں اس کے دفتر میں لاوارثوں کی طرح بیٹھے رہتے تھے' خط لکھا کہ آپ کے دور میں بھی پارٹی کے کارکنوں کی پرانی فائلیں چل رہی ہیں۔ آپ ان کو تلف کروائیں اور انٹیلی جنس والوں کو روکیں۔

بعد میں جب گورنر صاحب سے ایک پبلک جلسے میں جمال کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا ''مجھے تو آپ کا کوئی خط نہیں ملا۔ ہمارا ڈاک کا نظام بہت خراب ہے' مجھے اس سلسلے میں کچھ کرنا پڑے گا۔''

## آئی ایک حسین عورت

دفتر کے ایڈیٹر یان کے امپورٹر میاں صاحب بہت ذہین آدمی تھے۔ پڑھے لکھے بھی تھے اور اگر ان کے ذاتی سیاسی اور تجارتی مفاد پر زد نہ پڑتی ہو تو شریف بھی تھے' معقولیت پسند بھی تھے اور خوش مذاق بھی۔ وہ چونکہ گورنر صاحب کے ذاتی دوست بھی تھے اور اخبار کے ایڈیٹر ہو کر اور بھی کھل گئے تھے' اس لیے لوگ ان کے ہاں اکثر آتے تھے۔ اخبار پر وہ نظر رکھتے تھے۔ اب ان کو اداریے کسی قدر چبھنے لگے تھے مگر وہ مسکرا کر بات کرتے تھے اور جمال کے کام میں مداخلت کم ہی کرتے تھے۔ ویسے سمجھاتے رہتے تھے کہ پارٹی کی بہت مجبوریاں ہیں۔ ہم ایک دم انقلاب نہیں لا سکتے۔ ہمیں وقت کی نبض پر ہاتھ رکھنا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ مطلب یہ تھا کہ اے نالائق شخص تو ابھی تک پرچے کو بائیں بازو کا ترجمان بنائے جا رہا ہے' حالانکہ اب تو ہماری حکومت ہے جو سوئے ہوئے کتوں کو جگانا نہیں چاہتی۔

گلابی رنگ کا غرارہ پہنے اچانک ایک حسین عورت جمال کے کمرے میں پڑی ہوئی چک میں جھلک دکھاتی اور عطر کی لپٹیں چھوڑتی ہوئی تیزی سے گزر کر میاں صاحب کے کمرے میں گھس گئی۔ جمال اگرچہ بہت سنجیدہ آدمی تھا مگر حسین عورتیں اسے اب بھی من موہنی لگتی تھیں۔ اس کے دل میں گدگدی ہوئی مگر وہ پھر کام میں مصروف ہو گیا۔

حسین عورتیں اخبارات کے دفتروں میں کم ہی آتی ہیں۔ وہ سیدھی سیڑھی پر چڑھ جاتی ہیں مگر یوں تیز میک اپ کر کے چھوٹی سی چولی پہن کر کولہوں کی گولائی دکھاتی یہ کون پری چہرہ آئی اور کس لیے آئی۔

گھنٹے بھر کے بعد جب میاں صاحب کے کمرے سے قہقہوں کی آواز آنی بند ہو گئی تو جمال سمجھ گیا کہ دشمنِ جان چلی گئی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد میاں صاحب ٹہلتے ٹہلتے جمال کے کمرے میں آئے اور اس سے پوچھنے لگے کہ



جمال نے کہا ''زرعی اصلاحات پر میں انہیں ناکافی سمجھتا ہوں۔''

''ہیں تو ناکافی مگر آپ منشور پکڑ کر کب تک بیٹھے رہیں گے۔ حالات تبدیل ہو گئے ہیں۔ آپ آئیڈیلسٹ ہیں اور آپ جیسے آدمیوں کی بھی پارٹی کو ضرورت ہے۔ آپ انقلاب کی زنجیر عدل کھینچتے رہیں مگر پارٹی تو وہیں تک جائے گی جہاں تک وہ جا سکتی ہے۔ آپ کا تو کچھ بھی داؤ پر نہیں لگا ہوا۔ آپ انقلابی باتیں کر سکتے ہیں۔ یہ ہم ہیں جنہیں چو مکھی لڑنی پڑتی ہے۔ بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے۔ بہت سے لوگوں کو راضی رکھنا پڑتا ہے۔ ووٹ انقلابیوں کے پاس نہیں ہوتے' وڈیروں کے پاس ہوتے ہیں اور وڈیروں کو ہم بہت زیادہ ناراض نہیں کر سکتے۔ آپ کو پتہ ہے کہ پارٹی بھٹو کی ذاتی تخلیق ہے۔ اس نے یتیموں کو ٹکٹ دے کر وزیر بنا دیا۔ اب سب اپنی خدمات گنواتے اور انعام طلب کرتے پھرتے ہیں۔ گورنر صاحب کی تو جان آفت میں آئی ہوئی ہے۔ سارا دن اس کا پریشانی میں گزرتا ہے۔''

''مگر اس کی شامیں شہر میں بہت مشہور ہو رہی ہیں۔'' جمال نے ہنس کر کہا۔

''اس کا قصور نہیں۔ عورتیں اس کی جان نہیں چھوڑتیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو خاتون آئی تھی آپ نے دیکھی؟ نہیں دیکھی نا؟''

''کون تھی؟''

## وزیر بنوا دو

''میں نے آپ کی جان بچوا دی۔''

''مگر مجھے تو خوبصورت عورتیں اچھی لگتی ہیں۔''

''اچھی تو مجھے بھی لگتی ہیں' مگر ان کی فرمائشیں پوری کون کرے۔'' میاں صاحب بولے۔

''کیا فرمائش کی تھی اس نے؟'' جمال نے پوچھا۔

''میرے پاس آئی تھی کہ میں گورنر صاحب سے کہہ کر اسے وزیر بنوا دوں۔ وکیل ہے مگر وکالت نہیں کرتی۔ نخروں کی سیاستدان ہے۔''

''تو پھر آپ اسے وزیر بنوا دیں میاں صاحب۔''

''میں کیسے بنوا دوں۔ گورنر نے اسے میرے پاس بھیج دیا کہ اخبار میں اداریہ لکھوا دو کہ مجھے وزارت ملے۔''

''اداریہ لکھوا دیں کہ اسے وزیر بنوا دیا جائے۔ یہ کیسے ممکن ہے۔'' جمال نے کہا۔

''کہتی تھی پیپلز پارٹی عوامی پارٹی ہے۔ رائے عامہ کے آگے مجبور ہو سکتی ہے۔''

''پھر آپ نے کیا کہا میاں صاحب؟''

مجھے اس سے ملوادو۔ آگے میں جانوں میرا کام۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے ٹالا۔ آپ کی جان بچادی۔''

## ناپسندیدہ شخص

کئی ماہ جمال کو پتہ ہی نہ چلا کہ پارٹی کے نزدیک اب میں ایک ناپسندیدہ شخص ہوں اور مجھے یہاں سے بھگانے کی ترکیبیں سوچی جارہی ہیں۔ وہ پارٹی کا منشور اور اپنے یقین کو لیے بیٹھا تھا اور کسی کی پروا نہیں کرتا تھا۔ ملک کا کوئی مسئلہ حل نہ ہوا تھا۔ غنڈوں' اٹھائی گیروں اور لٹیروں کی ایک نئی نسل پارٹی کے سہارے میدان میں اُتر آئی تھی اور لوٹ مار میں مصروف تھی۔ کچھ وزیر بھی رشوت لینے لگے تھے۔ بھٹو صاحب کو ان کا پتہ لگ جاتا اور وہ ان کی فائلیں تیار کروا کر انہیں اپنے دفتر میں ذلیل کرتے۔ خود ان کو روپے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کا واحد جنون طاقت تھا اور وہ انہوں نے ساری کی ساری اپنے لیے مخصوص کرلی تھی۔ صوبوں کے وزیراعلیٰ اور گورنر انہوں نے روایتی جاگیردار خاندانوں سے لیے تھے' جن کی نفسیات وہ خوب سمجھتے تھے۔

مگر نوجوانوں کو کون مطمئن کرتا۔ انہوں نے ایک جلوس نکالا تو گورنر صاحب کے حکم پر انہیں وحشیانہ مار پڑی اور بعض کو پولیس نے سرعام ننگا کردیا۔ گورنر صاحب نے برہنہ لڑکوں کی تصویریں دیکھ کر کہا ''کیسا دلکش منظر ہے!''

جمال نے پولیس کے مظالم پر اداریہ لکھا تو میاں صاحب نے اس کی بہت تعریف کی۔ پھر اچانک کہا ''مگر آپ عجیب بے فکرے آدمی ہیں جنہوں نے پارٹی کے لیے کچھ بھی نہیں کیا' انہوں نے گھر بھر لیے مگر آپ نے اپنے مستقبل کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔''

جمال نے کہا ''میرا مستقبل یہی ہے۔ میں خوش ہوں۔''

''آپ نادان ہیں۔'' میاں صاحب نے ہمدردی سے کہا۔ ''ساری عمر کے بعد آپ کو کل بارہ سو روپے تنخواہ ملتی ہے۔ گزارہ کیسے ہوتا ہوگا۔''

''گزارہ تو نہیں ہوتا۔'' جمال نے جواب دیا۔

''آپ کے بال بچے ہیں۔ کل کلاں ان کی شادی ہوگی تو آپ کیا کریں گے۔ کیوں نہیں آپ کوئی اچھی سی نوکری کرلیتے۔ جرنلزم میں کیا رکھا ہے۔''

''مگر مجھے اچھی نوکری کون دے گا۔'' جمال نے کہا۔

''آپ ہاں تو کریں۔ میں آپ کو بینکنگ کونسل میں پی آر او کروادوں گا۔ تین ہزار ماہوار تنخواہ' سرکاری مکان' گاڑی اور بہت سے الاؤنس!''

''میں بینکنگ کو حرام سمجھتا ہوں۔ اس کی نوکری نہیں کرسکتا۔ یہ سرمایہ داری نظام کی بنیاد ہے۔''

''تو آپ عمر بھر یہیں سڑتے رہیں گے۔ پھر آپ کے دشمن بھی بہت ہیں۔ کیا عجب کہ اچانک آپ کو نکال دیا جائے۔''



''نکال دیا جائے پھر.....'' جمال نے چڑ کر کہا۔

''میرا مطلب یہ نہیں۔'' میاں صاحب جھینپ کر بولے۔ ''جب تک میں ہوں کوئی آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا مگر میرا بھی کیا اعتبار۔''

''تو پھر آپ کیا کریں گے؟''

''میرا تو خیر امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار ہے مگر آپ کیا کریں گے؟''

''کچھ بھی نہیں۔ میں تو آدھی زندگی بیکار رہا۔''

''افسوس کہ آپ پریکٹیکل آدمی نہیں ہیں۔''

''وہ تو میں نہیں ہوں۔''

اس پر میاں صاحب آزردہ ہو کر چلے گئے۔

## پیر فقیر کا مال ہے

جمال کو خیال تک نہ آیا کہ میاں صاحب مجھے اخبار سے نکالنا چاہتے ہیں تاکہ اخبار میں پارٹی پر تنقید نہ ہو اور گورنر صاحب خوش رہیں۔ بعض وزیر میاں صاحب کے پاس آتے تھے۔ ان میں ایک وزیر اوقاف بھی تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میں سوشلسٹ ہوں اور یہی میری اور جمال کی قدر مشترک ہے۔

ایک دن وہ آئے تو اچانک بولے ''جمال صاحب سوشلزم تو برحق ہے مگر اس میں رہنے کو ایک مکان تو ہر ایک کو ملے گا۔ آپ کے پاس نہ گھر ہے نہ آپ نے کوئی پلاٹ لیا ہے' حالانکہ اسی اخبار کے ایڈیٹر صاحب نے وزیر خزانہ ہو کر آپ کے کئی ساتھیوں کو بڑے بڑے قیمتی پلاٹ الاٹ کیے۔ آپ کو انہوں نے پوچھا بھی نہیں۔''

''مجھے تو پتہ نہیں۔'' جمال نے کہا۔

''تو آپ اب کچھ لے لیں۔''

''مگر میرے پاس تو کوئی پیسہ نہیں۔''

''پیسے کی کیا ضرورت۔'' وہ بولے ''اوقاف کی بے شمار جائیداد میری تحویل میں ہے۔ پانچ کنال کی ایک کوٹھی میورروڈ پر خالی پڑی ہے۔ یہ میں آپ کو ایک روپے ماہوار پر ننانوے سال کی لیز پر دے سکتا ہوں۔''

''مگر میں اس کا حق دار نہیں ہوں اور نجی ملکیت کو بھی حرام سمجھتا ہوں۔''

''یہ تو پیر فقیر کا مال ہے اور آپ جیسے کسی پیر فقیر ہی کے لیے ہے۔ حق کا کیا سوال؟''

جمال کی سمجھ میں بات نہ آئی۔ اتنی بڑی جائیداد کے لیے تو وزیر ترستے ہوں گے۔ یہ عنایت مجھ پر کیوں ہو رہی ہے مگر پھر اسے یاد آیا کہ میں نے طالب علموں کے جلوس میں حکومت کی سخت مذمت کی تھی۔ ہو نہ ہو سوشلسٹ وزیر اوقاف مجھے اسی کا انعام دے رہے ہیں

تھوڑے دنوں کے بعد بات کھل گئی۔ گورنر صاحب کا حکم تھا کہ اس شخص کو برخاست کیا جائے مگر یونین بڑی مضبوط تھی اس لیے اس کو نکالنے کے اور طریقے سوچے گئے۔ یہ اور بات ہے کہ بیشتر اخبار نویس مولوی نیاز علی کوثر نے خرید رکھے تھے اور اخبارات کو آزادیٔ اظہار بھی اتنی ہی ملی تھی جتنی بیوروکریسی برداشت کر سکتی تھی۔

علمائے کرم اور مشائخِ عظام جیسے ایوب خاں اور یحییٰ خاں کے چرنوں میں پانی بھرتے تھے۔ اسی طرح بھٹو صاحب کی آرتی اُتارنے لگے تھے اور پولیس، غنڈے، جرنلسٹ، مولوی اور کارکن عوام کے خلاف متحد تھے۔

## فلسطین چلو

بھٹو عالمِ اسلام کو ایک نئی سمت دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ عوام بھی اس معاملے میں سخت جذباتی تھے۔ یحییٰ خان کے سیاسی زمانے میں پاکستان کے بعض اخبارات میں بیروت کی امریکی یونیورسٹی سے آیا ہوا کچھ مواد اردو میں ترجمہ ہو کر جماعتِ اسلامی کے اخبارات میں شائع ہوا۔ اس کے مطابق فلسطینی مجاہد اور مصری جنگجو محض شرابی اور زانی تھے۔ یحییٰ خان ہی کے زمانے میں بریگیڈیئر ضیاء الحق نے اردن میں فلسطینی عورتوں اور بچوں کے کیمپ پر آگ برسائی تھی مگر پیپلز پارٹی کی حکومت نے اسرائیل کے خلاف شام اور فلسطینی مجاہدین کی عملی امداد کر کے یہ داغ دھو دیے تھے اور اب فلسطینی طلبہ پاکستان کو اپنا دوسرا اڈا سمجھنے لگے تھے۔ جمال کے پاس بھی ان کا آنا جانا عام تھا۔

جمال فلسطینیوں کے معاملے میں بہت جذباتی تھا۔ طبعاً وہ مہم جو بھی تھا اور جہاں آگ دیکھتا کود پڑتا تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ میں کسی طرح فلسطینیوں کے ساتھ جہاد کروں۔ اس کی عمر ایسی بکھیڑیں اٹھانے کی رہی نہ تھی مگر وہ ایک مہم جو آدمی تھا۔

مولوی نیاز علی کوثر ان دنوں بعض اخبار نویسوں کو سرکاری خرچ پر حج کروایا کرتے تھے۔ یہ ان کے تعلقات عامہ کا سلسلہ تھا۔

حج کی رشوت سے اخبار نویسوں کو انہوں نے مطیع کر لیا تھا۔ مولوی صاحب کہتے تھے کہ ہر شخص کی کوئی نہ کوئی قیمت ہوتی ہے اور حج کی شکل میں قیمت ادا کرنے میں ان کے باپ کا کچھ نہ جاتا تھا۔

جمال کا نام حج کے امیدواروں میں گیا تو اس نے فلسطینی طالب علم سے جو مقامی تنظیم کا امیر تھا' بات کی۔ اس نے کہا کہ مجھے فلسطین کی جنگ دکھا دو۔

کچھ دنوں کے بعد امیر نے اسے خوشخبری سنائی کہ سارا انتظام ہو گیا ہے۔ تم پی ایل او کے کیمپوں کی سیر کر سکو گے۔ تمہیں شام میں بھی لے جایا جائے گا۔ تم پی ایل او کے مہمان ہو گے۔

''مگر میں کسی گوریلا گروپ کے ساتھ اسرائیل کے اندر حملے میں شریک ہونا چاہوں گا۔'' جمال



''ہم دوستوں کو خطرے میں نہیں ڈالتے۔ ویسے کچھ پاکستانی مجاہد ہمارے ساتھ لڑائی میں شریک ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی ہیں مگر تمہیں دو ماہ کے بعد واپس آنا ہو گا۔ تمہاری جنگ قلم کے مورچے پر ہے۔''

''مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا ہے۔'' جمال نے پوچھا۔

''تمہیں کچھ نہیں کرنا۔ صرف حج کرنا ہے۔ حج کے بعد تم مدینے شریف جاؤ گے۔ جہاں سے تمہیں اغوا کر لیا جائے گا۔ شور مت مچانا۔''

''اغوا کر لیا جائے گا؟''

''ہمارے مجاہدین تمہیں اٹھا لیں گے۔''

''مگر وہ مجھے پہچانیں گے کیسے؟''

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں۔''

''وہ مجھے سیدھے سبھاؤ کیوں نہیں لے جاتے۔ ڈرامے کی کیا ضرورت ہے۔''

''سعودی حکومت کسی حاجی کو کسی غیر ملک کے سفر کی اجازت نہیں دیتی اور تمہاری اپنی حکومت بھی تمہیں پی ایل او کے کیمپ دیکھنے کی اجازت نہ دے گی۔ ایسے کام سیدھے سبھاؤ نہیں ہوتے۔''

''مگر واپسی پر وہ میرے پاسپورٹ پر شام کا ویزا دیکھ لے گی۔''

''ہم احتیاط کرتے ہیں۔ حکومتِ شام کو تمہاری آمد کا پتہ لگنے نہ دیں گے۔ پاسپورٹ پر کچھ درج نہ ہو گا اور دو ماہ کے بعد تمہیں پھر مدینے شریف پہنچا دیا جائے گا۔''

''مگر واپسی پر مجھ سے پاکستان میں پوچھ گچھ تو ہو گی۔''

''تمہارے پاس سعودی ڈاکٹروں کا میڈیکل سرٹیفکیٹ ہو گا کہ تم بیمار تھے۔ ہسپتال میں زیرِ علاج رہے۔ تمہاری بیوی تگڑی ہے نا؟ وہ شور نہ مچا دے کہیں!''

''میں اسے سمجھا دوں گا۔''

''اسے کچھ مت بتانا۔ بس اشارہ کر دینا کہ میں غارِ حرا میں چلہ کاٹوں گا اور اِدھر اُدھر کی سیر کروں گا۔ ہم حکومتِ پاکستان سے کوئی جھگڑا مول لینا نہیں چاہتے' مگر تمہیں کچھ پیسوں کی ضرورت تو ہو گی!''

''نہیں۔ میری تنخواہ گھر پہنچتی رہے گی اور وہاں میں تمہارا مہمان ہوں گا بھائی مرتضیٰ!''

''بے شک۔ تمہاری ضروریات پوری ہوتی رہیں گی۔''

''مگر اب مجھے کرنا کیا ہے؟'' جمال نے پوچھا۔

''یہ ایک خط ہے۔ یہ تم کراچی میں اس شخص کو دو گے جس کا پتہ لکھا ہوا ہے۔ آگے ہم جانیں اور ہمارا کام۔ تمہاری روانگی کب ہے؟''

''ابھی اسلام آباد سے اطلاع نہیں آئی۔'' جمال نے جواب دیا۔ ''ہفتے بھر میں غالباً۔''

مگر ہفتے بھر میں اسلام آباد سے جمال کو کوئی بلاوا نہ آیا۔ وہ لوگ چلے گئے جو مولوی نیاز علی کوثر کی ذاتی وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ ساجدہ اور مولوی صاحب اس سے ناراض تھے۔

افسوس! صد افسوس! یہ دکھ جمال کو زندگی بھر بھول نہ سکا!

## ساجدہ بی بی کا کاروبار

جمال کام میں منہمک بیٹھا تھا کہ ایک باوردی تھانیدار اس کے کمرے میں آیا اور سلیوٹ مار کر بولا ''میں واہگہ کے سرحدی علاقے سے آیا ہوں جناب عالی......''

''جی فرمائیے۔'' جمال نے خشک روئی سے کہا۔

''بات یہ ہے جناب عالی' میں نے سوچا کہ ایکشن لینے سے پہلے اوپر بات کر لی جائے۔ بعد میں مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ آپ کے ہاں ایک لیڈی رپورٹر ہیں مس ساجدہ۔ ان کی بات ہے۔''

''اس کی کیا بات ہے۔'' جمال نے پوچھا۔

تھانیدار بولا ''ہم خواہ مخواہ کسی کو بدنام نہیں کرنا چاہتے جناب عالی۔ ملزم ہمارے قبضے میں ہیں اور ثبوت بھی مگر ابھی ہم نے ایف آئی آر نہیں کاٹی۔''

''کون سا ملزم' کس بات کا ثبوت؟''

''مس ساجدہ کے بھائی ہیں جی۔ وہ بنگالیوں کو جو بنگلہ دیش نہیں جا سکتے' واہگہ کی سرحد پار کروا دیتے ہیں چھ ہزار فی کس میں۔ اس پر بھی ہمیں کوئی اعتراض نہیں جی کیونکہ مس ساجدہ پارٹی کے اخبار کی رپورٹر ہیں۔ پچھلے دنوں ان کے بھائی نے واہگہ کی سرحد پر بنگالیوں سے چھ چھ ہزار روپے بھی وصول کیے۔ پھر ان کا سامان بھی چھین لیا اور زیور' کپڑا بھی جوان کے پاس تھا۔ ڈھاکہ کے سفر کے لیے ان کے پاس ایک دھیلہ بھی نہ رہا۔ جب اپنے ملک میں ان کے ساتھ ایسا سلوک ہو تو آگے کیا ہوگا جناب عالی۔ وہ سرحد سے واپس آ گئے اور تھانے میں شکایت کر دی۔ اب ہم اگر ملزموں کا چالان کرتے ہیں تو اخبار ہمارے پیچھے پڑ جائے گا اور اگر کچھ نہیں کرتے تو بنگالی روتے دھوتے اوپر پہنچیں گے۔ ہم تو دونوں طرف سے مارے گئے جناب عالی!''

## دن کھلے مرجھا گئے

دفتر کے حالات بہت خراب ہو گئے۔ جمال نے ابھی تک اخبار کو بائیں بازو کا ترجمان بنا رکھا تھا مگر عملاً وہ بے اختیار تھا۔ دفتر میں کوئی اس سے کھل کر بات نہ کرتا تھا۔ نیوز ایڈیٹر اور کرائم رپورٹر نے ہیرا منڈی کے تھانے سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا اور وہ شام کو نو بجے کے بعد مزید دو ایک حواریوں کے ساتھ تھانے جا کر مفت کی شراب پیتے' طوائفوں سے مفت گانا سنتے اور جب نیوز ایڈیٹر صاحب دھت ہو کر گر پڑتے تو وہ سپاہی انہیں [illegible] گھر تک پہنچا آتے۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔



دفتر کے منیجر صاحب نے افیون کی سمگلنگ شروع کر دی تھی اور بعد میں ہیروئن تک پہنچ گئے۔ پولیس ان کا کچھ بگاڑ نہ سکتی تھی کیونکہ وہ پارٹی کے اخبار کے منیجر تھے۔

دفتر میں بھی انہوں نے لوٹ مچا دی۔ آمدنی میں غبن' تنخواہوں کی چوری' سامان کی خرید میں کمیشن اور نیوز ایجنٹ سے ساجھے داری اس میں انہیں نیوز ایڈیٹر کی حمایت حاصل تھی اور نیوز ایڈیٹر اخبار پر چھایا ہوا تھا۔ جمال کو انہوں نے نہتا کر دیا۔ اس کی تحریروں پر سبھی کو اعتراض تھا مگر کھلم کھلا کوئی اس پر تنقید نہ کر سکتا تھا۔

مگر پھر اس نے دیکھا کہ اس کے اداریے مشین پر کٹنے لگے۔ وہ سطور غائب کر دی جاتیں جو حکومت کی کمزوریوں کو ظاہر کرتی تھیں۔ کراچی سے صدیقی صاحب ایک مشہور زمانہ لیفٹنٹ ایڈیٹری کے لیے منگوائے گئے تھے مگر وہ بھی پرلے درجے کے زمانہ ساز اور مفاد پرست نکلے۔ جب بھٹو کی مدح میں کالم نکلتے تو دو رنگوں میں چھپواتے۔ اس پر اپنی تصویر لگواتے اور بھٹو صاحب کو بھیج دیتے۔ یہ لکھ کر...... وِد کمپلی منٹس فرام......

انہوں نے آتے ہی اخبار میں طاقت کا توازن دیکھا تو نیوز ایڈیٹر کے شاملِ حال ہو گئے اور اس میں جمال سے رقابت بنیادی بات تھی۔

وہ جمال کو کراچی سے جانتے تھے۔ اس کی دوستی کا دم بھرتے تھے مگر اس زمانے میں وہ بے حیثیت تھے۔ اب جو انہیں بھٹو صاحب کے ہاتھ سے پگڑی ملی تو وہ دنگل پر اُتر آئے۔ جمال نے محسوس کیا کہ اب یہاں میرا کوئی کام نہیں مگر سوال یہ تھا کہ میں کیا کروں۔ کدھر جاؤں۔ انقلاب تو ایک طرف رہا مگر روٹی کا کیا کروں۔ میرے بچوں نے تو سال ہا سال بھوک کاٹی ہے' اب ان کا کیا کروں۔

## باہر نکلنے کا راستہ

جمال انہی غموں میں بیٹھا تھا کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اُدھر سے کسی نے کہا ''جناب اسلام آباد سے سیکریٹری ایجوکیشن آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

سیکریٹری ایجوکیشن کے عہدے پر قدرت اللہ فائز تھے۔ جمال کی ان سے سرسری سی ملاقات تھی مگر وہ جمال کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے کیونکہ مفتی ان کا گہرا دوست تھا۔ ان دنوں وہ اسلام آباد میں مقیم تھا اور دوستوں کو کبھی بھولنے والا آدمی نہ تھا۔

جمال نے کہا ''جی سلام عرض کرتا ہوں۔''

قدرت اللہ صاحب بولے ''کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ ایک مہینے کی چھٹی لے کر اسلام آباد آ جائیں۔ حکومتِ پاکستان کو فلم پالیسی مرتب کرنی ہے اور ایجوکیشن منسٹری میں کوئی ایکسپرٹ ہے نہیں۔ آپ فلم انڈسٹری کے تمام مسائل کو بخوبی جانتے ہیں۔ آپ ہماری مدد کریں۔ آپ کو پانچ ہزار روپے بطور اعزازیہ ادا کر دیا جائے گا۔''

جمال نے پوچھا ’’جی میں کب آؤں۔‘‘

’’جس قدر جلدی ممکن ہو سکے۔‘‘ وہ بولے۔

جمال نے ایک مہینے کی چھٹی کی درخواست لکھی اور یہ سوچ کر اسلام آباد چل پڑا کہ لوٹ کے کبھی نہ آؤں گا۔ دفتر سے نکلتے ہوئے اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ باہر ہوا تازہ اور ٹھنڈی تھی۔

کچھ عرصہ قبل حکومت نے فلم والوں کی ایک کنونشن بلائی تھی اور مدعوئین میں جمال بھی شامل تھا کیونکہ اگرچہ اس کی فلم پٹ گئی تھی مگر وہ فلمساز شمار تو ہوتا تھا۔ جمال اس کنونشن میں زیادہ تر خاموش رہا مگر برآمدوں میں قدرت اللہ صاحب کو نکتے کی باتیں بتاتا رہا تھا اور وہ اس کے فلمی گیان سے متاثر تھے۔

## بیوروکریسی

قدرت اللہ صاحب نے جمال سے پوچھا ’’آپ کام کتنے دنوں میں ختم کر لیں گے؟‘‘

جمال نے کہا ’’جی ہفتہ بھر تو لگ ہی جائے گا۔‘‘

’’نہیں اتنی جلدی نہیں۔‘‘ وہ بولے۔

’’جی مجھے کچھ سوچنا نہیں۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔‘‘

’’یہ میں مانتا ہوں مگر سرکاری کام جلد کر دیئے جائیں تو دوسرے شبہ کرتے ہیں کہ کام ٹھیک نہیں ہوا ہوگا۔ ہمارے ہاں یہ رواج نہیں کہ کام جلد کیے جائیں۔‘‘

’’مگر جی کام ہے ہی ہفتے بھر کا۔‘‘

’’ٹھیک ہے مگر منہ سے کچھ نہ کہیں۔ ہفتے میں کام ختم کر لیں مگر اس کی ڈلیوری تین ہفتے کے بعد دیں۔ دو ہفتے کے لیے گھر ہو آئیں۔ اس کا ٹی اے آپ کو ملے گا کیونکہ آپ ریسرچ کرنے جائیں گے اور یہ آپ کے پانچ ہزار کے اعزازیئے کے علاوہ ہوگا۔‘‘

جمال اس پر مسکرایا مگر قدرت صاحب نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

جمال یہ سوچ کر آیا تھا کہ پانچ ہزار میں میرے تین مہینے آسانی سے گزر جائیں گے اور اس سے زیادہ اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

قدرت اللہ صاحب بولے ’’کاغذات آپ کو جلد مل جائیں گے مگر معاوضہ آپ کو آج ہی وصول کر لینا چاہیے۔‘‘ پھر انہوں نے کسی کو فون کیا کہ جمال صاحب تاحکمِ ثانی وزارتِ تعلیم میں فلم ایڈوائزر مقرر کیے گئے ہیں۔ انہیں ڈھائی ہزار روپے ایڈوانس کی ادائیگی فوراً کر دی جائے۔

ان کا حکم سن کر لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ پھر ٹیلی فون آنے لگے۔ سر ان کی شرائط کار کی کوئی ہدایت جاری نہیں ہوئی۔ ان کا کنٹریکٹ کس طرح ڈرافٹ ہوگا۔ ادائیگی کس مد میں ہوگی۔ فنانس منسٹری سے منظوری لی جائے گی یا نہیں۔ اے جی پی آر سے چیک آئے گا یا نقد ادائیگی ہوگی۔



جمال ان باتوں کو سمجھتا نہ تھا‘ اس لیے قدرت اللہ صاحب نے ان سوالات کے جواب میں جو کچھ کہا‘ اس میں اس نے کوئی دلچسپی نہ لی۔

جب قدرت اللہ صاحب ہر بات کا جواب دے چکے تو جمال نے کہا ’’میں زیادہ سے زیادہ دس دن میں کام مکمل کر کے لاہور چلا جاؤں گا۔ میرا مطلب ہے ریسرچ وغیرہ کے سلسلے میں۔‘‘

قدرت اللہ صاحب معنی خیز ہنسی ہنسے اور بولے ’’مگر آپ کو جلد واپس آنا پڑے گا کیونکہ آپ فلم پالیسی کا ڈرافٹ دینے کے بعد فارغ نہ ہوں گے۔ سیکرٹریٹ کا طریق کار آپ نہیں جانتے۔ میں آپ سے فائنل ڈرافٹ دس دن کے بعد وصول نہیں کر سکتا اور آپ کو فارغ نہیں کر سکتا۔ آپ کا ڈرافٹ نیچے بھیجنا پڑے گا۔ جوائنٹ سیکریٹری صاحب کے ہاں۔ وہ اسے ڈپٹی سیکریٹری کے پاس برائے مطالعہ و تنقید روانہ کریں گے اور وہ متعلقہ سیکشن افسروں سے آراء طلب کریں گے اور ہر میز پر کم سے کم ایک ہفتہ لگ جائے گا۔ پھر اسی سیڑھی سے آپ کی سفارشات مع درجہ بدرجہ تنقید و ہدایت مجھ تک پہنچیں گی۔ اگر کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوا‘ جو کہ محال ہے کیونکہ سیکریٹریٹ کا اصل کام کاموں کو چلانا نہیں روکنا ہوتا ہے اور کام کو روکنے کے لیے کسی قابلیت کی ضرورت نہیں ہوتی مگر فرض کیا کہ کسی کو کچھ نہ ہوا تو مہینے بھر کے بعد میں آپ کے ڈرافٹ کو منظور کر کے وزیر کو پیش کر سکوں گا۔ وزیر ہمارا بہت شریف آدمی ہے۔ وہ میری سفارشات پر اعتراض نہیں کرتا اور کاغذات پر دستخط بھی جلد کر دیتا ہے۔ پھر دستخط کرنے کے ساتھ ہی وہ مجھے ہدایت جاری کرے گا کہ کیبنٹ کے لیے سمری تیار کی جائے۔‘‘

## سمری تیار کرو

’’سمری؟ کس بات کی سمری؟‘‘ جمال نے پوچھا۔

’’آپ کا ڈرافٹ کتنے صفحے لے گا۔‘‘ قدرت اللہ نے پوچھا۔

’’آٹھ دس صفحے زیادہ سے زیادہ۔‘‘

’’اس پر تنقیدیں اور مشورے لگ کر فائل تیس چالیس صفحے کی بن جائے گی۔ اس میں فلم کنونشن کی رپورٹیں‘ فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کی قراردادیں اور مطالبات اور اخبارات کے تراشے جمع کرو تو فائل کے سو صفحے ہو جائیں گے۔ شاید اس سے بھی زیادہ اتنے صفحے تو پڑھنے کی فرصت نہ ہوگی‘ جب کیبنٹ کو اسی قسم کے سیکڑوں ڈرافٹ پڑھنے اور ان پر فیصلے لکھنے ہوں۔‘‘

’’یہ تو ٹھیک ہے۔‘‘ جمال نے کہا۔

’’اسی لیے ہم کیبنٹ کو فائل نہیں بھیجتے بلکہ سارے معاملے کی سمری بنا کر بھیج دیتے ہیں اور اہم نکات کی منظوری کی سفارش کر دیتے ہیں۔ اس طرح کیبنٹ کو آسانی ہو جاتی ہے۔‘‘

’’میں سمجھا۔‘‘ جمال نے کہا۔

اتنے میں چائے آئی جسے قدرت اللہ نے خود بنایا۔ وہ لوگوں کا احترام کرتے تھے' بولے: ''اور اس پروسیجر میں حکمتیں بھی ہیں۔ سب سے بڑی یہ کہ ہم وزیراعظم کو حقیقتِ حال کا پتہ ہی چلنے نہیں دیتے۔''

''وہ کس طرح؟''

''وہ اس طرح کہ ہم سمری میں وہی نکات ابھارتے ہیں جو ہمارے مطلب کے ہوں۔ جن میں ہماری طاقت گھٹے اُن کو ہم ابھارتے نہیں۔ ان کو چھپاتے بھی نہیں۔ مگر ان کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ ان کی اہمیت زائل ہو جائے۔ ان کا ذکر بالکل ہی نہ آئے تو گرفت ہو سکتی ہے اور گرفت بیوروکریسی کو منظور نہیں ہوتی۔ تجربے کا مطلب یہی ہے کہ اپنی مرضی کرو' مگر دستخط دوسروں سے کرواؤ۔ کاغذ پر کچھ نظر نہ آئے۔ کاغذ بہت خطرناک چیز ہے۔ وزیر یا وزیراعظم سے دستخط کروانا بہت آسان ہے۔ شرط یہ ہے کہ بیوروکریٹ کام جانتا ہو۔ چنانچہ ہر وزارت میں سمری لکھنے کے لیے ایکسپرٹ افسر ہوتے ہیں۔''

''مگر وزیراعظم بہت کامیاب آدمی ہے۔''

''بے شک ہے' مگر آخر انسان ہی تو ہے۔ پھر اس کی اپنی ترجیحات ہیں۔ جن باتوں میں اسے دلچسپی ہوتی ہے' ان میں ہم اس کی خواہشات کا خیال رکھتے ہیں مگر باقی سب کچھ بیوروکریسی اپنی مرضی سے کرتی ہے۔ مجموعی طور پر عوام کے مسائل دیگر امور کی ذیل میں آتے ہیں۔''

جمال بہت حیران ہوا' بولا: ''اس کا مطلب ہے کہ بھٹو کے ہوتے ہوئے بھی کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آ سکتی۔''

''بیوروکریسی کا کام سٹیٹس کا استحکام ہے اور کوئی بنیادی تبدیلی نہ ہونے دینا۔''

''پھر فلم پالیسی لکھنے کا فائدہ؟''

''لکھنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔ کچھ فائدہ بھی ہو سکتا ہے جن اصلاحات سے بیوروکیسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور خزانے پر بوجھ نہیں پڑتا' ان کو قبول کیا جا سکتا ہے۔''

''مگر میں تو فلم میں بنیادی تبدیلیوں کی سفارش کروں گا۔''

''ضرور آپ کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اس سے کم سے کم ہمارے افسروں کو حقائق کا پتہ چل جائے گا۔ میں نے دراصل اسی لیے آپ کو تکلیف دی۔ ہمارے افسروں کو فلم کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ اس کے باوجود ہم فلم پالیسی بنا سکتے تھے مگر میں نے سوچا کہ منسٹری کو کچھ غیر سرکاری دانش بھی حاصل ہو جائے۔''

''میں تو سب کچھ بلا کم و کاست لکھ دوں گا۔ آگے آپ کی مرضی۔''

''مگر کام اطمینان سے کیجیے۔ تیزی نہ دکھائیے۔ کام شروع کر کے ریسرچ کے بہانے لاہور جائیے۔ اس سے اچھا اثر پڑے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ بہت محنت کر رہے ہیں۔ سیکریٹریٹ کا یہی



''جی نہیں' میں تو پالیسی ختم ہی کر کے لاہور جاؤں گا۔''

''جیسے آپ کی مرضی' مگر پھر سیکریٹریٹ کے افسر آپ کے دشمن ہو جائیں گے۔ اب بھی آپ کے بلائے جانے پر کوئی خوش نہیں۔''

''میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟''

''ایک تو یہی کہ ثابت ہوا کہ منسٹری میں کوئی شخص فلم پالیسی لکھنے کے قابل نہ ہوا۔''

''سو وہ تو ہے۔''

''مگر اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ منسٹری ہر علم کی اجارہ دار ہوتی ہے۔ اسے کسی کی امداد یا بصیرت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ کے آنے سے یہ بات مشکوک ہوگئی۔ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ وزیر نے کسی ایکسپرٹ کو پالیسی بنانے کے لیے باہر سے منگوایا ہو؟''

''یہ تو واقعی میں نے نہیں سنا مگر ہارورڈ کے ماہرین اقتصادیات اور ورلڈ بینک کے ایکسپرٹ تو آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔''

''امریکی ماہرین کی اور بات ہے۔ ہمیں ان سے قرضے لینے ہوتے ہیں۔ نفسیاتی اور جذباتی طور پر ہم امپیریلزم کے غلام ہیں اور ملکہ وکٹوریہ کے وقت سے ہیں۔ یونیورسٹیوں سے ہمارے نوجوان صاف ستھرے اور قوم پرست نکلتے ہیں مگر ٹریننگ اور کام کے پروسیجر ان کو امپیریلزم کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔ سبز درختوں پر زرد اور چمکیلی آکاس بیل بھلی لگتی ہے' مگر وہ درخت پر پھل آنے نہیں دیتی۔''

''اور آپ اس کے باوجود یہاں بیٹھے ہیں۔ آپ بہت دکھی ہوں گے۔''

قدرت اللہ صاحب مسکرا کر بولے ''میں دکھی نہیں۔ میں اس سسٹم کو غلط سمجھتا ہوں اور کبھی کبھی اس سے ٹکر لے لیتا ہوں مگر میں اکیلا اس کو توڑ نہیں سکتا۔ اس لیے میں دکھی نہیں ہوتا۔''

''میں اس سسٹم کو توڑنا چاہتا ہوں۔'' جمال نے کہا۔

''ضرور ضرور۔'' قدرت اللہ صاحب بولے۔ ''انسان کو اپنے ارادوں کی تکمیل کی کوشش کرنی چاہیے۔''

## یا شہرِ خموشاں

مفتی کے گھر واپس جاتے ہوئے جمال اسلام آباد کو بڑے دھیان سے دیکھتا رہا۔ اسے یہ شہر بہت خوبصورت لگا مگر اپنا نہ لگا۔ سڑکیں سب صحیح' دامن کو پکڑ لینے والے رنگ برنگے پھولوں کے تختے' عجیب و غریب درخت' قالین کی طرح بچھا ہوا سبزہ مگر کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے کوئی چھونا چاہے۔

گلاب کی ہزار قسمیں' مگر خوشبو ندارد۔ قندیلوں کی طرح روشنی دیتے ہوئے سورج مکھی پھول مگر خودرو۔

تتلیوں‘ شہد کی مکھیوں اور کالے بھنوروں کی ڈالی ڈالی اُڑان کو رُک کر دیکھنے والا کوئی نہ ہوا۔ مارگلہ اور مری کے پہاڑوں کے فریم میں جڑا ہوا یہ شہر پاکستان کا حصہ نہ تھا۔ نہ اس میں پاکستانی چہرے نظر آتے تھے‘ نہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر‘ نہ نان حلیم کے ٹھیلے‘ نہ گنے کے رس کے بیلنے‘ نہ آوارہ کتے‘ نہ لولے لنگڑے فقیر‘ نہ گندے بچے۔ جمال بس سے اُتر کر سڑک کے کنارے چلتا چلتا گھر پہنچ گیا۔

راستے میں اس نے مختلف قسم کی آبادیاں دیکھیں۔ سیکریٹری‘ سیکریٹریوں کے سیکٹروں میں رہتے تھے۔ جوائنٹ سیکریٹریوں کا محلّہ الگ تھا جس میں ڈپٹی سیکریٹری رہ نہ سکتے تھے۔ وہ سیکشن افسروں سے بھی الگ رہتے تھے۔ ان کی بستی علیحدہ تھی پھر چھوٹے ملازمین اور ان کے کوارٹرز۔ سپرنٹنڈنٹ سے چپڑاسی تک ہر ایک اپنی اپنی سرکاری نسبت سے آباد تھا۔ کوارٹروں کے نقشے اور رنگ ایک ہی جیسے تھے۔ اعلیٰ حیثیت کے افسر ادھر سے ناک چڑھا کر یا منہ پر رومال رکھ کر نکل جاتے تھے۔ یہاں بدبو نہیں تھی مگر سٹیٹس کی ناک بہت حساس ہوتی ہے۔ غربت یا ماتحتی کی سڑاند برداشت نہیں کر سکتی۔

چپڑاسیوں سے سپرنٹنڈنٹس تک سٹیٹس ایک نازک مسئلہ تھا۔ سپرنٹنڈنٹ‘ سپرنٹنڈنٹوں اسسٹنٹ اسسٹنٹوں اور کلرک کلرکوں سے کم درجے کے لوگوں سے بات نہیں کرتے تھے۔ اپنی ناک پر ڈرائیور اور چپڑاسی بھی کوئی باہر کی مکھی بیٹھنے نہ دیتا تھا۔ اسلام آباد سٹیٹس کا مارا کرسی پر بیٹھا اندھا بہرہ شہر تھا۔ تپائی پر دوا کی شیشیاں‘ چائے کے خالی برتن اور بڑی میز پر فائلوں کے ڈھیر۔ ان کے بغیر وہ ایک دن میں مر جاتا۔

اسلام آباد ایک ویران شہر تھا۔ لوگ دفتروں سے نکلتے تو گھروں میں بند ہو جاتے۔ کسی کو کسی سے ملنے کے لیے آنا جانا ہو تو پہلے ٹیلی فون کر کے اجازت لیتا۔ سگریٹ سلگانے سے پہلے ایش ٹرے تلاش کرتا‘ چائے پر کافی کو ترجیح دیتا کیونکہ امریکی کافی کے رسیا تھے۔ انہی کے لہجے‘ انہی کا کلچر مگر آدابِ مجلس ہنوز انگریزی۔ وہی رکھ رکھاؤ۔ وہی چہرے پر خشونت‘ ماتحتوں اور عام آدمیوں کے ساتھ حقارت کا سلوک! ساتھیوں پر شک‘ کم گوئی اور گفتگو میں ابہام۔

مگر ایک خرابی یہاں اور در آئی تھی۔ جہاں انگریز افسر صاف فیصلے کرتے تھے اور ذمہ داری قبول کرتے تھے وہاں پاکستانی افسر فیصلے کرنے سے کتراتے۔ ذومعنی تجویزیں پیش کرتے یا فائل کو دوسرے افسر کی طرف بھیج دیتے تاکہ فیصلے کی ذمہ داری سے بچ جائیں مگر اس کے ساتھ ہی اُن کا جاگیرداروں اور تھانیداروں والا غرور جونت نئے سوٹ پہن کر دفتر آتا اور ایک ہی جیبی رومال سے منہ اور جوتے صاف کرتا۔ جاگیرداروں اور تھانیداروں کی طرح چھوٹے افسر بڑے افسروں کی خوشامد کرتے تو زمین پر لیٹ ہی جاتے۔

یہ باتیں جمال کو آہستہ آہستہ ہی معلوم ہوئیں۔ ابھی تو اُس کا پہلا دن تھا۔ وہ کام شروع کرنا چاہتا تھا۔ خیالات اس کے ذہن میں تھے مگر قدرت اللہ صاحب نے کہہ دیا تھا کہ آہستہ برگِ گل بفشاں بر مزار ما!...... ہمارے مزار پر آہستگی سے پھول برسا!



## آج کا کام کل پر ڈالو

''قدرت اللہ صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔'' مفتی نے کہا ''حکومت کا اصول ہے کہ جس کام کو کل پر ٹالا جا سکتا ہے‘ اسے آج نہ کرنا چاہیے۔''

''یہی تو وجہ ملک کو تباہ کرنے کی ہے۔'' جمال نے کہا۔

''تم ملک کو بچانے آئے ہو؟ بچا لو گے؟'' مفتی نے چڑ کر کہا۔

''یہ تو میں نہیں کہتا مگر سب لوگ کام کرنے لگ جائیں تو......''

''سب لوگ کام کرنے کیوں لگ جائیں؟ کون سی مجبوری ہے۔ اسی طرح ہوتا آیا ہے۔ اسی طرح ہوتا رہے گا۔ جان کو ہلکان نہ کرو۔ لے آؤ۔ شطرنج کی ایک بازی ہو جائے۔''

بساط بچھ گئی۔ مفتی کے خاندان کی ذہنی صلاحیت بہت زیادہ ہے۔ وہ دھڑا دھڑ ماتیں دینے لگا۔ جمال کھیل اور مطالعے کے دوران سگریٹ پینے کا عادی تھا۔ اس نے ایش ٹرے پاس رکھ لی اور وہ گُل اس کے اندر جھاڑتا تھا۔ مفتی پان کا عادی اور تمبا کو کھاتا تھا‘ پیتا نہیں تھا۔ دونوں کھیل میں مصروف ہو گئے۔

جمال مفتی اور اس کے بچوں سے بے تکلف تھا اور وہ بھی اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ جانتے تھے کہ دونوں کا جنم جنم کا ساتھ ہے۔ اچانک مفتی کی بہو کمرے میں آئی اور بولی ''ابو ہم جا رہے ہیں۔ ہمیں فارنرز کی ایک پارٹی میں جانا ہے۔ اس لیے......'' پھر اچانک وہ غضبناک ہو گئی اور بولی ''یہ کیا کر رہے ہیں ابو؟ آپ کو ایش ٹرے نظر نہیں آتی؟''

مفتی نے حیران ہو کر اپنی بہو کی طرف دیکھا۔ جمال کا رنگ زرد ہو گیا۔ اس نے سگریٹ کا گُل ایش ٹرے کے اندر جھاڑا تھا مگر راکھ ایک مرتبہ اپنے آپ جھڑ کر قالین پر بکھر گئی تھی۔ مفتی نے ادب سے کہا ''میں ابھی صاف کر دیتا ہوں۔'' اور اس نے بازی وہیں چھوڑ دی۔ جمال شرم کے مارے زمین میں گڑ گیا۔ ''اے گھامڑ تجھے پتہ نہیں کہ یہ اسلام آباد ہے۔''

## چلی مشین چلی

قدرت اللہ نے اگلے روز جمال سے کہا ''ایک آدھ دن میں آپ کو میز کرسی مل جائے گی۔ ہمارے ہاں جگہ کی تنگی ہے مگر میں نے انتظام کر دیا ہے۔''

''میں گھر میں کام کر سکتا ہوں۔'' جمال نے کہا۔

''یہ غلط بات ہوگی۔ منسٹری آپ کو قبول نہیں کریگی۔''

''نہ کرے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' جمال نے کہا۔

''فرق پڑتا ہے کیونکہ پھر آپ کی پالیسی بھی قبول نہ ہوگی۔ آپ باہر کے آدمی سمجھے جائیں گے اور باہر کے آدمیوں کو سیکریٹریٹ میں کوئی [illegible]''

"نہ دے۔ اگر پالیسی ٹھیک ہوگی تو میری اہمیت ہو جائے گی۔"

"آپ کی پالیسی ٹھیک ہوگی مگر اس کا فیصلہ تو یہی لوگ کریں گے۔ آپ ان کے جتھے میں شمار نہ ہوئے تو کچھ بھی نہ ہوگا۔ ان کو دراصل کسی پالیسی کی ضرورت ہی نہیں۔ آپ تبدیلی کریں مگر ظاہر نہ ہونے دیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"اسی کا نام تجربہ ہے۔" قدرت اللہ صاحب دانائی سے مسکرا کر بولے۔ "سیکریٹریٹ کے ماہرین اول تو تبدیلی کرتے ہی نہیں اور کرتے ہیں تو تھوڑی بہت مگر پتہ نہیں چلنے دیتے اور پہلے زمین ہموار کر لیتے ہیں۔ آپ کو زمین ہموار کرنے کے لیے ان کے قبیلے میں شامل ہونا پڑے گا۔ میز کرسی لگانی پڑے گی۔ وہ آپ کو نہیں ملے گی میرے حکم کے باوجود۔ پھر آپ کو شور مچانا پڑے گا۔ دھمکی دینی پڑے گی کہ میں سیکریٹری صاحب سے شکایت کروں گا۔ سیکریٹری سے یہ لوگ بہت ڈرتے ہیں۔"

"سیکریٹری تو آپ ہی ہیں۔"

"مجھ سے کوئی نہیں ڈرتا۔ سیکریٹری سے ڈرتے ہیں یہ لوگ۔ آپ پہلے میز کرسی لیں، پھر سٹینوگرافر کا مطالبہ کریں۔"

"سٹینوگرافر کی مجھے ضرورت نہیں۔ جب میں ڈرافٹ لکھ لوں گا تو کسی سے ٹائپ کروا لوں گا۔"

"سٹینوگرافر کی دراصل کم ہی لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ مگر جس افسر کے پاس سٹینوگرافر نہ ہو اس کا سٹیٹس کم سمجھا جاتا ہے۔ اس کی بات کوئی نہیں سنتا۔ آپ سٹینوگرافر ضرور لیں۔"

"وہ کیا کرے گا۔ مکھیاں مارے گا؟"

"سیکریٹریٹ کا اصل کام یہی ہے۔ مکھیاں مارنا یا مکھی پر مکھی مارنا۔ سٹینوگرافر آپ کا ٹیلی فون وصول کرے گا اور کہے گا صاحب میٹنگ میں ہیں۔ اس سے بڑا رعب پڑتا ہے۔"

"مگر مجھے یہاں کون ٹیلی فون کرے گا؟"

"ٹیلی فون آتا نہیں کروایا جاتا ہے۔ پہلے آپ کسی ڈپٹی سیکریٹری یا جوائنٹ سیکریٹری سے کسی چیز کا مطالبہ کریں گے۔ کوئی دھونس دیں گے، پھر آپ کو جواب آنے لگیں گے۔ آپ کی گنتی ہونے لگے گی۔ میں نے آپ کو فلم ایڈوائزر ٹو دی منسٹری آف ایجوکیشن کا عہدہ دیا ہے۔ یہ بھاری بھرکم ہے۔ وزارت کے افسر پالیسی کے علاوہ فلم کے تمام امور میں آپ سے مشورے لینے لگیں گے۔ آپ کو اپنی میٹنگوں میں بلانے لگیں گے، کام بن جائے گا۔"

"مگر یہ سب دس پندرہ دن کے لیے؟"

"دس پندرہ دن تو آپ کو میز کرسی اور ٹیلی فون کے حصول میں لگ جائیں گے۔ جتنا زیادہ وقت لگ جائے اتنا ہی اچھا۔ فی الحال آپ مجھے ایک نوٹ لکھ کر دے دیں کہ فلم کے سلسلے میں جتنی بھی تجاویز منسٹری



کے پاس ہیں، ان کی نقلیں میرے حوالے کر دی جائیں۔ پھر آپ ان کا مطالعہ کرنے بیٹھ جائیں۔ آپ کو لاہور جانے کی جلدی تو نہیں؟"

"جی نہیں مگر میں اب اخبار میں واپس نہیں جاؤں گا۔"

"مگر آپ استعفیٰ نہ دیں فی الحال! چیزوں کو مبہم رکھنا مفید ہوتا ہے۔ راستے بند نہ ہونے چاہئیں کسی صورت!"

## آپ سے ملیے

اتنے میں کچھ افسر فائلیں بغل میں دبائے قدم قدم چلتے کمرے میں داخل ہوئے۔

"سوری سر میں مخل ہوا۔" ایک افسر بولا۔

"آیئے آیئے۔" قدرت اللہ صاحب نے نہایت وضعداری سے کہا "میں جمال صاحب سے بات کر رہا تھا۔ بڑے روشن خیال اور تجربہ کار آدمی ہیں۔"

پھر وہ جمال سے مخاطب ہوئے۔ "یہ ہمارے جوائنٹ سیکریٹری ہیں، ڈاکٹر خان محمد صاحب۔"

"آداب عرض ہے جناب۔" ڈاکٹر خان مصنوعی ملائمت سے بولے۔

## آدابِ محفل

"آداب عرض جناب۔" جمال نے جواب دیا۔

"ہمیں ان کے ٹیلنٹ کی بڑی ضرورت تھی جناب۔" انہوں نے کہا "ہم لوگ فلم کے بارے میں کچھ جانتے نہیں۔ یہ ہمیں بتائیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

"خان محمد صاحب ایڈمنسٹریشن کے انچارج ہیں۔ آپ کا زیادہ واسطہ انہی سے پڑے گا۔" قدرت اللہ صاحب بولے۔

"ان کو ڈپٹی سیکریٹری فلمز کے کمرے میں بٹھا دیا جائے مگر ابھی ان کا سٹیٹس طے نہیں ہوا سر۔" وہ بولے۔

"مجھے کہیں بھی بٹھا دیں۔" جمال بولا۔

"ان کا سٹیٹس بھی طے ہو جائے گا۔" قدرت اللہ صاحب نے جواب دیا۔ "ان کے ایڈوانس کی ادائیگی کب ہوگی؟"

"فنانس کو نوٹ جا رہا ہے سر۔ سینکشن آ جائے تو میں فوراً چیک بنوا دوں گا۔"

"اور ان کا کنٹریکٹ بھی بنوا دیجیے۔ دو مہینے کے لیے فی الحال۔ میں سمجھتا ہوں کہ دو مہینے میں پالیسی بن جائے گی۔"

"مشکل ہے سر۔" ڈاکٹر خان بولے "فیڈرل گورنمنٹ کی پالیسی ہے آخر"

جمال نے کچھ کہنا چاہا۔ قدرت اللہ صاحب بولے "دو مہینے میں فیڈرل گورنمنٹ کی پالیسی کبھی بنی تو نہیں۔"

''کام بہت زیادہ ہے سر۔ ہمیں انڈسٹری کے تمام شعبوں کے بارے میں سوچنا ہے۔ پروڈیوسر ہیں' سٹوڈیو والے ہیں' پھر ایکٹر' مصنف' موسیقار' ٹیکنیشن' ان سب کے لیے کچھ کرنا ہے۔ کام بہت زیادہ ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' قدرت اللہ صاحب بولے ''بٹ فسٹ تھنگز فسٹ۔ ان کے بیٹھنے کی جگہ' ایک سٹینوگرافر۔ فون تو یہ فی الحال ڈپٹی سیکریٹری فلمز کا استعمال کریں گے۔ میرا مطلب ہے اگر ان کے کمرے میں گنجائش ہے تو۔''

''فرمایئے' یہ کیسی فائل ہے؟''

''جی منسٹر صاحب تنگ کر رہے ہیں۔ کچھ آدمیوں کو ملازمت دلوانا مقصود ہے۔ یہ لوگ ان کے گاؤں کے ہیں۔ عوام کی خدمت کا مسئلہ ہے۔''

''کوئی ویکنسی ہے؟'' قدرت اللہ صاحب نے پوچھا۔

''ویکنسی تو کوئی نہیں سر۔'' ڈاکٹر خان بولے۔ ''مگر انہوں نے حکم دیا ہے کہ ویکنسی پیدا کی جائے۔ فنانس سے وہ خود بات کرلیں گے۔ ارجنٹ ہے سر' ڈرافٹ آپ خود دیکھ لیں۔''

قدرت اللہ صاحب نے فائل دیکھے بغیر دستخط کر دیئے۔

جب ڈاکٹر خان محمد چلے گئے تو جمال نے کہا ''خان محمد صاحب کیا بہت لائق آدمی ہیں؟ آپ نے فوراً ہی دستخط کر دیئے۔''

''انگریزی ٹھیک لکھتے ہیں۔ پہلے کالج کے پرنسپل تھے۔ اب دفتری کام بھی سیکھ گئے ہیں۔ وزارت تعلیم میں آ کر میں نے محسوس کیا تھا کہ پروفیسروں اور پرنسپلوں کو کچھ عرصے کے لیے وزارت میں تعینات کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے معاملات اپنی مرضی سے طے کر سکیں۔ تین برس کے بعد وہ واپس چلے جائیں گے۔''

''یہ تو بہت عمدہ تجویز ہے۔ علم اور عمل کا جدلیاتی رشتہ' اس سے فائدہ تو بہت ہوا ہوگا۔'' جمال نے کہا۔

''پروفیسروں اور پرنسپلوں کو تو بہت فائدہ ہوا۔ انہیں عمدہ گریڈ اور ترقیاں مل گئیں مگر وزارت تعلیم اور تعلیمی پالیسیوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس لیے کہ اب یہ لوگ واپس جانے پر آمادہ نہیں۔ انہوں نے اپنی مستقل تعیناتی کے قوانین بنوا لیے ہیں۔ اب یہ کسی اور کو آنے نہیں دیتے۔ فیڈرل گورنمنٹ اور سول سروس کے تمام بھید جان گئے ہیں' مثلاً فیصلے کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالنا۔ افسروں کی ہاں میں ہاں ملانا' ہر نئے خیال کو رد کرنا۔ بات بات پر رولز کی دہائی دینا اور پروفیسروں اور پرنسپلوں سے حقارت کا سلوک کرنا۔''

''مگر آپ کہتے ہیں کہ یہ بہت لائق آدمی ہیں۔''

''سیکریٹریٹ میں لائق ایسوں ہی کو کہتے ہیں۔''

''کیا وہ تجویز درست تھی جس پر آپ نے دستخط کیے؟''

''تھی بھی اور نہیں بھی۔ یہ تجویز غلط تھی کیونکہ پنج سالہ منصوبے میں نئی آسامیوں کے لیے فنڈ مخصوص



نہیں ہیں مگر یہ پیپلز پارٹی کا زمانہ ہے۔ سیکریٹریٹ کے افسر ساری غلطیاں وزیروں سے کرواتے ہیں کیونکہ وہ عوامی نمائندے ہیں۔''

''پھر آپ نے دستخط کیوں کر دیئے؟'' جمال نے حیران ہو کر پوچھا۔

''سیکریٹری سے یہی توقع کی جاتی ہے۔ فوری فیصلہ۔ غلط اور صحیح فیصلوں کے نتائج یکساں ہوتے ہیں۔ کسی طرح بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سول سروس کو ٹریننگ میں دو تین باتیں سکھائی جاتی ہیں۔ اول کوئیک ڈسپوزل یعنی جلد فیصلہ' دوم کوئی ایسی تجویز سرے نہ چڑھنی چاہیے جس سے سوسائٹی میں کوئی تبدیلی آئے۔ سوم سیکریٹریٹ سرونٹ کا ضمیر حکومت کی ملکیت ہے۔ اس کی ذاتی اور انفرادی کوئی رائے نہ ہونی چاہیے۔''

''مگر آپ کی روشن ضمیری اور دلیری کی تو بڑی دھوم ہے۔''

''یہ بھی درست ہے۔ میں سال میں دو چار کیس خود کرتا ہوں جن میں وزیراعظم کو ذاتی طور سے دلچسپی ہو اور کبھی کبھی وزیراعظم یا صدر سے جھگڑا بھی کر لیتا ہوں۔ روزمرہ امور میں مَیں زیادہ عرق ریزی نہیں کرتا۔''

جمال کے لیے یہ ساری باتیں نئی تھیں۔ یہ بھید اسے کبھی کسی نے نہیں بتائے تھے۔ قدرت اللہ صاحب نے بتا دیئے کیونکہ جانتے تھے کہ جمال خود ایک باغی اور سر پھرا آدمی ہے۔ پھر جمال نے پوچھا ''کیا آپ نے شروع سے اسی طرح کام کیا؟''

## غلط اور صحیح فیصلے

قدرت اللہ صاحب بولے ''شروع میں جب میں نے آئی سی ایس میں پوزیشن لی تو میں ہر فیصلے کو اہمیت دیتا تھا۔ پھر تجربے نے بتایا کہ سو میں سے ننانوے کیس بیکار ہوتے ہیں اور آخری سویں کیس کو بھی احتیاط سے کرنا ضروری نہیں ہوتا۔''

جمال نے پوچھا ''آپ نے وہ سواں کیس کب کیا جو آپ کے نزدیک اہم تھا؟''

''گزشتہ سال۔ میں نے ایجوکیشن پالیسی لکھی تھی۔ بھٹو صاحب مجھ پر بہت بھروسہ کرتے تھے۔ انہوں نے پڑھے بغیر اس کی منظوری دے دی مگر اس سے کچھ ہوگا نہیں۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ میں نے تعلیم کا تصور ہی بدل دیا۔ اس پالیسی کے نتیجے میں طلبہ کا ذہنی ارتقا ہوگا۔ ان میں تجسس' تخلیق اور آزادیٔ فکر کے سوتے پھوٹ سکتے ہیں۔ یہ نئی بات ہے اور نئی بات حکمرانی کے فلسفے کے خلاف ہے۔ آپ کی پالیسی بھی نہیں چلے گی۔ اگر آپ نے کوئی نئی بات کی تو......''

''پھر میں کیا کروں؟''

''آپ اچھی پالیسی بنایئے۔ نئی بات کیجیے۔ چلے یا نہ چلے۔ آپ کو اس سے کیا۔ آپ کو ایڈوانس

''ابھی نہیں جی۔''

قدرت اللہ صاحب نے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری سے کہا ''ڈاکٹر خان محمد صاحب کو سلام کہو۔''

ڈاکٹر خان ہانپتے ہوئے اندر آئے اور کہنے لگے ''میں نے فنانس میں آدمی بھیجا ہے سر۔ آپ جانتے ہیں کہ فنانس والے کام نہیں کرتے مگر میں نے جوائنٹ سیکریٹری سے بات کر لی ہے۔ جمال صاحب آپ فکر نہ کریں۔ کل آپ کو ایڈوانس مل جائے گا۔''

''اور ان کے بیٹھنے کا کیا ہوا؟'' قدرت اللہ صاحب نے پوچھا۔

''جی میں کچھ سوچ رہا ہوں۔ ایک دفعہ ان کا سٹیٹس طے ہو جائے تو......''

''کنٹریکٹ بنا دیا ہے آپ نے؟''

''ڈرافٹ ہو رہا ہے سر۔'' ڈاکٹر خان بولے ''میں سمجھتا ہوں۔ ان کا وقت ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تخلیقی آدمی ہیں۔ لاہور میں ان کے بغیر کئی کام رُکے ہوں گے۔''

''جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔'' جمال نے شرما کر کہا۔

ڈاکٹر خان مسکرا کر بولے۔ ''یہ تو جناب کا تخلیقی عجز ہے۔ ہمیں کیا آپ کا مقام و مرتبہ معلوم نہیں؟ پرائم منسٹر نے آپ کو یونہی اپنے اخبار کا ایڈیٹر نہیں رکھ لیا تھا اور ہمارے سر بھی آپ کے معترف ہیں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں راہنمائی کے لیے پرائم منسٹر کا آدمی ملا۔''

''ڈاکٹر خان محمد صاحب میں پرائم منسٹر سے کبھی نہیں ملا۔ میں کسی طرح بھی اُن کا آدمی نہیں۔''

جمال نے کہا۔

ڈاکٹر خان نے قہقہہ لگایا اور بولے ''یہ کیسے ہو سکتا ہے سر۔ آپ ان کے سیاسی ترجمان ہوں اور ان سے کبھی ملے نہ ہوں۔''

''آپ مانیں یا نہ مانیں مگر میں بھٹو صاحب سے کبھی نہیں ملا۔'' جمال نے کہا۔

''کیا واقعی؟'' ڈاکٹر خان نے حیران ہو کر کہا ''مگر دیگر وزراء کو تو آپ جانتے ہوں گے؟''

''بعض مگر میں نے کسی سے خوشگوار تعلقات نہیں رکھے۔''

''کیوں بھلا؟''

''میں ایک اخبار نویس ہوں۔ تعلقات کی زنجیروں سے آزاد رہتا ہوں۔''

قدرت اللہ صاحب بولے ''یہ اور قسم کے اخبار نویس ہیں۔ اپنے ضمیر کے خلاف کچھ نہیں لکھتے۔ کسی کی نہیں سنتے۔ کسی سے ڈرتے بھی نہیں۔''

ڈاکٹر خان بہت متاثر ہوئے۔ بولے ''جی پھر تو ان سے ہمیں ڈرنا چاہیے مگر ہمارے وزیر صاحب سے تو ان کی شناسائی ہوگی۔''



''انہوں نے تو میرا نام بھی نہ سنا ہوگا۔'' جمال نے کہا۔

''مگران کا تو آپ سے واسطہ ہوگا یا مجھ سے۔'' قدرت اللہ صاحب نے لقمہ دیا۔

''جی میں تو خادم ہوں۔'' ڈاکٹر خان نے جھکتے ہوئے کہا ''یہ کام شروع کر دیں۔ پھر یہ فنانس بہت تنگ کرتا ہے سر۔ اب میں خود وہاں کا چکر لگاتا ہوں۔''

ڈاکٹر خان چلے گئے تو قدرت اللہ صاحب نے کہا ''آپ نے کیوں کہہ دیا کہ میں بھٹو صاحب سے کبھی نہیں ملا۔ یہ لوگ قصائی ہیں' ان پر رعب رکھنا چاہیے۔ یہ دل سے منتخب حکومت کے ساتھ نہیں۔ انہوں نے بھٹو صاحب کو تول لیا ہے۔ وزیروں کو شیشے میں اُتار لیا ہے۔ اب جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ آپ کو اپنے راز انہیں نہیں بتانے چاہئیں۔''

جمال نے کہا ''یہ تو ٹھیک ہے مگر میرا کوئی کیا کر لے گا۔ جب آپ یہاں بیٹھے ہیں۔''

''ضروری نہیں کہ میں یہاں بیٹھا رہوں۔ میں تو باقاعدہ سرکاری ملازم بھی نہیں۔ میں تو کنٹریکٹ پر ہوں۔ یحییٰ خان سے لڑ کر میں نے پنشن لے لی تھی۔ بھٹو صاحب نے آ کر مجھے بحال کرنا چاہا مگر میں راضی نہ ہوا۔ میرے بحال ہونے سے بہت سے لوگوں کی سنیارٹی خراب ہوتی۔ میں نے کنٹریکٹ لے لیا کہ جب چاہوں چھوڑ دوں یا جب سرکار چاہے مجھے نکال دے۔ میری ضروریات بہت محدود ہیں۔''

''بے شک!''

''مگر کچھ عرصے کے لیے مجھے شاید باہر جانا پڑے۔ میں نے ڈاکٹر خان سے کہہ دیا ہے۔ وہ آپ کا خیال رکھیں گے۔ آپ کسی سے جھگڑا نہ کریں میری واپسی تک۔''

اتنے میں دروازہ کھلا اور کچھ افسر دروازے میں نمودار ہو کر رک گئے۔ قدرت اللہ صاحب نے گھڑی دیکھی اور کہا ''اب مجھے ایک میٹنگ کرنی ہے۔''

## دشمنوں کے نرغے میں

شام کو جمال مفتی کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا کہ قدرت اللہ صاحب نے اسے گھر بلا لیا۔ جب وہ واپس آیا تو بازی اسی طرح لگی تھی۔ مفتی نے کہا ''لو چلو چال۔''

جمال نے گھوڑا بڑھایا تو مفتی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا ''عزت بیمار ہے' بہت بیمار ہے۔''

عزت قدرت اللہ کی بیوی گُردوں کے مرض میں مبتلا تھیں۔ اس کا جمال کو علم تھا۔ ''کیا بہت بیمار ہیں؟'' جمال نے پوچھا۔

''ہاں۔ انہیں لندن جانا پڑ گیا ہے۔ کل صبح کی سیٹیں ملی ہیں۔ قدرت اللہ نے فی الحال دو ماہ کی چھٹی لے لی ہے۔''

''مگر انہوں نے آج تک اس بات کا اشارہ نہیں کیا۔ حالانکہ دنیا جہان کی باتیں انہوں نے میرے

ساتھ کیں۔"

مفتی دانائی سے بولا "تم نہیں جانتے اسے۔ اس کا یہی طریقہ ہے۔ اپنا بھید کسی کو نہیں بتاتا۔ اپنے دکھوں میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ مجھے بلا کر کہا کہ جمال سے کہو وہ کسی بات کی فکر نہ کرے۔ ڈاکٹر خان کو اس نے تمہارے بارے میں تاکید کر دی ہے۔"

"میرے بارے میں انہیں نہیں سوچنا چاہیے اس وقت۔" جمال نے کہا۔

مفتی چڑ کر بولا "وہ جس کے بارے میں چاہے سوچے' تم کون ہو اس کو روکنے والے۔ تم اسے نہیں جانتے۔ وہ ایک راز ہے۔ جتنا اسے جانو اتنا ہی دکھ بھرو۔ اسے نہ جاننا نہ سمجھنا بہتر ہے۔ وہ بظاہر ایک بودا آدمی ہے مگر پیاز کی گٹھلی ہے۔ چھلکوں کے نیچے چھلکے نکلتے آتے ہیں۔ اللہ ایسے بودوں کو ہمیشہ آزمائش میں رکھتا ہے۔ اب پھر پھنس گیا ہے۔ اس کے گھر کا بھیدی ہے نا۔ لو میں نے فیل تمہارے بادشاہ پر لگا دیا۔ تم میرا وزیر مار سکتے ہو مگر پھر بازی مات۔"

## رنگ جہاں اور

دوسرے دن جمال ڈاکٹر خان کے کمرے میں چلا گیا۔ قدرت اللہ صاحب جا چکے تھے۔ ڈاکٹر خان فائلوں پر جھکے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر بولے "میں ذرا مصروف ہوں۔ آئی ایم سوری!"

"جی میں سمجھتا ہوں۔" جمال نے کہا "قدرت اللہ صاحب کہہ گئے تھے کہ میرے کنٹریکٹ پر آج دستخط ہو جائیں گے۔"

"فرصت نہیں ملی۔"

"ان کو فرصت نہیں ملی؟"

"مجھے فرصت نہیں ملی۔ آپ کا کنٹریکٹ تیار نہ ہو سکا۔ ضروری کاغذات فیصلہ طلب پڑے تھے اس لیے۔ آپ کا کنٹریکٹ ابھی ٹائپ نہیں ہوا۔"

"مگر وہ تو کل ٹائپ ہو رہا تھا۔"

"ہو رہا تھا مگر ہوا نہیں۔ منسٹری کو کام بھی تو کرنا ہوتا ہے۔"

جمال سمجھ گیا کہ قدرت اللہ صاحب کے جانے سے فضا تبدیل ہو گئی ہے مگر اس نے ڈھٹائی سے پوچھا "تو آج ٹائپ ہو جائے گا ڈاکٹر خان؟"

"اصل میں آپ فیڈرل گورنمنٹ کے رولز آف بزنس کو نہیں جانتے۔ ابھی تو ڈرافٹ فنانس کو جانا ہے۔"

"تو کتنا وقت لگے گا؟"

"کیا کہہ سکتا ہوں۔" ڈاکٹر خان نے چڑ کر کہا۔ "سرکاری کام اپنے وقت ہی پر ہوتے ہیں مگر ابھی آپ نے کام کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"



"میرے پاس تو بیٹھنے کو جگہ بھی نہیں ابھی۔" جمال نے کہا۔

ڈاکٹر خان ترش روئی سے بولے "تو کیا میں آپ کو اپنے کمرے میں میز لگوا دوں؟ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کا سٹیٹس کیا ہے۔ جب جگہ ہے ہی نہیں اور یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کا سٹیٹس کیا ہے تو میں آپ کو کہاں بٹھاؤں۔"

جمال بھی کچھ چڑ گیا۔ اس نے کہا "تو پھر کام کھڑے کھڑے تو نہیں ہو سکتا۔"

"یہ تو میں نہیں جانتا اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی باہر کا آدمی فیڈرل گورنمنٹ کی پالیسی مرتب کر سکتا ہے۔ آپ کو قدرت اللہ صاحب کہیں سے پکڑ کر لے آئے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ فیڈرل گورنمنٹ کی راہنمائی کے قابل ہو گئے۔ ہر ایرا غیرا دخل در معقولات دینے لگے تو ہم کیا یہاں بھاڑ جھونکنے کے لیے بیٹھے ہیں۔"

"میں کسی کو ستانے کے لیے نہیں آیا ڈاکٹر خان۔ مجھے تو قدرت اللہ صاحب نے درخواست کر کے بلایا تھا کہ میں آ کر فیڈرل گورنمنٹ کی مدد کروں ورنہ مجھے یہاں آنا کیا ضرور تھا!"

"کوئی تحریر ہے آپ کے پاس؟ آپ ناراض نہ ہوں میرے بھائی۔ میرے یہاں کام کا دباؤ بہت ہے۔ آپ آئے ہیں تو شوق سے پالیسی لکھیں' پھر ہم اس پر غور کریں گے۔ آپ کو کسی نے کام سے روکا تو نہیں۔ قدرت اللہ صاحب میرے محسن ہیں۔ میرا فرض ہے کہ میں آپ کا خیال رکھوں۔"

جمال کو بے حد غصہ آیا اور قریب تھا کہ وہ پھٹ پڑے مگر اخبار میں بھی وہ واپس جانا نہ چاہتا تھا۔ خون کے گھونٹ پی کر اس نے کہا "تو پھر آپ مجھے اپنے کاغذات جو پالیسی سے متعلق ہوں' دے دیں تا کہ میں ان کا مطالعہ کر لوں۔"

ڈاکٹر خان طنزاً مسکرا کر بولے "آپ فیڈرل گورنمنٹ کے رولز کو نہیں جانتے۔ ہم کیسے آپ کو سیکریٹریٹ کے راز دے دیں۔ فلم کے متعلق کاغذات آپ کو نہیں دکھائے جا سکتے۔"

"تو پھر میں کام کی ابتدا کیسے کروں۔"

"آپ ایکسپرٹ ہیں۔ آپ کو پتہ ہونا چاہیے فلم کنونشن میں جو تقریریں ہوئیں' ان کی ریکارڈنگ ہمارے کلچرل ونگ میں موجود ہے۔ اگر فلم والے جاہل نہ ہوتے اور انگریزی کی بجائے اردو میں بک بک شروع نہ کر دیتے تو ہم کوئی سٹینوگرافر لگا دیتے جو ان کو کاغذ پر اتار دیتا۔ آپ اتنا تو کریں فی الحال۔ ہمارے کلچرل ونگ میں آپ کو ٹیپ ریکارڈ بھی مل جائے گا اور چائے بھی۔ اگر کوئی رکاوٹ آئے تو مجھ سے رابطہ قائم کریں' مگر پہلے میرے پی اے سے وقت لے لیں۔ اوہو! میرا کتنا وقت فضولیات میں ضائع ہو گیا!"

قدرت اللہ صاحب اس وقت عدن پار کر چکے تھے اور یہ ڈاکٹر خان کو معلوم تھا۔

## باب 36

قدرت اللہ صاحب کے منظر سے غائب ہوتے ہی جمال کو وزارت میں پہچاننے والا کوئی نہ رہا۔ نہ تو اس کا کنٹریکٹ ٹائپ ہو سکا نہ فنانس سے ایڈوانس کی منظوری آئی اور نہ کسی نے اس سے فلم پالیسی کے بارے میں کوئی بات کی۔ وہ کلچرل ونگ میں بیٹھا ٹیپ ریکارڈر پر فلم والوں کی تقریروں کی ریکارڈنگ کو کاغذ پر اتارتا رہا۔ وہ چند ہفتے اسی طرح گزر گئے۔

ڈاکٹر خان پالیسیاں بنانے کی خصوصی ٹریننگ امریکہ سے لے کر آئے تھے اور ان کو جو کچھ معلوم تھا' وہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ انہوں نے سیکھا تھا کہ کسی بھی پالیسی کی ترتیب میں حکومت کے تمام صیغوں کو نمائندگی دینی ضروری ہے تاکہ پھر کوئی دوسری وزارت اعتراض کرنے کے قابل نہ رہے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ جو لوگ کسی مسئلے کی پالیسی وضع کرنے بیٹھیں انہیں نفسِ مضمون کا بھی کچھ علم ہو۔ گورنمنٹ کی ہر پالیسی میں میٹنگ بنیادی شرط ہے اور اسی میٹنگ میں فنانس منسٹری' فارن آفس' وزارت داخلہ اور دیگر وزارتوں اور شعبوں کے نمائندوں کو مدعو کیا جاتا ہے تاکہ بعد میں کوئی نہ بولے۔ اب فلم سے فنانس منسٹری فارن آفس اور وزارت داخلہ کا کیا تعلق' مگر یہ وزارتیں ہر معاملے میں دخل انداز ہو سکتی ہیں۔ اس لیے رفع شر کے لیے شروع ہی سے ان کو شاملِ حال کر لیا جاتا ہے۔ جمال دور کسی اور بلڈنگ میں بیٹھا ٹیپ ریکارڈر چلاتا اور بند کرتا رہا اور اِدھر وزارت میں ڈاکٹر خان کی صدارت میں فلم پالیسی بننے لگی۔ ایک میٹنگ میں وہ بن بلائے پہنچ گیا۔

ایک بہت لمبوتری میز کے گرد بہت سے افسر بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ سب کے سامنے پینسلیں اور کاغذ اور بعض کے آگے کچھ فائلیں رکھی تھیں۔ جمال کو دیکھتے ہی ڈاکٹر خان کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ حکومت میں بات کرنے کا ایک لہجہ مقرر ہے۔ وہ نہایت نرمی سے بولے: ''مسٹر جمال یہ سرکاری میٹنگ ہے۔ آپ کو یہاں کس نے بلایا ہے؟''

جمال نے کہا ''اسی لیے میں حاضر ہوا ہوں۔ مجھے بلایا تو نہیں گیا مگر میں نے پالیسی کے نوٹس تیار کر لیے ہیں۔''

''بہت خوب تو آپ اپنا ڈرافٹ سیکشن افسر فلمز کے حوالے کر دیں۔ وہ اس کو دیکھ لے گا۔''



''مگر میں اپنا ڈرافٹ یہاں میٹنگ میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔'' جمال نے کہا۔

''مگر آپ ہیں کون ڈاکٹر صاحب۔'' کسی وزارت کے نمائندے نے پوچھا۔

### باہر کا آدمی

اس سے پہلے کہ جمال بولے' ڈپٹی سیکریٹری صاحب نے کہا ''یہ فلمی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں قدرت اللہ صاحب نے دوستی کی بنا پر اچانک فلم ایڈوائزر مقرر کر دیا۔ باہر کے آدمی ہیں۔ ان کو سیکریٹریٹ کے پروسیجرز کا علم نہیں۔''

جمال نے تلملا کر جواب دیا ''میں فلمی دنیا سے تعلق نہیں رکھتا جناب۔ مگر فلم کے مسائل سے واقف ہوں۔ قدرت اللہ صاحب نے مجھے یہ کہہ کر بلایا تھا کہ میں وزارت کی مدد کروں۔ میں یہاں پروسیجر سیکھنے کے لیے نہیں آیا۔''

''اچھا اچھا۔ تو آپ حکومتِ پاکستان کی امداد کرنے آئے ہیں۔'' ایک اور افسر نے حقارت سے کہا۔ باقی لوگ زیرِ لب مسکرا دیئے۔

### فلم پالیسی

''تو پھر لایئے اپنا ڈرافٹ۔'' ڈاکٹر خان بولے۔

''جی میں اسے اس میٹنگ میں پڑھنا چاہتا ہوں تاکہ بحث ہو سکے۔''

''اتنا تو وقت نہیں کسی کے پاس۔'' ڈاکٹر خان بولے۔ ''زبانی خلاصہ بتا دیجیے۔''

جمال نے کہا ''یہ پالیسی ہے جناب۔ کوئی پیغامِ محبت نہیں۔''

''پالیسی تو ہم بنا چکے۔'' ڈاکٹر خان بولے۔ ''پروڈکشن کا باب وزارتِ منصوبہ بندی نے تیار کیا۔ فنانس نے اس کی اکنامک سائیڈ دیکھ لی۔ ڈسٹری بیوشن کی سفارشات وزارتِ تجارت نے تیار کر دیں۔ وزارتِ داخلہ نے اس پر لاء اینڈ آرڈر کے حوالے سے غور کر لیا اور وزارتِ خارجہ نے پاکستانی فلموں کی ایکسپورٹ پر تجاویز مرتب کر لی ہیں' مگر ہماری فلموں کے سفارتی اثرات کے حوالے سے اس میٹنگ کا خیال ہے کہ ان کی ایکسپورٹ پر پابندی لگا دی جائے تو بہتر ہو گا۔ اگرچہ وزارت خارجہ میں اس کے بارے میں ایک نرم گوشہ ہے۔''

اس پر بھی سب لوگ مسکرا دیئے۔

جمال بھونچکا رہ گیا اور بولا ''پالیسی کیا اس طرح بنتی ہے؟ کوئی ایک ادارہ اس پر مکمل عبور نہیں رکھتا اور نہ اس کا ذمہ دار ہو گا۔''

''ہم اجتماعی بصیرت پر یقین رکھتے ہیں مسٹر جمال۔'' ڈاکٹر صاحب بولے ''اور یہی پیپلز گورنمنٹ کی پالیسی ہے۔ کیا آپ کو پیپلز گورنمنٹ سے اختلاف ہے؟''

''جی یہ تو مسئلہ ہی نہیں۔'' جمال بولا۔

''تو آپ پیپلز گورنمنٹ کی پالیسی کو پیپلز گورنمنٹ سے زیادہ سمجھتے ہیں؟'' ڈاکٹر صاحب نے کہا ''میرے خیال میں بہت وقت ضائع ہو گیا۔ آپ کے لیے بہتر ہوگا کہ آپ خاموشی سے پالیسی کو سنیں اور اگر کچھ کہنا ہے تو بعد میں لکھ کر دے دیں۔''

پھر افسر باری باری اپنے نوٹ پڑھنے لگے۔ ان میں فلم کے مسائل کا ذکر ہی نہ تھا۔ فقط ارادے اور احکامات تھے جن کے تحت انڈسٹری پر مزید بے شمار پابندیاں عائد کی جا رہی تھیں۔ بحث مباحثے کی گنجائش ہی نہ تھی کیونکہ باقی وزارتوں کے نمائندے ڈاکٹر خان سے جونیئر تھے۔ جو وہ کہتے تھے سب اس پر سبحان اللہ کہتے تھے۔

جمال کچھ دیر تو سنتا رہا' پھر جل کر بولا ''ڈاکٹر خان آپ پالیسی جیسے معاملے کو ایک سانڈ کی طرح روندتے چلے جا رہے ہیں۔''

یہ بات سرکاری آداب کے حوالے سے خون سرد کر دینے والی تھی۔ میٹنگ سکتے میں آ گئی۔ ڈاکٹر خان پتھر ہو گئے۔ پھر جمال کو نظرانداز کرتے ہوئے بولے ''دی میٹنگ اِز اوور!''

مہینہ گزر گیا۔ جمال کو نہ پیسے ملے نہ واپسی کا حکم۔ ڈاکٹر خان اب وزارت میں اس کی موجودگی کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ ایک دن جمال نے ان سے پوچھا ''تو کیا میں واپس چلا جاؤں؟''

''آپ کی مرضی ہے۔'' انہوں نے رُکھائی سے کہا۔ ''فلم پالیسی کو تو آپ کی ضرورت نہیں اور آپ نے اس میں کوئی حصہ بھی نہیں لیا۔''

ایک صاحب جو کسی زمانے میں سندھ گورنمنٹ میں جمال کے افسر ہوتے تھے قدرت اللہ صاحب کے پاس گئے تھے اور بولے تھے۔ ''سر میں آپ کا جوائنٹ سیکریٹری ہوں اور اس شخص کو جانتا ہوں جسے آپ لائے ہیں۔ آپ غلطی کر رہے ہیں۔ جمال بڑا خطرناک آدمی ہے۔''

یہ جمال کے پہلے دن کی بات ہے۔

قدرت اللہ صاحب نے کہا ''غلطی تو یہ ہے کیونکہ باہر کے آدمیوں کو وزارت کے بھید معلوم نہ ہونے چاہئیں مگر اب تو میں یہ غلطی کر چکا ہوں۔''

وہ بولے ''سر یہ شخص جھگڑالو اور بدتمیز ہے۔ ماحول خراب کرے گا۔''

''اس میں تو کوئی شک نہیں۔ جھگڑالو اور بدتمیز تو وہ ہے اور ماحول بھی خراب کرے گا۔''

''وہ ہمارے کام کا کسی صورت نہیں' جو پالیسی لکھے گا انڈسٹری کے مفاد میں لکھے گا۔ حکومت کے مقاصد کو نظرانداز کرے گا۔ اس سے کیبنٹ ڈویژن ناراض ہوگی اور وزارتِ تعلیم کا وقار خراب ہوگا۔''

''یہ تو ہے۔'' قدرت اللہ صاحب بولے۔



''مگر سر وہ آپ کی بھی توہین کرے گا۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ توہین تو اس نے پہلے بھی کئی بار میری کی ہے۔''

جوائنٹ سیکریٹری صاحب مایوس ہو کر چلے گئے تھے۔

یہ بات جمال کو قدرت اللہ صاحب نے خود بتائی تھی مگر انہوں نے اس کا اشارہ تک نہ کیا تھا کہ جمال وزارت میں کس طرح وقت گزارے اور افسروں سے کس طرح بات کرے۔ اصل میں انہیں جمال کی صاف گوئی اور باغیانہ گفتگو پسند تھی اور وہ چاہتے تھے کہ وزارت کے بند ڈبے میں بھی سچائی کی کوئی کرن آ اُترے۔

ڈاکٹر خان کی مرتب کردہ فلم پالیسی چونکہ انڈسٹری کے کسی مطالبے کو پورا نہ کرتی تھی' مسترد ہو گئی۔ اگرچہ وہ بڑے شاندار مومی کاغذ پر چھپ کر بڑی عمدہ جلد میں باندھ کر وزیر صاحب کو پیش کی گئی تھی مگر جمال کو کسی نے طلب نہ کیا۔ وہ پانچ ہزار کے چکر میں پریشان حال رہا۔ واپس اخبار میں جانے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ گھر میں پیسے ختم ہو رہے تھے۔ رہنے کو اس کا ٹھکانہ وہی مفتی کا گھر تھا۔ اس کے سارے بچے جمال کی عزت کرتے تھے مگر بھورانی کا درجہ اس سے غریب رشتہ داروں کا رویہ تھا جو وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ جمال کو مجبوراً اس کی خوشامد کرنی پڑتی۔

دن اسی طرح گزرتے گئے۔ جمال پہلے پہل تو ہفتے دس دن کے بعد ایک دو دن کے لیے لاہور جاتا پھر جب منسٹری نے اس پر اپنے دروازے بالکل بند کر دیئے تو وہ ان پانچ ہزار روپوں کے لالچ میں جن کی خاطر وہ آیا تھا لاہور سے باقاعدہ آتا رہا۔ کبھی ایک دن کے لیے کبھی دو دن کے لیے۔ یہ وقت اس پر بڑا کڑا گزرا اور اس کو اپنے ساڑھ ستی کے دن پھر یاد آنے لگے۔ قدرت اللہ صاحب کی بیوی کی لندن میں صحت یابی کی کوئی صورت نہ پیدا ہوئی اور وہ مہینوں وہیں رکنے پر مجبور ہو گئے۔

## سندھی مڈل کلاس

وزیر صاحب سندھی تھے اور انہیں سندھیوں کا بڑا خیال تھا۔ مرکزی حکومت میں ان کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ بھٹو صاحب کے زمانے میں پہلی مرتبہ سندھ میں ایک مڈل کلاس پیدا ہو رہی تھی جس کے مفادات مرکز سے وابستہ تھے مگر تعلیم یافتہ لوگوں کی بیروزگاری روز افزوں تھی کیونکہ سندھ کا اصل مسئلہ اور پاکستان کا اصل مسئلہ جاگیرداری کا خاتمہ ہے۔ بھٹو صاحب کچھ اصلاحات لائے تھے مگر بڑے زمینداروں کی طاقت پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی۔ تعداد کے حساب اور تاریخی وجوہات سے پنجابی مرکزی حکومت پر غالب تھے۔ مہاجر اور پٹھان بھی ان کے شریکِ اقتدار تھے مگر گالی صرف پنجابیوں کو پڑتی تھی۔

سندھیوں کی بھرتی عام ہو گئی مگر حقداروں کو کم ہی کچھ ملا۔ وہ ایک اقلیت کی طرح اسلام آباد کے ایک مخصوص حصے میں آباد ہو گئے جن میں کچھ اعتماد پیدا ہو گیا انہوں نے دوسری شادیاں کر لیں۔ ایسی عورتوں

سے جو ڈھلتی عمر کی بھی تھیں اور کماتی بھی تھیں جن کو اب رشتے ملتے نہ تھے۔

پیشہ ور لڑکیوں کی ہمارے معاشرے میں حالت خراب ہے۔ اگر وہ نوکری کریں تو شادی کی عمر نکل جاتی ہے۔ شادی کریں تو ماری باندھی جاتی ہیں۔ چنانچہ عمر کے نکل جانے کے خوف سے بڑی بڑی نک چڑھی لڑکیوں نے بعض مجہول سندھی افسروں کو قبول کر لیا۔

سندھیوں کو جائز اور ناجائز مراعات دینے میں وزیر صاحب کو کچھ تکلیف ہوتی تھی کیونکہ ڈاکٹر خان پنجابی تھے۔ وہ تو حکم ملنے پر پنجابیوں کا قتلِ عام کرنے میں دریغ نہ کرتے' کیونکہ سرکاری افسروں کا ملازمت کے دوران کسی صوبے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وزیر صاحب نے ان بے قصور اور تابعدار خان صاحب کو نکلوا کر ایک سندھی جوائنٹ سیکریٹری کو تعینات کروادیا۔ یہ صاحب کبھی فوج میں کیپٹن تھے مگر زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بڑوں نے انہیں فوج سے چھڑوا کر سی ایس پی نامزد کروالیا اور اب وہ ایک تجربہ کار افسر شمار ہوتے تھے۔ نہایت کم گو دھیمے مزاج مگر نہایت کائیاں اور سنگدل ایسے کہ کسی کو قتل کراتے تو کافی کی چسکی لے کر اس کی جان کنی کا تماشہ دیکھتے۔

کپتان صاحب نے جلدی قدم جما لیے کیونکہ وزیر صاحب اُن کی مٹھی میں تھے۔

ان کا طریق کار نہایت نرالا تھا۔ وہ جو کام کرنا یا کروانا چاہتے اس کی سفارش کبھی نہ کرتے۔ سیکشن افسروں اور ڈپٹی سیکریٹریوں کو ٹیلی فون کر دیتے کہ فلاں مسئلے پر اس قسم کا نوٹ مجھے مطلوب ہے۔ پھر وہ اسی نوٹ پر دستخط کر دیتے جس کا مطلب یہ ہوتا کہ میں اس تجویز کا مخالف نہیں' کسی غلط کام کی ذمہ داری ان پر کبھی نہ آتی۔

## بیوروکریسی

وہ دن بھر اپنی مرضی کے کیس تیار کرواتے۔ پھر جب دفتر لوٹنے کا وقت آتا وزیر صاحب ملاقاتیوں سے تنگ آ چکے ہوتے۔ ان کو بھوک ستانے لگتی تو وہ فائلوں کا پلندہ لے کر پہنچ جاتے اور ادب سے کہتے ''سر کچھ کیسز توجہ طلب ہیں۔''

سر خوش ہو جاتے۔ فائلیں میز پر اکڑوں بیٹھ جاتیں۔ پھر کپتان صاحب ایک فائل اٹھاتے اور کہتے ''سر اس میں کچھ نہیں۔ کچھ لڑکوں کو امریکہ وظیفے پر بھجوانا ہے۔ فارنس آفس سے منظوری آ چکی ہے۔''

وزیر صاحب اس پر بن دیکھے دستخط کر دیتے۔

''سر سندھ سے ایک شکایت آئی ہے۔''

اور اس پر وزیر صاحب لکھی بٹھا دیتے۔ ''یہ ایک گرانٹ کا کیس ہے سر۔ فنانس سے بات کر لی ہے۔''

''بہت اچھا۔''



''باقی کیس بھی اسی قسم کے ہیں مگر سر کو بھوک لگ رہی ہوگی۔ بیگم صاحبہ انتظار کر رہی ہوں گی۔ تو سر میں لکھ دوں۔ ڈسکسڈ وِد منسٹر؟''

وزارت کا کام اسی طرح چلتا تھا۔ سیکریٹری صاحب جنہوں نے قدرت اللہ کی جگہ لی تھی' ملک کے مشہور دانشور تھے مگر وہ سی ایس پی نہیں تھے۔ اس لیے وزارت انہیں کم ہی تکلیف دیتی تھی اور وہ بھی اپنا وقت امن سے گزارنا چاہتے تھے۔ انہیں اس پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا کہ مجھے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

## ہاتھ کی صفائی

جمال اسی طرح کسمپرسی کے عالم میں لٹکتا رہا۔ نہ کسی نے اسے پانچ ہزار روپے دیئے نہ واپس چلے جانے کو کہا اور مالی سال ختم ہونے کو آ گیا۔ خدا خدا کر کے اکاؤنٹنٹ اے جی آفس سے واپس آیا تو جو آدمی پیسے لینے کے لیے گیا تھا' اس کو سیکشن افسر نے کہا ''جمال صاحب کے پیسے کہاں ہیں؟''

''وہ تو میں نے کل ہی وصول کر لیے تھے اور چیک بینک میں جا چکا ہے۔'' اس نے کہا۔

''مگر جمال صاحب کو آج ہی لاہور جانا ہے۔''

''تو چلے جائیں' ان کا گھر ہے وہاں۔'' وہ بولا۔

''بھلے آدمی پیسے ملیں تو جائیں۔''

''کون سے پیسے؟'' اس نے پوچھا۔

''وہی جو آپ نے اے جی آفس سے وصول کیے ان کے نام کے۔''

''اچھا اچھا آپ ان پانچ ہزار کی بات کر رہے ہیں؟ تو میرے بھائی وہ تو وزارتِ خزانہ نے وزارتِ تعلیم کا مطالبہ' زر پورا کیا تھا۔ وزارتِ تعلیم نے ہمارے سیکشن سے پانچ ہزار روپے قرض لے رکھے تھے۔ میں نے پے منٹ آرڈر اپنے سیکشن کے نام بنا کر وصول کر لیے۔ اب جمال صاحب جانیں اور وزارتِ تعلیم۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ جمال صاحب کے پیسے کہاں گئے؟''

''یہ آپ وزارتِ تعلیم سے پوچھیے جس نے انہیں کنٹریکٹ دیا تھا۔''

''دیکھو جی سرکاری کام اسی طرح ہوتے ہیں۔'' سیکشن افسر جمال کو دیکھ کر بولا۔ ''اب کچھ نہیں ہو سکتا۔''

مگر کام دوسری طرح بھی ہوتے ہیں۔ اگر کام کروانے والا طاقتور ہو اور چاہتا ہو کہ کام ہو جائے۔

جمال نے آٹھ نو مہینے بھوکے پیاسے کسی تنخواہ اور آمدنی کے بغیر گزار لیے۔ اس لیے کہ اس کے لیے کوئی چارہ نہ تھا اور پانچ ہزار روپے کو وہ اس بچے کی طرح دیکھتا تھا جس کے ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا کوا چھین کر لے جائے۔ [illegible]

تک محدود تھی۔ گھر میں فاقے تھے۔ قرضہ ملتا نہ تھا اور اس پر بھی جمال کو ہر ہفتے کم سے کم ایک مرتبہ لاہور سے اسلام آباد کا سفر کرنا پڑتا اور مفتی کی بہو کی انگارہ سی آنکھوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ وہ ایک زبردست عورت تھی۔ اگرچہ دل کی بری نہ تھی مگر اسے امریکن طرزِ زندگی سے جنون کی حد تک عشق تھا اور وہ پاکستانی رشتوں کو امریکی نظروں سے دیکھتی تھی۔ مثلاً جب فلاں سے ہمارا کوئی مطلب نکلتا نہیں تو ہم کیوں اس سے میل جول رکھیں۔

وہ جمال کو کچھ نہ کہہ سکتی تھی کیونکہ اسے پتہ تھا کہ اس کا سسر اس کا جگری یار ہے اور میرا میاں اس کی گود میں کھیلا ہے مگر نظروں نظروں میں اس نے جمال کو بھگا دینے کی پوری کوشش کی۔

پھر اچانک آسمان کا رنگ بدل گیا۔

## رنگ دیگر

قدرت اللہ صاحب کی بیگم انگلستان میں ہی فوت ہو گئیں اور انہیں دلگیر اور دکھی ہو کر واپس آنا پڑا۔ وہ بہت صابر اور شاکر آدمی تھے۔ قضا و قدر کی حکمتوں کا ادراک رکھتے تھے۔ اس لیے ویسے تو وہ چپ رہے مگر ان کی زندگی اس ایک وار سے بوند بوند بہہ گئی۔

واپسی پر انہیں وزارتِ تعلیم کی سربراہی پیش کی گئی۔ بھٹو صاحب ان کی قابلیت اور دیانت کے بہت معترف تھے اور ایوب خاں کے وقت سے تھے۔ جب قدرت اللہ صاحب اس کے پرسنل سیکریٹری ہوتے تھے مگر انہوں نے سربراہی سے انکار کر دیا۔

فلم پالیسی تو بنی نہ تھی اور اس کی ذمہ داریاں ایک صاحب نے جو بھٹو صاحب کی کابینہ میں امریکی نمائندے شمار ہوتے تھے، لے لی تھی۔ انہوں نے وزیرِ تعلیم کی سفارش پر اسے ایک ترک شیرازی کے سپرد کر دیا تھا جو خود ذہین اور فطین تھے اور ان کی بیگم کو نوادرات جمع کرنے کا شوق تھا۔

اس زمانے میں حکومت کے پائیں باغ میں بوہیمیائی دانشوروں کا ایک طائفہ گل چیں تھا۔ یہ لوگ اپر کلاس کے آدابِ مجلس اور طرزِ زندگی کے مختار کار تھے۔ اسلام آباد کی رونق ان کے دم قدم سے تھی۔ پیسہ بنانا بھی اُن کو آتا تھا اور اس کے خرچ میں بھی وہ سلیقہ مند تھے۔ ان کی پارٹیوں میں ارادہ مند خواتین امریکی لہجے میں انگریزی بولتی تھیں اور دیدہ و دل کے لیے ہوائے تازہ کا حکم رکھتی تھیں۔ ان کی پارٹیوں میں شمولیت کے لیے ادھیڑ عمر کے حسرت زدہ سیکریٹری اور اسی قبیل کے دوسرے افسر آہیں بھرتے تھے۔ اس طائفے کے ایک مرکزی حاضر باش کو فلم کا ایک اور محکمہ کھول کر دے دیا گیا۔ فنڈ اس کے قدموں میں اس طرح ڈھیر کر دیئے گئے جیسے ساغر کی تہ میں چاندی تلچھٹ اُبل پڑے۔ کوئی حساب کتاب نہ تھا کیونکہ روپیہ ان کو جو عطا ہوا وہ پاکستان میں امریکی فلموں کی کمائی کا حصہ تھا اور حکومت پاکستان کا اس پر کوئی کنٹرول نہ تھا۔

اس لیے اُن کے محکمے نے ہر چند کہ وہ تجارت تک محدود تھا، انگڑائی لی اور فلم پالیسی کی تیاری اپنے



طاقت اور تونگری کو چین نہیں آتا جب تک وہ جس کو دیکھے اسے ذلت کی خاک نہ چٹا دے۔

قدرت اللہ صاحب لوٹ کر آئے تو اس گروہ نے ان پر بھی ڈورے ڈالے۔ فلمی تجارت کا سربراہ ان کے سامنے باوضو رہتا مگر انہیں ٹوہتا رہتا۔ بھٹو صاحب کے بہت مجبور کرنے پر قدرت اللہ صاحب نے وزارتِ تعلیم میں فلم کے شعبے کی سربراہی قبول کر لی جس کا کوئی وجود نہ تھا اور یہ وجود بھی انہیں خود ہی معرضِ وجود میں لانا تھا۔

وہ گرے پڑوں سے دامن بچا کر نکل جاتے تھے کہ آخر کس کس کی مدد کریں مگر جمال کے بارے میں وہ بہت فکرمند تھے۔ انہیں مفتی نے جمال کی مصیبتوں کی تفصیل بتا دی تھی۔ وزارت میں انہیں فی الحال اپنے لیے ایک کمرہ الاٹ ہوا تھا۔ پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ وزیر صاحب کو ایک تین سطری نوٹ میں جمال کی باقاعدہ تقرری کی سفارش کر دی۔ آدھ گھنٹے میں جمال وزارتِ تعلیم کا ڈائریکٹر جنرل مقرر ہو گیا کیونکہ وزیر صاحب قدرت اللہ صاحب کے کاغذات پر فوراً دستخط کر دیا کرتے تھے۔

## دفتر چلا!

دوسرے ہی دن جمال کو پانچ ہزار روپے بھی مل گئے۔ پتہ نہیں کیسے ایک لاکھ روپے کی گرانٹ بھی جمال کے محکمے کے لیے آ گئی۔ پتہ نہیں کہاں سے۔

قدرت اللہ صاحب نے کہا ”جمال اس رقم سے ایک علیحدہ بلڈنگ دفتر کے لیے کرائے پر لے لو اور ایک نئی کار خریدو۔ آپ بیس گریڈ کے افسر ہیں۔ آپ بس میں سوار ہوں گے تو کوئی آپ کو افسر تسلیم نہ کرے گا۔ پھر آپ کی فائل آگے نہ چلے گی۔ کوئی کام نہ ہوگا۔“

”بہتر جناب۔“ جمال نے کہا۔

”اور پردے اور فرنیچر بھی کرائے پر لے لیں اور اپنے لیے ایک پی اے چنیں جو آپ کے ٹیلی فون سنے۔“

”ٹیلی فون تو میں خود سنوں گا۔“ جمال نے کہا۔

”آپ خود ہی سنیں مگر پہلے آپ کا سیکریٹری آپ کو کونٹیکٹ کرے گا اور اگر آپ کے پاس بات کرنے کا وقت ہو۔“

”وقت کا کیا سوال جی؟“

”آپ بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ وقت کی قلت کا سوال نہیں۔ سوال اپنے آپ کو منوانے کا ہے اور یہ کام پی اے کے ذریعے ہوتا ہے۔ وہی افسر کو افسر بناتا ہے اور افسر بننا ضروری ہوتا ہے ورنہ کام نہیں چلتا۔“

”ضروری تو کام ہونا چاہیے جی۔“ جمال نے کہا۔

”کام ضروری نہیں ہوتا۔“ قدرت اللہ صاحب بولے۔ ”مصروفیت ضروری ہوتی ہے اور افسری اسی کو کہتے ہیں۔ اب آپ حکومت کا ایک

جمال گھبرا گیا۔اس نے کہا ''میرے لیے یہ مشکل ہے کہ میں اپنے آپ کو حکومت کا حصہ سمجھوں۔''

''نہ سمجھئے' کبھی نہ سمجھئے۔'' قدرت اللہ صاحب بولے۔''یہ بہت گھٹیا مقام ہے۔میں نے بھی اپنے آپ کو کبھی حکومت کا حصہ نہیں سمجھا مگر یہ اندر کی بات ہے۔ظاہری نظر میں آپ کو افسر نظر آنا چاہیے ورنہ کوئی آپ کی بات نہیں سنے گا اور افسر وہ ہوتا ہے جس کے پاس نئی کار ہو۔باوردی شوفر ہو جو کار کا دروازہ کھولے۔ سیکریٹری ہو جو ٹیلی فون سنے۔ملاقاتیوں کو وقت دے یا ٹال دے۔آپ کی تنخواہ اور ٹی اے بل تیار کروائے۔ ہوائی جہاز کی سیٹ کنفرم کروائے اور آپ کو ایئرپورٹ پر چھوڑنے اور لینے جائے۔پھر آپ چاہیں تو آپ سے ڈکٹیشن بھی لے لے۔''

''مجھے تو ڈکٹیشن دینی نہیں آتی۔''

''مجھے بھی نہیں آتی مگر آپ کو یہ کہنا نہیں چاہیے کیونکہ آپ بیس گریڈ کے افسر ہیں۔''

جمال نے کہا ''مجھے تو انگریزی بھی اچھی طرح نہیں آتی۔''

قدرت اللہ صاحب بولے ''اگر آپ کا مطلب انگریزی میں آپ کی ادبی صلاحیت کی طرف ہے تو وہ آپ کے راستے میں رکاوٹ ہے۔دوسرے افسر برا مان جائیں گے کیونکہ یہاں انگریزی کم ہی کسی کو آتی ہے۔سیکریٹریٹ میں غلط انگریزی کا چلن ہے۔اس لیے انگریزی کی پروا نہ کریں جو منہ میں آئے بولتے چلے جائیں۔آپ کا سیکریٹری ڈرافٹ لکھ کر لے آئے تو آپ اپنے سلسلۂ کلام پر نظر ڈال لیں اور جو غلطی درست کر سکیں کر لیں' پھر سیکریٹری دوسرا ڈرافٹ تیار کر دے گا۔''

جمال نے پوچھا ''کیا انگریزوں کے زمانے میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا؟''

''ایسا تو نہیں ہوتا تھا۔'' وہ بولے ''مگر پاکستان میں ہر بات کے معیارات گر چکے ہیں۔اب کوئی کسی کو ٹوکتا نہیں۔ٹوکنا خلافِ دستور ہے۔''

''تو کیا آپ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے؟''

''میں نے بہت کوشش کی پھر سمجھ گیا۔اب میں صرف وقت گزارتا ہوں۔مجھے چونکہ مزید کسی ترقی کی خواہش نہیں اس لیے کسی کی خوشامد بھی نہیں کرتا۔بھٹو صاحب سے بھی نہیں ملتا حالانکہ ایک زمانے میں وہ دن دن بھر میرے پاس بیٹھے رہا کرتے تھے۔وہ بہت تیز طرار آدمی ہیں' مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔''

''وہ تو بہت طاقتور ہیں۔''

''مگر سیکریٹریٹ ان سے بہت زیادہ طاقتور ہے۔طاقت افسروں کی ذات میں مرتکز نہیں ہوتی۔ قواعد اور پروسیجرز میں ہوتی ہے جو انگریزوں نے عوامی نمائندوں کو باندھ کر رکھنے کے لیے بنائے تھے۔ان کو تبدیل کرنے کے لیے بھی قواعد اور پروسیجرز موجود ہیں یعنی یہاں بھی اسی عطار کے لونڈے سے دوا لینی پڑتی ہے۔بھٹو صاحب نے بہت سی روایات توڑیں۔بہت لوگ نکالے۔کیا اس سے کچھ فرق پڑا؟ کوئی فرق نہیں



پڑا کیونکہ انہوں نے پروسیجرز نہیں بدلے۔''

''اور آگے بھی کچھ نہ ہوگا مگر فی الحال آپ کیا کر رہے ہیں؟''

''جی میں نے فلم پالیسی لکھ لی ہے۔'' جمال نے کہا ''اس کو ٹائپ کروا کر پیش کر دوں گا۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔آپ پہلے اس کو چلانے کے لیے ایک محکمے کا ڈھانچہ بنائیں۔اخراجات کا تخمینہ لگائیں اور بجٹ پیش کریں۔''

جمال نے کہا ''جی مجھے زیادہ سٹاف کی ضرورت نہیں۔ایک کلرک' ایک سیکریٹری' ایک ڈرائیور اور ایک چپڑاسی کافی ہوگا۔فلم کے بارے میں صرف میں ہی باخبر ہوں۔سٹاف کا دوسرا آدمی یہاں کیا کرے گا۔''

''بے شک مگر آپ ڈائریکٹر جنرل ہیں اور ڈائریکٹر جنرل کی اعانت کے لیے دو ڈپٹی سیکریٹری جنرل مانگیں' ایک ٹیکنیکل اور دوسرا ایڈمنسٹریشن کے لیے۔ان کی اعانت کے لیے آپ کو چار ڈائریکٹروں کی ضرورت ہوگی' تین بھی ہو سکتے ہیں۔پھر ان کو اپنے لیے مزید ماتحتوں کی ضرورت ہوگی۔ان کے لیے چھ یا آٹھ اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہوں گے تاکہ محکمے کا کام درجہ بدرجہ کوآرڈینیٹ ہوتا جائے۔ان کے بعد عملے کی باری آتی ہے۔سیکریٹریٹ کے قواعد کے مطابق اگر آپ نے ہر سیکشن میں کم سے کم دو کلرک اور ایک اسسٹنٹ نہ رکھا تو آپ کی سکیم مسترد ہو جائے گی اور بجا طور پر۔''

''کیوں بھلا؟''

''اس لیے کہ کلرکوں اور اسسٹنٹوں کے بغیر محکمہ ٹاپ ہیوی کہلائے گا اور وزارتِ تعلیم آپ کا مذاق اڑائے گی یہ شخص ایڈمنسٹریشن کی الف بے سے بھی واقف نہیں۔''

''مگر اتنے سارے لوگ یہاں کریں گے کیا۔''

''یہ لوگ اتنے سارے نوٹ روزانہ لکھیں گے' جن پر تنقید ہوگی۔فائلیں بنیں گی' بل تیار ہوں گے' ترقیاتی گوشوارے بنیں گے' گھوڑے دوڑنے لگیں گے اور محکمہ چل نکلے گا۔''

''مگر اس طرح تو کام میں رکاوٹ ہوگی اور خرچ بھی بہت آئے گا۔''

''محکموں کی اہمیت اور کارکردگی کا اندازہ اس سے لگایا جاتا ہے کہ اس میں کون سا کاغذ کتنے چکر کھاتا ہے اور کون کتنا خرچ کرتا ہے تو آپ جس قدر زیادہ خرچ کریں اس میں آپ کا بھلا ہے کیونکہ حکومت کو پروپیگنڈے کا مواد مل جاتا ہے کہ ہم نے فلاں منصوبے پر اتنا سارا روپیہ خرچ کر دیا۔یہ نہیں بتایا جاتا کہ اس خرچ کا نتیجہ کیا نکلا۔فلمی تجارت کے محکمے والوں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اسلام آباد میں دو سینما گھر بنائے جائیں۔اگر آپ چاہیں تو یہ منصوبہ بھی میں آپ کو دلوا دوں دو کروڑ کا بجٹ ہے۔''

''جی میں یہ کام کرنا نہیں چاہتا۔'' جمال نے کہا۔

''مگر کیوں؟'' قدرت اللہ ...

"اس لیے کہ اگر میں نے بیس لاکھ روپے رشوت لے لی تو سینما گھر بن جائیں گے اور میں بدنام ہو جاؤں گا۔"

"پھر آپ لے لیں رشوت......" قدرت اللہ صاحب بولے۔

جمال نے جواب دیا "اگر میں نے بیس لاکھ رشوت نہ لی تو سینما بھی نہ بنیں گے اور میں بدنام بھی ہو جاؤں گا۔"

"اگر آپ تھوڑی سی بدنامی کے عوض بیس لاکھ روپے لے لیں تو سودا برا نہیں۔ ایسے کاموں میں پکڑا کوئی نہیں جاتا۔ پھر میں یہاں بیٹھا ہوں۔ آپ کا بال بیکا نہ ہوگا۔ زندگی میں آپ نے بہت مصیبتیں اٹھائی ہیں۔"

"مگر میں لوٹ مار سے نفرت کرتا ہوں۔ مجھے بیس لاکھ روپے کی ضرورت نہیں۔"

"تو چلو چھوڑ دو۔ روپیہ کوئی اچھی چیز نہیں۔"

سال بھر کی دریوزہ گری کے بعد جمال ایک بہت بڑی میز پر گھومنے والی کرسی لگا کر بیٹھ گیا۔ بیس گریڈ کے افسر کی میز کی لمبائی چوڑائی سیکریٹریٹ کے قواعد میں لکھی ہے۔ گھومنے والی کرسی البتہ شرط نہیں مگر قدرت اللہ صاحب نے یہ کرسی خاص طور پر اس کے لیے منگوائی تاکہ جمال محکمے کا سربراہ بھی لگے۔ دوسرے کمرے میں وہ خود بیٹھ گئے اور بغلی کمرے میں ایک سٹینوگرافر' دو چپڑاسی اور ایک کلرک جو سیکریٹری کا ذاتی عملہ شمار ہوتا ہے اور یوں محکمہ بننے لگا جس کی پالیسی ابھی تیار نہ ہوئی تھی۔

"تو ریاست کا بیڑا یوں غرق ہوتا ہے۔" جمال نے کہا۔

قدرت اللہ صاحب بولے "ریاست تو زور و شور سے ترقی کر رہی ہے۔ ریاست بیوروکریسی کا نام ہے اور بیوروکریسی کا پھیلاؤ اور عروج اس کا گواہ ہے۔"

جمال حساب کتاب میں جُت گیا۔ اتنے سارے لوگوں کے گریڈ' ترقیاں' دفتر کے اخراجات' اساسی اور ترقیاتی گوشوارے' دو پروگرام اور منصوبے اسے سوچنے پڑ گئے۔

سیکریٹریٹ کو اصل کام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ فلم انڈسٹری کی مسدود راہیں کھولنے سے کہیں زیادہ اسے محکمے کے ناک نقشے کا خیال تھا۔ اسے بہت جلد پتہ چل گیا کہ نالائقی اور حماقت افسروں میں نہیں ہوتی' قوانین میں ہوتی ہے جن میں سے بعض لارڈ کلائیو کے وقت سے جوں کے توں چلے آتے ہیں۔ امریکیوں نے ان میں کچھ اضافہ کرا دیا اور محکمہ سازی اور منصوبہ سازی میں طرح طرح کے پیچیدہ اور بے معنی پرفارمے نافذ کروا دیئے جن کو پُر کرنا تجربہ کار افسروں کے لیے بھی مشکل تھا۔ ان کا مطالعہ اور معائنہ بیسیوں میزوں پر ہوتا تھا اور درجنوں ان پر تبصرے ہوتے تھے۔ ساری سیکریٹریٹ اسی فکر میں رہتی تھی کہ کوئی کام ہو نہ جائے۔

## سیکریٹریٹ کا حیوان



بہت سوچ بچار کے بعد اسے کم سے کم تیس آسامیاں نکالنی پڑیں جن پر ہر سال ڈھائی لاکھ سے زیادہ خرچ آتا تھا۔

قدرت اللہ صاحب نے منصوبے کو پڑھے بغیر منظور کر دیا۔ جمال نے کہا "جی میں حکومت کے بھید نہیں جانتا۔ اس پر آپ ایک نظر ڈال لیتے تو اچھا ہوتا۔"

"اس کے لیے بہت وقت ہے۔" انہوں نے کہا "اوپر سے واپس آئے گا تو دیکھ لیں گے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ واپس نہ آئے۔" جمال نے کہا۔

"واپس تو ضرور آئے گا۔" قدرت اللہ صاحب بولے۔

"مگر کیوں؟"

"وہاں سیکریٹریٹ میں اتنے سارے افسر بیٹھے ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ کاغذات کو آگے پیچھے کرتے رہیں۔ کام تکمیل تک نہ پہنچے۔ یہی ان کی نوکری ہے' کام نہ ہو مگر مصروفیت رہے۔ اس طرح اُن کے محکمے پھیلتے ہیں اور ترقیاتی ہوتی ہیں۔ کیا آپ نے پارکنسز لاء نہیں پڑھا؟"

"پڑھا ہے جی۔ بڑا متفنی شخص تھا اس کا مصنف!"

"متفنی نہیں فلسفی ہے۔ یہ بہت سنجیدہ کتاب ہے۔ سیکریٹریٹ ایک زندہ اور متحرک حیوان ہوتا ہے۔ وہ اپنے پھیلاؤ میں لگا رہتا ہے۔ آپ نے جو ڈھانچہ بنایا ہے وہ اس کلیے کو ثابت کرتا ہے۔"

"اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ آپ اس پر ایک نظر ڈال دیں۔"

"آپ چاہتے ہیں کہ میں اس کی چولیں درست کر دوں یہی نا؟" قدرتِ اللہ صاحب بولے۔

"جی یہی چاہتا ہوں۔"

"تو کیا میں جانتا نہیں کام کو صحیح خطوط پر چلانے کے لیے آپ کی ذات کافی ہے۔ آپ کو کسی تخلیقی امداد کی ضرورت نہیں کیونکہ فلمی مسائل سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔"

"جی مگر......"

"مگر محکمہ بنا کر بھی آپ کچھ نہ کر سکیں گے۔"

"مگر وزیر تعلیم کا وعدہ ہے کہ فلم انڈسٹری کے راستے کی رکاوٹیں دور کر دی جائیں گی۔ بھٹو صاحب نے بھی اسی قسم کے اعلانات کیے ہیں۔"

قدرت اللہ صاحب بولے "بھٹو صاحب نے اور بھی بے شمار وعدے کیے ہیں۔ وہ مخلص بھی شاید ہیں مگر وہ کچھ بھی کر نہ سکیں گے کیونکہ سیکریٹریٹ کا حیوان ان کو کھا جائے گا اور انہیں پتہ بھی نہ چلنے دے گا۔ قواعد کے گورکھ دھندے انہیں اندھا کر دیں گے اور وہ خود ایک جنگل بن جائیں گے بلکہ بن بھی چکے ہیں۔ انگریز کے زمانے میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ عوام کے وہ بھی دشمن تھے مگر وہ کام روکتے نہیں تھے۔ ان کے زمانے میں افسر

آزاد ہوئے ہیں۔"

"افسر تو آپ بھی ہیں۔" جمال نے شرارت سے کہا۔

"بے شک افسر تو میں بھی ہوں اور آزاد بھی ہوں۔ میں آپ کے منصوبے پر نظر ڈالنے پر راضی نہیں ہوا۔ میری مرضی!"

"اس طرح تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

"بے شک۔ یہی حکومت کا مقصد ہے۔ حکومت یعنی سیکریٹریٹ۔"

"اور منتخب نمائندے؟"

"وہ بیکار ہیں' جب تک وہ حکومت اور نظامِ حکومت کو تبدیل نہیں کرتے' مگر اتنا کس بل ان میں ہے نہیں۔ وہ جاگیردار ہیں اور حالات کو علی حالہ رکھنے میں ان کے مفادات ہیں۔ پیداواری رشتے' نظامِ تخلیق و تقسیم دولت بھٹو صاحب کا بھی وہی رہا جو کہ صدیوں سے چلا آتا ہے۔ روٹی کپڑا اور مکان ایک دلکش نعرے کے سوا کچھ نہیں اور صحت اور تعلیم کا جو حال ہے' سو ہے۔"

"مگر تعلیمی پالیسی تو آپ ہی نے بنائی تھی۔" جمال بولا۔

"......اور وہ جوں کی توں منظور بھی ہو گئی تھی' مگر آگے نہیں چلی کیونکہ یہ نظریۂ تعلیم میں بنیادی تبدیلیوں کی پالیسی تھی۔ اس لیے افسروں کو منظور نہ ہوئی۔ بھٹو صاحب نے بھی اس میں مزید دلچسپی نہ لی۔ پارٹی ان کے کسی محکم فلسفۂ حیات پر منظم نہیں ہوئی اور نعروں اور تقریروں سے روایات تبدیل نہیں ہوتیں۔ پھر جرنیل ان کی تاک میں رہتے ہیں۔ بھٹو صاحب نے اپنی تھوڑی بہت اصلاحات سے بھی کچھ حلقوں کو ناراض کیا ہے۔ پھر امریکہ ہے جو ان پر شبہ کرتا ہے اور اگر وہ اپنی کسی قدر آزاد فارن پالیسی پر اڑے رہے اور اپنا ایٹمی پروگرام انہوں نے ترک نہ کیا تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگرچہ انہوں نے پاکستان میں امریکی اثر و نفوذ سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔"

"وہ کس طرح؟" جمال نے پوچھا۔

"بعض افسر وزیر اور مشیران کے ڈھانچے میں ایسے ہیں جن کے سی آئی اے سے رابطے راز کی بات نہیں۔ وہ انہیں خود لے کر آئے۔"

"تعجب ہے!"

"بھٹو صاحب بہت ذہین آدمی ہیں۔ شخصی ذہانت میں اس وقت دنیا میں شاید ہی کوئی لیڈر ان سے ٹکر لے سکے۔ وہ سی آئی اے کے آدمیوں کو یہ سوچ کر اپنے قریب لائے کہ ہمارے پاس چھپانے کو ہے ہی کیا۔"

## گاڑی واپس کر دو

جمال کسی قدر افسردگی کے باوجود کام میں لگ گیا اور منصوبہ وزارت کو پہنچ گیا۔ ...



ریمارک کے ساتھ واپس آ گیا کہ تمام آسامیوں کی فردِ عمل پر نظرِ ثانی کی جائے اور ان کے جواز کے دلائل تفصیل سے بیان کیے جائیں۔

جمال نے یہ بھی کیا اور اسی ادھیڑ بُن میں چھ مہینے لگ گئے۔ بالآخر منصوبہ فنانشل ایڈوائزر کے پاس پہنچا۔ دو ماہ کے بعد اس نے پوچھا کہ کیا اس منصوبے کی گنجائش پنج سالہ منصوبے میں موجود ہے؟

اس محکمے کی گنجائش پنج سالہ ترقیاتی منصوبے میں نہیں رکھی گئی تھی۔ اس کی منظوری کا کوئی جواز نہیں تھا۔ سال نکل گیا۔

جمال نے اس عرصے میں مختلف افسروں سے جان پہچان پیدا کر لی تھی اور اب انہوں نے اس کے وجود کو تسلیم کر لیا تھا مگر اس کی سرکاری کار انہیں بہت کھٹکتی تھی۔ قدرت اللہ صاحب کی وجہ سے وہ کسی قدر چشم پوشی کر جاتے تھے۔ ایک دن اسے وزارت کی طرف سے حکم آیا کہ سرکاری کار وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر حکومت کے حوالے کر دے۔ حکومت کا مطلب تھا سیکریٹریٹ۔

جمال گھبرایا' مگر قدرت اللہ صاحب نے کہا "لکھ دو کہ گاڑی ورکشاپ میں ہے۔ مرمت ہو جائے گی تو حکومت کو پیش کر دی جائے گی۔"

"مگر یہ تو جھوٹ ہے۔" جمال بولا "میں نے آج ہی ڈپٹی سیکریٹری ایڈمنسٹریشن کو لفٹ دی تھی۔"

قدرت اللہ صاحب نے کہا "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے پاس کوئی تحریری ثبوت اس امر کا نہیں کہ آپ نے اسے لفٹ دی اور حکومت میں ثبوت صرف تحریری ہوتا ہے۔ افسروں کی تربیت میں یہ بات شامل ہوتی ہے کہ وہ اپنی ذاتی معلومات کو فائل پر نہ لائیں۔"

"مگر گاڑی تو ٹھیک ہے سر۔" جمال نے کہا۔

قدرت اللہ صاحب بولے "آپ ورکشاپ والوں سے کہیں اسے چیک کریں' سروس کریں اور تیل تبدیل کریں۔ زیادہ سے زیادہ کوئی پرزہ نیا لگوا لیں' مثلاً بتیاں' ہارن فوری خطرہ ٹل جائے گا۔ پھر دیکھا جائے گا۔"

"مگر وہ ہفتے کے بعد پھر مانگیں گے۔"

"پھر کہہ دیجئے گا کہ گاڑی قدرت اللہ صاحب کے استعمال میں ہے۔ پھر کوئی پوچھے گا نہیں۔"

## نوکریاں ہی نوکریاں

محکمہ ابھی بنا نہیں تھا مگر وزیرِ تعلیم کی طرف سے بے شمار عرضیاں اس حکم کے ساتھ پہنچنے لگیں کہ سائل کو فوراً ملازم رکھا جائے۔

سائل سب کے سب سندھی تھے اور بعض نے زندگی میں شاید ہی کوئی فلم دیکھی ہوگی۔

پہلے پہل تو جمال ...

اوپر ہو گئی تو وہ گھبرایا۔

قدرت اللہ صاحب نے کہا ''ان باتوں میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ان احکام کو فائل کر دیجیے۔''

''مگر وزیر بگڑے گا۔''

''نہیں بگڑے گا۔ اسے ان سائلوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کے علاقے کے بڑے زمیندار اس کے پاس سفارشیں لاتے ہیں' تو ان کو راضی رکھنے کے لیے وہ حکم لکھ دیتا ہے۔''

''مگر ملازمت تو ملے گی نہیں۔ کیا وہ لوگ وزیر صاحب سے ناراض نہ ہوں گے۔''

''ناراض ہوں گے تو وزیر صاحب کہہ دیں گے بیوروکریسی بڑی ذلیل ہے۔ ہمارے احکامات مانتی نہیں۔ میں دوسرا حکم لکھ دیتا ہوں۔ پھر وہ دوسرا حکم لکھے گا پھر تیسرا۔ بالآخر وڈیرے چپ ہو جائیں گے۔ انہیں بھی سائلوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ آپ فائل چاہے ضائع کر دیں' کوئی نہیں پوچھے گا۔ وزیر صاحب' جس کو واقعی ملازمت دلوانا چاہتے ہیں' اس کے بارے میں مجھے فون کر دیں گے۔ یہی طریقہ سیکریٹریٹ میں رائج ہے۔ وزیروں کو اگر کسی کام میں ذاتی دلچسپی ہوتی ہے تو وہ خود رابطہ کرتے ہیں اور ذاتی رابطے ہم رد نہیں کرتے' اصول بقائے باہمی!''

## یہ دامن ہے یہ ہے گریباں!

دو برس گزر گئے' مگر جمال کے محکمے کا ڈھانچہ منظور نہ ہوا۔ جمال نے سوچا کہ میں کوئی اور کام نکالوں۔ وزیر صاحب کو فلموں سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ بچوں کے لیے فلمیں بنوانا چاہتے تھے مگر یہ انڈسٹری کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لیے جمال نے ایک لوک کہانی بیلے کی بنیاد پر بنانے کا منصوبہ پیش کر دیا۔ قدرت اللہ صاحب نے کاغذات آگے بڑھا دیئے تو فنانس منسٹری کو غور کرنا پڑ گیا کیونکہ قدرت اللہ آئی سی ایس افسر تھے اور اپنے کردار کے حوالے سے بہت اہم شخص تھے۔

فنانس منسٹری نے تجویز واپس بھیج دی اور ہدایت کی کہ بچوں کی فلم بنانے کے لیے پاکستان کے مختلف سٹوڈیوز سے تقابلی ریٹ حاصل کیے جائیں۔

تقابلی نرخوں کا کوئی سوال نہیں تھا کیونکہ ریٹس سب کے برابر تھے۔ یہی بات جمال نے لکھ دی۔

پھر اعتراض ہوا کہ فلم کے بجٹ کی تیاری میں وزارت اطلاعات سے مشورہ نہیں لیا گیا۔

جمال نے جواب دیا کہ وزارت اطلاعات صرف پروپیگنڈا فلمیں بناتی ہے اور یہ بچوں کی تفریحی فلم ہے جس کا اسے کوئی تجربہ نہیں۔

اسی قسم کے اعتراضات آتے رہے' جن کا جمال سیدھا جواب دیتا رہا۔ بالآخر فنانشل ایڈوائزر نے اسے میٹنگ کے لیے بلایا۔ وہ اس کی بے باکی اور پراگندہ خیالی کی وجہ سے اسے کسی قدر پسند بھی کرتا تھا۔ اس



نے کہا ''یار کیوں تنگ کرتے ہو؟''

جمال نے کہا ''میں تنگ نہیں کرتا۔ بجٹ میں نے ایمانداری سے اور صحیح بنایا ہے۔ اس کی منظوری دے دو۔''

وہ بولا ''اب میں تمہارے ایک لاکھ تیس ہزار کے بجٹ میں کتنا کاٹوں؟ مجھے بھی تو آخر کسی کو منہ دکھانا ہے۔''

''کاٹنا کیا ضروری ہے۔''

''ضروری ہے ورنہ میرا افسر کہے گا کہ میں نے کیس کا اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا۔ ہمیں ہر منصوبے میں سے کچھ نہ کچھ کاٹنا پڑتا ہے۔ بچت اور مستعدی دکھانے کی خاطر!''

''اور یہ جو وقت ضائع ہوتا ہے کاغذات کی گردش میں؟ آپ لوگ کیوں نہیں سارے اعتراضات ایک ہی مرتبہ بھیج دیتے۔ ایک ایک نکتہ کیوں نکالتے رہتے ہیں۔''

وہ بولا ''ایک ہی مرتبہ کریں تو بہت ساری میزیں خالی ہو جائیں اور سیکریٹریٹ میں اُلو بولنے لگے۔ تم کیا ملک میں بیکاری پھیلانا چاہتے ہو؟ پیپلز گورنمنٹ تو روزگار میں توسیع چاہتی ہے' مگر تم لوگوں میں جو باہر سے آ کر بیس گریڈ کے افسر بن جاتے ہو یہی خرابی ہے کہ تم لوگ پروسیجر کو نہیں سمجھتے اور سرکار کا وقت ضائع کرتے ہو۔ تم ایک شریف آدمی ہو اس لیے میں نے بات کھول کر بیان کر دی مگر میاں اس طرح تمہاری نوکری نہیں چلے گی۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟''

''تمہیں بجٹ سوچ کر بنانا چاہیے۔ تمہارا بجٹ درست ہے مگر سوچ کر نہیں بنا ہوا۔ میں نے وزارتِ اطلاعات سے پوچھا تو انہوں نے اس کام کے چار لاکھ مانگے۔ تم اسے ایک لاکھ تیس ہزار میں بنا دو گے تو یا تو تم بہت شریف آدمی ہو یا قطعی نالائق۔ میں کچھ کاٹوں گا ضرور۔ میں تمہیں ایک لاکھ سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتا۔''

''اتنے میں تو ہو نہیں سکتا کچھ۔''

''بعد میں تیس ہزار روپے کا ضمنی بجٹ دے دینا' وہ میں منظور کر دوں گا۔''

''یہ کیا بات ہوئی بھلا؟''

''اگر تم اسی فلم کا بجٹ چار لاکھ بتاتے تو میں ایک لاکھ کاٹ لیتا۔ ایک لاکھ تیس ہزار تم فلم پر خرچ کر کے باقی ایک لاکھ ستر ہزار کھا جاتے۔ تم بھی خوش سرکار بھی خوش۔ کام اسی طرح چلتے ہیں پیارے!''

## باب 37

فلم بنی اور عجیب طریقے سے بنی۔ کوئی بچی ایسی نہ تھی جسے ناچ کے انگ بھاؤ آتے ہوں اور اسے تو چار بچیوں کی ضرورت تھی۔ ناچار وہ ہیرا منڈی گیا۔ یہاں سے اسے ایسی بچیاں ملیں جن میں سے صرف ایک کو گنتی آتی تھی۔ ان کے ماں باپ غریب تھے۔ باپ تو جو بھی تھے جہاں بھی تھے۔ مائیں جوان کو پالتی تھیں' بہت غریب اور بدشکل تھیں۔ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو بھیج دیا کہ اس طرح کچھ سیکھ جائیں گی اور شاید آگے چل کر کچھ کما سکیں گی۔

جو میوزک ڈائریکٹر جمال نے چنا اس کا خیال تھا کہ جمال کو بیلے بنانے کا تجربہ ہے جو ڈانس ڈائریکٹر جمال کے ہاتھ لگا وہ شرابی اور غیر ذمہ دار تھا۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ جمال استاد آدمی ہے۔

جمال اچھے خیالوں کا مالک تو تھا۔ موسیقی کا ذوق بھی رکھتا تھا مگر نہ وہ ناچ سکتا تھا' نہ گا سکتا تھا اور نہ کبھی کسی نے پاکستان میں بیلے بنایا تھا' جو اس نے دیکھا ہو۔

جمال کو استاد بن کر بیٹھنا پڑا۔ اس نے پرانے زمانے کی چڑیا کوے کی کہانی کو ایسی شکل دی کہ جس سے یہ سبق ملے کہ کمزور طاقتور کو شکست دے سکتا ہے۔

بچیوں میں ایک کسی قدر قبول صورت تھی اور جسم و جان بھی اس کے ٹھیک تھے۔ اس کی ماں اصغری بیگم اور باقی بچیوں کی مائیں اور مامے ریہرسل کے لیے بچیوں کے ساتھ آتے۔ جمال کو انہیں روزانہ سگریٹ کی ڈبیاں اور کھانا دینا پڑتا اور ہر لحاظ سے خوش رکھنا پڑتا ورنہ وہ بچیوں کو واپس لے جاتے۔

### چڑی کہانی

جمال نے پہلے تو کہانی کے مناظر لکھے۔ کردار واضح کیے اور سیٹ سوچے' جن پر شوٹنگ درکار تھی۔ پھر چار بچیوں اور ایک کوے کی جوان کی کھچڑی چھین کر کھا جاتا ہے اور آخر میں ان سے بری طرح مار کھاتا ہے۔ حرکات لکھیں' فاصلے طے کیے' قدم گنے اور پھر ماتروں کا حساب لگا کر موڈ کے حساب سے دھنیں بنوائیں اور ڈانس ڈائریکٹر سے ناچ کے انگ بھاؤ طے کیے۔

ریہرسل میں چار ماہ لگ گئے۔ اسی دوران بجٹ تیزی سے خرچ ہوتا گیا مگر اس کے ساتھ ہی بچیوں



اور ان کی ماؤں کے ساتھ اس کی دوستی بھی ہو گئی۔

جمال ان سے برابری کا اور عزت کا سلوک کرتا تھا۔ ان کو حقارت سے نہیں دیکھتا تھا مگر اس کے ڈرائیور افراسیاب کی کدورت چھپائے نہ چھپتی تھی۔ وہ راولپنڈی کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا تھا اور نمازی پرہیزگار آدمی تھا۔ اسے روزانہ ہیرا منڈی جانا اور بچیوں اور ان کے رشتہ داروں کو لانا اور پھر چھوڑنا پڑتا مگر اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے کہا "صاحب میں تو دوزخ میں جاؤں گا۔ آپ ہی بچے رہیں۔"

اصغری بیگم جمال کے حسن سلوک کی گرویدہ تھی اور آہستہ آہستہ اس سے گھر کی باتیں کرنے لگی۔ وہ ایک بھرپور عورت تھی۔ پینتالیس سال کے پیٹے میں' گفتگو میں شائستہ۔ ایک دن جمال نے اس کی بیٹی روبی کی تعریف کی تو وہ بولی "میری بڑی بیٹی تو بہت ہی خوبصورت ہے ماشاءاللہ! سنہری اس کے بال ہیں اور یہ لمبا قد! اپنے باپ پر گئی ہے۔ کشمیر کا پکا ہوا سیب ہے!"

"کون تھا اس کا باپ؟" جمال نے پوچھا۔

"تھا جی ایک قالینوں کا سوداگر یوسف بٹ' مجھ پر عاشق ہو گیا اور اس نے مجھ سے شادی کر لی۔ اس سے میری چار بیٹیاں ہیں مگر پھر اس نے مجھے طلاق دے دی اور بیٹیاں بھی چھوڑ دیں۔"

"ایسا بھی ہوتا ہے؟" جمال نے حیران ہو کر پوچھا۔

### فقط ایک روپیہ

"ایسا بھی ہوتا ہے جی میں نہیں چاہتی کہ آپ کبھی بازار کی طرف آئیں۔ میری بیٹی کو دیکھ کر آپ کا دل مچل سکتا ہے۔"

"دل مچل تو سکتا ہے کیونکہ مجھے حسین عورتیں بہت لبھاتی ہیں۔" جمال نے ہنس کر کہا۔

"دل مچل جائے تو میں خود اسے ایک رات آپ کے لیے چھوڑ جاؤں گی۔ اسے فقط ایک روپیہ دے دیجیے گا۔"

"ایک روپیہ؟" جمال نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ ہماری ریت ہے جی۔ ہم کسی بھی شخص کے ساتھ پیسہ لیے بغیر نہیں سو سکتیں اور اس رات کھانا بھی میں خود بھیجوں گی۔ کیا عجب کہ آپ کی کوئی نشانی ہمیں مل جائے۔"

"توبہ توبہ۔ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" جمال بولا۔

"مگر آپ کے چھینٹے تو بہت لڑکیوں پر پڑے ہوں گے۔ آپ کو کیا پتہ کہ ان میں سے کیسے کیسے گل بوٹے نکلے...... کتنی ایسی خوش نصیب ہوں گی!"

"بہت نہیں مگر میں زندگی میں کبھی بازار نہیں گیا اور ہمیشہ ذمہ داری سے کام لیا۔ اس لیے میرے چھینٹوں سے کوئی بیل بوٹا نہیں پھوٹا۔"

’’مگر طوائفوں کی بیٹیاں شریفوں کی بیٹیاں ہوتی ہیں...... یا ان کی ماں ہماری بہو ہوگی۔ جو شریفوں کی اولاد ہوتی ہے یا ان کے باپ تماش بین ہوتے ہیں جو شریف گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر مٹی ڈالو جی اس بات پر۔‘‘ اصغری بیگم بولی ’’طوائف کی بیٹی پر ریجھ جانا کوئی اچھی بات نہیں۔ یہ میں آپ کی خاطر کہہ رہی ہوں ورنہ ہم تو آپ جیسے شریف آدمیوں کی تلاش میں رہتے ہیں تاکہ ہماری کوئی بچی کسی خوبصورت بیٹی کی ماں بن سکے۔‘‘

جمال کو یہ فلسفہ معلوم نہ تھا۔ اصغری بیگم بولی ’’ایک اور وجہ بھی ہے آپ کو اِدھر آنے سے منع کرنے کی۔ آپ بڑے افسر ہیں۔ فلم ڈائریکٹر ہیں۔ اگر آپ اِدھر کسی کوٹھے پر چڑھے تو کوئی نہ کوئی بچی آپ کے نام لگ جائے گی۔ ہماری بچیاں تو گمنام ہی ہوتی ہیں۔ اگر آپ جیسے کسی بڑے آدمی سے منسوب ہوسکیں تو ان کے بھاؤ بڑھ جاتے ہیں۔ ہمارنے ہاں بڑے بڑے شاعروں‘ ادیبوں‘ ایکٹروں اور دانشوروں سے منسوب لڑکیاں موجود ہیں۔ ان میں سے بعض واقعی ان کی بیٹیاں ہیں مگر زیادہ تر زبردستی ان کے ناموں سے جوڑ دی جاتی ہیں۔ ہماری نانیاں دادیاں بائی جی کہلواتی تھیں کیونکہ اس زمانے میں کسی طوائف کا خاندانی ہونا عزت کی بات تھی۔ اب تو یہ مس چودھری ہے۔ وہ مس شیخ ہے۔ اس طرح انہیں فلم انڈسٹری میں بھی چانس مل جاتا ہے۔ کسی بائی کو تو اب سٹوڈیو میں کوئی گھسنے نہیں دیتا مگر مس ڈار کے لیے دروازے کھلے رہتے ہیں۔‘‘

یہ بات بھی جمال کو بہت دلچسپ لگی۔

پھر اصغری بیگم نے ان لڑکیوں کے نام گنوائے جو لاہور کے بڑے آدمیوں کی یادگار تھیں اور ان کے بھی جو جھوٹ موٹ کسی مشہور آدمی سے منسوب کردی گئی تھیں۔

## فیملی پلاننگ

اصغری بیگم نے کہا ’’میرے تو کل پانچ بچے ہوئے۔ چار لڑکیاں جو بٹ صاحب چھوڑ گئے اور ایک لڑکا جو بعد میں پیدا ہوا۔‘‘

جمال کو اس پر حیرت ہوئی کہ بیاہتا عورتوں کے بھی بالعموم پانچ چھ بچے ہوتے ہیں اور طوائفوں کے بھی جو کسی رات کو رد نہیں کرسکتیں۔

اصغری بیگم نے کہا ’’آپ کا یہ خیال صحیح نہیں کہ ہم ہر روز کسی نہ کسی کے بستر میں ہوتی ہیں مگر بیاہتا عورتوں کو تو اپنے مرد روزانہ بھگتانے پڑتے ہیں۔‘‘

’’مگر تم بچوں کی پیدائش کو کیسے کنٹرول کرتی ہو۔ آخر بدصورت امیرزادے بھی تمہاری راتیں خریدتے ہوں گے۔‘‘

’’یہ باتیں ہمارے ایسے راز ہیں جو کہ ہم کسی کو نہیں بتاتے۔‘‘

## شوٹنگ

چار ماہ کی ریہرسل کے بعد جمال نے شوٹنگ صرف چھ دن میں مکمل کرلی مگر اسے تکلیف بہت



ہوئی۔ بچیوں نے تو کام شوق اور محنت سے سیکھا تھا مگر ڈانس ڈائریکٹر ایک ذلیل شرابی تھا۔ اس خوشی میں کہ بیلے کی شوٹنگ کرا رہا تھا۔ شوٹنگ کے دن اس نے صبح ہی صبح اتنی شراب پی لی کہ وہ اٹھنے کے قابل نہ رہا۔ کہیں دن کے تین بجے جمال کے آدمی اسے زبردستی گھر سے اٹھا کر لائے۔ سٹوڈیو میں اسے نہلا کر نشہ اتارا گیا اور شام کو کہیں شوٹنگ شروع ہوئی۔ اگر بچیوں نے اتنی لگن سے ناچ یاد نہ کیا ہوتا تو بیڑا غرق تھا۔

خدا خدا کر کے بیلے مکمل ہوا اور جمال فلم لے کر اسلام آباد پہنچا تو وزیر صاحب کو خبر ہوئی کہ میں نے فلم والوں سے جو وعدہ کیا تھا وہ جمال نامی ایک ڈائریکٹر جنرل نے پورا کردکھایا ہے۔ اس نے کہا ’’میں بیلے دیکھوں گا۔‘‘

قدرت اللہ صاحب جمال کے پیچھے نوکری چھوڑ کر جاچکے تھے۔

جمال نے اپنے طور پر کچھ بچے جمع کیے اور وزیر صاحب سے پہلے انہیں فلم دکھائی اور ان سے کہا کہ وہ کہانی بیان کریں۔ بچے کہانی سمجھ گئے تھے یعنی بیلے کامیاب تھا۔

قدرت اللہ صاحب کی جگہ ایک دلفریب شہزادہ جمال کا افسر مقرر ہوا تھا۔ دل کا اچھا تھا مگر بانکا اور خود پسند تھا۔ پیپلز پارٹی کے چابک سوار اس کی ہیکڑی سے ناخوش تھے اور اسے انہوں نے اس کی پکی نوکری سے مار بھگایا تھا‘ حالانکہ وہ مزاج کے حوالے سے حکمران طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ آرٹس سے بھی اسے دلچسپی تھی۔ جمال کے بارے میں وہ شکوک لے کر آیا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ اس کی چھٹی کرادے مگر چند ہی دنوں میں وہ سمجھ گیا کہ جمال دفتری آدمی نہیں۔ ترقی کی خواہش میں سازش نہیں کرتا۔ کام میں مستعد ہے مگر جو فلم اس نے بنائی تھی تخلیقی طور پر اس قابل تھی کہ جمال کا نوٹس لیا جاتا۔ وزیر صاحب واہ واہ کرچکے تو فلم سٹور میں رکھ دی گئی۔ جہاں اب بھی پڑی سڑ رہی ہے۔ یہ فلم کسی نے نہیں دیکھی کیونکہ ریلیز ہی نہیں ہوئی۔

بعد میں بھی جب وہ دلفریب شہزادہ جمال پر مہربان ہوگیا تب بھی اس نے اس بیلے کا کبھی ذکر نہ کیا۔ جمال بھی چپ رہا حالانکہ اب دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے احترام اور محبت تھی۔

## قائداعظم کی یاد میں

قائداعظم کی برسی کے سلسلے میں جمال نے ان پر ایک فلم بنانے کی اجازت مانگی جس پر طرح طرح کے اعتراض ہوئے مگر چونکہ منسٹری کے افسروں کو قائداعظم کے بارے میں خود کچھ معلوم نہ تھا‘ اس لیے وہ اس کے جوابات کو رد نہ کرسکے۔ جمال نے کسی نہ کسی طرح ایک مختصر فلم بنالی تو محکمہ خارجہ نے اس پر پابندی لگوادی کہ اس سے ہندوستان ناراض ہوگا جو کہ ایک دوست ملک ہے یعنی ہمارے محکمہ خارجہ کو بانی پاکستان پر فلم بنانے کے لیے ہندوستان کی اجازت درکار ہے۔ جمال نے یہی لکھ دیا۔ اس پر وہ اور بگڑے۔

حکومتِ پاکستان میں حکمران صرف چار ہی وزارتیں ہوتی ہیں۔ امورِ خارجہ‘ امورِ داخلہ‘ امورِ خزانہ اور اطلاعات۔ باقی برائے نام ہوتی ہیں اور صوبائی حکومتوں کے کاموں میں رخنے ڈالنے کے سوا کچھ نہیں کرتیں۔

طے ہو گیا کہ وہ سرکاری ملازمت کے قابل نہیں اور کچھ سیکھنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتا۔ خود جمال بھی اسی نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔

دفتر میں اسے کوئی تکلیف نہ تھی۔ چار برس اس کے محکمے کی بجٹ کی سالانہ منظوری اور بے معنی میٹنگوں میں گزر چکے تھے۔

یہ اور دور تھا اور یہاں کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہ تھی۔

## مصروفیت بہت مگر کام ندارد

اسلام آباد میں جمال کی سوشل لائف بہت محدود تھی۔ گھر اُس کو مل چکا تھا اور شام کو مفتی کے ہاں گپ مارنے یا دوسرے چوتھے دن قدرت اللہ صاحب کے گھر جانے کے سوا اسے کوئی مصروفیت نہ تھی۔ مگر وہاں رہتے رہتے اس کی کچھ ارادہ مند خواتین سے بھی ملاقات ہو گئی جو پڑھی لکھی' خوش حال اور ملنسار بھی تھیں۔ جمال ان کے رندے کے قابل نہیں تھا کیونکہ وہ اکیس بائیس گریڈ سے کم کے افسروں کو قابل توجہ نہ سمجھتی تھیں اور جمال تو طبعاً بیس گریڈ کا افسر بھی نہ بن سکا تھا۔

وہ زیادہ تر ان وزیروں کے اور ے تورے رہتیں یا ان کے سیکنڈلوں میں دلچسپی لیتیں جو بھٹو صاحب کے زیادہ قریب سمجھے جاتے تھے۔ ان کے اپنے خصم بھی بڑے بڑے افسر تھے مگر وہ اب ان کو لبھاتے نہ تھے۔ جمال کی ان میں سے ایک آدھ سے دوستی ہو گئی کیونکہ جمال ایک بدتمیز اور کھردرا آدمی تھا اور ایسے آدمی بھی بعض بہت نفیس عورتوں کو پسند آ جاتے ہیں۔

ان عورتوں کو تصوف میں بھی دلچسپی تھی اور تصوف میں ان دنوں قدرت اللہ صاحب کا بڑا نام تھا۔ جمال کو قبولیت بخشنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ قدرت اللہ کے مصاحبوں مریدوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ اس سے قدرت اللہ صاحب کی روحانی کیفیات کے بارے میں پوچھتی رہتیں۔

جمال قدرت اللہ صاحب کو ایک نہایت نیک دل' دردمند' سچا اور بہادر آدمی سمجھتا تھا۔ ایک مرتبہ کے سوا اسے ان پر روحانیت کا کبھی شبہ نہ ہوا۔ وہ مارکسی شعور پر یقین رکھتا تھا اور کائنات کی حرکت کو علت و معلول کا نتیجہ سمجھتا تھا۔ یہ بات اس نے قدرت اللہ صاحب کے سامنے بھی کہی مگر وہ کسی بات کی تردید نہ کرتے تھے اور مبہم جواب دیتے تھے۔ اس سے ان کی پراسرار شخصیت میں دلچسپی مزید بڑھ جاتی تھی۔

اعلیٰ طبقے کی تعلیم یافتہ خواتین زندگی سے بیزار رہتی تھیں کیونکہ ان کے کرنے کو کوئی کام نہ ہوتا تھا۔ ان کے 22 گریڈ کے خاوند دفتر چلے جاتے تو وہ گیارہ بجے کافی پارٹی کرتیں اور بعض اوقات ایسی فلمیں دیکھتیں جن کا ذکر ممنوع ہے۔

## خاندانی خاتون

اسلام آباد میں مشہور تھا کہ غیر ملکی مہمانوں کی آسودگی کے لیے پاکستان کے محکمہ خارجہ نے اعلیٰ



خاندانوں کی کلچرڈ خواتین کا ایک طائفہ رکھا ہوا ہے جو ان کو اسلام آباد کی سیر کراتیں۔ شاپنگ کرواتیں (اور کرتیں) اور راتوں کو ان کی تھکاوٹ اور تنہائی دور کرتیں۔ ان کو بہت معقول معاوضہ ملتا تھا۔

وہ دلربائی کی وجہ سے منتخب کی جاتیں۔ اعلیٰ افسروں کی بیٹیاں ہونے کا یہ مطلب نہ تھا کہ ان کو اعلیٰ افسروں کے رشتے بھی مل جاتے تھے۔ ان کے ذاتی اخراجات بھی بہت ہوتے تھے مگر ایسی نوکریاں انہیں نہیں ملتی تھیں جن میں حرام کی کمائی وافر ہو اور ان کے ذوق زندگی پر پوری اتریں۔ ان پر امریکی طرز زندگی کا بہت اثر تھا مگر وہ نہیں جانتی تھیں کہ امریکی اصلاً مزدور اور محنت کش ہوتے ہیں اور صرف ہفتے اور اتوار کو کھل کھیلتے ہیں۔ پانچ دن وہ بوریاں اٹھا کر گزارتے ہیں۔

وہ اس خیال سے بھی محکمہ خارجہ کے طائفے میں شامل ہو جاتی تھیں کہ شاید کسی غیر ملکی مہمان کو ان کی کوئی ادا پسند آ جائے اور وہ انہیں ساتھ لے جائے۔ غیر ملکیوں کے ساتھ پھرنا اور دیکھے جانا عزت کی بات سمجھی جاتی تھی۔

رات گزار کر وہ صبح سویرے منہ اندھیرے فارن آفس کی گاڑیوں میں گھروں کو روانہ ہو جاتیں اور کسی کو پتہ بھی نہ چلتا۔

مگر ایک عرب مہمان جس کا جہاز صبح سویرے چھوٹتا تھا اور جسے چار بجے جاگنا تھا' رات جگے کی وجہ سے وقت پر اٹھ نہ سکا۔ فارن آفس کے مہمانداروں نے دروازہ کھٹکھٹایا' ٹیلیفون کی گھنٹیاں بجائیں مگر عرب مہمان وقت پر تیار نہ ہو سکا۔ کبھی کہتا میں شیو کر رہا ہوں' کبھی کہتا میں نہا رہا ہوں۔ اسی کشاکش میں دن نکل آیا۔ جہاز رکا ہوا تھا اور ایئرپورٹ پر فکر کی زردی چھائی ہوئی تھی۔

فارن آفس کے مہماندار نے دروازہ دھپ دھپا کر کہا ''حضور نکلیے ورنہ جہاز جاتا ہے۔''

اندر سے آواز آئی ''کیسے نکلوں۔ میرے ساتھ ایک شریف خاندان کی معزز خاتون ہے۔ وہ نکلے گی تو سب اسے دیکھ لیں گے۔ آپ یہ کمرہ میرے نام سے ایک روز اور بک رکھیے تاکہ وہ معزز خاتون دن گزار کر شام کو گھر جا سکے۔''

## خوشامد کے بھید

اسلام آباد میں ایک سندھی دانشور جو نہایت ذہین اور معاملہ فہم شخص تھے اور کسی زمانے میں مرکزی وزیر رہ چکے تھے' ان دنوں بھٹو صاحب کے مشیر مقرر تھے۔ وہ پیر بھی تھے مگر شریر آدمی تھے اور انہیں دفع شر کے لیے رکھا گیا تھا۔ جمال انہیں سندھ گورنمنٹ کی نوکری کے زمانے سے جانتا تھا۔

جمال وزارت کے رویئے سے سخت دل برداشتہ تھا۔ اس نے سندھی دانشور سے پوچھا کہ میں کیا کروں' اس نے کہا ''تم بھٹو کے اخبار کے اداریہ نویس تھے اور بھٹو اپنے آدمیوں کی حفاظت کرتا ہے۔ اس کے پاس جاؤ اور فریاد کرو۔''

''میں اس سے کیا کہوں؟'' جمال نے بچوں کا سا سوال کیا۔

پیر صاحب بولے ''تم اس سے کہو اے فخر ایشیا! اے ماؤزے تنگ سے بھی بڑے انقلابی' اے قائداعظم ثانی' اے ہندوستان کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہونے والے پاکستان کے رکھوالے۔''

''مگر پیر صاحب ایسی مبالغہ آمیز اور جھوٹی خوشامد سن کر وہ کمرے سے باہر نہیں پھنکوا دے گا۔'' جمال نے کہا۔

''یقیناً پھنکوا دے گا مگر وہ تمہارا کام کر دے گا' وہ ایک وڈیرا ہے۔''

''مگر پیر صاحب اس طرح کی پوچ خوشامد مجھ سے نہ ہوگی۔'' جمال نے کہا۔

''برخوردار خوش آمد وہی موثر ہوتی ہے جو پوچ اور گھٹیا ہو۔ اگر تم وقار سے خوشامد کرو گے تو اسے طنز سمجھا جا سکتا ہے اور لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔''

## سائنس اکیڈمی

جمال نے ایک دن قدرت اللہ صاحب سے پوچھا کہ ''آپ نے جب ایوب خاں کے پرسنل سیکریٹری تھے ڈاکٹر عبدالسلام کے سائنس پراجیکٹ کو کیوں رد ہونے دیا؟''

ڈاکٹر عبدالسلام عقیدے کے اعتبار سے احمدی تھے' مگر پاکستان سے عشق کرتے تھے۔ حساب اور فزکس میں انہیں اللہ نے خاص طور پر نوازا تھا۔ انہوں نے ایک سکیم یونیسکو سے امریکہ اور روس کی مخالفت کے باوجود منظور کروائی تھی جس کے مطابق پاکستان میں یونیسکو کے خرچ پر فزکس کا ایک ریسرچ سنٹر قائم ہو جاتا اور پاکستان تیسری دنیا کا مرکز بن جاتا۔ اس کو روکنے کے لیے امریکہ نے پاکستان میں احمدیوں کے خلاف ایک مرتبہ تحریک چلوائی۔ نفرت کی اس لہر میں ڈاکٹر عبدالسلام قوم کے سامنے اپنا موقف بھی پیش نہ کر سکے۔ اس مرکز سے احمدیوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا مگر عالم اسلام کی جہالت دور ہو جاتی۔

پھر امریکیوں نے ایوب خاں کو لکھا کہ بطور میزبان ملک تم یہ سنٹر قبول کرنے سے انکار کر دو۔ ایوب خاں نے ایسا ہی کیا اور یہ ریسرچ سنٹر پاکستان کی بجائے ٹریسٹے میں قائم ہوا جس نے تھیوریٹیکل فزکس میں کارنامے انجام دیئے۔

قدرت اللہ صاحب کے پاس اس کا کوئی معقول جواب نہ تھا۔ انہوں نے کہا ''اگر یہ سنٹر یہاں بن جاتا تو ہم اس میں اسرائیل کے طلبہ کو بھی قبول کرنے پر مجبور ہو جاتے۔''

''بے شک ہو جاتے۔'' جمال نے کہا ''مگر اس سے عالم اسلام کو اور پاکستان کو جو فائدہ پہنچتا اس کا اندازہ کیجیے۔''

''اصل میں ہم اس مرکز کی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ پھر ایوب خاں کو امریکہ کی خوشنودی ہر صورت



تھی۔ اپنی حماقتوں کی ذمہ داری اللہ پر ڈالنا ہی اسلامی کلچر ہے۔''

## اسلام آباد کا کلچر

کلچر کی بھی ایک ہی رہی۔ بہت بڑے افسر جب سیمینارز میں سے نکلتے تو اگر شام کو کسی ڈنر میں مدعو نہ ہوتے تو ان میں سے بعض مزاروں پر جا کر قوالیاں سنتے' دعائیں مانگتے پھر خاموشی سے گھر جا کر وہسکی کے دو گھونٹ پیتے اور سو جاتے۔ ان کے بچے بچیاں سیر کوہسار میں شام گزارتے یا سڑکوں پر تیز رفتاری سے سرکاری گاڑیاں چلاتے۔ کوکا کولا پیتے' کافی کی چسکی لگاتے' آئس کریم کھاتے کیونکہ نیویارک کے نچلے طبقوں کے نوجوانوں کا یہی طرز زندگی ہے۔ بعض ان کی نقالی میں چرس پیتے اور راک میوزک پر ناچ کرتے۔ وہ سیخ کباب پر برگر اور بیف سٹیک کو ترجیح دیتے کیونکہ امریکہ میں تکا کباب کوئی نہیں کھاتا۔

درمیانے افسر زیادہ وقت گھروں میں گزارتے مگر چھٹی کے دن جھیل پر مچھلی پکڑنے کا شوق پورا کرتے کیونکہ مچھلی کا شکار بوڑھے انگریز افسروں کی مرغوب تفریح ہوتی تھی۔

چھوٹے اہلکاروں کی تفریح کا کوئی سامان نہیں تھا۔ وہ گھروں سے نکلتے ہی نہ تھے نکلتے تو مسجد تک یا بازار سے سودا سلف لانے کی خاطر۔ سرکاری افسروں میں وہ چھوٹے ہوں یا بڑے قدر مشترک یہ ہے کہ کتاب کوئی بھی نہیں پڑھتا۔ بعض اوقات بڑے افسر کتاب خرید لیتے ہیں مگر وہ ڈرائنگ روم میں سجاوٹ کے کام آتی ہے۔ ایک سیکریٹری صاحب نے ایک روز ترنگ میں آ کر کہا ''میرے گھر میں صرف ایک کتاب ہے۔ اگر کوئی بتا دے کہ وہ کون سی کتاب ہے تو سکاچ وہسکی کی بوتل ہارتا ہوں۔''

یہ ایک بہت بڑی ڈنر پارٹی تھی۔ سب نے قہقہہ لگا کر کہا ''یہ بھی کوئی شرط ہے۔ آپ ہار گئے کیونکہ آپ کے گھر میں جو ایک کتاب ہے' وہ قرآن شریف ہے۔''

سیکریٹری صاحب نے کہا ''میں شرط نہیں ہارا۔ وہ کتاب جو میرے گھر میں ہے وہ ٹیلیفون ڈائریکٹری ہے۔''

## جاوید نامہ

انہی دنوں علامہ اقبال کی برسی آ گئی اور حکم ہوا کہ اس کے لیے کوئی فلم تیار کی جائے۔ جمال نے سوچا کہ میں جاوید نامے پر فلم بناؤں کیونکہ یہ اقبال کے بڑے کارناموں میں سے ہے۔ اسے فارسی تھوڑی بہت آتی تھی۔ اس نے جاوید نامے کو دل لگا کر پڑھا اور اقبال کی منظر نویسی اور کردار نگاری پر حیران ہوا۔ فلم بہت مشکل تھی اور شاید جمال سے نہ بنتی کیونکہ پاکستان میں نہ تو جدید کیمرے تھے نہ روشنیوں کا انتظام نہ میک اپ کا کوئی استاد اور نہ کوئی آرٹ ڈائریکٹر جو آسمانوں کے سیٹ لگا سکے یا پارے کے تالاب بنا سکے مگر ابھی اس میں احمقانہ جرأت موجود تھی۔ اس نے رات دن بیٹھ کر اس کا منظر نامہ لکھا۔ بجٹ بنایا اور منسٹری کو بھیج دیا۔ چونکہ

لیے ایک کمیٹی بنادی گئی تا کہ بعد میں کسی ایک افسر پر الزام نہ آئے اور اگر آج تک حکومت کا کوئی افسر کسی غلط فیصلے کی وجہ سے گرفت میں نہیں آیا تو اسی حکمت کی وجہ سے بچا رہا۔ یہ اور بات ہے کہ فیصلے کمیٹی میں موجود بڑے افسر انفرادی طور پر ہی کرتے ہیں۔

جاوید نامے کی کمیٹی کے نفس ناطقہ مولوی نیاز علی کوثر تھے۔ انہوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ بھٹو صاحب پر جو وحی اترتی ہے میرے ذریعے اترتی ہے اور میرا مقام فرشتے کا مقام ہے۔

اصل میں وہ کھیڈے کے پالتو ہاتھی تھے۔ جنگلی ہاتھیوں کے غول میں گھس کر انہیں پھندے لگوا دیتے تھے۔

مولوی نیاز علی کوثر ایک خوش گفتار مگر دنیادار آدمی تھے۔ انہوں نے منصوبہ رد کروا دیا۔ یہ کہہ کر کہ یہ بہت مشکل کام ہے۔ شاید اچھا کیا کیونکہ کام واقعی مشکل تھا اور شاید جمال اس سے عہدہ برآ نہ ہو سکتا مگر مولوی صاحب نے اپنا بدلہ ایک مرتبہ اور لے لیا۔

## یہ اور دور ہے!

بھٹو صاحب نے الیکشن ایک مقررہ مدت سے ایک سال قبل کروا دیئے تھے۔ اس زعم میں کہ میں پانچ برس کا مینڈیٹ اور لے لوں۔

وہ اپنی نجی مجلسوں میں کہا کرتے تھے کہ میں پاکستان پر پندرہ برس حکومت کروں گا اور حاضرین مجلس کہتے تھے، جی ہاں یقیناً بلکہ اس سے زیادہ۔

کامیاب اور طاقتور شخص اصل میں تنہا ہوتا ہے کیونکہ کوئی اس کو حقیقت حال نہیں بتاتا۔

مگر بھٹو صاحب حقیقت حال سے بے خبر بھی نہ تھے۔ انہوں نے دو بڑی خطائیں کی تھیں جنہیں امریکہ معاف نہ کر سکتا تھا۔ ایک اسلامی سربراہوں کی کانفرنس جس کی تاریخ میں کوئی نظیر نہ تھی۔ اس کانفرنس میں انہوں نے عالم اسلام میں اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کی تحریک پیدا کی تھی اور اس سے امریکہ گھبرا گیا تھا۔ دوسرا گناہ ان کا ایٹمی پروگرام تھا۔ مغربی ممالک کسی صورت یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ کوئی مسلمان ملک ایٹم بم بنا لے۔ انہوں نے صاف کہا کہ باز آ جاؤ ورنہ ہم تم پر مال گاڑی چلا دیں گے۔ اس کے ساتھی وزیروں کے ذریعے بھی کہا جو سی آئی اے کے نمائندے تھے کہ بھٹو کو سمجھاؤ مگر بھٹو میں ایک جاگیردارانہ غرور بھی تھا اور وہ عالم اسلام کے لیڈر بھی بننا چاہتے تھے، اس لیے وہ ڈٹ گئے۔

الیکشن میں بھٹو صاحب نے اپنی سیٹ پر مخالفین کو غائب کروا دیا تو پارٹی کے دیگر لیڈروں نے بھی دھاندلی کی۔ اس پر احتجاج ہوا تو آئی ایس آئی نے جو بالعموم سی آئی اے کا ذیلی ادارہ ہوتا ہے، اسلامی جمہوری اتحاد کے نام سے ایک محاذ بنوا دیا جس نے بغاوت کر دی۔ اس اتحاد کے لیے ڈالر امریکہ سے آئے اور پہیہ جام ہڑتال کا منصوبہ بھی



بھٹو صاحب کچھ گھبرا گئے اور مذاکرات شروع ہوئے جن میں مولوی نیاز علی کوثر کے مشورے سے پہلے تو انہوں نے اسلامی سوشلزم کے نعرے کو مساواتِ محمدی کے نعرے میں تبدیل کیا۔ اتوار کی جگہ جمعے کی چھٹی کروائی۔ شراب پر بندش لگوائی، گھوڑوں کی ریس رکوائی۔ پھر انہیں مولانا مودودی کے گھر لے گئے تا کہ کسی طرح نظام مصطفیٰ کے نعرے کو روکیں مگر بات نہ بنی۔ فوج بھی ان کے خلاف تھی اور بیوروکریسی بھی۔

بھٹو صاحب نے اپنی پارٹی کو منظم نہ کیا تھا۔ وہ عوام سے ڈرتے تھے۔ ان کی سینٹرل کمیٹی نامزد ارکان پر مشتمل تھی جو وہی کہتی تھی جو وہ چاہتے تھے۔

جیسے جیسے بھٹو صاحب کمزور ہوتے گئے ان کے بیشتر ساتھی آئی ایس آئی کے کہنے پر ان کا ساتھ چھوڑتے گئے حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو اسلامی جمہوری اتحاد سے مذاکرات میں بھٹو کی نمائندگی کرتے تھے۔

بھٹو نے عوام کو میٹھے بولوں کے سوا کچھ نہ دیا تھا اور انہوں نے جو کارنامے انجام دیئے تھے، ان کا عام آدمی کی زندگی پر کوئی اثر نہ پڑا تھا اس لیے۔ اگرچہ عوام ان کے ساتھ تھے مگر چونکہ بھٹو نے پارٹی میں دوسرے کسی لیڈر کو ابھرنے کا موقع نہ دیا تھا، اس لیے اب کوئی بھی اس قابل نہ تھا کہ وہ اسلامی جمہوری اتحاد کی بغاوت کو تھام سکے۔

بھٹو صاحب سیکریٹریٹ کو جاتے تھے تو جمال کا گھر اُن کے راستے میں پڑتا تھا۔ وہ انتظار میں کھڑا تھا جب ان کی گاڑیاں گزریں۔ وہ لپک کر سڑک کے کنارے پہنچا اور بھٹو صاحب کے لیے تالیاں بجانے لگا۔

بعد میں وہ بہت افسردہ ہوا کہ اس لیڈر کے راستے میں تالی بجانے والا ایک صرف میں رہ گیا ہوں جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بچے ماؤں کا دودھ پینا چھوڑ دیتے تھے۔

بڑی مشکل سے اور بڑی کاوش کے بعد اسلامی جمہوری اتحاد میں مذاکرات شروع ہوئے جن میں بھٹو صاحب انتخابات دوبارہ کروانے پر تیار ہو گئے تھے اور لگتا تھا کہ بگڑی بن جائے گی۔

## دفتر کا کلچر

کام تو کچھ تھا نہیں۔ جمال نے دفتر کے لوگوں کو آزاد کر دیا۔ کسی کی حاضری نہ لگتی تھی۔ اس نے اپنا انٹرٹینمنٹ الاؤنس سب کے لیے جائز قرار دے دیا۔

مرکزی حکومت کے دفتروں کا قاعدہ ہے کہ ایک ریسپشن آفس ہو۔ آنے والا یہاں اپنا نام و پتہ لکھوائے۔ جس افسر کو ملنا چاہتا ہے اور جس وجہ سے ملنا چاہتا ہے بیان کرے۔ پھر مہماندار خاتون افسر مطلوب کو ٹیلی فون پر کوائف بتائے اور اس کی اجازت سے مہمان کو ایک چپڑاسی کے ساتھ افسر کے ہاں پہنچا دے۔ اگر وہ میٹنگ سے فارغ ہو چکا ہو تو۔

جمال دفتر کی دوسری منزل پر بیٹھتا تھا اور مہماندار خاتون پہلی منزل پر دروازے کے سامنے۔

اپنے دروازے پر جہاں افسر نو ایڈمشن لکھواتے ہیں' اس نے اردو میں لکھوا دیا جناب تشریف لائیے اور اس سے بھی وزارت کے افسروں کو بڑی تکلیف ہوتی۔ دوسری بات یہ کہ مہمان دار کے سامنے ایک صوفہ لگوا دیا اور مہماندار سے کہا کہ آنے والے کو ادب سے صوفے پر بٹھاؤ پھر مجھے ٹیلی فون کرو۔ میں خود نیچے آ کر مہمان کو اوپر لے جاؤں گا۔ اس پر تو وزارت میں قیامت مچ گئی کہ یہ آوارہ گرد شخص مرکزی حکومت کے جلال کو خراب کر رہا ہے' آداب جہاں بانی سے واقف بالکل نہیں۔ جمال کو خبریں پہنچتی رہتی تھیں اور وہ افسروں کے اضطرار کا مزہ لیتا تھا۔

مطلب یہ کہ زندگی بیکاری کے باوجود دلچسپ تھی۔ اس کو ابھی کنفرم نہ کیا گیا تھا۔ اس کا سٹیٹس بھی طے نہ ہوا تھا۔ اس کو گریڈ بیس کے الاؤنس بھی نہ ملتے تھے مگر وہ خوش تھا' یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایک دن مجھے اچانک نکال دیا جانا ہے۔ وہ طبعاً افسر نہیں تھا۔ وہ اپنی بے حیثیتی سے خوش تھا۔

قدرت اللہ صاحب گھر بیٹھے تھے مگر اس کے اس رویئے سے وہ خوش تھے۔ خود وہ بھی کبھی افسر نہ بنے تھے۔ ڈرائیور' پٹرول چوری کرتے تو وہ کچھ نہ کہتے تھے اور نالائقی اور سستی پر تو انہوں نے کبھی کسی کو کچھ کہا ہی نہ تھا۔ ان کا طویل تجربہ یہی بتاتا تھا کہ پاکستان میں رولز اور پروسیجرز ایسے ہیں کہ کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا اور جو لوگ ان کو تبدیل کرنے کی قدرت رکھتے ہیں' وہ تبدیل کرنا ہی نہیں چاہتے۔ اس لیے جلنے کڑھنے سے کیا حاصل۔

شروع میں جمال میں کچھ کر گزرنے کی شدید خواہش تھی۔ اس نے اسی جذبے کے تحت بچوں کے لیے ایک ناچ کی فلم بنائی تھی۔ پھر اس نے قائداعظم کی زندگی کی فلمی جھلکیاں مرتب کیں۔ اس فلم پر فارن آفس ناراض ہوا کیونکہ پاکستان کی تخلیق کے محرکات میں مہاتما گاندھی کی بدنیتی کا ذکر لازم آتا ہے اور اس کا ذکر وہ نہیں چاہتے تھے تو پھر جمال کو بھی عقل آ گئی۔ اس نے حکومت کے فلسفے کو دل سے تسلیم نہ کیا' مگر دکھی ہونا بھی چھوڑ دیا۔

## بادِ شمال

مفتی کا بیٹا اچھو بہت جینوئن آدمی تھا اور ٹورازم کے محکمے کے سربراہ کی حیثیت سے اس نے بڑے انوکھے کارنامے انجام دیئے تھے۔ اس کو افسری کے بھید بھی معلوم ہو گئے اور اس نے اپنے آپ کو وزارت میں قبول کروا لیا تھا۔

حکومتِ پاکستان صرف سیکریٹریٹ تک محدود ہے' اس کے ذیلی دفتر مثلاً فلم کا محکمہ یا ٹورازم کا محکمہ یا اسی قسم کے دیگر پیشہ ور محکمے کاغذوں کی حد تک خود مختار ہوتے ہیں مگر ان کے ہاں سیکشن افسر کی اجازت کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا اور یہ بھی رولز اور پروسیجرز کا کرشمہ ہوتا ہے مگر اچھو صاحب نے وزارت کے افسروں کو



ایک سکہ بند افسر تھا۔ میٹھی گفتگو' باتمیز' مددگار' اندر سے ٹھنڈا ٹھار۔ وہ اپنے ماتحتوں کو بے یقینی کے عالم میں رکھتا اور اپنے ارادوں کی بھنک پڑنے نہ دیتا مگر وہ جمال سے نہایت درجہ اخلاص رکھتا تھا اور اس کی دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا۔

اس نے کہا "میں خنجراب کے دورے پر جا رہا ہوں۔ سرکاری ویگن میرے پاس ہو گی' کیوں نہیں تم میرے ساتھ شمالی علاقوں کی سیر دیکھ لیتے۔"

اس کے ساتھ محکمے کے پانچ آدمی تھے۔ اس نے پانچ آدمیوں کے لیے ایک ٹینٹ سلیپنگ بیگ' جن میں سردی نہ لگے چاہے وہ برف پر بچھائے گئے ہوں۔ کچھ ڈبے پنیر کے' کچھ ڈبل روٹیاں اور چائے کا سامان ساتھ لیا اور پارٹی چین کی سرحد کو چلی۔

خنجراب قریباً سترہ ہزار فٹ کی اونچائی پر ایک سپاٹ جگہ ہے جہاں چین اور پاکستان کی سرحد ملتی ہے۔ اسلام آباد سے چلیں تو ایبٹ آباد' کوہستان کا سنگلاخ سلسلہ' چلاس' گلگت اور ہنزہ کے بعد خنجراب پہنچا جا سکتا ہے۔ سلک روٹ بن چکی تھی مگر ابھی مکمل نہ تھی۔

جمال نے شکاگو میں ہنزہ پر ایک پینوراما فلم دیکھی تھی۔ پینوراما پانچ کیمروں سے شوٹ کی جاتی ہے' جس میں ایک کیمرے کی تصویر دوسرے کیمرے کی تصویر میں گھل جاتی ہے۔ سکرین گول دائرے کی شکل میں ہوتی ہے یعنی اگر کوئی آدمی یا آبشار سامنے سے دکھائی جائے تو جوں جوں فلم آگے بڑھے گی آدمی یا آبشار نظروں سے پیچھے کو گھومتی اور گم ہوتی نظر آئے گی اور تصویر ایک حقیقی منظر بن جائے گی۔ اسے دکھانے کے لیے بھی پانچ پروجیکٹر استعمال ہوتے ہیں اور اس کی سکرین بھی خاص طور پر ڈیزائن کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کمرشل کام نہیں تھا' تجرباتی کام تھا۔ اس لیے اپنے بے مثال تاثر کے باوجود یہ تجربہ آگے نہ چلا مگر جمال حیران ہو گیا کہ میرے ملک میں ایسے ایسے خوبصورت اور حیران کن مقامات ہیں اور دریائے سندھ ایسا خوفناک ہے کہ کوئی اس کے قریب آنے کی جرأت نہ کرے۔

پھر اس نے یہ بھی پڑھا تھا کہ ہنزہ کے لوگ ایسے صحت مند ہیں کہ سو برس یا اس سے زیادہ کی عمروں میں شادیاں کرتے اور بچے پیدا کرتے ہیں۔

ایک بہت بڑا رومانس سلک روٹ کا بھی تھا جس پر چل کر مارکو پولو چین گیا تھا۔ اس شاہراہ پر چین کی پیپلز لبریشن آرمی کے رضا کار پاکستانی جوانوں کے ساتھ مل کر بارود سے چٹانیں اڑا رہے تھے۔ جمال نے سوچا کہ پیشتر اس کے کہ یہ سڑک مکمل ہو جائے اس کو دیکھ لینا چاہیے۔ ابھی تک آتش جواں تھا اور پاکستان کا یہی ایک گوشہ تھا جو ابھی تک جمال نے دیکھا نہ تھا۔

جمال یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ہزارہ کا علاقہ اس قدر سرسبز اور خوبصورت ہے مگر یہاں زمین پتھریلی

پہلے یہ علاقہ ریاستِ کشمیر کا حصہ ہوتا تھا مگر گلاب سنگھ نے یہ سوچ کر اسے چھوڑ دیا تھا کہ پہلے ہی ریاست میں مسلمان بہت ہیں' چنانچہ یہ علاقہ صوبہ سرحد کا حصہ بنا دیا گیا۔

مگر پہاڑیوں کے باوجود شاہراہ ریشم ہموار تھی اور گاڑی ٹاپ گیئر میں چل سکتی تھی اور یہی چینی انجینئروں کا کمال تھا۔ پہلے سڑک کا ڈیزائن پاکستانی انجینئروں نے تیار کیا تھا اور ان کا فلسفہ قدیم تھا جس کے مطابق سڑک وہاں بنائی جائے جہاں مٹی نرم ہو مگر اس سے سڑک کو چکر کاٹ کر کبھی پہاڑوں کی چوٹیوں پر جانا پڑتا۔ کبھی اتار کر وادی کی سطح پر لانا پڑتا۔ اس کی دیکھ بھال مشکل ہو جاتی۔ گاڑیوں پر پٹرول کا خرچ بڑھ جاتا اور پرزے اور ٹائر جلد خراب ہو جاتے پھر فاصلے خواہ مخواہ دُگنے ہو جاتے اور وقت ضائع ہوتا۔ چینیوں نے یہ ڈیزائن مسترد کر دیا اور مشورہ دیا کہ سڑک دریا کے ساتھ ساتھ چلے اور ہموار ہو تاکہ گاڑیاں تیز رفتاری سے چل سکیں۔

یہ بات دشوار تھی کیونکہ کوہستان کے علاقے کے پہاڑ بے آب و گیاہ اور سنگلاخ تھے۔ دریا سرخ رنگ کی سخت چٹانوں کے بیچ بہتا تھا۔ ان چٹانوں کو بارود سے اڑا کر سڑک کے لیے جگہ نکالنی پڑتی تھی۔ اس قسم کے کام کا پاکستانی انجینئروں کو کوئی تجربہ نہ تھا۔

### سلک روٹ

سڑک بنانے کا چارج چینیوں کے پاس تھا۔ اٹھارہ بیس سال کے سرخ و سفید چینی نوجوان ننگے پاؤں نوکیلی اور سنگلاخ چٹانوں پر چڑھتے پھر مطلوبہ جگہ پر ڈائنامیٹ لگاتے۔ سڑک کو دونوں طرف سے بند کر دیتے اور دھماکہ ہوتا تو بڑی بڑی چٹانیں نمک کے ڈھیلوں کی طرح فضا کے بسیط میں بکھر جاتیں۔ ایسا خوفناک منظر جمال نے کبھی دیکھا نہ تھا۔ دھماکے کے فوراً بعد کوئی اڑتی ہوئی چٹان کی جگہ پر نہ جاتا کیونکہ بعض اوقات دھماکے کے کئی منٹ بعد تک سیکڑوں ٹن بھاری چٹانیں جو اندر سے چٹخ گئی ہوتیں گر جاتیں اور بعض تو دو دو چار چار دن کے بعد اچانک مزدوروں پر آ پڑتیں۔ اس طرح اس وقت تک جب شاہراہ ریشم آدھی سے کچھ ہی زیادہ بنی ہوگی چار سو چینی اور پاکستانی فوجی جوان ان بعد میں گرنے والی چٹانوں کے نیچے آ کر کچلے جا چکے تھے اور سب کے نام سڑک پر کندہ تھے۔

پارٹی نے پہلی رات تو ہزارہ کے آخری حصے میں ایک پہاڑی نالے کے درمیان بنے ہوئے جزیرے میں ٹینٹ لگا کر گزاری۔ خطرہ تھا کہ رات کے کسی وقت آن کی آن میں نالہ چڑھ کر جزیرے کو ڈبو سکتا ہے مگر جگہ بہت دلربا تھی' اس لیے پارٹی نے یہ خطرہ مول لے لیا۔ رات سلامتی سے گزر گئی۔ کچھ بھی نہ ہوا۔

### دوسری رات

دوسری رات پارٹی نے شاہراہ ریشم پر گزاری' راستہ انتہائی ڈراؤنا تھا۔ کہیں کوئی سبز پتہ نظر نہ آتا تھا۔ مقامی کوہستانی کبھی کبھی اپنی گھنی ڈاڑھیوں کے ساتھ نظر آ جاتے تھے مگر پارٹی نے کہیں



سمجھا۔ جگہ جگہ چینی کیمپ قائم تھے جن میں رات کو متعلقہ دف کے آدمی قیام کرتے تھے مگر ایک عجیب بات تھی کہ اس سرمئی رنگ کی بانجھ زمین پر جہاں چینی کیمپ لگاتے تھے' وہاں لہلہاتی ہوئی سبزی کی کھیتیاں نظر آتی تھیں۔ چینیوں کو حکم تھا کہ وہ اپنی خوراک خود پیدا کریں اور انہوں نے چین سے بیج منگوا کر عجیب و غریب سبزیاں اُگا رکھی تھیں۔ ان میں جمال نے دو دو فٹ لمبی پھلیاں دیکھیں جو ہمارے ہاں چار پانچ انچ سے زیادہ نہیں ہوتیں۔

### معصوم چینی

ایک جگہ ڈائنامائٹ کے پھٹنے کے انتظار میں پارٹی رکی تو چینی مزدور ویگن کے گرد اکٹھے ہو کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ انہوں نے پارٹی کے تمام ارکان کی گھڑیاں دیکھنی شروع کر دیں۔ وہ اس بات پر حیران تھے کہ ہر گھڑی کی شکل دوسری سے مختلف ہے مگر وقت سب ایک ہی دے رہی ہیں۔ ان کو جوش سے باتیں کرتے دیکھ کر اچھو صاحب نے چپکے سے ویگن میں لگا ہوا ٹیپ ریکارڈر چلا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے کیسٹ سنانا شروع کی تو چینی نوجوان اپنی گفتگو سن کر حیران و پریشان ہو گئے۔ ان کو اپنے کانوں پر یقین نہ آتا تھا۔ وہ اتنے بڑے کارنامے کر چکے تھے مگر ان کی معصومیت کا کوئی اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ننگے پاؤں تھے اور ویت نامی نوجوان بھی ننگے پاؤں تھے۔ جب وہ امریکہ کو شکستِ فاش دینے کے بعد سیگان میں امریکی سفارت خانے کے صدر دروازے کو ٹینک سے توڑ کر اندر داخل ہوئے تھے اور معصوم اس قدر کہ کوکا کولا کے کریٹ انہوں نے آن کی آن میں خالی کر ڈالے تھے۔

### کھرپا اور چینی

پارٹی نے رات ایک چینی کیمپ کے قریب تنبو لگا کر گزاری۔ چینی پارٹی کے لیے سبز قہوہ لائے اور اشارے سے کہا کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو ہم حاضر ہیں۔

سویرے اٹھ کر جمال نے چائے پی اور جنگل کی تلاش میں پہاڑ کی طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں لوٹا تھا۔

تھوڑی چڑھائی کے بعد اس نے ایک موزوں جگہ دیکھی۔ مگر بیٹھنے سے پہلے اس نے ایک چینی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کھرپا اور ایک ٹین کا ڈبہ تھا۔

جمال نے سوچا کہ میں کچھ اور اوپر چلا جاؤں۔ کوئی سو گز اوپر جا کر اس نے دیکھا کہ وہ چینی اس کے پیچھے چلا آ رہا ہے مگر اسے رکا ہوا دیکھ کر رک گیا ہے۔

جمال کچھ اور اوپر چڑھا اور ایک چٹان کی اوٹ میں بیٹھنے لگا تو اس نے دیکھا کہ چینی اس کے ساتھ ساتھ ہے۔ جمال کے داخلی حالات خراب تھے۔ اسے غصہ آنے لگا۔ اس نے چیخ کر چینی کو اشارہ کیا کہ میرا پیچھا مت کرو۔

چینی متانت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر ایک پتھر پر اس کی طرف پشت کر کے بیٹھ گیا۔

فارغ ہوا تو اس نے دیکھا کہ چینی وہیں جمال کی طرف پیٹھ کیے بیٹھا ہے۔ اس نے چکر کاٹ کر دوسرا راستہ لیا اور جا کر اچھو صاحب کو واقعہ سنایا تو ساری پارٹی خوب ہنسی۔ اچھو صاحب نے کہا' وہ چینی تمہیں تنگ نہیں کر رہا تھا۔ اسے اس کھاد کی ضرورت تھی جو تم چٹان کے پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اس پتھریلی زمین میں سبزیاں کھاد کے بغیر نہیں اُگ سکتیں اور کھاد کو وہ چینی ضائع نہیں کر سکتا تھا۔

## سنسان سڑک

سڑک سنسان تھی اور لگتا تھا کہ پارٹی کا سفر کبھی ختم نہ ہوگا۔ اس کے اوپر پہاڑ تھا اور اس کی چھت کے نیچے چلنا پڑتا تھا۔ پہلو میں غصے میں بھرا ہوا دریائے سندھ' ٹھنڈا' تیز رفتار' پتھروں اور چٹانوں سے ٹکراتا ہوا۔ اس میں بڑے بڑے بھنور پڑتے تھے۔ کوئی کشتی اس میں اتر نہ سکتی تھی مگر جمال نے سوچا کہ اگر موقع ملے تو اس میں لکڑی کے تختے پر جسے انگریزی میں ریفٹ کہتے ہیں' گلگت سے نیچے تک کا سفر کرنا چاہیے اور اس سفر کی ڈاکومنٹری فلم بنانی چاہیے۔ واپس آ کر اس نے گلگت کے متعلقہ افسروں کو تجویز بھیجی مگر انہوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ یہ ایک احمقانہ منصوبہ تھا کیونکہ جمال کو تو تیرنا بھی نہ آتا تھا۔ اگر وہ نہ ڈوبنے والی جیکٹ پہن بھی لیتا تو اس کے ریفٹ کو کسی بڑے بھنور کے غار سے بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

جمال یہ بھی سوچتا رہا کہ کیا واقعی مارکو پولو اس راستے سے گزرا تھا؟ ناممکن کیونکہ اس زمانے میں یہ راستہ تھا ہی نہیں۔ دور کیوں جایئے 1947ء میں جب گلگت کے عوام نے مہاراجہ کشمیر سے بغاوت کر کے اس کے گورنر گھنسیا را سنگھ ڈوگرا کو قید کر لیا تو انہوں نے حکومتِ پاکستان کو گلگت کا چارج لینے کے لیے جو ایلچی پاکستان بھیجے وہ چار ماہ میں راولپنڈی پہنچے تھے وہ بھی پہاڑوں اور چٹانوں پر سے کود کر۔ مارکو پولو یہاں سے گزرا ضرور تھا مگر اس کے راستے کا تعین نہیں کیا جا سکتا تھا اور یہ بھی حیرت ناک ہے کہ چین کا ریشم سنکیانگ سے پاکستان' افغانستان اور ایران سے گزرتا ہوا ہنگری تک جاتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہیں نہ کہیں کوئی راستہ ہوگا جس پر اونٹ گھوڑے خچر اور یاک چلتے ہوں گے۔ پتہ نہیں لوگ کیا کھاتے ہوں گے کیونکہ راستے میں سیکڑوں میل لمبے صحرا پڑتے تھے اور آبادی ان میں ہوتی نہ تھی۔

## خوبانیوں کا جنگل

گلگت سے پارٹی نے دریا پار کیا اور ہنزہ کی طرف بڑھی۔ سڑک کے دونوں طرف خوبانی کے درخت بہار پر تھے اور ہر جگہ تھے۔ پکی ہوئی خوبانیاں زمین پر پڑی تھیں جن کو کھانے والا کوئی نہ تھا مگر اور کہیں کوئی دوسرا پھل نظر نہ آتا تھا۔ زمین پتھریلی تھی' کہیں کہیں چار چھ گز کا کوئی ٹکڑا قابلِ کاشت تھا اور اس پر مکئی بوئی ہوئی تھی۔ کتے' بلی' بکری اور مرغ کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ اس کی وجہ جمال کو ہنزہ پہنچ کر معلوم ہوئی۔ بکریاں اور مرغیاں زمین سے دانہ چگ لیتی ہیں' اس لیے انہیں ہنزہ میں کوئی برداشت نہیں کرتا کہ جو تھوڑی



بہت فصل ہو سکتی ہے' اس کے بیج ہی یہ جانور کہیں کھا نہ جائیں۔

ہنزہ کا ریسٹ ہاؤس ایک پہاڑی کے اوپر واقع تھا جس پر چڑھنے کے لیے ایک نہایت چکردار کچی سڑک بنی ہوئی تھی۔ اس پر جیپ ہی چل سکتی تھی اور وہ بھی ہر ڈرائیور کے بس کی بات نہ تھی مگر اچھو صاحب کئی دفعہ یہاں آ چکے تھے اور ان کو اس پہاڑی پر ڈرائیونگ کا تجربہ بھی تھا۔ سڑک ایسی تنگ تھی کہ مخالف سمت سے کوئی جیپ آئے تو راستہ نہ پائے۔

خدا خدا کر کے پارٹی ریسٹ ہاؤس پہنچی تو سوال پیدا ہوا کہ کھانا کہاں سے آئے۔ اچھو صاحب اسی قسم کے حالات سے نمٹنے کے لیے اپنے ساتھ جو تھوڑا بہت پنیر لائے تھے اس پر گزارہ کرنا پڑا۔ چائے ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے بنا دی۔

## سرمئی پانی

چائے پی کر پارٹی ہنزہ کی سیر کو نکلی۔ سامنے سرمئی رنگ کے پانی کا ایک نالہ بہتا تھا جس کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں ہنزہ کے لوگ آباد تھے۔ ڈسپلن اس قدر تھا کہ کوئی شخص سرمئی رنگ کے اس نالے میں اندھیرے میں بھی تھوک نہ سکتا تھا۔ یہ نالہ ہنزہ کی شاہراہ زیست تھا۔ اس کے پانی میں لوہے اور سونے کے ذرات تھے اور اگرچہ لوگوں کو کھانے کو کچھ نہیں ملتا تھا پانی کی تاثیر سے ان کی عمریں لمبی اور زندگیاں صحت مند ہوتی تھیں۔ وہ دبلے پتلے لوگ تھے۔ انہوں نے کبھی دودھ' مکھن' گھی اور گوشت نہ کھایا تھا اور مکئی بھی کبھی کسی کو کم ہی نصیب ہوئی ہوگی۔ چاول اور دالیں ان کے لیے ناقابل تصور اجناس تھیں اور مرغ کسی نے دیکھا ہی نہ تھا۔ یہ بھی سچ تھا کہ ہنزہ کے مرد عورت سو برس کی عمر میں بھی اس قابل ہوتے کہ دوسری تیسری شادی کر سکیں۔

ہنزہ کی ساری زمین ان کے امیر کی ذاتی ملکیت تھی۔ جب کوئی بچہ جوان ہو جاتا تو اسے ایک قطعہ کاشت کے لیے عطا ہو جاتا اور صرف ہنزہ کی بستی ہی میں تھوڑی سی کچی زمین پائی جاتی تھی۔

ہنزہ کے لوگ سال بھر ایک ہی غذا کھاتے۔ صبح اٹھ کر پسی ہوئی خشک خوبانیوں کی چائے کے ساتھ پسی ہوئی خوبانیوں کی روٹی' دوپہر کو بھی ان کا کھانا خوبانیوں کی روٹی اور خوبانیوں کے سالن پر مشتمل ہوتا اور رات کو بھی وہ یہی کچھ کھاتے۔ اس قدر غیر متوازن غذا کے باوجود ان کے جسم صحت مند تھے تو اس کی وجہ نالے کا سرمئی پانی تھا جس کی وہ بڑی حفاظت کرتے تھے۔

عقیدے کے لحاظ سے وہ اسمٰعیلی تھے اور آغا خاں کو اپنا آقا و مولا سمجھتے تھے اور کیوں نہ سمجھتے۔ آغا خاں انہیں ہر سال گرم کپڑے کے ٹرک بھیجتا اور ان کے لیے صحت اور تعلیم کا اہتمام کرتا مگر وہ بہت دکھی لوگ تھے۔ انہیں پاکستانی حکومت سے بڑا گلہ تھا۔ حکومت ان کی کوئی مدد نہ کرتی تھی۔ ان کو نوکری بھی بڑی مشکل سے ملتی تھی۔ وہ اپنا غم غلط کرنے کے لیے خوبانی کی شراب بناتے تھے جسے ہنزہ واٹر کہا جاتا تھا۔ جمال نے بڑی

کوشش کی کہ کہیں سے ہنزہ واٹر کی ایک بوتل مل جائے مگر بات سن کر ہنزہ کے لوگ کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے کہ نہ صاحب ہم نے کبھی ہنزہ واٹر کا نام بھی نہیں سنا۔

اصل بات یہ تھی کہ کچھ ہی دن پہلے ہنزہ پاکستانی انتظامیہ کے قبضے میں آ گیا تھا اور اس کی پہلی (اور آخری) علامت وہاں پر ایک تھانے کا قیام تھا جس میں باوردی سپاہی لوگوں کو غصے بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان کے ڈر سے ہنزہ واٹر غائب ہو گیا تھا کہ پولیس والے ہمیں اس جرم میں دھر لیں گے۔

مگر ابھی وہاں ٹیکس نہ لگے تھے یعنی ابھی حکومت کی کارفرمائی مکمل نہ ہوئی تھی۔

## سفید اور خاکی چیتے

ایک دن ہنزہ میں قیام کے بعد ویگن میں پٹرول کے فالتو ڈبے لے کر پارٹی خنجراب کو چلی۔

خنجراب اب ہنزہ سے ایک دن کا راستہ تھا مگر یہاں چار بجے کے بعد اندھیرا چھا جاتا تھا اور اگرچہ سڑک نہایت عمدہ تھی۔ اس پر چلنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ پارٹی صبح کی چائے پی کر نکل جائے اور ایک گھنٹہ چوٹی پر گزار کر واپس آ جائے۔ پھر جہاں شام آ جائے وہیں تنبو لگا کر رات کاٹ لے۔

راستہ یہاں بھی دریا کے ساتھ چلتا تھا مگر یہ دریائے سندھ نہیں' دریائے ہنزہ کہلاتا تھا۔ اس کا پانی بھی سرمئی تھا یعنی لوہے اور سونے اور دیگر معدنیات سے بھرا ہوا۔

شمالی علاقوں میں نیلم اور زمرد کی کانیں بہت ہیں۔ اگر کوئی حکومت دریائے ہنزہ کا پانی بوتلوں میں بھرے اور پھولوں کو محفوظ کر کے دساور کی منڈیوں میں بیچے تو ان علاقوں کی غربت دور ہو سکتی ہے مگر حکمران طبقے کو ملک اور عوام کی فکر کیوں ہو۔

سڑک پر ٹریفک نہ تھی۔ اس کے باوجود ویگن تیز نہ چل سکی کیونکہ راستے میں موڑ بہت تھے اور پارٹی کو وقت کی تنگی نہ تھی۔

یہاں سڑک ذرا مختلف تھی۔ اس کے ایک طرف تو دریا تھا مگر دوسری طرف واکھان کی پٹی تھی۔ کل بیس میل چوڑی یا اس سے بھی کم۔ اس میں بہت کم لوگ رہتے تھے کیونکہ زمین کاشت کے قابل نہ تھی اور چھوٹی چھوٹی چٹانوں سے اٹی پڑی تھی۔ یہاں صرف ایک جگہ چند جھونپڑیاں دکھائی دیں جن کے پاس پوست کے کچھ پھول چمک رہے تھے۔ یہ زمین کا مختصر سا ٹکڑا علاقے کے لوگوں کی نجی ملکیت تھا۔ تعجب ہے کہ ان علاقوں میں زمین کی اگر کہیں ملکیت تھی تو محض گانے بجانے والوں کی۔

اس پٹی کے پار کا علاقہ ازبکستان تھا۔ انگریزوں نے یہ پٹی جان بوجھ کر افغانستان کو دے دی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ روس اور ہندوستان کی سرحدیں براہ راست ملتی ہوں۔ یہی پٹی آگے جا کر بدخشان کی طرف نکل جاتی تھی جس کے لعل دنیا بھر میں مشہور ہیں۔

ایک روز موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ ہر چیز صاف دکھائی دیتی تھی۔ ویگن نے اچانک ایک موڑ کاٹا تو



ایک چٹان پر اطمینان سے بیٹھے دھوپ تاپتے ہوئے ایک سفید برفانی بلے نے حیران ہو کر گاڑی کی طرف دیکھا مگر اچھو صاحب جو پہلے بھی یہاں کئی مرتبہ آ چکے تھے' بے فکری سے گاڑی چلاتے رہے۔ آگے چلے تو اچانک ایک جگہ فوج کے تین جوانوں نے گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا۔

## فوجی بوٹ

انہوں نے سلیوٹ کیا اور کہا "آپ کو آگے جانے کی اجازت نہیں۔ آپ کو میجر صاحب کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ مہربانی کر کے گاڑی سے اتریئے۔"

اس جگہ کا نام بلی تھا اور یہاں ایک چھوٹی سی چھاؤنی تھی جو کمر کوہ پر واقع تھی۔ ویگن کا راستہ تھا مگر کچا اور پر پیچ۔ سب لوگ کچھ پیدل چلنا بھی چاہتے تھے اس لیے یہ سمجھ کر بے وقوف فوجیوں سے بحث فضول ہو گی سب آگے پیچھے اوپر کو چل دیئے۔

کوئی ایک فرلانگ چل کر وہ ایک مقابلتاً کھلی جگہ پہنچے جہاں پتھروں سے چنی ایک بے ڈھب سی بیرک تھی۔ پارٹی کو وہیں چھوڑ کر ایک جوان اندر گیا اور واپس آ کر کہا "صاحب نے اندر بلایا ہے۔"

سب لوگ اندر چلے گئے۔ آگے ایک لکڑی کی میز پر ایک میجر بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ دو اور افسران۔ بیرک کے دوسرے کونے میں بستر لگے ہوئے تھے۔ کھانے کی میز تھی اور کچھ برتن۔

## یادگار شام

میجر کی آنکھیں خشونت بھری تھیں۔ پارٹی کو دیکھ کر اس نے لکڑی میز پر ماری اور کہا "حرامزادو تم کس کی اجازت سے یہاں سے نکلے جا رہے تھے۔"

جمال کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

اس نے بھی پلٹ کر یہ گالی دینا چاہی مگر اچھو صاحب ایک تجربہ کار افسر تھے۔ انہیں گالی دینی نہ آتی تھی۔ انہوں نے جمال کا ہاتھ دبا کر میجر سے انگریزی میں کہا۔

"میں ڈائریکٹر جنرل ٹورازم ہوں اور یہ جمال صاحب ڈائریکٹر جنرل منسٹری آف کلچر ہیں۔ ہم تفریحی مقامات دیکھنے کے لیے آئے ہیں۔ ہمیں کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں اور آپ کو کوئی حق نہیں کہ آپ حکومتِ پاکستان کے سینئر افسروں سے بازاری زبان میں بات کریں۔"

میجر ذرا سا مسکرایا۔ پھر دھیمی آواز میں بولا "حرامزادو! سور کے بچو! میں نے گزشتہ چار ماہ سے تہذیب کی صورت نہیں دیکھی اور تمہاری بے حسی کا یہ عالم کہ تم مجھے اپنی صورت دکھائے بغیر یہاں سے نکل چلے تھے۔ آؤ ذرا گلے ملو۔"

پھر وہ آگے بڑھا اور اس نے ہر ایک کو سینے سے لگایا۔ پھر بولا "مجھے پتہ ہے کہ تمہیں کئی روز سے کھانے کو کچھ نہیں ملا۔ تم نے ڈبل روٹی اور بسکٹوں پر گزارہ کیا ہو گا۔ میں نے تمہارے لیے یاک کا کٹڑہ ذبح

کروایا ہے۔اس کا گوشت بھن رہا ہے۔روٹیاں بھی پک رہی ہیں۔مجھے چینی مزدوروں نے چاول کی بنی ہوئی شراب کی کچھ بوتلیں دی تھیں۔ان میں سے دو پڑی ہیں۔آؤ سب مل کر چسکی لگائیں کیونکہ میرے لیے یہ ایک یادگار شام ہے۔''

''ہمارے لیے بھی۔'' جمال نے کہا ''ہمیں امید نہ تھی کہ اس ٹھنڈے جنگل میں اتنی گرم جوشی بھی موجود ہوگی۔''

اچھو صاحب کی افسری گردن ڈال دینے پر تیار نہ تھی۔انہوں نے کسی قدر خشک روئی سے کہا ''مگر ہمیں تو آج ہی خنجراب پہنچنا ہے پروگرام کے مطابق۔''

''جناب کے لیے یاک کی کھال کے بستر تیار ہیں۔آج رات آپ کی یہیں کٹے گی۔کل صبح چلے جایئے گا ورنہ آپ کو پتہ ہے کہ پاکستانی جوان نشانہ خطا نہیں کرتے اور آپ کی یہاں موجودگی کا کوئی ثبوت بھی نہیں۔''

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔اچھو صاحب خاموش ہو گئے۔

تھوڑی دیر میں چائے آ گئی۔اس کے ساتھ کچھ بسکٹ اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

بلی سے کوئی پچاس میل کے فاصلے پر خنجراب واقع تھا مگر حکومتِ پاکستان کے فیصلے کے مطابق ان پچاس میلوں میں کسی کو رہنے کی اجازت نہ تھی۔منصوبہ یہ تھا کہ اس ویرانے کو سفید برفانی چیتوں' ہرنوں' یاکوں اور دیگر جنگلی جانوروں کا محفوظ علاقہ بنا دیا جائے تاکہ جس طرح سیاح اور غیر ملکی شکاری کینیا میں جنگلی جانور دیکھنے کے لیے جاتے ہیں یہاں بھی آئیں اور یہاں تو یاک اور سفید برفانی چیتے ملتے ہیں جو افریقہ میں نہیں ملتے۔

خدا جانے یہ خواب پورا ہوا یا ادھورا رہ گیا مگر تھا دلچسپ۔شاہراہ ریشم جو بیسویں صدی کا ایک عظیم واقعہ تھا چلی نہیں۔سنکیانگ سے گلگت تک کچھ چھوٹا موٹا سامان آ جاتا ہے مگر امریکیوں نے اسے شاہراہ تجارت بننے نہیں دیا اور ہمارے لوگ بھی اِدھر کی سیر نہیں کرتے۔

رات پارٹی نے میجر صاحب کی میزبانی میں گزاری۔کئی روز بعد پارٹی کو توے کی پکی ہوئی روٹی اور یاک کے کٹڑے کا بھنا گوشت ملا تو دل باغ باغ ہو گیا۔اچھو صاحب شراب نہیں پیتے تھے مگر جمال نے اس روز جی بھر کر پی۔چاول کی شراب کڑوی بہت تھی مگر نشہ ہلکا دیتی تھی۔

یاک اس علاقے کا ایک عجیب جانور تھا اور اس کی یہاں وہی اہمیت ہے جو ریگستان میں اونٹ کی۔ یہ ایک قسم کا کالا جنگلی بیل ہے جسے سدھایا جا سکتا ہے۔یہ دودھ دیتا ہے۔اس کا گوشت کھایا جاتا ہے اور اسے باربرداری کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔جمال نے پہلی مرتبہ اسے سرینگر کی ترکمان سرائے میں دیکھا تھا جہاں یاک کے نمکین گوشت کے پارچے روٹیوں کی طرح تنور میں پکائے جاتے تھے۔اس کی کھال سے کوٹ



بنائے جاتے ہیں اور بالوں سے کمبل بنتے تھے۔یہ غضب کا جانور ہے' سردی میں خوش رہتا ہے' میدانی علاقوں میں زندہ نہیں رہتا۔

رات کو سب کھا پی کر سوئے تو صبح تک کسی کی آنکھ نہ کھلی۔چائے پی کر پارٹی نے میجر صاحب سے رخصت لی تو وہ بہت اداس ہوئے اور تاکید کی کہ واپسی پر رک جانا۔پھر پوچھا کہ تمہاری گاڑی بھروسے کے قابل ہے یا نہیں۔پٹرول کا کیا حال ہے۔کچھ بسکٹ کے ڈبے انہوں نے دیئے اور پارٹی رخصت ہو گئی۔

خنجراب تک کوئی قابلِ ذکر بات نہ ہوئی۔تھوڑی دور جا کر دریائے ہنزہ الگ ہو گیا اور سڑک آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔

اس روز خوش قسمتی سے مطلع صاف تھا۔

## سرخ رنگ کے چوہے

دھند نہیں تھی اور نرم سنہری دھوپ چمک رہی تھی۔ایسا یہاں شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔سولہ سترہ ہزار کی بلندی پر آکسیجن کم ہو جاتی ہے مگر اس روز کسی کو سانس لینے میں بھی کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی۔

خنجراب ایک سپاٹ مقام تھا۔پاکستان کی طرف سے تو بلندی آہستہ آہستہ کم ہوئی تھی مگر چین کی طرف کا میدان ہموار تھا اور دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہ آتا تھا۔

خنجراب پر کسی درے کا گمان نہ ہوتا تھا۔بس یہ ایک کھلا میدان تھا۔ایک تختے پر لکھا تھا' عوامی جمہوریہ چین' مگر لگتا تھا مدت سے اِدھر کوئی نہیں آیا کیونکہ بورڈ ٹوٹا پڑا تھا۔پاکستان کا یہاں کوئی نشان نہ تھا اور اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔

مگر دیکھنے کو یہاں جو کچھ تھا وہ شاید ہی کسی دوسرے نے دیکھا ہو۔خنجراب کے میدان کی سنہری دھوپ میں قرمزی رنگ کے سیکڑوں چوہے' جن کے بدن کتے برابر اور دُم میں دس بارہ فٹ لمبی تھیں۔انسانوں کی آمد سے لاتعلق پھدکتے پھر رہے تھے۔وہ جنگلی پالک کھاتے اور اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔جمال نے سوچا کہ میں ان کے پاس جاؤں۔اُن کو ہاتھ لگا کے دیکھوں مگر اچھو صاحب نے روک دیا اور کہا ''دیکھتے نہیں ان کے دانت کتنے بڑے بڑے ہیں اور کیا پتہ کہ وہ گوشت خور ہوں اور وہ تم پر ٹوٹ پڑیں۔ان کے قریب جانے کی ضرورت نہیں۔''

جمال مبہوت ہو کر ان چمکیلے سرخ رنگ کے چوہوں کو دیکھتا رہا۔لگتا تھا وہ بھی موسم کی مستی میں باہر نکل آئے ہیں اور دھوپ کا مزہ لے رہے ہیں کیونکہ اتنی اونچائی پر دھوپ کبھی کبھار ہی نکلتی ہے۔

پھر جمال نے اچھو صاحب کے ہاتھ سے دوربین لے لی۔چاروں طرف جنگلی بیل درختوں کے پاس کھڑے تھے۔یاک کے گلے گھومتے تھے مگر چیتا جمال کو کوئی نظر نہ آیا۔

یہ ایک عجیب منظر تھا۔وہاں سے ہٹنے کو جی نہ چاہتا تھا۔کوئی گھنٹہ بھر ٹھہر کر اچھو صاحب نے کہا' دو بج

رہے ہیں اور اب یہاں سے نکل جانا چاہیے کیونکہ یہاں موسم بدلتے دیر نہیں لگتی۔

## واپس چلو

بادل نخواستہ پارٹی وہاں سے مڑی۔ ادھر پچاس میل تک کوئی انسان تھا نا جھونپڑی۔ اگر ویگن بگڑ جاتی تو پتہ نہیں کیا ہو جاتا مگر اچھو صاحب نے بتایا کہ چینیوں کی چوکی خنجراب کی چوٹی سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ہے۔ اگر ادھر سے کوئی چین کی طرف چلے تو اچانک گھوڑوں پر سوار چینی سرحدی فوج کے جوان آ کر پوچھ گچھ کریں گے۔

راستہ وہی تھا۔ اس میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ جمال سوچتا رہا کہ مارکو پولو نے جو بھی راستہ لیا ہوگا۔ خنجراب سے ضرور گزرا ہوگا کیونکہ دور دور تک پہاڑوں میں کوئی اور درہ نہیں تھا اور یہ بھی قرین قیاس ہے کہ وہ دریائے ہنزہ کے کنارے کنارے چلا ہوگا اور ہنزہ سے بھی گزرا ہوگا۔ اس زمانے میں پگڈنڈیاں چلتی ہوں گی جن پر ریشم کے تاجر باقاعدہ سفر کرتے ہوں گے مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ اسی راستے کو استعمال کرتے ہوں۔ مارکو پولو نے اپنے سفر کے مقامات کی تفصیل نہیں بتائی اور بتاتا بھی کیسے جب کہ اس کے زمانے میں کہیں کوئی گاؤں یا بستی تھی ہی نہیں اور غالباً ہنزہ کے باشندے بھی ابھی ایران سے وارد نہ ہوئے تھے۔

## پتھر برسے

چار بجے ہوں گے جب اچانک اندھیرا چھا گیا اور طوفانی ہوا چلنے لگی۔ ایسی تیز کہ پہاڑوں سے بڑے بڑے پتھر اُڑ کر برسنے لگے۔ دو تین ویگن پر آ پڑے اور خطرہ ہوا کہ شیشے ٹوٹ جائیں گے۔ اب سب کو افسوس ہوا کہ ہم راستے میں میجر صاحب کے ہاں کیوں نہ ٹھہر گئے۔ خوش قسمتی سے ایک چھوٹی سی بستی نظر آ گئی۔ یہاں ایک بیرک میں رینجرز مقیم تھے۔ اس بیرک کی اوٹ میں اچھو صاحب نے تنبو لگوا لیا تاکہ پتھروں کی برسات سے بچ سکیں۔ سردی بھی تو بلا کی تھی۔ ہڈیوں میں اُتر رہی تھی اور کھانے کو کچھ نہیں تھا۔

پارٹی بھوکے پیٹ سلیپنگ بیگوں میں دُبک کر پڑ گئی مگر سردی میں بھوک زیادہ ہی لگتی ہے اور ابھی سونے کا وقت بھی نہیں تھا۔

اُدھر ساتھ کی بیرک میں دال پک رہی تھی جس کی خوشبو سے جی پاگل ہو رہا تھا مگر سوال یہ تھا کہ یہ دال ہمیں کیسے ملے۔ مانگنا اچھو صاحب کی افسرانہ تمکنت کی توہین تھا مگر جمال کا ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا۔

اس کی بات سن کر رینجرز کے افسر نے کہا' راشن ہمارے پاس بھی تھوڑا ہی ہے' مگر ہم آپ کو بھوکا نہیں رکھیں گے۔ ہمارا اللہ والی۔

دال کے ساتھ گرم چاول کی سینی آئی تو سبھی لوگ جھپٹ پڑے۔ ایسا مزیدار کھانا زندگی میں پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔ اصل میں کھانا معمولی تھا' مگر حالات نے اسے مزیدار بنا دیا تھا۔



یہاں سے ہنزہ کوئی دو گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ اس لیے چلنے کی کوئی جلدی نہ تھی۔ سب لوگ آرام سے اُٹھے۔ چائے پی اور تنبو لپیٹ کر ویگن میں سوار ہو گئے۔

## اکیلا

آگے پھر ویرانہ تھا۔ گاڑی کی گھر رگھر رسے کان سن ہونے لگے۔ لوگ آپس میں بات چیت بھی نہ کرتے تھے۔

چلتے چلتے پارٹی ایک نسبتاً کھلے میدان میں داخل ہوئی تو دور سے ایک آدمی بھاگتا اور شور مچاتا ہوا نظر آیا۔ ''گاڑی روکو' میری بات سنو۔'' اس نے کہا۔

اچھو صاحب نے گاڑی رُوکی تو وہ آدمی ہانپ رہا تھا۔ اس نے کہا'' آٹھ دن سے اِدھر کوئی نہیں آیا اور اس جھونپڑی میں میری ڈیوٹی ہے۔ میں جہلم کا رہنے والا ہوں۔ میرا خط لے جائیے اور راستے میں کسی ڈاک خانے میں ڈال دیجیے۔ میں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔''

''تمہاری ڈیوٹی کیا ہے؟'' جمال نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔ بس آرڈر ہے۔ ہمیں یہ پوچھنے کی اجازت نہیں کہ ہماری ڈیوٹی کیوں لگائی گئی ہے جب کہ کرنا بھی کچھ نہیں۔ بس میرا خط لے جائیے۔ جب آپ ادھر سے گزر رہے تھے تو میں نے خط لکھا نہیں تھا پھر میں نے لکھ لیا۔ مجھے پتہ تھا کہ آپ واپس آئیں گے۔ دن رات میں آپ کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ شکر ہے کہ آپ رُک گئے ورنہ پتہ نہیں مجھے خط پوسٹ کرنے کے لیے اور کتنا انتظار کرنا پڑتا۔''

واپسی میں پارٹی ہنزہ کے ریسٹ ہاؤس میں رات گزار کر گلگت اور گلگت سے چلاس ہوتی ہوئی واپس اسلام آباد پہنچی تو سب لوگ بہت تھکے ہوئے تھے۔ نور کا برقعہ پہنے ہوئے کے ٹو اور نانگا پربت کا حسن بھلائے نہ بھولتا تھا۔ جمال نے ان کو دیکھ کر ادب سے سلام ہی کیا۔ پتہ نہیں وہ لوگ کس مٹی کے بنے ہوئے ہوتے ہیں جوان پر چڑھتے اور ان کا سکون برباد کرتے ہیں!

## باب 38

جمال کراچی میں تھا جب رات کے بارہ بجے ایک امریکی وائلڈ ویسٹ کی فلم ختم ہوئی تو ٹی وی پر اچانک پریس کانفرنس دکھائی گئی جس میں پیپلز پارٹی کے مولوی نیاز علی کوثر اور وزیر تعلیم اور پی این اے کے پروفیسر غفور اور مفتی محمود نے کہا ''ہمارا بھٹو صاحب سے سمجھوتہ ہو چکا ہے۔ دستخط کل صبح ہو جائیں گے۔''

جمال کو یہ بے وقت کانفرنس دکھانے پر تعجب ہوا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اس وقت اسلام آباد میں کیا ہو رہا ہے۔

کسی کو پتہ نہ تھا سوائے ان چند جرنیلوں کے جو تاریخ میں نقب لگا رہے تھے۔

مگر جماعت اسلامی کے مولوی طفیل محمد کو پتہ تھا۔ اصغر خاں بھی بے خبر نہ تھا۔ نسیم ولی خاں بھی رازداں تھی۔

پاکستان پر ایک قیامت ٹوٹنے والی تھی اور یہ لوگ اس کے معمار تھے۔

جو کچھ ہونے والا تھا اس سے ہنری کسنجر بھی واقف تھے۔ وہ بھٹو صاحب کے مداح تھے مگر مغربی قوموں کی پالیسیاں افراد کو خاطر میں نہیں لاتیں۔

ہوسکتا ہے کہ وہ کسی قدر جذباتی بھی ہوں ورنہ کسنجر صاحب ان سے صاف صاف نہ کہتے کہ ایٹمی پروگرام چھوڑ دو۔ عالم اسلام کی قیادت کے خواب نہ دیکھو ورنہ ہم تمہیں ایک دردناک مثال بنا دیں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب بنگلہ دیش کا زخم کھانے کے بعد بھٹو نے باقی ماندہ پاکستان کا اقتدار سنبھالا تو اسے امریکہ کی حمایت حاصل تھی مگر پھر وہ عالم اسلام کی قیادت کے خواب دیکھنے لگا تھا۔

اسے پتہ تھا کہ عالم اسلام وسائل سے مالا مال ہے۔ عربوں کے تیل کے بغیر مغرب کی صنعت و سرمایہ اندھا' بہرہ اور گونگا ہے۔ پاکستان کے پاس افرادی قوت ہے۔ پھر مصر ہے جو علوم کی بستی ہے۔ لیبیا ہے جس کے سربراہ کے ارادے ستاروں کو چھوتے ہیں۔ فلسطینی مجاہدین ہیں جو نئی دنیا کے نقیب ہیں۔ ملائیشیا اور انڈونیشیا ہے جہاں ربر کے جنگل مہکتے ہیں۔ اگر ان وسائل کے باوجود عالم اسلام خوار و خستہ ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو صحیح قیادت نہیں ملی۔ بھٹو صاحب نے ان کے راستے روشن کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اسلامی کانفرنس میں جو فیصلے



پاکستان اور مصر نئی اسلامی دنیا کے مراکز قرار پائے تھے۔ تمام اسلامی ممالک کے لیے جدید سائنس فاؤنڈیشن کا قیام اور جدید صنعت کے فروغ کے لیے امیر عرب ممالک نے فنڈز مہیا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

یہ ایک خطرناک پروگرام تھا۔ چل نکلتا تو عالم اسلامی مغربی استعمار کے پنجے سے نکل جاتا اور یورپ اور امریکہ سردی سے اکڑے ہوئے مردے بن جاتے۔

امریکہ نے بھٹو کو نظروں میں رکھ لیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے شاہ فیصل قتل کر دیئے گئے جنہوں نے مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کرنے کی قسم کھائی تھی۔

دیگر عرب امراء امریکہ کی دھونس میں آ گئے۔ نہ کسی نے پیسہ دیا اور نہ کوئی آگے بڑھا۔

بھٹو نے توازن قائم کرنے کی کوشش میں سوشلسٹ ملکوں سے تعلقات بڑھا لیے۔

بھٹو نے کہا کہ اگر میری قوم کو گھاس کھا کر گزارہ کرنا پڑے تو بھی پاکستان ایٹم بم بنا کر چھوڑے گا کیونکہ ہندوستان تو دھماکہ کر ہی چکا ہے۔ وہ ہندوستان سے دبنا نہیں چاہتا تھا۔ بھٹو ایٹمی ٹیکنالوجی سے پاکستان کے تخلیقی جوہر کو چمکانا چاہتا تھا۔ وہ عالم اسلام اور تیسری دنیا کو بتانا چاہتا تھا کہ ہم نااہل نہیں۔ تاریخ کی چوٹ کھائے ہوئے ہیں۔

### وقت سے پہلے انتخابات

وقت سے پہلے انتخابات کرانے کا فیصلہ بھٹو نے خود کیا تھا یا یہ اس کی تقدیر کی تحریر تھی، کہا نہیں جا سکتا۔ بظاہر یہ فیصلہ خفیہ تھا مگر سی آئی اے سے راز نہ رہ سکا جس کی کٹھ پتلیاں بھٹو کی آئی ایس آئی اور اس کی کیبنٹ کے اندر ناچتی تھیں۔

سی آئی اے نے برسراقتدار جرنیلوں کو ساتھ ملا لیا۔ پروگرام یہ تھا کہ اگر پاکستان نیشنل الائنس کو انتخابات میں شکست ہوگئی تو وہ تحریک چلائے گا جس کے نتیجے میں جرنیل شب خون مار کر بھٹو کا تختہ الٹ دیں گے۔

اس کا مرکزی کردار ایک دیندار جنرل ضیاء الحق تھا۔ اللہ کے نور سے جس کا چہرہ درخشاں تھا۔

اس نے دو برس قبل اردن میں فلسطینی عورتوں اور بچوں کے کیمپ پر ایسی شدید گولہ باری کی تھی کہ اس کی بھاری توپوں کی نالیاں سرخ ہوگئیں۔ اس نمازی نے کیمپ کا پانی بند کر دیا تھا۔ حسین کی روح کانپ گئی ہوگی جب کیمپ میں ماؤں نے اپنے شیر خواروں کے حلق میں پیشاب کے قطرے ٹپکائے تاکہ ان کے سانسوں کی ڈوری چلتی رہے۔

اس میں اور بھی خصوصیات تھیں۔ اس کی مسکراہٹ دلفریب اور گفتار من موہنی تھی۔ وہ قانون کی حکمرانی کا علمبردار تھا۔ قواعد پر سختی سے عمل کرتا تھا اور بڑوں سے جھک کر ملتا تھا۔ بھٹو ایک خوشامد پسند جاگیردار تھا اور یوں آگ اور پانی کا ملاپ ہوگیا۔ اس نے سوچا کہ یہ نمازی' پرہیزگار آدمی ہے۔ میرے حکم پر چلے گا۔

امریکہ نے تاڑ لیا کہ یہ کام کا آدمی ہے

بھٹو نے اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ جب ٹکا خان نے اس فوجی ٹربیونل کی صدارت کے لیے اس کا نام لیا جس میں بھٹو کا تختہ الٹنے کے الزام میں فوجی افسروں کے ایک گروہ کے خلاف مقدمہ زیر سماعت تھا۔

ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی کی سفارش پر اسے کمانڈر انچیف کر دیا تھا جو خود سی آئی اے کا آدمی تھا۔

اس زمانے میں ضیاء الحق کی نظریں بھٹو کے بوٹوں سے اوپر نہ اٹھتی تھیں اور اس کی یہی ادا وڈیرے کی تقدیر بن گئی۔

کسی کو پتہ نہ تھا کہ یہ نمازی پرہیزگار شخص بھٹو کو پھانسی پر لٹکائے گا اور پاکستان کو ایسے گڑھے میں پھینکے گا جہاں سے وہ برس ہا برس تک نکل نہ سکے۔

## ناہموار زمین

بھٹو نے اپنی طاقت کے زعم میں مولویوں، سرمایہ داروں، صنعتکاروں، افسروں اور سیاستدانوں کو ناراض کر لیا تھا۔ بلوچستان میں طویل فوج کشی کے نتیجے میں سردار اس کے خون کے پیاسے تھے۔ بلوچستان اور سرحد کی منتخب حکومتیں بلاجواز ختم ہو چکی تھیں۔ سندھ اور پنجاب میں بے چینی تھی۔ پارٹی میں غنڈے گھس آئے تھے اور پولیس سے ان کا اتحاد پختہ ہو چکا تھا۔

بھٹو صاحب خوشامدیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ انٹیلی جنس ایجنسیاں سی آئی اے کے اشارے پر انہیں غلط مشورے دیتی تھیں۔

پاکستان میں پارلیمنٹ کے ممبر، حکومت کے سیکریٹری، معتبر اخبار نویس اور مالکان، علمائے کرام، جج اور جنرلز سب سی آئی اے کی زلف کے گرہ گیر کے اسیر ہوتے ہیں مگر انٹیلی جنس اور پولیس افسروں پر اس کی توجہ خصوصی ہوتی ہے۔

ضیاء الحق ایک نیم خواندہ شخص تھا مگر اپنی سنگدلی کی وجہ سے سی آئی اے کے معیار پر پورا اترتا تھا۔ پاکستان میں پولیس اور فوج کی اہمیت بہت تھی کیونکہ پاکستان کا وزیراعظم ان پر بھروسہ بہت زیادہ کرتا تھا۔

ایک اور محکمہ سی آئی اے کا گھونسلا ہے اور وہ تھا امورِ خارجہ کا محکمہ۔ اس محکمے میں چند ہی ایسے افسر ہوں گے جو غیر ملکی امور میں اپنی حکومت کو خبردار کرنے سے پہلے سی آئی اے کو مطلع نہ کرتے ہوں اور اس سے ہدایات نہ لیتے ہوں۔ ان حالات میں بھٹو کی حیثیت ایک ایسے دیو کی تھی جس کی ٹانگیں مٹی کی ہوں۔ سی آئی اے کے لیے اس جن کی گردن مروڑنا بہت آسان تھا کیونکہ موت کے اندھے کنویں میں اترنے کی سیڑھیاں بھٹو کے دفتر میں سے نکلتی تھیں۔

## تخت یا تختہ

بھٹو نے مصالحت کی بڑی کوشش کی اور بالآخر سیاستدانوں سے سمجھوتہ ہو گیا۔ جس کی فلم جمال نے کراچی میں دیکھی تھی۔ موقع ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر سی آئی اے نے ضیاء الحق کو آگے بڑھایا کہ صبح ہونے سے پہلے بھٹو کا تختہ الٹ دو۔ پارٹی مردہ ہو چکی ہے اور بھٹو نے اپنے بائیں بازو کے ساتھی بار کر بھگا دیے تھے۔



بھٹو کو فوج اور پولیس پر بڑا مان تھا مگر اب وہی اس کی جان کے درپے تھے۔

## لمبے خنجروں کی رات

پریس کانفرنس کی فلم دیکھ کر جمال سو گیا۔ صبح اٹھا تو گلی میں شور مچ رہا تھا کہ مارشل لاء لگ گیا ہے۔

رات کو کس وقت کیا ہوا اور کس نے کیا کردار ادا کیا صحیح طور پر کسی کو بھی معلوم نہیں۔

جنرل ضیاء الحق اور جنرل فیض علی چشتی کو اس شب خون میں اپنے رول کا علم ہوگا اور دونوں نے بعد میں اشاروں اشاروں میں کچھ بتایا بھی اور کچھ چھپایا بھی مگر پوری حقیقت سامنے نہیں آئی۔

ضیاء الحق نے کہا کہ چونکہ غلام مصطفیٰ کھر نے خانہ جنگی کی دھمکی دی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ دونوں فریقوں کو یعنی اسلامی جمہوری اتحاد اور پاکستان پیپلز پارٹی کو ایک دوسرے سے ہٹا دیا جائے اور ملک کو بچا لیا جائے۔

یہ فیصلہ اس نے اسی روز کیا تھا جس روز نوابزادہ نصراللہ نے ٹی وی کی پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ ہمارا سمجھوتہ ہو چکا ہے۔

آدھی رات گئے پریس کانفرنس دکھانے کی وجہ یہ تھی کہ بھٹو کو اپنے جرنیلوں کے ارادوں کی بھنک پڑ چکی تھی۔

ضیاء الحق کے بیان کے مطابق نوابزادہ نے کہا تھا کہ ہمارا سمجھوتہ نہیں ہوا۔ نوابزادہ کا بیان شب خون کی صبح کے اخبارات میں چھپ چکا تھا جس کے مطابق سمجھوتہ ہو چکا تھا، جرنیلوں نے جھوٹ بولا تھا۔

جنرل فیض علی چشتی نے بعد میں کہا کہ میں تو نوکری کر رہا تھا، مجھے جو حکم ملا، میں نے اس پر عمل کیا۔

## منظر نامہ

فوجی رسالہ جسے پرائم منسٹر کے گھر کے گرد گھیرا ڈالنے کا مشن سونپا گیا تھا، تیار ہے۔ جنرل ضیاء الحق فوج کے کنٹرول روم میں موجود ہے۔ بندوقیں بھری جا چکی ہیں۔ لشکری حکم کے منتظر ہیں!

## دوسرا منظر

وزیراعظم اپنے گھر کے لان میں ممتاز بھٹو اور حفیظ پیرزادہ کے ساتھ مصروفِ گفتگو ہے۔ حفیظ پیرزادہ بھٹو کو مبارکباد دیتا ہے کہ اسلامی جمہوری اتحاد سے مذاکرات کامیاب ہوئے۔ ممتاز بھٹو حفیظ پیرزادہ کی سادگی کا مذاق اڑاتا ہے۔ پرائم منسٹر کہتا ہے، اس کی سادگی کو سکھر بیراج پر دھلنا چاہیے۔

"جب دریا چڑھاؤ پر ہو۔" ممتاز بھٹو نے کہا۔

ذوالفقار علی بھٹو اور ممتاز بھٹو کو حالات کی گرانی کا علم تھا۔ وہ بات کو ہنسی مذاق میں اڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں پیرزادہ اور ممتاز رخصت ہو گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو وہیں بیٹھا رہا۔ غالباً وہ واقعات کا منتظر تھا۔

## تیسرا منظر

پرائم منسٹرز ہاؤس کا ٹیلی فون ایکسچینج خاموش کر دیا گیا ہے اور اس پر فوج نے قبضہ کر لیا ہے۔

## چوتھا منظر

رات کے دو بج رہے ہیں۔فوجی کمانڈو بھٹو کے پاس آ کر سیلوٹ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ سر آپ کو چیف آف جنرل سٹاف کے حکم پر حراست میں لیا جاتا ہے۔بھٹو پرسکون رہتا ہے۔

## پانچواں منظر

رات کے سوا دو بجے جنرل ضیاء الحق ٹیلی فون پر بھٹو سے بات کرتا ہے ''سر میں نے ملک کو بچانے کے خیال سے یہ اقدام کیا۔ نئے انتخابات نوے دن کے اندر کروا دیئے جائیں گے اور سر جیت آپ ہی کی ہوگی اور میں آپ کو پھر سیلوٹ کروں گا۔''

اس کا لہجہ خوشگوار اور دوستانہ ہے۔

پھر کہتا ہے ''سر ہم آپ کو پوچھنے پر گرفتار کر لیں گے۔''

ٹیلی فون بند۔

## چھٹا منظر

بھٹو صاحب اپنے خاندان کو جگاتے ہیں اور سب کے ساتھ کافی پیتے ہیں۔کسی کو یہ گمان نہیں کہ یہ خاندان کا آخری اجتماع ہے۔

فوجی کمانڈر مع گارڈ دروازے پر کھڑا ہے۔

## ساتواں منظر

رات کے تین بجے......

بھٹو صاحب کو فوجی گاڑی میں جی ایچ کیو لے جایا جاتا ہے۔آگے انہیں مری جانا ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے دیگر لیڈر وزیر پکڑے جا چکے ہیں مگر اسلامی جمہوری اتحاد کے رہنما بھی چھوڑے نہیں گئے۔

جرنیل جانبداری یا تعصب کا شک پڑنے نہیں دینا چاہتا۔

## آٹھواں منظر

ایک فوجی افسر راولپنڈی کے ریڈیو سٹیشن کی طرف بھاگتا ہے۔خبریں پڑھی جا رہی ہیں۔نیوز ریڈر کے ہاتھ میں پڑھنے کے لیے ایک کاغذ پکڑا دیا جاتا ہے۔افسر کے ہاتھ میں پستول ہے اور انگلی لبلبی پر۔

## نواں منظر

دن نکل آیا۔کیا واقعی؟

اس ڈرامے کی کوئی تفصیل اخبار میں نہیں چھپی اور عدالت میں بھی بیان نہیں ہوئی۔

اور اب تو اس ڈرامے کے تمام ایکٹر مر چکے ہیں۔بھٹو کو پھانسی ملی۔ضیاء الحق کا جہاز گرا اور جسٹس



مولوی مشتاق آخری سال گھر میں مقید رہ کر مرا تو اس کے جنازے پر شہد کی مکھیاں ٹوٹ پڑیں۔

سپریم کورٹ کے جسٹس انوار الحق کو عالمی عدالت انصاف کی رکنیت نہ ملی اور وہ مرا تو ایک آنسو بھی نہ ٹپکا۔

جنرل فیض علی چشتی نے کہا' میں اس رات راولپنڈی میں موجود ہی نہیں تھا۔ میں تو گلگت کے دورے پر تھا۔

اب کوئی عدالت اس مقدمے کا حوالہ نہیں دیتی۔کوئی وکیل کسی مقدمے میں اس کو نظیر نہیں بناتا۔

نوابزادہ نصر اللہ خاں' مولوی طفیل محمد' ایئر مارشل اصغر خاں' بیگم نسیم ولی خاں اور پی این اے کے دیگر اتحادی گونگے ہو گئے ہیں' کوئی بات نہیں کرتا۔

مگر سازش کا علم سب کو نہیں تھا اور ڈالر بھی صرف میاں طفیل محمد کو ملے تھے۔جنوری اور مئی کے دوران!

جرنیل نے نوے روز میں الیکشن کروانے کی بجائے بھٹو پر نواب محمد خاں کے قتل کا مقدمہ چلوا دیا۔

بھٹو کے ذاتی لشکر ایف ایس ایف کا سربراہ جس نے یہ قتل کروایا تھا' وعدہ معاف گواہ بن گیا اور کہا کہ میں نے قتل بھٹو کے کہنے پر کروایا تھا۔

اس نے اس سے پہلے ڈھاکہ میں بنگالیوں پر زبان کے مسئلے پر گولی چلوائی تھی۔وہ ایک مجرم شخص تھا اور یہی سوچ کر بھٹو نے اسے منتخب کیا تھا۔اس کا خیال تھا کہ یہ شخص میرے سیاسی دشمنوں کی گردن بے دریغ کاٹے گا اور وڈیرے اسی لیے غنڈے اور قاتل پالتے ہیں۔

مقدمہ چیف جسٹس مولوی مشتاق کے سپرد ہوا جس کی بھٹو نے ترقی روکی تھی اور وہ اس کی جان کا دشمن تھا۔بھٹو کی رہائی کے لیے پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے اپنے طور پر شور شرابہ کیا' کوڑے کھائے' جیلیں کاٹیں اور آٹھ آدمی جل کر مرے مگر ضیاء الحق ایک مذہبی آدمی تھا اور مذہبی آدمی اس وقت بہت تشدد پسند ہوتے ہیں جب وہ دنیا کی گدی پر سوار ہو جائیں۔

## کیا تمہارا کوئی سیاسی پس منظر ہے؟

جنرل ضیاء الحق کی دہشت نے اسلام آباد کو گھیرے میں لے لیا اور وہ افسر جو بار بار پیپلز گورنمنٹ کے نعرے لگاتے تھے' اب ڈھونڈ ڈھونڈ کر بھٹو کے عیب نکالنے لگے۔اسی زمانے میں وزارتِ تعلیم نے ایک سرکلر کے ذریعے ہر افسر سے پوچھا کہ کیا تمہارا کوئی سیاسی پس منظر ہے؟

جمال نے لکھ دیا کہ جی ہاں۔میرا سیاسی پس منظر ہے۔میں بھٹو صاحب کے اخبار کا اداریہ نویس تھا اور سوشلسٹ ہوں۔

یہ جواب پا کر وزارت کو لرزے کا بخار چڑھ گیا۔یہ کون ہے جو کہتا ہے کہ میں سوشلسٹ ہوں۔

ڈپٹی سیکرٹری ایڈمنسٹریشن نے جمال کو فون کیا کہ پاگل ہو گئے ہو۔یہ ملک اسلام کے نام پر بنا تھا اور تم کہتے ہو کہ میں سوشلسٹ ہوں!

’’یہ ملک مسلم اکثریت کے نام سے بھی بنا تھا۔‘‘ جمال نے کہا۔

ڈپٹی سیکریٹری بولا: ’’کیوں اپنی جان کے دشمن ہو رہے ہو۔ جانتے نہیں کہ یہ اور دور ہے۔ یہاں نظام مصطفیٰ کی آمد آمد ہے۔‘‘

’’جانتا ہوں اور میں سوشلسٹ واقعی ہوں۔ میری تحریریں اس کی گواہ ہیں۔ میں سیاسی آدمی ہوں۔‘‘ جمال نے جواب دیا۔

ڈپٹی سیکریٹری بولا ’’تو تم نوکری سے جاؤ گے اور شاید جیل بھی۔ بھائی یہ سب کچھ لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ کہہ دیتے کہ میرا کوئی سیاسی پس منظر نہیں۔ میں تمہارا جواب فائل کر دیتا۔‘‘

’’میں اصل میں نوکری کے قابل ہی نہیں۔‘‘ جمال نے کہا ’’پانچ برس میں میرا محکمہ نہیں بنا۔ پانچ سال مجھے سالانہ ترقی بھی نہیں ملی۔ تم لوگ مجھ سے خوش بھی نہیں ہو اور آگے بھی کوئی امید نہیں۔ مجھے جانے ہی دو۔ میں پھر کسی اخبار میں بھاڑ جھونک لوں گا۔‘‘

جمال کو ایک مہینے کا نوٹس مل گیا۔ ساتھ ہی دوسرے محکمے کا داؤ چل گیا۔ جو فلموں کی تجارت کا ذمہ دار تھا۔ اب فیصلہ ہوا کہ جمال کے محکمے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیوں نہ اس کو ختم کر کے اخراجات بچائے جائیں۔

محکمہ ختم

اس محکمے کا انچارج وہ دلفریب شہزادہ جواب جمال پر بہت مہربان تھا اپنی آزاد طبیعت کی وجہ سے پہلے ہی نکالا جا چکا تھا۔ قدرت اللہ صاحب گھر بیٹھے اللہ اللہ کرتے تھے۔ انہوں نے جمال کی نوکری بچانے کی بہت کوشش کی مگر وہ کچھ نہ کر سکے۔

اس ایک مہینے میں جمال کے کرنے کے بہت کام تھے۔ اسے اپنی تو کوئی فکر نہ تھی۔ یہ خیال تھا کہ میرے عملے کے بتیس آدمی کہاں جائیں گے کیونکہ محکموں میں چھانٹی ہو رہی ہے اور ان کو نوکری کوئی نہ دے گا۔

اس نے اس ایک مہینے میں دوسرے محکموں کے دوست سربراہوں کو ذاتی درخواستیں کر کے ان میں سے بیشتر کو کام پر لگوا دیا مگر سب کے لیے جگہ نہ نکل سکی اور وہ بیچارے آہیں بھرتے اور اس کے کمرے میں بیٹھے دعائیں مانگتے رہے۔

جمال نے ایڈمنسٹریشن کو ایک آخری سرکاری خط لکھا جس میں استدعا کی کہ منسٹری میں چھوٹے عملے کی بہت سی جگہیں خالی ہوں گی، ان کو میرے عملے سے بھر لیا جائے۔

اور اس درخواست پر غور کرنے کے لیے حکم آیا کہ وزارتِ تعلیم کے علاوہ وزارتِ خزانہ، وزارتِ داخلہ اور کچھ ذیلی دفاتر کے سربراہ میٹنگ کریں گے اور اپنے اپنے محکموں کی سٹاف پوزیشن پر غور کریں گے۔ مزید برآں یہ میٹنگ فلاں تاریخ کو مری میں ہوگی۔



# باب 39

جمال آخری رسومات کے لیے صبح سویرے ہی مری پہنچ گیا۔ میٹنگ کے لیے شام پانچ بجے کا وقت مقرر تھا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی مگر چبھتی نہ تھی۔ جلدی میں کچھ کھا کے وہ سڑک پر نکل آیا۔ ڈاک خانے کے ارد گرد لوگوں کی چہل پہل تھی۔ زیادہ تر مڈل کلاس کے امیر لوگ اب مری کی بجائے بھوربن اور دیگر قصبات کو جانے لگے تھے۔ جہاں ٹھنڈ ذرا زیادہ ہوتی ہے اور تنہائی بھی۔

یہاں کے گھنے جنگلوں میں پاکستان کے امیر تاجر، جاگیردار اور بڑے افسر بال بچوں یا بہوؤں بہنوں کے ہمراہ سیر کرتے اور کھاتے پیتے تھے۔ بعض بانکی ترچھی محبوبائیں ساتھ لاتے اور ان کے ساتھ رنگ کھیلتے تھے مگر مری میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ یہاں بھیڑ بہت ہوتی تھی اور دور دور سے بھکاری بھی گرمیاں کاٹنے کے لیے آتے تھے۔

جمال کچھ دیر اکیلا ڈاک خانے کے پاس کھڑا رہا۔ پھر اس کو خیال آیا کہ مری شہر کے نیچے گھاٹی میں اور کھڈ کی طرف جو مقامی لوگ رہتے ہیں ان کی بود و باش بھی دیکھنی چاہیے۔ ان کے مرد روایتی پگڑیاں پہنے ہوئے اوپر آتے تھے۔ مری کے سیاحوں نے ان کی زندگیوں پر کوئی اثر نہ ڈالا تھا۔

فتح پنجاب کے بعد جب انگریزوں نے نادرن کمان کے ہیڈ کوارٹر کے لیے مری کو منتخب کیا تھا تو یہ ایک سنسان ٹیلہ تھا جس پر کچھ پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہاں ایک قبیلہ آباد تھا جس کے پاس وسائل زیست نہیں تھے۔ ابھی کشمیر کی سڑک بھی اِدھر سے گزری نہ تھی اور آتا جاتا بھی کوئی نہ تھا۔

انگریز افسر نے قبیلے کے سردار سے ٹیلے کی قیمت پوچھی تو اس نے کہا پچاس روپے دے دو اور ہمارے قبیلے کو رہائش کے لیے کوئی ایسی جگہ دے دو جہاں زمین ہموار اور پانی وافر ہو۔

جب انگریز افسر نے پچاس روپے دے کر کاغذ پر دستخط کروا لیے تو بابا رنگے نے (یہی نام قبیلے کے سردار کا بتایا جاتا ہے) دس روپے اسے واپس کر دیئے اور کہا ’’تمہاری بیوی کی ٹانگیں ننگی ہیں۔ تم بہت غریب ہو۔ ان دس روپوں میں اس کی حیا ڈھک جائے گی۔‘‘

## کھڈ میں اُترا

جمال کے دل میں آئی کہ قبیلے کے جو افراد باقی رہ گئے ہوں گے وہ ہی کھڈ کی ڈھلان پر رہتے ہوں گے مگر نیچے جانے کا کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیاں نیچے اترتی تھیں' جن پر اکا دکا مقامی لوگ چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔

پگڈنڈیاں کچی مٹی کی تھیں جن کے نیچے اترنا کافی دقت طلب معاملہ تھا۔ پکے گھر اور کوٹھیاں اوپر ہی رہ گئے تھے' سو دو سو گز نیچے اتر کر چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں اور کچے پکے مکان تھے جن میں عورتیں' بچے زندگی گزارتے تھے۔ جب جمال ادھر سے گزرا تو انہوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا کیونکہ سیاح نیچے کی طرف کبھی جاتے نہ تھے۔

جمال کھائیوں گھاٹیوں میں سے اترتا' پتھروں پر سے کودتا' سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھتا قدم بقدم نیچے اترتا گیا۔

وہ چھوٹی سی ندی جو کھڈ میں بہتی تھی' اسے نظر آنے لگی اوپر سے وہ ایک پتلی سی لکیر کی طرح دکھائی دیتی تھی مگر جوں جوں جمال اس کے قریب پہنچتا گیا اس کا شفاف اور تیز پانی واضح ہوتا گیا۔ اس کے اردگرد بہت کم لوگ آباد تھے اور غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں دھوپ اور روشنی بہت کم پہنچتی تھی۔ ندی کے کناروں پر عورتیں کپڑے دھونے میں مصروف تھیں یا بچے نہلا رہی تھیں۔ انہوں نے جمال کو اپنی طرف آتے ہوئے بڑی حیرت سے دیکھا اور پھر اوڑھنیوں سے چہرے لپیٹ لیے۔

جمال ندی تک نہیں گیا تا کہ عورتوں کو پریشانی نہ ہو۔ وہ کچھ دیر کے لیے ایک صاف پتھر پر بیٹھ گیا۔
ابھی دن کا ایک ہی بجا تھا اور میٹنگ میں اسے پانچ بجے پہنچنا تھا۔

تنہا بیٹھ کر بھی اسے کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ اس نے اسلام آباد سے واپسی کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔ اس کے بیوی بچے بھی بے یقینی کی زندگی کے عادی ہو چکے تھے۔ اسلام آباد کی کوٹھی' کار نے ان کا دماغ خراب نہ کیا تھا۔ جمال ذہنی طور پر پانچ برس میں بھی افسر نہ بن سکا تھا۔ وہ اپنی اصلیت کو کبھی بھولا نہ تھا۔
اس نے پچھلے پانچ سال پر ایک نظر ڈالی اور سوچا قدرت اللہ صاحب ٹھیک کہتے تھے' بھٹو صاحب کچھ بھی نہ کر سکے تھے اور جمال نے بھی بیکار ہی فائلیں بھری تھیں اور اب اسے چند دنوں کے اندر اندر واپس لاہور جانا ہی ہوگا جہاں نہ اس کے رہنے کو گھر ہے اور نہ کوئی ذریعہ آمدنی۔

پانچ سال کی غیر حاضری میں لاہور اسے بھول چکا تھا اور اس کو پتہ نہیں تھا کہ میں واپس جا کر کس طرح زندگی شروع کروں گا۔ کچھ پیسے اس کی جیب میں تھے جو قدرت اللہ صاحب نے قائداعظم پر اس کی فلم کے سلسلے میں بطور اعزازیہ دلوا دیئے تھے کیونکہ فلم بنانا اس کی ڈیوٹی میں شامل نہ تھا اور اس قسم کی باریکیاں بڑے افسر ہی جانتے ہیں۔ چنانچہ یہ خیال اس کے لیے بہت تسلی بخش تھا کہ فوری طور پر مجھے روٹی کی تکلیف نہ ہوگی۔



## روشنی غائب

وہ انہی خیالوں میں محو تھا کہ اچانک اندھیرا چھا گیا جیسے رات اتر آئی ہو۔ شمال کی طرف سے ایک گھنی کالی گھٹا نے اٹھ کر سورج کو چھپا لیا تھا اور دن کی روشنی غائب ہو گئی تھی۔
عورتوں نے جلدی جلدی اپنے گیلے کپڑے سمیٹے۔ بچوں کو بانہوں سے پکڑا اور گھسیٹتی ہوئی گھروں کو بھاگیں۔
بجلی چمکنے لگی' بادل گرجنے لگے۔ درختوں میں ہوا سنسنانے لگی۔ جمال کو یہ منظر بہت عمدہ لگا۔ پھر ٹھنڈی ہوا چلی۔ جمال کو یکدم سردی لگنے لگی کیونکہ وہ محض ایک قمیص پہن کر نیچے اترا تھا۔ پھر بارش شروع ہو گئی۔ اب جمال گھبرایا۔ پگڈنڈیاں بارش کے زور میں نظروں سے غائب ہونے لگیں اور چکنی مٹی پر پاؤں پھسلنے لگے۔ اس کے لیے واپسی کا سفر نہایت دشوار ہو گیا۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔
یکدم اسے چھینکیں آئیں' ناک سے پانی بہنے لگا اور سر میں درد ہونے لگا۔ اس کے ننگے سر پر بارش کے ٹھنڈے قطرے نیزوں کی طرح چبھنے لگے مگر اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح اوپر کی طرف چلتا رہوں۔ کئی مرتبہ وہ پھسلا اور گرا مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ ہمت ہارنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔
لگتا تھا مری کا بازار اور ڈاک خانہ میلوں دور ہو گیا ہے اور طوفان راستہ روکے کھڑا ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ میرا اوپر پہنچنا مشکل ہے۔ اگر راستے میں کہیں کوئی جگہ ملے تو میں بارش رکنے کا انتظار کر لوں مگر جھونپڑے اور کوٹھڑیاں اندر سے بند تھیں اور جمال میں یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ کوئی دروازہ کھلوائے۔
تھوڑی دور کوئی پچاس گز کے فاصلے پر اسے ایک چھوٹی سی کوٹھی نظر آئی جس کے باہر برآمدہ تھا اور اس میں کوئی مکین نظر نہ آتا تھا۔ لشتم پشتم جمال اس برآمدے تک پہنچا اور اس کے اندر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔
بارش کی شدت اس قدر تھی کہ دس گز کے آگے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ جمال کو یکدم کھانسی کے غوطے آنے لگے۔ وہ تھک گیا تھا مگر وہاں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ نڈھال ہو کر وہ فرش پر گر گیا۔
بارش کا زور ٹوٹتا ہی نہ تھا۔ بجلیاں چمک چمک کر گر رہی تھیں۔ بادل کڑک کے مار رہے تھے اور کہیں کوئی ذی روح نظر نہ آتا تھا۔ سردی سے جمال کا برا حال تھا۔ اسے کپکپی لگ گئی۔ دانت بجنے لگے مگر یہی غنیمت تھا کہ اس خالی کوٹھی کے برآمدے میں اسے جگہ مل گئی اور وہ مزید بھیگنے سے بچ گیا تھا۔
''پتہ نہیں یہ کوٹھی کس کی ہے اور خالی کیوں پڑی ہے؟'' اس نے سوچا ''جس کی بھی ہے خدا اس کا بھلا کرے۔''
دیوار سے ٹیک لگا کے وہ بیٹھا آسمان کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک اندر کمرے میں بجلی جل گئی۔
اس کا مطلب تھا کہ کوٹھی خالی نہیں۔ اس میں کوئی رہتا ہے۔ کون رہتا ہے؟ کیا وہ اسے کچھ دیر کے لیے بیٹھا رہنے دے گا؟

سردی کی وجہ سے جمال اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا' پھر اچانک اسے محسوس ہوا کہ بند دروازے کے شیشوں میں سے کوئی مجھے دیکھ رہا ہے مگر یہ ہمت اس میں نہ ہوئی کہ وہ ادھر نظر ڈالے۔

تھوڑی دیر اور گزر گئی۔

پھر دروازہ آہستہ سے کھلا اور پہاڑی بچی نے اسے کندھے سے ہلا کر کہا ''بیگم صاحبہ کہتی ہیں سردی بہت ہے آپ گرم چائے پی لیں۔''

جمال نے چائے کی پیالی پکڑی تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ انتہائی ممنون تھا اور اس نے کہا ''اپنی بیگم صاحبہ سے میرا اسلام کہنا اور بتانا کہ بارش تھمتے ہی میں چلا جاؤں گا۔''

جمال نے گرم گرم چائے پی تو اس کی جان میں جان آ گئی۔ اس نے سوچا اللہ بڑا مہربان ہے۔ وہ ہم جیسے گرے پڑوں کا ہر جگہ خیال رکھتا ہے مگر یہ بیگم صاحبہ کون ہیں اور یہاں کیوں رہتی ہیں۔ یہ خیال اسے پریشان کرنے لگا۔

## چترالی چغہ

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ پھر کھلا اور اسی پہاڑی بچی نے کہا ''ہوا بہت ٹھنڈی ہے۔ آپ یہ چغہ پہن لیں۔ بیگم صاحبہ کہتی ہیں۔''

وہ ایک چترالی چغہ اس پر پھینک کر چلی گئی۔ جمال شکریہ بھی ادا نہ کر سکا۔ اس چغے کے باوجود اس کی سردی کم نہ ہوئی۔ ٹھنڈی ہوا اس کے جسم کو چیرتی رہی۔ بارش کا زور اسی طرح تھا اور بادل گرج گرج کر پاگل ہو رہے تھے۔ چھینکوں سے جمال کا دماغ خالی ہو گیا۔ سر درد سے کنپٹیاں دھک دھک کرنے لگیں۔

تھوڑی دیر میں دروازہ پھر کھلا اور وہی پہاڑی بچی نمودار ہوئی۔ اس نے کہا ''بیگم صاحبہ پوچھتی ہیں کہ کیا کبھی پہلے آپ راولپنڈی میں رہتے تھے؟''

جمال نے کہا ''ان سے عرض کرو کہ میں راولپنڈی میں کبھی نہیں رہا۔ اسلام آباد میں رہتا ہوں اور یہاں سے بھی جلد چلا جاؤں گا۔''

بچی جانے کے لیے مڑی تو جمال نے کہا ''بیٹی مجھے یاد آیا' میں جنگ کے زمانے میں کچھ دیر راولپنڈی میں رہا تھا۔''

تھوڑی دیر اور گزر گئی۔ جمال نے محسوس کیا کہ دروازے کے شیشوں میں سے کوئی خاتون مجھے بڑے غور سے دیکھ رہی ہے مگر اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

دروازہ پھر کھلا اور پہاڑی بچی نے کہا ''بیگم صاحبہ پوچھتی ہیں آپ کا نام کیا ہے؟''

''جمال۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں رہنے والا لاہور کا ہوں۔ بارش تھم جائے تو چلا جاؤں گا اور چغہ واپس کر دوں گا۔''



اتنے میں اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ اب کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

دروازہ پھر کھلا اور بچی نے کہا ''بیگم صاحبہ کہتی ہیں آپ بیمار ہیں شاید۔ آپ ہمارے ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ جائیں۔''

جمال ان مہربانیوں پر از حد ممنون ہوا۔ دل ہی دل میں اس نے بیگم صاحبہ کو دعائیں دیں۔ وہ کمرے میں آ کر صوفے پر گر گیا۔ پہاڑی بچی نے ایک کمبل اس پر ڈال دیا۔

جمال کی حالت بہت خراب تھی۔ نزلہ زکام سر درد کھانسی اور اب اسے محسوس ہوا کہ مجھے تپ چڑھ رہا ہے۔ وہ لیٹے لیٹے سوچنے لگا کہ میں یہاں سے واپس کیسے جاؤں گا۔ میٹنگ تو شروع ہو چکی ہو گی۔ لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

وہ نجانے کب تک اسی طرح نیم بے ہوش رہا۔

پھر اچانک کسی خاتون کی آواز اس کے کانوں میں پڑی ''ہے تو وہی۔ یقیناً وہی ہے۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔'' پھر خاتون نے اپنا ہاتھ نہایت دلداری سے اس کے ماتھے پر رکھا اور کہا ''اوہ تمہیں تو بہت سخت بخار ہے۔ اس وقت تو کوئی ڈاکٹر بھی نہیں آ سکتا۔ اب میں کیا کروں۔''

جمال سب کچھ صاف صاف سن رہا تھا مگر وہ اسی طرح نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑا رہا۔ وہ کچھ سمجھ نہ سکا مگر وہ اس لمحے کی لذت کھونا نہ چاہتا تھا۔ اس نے مکاری سے آنکھیں بند رکھیں۔

خاتون نے ہاتھ کھینچ لیا۔ کمبل اس کو اچھی طرح اوڑھایا۔ تکیہ سیدھا کیا اور واپس چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ آ کر بولی ''لو تھوڑا سا سوپ پی لو۔ آنکھیں کھولو جمال۔''

جمال نے تھوڑی سی آنکھیں کھولیں۔ بجلی کا بلب خاتون کی پشت پر تھا۔ جمال اس کا چہرہ صاف نہ دیکھ سکا۔ آواز اس خاتون کی بہت محبت بھری تھی مگر وہ کون ہے' اس کا اسے کچھ اندازہ نہ ہو سکا۔

خاتون نے سوپ کا پیالہ جمال کے منہ سے لگا دیا۔ جمال نے کہا ''تکلیف نہ کریں' میں خود پی لوں گا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے تو میری جان بچائی۔''

''تم یہاں کیسے آ نکلے؟'' خاتون نے پوچھا۔

''میں نیچے کھڈ کو دیکھنے گیا تھا۔ صبح موسم بہت عمدہ تھا۔ پھر اس خوفناک بارش نے آ لیا اور میں پھنس گیا۔ آپ کا گھر راستے میں نہ پڑتا تو میں شاید مر ہی جاتا۔''

''اسی لیے تو ہم نے گھر یہاں بنایا ہے کہ لوگ پگڈنڈیوں پر نہ مر جائیں۔ یہ سب خدا کی مرضی ہے۔''

''کیا خدا کی مرضی ہے؟'' جمال نے پوچھا۔

''یہی کہ تم کھڈ میں اترو' پھر طوفان تمہارا راستہ روک لے اور سردی تمہیں ہمارے گھر پناہ لینے پر مجبور کر دے۔ یہ محض اتفاق تو نہیں ہے۔ ہمارا ملنا طے تھا......''

''مگر بیگم صاحبہ آپ ہیں کون؟''

## تمہارا سینہ کہاں ہے

''ابھی تک نہیں پہچانا؟ بڑے گدھے ہو۔'' وہ بولی ''لاؤ میں تمہارا سینہ مل دوں۔ تمہیں کھانسی بہت ہے۔ کہیں نمونیا نہ ہو جائے۔''

جمال نے گھبرا کر کہا ''ارے نہیں بیگم صاحبہ۔ یہ نہیں ہو سکتا۔''

''کیوں نہیں ہو سکتا۔'' وہ بولی ''کیا تم میرا سینہ نہیں ملا کرتے تھے؟''

جمال اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے خاتون کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ چالیس سال کی ایک خوبصورت عورت تھی۔ اس کا چہرہ اسے کسی قدر آشنا لگا مگر وہ اسے پہچان نہ سکا۔ اس نے کہا ''خدا کے لیے بتاؤ تم کون ہو، پہیلیاں نہ بجھواؤ۔''

وہ ہنسی اور اس سے لپٹ کر بولی ''بے وقوف میں نسیم ہوں۔ میجر دربار خاں کی بیٹی جسے تم انگلش پوئٹری اور نجانے کیا کیا پڑھایا کرتے تھے۔ یاد آیا کچھ؟''

''ہاں ہاں کیا میں تمہیں بھول سکتا ہوں؟'' جمال نے جوش میں آ کر کہا ''لو ایک دفعہ اور گلے سے لگ جاؤ۔''

وہ ایک دفعہ اور جمال کے گلے سے لگی۔ پھر پیچھے ہٹ کر بولی ''میری سن پچاس میں شادی ہو گئی تھی کیپٹن کفیل سے۔ ایک بچہ ہوا میجر شکیل، جس کی آج کل پوسٹنگ مظفر آباد میں ہے۔ پھر کیپٹن کفیل سن پینسٹھ کی جنگ میں سیالکوٹ کے محاذ پر شہید ہو گیا۔ اب میرے بیٹے نے مجھے یہاں مری میں رکھا ہوا ہے تاکہ وہ مجھے چھٹی کے دن آ کر مل سکے۔ بڑا اچھا بچہ ہے ماشاء اللہ! تم سناؤ۔ تم نے اس زمانے میں کیا کیا تیرے مارے۔''

''ارے کچھ نہیں۔'' جمال بولا ''شادی کی، بچے پیدا کیے۔ ہر حکومت سے بغاوت کی۔ بھوکا مرا، مگر سر نہیں جھکایا۔ ان دنوں میں وزارتِ تعلیم میں ڈائریکٹر جنرل ہوں اور اب یہاں سے نکالا جانے والا ہوں۔ گھر بار پیسہ میں نے کچھ نہیں بنایا۔''

''عشق بازی تو خوب کی ہو گی۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''ارے نہیں۔'' جمال نے جواب دیا۔ ''فرصت ہی نہ ملی۔''

''آج تو فرصت ہے۔'' وہ بولی ''کیا میں تمہارے ساتھ لگ جاؤں؟''

''آؤ میری جان!'' جمال نے جواب دیا۔

''مگر اسی طرح جس طرح ہم اس رات لیٹے تھے۔ راولپنڈی میں جب بلقیس پھوپھو نے تمہارا سر اپنی ران پر رکھا تھا اور میں رضائی میں تمہارے ساتھ چمٹی تھی۔ بات آج بھی آگے نہ بڑھے جمال۔ اب میں ایک جنٹلمین افسر کی والدہ ہوں۔ لو ہٹو، مجھے جگہ دو۔''



صوفہ بڑا تھا۔ جمال پیچھے ہٹا تو نسیم کے لیے جگہ بن گئی۔

وہ بولی ''بس یہیں تک۔ آگے نہیں۔''

''بالکل نہیں۔'' جمال نے کہا۔

''مگر تمہارا جسم تو جل رہا ہے جمال۔''

''صبح تک لیٹی رہو گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہارے آنے کے بعد چھینکیں کم ہو گئی ہیں!''

''مگر اب تمہیں زکام لگ جائے گا۔''

''لگ جائے پھر۔'' وہ بولی۔

''کیا میں تمہیں اب بھی اچھا لگتا ہوں۔'' جمال نے سرگوشی میں پوچھا۔

''بالکل نہیں، زہر لگتے ہو۔'' وہ بولی۔

''وہ کیوں؟''

''اتنے سال کہاں گم رہے؟ کوئی عورت اپنا پہلا پیار بھلا نہیں سکتی! تمہیں یاد کرتی رہی چپ چاپ۔''

''کیا میں تمہارا پہلا پیار تھا؟''

''تھے تو اور اب آخری پیار ہو۔ منہ اتنا قریب نہ لاؤ۔ تمہارا سانس بہت گرم ہے۔''

''یہ پیار کی گرمی ہے۔''

''نہیں یہ بخار کی گرمی ہے۔ کیا تم نے مجھے کبھی یاد کیا؟''

''بہت۔ مرد بھی اپنا پہلا پیار نہیں بھلا سکتے۔''

''کیا میں تمہارا پہلا پیار تھی؟''

''پہلا ہی سمجھو، اگرچہ تم نے مکمل نہیں ہونے دیا۔ اُف وہ رات کتنی سہانی تھی!''

''ہر رات سہانی ہوتی ہے جوانی میں مگر وہ رات یادگار تھی۔ اس رات بھی ایسا ہی طوفان تھا جب تم بھیگتے ہوئے گئے اور مونگ پھلی لے کر آئے تھے!''

''ہاں واقعی۔'' جمال بولا ''اس رات مجھے کچھ بھی نہ ہوا۔''

''ہوا تو بہت کچھ۔ رضیہ بیچاری کو بہت کچھ ہوا۔ وہ تم سے ایک بچے کی خیرات مانگتی تھی، دے دیتے۔''

پھر دونوں ہنسنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد بولی ''میں نے تمہاری فلم بھی دیکھی تھی۔ بری طرح فیل ہو گئی مگر تھی اچھی۔ اصل میں لوگ کسی بوڑھے آدمی کی کسی جوان لڑکی سے محبت برداشت نہیں کر سکتے۔''

''جیسے میری اور تمہاری محبت۔'' جمال بولا۔

''خیر میں بھی اب بڑھاپے کے دروازے پر کھڑی ہوں۔''

''ابھی نہیں۔ ابھی تو تمہارے جذبے تازہ ہیں۔''

## لمحے کہاں چلے جاتے ہیں

''وہ تو تمہیں اچانک دیکھ کر جاگ گئے ورنہ وہ دن کہاں۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ لمحے کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ مثلاً وہ لمحہ کہاں گیا جب میں نے تمہیں دروازے کے شیشوں میں سے جھانکا تھا۔''

''نجانے کہاں گیا۔''

''لوٹ کر بھی نہیں آئے گا؟''

''نہیں، کبھی نہیں۔''

''اور یہ رات بھی گزر جائے گی اور پھر تم چلے جاؤ گے۔''

''بے شک۔'' جمال بولا۔

''اور لوٹ کر کبھی نہ آؤ گے۔''

''کیا کہا جا سکتا ہے۔ اسباب کے اسباب ہوتے ہیں جن کو کوئی نہیں سمجھتا۔ وقت کے بھید کب کس پر کھلے؟''

''تو پھر یہ طے ہے کہ ہم پھر کبھی نہ ملیں گے؟''

''طے تو نہیں مگر اغلب یہی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ ایک مرتبہ اور ملنے میں فائدہ بھی کیا ہے۔ تم مجھے ایک مرتبہ زور سے سینے سے لگاؤ۔ مجھے اچھا لگتا ہے تمہارا بدن۔''

جمال نے نسیم کو بھینچ کر گلے لگایا اور سینے سے چمٹا لیا۔ وہ ایک نرم و نازک لڑکی کی طرح ڈھیلی پڑی رہی۔ پھر اچانک اس نے جمال کا منہ چوم لیا اور بولی ''لو اب تم سو جاؤ۔ زیادہ جاگنے سے تمہاری طبیعت اور بگڑ جائے گی۔''

''نہیں نہیں۔'' جمال بولا ''ابھی نہیں۔ میری طبیعت تو آہستہ آہستہ ٹھیک ہو رہی ہے۔ ابھی تو میں نے تمہیں اچھی طرح دیکھا بھی نہیں۔ رک جاؤ پیاری۔''

''نہیں جمال اب جانے دو۔ آدھی رات ہو چلی۔''

پھر وہ جمال سے ہاتھ چھڑا کر اٹھی اور پیچھے دیکھے بغیر کمرے سے نکل گئی۔

نجانے کب تک جمال چھت کی طرف دیکھتا رہا۔

### حافظ خدا تمہارا

جمال کی آنکھ کھلی تو باہر سنہری دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ موسم نہایت خوشگوار تھا۔ اس کی طبیعت بہت بہتر تھی۔ زکام کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ بخار بھی اتر چکا تھا مگر چھینکیں ابھی بند نہ ہوئی تھیں۔ جمال نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کے لیے گزرے ہوئے کل کے واقعات پر یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا جو کچھ ہوا کیا ایسا ہونا ممکن تھا؟



اتنے میں وہی پہاڑی لڑکی اس کے کمرے میں آئی جو یہاں کام کاج کرتی تھی اور فوراً واپس جا کر بولی ''بیگم صاحب جی وہ جاگ گئے ہیں۔''

تھوڑی دیر میں نسیم ہنستی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور بولی ''مزے کی نیند سوئے تم۔ میں دو مرتبہ تمہیں دیکھنے آئی تھی۔ اب کیسی ہے طبیعت؟''

جمال نے کہا ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہاری وجہ سے ٹھیک ہوں۔''

''بیمار بھی تو میری وجہ سے ہوئے تھے۔'' وہ بولی۔

''دیکھو تمہیں مجھ سے ملانے کے لیے قدرت کو کیا کیا کرنا پڑا۔ پہلے تم کھڈ میں اترے حالانکہ مری میں آ کر کوئی بھی کھڈ میں نہیں اترتا۔ پھر کالی گھٹا اُمڈ کر آئی اور برفانی ہوائیں ساتھ لائی تم بری طرح سے بھیگ گئے اور بارش سے بچنے کے لیے میرے برآمدے میں آ گئے۔ پھر میں نے تمہیں دروازے کے پیچھے سے دیکھ لیا اور مجھے شک پڑا کہ یہ تم ہو جمال۔ اتنے سالوں کے بعد بھی میں نے تمہیں پہچاننے میں غلطی نہ کی! میں سمجھتی ہوں کہ یہ سارا کھیل کسی خاص منصوبے کے تحت ہوا۔ جن واقعات کو ہم اتفاقیہ سمجھتے ہیں، شاید وہ اتفاقیہ نہیں ہوتے۔''

''ممکن ہے ایسا ہی ہو۔'' جمال بولا۔

''اور اب تمہارا جدا ہونا بھی اسی منصوبے کا حصہ ہو سکتا ہے۔''

''ہو سکتا ہے۔'' جمال بولا ''وقت کا پہیہ رکتا تو نہیں۔ شاید اس کا چکر ہمیں ایک دفعہ اور ملا دے۔''

''میں نہیں چاہتی کہ ایسا ہو۔''

''کیوں نہیں چاہتیں؟'' جمال نے پوچھا۔

''اس لیے کہ تم اتنے سالوں کے بعد ملے تو بے حد خوشی ہوئی اور مجھے اپنی الہڑ جوانی کے کچھ لمحے واپس مل گئے۔ کیسی پیاری رات گزری میری! اب تم جاؤ گے تو میرے لیے اس گدگداتی ہوئی رات کی یادیں چھوڑ کر جاؤ گے اور میری تنہائی کو بہلا وال جائے گا۔ مل کر ہمیں کیا کرنا ہے۔ جسم کی آگ تو ٹھنڈی ہو چکی۔''

''میرے جسم کی آگ ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی نسیم۔ میرے اندر تو شعلہ بھڑکتا رہا۔'' جمال بولا۔

''تم ایک گھٹیا انسان ہو۔ راولپنڈی میں جب تم مجھ سے نیکنگ اور بریسٹنگ کرتے تھے تو مجھے اچھے لگتے تھے مگر وقت وقت کی بات ہے۔ اب تمہارے بال بھی سفید ہو رہے ہیں اور میں بھی ایک جوان اور عزت دار بیٹے کی ماں ہوں۔ اب ہمیں خوبصورت باتیں سوچنی چاہئیں۔ بدصورت چیزوں کا خیال چھوڑ دینا چاہیے۔''

''میں جسمانی محبت کو دنیا کی سب سے خوبصورت چیز سمجھتا ہوں۔'' جمال نے کہا۔

''میں بھی ایسا ہی سوچتی ہوں مگر اب نہیں۔ لو زیادہ بکواس مت کرو۔ میں ناشتہ لاتی ہوں۔ میں تمہارے جاگنے کا انتظار کر رہی تھی۔''

اتنے میں پہاڑی لڑکی چائے اور ناشتہ لے آئی۔ نسیم نے خاموشی سے چائے بنائی سلائس پر مکھن لگایا۔ انڈوں پر نمک چھڑکا اور چپ چاپ بیٹھ گئی۔ کہنے کو کچھ تھا بھی نہیں۔

ناشتہ ختم کرتے کرتے دونوں بہت اداس ہو گئے۔ جمال نے کہا "نسیم کیا میں آخری دفعہ تمہارا منہ چوم سکتا ہوں؟"

"چوم سکتے ہو۔" وہ رکھائی سے بولی اور اس نے منہ آگے کر دیا۔

اس کی کھال ٹھنڈی اور بے جان تھی۔ آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔

جمال نے چغہ اتار کر رکھ دیا۔

بولی "یہ ساتھ لیتے جاؤ۔ تمہارے ہی لیے پڑا تھا۔"

جمال نے چغہ پہن لیا۔

برآمدے میں کھڑے ہو کر اس نے نسیم پر ایک آخری نگاہ ڈالی اور بولا "تو یہ طے ہے کہ ہم پھر کبھی نہیں ملیں گے۔"

"کبھی نہیں۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی "لو اب تم جاؤ۔ جہاں رہو خوش رہو۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد کرتی رہوں گی۔"

جمال سیڑھیوں سے اترا تو اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اس نے نسیم کو مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

قدرت اللہ صاحب نے سرکاری ملازمت اور سرکاری طریق کار کے بہت سے بھید جمال کو بتا دیئے تھے مگر یہ نہ بتایا کہ جب کسی کو جسے افسروں نے اپنے قبیلے میں قبول کر لیا ہو نکالا جائے یا اسے پنشن مل جائے تو اس کا حشر کیا ہوتا ہے۔ قدرت اللہ صاحب اس منزل سے نہ گزرے تھے۔ انہوں نے استعفیٰ دیا تھا اور وہ امن چین کے ساتھ گھر چلے گئے تھے۔ انہیں اللہ کا ولی سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ خود انہوں نے اس کی بار بار تردید کی مگر وہ پیروں فقیروں کو مانتے تھے اور مزاروں پر جا کر دعائیں بھی مانگتے تھے۔ مفتی ان کا اندھا مرید تھا اور کہتا تھا کہ اللہ نے اس شخص کو پاکستان کے تحفظ پر مامور کیا ہے اور یہ پاکستان کو بام ثریا تک پہنچا کر جائے گا۔

مفتی سمجھتا تھا کہ دنیا جیسی غیر متوازن ہے ویسی ہی رہے گی کیونکہ یہ خدا کی مرضی ہے اور دنیا کے دھرے کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنا خدا کے کاموں میں مداخلت ہے۔ دفتری بدتمیزیوں پر بھی اسے کوئی اعتراض نہ تھا۔ قدرت اللہ صاحب مایوسی کا اظہار کرتے تھے مگر وہ اسے بھی من جانب اللہ ہی سمجھتے تھے۔

## کتے اور افسر

جمال جب مری سے لوٹا تو دو تین روز کے بعد اسے منسٹری کے ایک جوائنٹ سیکریٹری کے دستخطوں سے خط ملنے لگے۔ دفتر کے اثاثہ جات کی تفصیل پیش کرو۔ گاڑی پر پچھلے پانچ سال میں مرمت اور پٹرول پر کل کتنا خرچ آیا اور یہ کل کتنے میل چلی۔ دفتر کے واجب الادا بل کتنی رقم کے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔



جمال نے ان سوالات کے جو جواب ہو سکتے تھے' دیئے مگر معلوم ہوتا ہے کہ جوائنٹ سیکریٹری جمال کو ذلیل کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس نے ٹیلی فون پر حکم دیا کہ گاڑی فی الفور میرے حوالے کر دی جائے۔ جمال نے عذر کیا کہ ابھی تو مزید چھ روز میں دفتر کا افسر اعلیٰ ہوں اور مجھے آنا جانا ہے۔ اس لیے گاڑی فی الحال واپس نہیں کی جا سکتی۔ اس پر جوائنٹ سیکریٹری بظاہر مطمئن ہو گئے مگر اگلے روز اس نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ چابیاں میرے حوالے کر دو۔

جب گاڑی اس کے قبضے میں آ گئی تو اس نے جمال کو خط لکھا کہ گاڑی کا سگریٹ لائٹر کہاں گیا۔ اس کی گمشدگی کی انکوائری رپورٹ بھیجی جائے اور ذمہ داری کا تعین کیا جائے۔

پھر پوچھا کہ پانچ سال پہلے آپ کو دفتر کے لیے اٹھارہ پردے خرید کر دیئے گئے تھے' مگر آپ نے صرف گیارہ پردوں کی موجودگی کا اقرار کیا ہے۔ باقی کے سات پردوں کا حساب دیا جائے۔

جمال نے لکھا پانچ سال میں پردے پھٹ جاتے ہیں اور یہ جو موجود ہیں' ان کی بھی دھجیاں اڑ رہی ہیں۔

پوچھا گیا کہ جو پردے پھٹ گئے تھے' وہ کہاں ہیں۔ اگر ان کے اتلاف کی وائس چیئرمین سے منظوری لی گئی تھی تو ان کی منظوری کی نقل پیش کی جائے۔

یہ اور اسی طرح کی ذلیل چٹھیاں روز بروز جمال کو ملنے لگیں۔ یہ حال دیکھ کر دفتر کے لوگ جن کی جمال نے ملازمت کی منظوری دی تھی اور جن کا جمال نے ہر طرح سے خیال رکھا تھا' اس سے دور دور رہنے اور فائلیں چھپانے لگے۔

پھر جمال نے دیکھا کہ انسائیکلو پیڈیا بریٹینیکا لائبریری سے غائب ہے۔ جمال نے پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ جوائنٹ سیکریٹری نے اپنے گھر بھجوا دی ہے اور اس بات کا کوئی ثبوت بھی نہیں چھوڑا۔ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا تھا کہ بعد میں اس کی چوری کا جمال پر الزام لگا دیا جائے گا مگر جمال کچھ کر نہ سکتا تھا۔ سیکریٹری صاحب نئے آدمی تھے اور انہیں جوائنٹ سیکریٹری نے باندھ لیا تھا کیونکہ لاہور کے ایک بڑے اخبار کا ایڈیٹر اس کا بہنوئی تھا اور یہ اخبار ضیاء الحق اور اسلام کی بڑی خدمت کرتا تھا۔

جمال نے کڑھنے کے بجائے سوچ لیا' سو وہاٹ! یعنی دیکھا جائے گا۔

گلی کے کتوں کا غول کسی غیر کتے کو آتے دیکھ کر بھونکنا اور بھاگنا شروع کر دیتا ہے تاکہ آنے والا ڈر جائے۔ افسر بھی نئے آنے والوں سے یہی سلوک کرتے ہیں مگر نیا آنے والا بھگایا نہ جا سکے تو پھر باقی افسر اسے اپنے قبیلے میں شامل کر لیتے ہیں۔ یہ بات تو قدرت اللہ صاحب جانتے تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ افسر جب حاکم وقت کی نظروں میں گر جائے تو اس کے جنم مرن کے ساتھی بھی اس سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ اس کا تجربہ انہیں ہو چکا تھا۔ جب انہوں نے بڑے افسروں کے ایک جلسے میں یحییٰ خاں پر تنقید کی تھی جس پر انہیں

ملازمت سے رخصت لینی پڑی تھی۔ انہیں بھی ان کے ساتھی سیکریٹریوں نے عجیب وغریب سوال پوچھے تھے مگر ان کے معیار یہ نہیں تھے جو جوائنٹ سیکریٹری کے معیار تھے۔

## لاہور چلو

جمال نے کسی نہ کسی طرح چھ دن گزار لیے۔ اس کی بیوی نے جو اس کی غیر یقینی زندگی اور خوئے بغاوت کی عادی ہو چکی تھی' کوئی اودھم نہ مچایا۔ ایک دن پہلے سامان بندھ گیا' مگر تھا کیا؟ کچھ بستر' کچھ کپڑے' کچھ برتن بھانڈے' ایک کالا ٹی وی سیٹ اور دو بوری کتابیں۔

سرکاری گاڑی اس نے پہلے واپس کر دی تھی۔ صبح سویرے وہ رکشاؤں میں سامان لاد کر اور بیوی بچے ساتھ لے کر بس کے اڈے پر پہنچ گیا۔ آدھا گھنٹہ اس کو یہاں رکنا تھا۔ وہ صندوقوں پر بیٹھ گیا۔ ایک لمحے کے لیے بھی اسے خیال نہ آیا کہ میں تو بیس گریڈ کا افسر تھا اب یہاں صندوقوں پر بیٹھا دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے۔

اصل میں وہ افسر بنا ہی نہ تھا۔ وہ عوامی آدمی رہا۔ غریب کا حامی' کمزور کا دوست اور دنیاوی راہ ورسم کا باغی۔ اسلام آباد میں پانچ سال گزار کر بھی اس نے کوئی یار نہ بنایا تھا۔ وہی مفتی اور تھوڑا بہت قدرت اللہ صاحب اس کے شاملِ حال رہے۔

وہ بہت اللہ والے تھے مگر کسی کو نیکی اور نماز کی تلقین نہ کرتے تھے۔ نماز ہمیشہ مسجد میں باجماعت ادا کرتے۔ جمال ان کے ساتھ مسجد تک جاتا' باہر منڈیر پر بیٹھ جاتا مگر انہوں نے کبھی منہ نہ بنایا۔ رہا مفتی تو وہ چھ آٹھ گھنٹے روز لکھتا۔ اس دوران طرح طرح کی نوجوان لڑکیاں اس کے پاس بیٹھی رہتیں اور وہ ان کے مسائل کا حل بتاتا یا انہیں اپنے روحانی پروں پر لاد کر ہفت آسمان کی سیر کرا دیتا۔

وہ سخت جنونی آدمی تھا اور اگرچہ جمال سے اس کو بہت محبت تھی مگر وہ اس سے ناراض رہتا تھا کہ جب میں نے صراطِ مستقیم دیکھ لیا ہے جس پر قدرت اللہ صاحب چراغ لیے کھڑے ہیں تو تم اندھے کیوں ہو مگر جمال اس معاملے میں اندھا ہی تھا۔ وہ علت ومعلول کا آدمی تھا اور نہیں مانتا تھا کہ کوئی بڑے سے بڑا پیر' فقیر' صوفی اور درویش واقعات کا رخ پھیر سکتا ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی غیر منطقی واقعہ ہوا نہ تھا۔

جمال' جس بے کسی اور مایوسی کے عالم میں پانچ سال پہلے لاہور سے اسلام آباد آیا تھا اس قسم کی بے کسی اور مایوسی اس پر اب سوار نہیں تھی مگر وہ یہ ضرور سوچتا تھا کہ آگے میں کیا کروں گا۔ اس کا خیال تھا کہ کسی اخبار میں مجھے جگہ مل جائے گی مگر اسے معلوم تھا کہ ضیاء الحق کے دور میں مجھے کوئی کچھ لکھنے نہ دے گا۔ اس نے آج تک اپنی دانست میں جھوٹ نہ لکھا تھا، کسی حکومت کی خوشامد نہ کی تھی بلکہ ہر حکومت پر تنقید کی تھی۔ نرمی اور لطافت سے کڑوی بات اسے کرنی بھی نہ آتی تھی۔

## خیر سے بدھو گھر کو آئے

لاہور میں اس کی بیٹی نے جو امریکہ میں مقیم تھی اور ان دنوں پاکستان آئی ہوئی تھی' ایک مکان خریدا



اور کہا کہ میں اپنے لیے پاکستان میں ٹھکانہ چاہتی ہوں مگر دراصل وہ اپنے باپ کے لیے ٹھکانہ بنا رہی تھی۔ جس کے پاس رہنے کو کوئی جگہ نہ تھی۔ جمال اس کے مکان میں اترا۔

اسے تھوڑے ہی دنوں میں اندازہ ہو گیا کہ مجھے کوئی اخبار قبول نہ کرے گا۔ بھٹو کے اخبار کی انتظامیہ بدل چکی تھی اور اب اس کا ایڈیٹر ایک مشہور شاعر تھا جو بائیں بازو سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے جمال ہی نے نوکری دلوائی تھی مگر اب جب جمال اسے ملنے کے لیے گیا تو اس نے کہا کہ تم رپورٹروں کے کمرے میں انتظار کرو۔ ابھی مجھے تم سے بات کرنے کی فرصت نہیں۔

یہ اور بات ہے کہ کام اس نے کبھی کیا نہ تھا۔

ادھر جمال رپورٹروں کے کمرے میں گیا۔ اُدھر وہ گھر کے لیے سیڑھیاں اتر گیا۔

مگر جمال کو ابھی گھریلو اخراجات کی پریشانی نہ تھی۔ اس کے پاس کچھ رقم تھی۔

## کوڑے قید اور مارشل لاء

باہر بہت ہنگامہ تھا' جس کا اسلام آباد میں کسی کو اندازہ نہ تھا۔ بھٹو پر مقدمہ چل رہا تھا اور عوام سخت بے چین تھے۔ ادھر ضیاء الحق ان لوگوں کو جو انصاف مانگتے تھے' کوڑوں پر کوڑے مار رہا تھا۔ جماعت اسلامی کے مولوی طفیل محمد اس کے مشیر اعلیٰ تھے کیونکہ ضیاء الحق نے نظام مصطفیٰ کے نفاذ کا وعدہ کر رکھا تھا۔ دیگر تمام مولوی اور دینی جماعتیں بھی اس کی ہمنوا تھیں اور اس کے نمائندے کہتے تھے کہ اب ہماری حکومت ہے۔ پولیس ہماری ہے۔ اخبارات ان کے بیانات اچھالتے تھے اور روسیوں کو گالیاں دیتے تھے' جنہوں نے افغانستان میں فوجیں اتاری تھیں۔ افغانستان میں روسی فوجوں کی آمد سے امریکیوں کو تشویش ہوئی اور اس جنگ میں پاکستان بھی شامل ہو گیا۔

اور یہ بات بھی بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ضیاء الحق جس کو تین ماہ کے لیے لایا گیا تھا' وہ کیونکر سالہا سال تک شاہ عالم بنا رہا۔

امریکی سی آئی اے نے بھٹو کو گرفتار کروایا تا کہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام رکوایا جا سکے اور عالم اسلام کے اتحاد کے امکانات کو ختم کیا جا سکے جس کے لیے ذوالفقار علی بھٹو' لیبیا کے کرنل قذافی اور سعودی عرب کے شاہ فیصل بہت پرجوش تھے مگر ضیاء الحق کی خوش قسمتی سے افغانستان میں استاد نور محمد ترکئی نے حکومت کا تختہ الٹا اور سوشلزم نافذ کرنے کی کوشش کی یعنی زمینوں کی تقسیم اور دیگر اثاثوں کی قومی ملکیت۔

افغانستان کی قبائلی معاشرت ایسی انقلابی تبدیلیوں کے لیے تیار نہ تھی مگر پاکستان نے نئی حکومت کو تسلیم کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

## افغانِ جہاد

ضیاء الحق طیارے میں راولپنڈی سے لاہور آ رہا تھا جب اس کو پائلٹ نے اطلاع دی کہ صدر کارٹر

آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ ضیاءالحق نے کہا ''ان کے ملٹری سیکریٹری سے کہو کہ وہ ایک گھنٹے کے بعد پنجاب کے گورنمنٹ ہاؤس میں فون کریں۔''

ایک گھنٹے کے بعد صدر کارٹر نے ضیاءالحق کو حکم دیا کہ وہ افغانستان میں نور محمد ترکئی کی حکومت کی مزاحمت کرے۔

چنانچہ پاکستان سے جماعت اسلامی کے کارکن شناختی کارڈ اور دعوت نامے لے کر افغانستان کے دیہات میں گئے اور انہیں پاکستان میں قیام وطعام کی دعوت دی اور یوں ان بھوکے ننگے افغانوں کی ہجرت کا سلسلہ چلا حتیٰ کہ ان کی تعداد تیس لاکھ تک پہنچ گئی۔ ان میں سے نصف سے زیادہ ہمیشہ کے لیے یہیں بس گئے۔ یوں بھی تاریخ گواہ ہے کہ ایک دفعہ افغانوں نے درہ خیبر پار کر لیا تو پھر وہ واپس نہیں گئے۔

مگر روسی تو نور محمد ترکئی کے انقلاب کے ٹھیک ایک برس بعد افغانستان میں داخل ہوئے تھے' پھر فوری طور پر جہاد کے نعرے کیوں لگنے لگے تھے؟ کیونکہ سی آئی اے یہی چاہتا تھا۔

جہاد جاری تھا۔ اس کے ساتھ ہی بھٹو پر مقدمہ بھی چل رہا تھا اور ضیاءالحق نے نادر شاہ کی طرح تلوار نیام سے باہر نکال رکھی تھی۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے لشکری جب چاہتے جماعت اسلامی کے محاذوں پر سکوٹروں پر سوار ہو کر پہنچ جاتے اور جلسوں جلوسوں پر ٹوٹ پڑتے۔ شہر میں دہشت چھائی ہوئی تھی لیکن لوگ احتجاج کرنے سے باز نہ آتے تھے۔ سڑکوں پر جلوس نکلتے۔ پولیس لاٹھی چارج کرتی۔ گیس کے دھویں سے دم گھٹتا۔ کچھ لوگ بھاگتے۔ کچھ گرفتار ہو جاتے۔ پھر شام ہو جاتی۔

## یوم آزادی

انہی ہنگاموں میں چودہ اگست آ گئی اور لاہور کے عوام نے اسے بھرپور طریقے سے منانے کا فیصلہ کر لیا مگر شام کو سکور کیا رہا؟

چار تو وہیں مر گئے۔ چونتیس گولیاں کھا کر ہسپتال پہنچے مگر سبھی زخمی ہسپتال میں داخل نہ ہوئے۔ بہت سے گھروں میں چھپ گئے کہ پولیس ہسپتال میں بھی ہمیں پکڑ لے گی۔

بھاٹی گیٹ اور موچی گیٹ کا درمیانی علاقہ اندرون شہر کی گلیاں' سرکلر روڈ میں داخلے کے تمام راستے' بانساں والا بازار جہاں سے 1947ء میں پنجاب کے قتل عام کی ابتدا ہوئی تھی' ایبک روڈ اور اردو بازار میں خون کے دھبے' گیس کے خالی ڈبے' گولیوں کے خول اور اینٹ روڑے بکھرے پڑے تھے۔

یہ ضیاءالحق کے اسلامی دور کا یوم آزادی تھا۔

جمال چالیس برس سے عوام کا پولیس مقابلہ دیکھ رہا تھا۔ وہ مسلم لیگ کی خضر حیات کے خلاف تحریک میں شامل تھا۔ اس نے 1953ء کی احمدی دشمن شورش دیکھی تھی۔ وہ لیاقت علی خاں اور دولتانہ کے خلاف ایجی ٹیشن کا بھی عینی شاہد تھا۔ ایوب دشمن تحریک بھی اس کا ذاتی تجربہ تھی اور بھٹو اور بھاشانی کے ہنگاموں



میں وہ بھی شامل رہا تھا۔ پھر اسلامی جمہوری اتحاد کی تحریک تو کل کی بات تھی۔ اس نے ضیاء کی فوج کو عوام پر گولیاں برساتے دیکھا تھا۔ یہ سب خوفناک واقعات تھے مگر جیسی خونخواری اور سنگدلی اس نے یوم آزادی پر دیکھی اس کی نظیر موجود نہ تھی۔

لوگ کیا چاہتے تھے؟ انہوں نے کوئی جیل نہ توڑی تھی۔ کوئی بینک نہ لوٹا تھا۔ سیکریٹریٹ پر حملہ نہ کیا تھا۔ شہر کو آگ نہ لگائی تھی۔ اسمبلی کی عمارت کو گرایا نہ تھا۔ وہ صرف موچی دروازے کے باغ میں جلسہ کرنا چاہتے تھے۔

ضیاء کے پنجابی حکمران نواز شریف کو اس بات کا رنج تھا کہ وزیراعظم جونیجو نے ہنگامے سے ڈر کر مینار پاکستان پر اپنی تقریر منسوخ کر دی تھی۔ وہ بتانا چاہتا تھا کہ میں لاہور پر حکمران ہوں اور میرے آگے کوئی بول نہیں سکتا۔ وہ امریکیوں کی طرح ویت نام کے گاؤں کو کمیونسٹوں سے بچانے کے لیے اسے تباہ کر دینا چاہتا تھا۔

اسی روز جیسی گولی چلی جمال نے کبھی دیکھی نہ تھی۔ ڈی آئی جی انچارج کو بھی معلوم نہ تھا کہ میں نے عورتوں اور بچوں پر گیس کے کتنے گولے چلائے ہیں۔

شاہ عالمی کے چوک میں ڈربے میں بیٹھی ساری مرغیاں گیس سے مر چکی تھیں مگر خون موت کے بعد بھی ان کی چونچوں سے قطرہ قطرہ رس رہا تھا۔ ان کے پھیپھڑے پھٹ چکے تھے۔

ایک تین ماہ کا معصوم بچہ اپنے بے بس اور بھاگتے ہوئے باپ کی گود میں درد سے چیخ رہا تھا مگر کسی کو معلوم نہیں تھا کہ پانی کا نل کہاں ہے۔ گیس سانس ہی نہیں روکتی تھی' جسم پر چھالے ڈال دیتی تھی۔ اس سے رگیں اور سینے خون اُگلنے لگتے تھے۔ چہرے جل جاتے تھے۔ پانی سے اس کو دھویا نہ جا سکتا تھا۔ ہوا جسم کو چھیلتی تھی۔ یہ گیس ضیاء نے امریکہ سے تازہ تازہ منگوائی تھی۔

## شیل ختم ہو گئے

لوہاری گیٹ میں گیس کے شیل ختم ہو گئے۔ جمال کے سامنے پولیس والوں نے ایک دوسرے کو آوازیں دیں کہ شیل نشانے دیکھ کر چلاؤ کیونکہ جنگ ابھی جاری ہے۔ یہ اندھا اور زخمی کر دینے والی گیس میو ہسپتال کے چوک سے بھاٹی دروازے کے اندر گھروں تک پھیلی ہوئی تھی۔ لوہاری گیٹ' اکبری گیٹ' موری گیٹ' شاہ عالمی گیٹ' موچی گیٹ اور سرکلر روڈ کے دونوں طرف زہر پھیلا ہوا تھا۔

ایک عورت پاگلوں کی طرح ہجوم میں اپنے میاں کو ڈھونڈ رہی تھی جسے پولیس گولی مارنے کے بعد گاڑی میں ڈال کر وہاں سے لے گئے تھی۔

وہ زندہ تھا یا مر چکا تھا؟ مگر کوئی اس عورت کے سوال کا جواب نہ دے سکتا تھا۔

جب جمال نے ایک دس سال کی بچی کو اپنے پانچ سالہ بھائی کا ہاتھ پکڑے دیکھا جو روتی ہوئی اپنے باپ کو ڈھونڈ رہی تھی تو وہ رو پڑا۔ وہ کہاں تھا؟ مگر کون کہاں تھا؟

غوث علی شاہ اور نواز شریف ٹیلی فون پر لمحے لمحے کی رپورٹ سن رہے تھے اور نمازی ضیاء الحق کسی پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنے خاندان اور ایک داماد کو ساتھ لے کر راولپنڈی شہر سے غائب ہو چکا تھا۔

اگلی صبح ایک احمقانہ پریس نوٹ میں کہا گیا کہ ایم آر ڈی کے کارکن کلاشنکوفوں سے مسلح تھے اور انہوں نے پولیس پر حملہ کر دیا۔ مجبوراً اپنے بچاؤ میں پولیس کو بھی ہوا میں گولی چلانی پڑی مگر جب ہجوم ہٹا تو تین آدمی مرے پڑے تھے۔ انہیں ان کے ساتھیوں نے مارا تھا تاکہ پولیس بدنام ہو۔

مگر کلاشنکوف تو ایریا ویپن ہے۔ یہ نشانہ لے کر نہیں چلائی جاتی۔ یہ تو ایک علاقے پر برسائی جاتی ہے۔ اس کے باوجود کسی پولیس والے کو خراش تک نہ آئی تھی۔

مگر لوگ تو حقیقت سے واقف تھے۔

جمال نے اپنی آنکھوں سے گرین کارڈ غنڈے موٹر سائیکلوں پر سوار دیکھے جو ہوائی فائر کر رہے تھے تاکہ پولیس کو کارروائی کا جواز ملے۔ پھر انہوں نے پولیس کی حمایت میں عوام پر بھی گولیاں چلائیں۔

لوہاری گیٹ کے پولیس مقابلے میں کوئی پولیس والا زخمی نہ ہوا۔ اس وقت مشاہد حسین' نثار عثمانی اور دیگر اخبار والے جمال کے ساتھ کھڑے تھے۔

شاہ عالمی چوک میں ایک کمزور سا بوڑھا جس کی سفید داڑھی تھی' ایک موٹر سائیکل سے اترا۔ قریباً دو سو پولیس والے سامنے کھڑے تھے مگر کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ بوڑھا بزرگ مولانا شاہ محمد امروٹھی ایم آر ڈی کا کنوینر ہے۔ اس نے چوک میں تقریر کرنے کی کوشش کی مگر چونکہ سننے والا کوئی نہ تھا اس لیے وہ جدھر سے آیا تھا' ادھر ہی واپس چلا گیا۔

اردو بازار کے سامنے ہجوم تھا اور وہ نعرے اور اینٹیں مار رہا تھا۔

پولیس نے گولی چلائی تو ہجوم کے ریلے میں جمال اوندھے منہ گر گیا۔ ایک شخص کی گردن میں گولی لگی۔ وہ تڑپے بغیر ٹھنڈا ہو گیا۔ ایک اور کے سر میں گولی لگی۔ اس کا خون آلود بھیجا زمین پر جھاگ کی طرح بکھر گیا۔ وہ بھی تڑپ نہ سکا۔

تیسرے کو گولی کھا کر گرتے دیکھا مگر جمال نے گولی لگتی نہیں دیکھی۔ چوتھا اور پانچواں بھی گرا مگر جمال نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کو بہت راحت ملی۔ پھر اسے اور دھکے پڑے تو اس نے سوچا کہ میرا بیٹا ہومی کہاں ہے؟ وہ میرے ساتھ شاہ عالمی گیٹ تک تو تھا مگر پھر کہاں گیا؟ اسے گولی تو نہیں لگ گئی؟ وہ اٹھا اور راستہ دیکھے بغیر ایک طرف کو چل دیا۔

شام ہو رہی تھی۔ پرندے اپنے گھونسلوں کو جا رہے تھے اور انہیں گھروں کے راستے معلوم تھے۔

## خیر سے بدھو گھر کو آئے

سوچے سمجھے بغیر چلتے ہوئے جمال نے ریگل چوک سے گلبرگ کی ویگن پکڑی اور گھر پہنچ گیا۔



دروازہ کھلا تھا اور اس کا بیٹا ہومی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور کالر پر خون کے دھبے تھے۔ جمال کو جیسے یکدم ہوش آ گیا ہو۔ اس نے بے قرار ہو کر پوچھا ''کیا ہوا بیٹے!''

''مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔ ہمیں آپ کی فکر تھی۔ سنا ہے انارکلی کے چوک میں بڑی گولی چلی۔ آپ کہاں تھے ابا؟''

''میں وہیں تھا اور گولی بھی چلی مگر میں ہجوم کے ریلے میں زمین پر گر گیا تھا۔ گولیاں میرے اوپر سے گزر گئیں۔''

''شکر ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔'' جمال کی بیوی بولی۔

''اب تم اپنی کہو۔'' جمال نے کہا ''تم پر کیا بیتی؟''

''میں مال روڈ پر عورتوں کے ایک گروہ کے ساتھ ہاتھ میں ایک پلے کارڈ لیے جا رہی تھی کہ اچانک پولیس والے ہم پر لپکے۔ عورتیں تتر بتر ہو گئیں۔ میں بھی بھاگی۔ اتنے میں ایک بس سڑک پر سے گزری۔ ڈرائیور نے حالات دیکھ کر رفتار دھیمی کر دی۔ کنڈیکٹر نے مجھے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ مجھے صرف تھوڑی سی گیس کھانی پڑی۔''

''اور تم کہو ہومی۔''

''میں لڑکوں کے ایک ہجوم کے ساتھ پولیس والوں پر اینٹیں برسا رہا تھا۔ وہ بھاگے تو ہم ان کے پیچھے دوڑے۔ پھر گلی میں سے پولیس کا ایک اور دستہ اچانک نکلا اور ایک سپاہی نے میرے سر پر ڈانگ ماری۔ مجھے چکر آ گیا اور میں زمین پر بیٹھ گیا۔ پولیس والے مجھے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ بس میری تو اتنی سی کہانی ہے۔''

''زخم کیسا ہے؟'' جمال نے اپنی بیوی سے پوچھا۔

ہومی بولا ''کچھ خاص نہیں۔ تھوڑا سا خون نکلا۔ امی نے ڈیٹول سے دھو کر ہلدی کا پھاہا رکھ دیا ہے۔ کل تک ٹھیک ہو جائے گا۔''

جمال کی بیوی اٹھ کر باورچی خانے میں آلو کے قتلے تلنے کے لیے چلی گئی۔

## مکالمہ

تھوڑی دیر باپ بیٹا خاموش رہے۔ پھر اچانک ہومی بولا ''ابا ہم کیا کر رہے ہیں؟''

جمال اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے کہا ''بیٹا ہم ڈکٹیٹر ضیاء الحق کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔ اس نے ذوالفقار علی بھٹو کو جھوٹے مقدمے میں پکڑا ہوا ہے۔''

''تو کیا ہم اسے چھڑا لیں گے؟''

''ہمیں مزاحمت تو کرنی چاہیے۔''

''بے شک مگر ابا کیا بھٹو ڈکٹیٹر نہیں تھا؟''

"وہ عوام کا مقبول لیڈر تھا۔ اگرچہ کچھ غلطیاں بھی اس نے کیں۔"

"میرا خیال ہے ابا حکمران سب ڈکٹیٹر ہوتے ہیں۔ ضیاء الحق اسے نہیں چھوڑے گا۔ اسے پھانسی پر لٹکائے گا۔"

"ایسی بات منہ سے نہ نکالو بیٹا' پھر آخری فیصلہ تو عدالت کرے گی۔"

ہومی بولا "تو آپ کا مطلب ہے کہ عدالت انصاف کرے گی۔"

"ہمیں توقع رکھنی چاہیے۔ یہ کوئی معمولی کیس نہیں۔"

"بے شک مگر امریکہ جو چاہے گا وہی ہوگا۔"

"نہیں بیٹا کیس کا فیصلہ میرٹ پر ہوگا۔ حکومت کو یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ بھٹو نے نواب محمد احمد خان کو قتل کروایا۔"

"کیا یہ بہت مشکل بات ہے؟"

"مشکل تو ہے۔"

اتنے میں جمال کی بیوی آلو کے تلے ہوئے قتلے' اچار اور پھلکے لے آئی۔

ہومی نے پوچھا "ابا کیا بھٹو فیصلے میرٹ پر کرتا تھا؟"

"بیٹا سیاستدانوں کے اپنے مفادات بھی ہوتے ہیں۔"

"ابا بھٹو کے لیے چھ سات آدمی جل کر مرے۔ بیسیوں نے کوڑے کھائے' جیلیں کاٹیں کیوں بھلا؟"

"اس لیے کہ وہ ان کی نجات کے وعدے کرتا تھا۔ سب کے لیے روٹی' کپڑا اور مکان اس کا منشور تھا۔"

"مگر ہمارے پاس تو کوئی مکان نہیں اور آپ کو اب کوئی نوکری بھی نہیں دیتا۔ اس کا اپنا اخبار بھی نہیں جس کی بنیاد میں آپ نے اپنا خون پسینہ ایک کر ڈالا تھا۔ کیا بھٹو کو آپ کی میرٹ کا علم نہیں تھا؟"

"اسے بڑے بڑے کام کرنے تھے' اس لیے......"

"مگر اس سے تو اس کا اپنا اخبار بھی نہ چلا۔ کیا اس کے پرانے کارکنوں میں اب کوئی باقی ہے؟"

"نہیں نئے لوگ آ گئے ہیں۔ نئے نظریے ساتھ لے کر۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ آپ لوگوں کی میرٹ آپ کے لیے مصیبت بن گئی۔ آپ لوگوں کا نظریہ آپ کو لے ڈوبا۔ آپ سوشلسٹ انقلاب چاہتے ہیں۔ پہلے جمہوریت تو حاصل کر لیں۔"

"یہی تو کوشش کر رہے ہیں۔"

"میں سمجھتا ہوں ابا۔" ہومی نے کہا "اس ملک میں جمہوریت نہیں آ سکتی۔"

"کیوں نہیں آ سکتی۔" جمال نے غصے سے پوچھا۔

"اس لیے کہ یہاں کا کلچر فیوڈل ہے اور اس کو مذہب کا ٹیکہ بھی لگا ہوا ہے۔ یہاں جمہوریت نہیں



آ سکتی۔ یہاں عوام حکمران نہیں ہو سکتے' کبھی نہیں۔"

جمال لاجواب ہو گیا۔ کڑک کر بولا "تم روٹی اتنی جلدی جلدی نہ کھاؤ اور چھوٹا لقمہ لو۔"

سب کھا چکے تو ہومی بولا "ابا اگر آپ برا نہ مانیں تو میں کہوں کہ آپ ایک ناکام آدمی ہیں۔"

"نہیں بیٹا میں برا نہیں مانتا' مگر میں ناکام آدمی نہیں۔"

"آپ نہ تو انقلاب لا سکے نہ ہی ہم لوگوں کو پیٹ بھر کر روٹی کھلا سکے۔ اسی لیے۔" وہ بولا۔

"یہ میں مانتا ہوں مگر میں نے زندگی اصولوں کے مطابق گزاری۔ نہ میں کسی کے آگے جھکا نہ بکا۔ ہمیشہ دوسروں کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں اپنی زندگی سے بہت مطمئن ہوں۔"

ہومی سنجیدہ شکل بنا کر بولا "اس کا مطلب ہے کہ آپ ناکام ہی نہیں خود غرض آدمی بھی ہیں۔ صرف اپنی زندگی گزارتے ہیں۔"

جمال گھبرا گیا۔

ہومی بولا "اب میں نے ایف اے پاس کر لیا ہے۔ بی اے بھی کر لوں گا اور ایم اے بھی شاید' پھر میرا کیا مستقبل ہے؟ کیا آپ مجھے میرٹ کے مطابق نوکری دلوا سکیں گے؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا۔ میں نے کبھی کسی کی سفارش نہیں کی اور کسی ایسے مقتدر آدمی کو جانتا بھی نہیں جو میرے کام آ سکے۔ تمہیں خود جدوجہد کرنی پڑے گی۔"

"پاکستان میں جہاں میرٹ کی کچھ وقعت نہیں' جدوجہد کے کیا معنی؟"

"یہ تو ہے بیٹا مگر یہی ہمارا ملک ہے۔ ہم اس کو تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"مگر ابا جن لوگوں میں میرٹ نہیں ہوتی' روٹی تو انہیں بھی ملنی چاہیے...... یا نہیں ملنی چاہیے؟"

"ایسا تو صرف سوشلسٹ سماج ہی میں ہو سکتا ہے۔ اسی لیے میں سوشلسٹ ہوں۔"

"اور کون سوشلسٹ ہے یہاں؟"

"بہت لوگ ہیں۔ تم ان کو نہیں جانتے۔"

"مگر کیا وہ سب آپ کی طرح بیکار' بیروزگار اور خالی ہاتھ ہیں؟"

"نہیں بعض کاروبار کرتے ہیں اور بعض کے پاس جائیدادیں بھی ہیں۔"

"جس کے پاس جائیداد ہے' وہ کیوں سوشلسٹ ہوگا؟"

"بس اب تم بکواس بند کرو اور جا کر سو جاؤ۔" جمال نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

وہ نہایت تحمل سے بولا "مجھے ابھی نیند نہیں آئی اور ابھی مجھے ٹی وی پر خبریں بھی سننی ہیں......"

"کون سی خبریں؟"

"یہی آج جو کچھ ہوا' کیا ٹی وی اس کی خبر دے گا؟"

''غالباً دے گا مگر توڑ مروڑ کر۔ عوام کے ہجوم نے پولیس پر حملہ کیا اور پولیس کو اپنے دفاع میں گولی چلانی پڑی۔ زخمیوں کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا ہے اور وزیراعلیٰ پنجاب نے ڈاکٹروں کو ہدایت کی ہے کہ وہ علاج میں کوتاہی نہ کریں۔ حکومتیں ایسا ہی کرتی ہیں۔''

''کیا بھٹو کی حکومت ایسا نہیں کرتی تھی؟''

''وہ بھی ایسا ہی کرتی تھی۔''

''تو پھر آپ کیوں اپنی جان کو جلاتے ہیں؟'' ہومی نے رحم کھا کر کہا۔

جمال لاجواب ہو گیا۔ اس نے کہا ''بکواس بند کرو۔'' اور وہ اٹھ کر سونے کے لیے کمرے میں چلا گیا۔

مگر نیند اس سے کوسوں دور تھی اور یہ خیال بھی دامن گیر تھا کہ میرا ایک ہی بیٹا ہے مگر چونکہ میں غریب آدمی ہوں اس لیے اسے کہیں نوکری نہ ملے گی' حالانکہ وہ ذہین بہت ہے۔

## آخری گیت

دو برس پہلے جمال کی بیٹی نیلم نے جو امریکہ میں رہتی تھی' جمال کو خط لکھا تھا کہ میرے بھائی نے میٹرک پاس کر لیا ہے۔ اب اسے میرے پاس امریکہ بھجوا دیں۔ میں اسے یہاں تعلیم دلواؤں گی۔ اس پر جمال نے اسے ایک سخت خط میں کہا تھا کہ میرا بیٹا پاکستانی ہے۔ تم کون ہوتی ہو اسے امریکہ بلانے والی' وہ یہیں پڑھے گا اور یہیں زندگی شروع کرے گا۔

اس پر وہ چپ ہو گئی تھی۔ اب جمال کو خیال آنے لگا کہ شاید وہ ٹھیک کہتی تھی۔ میرا بیٹا عملی زندگی کی باتیں کرتا ہے۔ وہ اپنے جنیٹک کوڈ کے مطابق سوچتا ہے۔ وہ میری طرح عینیت پسند نہیں۔ وہ پاکستان کی افراتفری کی پیداوار ہے۔ میں کیوں اس کو اپنی سولی پر لٹکاؤں۔

صبح اٹھ کر اس نے نیلم کو خط لکھ دیا کہ تم اپنے بھائی کو بلا لو۔ میں غلط تھا اور یہی میرا آخری گیت ہے۔

میں غلط تھا۔ میں جنم جنم کا ملامتی' میں غلط تھا۔ تم لوگ اپنی اپنی فکر لو' میں نے اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزار لی۔

جیسے ہی ہومی کے ویزے کا انتظام ہوا وہ چلا گیا۔

مگر ریت تو اُڑ رہی ہے۔ آنکھوں میں چاقو چبھ رہے ہیں۔ جھکڑ چل رہے ہیں۔ گرم ہوا کے بگولے جسموں کو جلا رہے ہیں۔

اور جمال کو ایک دفعہ اور زندگی شروع کرنی ہے۔

اور دل اس کا منزل منزل بھٹکے گا۔